بسم الله الرحمن الرحيم

تبیان الفرقان في تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ

سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵-لوئر مال ٥ بیسمنٹ منگو سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی ۵۔لوئر مال ۰ جمینت سنٹر ۰ اردو بازار لاہور

جامعہ اسلامیہ باب العلوم
کہروڑ پکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی
جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد
فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم
جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد
فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ
بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی
سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی
021-34130020
021-24125590

بیت الکتب
بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اُردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ ۔ ملتان

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

لا إله إلا الله محمد رسول الله

پیش لفظ

از قلم جانشینِ حکیم العصرؒ
اُستاذ المناظرین حضرت اقدس الشیخ منیر احمد صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث ورئیس المدرّسین، جامعہ اِسلامیہ باب العلوم، کہروڑ پکا

ایک عرصہ تک ''وفاق المدارس العربیہ، پاکستان'' کے نصاب میں ''ترجمۃ القرآن'' شامل نہ تھا، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اُس وقت علمائے دیوبند کی عظیم شخصیات کے ہاں سالانہ دو ماہی تعطیلات میں ''دورۂ تفسیرِ قرآن'' ہوتا تھا (جیسے ''مخزن العلوم'' خانپور میں حافظ الحدیث مفسرِ قرآن حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ، ''اشرف العلوم'' شجاع آباد میں عظیم مفسرِ قرآن، سرتاجِ اولیاء حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ، لاہور میں ولی کامل شیخ المشائخ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ، ''نصرت العلوم'' گوجرانوالہ میں محقق العصر حضرت شیخ الحدیث اِمام الموحّدین حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ) اور کثیر تعداد میں طلبہ کرام ان فحول علماء کے پاس ''دورۂ تفسیر'' میں ترجمۂ قرآن وتفسیر پڑھ لیتے تھے۔ جب شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ ''وفاق المدارس'' کے صدر منتخب ہوئے تو ان کے دور میں ''ترجمۃ القرآن'' کو باقاعدہ نصاب میں شامل کیا گیا۔

جب ''وفاق'' کے نصاب میں ''ترجمۂ قرآن'' شامل نہ تھا، اس وقت فصیح اللسان، شہنشاہِ تدریس، محدّث وفقیہ حضرت مولانا عبدالخالق صاحبؒ، سابق مدرّس دارالعلوم دیوبند اور مہتمم وبانی ''دارالعلوم کبیروالہ'' فکرمند ہوئے اور انہوں نے نصاب میں ''ترجمۂ قرآن'' کے شامل نہ ہونے کی کمی کو شدت سے محسوس کیا، چنانچہ انہوں نے اپنے دستِ راست اور انتہائی قابلِ اعتماد عظیم تلمیذ، دارالعلوم کبیروالہ کے مجسم شفقت ومحبت، طلبہ کے محبوب ترین مایۂ ناز اُستاذ حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمہ اللہ (جو بعد میں ''حکیم العصر، شیخ الحدیث، شیخ التفسیر'' کے مبارک القاب سے ملقب ہوئے اور ''عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت'' کے متفقہ اَمیر منتخب ہوئے) کو حکماً فرمایا کہ صبح کی نماز کے بعد دورۂ حدیث کے شرکاء سمیت تمام طلبہ کو پورا سال ترجمہ وتفسیرِ قرآن پڑھائیں اور مکمل پڑھائیں۔ فرمایا: ''ہماری طرف سے تعاون یہ ہوگا کہ اس وقت میں دورۂ حدیث سمیت کوئی دُوسرا سبق نہ ہوگا، تاکہ تمام طلبہ ترجمے کے سبق میں شریک ہوسکیں۔'' اس اہم مفوضہ کام کو کامیاب کرنے کے لئے

حضرت الاستاذؒ نے یہ تدبیر اختیار کی کہ صبح کی اذان ہوتے ہی خود جا کر طلبہ کو جگاتے تاکہ طلبہ نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کریں اور سبق میں بھی شریک ہوسکیں۔ دوسری طرف خدمتِ قرآن کا شوق وجذبہ اور محنت کا یہ عالم کہ آپ گرمیوں کی چھوٹی راتوں میں بھی دو بجے جاگتے اور مختصر نوافلِ تہجد سے فارغ ہوکر چائے پیتے، اور مطالعہ شروع کرتے، جو صبح کی اذان تک جاری رہتا۔ شروع میں آپ ''بیان القرآن''، ''فوائدِ عثمانی''، ''موضح القرآن''، ''تفسیر مدارک''، ''تفسیر مظہری''، ''جلالین''، ''لغات القرآن'' از مولانا عبدالرشید نعمانی، ''قصص القرآن'' از مولانا سیوہارویؒ مطالعہ میں رکھتے، جب ان تفاسیر کا کرات مرّات مطالعہ ہوچکا، تو بعد میں بعض جدید تفاسیر کا مطالعہ بھی شامل ہوگیا، جیسے ''تفہیم القرآن''، ''تدبر قرآن''، ''تفسیر ماجدی''، اس طرح قدیم تفاسیر کے ساتھ جدید تفاسیر بھی آپ کے مطالعہ میں رہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ''یہ جدید تفسیریں بعض مقامات میں آسان تعبیر کے لحاظ سے تو مفید ہیں، لیکن علم تفسیر کے سلسلے میں ان پر کلیۃً اعتماد کرنے کے بجائے اسلاف واکابر کی تفاسیر پر اعتماد کرنا چاہیے۔'' بعض خاص خاص مقامات میں مذکورہ تفسیروں کے علاوہ ''تفسیر ابن کثیر''، ''روح المعانی''، ''خازن'' اور ''قرطبی'' وغیرہ کا مطالعہ بھی کرتے۔ بندۂ عاجز نے حضرتِ والاؒ کے ساتھ اپنی ۵۶ سالہ غلامانہ وخادمانہ رفاقت میں حضرتِ والاؒ کو اس طرح پایا کہ آپ اپنی نیند اور ضروری تقاضوں کے علاوہ ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے، اور مطالعہ بھی پوری توجہ اور استغراق کے ساتھ کرتے۔ حجۃ الاسلام، محدّث العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ کا حافظہ تو ضرب المثل تھا ہی، لیکن آپ کے بعد علمائے دیوبند کے حلقے میں تین حضرات کا حافظہ بھی بے مثال تھا، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود زیدمجدہٗ، مناظرِ اسلام حضرت مولانا محمد امین صفدرؒ، حکیم العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ، اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ حضرت حکیم العصر کا علم وسیع بھی تھا اور عمیق بھی، آپ کے علوم کی وسعت اور عمق کا اندازہ وہی خوش نصیب حضرات کرسکتے ہیں جو حضرت کی مجالسِ علمیہ سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ اور استحضار کا یہ عالم کہ اگر کسی موضوع پر اچانک گفتگو شروع ہوجاتی تو معلومات کا دریا بہادیتے، یوں لگتا جیسے اس موضوع پر ابھی تازہ مطالعہ کرکے آئے ہیں۔

حضرتؒ نے اپنے تفسیری سبق کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ''میں تفاسیر کے مضامین کے علاوہ دیگر کتب سے اخذ کردہ نکات ومعلومات کو بھی سبق میں سمو دیتا ہوں۔'' حضرتؒ اپنے طبعی مزاج وذوق کے اعتبار سے اور خداداد قوتِ حافظہ کی وجہ سے ہمہ جہتی معلومات کا خزانہ تھے، معلومات کی وسعت اور استحضار کے اعتبار سے اگر آپ کو اپنے دور کا ''انور شاہ ثانی'' کہا جائے تو مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن کثرتِ مطالعہ اور معلومات کی وسعت کے باوجود درسی تقریر میں اعتدال کی خوبی قائم رہتی، تقریر نہ اتنی طویل ہوتی کہ رطب ویابس کا مجموعہ بن جائے اور شرکائے درس اُکتاہٹ محسوس کریں، نہ اتنی مختصر اور مغلق ہوتی کہ بات ہی نہ کھل سکے، بلکہ نہایت محقق، معتدل، مرتب، شگفتہ، عام فہم انداز ہوتا۔ چونکہ آپ کے درسِ قرآن میں طلبہ کے علاوہ عامۃ الناس میں سے قرآن فہمی کا شوق وذوق رکھنے والے متعدد تعلیم یافتہ حضرات بھی شریک ہوتے تو اس عوام وخواص کے مخلوط ماحول کا تقاضا بھی یہی تھا۔

یہ سلسلہ ''دارالعلوم کبیروالہ'' میں گیارہ سال تک جاری رہا، جب آپ ''باب العلوم کہروڑپکا'' میں رونق افروز ہوئے تو

یہاں بھی صبح کی نماز کے بعد حسبِ سابق تفسیر القرآن کا سلسلہ جاری رکھا، جس میں علماء، طلبہ اور عوام الناس میں سے کچھ چنیدہ فہمیدہ تعلیم یافتہ حضرات بھی شرکت کرتے، یوں پہلے کی طرح اب بھی درسِ قرآن میں آپ کے سامنے علماء، طلبہ اور عوامی شرفاء وصلحاء کی مخلوط جماعت ہوتی، درسِ قرآن میں آپ کا اصل مقصود علماء وطلبہ ہوتے، لیکن آپ عوامی لوگوں کی بھی رعایت رکھتے۔

اسی اثناء میں حکیم العصر کے منظورِ نظر تلمیذِ رشید حضرت قاری نسیم الدین آف کراچی (جو ''دار العلوم کبیر والہ'' میں زیرِ درس آیات کی تلاوت کے لئے متعین تھے، وہ اپنی خوبصورت آواز اور لہجے میں تلاوت کرتے، پھر حضرت والاؒ ان آیات کا ترجمہ وتفسیر ارشاد فرماتے) اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال دیا کہ اُستاذ جی رحمہ اللہ کا درس ٹیپ ہونا چاہیے، چنانچہ انہوں نے ٹیپ اور کیسٹوں کا انتظام کر دیا اور ہر روز کا درس ٹیپ ہونا شروع ہو گیا، جو شوال ۱۳۹۹ھ سے لے کر تین سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ کیسٹوں کا وہ سیٹ قاری نسیم الدین صاحب کے پاس محفوظ رہا اور سالہا سال ان کیسٹوں سے حکیم العصر کے علوم کے قدر شناس علماء، طلبہ، خطباء اور معلّمین کے علاوہ باذوق عوامی شخصیات نے خوب اِستفادہ کیا۔ پھر بعض احباب کا تقاضا ہوا کہ اس عظیم تفسیری شاہکار کو تحریری شکل میں لا کر طبع کرا دیا جائے تاکہ حضرت حکیم العصر کے تفسیری علوم کا فیض عام وتام ہو جائے۔ چنانچہ وہ تین سالہ دُروس کیسٹوں سے اوراق پر منتقل کرنے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ حکیم العصرؒ کے تفسیری علوم کو تو کاغذوں پر منتقل کیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کی شیریں زبان کی مٹھاس اور چاشنی، آپ کے شگفتہ بیان کی لذّت ولطف اندوزی، اور آپ کے حسین وجمیل چہرے کی مسکراہٹ اور نُورانیت کی تاثیر اور اَثر انگیزی کو کاغذوں میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد حضرت حکیم العصرؒ کے تلمیذِ رشید، محبّ ومحبوب، رفیقِ حج، اور اِنتہائی معتمد علیہ دوست ودستِ راست، اور بانیٔ دار العلوم کبیر والہ حضرت مولانا عبد الخالق صاحبؒ کے خادمِ خاص حضرت حافظ عبد الرشید صاحب حفظہ اللہ وزادہ مجدہٗ وشرفہ، اور ان کے دیگر چند خوش نصیب اَحباب نے بہ توفیقِ اِلٰہی طباعت کی ذمہ داری کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں، اور اُستاذِ محترم حضرت حکیم العصرؒ نے خود تفسیر کا نام تجویز فرمایا ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان''، چنانچہ تفسیری علوم کا یہ قیمتی خزانہ ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' کے نام سے پہلی مرتبہ دس جلدوں میں طبع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے عوام وخواص میں ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ لیکن حضرت حافظ صاحب جو معیارِ طباعت چاہتے تھے، اس کے مطابق طبع نہ ہو سکی تو آپ نے نئے عزم کے ساتھ اعلیٰ معیار پر طباعت کے لئے کمرِ ہمت باندھ لی۔ لیکن اس مرتبہ حضرت حکیم العصر کے معتمد علیہ تلامذہ واَحباب کا مشورہ تھا کہ اس پر نظرِ ثانی کی جائے، چنانچہ بندۂ ناچیز کی نگرانی میں اس پر نظرِ ثانی اور تخریج کا کام کیا گیا، اور اَب تفسیری علوم کا یہ خزانہ آٹھ جلدوں میں خوبصورت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔ دُعا ہے کہ جن اَحباب نے اس عظیم کارِ خیر میں جس درجے کا بھی تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین!

تنبیہ:- ''تصنیف اور تالیف'' کے طرز میں اور ''بیان وتقریر'' کے انداز میں بہت فرق ہے! ''تصنیف'' میں ایک بات کا تکرار عیب ہے، جبکہ ''تقریر'' میں بعض مرتبہ کسی اہم بات کے ذہن نشین کرانے کے لئے اور سامعین کے دل میں اُتارنے کے لئے تکرار ضروری ہو جاتا ہے، اسی لیے حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض دفعہ کوئی اہم بات تین مرتبہ ارشاد

فرماتے۔ چونکہ ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' حضرت حکیم العصرؒ کے تفسیری اسباق کی تقاریر ہیں، جن کو اسی تقریری انداز میں شائع کیا گیا ہے، اس لیے قارئین اس شاہکار تفسیر کو ''تصنیف وتالیف'' کی نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ خود کو سامع تصور کریں اور یوں سمجھ لیں کہ حضرت حکیم العصرؒ تقریر فرما رہے ہیں اور آپ تقریر سُن رہے ہیں، تو اس صورت میں ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' کے بعض مقامات کے اندر تکرار میں ''إِذَا تَكَرَّرَ تَقَرَّرَ'' کا لطف محسوس کریں گے اور ''تکرار'' عیب اور خامی کے بجائے کمال اور خوبی نظر آئے گا۔

''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' کی خصوصیات

۱- زیرِ درس آیات کا ترجمہ شیخ الہندؒ، ترجمہ ''بیان القرآن''، ترجمہ ''موضح القرآن''، ترجمہ حضرت لاہوریؒ کی روشنی میں عام فہم، آسان ترجمہ کیا گیا ہے۔

۲- ترجمے کے بعد خلاصۂ آیات ہے، جس کا اُسلوب یہ ہے کہ زیرِ درس آیت یا قطعۂ آیت کا ترجمہ اور اس کے ضمن میں جہاں ضرورت محسوس ہو لغوی، صَرفی نحوی تحقیق، تقدیرِ عبارت، ایک مادّے پر مشتمل مختلف جگہ اِستعمال ہونے والے الفاظ، ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کے طور پر ایک مضمون پر مشتمل مختلف آیات، ان کے علاوہ دیگر پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کے بعد باقاعدہ تفسیر کی گئی ہے۔ لیکن کہیں خلاصہ اور تفسیر الگ الگ نہیں بلکہ اکٹھا ہے، اور کہیں کہیں تفسیر پہلے اور خلاصہ بعد میں ہے۔

۳- ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' تفسیر بالروایہ اور تفسیر بالدرایہ کی جامع تفسیر ہے۔

۴- قرآنِ کریم میں بیان کیے گئے واقعات اور مثالوں کو پیش آمدہ اَحوالِ زمانہ پر منطبق کیا گیا ہے۔

۵- زیرِ درس آیات کی مناسبت سے اکابرینِ اُمت کے حالات وواقعات اور ان کا تعارف کرایا گیا ہے، تاکہ ان کی اہمیت دِل میں بیٹھ جانے کی وجہ سے ان کے علمی فیضان کے حصول کا اِشتیاق پیدا ہو۔ حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت کشمیریؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ اور مولانا عثمانیؒ کے اقوال کا خصوصیت سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

۶- فارسی، عربی اور اُردو اَشعار اور محاورہ جات کا بھی وافر ذخیرہ موقع محل کے مطابق اِستعمال کیا گیا ہے، جس سے مضمون کا سمجھنا سہل ہو جاتا ہے اور سبق دِلچسپ بن جاتا ہے۔ فارسی اَشعار اور محاورہ جات میں سے زیادہ تر مواد شیخ سعدیؒ کا ہے۔

۷- تفسیر کا انداز بالخصوص اختلافی عقائد ومسائل میں اِنتہائی سنجیدہ اور معتدل ہے، جو عقیدہ اور مسئلہ جس نوعیت اور جس حیثیت کا ہے، اس کو وہی حیثیت دی گئی ہے۔

۸- جدید مفسّرین کی تحقیقات کو بھی مدِنظر رکھا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدید مفسرین کی جن تحقیقات کو قابلِ اصلاح سمجھا گیا، اس پر علمی انداز میں تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

۹۔ ترجمہ شیخ الہندؒ اور ترجمہ تھانویؒ کو بطورِ خاص سامنے رکھا گیا ہے، اور جہاں جہاں دونوں تراجم کا فرق ہے، اس کو بھی نمایاں کیا گیا ہے، بایں انداز کہ ''فلاں لفظ کا اصل معنی یہ ہے اور اس کے مفہوم یہ دونوں ہی بن سکتے ہیں''، یا ''فلاں لفظ کی ترکیب میں یہ دو احتمال ہیں، اور ان دونوں کے مطابق ترجمہ دُرست ہے۔''

۱۰۔ اہلِ باطل کی طرف سے پھیلائے گئے جدید وقدیم شکوک وشبہات کے حسبِ موقع علمی انداز سے مدلل، تسلی بخش جوابات دیے گئے ہیں۔

۱۱۔ قرآنِ کریم کے وہ مضامین اور مسائل جن کو آج کل کا جدید ذہن اور بزعمِ خویش ''روشن خیال'' طبقہ قبول نہیں کرتا، ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' میں ان مضامین اور ان مسائل کو ایسے اچھوتے انداز سے لایا گیا ہے اور ایسی تعبیر اِختیار کی گئی ہے کہ جدیدیت زدہ طبقے کے لئے بھی قبول وتسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

۱۲۔ ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' تفسیر عثمانی، تفسیر بیان القرآن، تفسیر مدارک وغیرہ متعدّد قدیم وجدید تفاسیر کے اہم مضامین کی تلخیص ہے۔

۱۳۔ معلّمین حضرات اور عوامی درس دینے والے علمائے کرام کے لئے یکساں مفید ہے، مساجد میں درس دینے والے متعدّد علماء نے ذِکر کیا کہ ہمیں درس کے لئے پہلے مختلف تفسیریں دیکھنا پڑتی تھیں، لیکن اب درس کے لئے صرف ''تِبْيَانُ الْفُرْقَان'' کا مطالعہ کافی ہوجاتا ہے۔

منیر احمد غفرلہٗ
۱۶ر صفر ۱۴۴۱ھ

محمد رسول الله
والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم

فہرستِ مضامین

***

سُورَةُ الفَاتِحَة

اٰیاتھا ۷ | ۱ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۵ | رکوعھا ۱

سورۂ فاتحہ مکی ہے اور اِس کی سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے ① بے حد مہربان ہے نہایت رحم والا ہے ② جزاء کے دن کا مالک ہے ③

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ④ ہمیں سیدھے راستے پر چلا ⑤

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

راستہ ان لوگوں کا جن پر تُو نے اِنعام کیا، جن پر غضب نہیں کیا گیا، نہ وہ بھٹکنے والے ہیں ⑦

تفسیر

سورت کے اِختتام پر لفظ ''آمین'' کہنا مسنون ہے، جیسا کہ روایات میں آیا ہوا ہے،[1] ''آمین'' کا معنی ہے: ''اے اللہ! قبول کر'' اِس لیے دُعاؤں کے بعد یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کی وجۂ تسمیہ

سورۂ فاتحہ کے ساتھ لفظ ''مَکِّیَّۃ'' لکھا ہوا ہے، اور قرآنِ کریم کی سورتوں پر جس وقت آپ نظر ڈالیں گے تو بعض سورتوں کی اِبتدا میں ''مکیہ'' لکھا ہوا ہوتا ہے، اور بعض سورتوں کی اِبتدا میں ''مدنیہ'' لکھا ہوا ہوتا ہے، جیسا کہ اگلی سورت شروع ہوگی سورۃ البقرہ، اُس کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ''مدنیہ'' کا لفظ ہے۔ تو قرآنِ کریم کی سورتیں دو حصوں میں تقسیم ہیں، بعضی ''مکی'' کہلاتی ہیں، اور بعضی ''مدنی'' کہلاتی ہیں۔ اور یہ دو حصوں پر تقسیم کس طرح سے ہوئی؟ (اِبتدا میں یہ بات عرض کردی جائے گی، پھر بعد میں بار بار اِس کو نہیں دُہرایا جائے گا، اور سبق میں عام طور پر طریقہ یہی رہے گا کہ جس بات کی وضاحت ایک دفعہ ہوجائے گی اُس کی بار بار وضاحت نہیں کریں گے)۔ سرورِ کائنات ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی جو نبوت کی زندگی ہے، وہ دو حصوں میں تقسیم ہے، اِبتدائی تیرہ سال ''مکی زندگی'' کہلاتی ہے، اور آخری دس سال ''مدنی زندگی'' کہلاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی جو سورتیں یا جو آیات

---

(۱) ترمذی ج۱ ص۵۷، باب جاء فی التامین، وغیرہ

سرورِ کائنات ﷺ کی ہجرت سے قبل نازل ہوئیں، ان کو مفسرین کی اِصطلاح میں ''مکّی'' کہتے ہیں، ''مکّی'' کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہو، بلکہ ''مکّی'' کا مفہوم یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی ''مکّی زندگی'' میں نازل ہوئی، اور ''مکّی زندگی'' حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے تک ہے، پھر وہ سورت چاہے مکہ معظمہ شہر میں اُتری ہو، چاہے مکہ معظمہ کے اِردگرد کسی علاقے میں اُتری ہو، سرورِ کائنات ﷺ سفر میں ہوں اور مکہ معظمہ سے دُور کسی جگہ اُتری ہو، اِس سے بحث نہیں ہے۔ ہجرت سے قبل جو سورتیں یا آیات اُتری ہیں، وہ ساری کی ساری اِصطلاحِ مفسرین میں ''مکّی'' کہلاتی ہیں، اور جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے مکہ معظمہ سے ہجرت کرلی پھر آپ ﷺ کی زندگی ''مدنی'' بن گئی، اب جو آیات ہجرت کے بعد اُتریں وہ ''مدنی'' کہلاتی ہیں، چاہے وہ مدینہ منورہ میں اُتری ہوں، چاہے مدینہ منورہ سے باہر کسی اور جگہ میں اُتری ہوں، حتیٰ کہ اگر سرورِ کائنات ﷺ سفر کرکے مکہ معظمہ میں تشریف لائے ہوں اور مکہ معظمہ بھی اگر کوئی سورت اُتری ہو ہجرت کے بعد، تو اِصطلاحی طور پر وہ بھی ''مدنی'' کہلائے گی، ''مکّی'' نہیں کہلائے گی۔ تو دونوں قسم کی سورتوں کی تقسیم کا مدار اِس بات پر ہوا کہ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل جو سورتیں اُتریں وہ ''مکّی'' کہلائیں گی، اور ہجرت کے بعد جو سورتیں یا جو آیات اُتریں وہ ''مدنی'' کہلائیں گی۔

سورۂ فاتحہ کا تعارف

سورۂ فاتحہ کے ساتھ لکھا ہوا ہے ''مَكِّيَّة'' جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ''مکّی زندگی'' میں اُتری۔ اور یہ سورت اُن سورتوں میں سے ہے جو اِبتدا اِبتدا میں اُتری ہیں، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اِس کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا، اور ایک دفعہ مدینہ منورہ میں ہوا، اِس کی عظمت کے طور پر، اس لیے اس کو ''مکّی'' بھی کہہ سکتے ہیں اور ''مدنی'' بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن معروف یہی ہے کہ یہ سورت ''مکّی'' ہے، اور اِبتدائی اُترنے والی آیات میں سے ہے۔ اِس کا مجموعہ سات آیتیں ہیں، اِس بات پر سب فقہاء رحمہم اللہ کا اور مفسرین رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، اِسی لیے سورۂ حجر میں جو لفظ آیا ہے: ''اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' (آیت:۸۷)، تو ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' کا مصداق بھی اِسی سورت کو قرار دیا گیا ہے،[1] سات بار بار دُہرائی ہوئی آیتیں، چونکہ اِن کو بار بار دُہرایا جاتا ہے، نماز کے اندر کثرت سے پڑھی جاتی ہیں، جتنی تلاوت اس سورت کی ہوتی ہے اتنی تلاوت کسی دُوسری سورت کی نہیں ہوتی، اس لیے اس کو سات بار بار دُہرائی ہوئی آیتوں کا مصداق قرار دِیا گیا، تو جب اُس کا مصداق بھی سورۂ فاتحہ کو قرار دیا گیا ہے تو اِس لحاظ سے گویا کہ منصوص ہو گیا کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔

''بِسْمِ الله'' فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟

آگے فقہاء کے درمیان اِس میں تھوڑا سا اِختلاف ہے، (فقہی مسئلے کی تفصیل تفسیر کے سبق میں زیادہ نہیں کی جایا کرتی، لیکن اِبتدائی سبق ہونے کی بنا پر اِشارہ کرتا ہوں، مسئلہ حدیث شریف کے سبق میں آئے گا)، کہ ''بسم اللہ'' سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟ سورۂ نمل کے وسط میں جو آیت آئی ہوئی ہے: ''اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' یہ الفاظ تو

(۱) بخاری ۲/ ۶۸۳، باب ولقد اٰتیناک سبعا من المثانی/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۴، کتاب فضائل القرآن فصل اوّل۔

سورۂ نمل کا جزء ہیں، لیکن جو ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ '' سورت کی اِبتدا میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ کسی متعین سورت کا جزء ہے یا نہیں؟ فقہاء کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ قرآنِ کریم میں جتنی سورتیں آئی ہیں اُن میں سے صرف ایک سورۂ براءۃ کو چھوڑ کر باقی سب سورتوں کی اِبتدا میں ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ '' لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اَحناف رحمہم اللہ کے نزدیک ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ '' کے الفاظ قرآنِ کریم کا جزء تو ہے، قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے، لیکن کسی متعین سورت کا جزء نہیں ہے، نہ فاتحہ کا، نہ کسی دُوسری کا، بلکہ دو سورتوں کے درمیان میں فصل کرنے کے لئے اور تبرک کے طور پر یہ آیت اُتری تھی، اس لیے اَحناف رحمہم اللہ اس کو قرآنِ کریم کا جزء تو قرار دیتے ہیں لیکن متعین طور پر کسی سورت کا جزء قرار نہیں دیتے۔ چونکہ اَحناف کے نزدیک یہ قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے تو یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں رمضان المبارک میں قرآنِ کریم سناتے وقت اِس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کم اَز کم ایک دفعہ ''بسم اللہ '' کو جہراً ضرور پڑھ لیا جائے، جس جگہ بھی پڑھ لیا جائے، شروع میں، وسط میں، یا آخر میں، تاکہ سارے کا سارا قرآنِ کریم جہراً پڑھنے کا مصداق محقق ہو جائے۔ اور اگر کسی سورت کی اِبتدا میں ایک دفعہ بھی آپ ''بسم اللہ '' جہراً نہیں پڑھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت آپ نے تراویح کے اندر چھوڑ دی، اس لیے ایک دفعہ اِس کا پڑھنا اَحناف کے نزدیک ضروری ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ جزء ہے، تو ''اٰیَةٌ مِّنَ الْقُرْاٰن '' ہونے کے طور پر ایک دفعہ جب اِس کی تلاوت ہو جائے گی تو قرآنِ کریم مکمل ہو جائے گا، اور اگر آپ اِس کو نہیں پڑھیں گے تو ایک آیت کم رہ جائے گی۔

قراء کے نزدیک اور بعض فقہاء کے نزدیک ''بسم اللہ '' جو ہر سورت کی اِبتدا میں لکھی ہوئی ہے، یہ ہر سورت کا جزء ہے، اور پھر فاتحہ کے متعلق تو ان میں سے اکثریت کی رائے یہی ہے کہ یہ فاتحہ کا جزء ہے۔ جب ''بسم اللہ '' کو فاتحہ کا جزء بنالیا جائے گا تو پڑھتے وقت بھی اس کی ہیئت وہی ہوگی جو فاتحہ کی ہے، جب آپ فاتحہ کو جہراً پڑھیں گے تو ''بسم اللہ '' بھی ساتھ آپ کو جہراً پڑھنی پڑے گی۔ جب آپ فاتحہ کو سراً پڑھیں گے تو ''بسم اللہ '' بھی آپ کو فاتحہ کے ساتھ سراً پڑھنی پڑے گی۔ تو جب یہ اُس کی آیت اور ایک جزء بن گیا تو جو صفت سر اور جہر کے اِعتبار سے سورۂ فاتحہ کی ہوگی وہی صفت ''بسم اللہ '' کی ہوگی۔ اس لیے جس وقت حدیث شریف میں اس مسئلے کے اِختلاف کو ذِکر کیا جاتا ہے تو جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ فاتحہ کے ساتھ ''بسم اللہ '' کو جہراً نہیں پڑھتے تھے،[1] یہی اَحناف رحمہم اللہ کی دلیل ہوتی ہے کہ ''بسم اللہ '' فاتحہ کا جزء نہیں ہے، ورنہ اگر جزء ہوتا تو جب انہوں نے فاتحہ جہراً پڑھی تھی تو ''بسم اللہ '' بھی جہراً پڑھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمل کو جب ذِکر کیا جاتا ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی اِبتدا ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ '' سے کیا کرتے تھے اور ''بسم اللہ '' جہراً نہیں پڑھتے تھے،[2] تو یہی دلیل بن جاتی ہے اس بات کی کہ ''بسم اللہ '' فاتحہ کا جزء نہیں ہے، اگر جزء ہوتا تو جیسے انہوں نے فاتحہ کو جہراً پڑھا تھا اسی طرح ''بسم اللہ '' کو بھی جہراً پڑھتے، چنانچہ جن کے نزدیک جزء ہے ان کے نزدیک پڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ فاتحہ جہراً پڑھو تو ساتھ ''بسم اللہ '' کو بھی جہراً پڑھو۔

---

(۱) بخاری ۱/۱۰۳، باب ما یقول بعد التکبیر۔/مسلم ۱/۱۷۲۔ ۱/۱۹۳/ ابو داؤد ۱/۱۱۴، باب من لم یر الجہر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

(۲) مسلم ۱/۱۷۲، باب حجۃ من قال لا یجہر بالبسملۃ/ ترمذی ۱/۵۷، باب ما جاء فی افتتاح القراءۃ۔

اور جن کے نزدیک ''بسم اللہ'' فاتحہ کا جزء ہے، اُن کے نزدیک بھی آیات سات ہی ہیں، آیات کی تعداد نہیں بڑھتی، ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کو ساتھ شامل کر کے وہ بھی سات ہی آیتیں قرار دیتے ہیں، تو پھر آگے جا کر آخری جو دو آیتیں ہیں، اُن میں پھر اختلاف ہو جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' پر بھی آیت ہے، اور اُن کے نزدیک ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' پر آیت نہیں ہوگی بلکہ وہ آخر تک اِس کو ایک آیت قرار دیتے ہیں، تو گویا کہ اُن کے نزدیک ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' یہ ساری ایک آیت بن جائے گی، اور اَحناف کے نزدیک ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' بھی آیت ہے، اور ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' بھی مستقل آیت ہے، بہرحال اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ آیتیں تو اِس کی سات ہیں، باقی! سات آیتیں کس طرح ہیں؟ ''بسم اللہ'' کو ساتھ شامل کر کے یا بغیر ''بسم اللہ'' کے؟، یہ فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ بات ہے۔

اَحناف کا مسلک اِحتیاط پر مبنی ہے

اَحناف کے نزدیک یہ متعین مسلک ہے کہ ''بسم اللہ'' قرآنِ کریم کی کسی متعین سورت کا جزء نہیں ہے، حتیٰ کہ فاتحہ کا بھی جزء نہیں ہے، لیکن نماز پڑھتے وقت ہمیشہ اکابر علماء تلقین فرمایا کرتے ہیں کہ اختلاف سے نکلنا اور بچنا اچھا ہوتا ہے، اِس لیے نماز میں سورۂ فاتحہ کی اِبتدا میں سرًا ''بسم اللہ'' ضرور پڑھ لینی چاہیے، اگرچہ ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے، لیکن دُوسروں کے نزدیک چونکہ وہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے تو اُن کے نزدیک اِس کا پڑھنا ضروری ہوا، اور ہمارے نزدیک اِس کا پڑھنا کوئی ممنوع نہیں ہے، اس لیے سورۂ فاتحہ اگر سرًا پڑھنی ہے تو بھی ''بسم اللہ'' پڑھ لینی چاہیے، اور اگر فاتحہ جہرًا پڑھنی ہے تو بھی ''بسم اللہ'' سرًا پڑھ لینی چاہیے تاکہ اُس اختلاف سے کسی نہ کسی درجے میں انسان نکل جائے کہ فاتحہ کی ایک آیت کسی کے نزدیک بھی چھوٹے نہیں، ورنہ جن کے نزدیک ''بسم اللہ'' فاتحہ کا جزء ہے تو جب ہم ''بسم اللہ'' نہیں پڑھیں گے تو ایسا ہوگا گویا کہ نماز میں فاتحہ پڑھتے وقت ہم نے ان کے مذہب کے مطابق ایک آیت چھوڑ دی۔ پہلی رکعت میں دُعائے اِستفتاح کے بعد تو آپ پڑھتے ہی ہیں: ''اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' دُوسری رکعت کی طرف بھی جس وقت آپ اُٹھیں اس وقت بھی خیال کر کے سرًا ''بسم اللہ'' پڑھ لینی چاہیے، اور اُس کے بعد سورۂ فاتحہ شروع کرنی چاہیے، چاہے سورۂ فاتحہ جہرًا پڑھنی ہو، چاہے سرًا پڑھنی ہو۔ تو یہ سبع آیات کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی کہ یہ سات آیتیں ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے متعدّد نام اور ان کی وجۂ تسمیہ

''الفاتحۃ'' اِس کا نام ہے، اِس کو ''الفاتحۃ'' اس لیے کہا گیا کہ قرآنِ کریم کا اِفتتاح اس کے ذریعے سے کیا گیا ہے، ''فاتحہ'' کے معنی اِبتدا کرنے والی، فتح کرنے والی۔ قرآنِ کریم کا اِفتتاح جمع کرتے وقت چونکہ اسی کے ساتھ ہی کیا گیا، اس لیے اِس کو ''سورۂ فاتحہ'' کہتے ہیں۔ ویسے اِس کے متعدّد نام حدیث شریف میں آتے ہیں، ''فاتحہ'' کہنے کی وجہ تو یہ ہوگئی کہ اس کے ساتھ

قرآنِ کریم کا افتتاح ہو رہا ہے، یہ قرآنِ کریم کی ابتداء میں ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں اس کو "اُمّ الکتاب"(۱) بھی کہا گیا ہے، اور "اُمّ القرآن"(۲) بھی کہا گیا ہے، "اُمّ الکتاب" کا لفظی معنی بنتا ہے: "کتاب کی اصل"، اور "اُمّ القرآن": قرآن کی اصل۔ "اُمّ" اصل کے معنی میں آتا ہے، اور "اُمّ الکتاب" اور "اُمّ القرآن" کہنے کی وجہ بھی علماء کی تشریح کے تحت اس طرح ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت قرآنِ کریم کے تمام تفصیلی مضامین کو اِشارۃً اِس سورت کے اندر بند کر دیا ہے، بالکل اس طرح جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیج ہوتا ہے، جس وقت اُس کو بویا جاتا ہے تو اس میں سے ایک مفصل درخت یا ایک مفصل پودا نکلتا ہے، اور علم النباتات والوں کے نزدیک اُس پودے کی اور اُس درخت کی پوری تصویر اُس بیج کے اندر بند ہوتی ہے، یعنی خوردبین کے ساتھ اگر دیکھا جائے تو وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اِس بیج کے اندر کتنی حیات کا اثر ہے؟ اور اِس سے جو پودا نکلے گا وہ کتنا بڑا ہوگا؟ اور کتنی دیر تک وہ سرسبز رہ سکتا ہے؟ کتنا پھیلے گا؟ تحقیقات کے تحت بیج کی طرف دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔ تو اتنا بڑا درخت جو آپ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اُس کا اجمالی وجود جس طرح سے ایک بیج میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اُس کو بویا جاتا ہے، اس کو سینچا جاتا ہے، پانی دیا جاتا ہے، تو اُس میں سے پودا نکلتا ہے، اور نکل کے سارے کا سارا پھیل جاتا ہے، وہ اِجمال اس طرح سے تفصیل میں آ جاتا ہے، بعینہٖ اسی طرح سے قرآنِ کریم کے مضامین جو کہ مفصل آپ کے سامنے آنے والے ہیں، اِجمال کے درجے میں اِشارۃً اِس سورت کے اندر سمو دیے گئے اور اِس میں بھر دیے گئے، اور آگے جو بھی مضمون آئے گا وہ ایک قسم کی سورۂ فاتحہ کی تفصیل کے درجے میں ہوگا، اِس کو قرآنِ کریم کی بنیاد اور اصل کے درجے میں رکھ دیا گیا۔ اور وہ مضامین سارے کے سارے اِس میں کس طرح سے سمو دیے گئے؟ اس کی تشریح اِن شاء اللہ العزیز! اپنے وقت پر آپ کے سامنے آتی چلی جائے گی۔ تو "اُمّ القرآن" اور "اُمّ الکتاب" کہنے کی یہ وجہ ہے۔

اور ایسے ہی اِس سورت کا نام حدیث شریف میں "سورۃ الشفاء" بھی ذکر کیا گیا ہے، باطنی امراض سے تو شفاء ہے ہی، جیسے قرآنِ کریم کو "هُدًى وَّشِفَآءٌ" (سورۂ حم السجدہ: ۴۴) ذکر کیا گیا کہ جتنا اس کی تلاوت کرو گے، پڑھو گے، اِس میں غور کرو گے، دل کے اندر مستقل قسم کے روگ ہوتے ہیں، بیماریاں ہوتی ہیں، اُن سے یہ شفاء ہے، حسد، بغض اور دِل کے اندر دیگر اَمراض جن کی تفصیل آپ کے سامنے تصوف اور اخلاق کی کتابوں میں آتی رہتی ہے، قرآنِ کریم اُن سب بیماریوں کا بھی علاج ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ صرف رُوحانی اور قلبی اَمراض کا علاج نہیں، بلکہ جسمانی طبّی اَمراض کا بھی علاج ہے، چودہ سو سال سے اِس شعبے میں بھی قرآنِ کریم کا استعمال اُمت کے اندر چلا آ رہا ہے، کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بیماریاں قرآنِ کریم کی آیات پڑھ کر پھونکنے کے ساتھ، یا آیات لکھ کر گلے میں ڈالنے کے ساتھ، یا اُن آیات کا وِرد کرنے کے ساتھ وہ بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں، خصوصیت کے ساتھ سورۂ حمد (یعنی سورۂ فاتحہ) کو تو سورۂ شفاء قرار دیا گیا ہے، اور ہر بیماری سے شفاء قرار دیا گیا ہے،(۳) اور عاملین کو یہ بات معلوم ہے کہ

---

(۱) بخاری ۱/ ۱۰۷، کتاب الاذان، باب یقرأ فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب/ مشکوٰۃ ۱/ ۷۹، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ فصل اول.

(۲) بخاری ۲/ ۸۵۴، کتاب الطب، باب الرقی بفاتحۃ الکتاب/ مشکوٰۃ ص ۷۹، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ کی پہلی حدیث۔

(۳) سنن دارمی باب فضل فاتحۃ الکتاب. رقم ۳۳۴۳/ مشکوٰۃ ص ۱۸۹، کتاب فضائل القرآن فصل ثالث.

سورۂ فاتحہ کا دَم کرنے کے ساتھ کتنی بیماریوں کا علاج ہوجاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے ساتھ دَم کرنے کا واقعہ اور دَم وغیرہ پر اُجرت کا مسئلہ

بعد میں بھی اُمت کے اندر یہ معمول رہا، اور خود حدیث شریف میں بھی اِس کا ذِکر آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ ایک دفعہ سفر پر جارہے تھے، ایک جگہ جاکے قیام کیا، اُس زمانے کے دستور کے مطابق جو لوگ وہاں آباد تھے اُن سے مہمانی کا مطالبہ کیا، لیکن اُنہوں نے کسی قسم کا تعاون کرنے سے اِنکار کردیا، اتفاق ایسا ہوا کہ اُس قبیلے کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا، تو پھر وہ اِدھر اُدھر بھاگے، جب کوئی دوا نہ ملی تو انہی کے پاس آئے اور آکر کہنے لگے کہ تمہارے پاس کوئی منتر اور جھاڑ پھونک ہو تو ہمارے سردار کا علاج کرو، اس کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ تو صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ ہم تو بالکل جھاڑ پھونک کے ساتھ علاج نہیں کریں گے، تم نے ہماری مہمانی نہیں کی اور ہمارے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کیا، اب اِس شرط پر ہم جھاڑ پھونک کریں گے کہ اتنی بکریاں لیں گے۔ بکریوں کی تعداد متعین کرلی، مرتے کیا نہ کرتے، اُنہوں نے وعدہ کرلیا کہ ہاں! ہم اتنی بکریاں دیں گے۔ چنانچہ ایک صحابی گئے اور جاکے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اُس کو پھونکا اور اُس کو آرام آگیا، جب آرام آگیا تو بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا، تو باقی صحابہ کرامؓ نے کہا کہ یہ تو حلال نہیں ہیں، ''اَخَذْتَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ اَجْرًا'' تُو نے تو اللہ کی کتاب پر اُجرت لے لی، اور اللہ کی کتاب پر اُجرت لینا ٹھیک نہیں ہے، جس وقت تک سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے جاکر اس بات کو ہم دریافت نہ کرلیں اُس وقت تک ہم تو اِس کو حلال نہیں سمجھتے، (یعنی حاصل اُس روایت کا یہ ہے) مدینہ منوّرہ میں جس وقت واپس آئے اور سرورِ کائنات ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم کے ساتھ جو تم نے جھاڑ پھونک کی ہے، اِس پر تم اُجرت لے سکتے ہو، اور یہ تمہارے لیے حلال ہے، آپس میں ان کو بانٹ لو، اور اُن کی دِلجوئی کے طور پر فرمایا کہ ''میرا حصہ بھی ساتھ لگالو!'' اور حضور ﷺ ایسے موقع پر اکثر فرمادیا کرتے تھے، جب کوئی اس قسم کی بات پوچھی جاتی، صحابہ کرام کو کسی چیز کے کھانے پینے میں شبہ ہوتا اور وہ مسئلہ پوچھتے تو آپ ﷺ فرماتے کہ ''میرا حصہ بھی ساتھ لگالو!'' اِس میں مزید اطمینان ہوجاتا کہ کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔ اِس واقعے کے تحت شارحین اور علماء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ''اٰیۃٌ مِنْ آیاتِ اللّٰہ'' پڑھ کر، یا جائز الفاظ کے ساتھ کسی کو کوئی دَم کیا جائے اور اُس کا معاوضہ وصول کرلیا جائے، کچھ اُجرت لے لی جائے، تو اِس کا جواز ہے، صحابہ کرامؓ نے دَم کرکے بکریاں لی تھیں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے اُن کو آپس میں تقسیم کرنے کے لئے فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح سے کوئی معاوضہ وغیرہ اگر لے لیا جائے تو گنجائش ہے۔ اگرچہ بعد میں علماء نے اِس میں اختلاف کیا ہے کہ تعویذ لکھ کر اُس پہ معاوضہ لینا دُرست ہے یا نہیں، بہت سارے اس کو ناجائز بھی کہتے ہیں، لیکن ہمارے علماء کا رُجحان اِدھر ہی ہے کہ اگر تعویذ میں کوئی کُفر و شرک کی بات نہیں ہے، جس طرح سے جاہل قسم کے لوگ جادو کرتے ہیں، وہ تو پیشہ ہی حرام، اور اُس پر کسی قسم کی اُجرت لیں گے تو وہ بھی حرام، لیکن اگر جائز طریقے کے ساتھ کوئی دَم کیا جائے، قرآنِ کریم کی آیت پڑھ کر، یا ان دُعاؤں سے جو حدیث شریف میں آئی ہوئی ہیں، یا کوئی ایسے الفاظ جن میں کوئی ناجائز لفظ نہیں ہے جس میں کُفر و شرک، استعانۃ بالشیاطین، یا ارواحِ خبیثہ سے اِستعانت ہو، اس قسم کا

لفظ نہ ہو، تو یہ دَم کرنا جائز بھی ہے، اور اِس کے اثرات مسلّم ہیں، اور اِس دَم کرنے کے بعد اگر معاوضہ وصول کرلیا جائے تو اِس کا جواز بھی ہے۔ تو صحابہ کرامؓ میں بھی اِس بات کا ثبوت ملتا ہے، کہ جب کوئی تکلیف ہوتی تھی تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دَم کرلیا کرتے تھے، اِس لحاظ سے سورۂ فاتحہ شفا ہے، اور رُوحانی اور قلبی امراض کے علاوہ جسمانی اور طبّی اَمراض کے لئے بھی ہمیشہ سے اُمّت اِس کو اِستعمال کرتی آئی ہے۔ باقی! پڑھنے کے طریقے عاملین کے نزدیک تجربے کے طور پر مختلف ہوتے ہیں، کوئی کسی طرح سے پڑھ لیتا ہے، کوئی کسی طرح سے پڑھ لیتا ہے، بہرحال توجّہ کے ساتھ اگر پڑھی جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ شفا عطا فرمادیتے ہیں، اِس لحاظ سے اس کا نام ''سورۃ الشفاء'' بھی ہے۔

سورۂ فاتحہ کا نام ''تعلیم المسئلۃ'' اور اس کی وجہِ تسمیہ

اور اِس کا ایک نام روایات میں ''سورۃُ تعلیمِ المَسئلۃ'' ہے، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنے حاشیے میں ذِکر فرمایا، تعلیم المسئلۃ: مانگنا سکھانا، یعنی قرآنِ کریم کی یہ سورت سوال کرنے کی تعلیم دیتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح سے مانگنا چاہیے؟ چنانچہ یہاں جو طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا کی گئی، حمد وثنا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال کیا گیا، تو جو دُعا اِس انداز کے ساتھ ہوتی ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے طور پر ایک یہ بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سورت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے، وَلِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ میرے بندے کے لئے وہ چیز ہے جو یہ مانگے گا، ابتدائی آیات اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے طور پر ہیں، اور آخری آیات بندے نے اپنی حاجت کے طور پر اللہ کے دربار میں پیش کرنی ہیں، تو جب حمد وثنا کرنے کے بعد اللہ کے دربار میں درخواست پیش کی جائے گی تو دُعا قبول ہوگی۔ اِس لیے عام طور پر بھی دُعا کرنے سے قبل سورۂ فاتحہ کا پڑھنا معمول ہے، کہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس کے بعد دُعا کی جائے، تو چونکہ روایات صحیحہ کے اندر آیا ہوا ہے کہ جب انسان یہ الفاظ اپنی زبان سے اَدا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے ''وَلِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ''[1] میرے بندے کے لئے وہ چیز ہے جو وہ مانگے، تو ایسے وقت میں وہ دُعا اَقرب إلی الاجابۃ ہوجاتی ہے جو سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد کی جائے۔ تو عام طریقہ بھی یہی ہے کہ دُعا کرتے وقت پہلے حمد وثنا کرو، اور اگر سورۂ فاتحہ ہی پڑھ لو تو زیادہ مناسب ہے۔

اِس طرح سے اِس کے مختلف نام آئے ہیں، اور ناموں کا اِس کثرت کے ساتھ اور ایسے الفاظ کے ساتھ آنا، اِس کی عظمت پر دَلالت کرتا ہے۔

بعض سورتوں اور آیات کے مخصوص فضائل

سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے طور پر جو روایتیں ذِکر کی گئی ہیں اُن میں یہاں تک بھی ایک روایت تفسیرِ مظہری میں موجود ہے کہ اِس کا پڑھنا دو ثلث قرآنِ کریم کے ثواب کے برابر ہے۔ ...... اس مسئلے کو بھی اِبتدا میں تھوڑا سا ٹھن لیجئے! ...... قرآنِ کریم کا ایک

---

(۱) مسلم ۱/ ۱۷۰ باب وجوب قراءة الفاتحة/ مشکوٰۃ ۱/ ۷۸ باب القراءة في الصلوٰۃ فصل اول عن ابی ہریرہؓ۔

ایک لفظ اور ایک ایک آیت بابرکت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت بعض آیات کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور وہ فضیلت جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہے ضروری نہیں کہ ہم اُس کی وجہ سمجھ جائیں، اللہ تعالیٰ کے قرار دینے کے ساتھ بعض آیات بعض کے مقابلے میں اور بعض سورتیں بعض سورتوں کے مقابلے میں افضل ہیں، جیسے سورۂ یٰسٓ کے بارے میں آتا ہے کہ اِس کو پڑھ لیں تو دس قرآن کے برابر ثواب مل جاتا ہے،[1] سورۂ قُل ھو اللہ یعنی سورۂ اخلاص کے متعلق آتا ہے کہ یہ ثُلثِ قرآن کے برابر ہے،[2] قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے بارے میں آتا ہے کہ رُبع القرآن کے برابر ہے،[3] اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے متعلق آتا ہے کہ سُدس القرآن کے برابر ہے،[4] سورۂ زلزال کے متعلق آتا ہے کہ یہ نصف قرآن کے برابر ہے،[5] اسی طرح سورۂ فاتحہ کے متعلق بھی بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ دو ثُلث کے برابر ہے (مظہری)۔ اور ایسے ہی بعض آیات کی فضیلت بھی آتی ہے، جیسے سورۂ رُوم کے اندر ''فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ'' یہ جو تین آیتیں ہیں، اِن کی فضیلت حدیث شریف میں ذِکر کی گئی ہے کہ اگر صبح کے وقت کوئی پڑھے تو رات کے وقت اپنے عمل میں اور اپنے وظائف میں جو کوئی کمی کوتاہی رہ گئی ہو اللہ تعالیٰ پوری فرما دیتے ہیں، شام کو پڑھ لو تو دِن کی کوتاہیوں کی اللہ تعالیٰ تلافی فرما دیتے ہیں، تو بارہ گھنٹے کے اندر اپنے عمل میں اور اپنے وِرد وظیفے میں جو کوئی کمی کوتاہی رہ جاتی ہے تو اِن آیات کا اتنا ثواب ہے کہ اُس کی تلافی ہوجاتی ہے۔[6] اسی طرح سورۂ حشر کی آخری آیات ہیں: ''هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ'' سے آخر تک، اور اِن کے پڑھنے کا طریقہ حدیث شریف میں یونہی آیا ہے کہ پہلے تین دفعہ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ لیا جائے، اُس کے بعد ان آیات کی تلاوت کی جائے، جو صبح کو پڑھے تو سارا دِن ستر ہزار فرشتے اس کے لئے اِستغفار اور دُعا کرتے ہیں، اور اگر اِنسان مرجائے تو شہادت کی موت ہے، اور جو شام کو پڑھ لے تو ساری رات کے لئے یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے کہ ستر ہزار فرشتے دُعا و اِستغفار میں لگے رہتے ہیں، اور اگر شب کو انتقال ہوجائے تو شہادت کی موت ہے۔[7] تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کے تحت اُس کی عطا سے بعض آیات کو بعض کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے۔

فاتحہ خوانی کی حقیقت اور تعزیت کی شرعی حیثیت

سورۂ فاتحہ چونکہ عام طور پر سب کو یاد بھی ہوتی ہے اور فضیلت والی بھی ہے، اس لیے لوگوں نے مُردوں کو اِیصالِ ثواب کرنے کے لئے بھی اِسی سورت کو خاص کرلیا، اب یہ محاورہ ہی بن گیا ہے کہ جس وقت کسی میّت کی طرف آپ جاتے ہیں، کہتے ہیں

(۱) ترمذی ۱۱۶/۲، باب ماجاء فی فضل یٰس/ مشکوٰۃ ۱۸۷/۱، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی، عن انس رضی اللہ عنہ۔

(۲) بخاری ۷۵۰/۲، باب فضل قل ھو اللہ/ مشکوٰۃ ۱۸۵/۱، کتاب فضائل القرآن، فصل اول، عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ۔

(۳) ترمذی ۱۱۷/۲، باب ماجاء فی اذا زلزلت/ مشکوٰۃ ۱۸۸/۱، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی، عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۴) شعب الایمان ج ۲ ص ۱۴۱/ مشکوٰۃ ۱۹۰/۱، کتاب فضائل القرآن، فصل ثالث، عن ابن عمر رضی اللہ عنہ۔

(۵) ترمذی ۱۱۷/۲، باب ماجاء فی اذا زلزلت/ مشکوٰۃ ۱۸۸/۱، کتاب فضائل القرآن، فصل ثانی، عن ابن عباس۔

(۶) ابوداؤد ۳۳۶/۲، باب ما یقول اذا اصبح/ مشکوٰۃ ۲۱۰/۱، باب ما یقول عن الصباح، فصل ثالث، عن ابن عباس۔

(۷) ترمذی ۱۲۰/۲، ابواب القراءات، باب کیف کانت قراءۃ النبی سے پہلے/ مشکوٰۃ ۱۸۸/۱، کتاب فضائل القرآن، فصلِ ثانی، عن معقل بن یسار

کہ ''فاتحہ کہنے جارہے ہیں'' (جو پڑھے لکھے ہیں وہ تو''فاتحہ'' کہہ لیتے ہیں، ورنہ پنجابیوں کے ہاں تو لفظ ہوتا ہے کہ ''فِیْتِحَہ'' کہنے جارہے ہیں، تو فاتحہ کا فیتحہ بن گیا)، تو اُس کا بھی اصل مقصد یہی ہے کہ جب جاتے ہیں، جا کے سورۂ فاتحہ پڑھ لی جاتی ہے، پڑھنے کے بعد ایصالِ ثواب کرلیا جاتا ہے۔ تو عام طور پر چونکہ ایصالِ ثواب میں بھی اِس سورت کو پڑھا جاتا ہے، اِس لیے جو کوئی کسی کے پاس تعزیت کے لئے جاتا ہے تو اصل میں تو وہ تعزیت کی مجلس ہوتی ہے کہ جا کر صبر کی تلقین کرو، لیکن اب اُس کا عنوان یہی بن گیا کہ فاتحہ کہنے کے لئے جارہے ہیں، وہاں جائیں گے، سورۂ فاتحہ پڑھیں گے، سورۂ فاتحہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کردیں گے، مُردے کے لئے فاتحہ ہوگئی۔ تو اسی فضیلت کی بنا پر ایصالِ ثواب کے لئے بھی اِس سورت کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اور نمازوں میں تو ہر رکعت میں آپ جانتے ہیں کہ پڑھی جاتی ہے۔

سوال:- دُعا مانگنا ٹھیک ہے؟ جواب:- دُعا مانگنا فی نفسہٖ ٹھیک ہے، باقی! قرآنِ کریم ہاتھ اُٹھا کر پڑھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اور کسی کے گھر میں میت کی مجلس جو ہوا کرتی ہے، یہ اصل میں مجلسِ تعزیت ہے، اُس میں شرعی طریقہ یہ ہے کہ میت والے بیٹھیں، اور جانے والے جا کر اُن کو صبر کی تلقین کریں کہ ''اللہ تعالیٰ کی حکمت ایسے تھی، اللہ کو منظور ایسے ہی تھا، اللہ کے کاموں میں کس کا دخل ہے؟ ہمیں صبر ہی کرنا چاہیے! صبر نہیں کریں گے تو اور کیا ہوگا؟ رونے دھونے میں اپنا ثواب بھی کھوئیں گے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے، جیسے اس نے دیا تھا ویسے اس نے لے لیا'' جیسے موقع محل ہو، ویسے الفاظ کہے جائیں، مثلاً کسی کا بچہ مرگیا تو اس کو کہہ دے کہ اللہ تجھے نعم البدل دے، بیوی مرگئی تو اس کو کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ تجھے نعم البدل دے، کوئی اچھی رفیقۂ حیات دے دے۔ لیکن سمجھ سوچ کر یہ الفاظ بولنے چاہئیں، کسی کا باپ مرجائے تو اس کو جا کر نہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے نعم البدل دے، مطلب یہ ہوگا کہ تیرے باپ سے اچھا باپ مل جائے اور تیری ماں کو کوئی اچھا شوہر مل جائے، تو ایسے موقع پر یہ لفظ نہیں بولنے چاہئیں، بچے اور بیوی کے لئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی نعم البدل دے دے، لیکن کسی کا والد فوت ہوجائے اور اُس کی تعزیت کے لئے جائیں تو وہاں اس قسم کے لفظ نہیں بولنے چاہئیں۔ بہرحال! اصل تو وہ مجلس تعزیت کی ہوتی ہے، پھر جہالت کے ساتھ جس طرح سے ہم نے ہر چیز کا حلیہ بگاڑ دیا، اِس کا بھی حلیہ بگاڑ دیا، تین دِن تک شریعت نے اجازت دی تھی کہ انسان اپنے غم اور صدمے کے طور پر بیٹھ سکتا ہے، اس کے ساتھ خیرخواہی کرنے والے آئیں اور آ کر اُس کی تعزیت کرکے چلے جائیں، اب تعزیت کی بجائے اِس کو لوگوں نے عملاً ایک قسم کی ایصالِ ثواب کی مجلس بنالیا، اب جاتے ہی پہلا مطالبہ ہوتا ہے کہ کلام بخشو! تو ایصالِ ثواب سے اِبتدا ہوتی ہے، حالانکہ وہ ایصالِ ثواب کی مجلس نہیں ہے۔ اور پھر اگر کسی وقت ایصالِ ثواب بھی کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم پڑھو، پڑھنے کے بعد دُعا کرتے وقت ہاتھ اُٹھالو، یہ بات تو قاعدے کے مطابق ہے کہ پہلے قرآنِ کریم پڑھ لیجئے، پڑھنے کے بعد پھر جس وقت آپ دُعا کرنے لگیں تو دُعا کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھا لیجئے، جس طرح سے اگر کسی بزرگ کی اطلاع آتی ہے، یا کسی عزیز کی اطلاع آتی ہے تو ہم قرآنِ کریم پڑھواتے ہیں، سارے بیٹھ کر قرآنِ کریم پڑھ لیتے ہیں، ختم ہوجاتا ہے، ختم ہونے کے بعد جس وقت ایصالِ ثواب کے لئے دُعا کرنی ہوتی ہے تو اس وقت ہاتھ بھی اُٹھا لیے جاتے ہیں۔ باقی! ''کلام بخشو'' کہنا اور ہاتھ اُٹھا کر سورۂ فاتحہ پڑھنا، یہ بات بالکل کسی علمی اُصول کے تحت نہیں آتی، بس ایک جاہلوں کی رسم ہے اور جاہلوں کا رواج

ہے۔ اور ویسے بھی وہ مجلس تعزیت کی ہوتی ہے، ''تعزیت'' کا معنی ہے: صبر کی تلقین کرنا، کہ اُس کے پاس جاؤ اور جا کے صبر کی تلقین کرو۔ تو کلام پڑھنے کے لئے تو ہاتھ اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر ایصالِ ثواب کی مجلس ہے، جس طرح سے آپ سارے مل کر بیٹھے ہیں کہ کلمہ شریف پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیجئے، یا قرآنِ کریم کی تلاوت کر کے ایصالِ ثواب کر دیجئے تو اُس وقت دُعا کرتے وقت ہاتھ اُٹھالیں تو اُس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہرحال لوگ قبروں پر فاتحہ جو کہنے جایا کرتے ہیں تو اُس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونکہ یہ سورت فضیلت والی ہے، اِس لیے اِس کو پڑھ لیا جاتا ہے، اور تین دفعہ قل شریف (سورۂ اخلاص) پڑھ لیے جائیں، چونکہ یہ ثلث قرآن کے برابر ہیں تو تین دفعہ پڑھنے سے قرآنِ کریم کے برابر ہو گئے۔ جیسے اپنے والدین کی قبر پہ جائیں، کسی بزرگ کی قبر پہ جائیں، عام قبرستان میں جائیں، اور ایصالِ ثواب کرنے کا اِرادہ ہو تو سورۂ فاتحہ پڑھو، تین دفعہ قل شریف پڑھو، جتنی اللہ تعالیٰ توفیق دے قرآنِ کریم پڑھو، پھر بعد میں اُن کے لئے دُعا کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھالیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تو سورۂ فاتحہ جو اِس کو کہا جاتا ہے اُس کی وجہ بھی آ گئی، اور موٹے موٹے دُوسرے نام بھی اِس کے ذِکر کر دیے گئے، باقی اِن شاء اللہ العزیز! کل سہی۔

جمیع صفاتِ کمال اِصالۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ: سورۂ فاتحہ کے اِبتدائی مباحث آپ کے سامنے ذِکر کیے جا چکے ہیں۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ ''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں'' اِس کا مطلب یہ ہے کہ صفاتِ کمال جتنی بھی ہیں وہ سب کی سب اِصالۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، سب اچھی صفات اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اور تعریف کسی اچھی صفت پر ہی ہوا کرتی ہے، جب اصل کے اعتبار سے سب اچھی صفتیں اللہ کے لئے ہیں تو تعریف کا مستحق بھی اللہ ہی ہوا، اور مخلوق میں اگر کوئی اچھی صفت آئے تو چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اِس لیے ظاہری طور پر تو وہ تعریف مخلوق کی ہوگی لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ تعریف بھی اللہ کی ہے۔ ''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں'' اِس کا مطلب عرض کر رہا ہوں، کہ ظاہری طور پر تعریف تو مخلوق کی بھی ہم کرتے ہیں، کسی کے حُسن کی تعریف کر دی، کسی کے علم کی کر دی، کسی کے عمل کی کر دی، کسی کے اندر کوئی خوبی ہے، تو بظاہر تعریف مخلوق کی بھی ہوتی ہے، لیکن اصل کے اعتبار سے جو تعریف بھی آپ کریں گے وہ اللہ ہی کی ہوگی، کیونکہ اچھی صفتیں جتنی بھی ہیں وہ ساری کی ساری اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اور اگر مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر کوئی صفت نظر آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، جب وہ اللہ کی عطا کردہ ہوئی تو جو تعریف اُس صفت کی بنا پر آپ کریں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ اللہ ہی کی ہوئی۔ اِس کو اِس طرح سے سمجھ لیجئے کہ ایک عمارت ہے، بہت شاندار بنی ہوئی، آپ اُس کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی بے ساختہ اُس کے نقش و نگار کی اور اِس کی بناوٹ کی آپ تعریف کرتے ہیں، کہ بڑی پائیدار عمارت ہے، بڑی خوبصورت عمارت ہے، اور اِس کے مینارے کنارے جتنے بھی ہیں سب دلکش ہیں، پھول بوٹے گل کاریاں خوب ہیں۔ اب بظاہر آپ جو الفاظ استعمال کر رہے ہیں یہ اِس عمارت کی تعریف ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ عمارت خود بخود تو نہیں بن گئی، عمارت میں یہ اختیار

نہیں تھا کہ وہ مضبوط ہو جاتی، یا اس کے مینارے اُونچے ہو جاتے، یا اس کے اُوپر گل کاری ہو جاتی، ظاہری طور پر اگرچہ یہ صفتیں عمارت کی ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ معمار جس نے عمارت بنائی ہے یہ نسبت اُس کی طرف ہے، جب آپ ایک عمارت کی تعریف کریں گے تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ اِس کا معمار اچھا ہے جس نے یہ عمارت بنادی، چاہے آپ اُس کی طرف نسبت نہ کریں اور آپ کی تعریف کا رُجحان اُس عمارت کی طرف ہی ہو، لیکن وہ تعریف درحقیقت معمار کی طرف راجع ہوگی۔ ایسے ہی مخلوق جتنی بھی ہے، جب اُن کا اپنا وجود ہی اختیاری نہیں تو اُن کی صفات اُن کے اختیار میں کیسے ہوسکتی ہیں؟ آپ کا پیدا ہونا اور بننا آپ کے اختیار میں نہیں تھا، جب پیدا ہونا آپ کے اختیار میں نہیں تو آپ خود بخود دیکھنے والے اور سننے والے کیسے ہوگئے؟، آپ کا یہ حُسن وجمال آپ کے اختیار میں کیسے ہوا؟، آپ کا علم وعمل آپ کے اختیار میں کیسے ہوا؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی مخلوق کو وجود ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی مخلوق کو اچھی صفات ملتی ہیں، اس لیے کسی اچھی صفت کی بنا پر کسی مخلوق کی تعریف کی جائے تو حقیقت کے اعتبار سے وہ تعریف اُسی عطا کرنے والے کی طرف راجع ہوگی۔ اِس مطلب کے تحت آپ کے سامنے یہ آگیا کہ تعریف کا حصر ہے اللہ کے لئے، کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہر قسم کی صفتِ کمال اُس کے لئے ثابت ہے، اور جو بھی تعریف کی جائے اُس کا اصل مستحق بھی وہی ہے، اور وہ تعریف راجع بھی اُسی کی طرف ہی ہوتی ہے، مخلوق کی جب بھی تعریف کی جائے گی حقیقت کے اعتبار سے وہ اللہ ہی کی ہے۔ اِسی کو ایک فارسی شاعر نے اپنے ان الفاظ میں اَدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو خطاب کر کے کہتا ہے:

حمد را با تو نسبتے است دُرست بر درِ ہر کہ رفت بر درِ تُست (تفسیر عثمانی)

کہ حمد کو تیرے ساتھ ایسی نسبت ہے کہ یہ بظاہر کسی کے دروازے پہ نظر آئے حقیقت میں تیرے دروازے پہ ہے۔ وجہ اُس کی وہی ہے جو میں نے عرض کردی، کہ حمد کسی اچھی صفت کی بنا پر ہوا کرتی ہے، اور اچھی صفتیں جتنی بھی ہیں وہ ساری کی ساری اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اور مخلوقات میں سے اگر کسی کے اندر کوئی صفت ثابت ہے تو وہ اللہ کی عطا کردہ ہے، جب وہ اللہ کی عطا کردہ ہوئی تو ظاہری طور پر اگر کسی مخلوق کی تعریف بھی کرو گے وہ حقیقت کے اعتبار سے اُسی خالق اور عطا کرنے والے کی تعریف کہلائے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ ساری کی ساری صفاتِ کاملہ کا جامع ہے۔

لفظ ''رَبّ'' کا مفہوم

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اِس پہلی سورت میں اپنا تعارف کرایا ہے، رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ہے، رَبّ کا معنی: پالنے والا، تربیت کرنے والا، جس کو ہندی زبان میں ''پالن ہار'' کے ساتھ تعبیر کردیتے ہیں، فارسی میں ''پروردگار'' کہہ دیتے ہیں، ''پروردن'': پالنا، ''پروردگار'': پالنے والا، ''پالن ہار'': تربیت کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو ابتدا سے لے کر اُس کی مصالح کی رعایت رکھتے ہوئے، حکمت کی رعایت رکھتے ہوئے، بڑھاتے ہوئے اُس کو کمال تک پہنچا دینا، تو اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور اس کو کمال تک پہنچانے والا ہے، اور کمال تک پہنچانے کے لئے درمیان میں جتنی حاجات اور جتنی ضروریات ہوں گی، سب کا پورا کرنے والا وہی ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی پہچان اگر مخلوق کو کرائی گئی تو سب سے پہلے لفظ ''رَبّ''

کے ذریعے سے کرائی گئی، جس میں بتادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے ساتھ تعلق رَبّ ہونے کا ہے، پیدا بھی وہی کرتا ہے، وجود بھی وہی دیتا ہے اور تربیت بھی وہی کرتا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے کمال تک وہی پہنچاتا ہے، لفظِ رَبّ کا مفہوم یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف سب سے پہلے لفظِ ''رَبّ'' کے ساتھ کرایا

یہ جو میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے پہلے تعارف لفظِ رَبّ کے ساتھ ہی کرایا، اِس سورت میں بھی یہ حقیقت نمایاں ہے، لیکن سورۂ اَعراف میں جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی آدم سے اَخذِ میثاق کا ذِکر کیا، جو اللہ کی اپنی مخلوق کے ساتھ ابتدائی کلام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ پہلی کلام جو قرآنِ کریم میں ذِکر کی گئی، کہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اُس کی ساری کی ساری ذُرّیت کو موجود کیا، تفصیل حدیث شریف[1] میں موجود ہے، اور ذُرّیت کو موجود کرنے کے بعد سب سے پہلا سوال جو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، جس سے مقصد اُن کی ایک تعلیم ہے، وہ سوال یہی ہے ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'': کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب تلقین ہوا کہ مخلوق نے کہا: ''بَلٰی'': کیوں نہیں، گویا کہ یہ اقرار کروالیا کہ رَبّ تمہارا میں ہوں، جس کے تحت واضح الفاظ میں توحید آگئی، کہ جب پیدا کرنے والا میں ہوں، تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا میں ہوں، تمہیں صفات عطا کر کے کمال تک پہنچانے والا میں ہوں، تو پھر میرے ساتھ کسی دُوسرے کو شریک کرنے کا کوئی معنی نہیں، بندوں کا مکمل تعلق اپنے رَبّ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے، جو اُن کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور جو اُن کو ضرورت کی ہر چیز عطا کرتا ہے، لفظِ رَبّ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنیادی طور پر توحید کا عقیدہ قلوب کے اندر ڈال دیا۔

زندگی میں بھی عقیدۂ رُبوبیت پر اِستقامت مطلوب ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعارف مخلوق کے ساتھ اِسی لفظ سے ہوا، تعلق اِسی لفظ سے نمایاں ہوا، پھر اس دُنیا میں پیدا ہوجانے کے بعد جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ بھی یہی ہے، قرآنِ کریم میں جس طرح سے ذکر کیا گیا: ''اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ'' (سورۂ حم السجدۃ: ۳۰) جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: پھر اُسی کے اُوپر جمے رہتے ہیں، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: ان کے اُوپر اللہ کے فرشتے اُترتے ہیں۔ اور آگے بشارات کا ذِکر ہے کہ اُتر کر وہ یہ بشارات دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں سے جس بات کے اُوپر اِستقامت مطلوب ہے کہ بندے اِس بات کے اُوپر جم جائیں، ڈٹے رہیں، اور اِس سے پھسلیں نہیں اور اِس کو چھوڑیں نہیں، وہ عقیدۂ رُبوبیت ہے، الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: اللہ کو رَبّ کہنے کے بعد پھر اِسی کے اُوپر جم جائیں، اِسی کے اُوپر ڈٹے رہیں، اُن کے اُوپر فرشتے اُترتے ہیں اور اُن کو یہ یہ بشارتیں دیتے ہیں۔ تو زندگی کے اندر جس بات کے اُوپر استقامت مطلوب ہے وہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو رَبّ قرار دیا جائے، اِس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِسی رُبوبیت کے عنوان سے ہے۔

---

(۱) ترمذی ۲/۱۳۸، کتاب التفسیر سورۃ اعراف/ مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۴۵۵/ مشکوٰۃ ۱/۲۴ باب الایمان بالقدر کا آخر

عقیدۂ رُبوبیت کا تقاضا

اور یہ بات سامنے آجانے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ہمارا رَبّ ہے، پیدا کرنے والا ہے، ہماری ضروریات کو پورا کرنے والا ہے، کمال اور انتہا تک پہنچانے والا ہے، اِسی کا پھر مقتضائے طبعی ہوگا کہ ہم اُسی کی اطاعت کریں، اُسی کی عبادت کریں، اور کسی دُوسرے کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق نہ ہو، کسی دُوسرے کی طرف ہم اپنی احتیاج نہ رکھیں، یہ ساری کی ساری باتیں جو "عقیدۂ توحید" کہلاتی ہیں وہ اِسی لفظِ "رَبّ" سے خود بخود طبعی اقتضا کے طور پر نکلنے لگ جاتی ہیں، تو زندگی کے اندر مطالبہ اسی بات کا ہوا۔

قبر میں پہلا سوال بھی لفظِ "رَبّ" کے ساتھ ہوگا

اور پھر آپ یہ بھی سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں، کہ جس وقت ہماری یہ عملی زندگی ختم ہوجائے گی، یعنی ہم پر موت آجائے گی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت ہم نے بطور امتحان کے پیش ہونا ہے، اُس امتحان کی تمہید مرنے کے بعد ہی عالمِ برزخ سے شروع ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف کے طلبہ نے تو پڑھ لیا، مشکوٰۃ شریف میں بَابُ إِثْبَاتِ عَذَابِ الْقَبْرِ میں تفصیل آتی ہے، اور سنتے سارے ہی ہیں، گھروں کے اندر اِن کے تذکرے ہوتے رہتے ہیں، کہ مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر آئیں گے، اور انہوں نے انسان سے ابتدائی سوالات کرنے ہیں، جو خلاصہ ہے اُس امتحان کا جو کہ تفصیلی طور پر قیامت کے دِن پیش آنے والا ہے۔ اُن کا پہلا سوال کیا ہوگا؟ مَنْ رَبُّكَ: تیرا رَبّ کون ہے؟ تو مؤمن کا جواب ہوگا کہ رَبِّيَ اللهُ: میرا رَبّ اللہ ہے، اور کافر اور منافق اِس سوال کے جواب میں پریشان ہوجائے گا اور جواب نہیں دے سکے گا۔ [1]

قبر کے سوالات واضح ہونے کے باوجود ہر شخص صحیح جواب نہیں دے سکے گا

کیونکہ وہاں آپ جھوٹ نہیں بول سکیں گے، زندگی میں جس کو رَبّ سمجھا تھا وہاں آپ اُسی کا اقرار کریں گے۔ ویسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب سوال معلوم ہوگئے کہ امتحان میں یہ سوال آنے والے ہیں، تو جواب یاد کرلینا چاہیے، زندگی کیسی ہی گزار لو، جس وقت سوال ہوگا تو جواب وہی دے دو جو رَٹا ہوا ہے۔ جس طرح سے آپ کو معلوم ہوجائے کہ امتحان میں کتاب کا فلاں مقام پوچھا جائے گا، تو آگے پیچھے اگرچہ ایک لفظ بھی نہ آتا ہو لیکن آپ وہی مقام رَٹ لیں گے، اور جس وقت آپ سے پوچھا جائے گا تو فر فر سُنا دیں گے، اور ممتحن دھوکے میں آجائے گا کہ اِس کو ساری کتاب ایسے ہی یاد ہے جیسے یہ پیراگراف سُنا دیا۔ جیسے پتا چل گیا کہ حساب کا فلاں سوال آنا ہے، وہ یاد کرلیا جائے، جس وقت پرچہ آئے وہ حل کردیا جائے، ممتحن سمجھے گا کہ بڑا لائق طالب علم ہے، یہ حساب میں بڑا ماہر ہے، دیکھو! کیسا اچھا سوال حل کیا ہے۔ تو اسی طرح جب یہ تین سوال معلوم ہوگئے جو برزخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیے جائیں گے: مَنْ رَّبُّكَ، مَادِيْنُكَ، وَمَا تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ، [2] سوال بھی بتادیے گئے اور اِن کا جواب بھی بتادیا گیا کہ مؤمن نے یہ

(۱) مسلم ۲/ ۳۸۶، باب عرض مقعد المیت/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۴ عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ.

(۲) مسند ابی داؤد الطیالسی ج ۲ ص ۱۱۴ مطبوعہ مصر۔ نوٹ: ابوداؤد ۲/ ۲۹۸، باب فی المسئلة فی القبر. اور مشکوٰۃ ۲/ ۲۴۴ میں تیسرا سوال ہے: ما هذا الرجل الذی بعث فیکم، اور ترمذی ۲/ ۱۴۴، باب سورۃ ابراهیم میں تیسرا سوال ہے: من نبیُّك

جواب دینا ہے، تو پھر آپ اِس جواب کو رَٹ لیں، اور زندگی چاہے جیسی کیسی بھی گزار لیں، لیکن قبر میں جب منکر نکیر سوال کریں گے تو آپ یہی متعین جواب دے دیں، تو پھر یہ امتحان کیا ہوا؟ جس کا پرچہ پہلے ہی آؤٹ ہو گیا اور جواب پہلے ہی معلوم ہو گئے، کہ یہ پوچھا جائے گا اور یوں بتانا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ بات نہیں چلے گی، زندگی میں تو زبان جھوٹ بول لیتی ہے، قلب میں کچھ ہوتا ہے، زبان کچھ کہہ لیتی ہے، لیکن موت کے بعد یہ غلط ترجمانی نہیں ہو سکے گی، تو اِس سوال کے جواب میں رَبِّیَ اللّٰہُ وہی شخص کہہ سکے گا جس نے زندگی کے اندر رَبُّنَا اللّٰہ کہہ کے اس کے اُوپر موت تک اِستقامت اختیار کی ہوگی، اور جس نے رَبُّنَا اللّٰہ کہہ کے زندگی کے آخر تک اِس پر اِستقامت اختیار نہیں کی ہوگی وہ رَبِّیَ اللّٰہُ وہاں نہیں کہہ سکے گا۔ اور اسی طرح سے جس نے اپنا دِین اسلام قرار دیا ہوگا، وہ وہاں مَا دِیْنُكَ کے جواب میں کہہ سکے گا کہ دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ، اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی دُوسری چیز کو اِختیار کیا ہوگا وہ اِس سوال کا جواب وہاں نہیں دے سکے گا۔ جس نے زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو مانا ہوگا مَا تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا الرَّجُلِ کے جواب میں وہی شخص سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اقرار کر سکے گا، اور جس نے زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانا ہوگا وہ یہ جواب نہیں دے سکے گا۔

لفظِ ''رَبّ'' میں پوری حقیقت کا اِجمالی عنوان ہے

بہر حال میں آپ کے سامنے حقیقت یہ نمایاں کر رہا تھا کہ لفظِ ''رَبّ'' کے مفہوم کو آپ سمجھ لیجئے، لفظِ ''رَبّ'' کے مفہوم کی یہ وسعت ہے، اور پوری حقیقت کا ایک اِجمالی عنوان ہے، جس کی وجہ سے بنی آدم سے اقرار لیتے ہوئے سب سے پہلے رُبوبیت کا اِقرار لیا گیا، زندگی کے اندر اِسی رُبوبیت کے عقیدے پر اِستقامت کا مطالبہ کیا گیا، مرنے کے بعد سب سے پہلے یہی سوال کیا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی پہلی سورت میں یہی تعارف کرایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اور قرآنِ کریم کے اِختتام پر سورۂ ناس میں یہی لفظ استعمال کیا: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ تو کلام کی اِبتدا بھی رُبوبیت کے تذکرے کے ساتھ ہے اور اِس کی اِنتہا بھی رُبوبیت کے تذکرے کے ساتھ ہے۔ اور ہمارا جو عالمِ ارواح کے اندر وجود ہوا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اِسی رُبوبیت کے ساتھ نمایاں ہوا، مرنے کے بعد سب سے پہلے سوال اِسی رُبوبیت کے متعلق ہوگا۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ یہ لفظ کتنا حاوی ہے اور اِس کے سمجھ لینے کے بعد اِس کا طبعی اِقتضا کیا ہے؟ تو لفظوں میں وضاحت آپ کے سامنے ہوگئی، کہ ''رَبّ'' کا مفہوم ہوا کہ جس نے ہمیں وجود دِیا، جس نے ہماری ضروریات پوری کیں، جس نے ہمیں ہر قسم کی صفات عطا فرمائیں، اور اس طرح سے ہمیں کمال تک پہنچایا۔ جب ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، وجود دینے والا وہی ہے، صفات دینے والا وہی ہے، ہر قسم کی ضروریات پوری کرنے والا وہی ہے، تو اس کا طبعی اِقتضا یہ ہوگا کہ پھر قلبی تعلق اسی کے ساتھ ہو، اس کے علاوہ کسی دُوسرے کی طرف احتیاج محسوس نہ کی جائے۔

عقیدۂ رُبوبیت باقی سب سے اِستغنا کا تقاضا کرتا ہے

مثلاً ایک لڑکا یہاں طالب علم ہے، میں ذمہ داری لے لیتا ہوں کہ بیٹے! تیری ہر ضرورت میں پوری کروں گا، تجھے کپڑے

کی ضرورت ہوتو مجھے کہنا، روٹی کی ضرورت ہوتو مجھے کہنا، خرچ کے لئے ضرورت ہوتو مجھے کہنا، کتاب کی ضرورت ہوتو میرے پاس آنا، اور زندگی کی کوئی اور ضرورت پیش آجائے تو میرے پاس آنا ہے، میرے علاوہ تجھے کسی دُوسرے کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس کے سامنے وضاحت کردیتا ہوں، اب آپ بتائیے کہ جس وقت ایک لڑکے کو میں یہ کہہ دُوں گا تو سب کا بوجھ اُس کے ذہن سے میں اُتار نہیں دُوں گا؟ اور میرے اتنا کہہ دینے کے باوجود پھر وہ شخص اگر روٹی کے لئے کسی دُوسری طرف بھاگا پھرتا ہے، کپڑے کے لئے کسی اور طرف بھاگا پھرتا ہے، اور اپنی کسی ضرورت کے لئے کسی اور کے پیچھے پھرتا ہے، تو کیا خیال ہے کہ جب مجھے پتا چلے گا تو میں یہی کہوں گا کہ نادان ہے، بے عقل ہے، جب اِس کو میں نے سب سے مستغنی کردیا، اور ہر چیز کی ذمہ داری میں نے لے لی، تو اِس کو چاہیے تھا کہ یہ ہر وقت میرے دروازے کی طرف جھانکتا، یہ دُوسرے دروازوں کے کیوں چکر کاٹتا پھرتا ہے؟ تو کیا خیال ہے آپ کا کہ اس بچّے کی یہ حرکت کوئی عقل مندی ہوگی؟ اور کیا اِس حرکت کی وجہ سے میری طبیعت پہ ناگواری نہیں آئے گی؟ ایسے ہی سمجھ لیجئے، سمجھانے کے لئے ایک بات بتارہا ہوں، کہ جب ایک شخص کی ضروریات کا ذِمہ کسی نے لے لیا تو باقیوں سے اِستغنا ضرور ہونا چاہیے اور اُس کی طرف مکمل احتیاج ہونا چاہیے، جب مکمل احتیاج اس کی طرف ہوگا اور باقیوں سے اِستغنا ہوگا تو اِطاعت اور عبادت کی جو بات بھی ہوگی اُسی ذات کے ساتھ تعلق رکھے گی، کسی دُوسرے کی طرف جھانکنے کی ضرورت ہی نہیں، یہیں سے اَحکام ملیں گے کہ تم نے فلاں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا ہے، فلاں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا ہے، یہیں سے ہدایات لے کر مخلوق کے ساتھ تعلق رکھا جائے گا کہ ماں باپ سے کیسا تعلق رکھنا ہے؟ اُستاذ سے تعلق کیسا رکھنا ہے؟ مشائخ سے تعلق کیسا رکھنا ہے؟ اپنے کمرے کے ساتھیوں کے ساتھ کس طرح رہنا ہے؟ پڑوسیوں کے ساتھ تمہارا معاملہ کیا ہونا چاہیے؟ تمہاری خرید وفروخت کیسے ہونی چاہیے؟ جو ہدایات اِس دروازے سے ملیں گی اُن کا پابند رہنا ضروری ہوگا، باقی نہ کسی اور طرف سے ہدایات لینے کی ضرورت، نہ کسی طرف محتاج رہنے کی ضرورت۔ کوئی بات ہی باقی نہیں رہ جاتی، اِن ضروریات کی ذِمہ داری لینے کے بعد انسان سب سے مستغنی ہوجاتا ہے۔

اس لیے حضرتِ شیخ کہتے ہیں..... "حضرتِ شیخ" کا لفظ جس وقت [فارسی کے کسی حوالے میں] میری زبان پر بغیر کسی کا نام لینے کے آئے تو اُس سے شیخ سعدیؒ مُراد ہوتے ہیں، نئے طلبہ کے لئے کہہ رہا ہوں، پُرانے تو جانتے ہیں کہ ہمارا شیخ وہی ہے، نئے طلبہ کو بتارہوں کہ جس وقت بغیر کسی نام لینے کے "حضرتِ شیخ" کا لفظ بولوں تو اس سے حضرت سعدی رحمہ اللہ مُراد ہوتے ہیں، کوئی دُوسرا مُراد ہوتو میں اُس کی وضاحت کردیا کرتا ہوں..... گلستان [باب ۸ کے آخر] میں آپ نے حضرتِ شیخ رحمہ اللہ کا یہ قول پڑھا ہوگا:

موحد چہ در پائے ریزی زرش   چہ شمشیرِ ہندی نہی بر سرش

امید وہراسش نباشد زِ کس   بریں است بنیادِ توحید و بس

کہ موحد کے سامنے سونے کے ڈھیر لگادو، یا اُس کے سر کے اُوپر تلوار لے کے کھڑے ہوجاؤ، اسے نہ کسی سے اُمید ہوتی ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اِسی بات پہ ہے کہ نہ کسی سے خوف اور نہ کسی سے لالچ۔ اور یہ عقیدہ لفظ "رَبّ" میں غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے، جتنا اس میں غور کرتے چلے جاؤ گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی رُبوبیت کا مفہوم آپ کے سامنے کھلتا چلا جائے گا،

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتنا ہی زیادہ تعلق پیدا ہوتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج بڑھتی چلی جائے گی، ہر چیز میں ہم اپنے آپ کو اُس کا محتاج پائیں گے، صرف قولاً اور لفظاً ہی نہیں بلکہ درجۂ حال میں بھی ہم اپنے آپ کو اس کا محتاج پائیں گے، اور دُوسروں سے اُسی قدر ہی اِستغنا ہوتا چلا جائے گا، اور اِدھر اطاعت اور عبادت کا تعلق ہوتا جائے گا، اور باقیوں کے ساتھ معاملہ اِنہی کی ہدایت کے تحت ہوگا، پھر وہ درحقیقت اللہ کی عبادت ہوگی، جس وقت آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت والدین کی خدمت کریں گے تو یہ اللہ کی عبادت ہے، کیونکہ اُس کے حکم کے تحت ہو رہی ہے، ظاہری طور پر آپ کا رُخ چاہے والدین کی طرف ہوگا، خدمت کا تعلق بظاہر آپ کا اُستاذ کی طرف ہوگا، لیکن حقیقت میں یہ عبادت اللہ کی ہوگی، کیونکہ اُس کے حکم کے تحت ہو رہی ہے۔

تو یہ ہے لفظ ''رَبّ'' کی اہمیت جس کی بنا پر کتاب اللہ کے اوّل وآخر کے اندر اِس کو ذِکر کیا گیا، اور ہماری حیات کے ابتدائی مراحل میں بھی ہمارے سامنے یہی بات آئی، اور اِس حیات کے ختم ہونے کے بعد ابتدائی مراحل میں بھی ہمارے سامنے یہی بات آئے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کے ساتھ اِس پہلی سورت میں اپنا تعارف کرایا کہ اللہ رَبّ العالمین ہے۔

عالَم کا مفہوم اور وجہِ تسمیہ اور اس کو جمع لانے کی وجہ

اَلْعٰلَمِیْنَ: یہ عالَم کی جمع ہے، لام کے فتحہ کے ساتھ، مایُعلَمُ بِہِ الشیءُ، عالَم اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے کسی دُوسری چیز کا علم حاصل کیا جائے، دُوسرے الفاظ میں آپ اِس کو علامت کہہ لیجئے، اور ماسوی اللہ جتنا بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے ایک علامت ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے، اس لیے اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب عالَم کا مصداق ہے۔ اور جمع جو یہاں لائی گئی تو یہ مختلف انواع اور مختلف اجناس کے اعتبار سے ہے، ستاروں کا عالَم، عالَم حیوانات، عالَم نباتات، عالَم جمادات، جس طرح سے آپ کہتے رہتے ہیں، اِس کائنات کے اندر کروڑہا عالَم ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انواع کے بنائے، مختلف اجناس کے بنائے، اِن مختلف انواع واجناس کے اعتبار سے یہاں جمع آ گئی، ورنہ اصل کے اعتبار سے اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب عالَم ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے۔ تو عالمین جمع لا کر بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اِس کائنات میں جو کوئی موجود ہے، کسی جنس کا ہو، کسی نوع کا ہو، اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا تعلق اُس کے ساتھ ہے، ساری کائنات اللہ کی پیدا کردہ ہے اور دُنیا جہان میں جو کچھ موجود ہے سب اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔

کیا لفظِ ''رحمت'' کا اطلاق ذاتِ باری پر مجازاً ہے؟

اگلی صفت آ گئی: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ: یہ دونوں لفظ ہی رحمت سے ماخوذ ہیں، رَحِمَ یَرْحَمُ باب سَمِعَ سے اِس کا استعمال ہے، آپ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ رحمت کا معنی ہے رِقّتِ قلب، دِل کا نرم ہونا، اور یہ لفظ لکھنے کے بعد پھر آگے لکھ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق مجازی ہے، کیونکہ دِل کی نرمی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاسکتی، اس لیے اس سے مراد ایصالِ خیر ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر پہنچانے والے ہیں۔ تو رحمت کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات کے اُوپر مجازاً قرار دے دیا، کیونکہ اِس کا اصل معنی ہوا

رقتِ قلب۔ اِس بات پر حضرتِ شیخ الہند ؒ کی بات یاد آگئی، مولانا ابراہیم صاحب ؒ میاں چنوں میں ایک بزرگ ہوتے تھے، حضرت گنگوہی ؒ کے مُرید تھے، حضرت شیخ الہند ؒ کے شاگرد تھے، حضرت رائے پوری ؒ کے خلیفہ تھے، بہت اُونچی ہستی تھی، اُن کی خدمت میں ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا تھا، تو میں نے پوچھ لیا، (وہ ہمارے گاؤں کے تھے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کی نسبت کہاں کہاں ہے) بیٹھے ہوئے میں نے ایک دفعہ پوچھ لیا کہ آپ نے حضرت گنگوہی ؒ کی زیارت کی ہے؟ فرمانے لگے کہ زیارت کیا، میں تو اُن سے بیعت ہوں، اور پھر وہ بیان کرنے لگ گئے کہ میں نے شیخ الہند ؒ کے پاس فلاں فلاں چیز پڑھی ہے، اور فلاں فلاں بزرگ کے ساتھ میرا تعلق رہا۔ اُس کے ضمن میں انہوں نے ایک بات بتائی کہ ''توضیح تلویح'' پڑھاتے ہوئے حضرتِ شیخ ؒ نے فرمایا تھا کہ تعجب ہے ان اہلِ علم پر جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ رحمت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر مجازاً ہے، حالانکہ رحمت تو اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے، وہاں تو اس کو مجاز بنا دیا، اور مخلوق کے اندر رحمت مجازاً تھی، وہاں انہوں نے حقیقت بنا دیا۔ حقیقت تو یہ اللہ پر ہی صادق آتی ہے، رحمت حقیقتاً اللہ کی صفت ہے، وہاں کہہ دیا کہ یہ مجازاً صادق آتی ہے، اور مخلوق کے اندر یہ مجازاً پائی جاتی ہے، وہاں کہہ دیتے ہیں کہ حقیقتاً صادق آتی ہے، حضرت نے فرمایا کہ تمہیں کس نے کہا ہے کہ تم اس کا مفہوم ''رِقتِ قلب'' ذِکر کرو، تم اس کا مفہوم ذِکر ہی وہ کرو جو براہِ راست اللہ پر صادق آتا ہے۔ اس لیے حقیقتاً ''رحمت'' کا مفہوم یہی ہے جس کو آپ ایصالِ خیر یا دُوسرے کے لئے نفع کی فکر کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ رحیم ہے، رحمٰن ہے، رحمت کی صفت اُس میں پائی جاتی ہے، یہ لفظ یہاں جو ذِکر کر دیا تو اِس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ مخلوق کا پیدا کرنا یا اُس کی ضرورتوں کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہے، اللہ اپنی مخلوق کے لئے رحیم ہے، کریم ہے، اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض اور کوئی نفع مخلوق سے متعلق نہیں ہے، یہ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

لفظِ ''رحمٰن'' اور لفظِ ''رحیم'' میں فرق

''رحمٰن ورحیم'' اِن دونوں لفظوں کا آپس میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی آپ ابتدائی کتابوں کے اندر پڑھتے رہتے ہیں، میں تو زیادہ وسعت سے عرض نہیں کر سکتا، نہ وقت میں اتنی گنجائش ہوتی ہے، موٹی سی بات یاد رکھیے! کہ ''رحمٰن'' کے اندر عمومِ رحمت کی طرف اشارہ ہے اور ''رحیم'' کے اندر کمالِ رحمت کی طرف اشارہ ہے۔ تو ''رحمٰن'' کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر اِس اعتبار سے ہوا کہ اس کی رحمت بہت عام ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ اللہ کے علاوہ کسی دُوسرے پر نہیں بولا جاتا، ''رحمٰن'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ پر اِس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ اور ''رحیم'' میں کمالِ رحمت ہے، یعنی کامل طریقے سے کسی پر رحمت کرنا، اور ایسا ہو سکتا ہے کہ ماں پوری طرح سے اپنے بچے پر رحمت کرے، مہربان ہو، باپ کامل طریقے سے اپنے بچے پر مہربان ہو، تو یہ صفت غیر کے لئے ثابت ہو سکتی ہے، اس لئے ''رحیم'' بندے کی صفت بھی آجاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ میں سے نہیں، قرآنِ کریم میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (سورۂ توبہ: ۱۲۸) کا لفظ بولا گیا

ہے، حضور ﷺ کو ’’رؤف‘‘ بھی قرار دیا گیا اور ’’رحیم‘‘ بھی قرار دیا گیا، تو اِس سے معلوم ہو گیا کہ ’’رحیم‘‘ کا اطلاق غیر اللہ پر ہو جاتا ہے، اور ’’رحمٰن‘‘ کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمالِ رحمت اور عمومِ رحمت کو بیان کرنے کے لئے یہ دو لفظ بڑھ گئے۔

لفظِ ’’رحمٰن‘‘ و ’’رحیم‘‘ کو ذِکر کرنے میں حکمت

اِس میں بھی آپ سے ایک مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلبی تعلق جو اُس کی رحمت کو اور اُس کی شفقت کو یاد کرتے ہوئے ہوگا وہ محبت پر مشتمل ہوگا، اُس کی عظمت جو دِل میں پیدا ہوگی وہ محبت کی بنا پر پیدا ہوگی۔ اور خوف، ڈر والی بات بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں ہے، اُس کا جبار اور قہار ہونا بھی کامل طریقے سے ہے، وہ شدید العقاب بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ابتدائی تعارف میں اِن صفات کو ذِکر نہیں کیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ زیادہ تر رحمت کا پہلو رکھتا ہے، اور حدیث شریف میں بھی اِس کی وضاحت ہوگئی کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرنے لگے تو ایک تحریر لکھی اور لکھ کر اس کو عرش پہ رکھ لیا، گویا کہ اُصولِ موضوعہ (بنیادی اُصول) کے درجے میں یہ بات آگئی: ’’رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ‘‘[1] میری رحمت میرے غضب پر سابق رہے گی۔ تو اِس مخلوق کے ساتھ جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ ہے اُس میں رحمت غالب ہے اور غضب مغلوب ہے، اس لیے انسان کو اللہ کا تصور ’’رحمٰن ورحیم‘‘ کے الفاظ کے تحت کرنا چاہیے، جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ، رحمتِ شاملہ، کمالِ رحمت اور عمومِ رحمت نمایاں ہوتا ہے، تو قلب کے اندر محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف خوف اور ڈر کی اگر بات ہوتی تو عظمت تو پھر بھی پیدا ہوتی لیکن اُس میں محبت کی چاشنی کم ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کو صرف یومِ جزاء کا مالک کیوں کہا گیا؟

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: دِین کا معنیٰ جزاء۔ يَوْمِ الدِّيْنِ: جزاء کا دِن۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: جزاء کے دِن کا مالک۔ اصل میں اس کا مفہوم وہ ہے جو اِضافت لغوی کا ہوا کرتا ہے، ’’یومِ دِین‘‘ سے قیامت مُراد ہے، قیامت کے دِن کا وہ مالک ہے، یعنی قیامت کے دِن میں ملکیت اسی کے لئے ہوگی، کس چیز کی ملکیت ہوگی؟ وہ واضح نہیں کی گئی، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز میں ملکیت اسی کی ہوگی۔ دُنیا میں رہتے ہوئے بھی ہر شئ کا مالک اللہ ہی ہے، لیکن یہاں مجازاً ہی سہی، ملکیت کی نسبتیں دُوسروں کی طرف بھی ہیں، آپ بھی بعض چیزوں کے مالک کہلاتے ہیں، اور حقوقِ شرعیہ کے تحت بعض چیزوں کی ملکیت بعض حضرات کے لئے ہے، تو مالک کا اِطلاق آپ پر بھی ہوتا ہے، مجازاً نسبت آپ کی طرف ہو سکتی ہے، لیکن قیامت کے دِن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت اس طرح نمایاں ہوگی کہ مجازاً بھی کوئی دُوسرا مالک نہیں ہوگا، اِس لیے اس کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں خاص کرکے ذِکر کر دیا۔ قرآنِ کریم میں سورۂ مؤمن کے اندر اِس مضمون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہوا ہے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آیت:۱۶) آج ملک کس کے لئے ہے؟ حکومت سلطنت کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب یہی آئے گا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ: اللہ واحد کے لئے جو کہ سب کو کنٹرول کرنے والا ہے، اُسی کے لئے ہر قسم کا تملّک اور ملکیت ثابت ہے، اُس سورت کے اندر اِس مضمون کی وضاحت زیادہ کی گئی ہے، تو یہ

---

(۱) بخاری ۲/۱۱۰۴، باب وکان عرشہ علی الماء۔ مشکوٰۃ ۱/۲۰۷، باب الاستغفار سے اگلا باب، فصل اوّل۔

ظاہری طور پر جو ملک کی نسبتیں آپ کی طرف یا ہماری طرف ہوئی ہوئی ہیں اُس دن یہ ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی، اور مالک حقیقی اللہ ہی ہوگا، اور یہ بات ہر کسی کے سامنے واضح ہو جائے گی، اِس لیے یَوْمِ الدِّیْنِ کی طرف نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کو مالک قرار دیا گیا۔

توحید اور شرک میں صرف ''ہی'' اور ''بھی'' کا فرق ہے!

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ: آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اس کا ترجمہ حصر کے ساتھ کرتا ہے، ''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں''، ''ہی'' کا لفظ اُردو میں حصر کے لئے آتا ہے، جس طرح سے ''بھی'' کا لفظ شرکت کے لئے آتا ہے، جہاں ''بھی'' آجائے وہاں شرکت ہوتی ہے، جیسے ''میں آپ کا بھی دوست ہوں'' اس کا مطلب ہے کہ اور بھی ہیں جن کا میں دوست ہوں اور آپ کا بھی ہوں، اُس فہرست میں تیرا نام بھی ہے، اور جب کسی کو کہا جائے کہ ''آپ ہی کا دوست ہوں'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا کوئی دُوسرا دوست نہیں، میں صرف آپ کا ہی ہوں۔ جیسے حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی رحمہ اللہ (م ۱۹۶۶ء) تقریر میں عموماً یہ ذکر کیا کرتے تھے، جہاں کہیں توحید پر وعظ ہوتا، میں نے اُن کی زبان سے یہ بارہا سنا، فرمایا کرتے تھے کہ توحید اور شرک میں ''ہی'' اور ''بھی'' کا ہی تو فرق ہے، موحد کہتا ہے کہ: ''تیری ہی عبادت کرتے ہیں!'' اور مشرک کہتا ہے: ''تیری بھی کرتے ہیں!'' اور قرآنِ کریم میں چونکہ مشرک کی مثال سورۂ نور میں زانی کے ساتھ بھی دی گئی ہے، تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ زانی اور زانیہ کی بھی یہی صفت ہے، کہ عفیف عورت اپنے شوہر سے جب بات کرے گی تو اس کے دل دماغ میں یہ ہوتا ہے کہ ''تیری ہی ہوں!'' اور بازاری عورت جس وقت اپنی محبت کا اظہار کرے گی تو کہے گی: ''تیری بھی ہوں!'' تو ''ہی'' اور ''بھی'' کا ہی تو فرق ہے، تو جس طرح زانی اور زانیہ ''بھی'' کے قائل ہیں اسی طرح مشرک بھی ''بھی'' کا قائل ہے، تو سورۂ نور میں مشرک اور زانی اور مشرکہ اور زانیہ کا ذکر ایک آیت میں آیا ہوا ہے، اِس کی مناسبت ذکر کرتے تھے کہ ان دونوں میں وجۂ اِشتراک کیا ہے؟ کہ یہ دونوں ''بھی'' کے قائل ہیں، مشرک بھی ''بھی'' کہتا ہے کہ: ''ہم تیری بھی عبادت کرتے ہیں!'' اور زانی اور زانیہ بھی دُوسروں کو کہتے ہیں کہ: ''تیرا بھی ہوں/تیری بھی ہوں!'' اور جو عفیف عورت ہوا کرتی ہے وہ ''ہی'' کی قائل ہوتی ہے کہ: ''تیری ہی ہوں!'' کسی دُوسرے سے تعلق نہیں۔ اِسی طرح سے موحد بھی ''ہی'' کا قائل ہوتا ہے کہ ''تیرا ہی ہوں، تیری ہی عبادت کرتا ہوں!'' تو ''ہی'' کا لفظ اُردو میں حصر کے لئے آیا کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگیا کہ ہم تیرے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔

سورۂ فاتحہ کے شروع میں ''قُوْلُوْا'' کا لفظ مقدر ہے

گویا کہ یہ لفظ ہمیں تلقین کیے جارہے ہیں کہ اپنی زبان سے یوں اَدا کرو، اسی لیے آپ ''جلالین'' میں پڑھیں گے کہ اُنہوں نے اس سورت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے پہلے قُوْلُوْا کا لفظ مقدر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جارہا ہے قُوْلُوْا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۝ تو گویا

کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تلقین کررہے ہیں، جس طرح سے ابتداءً بچے کو سبق پڑھایا جاتا ہے تو اُستاذ کہتا ہے کہ الف، ب، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہا کہ یوں کہو۔ تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اصل میں ہماری زبان سے کہلوایا جارہا ہے۔ اسی طرح اِیَّاکَ نَعْبُدُ یہ بھی ہماری زبان سے کہلوایا جارہا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ قال اللہ کے طور پر ذِکر کیا جائے کہ قَالَ اللہُ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، تو قال اللہ کے تحت اِیَّاکَ نَعْبُدُ نہیں آئے گا، بلکہ یوں ہوگا کہ قَالَ اللہُ قُوْلُوْا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اب اِس کے ساتھ جوڑ لگ جائے گا، قُوْلُوْا: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم یوں کہا کرو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا ماقبل سے ربط اور اس کا مفہوم

''تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' یہ پچھلی صفات کا ایک طبعی اِقتضا ہے، جب سب صفاتِ کمال اُسی میں ہیں، یہ تو اُس کا ذاتی کمال ہوگیا، اور ربُّ العالمین اور رحمٰن ورحیم وہی ہے، یہ اس کا ایک اضافی کمال ہوگیا کہ مخلوق کے ساتھ اُس کا رُبوبیت کا تعلق ہے، مخلوق کے لئے وہ رحمٰن اور رحیم ہے، جیسے لفظی وضاحت کے تحت آپ کے سامنے ذِکر کردیا گیا، کہ اِس سے دل دماغ پر قابو پالیا گیا کہ وہی پیدا کرنے والا، اور وہی سب کچھ دینے والا، اور وہی سب ضرورتیں پوری کرنے والا ہے، جب اِس مفہوم کو آپ سمجھ جائیں گے کہ ایک ذات کامل الصفات ہے، اور کامل الصفات ہونے کے ساتھ ساتھ مخلوق کی رَبّ بھی ہے، اور اُس کا تعلق مخلوق کے ساتھ رحمٰن ورحیم ہونے کا بھی ہے، اور پھر وہ مخلوق کے ساتھ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہونے کا تعلق بھی رکھتی ہے، کہ ہم نے زندگی گزار کر آخر اُسی کے سامنے پیش ہونا ہے، ساری ملکیتیں ختم ہوجائیں گی، جس میں قیامت کے دِن کا تصور دے دیا گیا، تو اِن کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر بندگی اور عبادت کا تعلق اُسی کی ذات سے ہو، جیسے لفظِ ''رَبّ'' کے مفہوم میں میں نے ذکر کیا کہ اِس کا مفہوم اگر حقیقی طور پر دل دماغ میں اُتار لیا جائے تو یہ باقی مخلوق سے اِستغناء کا تقاضا کرتا ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف احتیاج کا تقاضا کرتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں ہم نے اسی چیز کا اعتراف کیا جو پچھلے الفاظ کا لازمی نتیجہ ہے، پچھلی باتوں کے اقرار کرنے کا ایک طبعی نتیجہ ہے کہ ہم باقی سب مخلوق سے مستغنی ہیں، ہم اپنے آپ کو کسی اور کا محتاج نہیں سمجھتے، عبادت اور بندگی کا تعلق صرف تیرے ساتھ ہی ہے۔

''اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں'' کس بارے میں مدد چاہتے ہیں؟ یہاں اُس کی بھی تعیین نہیں کی گئی، تو مطلب ہوگا کہ زندگی کے ہر معاملے میں، کیونکہ جب پیدا کرنے والا وہی، ہر قسم کی صفات دینے والا وہی، تو کسی کام کے ہونے نہ ہونے کا اختیار بھی اسی کو ہے، اسباب موافق مہیا کردے گا تو کام ہوجائے گا، اسباب مخالف مہیا ہوجائیں گے تو نہیں ہوگا، اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (سورۂ ہود: ۱۲۳) جب اُس کی شان یہ ہے کہ ہر اَمر کا رُجوع اُسی کی طرف ہی ہے تو ہم جو کچھ کریں گے تیری مدد سے کریں گے، چاہے تیری مدد براہِ راست نمایاں ہوجائے تجھے اختیار ہے، تیری مدد اِس طرح نمایاں ہوجائے کہ تو مخلوق کے دل میں ڈال دے کہ ہمارے ساتھ کسی معاملے میں موافقت کرے، تو بادلوں کو ہمارے کام کے لئے متعین کردے، ہواؤں کو متعین کردے، کسی بندے

کے دل میں ڈال دے، بہر حال جو چیز بھی اس زندگی کو گزارنے کے لئے اور اس عملی زندگی کے لئے بظاہر ہمارے لیے مددگار ثابت ہو رہی ہے، جیسے ظاہری طور پر ہم کاشت کرنے کے لئے بیلوں سے مدد لیں گے، بار برداری کے لئے گھوڑے گدھے سے مدد لیں گے، اور آگ، پانی، مٹی، ہوا، لوہا، تیل، جو کچھ بھی ہے اِن کو ہم استعمال کرتے ہیں، اور استعمال کر کے اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں، یہ زندگی گزارنے میں ہماری مددگار ہیں، لیکن چونکہ اِن سب کا عطا کرنے والا اور مہیا کرنے والا تُو ہی ہے، تو ہم تیرے سامنے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں مددگار تُو ہی ہے، ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں کہ ہمارے لیے اسباب مہیا کر دے جس سے ہمارے کام ہو جائیں۔ یہ گویا کہ پچھلی صفات کے اقرار کرنے کا ایک طبعی اقتضا ہے، کہ احتیاج بھی اُسی کی طرف، بندگی کا تعلق بھی اُسی کے لئے، اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں یعنی اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اور عملی زندگی کے لئے مدد بھی اُسی کی ہی، اگر اُس کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہو سکتا اور ہم اپنی اِس زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتے، البتہ اُس کی مدد کے ظاہر ہونے کے پھر آگے مختلف طریقے ہیں۔ تو اِس میں صراحت کے ساتھ اُس توحید کا اقرار آ گیا جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات تقاضا کر رہی تھیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ''عبادت'' کسے کہتے ہیں؟ یہ اِس سورت کے اِختتام پر واضح کروں گا۔

ہدایت کا مفہوم

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: یہ بھی وہی قُوْلُوْا کے تحت آ گیا، کہ اب آگے یہ دُعا کرو کہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت دے۔ بتلانا، دِکھلانا، چلانا، ہدایت کا یہ سارا مفہوم ہوتا ہے، ''شرح تہذیب'' کی اِبتدا میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ ہدایت کا مفہوم اِرَاءَۃُ الطَّرِیْقِ بھی ہے، اور ہدایت کا مفہوم اِیْصَالٌ اِلَی الْمَطْلُوْبِ بھی ہے، اور اِن دونوں معنوں کے درمیان جو فرق ہے اُس کی وضاحت بھی آپ نے ''شرح تہذیب'' کے مقدمے میں پڑھ لی، یہاں اِس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، بہر حال یوں ترجمہ کر لو کہ ''ہمیں صراطِ مستقیم دِکھلا'' جس طرح سے بعض تراجم میں ذکر کیا گیا، یہ بات بھی صحیح ہے۔ اور ''ہمیں صراطِ مستقیم پر چلا'' یہ بات بھی صحیح ہے۔

''صراطِ مستقیم'' کا مفہوم

''صراطِ مستقیم'': سیدھا راستہ، سیدھے راستے سے مُراد یہ ہے کہ اُس میں کوئی پیچ وخم نہ ہو، اور کوئی خوف وخطر نہ ہو۔ ایک جگہ سے انسان چلتا ہے، دُوسری جگہ پہنچنا چاہتا ہے، دو خط آپ کھینچ لیجئے، ایک اُوپر اور ایک نیچے، ایک نقطہ اِس میں متعین کر لیں اور ایک نقطہ اِس میں متعین کر لیں، ایک نقطے سے دُوسرے نقطے کو ملانے کے لئے آپ جتنے خطوط کھینچیں گے جو سب سے زیادہ سیدھا ہوگا وہی سب سے زیادہ چھوٹا ہوگا، یعنی ایک نقطے کو دُوسرے نقطے کے ساتھ ملانے کے لئے آپ خطوط کھینچے، یوں بھی کھینچ سکتے ہیں، یوں بھی لا سکتے ہیں، یوں بھی لا سکتے ہیں، یوں بھی کر سکتے ہیں، جتنے بھی کھینچ لو، جو سب سے سیدھا ہوگا وہی سب سے چھوٹا ہوگا، جو خط سب سے چھوٹا ہوگا وہی سب سے سیدھا ہوگا، تو گویا کہ صراطِ مستقیم وہ ہے جو مسافت کے لحاظ سے بھی مختصر ہو، کہ جس میں محنت تھوڑی کرنی پڑے اور مقصد تک جلدی پہنچ جائیں، اور اِس کے ساتھ ساتھ مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بے خوف وخطر بھی ہو، اِس میں کوئی خوف وخطرہ بھی نہ ہو، ورنہ اگر آپ ایک مختصر راستہ لے لیں لیکن اُس میں خوف اور خطرہ ہے، کھڈے اور گڑھے ہیں، اور ایک

لمبی سڑک ہے لیکن صاف ستھری ہے، تو بسا اوقات آپ لمبی سڑک پر چلیں گے تو جلدی پہنچ جائیں گے، اور جو کھڈوں اور گڑھوں والی اور خراب ہوگی اُس میں وقت زیادہ لگ جائے گا، تو صحیح طور پر صراطِ مستقیم وہی ہوتا ہے جس میں دونوں صفتیں پائی جائیں کہ مسافت کم ہو اور اُس میں کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہ ہو، تاکہ ہم اپنے مطلب تک جلدی پہنچ جائیں۔ اور حضرت شیخ (سعدیؒ) کی اس عبارت میں کہ ''راہ راست برو گرچہ دُور است!'' دُرست راستے پہ چلو اگرچہ دُور ہی کا کیوں نہ ہو، تو اُس میں یہی بے خوف و خطر والا راستہ مُراد ہے، کہ اگر ایک راستہ ایسا ہے جس میں مسافت کم ہے لیکن اُس میں خطرات ہیں تو اس راستے کو چھوڑ دو، اور جس میں مسافت زیادہ ہے لیکن خطرہ کوئی نہیں ہے اس راستے کو اختیار کرلو۔ تو صراطِ مستقیم کے دو مفہوم ہوئے، ایک تو یہ ہے کہ مسافت کم ہو کہ ہمیں محنت کم کرنی پڑے اور ہم اپنے مطلب تک پہنچ جائیں، اور دُوسرا یہ ہے کہ اُس راستے میں خوف و خطرہ کوئی نہ ہو، ایسا سیدھا راستہ ہمیں دکھادے۔

''صراطِ مستقیم'' اور ''مُنعم علیہم'' کا مصداق

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: مفسرین کہتے ہیں کہ یہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے بدل ہے، اور بدل کا مفہوم آپ نے نحو کے اندر پڑھا کہ جہاں بدل اور مبدل منہ اکٹھے آجایا کرتے ہیں، وہاں مقصود بالنسبت بدل ہوتا ہے، جب یہ بدل ہے تو گویا کہ صراطِ مستقیم بطورِ تعارف کے ذِکر کیا گیا ہے اور اصل مقصود صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے، اور بدل اور مبدل منہ کا ترجمہ کرتے وقت ''یعنی'' کا لفظ بڑھادیا جاتا ہے، جیسے: جَاءَنِيْ اَخُوْكَ زَيْدٌ: میرے پاس تیرا بھائی آیا یعنی زید، یوں کہہ دیا جائے تو مفہوم ذرا واضح ہوجاتا ہے، اور ''میرے پاس تیرا بھائی زید آیا'' یہ بات بھی صحیح ہے۔ تو یہاں بھی اگر یوں کہہ دیا جائے ''دِکھا ہمیں سیدھا راستہ یعنی راستہ ان لوگوں کا'' تو بھی بات ٹھیک ہے۔ اور ''یعنی'' کا لفظ بولے بغیر ادا کردیں ''بتلا تو ہمیں سیدھا راستہ، راستہ ان لوگوں کا جن پہ تیرا اِنعام ہوا'' اِس طرح سے بھی بات صحیح ہے۔ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: جن پر تیرا اِنعام ہوا، اِس سے مُراد منعم علیہم کے وہ چار گروہ ہیں جن کا ذِکر قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ آیا ہوا ہے: مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (سورۂ نساء:۶۹) یہ چار گروہ منعم علیہم ہیں۔ تو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا مطلب یہ ہوا کہ اِن منعم علیہم کے راستے پر ہمیں چلنے کی توفیق دے، یہ راستہ ہمارے سامنے واضح کر، نبیوں والا راستہ، صدیقین کا راستہ، شہداء کا راستہ اور صالحین کا راستہ، اس راستے پر ہمیں چلا۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن پر تیرا غضب نہیں کیا گیا اور جو بھٹکے نہیں، ایسے منعم علیہم جن پر تیرا غضب نہیں ہوا بلکہ تُو اُن پہ راضی ہے، تو جب اُن لوگوں کے راستے پر ہم چلیں گے تو ہم پہ بھی اللہ راضی ہوجائے گا۔ اور وہ بھٹکے نہیں ہیں کہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھٹک جائیں، ایسا نہیں۔

''مغضوب علیہم'' اور ''ضالین'' کا مفہوم اور مصداق

اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: یہ دو لفظ یہاں بولے گئے، مفسرین دونوں کے درمیان میں فرق کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں

کہ صراطِ مستقیم سے پھسل جانا دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک سبب تو جہالت ہے، کہ سیدھا راستہ معلوم نہیں تھا اس لیے غلط راستے پر چل دیے، جیسے مسئلہ معلوم نہ ہوا اور عمل غلط کر لیا جائے، یہ جہالت ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ علم تو ہے، مسئلہ تو معلوم ہے، لیکن انسان اُس کے مطابق عمل نہیں کرتا، عالم ہونے کے باوجود غلط روی اختیار کر لیتا ہے، اُس کو معلوم ہے کہ صحیح راستہ یہ ہے لیکن جان بوجھ کر دُوسرا راستہ اختیار کر لے۔ تو جہالت کی بنا پر جو صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں وہ "ضالین" کا مصداق ہیں، اور جو جان بوجھ کر صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیتے ہیں وہ "مغضوب علیہم" کا مصداق ہیں۔ تاریخی طور پر عیسائی "ضالین" کا، اور یہود "مغضوب علیہم" کا مصداق ٹھہرتے تھے۔ عام طور پر آپ تفسیروں میں لکھا ہوا دیکھیں گے کہ "مغضوب علیہم" سے مُراد یہود ہیں اور "ضالین" سے مُراد نصاریٰ ہیں،[1] اُس کی وجہ یہی ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود کے راستے سے بھی ہمیں بچا، نصاریٰ کے راستے سے بھی ہمیں بچا۔ لیکن اصل بات وہ ہے جو عرض کر رہا ہوں، کہ اُن لوگوں کے راستے پر ہمیں چلا جو تیرے "منعم علیہم" ہیں، نہ تو وہ بے علم ہیں اور نہ ہی جاننے کے باوجود وہ بدعمل ہیں، اور یہی دو کمال ہیں کہ انسان کے پاس علم ہو اور پھر علم کے مطابق عمل ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں اُن لوگوں کے راستے پر چلا جن کے پاس علم بھی ہے اور علم کے مطابق ان کا عمل بھی ہے، جاہلوں کے راستے سے بھی بچا کہ جن کو علم ہی نہیں، اس لیے جہالت کے اندر وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں، اور اُن لوگوں کے راستے سے بھی بچا جو جانتے تو سب کچھ ہیں لیکن جان بوجھ کر کج روی اختیار کرتے ہیں۔ عالم بدعمل "مغضوب علیہم" کا مصداق ہوا، اور جاہل "ضالین" کا مصداق ہوا۔ تو ہمیں اُن لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا اِنعام ہوا، اور وہ لوگ کون ہیں جن پر تیرا اِنعام ہوتا ہے؟ وہ وہ ہیں جو علم بھی رکھتے ہیں اور علم کے مطابق اُن کا عمل بھی ہے، ایسے نہیں کہ اُن کو علم نہ ہو اور جہالت کی وجہ سے وہ غلطیاں کر رہے ہوں، اور نہ وہ ایسے ہیں کہ علم تو ہے لیکن نفسانی شرارت اور شہوت پرستی کی بنا پر وہ اُس علم کے مطابق عمل نہ کرتے ہوں۔ تو یہ ہو گیا اِس دُعا کا حاصل! باقی تفصیل پھر سہی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

لفظِ "عبادت" کی تشریح

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: اِس میں جو لفظ عبادت آیا ہوا ہے، اِس کی کچھ تشریح باقی رہ گئی تھی۔ عبادت: عبد شدن، بندہ بننا، کسی کے ساتھ بندگی کا تعلق رکھنا، اور اِن سب لفظوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ کسی کے ساتھ عبدیت اور غلامی کا تعلق ہو جائے تو انسان کے اپنے اختیارات ختم ہو جایا کرتے ہیں، "عبد" یعنی غلام کے اُوپر اختیارات اُس کے مولیٰ کے چلتے ہیں، جیسے فقہ کی کتابوں میں آپ عبد کے اَحکام پڑھتے رہتے ہیں کہ وہ خود اپنا نکاح کرنے کا مجاز نہیں، خرید و فروخت کرنے کا مجاز نہیں، اُس کا کوئی تصرف اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا، وہ کسی چیز کا مجاز نہیں ہے، مالک اُس کو جس چیز کی اجازت دے گا وہی کام وہ

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۲۴، کتاب التفسیر، سورۃ فاتحہ۔ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْيَهُوْدُ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ وَالنَّصَارٰى ضُلَّالٌ

کر سکتا ہے۔ تو یہاں مطلب یہ ہوا کہ ہمارا بندگی کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے، کسی اور کی ہم عبادت نہیں کریں گے۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ''عبادت'' کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی ذات کے متعلق انتہائی تعظیم کا عقیدہ رکھتے ہوئے اُس کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا۔ کسی ذات کے متعلق انتہائی عظمت کا عقیدہ رکھتے ہوئے کہ اُس کو ہم پر اتنی عظمت حاصل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، اُس کے سامنے غایتِ تذلل اختیار کرنا، انتہائی عاجزی اور ذِلّت اختیار کرنا، ان الفاظ کے ساتھ ''عبادت'' کا مفہوم ذِکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کے متعلق آپ یہ عقیدہ رکھیں گے کہ اس کو ہمارے اُوپر بے انتہا بڑائی اور بے انتہا عظمت حاصل ہے، تو اُس کے بعد آپ زبان سے جو ایسے اقوال نکالیں گے جو عظمت پر دال ہیں، یا اِس قسم کا فعل اختیار کریں گے جو عظمت پر دال ہے، یہ سارے کے سارے اقوال اور افعال ''عبادت'' کہلائیں گے۔ زبان سے اُس کی تعریف کی جائے، حمد وثنا کی جائے، بدنی طور پر اُس کے سامنے جھکا جائے، اُس کو سجدہ کیا جائے، اُس کے سامنے مالی ہدیہ پیش کیا جائے، اُس کے اُوپر مال نثار کیا جائے، تو یہ قولی فعلی اور مالی عبادت ہے۔ اور اگر کسی کے متعلق انتہائی عظمت کا اور انتہائی بڑائی کا عقیدہ نہ ہو، اور انتہائی عظمت اور انتہائی بڑائی کا مطلب یہ ہے کہ آپ اُس کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے نفع ونقصان کا مختارِ مطلق ہے، ہمارا بنانا اور بگاڑنا اُسی کے اختیار میں ہے، وہ بنانا چاہے تو کوئی بگاڑ نہیں سکتا، اور وہ بگاڑنا چاہے تو کوئی بنا نہیں سکتا، وہ ہمیں کوئی نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اور اگر وہ ہمیں نقصان پہنچائے تو کسی شخص میں طاقت نہیں ہے کہ اُسے دفع کردے، یہ عقیدہ جس شخصیت کے متعلق آپ رکھیں گے تو آپ نے اُس کو معبود بنالیا، یہ عقیدہ رکھنے کے بعد آپ اُس کے سامنے جھکیں گے، اُس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھیں گے، اس کے نام پر اس کو خوش کرنے کے لئے مال دیں گے، زبان کے ساتھ اس کی حمد وثنا کریں گے تاکہ وہ خوش ہوجائے، تو یہ سارے کے سارے اقوال وافعال ''عبادت'' بن جائیں گے۔ اور اگر کسی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں ہے اور اُس کے ساتھ آپ اس قسم کی حرکات کرتے ہیں، جیسے اُستاذ کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھتے ہیں، یا اپنے شیخ کی اپنی زبان سے تعریف کرتے ہیں، یا اُس کو خوش کرنے کے لئے اس کے سامنے مالی ہدیہ پیش کرتے ہیں، آخر اِنسان اپنے اساتذہ اور مشائخ کے سامنے مالی ہدیے بھی تو پیش کرتا ہے، جاتے ہوئے آپ فروٹ لے جاتے ہیں، کبھی کپڑوں کا جوڑا دے دیا، کبھی اُس کو نقد ہدیہ پیش کردیا، آخر یہ سلسلہ جاری ہے، مشائخ کو، اساتذہ کو، جن کو اِنسان بزرگ سمجھتا ہے ان کے سامنے مالی ہدیے بھی پیش کیے جاتے ہیں، اور انسان ان کے سامنے جاتا ہے تو دوزانو ہوکر بھی بیٹھتا ہے، اور زبان کے ساتھ اُن کی تعریف بھی کرتا ہے، اُن کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے، اگرچہ یہ اقوال اور افعال سارے کے سارے تعظیم کے ہیں، اِس سے اُن کی تعظیم کی جاتی ہے، لیکن اِن کو ''عبادت'' نہیں کہیں گے، کیونکہ جس کے متعلق آپ اس قسم کی باتیں کررہے ہیں یا یہ حرکات اختیار کررہے ہیں اُس کے متعلق آپ کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہمارا بگاڑنا اور سنوارنا اِس کے اختیار میں ہے، ہمارے نفع ونقصان کا یہ مختارِ مطلق ہے، اِس کے اشارے کے ساتھ ہی کایا پلٹ جاتی ہے، اس قسم کا عقیدہ اُس کے متعلق نہیں ہے، لہٰذا یہ تعظیم کی حرکات ''تعظیم'' کہلائیں گی، ''عبادت'' نہیں کہلائیں گی، اور اگر اُسی کے متعلق یہ عقیدہ ہوجائے تو پھر اُس کے نام پر مال دیں، اس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھیں، اس کے سامنے جھکیں، یہی حرکات ''عبادت'' ہوجائیں گی۔

سجدۂ تعظیمی اور سجدۂ عبادت میں فرق

حتیٰ کہ سجدہ ہے، سجدے کی دو قسمیں آپ کے سامنے آتی رہتی ہیں، ایک سجدۂ تعظیمی ہے جو شرک نہیں ہے، اگرچہ حرام ہے، اور ایک سجدۂ عبادت ہے جو کہ شرک ہے۔ اب سجدۂ تعظیمی اور سجدۂ عبادت کے درمیان فرق کس طرح ہوگا؟ ایک آدمی پیر کو سجدہ کرتا ہے اور اس کے سامنے جا کے پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے، اب کیسے پتا چلے گا کہ اس کا یہ سجدہ کرنا شرک ہے اور یہ شخص مشرک ہو گیا؟ یا اِس نے حرام فعل کا ارتکاب کیا؟ ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کس طرح سے ہوگا؟ فرق ہوگا اُس کے اپنے عقیدے کے ساتھ، اگر اُس کا عقیدہ اپنے پیر کے متعلق یہ ہے کہ یہ ہمارے نفع ونقصان کا مختارِ مطلق ہے، بنانا اور بگاڑنا اِسی کے ہاتھ میں ہے، اس نظریے کے تحت اگر اُس کو سجدہ کرتا ہے تا کہ یہ خوش ہو جائے اور خوش ہو کر میری قسمت بنا دے، اور یہ ناراض نہ ہو کر میرا کچھ بگاڑ نہ دے، اس نظریے کے تحت اگر وہ اپنے پیر کو سجدہ کرتا ہے، زندہ ہو یا مُردہ ہو، جب وہ سجدہ کرے گا تو مشرک ہو گیا اور اِیمان سے خارج ہو گیا۔ اور اگر اُس کا عقیدہ اُس کے متعلق یہ نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ ہے تو یہ میرے جیسا انسان، لیکن اللہ کا مقبول بندہ ہے، بگاڑنا اور بنانا اِس کے اختیار میں نہیں، اللہ کے اختیار میں ہے، نظریہ اُس کا صحیح ہے، پھر اگر وہ اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور پیشانی زمین کے اُوپر رکھ دیتا ہے تو ایسی صورت میں اس نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے لیکن اس کو مشرک نہیں کہیں گے۔ دونوں باتوں کے درمیان فرق نظریے سے پڑتا ہے، اگر اس کے متعلق عقیدہ یہ ہو کہ وہ قادرِ مطلق ہے، مختارِ مطلق ہے، اگر وہ نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اگر وہ کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی ہٹا نہیں سکتا، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر بار بار اِس مضمون کو بیان فرمایا، سورۂ یونس کے آخری رُکوع میں آیات ہیں: اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ: اگر وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو اُس نقصان کو دُور ہٹانے والا اُس کے علاوہ کوئی نہیں، اور اگر وہ آپ کے متعلق کسی خیر اور فضل کا اِرادہ کرلے تو اُس کے خیر اور فضل کو رَدّ کرنے والا کوئی نہیں۔ اور حضور ﷺ کی دُعاؤں کے اندر بھی یہ الفاظ آئے ہیں، آپ دُعا فرمایا کرتے تھے، اُس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے طور پر یہ الفاظ بھی ہوتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ''(۱) اے اللہ! جو تُو دینا چاہے اُس کو روکنے والا کوئی نہیں، اور جس کو تُو روک لے اُس کو دینے والا کوئی نہیں۔ یہ عقیدہ دراصل اُلوہیت پیدا کرتا ہے اس ذات میں جس کے متعلق آپ یہ عقیدہ رکھ لیں۔ تو ''عبادت'' کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم اپنے اُوپر کسی کو مختارِ مطلق نہیں مانتے اور اپنے اُوپر کسی کو قادرِ مطلق تسلیم نہیں کرتے، ہمارے بنانے بگاڑنے کا اختیار سوائے تیرے کسی کو نہیں، ہمارے نفع ونقصان کا مختارِ مطلق تیرے علاوہ کوئی نہیں، جب یہ عقیدہ ہم رکھیں گے تو اس کے بعد جو بھی ہماری حرکات ہوں گی وہ ''عبادت'' کہلائیں گی، یہ موٹی سی بات ہے، جب اللہ کے غیر کے ساتھ اِس عقیدے کو لگا لیا جائے تو اِنسان مشرک ہو جاتا ہے، جہاں یہ عقیدہ ہوگا تو اُس کے بعد عظمت پر دلالت کرنے والی بات اور عظمت پر دلالت کرنے والا فعل، یہ سارے کے

---

(۱) بخاری ج۱ ص۱۱۷، باب الذکر بعد الصلوٰۃ/ مشکوٰۃ ص۸۲، باب الذکر بعد الصلوٰۃ فصل اول

سارے ''عبادت'' کہلائیں گے، اور اس عقیدے سے خالی ہو کر اگرچہ حرکات اسی قسم کی ہوں جس قسم کی عبادت کے لئے کی جاتی ہیں لیکن وہ ''عبادت'' نہیں کہلائے گی، وہ ''تعظیم'' کہلائے گی، تو ''عبادت'' کا مفہوم یہ ہوا۔

صراطِ مستقیم سے کیا مُراد ہے؟

آگے جو ذکر کیا گیا تھا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، ان کی لفظی تشریح تو ہو گئی تھی، صراطِ مستقیم کا لفظ قرآنِ کریم میں اکثر و بیشتر عبادت کے تذکرے کے بعد آیا ہے، سورۂ یٰس کی آیت آپ پڑھتے ہیں: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (سورۂ یٰس: ۶۰)، میری عبادت کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں بھی اِسی قسم کے الفاظ ہیں: هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ (سورۂ زخرف: ۶۴) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اُسی کی عبادت کرو، صراطِ مستقیم یہی ہے۔ تو ان آیات کے قرینے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس صراطِ مستقیم کی ہم نے اللہ سے ہدایت طلب کی ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں طریقِ عبادت بتا دے کہ ہم تیری عبادت کس طرح سے کریں؟ جو تیری عبادت کا طریقہ ہے ہمیں اس کے اُوپر چلا، اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کے طریقے کا پتا کس طرح سے چلے؟ تو اُس میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کتاب نازل کر دی جاتی اور کہہ دیا جاتا کہ یہی کتاب آپ کو طریقہ بتائے گی، یہ بھی کافی ہے، پھر اُس کتاب کو پڑھ کر علمی دلائل کے تحت اُس طریقے کو متعین کر لیا جاتا۔

دورِ حاضر میں گمراہی کی بنیاد

لیکن علمی دلائل کے تحت کسی طریقے کو متعین کرتے وقت اُس کی تعبیرات میں اِختلافات ہو سکتے ہیں، کیونکہ اکیلی کتاب پڑھ کر کبھی کوئی شخص صحیح طریقہ نہیں اپنا سکتا...... یہ بات اُصولی طور پر یاد رکھیئے!...... اور آج کے دور میں گمراہی کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ مطالعے کے ساتھ کوئی شخص کسی چیز کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے، یہ عقیدہ آج کی گمراہی کی بنیاد ہے، کوئی شخص ''مشکوٰۃ شریف'' کا اُردو ترجمہ گھر میں رکھ لیتا ہے، اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں ''محدّث'' بن گیا، پھر اپنے فہم کے مطابق لوگوں کے ساتھ بحثیں کرتا ہے، خود گمراہ ہوتا ہے اور دُوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ اُردو کی تفسیر گھر میں رکھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ پڑھنے کے بعد ہم قرآنِ کریم کا مفہوم صحیح سمجھ گئے، یا عربی لغات جان لی اور لغات جاننے کے بعد سمجھتے ہیں کہ اب ہم قرآن کو حل کر سکتے ہیں، اور پھر اسی زعم کے ساتھ وہ اہلِ علم سے ٹکراتے ہیں اور بیہودگیاں کرتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دُوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

ہر فن میں مہارت کے لئے کامل آدمی کی صحبت درکار ہے

یاد رکھیئے! کسی فن کی کوئی کتاب ہو، اُس کا مطالعہ کر کے کوئی شخص اُس فن کی مہارت حاصل نہیں کر سکتا، یہ ایک ایسا فطری اُصول ہے جس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص اِس کی تکذیب کرے اور کہے کہ نہیں، مطالعہ کرنے کے ساتھ انسان فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے، تو اُس کو بہت جلد مشاہدے کے ساتھ جھوٹا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''شاہی دسترخوان'' ایک کتاب چھپی

ہوئی ہے، جس میں ہر قسم کے کھانے پکانے کے طریقے لکھے ہوئے ہیں، شامی کباب کس طرح سے بنائیں گے؟ قورمہ کس طرح سے بنائیں گے؟ پلاؤ کس طرح سے پکائیں گے؟ فلاں قسم کا حلوہ آپ کس طرح سے پکائیں گے؟ اب ایک پڑھے لکھے گریجویٹ کے ہاتھ میں وہ کتاب دے دو اور اس کو باورچی خانے میں بٹھا دو، اسے کہو کہ یہ کتاب ہے اور یہ ساری کی ساری اشیاء پڑی ہیں، آپ نسخہ دیکھتے جایئے اور ہمیں کھانا تیار کر کے دیجئے! اگر تو وہ کتاب دیکھ کر کھانا تیار کر لے تو یہ علامت ہوگی کہ واقعی کوئی شخص کتاب کا مطالعہ کر کے کسی فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ قدم قدم پر غلطی کرے گا، اور کسی صورت میں بھی اچھی قسم کا کھانا نہیں پکا سکتا، بمقابلہ اس شخص کے جس نے کسی اُستاذ کے پاس بیٹھ کر کھانا پکانے کی مشق کی ہو۔ اسی طرح کپڑے سینے کے متعلق درزیوں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ایک مشین خرید لیجئے اور ایک کتاب لے لیجئے اور بیٹھ جایئے، پینٹ کوٹ اور دُوسرے کپڑے سینے شروع کر دیجئے، جتنے کپڑے صبح سے لے کر شام تک سیئیں گے، فی کپڑا سو جُوتا شام تک نہ کھایا تو کہنا! یعنی کپڑے دینے والے سوائے اِس کے کہ آپ کی مرمت جُوتوں سے کریں کہ ہمارے کپڑے برباد کر دیے، اور کیا حاصل ہوگا؟ اسی طرح انسان لوہار نہیں بن سکتا جس وقت تک کسی لوہار کے پاس بیٹھ کر کام کرنا نہ سیکھے، ترکھان نہیں بن سکتا، کوئی کام نہیں سیکھ سکتا، کپڑا بننا نہیں سیکھ سکتا جس وقت تک کسی اُستاذ کی مار نہ کھائے، کون سی چیز ہے جو آج کل تحریر میں آئی ہوئی نہیں ہے؟ دُور نہ جایئے! کیا طب کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہو گیا؟ ڈاکٹری کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہو گیا؟ تو کیا ضرورت ہے آپ کو کالجوں میں دھکے کھانے کی؟ اور دُوسرے لوگوں کے پاس جا کر جُوتیاں چٹخانے کی؟ کتابیں خرید و، اور دُکان کھول کر بیٹھ جاؤ! تپ دق کا مریض آ گیا تو تپ دق کے باب کا مطالعہ کرو اور اس کو نسخہ لکھ کر دے دو! نزلے کا مریض آ گیا تو نزلے کے باب کا مطالعہ کرو اور اس کو نسخہ لکھ کر دے دو! اب اس قسم کا طبیب اور ڈاکٹر جو کتابوں پر مدار رکھ کر ڈاکٹر اور طبیب بن گیا ہو، کسی اُستاذ سے اس نے مار نہ کھائی ہو، تو بتلاؤ! سوائے قبرستان کو آباد کرنے کے وہ اور کوئی کام کرے گا؟ سب چیزوں کے متعلق لوگوں کا عقیدہ یہی ہے کہ جب تک اُستاذ کی صحبت اختیار نہ کی جائی اور اُس کی مار نہ کھائی جائے اس وقت تک کوئی شخص کسی فن کے اندر مہارت نہیں حاصل کر سکتا، اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے چند لفظوں میں اِسی حقیقت کو بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

کورس تو الفاظ ہی سکھاتے ہیں　　　آدمی، آدمی بناتے ہیں

یعنی کورس کی کتابیں، نصاب کی کتابیں، اِن سے تو آپ الفاظ سیکھ جائیں گے، الفاظ رَٹ لیں گے، باقی یہ ہے کہ کوئی آدمی بن جائے تو آدمی بنانا آدمی کا کام ہے، کتابوں کا کام نہیں ہے، تو جس وقت تک کسی ایسے آدمی کی صحبت اختیار نہیں کی جائے گی جو اُس فن میں مہارت رکھنے والا ہو، اُس وقت تک اُس فن کی حقیقت سے انسان کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک واقعہ ہے اور جب چاہیں آپ تجربے میں لا کر اِس اُصول کی صداقت کو واضح کر لیجئے، کہ صرف الفاظ سے اور کتابوں کا مطالعہ کرنے سے کبھی کسی فن کے اندر مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ آپ کے گھروں میں آپ کی مائیں اور بہنیں کھانا پکاتی ہیں، روٹی پکاتی ہیں، اور آپ چولہے کے پاس بیٹھ کر ان کو پکاتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن کیا کسی دن ضرورت پیش آ جائے تو آپ پیڑا بنانے پر اور روٹی بنانے پر قادر ہو جائیں گے؟ جیسی روٹی وہ پکاتی ہیں، آپ پکا لیں گے؟ جیسی ہانڈی وہ پکاتیں ہیں، آپ پکا لیں گے؟ قدم قدم پہ غلطی کریں گے،

آپ نہیں کر سکتے، ہاں! البتہ آپ کی چھوٹی بہن جس نے ماں کی ماریں اور جھڑکیں کھائی ہیں، اور پاس بیٹھ کر پیڑا بنانا سیکھا ہے، روٹی پکانی سیکھی ہے، وہ چند دن میں مہارت حاصل کرلے گی، اور آپ کو چالیس چالیس سال ہوجائیں گے دیکھتے ہوئے، لیکن جب ضرورت پیش آئے گی آپ روٹی نہیں پکا سکتے۔ فرق کیا ہے؟ کہ اس نے روٹی پکانے کے لئے اپنی اماں کی شاگردی اختیار کی ہے، اور آپ نے شاگردی اختیار نہیں کی۔ یہ اتنا واضح اُصول ہے جس پر زیادہ دلائل دینے کی ضرورت ہی نہیں، کہ کسی فن میں مہارت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جس وقت تک کہ ماہرین کی رفاقت اختیار نہ کی جائے اور ان سے اَخذِ فیض نہ کیا جائے۔ صرف مطالعۂ کُتب کبھی کسی شخص کو اُس فن کے رُموز سے واقف نہیں کرتا، اور نہ اس کے اندر اُس کو مہارت حاصل ہوسکتی ہے۔ اور آج سب سے بڑی گمراہی کی بات یہی ہے کہ باقی فنون کے متعلق تو لوگوں کا یہی خیال ہے کہ جب تک ہم اُن کی سند حاصل نہیں کریں گے اور کسی اُستاذ کے پاس بیٹھ کر نہیں پڑھیں گے، اُس وقت تک اس میں مہارت حاصل نہیں ہوگی، لیکن دِینیات کے بارے میں ہر اُردو خواں ''مجتہد'' بنا ہوا ہے، حدیث کی کتاب کا ترجمہ پڑھ لیا تو اس کو زعم ہوگیا کہ میں نے پورا اِسلام سمجھ لیا، قرآنِ کریم کا ترجمہ دیکھ لیا تو اس کو زعم ہوگیا کہ میں نے سارا قرآن سمجھ لیا، اِس کے بعد پھر وہ اپنے طور پر فتوے دیتے ہیں، اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دُوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، اُن کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں اور صرف الفاظ سے حقیقت سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔

''صراطِ مستقیم'' صرف ''منعم علیہم'' کا راستہ ہے

اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے صراطِ مستقیم کا ذِکر کرنے کے بعد اُس کی وضاحت کے طور پر صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہہ دیا، یہ ایک حسی نشانی ہے جس سے ہم پہچان سکیں گے کہ طریقِ عبادت اور صراطِ مستقیم کیا چیز ہے؟ حاصل اُس کا یہ ہوا کہ منعم علیہم کا راستہ صراطِ مستقیم ہے۔ آپ کو پتا کیسے چلے گا کہ آپ سیدھے راستے پہ چل رہے ہیں؟ کیونکہ دلائل کے اُلجھاؤ میں تو کوئی شخص آپ کو ایک غلط بات بھی سمجھا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے، جیسے ایک آدمی زبان دراز ہے اور اُس کو بولنے کا طریقہ آتا ہے، وہ آپ پر غالب آسکتا ہے، اور کسی غلط بات کا بھی جواب آپ سے نہیں بنے گا، ہوسکتا ہے وہ دلائل کے ساتھ آپ کو ایک حقیقت سمجھا دے، اور وہ حقیقت ظاہری طور پر حقیقت کہلاتی ہو، لیکن ہو، وہ غلط۔ تو اِس صراطِ مستقیم کو پہچاننے کے لئے واضح علامت یہ بتادی گئی کہ اس راستے کو تم اللہ کا راستہ اور صراطِ مستقیم سمجھو جس راستے پر تمہیں انبیاء علیہم السلام چلتے ہوئے نظر آئیں، انبیاء کے بعد صدیقین چلتے ہوئے نظر آئیں، شہداء چلتے ہوئے نظر آئیں، صالحین چلتے ہوئے نظر آئیں۔ صالحین کا راستہ یہی صراطِ مستقیم ہے، نبیین کے بعد صدیقین میں عموم ہے، صدیق نبی بھی ہوتا ہے اور غیر نبی بھی ہوتا ہے، اور شہداء، صدیقین سے عام ہوگئے، اور صالحین سب سے عام ہیں، یعنی یہ خصوص سے عموم کی طرف ترقّی ہے، صالحین سب سے عام ہے، صالحین کا اِطلاق انبیاء پر بھی ہوتا ہے، صدیقین پر بھی ہوتا ہے، اور شہداء پر بھی ہوتا ہے، یعنی جن کو عُرفِ عام میں ''اولیاء اللہ'' اور ''نیک لوگ'' کہا جاتا ہے۔ تو اگر اِس کا یہ عنوان اختیار کرلیا جائے کہ صراطِ مستقیم صالحین کا صراط ہے، صالحین کا طریق صراطِ مستقیم ہے، تو یہ بات بالکل قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔

ہم قرآن وحدیث کے صرف الفاظ پر مدار نہیں رکھتے

اسی لیے ہمارے ہاں دِین کو سمجھنے کا اُصول یہی ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کے صرف الفاظ پہ مدار نہیں رکھتے، بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اِس کی کیا مُراد واضح فرمائی اور عمل کیسے اختیار کیا؟ اور ''سُنّت'' کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہم صحابہ کرام کے آثار کو دیکھتے ہیں، کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی مُراد کو کیا سمجھا؟ اور صحابہ کرام کی مُراد کو سمجھنے کے لئے اگلی صدی کے فقہاء کی باتوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اِن سے کیا سمجھا؟ اِس طرح سے درجہ بدرجہ جو اُمّت کے اندر صالحین کا ایک سلسلہ چلا آیا ہے، جو دِین اُن کی وساطت سے آتا ہے، اگرچہ بظاہر وہ بات آپ کو الفاظ کے خلاف ہی معلوم ہو، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تسلسل کے ساتھ صالحین کا طریق یہی چلا آیا ہے تو صراطِ مستقیم یہی ہے جس کو صالحین نے اختیار کیا، قرآن اور حدیث کے الفاظ سے وہ آپ کو سمجھ میں آجائے تو بہتر، اور سمجھ میں نہ آئے تو اُس کو اپنی سمجھ کی غلطی قرار دیجئے، اور صراطِ مستقیم وہی ہوگا جس کو اولیائے اُمّت نے، نیک لوگوں نے، مجتہدین نے، فقہاء نے، اور صحابہ ﷺ نے اپنایا۔

جنّتی فرقے کی علامت

یہی وجہ ہے کہ جب سرورِ کائنات ﷺ نے یہ ذکر کیا تھا...... یہ ایک اہم بات ہے جو آپ کی خدمت میں واضح کر رہا ہوں، اس کو ذہن نشین کر لیجئے، جو اِس بات کو اچھی طرح سے سمجھ جائے گا اِن شاء اللہ! زندگی بھر کبھی راہِ راست سے نہیں بھٹکے گا...... سرورِ کائنات ﷺ نے بیان فرمایا کہ میری اُمّت کے تہتّر'' فرقے ہوں گے، جن میں سے بہتر'' جہنّم میں جائیں گے اور ایک جنّتی ہوگا، صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے طریقے پر ہوں گے اور میرے صحابہ کے طریقے پر ہوں گے: ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ''[1] ملّتِ واحدہ کی تعبیر فرمائی: ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' وہ راستہ اور وہ طریق جس پر میں ہوں اور جس پر میرے صحابہ ہیں۔ یعنی یہاں شخصیات کو پیش کیا، یہ نہیں کہا کہ جو قرآن وسُنّت کے متبع ہوں گے، قرآن وسُنّت تو علم کے درجے کی چیز ہے، لیکن اُس کو پہچاننا کس طرح سے ہے کہ اس کی صحیح مُراد کیا ہے؟ تو ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' میرے عمل کو دیکھو اور میرے صحابہ کے طرز وطریق کو دیکھو، جس راستے پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں وہ راستہ ملّتِ واحدہ ہے جو جنّت میں لے جائے گا، یہ صراطِ مستقیم ہے۔

''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا لفظ عام استعمال کرنا چاہیے

یہ جو آپ اپنے لیے لفظ استعمال کیا کرتے ہیں: ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہم اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، اگرچہ اپنی نادانی کے ساتھ ہم نے اِس لفظ کو اپنے ہاں سے گنوا دیا اور دُوسرے قبضہ کر کے بیٹھ گئے، دُوسروں نے اپنے متعلق اس طرح تشہیر کی کہ جب کہا جائے کہ ''یہ اہل السنۃ والجماعۃ کی مسجد ہے!'' تو جاہل آدمی کا ذہن بریلویوں کی طرف ہی جاتا ہے، اور ہم نے اِس لفظ کا استعمال

---

(۱) ترمذی ۲/ ۹۳ باب افتراق ہذہ الامۃ/ مشکوٰۃ ص ۳۰، باب الاعتصام، فصل ثانی۔

زیادہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قابض ہو گئے، یہ ایک ہماری عملی کوتاہی کا نتیجہ ہے، اگر ہم بھی اس لفظ کو کثرت سے استعمال کرتے تو یہ لفظ اُن کے لئے الاٹ نہ ہو جاتا، ہماری اس غفلت سے انہوں نے فائدہ اُٹھایا اور اس لفظ کو اپنے لیے خاص کر لیا جو کہ ایک جنتی طبقے کا عنوان ہے۔ جس طرح میں بارہا اس دُکھ کا اظہار کیا کرتا ہوں، کہ یہ بھی ایک تاریخی ظلم ہے کہ بدعتیوں کے طبقے نے اولیاء اللہ کو اپنی صف میں کھڑا کر لیا اور ہمیں مخالف کر کے دِکھا دیا کہ یہ اولیاء اللہ کے مخالف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس میں بھی کچھ تھوڑا سا ہمارے طرزِ عمل کا قصور ہے، اِس کمی اور کوتاہی سے دُشمن نے فائدہ اُٹھایا اور اِس کمزور پہلو کے اُوپر اس نے حملہ کیا۔ اصل بات یوں ہوئی کہ جو اولیاء اللہ معروف معروف ہیں، اُن کے مقبرے بن گئے اور اُن کی قبروں پر کچھ غلط حرکتیں ہونے لگ گئیں، اُن غلط حرکتوں کی تردید کرنے کی وجہ سے ہمارے لوگ اُن مقابر پر آنا جانا ترک کر بیٹھے، ترک کرتے کرتے یہ اگلی نسل اس قسم کی آ گئی کہ یہ کبھی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہم سُنّت کے مطابق ہی کسی مزار کی زیارت کر کے اُس کے اُوپر فاتحہ پڑھ آئیں، آخر زیارتِ قبور کا مسنون طریقہ بھی تو ہے! یہ موجودہ دور میں تصادم ہونے سے قبل، یعنی جس وقت دیوبندی بریلوی تصادم ہوا، اِس سے قبل ہمارے اکابرِ دیوبند اِنہی مقابر پر جاتے تھے جو بنے ہوئے ہیں، جا کر مراقبے بھی کرتے تھے، فاتحہ بھی پڑھتے تھے، لیکن آج کے مبلغین میں بہت کم ایسے ہیں جو اِس طرح سے مقبروں کی زیارت کے لئے جائیں اور وہاں جا کر اَدب کے ساتھ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھیں۔ جس وقت آپ لوگ اِن مقابر پر زیادہ نظر نہیں آتے تو دُوسروں کو کہنے کا یہ موقع مل گیا کہ اِن کا کیا تعلق ان بزرگوں سے؟ اور اگر ہماری آمد و رفت بھی سُنّت کے مطابق وہاں کثرت سے ہوتی رہتی تو کم اَز کم اِس گھر کے اُوپر یہ مبتدع تو قابض نہ ہوتے! اب وہ تو اس لیے یقین جلدی دِلا دیتے ہیں کہ آئے دِن وہ تو قبروں پہ جھکے ہوئے ہیں، اور تم وہاں زیادہ نظر نہیں آتے، تمہارے پاس رہ گیا ایک دعویٰ ہی دعویٰ کہ ہمارا تعلق ہے، اور بالکل صحیح تعلق ہے، یہ نہیں کہ ہم کوئی لاتعلق ہو گئے، دِل میں عقیدت ہے، اُن کی تعلیمات پر عمل ہے، اور ہم اُن کے متعلق بڑے اچھے جذبات رکھتے ہیں، وہ ہمارے محسن ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اس علاقے میں اِنہی کی وساطت سے پھیلی ہے، ہم اُن کے شکرگزار ہیں، ان کے لئے دُعا گو ہیں، اُن کا نام ادب سے لیتے ہیں، جس وقت بھی ان کا نام آ جائے ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہتے ہیں، عقیدت ہے، محبت ہے، ہمارے شجروں اور سلسلوں میں اُن کے نام آتے ہیں، اور ہم ادب کے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں، سب کچھ صحیح ہے، لیکن وہی عملی کوتاہی کی بات آ گئی، کہ عملاً آپ چونکہ زیادہ آتے جاتے نظر نہیں آتے تو بدعتیوں کو موقع مل گیا کہ اِن نادانوں کو یہ یقین دِلا دیں کہ دیکھو! اِن کا اولیاء اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ورنہ ہمارے اکابر اس طرح سے دُور نہیں رہتے تھے، وہ مقبروں پر جاتے تھے، سُنّت کے مطابق زیارت کر کے چلے جاتے تھے، اب میں آپ کے سامنے اس قسم کے واقعات کیا بیان کروں کہ ہمارے دیوبند والے اکابر قریب قریب والے، وہ بھی اسی طرح سے معروف بزرگوں کی قبروں پر جاتے تھے اور سُنّت کے مطابق زیارت کر کے آ جاتے تھے۔ اور اس تصادم کے نتیجے میں ہمارے مبلغین کا طبقہ اور مولویوں کا طبقہ اِس سے کسی حد تک کٹ گیا، تو جاہلوں کو یقین دِلانا آسان ہو گیا۔

دُوسرے جب ہمارے لوگوں نے عملاً یہ تو کر لیا کہ سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے نام پر تقریب کر لیں، اور اپنے کسی دُوسرے بزرگ کے نام پر کوئی اس قسم کا کام کر لیں، لیکن ان گزرے ہوئے معروف قسم کے جو مسلّم بزرگ ہیں، اُن کے

ناموں پر ہمارے ہاں کوئی تقریبات نہیں ہوتیں، اور اُن لوگوں نے یہ طریقہ اپنا کر کہ کبھی وہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی گیارہویں شریف منارہے ہیں، کبھی کسی کا عُرس منارہے ہیں، کبھی کسی کا عُرس منارہے ہیں، یہ ایسے غلط طریقے اختیار کیے کہ جاہلوں کے دماغ میں بات ڈال دی۔ ہمارے ہاں جیسے باقی جلسے ہوتے ہیں تو اگر ہم اِمامِ اعظم رحمہ اللہ کی یاد میں ایک جلسہ کروالیں، تاریخ کا کوئی تعین نہ ہو، جب کوئی موقع ملے تو جلسے کا عنوان رکھ لیا جائے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یاد میں جلسہ کیا جارہا ہے، جس طرح آج آپ سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ کی یاد میں رکھ لیں، حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی یاد میں رکھ لیں، قریب قریب والے حضرات کی یاد میں جیسے رکھ لیا جاتا ہے، ایسے ہی کبھی حضرت معین الدین چشتی رحمہ اللہ کے نام پر کوئی مجلس ہوجائے اور اُس میں ان کے حالات بیان کردیے جائیں اور اس تقریب کو اُن کی طرف منسوب کردیا جائے، میرا خیال ہے کہ اگر یہ انداز رہتا تو شاید اتنی جلدی یہ لوگ پروپیگنڈا نہ کرسکتے، کہ دیکھو! ان کا بزرگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو تصادم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کسی حد تک دُور ہٹتے چلے گئے اور وہ قابض ہوتے چلے گئے۔ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کے لفظ کا بھی یہی حال ہوا۔

حق کی پہچان کے لئے دلائل کی بجائے شخصیات کو کیوں پیش کیا گیا؟

عرض یہ کررہا تھا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا لفظ کہاں سے لیا گیا ہے؟ وہ اِسی روایت کا ترجمہ ہے: ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' ''مَا اَنَا عَلَیْهِ'' سُنّت ہے، ''اَصْحَابِیْ'' جماعت ہے، تو جنہوں نے یہ طریقہ اپنایا وہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہوگئے، گویا کہ ہمارا مذہبی طرز یہی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سُنّت اور طریقِ صحابہ کیا ہے؟ اِس کو دیکھ کر ہم ایک مسلک اختیار کرتے ہیں، اس لیے ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کہلاتے ہیں، یہ عنوان روایت کے اِنہی الفاظ سے لیا گیا ہے۔ تو یہاں بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شخصیات کو پیش کیا کہ شخصیات کے ساتھ اس ملّت کو پہچانو جو ملّتِ ناجیہ ہے، جس پر چلنے والوں کی نجات ہوگی، وہاں بھی اِن شخصیات کو پیش کیا، کہ میرے طریقے کو دیکھو اور میرے صحابہ کو دیکھو۔ تو یہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے صراطِ مستقیم کا تعارف کرادیا کہ وہ صراطِ صالحین ہے، اِس کو اگر ہم اتباعِ اسلاف کے ساتھ ذِکر کرتے ہیں کہ ہمارا طریق اِتباعِ اسلاف ہے، کہ اسلاف نے جو طریق اختیار کیا ہم اُس طریق پہ چلیں گے، یہ عنوان بالکل قرآنِ کریم کے مطابق ہے، اس کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ صحبت میں بیٹھنے کے ساتھ جو مزاج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا، جو شخص صحبت میں بیٹھنے والا نہیں ہے وہ لفظوں کی طرف دیکھ کر اس بات کو قطعاً نہیں سمجھ سکتا۔

اب میں آپ کی خدمت میں ایک بات عرض کرتا ہوں، ذرا اِس کو سمجھئے! میری زبان سے الفاظ ادا ہوتے ہیں ''کیا ہے'' لکھا ہوا تو ہوگا: ''کیا ہے''، یہی دو لفظ آئیں گے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ لب ولہجے کے بدلنے کے ساتھ اِس کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ ''کیا ہے'' کا مطلب یہ بھی ہے کہ ایک چیز آپ کے ہاتھ میں ہے اور میں واقعی پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ اور کبھی آپ کوئی حرکت کررہے ہوں گے جو مناسب نہیں ہے تو میں ''کیا ہے'' کہہ کر اُس پر تنبیہ کروں گا اور آپ متوجہ ہوں گے تو اُس بات سے رُک جائیں گے۔ اسی طرح ''کیا بات ہے'' کہہ کر کبھی پوچھا جاتا ہے، کبھی تعجب کے طور پر کہا جاتا ہے، جیسے آپ نے کوئی بات کی تو کہتے

ہیں: ''کیا بات ہے!'' اب ''کیا بات ہے'' کا لفظ جو زبان پر جاری ہوا، یہ اظہارِ حیرت کے لئے ہے۔ اب اِن باتوں کے درمیان بہت باریک فرق ہوتا ہے کہ ذرا سا لب ولہجہ بدلا اور مفہوم بدل گیا۔ جیسے ایک آدمی آ کر مجھ سے پوچھتا ہے کہ ''میں یہ کام کرلوں؟'' میرا جواب ہوگا کہ ''کرلو!'' سننے والا سمجھے گا کہ اجازت مل گئی۔ اور ایک آدمی آ کر سوال کرے گا کہ ''کرلوں؟'' تو میری آنکھوں میں غصے کے آثار ہوں گے، چہرے پر اِنقباض ہوگا، میں کہوں گا: ''کرلو!'' وہ بھی سمجھ جائے گا کہ اجازت نہیں ہے، پوچھنے پر ناراض ہوگئے، اور اگر ہم یہ کام کریں گے تو یہ ٹھیک نہیں ہے، چہرے کے آثار اور آنکھوں کی ہیئت اور چہرے کے اُوپر جو ایک غصے کی سی بات آتی ہے کہ غصے میں آ کر اِنسان کہتا ہے: ''کرلو!'' تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ یہ اجازت نہیں ہے، اب اِن دونوں باتوں کے درمیان میں فرق دیکھنے والا جو وہاں موجود ہے وہ تو کرسکتا ہے، اور اگر یہی بات کاغذ پر لکھی ہوئی آجائے کہ فلاں شخص نے کام کرنے کی اجازت مانگی تھی تو اس نے جواب میں کہہ دیا کہ: ''کرلو!'' تو کیا یہ ''کرلو'' اِس مفہوم کو اَدا کرسکتا ہے؟ جو دیکھنے والے نے چہرے کی ہیئت دیکھ کے اور ماحول دیکھ کر بات سمجھی ہے وہ لفظوں کے تحت آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

مولانا عبدالمجید صاحب[1] کے ساتھ چوک منڈے (چوک سرور شہید) کی طرف پہلی دفعہ جب میں جارہا تھا تو وہاں بس میں رش بے انتہا تھا، انہوں نے بس ایسے بھری ہوئی تھی جیسے ٹرک کسی چیز کے ساتھ بھرا ہوا ہوتا ہے، راستے میں دائرہ دین پناہ میں پولیس اسٹیشن پر دو سپاہی کھڑے تھے، انہوں نے سوار ہونا تھا تو ڈرائیور نے اگلی سیٹ خالی کرا کے ان کو سوار کرادیا، اب راستے میں اوورلوڈ کرتا آیا، جب پولیس والے ساتھ سوار ہوگئے پھر اس کو کیا ڈر؟، چوک منڈے جس وقت اُترے تو میں نے عبدالمجید سے کہا (اُن دنوں میں راولپنڈی والوں کے ساتھ کچھ اختلافات تھے تو اس وقت یہ بحثیں بہت چلی ہوئی تھیں، اور اِتباعِ اسلاف کا عنوان ہمیشہ زیرِ بحث آتا تھا) میں نے اُن سے کہا کہ اب اگر میں اِن پولیس والوں سے ہاتھ ملاؤں اور ہاتھ ملا کر کہہ دُوں کہ ''پاکستان کی پولیس واقعی بڑی فرض شناس ہے!'' یہ فقرہ میں بول دُوں، اور کل کو یہ فقرہ اخبار میں چھپا ہوا آجائے، کہ عبدالمجید نے پولیس والوں سے ہاتھ ملایا اور یہ کہا کہ ''پاکستان کی پولیس بڑی فرض شناس ہے!'' سارا مُلک کہے گا کہ یہ پولیس کی تعریف ہے، اور تُو کہے گا کہ یہ مذمت ہے، اور میرے اِس فقرے کو سُن کر پولیس والوں کی بھی شرمساری سے نگاہ نیچی ہوجائے گی، وہ سمجھیں گے کہ ہم نے اپنا فرض اَدا کیا نہیں اور یہ کہتا ہے کہ بڑا فرض شناس ہے، تو یہ اِس نے اِستہزا کیا ہے۔ اب جس وقت اِس فقرے کی تشریح کا موقع آئے گا تو مُلک کی نو کروڑ آبادی اِس بات کی طرف ہوگی کہ یہ تعریف اور مدح ہے، اور تُو اکیلا ایک طرف ہوگا اور کہے گا کہ نہیں! یہ مذمت ہے، وہ کہیں گے کہ دُنیا کی کوئی لغات اُٹھا کر لے آؤ، اِس میں مذمت کا لفظ کون سا ہے؟ جب کسی سے کہا جائے کہ ''تُو بڑا فرض شناس ہے!'' یہ تعریف ہوتی ہے، اُردو زبان ہے، ہم اِس کو سمجھتے ہیں، اور اِس میں کونسا لفظ ایسا ہے جو لغۃً ہی اس بات پہ دلالت کرتا ہو کہ یہ مذمت ہے۔ میں نے کہا: نو کروڑ کی رائے ایک طرف ہوگی، تیری رائے ایک طرف ہوگی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تیرے اکیلے کی

---

(۱) شیخ الحدیث ومدیر جامعہ فاروقیہ، چوک سرور شہید، مظفرگڑھ۔ آپ حضرت حکیم العصر رحمہ اللہ کے قدیم اور محبوب تلامذہ میں سے ہیں۔

رائے ٹھیک ہے، نو کروڑ کی رائے غلط ہے۔ فرق کیا ہے؟ کہ جس موقع محل میں یہ لفظ استعمال کیا گیا وہ موقع محل تُو نے دیکھا ہے، اور جنہوں نے اخبار کے اندر یہ فقرہ پڑھا ہے وہ کیا اس موقع محل کو سمجھیں گے؟ اور جب تک موقع محل سامنے نہ ہو تو ایک فقرے کی صحیح مُراد کس طرح سے متعین کی جائے گی؟ تیرے سامنے تو یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے انتہائی غفلت کا ثبوت دیا، جو ان کا فرض تھا کہ کنٹرول کرتے اُس کو انہوں نے چھوڑا، اور اپنے مفاد کی خاطر چھوڑا کہ انہوں نے مفت سوار کرلیا، اور ان کی موجودگی سے دُوسروں نے اور فائدہ اُٹھایا، یہ تو فرض ناشناسی ہے، فرض شناسی نہیں ہے، اِس ماحول میں جب اس فقرے کو استعمال کیا گیا ہے تو یقیناً یہ مذمت ہے، تعریف نہیں ہے۔ اب تُو نے یہ موقع محل دیکھا ہے، تو سمجھے گا کہ مذمت ہے، اور دُوسرے لغات اُٹھا کر پھریں گے، اور کہیں گے کہ اُردو زبان ہے، کوئی لفظ اِس میں ایسا نہیں۔ لیکن رائے اُن کی غلط ہوگی اور تیری صحیح ہوگی۔ یہی فرق ہوتا ہے اس شخص کے درمیان جس نے کسی کی خدمت اور صحبت میں بیٹھ کر اُس کی باتوں کو سمجھا ہے، اور اس شخص کے درمیان جس نے کسی دُوسری مجلس میں بیٹھ کر صرف اُس کے چھپے ہوئے ملفوظات سنے ہیں یا پڑھے ہیں، تو مزاج شناسی ہمیشہ اُنہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے جو صحبت میں رہتے ہیں اور گفتگو کا انداز دیکھتے ہیں اور اس گفتگو کا ماحول سمجھتے ہیں۔

حاصلِ بحث!

تو اِتباعِ اسلاف کے اندر یہی نکتہ ملحوظ ہے کہ ہر نسل اُوپر والوں سے جب دِین کو اَخذ کرتی آئے گی، اُن کے مزاج کو دیکھ کر، ان کی باتیں سُن کر، صحیح مُراد یہی سمجھیں گے۔ اور جنہوں نے صرف لفظوں کا مطالعہ کرنا ہے وہ کبھی بھی صحیح مُراد نہیں سمجھیں گے، اس لیے آگے یہ جو لفظ بڑھادیے گئے، تو اِن کا مطلب یہی ہوا کہ صراطِ مستقیم کی تعیین طریقِ نبیین سے کرو، طریقِ صدیقین سے کرو، شہداء کے طرز وطریق سے کرو، صالحین کے طرز وطریق سے کرو۔ اور "صالحین" چونکہ سب سے عام لفظ ہے، تو ہم اگر یہ اختیار کرلیں کہ صالحین کا طریقہ، اولیائے اُمت کا طریقہ یہی صراطِ مستقیم ہے، جو شخص اِن کی اتباع کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گا، صراطِ مستقیم کا متبع ہے، یہ عنوان بالکل قرآنِ کریم سے تقریباً صراحت کے ساتھ ثابت ہے، جس میں کوئی اِشکال نہیں ہے۔ باقی! اولیائے اُمت اور صالحین کے لئے آگے یہ صفت ذِکر کردی کہ وہ مغضوب علیہم نہیں ہوتے اور بھٹکے ہوئے نہیں ہوتے، یعنی اُن میں جہالت بھی نہیں ہوتی کہ جہالت کی بنا پر وہ غلطیاں کرتے ہوں، اور علم حاصل ہوجانے کے بعد وہ جان بوجھ کر بھی کوتاہی نہیں کرتے، آگے اِس کی یہ تشریح آ گئی۔ تو صراطِ مستقیم کی تعیین ہمارے سامنے ایک عملی نقشے کے طور پر کردی گئی کہ دلائل اپنی جگہ، لیکن اِس کا تشخصِ خارجی یہ ہے کہ صالحین کا راستہ صراطِ مستقیم ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریقہ وہی معتبر ہوگا جو انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی وساطت سے ہمارے سامنے آئے گا۔

سورۂ فاتحہ کا سورۂ بقرہ سے ربط

سورۂ فاتحہ ختم ہورہی ہے، آگے سورۂ بقرہ شروع ہوگی، اور عام طور پر سورۂ بقرہ کے ساتھ سورۂ فاتحہ کا ربط اِن الفاظ کے

ساتھ واضح کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کی تھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ساری کتاب اسی ہدایت کے طور پر نازل کی ہے، اور صرف کتاب نازل نہیں کی بلکہ اپنا رسول ساتھ بھیجا، جس نے اِس کتاب کو سمجھا اور سمجھایا، اور اس پر عمل کر کے دکھایا، تو جو شخص صراطِ مستقیم اختیار کرنا چاہتا ہے اُس کے لئے یہ کتاب نصاب کے درجے میں ہے، اور اللہ کا رسول اس کا شارح اور اس کا مفسر بن کے آ گیا، لہٰذا قرآن کے ساتھ سُنّت کو جوڑ کر اور سرورِ کائنات ﷺ کے شاگردوں کو ساتھ ملا کر اسی ترتیب سے اس کتاب کو سمجھو اور اس پر عمل کرو، جب عمل کرو گے تو سمجھ لیجئے کہ تمہیں صراطِ مستقیم حاصل ہو گیا۔ کورس تو یہ ہے، جس طرح سے میں نے عرض کیا۔ باقی! شخصیات کے ساتھ ہم اس کورس کو سمجھیں گے، سمجھنے کے بعد اس پر عمل کریں گے، عمل کرنے کے ساتھ وہ ہدایت حاصل ہو جائے گی۔ تو جو دُعا تلقین کی گئی تھی کہ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلا، تو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کے اندر اُس ہدایت نامے کی نشاندہی کر دی گئی کہ آگے آنے والی کتاب ہدایت نامہ ہے، اِس کو سمجھو اور اس پر عمل کرو، تو تم صراطِ مستقیم پر چلنے والے بن جاؤ گے۔

کتابُ اللہ کا موضوع

اور کتابُ اللہ کا موضوع بھی اِس سے سمجھ میں آ گیا کہ ''طریقِ عبادت کی تعلیم'' اصل کے اعتبار سے کتابُ اللہ کا موضوع یہ ہے، طریقِ عبادت کی تعلیم اَحکام کے درجے میں بھی آئے گی، کہ اللہ تعالیٰ اَحکام دیں گے کہ اس طرح سے عمل کرو، اور پھر اُن پر عمل کرنے کی ترغیب کے طور پر دُنیوی اور اُخروی اِنعامات کا تذکرہ آئے گا، اور ترہیب کے طور پر جہنم کا اور دُنیوی عذابوں کا ذکر آئے گا، اور ماننے والوں کی دُنیا اور آخرت میں کامیابی کے واقعات بیان کیے جائیں گے، اور نہ ماننے والوں پر جو دُنیا میں بربادی آئی اور جو آخرت میں آئے گی، وہ سُنائی جائے گی، تو وہ سارے کے سارے اِسی لیے ہوں گے تا کہ اَحکام پر عمل کرنے کی ترغیب وترہیب ہو۔ ترغیب وترہیب آخرت کے حالات کے تحت بھی ہوگی اور دُنیا کے حالات کے تحت بھی ہوگی، اقوام کے واقعات سُنائے جائیں گے کہ دیکھو! اُنہوں نے اَحکام مانے تھے وہ کامیاب ہو گئے، اِنہوں نے نہیں مانے تھے برباد ہو گئے، اور آخرت کے قصے بھی آئیں گے۔ اِس نظریے کے ساتھ اگر آپ دیکھیں گے تو قرآنِ کریم کا سارا مضمون اسی نقطے پر جمع ہوتا چلا جائے گا کہ اصل میں آپ کو عبادت پر برانگیختہ کرنا ہے۔ عبادت کرنے کا طریقہ بتایا جائے گا اَحکام کے درجے میں، پھر اُس پر برانگیختہ کرنے کے لئے ترغیب وترہیب کے طور پر آخرت کی جنّت اور دوزخ کا ذکر آئے گا، اور دُنیا کے واقعات عذاب کے اور راحت کے، قوموں کی کامیابی کے اور بربادی کے، یہ سارے واقعات جو ذکر کیے جائیں گے تو اِن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو اِختیار کرنے کی ترغیب ہوگی اور اُن کے چھوڑنے سے ترہیب ہوگی، اِس طرح سے قرآنِ کریم کا موضوع بھی متعین ہو جاتا ہے کہ یہ طریقِ عبادت کی تعلیم کے لئے آیا ہے۔ یہ ضروری ضروری باتیں آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئیں، ان شاء اللہ العزیز! آگے سورۂ بقرہ شروع کریں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

***

سورة البقرة

اٰياتها ٢٨٦ ٢ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ٨٧ ركوعاتها ٤٠
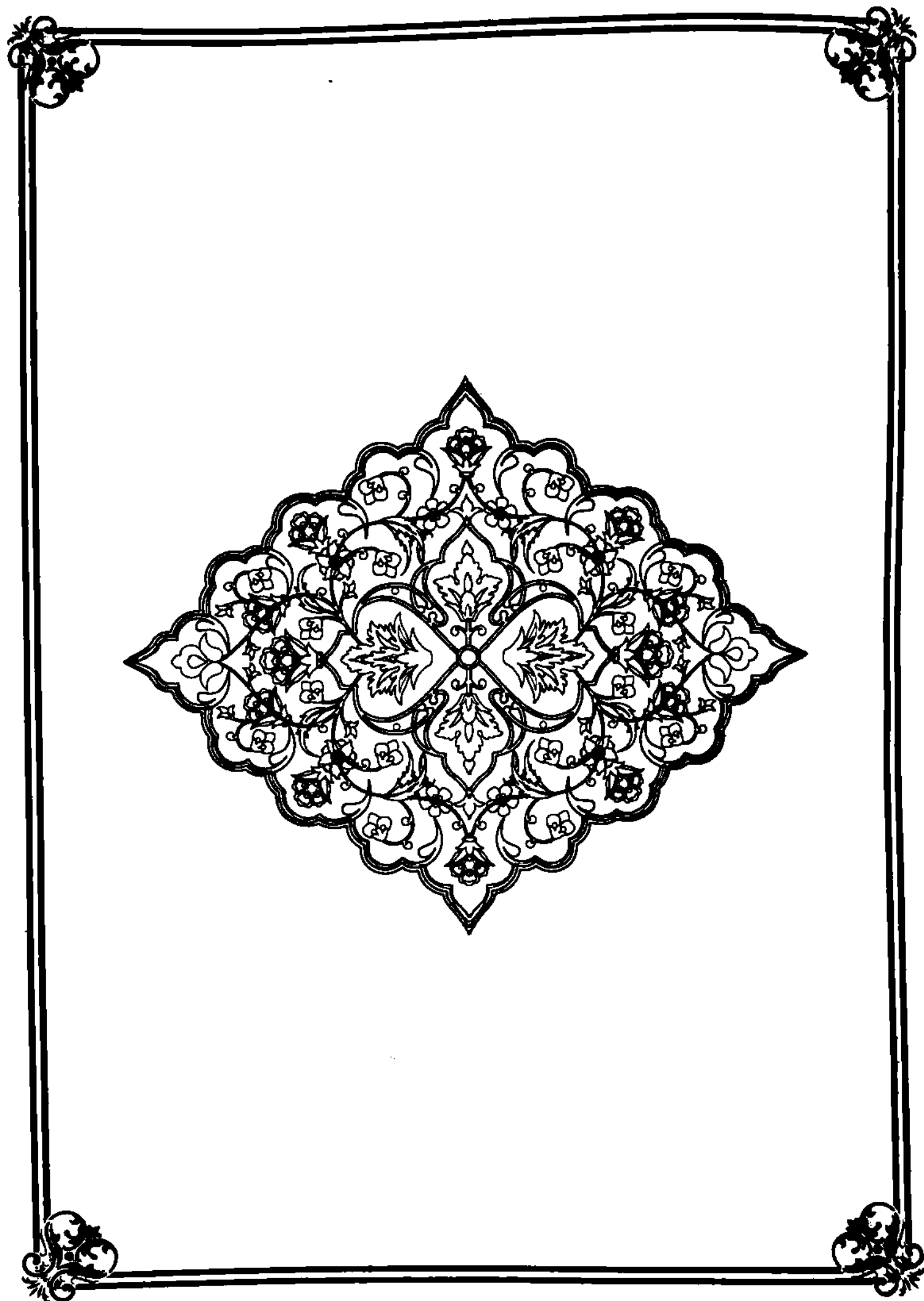
سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس کی ٢٨٦ آیتیں ہیں اور چالیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

الٓمّٓ ① یہ کتاب، اِس میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لئے ② جو تصدیق کرتے ہیں غیب کی،

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اُس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ اور جو ایمان تے ہیں

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④

اس چیز پر جو آپ کی طرف اُتاری گئی اور اس چیز پر جو آپ سے قبل اُتاری گئی، اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں ④

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤

یہی لوگ اس ہدایت پر ثابت ہیں جو ان کے رَبّ کی جانب سے ہے، اور یہی اپنے مقصد کو پانے والے ہیں ⑤

سورۂ بقرہ کی وجہ تسمیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس کی ٢٨٦ آیتیں ہیں اور اور ٤٠ رکوع ہیں۔ سورت کا نام ''البقرہ'' صحیح روایات میں آیا ہے، یہ نام اُس واقعے سے ماخوذ ہے جو چند رکوع بعد ذبحِ بقرہ کا آئے گا، بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ واقعہ چونکہ اِس سورت میں مذکور ہے تو تسمیۃ الکل باسم الجزء کے طور پر ساری سورت کا نام ہی ''بقرہ'' رکھ دیا گیا، ''بقرہ'' اصل میں گائے کو کہتے ہیں، مذکر ہو یا مؤنث دونوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اسی لیے وہاں ذبحِ بقرہ کے قصے میں مفسرین کے نزدیک یہ بات زیرِ بحث ہے کہ جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یا جو بنی اسرائیل نے ذبح کی تھی وہ مذکر تھی یا مؤنث؟ تو اِس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے، اگرچہ مذکر کے لئے لفظ ''ثور'' علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے، ''ثور'' بیل کو کہتے ہیں، جیسے ''شاۃ'' کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے بولتے ہیں، یعنی بکری کی نوع کے لئے، اور بکرے کے لئے ''تَيْس'' کا لفظ علیحدہ بھی بولا جاتا ہے۔ اور ''مَدَنِيَّة'' کی اصطلاح آپ کے سامنے

واضح کردی گئی تھی کہ ''مدنیہ'' اُن سورتوں کو کہا جاتا ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، چونکہ یہ سورت بھی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اس لیے اِس کو ''مدنیہ'' قرار دیا گیا۔

حروفِ مقطعات کی وجہِ تسمیہ اور اُن کے مفہوم کے متعلق مختلف اقوال

الٓمّٓ: اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِكَ۔ اِن حروف سے جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، سورتوں کی اِبتدا میں جو اس قسم کے حروف آئے ہوئے ہیں، مفسرین کی اِصطلاح میں ان کو ''مقطعات'' کہتے ہیں، اور ''مقطعات'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عام کلام کے دستور کے مطابق اِن کو ملا کر نہیں پڑھا جاتا، بلکہ ہر ہر حرف کو علیحدہ پڑھتے ہیں، الف، لام، میم، یوں علیحدہ علیحدہ قطع کر کے پڑھے جاتے ہیں، اس لیے اِن کو ''حروفِ مقطعات'' کہتے ہیں۔ ان حروف کا مطلب اور مفہوم کیا ہے؟ مفسرین کے کلام میں بہت سارے اقوال نقل کئے گئے ہیں، تمام کُتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے مرفوع حدیث میں اِس بارے میں کچھ نقل نہیں کیا گیا، اور ہمیں کوئی اِس قسم کی روایت نہیں ملی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سرورِ کائنات ﷺ سے سوال ہو کہ ''الٓمّٓ''، ''الٓرٰ''، ''الٓمّٓرٰ'' یہ حروف جو سورتوں کی شروع میں آئے ہوئے ہیں اِن کی کیا مراد ہے؟ اور یہ کس معنی پر دلالت کرتے ہیں؟ صحابہ نے سوال کیا ہو اور سرورِ کائنات ﷺ نے آگے سے کوئی جواب دیا ہو کہ اِن کا کوئی معنی ہے یا نہیں ہے، یا یہ کوئی راز اور بھید ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان ہے، اِس قسم کا کوئی تذکرہ کسی صحیح روایت میں موجود نہیں ہے۔ تو بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ حضور ﷺ سے اس بارے میں سوال ہی نہیں کیا گیا، جب یہ سوال نہیں کیا گیا اور حضور ﷺ کی طرف سے اس کی وضاحت کسی صحیح روایت میں نہیں ہے تو اِس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حروفِ مقطعات کا کسی کلام کی ابتدا میں استعمال کرنا یا خطبات کے شروع میں اِس قسم کے حروف کا زبان پر لانا، ہوسکتا ہے کہ اہلِ عرب کے نزدیک ایک معروف طریقہ ہو، کہ جب اُن کے خطیب کوئی خطبہ دینا شروع کرتے ہوں تو ابتدا ایسے حروف سے کرتے ہوں، یا کوئی شاعر وغیرہ قصیدہ پڑھتے ہوں تو اپنے قصیدے کی ابتدا میں ایسے حروف استعمال کرتے ہوں، بہر حال کوئی معروف طریقہ ہوگا، ورنہ اگر یہ طریقہ معروف نہ ہوتا تو لازماً اِن کے متعلق سوال ہونا چاہیے تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اِن کی تفہیم اور تبیین ہوتی، کہ یا تو اِس کا کوئی مفہوم اور معنی متعین کیا جاتا، یا منع کر دیا جاتا کہ اس بارے میں سوال نہ کرو، یہ راز اور بھید کی بات ہے جو میرے اور اللہ کے درمیان ہے۔ تو مرفوع حدیث میں اس قسم کا کوئی مضمون نہیں ہے، البتہ اقوالِ صحابہ کے طور پر باتیں نقل کی گئی ہیں کہ یہ حروف اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان بھید ہے، اس لیے اِن میں کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں، اِنہی اقوال کی طرف دیکھتے ہوئے عام طور پر مفسرین یہ الفاظ بولا کرتے ہیں جو میں نے اپنی تقریر کی ابتدا میں بولے ہیں، عربی تفاسیر میں آپ پڑھیں گے تو ''الٓمّٓ'' کے بعد لکھا ہوا ہوگا: ''اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِكَ'' (جلالین) اور اُردو تفاسیر آپ دیکھیں گے تو اُن میں اِس قسم کے لفظ لکھے ہوئے ہوں گے کہ ''اِن حروف سے اللہ کی جو مراد ہے، وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' بہر حال اِن کا کوئی مفہوم ہمارے سامنے متعین نہیں ہے، بعض حضرات نے اِن کو سورتوں کا نام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے اِن کو اَسمائے اِلٰہیہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، اور بعض نے اِن کو لمبی عبارت کا مخفف

قرار دیا ہے، اس قسم کی باتیں سب کی سب ظنی ہیں، اِن میں سے کسی پر یقین بھی نہیں لایا جاسکتا اور کسی کو بلادلیل غلط بھی نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ بات متیقن ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے ان حروف کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس لیے ان کے بارے میں محتاط پہلو وہی ہے جو ہمارے تمام اکابر اور مفسرین لکھتے آئے ہیں کہ: ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ'' ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے، وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، چاہے اس میں کوئی اشارہ اور کوئی رازداری ہو جو اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان میں ہے، اور چاہے یہ سورتوں کے نام کے طور پر آئے ہوئے ہوں، چاہے یہ لمبی عبارتوں کی کوئی تخفیف ہو، جو بھی مقصد ہو بہر حال احادیثِ صحیحہ مرفوعہ میں ان کے متعلق کسی معنی کی تعیین نہیں ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ: یہ کتاب، لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ: ریب کہتے ہیں تردّد اور شک کو، لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ: اس میں کوئی تردّد اور شک نہیں ہے۔ فِیْهِ کے آگے اور پیچھے تین تین نقطے لگے ہوئے ہیں، قرآنِ کریم میں جہاں کہیں بھی اس قسم کا اشارہ آئے گا تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ماقبل سے جُڑنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور مابعد سے جڑنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے، اب یہاں فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ، اور لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ دونوں دُرست ہیں، هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ: یہ متقین کے لئے ہدایت ہے، راہنمائی ہے۔ هُدًى اور هِدَايَة یہ دونوں مصدر ہیں، هَدٰى يَهْدِیْ: راہنمائی کرنا، راستہ بتلانا، اِسی سے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اَمر کا صیغہ آیا تھا۔ اِتِّقَاء: بچنا، بچ بچ کر چلنا، یہ لفظ ''تقویٰ'' سے لیا گیا ہے، متقین: بچنے والے، اور مراد یہ ہوتا ہے کہ جو اللہ کی نافرمانی سے بچتے ہیں، خدا تعالیٰ کے غضب سے بچتے ہیں، حاصل مفہوم اِس کا ''ڈرنے والا'' بھی کر دیا جاتا ہے، کیونکہ ڈرنے والا آدمی ہی بچنے کی کوشش کیا کرتا ہے، ''یہ کتاب ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لئے'' یا ''اِس کتاب میں ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لئے''۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ: یہ متقین کی صفت ہے، جو تصدیق کرتے ہیں غیب کی، ایمان تصدیق کے معنی میں ہے، غیب مصدر ہے مغیبات کے معنی میں، یعنی اُن چیزوں کی جو چھپی ہوئی ہیں، جن کو اِن کے حواس معلوم نہیں کر سکتے، آنکھوں سے وہ چیزیں دیکھی نہیں جاتیں، کانوں سے سُنی نہیں جاتیں، زبان کے ساتھ چکھی نہیں جاتیں، ہاتھ کے ساتھ چھوئی نہیں جاتیں، ایسی چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کے خبر دینے کی وجہ سے ہی، اور یہی ہے ایمان کی حقیقت، کہ ایسی باتیں جن کو آپ اپنے حواس کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے، اللہ اور اللہ کے رسول کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے آپ اُن کو مان لیجئے اور تصدیق کر دیجئے۔ تو جو بات بھی اللہ کے رسول نے بتائی اور وہ ہمارے حواس کے دائرے سے باہر ہے، بشرطیکہ حضور ﷺ کی وہ خبر ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچی ہو، قطعی طریقے سے پہنچی ہو، اُس میں ضعف یا اس قسم کی کوئی بات نہ ہو، قطعی طریقے سے معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ نے یہ بات بتائی ہے اور وہ بات ہم سے غائب ہے، ہمارے حواس کے اِدراک میں نہیں آتی، ہم آنکھ سے اُس کو نہیں دیکھ سکتے، کان سے نہیں سُن سکتے، اللہ کے رسول کی ذات پر اعتماد کر کے اُس بات کی تصدیق کر دینا، یہ ''ایمان'' ہے۔ تو یہاں غیب سے ایسی مغیبات اور چھپی ہوئی چیزیں مراد ہیں جن کو انسان اپنے حواس کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتا، ''متقین وہ ہیں جو چھپی ہوئی چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔'' وَیُقِیْمُوْنَ

الصَّلٰوۃَ: یُقِیْمُوْنَ کا لفظ ''اِقامت'' سے لیا گیا ہے، نماز قائم کرتے ہیں، اور یہ محاورے کے تحت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صرف نماز کا پڑھنا مراد نہیں ہے، بلکہ اُس کے حقوق، آداب اور اوقات کی رعایت رکھتے ہوئے پابندی کے ساتھ کامل طریقے سے ادا کرنا، ''اِقامت'' کے اندر یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ ''نماز کو کامل طریقے سے ادا کرتے ہیں'' یعنی اُس کے اوقات، آداب، فرائض، شرائط ہر چیز کی رعایت رکھتے ہیں، کامل طریقے سے ادا کرتے ہیں اور علی الدوام پڑھتے ہیں، ''اِقامت'' کے اندر یہ سارے مفہوم ہیں۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ: مِن تبعیضیہ ہے، جو کچھ ہم نے انہیں دیا اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، یُنْفِقُوْنَ، ''اِنفاق'' سے لیا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ: اور متقی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ کی طرف اُتاری گئی، وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: اور اس چیز پر جو آپ سے قبل اُتاری گئی، وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ: آخرۃ کا لفظی معنی ہے: پیچھے آنے والی، یہ لفظ دُنیا کے مقابلے میں آیا کرتا ہے، اور یہ ادنیٰ کا مؤنث ہے بمعنی قریب، جو چیز قریب ہو، دُنیا مِنَ الاخرۃ: آخرت کے مقابلے میں جو جہان ہمارے قریب ہے اُس کو دُنیا کہا جاتا ہے، اور جو اِس کے پیچھے آنے والا جہان ہے یعنی جب یہ زندگی ختم ہوگی تو اِس کے پیچھے جو زندگی آئے گی وہ آخرت ہے، اور جو ہمارے قریب ہے وہ دُنیا ہے، تو دُنیا کے مقابلے میں آخرۃ آ گیا، اِس کا مفہوم ہوگا پچھلی زندگی، ''اِس زندگی کے بعد پیچھے آنے والی زندگی پر وہ یقین رکھتے ہیں، آخرت پر وہ یقین لاتے ہیں۔'' اُولٰٓىٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ: یہی لوگ ہدایت پر ثابت ہیں، ایسی ہدایت جو اُن کے رَبّ کی جانب سے ہے، وَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: اَفْلَحَ: فلاح پانا، کامیاب ہو جانا، اور ''کامیاب'' فارسی کا لفظ ہے، ''کام'' مقصد کو کہتے ہیں، ''یاب''، ''یافتن'' سے ہے، اپنے مقصد کو پالینا، ''کامیاب'' اس کو کہتے ہیں جو اپنے مقصد کو پالے، ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے کامیابی پائی، یہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں، یہی اپنے مقصد کو پانے والے ہیں۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

سورۂ بقرہ کا اِجمالی تعارف اور اس میں بیان کردہ مضامین

سورۂ بقرہ قرآنِ کریم کی سورتوں میں سے سب سے بڑی سورت ہے، اور اَحکامِ الٰہیہ بھی اِس سورت میں باقی سورتوں کے مقابلے میں زیادہ آئے ہیں، عقائد کے متعلق بھی، عبادات کے متعلق بھی، معاملات اور معاشرت کے متعلق بھی، اور اخلاق کے متعلق بھی، دِین کے جتنے شعبے ہیں ان کے بارے میں ہدایات اِس سورت میں باقی سورتوں کے مقابلے میں زیادہ دی گئی ہیں۔ ابتدا میں ایمانیات کا ذِکر ہے، اور اِس کے متصل کافروں کا ذِکر آئے گا، پھر اُس کے متصل منافقوں کا ذِکر آئے گا، اِن تینوں طبقوں کو ذِکر کرنے کے بعد اِجتماعی طور پر تمام انسانوں کو خطاب کر کے ایمان کے اُصول بیان کیے جائیں گے، توحید، رِسالت اور معاد، جو ایمان کے اندر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کے اُوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اِنعامات اور احسانات کا تذکرہ ہوگا، مادّی بھی اور رُوحانی بھی، زمین وآسمان کا پیدا کرنا اور ان میں نعمتوں کا قائم اور ثابت کرنا، یہ مادّی نعمتیں ہیں، اور رُوحانی نعمتیں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں نمایاں کی جائیں گی، کہ اللہ تعالیٰ نے علم اور شرافت کے ساتھ آدم علیہ السلام کو فضیلت

دی، تو بنی آدم کو خطاب کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو مانو! جس نے تمہیں اس طرح سے رُوحانی اور جسمانی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور پھر بنی آدم میں سے خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کو خطاب شروع ہو جائے گا، چونکہ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ کا واسطہ اِسی طبقے سے پڑا تھا، اور یہی طبقہ اُس وقت اہلِ علم تھا اور اِن کے اثرات تھے، تو اِنہیں سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے کی ترغیب دی جائے گی، اور جس قسم کی انہوں نے شرارتیں اور بداخلاقیاں اختیار کر رکھی تھیں اُن کے اُوپر تنقید کی جائے گی، تو آدھی سورت تقریباً اِسی قسم کے حالات میں ہے، اُس کے بعد پھر براہِ راست اہلِ ایمان کو خطاب کیا جائے گا اور ان کو ہدایات دی جائیں گی۔ درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا جائے گا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بنی اسرائیل کے بھی مقتدیٰ تھے، اور وہ بھی اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی پر قرار دیتے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات اور اُن کا کعبۃ اللہ کے ساتھ تعلق اور پھر تحویلِ قبلہ کا مسئلہ درمیان میں آ جائے گا، گویا کہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف انتقال ہوتے ہوئے درمیان میں یہ ایک واسطہ ہوگا، سرورِ کائنات ﷺ کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ واضح کیا جائے گا، اس طرح یہ کلام اختتام تک پہنچ جائے گا۔ یہ اِس سورت کے مضامین کا اجمالی سا تعارف ہے۔

سورۂ بقرہ کے فضائل

حدیث شریف میں اِس سورت کے فضائل بھی بہت ذکر کیے گئے ہیں، سرورِ کائنات ﷺ نے اِس کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، جس گھر میں یہ پڑھی جائے شیطان اس گھر کے قریب نہیں آتا،[1] اور اس سورت میں ایک آیت ہے جس کو آیت الکرسی کہتے ہیں، وہ قرآنِ کریم کی جمیع آیات کے مقابلے میں افضل آیت ہے۔ اور اِس سورت کے اختتام پر جو دو آیتیں ہیں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر تک، وہ بھی افضل ترین آیتیں ہیں، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص رات کو وہ دو آیتیں پڑھ لے، تو مزید اوراد اور وظائف نہ بھی کر سکے تو وہ دو آیتیں اس کے لئے کافی ہو جاتی ہیں،[2] بلکہ سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق قرآنِ کریم کا اہلِ قرآن پر حق ہے کہ رات کو اس کی کچھ نہ کچھ تلاوت ضرور کریں، اور اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی زیادہ تلاوت نہ کر سکے اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لی جائیں تو قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے کافی ہیں۔[3] قیامت کے دن یہ سورت بادل یا سائبان کی شکل میں آئے گی اور اپنے پڑھنے والوں کے اُوپر سایہ افگن ہوگی،[4] حضور ﷺ نے اسی طرح سے وضاحت فرمائی ہے، کہ جو اس سورت کے ساتھ محبت رکھیں گے اور اِس کو پڑھتے رہیں گے، قیامت کے دن یہ سورت اُن کے اُوپر سایہ کرے گی۔ بہر حال فضلیت والی سورت ہے، اور قرآنِ کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور سب سے زیادہ احکام اِسی سورت میں مذکور ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۲۶۶، باب استحباب الصلوۃ النافلة مشکوۃ ص ۱۸۴، فضائل القرآن فصلِ اول۔

(۲) صحیح البخاری ج۲ ص۷۴۹، باب فضل البقرة۔ مشکوۃ ص۱۸۵، فضائل القرآن فصل اول۔

(۳) فیض الباری ج۵ ص۲۶ تسمیة من سمی من اهل بدر سے پہلے۔

(۴) مسلم ج۱ ص۲۷۰ باب فضل قراءة القرآن مشکوۃ ص ۱۸۴، فضائل القرآن فصلِ اول

ماقبل سے ربط

ماقبل کے ساتھ ربط کل آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا، کہ جو ہدایت ہم نے اللہ تعالیٰ سے طلب کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت نامہ آگے قرآنِ کریم کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ یہ ہدایت نامہ اللہ کے رسول پر اترا، اللہ کے رسول نے اس کی وضاحت کی، اور اَسلاف کی وساطت سے ہم تک پہنچا۔ تو ہدایت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہوگا کہ اس کتاب کو لو، اور اس کے مبیّن اور مفسّر کے واسطہ سے اِس کو سمجھنے کی کوشش کرو، اور اِس پر عمل کرو، یہی ہدایت کا راستہ ہے۔

''لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ'' پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ: حروفِ مقطعات کے متعلق آپ کی خدمت میں تفصیل عرض کر دی گئی۔ ''یہ کتاب، اِس کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی تردد اور شک نہیں ہے''، کتاب میں کوئی شک نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اِس کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، بلکہ بالکل یقینی طور پر ایک نمایاں حقیقت کی طرح یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بارے میں تو بہت سارے لوگوں کو شک ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں، تو یہ ابتداءً دعوے کے طور پر کیسے کہہ دیا گیا کہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں بلکہ بہت صاف ستھری بات ہے، جس طرح نصف النہار میں سورج واضح ہوتا ہے اور کسی کے لئے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی اسی طرح اس کتاب کا من جانب اللہ ہونا واضح ہے اور اِس میں کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں، یہ بات بطور دعوے کے کہہ دی گئی، حالانکہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کو اِس بارے میں شک ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے، یہ اشکال ذہن میں ابھرتا ہے، جس کا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ شک دو طرح سے ہوتا ہے، ایک ہوتا ہے کلام میں شک اور ایک ہوتی ہے دماغ میں کجی، بات صحیح طور پر اُس وقت سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ بات بھی اپنی حقیقت کے طور پر صحیح ہو اور سوچنے والے کا ذہن بھی صحیح ہو۔ اور تردد دو وجہ سے ہوتا ہے، بسا اوقات سوچنے والے کا ذہن صحیح ہوتا ہے لیکن بات غلط ہوتی ہے اس لیے وہ ذہن میں نہیں بیٹھتی، اور بسا اوقات بات صحیح ہوتی ہے لیکن سننے والے کا ذہن خراب ہوتا ہے اس لیے وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ مثلاً دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ چار، یہ ایک ایسا اصول ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، لیکن اب اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ کہے کہ دو اور دو پانچ ہیں، چار نہیں ہیں، تو سارے سمجھدار کہیں گے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اِس آدمی کا دماغ خراب ہے جس کو دو اور دو چار سمجھ نہیں آتا، بلکہ کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہیں۔ اب یہاں دو اور دو چار میں جو شخص شک کرے گا تو یہ اُس کے دماغ کی خرابی ہے، ورنہ یہ اصول اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، اور اگر آپ کے سامنے ایک آدمی آ کر کہے کہ دو اور دو پانچ ہیں، اور آپ کو سمجھانے کی کوشش کرے اور آپ کی سمجھ میں نہ آئے کہ دو اور دو پانچ کس طرح ہو گیا؟ تو یہ شک اور تردد جو اس میں پیدا ہوگا اور دماغ اس بات کو قبول نہیں کرے گا تو اس میں یہی وجہ ہے کہ آپ کا دماغ صحیح ہے لیکن یہ بات غلط ہے۔ تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات غلط ہوتی ہے اس لیے صحیح دماغ اُس کو قبول نہیں کرتا، اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بات صحیح ہوتی ہے لیکن دماغ غلط ہوتا ہے اس لیے سمجھ

میں نہیں آتی، کجی دماغ میں ہوتی ہے ورنہ بات صحیح ہوتی ہے۔ تو یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ بات تو یہ بالکل صحیح ہے اور سولہ آنے صحیح ہے، اس میں کوئی تردد کی بات نہیں کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہے۔

ایک فطری اُصول اور اس کی روشنی میں قرآنِ کریم کی حقّانیت کا اِثبات

باقی رہی یہ بات کہ اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اور اس صحیح بات کو تمہارے دماغ قبول نہیں کرتے تو اُس کا پھر آگے علاج بتایا جائے گا، جہاں سے معلوم ہوگا کہ ریب کی نسبت لوگوں کے دماغ کی طرف ہے، اِس بات کی طرف نہیں ہے۔ ابھی آپ کے سامنے چند آیات کے بعد ایک آیت آئے گی: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، اب اِس آیت کو اس کے ساتھ جوڑو، کہا یہ جارہا ہے کہ ہم نے تو دعویٰ کردیا کہ یہ بلاریب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، باقی اگر تمہیں تردد ہے اور تمہارا دماغ اس بات کو قبول نہیں کرتا تو اپنے اشکال کو اس طرح سے دور کرلو کہ انسان کی بنائی ہوئی چیز کی مثل انسان بنا سکتا ہے، مثلاً ایک کاریگر ایک چیز بناتا ہے تو دوسرا اُس کی نقل اتار لے گا، ایک ملک والوں نے ہوائی جہاز بنایا تو دوسروں نے اس کی نقل اتارلی، ایک نے ایٹم بم بنایا تو دوسروں نے اس کی نقل اتارلی، دنیا کے اندر کونسی چیز ایسی ہے کہ ایک انسان اس کو بنائے اور دوسرا انسان اُس کی نقل نہ اتار سکے، انسان کی مصنوعات جتنی بھی ہیں اُن کی نقل اُتاری جاسکتی ہے اور دوسرا انسان ان جیسی بنا کر پیش کرسکتا ہے، بلکہ پہلے نے جو چیز بنائی ہوگی جب دوسرا بنائے گا تو اس کی خامیوں کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو پہلے سے زیادہ اچھے طریقے سے بنالے گا، ایک جگہ کپڑا بنتا ہے تو دوسرا اس کی نقل اُتار لیتا ہے، ایک جوتی سینے والا آدمی جوتی بناتا ہے تو دوسرا دیکھ کر ویسی جوتی بنالیتا ہے، الغرض چھوٹی چیز سے لے کر بڑی چیز تک جتنی انسانوں کی مصنوعات ہیں دوسرا انسان اُن کی نقل اتار کر ویسی ہی بلکہ اُس سے اچھی بنا سکتا ہے، کیونکہ جس نے پہلی دفعہ بنائی ہے ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کچھ خامیاں رہ گئی ہوں، اور جو دوبارہ اس کو بنائے گا وہ ان خامیوں کا ازالہ کرکے پہلے سے بھی اچھی بنالے گا، تو انسان کے واسطے سے جو چیز وجود میں آئی ہو دوسرا انسان اس کی مثل تیار کرسکتا ہے۔ لیکن جو چیز براہِ راست قدرت کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور اُس میں انسان کا واسطہ نہیں ہوتا وہاں آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ اُس کی مثل نہیں لائی جاسکتی، مثلاً سورج اللہ نے بنایا ہے، اِس میں کسی انسان کا واسطہ نہیں ہے، اب سارے انسان اگر مل جائیں تو بھی اِس سورج جیسا دوسرا سورج نہیں بنا سکتے، چاند اللہ نے بنایا ہے اِس میں کسی انسان کا واسطہ نہیں ہے، تو سارے انسان مل جائیں اس چاند جیسا کوئی چاند نہیں بنا سکتے، زمین اللہ نے بنائی ہے، سارے انسان اکٹھے ہوجاؤ، اِس زمین جیسی دوسری زمین نہیں بنائی جاسکتی، آسمان اللہ نے بنایا ہے تم ساری دنیا اکٹھی ہوجاؤ اِس آسمان جیسا دوسرا آسمان نہیں بنایا جاسکتا۔ تو جس کی مثل نہ لائی جاسکے وہ براہِ راست قدرت کا فعل ہے، اور جس کے اندر انسان کی قدرت اور اُس کے عمل کا دخل ہو اُس کی مثل لائی جاسکتی ہے، آپ ساری کائنات کے اندر ایسی مثال کوئی نہیں دکھا سکتے کہ ایک چیز انسان نے بنائی ہو اور وہ یہ کہہ دے کہ دوسرا اس کی نقل نہیں اتار سکتا، اور ساری کائنات اُس کے سامنے عاجز آجائے، جب

سے دنیا آباد ہوئی ہے اب تک اور قیامت تک ایسی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ کوئی چیز بنائی ہوئی تو انسان کی ہو اور کوئی دوسرا انسان اس کی نقل نہ اتار سکے۔

تو یہاں اِسی اصول کے تحت قرآنِ کریم کی حقانیت کو پیش کیا گیا ہے، کہ ایک ہی قدم میں فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اس میں انسان کی قدرت کا دخل ہے یا نہیں، حضور ﷺ تمہارے سامنے ہیں، تمہارا خیال ہے کہ انہوں نے خود بنالی، اب یہ تمہاری برادری کا آدمی ہے، تمہاری قوم کا آدمی ہے، تم جیسی زبان بولتا ہے، اگر اِس نے بنالی تو تم ایک نہیں بلکہ سارے مل کر، اور پھر تم ہی نہیں بلکہ تمہارے جتنے معبود اور جتنے مددگار ہیں، جیسے آگے تفصیل بھی آجائے گی، کہ چاہے وہ جن ہوں، جو بھی ہوں، سب کو اکٹھا کرلو، اور اکٹھا کرنے کے بعد اِس کتاب جیسی کتاب (سورۂ اسراء: ۸۸)، یا اِس کتاب کی دس سورتوں جیسی دس سورتیں، جیسے ایک جگہ ہے بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ (سورۂ ہود: ۱۳)، اور آخر میں کہہ دیا گیا کہ اِس کی سورتوں میں سے ایک سورت کی مثل بنا کر لے آؤ (سورۂ بقرہ: ۲۳)، وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے شہداء ہیں اُن کو بھی بلالو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ کتاب اللہ کی نہیں ہے بلکہ اِس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ اگر اس کتاب کی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آؤ تو تم سچے اور یہ جھوٹے جو کہتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے آئی ہے، اور اگر تم سارے کے سارے مل کر اِس کی ایک سورت جیسی بھی سورت نہیں بنا سکتے، اور ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ لَنْ تَفْعَلُوْا: تم ہرگز یہ کام نہیں کرسکو گے، تو ساتھ یہ پیش گوئی بھی کردی کہ ہرگز تم یہ کام نہیں کرسکو گے، اور آپ جانتے ہیں کہ لَنْ میں مستقبل کی نفی کا استغراق ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ رہتی دنیا تک یہ ممکن نہیں ہے، آنے والی نسلیں بھی اِس قرآنِ کریم کی مثل نہیں لاسکتیں، جب اس کی مثل نہیں لائی جاسکتی تو اُسی فطری اصول کے تحت جو میں نے آپ کے سامنے واضح کیا ہے، کہ انسان کی مصنوعات کی بالیقین نقل اتاری جاسکتی ہے اور جس کی نقل نہ اتاری جاسکے یہ دلیل ہوتی ہے کہ وہ انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، تو پھر تمہیں یقین کرلینا چاہیے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تراشیدہ نہیں ہے بلکہ براہِ راست اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ یہ کتنا فطری اصول ہے اور کتنی واضح بات ہے، نہ اِس میں کوئی مقدمے جوڑنے کی ضرورت، نہ اِس میں کسی استدلال کی ضرورت، یہ بات فطری ہے کہ انسان کی بنی ہوئی چیز کی نقل انسان اتار سکتا ہے، تو پھر آؤ، اِسی اصول پر فیصلہ کرلو، اگر تو تم اِس کی نقل تیار کر کے لے آؤ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ انسان کی ساختہ ہے، اور اگر تم اس کی مثل نہ لاسکو تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے سورج جیسا سورج نہیں بنایا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی زمین جیسی زمین نہیں بنائی جاسکتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اِس کتاب جیسی کتاب نہیں بنائی جاسکتی۔ تو نہایت ہی عمدہ، بہترین اور سیدھے سادے طریقے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ کتاب انسانی قدرت سے باہر ہے، اور معلوم ہو گیا کہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں انسان کے عمل کا دخل نہیں، اگر انسان کے عمل کا دخل ہوتا تو اس کی مثل لائی جاسکتی۔

تو ذہنوں میں اِس صحیح بات کو قبول کرنے میں جو تردد ہوا تھا اُس کے ازالے کی تدبیر بتادی، معلوم ہو گیا کہ بات تو صحیح ہے، اور اگر تمہارے دماغ قبول نہیں کرتے تو تم اپنے اس شک اور تردد کو اس سیدھی سادی دلیل کے ساتھ دور کرلو، اور اگر اتنی سیدھی

سادی دلیل بھی تم نہیں سمجھتے تو پھر سوائے ضد اور عناد کے کوئی بات نہیں۔ اب یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے آگئیں کہ بات بالکل صحیح ہے، اِس میں کوئی تردد نہیں ہے، باقی اگر کسی کا دماغ اس کو قبول نہیں کرتا تو یوں سمجھو جیسے دو اور دو چار کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ یقین ہوتا ہے کہ دماغ اس کا خراب ہے ورنہ اصول اپنی جگہ صحیح ہے۔ اب لَا رَیْبَ فِیْهِ کا مفہوم آپ کے سامنے اچھی طرح واضح ہوگیا، کہ اِس کتاب کا من جانب اللہ ہونا بالکل یقینی ہے، اور اِس میں کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں ہے، اور اگر اس بات کو تمہارے دماغ قبول نہیں کرتے تو خرابی تمہارے دماغوں کی ہے جیسے کسی کا دماغ دو اور دو چار کو نہ سمجھے۔ اور اس شک اور شبہ کو دور کرنے کے لئے تمہارے سامنے ایک فطری دلیل پیش کی جارہی ہے، ایسے اصول کے تحت جس سے کسی جاہل کو بھی انکار نہیں ہوسکتا، کہ انسان کی مصنوعات کی نقل اتاری جاسکتی ہے اور جس کی نقل نہ اتاری جاسکے یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ کسی انسان کی صنعت نہیں ہے، تو تم اِس کتاب کی نقل اتار کر دیکھ لو، کوشش کر کے دیکھ لو، اگر تم اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر لے آؤ تو یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ یہ انسان کی صنعت ہے، اور اگر تم اس کی مثل تیار نہ کرسکو پھر جس طرح سورج براہِ راست اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح یہ کتاب بھی اللہ کی اتاری ہوئی ہے اور اللہ کا کلام ہے، کسی انسان کی کلام نہیں ہے۔ تو پہلی آیت کے اندر ہی اِس کتاب کی حیثیت کو واضح کردیا گیا۔ تو لَا رَیْبَ فِیْهِ کا مطلب یہ ہوا کہ من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں، یہ اللہ کی کتاب ہے۔

''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ: ڈرنے والوں کے لئے ہدایت ہے، اس پر بھی ایک اشکال عام طور پر کیا جاتا ہے کہ متقین کے لئے ہدایت کا کیا مطلب؟ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں، اور اِس کتاب کو متقین کے لئے ہدایت قرار دیا گیا حالانکہ ہدایت تو گمراہوں کے لئے ہونی چاہیے، یہ ایک عام مشہور سوال ہے اور اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے۔ دو طرح سے اس اشکال کو حل کیا گیا ہے، کہ یا تو متقین سے ادنیٰ درجے کے ڈرنے والے مراد ہیں، کہ اِس کتاب سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کے دل کے میں اللہ کا کچھ خوف ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ بات صحیح ہے کہ نصیحت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اگر کسی شخص کے دل میں اپنے آپ کو سنوارنے کی فکر نہیں ہے تو وہ نصیحت اُس کے کچھ کام نہیں آسکتی، نصیحت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم سننے والے کے قلب میں داعیہ پیدا ہو کہ میں اس بات کو قبول کر کے کوئی فائدہ اُٹھاؤں، جب تک فکر نہیں ہوگی اُس وقت تک بات نفع نہیں دے سکتی۔ تو پہلے دل میں کچھ خوف ڈر اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوگا تب آپ اِس سے فائدہ اٹھاسکیں گے، اور اگر اس قسم کا تقویٰ، خوف، ڈر، فکر، قلب میں پیدا نہ ہو تو اِس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ تو متقین سے مراد ہوجائے گا ڈرنے والے، بچنے والے، یعنی اس کا ابتدائی درجہ، کہ پہلے قلب میں اللہ کی ناراضگی کا ڈر پیدا ہو، اُس کے بعد اِس کتاب سے فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔

اور اگر متقین سے کامل متقی مراد ہوں تو پھر اس کے مفہوم کو یوں سمجھئے کہ جس طرح ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پرائمری کا نصاب ہے، یہ مڈل کا نصاب ہے، یہ میٹرک کا نصاب ہے، تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو پرائمری پاس کرنا چاہتا ہے اسے

چاہیے کہ اِس نصاب پر عبور حاصل کرے، جو مڈل پاس کرنا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اِس نصاب پر عبور حاصل کرے، جو میٹرک پاس کرنا چاہتا ہے اور میٹرک کی سند لینا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اس نصاب کو پڑھ کر اس میں کامیابی حاصل کرے، اسی طرح کہتے ہیں کہ یہ بی اے کا نصاب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جو بی اے پاس کرنا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اس نصاب میں کامیابی حاصل کرے۔ تو پھر ھُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا مطلب ہوگا کہ یہ متقیوں کا نصاب ہے، کہ اگر کوئی شخص متقی بننا چاہتا ہے اور متقیوں والا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لئے یہ کتاب ایک نصاب کے درجے کی ہے، یہ اُس کا کورس ہے، کہ اِس کو پڑھو گے اور پڑھ کر اِس کے مطابق عمل کرو گے تو تم متقی بن جاؤ گے اور تمہیں وہ کمال حاصل ہو جائے گا جو متقین کا ہوا کرتا ہے، اور جب تک اس کتاب کو نہیں پڑھو گے تو اِس کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہیں جو کسی انسان کو متقیوں کے درجے تک پہنچا دے، پھر اِس کا مطلب یوں بنے گا۔ تو جتنا جتنا تقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا اُتنا ہی انسان اِس کتاب سے ہدایت حاصل کرتا چلا جائے گا، جتنی ہدایت حاصل کرتا چلا جائے گا اتنا ہی تقویٰ میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔

متقین کی صفات

آگے متقین کی صفات ذکر کی ہیں، جن میں یہ معیار بتا دیا گیا کہ متقی کیسے ہوتے ہیں، اور تمہیں اِس کتاب سے تعلیمات حاصل کر کے ایسا ہی بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پہلی بات تو عقائدِ صحیحہ کی طرف اشارہ ہے، کہ مغیبات پر اُن کا ایمان صحیح ہوتا ہے، جو باتیں اُن کے حواس سے باہر ہیں اُن کو وہ رسول پر اعتماد کر کے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ملنے کی بناء پر مانتے ہیں، اِس میں اللہ کی ذات، اللہ کی صفات، آخرت کے حالات، فرشتے، جو چیزیں بھی آپ کو آنکھوں سے نظر نہیں آتیں اور اللہ کے رسول نے اُن کی خبر دی ہے وہ سب اس میں شامل ہیں، چاہے اُن کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہو چاہے آنے والے زمانے سے ہو، ایسی حقیقتیں جو اللہ کے رسول نے ہمارے سامنے واضح کی ہیں لیکن ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، اُن کا ماننا، ان پر ایمان لانا اور ان کا یقین کرنا ضروری ہے، انسان متقی تب بنے گا جب اُس کے اندر یہ صفت آجائے گی۔ عقائد کے اصول تو اِس میں واضح کر دیے گئے، یہاں اجمال ہے اور اِسی سورت کے اختتام پر اِس کی کچھ تفصیل آئے گی: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔ اِسی طرح پہلے پارے کے آخر میں بھی اِس کی کچھ تفصیل ذکر کی جائے گی کہ ایمان کن کن چیزوں پر لانا ضروری ہوتا ہے۔ تو يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے اندر تو اِنہی عقائد کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان متقی تب کہلائے گا جب وہ اس قسم کی مغیبات کو تسلیم کرلے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: نماز کا پڑھنا بدنی عبادت ہے، اور عملی احکام جتنے بھی ہیں وہ دو ہی قسم کے ہوا کرتے ہیں، یا بدنی یا مالی، عقائد کا تعلق قلب سے ہے، اور بدنی احکام میں سے اقامتِ صلوٰۃ سب سے بڑا حکم ہے، اس لیے اِس کو ذکر کر دیا، گویا کہ بدنی عبادت کی اعلیٰ نوع کو پیش کر دیا گیا اور اشارہ سب انواع کی طرف ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد بدنی عبادت بھی کرتے ہیں، جس کا اعلیٰ فرد اقامتِ صلوٰۃ ہے، کہ جو اقامتِ صلوٰۃ کرے، نماز صحیح انداز سے قائم کرے، وہ باقی احکام کا

پابند ہوہی جایا کرتا ہے۔ اور مالی عبادت کا ذکر مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں کر دیا، کہ جو کچھ ہم نے اُنہیں دے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، انفاق فی سبیل اللہ مالی عبادت ہے۔ اور اِس انفاق کو ذکر کرتے ہوئے مَارَزَقْنٰهُمْ کہا کہ "جو کچھ ہم نے انہیں دیا"، دیکھو! اِس میں لفظ ایسا بول دیا جس میں غور کرنے کے بعد انفاق مشکل نہیں رہتا، کہ جب تم خرچ کرنے لگو تو یہ سوچ لیا کرو کہ یہ دیا ہوا تو ہمارا ہی ہے، اُسی میں سے ہی ہم کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، ورنہ جب ماں کے بطن سے آپ پیدا ہوئے تھے تو ساتھ کیا لائے تھے؟ ننگ دھڑنگ تو آئے تھے، نہ پاؤں میں جوتی نہ سر پہ ٹوپی، تمہارے پاس کیا تھا؟۔ پھر جو کچھ دیا سب اللہ نے دیا، اب اُسی کی دی ہوئی چیزوں میں سے اگر مطالبہ ہو کہ یہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دو تو یہ کوئی مشکل نہیں ہونا چاہیے بلکہ خوشدلی کے ساتھ انسان خرچ کرے۔ جب یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے پھر تو انسان کہتا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

[غالب]

کہ اگر اللہ کے لئے جان قربان کر دی جائے تو وہ بھی تو اُسی کی دی ہوئی تھی، ہم نے کونسی کوئی چیز اپنی طرف سے دے دی، پھر پیسے خرچ کرنے تو اپنی جگہ رہے، جان دے کر بھی انسان سمجھتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ وہ اللہ کی چیز تھی، اللہ کی طرف واپس لوٹا دی، اور مالی عبادت میں جب بھی کوتاہی ہوتی ہے اِسی نظریے سے ہوتی ہے کہ انسان کہتا ہے کہ میں نے کمایا ہے، یہ میری چیز ہے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ نہیں! یہ ہم نے دی ہوئی ہے، جب ہم نے دی ہوئی ہے تو اُس میں سے کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ ہو تو اللہ کے راستے میں دینے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ بہر حال مالی عبادت کا اصول اِس میں واضح کر دیا۔

صحیح ایمان کے لئے کن چیزوں کا ماننا ضروری ہے؟

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ کی طرف اتاری گئی، وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے اتاری گئی، اِس میں تورات وانجیل اور دوسرے صحف آ گئے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل کیے گئے، تو گویا کہ ایمانِ صحیح کے لئے ضروری ہے کہ جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی چیزوں کو مانا جا رہا ہے ایسے ہی انبیائے سابقین پر بھی ایمان لایا جائے اور ان پر اتری ہوئی ہدایات کو بھی مانا جائے، ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ تعلیمات حق تھیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں، باقی اُس کے مطابق عمل کرنا ہے یا نہیں کرنا یہ ایک علیحدہ بات ہے، تسلیم تو اُن کو کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اتری تھیں اور حق تھیں، باقی! عمل تو قرآنِ کریم پر ہوگا، جو حقیقت باقی ہوگی اس کو اپنائیں گے، حتی کہ اگر قرآنِ کریم کی بعض آیات بھی منسوخ ہو جائیں تو باوجود اس بات کے کہ ہم ان کو حق سمجھیں گے، لیکن اُن پر عمل نہیں کریں گے، تو عمل ایک علیحدہ چیز ہے اور کسی چیز کو ماننا ایک علیحدہ چیز ہے۔ اب تورات کو ہم مانتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور موسیٰ علیہ السلام پر اتری، لیکن اِس پر عمل کرنا ہے یا نہیں؟ تو اللہ کی کتابوں کا آخری ایڈیشن قرآنِ کریم ہے، جس چیز کو اِس نے باقی رکھا اس پر عمل کریں گے، جس کو اِس نے باقی نہیں رکھا اس پر عمل نہیں کریں گے۔

ختمِ نبوّت کی دلیل

اور بہت ساری آیات ایسی آئیں گی جہاں اللہ تعالیٰ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ کو ذکر کیا جائے گا، مفسرین کہتے ہیں کہ اس میں ختمِ نبوّت کی طرف بھی اشارہ ہے، کہ کسی جگہ بھی متقی ہونے کے لئے مابعد کے کسی نبی پر ایمان لانے کے متعلق نہیں کہا گیا، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ وعدے لیے جاتے تھے کہ آنے والے پیغمبر کی تصدیق کرنی ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرے بعد ایک پیغمبر آنے والا ہے، اُس کی تصدیق کرنی ہے، لیکن جو کلام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا اس میں کہیں بھی کوئی اس قسم کا اشارہ نہیں دیا گیا، یہ تو کہا گیا ہے کہ پہلی اتری ہوئی چیزوں کو مانو، لیکن بعد میں اترنے والی چیز کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے۔

عقیدۂ آخرت کی اہمیت

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: مغیبات کے اندر اگرچہ آخرت بھی شامل ہے جس کا ذکر پہلے کر دیا گیا تھا، لیکن اِس کو علیحدہ کر کے ذکر کر دیا کیونکہ عقائد کے اندر اِس کی بہت اہمیت ہے، اور اسلامی عقائد میں سے انقلابی عقیدہ یہی ہے، کہ جب کسی شخص کا آخرت پر یقین ہو جائے اور وہ آخرت کو تفصیل کے تحت سمجھ لے، کہ میں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنی زندگی کے اعمال کا حساب دینا ہے، تو اُس کی عملی زندگی کا رخ سیدھا ہو جاتا ہے، اور جب تک یہ عقیدہ نہ ہو اس وقت تک انسان اپنے عمل میں آزاد رہتا ہے اور لاپروائی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ تو اسلامی عقائد میں سے سب سے بڑا انقلابی عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے، جس کے ساتھ انسان کے خیالات، رجحانات اور عملی زندگی میں تغیر برپا ہوتا ہے، جتنا آخرت کے متعلق عقیدہ پختہ ہو جائے گا یعنی اُس کی تفصیلات کے تحت، اتنا ہی انسان معصیت سے بچے گا اور نیکی کرنے کی کوشش کرے گا، پھر اُس کو یہ نہیں خیال ہوگا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا، اور مجھے سزا کا ڈر ہے یا نہیں ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے علم پر مدار رکھ کر اپنی آخرت کی زندگی کی فکر رکھتے ہوئے بُرے کاموں سے بچے گا اور اچھے کام کرے گا، چاہے کوئی دیکھ رہا ہو چاہے نہ دیکھ رہا ہو، چاہے سزا کا ڈر ہو چاہے ڈر نہ ہو، اِس لیے اس کو مستقل کر کے ذکر کر دیا۔

مذکورہ صفات اپنانے والوں کا انجام

جو یہ صفات اپنائیں کہ اُن کا ایمان مغیبات کے ساتھ صحیح ہو جائے، بدنی عبادات کے پابند ہوں، مالی عبادات کے پابند ہوں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی چیزوں کے ساتھ ساتھ انبیائے سابقین پر اتری ہوئی چیزوں کو بھی مانتے ہوں، اور آخرت پر ان کا یقین پختہ ہو جائے، یہی اُس ہدایت پر قائم ہیں جو اُن کے رب کی طرف سے آئی ہے، یہی ہدایت یافتہ سمجھے جائیں گے، اور یہی لوگ ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والے ہیں، مقصد ہے اللہ کی رضا کا حاصل کرنا اور آخرت کی کامیابی، اور اُس کا طریقہ یہی ہے کہ ان صفات کو اپناؤ جو متقین کی ذکر کی گئی ہیں۔

سوال:- کچھ سورتیں مکہ میں بھی نازل ہوئی تھیں تو سب سے پہلے سورۂ بقرہ کو لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- قرآن کریم کی ترتیب نزولی اور ہے، اور اِس کتاب کو جو جمع کیا گیا ہے تو اس میں نزولی ترتیب کی رعایت نہیں رکھی گئی، اور یہ ترتیب بھی توقیفی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے جس طرح بیان کیا اسی طرح اِس کتاب کو جمع کیا گیا۔ تو اس کی نزولی ترتیب اور ہے اور اِس کو تدوین اور طریقے سے کیا گیا ہے، اس لیے کہیں سورت مکی آجائے گی، کہیں مدنی آجائے گی، کہیں مکی سورتوں میں مدنی آیات ہیں، کہیں مدنی سورتوں میں مکی آیات ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، برابر ہے اُن پر کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ مہر کردی اللہ تعالیٰ نے

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَمِنَ

ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ⑦ لوگوں میں سے

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ

بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے، اور وہ بالکل ایمان لانے والے نہیں ⑧ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ

اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے، اور وہ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو، اور وہ جانتے نہیں ⑨ ان کے دلوں میں بیماری ہے

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَ

پس اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ⑩ اور

اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ

جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ⑪ خبردار! بیشک یہی لوگ

الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا

فسادی ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ⑫ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جس طرح لوگ ایمان لائے، تو وہ کہتے ہیں

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا
کیا ہم ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ خبردار! بیشک یہی لوگ نادان ہیں لیکن یہ جانتے نہیں ﴿١٣﴾ اور جس
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا
وقت یہ ملتے ہیں ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جس وقت خلوت میں چلے جاتے ہیں
اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ
اپنے شیاطین کی طرف تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزاء کرنے والے ہیں ﴿١٤﴾ اللہ تعالیٰ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
ان کے ساتھ استہزاء کرتا ہے، اور ترقی دیتا ہے انہیں ان کی سرکشی میں اس حال میں کہ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں ﴿١٥﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾
نے خریدا گمراہی کو ہدایت کے بدلے، ان کی تجارت نے نفع نہ پایا، اور یہ لوگ سیدھی راہ پانے والے نہیں ﴿١٦﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ: برابر ہے اُن پر کہ تو اُنہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ: اِنذار اور عدم اِنذار دونوں کے درمیان برابری کرنا مقصود ہے، اور یہاں ہمزہ استفہام جو آیا ہوا ہے تو اِس کا ترجمہ استفہام کے طور پر نہیں کرنا، بلکہ یہ تسویہ کے لئے ہے، بالکل ایسے ہی محاورے کے تحت، جیسے کہ گلستان میں آپ نے حضرتِ شیخ (سعدی ﷫) کا قول پڑھا تھا:

چو آہنگِ رفتن کند جانِ پاک — چہ برتخت مُردن، چہ برروئے خاک

(باب ا: حکایت ا)

''چہ'' کا لفظ بھی فارسی میں استفہام کے لئے آتا ہے لیکن ایسے موقع پر وہ بھی برابری بیان کرنے کے لئے ہے، اِس کا ترجمہ یوں نہیں کریں گے ''کیا تخت پر مرنا اور کیا روئے خاک پر مرنا''، اس طرح سے ترجمہ تحت اللفظ تو ہے، لیکن محاورے کے مطابق نہیں ہے، محاورے کے مطابق ترجمہ اِسی طرح ہوگا کہ ''جب جانِ پاک جانے کا ارادہ کرلے تو تخت پر مرنا اور روئے خاک پر مرنا برابر ہے'' مٹی کی سطح پر کوئی پڑا ہوا ہو یا تخت پر ہو دونوں صورتیں برابر ہیں۔ اِسی طرح یہاں ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ میں بھی ہمزہ تسویہ کے لئے ہے، یہاں استفہام کے طور پر ترجمہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہاں مفہوم یہ ہوگا کہ تیرا اُن کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر

ہے، برابر ہے اُن پر کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، لَا یُؤْمِنُوْنَ: وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ: مہر کی دی اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر، قلوب قلب کی جمع ہے، خَتَمَ یَخْتِمُ: مہر لگا دینا۔ طَبَعَ یَطْبَعُ بھی مہر لگانے کے معنی میں آتا ہے جیسے طُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (سورۂ توبہ: ۸۷) تو ختم اور طبع کا مفہوم ایک ہی ہے، وَعَلٰی سَمْعِهِمْ: سَمْع کا لفظ قرآنِ کریم میں مفرد ہی استعمال ہوا ہے، جمع کے طور پر نہیں آیا، عرب کا محاورہ اسی طرح ہے، قلوب قلب کی جمع ہے، اور اَبصار بصر کی جمع ہے، لیکن سَمْع کا لفظ قرآنِ کریم میں ہر جگہ مفرد ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے اندر محاورہ اسی طرح تھا، ورنہ سمع کی جمع اَسماع بھی آسکتی تھی، ایسا کہیں نہیں ہوا، ''اُن کے دلوں پر مہر کر دی، اور اُن کے کانوں پر مہر کر دی'' وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ: غشاوۃ پردے کو کہتے ہیں، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ: اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: مِنَ النَّاسِ میں مِن تبعیضیہ ہے، مَنْ چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے یَقُوْلُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے، اور معنیٰ جمع ہے کیونکہ کوئی ایک متعین فرد اِس سے مراد نہیں ہے، جو بھی ایسا ہوگا وہ اِس کا مصداق ہے، اور واقعہ کے اعتبار سے وہ متعدد افراد تھے، بہت سارے لوگ تھے، اس لیے یہ معنیٰ جمع ہے، یہی وجہ ہے کہ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ کے اندر جمع کی ضمیر لوٹا دی گئی، تو لفظوں کی رعایت رکھتے ہوئے مفرد کی ضمیر اور معنیٰ کی رعایت رکھتے ہوئے جمع کی ضمیر لوٹ جاتی ہے، یہاں دونوں باتیں ہی آپ کے سامنے آر ہیں، ہم نے چونکہ ترجمہ کرنا ہے تو ترجمے میں جمع کا صیغہ استعمال کریں گے تاکہ آنے والی ضمیروں کے ساتھ اِس کی مطابقت رہے، ''لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں''، اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: ہم اللہ پر ایمان لے آئے، وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اور پچھلے دن پر ایمان لے آئے، یعنی قیامت کے دن پر، وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ: اور وہ ایمان لانے والے نہیں۔ مَا نفی کے لئے ہے، اور خبر کے اوپر جو باء زائدہ آگئی اس سے مزید تاکید پیدا ہوگئی، اس لیے اگر اِس مفہوم کو یوں ادا کریں کہ وہ بالکل ایمان لانے والے نہیں، تو یہ بالکل صحیح مفہوم ہے، کیونکہ بالکل کا لفظ اردو میں بطورِ تاکید کے آجایا کرتا ہے، ''وہ ہرگز ایمان لانے والے نہیں، وہ بالکل ایمان لانے والے نہیں'' یہ اِن لفظوں کا صحیح مفہوم ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: خَادَعَ مُخَادَعَةً وَ خِدَاعًا... قَاتَلَ مُقَاتَلَةً وَ قِتَالًا، دونوں طرح سے مصدر آتا ہے، باب مفاعلہ اصل کے اعتبار سے تو مشارکت کو چاہتا ہے قَاتَلَ مُقَاتَلَةً: آپس میں لڑنا، جَادَلَ مُجَادَلَةً: آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرنا، كَالَمَ مُكَالَمَةً: آپس میں گفتگو کرنا، تو یہ مشارکت کے لئے ہوتا ہے، لیکن کہیں کہیں اِس کو مشارکت سے خالی کر لیا جاتا ہے، اور یہاں یہ مشارکت سے خالی ہے، کیونکہ اگر مشارکت کے طور پر ہو تو پھر معنی یوں ہوگا کہ اللہ اور کافر یہ آپس میں ایک دوسرے سے چالبازی کرتے ہیں، اور یہ مفہوم صحیح نہیں، تو اِس کا ترجمہ کریں گے کہ ''یہ لوگ دھوکا بازی کرتے ہیں، چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو ایمان لے آئے۔'' وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ: اور یہ چالبازی نہیں کرتے مگر اپنے آپ سے، دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو۔ وَمَا یَشْعُرُوْنَ: اور وہ جانتے نہیں، اُنہیں شعور نہیں۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: اُن کے دلوں میں بیماری ہے، فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا، مَرَضًا تمیز ہے، زیادہ کر دیا اُن کو اللہ نے ازروئے بیماری کے، لفظی ترجمہ اس طرح ہوگا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ تمیز کبھی محول عن الفاعل ہوتی ہے اور کبھی محول عن المفعول ہوتی ہے، جیسے: طَابَ زَیْدٌ نَفْسًا: زید خوش ہو گیا ازروئے دل کے، اس کا مفہوم ہے طَابَ نَفْسُ زَیْدٍ: زید کا دل خوش ہو گیا، یہ تمیز محول عن الفاعل ہے تو یہ فاعل والا مفہوم ادا کرے گی۔ اور یہاں تمیز محول

عن المفعول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ زَادَ مَرَضُهُمْ: اللہ نے اُن کی بیماری بڑھا دی۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے، بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ: بسبب اُن کے جھوٹ بولنے کے، كَذَبَ يَكْذِبُ: جھوٹ بولنا۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ: اور جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، قَالُوْٓا: وہ کہتے ہیں، اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ: اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے، سوائے اس کے نہیں کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں، عام طور پر ترجمہ کرتے ہوئے آپ یہ لفظ بولا کرتے ہیں ''سوائے اس کے نہیں کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں'' لفظوں کے تحت ترجمہ بالکل صحیح ہے، لیکن آج کل کے محاورے میں سہل اردو میں جس وقت آپ اس کو ادا کریں گے تو یوں ہوگا ''ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہی ہیں، ہم تو مصلح ہی ہیں''، مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر مصلح ہونے کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں پائی جاتی، ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں، آسان اردو میں اِس کو اس طرح ادا کریں گے۔ اَلَآ: یہ کلمہ تنبیہ کے لئے ہوتا ہے، خبردار! اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ: اِس کلام میں بھی تاکید ہے، بیشک یہی لوگ فسادی ہیں، یہی لوگ فساد مچانے والے ہیں، یا دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مفسد ہی ہیں، اِس میں حصر ہے کہ یہ مصلح بالکل نہیں ہیں، یعنی ضمیر کے ساتھ تاکید لانے کا مطلب یہ بنے گا کہ یہی لوگ فسادی ہیں، یعنی یہ جو کہتے ہیں کہ ہم مصلح ہیں، یہ مصلح نہیں بلکہ یہ لوگ فسادی ہیں، وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ: لیکن اُنہیں شعور نہیں، وہ سمجھتے نہیں۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا: اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ، كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ: جس طرح سے کہ لوگ ایمان لائے، النَّاسُ کا مصداق یہاں مخلص صحابہ ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے مخلص ساتھی، ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ، جس طرح سے لوگ ایمان لائے ہیں''، قَالُوْٓا: یہ کہتے ہیں، اِذَا قِيْلَ لَهُمْ، قَالُوْٓا، جب اُنہیں کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں، اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ: سفہاء سفیہ کی جمع ہے، قرآنِ کریم میں سَفِهَ کا لفظ بھی آیا ہوا ہے، بے عقل ہونا، نادان ہونا، خفیف العقل ہونا، سفیہ کہتے ہیں خفیف العقل کو، جس کے لئے بے وقوف کا لفظ بھی آپ استعمال کر لیتے ہیں، بے وقوف: جس کو وقوف نہ ہو، جو کسی چیز پر مطلع نہیں ہوتا، جس کو کوئی سمجھ نہیں ہے، اس کو بے وقوف کہہ دیا جاتا ہے، وقوف کی نفی ہوگئی کہ اِس شخص کو کوئی وقوف حاصل نہیں، یہ کسی چیز سے واقف نہیں ہے۔ تو لاعلم، جاہل، جو کسی چیز پر اطلاع نہیں رکھتا، اُس کو کسی چیز کا پتہ نہیں، اس کو بے وقوف سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، بے عقل کے معنی میں ہوتا ہے، ''کیا ہم ایمان لے آئیں جس طرح سے یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ جس طرح سے یہ نادان لوگ ایمان لائے ہیں؟'' اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ: خبردار! بیشک یہی لوگ نادان ہیں، وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ: لیکن یہ جانتے نہیں۔ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: لَقِيَ يَلْقٰى: ملاقات کرنا، لَقُوْا، اصل میں لَقِيُوْا تھا، جس وقت یہ لوگ ملتے ہیں اُن لوگوں کو جو ایمان لے آئے، قَالُوْٓا اٰمَنَّا: کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ: خَلَوْا یہ خلوت سے لیا گیا ہے، تنہائی میں چلے جانا، خلوت میں چلے جانا، جس وقت وہ خلوت میں چلے جاتے ہیں اپنے شیاطین کی طرف، شیاطین جمع شیطان کی، قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ: کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں، اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ: سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو استہزا کرنے والے ہیں، یہاں بھی (اِنَّمَا) اسی طرح سے ہے، ہم تو استہزا کرنے والے ہی ہیں، ہم تو صرف استہزاء کرنے والے ہیں، اس سے ہماری زبان میں وہ حصر والا معنی نمایاں ہو جاتا ہے جو عربی کے اندر لفظ اِنَّمَا کا معنی ہے، ہم تو صرف ٹھٹھا کرنے والے ہیں، دل لگی ہنسی مذاق کرنے والے ہیں، اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ: اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ استہزا کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اِن کے استہزا کا

انہیں بدلہ دے گا، اللہ تعالیٰ اِن کے ساتھ ہنسی کرتا ہے، وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ: اور اِن کو ترقی دیتا ہے ان کی سرکشی میں، مَدَّ يَمُدُّ: کھینچنا، یہاں ترقی دینا مقصود ہے، ترقی دیتا ہے انہیں ان کی سرکشی میں، يَعْمَهُونَ: یہ لفظ عَمِهَ سے لیا گیا ہے، جس طرح سے عَمِیَ آنکھوں سے بے بصر ہونے کو کہتے ہیں، اسی طرح عَمِهَ دل کے بے بصیرت ہونے کو کہتے ہیں، دل کے اندر بصیرت نہ رہے اور سمجھ نہ رہے تو اُس کے لئے عمہ کا لفظ بولا جاتا ہے، جس طرح سے آنکھوں کے اندر اگر نور نہ رہے تو اس کے لئے عمی کا لفظ بولا جاتا ہے، اس لیے يَعْمَهُونَ کا یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے جیسے کہ حضرت شیخ (الہند رحمہ اللہ) نے کیا کہ ''وہ عقل کے اندھے ہیں''، اور اگر یوں ادا کریں کہ ''بھٹکتے پھرتے ہیں'' تو یہ مفہوم بھی صحیح ہے، کیونکہ بھٹکنا پھرنا تبھی ہوتا ہے جب دل کے اندر کسی قسم کی بصیرت نہ ہو اور انسان کسی صحیح راستے کو اختیار نہ کرے، ''ترقی دیتا ہے اُنہیں اللہ تعالیٰ اُن کی سرکشی میں اس حال میں کہ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ عقل کے اندھے ہیں، بے سمجھ ہیں، اُن کے دل کے اندر بصیرت نہیں ہے''، أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ: اِشتراء: خریدنا، جس طرح سے آپ بیع وشراء کا لفظ بولتے رہتے ہیں، الضَّلَالَةَ: گمراہی، بِالْهُدَىٰ: ہدایت کے بدلے، ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے خرید اگمراہی کو ہدایت کے بدلے'' یہاں معروف خرید وفروخت مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں یہ ہے کہ ایک چیز چھوڑ دی اور دوسری چیز لے لی، ہدایت اور ضلالت میں سے انہوں نے ہدایت کو چھوڑ دیا اور ضلالت کو لے لیا، اس لیے یہ اختیار کرنے کے معنی میں ہے، ''ہدایت کو چھوڑ کر اِن لوگوں نے گمراہی کو اختیار کیا''، فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ: رَبِحَتْ کا لفظ رِبْح سے لیا گیا ہے، ربح نفع کو کہتے ہیں، ان کی تجارت نے نفع نہ پایا، وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ: اِهتداء: سیدھا راستہ پانا، اور یہاں مہتدین فی التجارۃ مراد ہے، ''اور یہ لوگ سیدھی راہ پانے والے نہیں'' یعنی اِن کو تجارت کے اندر سیدھی راہ نہیں ملی کہ ایسی تجارت کرتے جس میں نفع ہوتا، بلکہ اِنہوں نے غلطی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کر لیا جس میں خسارہ ہے، اِنہوں نے نفع نہیں پایا، اسی لیے ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال فرمایا کہ اِن لوگوں کو تجارت کرنے کا ڈھنگ نہیں آیا، یا، اِن کو تجارت کرنے کی سیدھی راہ نہیں ملی، سیدھی راہ یہ ہوتی ہے کہ انسان ایسی تجارت کرے جس میں نفع پائے، لیکن اِنہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں خسارہ اٹھایا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضامین

سورۂ بقرہ کی ابتداء سے الْمُفْلِحُونَ تک پانچ آیتیں ہیں، ان میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چشمۂ ہدایت کی نشاندہی فرما کر مہتدین متقین کا حال بیان کیا، کہ جو اس چشمہ ہدایت سے سیراب ہوتے ہیں اور اس کتاب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں وہی متقی ہیں اور وہی مفلح ہیں، اُن کے عقائد اور اُن کے اعمال کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا کہ متقین کا یہ حال ہوتا ہے يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ، اور اُن کے اعمال یہ ہیں يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ، وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ، اور انجام کے اعتبار سے أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ فرمایا کہ یہی لوگ فلاح

پانے والے ہیں، تو پہلے متقین مُفلحین کا ذکر ہوا۔ پھر دوسرے نمبر پر اِن کے مقابل وہ لوگ آ گئے جنہوں نے اِس ہدایت کو قبول نہیں کیا، جب وہ ہدایت کو قبول نہیں کریں گے تو نہ وہ متقی بن سکتے ہیں نہ مفلح رہ سکتے ہیں، بلکہ وہ مؤمن کہلانے کے بھی حقدار نہیں، یہ لوگ پھر آگے دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے، بعض اِن میں سے وہ تھے جنہوں نے دل سے بھی قبول نہیں کیا اور اُوپر سے بھی انکاری رہے، جن کو شریعت کے عرف میں کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے دل سے تو قبول نہیں کیا لیکن اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے زبانی طور پر اقرار کر لیا اور ظاہری طور پر وہ مؤمنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے، جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے، غیر مؤمن ہونے میں یہ دونوں شریک ہیں۔

اللہ کے ہاں طبقات صرف دو ہیں، باقی تقسیمات انسانوں کی خود ساختہ ہیں

اس لیے اصل کے اعتبار سے تو طبقے دو ہی بنے، کہ بعض مؤمن اور بعض کافر، انسانوں کی یہ تقسیم شریعت کی نظر میں ثنائی ہے، شریعت جن طبقات کا اعتبار کرتی ہے وہ طبقے دو ہی ہیں، ایک مؤمنوں کا اور دوسرا کافروں کا، اور جتنے احکام دیے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے اِسی طرح سے دو طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، باقی دنیا کے اندر جو تقسیمیں ہیں، جیسے وطنیت کے اعتبار سے تقسیم ہے کہ کوئی ہندوستانی ہے کوئی پاکستانی ہے، کوئی افریقی ہے کوئی امریکی ہے، یا قبیلوں اور قوموں کے اعتبار سے تقسیمیں ہیں، یا رنگت کے اعتبار سے تقسیم ہے کہ کوئی گورا ہے کوئی کالا ہے، یا زبانوں کے اعتبار سے تقسیم ہے کہ کوئی سندھی ہے کوئی پنجابی ہے، یہ تقسیمیں جتنی بھی ہیں یہ ساری انسانوں کی خود ساختہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں اِن تقسیموں کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے اللہ کے دین میں سب کا درجہ برابر ہے، کوئی افریقی ہو کوئی امریکی ہو، کوئی گورا ہو کوئی کالا ہو، کوئی ہندی ہو کوئی سندھی ہو، کوئی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کے سب انسان برابر ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر طبقات ہیں تو وہ دو ہی ہیں۔ سورۂ تغابن میں اِسی کو واضح فرمایا ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ یہاں بھی اِسی تقسیم کی طرف اشارہ کیا، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مؤمن ہیں، بس یہ دو طبقے ہیں جن کا شریعت اعتبار کرتی ہے، باقی دنیا کے اندر جتنے بھی طبقات ہیں شریعت کی نظر میں اِن کا کوئی اعتبار نہیں، اور احکامِ شریعت کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب برابر ہیں، جو ایمان اور تقویٰ اختیار کرے گا وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے، اور جو کفر فسق اور نفاق اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہے، اِس کے علاوہ شریعت نے کسی دوسرے طبقے کا اعتبار نہیں کیا، سب انسانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے، یہ تقسیمیں جو دنیا کے اندر لوگوں نے کر رکھی ہیں یہ سراسر فساد کا ذریعہ ہیں، شریعت کے ہاں ان تقسیموں کا کوئی اعتبار نہیں۔

تو جو لوگ کافر ہو گئے اُن میں پھر دو درجے نکال لیے، بعض ایسے ہیں جو زبان سے بھی انکار کرتے رہے، اور بعض نے مصلحتاً زبان سے اقرار کیا، تو مفلحون کے بعد دو آیتوں میں تو اُن کا ذکر ہے جو دل سے بھی منکر تھے اور زبان سے بھی منکر تھے جن کو کافر کہا جاتا ہے، اور اِس کے بعد تیرہ آیتوں میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے دل سے تو تسلیم نہیں کیا لیکن زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہہ کر مؤمنوں کی فہرست میں شمار ہونا چاہتے تھے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِن آیات میں اُن کی قباحتوں کو بیان کر کے واضح

کردیا کہ عند اللہ یہ بھی کافر ہیں، اور اِس قسم کے ظاہری رسمی ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، یہ ہے مفہوم اِن آیات کا جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں۔

لفظِ ''کُفر'' کا لغوی اور اِصطلاحی معنیٰ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: کَفَرُوْا یہ لفظ کُفر سے لیا گیا ہے، کُفر کا لغوی معنیٰ چھپانا، اور یہ لفظ قرآن وحدیث میں دو معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، شکر کے مقابلے میں بھی آتا ہے، اور ایسے موقع پر اکثر اِس مصدر کو ''کُفران'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کُفرانِ نعمت، اور مادّہ وہی ہے، جب یہ لفظ شکر کے مقابلے میں آئے گا تو اِس کا مفہوم ہوگا ناشکری، ناقدری، اور چھپانے والا معنیٰ اِس میں بھی پایا جاتا ہے کہ منعم کے انعام کو اور محسن کے احسان کو چھپالیا اور اس کا کسی قسم کا اِظہار نہیں کیا، محسن کے احسان کا اظہار زبان سے بھی ہوتا ہے، عمل سے بھی ہوتا ہے، دلی جذبات کے تحت بھی ہوتا ہے، لیکن کوئی انسان اس طرح سے اُس کو چھپالے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ اس کے اُوپر کسی نے احسان کیا ہے یا نہیں کیا، اِس کو کفرانِ نعمت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو شکر کے مقابلے میں جب یہ لفظ آئے تو اِس کا ترجمہ ناشکری کے ساتھ کردیا جاتا ہے، ناقدری، ناشکری۔ اور کبھی یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں آتا ہے، جس وقت یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں آئے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اُن میں سے کسی ایک کا انکار کرنا۔ اور ایمان کی مختصر سی تعریف آپ کے سامنے ذکر کی تھی، کہ اللہ کی جانب سے اس کا رسول جو دین لے کر آئے بشرطیکہ وہ لانا قطعی طور پر ثابت ہو (جن کو ہم اپنی اصطلاح میں ضروریاتِ دین سے تعبیر کرتے ہیں) اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے جو بات لے کر آئے بشرطیکہ اس کا ثبوت اللہ کے رسول سے قطعی اور یقینی ہو، اس میں شک کی گنجائش نہ ہو، اُن باتوں کو تسلیم کرنا، ماننا، اور قبول کرلینا ایمان ہے، اور اُن قطعیات میں سے کسی چیز کا انکار کردینا کفر ہے، تو کفر کے لئے لفظ کفر ہی بولا جاتا ہے، ایمان کے مقابلے میں جب کُفر آئے گا تو اس کو ہم کفر کے لفظ کے ساتھ ہی تعبیر کریں گے، اِس کا متبادل کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے، ہم اپنی زبان میں اس کو بے ایمان کہہ دیں وہ ایک علیحدہ بات ہے، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اِس کو ایمان حاصل نہیں ہے، ورنہ عرفِ شریعت میں ایسے شخص کو ''کافر'' کے لفظ کے ساتھ ہی تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس کا یہ نظریہ ''کُفر'' کہلاتا ہے، کہ جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان باتوں میں سے کسی ایک کا انکار کردیا جائے۔

کن کافروں کے لئے ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے؟

یہاں جو کہا کہ ''وہ لوگ جو کافر ہوئے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانے والے نہیں''، اِس میں اصل مقصد تو سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دینا ہے، کہ آپ محنت کرتے ہیں، اور آپ نے اپنی تبلیغ میں اور کوشش میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن بعض لوگ اس طرح سے اُڑے ہوئے ہیں کہ کسی صورت میں مانتے نہیں ہیں، تو آپ فکر نہ کیجئے، یہ لوگ ہیں ہی اس قسم کے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِن کی استعداد ختم ہوچکی ہے، یہ ماننے والے ہیں ہی نہیں، آپ اس فکر میں رہیں ہی نہیں کہ یہ کیوں نہیں مانتے، بس آپ اپنی تبلیغ کرتے جائیے، اِن کے حق میں برابر ہے آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ باقی! آپ کا فرضِ منصبی ہے ڈرانا،

آپ ڈرائیں گے تو اِس ڈرانے پر آپ کو ثواب ملے گا، آپ کا یہ کام عبث اور ضائع نہیں ہے، آپ اپنے فرض کو ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائیں گے، لیکن ان سے یہ امید نہ رکھیے کہ یہ مان جائیں گے۔

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ نے جس وقت تبلیغ شروع فرمائی تو اُس وقت تو تقریباً سارا عالم ہی کفر کی گود میں تھا، اور آپ ﷺ کی تبلیغ سے بہت سارے لوگ متاثر ہو کر مسلمان بھی ہوتے گئے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک آپ ﷺ کے مدمقابل بعض لوگ اس قسم کے تھے جن پر آپ ﷺ کی محنت ہوئی اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے تبلیغ بھی کی، لیکن تبلیغ کے نتیجے میں یہ بات تو بالکل واضح ہوگئی کہ اِن کے سامنے کوئی حقیقت مخفی نہیں ہے، یہ سمجھتے تو ہر چیز کو ہیں، لیکن اپنی اغراض کے تحت اور اپنی دیگر مصالح سے اڑے ہوئے ہیں، کسی صورت میں مانتے نہیں، وہ لوگ معاشرے کے اندر ممتاز ہو جایا کرتے ہیں، اور اُس وقت کے لوگ اُن کو جانتے پہچانتے ہیں کہ یہ ضدی ہے کسی صورت میں ماننے والا نہیں، یہ ضدی ہے کسی صورت میں ماننے والا نہیں، تو جس ماحول کے اندر گفتگو ہوتی ہے وہاں الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا مصداق متعین لوگ ہیں، ساری دنیا کے کافر مراد نہیں ہیں، کہ جنہوں نے بھی کفر کر لیا وہ ایمان نہیں لائیں گے، یہ بات تو واقع کے خلاف ہے، آئے دن لوگ کفر چھوڑ چھوڑ کر ایمان کی طرف آتے تھے، تو پھر ہم کیسے کہیں کہ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا جو بھی ہوں گے ایمان نہیں لائیں گے، ایسی بات نہیں ہے۔ اس کو آپ اپنے اصطلاحی الفاظ میں ادا کریں تو یوں کہہ لیں کہ اس سے معہود لوگ مراد ہیں، عام لوگ مراد نہیں ہیں، یعنی ایسے لوگ جو اُس معاشرے میں ممتاز تھے، معلوم تھے، جن کے متعلق یہ یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کوئی حقیقت اِن سے مخفی نہیں، یہ ہر بات کو سمجھتے ہیں، لیکن ضد عناد اور بغض کی بناء پر مانتے نہیں، حضور ﷺ کو صبح شام رات دن فکر رہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ مان جائیں، اور جب امید لگی رہے اور وہ امید پوری نہ ہو تو آپ جانتے ہیں کہ تکلیف بھی زیادہ ہوا کرتی ہے، تو یہاں اللہ تعالیٰ اُن کی طرف سے امید کو منقطع کرتے ہیں تا کہ وہ فکر ختم ہو کر کچھ راحت ہو جائے، کہ آپ اپنا فرض ادا کرتے رہیے، اِس قسم کے لوگ جن کی ضد اور ہٹ دھرمی نمایاں ہو چکی ہے وہ مانیں گے نہیں، آپ کا فرض ہے کہ آپ اُن کو سمجھاتے رہیں، آپ اپنے عمل کے اُوپر ثواب پائیں گے، باقی اُن سے آپ امید کو منقطع کر دیجیے، وہ ایمان نہیں لائیں گے، کیوں؟ کہ ایمان لانے کی استعداد ان کے اندر ختم ہو چکی ہے، اور یہ واقعہ ہے، کوئی ایسی مخفی بات نہیں ہے، کہ ایک آدمی جان بوجھ کر کسی بات پہ اُڑ جائے اور یہ طے کر لے کہ میں نے فلاں کی بات نہیں ماننی اور مخالفت پر اُتر آئے، جس کو مخالفت برائے مخالفت کہتے ہیں، تو یہ مخالفت کرتے کرتے کرتے اتنا بُعد ہو جایا کرتا ہے کہ پھر یہ توقع ہی نہیں رہتی کہ کسی وقت اِن کا آپس میں اتفاق بھی ہو سکتا ہے، اتفاق کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، انسان اگر سمجھنا سوچنا چاہے تو اس کے قلب کے اندر استعداد ہے، لیکن اگر اس کے برعکس اپنے آپ کو دوسری طرف لے جائے تو آہستہ آہستہ قلب کی استعداد بھی ختم ہو جاتی ہے، آنکھ کے ساتھ دیکھ کر انسان متاثر نہیں ہوتا، کانوں کے ساتھ سن کر متاثر نہیں ہوتا، ضد اور عناد میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ اپنے مخالف کی کوئی اچھی بات اُس کو اچھی نظر نہیں آتی، اور ہر بُری بات کو وہ اخذ کرتا ہے، جس کی بناء پر اس کی نظر بُرائی پر رہتی ہے، اچھائی پر نہیں رہتی۔ تو یہی استعداد کا ختم ہو جانا، اِس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے لفظ ''ختم'' کے ساتھ تعبیر کیا، گویا کہ اُس کے اوپر مہر ہی ہوگئی۔

مُہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کی گئی؟

باقی! اللہ تعالیٰ نے اِس مہر لگانے کو منسوب اپنی طرف کیا کہ اللہ نے مہر لگادی، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کائنات کے اندر چاہے کوئی جوہر ہو، چاہے عرض ہو، خالق ہر چیز کا اللہ ہے، خالق کوئی دوسرا نہیں ہے، لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰہُ جواہر کا خالق بھی وہی ہے، اور اَعراض کا خالق بھی وہی ہے، یہ دو چیزیں جو آپ بیان کیا کرتے ہیں کہ ساری کائنات یا جوہر ہے یا عرض، اِن میں سے جو چیز بھی ہوگی اُس کا خالق اللہ ہے، اس لیے انسان کے اُوپر جتنی کیفیات طاری ہوتی ہیں یہ انسان کے اعراض ہیں، اِن کا خالق بھی اللہ ہے، اللہ تعالیٰ ہی ہر کیفیت کو پیدا کرتا ہے، اس لیے پیدا کرنے کے اعتبار سے نسبت اُس کی طرف ہے، باقی! وہ پیدا کن اسباب کی بناء پر ہوئی ہے؟ اُس کی نشاندہی قرآنِ کریم میں جگہ بجگہ کردی گئی، کہ جب آخرت کے مقابلے میں انسان دنیا کو ترجیح دیتا ہے اور ارادہ کرلیتا ہے کہ میں نے حق کو نہیں ماننا، تو آہستہ آہستہ بُعد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، جس کی بناء پر یہ استعداد ختم ہوجاتی ہے، تو ختم کا سبب انسان کی اپنی ضد عناد اور ہٹ دھرمی ہے، لیکن جو کیفیت پیدا ہوگئی تو کہیں گے اُس کو یہی کہ یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ کیونکہ کوئی بھی کیفیت اور کوئی بھی چیز اس عالم کے اندر وجود میں آئے گی تو وہ آئے گی اللہ کے پیدا کرنے کے ساتھ ہی، لیکن انسان کے عمل اور کسب کا اُس میں ابتدائی طور پر دخل ہوتا ہے، اور اُسی عمل اور کسب کی بناء پر انسان کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، ورنہ کیفیت جو بھی آئے گے وہ آئے گی اللہ کی جانب سے ہی۔ مثلاً آپ ایک آدمی کو زہر دے دیتے ہیں اور اس کے اُوپر موت واقع ہوجاتی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ موت دینے والا تو اللہ ہی ہے، اُس کے وجود میں موت کو اللہ نے ہی پیدا کیا ہے، موت اللہ نے ہی طاری کی ہے، لیکن اُس کا سبب اور ذریعہ چونکہ آپ کا زہر کھلانا ہے اِس لیے نسبت آپ کی طرف ہوجائے گی، اسی طرح اُن کی جو استعداد ختم ہوئی وہ ختم تو ہوئی اُن کی ضد عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر، لیکن یہ کیفیت جو پیدا ہوگئی کہ اب اُن میں سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے، اِس کیفیت کا بھی خالق اللہ ہے، اِس اعتبار سے اس قسم کی باتوں کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی طرف فرمالیتے ہیں۔

دِل اور کان کے لئے ''مُہر'' کا لفظ اور آنکھ کے لئے ''پردے'' کا لفظ کیوں؟

مُہر کی نسبت دو چیزوں کی طرف کی گئی ہے، قلوب اور سمع کی طرف، اور آنکھوں کے اُوپر پردے کا ذکر کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ دل کے سوچنے کی ایک جہت متعین نہیں ہے، کہ یہ صرف سامنے کی بات کو سوچ سکتا ہو، پیچھے کی بات کو نہ سوچ سکتا ہو، دائیں طرف نہ سوچ سکتا ہو، بائیں طرف نہ سوچ سکتا ہو، تو اس کے سوچنے کی کوئی جہت متعین نہیں، اسی طرح سے کان کے سننے کی کوئی جہت متعین نہیں ہے، کوئی آگے گفتگو کرے تو بھی یہ سنتا ہے، دائیں کرے، بائیں کرے، پیچھے کرے، ہر طرف سے گفتگو کان کے اندر آجاتی ہے، اس لیے یہاں تو مہر کا ذکر کیا کہ ایسے ہے جیسے بالکل ہی بند کردیے، کہ کسی طرف سے بھی اِن میں کوئی بات داخل نہیں ہوسکتی، قلب پر مہر کردی کہ اب کوئی نیک بات اور کوئی اچھا جذبہ اِن کے دل میں نہیں آسکتا، اور جو کفر اندر بھرا ہوا ہے وہ نکل نہیں سکتا، اِسی طرح کانوں پر مہر کردی کہ بالکل بند لگادیا، اب یہ کوئی حق بات ایسے طور پر سن نہیں سکتے کہ اس کو قبول کرلیں۔ لیکن آنکھ

کے دیکھنے کے لئے ایک جہت متعین ہے کہ یہ صرف سامنے دیکھ سکتی ہے، اور آگے پردہ ڈال دیا جائے تو آنکھ نہیں دیکھ سکتی، اس لیے یہاں غِشَاوَةٌ کے ساتھ ذکر کردیا کہ ان کی آنکھوں کے اُوپر پردہ ہے۔

بُرائی کرتے کرتے نیکی کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے

وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ: اوران کے لئے بڑا عذاب ہوگا، یعنی دنیا کے اندر تو ان پر یہ اثر پڑا کہ نیکی کی صلاحیت ختم ہوگئی، یہ دنیا کی ایک سزا ہے، جیسے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ اِنَّ مِنۡ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ بَعۡدَهَا وَاِنَّ مِنۡ جَزَاءِ الۡحَسَنَةِ الۡحَسَنَةَ بَعۡدَهَا (دیکھیے ابن کثیر) یہ ایک ضابطہ ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے اندر اگر آپ کوئی بُرائی اختیار کرتے ہیں تو وہ کسی دوسری بُرائی کے اختیار کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، حتیٰ کہ وہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، اتنا چلتا رہتا ہے کہ پھر بُرائی قلب کے اُوپر غالب آجاتی ہے، اور قلب کے اُوپر غالب آجانے کے ساتھ نیکی کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ جیسے حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان ایک گناہ کرتا ہے تو دل کے اُوپر ایک سیاہ داغ نمایاں ہوجاتا ہے، اگر توبہ کرلے تو دل صاف ہوجاتا ہے، اور اگر وہ اُسی طرح بُرائی کرتا رہے تو سیاہی پھیلتی رہتی ہے، حتیٰ کہ اُس کے قلب کے اُوپر غالب آجاتی ہے، اور سیاہی جس وقت قلب کے اُوپر غالب آجاتی ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہی وہ رَین یا ران ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا بَلۡ سکتہ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ:[1] جو یہ کسب کرتے ہیں وہ ان کے دلوں کے اُوپر بطور زنگ کے جم گیا، ان کے دل زنگ آلود ہوگئے، کہ جو کرتے ہیں وہ بطور زنگ کے اُن کے دلوں کے اُوپر لگتا جاتا ہے، جب یہ زنگ غالب آجاتا ہے اور سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے تو پھر نیکی کی توفیق بالکل ہی ختم ہوجاتی ہے، پھر انسان کے توبہ کرنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔ تو یہ دنیا کے اندر بُرائی کی ایک سزا ملتی ہے کہ ایک بُرائی دوسری بُرائی کو جنم دیتی ہے، جب انسان ایک بُرائی اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے دوسری بُرائی آسان ہوگئی، پھر اگلی آسان ہوگئی، اس طرح سے بُرے راستے پر چلا تو چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اِنَّ مِنۡ جَزَاءِ الۡحَسَنَةِ الۡحَسَنَةَ بَعۡدَهَا کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم نیکی کروگے تو ایک نیکی کے ساتھ دوسری نیکی کی توفیق ہوگی، اِس طرح سے نیکیوں کا سلسلہ چلتا چلا جائے گا، تو قلب میں اتنی صلاحیت نمایاں ہوجائے گی کہ پھر گناہ کی طرف طبیعت متوجہ ہی نہیں ہوگی۔ تو یہاں بھی اِسی طرح سے ہے کہ کفر کرتے کرتے اُن کے قلب بالکل سیاہ ہوگئے، اب اُن کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں رہی نیکی کو قبول کرنے کی۔ تو دنیا کے اندر تو سزا یہ ہوئی کہ صلاحیت ختم ہوگئی، اب یہ نیکی اختیار نہیں کرسکتے، اور آخرت میں وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ: اِن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ تو متقین مفلحون کے لئے جس طرح ذکر کیا گیا تھا کہ وہ کامیاب ہوں گے اور اپنی مراد کو پہنچیں گے، یہاں کفار کا انجام ذکر کردیا گیا کہ اِن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

لفظِ ''اِنذار'' کی تحقیق

ایک لفظ درمیان میں آیا ہے ''اِنذار'' کا، اَنۡذَرَ اِنۡذَار باب افعال سے ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی ''نذیر'' کا لفظ

(۱) مشکوۃ ۱/ ۲۰۴، باب الاستغفار۔ فصل ثانی۔ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ/ ترمذی ۱۷۱/۲، ابواب التفسیر۔ سورۃ مطففین

استعمال ہوتا ہے، جس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے ڈرانا، لیکن یہ عام ڈرانے کی طرح نہیں ہوتا۔ ڈرانا دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جیسے چور اور ڈاکو کسی آدمی کو دھمکاتے ہیں، ڈراتے ہیں، اور اس سے کوئی چیز چھیننے کی کوشش کرتے ہیں، ڈرا دھمکا کے یہ کام کرالیا، لیکن نذیر کا مفہوم یہ نہیں، بلکہ نذیر کا مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو محبت اور شفقت کی بناء پر بُرے انجام سے آگاہ کرے، کہ جن کاموں میں تو لگا ہوا ہے اگر ان کے اندر تو لگا رہا تو کسی ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا، اس کے اندر محبت اور شفقت کا پہلو غالب ہوتا ہے، اور بُرے انجام سے ڈرایا جاتا ہے، اور یہ ڈرانا انبیاء علیہم السلام کی صفت ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام کی صفت کے طور پر لفظِ نذیر ذکر کیا گیا ہے۔ بشیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی خبر سنائی جائے جس سے قلب کے اُوپر سرور آجائے، اور نذیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو برے انجام سے ڈرایا جائے اور یہ ڈرانا محبت اور شفقت کی بناء پر ہوتا ہے۔ تو عربی کے اندر انذار کا لفظ اِسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ڈرانے کے دو مفہوم آتے ہیں، ایک ڈرانا ایسے ہے جیسے دشمن دشمن کو ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے، دھمکی دیتا ہے، اِنذار میں یہ مفہوم نہیں، بلکہ اِنذار میں ایسے ہے جس طرح سے والد اپنے بچے کو کسی بُری عادت چھڑانے کے لئے اُس کے انجام سے ڈراتا ہے، استاذ اپنے شاگرد کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر فلاں عادت نہیں چھوڑو گے تو اس کا نتیجہ غلط نکلے گا، ماں اپنے بچوں کو سمجھاتی ہے، تو محبت اور شفقت کے ساتھ بُرے انجام سے ڈرایا جائے اور اس کی بُری خصلتوں کو چھڑایا جائے، عربی کے اندر لفظِ اِنذار کا یہ مفہوم ہے، اور اِسی معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کو نذیر کہا جاتا ہے۔ یہاں کافروں کا ذکر ختم ہوا، آگے منافقین کا ذکر ہے، ان شاء اللہ! کل سہی۔

سوال:- جب کہہ دیا گیا کہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ: برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، تو پھر اِس کے بعد آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ کا فرض منصبی ہے تبلیغ کرنا، آپ اِن لوگوں کو تبلیغ کرتے رہیں، تو اِس میں تو قرآن پاک کی توہین ہے، یا، ایمان کی توہین ہے، کہ آپ اِن کے پیچھے پھر بھی لگے رہیں۔

جواب:- اصل میں باتیں دو ہیں، یہ نہیں کہا گیا کہ آپ کے حق میں برابر ہے، یہ کہا گیا ہے کہ اُن کے حق میں برابر ہے، آپ ﷺ کا تو فرض منصبی ہے، اور جو شخص بھی اپنا فرض منصبی ادا کرے گا اللہ تعالیٰ کے ہاں جزاء پائے گا، دوسرا کوئی متاثر ہو یا نہ ہو، یعنی اِس میں مبلغ کے لئے بھی ایک بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بطور نصیحت کے آگئی، کہ مبلغ کو اِس بات پر نظر نہیں رکھنی چاہیے کہ کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا، اُس کا فرض ہے کہ حق کی منادی کرتا رہے، اور حق کا وعظ ہر کسی کے کان تک پہنچاتا رہے، آگے کوئی مانے یا نہ مانے اس سے بحث نہیں ہے۔

سوال:- جب وہ لوگ یہ کلام سنتے ہوں گے اور وہ سمجھتے بھی ہیں، پھر وہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں برابر ہے، پھر ہمیں تبلیغ کرنے کا کیا مقصد؟

جواب:- دیکھو! میں ایک بات آپ کی خدمت میں عرض کروں، قرآنِ کریم کی یہ آیت قرآنِ کریم میں پڑھی گئی اور اُن لوگوں کے سامنے پڑھی گئی جو اِس کے مخاطب ہیں، لیکن کسی تاریخ میں جھوٹی سے جھوٹی روایت بھی نہیں ہے کہ کافروں نے یہ کہا

ہو کہ جب اللہ نے کہہ دیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر ہمارا کیا قصور؟، ورنہ جن کے متعلق یہ بات کہی جارہی ہے سب سے پہلے تو یہ اعتراض اُن کی طرف سے ہونا چاہیے تھا، اُن میں سے تو کسی نے اپنی زبان سے نہیں کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ یہ نہیں مانیں گے، تو اس لیے ہم معذور ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ اشارہ ہماری جانب ہی ہے کہ ہم مانیں گے نہیں، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہم نے ماننا نہیں، اور پھر وہ اپنے دل دماغ میں یہ بھی جانتے تھے کہ ہم جو نہیں مانتے تو فلاں غرض کی وجہ سے نہیں مانتے، فلاں ضد کی وجہ سے نہیں مانتے، ضدی آدمی اپنے حال کو تو جانتا ہے۔ اگر یہاں حقیقت یہ ہوتی کہ وہ لوگ بھی اپنے آپ کو مجبور پاتے کہ ہم نہیں مانیں گے اور نہ ماننے پر مجبور ہیں، تو وہ یقیناً اپنی اس مجبوری کو واضح کردیتے۔ ضد کے اندر آپ انتہا کو پہنچ جائیں، لیکن پھر بھی اگر آپ خالی الذہن ہو کر سوچیں گے تو ایسا ہوسکتا ہے کہ اگر آپ باز آنا چاہیں تو آسکتے ہیں، لیکن بسا اوقات اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ واقع کے اعتبار سے آپ واپس آتے نہیں ہیں، دوسرا آدمی کہتا ہے کہ اب اِس درجے پر پہنچ گئے کہ اب اِن سے ماننے کی امید نہ رکھو۔ اگر ایسی بات ہوتی کہ وہ لوگ سمجھتے کہ اب ہمارے دلوں میں تالے لگ گئے اور اب ہم بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے، تو یہ اعتراض سب سے پہلے اُن کی جانب سے ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ اُس زمانے کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے، جھوٹ موٹ کے طور پر بھی آپ کو کسی کافر کی طرف سے یہ اعتراض نہیں ملے گا کہ جب قرآن کہتا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، تو ٹھیک ہے پھر ہم ایمان نہیں لاتے۔ اس لیے اِس کا صحیح مفہوم وہی ہوگا جو اس اعتراض سے بالاتر ہے، اور جو اِس کے مخاطب تھے وہ اپنے آپ کو سمجھتے بھی تھے کہ یہ چوٹ ہم پر لگائی جارہی ہے، اور ہمیں کہا جارہا ہے کہ اِن کے دلوں کانوں اور آنکھوں کی صلاحیت ختم ہوگئی، تو مخاطب یہ بات سمجھتے تھے، لیکن اُن کے سامنے اپنا حال بھی تھا کہ جو کچھ ہم کیے بیٹھے ہیں اپنے اختیار سے کیے بیٹھے ہیں، جب اپنے اختیار سے کیے بیٹھے ہیں تو کسی دوسرے پر کیا الزام ہے۔ کیونکہ اِس کا مصداق کافروں کے لیڈر ہیں، اور جس وقت لیڈر کو زیادہ سے زیادہ تفہیم کی جائے اور اُس کو اچھے سے اچھے دلائل سے متاثر کرنے کی کوشش کی جائے پھر بھی وہ متاثر نہ ہو، اور اُس کے اِس بغض اور عناد کو نمایاں کردیا جائے، تو اس کا پھر اثر یہ پڑتا ہے کہ جو لوگ اُس کے پیچھے لگنے والے ہوتے ہیں اکثر و بیشتر وہ ماننے لگ جاتے ہیں، یعنی اُن کی ضد نمایاں ہونے کے ساتھ اُس کے مقتدیوں میں سے کسی کے اندر اگر اچھی صلاحیت ہوتی ہے تو اُس کے سامنے آجاتا ہے کہ یار! ہمارا لیڈر خواہ مخواہ کی ضد کررہا ہے، ورنہ بات تو کوئی مخفی نہیں رہی۔ تو اُس میں ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے تاکہ دوسروں کے اوپر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے، اور اگر اُن کو خطاب کرکے ان کے بُرے کو اس کے گھر تک نہ پہنچایا جائے تو بسا اوقات پچھلے لوگ سمجھتے رہتے ہیں کہ شاید یہ صحیح کہہ رہے ہیں، لیکن جب گفتگو کرکے اُن کو انتہاء تک پہنچا دیا جاتا ہے تو اُن کے پیچھے لگنے والے اکثر و بیشتر اُن کی قیادت پر اعتماد چھوڑ دیتے ہیں، اور جس وقت قیادت پر اعتماد چھوٹتا ہے تو پھر وہ دوسری طرف سے متاثر ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں بہت ساری آیات اس قسم کی آئیں گی جن میں آج کل کے محاورے کے مطابق اُن کی قیادت پر جرح کرکے اور اُن کے قائدین کو مجروح کرکے قوم کو اُن سے علیحدہ کرنا مقصود ہے، کہ یہ قائدین تو اپنے اغراض کے تحت لگے ہوئے ہیں، اور اپنی غرض کے تحت اس قسم کا فساد کرتے ہیں، بدبختو! تم ان کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو، کل کو جہنم میں جب جاؤ گے اور اللہ کی گرفت میں آجاؤ گے تو پھر یہ قائدین تمہارے کچھ کام نہیں آئیں گے، قرآنِ کریم میں بہت ساری آیات ہیں جن میں یہ مفہوم

ذکر کیا گیا، وہاں اس کی وضاحت کروں گا، وہاں قائدین سے قوم کا اعتماد اٹھانا مقصود ہوتا ہے، تاکہ اِن ضدی لوگوں کو چھوڑ کر قوم حق بات کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور ان کا رعب اپنے سر سے اتار دے۔ یہ مقصد بہر صورت حاصل ہو سکتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

گزشتہ آیات سے ربط

کل کے سبق میں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ لے کر وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ تک، اِن آیات کا ترجمہ عرض کر دیا گیا تھا، اور یہ بات بھی آپ کے سامنے واضح کر دی گئی تھی کہ شروع سورت سے ابتدائی پانچ آیتوں میں متقین کا ذکر تھا، اُن کی صفات کا اور اُن کے انجام کا، اور اُس کے بعد دو آیتوں میں جو علی الاعلان کافر تھے اُن کا حال اور انجام ذکر کیا گیا تھا، اور آئندہ تیرہ آیات میں تیسرے گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو منافقین کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، یہ لفظ اگرچہ اِس رکوع میں استعمال نہیں ہوا لیکن جو اِن کا حال بیان کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے، اور قرآنِ کریم میں دوسری آیات میں یہ لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، اور ان کا حال بھی اسی کے ساتھ ملتا جلتا واضح کیا گیا ہے۔

منافق کون ہوتے ہیں؟

یہ تیسرا طبقہ ایسے لوگوں کا تھا جن کو آپ اپنی زبان میں صلح کلیے کہہ سکتے ہیں، جنہوں نے اپنے لیے یہ طرزِ عمل تجویز کیا کہ ہر کسی سے بنا کر رکھنی چاہیے، بگاڑنی نہیں چاہیے۔ اور یہ جو جذبہ ہے کہ ہر کسی سے بنا کر رکھی جائے، بگاڑی نہ جائے، خاص طور پر اُس وقت جبکہ حق اور باطل کی آپس میں جنگ ہو، یہ جذبہ دو وجہ سے پیدا ہوتا ہے، یا تو اِس کی بناء بزدلی پر ہوتی ہے یا اِس کا منشا لالچ حرص اور مفاد پرستی ہوتی ہے۔ دو گروہوں میں حق اور باطل کی ٹکر ہو گئی، دونوں حق پر نہیں ہو سکتے، ایک کو قبول کرنا ہے اور ایک کو چھوڑنا ہے، لیکن اِس کے لئے جرأت چاہیے کہ انسان حق بات کا ساتھ دے کر اہلِ باطل سے کہہ دے کہ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا تھا کہ جب تک تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لاؤ تو ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں، سورۂ ممتحنہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کا نمونہ اہلِ ایمان کے سامنے پیش کیا ہے، کہ جس طرح اُنہوں نے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا تو تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے اندر یہ اُسوہ ہے، کہ تم بھی جو اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے یا توحید کا اقرار نہیں کرتے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے اُن کے ساتھ کوئی محبت اور تعلق نہ رکھو۔ اب اگر اِس طرح سے کیا جاتا ہے تو لازماً ایک گروہ کے ساتھ محبت اور دوسرے کے ساتھ عداوت ہو جائے گی، ایک گروہ کے ساتھ تعلق ہو گا اور دوسرے سے دشمنی ہو جائے گی، تو یہ خطرات برداشت کرنا کچھ جرأت ہمت اور بہادری چاہتا ہے، تو جن کے دل میں بزدلی ہو اور وہ ہر شخص سے ڈرتے اور دبتے ہوں اُن میں یہ ہمت نہیں ہوا کرتی کہ کھل کر کہہ دیں کہ ہم فلاں گروہ کے ساتھ ہیں، فلاں گروہ کے ساتھ نہیں ہیں، اور جن کے ساتھ نہیں ہیں اُن کی دشمنی برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دل کی کمزوری اور بزدلی اِس اظہار کی نوبت نہیں آنے دیتی، جب یہ آئیں گے تو انہیں کہہ دیا جائے گا کہ بھئی! ہماری دوستی تمہارے ساتھ

ہے، فکر نہ کرو، اور دوسرا گروہ آئے گا تو اُن کو کہہ دیں گے کہ ہماری دوستی تمہارے ساتھ ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اِن کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں اور اُن کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں، یوں دوغلا پن اختیار کر لیتے ہیں بزدلی کی بناء پر۔ تو اس نفاق اور دوغلے پن کا مبنیٰ یا تو بزدلی اور جبن ہوتا ہے، اور یا مفاد پرستی، کہ دونوں گروہوں میں سے اگر ایک گروہ کے ساتھ مخالفت علی الاعلان کر لی تو ہمارا جو اِن سے مفاد متعلق ہے وہ ختم ہو جائے گا، تو ہم ایسی ہوشیاری کیوں نہ دکھائیں کہ یہ آئیں تو اِن کے سامنے ذکر کر دیں کہ ہم تمہارے ہیں، جو فائدہ اِن سے اٹھایا جا سکتا ہے ان سے اٹھالو، اور دوسرے آجائیں تو ہم اُن کے ساتھ بھی محبت کا اظہار کر دیں اور جو فائدہ اُن سے اٹھایا جا سکتا ہے اس کو بھی ضائع نہ جانے دو...! تو لالچ حرص اور مفاد پرستی بسا اوقات انسان کو دوغلے پن پر مجبور کرتی ہے، ورنہ جو شخص بہادر ہو اور اُس کے دل کے اندر حق پرستی ہو، مفاد پرستی نہ ہو، کبھی وہ دو فریقوں کے درمیان میں دوغلا پن نہیں اختیار کر سکتا، وہ علی الاعلان ظاہر کر دے گا کہ میں فلاں کے ساتھ ہوں اور فلاں کے ساتھ نہیں ہوں، چاہے اِس میں اُس کا مفاد تلف ہو جائے، اور چاہے اِس میں اُس کو خطرات سامنے آئیں، وہ جرأت کے ساتھ اِس بات کا اظہار کر دیتا ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کی زبانی منافق کی مثال

اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ نے منافق کے مثال دیتے ہوئے بیان فرمایا: مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ۔ شاۃ: بکری، اور عائرہ کہتے ہیں، معلوم نہیں آپ اپنی زبان میں کیا کہتے ہوں گے، بکری جس وقت بہار میں آجاتی ہے اور بکرے کی طالب ہوتی ہے، اس کی شہوت بھڑک اٹھتی ہے، اس کو کیا کہتے ہو؟ واری ہوئی بکری؟ جانور جس وقت ایک خاص کیفیت میں ہوتے ہیں، جب ان کو نر کی طلب ہوتی ہے، تو اس وقت بھاں بھاں کرتی ہے، دوڑی پھرتی ہے، اُس کی طبیعت میں بے چینی ہوتی ہے، اِس کیفیت کو کس لفظ سے ادا کیا کرتے ہو؟ ''بکری بول اٹھی، بھینس بول اٹھی'' یہ تو ایک عام لفظ ہے..... (طلبہ نے بتایا کہ واری ہوئی بکری کہتے ہیں)..... مَثَلُ المنافقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ منافق کی مثال تو واری ہوئی بکری کی طرح ہے، تَعِيْرُ إِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَإِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً[1] بکرے کی تلاش میں کبھی وہ اِس ریوڑ کی طرف دوڑ کر جاتی ہے، جب وہاں اُس کو بکرا نہیں ملتا تو دوڑتی ہوئی اِس ریوڑ کی طرف آتی ہے، یعنی اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جدھر بھی اُس کو کوئی موقع ملے کہ وہاں سے شہوت پوری ہو سکتی ہے وہ ادھر کو بھاگ کر جاتی ہے اور پوری بے چینی کے ساتھ۔ اور جس وقت کسی اُنثیٰ کی شہوت بھڑکی ہوئی ہو اور اُس شہوت کے پورا کرنے کے لئے اس میں بے چینی پیدا ہو جائے اس وقت وہ اپنی قوتِ فکریہ کھو دیتی ہے، پھر اُس کی طبیعت اِسی تلذذ کی طالب ہوتی ہے، چاہے اُس کو کسی کی گود میں بیٹھ کے یہ تلذذ ملے، وہ اس تلذذ کو چاہے گی، اور اُس کی قوتِ فکریہ جواب دے دیتی ہے۔ تو ایسے ہی شہوتی عورتوں کی طرح اور شہوتی انثیٰ کی طرح منافقوں کا حال ہے، کہ یہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے کبھی مؤمنوں کی گود میں گھستے ہیں، کبھی کافروں کی گود میں گھستے ہیں، اِن کو اپنے مفاد سے غرض ہے، اِن کو تلذذ حاصل ہونا چاہیے، اِن کا مزہ کرکرا نہ ہو، اس سے کوئی بحث نہیں کہ اِن کی یہ شہوت کافروں سے پوری ہوتی ہے تو وہاں سے پوری کر لیں گے، مؤمنوں سے پوری ہوتی ہے تو مؤمنوں سے پوری کر لیں

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۷۰، کتاب صفات المنافقین کا آخر. مشکوۃ ص ۱۷، باب الکبائر. فصل اول کا آخر. واللفظ للمشکوۃ. اس کے مفہوم کے لئے دیکھیں مرقاۃ

گے، یہ دوسرے کی گود میں بیٹھ کے عیاشی چاہتے ہیں، باقی ان کے اندر اتنی جرأت نہیں ہے کہ نروں کی طرح اور مردوں کی طرح علی الاعلان کہہ دیں کہ ہم فلاں کے دوست ہیں اور فلاں کے دشمن ہیں۔ یہ موقع محل کے مطابق اور بہت بہترین مثال ہے، اس سے اچھی مثال کسی مفاد پرست انسان کی نہیں دی جاسکتی جو سرورِ کائنات ﷺ نے بیان فرمائی۔

''نفاق'' کی تعریف اور اس کی اقسام

یہ تو وہ نفاق ہے جس کو حقیقی نفاق کہتے ہیں، اِبْطَانُ الْکُفْرِ وَاِظْهَارُ الْاِیْمَانِ کُفر کا چھپالینا اور ایمان کا ظاہر کرنا یہ نفاق حقیقی ہے، کہ اندر سے انسان کافر ہو اور ظاہراً اپنے آپ کو مؤمن کرے۔ اور ایک نفاق ہوتا ہے عرفی، جس کو ہم دوغلا پن سے تعبیر کرتے ہیں، چاہے وہ کُفر اور ایمان کی بات نہ ہو، لیکن اپنے دل کی حقیقت کسی کے سامنے ظاہر نہ کی جائے، اور ہر کسی کو یہ تاثر دیا جائے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں، حتیٰ کہ دو متصادم لوگ ہوتے ہیں، اور اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو واضح نہ کیا جائے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ اِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ اَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ ہوں گے، اِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں تو بھائی بنے ہوئے ہوں گے، وَاَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ لیکن در پردہ دشمن ہوں گے، یعنی اپنی دشمنی کو چھپائیں گے اور دوستی ظاہر کریں گے، ایک وقت ایسا آجائے گا کہ لوگ یہ عادت اختیار کرلیں گے کہ ظاہری طور پر تو بھائی بنے ہوئے ہیں لیکن در پردہ دشمن، عداوت کو مخفی کریں گے اور اُخوت کو ظاہر کریں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوگا، اِس کی وجہ کیا ہوگی کہ ظاہری طور پر بھائی بن کے رہیں اور اندر سے دشمن بن کے رہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذَالِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰی بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ[1] کہ چونکہ بعض کو بعض سے لالچ ہوگا، مطلب ہوگا، تو دل کی دشمنی مخفی کر کے بھی اپنے مطلب کو حاصل کرنے کے لئے وہ دوستی اور محبت کا اظہار کریں گے، اور بعضوں کو بعضوں سے خوف ہوگا، ڈریں گے کہ اگر ہم نے اپنے دل کی عداوت اِس کے سامنے ظاہر کردی کہ میں تیرے ساتھ نہیں ہوں تیرا دشمن ہوں تو اس سے کسی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تو خوف اور لالچ یہ دو باتیں ہیں جو انسان کو اِس کمزوری کے اندر مبتلا کرتی ہیں، کہ انسان اپنے دل کی بات ظاہر کر کے نہیں کہتا، بلکہ اپنے دل کی بات کو چھپاتا ہے، دل میں کچھ اور ہوتا ہے، ظاہر کچھ اور کرتا ہے۔ اور یہ اخلاق کے اندر ایک بنیادی کمزوری ہے، جب کسی انسان کے یہ جذبات ہوجائیں کہ اپنے مفاد کی خاطر وہ باطل کا ساتھ بھی دے سکتا ہے، اور نقصان کے ڈر سے وہ حق کو بھی چھوڑ سکتا ہے، اور اس کے عمل کا، کردار کا، ہر چیز کا مدار اپنے مفاد پر اور اپنی حفاظت پر ہے، ایسے وقت میں اُس کی کوئی اخلاقی قدر محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اِس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے اِس کی مذمت کی، اور منافقین کے ٹولے کو کافروں کے مقابلے میں بھی زیادہ خطرناک قرار دیا گیا ہے، اور زیادہ خطرناک ہونے کی وجہ یہی ہے کہ جو علی الاعلان دشمن ہوا کرتا ہے اس کا دفعیہ آسان ہے، اُس کے ضرر سے بچنا آسان ہے، لیکن اگر کوئی علی الاعلان دشمن نہ ہو، ظاہری طور پر تو محبت کا اظہار کر رہا ہو اور مخفی طور پر وہ دشمن ہو، تو جو نقصان یہ پہنچاتا ہے علی الاعلان دشمن اِس قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا، اسی کو اردو کے محاورے میں مارِ آستین کہتے ہیں، آستین کا سانپ، یعنی

---

(1) مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۲۰۵۵/ مشکوۃ ۲/ ۴۵۵، باب الریاء، فصل ثالث

ایسا سانپ جو انسان کی آستین میں چھپا ہوا ہے، اس قسم کے لوگ جو ظاہری طور پر دوست ہوں اور حقیقت کے اعتبار سے دشمن ہوں، اور اپنی کسی مفاد پرستی کے تحت یا بزدلی کی بناء پر اپنے اُن دلی جذبات کو چھپائے ہوئے ہوں، یہ مارِ آستین کہلاتے ہیں، اور ان سے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے علی الاعلان کافروں کا ذکر اگر دو آیتوں میں آیا تو ان کا ذکر آگے تیرہ آیتوں میں آ رہا ہے۔

منافقین بالکل مؤمن نہیں

پہلے تو اُس کا عنوان یہ قائم کیا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یوم آخر پر، وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ: اور وہ بالکل ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور یہ ''بالکل'' تاکید کے طور پر ترجمہ کیا جا رہا ہے، کیونکہ مَا کی خبر پر باء زائدہ آئی ہوئی ہے۔ تو ان کا یہ ایمان معتبر نہیں ہے، جیسے سورۂ منافقون کی ابتداء میں بھی یہی بات ذکر کی گئی اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ: یہ جو کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، یہ جھوٹ بول رہے ہیں، کیونکہ یہ دل سے نہیں کہہ رہے بلکہ اُوپر اُوپر سے محض آپ کو مطمئن کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے، کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور یومِ آخر پر ایمان لے آئے، اور یہ بالکل مؤمن نہیں۔

منافقین کی چالبازیاں

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: چالبازی کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور مؤمنوں کے ساتھ۔ اللہ کے ساتھ چالبازی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول سے چالبازی کرتے ہیں، اللہ کے نیک بندوں سے چالبازی کرتے ہیں، اصل کے اعتبار سے تو ان کی چالبازی مؤمنوں کے ساتھ تھی، کہ اِن کو دھوکا دینا چاہتے تھے، دھوکا دے کر اِن کے ضرر سے بچنا چاہتے تھے اور مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن اللہ کا رسول اور مؤمنین چونکہ حزبُ اللہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِن کا تعلق ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر چلنے والے ہیں، تو جو اِن کے ساتھ چالبازی کا ارادہ کرتا ہے یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی کرتا ہے۔ ورنہ منافقین جو کردار اَدا کر رہے تھے تو اُن کے دل میں بھی یہ نہیں تھا کہ ہم اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، لیکن اللہ کی جماعت کو دھوکا دینے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ کو دھوکا دینا۔

اللہ والوں سے اچھے تعلقات رکھنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی علامت ہے

اِس میں سے اس بات کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ انسان کا معاملہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہ اللہ کے ساتھ، اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ''[1] جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اُس کو اعلانِ جنگ ہے، کیا مطلب؟ کہ اُس کی عداوت میرے ساتھ ہے، وہ میرا دشمن اور میں اُس کا دشمن جس کی عداوت میرے ولی کے ساتھ ہے۔ اس لیے نیک لوگوں کے ساتھ جن کا ظاہر شریعت کے مطابق ہے، وہ اللہ اللہ کرنے والے ہیں، جن کو عرفِ عام میں ولی کہا جاتا ہے، اُن کی قدر و منزلت یہ پہچانی چاہیے کہ اُن کے متعلق اچھے جذبات کی اللہ کے ہاں قدر ہے، اور

(۱) بخاری ۲/ ۹۶۳، کتاب الرقاق، باب التواضع/ مشکوۃ ۱/ ۱۹۷، باب ذکر للہ، فصل اول.

اُن کے ساتھ محبت رکھنا اور اُن کے متعلق اچھے جذبات رکھنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی علامت ہے، اور اگر اُن کے ساتھ کسی قسم کے بُرے جذبات رکھے جائیں، دل کے اندر بغض ہو، عداوت ہو، یا اُن کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے یہ معاملہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رہا ہے۔ تو ولی کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عداوت قرار دیا۔ اسی طرح سے وہ چالبازی تو اللہ کے رسول سے کرتے تھے اور مؤمنین سے کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ چالبازی اللہ سے کرتے ہیں، تو اس کا بھی وہی معنی ہے کہ جو اللہ کے گروہ کے ساتھ خداع کرتا ہے، دھوکا بازی کرتا ہے، چالبازی کرتا ہے، تو اُس کی شدت بیان کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ چالبازی قرار دیا، کہ یہ اللہ کے رسول کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر رہے، مؤمنوں کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر رہے، بلکہ یوں سمجھو! کہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

منافق حقیقت میں اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ: یہ نہیں دھوکا دیتے مگر اپنی ہی جانوں کو، اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتے ہیں، کیا مطلب؟ کہ اِن کے اس خداع کا نقصان اِنہی کو پہنچے گا، اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ کی جماعت کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے اِن کے حالات کو اور ان کی کیفیات کو اپنے رسول تک پہنچا دے گا، اور وہ اِن کے ضرر سے بچنے کی تدبیر کرلیں گے، اس لیے اس نفاق کا اور دوغلے پن کا جو نقصان ہوگا اِنہی کو ہوگا۔ اور ویسے بھی آپ دیکھ لیا کریں، عرفِ عام میں بھی ایسے ہی ہے، کہ جو آدمی دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان میں دوغلا پالیسی اختیار کرتا ہے، دیر نہیں لگتی کہ وہ رسوا ہو جاتا ہے، بسا اوقات وہ دونوں فریق آپس میں متفق ہو جائیں گے، اور سب سے زیادہ ذلیل یہی شخص ہوا کرتا ہے، تب پتہ چلتا ہے کہ اس نے دوغلے پن کے ساتھ جو دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی سب سے زیادہ نقصان میں یہی رہا۔

منافقین کے احوال ذکر کرنے سے مقصود

اور قرآنِ کریم میں جو واقعات نقل کیے جایا کرتے ہیں یا کسی جماعت کے احوال ذکر کیے جایا کرتے ہیں تو محض قصہ گوئی اور واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا...... اِس نکتے کو ہمیشہ کے لئے اپنے ذہن میں رکھیے!...... واقعات جو بھی قرآنِ کریم میں ذکر کیے جائیں یا کسی گروہ کے احوال ذکر کیے جائیں تو وہاں صرف قصہ گوئی مقصود نہیں ہوتی، کہ ایک شخص کو سامنے رکھ کر اس کے حالات ذکر کردیے یا واقعہ ذکر کردیا، ایسا نہیں، بلکہ یہاں وہی بات ہوا کرتی ہے کہ:

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(مثنوی: حکایت ۲)

بات دوسروں کی سنائی ہے اور اُس میں سبق آپ کو پڑھانا ہے، کہ اس گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کریں اور اِس گروہ سے تعلق نہ رکھیں، جن کے یہ حالات اور کیفیات ہیں اِن سے بچنے کی کوشش کرو، اگر آپ اس قسم کے حالات اور کیفیات اختیار کریں گے تو آپ کا شمار بھی اسی گروہ میں ہو جائے گا۔ بس ایک واقعہ کے ضمن میں گویا کہ یہ نصیحت کردی جاتی ہے، کہ فلاں شخص نے

ایسا کیا تھا اُس کا یہ انجام نکلا، جس میں سننے والوں کو یہ کہنا مقصود ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، ورنہ تمہارا انجام بھی ایسے ہی ہوگا، اس لیے نیک لوگوں کے ساتھ جو چالبازی کی کوشش کرے یوں سمجھے کہ اس کی چالبازی اللہ تعالیٰ سے ہے، اور اُس کا نقصان اسی کو پہنچے گا۔ ''نہیں دھوکا دیتے وہ مگر اپنے ہی نفسوں کو'' وَمَا یَشْعُرُوْنَ: اور ان کو شعور نہیں، اور اُن کو سمجھ نہیں۔

منافقین کے دِلوں میں کون سی بیماری تھی؟

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: اُن کے دلوں میں بیماری ہے، بیماری کسے کہتے ہیں؟، بیماری کا لفظ صحت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، بیماری اُس کیفیت کو کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے اعتدال سے نکل جائے، جسمانی بیماری کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ جو انسان کی طبیعت میں اعتدال ہونا چاہیے گرمی کا، سردی کا، خشکی کا، تری کا، جس اعتدال کی بناء پر انسان صحت مند ہوتا ہے، چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اُس کی قوتیں بحال ہوتی ہیں، جس وقت انسان اس اعتدال سے نکل جاتا ہے تو یہ بیماری ہے، اور یہ بیماری اگر بڑھتی جائے تو نتیجۃً انسان ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح سے بیماری روحانی بھی ہوتی ہے، کہ قلب کی صحیح کیفیت یعنی اِس میں خلوص ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو، اللہ کے دین کے ساتھ پیار ہو، یہ ایک روحانی صحت ہے، اور جس وقت کوئی شخص اِس صحت سے زوال میں آتا ہے تو وہ بیماری ہے، اور یہ بیماری بھی بسا اوقات بڑھتی جاتی ہے، بڑھتی جاتی ہے، حتیٰ کہ روحانی موت کا باعث بن جاتی ہے، کہ اُس کے بعد پھر اُس میں نیکی قبول کرنے کی اور بُرائی سے بچنے کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اور حضرت جنید بغدادی ﷫ فرماتے ہیں کہ دلوں کے اندر جو امراض ہیں یہ زیادہ تر اتباعِ شہوات کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جب انسان اپنی خواہش پر چلتا ہے اور ہدایت کی پیروی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اپنی خواہشات پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے دل میں مختلف قسم کے عوارض لاحق ہوجاتے ہیں جن کو روحانی لحاظ سے بیماری کہا جاتا ہے، اور وہ بیماری روح کو بھی فناء کردیتی ہے، روحانی موت کا باعث بن بھی جاتی ہے، اور بسا اوقات وہ بیماری جسم کے لئے بھی تکلیف دِہ ثابت ہوجاتی ہے۔ جیسے یہاں اِن لوگوں کے دل میں کیا بیماری تھی؟ ایک تو انہوں نے کفر کو چھپا رکھا تھا، اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حسد تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اقتدار کو برداشت نہیں کرتے تھے، اب اللہ تعالیٰ دن بدن اِن کی بیماری کو بڑھائے گا، کہ مسلمان تو ترقی پذیر ہوتے چلے جائیں گے اور یہ اپنے حسد میں جلتے رہیں گے، اور اِن دل کے اندر کفر ضد میں آکر اور بڑھتا رہے گا۔ روحانی طور پر بھی یہ مریں گے، اور جسمانی طور پر بھی ہر وقت کی جلن، ہر وقت کی گھٹن، ہر وقت کا غم، ہر وقت کا فکر یہ مستقل ان کے لئے ایک روگ ہوگا۔ تو اگرچہ نفاق اور کفر کی بیماری اصل کے اعتبار سے روحانی بیماری ہے، لیکن اس کے نتیجے میں جو حسد غم اور گھٹن مؤمنوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دل کے اندر ہر وقت رہتی تھی یہ جسم کو بھی بیمار کرسکتی ہے، اور اکثر و بیشتر اِس قسم کا انسان جسمانی طور پر بھی بیماری کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ ''ان کے دلوں میں بیماری ہے''، فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: زیادہ کیا اِن کو اللہ تعالیٰ نے ازروئے بیماری کے، یعنی اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی، یعنی آئندہ بھی اِن کا مرض بڑھتا رہے گا، ان کی خواہش کے مطابق مسلمانوں پر زوال نہیں آئے گا، بلکہ

مسلمان ہر وقت ترقی پذیر ہوں گے، جب ترقی پذیر ہوں گے تو یہ مزید جلتے رہیں گے، اور اپنے اسی حسد کی آگ کے اندر بھنتے رہیں گے، یہ ہوگا اِن کے مرض کا بڑھانا۔

کذب کی اقسام واحکام

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہے، بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ: بسبب اِس کے کہ یہ جھوٹ بولتے تھے۔ یہاں كَذَبَ يَكْذِبُ جھوٹ بولنے کے معنی میں ہے، جھوٹ کہتے تھے، جھوٹ بولتے تھے۔ جھوٹ بولنے سے مراد اُن کا یہ دعویٰ ہے جو کہتے تھے کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یہ جو جھوٹا دعویٰ کرتے تھے، حقیقت کے اعتبار سے تو اُن کا ایمان نہیں ہے نہ اللہ پر اور نہ یومِ آخر پر، لیکن جھوٹ بولتے ہوئے کہتے تھے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، اِس جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے عذابِ الیم ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آرہی ہے کہ کِذب جو صدق کے مقابلے میں آتا ہے، کہ خلاف واقع بات کہہ دی جائے، شریعت میں اِس کا ایک ہی درجہ نہیں ہے کہ یہ کُفر ہو، بلکہ اس کے مختلف درجات ہیں، اگر تو ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہو اور زبان سے جھوٹ ادا کرے تو یہ کذب کُفر ہے، اور کبھی انسان عقائد میں تو جھوٹ نہیں بولتا لیکن معاملات میں جھوٹ بولتا ہے، اب لغوی حیثیت سے تو کذب اُس پر بھی صادق آئے گا لیکن وہ کُفر نہیں ہے، اگر کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے اور دھوکا دینے کے لئے معاملات میں جھوٹ بولا جائے تو یہ کذب حرام ہے۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کسی شرعی مصلحت کے تحت، جہاں صحیح بات کہنا شرعی مصلحت کے خلاف ہو وہاں خلافِ واقع بات کہنا شریعت کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ایسے کہو، وہ لغوی طور پر اگرچہ جھوٹ ہوگا لیکن ہم اُس کو حرام بھی نہیں کہیں گے چہ جائیکہ کفر کہیں، جیسے ایک آدمی دوسرے کو قتل کرنا چاہتا ہے، اور وہ شخص جس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں چھپ گیا ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ دوسرا آدمی ظالم ہے، ظلم کے طور پر قتل کرنا چاہتا ہے، اب وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ زید کدھر گیا؟ آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہاں اِس کوٹھڑی میں چھپا ہوا ہے یا اِس فصل میں چھپا ہوا ہے، تو آپ پر فرض ہے کہ آپ کہہ دیں کہ مجھے معلوم نہیں، یا اس قسم کی بات کہہ کے اس کو اس راستے سے ٹال دیں اور اِس شخص کو ظلم سے بچالیں، ایسے موقع پر سچ بولنا جائز نہیں ہوتا اور خلافِ واقع بات کہنی ضروری ہوتی ہے، تو لغوی طور پر تو کِذب اِس پر بھی صادق آتا ہے لیکن یہ حرام بھی نہیں چہ جائیکہ ہم اس کو کفر قرار دیں، اسی لیے تو ہمارا شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہے کہ ”دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز“ (گلستاں، باب ۱- حکایت ۱) کہ جس سچ بولنے کے ساتھ فتنہ اٹھتا ہے اُس کے مقابلے میں ایسا جھوٹ جس میں مصلحت ہو وہ بہتر ہوتا ہے۔

غیبت اور چغلی سچ ہونے کے باوجود حرام ہیں

حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے کہ شریعت نے غیبت اور چغلی کو حرام قرار دیا ہے۔ ”غیبت“ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کسی بھائی کا عیب اس کے پس پشت بیٹھ کے اچھالتے ہیں محض اس کو مجلس میں ذلیل کرنے کے لئے، یہ غیبت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا تھا، کہ یارسول اللہ! مَا الْغِیْبَۃُ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذِکْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَكْرَہُ: تیرا اپنے بھائی کو ایسے الفاظ کے ساتھ یاد کرنا جن کو وہ پسند نہیں کرتا، اس کو اگر پتہ چلے کہ میرا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا تھا تو اُس کو تکلیف پہنچے، یہ ہے غیبت۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اگر وہ عیب واقعی اُس میں موجود ہو جو ہم بیان کرتے ہیں (جس طرح ہم کسی کا عیب اچھالتے ہیں، پھر ساتھ کہتے ہیں کہ میں قسم کھا کے کہتا ہوں یہ بات سچی ہے، جھوٹ نہیں ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں) تو اگر سچی بات ہو، عیب واقعی اُس کے اندر موجود ہو، کیا اُس کا ذکر کرنا بھی غیبت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ غیبت تو یہی ہے کہ عیب واقعی اس کے اندر موجود ہو اور تم اس کو اُچھالو، اور اگر عیب اس کے اندر موجود ہی نہیں اور تم اس کو اُچھال رہے ہو یہ تو بہتان ہے،[1] اور بہتان کا درجہ غیبت سے بھی اُوپر ہے، کہ ایک عیب اُس میں تھا بھی نہیں، تم نے اپنی طرف سے لگایا اور لگانے کے بعد اس کو رُسوا کرنے کے لئے مجلسوں میں بیٹھ کر اُس عیب کو اُچھالا۔ تو حضور ﷺ نے صراحت فرمادی کہ غیبت سچی بات ہوتی ہے، لیکن جب تم کسی مؤمن کو ذلیل اور رسوا کرنے کے لئے یہ بات کرو گے تو ایسی صورت میں تمہارا وہی سچ بولنا تمہیں جہنّم میں لے جائے گا۔ اور ''چغلی'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ سے بات سنی اور دوسرے تک پہنچادی اِس نیت کے ساتھ تاکہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں، ایک کو دوسرے کے خلاف مشتعل کرنے کے لئے سنی ہوئی بات دوسرے تک پہنچادی جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ نَمَّامٌ''[2] چغل خور جنت میں نہیں جائے گا، تو اب چاہے اس نے سچی بات کہی ہو لیکن چونکہ دو کو لڑانے کے لئے کہی ہے، تو یہ سچ بولنے والا جہنمی ہے، ایسے موقع پر سچ بولنا جائز نہیں ہے۔ آپ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں کہ اس نے بات اس طرح کی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا جو دو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا۔

اصلاحی نقطۂ نظر سے خلافِ واقع بات جائز ہے

اور اِس کے مقابلے میں سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ''لَیْسَ الْكَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ''[3] جو شخص دو آدمیوں کے درمیان صلح کرواتا ہے وہ کذاب نہیں ہے، کیا مطلب؟ کہ صلح کروانے کے لئے اگر اُس کو کبھی خلافِ واقع بات بھی کہنی پڑ جائے تو یہ چونکہ ایک اصلاحی فعل ہے، اِس اصلاحی فعل کے لئے اگر وہ خلافِ واقع بات کہتا ہے تو شریعت اُس کو کذاب نہیں کہے گی...... ذرا خیال فرمالیجئے...... ہمارا کردار اِس روایت کی روشنی میں کتنا گھٹیا ہے، کہ ہم فساد مچانے کے لئے تو جھوٹ بھی بول لیتے ہیں، جبکہ شریعت کے نزدیک سچی بات بھی کہنے کی اجازت نہیں ہے، اور صلح کروانے کا جذبہ ہمارے اندر کم ہوتا ہے، لَیْسَ

---

(۱) ترمذی ۲/۱۵، باب ما جاء فی الغیبۃ/ نیز مسلم ۲/۳۲۲، باب تحریم الغیبۃ/ مشکوۃ ۲/۴۱۲، باب حفظ اللسان۔ آخری دو میں سوال بھی حضور ﷺ کی طرف سے مذکور ہے۔

(۲) مسلم ۱/۷۰، باب بیان غلظ تحریم الغیبۃ/ مشکوۃ ۲/۴۱۱، باب حفظ اللسان فصل اول/ نیز بخاری ۲/۸۹۵، باب ما یکرہ من النمیمۃ ولفظہ: لا یدخل الجنۃ قتات.

(۳) بخاری ۱/۳۷۱، باب لیس الکاذب/ مسلم ۲/۳۲۵، باب تحریم الکذب/ مشکوۃ ۲/۴۱۲، باب حفظ اللسان فصل اول.

الکذّابُ الَّذِی یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ کا مطلب یہی ہے، مثلاً طیب میرے پاس آتا ہے، اور آکر میرے سامنے غصے کا اظہار کرتا ہے، مثلاً مقبول کے متعلق، اُس کی کوئی شکایت کرتا ہے، اُس کو بُرا بھلا کہتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اِن دونوں کی آپس میں لڑائی ہے، دوسرے وقت میں مقبول میرے پاس آجاتا ہے، کہ جی! طیب میرے متعلق کیا کہہ کر گیا ہے؟، اب اگر میں صحیح بات کہہ دوں کہ طیب تجھے بُرا بھلا کہہ کر گیا ہے تو لازمی بات ہے کہ اِن کی لڑائی آپس میں بڑھے گی، اس لیے یہاں سچی بات بتانا بھی جائز نہیں ہے، بلکہ یہاں اُس کے سامنے ایسی بات کہی جائے جس کے ساتھ اُس کے جذبات میں فرق آئے، انکار کر دیا جائے کہ تیری شکایت تو کوئی نہیں کی، یا، یہ کہہ کر گیا ہے کہ "مقبول کے ساتھ میرے پُرانے تعلقات تھے، بس ایسے ہی غلط فہمی کی بناء پر ہمارا اختلاف سا ہو گیا، کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہم آپس میں جُڑ بیٹھیں"، یعنی جس کے ساتھ دوسرے کے جذبات کو تسکین دینا مقصود ہو، اور اُس کا رجحان بھی یوں کرنا مقصود ہو کہ وہ بھی صلح کی طرف آمادہ ہو جائے، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعد میں یہ آپس میں جُڑ جائیں اور آپس میں اختلاف دور ہو جائے اور یہ شر و فساد سے بچ جائیں۔ تو یہ بات اگرچہ میں خلافِ واقع کہوں گا، حقیقت تو یہ ہے کہ طیب میرے سامنے گالیاں دے کر گیا ہے، لیکن میں انکار کر دوں، یا میں کہوں کہ وہ تو آپ کے ساتھ دوستی لگانے کا بڑا خواہش مند ہے، اور اِس اختلاف کو دور کرنے کے متعلق وہ کہتا ہے کہ کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہمارے یہ اختلافات دور ہو جائیں، اگر ایسے میں اِس کو آمادہ کروں گا، پھر اُس کی بات اِس تک ایسے ہی پہنچاؤں، کہ بھئی! تو تو اس پر ناراض ہو رہا تھا، لیکن وہ تو میرے پاس آیا تھا اور تیرے متعلق بڑے اچھے جذبات کا اظہار کر رہا تھا، وہ تو آپ کے ساتھ صلح کرنا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ واقعی اگر کوئی غلط فہمی درمیان میں ہو گئی ہے تو اُس کو دور کر دیا جائے، اس طرح سے اس کو ٹھنڈا کر دیا جائے اور دونوں کو آپس میں ملا دیا جائے، تو یہ بات اگرچہ بظاہر خلافِ واقع ہو گی لیکن چونکہ یہ اصلاحی نقطہ نظر کے ساتھ کہی گئی ہے تو یہ لغۃً اگرچہ جھوٹ ہے لیکن شریعت کی نظر میں ایسا شخص کذاب نہیں ہے۔

اس لیے شریعت کی نظر میں کذب کا ایک درجہ نہیں، کسی جگہ خلافِ واقع بات کہنا ضروری ہوتا ہے، اور جہاں معاملات کے اندر کسی کو دھوکا دینا مقصود ہو، نقصان پہنچانا مقصود ہو، مغالطے میں ڈالنا مقصود ہو، وہاں کذب حرام ہوتا ہے اگرچہ کفر نہیں ہے، اور اگر ایمان کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے تو یہ کذب کفر ہے۔ اور یہاں جو عذابِ الیم کہا گیا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ، تو یہاں کذب سے یہی ایمان کا جھوٹا دعویٰ مراد ہے، اس لیے ہر جھوٹ کی سزا عذابِ الیم نہیں ہے بلکہ یہاں جھوٹ سے خاص جھوٹ مراد ہے جو انہوں نے کہا تھا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے، یہ ترجمہ اس لیے کیا جائے گا تاکہ اشارہ صراحتاً اِدھر ہو جائے کہ ان کا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کہنا، یہی جھوٹ یہاں مراد ہے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے "اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے"، اور یہ لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا تاکہ صراحتاً اشارہ اِدھر ہو جائے۔

فساد ہر اِعتبار سے فساد ہی ہوتا ہے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ: اور جب اِن لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ، قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ

مُصْلِحُوْنَ: وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، ہم تو حالات ٹھیک کرتے ہیں، ہم تو اصلاح کرتے ہیں، اِس سے معلوم ہوگیا کہ وہ جو کچھ کرتے تھے اُن کی نیت میں یہ نہیں تھا کہ ہم فساد مچاتے ہیں، تو یہ بات واضح ہوگئی کہ فساد فساد ہی ہے چاہے کوئی نیک نیتی کے ساتھ ہی کیوں نہ کرے، کرنے والے کی نیت نیک ہی کیوں نہ ہو تو بھی وہ مفسد ہے جب قاعدے کی رو سے اُس عمل کو فساد قرار دے دیا جائے۔

فسادِ ظاہری اور فسادِ باطنی

فساد کس اعتبار سے تھا؟، ایک فساد فی الارض تو ہوتا ہے ظاہری طور پر، چوری، ڈاکہ قتل، غارت، اِغواء، بدمعاشی، لڑائی، جھگڑے، ایک فساد تو یہ ہے۔ اور ایک فساد فی الارض ہوتا ہے باطنی طور پر، کہ زمین کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ سارے کے سارے اللہ کے احکام کے پابند ہو جائیں، اور اللہ کے قانون کی پابندی کرنے کا نتیجہ ہوگا کہ دنیا میں امن وسکون عام ہو جائے گا، اور انسانوں کے دلوں میں خوفِ خدا قائم ہو جانے کی وجہ سے ہر شخص دوسرے کا حق پہچانے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، یہ ہے ایک اصلاحی صورت، کہ لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا جائے، ایمانی جذبات اُبھارے جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرائی جائے، جو قانون ہر شخص کی مصلحت کی رعایت رکھتے ہوئے اللہ نے بنایا ہے، یہ ہے نظامِ عالم کو برقرار رکھنے کی ایک صورت، جو شخص بھی اِس نظام میں خلل ڈالے گا وہ فساد فی الارض کا ارتکاب کرے گا۔

آئین کے محض الفاظ سے اصلاح ممکن نہیں

کیونکہ ظاہری قانون جو امن قائم کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، امن وعافیت کے لئے بنایا جاتا ہے، آپ جانتے ہیں کہ ظاہری قانون یہ کوئی خود کار مشین نہیں ہوتی کہ حالات کو خود ٹھیک کر دے، اب ایک ملک کا قانون بنا ہوا ہے کہ چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو، دھوکا نہ دو، لیکن اب آئین کو اگر کاپی میں لکھ دیا گیا تو اس کا کیا فائدہ؟ یہ کوئی خود کار مشین نہیں ہے، اِس آئین کو چلانے والے انسان ہوتے ہیں، تو جس وقت تک انسانوں کے قلوب کی اصلاح نہ ہو اُس وقت تک آئین کے صرف الفاظ کبھی بھی کسی ملک یا زمین کے خطے کی اصلاح نہیں کر سکتے، یہ بات تو واضح ہے، اگر انسانوں کے دلوں میں صلاحیت نہیں ہے تو یہ کاغذوں کے اُوپر لکھا ہوا قانون کسی صورت میں بھی کسی ملک یا زمین کے کسی خطے کی اصلاح نہیں کر سکتا، اگر حالات کی اصلاح ہو سکتی ہے تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اُس آئین کو چلانے والے انسانوں کے قلوب سدھرے ہوئے ہوں۔ تو چوری ڈاکہ یہ تو ظاہری فساد ہے، اور انسانوں کے قلوب کے اندر فساد پیدا کرنا یہ باطنی فساد ہے، جس کے بعد ظاہری فساد اُس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

منافقین کا فساد کیا تھا؟

تو یہ لوگ اسلام کی جو تحریک اُٹھی تھی اور سرورِ کائنات ﷺ نے ایمان کی جو دعوت دی تھی اُس کے اندر رکاوٹ بنے ہوئے تھے، یہ چاہتے تھے کہ کوئی اس قسم کی صورت پیدا ہو جائے کہ جس طرح ہم پہلے خلط ملط سے ہو کر رہتے تھے، ویسے ہی خلط ملط ہوں، اور کافروں کے ساتھ اور اہلِ باطل کے ساتھ براہِ راست ٹکر نہ لی جائے، آپ جانتے ہیں کہ یہ جذبہ اصل کے اعتبار سے

لوگوں کے قلوب کی اصلاح کو روکنے والا جذبہ تھا، اور قلوب کے اندر اس قسم کی مفاد پرستی اور بزدلی کو پیدا کر دینا یہ کسی صورت میں بھی حق کو غالب کرنے کی بات نہیں ہے۔ پھر جب وہ دونوں کے ساتھ ملتے تھے تو اِدھر کی بات اُدھر پہنچاتے اور اُدھر کی بات اِدھر پہنچاتے، اپنے طور پر وہ سمجھتے کہ ہم اِن میں صلح کرانے کی کوشش کر رہے ہیں یا آپس میں ان کو جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی اِدھر پہنچانے کی وجہ سے نتیجہ زیادہ خراب ہو جاتا ہے، یہ تھا وہ فساد جو وہ کرتے تھے، اور اپنے طور پر وہ اصلاح کے جذبے سے کرتے تھے لیکن قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ مصلح نہیں، یہ مفسد ہیں، کیونکہ جب قاعدے اور قانون کی رو سے یہ فساد ہے تو اِن کی نیک نیتی یا اِن کا جذبہ کہ ہم اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں، اِس کے ساتھ وہ فساد اصلاح نہیں کہلائے گا، قاعدے اور قانون کی رو سے جب ان کا طرزِ عمل فساد قرار پا گیا، اب اگر یہ اصلاح کا ارادہ بھی رکھتے ہیں تو اِن کے ارادے کے ساتھ یہ اصلاح نہیں بنے گی، وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ (سورۂ بقرۃ: ۲۲۰) مفسد اور مصلح کو اللہ جانتا ہے، کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون ہے، ایک انسان اپنے آپ کو زبان سے کہتا ہے کہ میں مصلح ہوں لیکن اُس کی کارروائیاں نتیجۃً فساد کا باعث بنتی ہیں تو صرف زبان سے کہنے سے وہ مصلح نہیں بن جایا کرتا۔ ''جب اِنہیں کہا جاتا ہے کہ علاقے میں فساد نہ مچاؤ'' یہاں ارض سے ارضِ معہود مراد ہے، مدینہ منورہ کی زمین، اپنا علاقہ اُن کا جو بھی تھا، جس میں ان کی کارروائیاں جاری تھیں، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم فساد نہ کرو ملک میں، اپنے علاقے میں، الۡاَرۡضِ سے زمین کا معہود خطہ مراد ہے۔ قَالُوۡۤا: وہ کہتے ہیں اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ: سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو مصلح ہیں، یعنی ہم تو مصلح ہی ہیں، جیسے کل میں نے عرض کیا تھا کہ اِنَّمَا حصر کے لئے ہوتا ہے۔ اَلَاۤ: خبردار، یہ کلمہ تنبیہ کے لئے ہے، بیشک یہی لوگ مفسد ہیں، لیکن یہ سمجھتے نہیں، اِن کو شعور نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیامت تک کے لئے معیارِ حق ہیں

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ: النَّاسُ سے یہاں مخلص صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخلاص اور محبت کا تعلق رکھتے تھے، اور وہ اُس معاشرے کے اندر نمایاں تھے۔ ''جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح سے لوگ ایمان لائے ہیں'' یعنی جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ساتھیوں کا ایمان ہے تم بھی اسی طرح سے ایمان لاؤ، اُس ایمان کے تقاضے سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی ہو کر رہو، اور دوسروں کے ساتھ تعلق ترک کر دو، یہ معیار تمہارے سامنے ہے، جس طرح سے یہ مخلص ہیں تم بھی اِسی طرح سے ہو جاؤ۔ گویا کہ اُن کے سامنے ایمان کے لئے ایک حسی کسوٹی اور معیار پیش کیا گیا ہے کہ ایمان صحیح وہی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کے مشابہ ہو۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی لوگوں کے سامنے اُس طبقے کو جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑ گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا اور آپ کے ساتھ اخلاص اور محبت کے ساتھ ہر معاملہ کرتا تھا، اُن کے ایمان کو اُس زمانے میں بھی دوسرے لوگوں کے سامنے بطور معیار کے پیش کیا گیا، اور یہی معیار قیامت تک قائم ہے، اس لیے اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عقیدے کی صحت اور عمل کی صحت کو پرکھنے کا ذریعہ یہی ہے کہ یہ دیکھو کہ صحابہ کرام نے اِس عقیدے کو کس انداز میں اختیار کیا اور اِس عمل کو کس طرح سے کیا۔ اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کے الفاظ کو لے کر

اُس میں سے کوئی ایسا عقیدہ نکالنا چاہتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ کریم سے نہیں سمجھا، سرورِ کائنات ﷺ کی تعلیم سے انہوں نے اخذ نہیں کیا، تو ظاہری طور پر وہ لفظوں کے مطابق کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ حق نہیں ہے بلکہ باطل ہے، یہ معیار ہمارے سامنے ہے، صحابہ ہمارے لیے معیارِ حق ہیں، اپنے عقیدے کو اور اپنے عمل کو اُنہی کے عقیدے اور عمل پر پرکھا جائے گا، اگر ہمارا ایمان، ہمارے عقائد اور ہمارے اعمال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرز کے مطابق ہیں تو صحیح ہیں، اور اگر مطابق نہیں ہیں تو صحیح نہیں ہیں۔

منافق لوگ مخلصین کو نادان کس اعتبار سے کہتے تھے

جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جس طرح سے کہ لوگ ایمان لائے ہیں، قَالُوْٓا: وہ کہتے، اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ، یہ بات اپنی مجلسوں میں کہتے تھے یا بعض مساکین غرباء کے سامنے کہہ دیتے تھے، ورنہ منافق علی الاعلان تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اِن صحابہ کو سُفَهَاء کے لفظ سے تعبیر کرتے، کہ یہ تو نادان لوگ ہیں، خفیف العقل ہیں، یہ عقل مند لوگ نہیں، اِن جیسا بننے کے لئے ہمیں کہتے ہو؟ یہ سفیہ اور نادان کس اعتبار سے کہتے تھے؟ یہ وہی جذبہ ہے جس کا ذکر ابتدا میں میں نے آپ کے سامنے کیا، وہ کہتے کہ یہ تو نادان لوگ ہیں، خواہ مخواہ ایک کے ساتھ مل کر باقی ہزاروں سے دشمنی ڈال لی، اپنا گھر گنوایا، بیوی سے جدائی اختیار کی، بچوں سے علیحدہ ہوئے، مار پٹائی برداشت کی، اور اپنی املاک اور جائیدادیں لٹادیں، یہ کوئی عقل مندی ہے؟ ہوشیار تو ہم ہیں کہ اِن کے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور اُن کے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں، کہیں بھی اپنے مفاد کو ہم نقصان نہیں پہنچنے دیتے، یہ کون سی عقلمندی ہے کہ ایک کے ساتھ ہو کر ہزاروں سے بگاڑ لو، اور پھر سب کچھ لٹ پٹ کے آگئے، نہ گھر رہ سکے، نہ بیوی پاس رہی، نہ بچے پاس رہے، نہ جائیداد رہی، گھر سے بے گھر ہو گئے، تکلیفیں اٹھائیں، مار پٹائی کا نشانہ بنے، تو یہ کوئی عقلمند لوگ نہیں ہیں، سمجھدار تو ہم ہیں کہ جدھر چلے جائیں (آج کل کے محاورے میں) لوگ چائے پلاتے ہیں، کسی سے ہماری بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ اِس طرح سے اپنے آپ کو جو انہوں نے رکھا ہوا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنا مفاد محفوظ کیا ہوا ہے، اور اپنے مفاد کو محفوظ کر لینا اور مختلف لوگوں کے خطرات سے بچ جانا ہی عقلمندی ہے، یعنی اُن کا جذبہ اس قسم کا تھا کہ اپنے مفاد کو نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔ وہی ابتداء والی بات! کہ مفاد پرستی اور بزدلی کے تحت وہ سمجھتے تھے کہ اچھی زندگی اسی طرح سے گزرتی ہے کہ اپنے مفاد کو ہمیشہ مدنظر رکھو، اور کسی کے ساتھ بگاڑ کر خواہ مخواہ خطرات مول نہ لو۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ کائنات ﷺ کا ساتھ دے کر علی الاعلان سب سے بگاڑ لی، جس کے نتیجے میں نقصان بھی اٹھایا، تکلیفیں بھی برداشت کیں، وطن بھی چھوڑا، اہل وعیال سے بھی جدا ہوئے، تو منافق سمجھتے تھے کہ یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

درحقیقت نادان کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ: نادان تو یہ لوگ ہیں جو دنیا کے عارضی مفاد کی خاطر چند روزہ زندگی میں اپنے اس مفاد کو عزیز رکھتے ہیں اور آخرت کو برباد کر رہے ہیں، یہ تو ایسے ہے جیسے ٹکوں کی حفاظت کی جائے اور سونے کے ڈھیروں سے

صرف نظر کی جائے، اور جو آدمی ٹکوں کو قربان کرتا ہے اور اُس کے مقابلے میں سونے کے ڈھیر لیتا ہے، عقل مند تو وہ شخص ہے۔ تو جس نے حق کی خاطر اپنا وطن چھوڑا، تکلیفیں اٹھائیں، اس نے تو بہت عارضی سا مفاد چھوڑا ہے اور دائمی مفاد حاصل کر لیا، بخلاف اِن کے جو عقل مند بنے پھر رہے ہیں، انہوں نے اپنے اس عارضی مفاد کو مدنظر رکھا ہے اور دائمی عذاب الیم لے لیا، تو عقل مند یہ ہوئے یا وہ عقل مند ہوئے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جن لوگوں نے بے عقل سمجھا، بے وقوف سمجھا، نادان سمجھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہ خود نادان ہیں، صحابہ تو بہت بڑے عقل مند ہیں جنہوں نے آخرت کے مفاد کو مدنظر رکھا اور حق کا ساتھ دیا۔ کیونکہ حق کا ساتھ دینے والا بہر حال جیتتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے چاہے وہ میدان کے اندر شہید ہی ہو جائے، اور باطل کا ساتھ دینے والا بہر حال خسارے میں ہے اگر چہ عارضی طور پر وہ فتح بھی پالے اور اُس کو کوئی مال و دولت بھی مل جائے، کیونکہ فانی اور باقی کا فرق ہے، کہ حق کا ساتھ دینے والا باقی کو اختیار کرتا ہے اور فانی کو چھوڑتا ہے، اور باطل کا ساتھ دینے والا باقی کو چھوڑتا ہے اور فانی کو اختیار کرتا ہے، فانی اور باقی کا کیا مقابلہ؟، اس لیے صحابہ کرام کے عمل کو عقلمندی قرار دیا گیا، اور جن کو صحابہ کرام کا عمل نادانی نظر آتا تھا انہیں نادان کہا گیا۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ: خبردار! بیشک یہی لوگ نادان ہیں، وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اِن کو علم نہیں۔

منافق زمانہ ساز تھے

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا: یہ ان کی چوتھی قباحت ہے، جب یہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے، وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ: شیاطین شیطان کی جمع ہے، شیطان فَعلان کے وزن پر ہے، شَاطَ يَشِيْطُ سے، تندخو ہونا، بدمزاج ہونا، مشتعل مزاج ہونا، شریر ہونا، اس کا مفہوم اس قسم کا ہوتا ہے، تو جو شخص تندخو، تیز مزاج، شریر اور مشتعل مزاج ہو اُس کو شیطان سے تعبیر کرتے ہیں، چاہے وہ انسانوں سے ہو، چاہے وہ جنوں سے ہو، شیاطین الجن والانس دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ "جب یہ خلوت میں جاتے ہیں اپنے شیاطین کی طرف" یہاں سے اُن کے رؤسا مراد ہیں، خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ: جب خلوت میں جاتے ہیں، جب تنہا ہوتے ہیں اپنے سرداروں کی طرف تو کہتے ہیں اِنَّا مَعَكُمْ: ہم تمہارے ساتھ ہیں، یعنی اِدھر مومنوں کے پاس آتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور اُدھر اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو انہیں کہہ دیتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، یہی اُن کی چُستی تھی کہ دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے، جس کو آج کل کے محاورے میں آپ زمانہ ساز سے تعبیر کرتے ہیں، زمانہ ساز کا معنی زمانے سے موافقت کرنے والا، کہ جس قسم کے حالات ہوں وہ اُن کے ساتھ موافقت کر لیتا ہے، جیسے کیسے لوگ آگئے اُن کے ساتھ موافقت کر لیتا ہے اس کو کہتے ہیں زمانہ ساز، زمانے سے موافقت کرنے والا۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے [بالِ جبریل میں] اپنے ایک شعر میں ذکر کیا ہے:

حدیثِ بے خبراں ہے، تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

یہ تو بے خبروں کی بات ہے کہ تم زمانے کے ساتھ موافقت کرو۔ اصل یہ ہے کہ اپنے آپ کو مستقل رکھو، زمانہ تمہارے ساتھ موافقت کرتا ہے تو بہتر، اور اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تمہیں چاہیے کہ زمانے سے لڑتے رہو۔ مخالف ماحول میں

رہتے ہوئے اُس مخالف ماحول سے ٹکر لے کر رکھنا اور لڑتے رہنا اور حق کا ساتھ نہ چھوڑنا یہ ہے عقلمندی کی بات، اور یہ بے خبروں کی بات ہے کہ تو زمانے کے ساتھ موافقت کیا کر۔ عقلمندی کی بات یہ ہے کہ اگر زمانہ تیرے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تُو زمانے کے ساتھ لڑ!

زمانہ سازی اہلِ حق کی شان نہیں

انبیاء علیہم السلام کا اُسوہ کیا ہے؟ وہ مخالف ماحول میں آتے ہیں، اور ماحول کو موافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر کوشش کے ساتھ ماحول موافق بن گیا تو بہتر، اور اگر نہیں بنا تو آخری دم تک اُس ماحول سے لڑتے رہتے ہیں، ماحول سے کبھی صلح نہیں کرتے۔ تو اہلِ حق کے جو پیشوا ہیں، انبیاء علیہم السلام کا گروہ، اُن کا بھی کردار یہی ہے، اس لیے اہلِ حق کو چاہیے کہ جہاں بیٹھے ہوں اپنے حق کا اظہار کریں، اگر ماحول موافقت کرتا ہے تو بہتر، ورنہ ساری زندگی ٹکراؤ رہے اور اسی ٹکراؤ میں مر جائیں، یہی انبیاء علیہم السلام کا اُسوہ ہے اور یہی اہلِ حق کی پہچان ہے، حق کو دبا کر اپنے ماحول سے موافقت کر لینا اہلِ حق کا کام نہیں ہے۔ اور حدیث شریف میں بھی صراحتاً سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات فرمائی، مشکوٰۃ شریف میں آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً''(1) اِمعۃ نہ بنو، اِمّعة کا لفظ اِنَّا مَعَ النَّاسِ سے لیا گیا ہے، یہ تمہارا نعرہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم تو لوگوں کے ساتھ ہیں، جدھر کی ہوا دیکھو اُدھر کو چل پڑو، یہ نعرہ تمہارا نہیں ہونا چاہیے، اگر لوگ نیکی کریں تو ان کے ساتھ مل کر نیکی کرو، لیکن اگر لوگ بُرائی کریں تو ان کے ساتھ مل کر بُرائی نہ کرو، تو آگے روایت کے الفاظ اس طرح سے ہیں جن میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ لوگ اگر نیکی کریں تو نیکی کے اندر تو لوگوں کیساتھ موافقت رکھو، لیکن اگر لوگ بُرائی کرتے ہیں تو بُرائی میں لوگوں کا ساتھ نہ دو۔ اور منافقین کا یہی کام تھا، اِنَّا مَعَ النَّاسِ والی بات تھی، کہ مؤمنوں کے پاس جاتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور جب اپنے شیاطین کی طرف جاتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

منافقین کا اِستہزا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

اور پھر اُن کو مطمئن کرنے کے لئے کہتے کہ ہم نے وہاں جا کر جو کلمہ پڑھ لیا اور اہلِ ایمان کو جا کر جو کہہ دیا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو استہزاء کرتے ہیں، وہ تو ہماری ہنسی مذاق تھی، ہنسی مذاق کے طور پر ہم نے کہا تھا کہ ہم اللہ کے رسول کو مانتے ہیں، یومِ آخر کو مانتے ہیں، فلاں چیز کو مانتے ہیں، یہ تو ایسے ہی ہم نے دل لگی کے طور پر ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہنسی وہ نہیں کر رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اِن کے ساتھ استہزاء کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ استہزاء کس طرح سے کر رہا ہے؟ کہ یہ تو خوش ہیں کہ ہماری حالت دن بدن اچھی ہوتی جا رہی ہے، جبکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ ہلاکت کے گڑھے میں جا رہے ہیں، جس دن نتیجہ واضح ہوگا تو پتہ چلے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے تھے یا غلط راستے پر۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس استہزاء کا جواب ہے، کہ یہ دل لگی تمہاری نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ استہزاء کرتا ہے، کہ تم اس طرح سے گمراہی کی طرف بڑھتے جا رہے ہو کہ تمہیں پتہ بھی نہیں چل رہا، جیسے اگلے الفاظ میں بیان فرما دیا ''اللہ تعالیٰ اِن سے استہزاء کرتا ہے، اور اِنہیں ترقی دیتا ہے اِن کی سرکشی میں''، يَعْمَهُوْنَ: یہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے اختیار کر لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے'' کہ سیدھا راستہ چھوڑا اور ضلالت

(1) ترمذی ۲۱/۲، باب ماجاء فی الاحسان/ مشکوٰۃ ۴۳۵/۲، باب الظلم، فصل ثانی۔

اور گمراہی کو اختیار کیا، فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ: ان کی تجارت نے نفع نہ پایا، وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ: اور نہ یہ ہدایت یافتہ ہیں، یعنی نہ ان کو تجارت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، تجارت تو ایسے طور پر ہونی چاہیے کہ انسان سرمایہ خرچ کرے اور نفع اٹھائے، اور یہ تو دن بدن خسارے میں جا رہے ہیں، ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کی تو یہ کوئی نفع کی تجارت نہیں ہے، ان لوگوں کو تجارت کرنے کا طریقہ نہیں آیا، یہاں اِہتداء فی التجارۃ مراد ہے، یعنی یہ جو انہوں نے تجارت کی کہ ہدایت کو چھوڑا اور گمراہی کو لیا یہ ان کی بے ڈھنگی تجارت ہے جس کے نتیجے میں یہ نقصان میں رہیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ
ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی، جب روشن کر دیا اُس آگ نے اُس شخص کے اردگرد کو تو لے گیا اللہ
بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ
ان کے نور کو اور چھوڑ دیا ان لوگوں کو اندھیروں میں ایسے حال میں کہ وہ دیکھتے نہیں ﴿۱۷﴾ وہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں،
فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ
پس وہ لوٹیں گے نہیں ﴿۱۸﴾ یا مثل آسمان سے نازل ہونے والی بارش کے، جس میں تاریکیاں ہیں اور کڑک ہے اور چمک ہے، کرتے ہیں
أَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ
وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں بجلیوں کی وجہ سے موت کے ڈر سے، اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ قریب ہے کہ
الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَإِذَا
چمکنے والی بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو، جب کبھی وہ بجلی روشن ہوتی ہے ان کے لئے تو چل پڑتے ہیں اُس کی روشنی میں، اور جب
أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ
بجلی ان پر تاریک ہو جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں، اگر اللہ چاہے تو لے جائے ان کے کانوں کو اور ان کی آنکھوں کو،
إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٠﴾
بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا: اِسْتَوْقَدَ اِستیقاد: آگ جلانا۔ اَوْقَدَ باب افعال سے، اسْتَوْقَدَ باب استفعال سے، اِیقادِ نار، استیقادِ نار: آگ جلانا۔ وَقود کا لفظ آپ کے سامنے اگلے رکوع میں آئے گا، وَقود ایندھن کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے آگ جلائی جاتی ہے، مَایُوْقَدُ بِهِ النَّارُ۔ اور باب اِفعال سے بھی یہ لفظ سورۂ رعد میں استعمال ہوا ہے۔ ''اِن کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی''، فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ: اَضَآءَتْ کی ضمیر نار کی طرف لوٹ گئی، اَضَاءَ لازم اور متعدی دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے، روشن ہونا، روشن کرنا، یہاں چونکہ مَا حَوْلَهٗ اس کا مفعول آیا ہوا ہے، اس لیے ترجمہ متعدی کے ساتھ کرنا ہے، جب روشن کر دیا اُس آگ نے، مَا حَوْلَهٗ: اُس شخص کے ماحول کو، ماحول: اردگرد کی جگہ، آپ جو بولا کرتے ہیں کہ ہمارے مدرسے کا ماحول اچھا ہے، فلاں جگہ کا ماحول اچھا نہیں ہے، تو اس ماحول سے اردگرد مراد ہوتا ہے، تو یہاں بھی مَا حَوْلَهٗ کا مطلب یہی ہے کہ اس کے اردگرد جگہ کو اس آگ نے روشن کر دیا، ''جب روشن کر دیا اُس آگ نے اس شخص کے اردگرد کو''، ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ: اب الَّذِي بھی لفظوں میں مفرد ہے، اس لیے اسْتَوْقَدَ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے، مَا حَوْلَهٗ کی ضمیر بھی مفرد لوٹ رہی ہے، لیکن معنیٰ چونکہ جمع ہے اس لیے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کے اندر جمع کی ضمیر لوٹا دی گئی، جیسا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ کے اندر ذکر کیا تھا، کہ وہاں بھی يَقُوْلُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی تھی، آگے اٰمَنَّا جمع کا صیغہ تھا تو وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کے اندر ضمیر جمع کی لوٹ رہی تھی، اسی طرح یہاں بھی بِنُوْرِهِمْ کے اندر ضمیر جمع کی آگئی۔ ذَهَبَ: یہ لازم ہے، جانے کے معنی میں، لیکن چونکہ اِس کے بعد باء تعدیہ کی آگئی تو اب اِس کا ترجمہ ہم ''لے جانے'' کے ساتھ کریں گے، ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ: لے گیا اللہ تعالیٰ اُن کے نور کو، اُن کی روشنی کو اللہ لے گیا، یعنی اللہ نے ان کی روشنی ختم کر دی، وَتَرَكَهُمْ: اور چھوڑ دیا اُن لوگوں کو، فِيْ ظُلُمٰتٍ: یہ ظُلْمَةٌ کی جمع ہے بمعنی تاریکی، چھوڑ دیا ان لوگوں کو اندھیروں میں، تاریکیوں میں، لَّا يُبْصِرُوْنَ: وہ لوگ دیکھتے نہیں، یعنی ایسے حال میں چھوڑ دیا کہ وہ دیکھتے نہیں، صُمٌّ: اَصَمّ کی جمع ہے، اَصَمُّ بہرے کو کہتے ہیں، بُكْمٌ اَبْكَمُ کی جمع ہے، اَبکم گونگے کو کہتے ہیں، جو زبان سے بول نہ سکتا ہو، عُمْيٌ اَعْمٰى کی جمع ہے، اور اَعمیٰ اندھے کو کہتے ہیں، اور یہ تین صفتیں اکٹھی کر دیں بغیر عطف کے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت یہ تینوں باتیں موجود ہیں۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ: هُمْ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ۔ هُمْ مبتدا محذوف نکالیں گے اور یہ خبریں ہیں۔ وہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں، یعنی اُن کے کانوں میں بھی صلاحیت نہیں، آنکھوں میں بھی صلاحیت نہیں، اور زبان میں بھی صلاحیت نہیں، فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: پس وہ لوٹیں گے نہیں۔ اَوْ كَصَيِّبٍ: صَيِّب: نازل ہونے والی بارش، صَيْوِبٌ تھا اصل میں، جیسے سَيِّدٌ اصل میں سَيْوِدٌ تھا، اسی طرح صَيِّب بھی صَيْوِبٌ تھا، جب واؤ اور یاء ایک جگہ اکٹھی ہو گئیں اور اُن میں سے پہلا ساکن ہے تو واؤ کو یاء کر کے یاء کا یاء میں ادغام کر دیا تو صَيِّبٌ بن گیا، ''یا مثل آسمان سے نازل ہونے والی بارش کے'' فِيْهِ ظُلُمٰتٌ: اُس بارش میں تاریکیاں ہیں، اندھیرے ہیں، وَّرَعْدٌ: اور کڑک ہے، وَّبَرْقٌ: اور چمک ہے۔ رَعد، بَرق، صاعقہ یہ تینوں لفظ استعمال ہوا کرتے ہیں، جیسے صَوَاعِق کا لفظ آگے بھی آ رہا ہے جو جمع صاعقہ کی۔ بجلی کڑکتی ہے، اور بسا اوقات کڑک کر گرتی ہے، یا آسمان کے اُوپر چمکتی ہے، یہ آسمانی بجلی کی

مختلف کیفیتیں ہیں، اور اِنہی کیفیتوں کے اعتبار سے اُس کے تین نام ہیں، کڑک کر گر جائے تو اُس کو صاعقہ کہہ دیتے ہیں، اس لیے صاعقہ کا ترجمہ کڑک کے ساتھ بھی کر دیا جاتا ہے، اُس میں دونوں باتیں ہوتی ہیں کہ کڑک کر گرنے والی ہے۔ اور رَعد کڑکنے والی بجلی ہوگئی جو یہ آواز دیتی ہے، اور برق یہ چمکنے والی ہوگئی، ''اُس بارش میں تاریکیاں ہیں اور کڑک ہے اور چمک ہے'' یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ: اب یَجْعَلُوْنَ کی ضمیر جمع مذکر کی ہے، یہ لوٹ رہی ہے ان لوگوں کی طرف جو اس بارش میں گھر جائیں، اسی لیے مفسرین نے ترجمہ کرتے وقت ''کَ'' کا جو مدخول ہے صَیِّبٍ، اس کے اُوپر مضاف کو محذوف مانا ہے اَوْ كَذَوِيْ صَيِّبٍ، تاکہ یَجْعَلُوْنَ کی ضمیر کا مرجع لفظوں میں متحقق ہو جائے، اَوْ كَذَوِيْ صَيِّبٍ: یا اِن کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو آسمان سے اترنے والی بارش والے ہوں۔ اب وہ بارش والے یعنی جو بارش کے اندر گھر گئے، یَجْعَلُوْنَ کی ضمیر اُن کی طرف لوٹے گی، وہ لوگ جو اس بارش کے اندر گھر گئے ہیں وہ کرتے ہیں اپنی انگلیاں، اَصَابِع اِصْبَع کی جمع، ذکر یہاں کل کا ہے اور ارادہ جزء کا ہے، مراد پورے ہیں، انگلیوں کا آخری حصہ، ساری انگلی تو کان میں نہیں جایا کرتی، آخری حصہ جایا کرتا ہے، ''کرتے ہیں وہ اپنی انگلیاں'' فِيْۤ اٰذَانِهِمْ: اپنے کانوں میں، مِّنَ الصَّوَاعِقِ: بجلیوں کی وجہ سے، صواعق صاعقہ کی جمع، جس کے اندر کڑک کا مفہوم بھی ہے اور گرنے کا مفہوم بھی ہے، حَذَرَ الْمَوْتِ: یہ یَجْعَلُوْنَ کا مفعول لہٗ ہے، موت سے بچنے کے لئے، موت کے ڈر سے، دونوں طرح سے اس کو آپ کہہ سکتے ہیں، وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ: يَكَادُ افعالِ مقاربہ میں سے ہے، قریب ہے کہ چمکنے والی بجلی اچک لے اُن کی آنکھوں کو، یعنی اتنی تیز روشنی آتی ہے کہ ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو جاتی ہے، جس کو آپ کہتے ہیں کہ آنکھیں چندھیا گئیں، اتنی تیز روشنی آجاتی ہے کہ آنکھیں ماؤف ہو جاتی ہیں، دیکھتی کچھ نہیں ہیں، كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ: اَضَآءَ یہاں متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازم بھی، متعدی ہوگا تو ترجمہ یوں کریں گے ''جب کبھی بجلی روشن کر دے اُن کے لئے راستے کو، مَّشَوْا فِيْهِ: تو وہ اُس روشنی میں چل پڑتے ہیں''، اَضَآءَ کا مفعول محذوف نکلے گا اَضَآءَ لَهُمْ مَمْشٰى: چلنے کی جگہ، راستہ، ''جب وہ بجلی روشن کر دیتی ہے ان کے لئے راستے کو تو وہ اس میں چل پڑتے ہیں'' یعنی اس کی روشنی میں چل پڑتے ہیں۔ اور اگر لازم کے طور پر ہوگا تو پھر یوں ترجمہ کریں گے ''جب وہ بجلی روشن ہوتی ہے ان کے لئے تو اُس کی روشنی میں چل پڑتے ہیں''، وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ: اور جس وقت وہ بجلی اُن پر تاریک ہو جاتی ہے، اندھیرا چھا جاتا ہے، جب اُن کے اُوپر تاریکی چھا جاتی ہے قَامُوْا: اِس کا یہاں ترجمہ کرنا ہے ٹھہر جاتے ہیں، کیونکہ قَامَ کا مفہوم دو طرح سے آیا کرتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ چلتا ہوا آدمی رک گیا، اس کو بھی کہتے ہیں کہ ٹھہر گیا، اور اسی طرح ہماری زبان میں بھی اُس کے لئے لفظ استعمال ہوتا ہے کھڑا ہو گیا، ''دوڑ رہا تھا کھڑا ہو گیا، چل رہا تھا کھڑا ہو گیا'' یہ کھڑا ہونا چلنے کے مقابلے میں ہے، جس کے لئے دوسرا لفظ ہے ٹھہرنا، اور ایک یہ ہے کہ بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا، بیٹھنے کے مقابلے میں بھی کھڑا ہونا آیا کرتا ہے، یہاں چونکہ مشی کے مقابلے میں آرہا ہے اس لیے اس کا مفہوم اِنہی لفظوں میں اداء کرنا ہے کہ جب ان کے اُوپر تاریکی ہو جاتی ہے تو وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ اور ''کھڑے ہو جاتے ہیں'' یہ بھی بات وہی ہے، لیکن کھڑا ہونا دو طرح سے ہوتا ہے، چلتے ہوئے کھڑے ہو گئے، اور بیٹھے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، تو ٹھہرنے کا لفظ اُسی مفہوم کو اداء کرتا ہے جو چلتا ہوا اور بھاگتا ہوا آدمی ٹھہر جائے، ''جب اُن کے اُوپر تاریکی ہو جاتی ہے ٹھہر جاتے ہیں''، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ: اگر اللہ چاہے تو لے جائے

اُن کے کانوں کو، وَاَبْصَارِهِمْ: اور ان کی آنکھوں کو، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں آپ کے سامنے منافقین کے مختلف احوال ذکر کیے گئے، اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ اُنہی کے حال کو دومثالوں کے ساتھ واضح فرماتے ہیں۔

مثال اور تشبیہ میں فرق

یہ مثال ہے تشبیہ نہیں، تشبیہ اور مثال میں کچھ تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، جہاں تشبیہ پائی جائے وہاں تشبیہ کے ارکان یعنی مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ تشبیہ اِن تینوں کا نکالنا ضروری ہوتا ہے، پھر اِن کی آپس میں مطابقت دیکھی جاتی ہے، کہ مشبہ کیا ہے یعنی تشبیہ کس کو دی جارہی ہے؟، مشبہ بہ کیا ہے یعنی کس کے ساتھ تشبیہ دی جارہی ہے؟، اور وجہ شبہ کیا ہے یعنی تشبیہ کس اعتبار سے دی جارہی ہے؟ جس طرح سے آپ کہیں کہ زَيْدٌ اَسَدٌ یا زَيْدٌ كَالْاَسَدِ، تو آپ نے زید کو شیر کے ساتھ تشبیہ دے دی، زید مشبہ ہے اور اَسد مشبہ بہ ہے، اور وجہ تشبیہ آپ اِس میں شجاعت نکالتے ہیں، کہ جس طرح شیر کے اندر شجاعت پائی جاتی ہے اسی طرح زید میں بھی شجاعت پائی جاتی ہے، تو تینوں جزء وہاں نکالے جایا کرتے ہیں، اور جتنی وجہ شبہ دونوں کے درمیان میں کامل ہوتی ہے، اتنی ہی تشبیہ کامل کہلاتی ہے۔ اور مثال کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اُس کے اجزاء کو ممثل لہ کے ساتھ مطابق کرنا ضروری نہیں ہوتا، مثال کے کل اجزاء کو ممثل لہ کے کل اجزاء کے ساتھ مطابقت دینی ضروری نہیں ہوتی، بلکہ مثال کے ساتھ ایک ہیئت اور ایک کیفیت سامنے لائی جایا کرتی ہے، اور وہ ہیئت اور کیفیت ممثل لہ کے اُوپر صادق آتی ہے جس کے لئے مثال پیش کی جارہی ہے، اس لیے اس میں علیحدہ علیحدہ اجزاء دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، کہ اِس جزء سے کیا مراد ہے، اِس جزء سے کیا مراد ہے، یہاں تشبیہ کا مفہوم نہیں ہوا کرتا، بلکہ کل مثال کو سامنے رکھتے ہوئے جو ایک ہیئت اور کیفیت انسان کے ذہن میں آتی ہے، ممثل لہ کے بارے میں وہی کیفیت بیان کرنی مقصود ہوتی ہے، علیحدہ علیحدہ اجزاء کی ایک دوسرے کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود نہیں ہوتا۔

دو مثالیں کیوں ذکر کی گئیں؟

منافق اصل میں دو طرح کے تھے جیسا کہ عام طور پر مفسرین ذکر کرتے ہیں، بعض تو ایسے تھے جن کو اپنے دل میں کُفر کے اوپر قرار تھا، اُن کے دل میں تردد نہیں تھا، اندر کُفر چھپایا ہوا تھا اور ظاہر ایمان کو کرتے تھے، اپنے آپ کو مؤمن کہتے تھے۔ اور دوسرے وہ تھے جن کے دل میں کُفر تھا لیکن کبھی کبھی وہ تردد کی کیفیت اختیار کرلیتے۔ تو یہ دونوں مثالیں اِنہی دونوں گروہوں کو واضح کرنے کے لئے ہیں۔

پہلی مثال کی وضاحت

پہلی مثال کا حاصل یہ ہے کہ جیسے ایک شخص آگ جلاتا ہے، اس لیے جلاتا ہے کہ وہ بھی اور اس کے اردگرد والے لوگ بھی اُس کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھائیں، آگ میں یہی دو مقصد ہوا کرتے ہیں، پہلے زمانے میں جب چراغوں کا سلسلہ نہیں تھا تو لوگ روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی آگ جلاتے تھے، اور جیسے اپنے ہاں قریب زمانے میں بھی دیئوں کا رواج تھا، تو دیا بھی ایک آگ ہی ہے جو انسان روشنی حاصل کرنے کے لئے جلاتا ہے، اور باہر جانے والے مسافر اور جنگل میں رہنے والے تو باقاعدہ لکڑیاں جلا کر روشنی حاصل کرتے ہیں، تو گرمی کا حاصل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے اور روشنی کا حاصل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ جلانے والے کا مقصد یہ ہے کہ خود بھی فائدہ اٹھائے اور اُس کے ساتھی بھی اُس کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھائیں، آگ جل پڑی، اردگرد روشن ہو گیا، اور جس وقت اُن کے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا تو یکدم آگ بجھ گئی اور وہ ہر قسم کے فائدے سے محروم ہو گئے۔ یہ ایک مثال دی ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کا شخص جس نے آگ جلائی ہو اور کسی فائدے کے حاصل کرنے کے لئے جلائی ہو، لیکن جب فائدہ حاصل کرنے کا موقع آئے وہ آگ بجھ جائے تو یہ ایک انتہائی درجے کی ناکامی کی صورت ہے، اسی طرح سے اُن لوگوں نے اپنی زبان سے ایمان کو ظاہر کیا، دل میں کُفر چھپایا، اور ظاہر اس لیے کیا تھا کہ اِس سے فائدہ اٹھائیں گے، لیکن جب مریں گے تو مرتے ہی ان کا یہ نور بجھ جائے گا، اور وہ ایمان جس کے ذریعے ظاہری طور پر اُنہوں نے ایک روشنی مہیا کرنے کی کوشش کی تھی وہ ان کے لئے کسی قسم کے کام نہیں آئے گا۔ اور یہ گروہ جنہوں نے اپنے دل کے اندر کفر کو چھپایا ہوا ہے، جیسے پہلے اُن کافروں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اِن کے دلوں پر مہر کر دی، اِن کے کانوں پر مہر کر دی، اِن کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، اِس لیے یہ لوگ کسی صورت میں بھی سمجھتے نہیں اور ایمان نہیں لائیں گے، اسی طرح اِن کے بارے میں بھی کہا کہ ان کے کان بیکار ہو چکے ہیں کہ کانوں سے باتیں سن کر اِن کا دل متاثر نہیں ہوتا، زبان سے یہ گونگے ہیں کہ حق بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتے، یہاں گونگے اس اعتبار سے ہیں، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے وہ بہرے نہیں تھے، اُن کے کان میں آواز جاتی تھی، لیکن جس وقت وہ اس آواز سے متاثر نہیں ہوتے تھے تو یونہی سمجھو کہ بہرے ہیں، کیونکہ سننا تو مقصود ہوتا ہے متاثر ہونے کے لئے، اور اگر کوئی شخص بات تو سنتا ہے اور اُس کے کان میں آواز تو جاتی ہے لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے نہیں سنی۔ اور یہ لفظ ہمارے محاورے میں بھی یونہی استعمال ہوتا ہے، جیسے میں آپ سے کہوں کہ میں تمہیں بار بار نصیحت کرتا ہوں لیکن تم سنتے ہی نہیں، اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آواز ہی آپ کے کان میں نہیں جاتی، آواز تو جاتی ہے، لیکن متاثر نہ ہونے کو نہ سننے سے تعبیر کیا جا رہا ہے، کہ جب سننے کا مقصد حاصل نہیں ہوا تو سننا اور نہ سننا برابر ہے، اسی طرح یہاں ہے کہ جب وہ کانوں کے ذریعے سے متاثر نہیں ہوتے تو یوں سمجھو کہ وہ کانوں سے بہرے ہیں اور اُن کے کانوں میں سننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی، زبان کے ساتھ حق بات کا اقرار کرنا زبان کا اصل کام ہے، اگر کوئی شخص حق کا اعتراف نہیں کرتا اور حق بات اپنی زبان پر نہیں لاتا تو یوں سمجھو کہ گونگا ہے۔ جیسے بعض روایات میں آتا ہے کہ عالم آدمی جو کسی بُرائی کو دیکھے اور اُس کی بُرائی کو ظاہر نہ کرے اُس کو شیطانِ اخرس کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے

یعنی گونگا شیطان[۱] تو اُس کا مقصد بھی یہی ہے کہ زبان سے کام لینا چاہیے تھا کہ وہ حق بیان کرے، حق کا اظہار کرے، حق کا اقرار کرے، جس وقت وہ حق کو بیان نہیں کرتا اور حق کا اقرار نہیں کرتا تو یوں سمجھو کہ گونگا ہے۔ اور اِسی طرح بعض حقائق اس قسم کے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان متاثر ہوتا ہے، تو آنکھ اللہ نے اس لیے دی تا کہ اِس کے ذریعے سے تم حقائق کو پہچانو اور اُن حقیقتوں سے متاثر ہوؤ، بعض باتیں ایسی ہیں جن کو انسان مشاہدہ کر کے تسلیم کرتا ہے، جب وہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن اُن حقیقتوں کو پہچانتے نہیں اور ان سے متاثر نہیں ہوتے تو یوں سمجھو کہ اندھے ہیں۔ ایک چیز آپ کے سامنے پڑی ہوئی ہے لیکن آپ اُس کا انکار کرتے چلے جاتے ہیں تو آپ کو آپ کے ساتھ کلام کرنے والا یہی کہے گا کہ اندھے ہو؟ یہ تمہیں نظر نہیں آ رہی؟ حالانکہ گفتگو کرنے والے کو پتہ بھی ہوتا ہے کہ آپ اندھے نہیں ہیں، لیکن جس وقت سامنے پڑی ہوئی چیز کو بھی آپ نہیں دیکھتے اور اس کو تسلیم نہیں کرتے تو انسان یہی کہتا ہے کہ یہ تو اندھا ہے، اس سے کیا بات کرتے ہو، تو یہاں بھی اُن کو اندھا اسی اعتبار سے کہا جا رہا ہے۔ جب کان ماؤف ہو گئے، اور زبان بھی حق کے اقرار سے محروم ہو گئی، اور آنکھیں بھی حقیقت پہچاننے سے اندھی ہو گئیں تو فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: یہ لوگ اپنے راستے سے واپس نہیں لوٹ سکتے، یہ اِن کے بارے میں فیصلہ ہو گیا کہ اب یہ لوگ واپس نہیں لوٹیں گے، جدھر کو جا رہے ہیں اندھا دھند اُدھر کو ہی دوڑتے چلے جائیں گے، پیچھے سے آوازیں دیتے رہو یہ نہیں سنیں گے، آنکھیں اِنہوں نے بند کر رکھی ہیں، کچھ دیکھتے نہیں، زبان سے کسی سے پوچھتے نہیں، جب معلومات حاصل کرنے کے یہ تینوں راستے ہی ماؤف ہو گئے تو جدھر کو ان کا رُخ ہے چلتے چلے جائیں گے، اب اِن کے لوٹنے کی اور واپس آنے کی کوئی صورت نہیں۔

تو یہاں آگ کا ذکر ہوا، جلانے کا ذکر ہوا، نور کے پھیلنے کا ذکر ہوا، نور کے بجھنے کا ذکر ہوا، ہر چیز کی مثال کسی دوسرے سے ذکر کرنا ضروری نہیں، کہ آگ سے کیا مراد ہے اور جلانے والے سے کیا مراد ہے، کیونکہ یہ ایک مثال ہے جس کے ساتھ ایک کیفیت اور ایک ہیئت آپ کے سامنے لائی گئی، اور اِن لوگوں کے اُوپر یوں منطبق کی گئی کہ اِن کا حال بھی اسی شخص جیسا ہی ہے۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے، مشکوٰۃ شریف باب الاعتصام میں حدیث آئے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے ایک شخص آگ جلاتا ہے اور پتنگے کیڑے مکوڑے زبردستی آ کر آگ میں گرنے لگ جاتے ہیں، اور وہ شخص ان پتنگوں کو اور کیڑے مکوڑوں کو دور ہٹاتا ہے تا کہ وہ جلیں نہیں، کیونکہ آگ اس لیے جلائی گئی ہے کہ لوگ فائدہ اٹھائیں، اس لیے تو نہیں جلائی کہ پتنگے اِس میں چھلانگیں لگا لگا کر اپنے آپ کو جلا لیں۔ فرمایا کہ میری مثال بھی اسی طرح سے ہے، کہ میں تمہیں پکڑ پکڑ کر دور ہٹاتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ "هَلُمَّ عَنِ النَّارِ"[۲] آگ سے دور ہو جاؤ، آگ سے دور ہو جاؤ، لیکن تم ہو کہ کیڑوں اور پتنگوں کی طرح اس میں گھستے ہی چلے جا رہے ہو۔ تو اس قسم کی مثالیں دے کر کیفیت کو واضح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی اِسی طرح سے وہ منافقین جو اپنے دلوں میں کُفر پر قرار پکڑے ہوئے ہیں اُن کی مثال اس طرح سے دے دی کہ یہ محروم ہیں، اور بوقتِ ضرورت اُس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ باقی! اب اِن کے متاثر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، کیونکہ یہ اغراض پرستی

---

(۱) یہ ابوعلی الدقاق کا قول ہے، دیکھیے شرح نووی علی مسلم ج ۱ ص ۵۰ باب الحث علی اکرام الجار۔

(۲) مسلم ۲/۲۴۸، باب شفقته علی امته۔ مشکوٰۃ ۱/۲۸، باب الاعتصام، فصل اول۔ نیز بخاری ۲/۹۶۰، باب الانتهاء الخ۔

میں اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ نہ یہ کانوں سے متاثر ہوں، نہ یہ زبان سے اقرار کریں، اور نہ یہ آنکھوں سے متاثر ہوں، اس لیے اِن کا اپنی حالت سے دوسری طرف کو لوٹ کر آنا اب ممکن نہیں رہا، فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کا یہ مفہوم ہوا۔

دُوسری مثال کی وضاحت

دوسری مثال متردّدین کی دے دی، یہ یوں سمجھو کہ چند آدمی سفر کرتے ہوئے جا رہے ہیں، رات ہو، اور بادل چھا جائیں، اور پھر زور کی بارش آجائے، اب اِس مثال کو اپنے ذہن میں لائیے، ایک تاریکی تو رات کی ہوگئی، اور اس کے اُوپر اضافہ بادل کے ساتھ ہوگیا، اور پھر جس وقت زور سے بارش آئے گی تو پانی کے گرنے کے ساتھ تیسری تاریکی ہوگئی، تاریکیاں ہی تاریکیاں جمع ہوگئیں، جس کو آپ گھٹا ٹوپ اندھیرا کہتے ہیں، کہ اگر انسان اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اُس کو نہیں دیکھ سکتا، یہ مثال قرآنِ کریم میں آئی ہے ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا (سورۂ نور: ۴۰)، اُردو میں اس کے لئے محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا، ''اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا'' دیکھو! یہ ہاتھ اِس ہاتھ کو تلاش کرنا چاہے، چاہے آپ آنکھیں بند کرلیں، حقیقتاً اندھے ہوں، یہ ہاتھ ہاتھ کو تلاش کرلیتا ہے، یہ کبھی ایک دوسرے سے خطا نہیں کرتے، لیکن جب مبالغۃً تاریکی کو ذکر کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا، یہ ایک مبالغہ ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہے کہ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ: اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ نکالے، لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا: تو دیکھنے کے قریب بھی نہیں جاتا، یہاں بھی ہاتھ کی مثال اس لیے دے دی کہ انسان اپنے ہاتھ کو قریب سے قریب تر کرسکتا ہے، انسان کی اور کوئی ایسی چیز نہیں جو اُس کی آنکھوں کے زیادہ سے زیادہ قریب آجائے، یہ ہاتھ قریب اور دور، جدھر چاہو کرلو، تو جب انسان کو اپنا ہاتھ بھی نظر نہ آئے تو کسی دوسری چیز کے نظر آنے کی کیا توقع ہے؟۔ اس طرح سے تاریکیاں ہی تاریکیاں اکٹھی ہوگئیں، رات کی تاریکی اور اس کے اُوپر بادل چھا گئے، پھر زوردار بارش ہوگئی، یہ تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوگئیں، سفر میں جا رہے ہیں اور یہ حالت آگئی، اور اُدھر بادلوں میں کڑک ہے اور بجلی چمکتی ہے اور اُس بجلی کے گرنے کا اندیشہ بھی ہے، اب یہ لوگ جو پھنسے ہوئے ہیں، جس وقت زور سے کڑک آتی ہے اور موت کا ڈر ہے کہ کہیں بجلی گرنے کی وجہ سے مر نہ جائیں، تو اپنی انگلیاں کانوں میں دے کر وہ اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں، ''انگلیاں دیتے ہیں کانوں میں بجلی کے ڈر سے''، کڑک جس وقت آتی ہے تو خوفزدہ ہوکر اپنے کان بند کرتے ہیں، کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں، اور جب بجلی چمکتی ہے اور راستہ ذرا تھوڑا سا نمایاں ہوتا ہے تو آگے کو چل پڑتے ہیں، اور جس وقت تاریکی چھا جاتی ہے اور روشنی ختم ہوجاتی ہے تو پھر حیران ہوکر وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ اب یہ لوگ جو بارش کے اندر گھرے ہوئے ہیں ان کی کس قسم کی سراسیمگی اور پریشانی کی کیفیت ہوتی ہے۔ تو بعض لوگ اسی قسم کے تھے، قرآنِ کریم ایسے ہے جیسے آسمان سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک بارش اتاری، اور اس کے اندر جو وعیدیں ہیں اور دنیا اور آخرت کے عذابوں کا جو تذکرہ ہے اِس سے وہ لوگ خوفزدہ بھی ہوتے ہیں، اور پھر اُن سے بچنے کے لئے کوئی وہمی سی تدبیریں بھی اختیار کرتے ہیں، جب اِس کے قبول کرنے میں ذرا سا نفع معلوم ہوتا ہے تو قدم آگے کو بھی بڑھتے ہیں، اور جب اس دین کے قبول کرنے سے کوئی مصیبت یا تکلیف کا سامنا ہوتا ہے تو پھر وہ

کچھ پیچھے کو بھی ہٹ جاتے ہیں، تو یہ جو تردد کی کیفیت ہے اس کو اس مثال کے ساتھ واضح کیا گیا۔ اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وعید سنادی گئی کہ انکار کرنے والے جتنے ہیں یہ سب اللہ کے احاطے میں ہیں، جس طرح سے کوئی شخص گرنے والی اور کڑکنے والی بجلی سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے کر نہیں بچ سکتا، یہ ایسے ہی ایک وہمی سی تدبیر ہے، جب بجلی گرے یا بجلی کڑکے اور کوئی کہے کہ میں اپنے کانوں میں انگلیاں دے دوں، نہ اس کی آواز سنوں گا اور نہ اس بجلی کا شکار ہوں گا، اس قسم کی تدبیروں کے ساتھ اللہ کے عذاب سے بچا نہیں جاسکتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی آنکھیں بھی ختم کردے اور ان کے کان بھی ختم کردے، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اس طرح سے اُن کو یہاں وعید بھی سنادی گئی۔ تو یہ مثال اُن لوگوں کی ہوگئی جو کہ متردد قسم کے ہیں، اور وعیدوں سے اور قرآنِ کریم کی جھڑکیوں سے، یعنی دنیا اور آخرت کے عذاب کے ساتھ جو وعیدیں سنائی جارہی ہیں ان سے کچھ ڈرتے بھی ہیں، اور جب کچھ نفع کی توقع ہوتی ہے تو آگے کو بھی بڑھتے ہیں، اور جہاں وہ نفع ختم ہوتا نظر آتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ سامنے آتا ہے تو ان کے قدم رُک جاتے ہیں اور وہ پیچھے کو ہوجاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! عبادت کرو اپنے ربّ کی جس نے تم کو اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا فرمایا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿۲۱﴾

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالا اس کے ذریعے

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ

پھلوں سے تمہارے لیے رزق، پس تم اللہ کے لئے مقابل نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾ اور اگر تم اس کتاب کی طرف سے شک میں

مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی تو لے آؤ کوئی سورت جو اس جیسی ہو اور بلا لو اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ

تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پس اگر تم نہ کرو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو ڈرو آگ سے جس کا ایندھن انسان

وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ

اور پتھر ہیں، وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے ﴿۲۴﴾ اور خوشخبری دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ بیشک ان کے لئے

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا

باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جب کبھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل بطور غذا کے دیا جائے گا تو کہیں گے

هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ

کہ یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا، اوران کو ہم شکل پھل دیے جائیں گے، اوران کے لئے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورت کی ابتدا سے[1] اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا تذکرہ کیا، مؤمنین کا ذکر کیا، ان کی صفات کو بیان فرمایا، پھر کافروں کا ذکر کیا، اوراس کے بعد جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہیں یعنی منافقین، ان کا تفصیلی ذکر کیا، ان کی عادات کو بیان کیا، اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اور توحید کے دلائل کو بیان کیا جارہا ہے۔

جبینِ نیاز کس کے سامنے جھکنی چاہیے؟

سب سے پہلے فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ: اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ یہ خطاب عام ہے، مؤمن اور کافر سب کو شامل ہے کہ سارے کے سارے لوگ اپنے رب کی عبادت کریں۔ اور پھر صفت ربوبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا ربّ وہ ہے جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا فرمایا، کہ تمہارا خالق صرف اور صرف اللہ ہے، اور اس کی خالقیت کا تقاضا ہے کہ اسی کو اپنا معبود تسلیم کیا جائے، اور اپنی جبینِ نیاز کو اسی کے سامنے جھکایا جائے۔

مفہومِ عبادت اور مطالبہ عبادت

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ: اس آیتِ کریمہ میں لوگوں کو عبادت کا حکم دیا گیا، اور لفظ عبادت یہ عبد سے

---

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان آیات کی تفسیر میں جانشین حکیم العصر شیخ الحدیث مولانا منیر احمد صاحب منوّر مدظلہ کی تقریر درج کی گئی ہے۔

ہے، عبد عربی زبان میں اس غلام کو کہتے ہیں جو مکمل طور پر اپنے آقا کا تابع ہوتا ہے، کہ جو آقا اُسے دے گا وہی کھائے گا، جو آقا اُسے پہنائے گا وہ وہی پہنے گا، اور جو خدمت آقا اس سے لینا چاہے گا وہ اس خدمت کو سرانجام دے گا، یعنی اس کی ساری زندگی اور زندگی کے صبح وشام آقا کے تابع ہوں گے، اور وہ اپنی زبان پر حرفِ شکایت نہیں لاسکتا، اور وہ اتنا مجبور ہوتا ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر نہ وہ کچھ بیچ سکتا ہے، نہ خرید سکتا ہے، نہ کوئی اور معاملہ کرسکتا ہے، اگر کر بھی لے گا تو وہ بھی آقا کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر آقا تسلیم کرلے تو درست ہوگا، ورنہ باطل قرار پائے گا، جو شخص اس قدر مجبور ہو اس کو عربی زبان میں عبد کہا جاتا ہے۔ اور یہاں بھی عبد بننے کا مطالبہ ہے کہ اپنی ساری خواہشات کو اپنے خالق اور مالک کے تابع کردو، جن چیزوں کا حکم دے ان کو اپنالو، اور جن چیزوں سے منع کرے ان سے رک جاؤ، اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے عبد اور غلام بنا کر رکھو، جس حال میں بھی وہ رکھے اسی حال میں خوش رہو، اپنی زبان پر حرفِ شکایت نہ لاؤ، یہ ہے عبادت کا مفہوم، اور اسی کا مطالبہ ہم سے اس آیت کے اندر کیا گیا ہے۔

عبادت کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ فرمایا کہ اس عبادت کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ جب تم ہر وقت اپنے رَبّ کی عبادت میں لگے رہو گے، اس کے فرمانبردار بن جاؤ گے، اپنی خواہشات کو اس کے حکموں کے تابع کردو گے، تو پھر تمہیں تقویٰ والی صفت حاصل ہوجائے گی، اور تم اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے بن جاؤ گے۔ پھر تقویٰ کے مختلف درجات ہیں، اس کا ایک معنی گناہوں سے بچنا بھی ہے، کہ جب کوئی شخص ہر وقت اللہ کی عبادت میں لگا رہے گا، اس کو خوش رکھنے کی فکر میں ہوگا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچے گا۔ اور اس کا ایک معنیٰ دوزخ کے عذاب سے بچنا بھی ہے، کہ جب کوئی شخص گناہوں سے بچے گا، تو ظاہر ہے کہ دوزخ کے عذاب سے بھی محفوظ رہے گا، اسی لیے بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ لکھا ہے "تاکہ تم دوزخ سے بچو"۔

توحید کے دلائل

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا: اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ تو ہر چھوٹی بڑی چیز میں ہوتا ہے، اور اللہ کی قدرت ہر چیز سے نمایاں ہوتی ہے، اور پہچاننے والوں نے تو اپنے رب کو شہتوت کے پتے سے پہچانا ہے، کسی نے صرف ایک چھوٹے سے کیڑے سے اللہ کو پہچانا ہے، لیکن اس آیت میں دلائل قدرت میں سب سے عیاں اور واضح چیز جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کو بیان کیا ہے ...... اس آیت میں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ "اس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا" اب زمین کا وجود سب کے سامنے ہے، اَن پڑھ سے اَن پڑھ اور جاہل سے جاہل شخص بھی سمجھتا ہے، کہ وہ زمین پر آباد ہے، پھر یہ زمین ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے، اور اس زمین کے اندر بہت سارے منافع ہیں، جن سے ہم صبح شام ہر وقت فائدہ حاصل کرتے ہیں، اور یہ زمین کا وجود ہی خود بتاتا ہے کہ اس کو بنانے والا بہت بڑی قدرت کا مالک ہے۔

۲۔ زمین کے تذکرے کے ساتھ ہی پھر آسمان کا ذکر فرمایا کہ اللہ نے آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا ہے، جیسے مکان

کی چھت ہوتی ہے تو زمین کی چھت آسمان ہے، اور پھر چھت میں روشنی کے لئے بلب لگائے جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی آسمان کو سورج چاند اور ستاروں سے مزین کیا ہے، اس کے علاوہ آسمان کے اور بھی بہت سارے فوائد ہیں، مثلاً غم کا کم ہونا، وہم اور خوف کا زائل ہونا، اور آسمان دعا کرنے والوں کا قبلہ ہے۔

۳۔ زمین اور آسمان کے تذکرے کے بعد پھر بارش کا ذکر فرمایا، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، اور اس کے ذریعے مختلف قسم کے پھل پیدا فرمائے، جو لوگوں کے لئے رزق ہیں، ان کے ذریعے انسان نشو ونما پاتا ہے اور قوت حاصل کرتا ہے، اس زمین کی رونق بارش کی وجہ سے ہی قائم ہے، کہ جب بارش ہوتی ہے تو بارش کا پانی انسانوں اور جانوروں کے کام آتا ہے، اس سے زمین سیراب ہوتی ہے، اور اس کے ذریعے پھل پھول بیل بوٹے اُگتے ہیں، اور اس سے اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ زمین ایک ہی ہے، اترنے والا پانی بھی ایک ہی قسم کا ہے، لیکن زمین سے جب سبزہ نکلتا ہے تو اس کے رنگ بھی مختلف ہیں، ذائقے بھی مختلف ہیں...... یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے انعام ہیں جو کسی سے بھی مخفی نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا کیا ہے؟

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا: زمین آسمان اور بارش کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم نے اپنے خالق کی قدرت کو پہچان لیا، اور اس کے انعامات تم پر واضح ہو گئے، تو اب عقل اور سمجھ کا تقاضا یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کو ہی اپنا خالق اور مالک تسلیم کرو، صرف اسی کی عبادت کرو، صرف اسی کی ربوبیت کا اقرار کرو، اور اس کے مقابل کسی اور شریک مت ٹھہراؤ، اس کے علاوہ رب بھی کوئی نہیں، پالنے والا بھی کوئی نہیں، پیدا کرنے والا بھی کوئی نہیں، نعمتیں دینے والا بھی کوئی نہیں، ان سب باتوں کو جانتے ہوئے پھر بھی شرک کرنا اور اس کے مقابل کسی کو اس کی ذات وصفات میں شریک ٹھہرانا یہ عقل اور فہم کے خلاف ہے، اس لیے ان نعمتوں کا تقاضا یہی ہے کہ صرف اس ایک اللہ کو ہی اپنا خالق اور رب تصور کر کے صرف اور صرف اسی کی بندگی کی جائے۔

حقانیتِ قرآن پر کھلا چیلنج اور کفّار کا عجز

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا: عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کے بعد اب اس آیت میں عقیدۂ رسالت کو ماننے کی دعوت دی جارہی ہے، کیونکہ جب اپنے خالق اور مالک کو پہچان لیا تو اب اس کی ذات وصفات کو جاننا بھی لازم ہے، اور اس کی مرضیات و نامرضیات کو جاننا بھی ضروری ہے، اب اللہ کی مرضیات و نامرضیات کیا ہیں؟ ہمیں خود بخود اس کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ بسا اوقات جب ہمارا کوئی دوست مہمان آتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ ٹھنڈا پسند کریں گے یا گرم؟ دوست ہے، جان پہچان ہے، اکٹھے رہتے ہیں، پھر بھی اس کے بتائے بغیر ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ اس کو کیا پسند ہے، تو اللہ کی مرضیات و نامرضیات کو ہم خود بخود کیسے پہچان سکتے ہیں؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے اظہار کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، اور ہر نبی کو اس کی نبوت کے ثبوت کے لئے اس ماحول کے مطابق معجزات دیے، کہ جس زمانہ میں جس چیز کا رواج تھا اللہ نے اپنے نبی کو ویسی ہی چیز

عطا فرمائی، جس کا مقابل لانے سے اس کے مد مقابل عاجز رہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا زور تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس قسم کے معجزات عطا فرمائے جیسے عصا اور یدِ بیضاء۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب اور حکمت کا زور تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس قسم کے معجزات عطا فرمائے، مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا، کوڑھیوں کو تندرست کرنا۔ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا، حتیٰ کہ اہل عرب اپنے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو گونگے تصور کرتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں اور بہت سارے معجزات عطا فرمائے گئے، ان میں سے سب سے بڑا معجزہ آپ کا قرآنِ کریم ہے، جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے تمام عرب اور ان کے شعراء عاجز آ گئے، اور قرآنِ کریم کا چیلنج آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جب قرآنِ کریم نازل ہوا تو بعض جاہلوں نے کہا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (سورۂ انفال: ۳۱)، اور کچھ لوگوں نے قرآن کے مقابلے میں کچھ عبارتیں بنائیں، پھر خود ہی جب آپس میں مل کر بیٹھے، تو کہنے لگے کہ یہ تو قرآن جیسی نہیں ہیں، اور آج تک کوئی اس جیسی ایک آیت بھی بنا کر نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ آیت مذکورہ میں اہل عرب کو قرآن جیسی ایک سورت بنا کر لانے کا چیلنج کیا گیا ہے، اور یہ بھی چھوٹ دی ہے کہ اس کے بارے اللہ کے علاوہ اپنے سب حمایتیوں اور مددگاروں کو بلا لو۔ ابتدا میں دس سورتیں بنانے کا حکم دیا تھا، پھر بعد میں ایک سورت بنانے کا حکم دیا، لیکن عرب کے تمام فصحا و بلغاء اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی بنا کر نہ لا سکے اور اس سے عاجز رہے۔

قرآنِ کریم کو قبول نہ کرنا جہنّم کو دعوت دینے کے مترادف ہے

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا: اس آیتِ کریمہ میں قرآن کریم کے ہمیشہ باقی رہنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اور یہ بھی پیشین گوئی کی گئی ہے کہ قیامت تک کوئی فرد یا جماعت اس جیسا دوسرا قرآن نہیں بنا سکتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جیسے قیامت تک باقی رہے گی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ قرآنِ کریم بھی قیامت تک باقی رہے گا۔ قرآن موجود ہے اس کی دعوت عام ہے، پھر بھی اس کو قبول نہ کرنا اپنے آپ کو جہنم کے عذاب میں ڈالنے والی بات ہے، اس لیے فرمایا کہ تم اس قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے خواہ مخواہ اس کا انکار کر کے عذاب کے مستحق نہ بنو، اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ! جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، انسان تو وہی جو منکر ہیں، اور پتھروں سے وہ پتھر مراد ہیں جن کی مشرکین دنیا میں عبادت کیا کرتے تھے، وہ پتھر بھی جہنم میں ہوں گے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ: اور یہ دوزخ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اہلِ جنّت کے اِنعامات کا ذکر

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اس رکوع میں عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، اور نہ ماننے والوں کے لئے عذاب کے تذکرے کے بعد اب اس آیت میں ایمان لانے والے اور نیک اعمال کرنے والے لوگوں کے لئے جزا کا ذکر ہے، جو مختلف نعمتوں کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ پہلے تو یہ بیان کیا کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اور نیک اعمال کرتے ہیں، ان کے لئے جنت کے اندر باغات ہوں گے، اور ان باغات میں نہریں جاری ہوں گی، پھر یہ مختلف قسم کی نہریں ہوں گی، صاف شفاف پانی کی نہر ہوگی، دودھ

کی نہر ہوگی، شراب طہور کی نہر ہوگی، اور شہد کی نہر ہوگی، اور وہ شراب ایسی ہوگی جو پینے والوں کے لئے لذت کا باعث ہوگی، نہ اس سے نشہ آئے گا نہ سر میں درد ہوگا، جیسے دوسری جگہ ہے لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ (سورۂ صافات: ۴۷)۔

جنتی پھلوں کی صفات

دوسرا یہ بیان فرمایا کہ ان درختوں کے جو پھل ہوں گے ان پھلوں میں سے جب کبھی بھی کوئی پھل ان کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا، کیونکہ وہ پھل آپس میں ہم شکل ہوں گے، اگرچہ لذت اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو پھل دیا گیا تھا یہ اسی جیسا ہے، اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہیں جنت میں جو پھل دیے جائیں گے ان کے بارے میں کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا، اور علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں پہلا قول زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ جنت کے اندر سب سے پہلے جو پھل دیا جائے گا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ تو وہی ہے پہلے جو پہلے دیا گیا تھا، یہ اس وقت ہی صحیح ہوگا جب مِنْ قَبْلُ سے دنیا والے پھل مراد لیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جنت کے پھلوں جیسا دنیا میں کوئی پھل نہیں، بس ناموں کی مشابہت ہے، یعنی پھلوں کو دیکھ کر اہلِ جنت کہیں گے کہ یہ سیب ہے، یہ انار ہے، ہم نے اس کو دنیا میں کھایا تھا، لیکن وہ مزے میں دنیاوی پھل کی طرح نہ ہوں گے، بلکہ ان کا مزہ اور ذائقہ جنت کے اعتبار سے ہوگا جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔

جنتی بیویوں کی صفات

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت پاکیزہ بیویوں کا ملنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ گندگی اور تکلیف دینے والی چیز سے پاک ہوں گی، یعنی ان کا ظاہر اور باطن سب کچھ عمدہ اور بہترین ہوگا، شوہروں کی اطاعت کریں گی اور ان کا حسن و جمال بیان کرتے ہوئے، سورت رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ کہ گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں، ایسی پاکیزہ بیویاں اہلِ جنت کو ملیں گی۔ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مؤمن ان نعمتوں کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے نہ وہاں سے نکلیں گے، اور نہ نکالے جائیں گے، نہ ان نعمتوں کو فنا کیا جائے گا نہ مؤمن فنا ہوں گے، نعمتیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوں گی اور فائدہ حاصل کرنے والے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے، حدیث میں آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ کی طرف سے ندا دینے والا ندا دے گا کہ تمہارے لیے یہ بات طے کردی گئی ہے، کہ تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہوگے، اور یہ کہ ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تمہیں موت نہ آئے گی اور جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہوگے اور نعمتوں میں رہو گے پس تم کو کبھی محتاجی نہ ہوگی،[1] اور اس کے برعکس دنیا کی نعمتوں کے اندر ایسی بات نہیں ہے، یہاں کی ساری نعمتیں فانی ہیں، اس لیے اہلِ جنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان نعمتوں کے اندر رہنا، یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۳۸۰ کتاب الجنة باب ما ورد فی ابواب الجنة / مشکوٰۃ ۲/۴۹۶ عن ابی سعید و ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ. باب صفة الجنة فصل اول.

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی بھی مثال بیان فرمائے، مچھر ہو یا اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز ہو، پس جو لوگ

آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ

ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ بیشک یہ مثال ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اور لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ کہتے ہیں

مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ

کہ کیا ارادہ کیا اللہ نے اس مثال کے ساتھ، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہتوں

كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ

کو ہدایت دیتے ہیں، اور اس کے ذریعہ نہیں گمراہ کرتے مگر نافرمانوں کو ﴿۲۶﴾ جو لوگ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کی مضبوطی کے بعد،

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ

اور توڑتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، اور فساد کرتے ہیں زمین میں، یہی لوگ

الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ

خسارہ پانے والے ہیں ﴿۲۷﴾ تم کیسے کُفر کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تم بے جان تھے، پس اس نے تمہیں زندگی دی پھر تمہیں موت دے گا،

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ

پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے

جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

سب کا سب، پھر قصد کیا آسمان کی طرف، پس ان کو ٹھیک طرح بنا دیا سات آسمان، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

تفسیر

مچھر اور مکھی کی مثال پر کُفّار کے اعتراض کا جواب

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عنکبوت اور ذُباب کا قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا تو مشرکین کہنے لگے کہ اس میں تو مکڑی اور مکھی کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے کیا ارادہ کیا ہوگا (ابن کثیر)۔ اور یہ استفہام انکاری ہے

مطلب یہ تھا کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتا۔ تفسیر نسفی میں ہے کہ جب مکھی اور مکڑی کا ذکر کتاب اللہ میں سنا تو یہود ہنسے اور کہنے لگے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے ملتی جلتی بات نہیں ہے[1] اِس سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام نہیں ہے، اِن آیات میں اس شبہ کو دور کیا گیا ہے۔ اور حاصل اس کا کیا ہے؟ شبہ کو اس طرح سے کیا گیا کہ مثال کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ مثال ممثل لہٗ کے مطابق ہونی چاہیے نہ کہ مثال دینے والے کے، جس کی مثال دینا مقصود ہوتا ہے وہ مثال اُس کے حال کی وضاحت کرے، مثال دینے والے کے ساتھ مثال کی مطابقت ضروری نہیں، یہاں مثال دینے والے اگرچہ اللہ تعالیٰ ہیں، لیکن جس چیز کی مثال دی جارہی ہے وہ عاجز اور نکمے بت ہیں، اور اللہ کے علاوہ دوسرے جو آلہہ اختیار کر لیے گئے ہیں اُن کا عجز اور درماندگی ثابت کرنے کے لئے یہ مثال بیان کی گئی ہے، کہ جن کو تم نے اپنا کارساز سمجھ رکھا ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ مشکل وقت میں ہمارے کام آئیں گے، اُن کی تو حقیقت یہ ہے کہ ایک مکھی کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، مکھی کو پیدا تو کیا کرنا ہے اگر مکھی ان کے چڑھاووں میں سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے وہ واپس نہیں لے سکتے، تو جب وہ اتنے عاجز ہیں تو تم انہیں اپنا کارساز اور مشکل کشا کس طرح سے سمجھتے ہو؟۔ اور ایسے ہی مکڑی کی مثال جہاں دی گئی وہاں بھی اِسی حقیقت کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے علاوہ جو لوگوں نے سہارے اختیار کر رکھے ہیں کہ یہ مصیبت کے وقت ہمارے کام آئیں گے، اُن کی مثال دی گئی ہے کہ جیسے مکڑی ایک گھر بنالیتی ہے، اور تمام چیزوں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (سورۂ عنکبوت: ۴۱) ہوا کا ایک جھونکا آجائے تو وہ سارے کا سارا جالا اڑ جاتا ہے، اور ایک بچہ ایک جھاڑ دے کر پھیر دے تو سارے کا سارا جالا اکٹھا ہوجاتا ہے، تارِ عنکبوت اپنی کمزوری میں ایک ضربِ مثل ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُن شرکاء کا عجز بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ سہارے تو تارِ عنکبوت ہیں، تم اِن کو سمجھتے ہو کہ ہماری مشکل کے وقت یہ کام آئیں گے، حالانکہ یہ مشکل کے وقت کام آنے والے نہیں ہیں۔ تو اِن کا عجز مکھی اور مچھر کی مثال سے ہی ثابت کیا جاسکتا ہے، اگر یوں کہا جائے کہ تمہارے آلہہ ہمالیہ پہاڑ پیدا نہیں کر سکتے، سورج نہیں بنا سکتے، چاند نہیں بنا سکتے، تو اِس میں اُن کا عجز اتنا نمایاں نہیں ہے جتنا مکھی یا مکڑی کی مثال دینے میں نمایاں ہے۔ جب مثال کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ممثل لہٗ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے تو اِس مقصد کے تحت یہ مثال عین موقع محل کے مطابق ہے، اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ ایمان لے آئے اور اُن کا طرزِ فکر صحیح ہوگیا وہ اِس مثال کو عین موقع کے مطابق سمجھتے ہیں اور اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ: حق کا معنی یہاں یہی ہے کہ یہ مثال عین موقع کے مطابق ہے۔ لیکن جو لوگ کافر ہیں اور اُن کو حقیقت سمجھنے کا سلیقہ نہیں ہے، اُن کا طرزِ فکر غلط ہے، وہ اِن مثالوں سے مزید کفر کی طرف چلے جاتے ہیں، اور استہزاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان مثالوں سے کیا ارادہ ہے؟

قرآن کی وجہ سے گمراہ ہونے کا مطلب ایک مثال کی روشنی میں

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ارادہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے سے بہتوں کو ہدایت دی جائے اور بہتوں کو گمراہ کیا جائے۔

---

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہاں تک چند سطر اور ترجمہ "انوار البیان" سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس کے بعد کی تقریر حضرت حکیم العصرؒ کی ہے۔

یہ بات ایسے ہے جیسے حضرت تھانوی ؒ نے مثال دیتے ہوئے ذکر فرمایا، کہ ایک ڈاکٹر نے نگاہ کے شیشے تیار کیے، اب ایک سمجھدار آدمی وہاں جائے گا اور شیشوں کو طریقے کے مطابق استعمال کرے گا تو اس کی بینائی تیز ہوگی اور وہ ان شیشوں سے فائدہ اٹھائے گا، اور اگر ایک جاہل اناڑی اُجڈ آدمی چلا جائے اور وہ ان شیشوں کو اٹھا کر اپنی آنکھوں میں مارنا شروع کردے اور اس کا ڈھیلا پھوٹ جائے، بعد میں وہ ڈاکٹر پر ناراض ہو کہ ڈاکٹر صاحب! یہ شیشے کیوں بنائے ہیں؟، ڈاکٹر یہی کہے گا کہ اس لیے بنائے ہیں تاکہ سمجھداروں کی بینائی تیز ہو اور تیرے جیسے بیوقوفوں کی آنکھیں پھوٹیں۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر کا یہ قول اصل میں اُس کے غلط استعمال کی بناء پر اُس پر ایک الزام ہے، کہ جب جاہل آدمی اپنی جہالت کی بناء پر ایک چیز کو غلط استعمال کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یہ بیان کردہ مثال ہے، اگر اِس کو ممثل لہٗ کے ساتھ مطابقت دے کر دیکھا جائے اور اس مثال کے ذریعے سے شرکاء کے عجز کو سمجھ لیا جائے تو یہ مثال مزید ہدایت کا باعث بنے گی، اور اگر اپنی بے وقوفی اور جہالت کے ساتھ محض اس کے ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہ اللہ عظیم الشان ہے اور وہ مثال مکھیوں کی بیان کرتا ہے، یہ اس کی شان کے لائق نہیں، تو پھر اس قسم کی کج روی کے نتیجے میں گمراہی بڑھتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”گمراہ نہیں کرتا اس کے ذریعے سے مگر نافرمانوں کو“، جن کو بغاوت کی عادت ہے، طاعت سے نکلنے کی عادت ہے، وہی اِس کے ذریعے سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اور اِضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اُسی اعتبار سے ہے جو آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا، کہ ہر کیفیت اور ہر چیز کا خالق چونکہ اللہ ہے، اس لیے چاہے ضلالت ہو چاہے ہدایت ہو، جو کچھ پیدا ہوگا سب اللہ کے پیدا کرنے سے ہوگا، خالق ہونے کے اعتبار سے اس کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔

فاسقین کی پہچان

اگلے الفاظ (اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ الخ) میں فاسقین کی وضاحت کردی گئی، کہ فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں اُس کی پختگی کے بعد، اس سے مراد وہ عہد ہے جو عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے خطاب کرکے کہا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، اور سب نے جواب دیا تھا بَلٰى (سورۂ اعراف: ۱۷۲)، اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اقرار کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار ہے، تو وہاں جو عہد کیا گیا تھا دنیا میں آکر اس کو توڑ دیا، اِس میں حقوق اللہ کے تلف کی طرف اشارہ ہے۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ: جن چیزوں کے وصل کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ اُن کو ملایا جائے، جیسے صلہ رحمی ہے اور دوسرے انسانوں کے حقوق ہیں، جن کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اُس کو وہ قطع کرتے ہیں، اور صلہ رحمی وغیرہ کے ختم کرنے میں اور دیگر اپنے ہم جنسوں کے حقوق نہ ادا کرنے میں زمین کا فساد ہے، اسی لیے فرمایا کہ وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہ ہے فاسقوں کی تعریف، کہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کی بھی رعایت نہیں رکھتے اور جن تعلقات کو قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اُن کو قطع کرتے ہیں، اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں خسارے والے، جو دنیا میں بھی خسارہ اٹھائیں گے اور آخرت میں بھی خسارہ پائیں گے۔

مسئلۂ معاد کی وضاحت اور عقیدۂ عذابِ قبر

آخری آیت (کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ الخ) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاد کے مسئلے کو واضح کیا، جس طرح سے پہلے اجمالاً ذکر کر دیا گیا تھا، کہ اس رکوع میں تینوں عقیدوں کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ ''تم اللہ کے ساتھ کفر کیسے کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے'' اِس بے جان ہونے سے مراد یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے انسان مختلف ذرات کی شکل میں ہوتا ہے، کہیں غذا کی صورت میں، کہیں دوا کی صورت میں، اور اُس کے بعد خون کی صورت میں، نطفے کی صورت میں، جہاں جہاں موجود ہوتا ہے بے جان ہوتا ہے، فَاَحْیَاکُمْ: پھر اس نے تمہیں زندگی دی، یعنی عدم سے تمہیں موجود کیا، بے جان ہونے کے بعد تمہیں جاندار بنایا، ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ: پھر تمہیں وہ موت دے گا، دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد جو موت آتی ہے اِس اِماتت سے وہی موت دینا مراد ہے، ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ: اِس اِحیاء سے قیامت کا اِحیاء مراد ہے، کہ قیامت کے دن پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اُسی کی طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔ اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق اِس موت کے بعد اور قیامت کی زندگی سے پہلے جو زمانہ عالم برزخ میں گزرتا ہے اُس میں بھی من وجہ حیات نصیب ہوتی ہے، جس کی وجہ سے قبر کا عذاب اور قبر کے ثواب کا ادراک ہوتا ہے، اُس کا یہاں ذکر نہیں ہے، بلکہ حیاتِ کاملہ کا ذکر ہے جو قیامت کو ہوگی، اُس کو اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ من وجہ حیات ہے اور من وجہ موت کے مشابہ ہے، کامل حیات نہیں ہے، اس لیے اُس کو ذکر نہیں کیا گیا، ورنہ روایاتِ صحیحہ میں اور قرآنِ کریم کی آیات کے اشاروں میں، ایسے اشارے جو کہ صراحت کے قریب ہیں، عذابِ برزخ کا ذکر ہے، اور اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اِس موت کے بعد قیامت سے پہلے برزخ کے اندر بھی انسان کو من وجہ حیات ملتی ہے، جس سے اس کو ثواب کا، راحت کا، الم کا، عذاب کا ادراک ہوتا ہے، اور انسان بالکل بے جان اور بے حس نہیں پڑا ہوا ہوتا کہ اس کو کسی چیز کی خبر نہ ہو، جو ثواب وعذابِ برزخ کا کلیۃً منکر ہے اُس کو کافر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے اور تواترِ معنوی سے ثابت ہے، اِس کی تفصیل حدیث شریف میں بابِ اِثباتِ عذاب القبر کے اندر ذکر کی جاتی ہے۔ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ: پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اِس میں صراحتاً معاد کا ذکر آ گیا۔

قدرت کے مادّی اِنعامات

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں'' یہاں سے پھر انعامات کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے مادی انعام کا ذکر ہے جن سے انسان اِس دنیا میں فائدہ اٹھاتا ہے، زمین کی چیزیں کھانے سے تعلق رکھتی ہیں، پینے سے تعلق رکھتی ہیں، اسی طرح پہننے کی چیزیں ہو گئیں، ہر قسم کی آرائش زیبائش اور آسائش کے سامان جتنے بھی انسان اختیار کرتا ہے سب زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفع کے لئے اِن سب چیزوں کو پیدا کیا۔ ''پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف، پھر برابر کیا اُن کو، ٹھیک کر کے بنایا اُن کو سات آسمان'' یعنی پہلے آسمان ایک مادے کی شکل میں تھا، چونکہ وہ سات بنے

والے تھے اس لیے سَوّٰھُنّ کے اندر سماء کی طرف جمع کی ضمیر لوٹادی گئی ما یؤل کے اعتبار سے۔ تو پہلے دخان کی شکل میں تھا، جیسے وَھِیَ دُخَانٌ قرآنِ کریم میں ہے (سورۂ حم السجدہ:۱۱)، پہلے وہ دھویں کی شکل میں ایک ہی تھا، پھر اس کو ٹھیک کر کے سات آسمان بنادیے۔ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

(کسی سوال پر فرمایا:) حیاتِ شہداء کا مسئلہ دُوسرے پارے میں لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ کے ضمن میں اِن شاء اللہ! ذکر کریں گے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ
اور جب آپ کے رَبّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب، فرشتوں نے کہا کیا بنائیں گے آپ اس زمین میں
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ
اس کو جو اس زمین میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟، اور ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا
اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ
کہ بیشک میں جانتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں جانتے ﴿۳۰﴾ اور تعلیم دے دی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں کی، پھر
عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا
پیش کیا اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء کو فرشتوں کے سامنے، پھر کہا تم مجھے خبر دو ان چیزوں کے ناموں کی اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ فرشتوں نے کہا
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰٓاٰدَمُ
تو پاک ہے، ہمیں کوئی علم نہیں مگر جو تو ہمیں سکھا دے، بیشک تو علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ نے فرمایا کہ اے آدم!
اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ
ان فرشتوں کو خبر دے ان چیزوں کے ناموں کی، پس جب آدم علیہ السلام نے خبر دے ان کو ان چیزوں کے ناموں کی، تو اللہ نے فرمایا
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا
کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین میں چھپنے والی چیزوں کو، اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو

تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے ہو۳۳ اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو تم آدم کو، تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے

اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴

ابلیس کے، وہ اَڑ گیا، اور اس نے تکبر کیا، اور ہو گیا وہ کافروں میں سے ۳۴

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً: اِذْ ظرف کے لئے ہے، اور اپنا معنی ظاہر کرنے کے لئے اِس کو کسی نہ کسی عامل سے متعلق کرنا پڑتا ہے، عام طور پر اہل ترجمہ اِس کو اُذْكُرْ کے متعلق کرتے ہیں پھر ترجمہ یوں ہوگا ''یاد کیجئے اُس وقت کو جبکہ کہا تیرے رب نے''، یا، لِيُذْكَرْ اِذْ قَالَ رَبُّكَ ''چاہیے کہ ذکر کیا جائے وہ وقت جبکہ کہا تیرے رَبّ نے فرشتوں کو'' تو یہاں اگر اس کا عامل محذوف نکال لیں تو اُس کے مطابق بھی ترجمہ صحیح ہے۔ یا جو آگے لفظ آ رہا ہے قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا، اِس اِذْ کو اُس کے متعلق کر دیا جائے تو پھر عامل محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں، اور ترجمہ پھر بھی صاف ہو جاتا ہے۔ قَالُوْٓا: فرشتوں نے کہا، اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا: کیا بناتا ہے تو اِس زمین میں اُس شخص کو جو فساد کرے گا اِس زمین میں؟، وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ: اور خون بہائے گا، یہ فرشتوں نے کب کہا؟ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً، پھر اِس کا مفہوم اُس کے ساتھ تعلق رکھے گا، ''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب، تو فرشتوں نے کہا کہ کیا تو بنائے گا اُس زمین میں ایسے شخص کو جو فساد کرے گا اُس زمین میں اور خون بہائے گا۔ جب اس اِذْ کو قَالُوْٓا کے متعلق کر لیں گے تو پھر اِس کا عامل محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، ''فرشتوں نے اُس وقت کہا جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا'' اس طرح سے مفہوم صاف ہو جاتا ہے۔ ملائکہ یہ مَلْئَكٌ کی جمع ہے، اور آخر میں تاء تانیثِ جمع کی ہے، اصل میں ملائک ہے مَلْئَكٌ کی جمع، پھر مَلْئَكٌ میں صرفی توجیہ ہوگئی، کہ ہمزہ متحرک ہے، اُس کا ماقبل ساکن ہے، ہمزے کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دے دی اور ہمزے کو گرا دیا، مَلَكٌ بن گیا، عام طور پر آپ فرشتے کے لئے مَلَكٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ورنہ اِس کی جمع اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل کے اعتبار سے اس میں ہمزہ ہے، اصل میں یہ مَلَكٌ نہیں بلکہ مَلْئَكٌ ہے، مَلَكٌ کہتے ہیں فرشتے کو، ''جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو''۔ قَالَ کے بعد لام کا مدخول اگر مخاطب ہو جس سے بات کی جا رہی ہے تو پھر ترجمہ اسی طرح سے کیا جاتا ہے ''فرشتوں کو کہا''، یہاں ترجمہ یوں نہیں کریں گے ''فرشتوں کے لئے کہا''، یہ مفہوم صحیح ادا نہیں ہوگا، جیسے قُلْتُ لِزَيْدٍ: میں نے زید کو کہا، یا اردو محاورے کے مطابق یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے زید سے کہا۔ زید کے لئے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخاطب آپ کا کوئی اور ہے، اور زید کے لئے سفارش کرتے ہوئے آپ نے کوئی بات کہی، اردو میں اِس کا مفہوم یہ نکلتا ہے۔ چونکہ یہاں ملائکہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہیں اس لیے ترجمہ یوں کریں گے کہ تیرے رَبّ نے فرشتوں کو کہا، یا، فرشتوں سے کہا، اِنِّيْ جَاعِلٌ

فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً: خَلَفَ: پیچھے آنا۔ خلیفہ: پیچھے آنے والا، جس کو نائب کہتے ہیں، میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب، قَالُوْا: فرشتوں نے کہا، اَتَجْعَلُ فِیْهَا: کیا بنائیں گے آپ اُس زمین میں، مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا: جو اُس زمین میں فساد کرے گا، وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ: دِماء دَمٌ کی جمع ہے، اور خونریزیاں کرے گا، خون بہائے گا۔ سفک دِماء: خون بہانا۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: اِس میں دو لفظ آرہے ہیں، ایک تسبیح اور ایک تقدیس، دونوں لفظ قریب قریب ہیں، پاکی بیان کرنا، نقائص سے طہارت بیان کرنا، کہ اس ذات میں کسی قسم کا کوئی نقص موجود نہیں ہے، فرق صرف اتنا کیا گیا ہے کہ تسبیح قول اور عمل کے درجے میں ہے اور تقدیس عقیدے کے درجے میں ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم دل سے اور عقیدہ سے بھی آپ کو پاک قرار دیتے ہیں، اور اپنی زبان کے ساتھ بھی آپ کی پاکی کا اقرار کرتے ہیں، تو یہ تسبیح ہوگئی لساناً و اَرکاناً وجَناناً، قلب کے اعتبار سے بھی تسبیح ہوگئی، زبان کے اعتبار سے بھی تسبیح ہوگئی، اور ظاہری اعمال کے اعتبار سے بھی تسبیح ہوگئی۔ اور تسبیح کا معنی ہوتا ہے منزہ قرار دینا، کسی ذات کو نقائص اور عیوب سے پاک قرار دینا۔ ''ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں'' یعنی دلی طور پر بھی تجھے پاک قرار دیتے ہیں، عقیدۃً بھی تجھے پاک جانتے ہیں، کہ تیرے اندر کسی قسم کا کوئی نقص اور عیب نہیں، اور زبان کے ساتھ بھی تیری تسبیح بیان کرتے ہیں، قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں جانتا ہوں وہ چیز تم نہیں جانتے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا: سکھادیا اللہ تعالیٰ نے، تعلیم دے دی اللہ تعالیٰ نے آدم کو۔ اَلْاَسْمَآءَ پر الف لام عوضِ مضاف الیہ ہے، اسماءُ المُسَمَّیات: تمام چیزوں کے نام، مسمیات: جن کے نام رکھے گئے ہیں، ''تمام چیزوں کے ناموں کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آدم کو دے دی'' یعنی نام بھی بتادیا اور اس کے خواص اور آثار بھی بتادیے، کہ اِس چیز کا یہ نام ہے اور یہ اِس کام آتی ہے، اس میں یہ نفع کا پہلو ہے اور یہ نقصان کا پہلو ہے، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، اس قسم کی تفصیلات کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دے دی، ''تعلیم دی اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے ناموں کی''، كُلَّهَا: تمام کی تمام چیزوں کے ناموں کی، ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ: هُمْ ضمیر اُنہی مسمیات کی طرف لوٹ رہی ہے، پھر پیش کیا اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء کو فرشتوں کے سامنے، فَقَالَ اَنْۢبِــُٔوْنِیْ: پھر کہا اللہ نے اَنْۢبِــُٔوْنِیْ: یہ خطاب فرشتوں کو ہے، تم مجھے خبر دو، بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ: اِن چیزوں کے ناموں کی اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو، یعنی جو بات پیچھے سے سمجھ میں آرہی تھی کہ ہم خلافت کے اہل ہیں اور ہم اِس فرض کو ادا کرلیں گے، اگر تم اپنی اس اہلیت کے خیال میں اور اس کام کو سنبھالنے کے بارے میں جو تم نے ظاہر کیا کہ ہم اس کو سنبھال لیں گے (اُن لفظوں کے تحت یہی بات سمجھ میں آرہی ہے، جیسے کہ تشریح میں آپ کے سامنے آئے گی) اگر تم اپنے اِس خیال میں سچے ہو کہ تم اس خلافت کے اہل ہو، تم اِس نظم کو سنبھال لوگے، تو مجھے اِن چیزوں کے اسماء بتاؤ، قَالُوْا: فرشتوں نے کہا، سُبْحٰنَكَ: تو پاک ہے، لَا عِلْمَ لَنَآ: ہمیں کوئی علم نہیں، اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا: مگر جو تو ہمیں سکھادے، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ: بیشک تو علم والا ہے حکمت والا ہے۔ قَالَ یٰٓاٰدَمُ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم!، اَنْۢبِئْهُمْ: اِن فرشتوں کو خبر دے بِاَسْمَآئِهِمْ: اِن چیزوں کے ناموں کی، فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ: پس جب آدم نے خبر دے دی اُن کو اُن چیزوں کے ناموں کی، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ: کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا، اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین میں چھپنے والی چیزوں کو، وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ: اور میں جانتا ہوں اُس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو، وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ: اور جس کو تم چھپاتے

ہو۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: جب کہا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو تم آدم کو، فَسَجَدُوْٓا: تو انہوں نے سجدہ کر دیا، اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سوائے ابلیس کے، اَبٰى: وہ اَڑ گیا، شدت کے ساتھ کسی چیز سے رک جانے کو اِباء سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اڑ گیا، رُک گیا، اُس نے انکار کر دیا، وَاسْتَكْبَرَ: اور اس نے اپنے آپ کو بڑا جانا، اس نے تکبر کیا، استکبار کا معنی یہی ہے کہ اپنے آپ کو بڑا جاننا، تکبر کا مفہوم اصل کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے بہ تکلف اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں بڑا قرار دینا، اور شرعی مفہوم اِس کا یہی ہے "بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ"[1] دوسروں کو ذلیل اور حقیر جاننا، اور سچی بات قبول کرنے کے مقابلے میں اڑ جانا، شرعی طور پر تکبر کی یہ تعریف ہے۔ وَاسْتَكْبَرَ: وہ متکبر ہو گیا، اُس نے اپنے آپ کو بڑا جانا، وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ: اور ہو گیا وہ کافروں میں سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور آیاتِ بالا میں بیان کردہ مضامین

پچھلے رکوع کی آخری آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انعامات کا سلسلہ شروع کیا تھا، هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا سے معاد کا تذکرہ کرنے کے بعد انعامات کا ذکر چھیڑا تھا، اور اُس آیت میں مادی انعامات کو ذکر کیا، یعنی محسوس انعامات جو انسان کو محسوس ہوتے ہیں اور اُن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ اِن آیات میں آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرماتے ہیں، اور اِس قصہ کے ضمن میں روحانی انعامات جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطاء فرمائے ہیں، عزت، شرافت، علم، دوسروں کے مقابلے میں بلندی، عظمت، اُس کو بیان فرماتے ہیں۔ اور اِن انعامات کے تذکرے کے ساتھ اپنی طاعت اور عبادت کی طرف ہی بلانا مقصود ہے جیسے پہلے آپ کے سامنے وضاحت کر دی گئی تھی۔ نیز انسان کی ابتداء کیسے ہوئی، کن حالات میں ہوئی، اِن آیات میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اور اس کے بعد ابلیس نے جس طرح سے مخالفت کی اور آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کا مظاہرہ کیا اور آدم علیہ السلام کو بہکانے کا باعث بنا، اور آئندہ آدم علیہ السلام کی اولاد کے متعلق اُس نے جس قسم کے دعوے کئے اور جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں اس واقعہ کو نمایاں کیا ہے انسان کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ایک تمہارا ازلی دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے، اور وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی پر برانگیختہ کرتا ہے، تم اپنے دشمن کو پہچانو اور اپنے دوست کی شناخت کرو، اللہ تعالیٰ جو احکام تمہیں دیتا ہے اِن میں تمہارا فائدہ ہے، اور شیطان ابلیس تمہیں بہکا کر جس راستے کی طرف لے جاتا ہے اُس میں تمہارا نقصان ہے، اور اِس کی عداوت اُس وقت سے نمایاں ہے جب سے آدم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عظمت عطاء فرمائی، اب اگر تم اُس کے پیچھے لگو گے تو جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو بہکا لیا تھا تمہیں بھی بہکائے گا اور اللہ کی نافرمانی کی طرف ڈال دے گا، جس کے نتیجے میں تم جہنم میں جاؤ گے، اور اپنے باپ کی وراثت جو کہ جنت ہے اُس سے تم

---

(۱) مسلم ج۱ ص۶۵ باب تحریم الکبر / مشکوٰۃ ج۲ ص۴۳۳ باب الغضب والکبر، فصل اول۔

محروم ہوجاؤ گے۔ اِس چیز کو نمایاں کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد سورتوں میں آدم علیہ السلام اور شیطان کے واقعہ کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، تو اِن آیات کے ضمن میں یہ بات بھی اچھی طرح سے واضح ہوجائے گی۔

آدم علیہ السلام کی باقی مخلوق کے مقابلے میں شرافت

سب سے پہلے تو آدم علیہ السلام کی خلقت کا تذکرہ ہے، قرآنِ کریم نے اِس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ انسان جو اِس وقت زمین کے اُوپر پھیلے ہوئے ہیں اور جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کائنات کی باقی چیزوں کے مقابلے میں اِن کو برتری دی ہے، اِن کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ ان کے جدِ اعلیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت کے ساتھ پیدا فرمایا، اور یہ اِس آدم کی شرافت ہے کہ باقی چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ نے کلمۂ کُن کی طرف کی ہے کہ میں نے اُن کو کلمہ کُن سے پیدا کیا ہے، اور جہاں آدم علیہ السلام کا ذکر فرمایا وہاں ہے خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (سورۂ ص:۷۵) میں نے اِس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ ہاتھ کا لفظ اگرچہ متشابہات میں ہے، ہم اِس کی تعبیر نہیں کرسکتے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہاتھ کیسا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے کس طرح بنایا، بہر حال باقی مخلوق کے مقابلے میں یہ شرافت اِس کو حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنے ہاتھوں کی طرف کی اور کہا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ: میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ حدیث شریف میں بھی اس کی وضاحت ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ! تو نے آدم علیہ السلام کے لئے دنیا کی نعمتیں بنادیں، یہ کھاتا ہے، پیتا ہے، سواری کرتا ہے، ہر قسم کی عیاشی اِس کو دنیا کے اندر نصیب کردی، اس لیے اِس کو تو دنیا دے دے اور ہمارے لیے تو آخرت کردے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں میں نے کلمہ کُن سے پیدا کیا ہے، اور آدم کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے، تو میں ایسی مخلوق کو جس کو کلمہ کُن سے پیدا کیا ہے اُس مخلوق کی طرح قرار نہیں دے سکتا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔[1] یہ اُس روایت کا مفہوم ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی، تو اس روایت میں بھی آدم علیہ السلام کی شرافت اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیان کرتے ہوئے یہی کہا کہ میں نے اُس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے، تو باقی مخلوق کے مقابلے میں کوئی خصوصیت آدم علیہ السلام کی ہے، کہ باقیوں کو بنانے اور پیدا کرنے کی نسبت کلمہ کُن کی طرف ہے، اور آدم علیہ السلام کو بنانے اور پیدا کرنے کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھوں کی طرف ہے۔

آدم کو بنایا، آدم کو پیدا کرنے کے بعد پھر اس کے ساتھ اس کی زوجہ کو پیدا کیا، جیسے سورۂ نساء کی پہلی آیت میں آئے گا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا: اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا، وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً (سورۂ نساء:۱) ان دونوں سے یعنی آدم اور اُس کی بیوی حواء سے بہت سارے مرد اور عورتوں کو اللہ نے پھیلا دیا، پھر آگے یہ جتنا سلسلہ پھیلا وہ آدم اور حواء سے ہی پھیلا، تو دنیا کے اندر جتنے بھی انسان موجود ہیں، گورے ہیں یا کالے ہیں، عرب ہیں یا عجم ہیں، یورپی ہیں یا مشرقی ہیں، جیسے بھی ہوں وہ سارے کے سارے آدم کی نسل ہیں، اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اِن سب کا خاندان ایک ہے، قرآنِ کریم نے انسان کی ابتدائے آفرینش کی طرف اس طرح سے اشارہ فرمایا، اور آیات کے اندر اس کی وضاحت کی ہے۔

---

(۱) شعب الایمان، رقم: ۱۴۷ / مشکوٰۃ ۲/۵۱۰ باب بدء الخلق، فصل ثانی۔

ڈارون کا فلسفہ اور اس کی تردید

اور اس سے آج کل کے دہریوں کی تغلیط ہو جاتی ہے، خاص طور پر جو ڈارون کا فلسفہ مشہور ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کسی ایک فرد کی اولاد نہیں ہے، بلکہ جمادات سے نباتات، اور نباتات سے آگے حیوانات بننا شروع ہوئے، کہ اِن کی ابتدا ایسے کیڑوں سے ہوئی جن کے اندر اعضاء بہت کم تھے، صلاحیتیں بہت کم تھیں، پھر اُس کے اُوپر دوسری نسل بڑھی، ترقی کرتے کرتے پھر تیسری نسل آئی، پھر چوتھی نسل آئی، اس طرح سے حیوانات ترقی کرتے کرتے بندر تک آگئے، بندر ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جس میں بہت ساری خوبیاں اور بہت ساری صلاحیتیں اور بہت سمجھ وغیرہ پائی جاتی ہے، اور پھر بندر سے آگے ترقی کر کے یہ انسان وجود میں آیا، گویا یہ انسان بندر کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے، باقی یہ کہ اللہ نے کوئی آدم بنایا ہو اور آدم کی نسل سے انسان پھیلا ہو اِس بات کا وہ انکار کرتے ہیں۔ تو انسان کو بندر کی ترقی یافتہ صورت قرار دیتے ہیں، گویا کہ حیوان کی ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم ہے، اور اس طرح سے درجہ بدرجہ ترقی کرتا کرتا یہ حیوان اپنے کمال کو پہنچا ہے، اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے کمال رکھ دیے، اِس کے اعضاء ہر طرح سے تام کر دیے، باقی ہم ایک خاندان کہیں یا ایک باپ کی اولاد کہیں، اِس کو آج جدید فلسفہ تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کی ساری کی ساری بناء توہمات پر ہے، نہ تو انسان کی ابتداء کسی نے دیکھی، نہ یہ دیکھا کہ کس طرح سے ایک نسل منتقل ہو کر دوسری نسل بنتی ہے، کسی نے اپنی آنکھوں کے ساتھ نہیں دیکھا، تو اِن توہمات کے مقابلے میں جو پردہ شریعت نے اُٹھایا ہے، اور اللہ کی کلام نے اٹھایا ہے، جو اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والے ہیں، وہی یقین کے قابل ہے اور اسی پر ہی اعتماد کرنا چاہیے، اور انسان کی شرافت کے لائق بھی یہی چیز ہے کہ مرد اور عورت اللہ تعالیٰ نے پہلے پیدا کیے، پہلے آدم علیہ السلام کو بنایا پھر اس کی بیوی کو بنایا، اور اس کے پیدا کرنے کی نسبت اپنے ہاتھوں کی طرف کی، اور پھر اس سے اس کی اولاد کو پھیلایا، یہی حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ انسان کی شرافت زیادہ نمایاں ہے۔

فرشتوں کی اللہ کے سامنے درخواست اور اس کا مقصد

پیدا کرنے سے قبل فرشتے موجود تھے، اور سورۂ حجر کے اندر آیت آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ جنات کی خلقت بھی آدم سے پہلے ہو چکی تھی، جنات بھی موجود تھے اور فرشتے بھی موجود تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے ذکر کیا کہ میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو یہ نیابت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دی اور نہ جنات کو دی۔ جس وقت یہ اعلان ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، تو فرشتوں نے آگے ایک بات کہی، اُن کی بات کا حاصل یہ ہے کہ یا اللہ! ہم موجود ہیں، اور ہر طرح سے تیرے فرمانبردار ہیں، زبان کے ساتھ بھی تیری تسبیح کرتے ہیں، دل کے ساتھ بھی تیرے مطیع ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اگر کوئی نیا کام تجویز ہو رہا ہے تو اُس کو ہمارے سپرد ہی کر دیجئے، ہم ہی اس کام کو کر لیں گے۔ باقی! جو آپ نئی مخلوق بنانے والے ہیں وہ تو زمین میں فساد کرے گی، خونریزیاں کرے گی، تو آپ کے بھی مزاج کے خلاف واقعات پیش آئیں گے، پھر آپ بھی ناراض ہوں گے، تو کیا ضرورت ہے ایک نئی مخلوق کے پیدا کرنے کی، ہم جو خادم موجود ہیں، یہ کام آپ ہم سے

لے لیجئے۔ یہ فرشتوں کا کہنا بطور اعتراض کے نہیں ہے، نہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے مشورہ لیا، بلکہ اِس حکمت کے تحت کہ فرشتوں کے جذبات نمایاں ہوں اِس بات کو ذکر فرمادیا، اور فرشتوں کی اِس بات کا حاصل یہی ہے جس طرح سے ایک فرمانبردار نہایت صالح قسم کا خادم کسی کے پاس موجود ہو، اور آقا اس کے سامنے ذکر کرے کہ بھئی! گھر کا ایک اور کام نکل آیا، میں اس کے لئے کسی دوسرے کو متعین کردوں؟ تو وہ کہے کہ نہ جی! بالکل ضرورت نہیں ہے، دوسرا جو آئے گا، معلوم نہیں کہ آپ کے مزاج کو سمجھے یا نہ سمجھے، اس کو کام کرنے کا سلیقہ ہو یا نہ ہو، پھر آپ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے، میں جو موجود ہوں آپ کا خادم، یہ کام بھی میرے سپرد ہی کردو، میں اِس کو بھی کرتا رہوں گا۔ تو جس طرح سے نیازمندی کے اظہار کے طور پر یہ خادم کہتا ہے کہ کوئی اور ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام بھی میرے ہی سپرد کردو، میں آپ کا مزاج شناس ہوں، اِس گھر میں رہتے ہوئے مجھے مدت ہوگئی، مجھے پتہ ہے کہ آپ کا مزاج کیا ہے، اس لیے جو کام کروں گا آپ کی مرضی کے موافق کروں گا، آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، نیا آدمی آپ لائیں گے تو پتہ نہیں وہ کیسا ہوگا، ایسی حرکتیں کرے گا جو آپ کے لئے باعث تکلیف ہوں گی، تو مناسب یہ ہے کہ یہ خدمت بھی میرے ہی سپرد کردیجئے۔ یہ ایک قسم کی نیازمندی کا اظہار ہے جو وہ خادم کررہا ہے، یہ کسی قسم کا اعتراض کرنا مقصود نہیں۔ یہاں بھی فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اِسی طرح کی نیازمندی کا اظہار کیا، کہ نیا کام بھی ہمارے سپرد کردو، ہم ہی اسے سنبھال لیں گے، اور اس کام کے لئے کسی نئی مخلوق کو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرشتوں کو اِنسان کے حالات کیسے معلوم ہوگئے؟

البتہ درمیان میں آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرے گا، کہ فرشتوں نے یہ جو کہا کہ وہ اس زمین میں فساد کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا، فرشتوں کو یہ پتہ کیسے لگ گیا کہ جو نئی مخلوق پیدا کی جارہی ہے وہ فسادی ہوگی، اور آپس میں لڑیں گے، خونریزیاں کریں گے، فرشتوں کو اِس بات کا علم حاصل کس طرح سے ہوگیا؟ مفسرین نے دو قسم کی باتیں نقل کی ہیں، ایک تو یہ بات نقل کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس وقت اِس خلیفے کا تذکرہ کیا تھا تو اُس کا تعارف بھی کرایا کہ وہ ایسا ہوگا، اُس کی آگے اولاد پھیلے گی، اُن میں سے بعض میرے فرمانبردار ہوں گے، بعض نافرمان ہوں گے، اور میں اُس کو خلیفہ بناؤں گا، اس کے اُوپر احکام نازل کروں گا، اور وہ اُن احکام کے تحت عدل وانصاف قائم کرے گا، دنیا کے نظام کو سنبھالے گا، اِس قسم کی تفصیل اُن کے سامنے ذکر کردی ہو، جس میں یہ بات بھی آگئی ہو کہ بعض نافرمان بھی ہوں گے، آپس میں لڑیں گے بھی، خون ریزیاں بھی کریں گے، اسی لیے حکومت قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، پکڑ دھکڑ ہوگی، عدل وانصاف ہوگا، اِس سے انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ تو بہت لمبا چوڑا دھندا شروع ہوجائے گا فساد کا اور خون ریزیوں کا، یہ دھندا پھیلانے کی کیا ضرورت ہے، اگر کوئی خلافت کا کام اس قسم کا ہے تو ہم سے لے لیجئے۔ تو جس وقت اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کا اعلان فرمایا تو اُسی وقت خلیفہ کا کام اور اِس خلیفہ کی آگے جو اولاد پھیلے گی تو اُس کے جس قسم کے واقعات ہوں گے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اُن کا تذکرہ کردیا، وہاں سے یہ سمجھ گئے۔ یا مفسرین نے یہ بھی لکھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس وقت آدم کو بنایا تھا تو آدم کا یہ ڈھانچا بنا پڑا تھا، ابلیس کو بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ

کوئی نئی مخلوق بنانے والے ہیں، حدیث شریف میں حضور ﷺ نے اِس کی وضاحت فرمائی کہ ابلیس دیکھنے کے لئے آیا تو آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنا پڑا تھا، ابھی اُس میں روح نہیں ڈالی تھی، آیا، اس نے چاروں طرف گھوم گھام کر دیکھا، دیکھتے ہوئے جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ یہ اجوف ہے، یعنی اندر سے کھوکھلا ہے (دیکھو نا، ہمارے اردگرد ساری تہہ ہے اور ہم اندر سے خالی ہیں، یہ سب ہوا بھری ہوئی ہے اور سب اندر سے خالی ہے) جس وقت اِس کو اجوف دیکھا کہ یہ اندر سے خالی ہے، تو ابلیس نے دیکھ کر اندازہ لگایا، کہنے لگا کہ ''خَلَقَ خَلْقًا لَا یَتَمَالَكُ''[1] اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی، اِس کے کھوکھلے ہونے سے اُس نے اندازہ یہ لگایا کہ یہ مخلوق ایسی ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی، یعنی جس وقت اِس کو کہیں سے ہوا ملے گی، کوئی اِس کو ہوا دے گا تو کبھی یہ کدھر کو اُڑے گا اور کبھی کدھر کو اُڑے گا، اِس میں اتنی قوت نہیں ہوگی کہ اپنے آپ کو سنبھال لے۔ جیسے اُس نے اِس بناوٹ کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا تو ممکن ہے کہ اُن کی بناوٹ دیکھ کر، جس قسم کے اعضاء انسان کو دیے جا رہے تھے، جس قسم کا انسان کو پیدا کیا جا رہا تھا، ہوسکتا ہے کہ فرشتوں نے بھی اِسی سے ہی اندازہ لگایا ہو۔ ابلیس کے اِس اندازے کا ذکر تو صحیح حدیث کے اندر موجود ہے، فرشتوں کے اس اندازے کا ذکر موجود نہیں، لیکن اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جو قبل از وقت کہہ دیا کہ لڑے گا، بھڑے گا، فساد کرے گا، ہوسکتا ہے کہ اس کی خلقت کے انداز سے ہی اُنہوں نے سمجھ لیا ہو کہ اِس کے آثار کچھ اس قسم کے ہوں گے، ایسا بھی ممکن ہے۔ بہر حال اِس کے بعد پھر اپنی تسبیح و تقدیس کا ذکر کیا۔

اللہ کی طرف سے فرشتوں کو جواب

اللہ تعالیٰ نے پہلے تو اجمالی جواب دیا کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس زمین میں خلافت کو سنبھالنے کے لئے اور نظامِ خلافت قائم کرنے کے لئے کس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے، کس قسم کے علم کی ضرورت ہے، کیسی کیسی صلاحیتیں چاہئیں، مجھے پتہ ہے کہ وہ تم میں نہیں ہیں، اور جو میں نئی مخلوق پیدا کر رہا ہوں وہ اُسی میں ہیں، یہ تو اجمالی بیان فرمادیا کہ اس کام کے لئے جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ صلاحیتیں تم میں موجود نہیں، اس لیے میں نئی مخلوق پیدا کر رہا ہوں جو اس نظامِ ارضی کو سنبھالے گی، اور وہاں جاکر میرے احکام کی تنفیذ کرے گی، تمہارے اندر وہ صلاحیتیں نہیں ہیں، پہلے تو اجمالی جواب دیا، پھر فرشتوں کے سامنے تفصیل نمایاں کرنے کے لئے جس میں آدم علیہ السلام کی شرافت بھی نمایاں ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ نے زمین کی اشیاء، اُن سب کے نام، اُن کے خواص، اُن کا طرزِ استعمال، اُن کا نفع و نقصان، اُن کی حلت و حرمت، الغرض جس قسم کے اوصاف اُن کو عطا فرمائے تھے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اُن کی تعلیم دے دی۔

کیا آدم علیہ السلام کو تعلیم فرشتوں کے سامنے دی گئی تھی؟

اب یہ آدم علیہ السلام کو جو تعلیم دی، ضروری نہیں کہ فرشتوں سے علیحدہ کر کے چھپا کر تعلیم دے دی ہو، یہ کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ فرشتے بھی موجود ہوں اور فرشتوں کی موجودگی میں آدم علیہ السلام کو تعلیم دے دی ہو، ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن فرشتوں میں جب اس

---

(۱) صحیح مسلم باب خلق الانسان خلقا / مشکوۃ ج ۲ ص ۵۰۶، باب بدء الخلق، فصل اول، عن انس رضی اللہ عنہ۔

بات کی استعداد ہی نہیں تھی تو وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے، اس لیے ان کے سامنے بھی اگر اس مسئلے کی تقریر کی جائے گی تو اُن کے علم میں اضافہ نہیں ہوسکتا، فرشتے اُس بات کو یاد نہیں کر سکتے۔ جس طرح سے آپ لوگ منطق پڑھتے ہیں، فلسفہ پڑھتے ہیں، اب فلسفے کا کوئی پیچیدہ سا مسئلہ آ گیا، استاذ اس کی تقریر آپ کے سامنے کرتا ہے، آپ میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہے، آپ اُس کو اخذ کر جائیں گے، اور ایک جاٹ (دیہاتی اَن پڑھ) آدمی جس نے الف باء تاء بھی نہیں پڑھی، وہ بھی اِسی درسگاہ کے اندر موجود ہو، لیکن جس وقت سبق ختم ہوگا تو آپ کا دماغ معلومات کے ساتھ بھرا ہوا ہوگا، اور وہ جیسے خالی آیا تھا ویسے کا ویسے بیٹھا آپ کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہوگا، اب اگر آپ اُس سے پوچھیں گے کہ بتا میں نے کیا بیان کیا، وہ کہے گا مجھے تو پتہ نہیں، اور آپ سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ میں نے کیا بیان کیا تو آپ فرفر وہ سبق سنا دیں گے، کیونکہ آپ میں صلاحیت ہے اور اُس میں صلاحیت نہیں ہے۔ تو آدم کی فطرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے چونکہ اُن علوم کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھی تھی، اس لیے اللہ نے جب تعلیم دی تو وہ تو اُن کو اخذ کر گئے، اور فرشتوں کے اندر صلاحیت ہے ہی نہیں، نہ اُن کو بھوک کا پتہ، نہ کھانے کا پتہ، نہ نہ کھانے کے اثرات کا پتہ، مثلاً فلاں چیز کے کھانے سے نشہ چڑھتا ہے، وہ نشے کو نہیں جانتے کہ کیا ہوتا ہے، نشے کی کیفیت نہیں سمجھتے، اور اِس چیز کے مارنے سے انسان زخمی ہوجاتا ہے، یہ زہر ہے، یہ مر جائے گا، وہ موت کو نہیں جانتے اور حیات کو نہیں سمجھتے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ اِن چیزوں سے بالا و برتر ہیں، جب ان چیزوں کو استعمال کرنے کی اور اُن کے اثرات اپنے اُوپر طاری ہونے کی اُن کے اندر صلاحیت ہی نہیں، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم کو یہ تعلیم اگر اُن کے سامنے بھی دی ہو تو بھی فرشتے خالی کے خالی رہیں گے اور آدم علیہ السلام اُن علوم کو اخذ کر جائیں گے۔

فرشتوں اور حضرت آدم علیہ السلام کا امتحان

اس لیے اِس تعلیم کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے وہ چیزیں پیدا کیں اور کہا کہ بتاؤ اِن کے کیا نام ہیں؟ کیا خواص ہیں؟ اِن کو استعمال کس طرح کیا جاتا ہے؟ اور اِن کے آثار کیا ہوں گے؟ وہ کہنے لگے کہ لَا عِلْمَ لَنَا: ہمیں تو کوئی علم نہیں، ہم تو وہی چیز جانتے ہیں جو تو نے ہمیں ہماری استعداد کے مطابق سکھادی، اور جس کی تعلیم تو نے ہمیں نہیں دی اور جس کا علم ہمارے دل دماغ میں تو نے نہیں ڈالا، یعنی ہمارے اندر اُس کی استعداد نہیں رکھی، ہم اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ تو اُنہوں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرلیا، اور سمجھ گئے کہ واقعی خلافت کے لئے جس قسم کے مسائل کی ضرورت ہے وہ ہمارے بس کے نہیں ہیں۔ پھر یہ بات کہ فرشتے کہیں کہ ٹھیک ہے ہمیں تو سمجھ میں نہیں آئی اور ہم تو اخذ نہیں کر سکے، لیکن اس نئی مخلوق کو بھی سمجھ میں آئی یا نہیں اِس کا پتہ کیسے چلے؟ تو پھر وہی سوال اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پہ کردیا کہ آدم! ذرا اِن کو سناؤ، ان چیزوں کے کیا نام ہیں، تو آدم علیہ السلام نے فرفر بیان کردیے، تو اُن کو اندازہ ہوگیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی بات آدم اخذ کر گیا، ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ جیسے جب آپ استاذ سے سمجھنے کے بعد اُس مسئلے کی تقریر کریں گے تو چاہے جاٹ آپ کی بات بھی نہیں سمجھے گا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط کہہ رہے ہیں، لیکن اِس انداز سے اُس کو پتہ چل جائے گا کہ واقعی اِس کو سبق یاد ہے، یعنی جب ایک طالب علم استاذ کی تقریر کو نقل کرے گا تو اگرچہ

وہ جاٹ ویسے کا ویسے جاہل بیٹھا ہوگا، لیکن آپ کے بولنے سے اُس کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے تو کوئی چیز نہیں سمجھی، میرے پلے تو کوئی لفظ نہیں پڑا، لیکن اِن کے فرفر بولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کو سمجھ گئے ہیں۔ اِسی طرح سے آدم کی تقریر کے بعد فرشتوں کو اعتراف ہوگیا کہ واقعی خلافت کے لئے جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے اور جس قسم کے مسائل جاننے کی ضرورت ہے آدم اُن سے واقف ہے، ہم واقف نہیں ہیں، تو اس علم کے ذریعے سے اللہ نے آدم علیہ السلام کی فرشتوں کے اُوپر برتری نمایاں کردی کہ خلافت کی اہلیت اِس میں ہے، تم میں نہیں۔

سوال: ۔فرشتوں کو جب بتایا ہی نہیں تھا تو اُنہوں نے جواب کیا دینا تھا؟

جواب: ۔یہ تو میں نے ابھی ذکر کیا ہے، کہ بتایا تو سب کو تھا، لیکن فرشتوں کے اندر اللہ نے چونکہ اُن کی استعداد ہی نہیں رکھی اس لیے وہ سمجھ نہیں سکے، باقی یہ ہے کہ فرشتوں میں استعداد کیوں نہیں رکھی؟ وہ اس لیے کہ اُن کی بناوٹ یہی ہے، اُن کی خلقت کا موضوع ہی ایسا ہے، اگر اُن کے اندر بھی استعداد رکھ دی جاتی تو پھر انسان میں اور فرشتوں میں کیا فرق ہے، پھر تو آپ یہ کہیں کہ اِن فرشتوں کو اللہ نے انسان ہی کیوں نہ بنادیا، جب دو نوعیں علیحدہ علیحدہ ہیں، فرشتہ ایک علیحدہ نوع ہے، اُس کے خواص اور ہیں، اور انسان ایک علیحدہ نوع ہے، تو انسان کے بعض ایسے امتیازات ہیں جو فرشتوں کی نوع میں نہیں پائے جاتے۔ اِن امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں کو استعمال کرنا اور اُن کے اثرات سے واقف ہونا اور اُن کے نفع نقصان کی تفصیل، یہ انسان کی صلاحیت سے تعلق رکھتی ہے، فرشتوں کی صلاحیت سے تعلق نہیں رکھتی، فرشتوں کی بناوٹ اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے بنائی ہے۔ باقی! ایسی کیوں بنائی، یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے، اگر اُن کو بھی کھانے پینے والے بنادیتا، اُن کو بھی نکاح کرنے والے بنادیتا، اور بیماریاں اور تندرستیاں اُن کے ساتھ بھی لگا دیتا، پھر تو مطلب یہ ہے کہ انسان اور فرشتے میں فرق ہی کوئی نہ رہتا، حالانکہ ابتداء سے جب دو نوعیں بنائی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے بعض کے خواص اور رکھے ہیں، بعض کے خواص اور رکھے ہیں۔ لیکن اتنا اُن کی سمجھ میں آگیا کہ واقعی اِس زمین کی چیزوں کے ناموں کا جاننا، اُن کے استعمال کے طریقے کا سمجھنا، اور اُن کے نفع ونقصان سے واقف ہونا، یہ ایک ایسا علم ہے جو فطرتِ انسانی کے ساتھ تو تعلق رکھتا ہے، ہمارے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے، تو خلافت کے لئے آدم علیہ السلام کی برتری فرشتوں کے سامنے اِس علم کے ذریعے سے نمایاں ہوگئی۔

سوال: ۔عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اللہ نے تعلیم دی ہی نہیں تھی۔

جواب: ۔تعلیم تو آدم علیہ السلام کو ہی دی، سبق تو آدم علیہ السلام کو پڑھانا تھا، عَلَّمَ تَعْلِیْم کا معنی ہوتا ہے دوسرے کے دل دماغ میں علم کو ڈال دینا، اور فرشتوں کے دل دماغ میں تو یہ علم ڈالا ہی نہیں جاسکتا، چونکہ اُن کو اللہ نے اِس علم کی صلاحیت سے ہی محروم کردیا، ان کے سامنے یہ بات آئے گی تو عَرَضَهُمْ: یہ چیزیں ان کے سامنے پیش کیں، اور انہیں کہا کہ بتاؤ ان کے کیا نام ہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ ہمیں کوئی علم نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے نتیجے میں اُن کے دل دماغ میں یہ علم نہیں آیا، کیونکہ ان کے اندر اس علم کے حاصل کرنے کی اللہ نے صلاحیت ہی نہیں رکھی۔ یہی بات تو میں اپنے بیان کے اندر واضح کرتا آرہا ہوں کہ آدم علیہ السلام کو تعلیم اُن کے سامنے بھی دی ہوتو بھی وہ علم نہیں حاصل کرسکتے، چونکہ ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک جوان آدمی ہے، وہ تو

جلدی سے سمجھ جائے گا کہ نکاح کیا ہوتا ہے، نکاح میں کیا لذت ہے، اس کا کیا مفہوم ہے، لیکن اگر ایک مادر زاد عنین نامرد آدمی ہو، اُس کو لذتِ جماع کوئی شخص کسی دلیل سے سمجھا سکتا ہے؟ چاہے اُس کے سامنے ہزار دفعہ تقریر کرو، کیونکہ اُس کے اندر صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اِس بات کو سمجھ سکے، جس میں صلاحیت ہوتی ہے وہ بات کو سمجھا کرتا ہے، جس میں صلاحیت ہی نہیں وہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب فرشتوں کے اندر ان چیزوں کے علم کی اللہ نے صلاحیت ہی نہیں رکھی تو اُن کے سامنے بھی اگر تقریر ہوتی رہے تو بھی وہ اس کا علم حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا کا مطلب یہی ہے کہ جو علم تو نے ہمارے دل و دماغ میں ڈالا ہے ہم تو وہی جانتے ہیں، باقی اِس کی چونکہ ہمارے اندر تو نے صلاحیت ہی نہیں رکھی اس لیے ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ تو علیم ہے، حکیم ہے، ہر قسم کا علم رکھتا ہے، ہر قسم کی حکمت اور دانائی تیرے لیے ہے، تو ہی جانتا ہے کہ کس کو کیسا بنانا ہے اور کون کس کے لائق ہے۔

آدم علیہ السلام کی برتری علم کے ساتھ نمایاں ہوئی

تو گویا کہ قولی طور پر انہوں نے آدم علیہ السلام کی برتری کا اعتراف کر لیا، کہ واقعی اس علم کے اندر فوقیت آدم علیہ السلام کو حاصل ہے، یہاں آدم کی برتری علم کے رنگ میں نمایاں ہوئی ہے، ورنہ جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو تسبیح و تقدیس میں فرشتے کوئی پیچھے نہیں ہیں، یہ برتری علم کے طور پر نمایاں ہوئی، اور اللہ کی صفات میں سے علم ایک بہت بڑی صفت ہے، جس کا پرتو انسان پر پڑتا ہے تو اس کو شرافت ملتی ہے۔ باقی رہی عبادت، عبادت تو بندے کی صفت ہے، یہ اللہ کی صفت نہیں ہے، تو عبادت اور علم کے اندر ایسے ہی فرق ہے جیسے مخلوق کی صفت میں اور اللہ کی صفت میں فرق ہوا کرتا ہے، علم کو عبادت کے مقابلے میں اتنی برتری حاصل ہے۔

سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کے ساتھ اِبلیس کو بھی تھا

پھر اللہ تعالیٰ نے عملاً بھی آدم کو عظمت دینے کا ارادہ فرمایا کہ مخلوق سے آدم کی تعظیم کرائی جائے، جب آدم کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنا کر زمین میں اتارا جائے گا تو اِس خلیفہ کی تعظیم باقی مخلوق سے کرائی جائے تا کہ عملاً بھی اِس کی برتری سامنے آجائے، تو فرشتوں میں اعلان ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ اور جن چونکہ پہلے پیدا ہو چکے تھے، اور جنوں کا سردار ابلیس فرشتوں میں ملا جلا رہتا تھا، جیسے کہ آگے معلوم ہوگا کہ آسمانوں میں رہتا تھا، اُن کے ساتھ پھرتا تھا، اور فرشتے اشرف نوع ہیں، جب اِن کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو تبادراً معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو بھی ساتھ ہی حکم تھا کہ اِن کو سجدہ کریں، اور باقی مخلوق میں ایسا شعور نہیں ہے، اس لیے اُن سے سجدہ کروانے کی ضرورت نہیں پیش آئی، نباتات جمادات وغیرہ پر برتری ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، ذی شعور مخلوق فرشتے اور جن موجود تھے، اِن کو حکم دے دیا گیا۔ اِبلیس کو حکم دینا قرآنِ کریم کی آیات سے دلالۃً ثابت ہوتا ہے، کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا تھا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا، تو اس نے آگے سے یہ نہیں کہا کہ مجھے تو حکم ہی نہیں دیا گیا، حکم فرشتوں کو دیا گیا اُنہوں نے سجدہ کر دیا، مجھے آپ نے کب کہا تھا کہ سجدہ کر؟، اُس نے یہ عذر نہیں کیا، بلکہ اس نے آگے سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو حکم ہی ٹھیک نہیں تھا، یہ تو میری شان کے لائق نہیں، میں برتر ہوں وہ ادنیٰ ہے، ادنیٰ تو اعلیٰ کو سجدہ کیا کرتا ہے، اعلیٰ ادنیٰ کو سجدہ کیسے کرے؟ یہ تو حکم ہی حکمت کے خلاف ہے، اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اس قسم کی حکمتیں بگھارنی شروع کر دیں

اور اپنی منطق لڑانی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں وہ مردود ہوا، لیکن کسی آیت اور روایت میں یہ اشارہ نہیں ہے کہ اس نے یہ عذر کیا ہو کہ مجھے تو حکم ہی نہیں دیا گیا، جس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ سجدہ کرنے کا حکم جس طرح فرشتوں کو دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو اور اس کی جماعت کو بھی حکم تھا، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد فرشتے تو سجدے میں گر گئے، اور ابلیس اکڑ گیا، اُس نے اپنے آپ کو بڑا قرار دیا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آئے گی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

کسی فرض کو عملاً ترک کرنا کفر نہیں ہے

یہاں اُس کے ترکِ سجدہ پر کُفر کا حکم لگ گیا کہ یہ کافر ہے، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کو عملاً ترک کرتا ہے تو فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کافر نہیں، کُفر آتا ہے عقیدے سے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو حکمت کے خلاف سمجھے اور یہ سمجھے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر بالاتفاق انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ابلیس ترکِ سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو خلافِ حکمت ٹھہرانے کے ساتھ کافر ہوا ہے۔ کسی فرض کو عملاً ترک کر دیا جائے، جیسے نماز فرض ہے، اِس کو کوئی شخص فرض سمجھتا ہے، اور اِس حکم کو حکمت کے مطابق سمجھتا ہے، لیکن پڑھتا نہیں، عملاً اِس کا تارک ہے، تو کافر نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی کہہ دے کہ نماز پڑھنے کا حکم تو ٹھیک ہی نہیں، یہ تو حکمت کے منافی ہے، ایسی صورت میں وہ کافر ہو جائے گا۔ تو ابلیس کا کفر اسی وجہ سے آیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے اِس حکم کو خلافِ حکمت قرار دیا اور اُس کے سامنے اکڑ گیا کہ میں اِس حکم کو نہیں مان سکتا، اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ: میں اس سے بہتر ہوں، اور آگے دلیل دے دی کہ میں بہتر کس طرح سے ہوں، حاصل اُس کا یہی ہے کہ میں اعلیٰ ہوں یہ ادنیٰ ہے، اور اعلیٰ ادنیٰ کو سجدہ نہیں کیا کرتا، اس لیے میں اس کو سجدہ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی حکمت کے انکار کرنے کی وجہ سے وہ کافر ٹھہرا۔ یہ مفہوم ہے اِن آیات کا جہاں تک آپ کے سامنے ترجمہ عرض کیا گیا ہے۔

اب یہاں ایک سوال آپ کے سامنے آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو کیا غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہے؟ اور اس سجدے کی کیا نوعیت تھی؟ اِن شاء اللہ العزیز! اس کا ذکر کل کریں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا
اور ہم نے کہا اے آدم! ٹھہر تو بھی اور تیری بیوی بھی جنت میں، اور تم دونوں کھاؤ اس جنت سے وسعت کے ساتھ جہاں کہیں تم چاہو،
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ
اور نہ قریب جائیو اس درخت کے، ورنہ ہو جاؤ گے تم قصور واروں میں سے ﴿۳۵﴾ پھسلا دیا ان دونوں کو شیطان نے

عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

اس درخت کے سبب سے، پھر نکال دیا ان کو اس عیش و آرام سے جس میں وہ دونوں تھے، اور ہم نے کہا اتر جاؤ تم، تمہارا بعض

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ

بعض کے لئے دشمن ہوگا، اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک ﴿۳۶﴾ حاصل کر لیے آدم نے

مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا

اپنے رَبّ کی طرف سے کچھ کلمات، پس اللہ نے آدم پر توجہ فرمائی، بیشک وہ تو بہت توجہ کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۳۷﴾

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

ہم نے کہا کہ اتر دتم سب آسمان سے اکٹھے، اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پھر جو شخص پیروی کرے گا

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ

میری ہدایت کی تو نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۳۸﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور میری آیات کو جھٹلایا یہ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

جہنم والے ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۳۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ: وَقُلْنَا: اور ہم نے کہا، یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، يٰٓاٰدَمُ: اے آدم! اُسْكُنْ: تو سکونت اختیار کر، تو ٹھہر، تو رہ، اَنْتَ وَزَوْجُكَ: وَزَوْجُكَ کا عطف چونکہ اُسْكُنْ کی ضمیر مستتر پر ہے، اور اسم ظاہر کا ضمیر مرفوع متصل پر اگر عطف کرنا ہو (اور معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان فاصلہ بھی نہ ہو) تو ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ اُس کا اعادہ ضروری ہے، اس لیے اَنْتَ کا ذکر آ گیا، یہ ضمیر مرفوع متصل کا اعادہ ہے منفصل کی صورت میں، ''تو ٹھہر، تو بھی اور تیری بیوی بھی'' الْجَنَّةَ: یہ اُسْكُنْ کا مفعول فیہ ہے، ''جنت میں''، وَكُلَا: اور تم دونوں کھاؤ، مِنْهَا: اُس جنت سے، رَغَدًا: یہ مصدر ہے، اور مفعول مطلق کی صفت واقع ہو رہا ہے، اور مصدر کو صفت بنا دیا گیا مبالغۃً، وَكُلَا مِنْهَا، اَكْلًا رَاغِدًا، کھاؤ تم دونوں اُس جنت سے کھلا، کھانا فراخی کا، وسعت کے ساتھ کھاؤ پیو، حَيْثُ شِئْتُمَا: جہاں کہیں تم چاہو، یعنی جنت میں تمہیں چلنے پھرنے کی بھی اجازت ہے، اور جس جگہ سے جو چاہو کھاؤ، خوب کھلا، فراخی کے ساتھ کھاؤ۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: اور تم دونوں قریب نہ جائیو اس درخت کے، اشارے کے ساتھ

اُس درخت کو متعین کر دیا گیا، فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: تَكُوْنَا کے آخر سے نون گرا ہوا ہے اصل میں تکونان تھا، نون گر گیا، گرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تکونا مجزوم ہوا اور اس کا عطف تَقْرَبَا پر ہو، پھر یہ بھی لائے نہی کے نیچے آجائے گا، لا تکونا من الظّٰلمین اور ظالموں میں سے مت ہو جائیو۔ ''اِس درخت کے قریب نہ جائیو، پھر تم ظالموں میں سے نہ ہو جائیو'' نہی کے ساتھ ترجمہ یوں ہو گیا۔ اور تَكُوْنَا منصوب بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ نصب کی وجہ سے بھی نون اعرابی گر جایا کرتا ہے، پھر یہ جواب نہی ہے، اور فاء کے بعد اَن مقدر ہے، پھر ترجمہ یوں کریں گے کہ ''تم دونوں قریب نہ جائیو اِس درخت کے، ورنہ ہو جاؤ گے تم ظالموں میں سے'' یعنی اگر تم قریب چلے گئے تو تمہارا شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔ ظالمین ظالم کی جمع ہے، اور ظلم کہتے ہیں حق تلفی کرنے کو، جو شخص بھی کسی دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اُس کے کسی حق کو تلف کر دیا، اُس کا حق دبا لیا، یا اس کا کوئی حق چھین لیا، یہ ظلم ہے، اسی لیے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا، کہ اِس میں اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے حق کو انسان تلف کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اُسے ذات و صفات میں ایک جانیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، تو جو بندہ اِس حق کو تلف کرتا ہے وہ ظالم ہے اور ظلم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے نفس کا حق ادا نہیں کرتا، ایسا کام کرتا ہے جس کی بناء پر اس کے نفس کو آنے والے وقت میں عذاب ہوگا، تکلیف میں ڈال دیا جائے گا، تو یہ اپنے نفس کی حق تلفی ہے، اِس کو ظلم علی النفس کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ: اُس نے اپنے نفس پر ہی ظلم کیا، تو اپنے نفس پر ظلم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اپنی حق تلفی کی، کیونکہ آپ کے نفس کا آپ پر یہ حق ہے کہ اُس کو عذاب سے بچانے کی کوشش کرو اور اس کے لئے اچھا انجام سامنے لاؤ، اور اگر آپ کوئی اس قسم کا کام کریں گے جس کے نتیجے میں آپ عذاب میں چلے جائیں تو یہ آپ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، تو یہاں ظالمین کا مفہوم بھی ایسے ہی ہے، ''تم اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں'' یہاں ظالمین کا یہ معنی ہے، کیونکہ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تو کھا کر کسی اور کا تو نقصان نہیں کیا، اپنا ہی کیا، اپنے نقصان کو ظلم کے ساتھ تعبیر کیا گیا، یہ ظلم علی النفس ہے، ''ہو جاؤ گے تم ان لوگوں میں سے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں'' اِس میں تمہارا اپنا نقصان ہے اگر اِس درخت کے قریب چلے جاؤ گے، تمہارا یہ ظلم ظلم علی النفس ہے، کسی دوسرے پر ظلم نہیں ہے، ظالمین کا مفہوم یہ ہے۔ ''ورنہ ہو جاؤ گے تم قصورواروں میں سے'' یوں ترجمہ کر دیا جائے تو بھی ٹھیک ہے، اور ''ورنہ ہو جاؤ گے تم اُن لوگوں میں سے جو اپنا نقصان کر لیتے ہیں'' یہ ترجمہ بھی ٹھیک ہے۔ اور اگر آپ ظالم کا لفظ ہی بولیں تو ہماری زبان میں یہ لفظ ذرا گراں سا سمجھا جاتا ہے، ''ہو جاؤ گے تم ظالموں میں سے''، ظالم کا لفظ ہماری زبان میں بہت ثقیل سا ہے، جس کے مفہوم میں کچھ ایسی باتیں آجاتی ہیں جن کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف ٹھیک نہیں ہے، اور یہاں اُنہوں نے گندم کھا کر، یا جو بھی درخت تھا، وہ کھا کر نقصان کیا تو اپنا کیا، اس لیے یہاں ظالم کا مفہوم ظالم علی النفس والا ہے۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا: زَلَّ يَزِلُّ: پھسلنا، زَلَّتْ قَدَمُهٗ: اس کا قدم پھسل گیا، اور فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا قرآن کریم میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے (سورۂ نحل: ۹۴)۔ لغزش: قدم کا پھسل جانا، اَزَلَّ: پھسلا دینا، اور عَنْهَا میں عَن سببیہ ہے، ''پھسلا دیا شیطان نے ان دونوں کو اُس درخت کے سبب سے''، فَاَخْرَجَهُمَا: پھر نکال دیا اُن دونوں کو، مِمَّا كَانَا

فِیْهِ: اُس عیش وآرام سے جس میں وہ دونوں تھے، مِمَّا کَانَا فِیْهِ: جس چیز میں وہ دونوں تھے، اِس سے مراد جنت کا عیش وآرام ہے، وَقُلْنَا: اور ہم نے کہا، اهْبِطُوْا: اتر جاؤ، یعنی آسمانوں سے اتر جاؤ کیونکہ جنت آسمانوں پر ہے، اتر جاؤ تم سب، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: تمہارا بعض بعض کے لئے دشمن ہوگا، اِهْبِطُوْا کا خطاب آدم علیہ السلام، حواء علیہا السلام، اور شیطان کو ہے، وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ: اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے، وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ: اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک، یعنی وہاں بھی دوام نہیں بلکہ کچھ وقت کے لئے تم وہاں جا کر وقت گزارو گے، وہاں تمہارا ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ایک وقت تک ہوگا۔ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ: حاصل کر لیے آدم نے اپنے ربّ کی طرف سے کچھ کلمات، فَتَابَ عَلَيْهِ: تاب توبۃً اِس کے اندر معنی ہے رجوع کرنے کا، لوٹنے کا۔ اس لیے یہ صفت بندے کی بھی آتی ہے تاب العبدُ، جیسے بندوں کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ (سورۂ تحریم: ۸)، اور یہ صفت اللہ کی بھی آتی ہے تاب اللّٰہُ (سورۂ مائدہ: ۷۱)، تو تَابَ کا فاعل اللہ بھی آتا ہے اور اس کا فاعل بندہ بھی آتا ہے، لیکن جس وقت اِس کا فاعل اللہ ہوتا ہے تو عموماً اس کا صلہ علیٰ آیا کرتا ہے جیسے تاب علیہ اور جس وقت اس کا خطاب بندے کو ہوتا ہے تو اس وقت اس کا صلہ اِلیٰ آیا کرتا ہے جیسے تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ، تاب اِلی اللہ، اور اس کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ بندے کا اصل رخ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے، اور جس وقت وہ معصیت اختیار کرتا ہے تو اس نے اللہ سے اعراض کر لیا، اللہ سے اپنا رخ پھیر لیا، اور اللہ تعالیٰ بھی اپنا رخ اس بندے سے پھیر لیتا ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔ اور بندے کے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے جو اعراض شروع کر دیا تھا وہ اعراض ختم کر دیا اور اللہ کی طرف وہ لوٹ آیا، اور اللہ کی طرف اس کے لوٹنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اللہ بھی اس پر رحم اور شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو اِس کی معصیت کی بناء پر اِس سے اعراض کر لیا تھا تو بندے کے لوٹنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی ہو جاتی ہے، تو اِس تاب علیہ کے اندر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مہربانی کے ساتھ، رحم اور شفقت کے ساتھ اُس پر متوجہ ہو گیا، یہ مفہوم ہے جس کی بناء پر تاب کا فاعل اللہ بھی آجاتا ہے اور اس کا فاعل بندہ بھی ہوتا ہے۔ فَتَابَ عَلَيْهِ: اللہ تعالیٰ نے مہربانی کے ساتھ آدم کے اوپر توجہ فرمائی، اور اِسی کا حاصل مفہوم ہوا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، توبہ کے قبول کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اُس معصیت کی بناء پر پہلے اللہ تعالیٰ نے اعراض فرمالیا تھا اور اب بندے پر متوجہ ہو گیا، ”اللہ نے توبہ قبول کر لی“ یہ حاصل ترجمہ ہے، ورنہ اصل ترجمہ یہ ہے کہ اللہ اُس پر متوجہ ہوا۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: دیکھو! یہاں تواب اللہ کی صفت ہے، بیشک وہ تو بہت توجہ کرنے والا ہے، الرَّحِيْمُ: رحم کرنے والا ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا: ہم نے کہا کہ اترو تم سب، مِنْهَا: اِس آسمان سے، جَمِيْعًا: اِس کا تعلق اهْبِطُوْا سے ہے، سارے کے سارے اکٹھے اترو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى: اِمَّا اصل میں اِنْ مَا ہے، اِنْ شرطیہ، مَا زائدہ، اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت، راہنمائی، فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ: پھر جو شخص پیروی کرے گا میری ہدایت کی، فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: نہ اُن کے اُوپر کوئی خوف ہوگا، وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ خوف اور حزن یہ دو لفظ آگئے، خوف ہوا کرتا ہے کسی آنے والے خطرے کے تصور سے، اور حزن ہوا کرتا ہے کسی واقعہ پر جو پیش آچکا ہو، یعنی انسان کے دل کو دکھ دو طرح سے پہنچا کرتا ہے، مثلاً بچہ بیمار ہے، اب اِس احتمال کی بناء پر کہ یہ مرجائے گا، جب انسان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ کہیں یہ مرنہ

جائے، اِس خطرے کا جو تصور انسان کو آتا ہے تو دل کو ایک تکلیف ہوتی ہے، یہ خوف کہلاتا ہے، کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، آنے والے واقعات سے جو خطرہ ہوتا ہے، اور دل کے اندر ایک دکھ سا انسان محسوس کرتا ہے، فکر سی لگ جاتی ہے، جس کے تحت تاثر یہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا ہو نہ جائے، اِس کو کہتے ہیں خوف۔ اور ایک ہے کہ بچہ مر گیا، واقعہ پیش آ گیا، اس کے بعد جو دل میں دکھ ہوتا ہے، اِس کو عربی میں حزن سے تعبیر کرتے ہیں، گزرے ہوئے واقعہ پر جو تکلیف ہوتی ہے اُس کو حزن سے تعبیر کرتے ہیں، تو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مطلب یہ ہوا کہ نہ اُن کو کسی آنے والے خطرے کی بناء پر دل میں تکلیف ہوگی، اور نہ ہی کسی گزرے ہوئے واقعہ پر ان کو دکھ ہوگا۔ اور اِن الفاظ کے ساتھ قرآنِ کریم میں جنت کی زندگی کی تعبیر ہوتی ہے، کہ جنت کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی حزن، دنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان طبعی طور پر خوف وحزن سے نہیں بچ سکتا، یہاں زیادہ تر واقعات مرضی کے خلاف پیش آتے ہیں، مرضی کے خلاف پیش آنے کی جو توقع ہوتی ہے اُس کی بناء پر بھی قلب کے اُوپر ایک ناگواری سی کیفیت طاری ہوتی ہے، اُس کو خوف سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور طبیعت کے خلاف جو واقعات پیش آجاتے ہیں اُن سے قلب کے اندر جو ناگواری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کو حزن سے تعبیر کیا جاتا ہے، دنیا کے اندر حزن اور خوف انسان کو گھیرے ہوئے ہیں، بعض چیزوں کا ڈر ہے اور بعض جو واقع ہو چکی ہیں اُن کا دکھ ہے، اور جنت کی زندگی ایک ایسی زندگی ہوگی جس کے اندر نہ کسی آنے والے واقعات سے انسان کے اُوپر کوئی خطرہ ہوگا، اور نہ کوئی واقعہ ایسا پیش آئے گا کہ اُس کے پیش آنے کے بعد انسان کے دل کو تکلیف ہو، اس لیے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ جنت کی زندگی کا ایک عنوان ہے، تو پھر مطلب یہ ہوا کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ دوبارہ جنت میں چلے جائیں گے، اور خوف وحزن کی زندگی سے نجات پا جائیں گے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ: اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور میری آیات کی تکذیب کی، آیات آیت کی جمع ہے، اور آیت نشانی کو کہتے ہیں، ایسی آیات جو احکام پر دال ہوں، یا معجزات، یہ سب اِس کا مصداق ہوتے ہیں، اسی طرح آفاق کے اندر ایسی نشانیاں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اُوپر دلالت کرتی ہیں اُن کو بھی آیات کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ کُفر اور تکذیب، اِن دونوں کے درمیان میں فرق یہ ہے کہ کُفر قلب کے ساتھ ہوتا ہے اور تکذیب زبان کے ساتھ ہوتی ہے، دل میں غلط عقیدہ بٹھا لیا جائے تو یہ دل کا کفر ہے، زبان سے اُس کا اظہار کر دیا جائے تو یہ زبان سے اللہ کے احکام کی تکذیب ہے، جس طرح سے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ایمان کے دو درجے ہوتے ہیں، کہ دل سے مانا جائے اور زبان سے اقرار کیا جائے، اسی طرح سے ایک آدمی دل سے نہیں مانتا اور زبان سے جھٹلاتا ہے، تو کفر وتکذیب کا لفظ ان دو حالتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے توبہ اور استغفار کے اندر بھی یہی فرق کیا جاتا ہے، کہ توبہ اصل کے اعتبار سے قلب سے ہوتی ہے اور استغفار زبان سے، زبان سے جو انسان اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے اُس کو استغفار سے تعبیر کر دیتے ہیں، اور توبہ اصل کے اعتبار سے قلب سے ہوتی ہے، تو بہ واستغفار کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں بھی اپنے کیے پر ندامت محسوس کرو اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرو کہ ہم سے غلطی ہو گئی، یہ معاف کر دی جائے، اور آئندہ میں ایسا نہیں کروں گا، زبان سے جب انسان اس طرح سے ظاہر کرتا ہے، یہ استغفار ہو گیا۔ تو توبہ واستغفار، کُفر وتکذیب، اقرار وتصدیق

اِن دونوں کے درمیان میں یوں فرق کر دیا جاتا ہے کہ ایک کو قلب سے اور ایک کو زبان سے لگا دیا جاتا ہے، ''جنہوں نے کفر کیا اور میری آیات کو جھٹلایا''، اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ: یہ جہنم والے ہیں، ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمۡدِکَ اَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُکَ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡکَ

اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ الَّذِیۡ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ

گزشتہ سے پیوستہ

سجدۂ تعظیم اور سجدۂ عبادت میں فرق

کل کے سبق میں ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو جو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، یہ سجدہ غیراللہ کو ہے، تو کیا اللہ کے غیر کو سجدہ کرنا جائز ہے؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم کو کروایا۔ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ سجدہ دو قسم پر ہے، سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم، اِن دونوں کے درمیان فرق انسان کے عقیدے سے ہوتا ہے۔ جس کے سامنے وہ جھکتا ہے اور اُس کو سجدہ کرتا ہے اگر تو اُس کے اندر اِلٰہ والی صفات مانتا ہے، اس کو اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھتا ہے، اپنے حالات کا جاننے والا اور عالم الغیب مانتا ہے، اور اُس کے لئے تصرف کا قائل ہے، کہ بنانا اور بگاڑنا اِس کے اختیار میں ہے، یعنی اِلٰہ کے مفہوم میں آپ کے سامنے جو باتیں ذکر کی جایا کرتی ہیں، جیسے سورۂ فاتحہ میں عبادت کے لفظ کے تحت یہ عرض کیا تھا کہ اپنے اُوپر کسی کا غیبی تسلط اِس درجے میں مان لینا کہ اُس سے بڑا درجہ متصور نہ ہو، اور انتہائی عظمت محسوس کرتے ہوئے اُس کے سامنے تذلل اور انکسار کا اظہار عبادت کہلاتا ہے، اگر اس قسم کے جذبات کے تحت وہ سجدہ کیا گیا ہے تو وہ سجدۂ عبادت ہے۔ اور ایک ہوتا ہے کہ اس قسم کے جذبات تو نہیں ہیں، اور نہ اپنے مسجود لہ کے اندر اس قسم کی صفات مانی گئیں، بلکہ جس طرح سے آج کل ہم محبت کے ساتھ سلام کرتے ہیں یا اپنے بزرگوں کے ہاتھ چوم لیتے ہیں، یہ عظمت کا اقرار ہے اور ان کے سامنے اپنی پستی کا اور اپنے چھوٹے ہونے کا اظہار ہے، تو اسی درجے میں تعظیم کی جائے سر ٹیک کر اور زمین کے اُوپر سر رکھ کر، جس کو سجدہ کہتے ہیں، تو یہ سجدۂ تعظیم ہے۔ تو ظاہری طور پر فعل ایک ہی ہے لیکن دونوں کے درمیان میں فرق انسان کے عقیدے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اُمتِ محمدیہ میں سجدۂ تعظیم کی حرمت

سجدۂ تعظیم گزشتہ اُمتوں میں جائز تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم کروائی اِسی سجدے کے ساتھ، یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا، تو یہ سجدہ سجدہ تعظیمی کہلاتا ہے، پچھلی اُمتوں میں یہ جائز تھا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد اس شریعت میں جو قرآن اور حدیث کی طرف منسوب ہے، اِس سجدہ تعظیمی کو بھی حرام ٹھہرا دیا گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسی جگہ کا رواج ذکر کیا، کہ وہ اپنے بڑے کو سجدہ کرتے ہیں، اور وہ رواج ذکر کر کے اجازت چاہی، کہ آپ زیادہ حقدار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

سے منع فرمایا، اور یہ کہا کہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کرے تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔[1] اللہ تعالیٰ نے خاوند کے جو حقوق بیوی پر بنائے ہیں اُن کا تقاضا تھا کہ بیوی خاوند کو سجدہ کرے، جب بیوی کو اجازت نہیں دی گئی خاوند کو سجدہ کرنے کی، تو پھر اللہ کی مخلوق میں سے کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی اس کو ذکر کیا لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (سورۂ حم السجدہ: ۳۷) جس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کو اور چاند کو سجدہ نہ کیا کرو، سجدہ اسی کو کیا کرو جس نے ان کو پیدا کیا، اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب سجدہ صرف خالق کے لئے ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے، اور حضور ﷺ نے اپنے آپ کو سجدہ کرنے سے بھی ممانعت کردی اور اس بات کو گوارا نہیں کیا۔ اور یہ روایت تقریباً بیس صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اس لیے اس کا درجہ تواتر کا ہے، اور اگر کوئی شخص تواتر کا انکار کرے تو شہرت کے درجے میں یقیناً ہے، تو قرآنِ کریم کی اِن آیات سے جو جواز نکلتا ہے کہ اس قسم کا سجدہ کیا جاسکتا ہے وہ روایت اس کے نسخ کے لئے حجت ہے، جبکہ قرآنِ کریم میں دوسرے اشارے اس قسم کے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدے کی علی الاطلاق ممانعت ہے، اور سجدہ صرف خالق کے لئے ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں۔

یہ تقریر کرنے کی ضرورت اُس وقت پیش آئے گی جب ہم تسلیم کرلیں کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا تھا تو آدم علیہ السلام کو ہی کیا گیا تھا اور وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْأَرْضِ کی صورت میں کیا گیا تھا، اور یوسف علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کو ہی کیا گیا تھا اور وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْأَرْضِ کی صورت میں کیا گیا تھا، زمین پر پیشانی رکھنے کی صورت میں کیا گیا تھا، اِن دونوں باتوں کو تسلیم کرلینے کے بعد پھر یہ تقریر ہے کہ اب یہ سجدہ منسوخ ہے اور اِس کے اوپر اجماعِ اُمّت ہے۔

سجدۂ تعظیم کے متعلق بعض صوفیہ کا عمل حجت نہیں

فقہاء میں سے کسی فقیہ نے اجازت نہیں دی، صحابہ میں سے کسی کا اِس کے متعلق جواز کا قول نہیں ہے، تابعین میں سے کسی کا جواز کا قول نہیں ہے، اور ہندوستان کے بعض صوفیہ کی طرف جو نسبت کی گئی ہے کہ اُن کی مجلس کے اندر سجدہ کیا جاتا تھا، یہ ان کی ہمیشہ غلطی قرار دی گئی اور ان کا عمل حجت نہیں ہے، اگر انہوں نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر ایسا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معذور ہیں، اور اگر کسی تاویل کی غلطی پر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے، بہرحال ان کے عمل پر مدار نہیں رکھا جاسکتا، ان کا عمل اِس کے جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے، اور اُن پر ملامت بھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مختلف وجوہ ہوسکتے ہیں، ناواقفیت، علم کی کمی، تحقیق کی کمی، کسی تاویل وغیرہ کی غلطی، بہرحال اُن کے عمل سے جواز نہیں ثابت کیا جاسکتا۔

فرشتوں کے سجدے کے متعلق مزید اقوال

اور اگر یہ تسلیم ہی نہ کیا جائے کہ یہ سجدہ آدم کو تھا، اور اسی طرح یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ زمین کے اُوپر پیشانی رکھ کر انہوں نے سجدہ کیا تھا تو ان دونوں باتوں کی بھی گنجائش ہے۔ مفسرین نے یہ اقوال بھی اختیار کیے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے جو سجدہ کیا تھا

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۳ باب حق الزوج علی المرأۃ / مشکوٰۃ ص ۲۸۱ باب عشرۃ النساء، فصل ثالث۔

تو آدم کو سجدہ کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ آدم ایسے تھے جیسے ہمارے لیے کعبۃ اللہ ہے، کہ ہم بھی کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں، بظاہر ہمارا سجدہ اس کمرے کو ہوتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے عبادت اللہ کی ہوتی ہے، ہاں البتہ جدھر منہ کرا کے سجدہ کرایا تو کسی نہ کسی درجے میں اُس کی عظمت نمایاں ہوگئی، تو حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں کے لئے بطور کعبہ کے تھے، اور آدم علیہ السلام کی طرف منہ کر کے فرشتوں نے جو سجدہ کیا تو سجدہ اللہ کو تھا، اور اِس میں عظمت نمایاں تھی حضرت آدم علیہ السلام کی، یہ تاویل بھی اِس میں کی گئی ہے (آلوسی، مظہری)۔ اور یہ بھی آپ کتابوں کے اندر پڑھیں گے، غالباً جلالین کے اندر بھی قول آئے گا کہ یہ سجدہ وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْأَرْضِ کے طور پر نہیں تھا، بلکہ مطلقاً اِنحناء کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ تعظیماً جھک گئے، اگر چہ اس قسم کا اِنحناء اور تعظیماً جھکنا بھی اب ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھائیوں نے جو سجدہ کیا تو وہ سجدہ اللہ کو تھا، گویا کہ یوسف علیہ السلام کی اس حالت کو دیکھ کر شکر ادا کیا، منہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا اور حقیقت میں اللہ کا شکر ادا کرنا مقصود تھا اور یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے تھا، یوسف علیہ السلام کے لئے نہیں تھا، یہ تاویلیں بھی تفسیر کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں، اور اِذَا جَاءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ جب اِن آیات کے اندر یہ احتمالات بھی موجود ہیں تو یہاں سے سجدہ تعظیمی کے جواز کے لئے استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہر حال زیادہ پختہ بات پہلی ہے کہ اس میں زیادہ تاویلات کی ضرورت پیش نہیں آتی، تسلیم کرلیں کہ یہ سجدہ وضع الجبہہ کے ساتھ تھا، اور تسلیم کرلیں کہ آدم علیہ السلام کو اور یوسف علیہ السلام کو تھا، لیکن ہم یہ کہیں گے کہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا، اور یہ سجدۂ تعظیمی تھا، سجدۂ عبادت نہیں تھا، کیونکہ سجدۂ عبادت کبھی کسی شریعت میں مشروع نہیں رہا۔ جس طرح سے آج مصافحہ ہے، معانقہ ہے، تقبیل ہے، ہم محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کام کر لیتے ہیں تو پچھلی امتوں کے اندر یہ سجدہ اِسی درجے کا تھا، اور اِس شریعت کے اندر اِس صورت کو منع کر دیا گیا، کیونکہ اِس میں جاہلوں کے لئے عقیدے کے خرابی کی گنجائش ہے، کہ یہ سجدہ تعظیمی نہ رہے، سجدۂ عبادت بن جائے، اور حضور ﷺ کی شریعت چونکہ آخری شریعت ہے، اِس کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا، تو ہر اُس صورت کو ممنوع ٹھہرا دیا گیا جس کی صورت شرک کے ساتھ ملتی جلتی تھی۔ یہ ہے اِس مسئلے کی تحقیق جو آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔

زیرِ درس آیات کی تفسیر

حواء علیہا السلام کی پیدائش، اور عورت کی فطرت

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ پیش آگیا کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کرلیا، اور ابلیس آدم علیہ السلام کے سامنے نہ جھکنے کی بناء پر مردود ہوگیا، اب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اور اس کی بیوی کو، جو کہ روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے کے بعد ان کی کسی پسلی سے کوئی مادہ لے کر اُس کو بنیاد بنا کر ان کے لئے زوجہ بنادی گئی تھی تاکہ اس کے ساتھ سکون حاصل کریں لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (سورۂ اعراف: ۱۸۹)، پسلی سے کوئی مادہ لیا گیا تھا جس سے بنائی گئی، تفسیری روایات میں یہی ہے (عام تفاسیر)۔ اس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کے متعلق میری

وصیت قبول کرو کہ اِن پر زیادہ سختی نہ کیا کرو، کیونکہ اِن کی طبیعت میں فطری طور پر کجی ہے، اس لیے ان کو کج رکھتے ہوئے ہی ان سے فائدہ اٹھاؤ، اگر زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائیں گی، کیونکہ اِن کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے، اس لیے اِن کی خلقت اور اِن کی فطرت کے اندر کسی نہ کسی درجے کی کجی ہے، اور ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے نکال دو گے، طلاق دے دو گے، اور اگر یہ کہو کہ یہ بالکل سیدھی ہو جائیں اور ہمارے ساتھ پوری طرح سے موافقت کر کے رہیں، یہ بہت مشکل ہے۔ عورت کی طبیعت کے اندر مرد کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ کجی ہے، اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کجی کو برداشت کرتے ہوئے اِس سے فائدہ اٹھاؤ، اور اِس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، اور اِس کا ٹوٹنا یہ ہے کہ طلاق ہو جائے گی،[1] بہر حال آدم علیہ السلام کی پسلی سے کچھ مادہ لے کر اُس کو بنیاد بنا کر آدم علیہ السلام کی بیوی بنا دی گئی تھی۔

جنّت میں بھیجتے وقت حضرت آدم و حوّاء کو ہدایات

تو اُس کے بننے کے بعد یہ حکم ہوا کہ تو بھی اور تیری بیوی بھی دونوں جنّت میں رہو (اِس بیوی سے مراد حواء ہے، حواء کا نام قرآن میں نہیں آیا ہوا، روایات سے معلوم ہوتا ہے) اور تم دونوں اس جنّت میں جہاں سے چاہو، جو چاہو کھاؤ، تمہیں کھلی چھٹی ہے، صرف ایک درخت پر پابندی لگاتا ہوں کہ اِس درخت کے قریب نہ جانا، قرآنِ کریم کی آیات میں اور حدیث شریف کی صحیح روایات میں کہیں مذکور نہیں کہ اِس شجرہ سے کون سا شجرہ مراد ہے، مفسرین نے اِس کی مختلف توجیہات کی ہیں، وہ احتمال کے درجے میں ہیں، اور قرآنِ کریم کی تفسیر اِس پر موقوف نہیں کہ تعیین کی جائے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لئے ایک قسم کا امتحان متعین کیا، کہ اُن کو ایک چیز سے ممانعت کر دی اور باقی لاکھوں چیزوں میں چھٹی دے دی، جس طرح سے آج دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے لیے بھی ایسے ہی ہے، کہ ممنوعات اور محرمات چند گنتی کی چیزیں ہیں، یہ نہ کرو، یہ نہ کرو، یہ نہ کرو، یہ چیز نہیں کھانی، یہ چیز نہیں کھانی، باقی ساری دنیا سے فائدہ اٹھانے کی تمہیں اجازت دے دی، یہ بھی ایک قسم کا امتحان ہے۔ لیکن انسان کی طبیعت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکمت کے تحت یہ ایک کمزوری رکھی ہے کہ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَامُنِعَ جدھر سے اِس کو روکا جائے اِس کی طبیعت اُدھر زیادہ متوجہ ہوتی ہے، اور یہی انسان کے لئے مقامِ امتحان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے پابندی لگا دی اور یہ کہہ بھی دیا کہ اگر اس کے قریب جاؤ گے (قریب جانے سے ممانعت کر کے شدت سے بچنے کا حکم دینا مقصود ہے، جیسے لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی (سورۂ اسراء: ۳۲) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، مطلب یہ ہے کہ اُس کے مقدمات اور ایسے اسباب جن کے ساتھ انسان وہاں تک پہنچ سکتا ہو اُن سے بھی بچو۔ تو شدت کے ساتھ بچنے کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اِس کام کے قریب بھی نہ جاؤ) اگر قریب چلے جاؤ گے تو نقصان اپنا کرو گے۔ یہ بات آدم علیہ السلام کو سمجھا دی گئی، اور آدم علیہ السلام جنّت میں رہنے لگ گئے۔

آدم علیہ السلام سے شیطان کی دشمنی کا آغاز

اب ابلیس چونکہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے مار کھا چکا تھا، شکست کھا گیا تھا، اللہ کے ہاں وہ مردود ہو گیا، ملعون ہو گیا، اور وہ سمجھتا

---

(۱) مسلم ۱/۴۷۵ باب الوصیۃ بالنساء/ مشکوٰۃ ۲/۲۸۰ باب عشرۃ النساء۔ فصل اول/ نیز بخاری ۱/۴۶۹ خلق آدم وذریۃ۔

تھا کہ میرے ساتھ یہ معاملہ آدم علیہ السلام کی بناء پر ہوا ہے، کیونکہ حسد اور تکبر کی بناء پر اس نے آدم علیہ السلام کو گوارا نہیں کیا تھا، اور اِس گوارا نہ کرنے کی وجہ سے جب وہ مردود اور مغضوب ہوا تو اُس کا غصہ اور بھڑک اٹھا، چنانچہ سورۂ اعراف میں آپ کے سامنے آئے گا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اُس کے اُوپر ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ نادم اور شرم سار نہیں ہوا، اور یاد رکھیئے! جو گناہ بھی حسد یا تکبر کی بناء پر ہوا کرتا ہے اُس کا اثر یہی ہوتا ہے کہ انسان اُس پر نادم نہیں ہوتا، شرمساری کا اظہار نہیں کرتا، اور جو غلطی طبعی کمزوری کی بناء پر ہوا کرتی ہے اُس پر ہمیشہ انسان نادم بھی ہو جاتا ہے، اپنی غلطی کا اقرار بھی کر لیتا ہے، معافی بھی مانگ لیتا ہے، تو اِن دونوں گناہوں میں یہ فرق ہے، جو غلطی انسان سے طبعی کمزوری کی بناء پر ہوتی ہے اُس سے توبہ کرنے میں اور ندامت کا اظہار کرنے میں انسان ذرا باک نہیں محسوس کرتا، ایک آدمی پکڑا گیا، اُس نے غلطی کر لی، وہ کہے گا ہاں جی! مجھ سے غلطی ہوگئی، یہ میری غلطی ہے، میں نے کوتاہی کی، مجھے معاف کر دیا جائے، تو وہ بہت جلدی مان جائے گا، لیکن جو گناہ کسی نے تکبر کی بناء پر کیا ہو یا کسی کے ساتھ حسد کی بناء پر کیا ہو وہاں وہ جھکنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوتا۔ ابلیس کا گناہ آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد اور تکبر کی بناء پر تھا، اس لیے جس وقت اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اُسے یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں اب آدم کو سجدہ کر دیتا ہوں، کیونکہ یہ بات اُس کے تکبر کے بھی منافی تھی اور اس کے حسد کے بھی منافی تھی، وہ آگے سے اکڑ گیا، اور اکڑنے کے بعد اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے آدم کے متعلق اور آدم کی اولاد کے متعلق جس قسم کا اظہار کیا تھا سورۂ اعراف میں اُس کی تفصیل آئے گی، جس کا مطلب یہ تھا، جس طرح سے آج کوئی کہے کہ اچھا! یہ آپ کا بہت چہیتا ہے، جس کی بناء پر آپ نے میرے اُوپر سختی کی ہے، کوئی موقع ملا تو میں بتاؤں گا کہ یہ آپ کا کتنا فرمانبردار ہے، اِس کی فرمانبرداری آپ کے سامنے آجائے گی، ذرا مجھے مہلت دو، اِس کی غلطیاں میں تمہیں پکڑ کر بتاتا ہوں کہ کیا کرتا ہے، کیا نہیں کرتا۔ جب دو میں مقابلہ ہوتا ہے تو پھر اسی قسم کے جذبات ہوتے ہیں، تو ابلیس نے بھی وہاں اسی طرح کیا، کہ ٹھیک ہے یہ آپ کا بہت لاڈلا ہے، مجھے ذرا مہلت دے کر دیکھو، میں نے اِس کا سب لاڈلا پن نہ نکال دیا تو کہنا، جس کی آج تم اتنی عزت افزائی کر رہے ہو، اور ہم نے اِس کو سلام نہیں کیا تو ہمیں مردود کر دیا، میں دیکھوں گا آپ کا کتنا فرمانبردار بن کر رہتا ہے، اگر اِس کی ساری کی ساری اولاد کو قابو نہ کر لیا تو کہنا، لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (سورۂ اعراف: ۱۷) اِن میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہیں پائے گا، اِس طرح سے کھڑے ہو کر اُس نے گویا کہ تقریر جھاڑ دی، کہ مجھے ذرا چھٹی دو تو میں بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی کہہ دیا کہ چل! مہلت ہے، کر لینا جو کچھ تجھ سے ہوتا ہے، اور آدم کو کچھ ہدایات دے دیں۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ ابلیس کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں، اور آدم علیہ السلام جنت میں بڑے اعزاز اور احترام کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں، اب وہ حیلہ جوئی کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے آدم کو پھسلائے، اور جیسے اس نے آدم علیہ السلام کا تابوت پڑا ہوا دیکھا تھا، اور دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بھکول ہوگا، اِس کو بہکایا جا سکتا ہے، اِسی سے اُس کی حوصلہ افزائی ہوگئی کہ کوئی نہ کوئی راستہ اس قسم کا تلاش کروں کہ آدم علیہ السلام کو بہکاؤں۔

ابلیس مردود ہو جانے کے بعد بھی آسمانوں پر ٹھہرا ہوا تھا

آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے اس نے کیا طریقہ اختیار کیا؟ سورۂ اعراف میں اِس کی تفصیل آئے گی، چونکہ واقعہ شروع

ہوگیا اس لیے یہیں عرض کر دیتا ہوں، طریقہ اُس نے یہ اختیار کیا کہ آدم علیہ السلام سے جس وقت میل جول ہو گیا، یا تو جنت میں ابھی اُس کا آنا جانا تھا کہ اللہ نے مردود تو اس کو کر دیا تھا، لیکن ابھی وہ آسمان سے اترا نہیں تھا، جیسے اھبطوا سے معلوم ہوتا ہے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس بات کو سمجھانے کے لئے کہتے ہیں کہ جیسے کریم آقا کا حال ہوتا ہے کہ اگر نوکر گستاخی کرلے تو اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ چل، نکل جا، دفع ہو جا یہاں سے، نوکری سے اُس کو معزول کر دیا، لیکن فوراً ہی بوریا بستر اٹھا کر باہر نہیں پھینک دیا جاتا، آہستہ آہستہ وہ اپنا انتظام کر کے دو چار دن میں چلا جاتا ہے، یہ نہیں کہ اسی وقت ہی بوریا بستر اٹھایا اور باہر پھینک دیا۔ چاہے اس کو ملازمت سے معزول کر دیا، لیکن اس کو فوراً گھر سے نہیں نکال دیا جاتا، اسی طرح سے یہ مردود ہو گیا تھا، لیکن اس کی آمد و رفت ابھی تھی۔ یا ہو سکتا ہے کہ جنت میں نہ جاتا ہو، آسمان میں ابھی گھومتا پھرتا ہو، اور آدم علیہ السلام جنت میں گھومتے پھرتے کہیں جنت کے دروازے پر آگئے ہوں اور آپس میں ملاقات ہو گئی ہو۔

آدم علیہ السلام کو پھسلانے کے لئے اِبلیس کا طریقہ واردات

جب ملاقات ہوئی تو علیک سلیک ہوئی، جس طرح سے ووٹ لینے والے ممبر اُس وقت بڑے مؤمن، بڑے مخلص، اور سب کچھ ہو جایا کرتے ہیں، اسی طرح سے وہ بھی جب آدم علیہ السلام کو دیکھتا ہوگا تو ظاہری طور پر بڑے احترام کے ساتھ پیش آتا ہوگا داؤ کھیلنے کے لیے، کہ کسی طرح اس کو قابو کروں، تو باتیں کرتے کرتے معلوم کر لیا کہ جنت کی نعمتوں کا کیا حال ہے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز سے روکا بھی ہے؟، وہ کہنے لگے ہاں جی! ہمیں فلاں درخت سے روکا ہے (یعنی آیات کی طرف دیکھتے ہوئے صورت یوں بنے گی) فلاں درخت سے روکا ہے، اور باقی ہمیں کھانے پینے کی اجازت دی ہے، وہ کہتا ہے کہ آدم! تجھے ایک بات بتاؤں؟ یہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے وہاں سے روکا ہے وہ ابتداء ابتداء کی بات تھی جس وقت تو نیا نیا جنت میں گیا تھا، کیونکہ وہ بہت قوی غذا ہے اور جس وقت معدہ نیا نیا ہوتا ہے تو وہ قوی غذا کو ہضم نہیں کر سکتا۔ جیسے آپ کو سمجھانے کے لئے کہوں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گوشت کتنی ہی مقوی غذا ہے، اور بھینس کا دودھ کتنا ہی قوت بخش ہے، اور مکھن کتنا ہی اچھا ہے، مرغی کا انڈہ کتنا ہی مقوی ہے، لیکن پیدا ہونے والے بچے کو نہیں دیا جاتا، ممانعت ہوتی ہے کہ بچے کو گوشت نہیں کھلانا، بچے کو مکھن نہیں کھلانا، بچے کو انڈہ نہیں دینا، کیوں؟ کہ اُس کا معدہ ابھی متحمل نہیں ہے، جب وہ دنیا کی چیزیں کھا کھا کر اِس قابل ہو جاتا ہے کہ انڈہ ہضم کرلے، گوشت کھالے، اور دودھ اچھی طرح سے پی لے، مکھن کھالے، پھر سیروں کے حساب سے کھاتا ہے، وہ اُلٹا اُس کی قوت میں اور زیادہ اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ شیطان نے کہا وہ تو نئی نئی بات تھی جب تم جنت میں گئے تھے، چونکہ بہت قوی غذا ہے، اِس لیے تمہیں روک دیا کہ پہلے تم جنت کی نعمتوں کے ساتھ مانوس ہو جاؤ۔ ورنہ اِس درخت کا اثر یہ ہے کہ اگر تم اس کو کھالو گے ایک تو کبھی تمہیں موت نہیں آئے گی اور دوسرے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارا یہ ملک اور سلطنت اور تمہاری یہ بادشاہت قائم رہے گی، یہ لفظ قرآنِ کریم میں آئے ہوئے ہیں هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (سورۂ طٰہٰ: ۱۲۰) میں تمہیں ایسے درخت کی راہنمائی نہ کروں جو شَجَرَةُ

الخُلْدِ ہے کہ جو اُس کو کھالے اس کو کبھی موت نہیں آتی، اور اسی طرح مُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ: تمہیں ایسی سلطنت پر راہنمائی نہ کروں جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی، ہمیشہ بادشاہ بن جاؤ گے، ہمیشہ اِسی طرح سے رہو گے، شیطان نے اس طرح سے تقریر شروع کردی، کہ یہ شَجَرَةُ الخُلْدِ ہے، اِس کے کھانے کے ساتھ انسان موت سے بچ جاتا ہے، جس طرح سے آبِ حیات کے متعلق مشہور ہے کہ جو پی لے اُس کو موت نہیں آتی، تو شیطان نے کہا یہ شَجَرَةُ الخُلْدِ ہے، اور اس کے کھانے کے ساتھ انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے، اور ایسی سلطنت مل جاتی ہے جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوتی، چونکہ بہت قوت والا درخت تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابتداء ابتداء میں ممانعت کردی تھی، کہ کہیں اِس کو ابھی نہ کھالیجیو، تمہارے اندر اس کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اگر اُس وقت کھالیتے تو آپ کا نقصان ہوتا، جس طرح سے بچے کو اگر آپ مقوی غذا دے دیں گے تو اُس کو پیچش لگ جائیں گے، پیٹ میں درد ہوجائے گا، اور بچے کا نقصان ہوجائے گا، اسی طرح آپ کو جو ممانعت کی گئی تھی کہ اِس کو نہ کھائیو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے، تو اُس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی آپ میں صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی، اور اب تو صلاحیت پیدا ہوگئی، اور اگر کھالو گے تو کھانے کے ساتھ تمہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوجائے گی اور ہمیشہ کے لئے سلطنت حاصل ہوجائے گی، اور کبھی بھی تم موت کا شکار نہیں ہوؤ گے۔ اور اِس بات کو بیان کرنے کے بعد قرآن نے ابلیس کے متعلق کہا کہ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (سورۂ اعراف: ۲۱) اُن دونوں کے سامنے وہ اللہ کی قسمیں کھا گیا، اور ساتھ ہی یہ کہنے لگ گیا کہ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ: میں تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں...... کیونکہ ہر غلط کار آدمی جس وقت دوسرے کو کسی غلط راستے پر لگاتا ہے تو پہلے اپنے آپ کو اُس کا خیر خواہ ثابت کرتا ہے، کہ میں تیرا بڑا خیر خواہ ہوں، جو کچھ کہہ رہا ہوں تیرے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں، تو بتا تو سہی، بھلا! اِس میں میرا کوئی فائدہ ہے؟...... اب اگر تم موت سے بچ جاؤ، ہمیشہ کے لئے تمہیں جنت نصیب ہوجائے، ہمیشہ کے لئے بادشاہت تمہیں مل جائے، اِس میں میرا کوئی فائدہ ہے؟ تو میں تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ اور وَقَاسَمَهُمَآ: ان کے سامنے قسمیں کھا گیا۔ اب بابا آدم علیہ السلام کو کیا پتہ تھا کہ شیطان کیا کیا کرتب کھیلتے ہیں، وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ اللہ کا نام لے کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، چاہے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگئے، جو کچھ بھی ہے، لیکن اللہ کا نام لے کر اور قسمیں کھا کر بھی کوئی شخص جھوٹ بول سکتا ہے؟۔ اور جو صوفی مزاج بندے ہوتے ہیں سب کا یہی حال ہوتا ہے، کہ جلدی سے دوسرے کا اعتبار کرلیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم خدا سے ڈرتے ہیں ہر کوئی خدا سے ڈرتا ہے، جیسے ہم کسی کو دھوکا نہیں دیتے شاید ہمیں بھی کوئی دھوکا نہیں دیتا۔

غیر محقق صوفی کی روایت کیوں معتبر نہیں؟

اسی لیے تو محدثین کہتے ہیں کہ صوفی کی روایت کا اعتبار کوئی نہیں، محدثین کہتے ہیں جس سند کے اندر کوئی غیر محقق صوفی آجائے اُس سند سے ہاتھ دھولو، وہ سند کسی کام کی نہیں، وجہ اُس کی یہی ہے کہ وہ خود نیک ہوتے ہیں، خود جھوٹ بولتے نہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ شاید دوسرا بھی جھوٹ نہیں بولتا، ہر ایرے غیرے پر اعتماد کرکے روایت لے لیتے ہیں، اور ان کو روایتیں سنانے والے

اکثر اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جس کی بناء پر غلط روایتیں صوفیہ کے ہاتھوں میں آجاتی ہیں، وہ آگے نقل کرتے رہتے ہیں، "اِذَا كَانَ فِي السَّنَدِ صُوْفِيٌّ فَاغْسِلْ عَنْهُ يَدَيْكَ"(۱) جس وقت سند کے اندر کوئی صوفی آجائے اپنا ہاتھ دھولو، وہ سند کسی کام کی نہیں۔ "رِوَايَةُ الصُّوْفِيِّ لَا تُعْتَبَرُ": صوفی کی روایت معتبر نہیں ہے محدثین کے نزدیک۔ اُس کی وجہ یہی ہے کہ یہ تحقیق نہیں کرتے، جو آکر کان میں پھونک مار دے اُسی کے پیچھے لگ جائیں گے۔ تو بھولا بھالا آدمی جو ہوتا ہے یہ اصل میں خوش اعتقادی ہے، وہ کہتے ہیں جیسے ہم اللہ سے ڈرتے ہیں، دوسرا بھی ڈرتا ہے، جیسے ہم حضور ﷺ کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولتے کوئی دوسرا بھی نہیں بولتا ہوگا، جیسے ہم کسی کو دھوکا نہیں دیتے کوئی دوسرا بھی نہیں دیتا ہوگا، اس لیے وہ اپنے جیسا سمجھ کر جلدی سے اعتماد کر لیتے ہیں۔ جیسے عام طور پر آپ کہا کرتے ہیں اَلْمَرْءُ يَقِيْسُ عَلٰى نَفْسِهٖ کہ نیک آدمی دوسرے کو نیک سمجھتا ہے، اور جو خود گڑبڑ ہوتا ہے وہ دوسرے کو گڑبڑ سمجھتا ہے۔ بہرحال نیک بندوں میں جو صوفی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان میں عموماً تحقیق کا جذبہ نہیں ہوتا۔

آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات کا اعتبار کیوں کر لیا؟

اور یہ تو واقعہ ہی پہلا تھا آدم کے سامنے۔ اب اللہ تعالیٰ کی محبت آدم علیہ السلام کے دل میں ہے، اللہ کی عظمت آدم کے دل میں ہے، اللہ کا خوف آدم کے دل میں ہے، وہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس لیے وہ اس گڑبڑ میں آگئے اور اُس کا اعتبار کر لیا، کہ ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو ہم اُس درخت کو کھا لیتے ہیں، اور کھانے کے بعد ہمیشگی کی زندگی حاصل ہو جائے گی۔

سوال:- جب دشمن تھا تو اس پر اعتبار کیوں کیا؟

جواب:- دشمن تو تھا، اور کہہ بھی دیا گیا تھا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (سورۂ اعراف: ۲۲) یہ تمہارا دشمن ہے، اس کی باتوں میں نہ آنا، یہ کہہ دیا گیا تھا، لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ قسمیں کھا کر پھر بہکا لیا، اور اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت کر دیا، کیونکہ آپ بھی کہا کرتے ہیں کہ اُنْظُرْ اِلٰى مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى مَنْ قَالَ کہ یہ دیکھو کہ وہ کہہ کیا رہا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، بسا اوقات آپ کا دشمن ہوتا ہے لیکن آپ کو فائدے کی بات کہہ دیتا ہے، اِنَّ الْكَذُوْبَ قَدْ يَصْدُقُ: جھوٹا بھی تو کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے، تو یہ فقرہ جو آپ کہا کرتے ہو کہ "یہ دیکھو کہ کہہ کیا رہا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے" ممکن ہے کہ آدم علیہ السلام کے دل میں بھی کوئی اسی قسم کی بات آئی ہو، کہ ٹھیک ہے یہ شیطان ہے، مردود ہے، سب کچھ ہے، لیکن بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے، کہ یہ کھانے کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے گی، اللہ کا قرب حاصل ہو جائے گا، اور یہ واقعی ہو سکتا ہے کہ ہم چونکہ ابتداء میں نئے نئے جنت کے اندر گئے تھے تو ان نعمتوں کی برداشت ہمارے اندر نہیں تھی، اس لیے اللہ نے روک دیا ہوگا۔ بہرحال نسیان کی نسبت اللہ نے آدم علیہ السلام کی طرف کی نَسِيَ (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۵) کہ ہم نے جو کہا تھا کہ اس کی باتوں میں نہ

(۱) العرف الشذی للکشمیری، باب ما جاء فی الاستنجاء بالحجرین میں ہے: اذا وقع فی الاسناد صوفی فاغسل یدیک منه. اسی طرح تذکرۃ الحفاظ (طبقہ ۱۳ کے آخر) میں محدث ابن مندۃ اصبہانی کا قول ہے: اذا وجدت فی اسناد زاهدًا فاغسل یدك من ذلك الحدیث.

آنا، یہ تمہارا دشمن ہے، اس قسم کی باتیں آدم علیہ السلام کے ذہن سے نکل گئیں، اُس نے اس طرح سے پریشر ڈالا۔

ارے بھائی! یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، بازار کے اندر بعض لوگ دائرہ لگا کر دوائیاں بیچ رہے ہوتے ہیں، بازار میں آپ نے نہ دیکھا ہو تو گاڑی کے اندر دیکھا ہوگا جو دوائیاں بیچتے ہیں، اتنی زبردست تسلسل کے ساتھ اور اتنے قوی دلائل کے ساتھ تقریر کرتے ہیں، کہ آپ کا علم یہ کہتا ہے کہ یہ سارے کا سارا فراڈ ہے، اگر یہ اتنے ہی کامل ہیں اور ان کی دوائی اتنی ہی کامیاب ہے تو گھر میں بیٹھ کر عزت کے ساتھ کما کر کیوں نہیں کھاتے؟ دردر کے دھکے کیوں کھاتے پھرتے ہیں؟ آپ کے دل میں یہ بات ہوتی ہے، لیکن اُن کے دلائل کا زور اور اُن کے بیان کی روانگی اور اُن کی خود اعتمادی آپ کو متاثر کردیتی ہے، آپ کہتے ہیں ہوسکتا ہے یہ سچا ہی ہو، سارے جھوٹے تو نہیں ہوتے، اور آپ بھی خرید کر لے آتے ہیں، جب گھر لاکر دیکھتے ہیں تو کچھ بھی نہیں نکلتا۔ بار بار دھوکا کھانے کے باوجود آپ باتوں میں آجاتے ہیں، کہ کیا ضروری ہے کہ ہر کوئی جھوٹ ہی بول رہا ہو، کسی کی بات سچی بھی تو ہوسکتی ہے۔ جب بھی آپ دیکھیں گے تو اس قسم کے لوگ دماغ پر یوں اثر ڈال لیتے ہیں، تو اُس نے بھی اسی طرح آدم علیہ السلام پر اثر ڈالا، اور آدم علیہ السلام اِس معاملے میں آگئے، اور انہوں نے وہ درخت کھالیا۔

آدم علیہ السلام اور اِبلیس کی غلطی میں فرق!

جب کھالیا، یعنی جو ممانعت تھی اُس کا ارتکاب ہوگیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُسی طرح سے ناراضگی کا اظہار ہوا جس طرح سے ابلیس نے غلطی کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو تیز لب ولہجے کے ساتھ کہا تھا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (سورۃ اعراف: ۱۲) جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا؟، یہ سوال تھا، جس کے آگے وہ اکڑ گیا۔ آدم علیہ السلام پر بھی اللہ نے اِسی طرح سے سوال کیا کہ میں نے تجھے کہا نہیں تھا؟ کہ اِس درخت کے قریب نہیں جانا اور اس ابلیس کی باتوں میں نہیں آنا، اب آدم علیہ السلام نے جو غلطی کی یہ آدم علیہ السلام کی کوتاہی تھی اپنی ایک قسم کی طبعی کمزوری کی بناء پر، یہ کوئی حسد یا تکبر یا کسی ایسی بات کی بناء پر نہیں تھی، جب ایک طبعی کمزوری کی بناء پر یہ پیش آئی تھی تو آدم علیہ السلام فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک گئے، کہنے لگے یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردے، اگر تو مجھے معاف نہیں کرے گا تو واقعی میں خسارے میں پڑجاؤں گا۔

زمین پر اُترنے کا حکم

اب آدم علیہ السلام نے اِس طرح سے آگے اللہ تعالیٰ کے سامنے رونا شروع کردیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُس وقت توبہ قبول نہیں کی، حکم دیا کہ چلو، نکلو یہاں سے، جاکے زمین میں دنگل مچاؤ، یہاں تمہاری لڑائی کا مقام نہیں ہے۔ اب ابلیس نے چوٹ کھائی ہوئی تھی آدم علیہ السلام سے، اور آدم علیہ السلام چوٹ کھاگئے ابلیس سے، اب اِن دونوں کو بھڑکا کر اِس دنیا میں اُتار کے اس دنیا کو میدانِ جنگ بنادیا۔ آدم داؤ کھیلتا ہے ابلیس کے خلاف، اور ابلیس داؤ کھیلتا ہے آدم کے خلاف، اب میدانِ جنگ جو ہے یہی آپ کی تکلیفی زندگی ہے، اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کر کے اس میدان میں اتار دی گئیں۔

اللہ کی طرف سے الفاظِ توبہ کا اِلقاء اور توبہ کی قبولیت

لیکن آدم علیہ السلام کو تو فکر اب یہی لگی ہوئی تھی کہ میرا آقا میرے پر ناراض ہو گیا، روتے رہے، روتے رہے، آخر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مہربانی ہوئی کہ اُن کو چند کلمات بطور توبہ کے سکھائے گئے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے اُوپر اتنا غم طاری ہوا اور اتنا صدمہ ہوا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا، کہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی بناء پر آدم علیہ السلام کو سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی کس طرح سے مانگوں۔ جیسے ایک بچہ ہے، غلطی کر لی، استاذ کے سامنے آ گیا، اب وہ چاہے ہاتھ باندھے کھڑا ہے، رو بھی رہا ہے، لیکن اُسے یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کیا لفظ بولوں، جب کافی دیر تک وہ اس طرح سے کھڑا رہتا ہے اور روتا ہے، پھر استاذ کہتا ہے اچھا کہہ! پھر ایسی غلطی نہیں کروں گا، کہہ! کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا، میں پکا عہد کرتا ہوں کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ استاذ کہلاتا جاتا ہے، طالب علم پیچھے پیچھے کہتا جاتا ہے، جب وہ اپنی زبان سے اداء کر لیتا ہے، تو استاذ کہتا ہے چل! معاف کیا۔ خود ہی الفاظ کہلوا لیے، اس کے بعد پھر کہہ دیا کہ چل تجھے معاف کیا۔ تو یہاں چونکہ آدم علیہ السلام نے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری ظاہر کی، اور غم اور صدمے کا اظہار کیا، پتہ نہیں کتنے برس روتے رہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چھا یوں کہہ کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا: یا اللہ! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (سورۂ اعراف: ۲۳) اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہمارے اوپر رحم نہیں کرے گا تو ہم بہت خسارہ پانے والے ہو جائیں گے، یہ ہیں وہ کلمات جو آدم نے اللہ سے لیے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ، یعنی یہ کلمات بھی اللہ نے سکھائے، اور اللہ سے سیکھ کر آدم علیہ السلام نے جس وقت یہ کلمات ادا کیے تو اللہ نے توبہ قبول کر لی۔

آدم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے زمین پر رہنے کے لئے ہدایات

توبہ قبول کرنے کے بعد اپنی رضا کا تو اظہار کر دیا لیکن ساتھ یہ کہہ دیا کہ رہنا اب دنیا میں ہی ہے، کہ تمہارا میدان اب زمین ہے آسمان نہیں، کیونکہ تمہیں پیدا ہی کیا گیا تھا زمین میں خلیفہ بنانے کے لئے، اب جاؤ، وہاں جا کر دیکھو تمہاری آپس میں کیا گزرتی ہے، میں تمہاری راہنمائی کے لئے کچھ باتیں اتارتا رہوں گا، جو اُن کو قبول کرے گا وہ دوبارہ وہی جنت والی زندگی حاصل کر لے گا، اور جو اُن کو نہیں مانے گا اور ان کا انکار کرے گا، تکذیب کرے گا، وہ آخرت میں عذاب کے اندر مبتلا ہو گا اور اِس جنت کی وارثت سے محروم ہو جائے گا۔ یہ ہدایات دے کر آدم کو، حواء کو، اور ابلیس کو، تینوں کو اس زمین کے اندر آزاد چھوڑ دیا گیا۔ ان آیات کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی ابتدائی تاریخ کو آپ کے سامنے واضح کیا ہے۔ ایک دفعہ ترجمہ دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ سارا مضمون ان آیات پر منطبق ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ [1]

---

(۱) عقیدہ عصمت انبیاء ؑ کی تفصیل اگلی آیات کے خلاصے کے بعد دیکھیں۔ ناقل۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ

اے اسرائیل کی اولاد! یاد کیجئے میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا، اور پورا کرو میرے عہد کو، میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو،

وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا

اور تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو ۝۴۰ اور ایمان لے آؤ تم اس چیز پر جو میں نے اتاری، اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے

لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ‌ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا وَاِيَّاىَ

اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، اور تم اولین کافر نہ بنو اس کتاب کے ساتھ، نہ لو میری آیات کے بدلے ثمن قلیل، اور مجھ ہی

فَاتَّقُوۡنِ ۝۴۱ وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۴۲ وَاَقِيۡمُوا

سے ڈرو ۝۴۱ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، اور حق کو چھپاؤ نہیں حالانکہ تم جانتے ہو ۝۴۲ قائم کرو

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ۝۴۳ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ

نماز کو، اور دیا کرو زکوٰۃ، اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر ۝۴۳ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور اپنے آپ کو

اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝۴۴ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ‌ؕ وَاِنَّهَا

بھولے بیٹھے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟ ۝۴۴ مدد حاصل کرو صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ، بیشک یہ نماز

لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَۙ ۝۴۵ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ۝۴۶

گراں ہے مگر ان لوگوں پر جو عاجزی کرنے والے ہیں ۝۴۵ جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بیشک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب کے ساتھ، اور وہ خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اسی کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں ۝۴۶

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰبَنِیۡٓ اِسۡرَآءِیۡلَ: اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے، اور اسرائیل سریانی لفظ ہے، سریانی زبان میں اس کا معنی ہے: عبداللہ، اللہ کا بندہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے حضرت اسحٰق، اور حضرت اسحٰق کے صاحبزادہ تھے حضرت یعقوب، علیہم السلام، اور اُن کے آگے بارہ بیٹے تھے، اس لیے بارہ خاندان آگے پھیلے، تو بنی اسرائیل کہہ کر انہی خاندانوں کو خطاب ہے۔ اے اسرائیل کی اولاد! اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ: یاد کیجئے میرے اُس احسان کو جو میں نے تم پر کیا۔ نعمت: احسان۔ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡٓ: اَوۡفُوۡا امر کا صیغہ ہے ایفاء سے، پورا کرو میرے عہد کو، عَھۡدِیۡ کے اندر اضافت مفعول کی طرف ہے، یعنی جو عہد تم نے مجھ سے کیا اُس کو پورا کرو۔ اُوۡفِ: میں پورا کروں گا، بِعَهۡدِكُمۡ: تمہارے عہد کو، یہاں بھی اُسی طرح سے اضافت مفعول

کی طرف ہے، یعنی اُس عہد کو جو میں نے تم سے کیا، تم پورا کرو میرے عہد کو یعنی جو تم نے مجھ سے عہد کیا ہے، اور میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو یعنی جو میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے، وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ: اِیَّایَ یہ مفعول مقدم کر دیا (اِرْهَبُوْا محذوف کا) حصر پیدا کرنے کے لئے، اور فَارْهَبُوْنِ کے آخر میں جو نون ہے اِس کا کسرہ بھی دال ہے یائے متکلم پر، اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِیْ، تو مفعول مقدم بھی ہے، اور بعد میں جو کسرہ ہے وہ بھی دال ہے یائے متکلم پر، جو مفعول کی جگہ ہے، تو اس میں تاکید در تاکید ہوگئی، ''تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو''، کسی اور شخص سے یا کسی اور چیز سے اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

رہب، خشیت اور تقویٰ میں فرق

رَہب ڈرنے کو کہتے ہیں، تین لفظ استعمال ہوتے ہیں، رَہب خشیت تقویٰ، اور ان کا مفہوم قریب قریب ہی ہے، کسی کی عظمت اور جلال کو یاد کرتے ہوئے جو انسان کے دل کے اُوپر ایک لرزہ اور کپکپی طاری ہوتی ہے یہ رَہبت ہے، اور اُس عظمت اور جلال کے تصور سے جو انسان پر اپنی پستی نمایاں ہوتی ہے، اپنا انکسار منکشف ہوتا ہے، آواز دب جاتی ہے، اور انسان خود اپنے آپ کو ایک عاجز سا محسوس کرتا ہے، یہ عجز اور انکسار کی کیفیت جو انسان کے اُوپر طاری ہوتی ہے یہ خشیت ہے، اور دل میں خوف پیدا ہوجانے کے بعد اور اپنا عجز اور بیچارگی نمایاں ہوجانے کے بعد ذوالجلال کی نافرمانی سے انسان میں بچنے کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے، کہ جب اپنے آپ کو وہ عاجز محسوس کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کے اُوپر منکشف ہوجاتی ہے، تو پھر اُس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ میں اپنے اس مالک ذوالجلال کی نافرمانی نہ کروں، نافرمانی کرنے سے وہ بچتا ہے، یہ کیفیت تقویٰ ہے۔ اس لیے یہ لفظ آپس میں تقریباً لازم ملزوم سے ہیں، کہ رَہبت دل میں پیدا ہوگی تو خشیت آجائے گی، اور خشیت آجائے گی تو تقوے کی کیفیت انسان میں پیدا ہوجائے گی۔ گناہوں سے نافرمانی سے بچنے کا پھر جذبہ جو پیدا ہوتا ہے وہ تقویٰ ہے۔ تو اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ: تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو۔

مُصَدِّقًا کے دو مفہوم

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ: اور ایمان لے آؤ تم اس چیز پر جو میں نے اتاری، مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے، لِمَا مَعَكُمْ: اُس کتاب کی جو تمہارے ساتھ ہے، یعنی جو کچھ میں نے اتارا یہ اتاری ہوئی چیز، تمہارے پاس جو کتاب ہے اُس کے ساتھ ٹکراتی نہیں، اُس کا یہ انکار نہیں کرتی، کہ تم یہ کہو کہ یہ ہماری کتاب کے مخالف ہے، بلکہ یہ میری اتاری ہوئی کتاب اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے تصدیق کرتی ہے، اُسے سچا بتلاتی ہے، تو اس سے معلوم ہوگیا کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جس طرح سے عادت ہے کہ کچھ کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت احکام میں تغیر کرتا ہے، اگر کہیں تبدیلی ہے تو ایسی ہے جیسے پہلے سے ہوتی آرہی ہے، ورنہ یہ اتاری ہوئی کتاب تمہارے پاس جو کتاب موجود ہے اس کے ساتھ کوئی ٹکراتی نہیں، اُس کے ساتھ اِس کا کوئی تضاد کا تعلق نہیں ہے بلکہ تصدیق کا تعلق ہے، مُصَدِّقًا کا معنی اگر کریں ''سچا قرار دینے والی، تصدیق کرنے والی'' تو پھر اس کا مفہوم یہ ہے۔ اور اس کے مفہوم کو ان لفظوں سے بھی واضح کر سکتے ہیں کہ مُصَدِّقًا: اس حال

میں کہ وہ مصداق بننے والی ہے اُس چیز کا جو تمہارے پاس ہے، یہ اُس کا مصداق ہے، مطلب پھر بھی وہی، کہ تمہارے پاس جو کتاب ہے اُس میں پیش گوئیاں موجود ہیں کہ ایک ایسا رسول آئے گا اور ایک ایسی کتاب اترے گی، اب اگر وہ رسول نہیں آتا اور وہ کتاب نہیں اترتی تو تمہاری کتاب کی پیش گوئیوں کا مصداق مہیا نہیں ہوگا، اور مصداق مہیا نہ ہونا یہ تمہاری کتاب کی تکذیب کا ذریعہ بن جائے گا، جب ایک کتاب کے اندر پیش گوئی کی گئی ہے، کہ اس کے بعد ایک اور عالی شان کتاب آنے والی ہے، ایک اور عالی شان رسول آنے والا ہے، اب اُس کتاب کا آجانا اور اُس رسول کا آنا یعنی اُس پیش گوئی کا مصداق مہیا ہوجانا تمہاری کتاب کی صداقت کی دلیل ہے، اگر تم آنے والے پیغمبر کو نہیں مانو گے اور اس پر اتاری گئی کتاب کو تسلیم نہیں کرو گے تو تمہاری کتاب کی پیش گوئیوں کا مصداق کہاں رہا؟، اور جب اُس پیش گوئی کا مصداق نہیں آئے گا تو اُس کے سچے ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ اِس لیے اِس رسول کو ماننا اصل میں اپنی کتاب کی تصدیق ہے، اور اِس رسول کو مان لینا اصل کے اعتبار سے تمہارے اپنے رسول کی تصدیق ہے، اور اگر نہیں مانو گے اور انکار کرو گے تو تمہاری اپنی کتاب کی تکذیب لازم آتی ہے، پھر اِس کا مفہوم یہ نکلے گا، ''یہ کتاب جو میں نے اتاری یہ مصداق بننے والی ہے اُس چیز کا جو تمہارے پاس ہے'' مفہوم ایک جیسا ہی ہے، صرف الفاظ بدل گئے، یوں کہہ دو ''تصدیق کرنے والی ہے، سچا قرار دینے والی ہے''، یا ''مصداق بننے والی ہے'' مطلب دونوں کا ایک طرح سے ہے، کیونکہ مصداق بننا بھی اُس کی تصدیق ہے، اور مصداق مہیا ہونا بھی اُس کتاب کی صداقت کی دلیل ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ: وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ فَرِيقٍ كَافِرٍ، کافر کا لفظ چونکہ مفرد آگیا، اس لیے اس کا موصوف فریق نکال لیجئے، یا، کافر معنیً جمع ہے، کوئی متعین کافر اس سے مراد نہیں ہے، تفسیروں میں دونوں توجیہیں کی گئی ہیں، ''نہ ہو اِس مَآ اَنْزَلْتُ کے ساتھ پہلے کفر کرنے والے''، پہلے کافر نہ بنو، اس میں اوّلیت اضافی ہے، یعنی تم کفر کرو گے تو تمہارے مریدین اور تمہارے معتقدین بھی تمہاری طرف دیکھ کے کفر کریں گے، تو اس بارے میں امامت کا درجہ تمہیں حاصل ہوجائے گا، اس لیے تم اولین کافر نہ بنو اس کتاب کے ساتھ۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اِشتراء: خریدنا، بیع وشراء کا لفظ آپ سنتے رہتے ہیں، اور خریدنا ایک حقیقتاً ہوتا ہے، جیسے ایک طرف سے مال دیا اور دوسری طرف سے مال لیا، جس طرح سے بیع وشراء آپ کیا کرتے ہیں، اور بدل کے طور پر کسی چیز کا لے لینا بھی اشتراء کہلاتا ہے، جیسے پیچھے آیا تھا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ، تو یہاں بھی اُسی طرح سے ہے، ''میری آیات کے بدلے ثمن قلیل نہ لو، نہ لو میری آیات کے بدلے ثمن قلیل''، قلیل ثمن: قلیل قیمت، یعنی میری آیات کو قلیل قیمت پر نہ بیچو، اور قلیل قیمت سے یہاں مراد ہے متاعِ دنیوی، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (سورۂ نساء: ۷۷) دنیا کا سامان جتنا بھی ہو وہ قلیل ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی سونے کا پہاڑ لے کر بھی اللہ کے کسی حکم میں تحریف کرتا ہے یا اُس کو چھپاتا ہے تو یہ بھی ثمنِ قلیل ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں اور آخرت کے مقابلے میں دنیا کثیر ہے ہی نہیں، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ: دنیا کا سارا سامان قلیل ہے، فانی ہے، ان چیزوں کو لے کر میری آیات کو نہ چھوڑو، وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ: اور مجھ ہی سے ڈرو، جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ میری ہی نافرمانی سے بچو، جیسے میں نے عرض کیا کہ رھبت تقویٰ اور خشیت یہ الفاظ قریب قریب ہیں، ایک سے دوسری کیفیت حاصل ہوتی ہے، ''مجھ ہی سے بچو'' یعنی میری نافرمانی سے بچو۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: لَبَسَ لَبْسًا:

خلط ملط کرنا، حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، یعنی کچھ حق اور کچھ باطل ملا لیا، ایسا نہ کیا کرو، ''نہ خلط کرو حق کو باطل کے ساتھ'' حق خالص کر کے ہی قبول کرو، خالص کر کے ہی حق کا اظہار کرو، اس میں باطل کی آمیزش نہ کرو، وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: اس کا عطف تَلْبِسُوا پر ہے اور یہ بھی لا کے نیچے داخل ہے، یعنی وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ: اور حق کو چھپاؤ نہیں، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم جانتے ہو، یہاں صرف اُن کو علم کے ساتھ موصوف کرنا مراد ہے، حالانکہ تم صاحب علم ہو، اور علم ایک نور ہے جس کے ساتھ حق اور باطل نمایاں ہوتا ہے، تو صاحب علم ہونے کی وجہ سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ تم حق کو پہچانو اور حق کا اظہار کرو، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم صاحب علم ہو، چونکہ یہاں مصدر کے ساتھ ہی فاعل کو موصوف کرنا مقصود ہے تو پھر اِس کا مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں، مختصر المعانی میں آپ یہ قاعدہ پڑھیں گے۔ اور اگر اس کا ترجمہ متعدی کے ساتھ ہی کرنا ہو تو مفعول نکالا جاسکتا ہے'' حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کا چھپانا بری بات ہے''، تو پھر اس جاننے کے باوجود تم کیوں حق چھپاتے ہو۔ حق کا سرے سے انکار کر دیا جائے یہ کتمانِ حق ہے، اور لبسِ حق بالباطل بھی حق کا کتمان ہے، یعنی چاہے کچھ تھوڑا بہت سچ بتا دیا، اور تھوڑی بہت اُس کے اندر ساتھ اپنی آمیزش کر دی، یہ بھی ایسے ہے جیسے حق کو چھپالیا، تو وہ بعض حکموں کا انکار ہی کر دیتے تھے کہ ہماری کتاب میں یہ بات ہے ہی نہیں، اور بعض کا اقرار کرتے تھے تو اپنی پخ ساتھ لگا دیتے، دونوں صورتیں اِس میں ممنوع ہیں۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: قائم کرو نماز کو۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: اور دیا کرو زکوۃ۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: رَكَعَ رُكُوْعًا: عاجزی کرنا، رکوع چونکہ نماز کا ایک رکن ہے تو ایک رکن بول کر کل صلوۃ مراد لے لی جاتی ہے، جیسے سجدے کا حکم ہو تو اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ تو وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ مل کر (روح المعانی) یا یہ ہے کہ رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر (عام تفاسیر) جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھو۔ کہتے ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ رکوع کا تذکرہ اس لیے کر دیا کہ نماز میں رکوع ہی ایک ایسا رکن ہے کہ جس میں لوگ عموماً غفلت برتتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں بھی صحیح رکوع ادا نہیں ہوتا، رکوع کے بعد قومہ صحیح ادا نہیں ہوتا، لوگ تعدیلِ ارکان میں زیادہ تر کوتاہی رکوع کے معاملے میں ہی کرتے ہیں، اسی طرح یہود کی نماز میں یا تو رکوع تھا ہی نہیں، تو وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام قبول کر کے اب امتِ محمدیہ کے ساتھ مل کر نماز پڑھو جن کی نماز میں رکوع ہے۔ (عام تفاسیر) یا ممکن ہے اُنہوں نے بھی اِسی طرح کوتاہی کر رکھی ہو، اصل کے اعتبار سے حکم ہو، لیکن جلد بازی میں جس طرح ہمارے ہاں لوگ صحیح رکوع ادا نہیں کرتے وہ بھی اسی طرح کوتاہی کرنے لگ گئے ہوں، تو نماز کو خصوصیت کے ساتھ لفظِ رکوع کے ساتھ ادا کرنے کی یہ ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ: بِر کا لفظ بار بار قرآنِ کریم میں آئے گا، اِس کا مفہوم ذکر کر دیا جاتا ہے نیکی، کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، بَرًّا بِوَالِدَتِيْ، بَرًّا بِوَالِدَيْهِ (سورۂ مریم: ۳۲، ۱۴)، احسان کرنا، اچھا سلوک کرنا، ایفائے عہد، یہ سب اِس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں، اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ: یہ ہمزہ انکار کے لئے ہے، اور انکار وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ پر ہے، حکم دیتے ہو تم لوگوں کو بھلائی کا اور بھولتے ہو تم اپنے نفسوں کو؟ دیکھو اب ولہجے سے اردو میں استفہام انکار والا پیدا ہو رہا ہے۔ لوگوں کو بھلائی سکھلاتے ہو، لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو، اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اردو زبان میں لب ولہجے کے ساتھ انکار جس وقت ہوگا تو آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس بات پر انکار کرنا مقصود نہیں ہے کہ تم نیکی سکھاتے ہو، ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ نیکی سکھانا تو ایک اچھا کام

ہے، اُس پر انکار کا کیا مطلب؟ انکار اس بات پر ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اپنے آپ کو بھلا دیا؟ اپنا آپ یاد نہیں ہے؟ انکار اِس جملے پر کرنا مقصود ہے، اب ترجمہ ہم یونہی کریں گے "کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو نیکی کا اور بھولے بیٹھے ہو اپنے آپ کو؟" اِس انداز کے ساتھ ادا کریں گے تو مفہوم خود واضح ہو جاتا ہے، انکار وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ پر کرنا مقصود ہے، کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو نیکی کا اور اپنے آپ کو بھول گئے؟ اپنے آپ کو بھلائے بیٹھے ہو؟ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ: حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، اور اُس کتاب میں عالم بےعمل کے لئے کتنی وعیدیں ہیں، تو جب لوگوں کو بھلائی سکھاؤ گے اور خود اپنے آپ کو بھول بیٹھو گے تو تم عالم بےعمل ہو گئے، اور تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کتاب کے اندر عالم بےعمل کے لئے وعیدیں موجود ہیں، تو کتاب بھی پڑھتے ہو اور پھر اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟ یہاں بھی وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی طرح مصدر کے ساتھ فاعل کو موصوف کر دیا۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم جانتے ہو تم صاحب علم ہو، سمجھدار ہو، پھر ایسا کرتے ہو؟ اور اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کا مفہوم ہوگا "کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟" تو یہاں مصدر کے ساتھ فاعل کو موصوف کرنا مقصود ہے، اِس لیے مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ تمہیں عقل نہیں ہے؟ یہاں بھی اُسی طرح سے استفہام انکاری ہے، یعنی تمہیں عقل تو ہے، تم اس سے کام کیوں نہیں لیتے؟ سمجھ دار ہونے کے باوجود ایسی باتیں کرتے ہو؟ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ: مدد حاصل کرو صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ، وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ: ھا ضمیر صلوٰۃ کی طرف راجع ہے، بیشک یہ نماز گراں ہے، دشوار ہے، بوجھل ہے، ثقیل ہے، اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ: مگر ان لوگوں پر جو خشوع اختیار کرنے والے ہیں، عاجزی کرنے والے ہیں، اُن پر ثقیل نہیں ہے، کبیر نہیں ہے۔ کبیرہ کا یہاں معنی ہے ثقیلہ، بوجھل، گراں، جس کی پابندی دشوار گزرتی ہے، "مگر خاشعین پر"، خاشعین وہ لوگ ہیں الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں، ظَنَّ: گمان کرنا، خیال رکھنا، اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: کہ بیشک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے ربّ کے ساتھ، مُلٰقُوْا اصل میں مُلٰقُوْنَ تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا، جو خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ ملنے والے ہیں اپنے ربّ کے ساتھ، وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: اور وہ خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اُسی کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

گزشتہ سے پیوستہ

عقیدۂ عصمتِ انبیاء علیہم السلام اور اس کی تفصیلی بحث

پچھلے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے گزرا ہے، اُس میں حضرت آدم علیہ السلام کو ایک درخت سے ممانعت کی گئی، اُس کا ذکر آیا، لیکن ممانعت کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام نے اُس کو کھا لیا، اور اُس کے کھا لینے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو تنبیہ ہوئی، اُس کے متعلق پچھلے بیان میں صرف ایک بات رہ گئی تھی اُس کو مکمل کرنا چاہتا ہوں، کہ آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں، عصمتِ انبیاء علیہم السلام متفق علیہ

عقیدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی گناہ نہیں کر سکتا، نبوت کے اظہار کے بعد صغیرہ اور کبیرہ دونوں سے محفوظ، دونوں سے بچا ہوا ہوتا ہے، دونوں کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اور نبوت کے اظہار سے قبل کبیرہ سے بالیقین محفوظ ہوتا ہے، اور صغیرہ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، لیکن راجح یہی ہے کہ صغیرہ سے بھی بچے ہوئے ہوتے ہیں۔

سوال:-نبوت سے قبل بھی معصوم ہوتے ہیں؟

جواب:-ہاں نبوت سے قبل، کیونکہ نبوت کے بعد تو ہیں ہی معصوم، قبل از نبوت بھی نبی کا دامن ہر قسم کے گناہ سے صاف ہوتا ہے، اور ایسا عقیدہ ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں، نہ اس میں شک کی گنجائش ہے۔

انبیاء علیہم السلام بندوں کے لئے ہدایت کا نمونہ ہوتے ہیں

عقل و نقل کے ساتھ یہ ثابت ہے، زیادہ تفصیل اس وقت کرنا مقصود نہیں ہے، صرف اتنا جان لیجئے کہ نبی کا منصب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ دوسرے بندوں کے لئے جن کا براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہدایت حاصل کرنے کا تعلق نہیں ہے اُن سب کے لئے وہ نمونہ ہوتا ہے۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ کو قرآنِ کریم میں اسوۂ حسنہ قرار دے کر اتباع کی طرف بلایا گیا، تو نبی دوسرے لوگوں کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو، یا اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے بننا چاہتے ہو، تو یہ نمونہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ اب اگر وہ نمونہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ترین نہ ہو تو پھر ہدایتِ خلق کے اندر خلل واقع ہوتا ہے، اگر نبی سے بھی گناہ صادر ہو جائے اور نبی کے عمل میں بھی اس قسم کی کوتاہی پائی جائے تو پھر وہ باقی مخلوق کے لئے نمونہ کس طرح بنے گا؟، اس لیے اُس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک قول کا اللہ تبارک و تعالیٰ ذمے دار ہوتا ہے، یہ ہے بنیادی عقیدہ، کہ اگر نبی بھی معصیت کار ہو جائے نعوذ باللہ، تو باقی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کس طرح دے گا؟ انسان کہے گا کہ جو اللہ تعالیٰ کے خاص اور مقبول بندے ہیں اور جن پر براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے جب یہ بھی شہوات کی اتباع کر لیتے ہیں اور یہ بھی گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں تو پھر ہماری کیا بات ہے؟، اِس طرح سے دعوت میں خلل آ جائے گا، اور انسان انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ہدایت نہیں حاصل کر سکے گا۔

انبیاء علیہم السلام کی طرف ذنب کی نسبت کی توجیہات

عقیدہ تو یہ ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنِ کریم میں ہی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی گناہ ہو جاتا ہے نعوذ باللہ، قرآنِ کریم میں ہی ایسے واقعات منسوب کیے گئے ہیں، اور پھر ذنب کی نسبت بھی ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا استغفار اور اپنے ذنب کا اقرار اور اعتراف اور پچھلے سے معافی مانگنا اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کا عہد خود قرآنِ کریم کی آیات میں موجود ہے۔ اسی سلسلے میں پہلی آیت جو آپ کے سامنے آئی وہ یہی حضرت آدم علیہ السلام کی اکلِ شجرہ کی ہے، کہ ممانعت کے باوجود درخت کھایا، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے قصور کا اعتراف کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (سورۂ طٰہٰ: ۱۲۱) آدم علیہ السلام نے اپنے رَبّ

کی نافرمانی کی اور وہ بھٹک گیا، تو عصیان کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف قرآنِ کریم کی آیات میں موجود ہے۔ تو پھر ان واقعات کی کیا توجیہ ہے؟۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا، کہ قبطی کو مار دیا، یہ بظاہر قتل کا گناہ ہے، پھر اللہ تعالیٰ سے قصور کا اعتراف کر کے معافی بھی مانگی، یونس علیہ السلام کے متعلق تذکرہ آئے گا، حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ذکر آئے گا، یہ واقعات قرآنِ کریم میں ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (سورۂ مؤمن:۵۵، سورۂ محمد:۱۹)، لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (سورۂ فتح:۲) یہ نسبتیں موجود ہیں۔

معصیت اور لغزش کی حقیقت، اور ان میں فرق

تو اس کے بارے میں یہ یاد رکھیے کہ حقیقتاً معصیت کیا چیز ہے؟ نافرمانی کسے کہتے ہیں؟ حقیقتاً معصیت اور نافرمانی وہ ہوتی ہے کہ انسان سوچتا سمجھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ کا حکم یہ ہے، اور یاد بھی ہے، سمجھتے ہوئے، سوچتے ہوئے، باہوش و حواس اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ اُس حکم کی مخالفت کرتا ہے، یہ ہے معصیت کی تعریف۔ اگر تاویل میں غلطی ہو جائے، یا سہو و نسیان طاری ہو جائے، یا اپنی طرف سے خیر کا قصد کیا تھا لیکن نتیجۃً کوئی ایسی بات ہوگئی جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت ہے، اس کو لغزش اور زَلت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ حقیقت کے اعتبار سے معصیت نہیں ہے۔ زَلّت کا معنی ہوتا ہے جیسے پاؤں پھسل گیا، ایک آدمی چھت پر چڑھ کر قصد کے ساتھ چھلانگ مارتا ہے اور نیچے گرتے ہوئے اُس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے تو ہر شخص اسے ملامت کرے گا کہ یہ تو نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تجھے نہیں کرنا چاہیے تھا، ہر کوئی کہے گا کہ اس میں قصور تیرا ہے، تو نے ایسا کیوں کیا؟، چھلانگ کیوں ماری؟، جان بوجھ کر، قصد کے ساتھ، جانتے ہوئے جب تو نے چھلانگ ماری ہے تو چوٹ تو لگنی تھی، لوگوں کے دلوں میں اُس پر شفقت اور رحمت کی بات نہیں ہوگی، بلکہ غصہ آئے گا اور سارے اس کو بے وقوف کہیں گے۔ اور ایک ہے کہ انسان اپنے طور پر قصد کر کے سیدھا چلا جا رہا ہے اور اتفاقاً پاؤں پھسل گیا، اور ٹانگ اُس کی بھی ٹوٹی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ کے قلوب میں بھی اور اُس شخص کے متعلقین کے قلوب میں بھی دونوں کے متعلق بڑا فرق ہے، کہ ایک جان کر چھلانگ لگاتا ہے اور ایک کا چلتے ہوئے پاؤں پھسل جاتا ہے، پاؤں پھسلنے والے کا اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہر کوئی کہتا ہے کہ بس اس بیچارے کا کیا قصور ہے، اللہ تعالیٰ کو منظور ہی ایسے تھا، یہ زَلّت ہے، پاؤں پھسل جانا، انبیاء علیہم السلام کے واقعات جتنے بھی ہیں وہ ہر ہر واقعہ آپ کے سامنے آئے گا اور اُس کی توجیہ آپ کے سامنے آتی چلی جائے گی، وہاں گناہ کرنے کا اور نافرمانی کا قصد نہیں ہے، بلکہ بلا قصد یا خیر کے جذبے کے تحت یا بھول چوک سے ایسا کام ہو گیا جس میں صورۃً اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہوگئی۔

انبیاء علیہم السلام پر ''معصیت'' کا لفظ حقیقتاً صادق نہیں آتا

جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کی تقریر کرتے ہوئے آپ کے سامنے میں نے کہا کہ شیطان نے آ کر مغالطہ دیا، دھوکا دیا، اور یہ کہا کہ یہ درخت ایسا ہے کہ اس کو کھا لو گے تو اللہ کے مقرب فرشتے بن جاؤ گے اور ہمیشہ کے لئے تمہیں جنت میں رہنا نصیب ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے قرب کی طمع دلائی، اور پھر قسمیں کھا کر اپنے خیر خواہ ہونے کی اطلاع دی، اور اُدھر جہاں تک

درخت کو کھانے کی ممانعت کا تعلق تھا اُس میں تاویل کی گنجائش نکالی، کہ یہ ابتداء ابتداء کی بات ہے، جب تم جنت کی نعمتیں برداشت نہیں کر سکتے تھے، اُس وقت تمہارے معدے میں قوت نہیں تھی، اب قوت آ گئی، یا آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ متعین درخت جدھر اشارہ کیا گیا تھا وہی مراد ہے، اِس کی نوع مراد نہیں ہے، اور آدم علیہ السلام نے اُس مشار الیہ درخت سے نہ کھایا ہو بلکہ اُس کی نوع کھالی ہو، اور اللہ تعالیٰ کا مقصود اُس نوع کی ممانعت ہو۔ جیسے یہاں دو روٹیاں پڑی ہوئی ہیں، میں کہوں دیکھو بھئی! یہ روٹی نہیں کھانی، یہ تمہیں نقصان دے گی، اور تم یہ نہ کھاؤ اور وہاں تندور سے لے کر کھالو، یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید خصوصیت کے ساتھ صرف اِنہی کی ممانعت مقصود ہے، تو یہ مغالطہ آ سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اُس کے دشمن ہونے کی نشاندہی کی گئی تھی، یا اِس درخت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو ممانعت کی تھی، تو خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہے نَسِیَ: آدم بھول گیا، وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۵) آدم کو ہم نے ایک حکم دیا تھا لیکن آدم نے یاد ہی نہیں رکھا، بھول گیا، اور ہم نے اُس کے لئے کوئی پختگی نہیں پائی۔ تو نسیان کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے، اور حضرت آدم علیہ السلام نے یہ اقدام قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے، ہمیشہ جنت میں رہنے کے لئے، اور نہ فنا ہونے والے ملک کو حاصل کرنے کے لئے، اِس قسم کے جذبات کے تحت یہ اِقدام کیا تھا، اِس لیے یہ حقیقتاً معصیت کی تعریف میں نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آئے گا، وہ اِس سے بھی زیادہ واضح ہے، کہ ایک ظالم ایک مظلوم کو پکڑے ہوئے ہے، مظلوم فریاد رسی کرتا ہے، ظالم کو پہلے آپ نے زبانی سمجھایا، وہ نہیں باز آیا تو آخر ایک مظلوم کی حمایت میں ایک ہی تو مکا مارا تھا فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى (سورۂ قصص: ۱۵) موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مکا مارا۔ اب ایک مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنا نیکی کا جذبہ ہے، اور جب کوئی نرمی کے ساتھ باز نہ آئے تو تنبیہ آخر ہاتھ کے ساتھ بھی ہوتی ہے، مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ۔[1] اب یہ اتفاقی بات ہے کہ مکا لگا اور وہ مر گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کرنے کے جذبے سے اُس کو مکا نہیں مارا، اسی لیے تو فوراً گھبرا گئے اور یہ کہا کہ یہ تو ایک شیطانی حرکت ہو گئی۔ تو جذبات اچھے ہوتے ہیں، اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہو، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے، لیکن کوئی اجتہادی لغزش یا انسان ہونے کی وجہ سے نسیان، ذہول، خطا، چوک جانا، اِس طرح سے یہ جو کام ہو جایا کرتے ہیں اچھے جذبے کے تحت، یہ حقیقتاً معصیت نہیں ہیں۔

انبیاء علیہم السلام پر گرفت کا سبب ان کا مقربِ اِلٰہی ہونا ہے

البتہ چونکہ صورۃً معصیت ہو گئی......اب خیال فرمایئے!......اور یہ طبقہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی مقرب ہے، اور جتنا انسان مقرب ہوا کرتا ہے اُتنی ہی اس کے اُوپر گرفت زیادہ ہوتی ہے، جتنا کوئی دور ہے اور اُس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ہم بھی اُس کی بیسیوں غلطیوں سے درگزر کر جاتے ہیں، ماں باپ کو جو اپنی اولاد کی غلطی پر غصہ آیا کرتا ہے وہ محبت کی بناء پر ہوتا ہے، کہ وہ اولاد میں غلطی نہیں دیکھنا چاہتے، وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ زیادہ سے زیادہ سدھرا ہوا ہو، اور اُسی قسم کی غلطیاں محلے کے اندر

---

(۱) مسلم ۵۰/۱ باب بیان کون النہی الخ / مشکوۃ ۴۳۶/۲ باب الامر بالمعروف فصل اول.

دوسرے بچے کرتے پھرتے ہیں اور انسان اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لیکن اپنا بچہ غلطی کرتا ہے تو انسان اُس کو تنبیہ بھی کرتا ہے، اُس کی حالت پر پریشان بھی ہوتا ہے، یہ محبت کی بناء پر ہے۔ تو انبیاء چونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت مقرب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اِن کو لوگوں کے سامنے بطور نمونے کے پیش کرنا ہوتا ہے اس لیے جب ان سے کسی قسم کی کوئی لغزش ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ان کے اوپر ایسی ہوتی ہے جیسے کسی گنہگار کے اُوپر کی جائے، اس سے اُن کا مقام اور اونچا ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ ولجاجت کرتے ہیں، جس سے اُن کا قرب اور بڑھتا ہے۔ اور یہ بات بھی بندوں کے لئے نمونہ بنتی ہے کہ اگر کہیں بغیر قصد کے بھی انسان سے نافرمانی ہوجائے تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ اپناؤ، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر، توبہ کرکے، استغفار کرکے اپنا دامن صاف کرلو۔ بہرحال یہ حقیقتاً معصیت نہیں ہوتی۔ تو جتنے انبیاء علیہم السلام کے واقعات آتے ہیں اُن سب میں توجیہ یہی ہے کہ وہاں معصیت کی حقیقی تعریف نہیں، البتہ صورۃً معصیت ہے، اور اُن کے مقرب ہونے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک ان کے اُوپر گرفت زیادہ ہوتی ہے۔ حقیقتاً معصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اللہ کا حکم یاد ہو، اور اُس کا مطلب صحیح سمجھ رہا ہو، اور باہوش وحواس قصد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے، حقیقتاً معصیت یہ ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کا دامن اِس سے پاک ہے، اُن کا معاملہ ایسے ہے جیسے بارش میں آپ چل رہے ہیں اور آپ کا قصد ہے کہ ہم سیدھے چلیں، لیکن کسی جگہ پاؤں پھسل جاتا ہے اور آپ گرجاتے ہیں اور آپ کا دامن آلودہ ہوجاتا ہے، لیکن یہ دامن کی آلودگی کسی کے نزدیک باعثِ ملامت نہیں، کیونکہ آپ قصد سے نہیں گرے۔ اور اگر آپ کیچڑ کے اندر یا کسی گندے نالے کے اندر خود چھلانگ لگائیں گے تو ہر کوئی شخص آپ کو ملامت کرے گا۔ تو انبیاء علیہم السلام کے واقعات جتنے بھی ہیں اُن سب میں توجیہ اسی طرح ہوگی۔

انبیاء علیہم السلام اپنی فطری پاکیزگی کی بناء پر گناہ کا تصور ہی نہیں کرسکتے

تو حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا، اُس کی میں نے توجیہ کردی، اور ایک کلی اصول آپ کی خدمت میں عرض کردیا، کہ عصمتِ انبیاء متفق علیہ مسئلہ ہے، انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، یعنی وہ گناہ کرنہیں سکتے، باوجود اِس بات کے کہ اُن میں صلاحیتیں سب تام ہوتی ہیں، یہ نہیں کہ اُن سے گناہ کی طاقت سلب کرلی جاتی ہے، طاقت سلب نہیں کی جاتی، اُن کی قوتیں طاقتیں سب بحال ہوتی ہیں، لیکن طاقت اور قوت ہونے کے باوجود اُن کی فطرت اتنی صاف ہوتی ہے کہ وہ گناہ کا تصور ہی نہیں کرسکتے اور گناہ اُن کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا، جس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ (سورۂ یوسف: ۲۴) تاکہ ہم اُس سے سوء کو دور ہٹادیں، تو اللہ تعالیٰ اُن سے سوء کو دور رکھتا ہے، اور فطرت کی پاکیزگی کی بناء پر وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کا قصد بھی نہیں کرسکتے۔ سمجھانے کے لئے ایک مثال عرض کروں (یہ مضمون سمجھانے کے لئے عرض کرتا ہوں، اِس کا ماقبل کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے، ذرا خیال فرمانا، یعنی یہ نہ ہو جس طرح سے بریلوی لوگ جلدی سے کہہ دیتے ہیں دیکھو جی! اللہ تعالیٰ کی مثال اِس چیز کے ساتھ دے دی، اللہ کے رسول کی مثال اِس چیز کے ساتھ دے دی، یہ اُن کی

مثال دینی مقصود نہیں ہے، اُس سے ذرا اپنے ذہن کو تھوڑا سا کاٹ لیجئے) میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فی حد ذاتہ طاقت ہونے کے باوجود کسی کام کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اِس کو نہیں کر سکتا، یہ کہنا ٹھیک ہے باوجود اِس بات کے کہ آپ میں قوت اور طاقت موجود ہے، ماقبل سے اِس مضمون کو کاٹ کے اور علیحدہ کر کے بیان کر رہا ہوں صرف اس مسئلے کو سمجھانے کے لئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں کہ دیکھو! فلاں چیز کی مثال فلاں چیز سے ہوگئی، فلاں چیز سے ہوگئی، ایسی بات نہیں ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ میں طاقت ہے کہ آپ ایک چیز کھا سکتے ہیں، اللہ نے دانت دیے ہیں، چبا سکتے ہیں، حلق سے نگل سکتے ہیں، لیکن اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ گوبر کھالیں گے؟ (نہیں) نہیں کھائیں گے یا نہیں کھا سکتے؟، آپ کہیں گے کہ کسی انسان کے ہوش وحواس قائم ہوں تو وہ جان بوجھ کر پاخانہ کھا نہیں سکتا۔ باہوش وحواس انسان پاخانہ کھا سکتا ہے؟ نہیں کھا سکتا۔ کیا بات ہے؟ اُس میں طاقت نہیں؟ کہ ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں ڈال نہیں سکتا، یا دانتوں سے چبا نہیں سکتا، یا نگل نہیں سکتا، کیا بات ہے؟، لیکن اِس کے باوجود انسان یہی کہے گا کہ کوئی انسان گند نہیں کھا سکتا، گوبر نہیں کھا سکتا، پاخانہ نہیں کھا سکتا۔ اُس کی وجہ کیا ہے؟ کہ طبیعت کی لطافت اس بات سے اِباء (انکار) کرتی ہے۔ جس وقت بھی آپ بات کریں گے تو یہی کریں گے کہ گوبر کھانا کسی انسان کا کام نہیں ہے، انسان کھا ہی نہیں سکتا، یعنی اُس کو پتہ ہو کہ یہ پاخانہ ہے، اور باہوش وحواس ہو، اُسے کہا جائے تو وہ ایسے محسوس کرے گا جیسے مجھے تکلیف مالایطاق دی جارہی ہے، وہ کہے گا میری قوت اور طاقت میں نہیں ہے کہ میں یہ کام کروں، انسان جان تو دے دے گا، اُسے کہو کہ پاخانہ کھا، وہ نہیں کھائے گا، وہ کھا ہی نہیں سکتا۔ اب نہ کھا سکنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں طاقت نہیں، آنکھیں بند کرے، اور یوں کر کے ہاتھ مارے اور اٹھا کے منہ میں ڈال لے اور نگل جائے، آپ کہیں گے قوت تو ہے، لیکن کوئی کر نہیں سکتا، اپنے آپ کو انسان عاجز محسوس کرتا ہے، بے بسی محسوس کرتا ہے، لہٰذا اُس کے سر پہ ڈنڈا بھی لے کر کھڑے ہو جاؤ اور اسے کہو کہ یہ کھا، تو بھی انسان نہیں کھائے گا، بسا اوقات جان دے دے گا لیکن یہ ہمت نہیں ہوگی کہ اٹھا کر اُس کو منہ میں ڈال لے۔ یہاں کیا چیز ہے؟ قوتیں طاقتیں بحال ہونے کے باوجود طبیعت کی لطافت اِس نجاست حسی سے آپ کو عاجز کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے انبیاء ﷩ میں قوتیں پوری ہوتی ہیں لیکن جب اُن کو پتہ ہو کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے، یاد ہو کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے، تو اُن کی فطرت لطیفہ اِس بات سے انکار کرتی ہے کہ اس کے قریب جائیں یا اس کو برداشت کریں، قوتیں ہونے کے باوجود......! یہ نہیں کہ قوتیں ہی سلب ہوگئیں، قوتیں سلب نہیں ہوتیں، لیکن اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا اتنا انکشاف ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے پاخانے کی پلیدی اور نجاست کا اتنا انکشاف نہیں ہے۔ تو جس طرح سے تم قوتیں اور طاقتیں رکھنے کے باوجود آپ حسی نجاست کے قریب نہیں جا سکتے، اسی طرح سے انبیاء ﷩ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے قریب نہیں جا سکتے۔ باقی! خطاء، نسیان، اجتہاد، ذہول، تاویل میں غلطی ہوگئی، یا قصد تو ہے اللہ کا قرب حاصل کرنے کا اور نیکی کرنے کا، لیکن آخر انسان ہے، کبھی نسیان طاری ہو گیا، کبھی کوئی اس قسم کی بات ہوگئی، تو اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ایک صورت بن جاتی ہے تو اُس میں حقیقت نہیں ہوتی، اور یہ چیز عصمت کے منافی نہیں، انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے بنایا ہے، اس میں نسیان بھی آجاتا ہے، ذہول بھی آجاتا ہے، انسان اجتہاد کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود

صواب کو نہیں پہنچ سکتا، تو اِس میں انسان بے قصور ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے اِس مسئلے کی جس کو عصمت انبیاء علیہم السلام کہتے ہیں۔ تو آدم علیہ السلام کا واقعہ چونکہ آیا تھا اُس کے متعلق میں نے وضاحت کر دی، اور آگے جس جس نبی کا واقعہ جس جس انداز میں آئے گا اُس کی توجیہ وہاں کرتا چلا جاؤں گا۔ باقی! زیرِ درس رکوع کے متعلق ان شاء اللہ! کل عرض کریں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

زیرِ درس آیات کی تفسیر

گزشتہ رُکوع سے ربط اور یہود کا تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ ترجمہ تو اِس رُکوع کا عرض کر دیا گیا تھا، مضامین پر نظر ڈال لیجئے۔ پچھلے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا تھا جس میں تمام بنی آدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا روحانی انعام مذکور تھا، کہ اس نے آدم کو پیدا کیا، اور اُس کو علم عطا فرما کر فرشتوں اور دیگر مخلوق کے مقابلے میں شرافت بخشی، اور جنت کو اُن کا ٹھکانہ بنایا، پھر اُن کے ساتھ حسد کی بناء پر ابلیس مردود ہوا، اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اس کے دل میں بغض بڑھ گیا، آخر کار وہ حضرت آدم علیہ السلام کو لغزش دینے میں کامیاب ہو گیا، اور اُس لغزش کے نتیجے میں حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے خروج ہوا، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سامنے آئی، آدم علیہ السلام نے توبہ واستغفار کی، اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، اِس واقعہ کے ضمن میں ابلیس اور آدم کی عداوت کو نمایاں کر دیا گیا، اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ابلیس جو پھسلا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کرنے کی بناء پر پھسلا ہے، تکبر میں آ گیا، اس نے آدم علیہ السلام کی تحقیر کی، اپنے آپ کو سمجھتا تھا کہ میں بہتر ہوں اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورۂ اعراف: ۱۲، وغیرہ)۔ اِس قسم کے حالات پچھلے رکوع میں ذکر کیے گئے، اب آگے کلام اہلِ کتاب کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو آپ کا واسطہ یہود کے ساتھ پڑا، جو اسرائیلی ہیں، یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اُس وقت علمی ریاست اِنہی کے پاس تھی، مشرکینِ عرب اُمّی کہلاتے تھے یعنی اَن پڑھ، اُن کے اندر علم کا چرچا نہیں تھا، اور یہ اہلِ کتاب تھے، اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر کی تعلیمات اِن کے پاس تھیں، اور اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی طرف منسوب تھے، تو علمی ریاست اور علمی سرداری اِنہی کو حاصل تھی، یہ اُس وقت کے علماء تھے، اُس وقت کے درویش تھے، آج کل کی اصطلاح میں اُس وقت کے گدی نشین پیر تھے، مشائخ تھے، تو علم کے وجہ سے بھی مرجع یہی تھے اور بزرگی کے لحاظ سے بھی لوگ اِنہی کی طرف ہی رجوع کرتے تھے اور ان کی سرداری مانتے تھے۔

یہود نے اِبلیس کی طرح حسد کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اِنکار کیا

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسد لاحق ہو گیا، اس وجہ سے کہ اگر ہم اِن کو پیغمبر تسلیم کر لیں تو علمی ریاست بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہو جائے گی، جو لوگ ہمارے آستانوں پر

آیا کرتے تھے وہ ہمارے آستانوں پر نہیں آئیں گے، اُن کا رجوع اِن کی طرف ہو جائے گا، ہماری مشیخت زائل ہو جائے گی، لوگ ہمیں پیر نہیں سمجھیں گے، لوگ ہمیں عالم نہیں سمجھیں گے، تو جس قسم کے نذرانے چڑھاوے لوگ دیا کرتے تھے، اور اُن کو حرام خوری کی عادت پڑی ہوئی تھی، لوگوں کو غلط مسئلے بتلا کر اور اِسی طرح سے مختلف قسم کے مغالطے دے کر آمدنی حاصل کرنے کی، وہ آمدنی زائل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ حرام خور کا لفظ جو میں نے استعمال کیا، قرآنِ کریم نے یہی لفظ استعمال کیا ہے اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (سورۂ مائدہ: ۴۲) یہ لوگ بہت حرام خور ہیں، سُحت حرام کو کہتے ہیں، اَكّٰلُوْنَ مبالغے کا صیغہ ہے، یہ بہت حرام خور لوگ ہیں، لوگوں کو دھوکے دے دے کر رشوتیں کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام غلط بتلاتے ہیں، اور مختلف حیلوں کے ساتھ یہ لوگوں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴) احبار: علماء، اور رھبان: درویش، بہت سارے علماء اور درویش لوگوں کے مال بہت غلط طریقے سے کھا رہے ہیں، قرآنِ کریم نے اُس وقت کے لوگوں کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا ہے۔ تو حضور ﷺ پر ایمان لانے کی صورت میں اُن کے خیال کے مطابق ہر چیز کو نقصان پہنچتا تھا، کہ ہماری عزت بھی نہیں رہے گی، یہ حُبِّ جاہ ہے، اور ہمارے پاس مالی آمدنی بھی نہیں رہے گی، یہ حُبِّ مال ہے۔ تو اِسی جاہ اور مال کی محبت کی وجہ سے وہ حضور ﷺ کے ساتھ عداوت پر اتر آئے، باوجود اِس بات کے کہ اُن کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو علامات اور جو نشانیاں ذکر کی گئی تھیں وہ ساری کی ساری سمجھتے تھے، اور حضور ﷺ کے اُوپر اُن کا انطباق اُن کے سامنے کوئی مخفی حقیقت نہیں تھا، سب کچھ جاننے کے باوجود منکر ہو گئے، قرآنِ کریم کہتا ہے اور بانگ دُہل کہتا ہے جس کے انکار کی یا تردید کی ان لوگوں نے جراٴت نہیں کی، کہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۴۶) یہ اِس پیغمبر کو علامات کے ساتھ اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹے کو پہچانتے ہیں، کہ مجمع عام میں اُن کا بیٹا پھر رہا ہو تو اِن کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں پیش آتی، بیٹے کی شکل اتنی ذہن میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ استدلال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، کہ ہم کہیں کہ دیکھو! اس کا ناک ایسا ہے، معلوم ہوتا ہے ہمارا لڑکا ہے، اس کی شکل ایسی ہے، معلوم ہوتا ہے ہمارا لڑکا ہے، اُس کی علامات اتنی ذہن میں بیٹھی ہوتی ہیں کہ انسان نظر ڈالتے ہی دفعۃً پہچان لیتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اسی طرح وہ علامات کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ کا رسول اور قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب پہچانتے تھے اور اچھی طرح سے پہچانتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے انکار کیا، یہ انکار حسد کی بناء پر تھا۔ تو پہلے ابلیس کا قصہ سنا کر اُن کے ذہن پر یہ اثر ڈالا گیا کہ پچھلی تاریخ کو دیکھو، کسی کے کمالات کا اعتراف نہ کرنا اور حسد کے اندر مبتلا ہو جانا انسان کو اللہ کا مبغوض بنا دیتا ہے، ملعون بنا دیتا ہے، قبولیت کے درجے سے گر کر انسان مردود ہو جاتا ہے، دائمی جہنمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے تم حسد کی بیماری کو چھوڑ دو، تمہارے لیے یہ حسد اچھا نہیں ہے۔

دوسروں کو نصیحت، خود میاں فضیحت

پھر اللہ تعالیٰ کے تمہارے اُوپر کتنے احسانات ہیں، بنی آدم ہونے کے لحاظ سے احسانات تو سب پر ہیں، خصوصی خصوصی

احسانات تم پر کتنے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتاب دی، تمہارے اندر پیغمبر بھیجے، اور اُن کے ذریعے سے تم سے عہد معاہدے کیے، تمہیں چاہیے کہ اُن عہد معاہدوں کا پاس رکھو۔ اور لوگوں کے سامنے وعظ ونصیحت کرتے ہوئے جو تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ جیسے ہم لوگ جب منبر پر بیٹھتے ہیں، اسٹیج پر وعظ کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، تو لوگوں کو کیا کہا کرتے ہیں؟ کہ آخرت کا خیال کرو، آخرت کے مفاد کے مقابلے میں دنیوی مفاد کوئی چیز نہیں ہے، اگر دنیا کی لذات کے پیچھے پڑ کر تم آخرت کو نقصان پہنچاؤ تو یہ گھاٹے کا سودا ہے، انسان کو اللہ کی عبادت اور اطاعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ رہے۔ ہم وعظ کرتے ہوئے کہیں گے کہ دیکھو! حسد بہت بڑی بیماری ہے، حسد اختیار نہیں کرنا چاہیے، اور مالی طمع کے اندر آ کر یا جاہ کے پیچھے لگ کر انسان حق سے کبھی روگردانی نہ کرے، اور اگر کبھی غلطی ہو ہی جائے تو فوراً اپنے قصور کا اعتراف کرے اور توبہ واستغفار کرے۔ ہمارے وعظ کا خلاصہ یہی ہوتا ہے نا؟ آخرت سے ڈرانا، اللہ سے ڈرانا، عبادت اور اطاعت کے اُوپر برانگیختہ کرنا، روحانی بیماریوں کے ازالے کی تدبیریں بتانا، ہمارا وعظ یہی ہوتی ہے۔ لیکن جس وقت اپنا شخصی معاملہ آجائے گا اُس وقت اپنے شخصی معاملے میں آ کر ہم اِنہی نصیحتوں کو بھول جاتے ہیں، لوگوں کو ہم کہتے ہیں کہ تم خدا سے ڈرو لیکن خود ہم خدا سے نہیں ڈرتے، لوگوں کو ہم کہتے ہیں کہ جہاں ہدایت اور اپنی خواہشات کا مقابلہ آجائے تو ہدایت کو اختیار کرو اور خواہشات کے پیچھے نہ چلو، حبِ مال خطرناک چیز ہے، حبِ جاہ خطرناک چیز ہے، آخرت کے معاملے میں انسان اِن جذبات سے متاثر ہو کر اپنی آخرت کو نقصان نہ پہنچائے، لیکن جس وقت ہم اپنے شخصی معاملات میں آتے ہیں تو ہم مالی محبت کے اندر مبتلا ہو کر حق کو چھوڑتے ہیں، اپنی عزت کے احساس کے طور پر حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں، ایک دوسرے سے بغض رکھتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں وہ جوش وخروش نہیں دکھاتے جس جوش وخروش کے ساتھ ہم منبر پر کھڑے ہو کر قوم کو تلقین کرتے ہیں۔ تو جب کوئی اِس قسم کا معاملہ آئے گا تو پھر ہمیں یاددہانی یہی کرائی جائے گی، کہ بھئی! لوگوں کو نصیحت کرتے ہو، اپنے آپ کو کیوں بھولے بیٹھے ہو؟ لوگوں کو ترغیب دیتے ہو کہ آخرت کا خیال کرو اور دنیا کے پیچھے نہ لگو، تو خود تم یہ اصول کیوں چھوڑے بیٹھے ہو؟ ہمیں بھی آج اسی طرح سے کہا جائے گا۔ جس طرح سے حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ واعظوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ در محراب ومنبر مے کنند　　چوں بخلوت میروند، کارِ دیگر مے کنند

کہ یہ واعظ لوگ جو محراب اور منبر کے اُوپر کھڑے ہو کر جوش وخروش دکھاتے ہیں، جب خلوت میں چلے جاتے ہیں تو کارِ دیگر مے کنند، اب کارے دیگر کا مصداق پتہ نہیں کیا ہے؟ آپ کہیں گے کہ ہم فلاں کام نہیں کرتے، تو اُس نے کوئی نام تو نہیں لیا کہ آپ فلاں کام کرتے ہیں، وہ کہتا ہے کارِ دیگر، کارِ دیگر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو تلقین کرتے ہیں اور جس قسم کا معیارِ زندگی لوگوں کے سامنے اپنی زبان کے ساتھ پیش کرتے ہیں، خلوت میں جا کر وہ معیارِ زندگی نہیں رہتا۔ آگے فرماتے ہیں:

مشکلے دارم زِ دانش مند مجلس باز پرس　　کہ توبہ فرمایند چرا خود توبہ کم تر مے کنند

کہ لوگوں کو تو بڑی توبہ کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ خود توبہ کیوں نہیں کرتے۔

یہود دوسرے کو نصیحتیں کرتے تھے اور خود عمل سے عاری تھے

توجس طرح سے ہمارا طرزِ گفتگو ہے کہ بھائی! جس طرح سے زبان سے کہتے ہو اُس طرح سے کرو بھی، جیسے لوگوں کے اندر نیکی کے جذبات اُبھارتے ہو، تمہارے اندر بھی نیکی کے جذبات ابھرنے چاہئیں، اِسی انداز کی گفتگو ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے کی، کیونکہ یہ اُس وقت کے اہل علم تھے، اور اہل علم کا کام ہوتا ہے لوگوں کو نصیحت کرنا اور لوگوں کو نیکی کی ترغیب دینا اور یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو، تو قرآن کہتا ہے کہ کم از کم تم بھی تو اِن چیزوں کا خیال کرو، اگر تم مال کے پیچھے لگ کر اپنے مالی مفاد سے ڈرو گے تو تم خدا سے نہ ڈرے بلکہ اہمیت مال کو دے دی، اگر تم اپنی آخرت کا خیال نہیں کرتے اور اِس فانی دنیا کو آباد کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہو تو تم دنیا پرست ہو گئے، دین پرست کہاں ہوئے؟ ۔ تو بے عمل علماء کے متعلق جو وعیدیں کتاب میں پڑھتے ہو وہ کتاب تمہارے سامنے ہے، وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ، لیکن اِس کے باوجود تم خود نصیحتوں کو بھولے بیٹھے ہو؟ اِس رکوع میں تو اُصولی طور پر گفتگو ہے، اگلے رکوع سے جزئیات کا تذکرہ شروع ہو جائے گا، کہ تم نے یہ کیا، یہ کیا، اور ہم نے تمہارے ساتھ یہ کیا، یہ کیا۔ یہ سارے کا سارا قصہ آگے تفصیلاً شروع ہو جائے گا۔

نماز کی پابندی کب آسان ہوگی؟

آگے نماز اور صبر کی تلقین کی، کہ صبر کرو، مشکلات برداشت کرنے کی عادت ڈالو، مالی مفاد کو نقصان پہنچنے سے تم جو سمجھتے ہو کہ ہماری لذت پرستی کو نقصان پہنچے گا تو صبر کی عادت کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرو، اگر طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آ رہی ہے تو برداشت کرو۔ نماز کی پابندی کرو تاکہ تمہارے تکبر اور حبِ جاہ کا علاج ہو، تواضع اور انکسار سیکھو۔ اور اگر نماز کی پابندی تمہیں گراں گزرے تو یہ خیال رکھو کہ تم نے ایک دفعہ اللہ کے سامنے جانا ہے، اور اُس کے سامنے جا کر حساب و کتاب پیش کرنا ہے، یہ مراقبہ کرو......! اِس کو آپ صوفیوں والا مراقبہ کہہ لیں، کہ اپنے ذہن میں یہ بات بٹھاؤ کہ تم اپنے رب سے ملنے والے ہو، اُسی کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہے، جا کر حساب و کتاب دینا ہے۔ جس وقت اس خیال کو اپنے ذہن میں بٹھاؤ گے تو پھر نماز کی پابندی بھی تمہارے لیے آسان ہو جائے گی، صبر اور برداشت کی عادت ڈالو گے تو جو لذات کو نقصان پہنچے گا اُس کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس طرح سے اس رکوع میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اصولی طور پر تلقین کی گئی ہے، اور اگلے رکوع سے تفصیلی تذکرہ شروع ہو جائے گا۔

تم اپنے عہد کو پورا کرو میں اپنے عہد کو پورا کروں گا

آیات پر نظر ڈالیے! ...... اے بنی اسرائیل! (میں نے عرض کیا تھا کہ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے) ''اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا''، یہ آگے تفصیل آئے گی کہ کس کس موقع پر کیا کیا احسانات کیے، خصوصاً بنی اسرائیل پر، باقی جو احسانات عام انسانوں پر ہیں وہ تو ہیں ہی، خصوصی احسانات کا تذکرہ آگے تفصیلاً آ رہا ہے، ''میرے احسان

کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا، اور میرے عہد کو پورا کرو' یعنی جو عہد تم نے میرے ساتھ کیا تھا اُس کو پورا کرو، اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ: میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا، یعنی جو میں نے تم سے کیا ہے میں اُس کو پورا کروں گا، وہ عہد کون سا ہے؟ اُس کی تفصیل بھی آگے سورۂ مائدہ کی اِن آیات میں ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ (یہاں سے میثاق کی تفصیل ہے) لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (آیت: ۱۲) اگر تم یہ کام کرو گے، کہ نماز کو قائم کرو گے، زکوٰۃ دو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور اُن کو قوت پہنچاؤ گے، اور اللہ کو قرضِ حسن دو گے، اللہ کے راستے میں خیر خیرات کی عادت رکھو گے، تو میں تم سے تمہارے گناہ دور ہٹاؤں گا، اور تمہیں ایسی جنات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تو لَاُكَفِّرَنَّ سے اللہ کا عہد آ گیا کہ تم ایسا کرو گے تو میں یہ کروں گا، اب یہ عہد تم نے کتابوں کے اندر میرے ساتھ کیا ہوا ہے اُس کو پورا کرو، مال کی محبت میں مبتلا ہونے کی بجائے اللہ کے راستے میں خیرات کرنے کی عادت ڈالو، زکوٰۃ دو، اور قرضِ حسن میں عام نفلی خیرات بھی آ گئی۔ نماز کی پابندی کرو، اللہ کے سامنے جھکنے کی عادت ڈالو، تو تمہیں حق قبول کرنے کی عادت پڑے گی، رسولوں پر ایمان لانے کا تم نے وعدہ کیا تھا تو جو رسول آ جائے اُس پر ایمان لاؤ۔ اگر تم یہ کرو گے تو میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ آخرت میں تمہیں کامیابی ہوگی، دنیا میں اللہ تعالیٰ تمہیں عزت کے ساتھ نوازے گا، تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ تو یہ اُسی عہد کی طرف اشارہ ہے جو قرآنِ کریم کی مختلف آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے۔

رہبت، خشیت اور تقویٰ میں فرق، اور مُصَدِّقًا کے دو مفہوم

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ: تین لفظ آپ کی خدمت میں عرض کیے تھے، رہبت، خشیت، اور تقویٰ۔ میں نے کہا تھا کہ اِن کا مفہوم قریب قریب ہے، کسی باعظمت شخصیت کا تصور کر کے قلب کے اُوپر جو کپکپی اور لرزہ طاری ہوتا ہے یہ رہبت ہے، اور اُس کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے انسان جو اپنی پستی کا احساس کرتا ہے، عجز و انکسار کے جذبات جو انسان کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں یہ خشیت ہے، اور اِن چیزوں کے حاصل ہو جانے کے بعد اُس باعظمت شخصیت کی نافرمانی سے جو انسان بچنے لگ جاتا ہے یہ تقویٰ ہے، یہ ساری چیزیں قریب قریب ہی ہیں۔ تو وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ: خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو، تمہارے دلوں کے اُوپر اگر ہیبت ہو تو صرف میری ہو۔ باقی! مفاد پرستی اور دنیا کے نقصان سے ڈرنا اور عزت کے زوال سے ڈرنا یہ تمہاری شان نہیں ہے، تمہیں چاہیے کہ صرف مجھ سے ڈرو۔ ''ایمان لے آؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری''، مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: اس کا مطلب دو طرح سے آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا، مَآ اَنْزَلْتُ: جو چیز میں نے اتاری وہ تصدیق کرنے والی ہے اُس کی جو تمہارے پاس ہے، یا مصداق بننے والا ہے اُس چیز کا جو تمہارے پاس ہے، مصداق بننا بھی ایک تصدیق ہی ہے، کیونکہ جو پیش گوئی تورات کے اندر ذکر کی گئی تھی اگر اُس کا مصداق مہیا نہیں ہوگا، تو وہ کتاب سچی ثابت نہیں ہو سکتی، اگر تم آنے والے پیغمبر کو تسلیم نہیں کرو گے تو وہ پیش گوئیاں غلط ہو جائیں گی

جو تمہاری کتاب میں آئی ہیں، اُن کا سچا ثابت ہونا تبھی ہوگا کہ اِس آنے والے رسول کو مانو اور اِس اتاری ہوئی کتاب کو تسلیم کرو، تب جا کے تمہاری کتاب سچی ثابت ہوگی، ورنہ جب اُس کی پیش گوئیاں پوری نہیں ہوں گی تو وہ بھی غلط ہو جائے گی۔

دو طبقوں کی وجہ سے قوم سدھرتی اور بگڑتی ہے

اور پھر اُن کو اُن کے مقتدیٰ ہونے کا احساس دلایا، کہ لوگ تمہارے مونہوں کی طرف دیکھتے ہیں، کہ آنے والے نبی کو تم قبول کرتے ہو یا نہیں کرتے، کیونکہ تم اہل علم ہو، اور جب تم قبول نہیں کرو گے تو لوگ کہیں گے کہ ہمارے پیروں نے نہیں مانا، ہمارے استاذوں نے نہیں مانا، ہمارے مفتیوں نے نہیں مانا، ہم کیسے مانیں؟ تو کفر کے اندر بھی مقتدائیت تمہیں حاصل ہو جائے گی، اس لیے قرآنِ کریم کا انکار کر کے اول کافر نہ بنو۔ اہل علم کی یہی بات ہوا کرتی ہے بھئی!۔ اہل علم ہدایت پر آتے ہیں تو قوم ہدایت پر آتی ہے، اہل علم پھسل جاتے ہیں تو قوم بھی پیچھے پھسل جاتی ہے۔ اسی لیے عربی میں وہ فقرہ مشہور ہے، آپ سنتے رہتے ہیں زَلَّةُ الْعَالِمِ زَلَّةُ الْعَالَمِ: زَلَّة لغزش کو کہتے ہیں، عالم کا پھسلنا جہان کا پھسلنا ہے۔ اور علماء کے گروہ کے متعلق ہی یہ بات ہے کہ اگر یہ سدھر جائیں تو قوم بھی سدھر جاتی ہے، اور اگر اِن کا طرزِ عمل غلط ہو جائے تو قوم کا طرزِ عمل بھی غلط ہو جاتا ہے۔ انسان کے بدن کے اندر جس طرح دل اور دماغ کی اصلاح ہو جانے کے ساتھ انسان کے اعمال اور کردار کی اصلاح ہو جاتی ہے، تو قوم کے اندر بھی دو طبقے ایسے ہوا کرتے ہیں جن کے سدھرنے کے ساتھ قوم سدھرتی ہے، ایک علماء کا طبقہ اور ایک حکام کا طبقہ، امراء اور حکام سدھر جائیں اور اہل علم سدھر جائیں تو قوم کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے، اور اگر یہ دونوں طبقے بگڑے ہوئے ہوں تو کوئی طاقت نہیں جو قوم کو سیدھے راستے پر لاسکے، اس لیے فَسَادُ الْعَالِمِ فَسَادُ الْعَالَمِ عالم کا بگڑنا عالَم کا بگڑنا ہے، اِس کے ساتھ جہان میں فساد ہوتا ہے۔

اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ

عام طور پر لوگ یہ واقعہ بیان کیا کرتے ہیں، کتابوں میں لکھا ہوا ہے، کہ حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے جا رہے تھے، اور ایک بچہ بھی ساتھ تھا، تو راستے میں ایک طرف کچھ کیچڑ سا تھا، وہ لڑکا اُس کیچڑ کی جانب سے چل رہا تھا، حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بیٹے! اِدھر سے چلو، کہیں پھسل نہ جانا، کیچڑ ہے۔ کہتے ہیں کہ اُس بچے کے منہ سے ایک فقرہ نکلا، کہنے لگا: حضرت! میرے پھسلنے کی کوئی بات نہیں، خود سنبھلنا، اگر آپ پھسل گئے تو جہان پھسل جائے گا۔ حضرت ابوحنیفہ اُس کے اِس فقرے سے بہت متاثر ہوئے، کہتے ہیں اس موقع پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ دیکھو! میرا قول تمہارے سامنے آئے، اور دوسری طرف صحیح حدیث غیر متعارض تمہارے سامنے آجائے، تو میرے قول کو چھوڑ دینا اور صحیح حدیث کو لے لینا۔[1] ایسا نہ ہو کہ تم اس وجہ سے کہ ہمارے استاذ کا قول ہے، چاہے مقابلے میں صحیح غیر متعارض غیر منسوخ حدیث تمہارے سامنے آجائے، تم یہ کہو کہ چونکہ ابوحنیفہ نے ایسے کہا اس لیے ہم ایسے ہی کریں گے، اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مجھ سے لغزش ہوئی ہے تو اُس لغزش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے کے سارے پیچھے والے پھسل جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بسا اوقات ایک آدھ فقرہ کسی کے منہ سے نکل

(۱) دیکھئے تذکرۃ الاولیاء للشیخ العطار ص ۲۲۷ بعنوان ذکر امام ابو حنیفۃ ... باختلاف یسیر۔

جاتا ہے اور دوسرے کے لئے تنبہ کا باعث ہوجاتا ہے۔ تو یہی بات ہے کہ عالم کا پھسلنا سارے جہان کا پھسلنا ہوتا ہے، عالم بن جانے کے بعد صرف شخصی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ قوم کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔

اہلِ کتاب کے علماء کو تذکیر

یہاں اُن کو اُن کا یہی مقام یاد دلایا جارہا ہے کہ اول کافر نہ بنو، کیونکہ لوگ تمہاری طرف دیکھ کر کفر پر اڑیں گے، اور یہ کہیں گے کہ جب ہمارے علماء نہیں مانتے، ہمارے اہل فتویٰ نہیں مانتے، اور ہمارے مشائخ نہیں مانتے، تو ہم کس طرح سے مان لیں؟، تو اُن کو اُن کی مقتدائیت کا احساس دلایا ہے۔ اور اگر تم مان جاؤ گے تو تمہیں اِدھر بھی مقتدائیت حاصل ہوگی، کہ تمہاری وجہ سے جتنے لوگ ایمان لائیں گے اُن کا ثواب بھی تمہیں ہوگا۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ: اَوَّلَ فریقٍ کافرٍ بہ، اور یہ اولیت اضافی ہے، ورنہ مشرکین مکہ بھی پہلے انکار کرچکے تھے، لیکن مدینہ منورہ میں آنے کے بعد اِن اہل علم کا انکار کرنا اُن کے پچھلوں کے لئے اولیت کا درجہ رکھتا ہے، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا: یہ اُن کی وہی دکھتی رگ پکڑی، کہ تمہیں یہ جو عادت پڑ گئی ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھپانے کی، بدلنے کی، اور لوگوں سے فیسیں بٹورنے کی، یہ تو تم اللہ کی آیات کو ثمن قلیل کے عوض میں بیچ رہے ہو، اور ثمنِ قلیل کا مصداق ساری دنیا ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (سورۂ نساء: ۷۷)، اللہ کے حکم کے مقابلے میں اگر ساری دنیا لے لی جائے تو بھی وہ ثمنِ قلیل ہے۔ وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ: فَاتَّقُوْنِیْ مجھ سے ہی ڈرو، میری نافرمانی سے بچو، یہ بھی اُسی طرح سے تاکید ہے کہ اِیَّایَ مفعول مقدم بھی آگیا (فعل محذوف کا)، اور فَاتَّقُوْنِ کے اُوپر نون کا کسرہ بھی دال بریائے متکلم ہے۔

حق کو چھپانے کی دو صورتیں

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو، کہ تھوڑی سی حق بات بھی بتادی اور اس کے اندر کچھ اپنی پیچ بھی لگادی، وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: اور حق کو چھپایا نہ کرو۔ حق کو چھپانے کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو ہے کہ سرے سے انکار کردیا، کہ یہ مسئلہ ہماری کتاب میں ہے ہی نہیں، اور ایک یہ ہے کہ ہے تو سہی لیکن اُس کی تاویل اور توجیہ اس قسم کی کردی کہ حق کے ساتھ باطل بھی ملادیا، یہ دونوں کتمانِ حق کی صورتیں ہیں۔ نہ تو مطلقاً چھپایا کرو اور نہ حق اور باطل کو خلط کیا کرو، صاف صاف بات کہو جو سچی ہے، جس کو تم کتاب اللہ کی طرف دیکھ کر صحیح سمجھتے ہو وہی بات کہا کرو، حق اور باطل کو خلط نہ کیا کرو، اور نہ حق کو چھپایا کرو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ کا عطف تَلْبِسُوا پر ہے، اور یہ بھی لَا کے نیچے داخل ہے، لَا تَلْبِسُوا وَلَا تَكْتُمُوا، خلط ملط بھی نہ کرو اور چھپاؤ بھی نہیں۔ ''حالانکہ تم صاحب علم ہو'' اور صاحب علم کا کام حق کا اظہار ہوتا ہے، حق اور باطل کو خلط کرنا اور حق کو چھپانا یہ تو جہالت ہے، علم والوں کی شان کے لائق نہیں ہے، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یعنی مصدر کے ساتھ ہی فاعل کو موصوف کرکے ذکر کردیا گیا، حالانکہ تم صاحب علم ہو، اور صاحب علم کا کام نہیں ہے کہ حق کو چھپائے، اُس کا کام تو یہ ہے کہ لوگوں کو حق بتائے، حق کا اظہار کرے، حق اور باطل کو خلط ملط کرنا یا حق کو چھپانا یہ دونوں ہی صاحب علم کی شان کے منافی ہیں، اور تم صاحب علم ہو، تمہیں اس قسم کی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

اخلاقِ باطنہ پر زیادہ تر صحبت کا اثر ہوتا ہے

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور عاجزی کرنے والوں کے ساتھ مل کر عاجزی کرو (آلوسی) یا تو یہ مطلب ہے کہ اُمتِ محمد یہ میں شامل ہو کر اُن کے ساتھ مل کر نماز پڑھو (عام تفاسیر)، کیونکہ رکوع اُمتِ محمد یہ کے اندر ہی نمایاں طور پر کیا جاتا تھا، یہود کی نماز میں یا تو تھا ہی نہیں (عام تفاسیر)، یا اگر تھا تو کوتاہی کے طور پر انہوں نے چھوڑنا شروع کر دیا۔ تو جب ان راکعین کے ساتھ ملو گے، تواضع کرنے والوں کے ساتھ ملو گے، تو تمہارے اندر بھی تواضع پیدا ہو گی۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اخلاقِ باطنہ کے اوپر زیادہ تر اثر صحبت کا پڑتا ہے، جس قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھو گے اسی قسم کے اثرات بسا اوقات غیر شعوری طور پر انسان میں پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں، متکبروں کے پاس بیٹھو گے تو اُن کا اٹھنا بیٹھنا چال چلن سب تکبر پہ دلالت کرے گا، تو تمہاری طبیعت بھی آہستہ آہستہ سرقہ اور چوری کر کے وہی عادات اختیار کرنی شروع کر دے گی، اچھے لوگوں کے پاس بیٹھو گے تو چونکہ طبیعت نقل اتارتی ہے، تو آہستہ آہستہ وہی اچھی عادتیں پڑ جائیں گی، متواضع لوگوں کے پاس بیٹھو گے تو تمہیں بھی تواضع آ جائے گی، متکبروں کے پاس بیٹھو گے تو تمہارے اندر بھی تکبر پیدا ہو جائے گا۔ عربی میں جیسے آیا کرتا ہے کہ اِنَّ الطَّبۡعَ مِنَ الطَّبۡعِ یَسۡرِقُ: طبیعت طبیعت سے چوری کرتی ہے، باطنی اخلاق ہمیشہ اسی طرح سے سرایت کیا کرتے ہیں کہ جس قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھنا شروع کرو گے اسی قسم کے اثرات پڑنا شروع ہو جائیں گے۔ تو متواضعین کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی تواضع کی عادت پڑے گی اور تمہارا تکبر ختم ہو گا۔

علمائے یہود کو ملامت

آگے وہی ملامت ہے، جس طرح سے میں نے عرض کیا، کہ لوگوں کو نیکی سکھاتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اب اس میں کسی ایک نیکی کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کہ کیا نیکی سکھاتے تھے اور خود قبول نہیں کرتے تھے، اگرچہ تفسیروں میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ ان میں سے بعض علماء نے اپنے رشتہ داروں کو مشورہ دیا کہ ایمان لے آؤ، یہ رسول سچا ہے، اور ایمان لانے کے بعد تائید کی کہ تم نے اچھا کیا، یہ رسول بالکل سچا ہے۔ وہ کہتے کہ پھر تم کیوں نہیں مانتے؟ کہتے کہ ہم اس لیے نہیں مانتے کہ گدی کو نقصان پہنچے گا، یہ سارے کا سارا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا، لیکن تم ٹھیک ہو، اِس کے پیچھے لگ جاؤ۔ اب اس قسم کی باتیں جب دوسروں کو وہ کرتے تھے، اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے تھے، تو اس بات پر ملامت ہے۔ ورنہ یہ واقعہ اگر ثابت نہ ہو کہ کسی عالم نے اپنے ماننے والوں کو یا اپنے قریبی رشتہ داروں کو ایمان لانے کے لئے کہا تھا اور خود ایمان نہیں لایا، تو واقعہ متعین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، عالم کا کام ہے کہ لوگوں کو نصیحت کرتا ہے، خدا سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے، آخرت کی ترجیح کا قول کرتا ہے کہ آخرت کو دنیا کے مقابلے میں ترجیح دو، فسق و فجور چھوڑنے کے لئے کہتا ہے، معصیت ترک کرنے کے لئے کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کی طرف متوجہ کرتا ہے، ہر عالم وعظ و نصیحت کرتا ہوا اسی قسم کی باتیں کیا کرتا ہے، لیکن جب اپنا شخصی معاملہ آ جاتا ہے تو پھر اُنہی نصیحتوں کو بھول جاتا ہے، پھر اپنے شخصی مفاد کے پیچھے حبِ مال سے متاثر ہو کر یا حبِ جاہ سے متاثر ہو کر حق کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔

(کسی سوال پر فرمایا) یہ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کا ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا، بیان القرآن میں لکھا ہے، میں نے اسی لیے تو عرض کیا، آپ نے میری بات کی طرف توجہ نہیں کی، کہ اگر چہ تفسیروں میں یہ اثر منقول ہے کہ ان کا کوئی ماننے والا ایمان لے آیا تو اس کو کہہ دیا کہ تم نے ٹھیک کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہو، یہ خصوصی خصوصی واقعات ہیں، علی الاعلان نہیں، بعض لوگوں کو اس طرح سے کہہ دیا۔ (پھر دوبارہ کسی سوال پر فرمایا) دوسروں کو بتایا اور دوسروں کے سامنے ظاہر ہوا، اسی لیے تو نتیجۃً اُن کا منہ کالا ہوا، آخر اُن پر زوال آیا کہ نہیں آیا؟ ایسی باتیں کوئی چھپی رہا کرتی ہیں؟ جتنی تفصیل کے ساتھ واقعات پیش آئے تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ قوم آخر ان کا ساتھ چھوڑ گئی، وہ کب تک قوم کو گمراہ رکھ سکتے، آگے تفصیل کے ساتھ گفتگو جو آپ کے سامنے اِن بنی اسرائیل علماء کے متعلق آئے گی اُس میں مقصد بھی تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے اِن کا حال نمایاں ہو، جو ان کے معتقد بنے بیٹھے ہیں کم از کم وہ اپنے اِس اعتقاد کو چھوڑیں۔ اور یہ کوشش بالکل کامیاب رہی، بہت کم لوگ ہوں گے جو اُن کے پیچھے لگے رہ گئے، ورنہ اکثر و بیشتر اُن کا دامن چھوڑ گئے جیسے جیسے ان کی خیانتیں سامنے نمایاں ہوتی چلی گئیں، لیکن بعض لوگ اِس قسم کے ضدی ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بس جدھر یہ جائیں گے ادھر ہی ہم جائیں گے، جہنم میں جائیں گے تو ہم ساتھ ہیں، جنت میں جائیں گے تو ہم ساتھ ہیں، ایسے لوگوں کو تو پھر نہیں سمجھایا جا سکتا۔ میں نے تو اور وسعت کے ساتھ بات کر لی کہ اگر یہ واقعہ ثابت نہ بھی ہو تو ہمیں اِس پر زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں، اِس واقعہ کے ثبوت پر قرآنِ کریم کی آیت کی تفسیر موقوف نہیں ہے، کیونکہ جو بھی عالم منبر پر کھڑا ہوگا، اسٹیج پر کھڑا ہوگا، تو لوگوں کو تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آخرت کو ترجیح دو، دنیا کی محبت چھوڑ دو، اللہ سے ڈرو، کسی دوسری چیز سے نہیں ڈرنا چاہیے، تو لوگوں کو نصیحت کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟ اَتَاْمُرُوْنَ کے اندر جو استفہام انکاری ہے اِس انکار کا تعلق تَنْسَوْنَ کے ساتھ ہے، جیسے کہ ہم اپنے لب و لہجے میں جب ترجمہ کریں گے تو یوں ہوگا ''لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟'' اس اندازِ گفتگو میں جو انکار کیا جا رہا ہے وہ اپنے آپ کو بھولنے پر ہے۔ جس کا دوسرا عنوان یہ لے لیجئے کہ اِس کا مقصد یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے، واعظ کو چاہیے کہ جس قسم کا وعظ لوگوں کو کہتا ہے اُس پر عمل بھی کرے، واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے، اِس کا مفہوم یہ ہے۔

کیا بے عمل کے لئے وعظ کہنا ممنوع ہے؟

یہ مطلب اِس کا غلط ہے کہ کوئی یہ کہے کہ بے عمل کو وعظ نہیں کہنا چاہیے، کہ جو خود بے عمل ہے اُس کو وعظ نہیں کہنا چاہیے، یہ مطلب نہیں ہے۔ بے عملی ایک مستقل جرم ہے، وعظ کہنا نیکی ہے، بُرائی کو نیکی چھوڑنے کا ذریعہ نہ بناؤ، کہ چونکہ ہمارا عمل نہیں ہے اِس لیے ہم لوگوں کو بھی کیوں کہیں؟ آپ میں عمل نہیں ہے تو یہ آپ کی بُرائی ہے، اور لوگوں کو نصیحت کرنا ایک نیکی تھی، آپ اپنی بُرائی کو اس نیکی کے چھوڑنے کا ذریعہ نہ بنائیں، البتہ ایک نیکی کو دوسری نیکی کا ذریعہ بنائیں، کہ جب آپ لوگوں کو کہتے ہیں تو یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک نیکی ہے، تو اپنی اِس عادت کو خود عمل کرنے کی عادت کا ذریعہ بنائیں تو ایک نیکی دوسری نیکی کا ذریعہ بن جائے گی۔ ایک جرم کو دوسرا جرم کرنے کا سبب نہیں بنانا چاہیے، بلکہ نیکی کو دوسری نیکی کی عادت ڈالنے کا سبب بنانا چاہیے۔ وعظ

کہنا نیکی ہے، اِس وعظ کہنے کے جذبے سے اپنے آپ کو عمل کی راہ پر لگاؤ، تو یہ ایک نیکی دوسری نیکی کا ذریعہ بن گئی، کہ جب لوگوں کو کہتے ہو تو کرو بھی۔ اور اگر یوں کہیں گے کہ جب خود نہیں کرتے تو پھر لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو، تو اس کا مطلب ہے کہ ایک بُرائی کو دوسری بُرائی کا ذریعہ بنایا جارہا ہے۔ نیکی کی تلقین کرنا مستقل نیکی ہے، اِس کو سبب بناؤ اس بات کا کہ تم اپنے آپ میں بھی نیکی کی عادت ڈالو، یہ نہیں کہ اگر تمہیں نیکی کی عادت نہیں ہے تو تم دوسرے کو کہنا چھوڑ دو، یہ مطلب غلط ہے۔ تو انکار یہاں تَاْمُرُوْنَ پر نہیں، تَاْمُرُوْنَ تو نیکی کا کام ہے، انکار تَنْسَوْنَ پر ہے کہ اپنے آپ کو بھولے کیوں بیٹھے ہو؟ ۔ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ: حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، اور اُس کتاب کے اندر عالمِ بے عمل کے لئے وعیدیں ہیں، تو سب کچھ تمہارے سامنے ہے پھر بھی تم ایسے کرتے ہو؟ تو تمہیں عقل نہیں ہے؟ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: تم سوچتے نہیں اِن باتوں کو؟ عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہ ملامت کا انداز ہے۔

صبر اور نماز کی تاکید

اِس حق کے قبول کرنے میں تمہاری خواہشات کو نقصان پہنچے گا، وہ لذت پرستی نہیں رہے گی، تو استعانت بالصبر کرو، صبر کی عادت ڈالو، یہ صبر تمہارے لیے اِن حالات کو برداشت کرنے کے لئے معاون بنے گا۔

صبر کا مفہوم اور اس کی اقسام

صبر انسان کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ ہے جس سے انسان خلافِ طبیعت اُمور کو سہہ جاتا ہے، برداشت کرجاتا ہے، صبر اخلاقِ باطنہ میں سے ایک خُلق ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت میں ایسی چیز پیدا کرو کہ اگر خلافِ مزاج واقعات بھی پیش آجائیں تو اُن کو سہہ جاؤ، یہ ملکہ پیدا کرو، اِس کو صبر کہتے ہیں۔ اور صبر کا مفہوم بہت عام ہے، آپ سنتے رہتے ہیں، صبر علی المصیبۃ: کوئی مصیبت پہنچ گئی تو اُس کو برداشت کرو، واویلا نہ کرو، زیادہ رودھو نہیں۔ صبر علی الطاعۃ: نیکی کرنے میں طبیعت کو ناگواری ہے تو اس ناگواری کو برداشت کرو، نیکی کی عادت ڈالو۔ اور صبر عن المعصیۃ: طبیعت کا میلان معصیت کی طرف ہے، اُس کو روکنے میں طبیعت کو ناگواری ہے، تو اس کو روکو۔ تو صبر کا مفہوم ہر طرح سے ہے، اصل ہے حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ کہ جو چیز نفس کو ناگوار ہے اُس پر نفس کو پابند کرنا، مصیبت آجائے تو نفس کی خواہش ہے کہ واویلا کرے، شکوہ شکایت کرے، اور خاموش ہوجانا اور اُس کو سہہ جانا نفس کو ناگوار ہے، تو برداشت کرنے کی عادت ڈالو، اسی طرح طاعت کی طرف جانا نفس کو ناگوار ہے تو اِس پر اُسے پابند کرو، اور معصیت چھوڑنا نفس کو ناگوار ہے تو اِس پر نفس کو پابند کرو، اس طرح سے صبر کا دائرہ تمام طاعات کی طرف اور تمام معاصی سے بچنے کی طرف وسیع ہوجاتا ہے، اور خلافِ طبیعت واقعات جو پیش آتے ہیں، جن کو ہم اپنی اصطلاح میں مصیبت کہتے ہیں، اُن کو سہنا بھی صبر میں شامل ہوجاتا ہے۔ صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خُلق اتنا مضبوط ہوجائے کہ طاعت ناگوار ہے تو بھی کرو، معصیت کا چھوڑنا ناگوار ہے تو بھی چھوڑو، اور خلافِ طبیعت واقعہ پیش آگیا جس کے اوپر خاموشی اختیار کرنا ناگوار ہے، تو اُس پر بھی خاموشی اختیار کرو۔ اور لذت پرستی اور شہوت پرستی صبر کے منافی ہے، کہ گناہ کرنے کو طبیعت چاہی تو کرلیا، نیکی نہ کرنے کو طبیعت چاہی تو نہیں کی، اور اسی طرح ذرا تکلیف پہنچے اور خلافِ طبیعت واقعہ پیش آئے تو شکوہ شکایت اور واویلا کرنے میں نفس

لذت محسوس کرتا ہے تو یوں کرنے لگ گئے، یہ سب چیزیں صبر کے خلاف ہیں۔ تو تم بھی صبر اور نماز کی عادت ڈالو، یہ تمہارے لیے معاون بنیں گی اِس حق کے قبول کرنے میں۔

صبر اور نماز کی عادت کیسے ڈالی جائے؟

باقی رہا کہ صبر اور صلوۃ تو معاون بن جائیں گے، لیکن صبر وصلوۃ کو اختیار کس طرح سے کریں؟ ان کی عادت کس طرح سے ڈالیں؟ آخر یہ بھی تو ایک مشکل کام ہے، تو آگے اُس کا طریقہ بتا دیا۔ اِنَّهَا کی ضمیر صلوۃ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے (عام تفاسیر)، اور مجموعی طور پر اُس خصلت کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے جس کا ذکر وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے اندر کیا گیا ہے (مظہری)، صبر وصلوٰۃ کے ساتھ استعانت، یہ خصلت گراں ہے، اِس کا اختیار کرنا بوجھل ہے مگر خشوع اختیار کرنے والوں پر، جو عاجزی اختیار کرنے والے ہیں اُن پر گراں نہیں ہے۔ اور عاجزی اختیار کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے رب سے ملنا ہے اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: کہ بیشک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب کے ساتھ، اور اُسی کی طرف ہی انہوں نے لوٹنا ہے۔ تو اللہ کی طرف لوٹنے کا خیال اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا تصور انسان میں خشوع اور عاجزی پیدا کرتا ہے، اور جس وقت عاجزی پیدا ہو جائے گی تو یہ خصلت اختیار کرنی آسان ہو جائے گی کہ تم صبر وصلوٰۃ کو اختیار کر لو گے، اور صبر وصلوٰۃ جس وقت تمہیں حاصل ہو جائے گا تو تکبر چلا جائے گا اور شہوات پرستی ختم ہو جائے گی، پھر حق کا قبول کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا، جس حق کے قبول کرنے میں تم یہ سمجھتے ہو کہ ہماری عزت اور مال کو نقصان پہنچے گا تو صبر وصلوٰۃ کی عادت پڑ جانے کے بعد اِس حق کا قبول کرنا آسان ہو جائے گا، اس طرح سے اِن آیات میں اِن علمائے بنی اسرائیل کو روحانی علاج کی طرف متوجہ کر دیا گیا۔ یہ ایک اجمالی تذکرہ ہے اور اگلے رکوع سے تفصیلی تذکرہ شروع ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میری طرف سے یہ یہ احسانات ہوئے، اور تمہاری طرف سے ایسے ایسے واقعات پیش آئے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے اس احسان کو جو میں نے تم پر کیا، اور اس بات کو یاد کرو کہ بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی جہانوں پر ﴿۴۷﴾

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

اور ڈرو اس دن سے جس میں نہیں ادا کرے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ بھی اور نہیں قبول کی جائے گی کسی نفس کی طرف سے

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ

سفارش، اور نہیں لیا جائے گا کسی کی طرف سے کوئی بدل، اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے ﴿۴۸﴾ اور یاد کیجئے جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی

مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ

فرعون کے لوگوں سے، پہنچاتے تھے وہ تمہیں برا عذاب، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو، اور

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ

اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی ﴿۴۹﴾ اور یاد کیجئے جب پھاڑا ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو

فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى

پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور یاد کیجئے جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ

چالیس راتوں کا، پھر بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود موسیٰ کے (جانے کے) بعد، اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اس کے بعد تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۵۲﴾ اور یاد کیجئے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور فرقان دی، تاکہ تم ہدایت حاصل کرو ﴿۵۳﴾

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا

اور یاد کیجئے جس وقت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا بچھڑے کو معبود بنا کر، پس تم توبہ کرو

اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ

اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، اور قتل کرو اپنے لوگوں کو، یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک،

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى

پس اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی، بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾ اور یاد کیجئے جب تم نے کہا اے موسیٰ!

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

ہم ہرگز تیری بات کا یقین نہیں کریں گے جب تک ہم دیکھ نہ لیں اللہ کو کھلم کھلا، پس پکڑ لیا تمہیں کڑکنے والی بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۵﴾

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا

پھر ہم نے تمہیں اٹھا دیا تمہارے مرنے کے بعد، تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۵۶﴾ سائبان بنا دیا ہم نے تمہارے اوپر بادل کو، اور اتارا ہم نے

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

تمہارے اُوپر من وسلویٰ (اور ہم نے کہا کہ) تُمہاری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ اور ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہ کیا، لیکن وہ

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے ۝۵۷ اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں پھر کھاؤ تم اس شہر سے جہاں تم چاہو

رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ

وسعت کیساتھ، اور داخل ہو جاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے، اور یہ کہتے جاؤ حطہ، ہم تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، اور

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ

نیکو کاروں کو ہم اور زیادہ دیں گے ۝۵۸ بدل دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات سوائے اس بات کے جو ان سے کہی گئی تھی،

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۵۹

پھر اتارا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمان سے بسبب اس بات کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ۝۵۹

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اے اولادِ یعقوب!، اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ: یاد کرو میرے اُس احسان کو جو میں نے تم پر کیا۔ نعمت: احسان۔ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ: اِس کا عطف نِعْمَتِيَ پر ہے، اور اِس بات کو یاد کرو کہ بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: جہانوں پر۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا: اور ڈرو اُس دن سے لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا: لَا تَجْزِيْ سے اگلے جملے يَوْمًا کی صفت واقع ہو رہے ہیں، اِس لیے ترجمے میں یہ لفظ بولا گیا "ڈرو ایسے دن سے جس میں یہ واقعات پیش آئیں گے"۔ جَزٰى يَجْزِيْ: اداء کرنا۔ نہیں ادا کرے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ بھی، اصل معنی اِس کا یہی ہے، باقی اِس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نفس کسی نفس کے لئے کافی نہیں ہوگا، کوئی نفس کسی نفس کے کام نہیں آئے گا، مفہوم اِن الفاظ کے ساتھ بھی ادا ہو جاتا ہے، اصل ترجمہ یہی ہے کہ "کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا"، وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ: لَا يُقْبَلُ: نہیں قبول کی جائے گی مِنْهَا: نفس کی طرف سے شَفَاعَةٌ: سفارش، یعنی کسی نفس کی طرف سے کسی نفس کے لئے سفارش قبول نہیں کی جائے گی، وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ: عدل کا معنی بدلہ، عدل اصل میں برابر چیز کو کہتے ہیں، اور ایک چیز ادا نہ کی جائے اور اُس کے بدلے میں اُس کے برابر کوئی دوسری چیز ادا کر دی جائے تو وہ عدل ہے، "نہیں لیا جائے گا کسی نفس کی طرف سے کوئی بدل"، وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ: اور نہ وہ لوگ مدد کیے جائیں گے، مدد دیے جائیں گے، دونوں طرح سے یہ مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ

فِرْعَوْنَ: اور یاد کیجئے جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی، مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: آل کا لفظ اولاد کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ تمام متعلقین، اتباع کرنے والے، متبعین، پچھلگ، وہ سب آل کہلاتے ہیں، اور یہ فرعون جس کا ذکر ہے یہ تو سرے سے بے اولاد تھا، تو آلِ فرعون سے یہاں مراد ہے فرعون کی فوجیں، فرعون کے متعلقین، فرعون کے کارکن، ''یاد کیجئے جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے، فرعون کے متعلقین سے''، یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: پہنچاتے تھے تمہیں برا عذاب، یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ: یہ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کی تفسیر ہے، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو، وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ: اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو، وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ: بلاء کا معنی آزمائش بھی ہوتا ہے، اور بلاء کا معنی احسان وانعام بھی ہوتا ہے، اور بلاء کا معنی مصیبت بھی ہوتا ہے، اور یہ تینوں معنی یہاں لگ سکتے ہیں، ذٰلِكُمْ کا اشارہ اگر یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ، یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ میں مذکور آلِ فرعون کا جو معاملہ تھا بنی اسرائیل کے ساتھ، ذٰلِكُمْ کا اشارہ اگر اِدھر ہو جائے تو بلاء مصیبت کے معنی میں ہے ''اِس میں بڑی مصیبت تھی تمہارے لیے۔'' اور اگر نَجَّیْنٰكُمْ میں جو نجات دینا مذکور ہے ذٰلِكُمْ کا اشارہ اِدھر ہو جائے تو پھر یہ انعام اور احسان کے معنی میں ہے ''اِس نجات دینے میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا احسان تھا، بہت بڑا انعام تھا''، اور اگر مجموعے کی طرف اشارہ ہو جائے تو پھر یہ آزمائش کے معنی میں ہے، کہ فرعونیوں کی طرف سے جو عذاب ہو رہا تھا وہ بھی مستقل آزمائش تھی، اور اللہ کی طرف سے جو نجات ملی اس میں بھی آزمائش تھی، ''اِس میں آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بڑی''۔ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ: اور یاد کیجئے جب پھاڑا ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو، فَاَنْجَیْنٰكُمْ: پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی، وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ: اور فرعون کے متعلقین کو، فرعون کے لوگوں کو غرق کردیا، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ: اور تم دیکھ رہے تھے، یعنی تمہاری آنکھوں کے سامنے، تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو غرق کردیا۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی: اور یاد کیجئے! جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً: چالیس راتوں کا، ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ: پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو، دوسرا مفعول یہاں محذوف ہے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ اِلٰهًا: پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا، اِلٰہ بنالیا، مِنْۢ بَعْدِهٖ: مِنْ بَعْدِ ذَهَابِهٖ، موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا، وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ: اور تم بہت بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے، تم بہت ظلم ڈھانے والے تھے، ظلم کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اصل کے اعتبار سے ظلم کہتے ہیں حق تلفی کو، کسی کی حق تلفی کی جائے یہ ظلم ہے، اور شرک سب سے بڑا ظلم ہے، کیونکہ اِس میں مالکِ الملک کی حق تلفی ہوتی ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)، خالق الکل کی اِس میں حق تلفی ہے اور بہت بڑی حق تلفی ہے، اُس کے متعلق توحید کا عقیدہ رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر بہت بڑا حق ہے، اور جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ اِس حق کو فوت کرتا ہے، اس لیے یہ ظلم عظیم ہے، ''اور تم ظلم کرنے والے تھے، تمہاری یہ حرکت ظالمانہ تھی، تم ظلم ڈھانے والے تھے''، ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ: پھر ہم نے تم سے درگزر کیا، مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: اِس شرک کے ارتکاب کے بعد، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ، احسان مانو۔ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ: اور یاد کیجئے! جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور فرقان دی، کتاب سے تورات مراد ہے، فرقان کہتے ہیں ایسی چیز کو جو کہ فارق بین الحق والباطل ہو، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز، اس لیے یہ عطف تفسیری بھی ہوسکتا ہے کہ وہی کتاب فرقان ہے، اللہ کی طرف سے جو کتاب اترتی ہے وہ فرقان ہی ہوتی ہے، جس کے ساتھ حق اور باطل میں، حلال اور حرام میں، غلط اور صحیح میں فرق ہوتا ہے، اس لیے

اللہ کی کتاب بھی فرقان کی مصداق ہوسکتی ہے، جیسے قرآنِ کریم کے بارے میں بھی یہی لفظ متعدد آیات میں آیا تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (سورۂ فرقان:۱) وہاں قرآن کو بھی فرقان کہا گیا، اور دسویں پارے کی ابتداء میں آپ کے سامنے آئے گا کہ یومِ بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا، کہ وہ بھی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کا دن تھا، جس میں حق و باطل خوب اچھی طرح سے نمایاں ہوگئے۔ اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کے معجزات بھی فرقان کا مصداق ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے ساتھ بھی سچے اور جھوٹے میں فرق ہوتا ہے۔ تو یہاں فرقان سے وہی تورات مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے، اور جو معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے جو ان کی صداقت کی دلیل تھے، جن کے ساتھ سچے اور جھوٹے میں فرق ہوا، فرقان کا مصداق وہ بھی بن سکتے ہیں۔ اور خاص طور پر عظیم معجزات یعنی عصائے موسیٰ اور ید بیضاء، ان کا جو ذکر کیا گیا ہے جو پہلے پہلے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف گئے تھے، فرقان کا مصداق یہ ہوسکتے ہیں۔ اور اسی طرح سے دلائل علمیہ جن کے ساتھ حق اور باطل کو متعین کیا جاتا ہے، حرام اور حلال کا امتیاز کیا جاتا ہے، سچے اور جھوٹے میں امتیاز کیا جاتا ہے، وہ دلائل علمیہ بھی فرقان کا مصداق ہوتے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تاکہ تم ہدایت حاصل کرو، تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ: یاد کیجئے جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔ ''قوم کے لئے کہا'' یہ ترجمہ نہیں کرنا، اس سے مفہوم صاف نہیں ہوتا، میں نے آپ کو ایک دن پہلے بھی سمجھایا تھا، قلتُ لزیدٍ: میں نے زید کو کہا، یا، زید سے کہا، تو یہاں بھی قوم موسیٰ علیہ السلام کی مخاطب ہے، تو ترجمہ ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔ یٰقَوْمِ: قومِ میں میم کے نیچے کسرہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے، اے میری قوم! اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ: تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، تم نے اپنے آپ پر زیادتی کی، بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ: عجل کو معبود بنا کر، بچھڑے کو معبود بنا کر، بسبب بنانے تمہارے بچھڑے کو معبود۔ اتخاذ مصدر ہے اور اس کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اور عجل پہلا مفعول، اور اِلٰهًا دوسرا مفعول، بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ اِلٰهًا: تم نے بچھڑے کو معبود بنانے کے سبب سے اپنا نقصان کیا، اپنی جان پر ظلم کیا، کیونکہ اپنے نفس کا حق بھی یہی ہے کہ انسان اس کے ساتھ ایسے کام کرے کہ یہ اللہ کے عذاب سے نجات پائے اور آخرت کی کامیابی حاصل کرے، جس وقت آپ اپنے آپ کو کسی گناہ میں مبتلا کرتے ہیں یہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، اپنے نفس کا حق بھی فوت کرتے ہیں۔ ''اے میری قوم! بیشک تم نے ظلم کیا اپنے آپ پر، اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اپنی حق تلفی کی، اپنا نقصان کیا، بسبب بنا لینے تمہارے بچھڑے کو معبود''۔ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ: پس تم لوٹو، رجوع کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، اس کا بھی وہی مفہوم ہوا، جیسے ''تاب'' کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اصل میں لوٹنے کو کہتے ہیں، ''رجوع کرو تم، لوٹو تم، توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف''، فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اور اپنے لوگوں کو قتل کرو، اَنْفُسَكُمْ سے مراد اپنی قوم کے افراد ہیں، اپنے آپ کو قتل کرنا مراد نہیں ہے، یہاں قتل کرنے والے وہ تھے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی بلکہ وہ موحد رہے، اور قتل اُن کو کرنا ہے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی، چونکہ وہ مرتد ہوگئے تھے، انہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا، تو اُن کو یہ سزا دی گئی، اس لیے اس کا ترجمہ یوں کرنا ہے کہ قتل کرو تم اپنے لوگوں کو۔ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ: یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک فَتَابَ عَلَیْكُمْ: اس سے پہلے یہ مضمون مقدر ہوگا کہ پھر تم لوگوں نے اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنے لوگوں کو قتل کیا، تو اللہ نے تم پر توجہ کی، تمہاری اس توبہ کو قبول

کرلیا، ساری قوم کا گناہ معاف ہوگیا، اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ: بیشک وہ تو بہت توبہ قبول کرنے والا، الرَّحِیْمُ: رحم کرنے والا ہے۔ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی: اور یاد کیجئے! جب تم نے کہا اے موسیٰ! لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ: ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے، تیری بات نہیں مانیں گے، حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً: حتیٰ کے بعد اُردو محاورے کے مطابق مضارع کا ترجمہ نفی کے ساتھ کردیا جاتا ہے، ''ہم تیری بات نہیں مانیں گے، تیری بات کا یقین نہیں کریں گے جب تک نہ دیکھ لیں ہم اللہ کو کھلم کھلا'' اُردو محاورے کے مطابق ترجمہ اِس طرح سے ہوگا، جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا نہیں دیکھ لیں گے اُس وقت تک ہم تیری بات کو نہیں مانیں گے، فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ: صاعقہ کا لفظ پہلے آپ کے سامنے گزر گیا صواعق، منافقین کی مثال دیتے ہوئے یہ لفظ آیا تھا، صواعق جمع ہے صاعقہ کی، صاعقہ اس بجلی کو کہتے ہیں جس میں کڑک بھی ہو اور جو کبھی گر بھی جاتی ہو، ''تمہیں کڑک نے پکڑلیا'' تمہارے اُوپر ایک بجلی کڑکی اور اُس کی گرفت میں تم آگئے، ''پکڑلیا تمہیں کڑکنے والی بجلی نے''، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ: اور تم دیکھ رہے تھے، کھلی آنکھوں تمہارے سامنے یہ معاملہ پیش آیا، ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ: پھر ہم نے تمہیں اٹھادیا، مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ: تمہارے مرنے کے بعد، تمہاری موت کے بعد پھر ہم نے تمہیں اٹھادیا، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکر گزار ہوجاؤ، تاکہ تم احسان مانو۔ وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ: غمام کہتے ہیں باریک بادل کو، ہم نے تمہارے اُوپر سایہ افگن کردیا، سایہ ڈالنے والا بنادیا، ہم نے تمہارے اُوپر سائبان بنادیا بادل کو۔ ظُلَّة کہتے ہیں سائبان کو، جو سایہ کرنے کے لئے اُوپر تان دیا جاتا ہے، یَوْمِ الظُّلَّةِ کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں آئے گا (سورۂ شعراء: ۱۸۹)، سائبان کا دن، جس دن بادل اس طرح طاری ہوگیا تھا جیسے کوئی سائبان تنا ہوا ہو، ''ہم نے سایہ دار کردیا تمہارے اُوپر، یا، سائبان بنادیا ہم نے تمہارے اُوپر بادل کو''، وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی: اور اتارا ہم نے تمہارے اُوپر مَن وسلویٰ، سلویٰ ایک پرندہ ہے بٹیر کے مشابہ، عام طور پر اِس کا ترجمہ بٹیر کے ساتھ ہی کردیا جاتا ہے، اور مَنّ یہ کوئی چیز آسمان سے برستی تھی اوس کی طرح، جس طرح سے شبنم کے قطرے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح وہ چیز برستی تھی، میٹھی تھی، جس کو یہ اٹھالیتے تھے اور کھاتے تھے، ''ہم نے من وسلویٰ تمہارے اُوپر اتارا''، كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ: اِس امر سے پہلے قُلْنَا کا لفظ مقدر ہے، اور ہم نے تمہیں کہا کہ کھاؤ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے عمدہ چیزیں، ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، وَمَا ظَلَمُوْنَا: اور اُن لوگوں نے ہم پر ظلم نہ کیا، وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے، اگر انہوں نے کوئی گڑبڑ کی جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم ہوگئے، من وسلویٰ سے محروم ہوگئے، تو اِس میں ہمارا کیا نقصان ہوا؟ انہوں نے ایسی گڑبڑ کرکے اپنا نقصان کیا، ایسی حرکتیں کیں جن کی وجہ سے اِس نعمت سے محروم ہوگئے تو اِس سے ہمارے اُوپر انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی، اپنا نقصان کیا، جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارا کیا بگڑا؟ نقصان اپنا کربیٹھے، اِس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انہوں نے ایسی حرکتیں کی تھیں جن کی بناء پر وہ اللہ کی اِس نعمت سے محروم ہوگئے۔ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ: اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے کہا کہ داخل ہوجاؤ اِس شہر میں، قریہ آبادی کو کہتے ہیں جس میں لوگ جمع ہوکر سکونت اختیار کرلیتے ہیں، چھوٹے دیہات اور بڑے شہر سب کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَرْیَتَیْنِ کا لفظ سورۂ زخرف (آیت: ۳۱) میں آپ کے سامنے آئے گا، جس کا مصداق مکہ اور طائف ہیں، اور اسی طرح سورۂ یوسف کے اندر قریہ کا لفظ آئے گا جس سے مصر شہر مراد ہے جو اُس وقت کی سلطنت کا دارالخلافہ تھا، وَسْئَلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَ الْعِیْرَ الَّتِیْٓ اَقْبَلْنَا فِیْهَا

(سورۂ یوسف: ۸۲) وہاں قریہ سے مصر مراد ہے۔ ''داخل ہو جاؤ اس شہر میں''، فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا: پھر کھاؤ تم اس شہر سے جہاں تم چاہو کھلم کھلا، رَغَدًا کا لفظ ابھی آپ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی گزرا، ''کھلم کھلا کھاؤ، وسعت کے ساتھ کھاؤ''، كُلُوْا أَكْلًا رَاغِدًا، یوں یہ مصدر کی صفت ہو کر كُلُوْا کا مفعول مطلق ہو جائے گا، ویسے رَغَدًا مصدر ہے اور وسعتِ عیش کے معنی میں آیا کرتا ہے۔ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا: سُجَّدًا ساجد کی جمع، اور داخل ہو جاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے، دروازے سے شہر کا دروازہ مراد ہے یا عبادت خانے کا (مظہری) عبادت خانے کے دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ، یا شہر کے دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ: اور یہ کہتے جاؤ حِطَّةٌ: مَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیے جائیں، حِطَّةٌ کا لفظ اِس سارے مفہوم پر دلالت کرتا ہے، حِطّہ حِطّہ، یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے ہم کہتے ہیں توبہ توبہ، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں توبہ کرتا ہوں، میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، لفظ ایک ہے اور اس کے اندر یہ سارے کا سارا مفہوم آ گیا، ''توبہ توبہ'' یہ توبہ کا لفظ مفرد استعمال ہو رہا ہے لیکن مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری توبہ، میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، تو اسی طرح سے یہاں بھی ہے کہ حِطّہ حِطّہ کہتے ہوئے جاؤ، جس کا مطلب یہ ہوگا مَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیے جائیں، توبہ استغفار کرتے ہوئے دروازے کے اندر داخل ہو جاؤ، عملی طور پر جھکتے ہوئے اور قولی طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کرتے ہوئے، نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ: یہ جوابِ امر ہے، یعنی اگر تم ایسا کرو گے، کہ دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہوئے اور زبان سے حِطّہ حِطّہ کہتے گئے تو ہم تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ: اور نیکوکاروں کو ہم اور زیادہ دیں گے، جتنا اپنے عمل میں احسان پیدا کرتے چلے جاؤ گے اُتنا اللہ کی طرف سے انعام میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اِحسان کا معنی ہے کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنا، اِحسان فی العبادۃ یہ ہوتا ہے کہ عبادت کو ایسے طور پر کیا جائے، اس یقین کے ساتھ کیا جائے گویا کہ انسان اللہ کو دیکھ رہا ہے، باقی ہر معاملے میں احسان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کام کو اچھے طریقے سے کر دیا۔ نیکوکار، اچھی طرح سے کام کرنے والوں کو ہم زیادہ دیں گے۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ: بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قول غیر اُس قول کے جو اُن کے لئے کہا گیا تھا، جو بات اُن سے کہی گئی تھی انہوں نے تبدیل کر کے اور بات بنالی۔ بَدَّلَ: ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دیا۔ جو بات ان سے کہی گئی تھی اس کے بدلے میں اور بات کہنے لگ گئے، جیسا کہ تفسیر والوں نے ذکر کیا کہ حِطّہ کے لفظ کو استہزاء اور مذاق کے طور پر، ٹھٹھہ کرتے ہوئے بگاڑ لیا، حِطّہ کی بجائے حِنْطَۃ حِنْطَۃ کہنے لگ گئے، اور حنطۃ کا معنی ہے گندم، کہاں تو حِطّہ کا لفظ جس کا مطلب تھا کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیے جائیں، اور کہاں مذاق کر کے حِطّہ کو اُنہوں نے حنطۃ بنالیا، گندم گندم کرتے جا رہے ہیں، اب گندم گندم کا یہاں کیا معنی؟، بس یہی جو فطرت میں شرارت تھی اُس نے بات بگاڑ دی، ''بدل دی ظالموں نے، بدل دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات سوائے اُس بات کے جو اُن سے کہی گئی تھی''، فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا: رِجز عذاب کو کہتے ہیں، سختی، عذاب، پھر اتارا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمان سے، بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: بسبب اِس بات کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، بسبب اِس بات کے کہ وہ خروج عن الطاعۃ کا ارتکاب کرتے تھے، اُن کے فسق و فجور کی وجہ سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں بنی اسرائیل کو کچھ اصولی خطاب تھا، اور یہاں سے اب تفصیلی واقعات شروع ہوئے۔ پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجمالاً اپنے انعام کا تذکرہ ہے اور آخرت سے ترہیب ہے، اور آگے پھر (جس طرح سے آپ نے ترجمے میں سن لیا) مختلف واقعات اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرمارہے ہیں۔

بنی اسرائیل کو فضیلت جزوی حاصل تھی یا کلّی؟

پہلی آیت میں تو وہی بات ہے کہ اپنا احسان جتلایا جارہا ہے، کہ اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا، اور اِس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں جہانوں پر فضیلت دی۔ اَلْعٰلَمِیْنَ سے اگر تو اُس دور کے لوگ مراد لے لیے جائیں، علی الاطلاق سارے جہان مراد نہ ہوں، پھر تو کوئی اشکال نہیں، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے تمام عالمین سے افضل وہی تھے، ایک نبی پر ایمان لائے، وہ صاحب کتاب تھے، اہل حق اُس وقت وہی لوگ سمجھے جارہے تھے، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک وقت تم پر ایسا گزرا ہے کہ تم زمانے میں سب سے اچھے لوگ تھے، اور یہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی، نبی بھیج کر تمہیں ہدایت دی، تمہارے پاس کتاب اتاری، تم اہل حق کا گروہ تھے، یہ اللہ کا کتنا بڑا انعام ہے کہ ایک وقت میں تم سب جہان سے افضل تھے، وہ بات اُن کو یاد دلائی جارہی ہے، تو پھر کوئی اشکال نہیں۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد چونکہ اُن کی وجہِ فضیلت ختم ہوگئی، اب وہ متبع شریعت نہ رہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کے پیروکار نہ رہے، بلکہ آنے والے نبی کا انکار کر کے کافر ہوگئے، اپنی ضد اور عناد کی بناء پر انہوں نے حق کو قبول کرنا چھوڑ دیا، اب وہ افضل العالمین نہیں ہیں بلکہ شر العالمین ہیں، تمام جہانوں میں سے ان کا درجہ بدتر ہوگیا، وہ مبغوض ہوگئے، ملعون ہوگئے، اب اُن کا درجہ عالمین کے اُوپر فضیلت کا نہیں، ہاں! ایک وقت تم پر ایسا گزرا ہے کہ تم سب جہانوں سے افضل ترین لوگ تھے، اور تم پر اللہ کا یہ کتنا بڑا انعام تھا کہ ساری مخلوق میں سے تم افضل تھے...... اور اگر العالمین سے مراد سارے جہان ہی لیے جائیں تو پھر اس میں مفسرین کہتے ہیں کہ توجیہ کرلی جائے گی کہ جزوی فضیلت کے طور پر، یعنی تم اپنی تاریخ میں غور کرو، میں نے تمہارے ساتھ ایسے ایسے معاملات کیے ہیں کہ اُن جیسے معاملات میں نے مخلوق میں سے کسی سے نہیں کیے، اُن معاملات کی بناء پر یعنی اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی خصوصی انعام تمہارے اوپر کیے ہیں اُن کی بناء پر تم سب جہانوں سے افضل ہو، پھر یہ جزوی فضیلت ہے کہ ایسے معاملات جو تمہارے ساتھ کیے گئے دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں کیے گئے، جیسے کہ اُن معاملات کی تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے، اِس کو جزوی فضیلت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جزوی فضیلت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک بات میں کوئی شخص دوسرے سے زائد ہوجائے، لیکن کلی فضیلت کا مدار ہوا کرتا ہے سارے حالات کو دیکھ کر۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو قرآنِ کریم کے حافظ نہیں تھے، اور آپ حضرات

قرآنِ کریم کے حافظ اور قاری ہیں، اِس اعتبار سے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اِس وصف کے اعتبار سے آپ فلاں صحابی سے افضل ہیں، لیکن جہاں تک کلی فضیلت کی بات ہے وہ سارے حالات کی طرف دیکھتے ہوئے ہوگی، لیکن ایک بات کی طرف دیکھتے ہوئے اگر مفضول کو افضل سے اچھا قرار دے دیا جائے تو اس میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ تو اسرائیلیوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کے ایسے معاملات تھے جو عام لوگوں کے ساتھ نہیں، اِس اعتبار سے وہ ساری دنیا سے ممتاز ہیں، پھر یہ جزوی فضیلت کا قول کر دیا جائے گا، اس صورت میں الْعٰلَمِیْنَ کو اگر عام بھی رکھا جائے گا تو اِس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر فساد کی اصل وجہ

''ڈرو اُس دن سے'' اِس سے مراد قیامت کا دن ہے جس کی آگے صفات ذکر کی گئی ہیں کہ اس دن میں کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کر سکے گا۔ اسرائیلی جو بگڑے بیٹھے تھے اور اِن کے اندر جو فساد آیا تھا اُس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ کہنے لگ گئے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ:۱۸) ہم تو اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں اور اللہ کے محبوب ہیں۔ اور یہ ایسا کیوں کہتے تھے؟ اس لیے کہتے تھے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں، بزرگوں کی نسل ہونے پر فخر کرنے لگ گئے تھے، جس طرح آج کل جاہل پیرزادوں کا حال ہے، ایک بزرگ کی نسل میں پیدا ہو گئے، چاہے بیسویں نسل ہی بزرگوں کی کیوں نہ ہو، اور اب وہ نیچے والے چاہے دن رات بندر کتوں کا کھیل ہی رچاتے ہوں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں لہٰذا ہم بخشے بخشائے ہیں، جب اللہ کے دربار میں پیش ہوں گے تو ہمارے وہ بزرگ آئیں گے اور سارا حساب کتاب ٹھیک ٹھاک کرا کے ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔

مجرم کو چھڑانے کے دُنیا میں مروّج مختلف طریقے

اور دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہی معاملہ ہوتا ہے، کہ ایک آدمی اگر جرم کرتا ہے اور وہ اُس جرم کی بناء پر پکڑا جائے تو ایک شخص اہل حکومت کے پاس جاتا ہے اور جا کر کہتا ہے کہ جو ذمہ داری اِس پر عائد ہوتی ہے وہ میں قبول کرتا ہوں، جو جرمانہ آپ اِس کو کریں اور جو حق اِس کے ذمے ثابت ہوتا ہے وہ مجھ سے لے لو اور اِسے چھوڑ دو، تو ایک آدمی دوسرے کی طرف سے جا کے وہ حق ادا کر دیتا ہے اور پکڑا ہوا آدمی چھوٹ جاتا ہے...... اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک آدمی اہل حکومت کی گرفت میں آ گیا، اور کوئی بڑا آدمی سفارشی بن کے چلا گیا، تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل حکومت اُس کی سفارش قبول کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اُس بڑے آدمی کے دباؤ میں ہوتے ہیں، چاہے جرم صحیح ثابت ہو لیکن پھر بھی بڑے آدمی کے دباؤ کی بناء پر اہل حکومت اُس کو چھوڑ دیتے ہیں...... اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے کوئی رشوت لے لو، کوئی پیسے لے لو، اگرچہ متعین حق ادا نہیں کیا جاتا، لیکن ویسے ہی کچھ مٹھی گرم کر دی جاتی ہے، تو بدلے کے طور پر کوئی چیز لے کر اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے...... اور ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ مجرم کے حامی اکٹھے ہو کر زور اور طاقت کے ساتھ چھڑا لیتے ہیں، جلوس نکالا، جیل پر حملہ کر دیا، دیواریں توڑ دیں، دروازے توڑ دیے، اور قیدیوں کو لے بھاگے، آئے دن اخبار میں آپ اس قسم کے واقعات بھی پڑھتے رہتے ہیں، کہ ایک آدمی پکڑا گیا اور دوسرے زبردستی کر کے حملہ آور

ہوکر اس کو چھڑا کر لے گئے۔ تو کسی مجرم کے چھڑانے کے لئے یہی طریقے ہوتے ہیں جو دنیا میں مروج ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں، اور اگر اِن طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی کسی شخص کو حاصل ہو تو اُس کے اندر جرم کی جرأت ہوتی ہے، اگر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری جگہ فلاں ادا کردے گا تو بھی وہ بے باک ہو جائے گا، اگر یہ سمجھتا ہے کہ کچھ دے دلا کے چھوٹ جائیں گے تو بھی وہ بے باک ہو جائے گا، اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا فلاں سفارشی ہے تو بھی وہ شرارتیں کرے گا اور کسی سے نہیں ڈرے گا، اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا جتھا مضبوط ہے، مجھے کون ہاتھ ڈال سکتا ہے، جس دن میں پکڑا گیا اس دن سارے ملک میں ہڑتال ہو جائے گی، جلوس نکل جائیں گے، اور لوگ زبردستی کر کے چھڑالیں گے، تو بھی وہ جری ہو جاتا ہے۔

آخرت میں مذکورہ طریقے کام نہیں آئیں گے

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میری عدالت کو اور اُس دن کو اس طرح نہ سمجھنا جیسے دنیا کے واقعات ہیں، کوئی نفس کسی کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا، اگر آپ نے ایک نماز نہیں پڑھی اور اُس کی بناء پر پکڑے گئے تو آپ کا بھائی، آپ کے دوست، آپ کے بڑے، آپ کے چھوٹے اللہ کے دربار میں جا کر یہ نہیں کہیں گے، کہ اِس کی جو ایک نماز رہ گئی وہ ہمارے نامۂ اعمال سے کاٹ کر اِس کے نامۂ اعمال میں درج کردو اور اِسے چھوڑ دو، کوئی نفس اس طرح سے کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا، جو ذمہ داری تم پر ہے اُس کا جواب تم نے ہی دینا ہے، اس لیے یہ زعم اپنے دل سے نکال دو کہ وہاں کوئی تمہارے کام آجائے گا، اور تمہاری جگہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کوئی دوسرا ادا کر کے تمہیں چھڑا کر لے جائے گا، ایسی بات نہیں ہے...... پھر اگر تم اِس زعم میں مبتلا ہو کہ ہمارے تعلق والے اللہ کے مقرب ہیں، جب وہ اللہ کے سامنے سفارش کریں گے تو اللہ تعالیٰ سفارش رد نہیں کرے گا، وہ سفارش کر کے چھڑا کے لے جائیں گے، یہ بات بھی نہیں ہے، اصول وہاں یہی ہے کہ کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی، باقی! آگے تفصیل دوسری آیات اور روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہوگی کہ کافر کے لئے کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی، یعنی وہاں کافر کی سفارش ہوگی ہی نہیں جو کام آئے، باقی! مؤمن کے لئے سفارش ہوگی، جس کا ذکر قرآنِ کریم کی آیات میں بھی ہے اور روایات میں تو بہت صراحت کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ اور بات صحیح وہی ہوا کرتی ہے جو دین کی پوری باتوں پر نظر رکھتے ہوئے سمجھی جائے، ایک ہی آیت پر مسئلے کا مدار نہیں رکھا جایا کرتا، روایات اور قرآنِ کریم کی دوسری آیات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش تو ہوگی لیکن مقبول بندے کریں گے اور مؤمنین کی کریں گے، اور کافر کے لئے کوئی سفارش کرے گا ہی نہیں، جب کرے گا ہی کوئی نہیں تو قبولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تو یہاں لَا یُقْبَلُ میں نفی کی جارہی ہے قبولیت کی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے، جیسے آیات سے معلوم ہوتا ہے، سرے سے سفارش ہی نہیں ہوگی...... اور ایسے ہی یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی فدیہ دے دو، مثلاً دو سیر سونا لے لو اور ہمیں چھوڑ دو، جو حق ہمارے ذمے لگا ہوا ہے وہ تو ہم نہیں دے سکتے، لیکن یہ فدیہ لے کر چھوڑ دو، تو فدیے کا قصہ بھی وہاں نہیں ہوگا......
اور ایسا بھی ممکن نہیں کہ تمہارا جتھا اور تمہاری پارٹی اکٹھے ہو کر آجائے اور جلوس نکال کر اور نعرے لگا کر نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے اور چھڑا کر لے بھاگے۔ تو مجرم کو چھڑانے کر اور بچانے کے جتنے طریقے ہیں سب کی نفی ہوگئی۔ اُس دن کا

خیال کرو، اس گھڑی کو سوچو جو تمہارے سر پہ کھڑی ہے، اور اُس میں تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور پکڑے جاؤ گے تو تمہیں کوئی چھڑانے والا نہیں ہوگا، تمہارے ذمے جو اللہ کے حقوق ہیں وہ تمہاری جگہ کوئی ادا نہیں کرے گا، وہاں فدیے کا کوئی قصہ نہیں، کوئی تمہاری سفارش کرنے کے لئے نہیں آئے گا، کوئی تمہارے حمایتی کھڑے نہیں ہوں گے، اُس وقت کا تصور کرو اور اپنی آخرت کا خیال کرتے ہوئے حق کو قبول کرو اور باطل کی حمایت چھوڑ دو، جیسے کہا کرتے ہیں کہ ''ڈرو اُس گھڑی سے جو سر پہ کھڑی ہے'' اُس کا یہی مطلب ہے کہ وہاں جا کر پھر بچاؤ کی صورت کوئی نہیں ہوگی، غلط قسم کے خیالات اپنے دماغ سے نکال دو، جو تم اپنے بڑوں پر اعتماد کیے بیٹھے ہو یہ سب قصے غلط ہیں۔ اُس دن کا خیال کرو جس دن میں یہ واقعات پیش آئیں گے۔

فکرِ آخرت کی اہمیت

اور فکرِ آخرت ہی ہے جو انسان کے دل دماغ کو سیدھا کرتی ہے، جس کے ساتھ انسان کے اندر حق کے قبول کرنے کا جذبہ اُبھرتا ہے وہ صرف فکرِ آخرت ہے، جب انسان یہ سوچتا ہے کہ میں اللہ کے سامنے پیش ہوں گا، اور وہاں میرا کچھ نہیں بن سکے گا، میں نے اپنے کردار کی بناء پر چھوٹنا ہے، ورنہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا، تو پھر انسان میں اپنے کردار کو اچھا کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اُس کو یہی فکرِ آخرت کی تلقین کی ہے۔

آگے واقعات کی تفصیل شروع ہوگئی، یہاں صرف فہرست کے طور پر یہ واقعات پیش کیے ہوئے ہیں، اور قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اِن واقعات کی تفصیل آئے گی، تو چونکہ تفصیل آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں آرہی ہے اس لیے ہم یہاں واقعہ پورا مفصل ذکر نہیں کریں گے، آیات کا مفہوم دیکھتے چلے جایئے، مفصل واقعات خود قرآنِ کریم کے اندر مذکور ہیں، سورۂ اَعراف، سورۂ طٰہٰ اور دیگر سورتوں میں یہ واقعات تفصیل سے آتے چلے جائیں گے۔

یہود کے آباء پر کیے ہوئے احسانات موجودہ یہود کو کیوں سُنائے گئے؟

اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: یہ خطاب اگرچہ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود یہودیوں کو ہے، لیکن یہاں سے متعین وہی یہودی مراد نہیں بلکہ قومِ یہود مراد ہے، اور قومِ یہود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو معاملات تھے، چاہے اِن کے آباء و اجداد کے ساتھ تھے، وہ احسان آج جتلایا جاسکتا ہے۔ آپ کتابوں میں یہ فقرہ عام طور پر پڑھتے رہتے ہیں اور آپ کی زبان پر آیا کرتا ہے، اَلنِّعْمَةُ عَلَى الْاٰبَاءِ نِعْمَةٌ عَلَى الْاَبْنَاءِ (تفسیر نیسابوری وغیرہ) کہ اگر کسی کے آباء پر احسان کیا گیا ہے تو بیٹوں پر بھی احسان ہے۔ مثلاً اگر کسی حکومت نے یا کسی فرد نے علمائے دیوبند کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے تو آج ہمیں اُس احسان کو جتلا کر کہا جاسکتا ہے کہ دیکھو! اِس شخص کا تم پر یہ احسان ہے، تمہیں چاہیے کہ اِس کی رعایت رکھو، حالانکہ براہِ راست اُس کا ہم پر احسان نہیں ہوگا، بلکہ ہمارے بزرگوں پر احسان ہے، لیکن اُس کا حوالہ دے کر ہم سے مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ جب اِس شخص کا تم پر احسان ہے تو تمہیں چاہیے کہ اِس کی رعایت رکھو۔ تو تم پر احسان کا مطلب ہوتا ہے کہ تمہاری پارٹی پر، تمہاری جماعت پر، تمہارے مسلک پر اِس شخص کا احسان ہے۔ تو آباء و اجداد پر جو نعمت ہوا کرتی ہے اُس کا حوالہ بھی بیٹوں کو دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ قومی سطح کا ایک احسان ہوتا ہے، جس کا

احساس بعد میں آنے والے ہر فرد کو بھی ہونا چاہیے۔ یہ عام طور پر دنیا میں ایک طریقہ چلا آ رہا ہے، اُسی کے مطابق یہ احسانات اگرچہ اِن کے آباء پر ہیں، اور یہ واقعات اِن کے سامنے بالکل نمایاں تھے، اور یہ اِن واقعات کو جانتے تھے، بلکہ اِن واقعات کو اپنے لیے فخر مانتے تھے، تو اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہے کہ دیکھو! تمہارے اُوپر یعنی تمہاری قومِ یہود پر ہمارے کیسے کیسے احسان ہیں، تو اُن احسانات سے متاثر ہو کر تمہیں سیدھی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

فرعون کو خطرہ پیش گوئی کی وجہ سے تھا، یا ظاہری حالات کو دیکھ کر؟

اس (اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ) میں اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں سارے کے سارے اسرائیلی مصر میں منتقل ہو گئے تھے، اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے تھے، اور مصر کا جو بادشاہ ہوتا تھا وہ فرعون کہلاتا تھا، تو ایک وقت ایسا آیا کہ اُس کو کسی نے پیش گوئی کر دی حالات کے تحت، کہ یہ اسرائیلی تیرا تختہ الٹ دیں گے، اور اقتدار کے زائل ہونے کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس کو حاکم کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا، اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے پھر وہ آگ اور خون کا کھیل بھی کھیلتا ہے، تو فرعون کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا یا تو اِن کی قومی ترقی کو دیکھ کر، کہ یہ جو اتنے بڑھتے جا رہے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو افرادی قوت حاصل ہو جائے، اور افرادی قوت حاصل ہو جانے کے بعد میرا تختہ نہ الٹ دیں، یہ استدلال ظاہری حالات سے ہو سکتا ہے، پھر چاہے کسی نے پیشگوئی نہ بھی کی ہو تو کوئی بات نہیں، کیونکہ پیش گوئی کے قصے کہ کسی نے ایسا کہا تھا اور ایسا ہو گیا، پھر اس میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، کہ یہ پیش گوئی کتنی صحیح نکلی؟ کیا واقعی ایسی کوئی پیش گوئی کی بھی تھی یا نہیں کی تھی؟ ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ اِن واقعات کے ثبوت مہیا کرنے کے لئے ہم زور لگائیں، اگر ایسا ہو گیا ہو تو بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے، کیونکہ پیش گوئی کرنا اور آنے والے حالات کا اندازہ کر لینا، یہ ہوتا رہتا ہے، اور کافر لوگ بھی کچھ اس قسم کے فن جانتے ہیں جن کے ساتھ ظنی طور پر اندازہ لگ جاتا ہے کہ یہ واقعہ یوں ہونے والا ہے۔

آنے والے واقعات معلوم کرنے کے سارے علوم ظنی ہیں

سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ آنے والے واقعات معلوم کرنے کے لئے دنیا کے اندر تقریباً چھتیس علوم مروج ہیں، جن میں مہارت حاصل کر کے لوگ آنے والے واقعات کو معلوم کرتے ہیں، لیکن وہ سارے کے سارے ظنی ہیں، اُن میں سے قطعی کوئی نہیں، قطعی ذریعہ صرف وحی کا ہے جو اللہ کی طرف سے آ جائے، جس میں یہ کہہ دیا جائے کہ ایسا ہو جائے گا، یہ ہے قطعی جس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے، باقی! فنی قواعد کے تحت غیبی امور کو لوگ معلوم کرتے ہیں، اور وہ کبھی صحیح بھی نکل آتا ہے کبھی غلط بھی ہوتا ہے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی کوئی قید نہیں ہے، ستاروں کے اندر غور و فکر کر کے لوگ آنے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں، دست شناسی کے ساتھ آنے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں، رمل کے ذریعے سے کرتے ہیں، جفر کے ذریعے سے کرتے ہیں، کشف ہے، الہام ہے، اِسی طرح سے اور بہت سارے علوم ہیں جن میں مہارت پیدا کر لینے کے ساتھ آنے والے واقعات کا کچھ انعکاس انسان کے قلب پر واقع ہو جاتا ہے، ایسا ہوتا رہتا ہے، لیکن وہ سب ظنی ہیں،

کسی پر یقین نہیں کیا جا سکتا، کبھی بات صحیح بھی ہوگی اور کبھی غلط بھی ہوگی۔ اس لیے اگر کسی نجومی نے آنے والے حالات کے متعلق یہ پیش گوئی کر دی ہو تو بھی کوئی بڑی بات نہیں، اور پھر وہ صحیح بھی نکل آئے، ایسا ہو سکتا ہے، لیکن یہ چیزیں یقینی نہیں ہوتیں، کبھی صحیح نکلے گا اور کبھی غلط ہوگا، قطعی ذریعہ جس کے اُوپر یقین کیا جا سکتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، ورنہ ولی کو بھی اگر الہام ہو جائے تو اُس پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا ہو جائے گا، اُس میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔

اور یہ ظاہری بات جو میں کہہ رہا ہوں اس میں کوئی شبہ ہی نہیں، کہ وہ آخر وقت کا حاکم تھا، بادشاہ تھا، اور بادشاہوں کا دماغ بادشاہوں جیسا ہوتا ہے، وہ حالات پر نظر رکھا کرتے ہیں، جب اس نے دیکھا کہ ایک غیر قوم یہاں آباد ہے، اور اِن کے بارہ خاندان ہیں، اور دھڑا دھڑ بچے پیدا ہو رہے ہیں اور افرادی قوت بڑھ رہی ہے، اگر ان کی رفتار اسی طرح سے رہی تو کہیں میرا تختہ نہ اُلٹ دیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے، اور خود بادشاہ بے اولاد تھا، یہ سیدھی سی بات ہے، آپ جس وقت دیکھیں گے، غور کریں گے، اور ارد گرد نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے، امیروں کی اتنی نہیں ہوتی، اس کی وجوہ چاہے کچھ بھی ہوں لیکن واقعہ یہی ہے کہ جتنے لوگ عیاش ہوتے ہیں اور جتنے لوگ آرام طلب قسم کے ہوتے ہیں، جن کی زندگی لذات پرستی میں گزرتی ہے، اُن کے ہاں زیادہ اولاد نہیں ہوتی، غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے۔ اب اسرئیلیوں کے بارہ خاندان جو وہاں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے، اُن میں دھڑا دھڑ اولاد چل رہی تھی، اور فرعون کے خاندان میں اتنی پیداوار نہیں تھی، تو یہ خطرہ محسوس کر لے کہ اب افرادی قوت اِن کی بڑھ رہی ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ اس افرادی قوت کے نتیجے میں کسی دن میرا تختہ الٹ دیں، یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کے لئے ہمیں کوئی ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ظاہری حالات کے مطابق ہے اور سیاست دان اس قسم کی باتیں سوچا کرتے ہیں، اور جو اقتدار پہ ہوتا ہے وہ اس قسم کی نظر رکھا کرتا ہے کہ کون میرے اقتدار کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ تو اگر یہ صورتحال پیدا ہوگئی ہو کہ فرعون ان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے مرعوب ہوگیا، کہ اِن کی افرادی قوت اگر اسی طرح سے بڑھتی چلی گئی تو ایک دن تختہ الٹ دیں گے، تو یہ عین سیاستدانوں کے مزاج کے مطابق بات ہے، اور وہ ایسے ہی حالات پر نظر رکھا کرتے ہیں، پھر دوسری جماعت کو توڑنے کے لئے، کمزور کرنے کے لئے، اور اُن کے اندر افراتفری پیدا کرنے کے لئے، کوئی نہ کوئی خفیہ راستے وہ تلاش کرتے ہیں۔

انگریز فرعون کے کردار سے بڑھ گئے

اور وہ زمانہ چونکہ ترقی یافتہ زمانہ نہیں تھا، اگر اس قسم کا ترقی یافتہ زمانہ ہوتا جیسے آج ہے، تو زبردستی کوئی خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ہی بنا لیا جاتا، ایسے ٹیکے لگانے شروع کر دیتے کہ اولاد نہ ہو، گولیاں دینی شروع کر دیتے، خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام چلتا، لیکن وہ زمانہ ایسا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ یا کوئی ایسی سکیم بنائی جاتی کہ لوگوں کے دل دماغ پلٹ دیے جاتے، اور وہ فرعون کے گن گاتے، اس قسم کی تعلیم اور تربیت کا انتظام بھی اُس دور میں نہیں ہو سکتا تھا، جیسے کہ اکبر الہ آبادیؒ نے انگریز کے طرزِ تعلیم پر چوٹ کی ہے۔ انگریز نے یہاں رہتے ہوئے فرعون سے کم کردار نہیں ادا کیا، لیکن اس نے طریقہ ترقی یافتہ اپنایا کہ قتل کرنے کی

بجائے دل دماغ بدل دیا، کہ رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی لیکن دل اور دماغ کے اعتبار سے انگریز، ہندوستانیوں کی اولاد کو اُس نے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنالیا، اور اِسی مطیع اور فرمانبردار بنانے کی وجہ سے سو سال اِس علاقے میں حکومت کر گیا۔

برصغیر سے انگریز کے قدم کس نے اکھیڑے

یہ تو اگر چند درویش نہ ہوتے اِس کے ساتھ ٹکرانے والے تو اِس کے قدم کہاں ہلتے، اِس کو تو ان درویشوں کی آہیں لے گئیں، اور اِنہی کی کوششیں تھی جو انقلاب لائی ہیں، سب سے پہلے انقلاب ہندوستان میں آیا ہے، تب جا کے دنیا کے مختلف ملک دھڑا دھڑ آزاد ہونا شروع ہوئے، اور یہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا اُس وقت تک سارے مشرقِ وسطیٰ پر انگریزوں کا تسلط رہے گا اور کسی کی جان نہیں چھوٹے گی، یہاں سے قدم اکھڑے تو پھر اکھڑتے ہی چلے گئے، اب وہ صرف اپنے اُس چھوٹے سے ملک کے اندر بند ہو گئے، باقی ہر جگہ سے سمٹ گئے، تو اُن کے قدم ہندوستان سے ہی اکھڑنے شروع ہوئے۔

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

تو اکبر الٰہ آبادیؒ نے اِس طرزِ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے ایک بات کہی، اور بڑی پیاری بات کہی، اکبر کہتا ہے (یہ خود گریجویٹ ہے، جج تھا، اس لیے اندر کا آدمی ہے، بات صحیح کہتا ہے) کہتا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

کہ فرعون بھی اگر کالج کھول دیتا تو اُس کو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اِس قوم کے بچوں کو قتل کرتا، بچے یہ لوگ جنتے اور فوج بنتے فرعون کی، جس طرح سے یہاں انگریز نے کیا کہ بچے ہندستانی جنتے، لیکن معاون انگریز کے، رنگ کے کالے، نسل ہندوستانی، لیکن دل دماغ انگریزوں جیسا۔ اب اِس بات پر فخر کرتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پیشاب کیا جائے، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ چلتے پھرتے ہوئے کھایا جائے، اِن سے وجہ پوچھی جائے تو سوائے اس کے کہ اِن کے آقا کا طریقہ ہے کوئی وجہ اِن کے سامنے نہیں۔ تو اتنا مطیع اور فرمانبردار ہو گئے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی عادات کے اندر بھی اُن کا طریقہ اپنالیا، یہ تو بنے بنائے بچے مل گئے، الٹا اپنے لئے فوج مہیا ہو گئی، اس فوج نے اگر ضرورت پیش آئی تو کعبۃ اللہ پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہیں کیا، اسی فوج نے جہاں ضرورت پیش آئی اپنوں کے ساتھ غداری کرنے میں بھی کوئی دریغ نہیں کیا، اس لیے اکبر کہتا ہے کہ فرعون سے یہ غلطی ہوئی جو بچوں کو قتل کر کے بدنام ہوا، اگر اُس کو بھی یہ کالج سسٹم سوجھ جاتا اور وہ بھی کالج کھول لیتا تو اسرائیلیوں کے بچے، کام فرعونیوں کے آتے۔ کتنی بڑی چوٹ ہے یہ کالج کے نظامِ تعلیم پر، کہ انگریز نے قوم کو قتل کر کے رکھ دیا، لیکن ظاہری طور پر گلے پر چھری نہیں چلائی، نظامِ تعلیم کے ساتھ بدل کے رکھ دیا، اپنے دین سے نفرت ہو گئی، حب الوطنی ختم ہو گئی، قومی جذبہ ختم ہو گیا، انگریز کے گن گانے لگ گئے اور اسی کے معاون بن گئے، تو کتنی بڑی چالاکی اور کتنی بڑی چستی ہے۔ اور فرعون نے بچے قتل کئے تو بھی کچھ نہ بنا اور بدنام علیحدہ ہوا، تو یہ

چونکہ ترقی یافتہ صورتیں تھی نہیں، تو اُس نے اِس قوم کی افرادی قوت کو ختم کرنے کے لئے یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا۔ چونکہ وہ محکوم تھے، غلام تھے، جس گھر کے اندر بچہ پیدا ہوتا وہ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر اٹھوالیتا اور اُسے قتل کروا دیتا۔

فرعون نے لڑکیوں کو قتل کیوں نہیں کرایا؟

چونکہ انقلاب لانے کا خطرہ مردوں سے ہی ہوتا ہے، اور پُرانے زمانے میں تو خاص طور پر اس قسم کے سیاسی امور میں دلچسپی لینا، لڑائی بھڑائی میں لگ جانا، اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا، کسی کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنا، یہ کام ہی مردوں کا تھا، اب تو ماشاءاللہ! حواء کی بیٹیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، کسی کا اقتدار الٹنے کے لئے اب یہ بھی جلوس نکالتی ہیں، جلسے کرتی ہیں، کرسی کے لئے یہ بھی جنگ کرتی ہیں، کتنے ملک آپ کے سامنے پچھلے دنوں میں ایسے گزرے جہاں حکومت ہے ہی عورتوں کی۔ اور گھریلو زندگی پر تو قبضہ ماشاءاللہ! بیگمات کا ہو ہی گیا، اُس کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ تو اب یہ حواء کی بیٹیوں کا زمانہ آ گیا، اگر یہ زمانہ اُس وقت ہوتا کہ لڑکیاں بھی یونہی جلوس نکالتیں تو فرعون اِن کو بھی نہ چھوڑتا، اِن کو بھی مروا دیتا، لیکن اس نے لڑکیوں کو کچھ نہیں کہا، کیونکہ اُس کو پتہ تھا کہ اقتدار پہ قبضہ کرنا لڑکیوں کا کام نہیں ہے۔ اور پھر اگر لڑکیوں کو بھی مار دے اور لڑکوں بھی مار دے تو آخر گھروں میں جو کام کرنے کی ضرورت ہے وہ کون کرے گا، اُن کو گھروں میں خادمہ رکھتے، اُن سے کام لینا ہوتا تھا، اس لیے لڑکیوں کو قتل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، صرف لڑکوں کو قتل کرتا تھا، نسل کشی لڑکوں کی وساطت سے ہوئی اور لڑکیوں کو خدمت کے لئے رکھا۔

لڑکیوں کو زندہ رکھنے میں غیرت کو بھی چیلنج تھا

چنانچہ مفسرین کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ جہاں ذبح کا ذکر کیا وہاں تو اَبناء کا لفظ بولا کہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتا تھا، بیٹا بولنے میں باپ کی شفقت پدری ابھرتی ہے، اور آگے جہاں زندہ چھوڑنے کا ذکر آیا وہاں نساء کا لفظ بولا جو عام طور پر بالغ عورتوں کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہاری لڑکیوں کو چھوڑتا جو جوان ہو کر اُن کے کام آتیں، اور اِس میں غیرت کو چیلنج ہے کہ وہ ظالم ایسا تھا کہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتا تھا جو جوان ہو کر اُن کے خاندان میں کام آتیں، یہ تو اس نے تمہارا حال کر رکھا تھا، لڑکوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اور لڑکیوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا، اس طرح سے تم اُس مصیبت اور عذاب میں آئے ہوئے تھے، اور ہم نے تمہیں نجات دی، اِس احسان کو تم بھول گئے ہو؟ کتنا بڑا ایک قومی احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا تھا، اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: جو تمہیں بُرا عذاب پہنچاتے تھے، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو، نساء کا ترجمہ عورتیں، یوں نہیں کہا يَسْتَحْيُوْنَ بَنَاتِكُمْ کیونکہ بنت کا لفظ تو ایک چھوٹی بچی پر بھی بولا جائے گا، لیکن وہ چھوٹی بچی کو جو قتل نہیں کرتا تھا وہ بنتی تھی پوری عورت، اور اُن کا زندہ چھوڑنا جبکہ ساتھ سرپرستی کرنے والے اپنے خاندان کے آدمی نہ ہوں یہ غیرت کے خلاف ہے، گویا کہ عورتوں کو وہ گھروں میں کام میں لاتے تھے اس لیے زندہ چھوڑتے تھے، اور تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے، تو یہ بات غیرت کے بھی منافی تھی، اور نسل کشی کے اعتبار سے جن ماں باپ کے بیٹے قتل ہوتے ہوں گے اُن کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ اتنا بڑا عذاب تھا

جس کو سُوْٓءَ الْعَذَابِ کے ساتھ تعبیر کیا، ہم نے تمہیں اُس عذاب سے نجات دی۔ اور اِس میں مصیبت تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بہت بڑی، یا اِس نجات میں انعام تھا، یا اِس مجموعی حالات میں آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بڑی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

بنی اسرائیل پر دُوسرا اِحسان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ: واقعات کے سلسلے میں یہ دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا، یہ اُس وقت پیش آیا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اسرائیلیوں کو لے کر راتوں رات مصر چھوڑ جائیے اور شام کی طرف چلے جائیے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رات کو اپنی قوم کے ساتھ سفر شروع فرمادیا، اور فرعونیوں کو پتہ چلا تو فرعون اپنی فوجیں لے کر اِن کے پیچھے ہولیا، جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں سمیت سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے تو پیچھے سے فرعون کی فوجیں بھی نظر آنے لگ گئیں، تو قوم نے اُس وقت گھبرا کر کہا تھا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ: بیشک ہم پکڑ لیے گئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (سورۂ شعراء: ۶۲) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ فرعون اور فرعون کی فوجیں ہمیں پکڑ لیں، میرے ساتھ میرا اللہ ہے، وہ مجھے ضرور راستہ دے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا کہ اپنا عصا سمندر کی سطح پر مارو، جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی سمندر کی سطح پر ماری تو سمندر پھٹ گیا، کہتے ہیں کہ اس میں بارہ راستے بن گئے...... اسرائیلیوں کے چونکہ بارہ قبیلے تھے تو انتظامی امور میں ان کو علیحدہ علیحدہ ہی رکھا جاتا تھا، پتھر سے چشمے جب پھوٹے تو بھی بارہ ہی پھوٹے، کہ ہر قبیلہ اپنے علیحدہ علیحدہ چشمہ پر قبضہ کرلے اور علیحدہ علیحدہ چشمے سے پانی لے، تاکہ آپس میں یہ لڑیں جھگڑیں نہیں، کیونکہ ایک دوسرے کے ساتھ یہ رواداری نہیں کرتے تھے، معمولی معمولی باتوں میں آپس میں لڑائی فساد ہوجاتا تھا، اس لیے انتظامی امور میں اِن کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا...... تو بارہ راستے بن گئے، پانی اس طرح سے کھڑا ہوگیا جس طرح سے دیواریں ہیں، اور درمیان میں راستے کھل گئے، قرآنِ کریم میں ہی لفظ آئے گا فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (سورۂ شعراء: ۶۳) پانی کا ہر ٹکڑا منجمد ہوگیا، دیواریں کھڑی ہوگئیں، بڑے بڑے ٹیلوں اور پہاڑوں کی طرح پانی نمایاں ہونے لگ گیا، اور اندر سے راستے بن گئے، موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سمیت اُن راستوں میں داخل ہوگئے، اور فرعون جس وقت اپنی فوجوں کو لے کر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سمندر میں راستے بنے ہوئے ہیں تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ گزرنے کی جگہ ہے وہ بھی اپنی فوجوں سمیت اُنہی سڑکوں میں پیچھے ہولیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ اسرئیلیوں کا آخری آدمی سمندر سے باہر ہوا، اِتنے میں فرعونیوں کا آخری آدمی سمندر میں داخل ہوگیا، یعنی دونوں میں اتنا فاصلہ تھا کہ آگے آگے اسرائیلی جارہے تھے پیچھے پیچھے فرعونی، اسرائیلوں کے آخری آخری افراد جس وقت سمندر سے باہر نکلے تو فرعونیوں کی فوج کا آخری آخری حصہ سمندر کے اندر آگیا، جس وقت اندر آگیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگیا اور دریا آپس میں مل گیا، سمندر کا پانی اکٹھا ہوگیا، اب اسرائیلی سمندر کے کنارے پر کھڑے نظارہ دیکھ رہے ہیں، اور فرعونی جتنے تھے سارے کے سارے ڈوب گئے، اور غوطے کھا کھا کے وہیں غرق ہوگئے۔

ظاہری ہیبت والے آدمی کی موت کا جلدی یقین نہیں آتا

فرعون کی ہیبت چونکہ اسرائیلیوں پر بہت زیادہ تھی، اُن کو ظاہری طور پر یہ یقین آنا مشکل تھا کہ فرعون بھی ڈوب گیا، اور فرعون بھی ڈوب سکتا ہے؟ جس طرح سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ بھٹو کو (۴/اپریل ۱۹۷۹ء میں) پھانسی ہوئی، اور لوگوں کو اَب تک یقین نہیں آتا کہ اُس کو پھانسی دے دی گئی، وہ کہتے ہیں کہ بھٹو اور پھانسی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پہلے کہتے تھے اِس کو پکڑ کوئی نہیں سکتا، جب پکڑا گیا تو کہتے ہیں کہ لو، یہ تو ایسے ہی کوئی سیاسی چال ہے، ضیاء الحق تھوڑے دنوں کے بعد چھوڑ دے گا، اور جب مقدمہ ہوگیا تو کہتے ہیں لو! ہائیکورٹ سزا دے ہی نہیں سکتا، ہائیکورٹ چھوڑ دے گا، جب ہائیکورٹ نے سزا دے دی تو کہتے ہیں کہ بس سپریم کورٹ میں اپیل ہوگی اور چھوٹ جائے گا، اور جب اپیل میں بھی خلاف فیصلہ ہوگیا تو کہتے ہیں بیرونی دنیا کا دباؤ پڑے گا، ممکن ہی نہیں کہ بھٹو کو پھانسی دے دی جائے، اور جس وقت غریب لٹکا ہی دیا گیا اب اُس کے بعد بھی کہتے ہیں کہ یہ تو ایسے ہی ڈھونگ ہے، پھانسی تو کسی اور کو دی ہے، اس کو تو کہیں چھپایا ہوا ہے، وہ کہیں باہر ملک میں چلا گیا ہے، آئے دن اِس قسم کی افواہیں اڑتی رہتی ہیں کہ اِس کو پھانسی دی ہی نہیں گئی۔ جب ایک آدمی لوگوں کے اُوپر کچھ زیادہ ہی اپنی ہیبت ڈال دے تو لوگوں کو اُس کی موت کا جلدی سے یقین نہیں آیا کرتا، پچھلی جنگ عظیم میں ہٹلر (م ۱۹۴۵ء) جو جرمن کا صدر تھا اس نے یورپ کو جو ناچ نچوایا، تو امریکی اور برطانوی جتنے بھی اُس کے خلاف تھے ان کو اتنا پریشان کیا کہ وہ ہٹلر اُس جنگ میں مارا گیا، لیکن برسہابرس تک یورپ کو یقین نہیں آیا کہ ہٹلر مر گیا، وہ ہر وقت اُس کے نام سے دھڑکتے تھے کہ ابھی بھی وہ کہیں چھپا ہوا ہے، پتہ نہیں کس وقت نکل آئے۔ پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد اُن کو یقین آیا ہوگا کہ وہ مر گیا، ورنہ بہت مدت تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ زندہ ہے، اور کہیں چھپا ہوا ہے، اور خطرہ ہے کہ پھر وہ نکلے گا اور پھر کوئی فتنہ کھڑا کردے گا۔ جب کسی آدمی کی ہیبت زیادہ ہوجایا کرتی ہے یا اُس کی عظمت قلوب پر زیادہ اثر انداز ہوجاتی ہے تو پھر اُس کی موت کا جلدی یقین نہیں آیا کرتا۔

فرعون کی لاش کو سمندر سے باہر کیوں پھینکا گیا؟

تو اسرائیلیوں کا بھی کچھ ایسے ہی حال تھا، کہ فرعون کے متعلق اِن کو یقین آنا مشکل تھا کہ فرعون بھی ڈوب سکتا ہے؟ اور وہ بھی پانی میں مرجائے گا؟ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سارے فرعونیوں میں سے ایک فرعون کی لاش کو سمندر سے باہر پھینکا، جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ یونس میں آئے گا فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (آیت:۹۲) اُس کی لاش کو نجات دی گئی، اُس کے بدن کو باہر پھینکا گیا، تاکہ اسرائیلیوں کو بھی یقین آجائے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرعون کی ذلت کا سامان بھی ہوجائے، اس وقت تک فرعون کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، اس کے ڈھانچے کا فوٹو بھی آیا تھا، گوشت تو چہرے سے جھڑ گیا ہے، ہڈیوں کا ڈھانچہ اِس وقت تک بھی موجود ہے، اس طرح سے اُس کی ذلت کا نشان بھی ہوگیا اور اسرائیلیوں کے لئے یقین کا باعث بھی ہوگیا، اس لیے قرآنِ کریم جس وقت احسان جتلاتا ہے تو جہاں یہ احسان جتلاتا ہے کہ ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پھاڑا اور

تمہیں نجات دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا، آگے لفظ ہیں وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ: ہم نے فرعون کو اور فرعون کے لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق، تم دیکھ رہے تھے، یہ سارا نظارہ تم نے دیکھا۔

احسانات کو ذکر کرنے کا مقصد

تو کتنا بڑا اللہ کا احسان ہے، کہ ایک معجزانہ طریقے سے اتنے بڑے دشمن کو پانی میں غرق کر دیا گیا، اور ایک معجزانہ طریقے سے ہی تمہارے لیے سمندر کے اندر راستے بنائے گئے، تمہیں تو چاہیے تھا کہ ان احسانات کو یاد کرتے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں لگے رہتے، کبھی اُس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرتے۔ قومی طور پر اللہ تعالیٰ کے تم پر اس قدر احسانات ہیں کہ تمہاری طرف سے نافرمانی ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ کا یہی مفہوم ہے کہ اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، یعنی تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ سارا کھیل کھیلا گیا، کہ تمہارے سامنے دریا کو پھاڑا گیا، تمہیں دریا میں سے گزارا گیا، اور فرعونیوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا گیا۔ اس احسان کو یاد کرو، جب اس قسم کے احسانات کو یاد کرو گے تو تمہارے اندر اطاعت کا مادہ پیدا ہوگا۔ یہ اس واقعہ کا حاصل ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ واقعات کی کچھ فہرست دی جا رہی ہے، ان کی تفصیل خود دوسری سورتوں میں آئے گی، سورۂ شعراء اور سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ مفصل آئے گا۔

توراۃ کے نزول کا واقعہ

اگلا واقعہ...... وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً: جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چالیس راتوں کا، پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد، وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ: اور تم بہت ہی ظلم ڈھانے والے تھے، تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، یا تم مشرک ہو گئے، کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، ظلم کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ حق تلفی کو کہتے ہیں، اور جس وقت کوئی شخص کسی فرد کو اللہ کی ذات وصفات میں شریک کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے حق کو تلف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ عظیم الشان کا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واحد قرار دیا جائے اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس لیے اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا۔ اِس واقعہ کی تفصیل بھی آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آئے گی، کہ جس وقت اسرائیلی نجات پا گئے اور دشمن سے چھوٹ گئے تو ان کو کچھ اطمینان ہوا، اس لیے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اب ہمارے سامنے کوئی قانون آجائے، شریعت آجائے، تو ہم اُس قانون کی پابندی کریں گے اور اُس کے مطابق عمل کریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قانون مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کوہِ طور پر آؤ اور آکر تیس دن کا اعتکاف کرو، اُس کے بعد آپ کو تورات دی جائے گی، تیس دن کے لئے بلایا ثَلٰثِيۡنَ لَيۡلَةً۔ وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ پھر ہم نے اُن تیس کا تتمہ دس کو بنا دیا، فَتَمَّ مِيۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً (سورۂ اعراف: ۱۴۲) اُس کے رَبّ کا جو وعدہ چالیس رات کا تھا وہ پورا ہو گیا، تام ہو گیا، یعنی پہلے تیس راتیں، اور اُس کے بعد دس راتیں اُس کا تتمہ بنا دی گئیں، تیس روزے رکھے، اعتکاف کیا، تیس دن

کے بعد تورات کا نزول شروع ہوا، دس دن میں وہ پورا ہوا، چالیس دن پورے ہوئے تو تورات مکمل مل گئی، یہ تورات موسیٰ علیہ السلام پر لکھی لکھائی الواح کی صورت میں نازل ہوئی، اور موسیٰ علیہ السلام وہ تورات لے کر قوم کی طرف آئے۔

بچھڑے کی پوجا کا واقعہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر جا رہے تھے تو پیچھے انتظامی امور میں حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا گئے تھے (واقعہ مفصل ذکر کرنا مقصود نہیں ہے، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعراف میں یہ واقعہ مفصل آئے گا) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد ایک اسرائیلی نے جس کو قرآنِ کریم نے سامری کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس نے سونے چاندی کے زیورات ڈھال کر جس طرح سے سنارے کھلونا بنایا کرتے ہیں، اُس نے ایک بچھڑا بنا کر کھڑا کر دیا، اور کسی وجہ سے (جس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں آئے گی) اُس کے اندر کچھ ایسے حیات کے آثار پیدا ہو گئے کہ لَهٗ خُوَارٌ: وہ اِس طرح سے بھاں بھاں کرنے لگ گیا جس طرح سے گائے کا بچھڑا بولا کرتا ہے، بس اتنی سی بات تھی، فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ: خوار کہتے ہیں گائے کی آواز کو، گائے کی آواز کی طرح اُس میں آواز پیدا ہو گئی، اور اس نے ساتھ ہی نعرہ لگا دیا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى: تمہارا اور موسیٰ کا خدا یہی ہے، فَنَسِیَ (سورۂ طٰہٰ: ۸۸) موسیٰ بھول گیا جو طور پر ملاقات کرنے کے لئے چلا گیا۔ تو هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى کا نعرہ سامری نے لگایا بچھڑے کے بنانے کے بعد، جب اُس میں گائے جیسی آواز پیدا ہو گئی۔ تو بہت سارے لوگ اُس کی اِس بات سے متاثر ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ یہ فرعون کے جو زیرِ اثر رہے تھے، اور فرعونیوں کے طریقے میں گاؤ پرستی بھی تھی یعنی گائے کی پوجا کرنا، جیسے اِس وقت بھی ہندو گائے کو پوجتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے سے ہی لوگوں کا نظریہ گاؤ کے متعلق کچھ تبرک کا رہا ہے، اِس وقت بھی ہندوستان کے ہندو جتنے ہیں سب گاؤ کو معبود سمجھتے ہیں، یہ ان کے نزدیک متبرک جانور ہے، تو اسرائیلی بھی فرعونیوں کی تہذیب سے متاثر تھے اور ان کے دل میں بھی گاؤ کی عظمت تھی، اس لیے جونہی گاؤ کی شکل سامنے آئی اور اس قسم کا کرشمہ اُس میں نمایاں ہوا تو بہت جلدی انہوں نے اُس کی عظمت کا اعتراف کر لیا۔

مذکورہ واقعے میں اسرائیلیوں کے تین گروہ اور ان کا انجام

یہ اسرائیلی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے، بعض ایسے تھے جو شدت کے ساتھ ممانعت کرنے والے تھے، اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ مل کر انہوں نے سمجھایا، سب کچھ کیا، یعنی شرک میں مبتلا بھی نہیں ہوئے اور مشرکین کو روکا بھی۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے سکوت اختیار کر لیا، جس طرح سے صلح کلیے ہوتے ہیں کہ ہر کسی کے ساتھ ہی صلح رکھو، کیا کسی سے بگاڑنی ہے، نہ اُن کے ساتھ ہوئے نہ اِن کے ساتھ ہوئے، خاموشی اختیار کر لی۔ اور ایک طبقہ تھا جو سامری کے ساتھ مل کر بچھڑے کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا، اور اِس شرک کے اندر مبتلا ہو گیا۔ اِس واقعہ کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر دے دی اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ (سورۂ طٰہٰ: ۸۵) کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُس وقت تو چنداں غصہ نہ آیا، لیکن جس وقت واپس آئے اور آ کر قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو پھر جس قسم کے غصے کا اظہار کیا وہ نقشہ اللہ تعالیٰ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعراف میں کھینچیں گے، کہ واپس

آنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح سے غصے کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور اپنی قوم کے ساتھ معاملہ فرمایا۔ بہرحال یہ واقعہ پیش آگیا، پیش آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام آئے، تنبیہ کی، اور اُس بچھڑے کو بھی مارا، ہلاک کیا، ریزہ ریزہ کیا، اور اس کو سمندر میں بہادیا اور ہواؤں میں اڑادیا، اس طرح سے اُس کو نیست و نابود کردیا، سامری بھی دنیوی عذاب میں مبتلا ہوگیا، وہ پاگل سا ہوگیا تھا، اور آبادیوں سے بھاگا پھرتا تھا، اُس کے قریب کوئی آتا تو وہ کہتا تھا لا مِساس لا مِساس: مجھے ہاتھ نہ لگانا، مجھے ہاتھ نہ لگانا، وحشی جانوروں کی طرح وہ اِس طرح پاگل سا ہوکر بھاگنے پھرنے لگ گیا، باقی قوم کو تنبہ ہوا تو وہ بھی تائب ہونے لگی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیتِ توبہ کا قانون یہ اترا کہ یہ جو مشرک ہوگئے تھے، جنہوں نے شرک کیا ہے اِن کو قتل کیا جائے، اِن کو قتل کرنا قومی سطح پر توبہ ہے، یعنی اِن کی توبہ تب قبول ہوگی کہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں اور دوسرے لوگ اِن کو قتل کریں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لکھنے کے مطابق قتل کرنے کا حکم اُن کو دیا گیا جنہوں نے سکوت اختیار کیا تھا، تاکہ من وجہ اُن پر بھی ایک تنبیہ ہوجائے، اور اُن کو قتل کیا گیا جنہوں نے اِس شرک کا ارتکاب کیا تھا، یعنی یہ قتل ہونا توبہ قرار دیا گیا، جس طرح سے ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا یہی ہے کہ اگر لفظی طور پر توبہ کی جائے تو قبول نہیں، بلکہ ساتھ جان دینی پڑتی ہے، تب جاکر توبہ قبول ہوتی ہے۔ جیسے شادی شدہ آدمی زنا کرتا ہوا پکڑا جائے اور اس پر شہادتیں گزر جائیں تو اس کی قبولیتِ توبہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت کے لئے پیش کردے، جس وقت اُس کو رجم کیا جائے گا اور جان سے مار دیا جائے گا تو یہ اس کی ایک توبہ ہے جو قبول ہوگئی، آخرت میں اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردیں گے۔ اسی طرح قاتل عمداً اگر پکڑا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا توبہ کرلینا اور استغفار کرلینا کافی نہیں ہے، بلکہ اُس کو قتل کیا جاتا ہے، یہی اس کی توبہ ہے، کہ جب وہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کردے گا اور اُس کی جان چلی جائے گی تو یہی اس کے لئے قبولیتِ توبہ کا نشان ہے۔ اسی طرح اِن مرتدین کے لئے بھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں مرتد ہوگئے تھے، شرک میں مبتلا ہوگئے، اِن کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اِن کو قتل کیا گیا، بہت سارے لوگ مارے گئے، تو قومی سطح پر اِس جرم کا جو ارتکاب ہوا تھا اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ معاف کردیا۔ یہاں دونوں باتیں جتائی جارہی ہیں، کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کتاب دینے کے لئے بلایا اور تم پیچھے یہ حرکت کر بیٹھے، اور اس حرکت کرنے کے بعد پھر قومی سطح پر ایک جرم کا جو ارتکاب کیا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے معاف کیا، تمہاری توبہ قبول کی، جس کی صورت یہ تھی کہ تم سے ایک دوسرے کو قتل کروایا گیا۔ اِس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اور تفصیل دوسری سورتوں میں آرہی ہے۔

تبلیغی جماعت اور صوفیہ کے چلے کا ثبوت

''یاد کیجئے! جس وقت کہ وعدہ کیا ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا'' یہاں پورا عدد ذکر کردیا گیا، دوسری جگہ آئے گا کہ پہلے تیس راتیں تھیں، پھر اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (سورۂ اعراف: ۱۴۲) دس راتوں کو اُن کا تتمہ بنادیا گیا تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ کا چالیس راتوں والا وعدہ پورا ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو چالیس راتیں وہاں طور پر گزاری تھیں تو صوفیہ کرام کے ہاں اصلاحِ باطن کے لئے جو چلہ کشی کا رواج ہے یہ واقعہ بھی اُس کے لئے ایک اصل بنتا ہے، اور تبلیغی جماعت والوں نے جو چلہ رکھا ہے اُس کے لئے

بھی یہاں سے ایک تائید حاصل ہوتی ہے، کہ حالات کے بدلنے کے لئے چالیس دن تک اپنے ماحول کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماحول میں چلے جانا، جس میں انسان کی طبیعت میں یکسوئی پیدا ہو جائے، یہ روحانی کیفیات حاصل کرنے کے لئے ایک بہت بڑا مجرب ذریعہ ہے۔ چلہ کشی اور خلوت نشینی کے لئے اسی قسم کے واقعات دلیل ہیں۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے بھی نبوت سے قبل غارِ حراء کے اندر یہی چلہ کشی کی، وہیں خلوت اختیار کی، تو اس طرح تنہائی میں بیٹھ کر جو غور و فکر کیا جاتا ہے، انسان اپنے حالات کو سوچتا ہے، یا اپنے ماحول سے کٹ کر ایک نیا ماحول جو اختیار کرتا ہے، اکثر و بیشتر چالیس دن تک اگر ان حالات کی رعایت رکھ لی جائے تو انسان کی طبیعت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے چلہ کھنچوایا، اُس کے بعد یہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتری۔ ''پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو'' مفعول ثانی محذوف ہے، جیسے ترجمے میں ظاہر کر دیا گیا تھا ''بنالیا تم نے بچھڑے کو معبود'' مِنۡۢ بَعۡدِهٖ: مِنۡۢ بَعۡدِ ذَهَابِهٖ، موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد، وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ اور تم بہت ظلم ڈھانے والے تھے۔ ''پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اِس کے بعد تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ، تاکہ تم احسان مانو۔''

''فرقان'' کا مفہوم و مصداق

''اور یاد کیجئے! جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور فرقان دی۔'' فرقان کے متعلق میں نے عرض کر دیا تھا کہ فارِق بین الحق والباطل چیز کو کہتے ہیں، جس کا مصداق خود یہ کتاب بھی ہو سکتی ہے، تو پھر یہ عطف تفسیری ہے کہ کتاب ہی فرقان ہے، کیونکہ اس کتاب کے ذریعے سے حق و باطل کا فیصلہ ہوتا ہے، قرآنِ کریم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اِسی قرآن کے اندر فرقان کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے تَبٰرَكَ الَّذِيۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ (سورۂ فرقان: ۱) حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز۔ اور اِس سے معجزات بھی مراد لے جاسکتے ہیں، لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ: تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

توبہ کا مفہوم

''اور یاد کیجئے! جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بیشک تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا بچھڑے کو معبود بنا کر''، یہ وہی واقعہ ہے جس کی کچھ تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی، ''تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا'' فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ: اپنے پیدا کرنے والے کی طرف تم لوٹو، رجوع کرو، توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف۔ توبہ کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں، کہ اصل میں اِس کا معنی ہوتا ہے لوٹنا اور رجوع کرنا، اور بندہ جو معصیت کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ اُس کی توبہ ہے، اور اللہ تعالیٰ بندے کی معصیت کی بناء پر جو اپنی شان کے مطابق اعراض کر لیتا ہے پھر بندے کے رجوع کرنے پر اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف بھی توبہ کی نسبت ہے، اس لیے اسے بھی تابَ کہا جاتا ہے، تابَ علیہ اور توّاب یہ اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں بھی آتا ہے، اصل مفہوم اِس کا رجوع والا ہے۔ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ: اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹو، توبہ کرو۔

گناہ کی سزا میں سختی اَمنِ عالم کے لئے ضروری ہے

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اور توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو، یہاں اَنْفُسَكُمْ کا مصداق اپنی ذات نہیں ہے، بلکہ اپنے لوگوں کو قتل کرو، کیونکہ قاتل اور ہیں، مقتول اور ہیں، ''قتل کرو تم اپنے لوگوں کو، یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے نزدیک'' بہتر اس لیے ہے کہ جب گناہ کی اس طرح سزا دے دی جائے اور گناہگاروں کو یوں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تو قومی طور پر ایک تنبیہ ہو جاتی ہے، جس کی بناء پر آئندہ کوئی ایسی جرأت نہیں کرتا۔ گناہ کی سزا میں جو سختی ہوتی ہے یہ امنِ عالم کے لئے ضروری ہے، گناہ گار پر رحم کرنا امنِ عالم کو تباہ کرنے والی بات ہے، کیونکہ جس وقت ایک آدمی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور آپ لوگ اُس پر ترس کھا کر اسے چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود بھی آئندہ جرأت کرے گا اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی بھی ہمت بڑھے گی، وہ کہیں گے کیا ہوتا ہے، فلاں پکڑا گیا تھا، چھوٹ گیا، سفارش سے چھوٹ گیا، فلاں سے چھوٹ گیا، تو اُن کی بھی جرأت بڑھے گی، اس طرح سے سارے کا سارا عالم کا امن تباہ ہو جاتا ہے اگر مجرم کی سرپرستی شروع کر دی جائے، تو امنِ عالم کے لئے ضروری ہے کہ مجرم کے اُوپر سختی ہو، اور سختی کے ساتھ اس جرم کو مٹایا جائے، اور مجرم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، تاکہ آئندہ دوسرے لوگ جرأت نہیں کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جس وقت قصاص کا حکم ذکر کیا تو فرمایا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (سورۂ بقرہ: ۱۷۹) عقل والو! تمہارے لیے اِس قانونِ قصاص میں زندگی ہے، یہ تمہاری زندگی کو بچانے والی چیز ہے، کہ ایک قاتل کو مارو گے تو سارے انسان امن میں ہو جائیں گے، اور اگر تم اِس قانونِ قصاص کی خلاف ورزی کرو گے اور قاتل کو چھوڑ دو گے تو تمہاری اپنی جانوں کو امن نہیں رہے گا، جیسے آج آپ دیکھ رہے ہیں، چوروں پر رحم ہے کہ چوروں کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے تو مالی طور پر امن تباہ ہے، اور قاتلوں پر رحم ہے کہ قاتلوں کو اس طرح سے بر سرِ بازار اڑایا نہیں جاتا تو جانی طور پر بھی امن تباہ ہو گیا۔ آج آپ جو کہتے ہیں کہ نہ جان محفوظ ہے نہ مال محفوظ ہے، یہ مجرموں پر شفقت کا نتیجہ ہے، اور اگر مجرموں پر شفقت نہ ہو بلکہ چور پر بھی سختی کی جائے اور قاتل پر بھی سختی کی جائے تو سارے لوگوں کی جان بھی محفوظ ہو جائے گی اور مال بھی محفوظ ہو جائے گا، حفاظتِ جان اور حفاظتِ مال کے لئے مجرموں کے اوپر سختی ضروری ہے، تو قصاص میں حیات ہونے کا یہی معنی ہے، یہ آیت آگے آئے گی، وہاں اس کی تفصیل آ جائے گی۔ اور اسی طرح چور پر جس وقت سختی کریں گے تو مال محفوظ ہو گیا، اور زانی چونکہ دوسروں کی عزت کو نقصان پہنچاتا ہے، عصمت لوٹتا ہے، اُس کے اُوپر بھی سختی کی گئی۔ آج یہ تین ہی لفظ بولے جاتے ہیں کہ نہ عزت محفوظ نہ جان محفوظ نہ مال محفوظ، اور تینوں قانون اگر نافذ کر دیے جائیں اور اِن مجرموں کو اس طرح سے سزا ہونی شروع ہو جائے تو تینوں چیزیں محفوظ ہو جائیں گی، نہ کوئی کسی کی عزت کی طرف نظر اٹھائے گا، نہ کسی کے مال کی طرف، اور نہ کسی کی جان کی طرف۔ تو زنا کی سزا جو کوڑے لگانے کی قرآنِ کریم نے ذکر کی ہے (رجم کی سزا اِس وقت قرآنِ کریم میں مذکور نہیں، روایاتِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا قرآنِ کریم میں تھی، لیکن اس کی تلاوت منسوخ ہے، اور باجماعِ امت یہ سزا نافذ ہے، تلاوت اِس کی منسوخ ہوئی لیکن قانون باقی ہے، اور کوڑوں کی سزا قرآنِ کریم میں مذکور ہے) کوڑوں کی سزا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے یہاں بھی یہی لفظ بولا ہے،

سورۂ نور کی ابتداء میں ہے فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (آیت:۲)، دِیْنِ اللّٰہِ سے یہاں قانون مراد ہے، اللہ کے اس قانون کے نافذ کرنے میں تمہیں اس زانی اور زانیہ کے اوپر شفقت نہ آئے، ان کے اُوپر نرمی نہ دکھانا، وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ: ان دونوں کے متعلق تمہیں کہیں رأفت نہ پکڑ لے، فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ: اللہ کے قانون کے بارے میں، اللہ کے قانون کے بارے میں اِن کے اوپر کوئی رحم اور شفقت تمہارے دل میں پیدا نہ ہو، بلکہ امن عالم کے لئے اور دوسری ساری مخلوقات کے اُوپر شفقت کا تقاضا ہے کہ اِن مجرموں کو فناء کر دیا جائے، وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (حوالہ مذکورہ) اور اِن کو سزا دیتے ہوئے مؤمنوں کا ایک گروہ موجود ہونا چاہیے، برملا اور علی الاعلان سزا دو تا کہ دوسروں کو تنبیہ ہو۔ تو اسی طرح سے یہاں فرمایا کہ یہ سختی تمہارے حق میں بہتر ہے، کہ جب اس طرح سے سختی کر کے ان مجرموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو گے تو آئندہ کے لئے تنبیہ ہو جائے گی کہ قوم پھر اس قسم کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہیں کرے گی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح سے انہیں ترغیب دی کہ ”یہ قتل کرنا اپنے لوگوں کو بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک۔“

بنی اسرائیل کی توبہ کیسے قبول ہوئی؟

فَتَابَ عَلَيْكُمْ: فاء سے پہلے یہ مضمون مقدر ہوگا کہ پھر غیر مجرموں نے مجرموں کو قتل کیا، اور اُن مشرکوں کو یہ سزا دی گئی، فَتَابَ عَلَيْكُمْ: پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی، جب انہوں نے یہ کام کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سب پر رجوع کر لیا اور توبہ قبول کر لی، هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: وہ تو توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تَوَّاب: چونکہ توبہ جب اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے قبولیت توبہ، مجرم کی طرف رجحان کرنا، مجرم پر متوجہ ہو جانا، اس لیے تواب کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے توبہ کو قبول کرنے والا، ورنہ لفظی معنی یہ ہوگا کہ وہ تو بہت رجوع کرنے والا ہے، بہت متوجہ ہونے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

کمالات کب نکھرتے ہیں اور کب مُردہ ہوتے ہیں؟

اگلا واقعہ! (وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً) چونکہ یہ واقعات کی فہرست ہے، کوئی مسلسل مضمون نہیں ہے۔ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا کہ قوم نے توبہ کر لی اور مرتدوں کو قتل کر دیا گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات قوم کے سامنے پیش کی، اور غلامی کی زندگی گزارنے کے ساتھ اِن اسرائیلیوں کا مزاج بہت ہی گھٹیا قسم کا ہو گیا تھا...... یہ بھی ہمیشہ یاد رکھیے...... جتنا انسان آزادی کی فضاء میں سانس لیتا ہے اور ارد گرد اپنی عزت محسوس کرتا ہے تو اس کے اندر کمالات اجاگر ہوا کرتے ہیں اور وہ اچھی عادتیں اختیار کرتا ہے، اور جو شخص اپنے ارد گرد اپنی ذلت محسوس کرتا ہے، کہ ہر کوئی اُس کو دباتا ہے، ہر کوئی اُسے ذلیل کرتا ہے، جو دیکھتا ہے اُسے اپنے بیگار میں پکڑ لیتا ہے، ایسی صورت میں یہ ایک طبعی سی بات ہے کہ انسان کے اندر رذائل پرورش پاتے ہیں اور کمالات اور فضائل مردہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں حوصلہ افزائی کا ماحول ہو، جہاں انسان کو تعریف کر کر کے چلایا جائے اور آزادی کے ماحول میں وہ سانس لے، اُس کو معاشی طور پر بھی پستی نہ ہو، اور ارد گرد وہ اپنی عزت بھی محسوس کرتا ہو، تو ہمیشہ انسان کے اندر کمالات

اجاگر ہوتے ہیں۔ اور جہاں معاشی تنگی بھی ہو، معاشی طور پر بھی انسان دوسرے کا دست نگر ہو، اور ٹکڑے ٹکڑے کے لئے دوسرے کے سامنے ذلیل ہوتا پھر رہا ہو، اور اسی طرح سے اُس کی حیثیت معاشرے میں ایسی ہو کہ ہر کوئی اُسے نوکر اور غلام سمجھتا ہے، جو چاہتا ہے اُس کو بیگار میں پکڑ لیتا ہے، جو چاہتا ہے بلاتا ہے اور گالی دے کر بلاتا ہے، ایسے وقت میں اس کے جتنے کمالات ہوتے ہیں مخفی ہو جاتے ہیں اور رذائل ابھر آیا کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے معاشرے میں اس قسم کی مثالیں ہیں، جس وقت چاہیں آپ دیکھ سکتے ہیں، کہ جو بچے اچھے ماحول کے اندر نشو و نما پاتے ہیں اُن کا دل دماغ اور قسم کا ہوتا ہے، اور جن کی محلوں کے اندر حیثیت یہ ہوتی ہے کہ ہر کوئی ان پر رعب ڈالتا ہے، اور معاشی طور پر وہ اپنے آپ کو انتہائی پست اور ذلیل سمجھتے ہیں، جو کوئی چاہتا ہے ان کو بیگار میں بلا لیتا ہے، جس طرح سے چاہتے ہیں لوگ اُن کو کھینچے پھرتے ہیں، اگرچہ یہ غلام نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی اُن کی طبیعتیں بڑی پست پست سی ہوتی ہیں، اور ذرا ذرا چیز کے پیچھے لڑ پڑنا، پیسے پیسے کے پیچھے جھگڑے ڈالنا، اِس قسم کا مزاج ان کا بن جایا کرتا ہے۔ اور یہ تو غلامی کی زندگی گزار کے آئے تھے، تو غلامی کی زندگی کے اندر انسان میں اسی قسم کے رذائل نشو و نما پاتے ہیں، ذرا ذرا بات پر اڑ جانا، معمولی معمولی چیز کے اندر تنگی دکھانا ان کی عادت بن جاتی ہے۔

توراۃ آجانے کے بعد اسرائیلیوں کی موسیٰ علیہ السلام پر عدم اعتمادی کا واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت کتاب ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق اِس میں بھی بات بنالی، کہنے لگے جی! آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، ہمیں کیسے یقین آئے کہ آپ یہ صحیح کہہ رہے ہیں (یہ اپنے نبی کے ساتھ اُن کی گفتگو ہے)، ہم تو تب مانیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کہہ دے کہ واقعی یہ میری کتاب ہے، اِس کی اطاعت کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن پر اِتمامِ حجت کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت لی اور اُن کے ستر نمائندے لے کر طور پر پہنچ گئے، کہ اللہ تعالیٰ اِن سے کہہ دے گا کہ یہ کتاب میری ہے اور اس کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس بات کو کہلوانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی لے کر کوہِ طور پر چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ غیب سے آواز آگئی، اور انہیں کہا گیا کہ یہ میری اتاری ہوئی کتاب ہے، اور تمہیں اِس کی اطاعت کرنی چاہیے، لیکن وہاں جا کر انہوں نے پھر ایک اور اڑنگا لگا دیا، وہ کہنے لگے جی! آواز تو آرہی ہے، نظر تو کوئی نہیں آرہا، اب ہمیں کیا پتہ کہ کون بول رہا ہے؟ ہم تو جس وقت تک اللہ کو آمنے سامنے نہ دیکھیں گے ہم تو یقین نہیں کر سکتے۔ اب آپ جانتے ہیں کہ ناز برداری بھی اگر کسی کی ہو تو ایک حد تک ہوتی ہے، جب انسان آگے گستاخ در گستاخ ہوتا چلا جائے تو پھر آگے تھپڑ بھی لگ جاتا ہے، جب اُنہوں نے اس قسم کی بات کی تو اِس گستاخی کی سزا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بجلی کڑکی جس کے ساتھ یہ سارے کے سارے حقیقتاً مر گئے یا بے ہوش ہو گئے، تفسیروں میں دونوں قول ہیں، اِن کے حواس خطا ہو گئے یا مر گئے، کیونکہ موت کا لفظ بیہوشی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، نیند کے لئے بھی موت کا لفظ بولتے ہیں، جیسے ہمیں حدیث شریف میں دُعا تلقین کی گئی ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ"[1] سو کر اُٹھنے کے بعد یہ دُعا پڑھی جاتی ہے، جس کا ترجمہ ہے کہ

---

(۱) بخاری ۹۳۶/۲، باب ما یقول اذا اصبح/ مشکوٰۃ ۲۰۸/۱، باب ما یقول عند الصباح والمساء۔

شکر ہے اُس اللہ کا جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی دے دی۔ موت سے وہاں نیند مراد ہے، کیونکہ ''اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ''[1] اور آپ بھی کہا کرتے ہیں ''سویا ہوا مویا ہوا ایک برابر!'' تو نیند موت کے برابر ہے، اور اُس کے بعد بیدار ہو جانا جی اٹھنے کی طرح ہے۔ اسی طرح سے یہاں تفسیروں میں دونوں قول موجود ہیں، کہ یا تو یہ بالکل بے ہوش ہو گئے، ہوش وحواس اِن کے ختم ہو گئے لیکن تھے زندہ، بعد میں اُن کو دوبارہ اللہ تعالیٰ نے ہوش وحواس دیے، تو یہ بات موت کے بعد اٹھانے کے مشابہ ہوئی، یا پھر حقیقتاً یہ مر گئے تھے۔ جس وقت یہ حال موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے سامنے زاری کرنے لگ گئے، کہ یا اللہ! گستاخی انہوں نے کی اور سزا اِن کو مل گئی، لیکن اس سزا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تو میرے بھی مخالف ہو جائیں گے کہ ہمارے سرداروں کو لے کر پتہ نہیں کہاں مار آیا، اور یہ قوم جو بگڑ جائے گی وہ تو میرے قابو میں بھی نہیں رہے گی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِن کی ہلاکت میری ہلاکت پر منتج ہوگی، اس لیے تو رحم کر، اِن کی غلطی معاف کر دے، اور انہیں دوبارہ صحیح کر دے، زندگی دے دے یا اِن کے ہوش وحواس ٹھیک کر دے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو دوبارہ پھر ان کو زندگی حاصل ہوئی۔ یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے اُنہوں نے دیکھا، دیکھنے کے بعد جب یہ قوم کے پاس آئے، اب چاہیے تو تھا، شرافت تو یہ تھی کہ کہہ دیتے کہ ہم جس چیز کی تحقیق کے لئے گئے تھے ہم دیکھ آئے، واقعہ صحیح ہے، یہ اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے، اللہ کی دی ہوئی کتاب ہے، ہمیں اِس کے ساتھ فرمانبرداری کا تعلق رکھنا چاہیے، اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیے، لیکن یہاں آ کر پھر اپنی فطرت کے مطابق پچر لگا دیا، اور آ کر کہنے لگے کہ ہے تو یہ اللہ کی کتاب، اتاری تو اللہ تعالیٰ نے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس میں سے جو مشکل بات معلوم ہو اُس پر بیشک عمل نہ کرنا، یوں ساتھ یہ بات بھی کر دی، اس کا ذکر آگے آ رہا ہے واقعات کے سلسلے میں، کہ اِس طرح سے انہوں نے اللہ کی کلام کو بدلا اور بگاڑا، کہ آ کر ساتھ اِس قسم کی بات کہہ دی جس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کا کوہِ طور کو اٹھانا، اور کتاب کے اُوپر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کا معاہدہ، آگے آیات کے اندر آئے گا، وہاں اِس واقعہ کو ذکر کیا جائے گا۔ اس طرح سے یہ واقعات کا سلسلہ ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب اُنہیں یہ جتایا جا رہا ہے کہ تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ہم تجھ پر، تیری بات کا یقین نہیں کریں گے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا آمنے سامنے نہ دیکھ لیں، نَرَى اللهَ جَهْرَةً: جَهْرَةً یہ عِيَانًا کے معنی میں ہے (جلالین)، رُؤْيَةً ذات جهرة، ایسی رؤیت جو بالکل معائنے والی ہو، کہ آمنے سامنے کھلم کھلا جب تک نہ دیکھ لیں ہم نہیں مانیں گے، فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ: پھر تمہیں بجلی نے پکڑ لیا، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ: اِس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے تمہارے اوپر بجلی گری، ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ: پھر ہم نے تمہیں اٹھا دیا، مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ: تمہاری موت کے بعد، اِس موت کے مصداق میں میں نے آپ کے سامنے دو قول نقل کیے ہیں، کہ یا تو وہ حقیقتاً مر گئے تھے یا ان کے اُوپر موت جیسی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اور بعث کا لفظ بھی دونوں پر بولا جاتا ہے، حقیقتاً مرنے کے بعد زندہ کیا جائے وہ بھی بعث کا مصداق ہے، اور سونے کے بعد جو اُٹھتے ہیں وہ بھی بعث کا مصداق ہے، بے ہوشی اور غشی کی کیفیت کے بعد جو ہوش سنبھالی جائے اُس کو بھی بعث سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) مشکوۃ ۲/۵۰۰، باب صفۃ الجنۃ کا آخر/ شعب الایمان، رقم ۴۴۱۶

جہاد سے انکار اور وادیٔ تیہ میں محصور ہونے کا واقعہ

آگے جو واقعہ ذکر کیا ہے اُس کا تعلق وادی تیہ کے ساتھ ہے، کہ جب اِنہیں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا، یہ تفصیل سورۂ مائدہ میں آئے گی، شام کے علاقے پر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا، کہ وہ علاقہ تمہارا ہے، چلو تم جہاد کرو، اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی، علاقہ فتح ہو جائے گا، لیکن اِن کو جب پتہ چلا کہ وہاں بڑی جفاکش اور بہت بہادر قسم کے لوگ عمالقہ قوم آباد ہے تو یہ اکڑ گئے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، سورۂ مائدہ کے اندر تفصیل آئے گی، کہ یٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ (آیت: ۲۲) وہاں بہت سخت قسم کے لوگ موجود ہیں، ہم وہاں نہیں جاسکتے، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، تُو جا اور تیرا رب جائے، جا کے علاقہ خالی کروالو، جس وقت وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو پھر ہم داخل ہو جائیں گے، یہ آیات قرآنِ کریم میں غالباً سورۂ مائدہ میں آئیں گی...... میں تو چونکہ حافظ نہیں ہوں، آپ سے تائید چاہتا ہوں اور آپ خاموش رہ جاتے ہیں، (طلبہ نے کہا کہ سورۂ مائدہ میں ہے تو فرمایا) چلو! اللہ کا شکر ہے میری بات صحیح ہے...... جس وقت انہوں نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ علاقہ چالیس سال تک ان کے اُوپر حرام ٹھہرا دیا تھا، کہ اب یہ اس علاقے کو فتح نہیں کر سکتے، اور پھر یہ حیران پریشان پھرتے رہے اُس جگہ میں جس کو آج آپ صحرائے سینا کہتے ہیں، نہر سویز سے گزر کر جو علاقہ اسرائیل کے ساتھ آج کل لگتا ہے، جس پر پہلے اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا اور اب انوار السادات (م ۱۹۸۱ء) نے واپس لے لیا ہے، یہ ریتلا علاقہ ہے انتہائی مہلک قسم کا، جسے صحرائے سینا کہتے ہیں، یہی علاقہ ہے جس کے اندر اسرائیلی چالیس سال تک محصور رہے ہیں، اور یہاں پریشان پھرتے رہے، اِن کے لئے یہ ایک قسم کا تربیتی کیمپ لگ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں موجود تھے تاکہ اِن کی اصلاح کریں، اور بڑے بڑے پاپی مر جائیں، نئی نسل پیدا ہوگی تو اُن کو پھر آگے چلایا جائے گا، لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال بھی وہیں وادیٔ تیہ میں ہوا، اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال بھی وہیں ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام خلیفہ بنے، اور پُرانے پُرانے جتنے اسرائیلی تھے وہ فوت ہو گئے، پھر یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد ہوا اور بیت المقدس فتح ہوا ہے۔

جرم کے باوجود بنی اسرائیل کی ناز برداریاں

چالیس سال تک یہ اُس علاقے کے اندر محصور رہے، وہاں نہ کوئی درخت تھا جس کے سائے میں بیٹھیں، اور نہ وہاں کوئی کھانے پینے کا انتظام تھا، تو باوجود اس بات کے کہ اِن کو سزا کے طور پر اس علاقے میں محصور کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اِس قوم کے کتنے ناز اٹھائے ہیں، کہ سزا کے طور پر وہاں رکھا ہے لیکن پھر دھوپ کی تکلیف ہوئی تو اللہ نے پتلے پتلے بادل بھیج دیے جو ان کے اُوپر سایہ رکھیں، دھوپ کی تکلیف نہ ہو، کھانے کی دقت پیش آئی تو من وسلویٰ اتار دیا، کہ لو، کھاؤ اور مزے اڑاؤ، وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ: پانی مانگا تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ پتھر پر جا کر اپنی لاٹھی مارو، فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا: بارہ چشمے اُس میں سے پھوٹ پڑے، اور اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ کھاؤ پیو، زمین کے اندر فساد نہ مچاؤ، مطلب

یہ تھا کہ اسی غذا کے اُوپر کفایت کرتے ہوئے تمہیں چاہیے کہ اپنی روحانی تربیت حاصل کرو، فرعونیوں کی صحبت میں آ کر تمہارے اندر جو کوتاہی ہوگئی تھی اُس کی تلافی ہوجانی چاہیے، لیکن وہاں بھی انہوں نے جو گڑبڑ کی اُب اس کی یاددہانی کرائی جارہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسے کیسے احسانات تھے اور اِن کی طرف سے کس قسم کی حرکتیں آگے سے ہوتی تھیں، وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ: یہ وادی تیہ کا واقعہ ہے، ہم نے سایہ افگن کر دیا، سائبان بنادیا تمہارے اُوپر بادل کو، وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى: اور ہم نے تمہارے اُوپر من وسلویٰ اتارا، سلویٰ یہ بٹیر جیسا ایک پرندہ ہے، عام طور پر مترجمین نے اِس کو بٹیر کے ساتھ تعبیر کیا ہے، یا بٹیر جیسا کوئی پرندہ ہے، یہ کثرت کے ساتھ آجاتے تھے اور باوجود اس بات کے کہ پرندے انسان سے بدکتے ہیں، لیکن یہ بدکتے نہیں تھے، زندہ زندہ پاس آجاتے، کہ جتنی ضرورت ہو پکڑو، پکڑ کر اِن کو ذبح کر کے کھالو۔

واعظوں کی گھڑی ہوئی باتیں

یہ جو کہا کرتے ہیں کہ پکے پکائے اترا کرتے تھے، یہ واعظوں کا اضافہ ہے۔ واعظ ایک مستقل قوم ہے جو بات کو بگاڑنے میں اور نئے سرے سے بنانے میں اور اِدھر اُدھر کی مارنے میں اِن کو مہارت ہوتی ہے، ایک ہی واقعہ کو جب ذکر کریں گے تو ایسے ہی کوئی کدھر کی لگادیں گے، کوئی کدھر کی لگادیں گے، اس لیے محدثین کی اصطلاح ہے کہ جہاں روایت کے اندر کوئی غلط بات داخل ہوجائے اُس کو کہتے ہیں مُخْتَلَقُ الْقُصَّاص، یہ واعظ لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے، محدثین بھی اسی طرح سے کہا کرتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ گو لوگوں کی پُرانی عادت ہے کہ جب بات بنانے لگتے ہیں تو اس کو مزین کرنے کے لئے اور لوگوں پر اثرانداز ہونے کے لئے اُس میں کچھ اضافے کرتے ہی رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا جس وقت یہ وعظ کیا کرتے ہیں تو یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے جبریل علیہ السلام حضور ﷺ سے جب گفتگو کر رہے تھے تو یہ پاس کھڑے ہوئے سن رہے تھے، ''اللہ نے کہا او جبریل! حضور ﷺ نے یوں فرمایا، جبریل نے یوں کہا، آپ نے یوں کہا'' اس قسم کے مکالمے جن کا کہیں روایات کے اندر کوئی ثبوت نہیں ہوتا، اور یہ یوں گھڑ لیتے ہیں جس طرح سے جب یہ گفتگو ہورہی تھی تو پاس کھڑے تھے، نقشے کچھ اس قسم کے کھینچتے ہیں۔ یہ بات کی تزئین ہے کہ بات کو بنانے کے لئے وہ یہ انداز اختیار کرتے ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہے، اور اِس میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ بھی کذب علی النبی، یا کذب علی اللہ، افتراء علی اللہ میں نہ داخل ہوجائے، جو بات اللہ نے نہیں کی اور ہم بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں، اور جو بات سرورِ کائنات ﷺ نے نہیں کی اور ہم بنا کر سرورِ کائنات ﷺ کی طرف منسوب کریں، یہ بہت بڑی بات ہے، اس لیے یہ انداز غلط ہے، یہ انداز صحیح نہیں ہے، پرانے بزرگوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں تھا، یہ پنجابی واعظوں کی عادت ہے، اور پرانے زمانے میں اگر کسی سے کوئی ایسا لفظ ثابت ہوجاتا تھا تو اُس کو معاشرے میں بے وقعت کر دیا جاتا تھا، لوگ اُس کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے تھے، اسی لیے تو مذمت کے عنوان سے ذکر کیا ہوا ہے کہ جہاں کسی روایت کے اندر کوئی لفظ اس قسم کا آجائے تو کہتے ہیں ''هٰذَا مُخْتَلَقُ الْقُصَّاص''[1] یہ تو واعظوں کی اور قصہ گو لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے۔ اس انداز کے ساتھ ذکر کرتے تھے، جس

(۱) مثلاً دیکھیے مرقاۃ شرح مشکوۃ، باب الذکر بعد الصلوۃ فصل اول کے تحت۔ اور بعض کتب میں حدیث القُصّاص کا محاورہ بھی ہے۔

کا مطلب یہ ہوا کہ قُصّاص کی حیثیت اُس معاشرے میں کچھ نہیں تھی، جہاں قصہ گو کی طرف بات منسوب ہوئی تو اُس کا مطلب ہے یہ کہانی ہے، جس کا واقعہ کچھ نہیں ہے۔

تو پکے پکائے کا ذکر کہیں نہیں، یوں تھا کہ وہ کثرت کے ساتھ آجاتے تھے جن کے پکڑنے میں اُن کو کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، اور رات کو مَن آسمان سے برستا، جس طرح سے گھاس کے اُوپر اَوس کے قطرے ہوتے ہیں، اور وہ منجمد ہو جاتا تھا، یہ کوئی میٹھی چیز تھی جس کو وہ اکٹھا کر کے استعمال کرتے تھے۔ تو زندگی گزارنے کے لئے یہ غذا اُن کے لئے کافی تھی، پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اگلے رکوع میں ذکر آئے گا کہ ایک ہی پتھر سے بارہ چشمے جاری کر دیئے گئے، پینے کی ضرورت اس طرح سے پوری کر دی گئی۔

من وسلویٰ کے لئے لفظ ''اِنزال'' کیوں استعمال کیا گیا؟

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى: اِس کو اَنْزَلْنَا کے ساتھ جو تعبیر کیا کہ ہم نے اتارا، چونکہ بغیر ظاہری اسباب کے اِس قسم کی نعمتیں حاصل ہوئی تھیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بغیر ظاہری اسباب کے نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ یونہی ہیں جیسے کہ آسمان سے اُتاریں، چونکہ اِن کی ظاہری کوشش اور ظاہری اسباب کے بغیر یہ نعمتیں حاصل ہو رہی تھیں اس لیے اِن کی نسبت براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ قرآنِ کریم میں حیوانات کے لئے بھی اِنزال کا لفظ آیا ہے، وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (سورۂ زمر:۶) اللہ نے حیوانات کی آٹھ قسمیں پیدا کیں، بکری بکرا، بھیڑ بھیڑو، اگائے بیل، اور اونٹ اونٹنی، اور ان کا ذکر کرتے ہوئے اَنْزَلَ کہا، تو وہاں بھی اِنزال کا لفظ ہے۔ اسی طرح زمین کے اندر لوہا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، زمین سے لوہا نکلتا ہے، اور لوہے کے ساتھ بھی اللہ نے اَنْزَلْنَا کا لفظ استعمال کیا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (سورۂ حدید:۲۵) کہ لوہا ہم نے اتارا۔ تو انسان کی کوشش کے بغیر براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اُس کو اَنْزَلْنَا کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

''اور ہم نے کہا کہ کھاؤ اُن پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں'' وَمَا ظَلَمُوْنَا: اُنہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہ کیا، یعنی وہاں کمیاں اور کجیاں اختیار کر کے اور گڑبڑ کر کے جو یہ رزق بند کروالیا، اِس میں ہمارا انہوں نے کیا نقصان کیا؟ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: وہ اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرتے تھے، اپنے اِن کرتوتوں کے ساتھ نقصان اپنا ہی کرتے تھے۔

ایک شہر میں داخلے کے وقت اسرائیلیوں کی شرارت کا واقعہ

اگلے رکوع میں آئے گا، جب انہوں نے کہا تھا کہ ہم اِس کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، ہمیں تو پیاز چاہیے، لہسن چاہیے، ساگ چاہیے، تریں چاہئیں، گندم چاہیے، اِس قسم کی چیزیں ملیں، اسی طرح مسور کی دال ہو (جس سے آج کل آپ تنگ آجاتے ہیں، یہ نعمت اسرائیلیوں کی مانگی ہوئی ہے) تو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اچھا! پھر کسی شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ، وہاں تمہیں یہ ساری کی ساری چیزیں مل جائیں گی۔ جہاں اِن کو ٹھہرایا ہوا تھا وہاں تو چونکہ اس قسم کی پیداوار نہیں تھی، جہاں آبادی تھی وہاں پیداوار تھی......

سوال:- پہلے تو آیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے شام میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔

جواب:- شام میں جانے سے انکار کر دیا تھا، لیکن تیہ تو مصر کا علاقہ ہے، یہاں اُن کو سزا کے طور پر محصور کر دیا گیا تھا،

وہاں اس قسم کی آبادیاں نہیں تھیں...... اور پھر یہ حکم دیا کہ جس وقت جاؤ تو جاتے ہوئے متواضعانہ طور پر جانا، عبادت خانے کے اندر سر کو جھکاتے ہوئے جانا، اور حِطّة حِطّة کہتے ہوئے جانا۔ حطہ کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ حطہ حطہ یہ لفظ ایسے ہی ہے جیسے ہم توبہ توبہ کہتے ہوئے جاتے ہیں، جس کا مطلب ہے میری توبہ، یا اللہ! میری توبہ، میرے گناہ معاف کر دے، تو حِطّةٌ کا مطلب یہی تھا مسئلتنا حطةٌ ہمارا سوال یہی ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیے جائیں، جو ہم سے قصور اور غلطیاں ہو گئیں وہ معاف کر دی جائیں، اس طرح سے زبان سے توبہ توبہ کہتے ہوئے اور سر جھکاتے ہوئے تواضع کے ساتھ تم دروازے میں داخل ہونا۔ لیکن یہاں پھر انہوں نے وہی شرارت کی، کیونکہ مزاج جس وقت بگڑا ہوتا ہے تو پھر قدم قدم پر ہی گڑبڑ ہوتی ہے، کہ نفع کی بات کہی جائے، سمجھانے کے لئے کہی جائے، تو شرارت کے طور پر کوئی نہ کوئی الٹا کام کرنا ہے، کہتے ہیں کہ وہ یوں اکڑ کر چلے، سینے نکال کر اور سرین باہر کو نکال کر۔ جس وقت انسان بہ تکلف اکڑتا ہے (آپ جس وقت چاہیں تجربہ کر کے دیکھ لیں) جس وقت اکڑتا ہے اور سینے کو آگے کرتا ہے تو سرین پیچھے کو ہو جاتے ہیں، اور پھر اکڑ کے جب انسان سرین ہلاتا ہوا چلتا ہے تو اُس کو کہتے ہیں کہ سرین کے بل چل رہا ہے۔ تو تفسیر کے اندر جو یہ لفظ آتا ہے کہ سرین کے بل وہ چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے،[1] اُس کا یہ معنی نہیں کہ زمین پر رگڑتے ہوئے داخل ہوئے، جیسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے، یہ بات نہیں ہے، کیونکہ اس طرح سے داخل ہونا کوئی متکبرین کی حالت نہیں ہے، یہ تو بالکل ہی ایک ذلیل گن حرکت ہے، قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ متکبر تھے اور بات کو بگاڑتے تھے، تو سرین کے بل چلنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بچوں کی طرح زمین پر گھسیٹی کرتے ہوئے جا رہے تھے، سرین رگڑتے ہوئے اور سر پیچھے کو ہٹا کر، ایسا نہیں، بلکہ سرین کے بل چلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب انسان متکبرانہ طور پر یوں سینہ کھولتا ہے، تو سینہ آگے کو بڑھے گا اور سرین پیچھے کو ہو جائیں گے، اور پھر جس وقت انسان اکڑ کر چلتا ہے تو اس کی سرین کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ عام حالات کے مطابق نہیں ہوتی، تو یہ چلنا بھی سرین کے بل چلنا ہے،[2] اِس کو بھی محاورے میں سرین کے بل چلنا کہتے ہیں، یعنی ایک تو وہ اکڑے اور سرین ہلاتے ہوئے گئے، اور دوسرے حِطّہ کو انہوں نے بگاڑ کر حنطہ بنا دیا، یا کوئی اور لفظ بنا دیا جس سے مہمل سی بات بن گئی۔ اکڑے بھی جا رہے ہیں اور حِنطة حِنطة کرتے جا رہے ہیں، جس سے ایک مذاق بن گیا، اب حِطّةٌ کا مطلب تو تھا کہ ہمارے گناہ گرا دیے جائیں، اور حنطة کہتے ہیں گندم کو، اب یہ گندم گندم کرتے ہوئے جائیں، تو اِس میں کیا ہوتا ہے، یعنی لفظی طور پر بھی مذاق اڑایا، اور اکڑ کر جو داخل ہوئے تو عملی طور پر بھی حکم کی مخالفت کی۔ جب یہاں تک نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا، آسمان کی طرف نسبت اس لیے ہے کہ یہ وباء براہِ راست اللہ کی طرف سے آئی، ایک یہ ہے کہ دشمنوں سے پٹائی کروا دی جائے یا آپس میں لڑ پڑیں، جس سے نقصان ہو جائے، وہ بھی ایک عذاب کی صورت ہے، لیکن آسمان کی طرف سے عذاب اترنے کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ اُن کے اُوپر وباء آئی، کہتے ہیں کہ طاعون کے اندر مبتلا ہوئے اور بہت کثرت کے ساتھ یہ لوگ مرے، اس تکبر اور اس بدزبانی کا نتیجہ اُن کے سامنے یہ آیا۔ تو یہ احسانات اللہ تعالیٰ یہاں ذکر کرتے ہیں، ساتھ ساتھ اُن کی

(۱) بخاری ۲/ ۶۴۳، تفسیر سورۃ البقرۃ/ مسلم ۲/ ۴۱۹، کتاب التفسیر۔ ولفظ الحدیث: عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ فَدَخَلُوا يَزْحَفُونَ عَلَى أَسْتَاهِهِمْ

(۲) دیکھیے قصص القرآن از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بعنوان یوشع بن نون۔

کجیاں ذکر کر کے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ماریں کھائی ہیں ان کو یہ بھی یاد دلایا جارہا ہے، کہ اب آئندہ کے لئے بھی سنبھل جاؤ، اگر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی مخالفت اُسی طرح سے تم کرتے رہے اور ہدایت کو نہ مانا تو جیسے وقتاً فوقتاً تمہارے بڑے پٹے تھے اسی طرح تمہارے بھی پٹنے کا وقت آجائے گا، ان واقعات کے ضمن میں اُن کو یہ نصیحت کرنی مقصود ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ

جب پانی طلب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے، پھر ہم نے کہا کہ مار تو اپنی لاٹھی پتھر پر

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

پھر پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے، جان لیا ہر قبیلے نے اپنے گھاٹ کو

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۝۶۰

(ہم نے کہا کہ) کھاؤ اور پیو اللہ کا رزق، اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو ۝۶۰

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک قسم کے کھانے پر، تو دعا کر ہمارے لیے اپنے رَبّ سے،

یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآىِٕهَا وَفُوْمِهَا

نکالے وہ ہمارے لیے ان چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے، یعنی اس کی سبزی اور اس کی ککڑی اور اس کے گیہوں

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ

اور اس کی مسور اور اس کا پیاز، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم لینا چاہتے ہو اس چیز کو جو گھٹیا ہے اس چیز کے بدلے

هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ

جو بہتر ہے، اترو کسی شہر میں، پس بیشک تمہارے لیے وہ چیز ہوگی جو تم نے مانگی، اور تھوپ دی گئی ان پر

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ

ذلت اور مسکنت، اور لوٹے وہ اللہ کا غضب لے کر، یہ اس سبب سے ہوا کہ وہ انکار کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیات کا،

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور قتل کیا کرتے تھے نبیوں کو ناحق، یہ اس سبب سے تھا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے ﴿۶۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ: سَقٰى يَسْقِيْ: سیراب کرنا، یہ لفظ آگے بقرہ کے قصے میں آئے گا، وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ۔ سَقٰى يَسْقِيْ: سیراب کرنا۔ اِسْتَسْقٰى: باب استفعال، سیرابی کا مطالبہ کرنا۔ اس لیے پانی طلب کرنے اور بارش طلب کرنے کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں آپ صلوٰۃِ استسقاء پڑھا کرتے ہیں تو اُس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ بارش نہیں ہورہی، اور آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بارش دے دی جائے، تو بارش کی طلب بھی استسقاء ہے، کیونکہ اُس میں بھی سیرابی کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ''جب پانی طلب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے''۔ فَقُلْنَا: پھر ہم نے کہا کہ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ: مار تو اپنی لاٹھی پتھر پر، اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مار۔ اَلْحَجَرَ کے اُوپر الف لام عہد کا ہے، اُس علاقے میں کوئی ممتاز پتھر ہوگا جس کی طرف اشارہ کرکے یہ کہا گیا، موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی کی گئی کہ فلاں پتھر کو جا کر اپنی لاٹھی مارو۔ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا: فاء سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے، فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ: موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری پھر پھوٹ پڑے اُس پتھر سے بارہ چشمے۔ اِنْفِجَار: پھوٹ پڑنا۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ: اُناس انسان کے معنی میں ہے، جیسا کہ عرض کیا تھا کہ اس کے اُوپر الف لام داخل ہوجائے تو اَلْاُنَاس نہیں پڑھا جائے گا، اَلنَّاس پڑھا جائے گا، اَلنَّاس اصل میں اَلْاُنَاس ہی تھا۔ ''جان لیا ہر قبیلے نے اپنے گھاٹ کو''۔ مشرب: پانی پینے کی جگہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اُن اسرائیلیوں کے بارہ قبیلے تھے تو اُن بارہ میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ متعین ہوگیا، پھر جب پانی لینا ہوتا وہیں سے لیتے، علیحدہ علیحدہ اُن کی گھاٹ متعین کردی گئی، تاکہ پانی لینے میں اور اس کے استعمال کرنے میں آپس میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے، انتظامی امور میں اِن بارہ قبیلوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا: قُلْنَا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا: پھر ہم نے کہا کہ کھاؤ اور پیو، مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ: اللہ کا رزق، وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو۔ لَا تَعْثَوْا: عَثِيَ يَعْثٰى فساد کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، اس لیے مُفْسِدِيْنَ یہ لَا تَعْثَوْا کی ضمیر سے حالِ مؤکدہ ہے، جو معنی لَا تَعْثَوْا میں موجود ہے مُفْسِدِيْنَ نے آکر اُسی کی تاکید کی ہے، ''زمین میں فساد نہ مچاؤ، فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو''۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى: اور قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰ! لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ لَنْ مضارع مستقبل کی نفی کے استغراق کے لئے ہوتا ہے، اور اس میں تاکید والا معنی ہوتا ہے، جیسے لَنْ يَّضْرِبَ: وہ ہرگز نہیں مارے گا، یہ ہرگز کا لفظ آپ بطورِ تاکید کے استعمال کیا کرتے ہیں، لَنْ نَّصْبِرَ: ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ایک کھانے پر، ایک کھانے سے مراد ہے ایک قسم کا کھانا، کہ ہر روز ہمیں ایک ہی قسم کا کھانا ملے، ہم صبر نہیں کریں گے، ہم اس بات کو برداشت نہیں

کر سکتے، یہاں واحد سے وحدتِ نوع مراد ہے، ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے، فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ: انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اُن کا طرزِ کلام ہمیشہ گستاخانہ سا ہی ہے، ایک تو سامنے درخواست کرنے کی بجائے فیصلہ سنا دیا، ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ ہماری یہ عرض ہے کہ اس بات میں کچھ ترمیم کر دی جائے، یوں درخواست کریں، نیازمندی کے ساتھ ذکر کریں، اس میں کوئی حرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں بندے اپنی نیازمندی کے ساتھ اپنی کوئی عرض کر دیں، ضرورت پیش کر دیں۔ لیکن یہ عرض نہیں کرتے، یہ فیصلہ سناتے ہیں، ''ہم یوں کر دیں گے، ہم یوں نہیں کریں گے'' یہ فیصلہ سنانے والی بات ہے، اور پھر آگے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرنے کو بھی موسیٰ علیہ السلام کے ذمے لگاتے ہیں کہ تو دعا کر، اور پھر کرکس کے سامنے؟ فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا نہیں، فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ، جیسے اِن کا کوئی تعلق ہی نہیں، ''تو دُعا کر ہمارے لیے اپنے رَبّ سے۔'' يُخْرِجْ لَنَا: نکالے وہ ہمارے لیے، پیدا کرے وہ ہمارے لیے، مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ: اُن چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے، یعنی زمین کی نباتات میں سے، نکالے ہمارے لیے زمین کی نباتات میں سے، مِنْ بَقْلِهَا: یہ مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ میں جو مَا ہے اُس کا بیان ہے، بقل کہتے ہیں ہر قسم کی سبزی کو، اِس لیے سبزی فروش عربی میں بَقَّال کہلاتا ہے، ہر قسم کی سبزی میں شلغم بھی آ گئے، ٹماٹر بھی آ گئے، بینگن بھی آ گئے، عام طور پر جو سبزی کے طور پر آپ کھایا کرتے ہیں، اسی طرح آلو، اروی، گوبھی، کدو، ٹینڈے یہ ساری کی ساری چیزیں بقل کے اندر آ گئیں۔ وَ قِثَّآىِٕهَا: پھر ان سبز چیزوں میں سے جن خاص خاص چیزوں سے ان کو خصوصی رغبت تھی اُن کو علیحدہ کر کے بھی ذکر کر دیا۔ قِثَّاء کہتے ہیں ککڑی کو اور کھیرے کو، ککڑی جس کو ہم تر کہتے ہیں، اور اِس علاقے کے (سرائیکی) لوگ اُس کو پابی کہتے ہیں، یہ لمبی لمبی اور پتلی پتلی ہوا کرتی ہیں، ہم اُن کو تریں کہتے ہیں۔ تو قِثَّاء کا لفظ ککڑی اور کھیرا دونوں کے لئے بولا جاتا ہے، کھیرا موٹا سا ہوتا ہے اگرچہ اندر سے اس کی بناوٹ تر جیسی ہوتی ہے، بیج وغیرہ اور گودا تر جیسا ہی ہوتا ہے، لیکن وہ چھوٹا اور موٹا سا ہوتا ہے، اور تریں لمبی لمبی ہوتی ہیں، قِثَّاء کا لفظ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَفُوْمِهَا: فُوم کا ترجمہ یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے گیہوں کے ساتھ کیا ہے، اور بیان القرآن میں بھی اِس کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے گیہوں کے ساتھ کیا ہے، فوم گیہوں کو کہتے ہیں، لیکن دوسرے مفسرین اِس فوم کو ثوم قرار دیتے ہیں، کہ فاء اور ثاء دونوں آپس میں عربی کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، جیسے حافظ صاحب نے کل ہی حدیث شریف میں يَتَحَنَّثُ کا لفظ پڑھا (بخاری ص ۲) تو اُس روایت میں بعض نے يَتَحَنَّفُ پڑھا ہے، اور يَتَحَنَّفُ اور يَتَحَنَّثُ دونوں کا مصداق ایک ہے، کہ وہ دینِ حنیف کو اختیار کرتے تھے۔ يَتَحَنَّثُ اصل میں يَتَحَنَّفُ تھا، فاء کو ثاء سے بدل دیا، یعنی دینِ حنیف کو اختیار کرتے تھے۔ تو فاء اور ثاء آپس میں بدلتی رہتی ہیں، اس لیے فوم اصل کے اعتبار سے ثوم ہے، اور ثوم عربی میں کہتے ہیں لہسن کو، اور اسی ثوم کو سرائیکیوں نے تھوڑا سا بگاڑ کر تھوم بنا لیا، یہ جو لہسن کو تھوم کہتے ہیں یہ لفظ ثوم کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، جیسے بصل کو وصل کہنے لگ گئے، تو ان دونوں کا ماخذ عربی لفظ ہے۔ بہرحال ثوم سے لہسن بھی مراد لے سکتے ہیں۔ زمین کی ککڑیاں اور زمین کا لہسن، ھا ضمیر ارض کی طرف لوٹ گئی۔ وَعَدَسِهَا: عدس کہتے ہیں مسور کو، یہ مسری کی دال جو آپ کھایا کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بہت مرغوب فیہ چیز تھی، تو اُس کی مسری چاہیے، وَبَصَلِهَا: اور اس کا پیاز، بصل کا معنی

پیاز، اِسی کو تھوڑا سا بدل کے اِس علاقے کے (سرائیکی) لوگ وصل کہتے ہیں، اصل لفظ بصل ہے، اگر وصل اور تھوم میں باء اور ثاء بولا کریں تو یہ خالص عربی لفظ ہے۔ تو ان چیزوں کا ذکر خصوصیت سے کردیا، زمین کی سبزیاں، زمین کی ککڑیاں، زمین کا لہسن، زمین کی مسور، اور زمین کا پیاز۔ اپنے رَبّ سے کہہ، یہ چیزیں ہمارے لیے نکالے، ہم ایک قسم کے کھانے پر صبر نہیں کرسکتے۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اَتَسْتَبْدِلُوْنَ: کیا بدلنا چاہتے ہو تم، الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی: اُس چیز کو جو گھٹیا ہے، بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ: اس چیز کے بدلے جو بہتر ہے، بدلے میں لینا چاہتے ہو تم اَدْنٰی کو اس چیز کے جو کہ بہتر ہے؟، بہتر چیز کو چھوڑ کر تم گھٹیا چیز کو لینا چاہتے ہو؟ یہ استفہام انکاری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، جو کچھ تمہیں مل رہا ہے یہ هُوَ خَیْرٌ کا مصداق ہے، اور جو کچھ تم لینا چاہتے ہو وہ هُوَ اَدْنٰی کا مصداق ہے۔ تم الَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ کے بدلے میں الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی لینا چاہتے ہو؟ گھٹیا چیز لینا چاہتے ہو؟ اِهْبِطُوْا مِصْرًا: نازل ہو جاؤ کسی شہر میں، اُترو کسی شہر میں، مِصْرًا یہ نکرہ استعمال ہوا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہے، کیونکہ ملک مصر کے طور پر یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے وہاں غیر منصرف آیا ہے، جیسے اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (سورۂ زخرف: ۵۱)، اور جہاں یہ نکرہ اور منصرف استعمال ہوا ہے وہاں کوئی غیر معین شہر مراد ہے، ملک مصر مراد نہیں، فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ: پس بیشک تمہارے لیے وہ چیز ہوگی جو تم نے مانگی۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: ماردی گئی اُن کے اُوپر ذلت اور مسکنت۔ ضرب کا لفظی معنی ہے مارنا، اور یہاں اِس کا مطلب یوں ہوتا ہے جس طرح سے آپ کوئی گارا لیں اور دیوار کے اُوپر یوں ماردیں، اس لیے جدید مترجمین نے اس لفظ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بہت مفہوم خیز ہے ''تھوپ دی گئی ان کے اُوپر ذلت اور مسکنت''، جب کسی کے اُوپر کثرت کے ساتھ کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف چڑھادی جائے تو کہتے ہیں کہ اس کے اُوپر تھوپ دی گئی، جیسے ''یہ بات کی کس نے تھی اور تھوپ دی میرے سر''، تو یہاں ضُرِبَتْ کا یہی مطلب ہے، چمٹادی گئی، تھوپ دی گئی اُن کے اُوپر ذلت اور مسکنت، ذلت تو ذلیل ہونے کے معنی میں ہے کہ عزت نہ رہی، اور مسکنت میں عجز اور بے چارگی آگئی، تو ذلت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے ہاں بھی عزت نہ رہی، اور مسکنت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی نظروں میں بھی مسکین ہوگئے، ذلیل ہوگئے اور کوئی اولوالعزمی اور ہمت باقی نہ رہی۔ اپنی نظروں میں بھی ذلیل ہوئے یہ مسکنت ہے، اور لوگوں کی نظر میں بھی ذلیل ہوگئے یہ ذلت ہے، نہ لوگوں کی نظر میں عزت رہی اور نہ اپنی طبیعت میں حوصلہ رہا۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: اور لوٹے وہ اللہ کا غضب لے کر، مستحق ہوئے وہ اللہ کے غضب کے، لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ یہی چیز لے کر وہ لوٹے، یہی چیز اُن کے پلے پڑی، مستحق ہوگئے وہ اللہ کے غضب کے، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ اس سبب سے ہوا کہ وہ انکار کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیات کا، وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ: اور قتل کیا کرتے تھے نبیوں کو، بِغَيْرِ الْحَقِّ: ناحق۔ انبیاء علیہم السلام کا قتل تو ناحق ہی ہوتا ہے لیکن اس کی صراحت اس لیے فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی ان کو قتل کرنا ناحق تھا، اس کے جواز کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، اور پھر ان کے قتل پر کوئی ندامت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا: اور یہ اس سبب سے تھا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ اعتداء: حد سے تجاوز کرنا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

پتھر سے بارہ چشمے جاری ہونے کا واقعہ

بنی اسرائیل کے متعلق واقعات کا تذکرہ چلا آ رہا ہے، اُن واقعات کے سلسلے میں یہ استسقاء کا واقعہ جو ذکر کیا یہ بھی وادیٔ تیہ سے تعلق رکھتا ہے، جہاں اِن کو جہاد کے چھوڑنے کے نتیجے میں یا جہاد کرنے سے انکار کے نتیجے میں محصور کر دیا گیا تھا، وہاں دھوپ کی تکلیف ہوئی تو بادلوں کو سائبان بنا دیا گیا، کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو من وسلویٰ اتار دیا گیا، اور پھر پیاس لگی، موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا، تو اللہ تعالیٰ نے مہربانی کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فلاں پتھر پر اپنا عصا مارو تو اس سے چشمے پھوٹ پڑیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس پر عصا مارا تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہتات کے ساتھ پانی دے دیا۔ بارہ چشمے دیے کیونکہ بارہ خاندان تھے، ہر خاندان نے اپنا ایک ایک چشمہ متعین کر لیا۔ بغیر کسی قرینے کے متعین کر لیا ہوگا، یا ہو سکتا ہے کہ چشموں میں پانی تھوڑا زیادہ ہو، اور بڑے چھوٹے قبیلے کے اعتبار سے اس کی تعیین ہوگئی ہو، کہ جس چشمے سے پانی زیادہ نکلتا ہو وہ بڑے قبیلے نے لے لیا، اور جس سے تھوڑا نکلتا ہو وہ چھوٹے قبیلے نے لے لیا، کوئی وجہ بھی تھی، بہر حال ایک ایک چشمہ ان کے لئے متعین ہو گیا۔ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

پتھر سے پانی کا نکلنا ممکن ہے

اور پتھر سے پانی نکل آنا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تعجب سے دیکھا جائے، اب بھی آپ پہاڑوں میں جا کر دیکھیں، پتھروں سے چشمے پھوٹ رہے ہیں، اور پہلے نہ ہو اور بعد میں پھوٹ جائے ایسا بھی ہوتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کیساتھ پانی نکالتے رہتے ہیں۔ تو ایسے ہی وہ پتھر تھا، جب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عصا مارا تو معجزۃً اُس پتھر نے زمین کا پانی کھینچ کھینچ کر اُوپر ابالنا شروع کر دیا، وہ پانی اُبل اُبل کر باہر نکلنے لگ گیا، جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو چشمے ہیں تو اُوپر سے تو پانی نہیں آتا، وہ نیچے سے ہی پانی جا کر اُوپر سے نکلتا ہے، تو وہاں پتھروں کے اندر کچھ اس قسم کی تاثیر ہوتی ہے کہ زمین کے پانی کو کھینچتے ہیں، کھینچ کے اُوپر سے نکال دیتے ہیں۔ اِسی طرح اِس پتھر نے بھی زمین کا پانی کھینچا ہو اور کھینچ کر نکال دیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، پتھر اِس طرح سے پانی نکالتے رہتے ہیں، اور عصا مارنے کے ساتھ اُس میں چشموں کا پھوٹ پڑنا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے، اور معجزہ ہوا ہی وہی کرتا ہے جو عام طور پر انسان کے بس کی بات نہ ہو، بلکہ ظاہری اسباب کے خلاف ایک واقعہ پیش آ جائے، تو یہاں بھی ظاہری اسباب کے خلاف لاٹھی مارنے کے ساتھ پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے۔

پانی کا ملنا اللہ کا بہت بڑا احسان تھا

یہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے اور اسرائیلیوں کے اُوپر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، ورنہ اگر پانی نہ ملتا تو پانی کی خاطر یہ لوگ پریشان ہوتے، پیاس میں مرتے، اور تھوڑی مقدار میں ملتا تو آپس میں لڑتے اور ان کی تلواریں نکلتیں، کیونکہ شرافت اِن میں جیسی

تھی اور آپس میں رواداری جیسے کرتے تھے وہ آپ کے سامنے ہی ہے، اگر تھوڑا پانی ہوتا تو اُس کے پیچھے لڑتے، مرتے، لاٹھیاں تلواریں نکلتیں، اس طرح سے خراب ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ احسان فرمایا کہ پانی کثرت سے پیدا کیا، اور بارہ چشمے نکال دیے تاکہ ہر قبیلہ اپنے چشمے سے پانی لے اور کسی کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ ہو، یہ احسان ہے۔ فَانْفَجَرَتْ کا معنی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا مارنا ہی تھا کہ اُس پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

سوال:- وادی تیہ میں پہاڑ بھی ہیں؟ وہ تو ریتلا علاقہ ہے۔

جواب:- وہ ایسے ہی ہے جیسے ریتلے علاقوں میں کہیں کہیں کوئی پتھر نمایاں ہو جاتے ہیں، اسی قسم کے پہاڑ ہیں، ریتلے علاقے میں کہیں کہیں کوئی چٹان نمایاں ہوگی، ورنہ اصل وہ علاقہ زیادہ تر ریتلا ہے۔

تمام لوگوں نے اپنے مشرب کو معلوم کر لیا، مشرب گھاٹ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی پیا جاتا ہے۔ جہاں من وسلویٰ کا ذکر تھا تو وہ چونکہ کھانے کی چیز تھی اس لیے وہاں لفظ آیا تھا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ، وہاں صرف کھانے کا ذکر تھا، یہاں کھانے کے ساتھ ساتھ چونکہ پانی بھی مل گیا تو یہاں کُلُوْا وَاشْرَبُوْا دو لفظ آ گئے، اللہ کے رزق سے کھاؤ اور پیو، وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ: زمین میں، علاقے میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو، فساد مچانا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے قوانین کا توڑنا، اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے خلاف جو بھی تصرف کیا جائے کسی علاقے کے اندر وہ سب فساد میں شامل ہوتا ہے، ''زمین میں فساد نہ مچاؤ''۔

روکھی سوکھی کھا کر اپنے وقار کو بحال رکھنا عظیم لوگوں کا شیوہ ہے

اب اُن کو چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے معاشی طور پر اُن کو بے فکر کر دیا، کھانے پینے کی فکر نہیں رہی، اب وہ اپنی قومی حیثیت بحال کرتے، جہاد کی تیاری کرتے، فرعون کی غلامی کی بناء پر ان کے اندر جو پستی آ گئی تھی اُس کو زائل کرتے، اور پھر مجاہدانہ طریقہ اختیار کرتے، ایک مجاہد قوم کی طرح اپنے مخالفوں پر حملہ کرتے اور اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لے لیتے، چاہیے تو یہ تھا کہ جس وقت تک اپنے قومی وقار کو بحال نہ کر لیتے اور اپنا شام کا علاقہ دشمنوں سے واپس نہ لے لیتے اُس وقت تک اِن کو زبان کے چٹخاروں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ جیسے لوگ کہا کرتے ہیں کہ سوکھی روٹی کھاؤ، چنے چباؤ، پانی کا گھونٹ پیو، لیکن اپنی عزت بحال کرنے کی کوشش کرو۔ اور اِن کو تو اللہ تعالیٰ نے گوشت دیا، من دیا، سلویٰ دیا، اور وافر مقدار میں پانی پینے کے لئے دے دیا، تو معاشی حالات سے بے فکر ہو کر وہ جہاد کی تیاری کرتے اور اپنی پچھلی کوتاہیوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے، قومی وقار کو بحال کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جس وقت انسان کی طبیعت میں پستی آ جاتی ہے تو اُس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ زبان کے چسکے انسان چھوڑ نہیں سکتا، وہ کہتا ہے کہ کھانے پینے کے لئے اچھا ملنا چاہیے چاہے کسی کے جوتے چاٹ کر ہی ملے، اِس لیے وہ ایسی حالت کو ترجیح دیں گے کہ جہاں کھانا پینا اچھا ہو، عزت ہو یا نہ ہو، ذلت ہو، ذلت ہی ذلت ہو، دوسرے کی غلامی ہو، دوسرے کے دسترخواں پر بیٹھنا پڑے، لوگ انتہائی ذلت کی نگاہ سے دیکھیں، لیکن چونکہ کھانے پینے کو اچھا ملتا ہے اس لیے انسان اُدھر ہی جھکتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا حال ہوا کرتا ہے جن کی قسمت میں عزت کی زندگی نہیں ہوتی، عزت کی زندگی اُسی شخص کو ملا کرتی ہے جو اپنے وقار کی رعایت رکھے، عزت کی

رعایت رکھے، اور اگر اُس کو سوکھا کھانا پڑے تو سوکھا کھالے، روکھا کھانا پڑے تو روکھا کھالے، پھٹے ہوئے کپڑوں پر گزارہ کرنا پڑے تو پھٹے ہوئے کپڑوں پر گزارہ کرلے، وہ اچھے لباس اور اچھی خوراک کے لئے کسی دوسرے کی غلامی اور اُس کے سامنے ذلت اختیار نہ کرے۔ یہاں اُن کو یہی سبق دینا مقصود تھا کہ اب یہ چسکارے چٹخارے چھوڑ دو، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاشی طور پر بے فکر کردیا ہے، کھاؤ اور مجاہدانہ زندگی اختیار کرو، اور مجاہدانہ زندگی اختیار کر کے اپنے گرے ہوئے قومی وقار کو بحال کرو۔

بنی اسرائیل کی عیاشی اور اس پر ہٹ دھرمی

لیکن وہ ایسے کاہے کو تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم تو ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کرسکتے، ہر روز منّ وسلویٰ پر گزارہ کریں یہ ہم سے نہیں ہوسکتا، ہم تو عادی ہیں کہ پیاز ہو، لہسن ہو، سبزیاں ہوں، کبھی اُن کو شوربے دار بنا کر کھایا جائے، کبھی اُن کو بھون کر کھایا جائے، کبھی مسالے دار بنا کر خوب زبان کے چسکارے چٹخارے پورے کیے جائیں، ہم تو اس طرح سے نہیں کرسکتے کہ روز گوشت کھائیں، موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انہوں نے اس طرح سے جواب دے دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کو ایک فوجی چھاؤنی کے اندر جو رکھا ہوا تھا، اور سارے کے سارے وظائف اُن کو دیے جاتے تھے تاکہ وہ جہاد کی تیاری کریں، اب وہ لوٹ کر پھر آئیں اسی طرح سے؟ ہل جوتیں، زمین کی خاک چھانیں، اور زمین سے نکال نکال کر اِن چیزوں کو کھائیں، اور جب ایک انسان اس طرح سے بیلوں کی دمیں دبانے لگ جائے اور صبح شام رات دن وہ زمین کی مٹی چھاننے لگ جائے تو وہ کیا مجاہدانہ زندگی اختیار کرے گا، جیسے حدیث میں آتا ہے ایک دفعہ ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے سامنے سے آلاتِ زرع میں سے کوئی چیز گزری (جیسے ہل ہے، پھالی ہے، بیل کے اوپر رکھ کر جس سے کام کیا کرتے ہیں) تو کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس گھر کے اندر یہ چیزیں داخل ہوجائیں اُس گھر میں ذلت آجاتی ہے۔[1] مقصد یہی تھا کہ جو لوگ اِن چیزوں کے پیچھے لگ جائیں گے اور جہاد کو چھوڑ دیں گے، جبکہ قوم کی تعمیر ہورہی ہے، تو ایسی صورت میں نتیجۃً دشمن غالب آجائے گا۔ ہر وقت خاک چھان رہے ہیں، ہر وقت بیلوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، کھاد سر پہ اٹھائی ہوئی ہے اور بکھیر رہے ہیں، کاشتکار کا کوئی حال ہوتا ہے؟، اور خاص طور پر وہ وقت جب ایک قوم کی تعمیر ہورہی ہے اور پھر اُن کو بے فکر کیا جارہا ہے کہ تم چھوڑو اِن چیزوں کو اور جہاد کی تیاری کرو، دشمن سے اپنے علاقے واپس لو۔ وہ کہتے ہیں ہم تو وہی زندگی اختیار کریں گے جو پہلے اختیار کر رکھی تھی، پھر یہی کہنا تھا کہ جاؤ، جا کر پھر خاک چھانو اور زمین میں ہل جوتو، اور اسی طرح سے بیلوں کے پیچھے لگو، اور کماؤ اور کھاؤ۔ تو یہ اعلیٰ حالت سے اُن کا نزول پست حالت کی طرف ہوگیا، زبان کے چسکاروں نے اِن کو خراب کیا، کہ زبان کی لذت کی جو عادت پڑی ہوئی تھی اُس نے اِن کو مجاہدانہ زندگی گزارنے پر باقی نہ رکھا، اور اس طرح سے اِن کو ذلت کی طرف لے آئی۔ اور یہ چیزیں پہلے اُن کے عام استعمال میں آتی ہوں گی، بقل: عام سبزیاں، قثاء: ککڑی، فوم: لہسن یا گندم، عدس: مسور، اور بصل: پیاز۔ تو عدس بھی اسرائیلیوں کی مرغوب فیہ چیز ہے، جس طرح سے پیاز لہسن ہیں اسی طرح سے مسری کی دال کا ذکر بھی ہے۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۱۲، باب ما یحذر من عواقب الاشتغال بآلۃ الزرع۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۷، باب المساقاۃ فصل اول۔

دال کے متعلق حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا دلچسپ واقعہ

سنا ہے ایک دفعہ دیوبند میں (طالب علموں کو اکثر و بیشتر مدرسے میں دال کی شکایت تو ہوتی ہی ہے، اس کے متعلق عجیب وغریب قسم کے لطیفے بناتے رہتے ہیں) ایک دفعہ دیوبند میں مسری کی دال ہی پکی ہوئی تھی، اور طالب علم حضرت مدنی رحمہ اللہ کو دکھانے کے لئے پیالہ بھر کر لے گئے، اُس میں نمک مرچ کم ہوگا، پانی کچا ہوگا، جس طرح سے عام طور پر ہوتا ہے، جب اتنے آدمیوں کا کھانا پکنا ہے تو اس میں ایسے ہوتا رہتا ہے، شکایت کرنے کے لئے حضرت مدنی رحمہ اللہ کے پاس گئے، حضرت مدنی رحمہ اللہ کے پاس جس وقت لے جاکے پیالہ رکھا تو آپ تو سمجھ گئے کہ یہ شکایت کرنے کے لئے آئے ہیں، فوراً وہ پیالہ پکڑا اور اُن کے سامنے سارا ہی پی گئے، اور کہنے لگے الحمد للہ! یہ تو وہ نعمت ہے جو اسرائیلیوں کو ترس ترس کے ملی تھی۔ جب یہ بات ہوئی تو آگے سے طالب علم کیا شکایت کریں؟ تو عدس اسرائیلیوں کی مرغوب فیہ چیز ہے، اور اُنہوں نے مانگی تھی، پہلے کھانے کے عادی ہوں گے، اب زبان اس چیز کو ترس رہی تھی، اس لیے جہاں اور چیزوں کو ذکر کیا وہاں اِس مسری کی دال کا بھی ذکر کردیا۔

سوال:- اگر مسری پہلے موجود تھی تو ان کو درخواست دینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ویسے ہی بیج ڈال دیتے زمین میں، وہ کام تو کر ہی سکتے تھے۔

جواب:- بیج تو وہیں ڈالتے جہاں زمین کاشت کے قابل ہوتی، اور بیج وہیں ڈالتے جہاں ان کے پاس بونے کے اور سیراب کرنے کے ذرائع ہوتے، اب کسی کو لے جاکر ریت کے ٹیلے پر بٹھا دیا جائے، جہاں نہ پانی ہے، نہ ہل ہے، نہ بیل ہیں، نہ بیج ہے، اب وہ وہاں سے مسری کیسے نکالے گا، اگر وہ مسری کھانا چاہے گا اور پیاز لہسن کھانا چاہے گا تو اسے یہی کہیں گے کہ بھئی! کسی زرخیز علاقے میں جاؤ، اور وہاں جاکر کاشتکاری کے آلات اختیار کرو، اور جو محنت کا طریقہ ہے کرو، اور جاکر کماؤ اور کھاؤ۔ جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے وہ علاقہ اس قسم کی پیداوار کا نہیں تھا، اس لیے کہا کہ کسی شہر میں جاؤ۔ پہلے یہ چیزیں موجود تھیں، یہ نہیں کہ ان کے مانگنے سے یہ دنیا میں آئی ہیں، اگر پہلے یہ موجود نہ ہوتیں تو ان کو کیسے پتہ تھا کہ پیاز بھی ہوتا ہے اور لہسن بھی ہوتا ہے اور ککڑیاں بھی ہوتی ہیں، کھیرے بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ پہلے مصر کے علاقے میں یہ چیزیں استعمال کرتے تھے، اور اُس وقت بھی باقی دنیا یہ چیزیں کھا رہی تھی، یہ تو اِس قوم کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام تھا کہ ان کو ایک جگہ ٹھہرا کر ان کی فوجی چھاؤنی بنادی، اور وہاں ان کے لئے خاص قسم کا معاش کا انتظام کیا، اور مقصد تھا کہ اب یہ لذتوں سے باز آجائیں، اور اِس کے اوپر کفایت کر کے اپنی جہاد کی تیاری کریں، لیکن وہ اپنی اِن لذتوں سے باز نہیں آئے اور یہ مطالبہ کردیا۔ اس لیے عام لوگ جو کہا کرتے ہیں کہ اگر اسرائیلی یہ دُعا نہ کرتے تو دنیا ہمیشہ گوشت ہی کھاتی، یہ بات بھی وہی واعظوں والی ہے، اُس وقت بھی باقی آبادی یہی چیزیں کھاتی تھی اور اسرائیلی بھی پہلے یہی کھاتے رہے تھے، وہ تو ایک خاص حال کے اعتبار سے اُن کو ایک علاقے میں جو محصور کردیا گیا تھا تو وہاں اُن کے لئے گوشت کا انتظام کیا گیا تھا۔

بنی اسرائیل نے اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی: تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنبیہ کی کہ تم اعلیٰ اور خیر چیز کو چھوڑ کر اس کے بدلے میں ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ اب یہ معاشی طور پر بھی جو تمہیں مل رہا ہے بے فکری کے ساتھ مل رہا ہے، آزادی کے ساتھ مل رہا ہے، بغیر کسی قسم کی ذلت اٹھائے ہوئے مل رہا ہے، یہ رزق بہر حال تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور جو تم لینا چاہتے ہو وہ تمہارے لیے ادنیٰ ہے، کہ تمہاری محنتیں اب اِسی رزق پر ضائع ہونے لگ جائیں گی، اور پھر تمہیں اُسی طرح سے شہر میں جا کر اُسی قسم کی مزدوروں والی زندگی اختیار کرنی پڑے گی جو پہلے تم نے اختیار کر رکھی تھی، تو ایک اچھی حالت کو چھوڑ کر تم ادنیٰ حالت کی طرف کیوں جاتے ہو؟ یہ رزق تمہارے لیے بہتر ہے، اس لیے بہتر ہے کہ آزادی سے مل رہا ہے، چاہے اِس میں وہ نمک مرچ اور مسالوں والی لذت نہیں ہے، لیکن پیٹ بھرنے کے لئے اور زندگی گزارنے کے لئے کافی ہے، عزت سے مل رہا ہے، وقار سے مل رہا ہے، بغیر کسی محنت اور مشقت کے مل رہا ہے، یہ حالت بہر حال تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور دوسری حالت اختیار کرو گے تو اپنی صلاحیتیں تم پھر اُسی طرح سے زمین میں کھپا دو گے، اور وہی محنت مزدوری تمہیں کرنی پڑے گی جس طرح پہلے کرتے تھے، تو تمہاری توجہ جو ایک درجہ علیا کو حاصل کرنے کی طرف لگائی گئی ہے، کہ تم مجاہدانہ زندگی اختیار کر کے اپنے علاقے واپس لو، تم پھر وہی خاک چھاننے میں لگ جاؤ گے، یہ حالت تمہارے لیے اچھی نہیں ہے، شہروں میں جاؤ گے، لوگ اُسی طرح تمہیں مزارع رکھیں گے، اُسی طرح تم کاشتکاری کرو گے، اور وہی مٹی چھاننی ہوگی، اور پھر اپنے لیے تم یہ لذتیں پیدا کرو گے۔ تو جس حالت کی طرف ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں اُس کے یہ بات منافی ہے کہ تم زبان کی لذت کے پیچھے لگ کر اس قسم کی زندگی اختیار کر لو۔ اِهْبِطُوْا مِصْرًا: جب وہ نہیں باز آئے ہوں گے تو پھر انہیں کہہ دیا، کہ اچھا! چلو، کوئی شہر یا کوئی بستی ہوگی صحرائے سینا میں ہی کسی کنارے پر، جس میں کچھ آباد علاقہ ہوگا اور اس میں پیداوار ہوتی ہوگی، ''اترو، نازل ہو جاؤ شہر میں، اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے مانگی۔''

ذِلت اور مسکنت بنی اسرائیل پر کیوں تھوپ دی گئی؟

وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ: اِن کے اُوپر ذلت لازم کر دی گئی، اور ان کو مسکنت چمٹا دی گئی، تھوپ دی گئی اِن کے اوپر ذلت اور مسکنت، کہ نہ تو لوگوں کی نظر میں اِس قوم کی عزت رہی، جو بار بار پٹ رہی تھی اور بار بار اِس طرح سے اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ رہی تھی، اور خود مار کھاتے کھاتے اپنی نظر میں بھی اِن کی عزت نہیں رہی، اپنی نظر میں بھی یہ حقیر اور ذلیل ہو گئے۔ ''اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے، اور یہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹنا اور ذلت و مسکنت کا ان کے اُوپر تھوپا جانا اِس وجہ سے تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے، اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ ذلت اور مسکنت اِن کے اوپر بلاوجہ یا دفعۃً نہیں تھوپ دی گئی، بلکہ ان کی تاریخ تسلسل کے ساتھ کفر بآیات اللہ کی حامل ہے، اور جو اِن کو سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام آتے تھے اُن کو یہ قتل کرنے سے باز نہیں آتے تھے، ان کی یہی حرکتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ قومی سطح پر ذلیل ہو گئے، اور ان کے اوپر مسکنت لازم کر دی گئی، اور اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے، مسلسل ان کی یہ حرکات ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات

کا انکار کرنا اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، کتنے انبیاء تھے جو یہود کے ہاتھوں قتل ہوئے، اِن قومی حرکات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ اِن کے اُوپر ذلت لازم کردی گئی، چمٹا دی گئی، اور اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ اور کفر بآیات اللہ اور قتلِ انبیاء کی نوبت اِس لیے آئی کہ اِن کو نافرمانی کی عادت ہے، اِنہوں نے عصیان اختیار کر رکھا ہے، اور حد سے نکلنے کی عادت ہے۔ تو عصیان اور اعتداء سبب بنا اللہ تعالیٰ کی آیات کے انکار کا اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کا، اور کفر بالآیات اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا سبب بنا اِن کے لئے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کا اور ذلت اور مسکنت کا نشانہ بننے کا، یہ ترتیب ہوئی اِس میں، کہ طبیعت کے اندر سرکشی ہے، فرمانبرداری نہیں ہے (عصیان ایک جذبہ ہے نافرمانی کا، کہ جب کہو اُلٹا چلنا ہے، بعض طبیعتوں کے اندر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ جب اُن کو کوئی نصیحت کی جائے تو اُس کے مطابق چلنے کی بجائے اُن کی طبیعت میں یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ جو کوئی کہے اُس کے اُلٹ چلنا ہے) اِن کی طبیعت میں یہ عصیان ہے، حد پر رہنے کی اِن کو عادت نہیں، حد سے تجاوز کرتے ہیں، یہی جو طبیعت کا جذبہ تھا کہ نصیحت قبول نہیں کرنی بلکہ نصیحت کے مقابلے میں اُلٹی رفتار اختیار کرنی ہے، اِسی نے اِن کو کفر بالآیات اور قتلِ انبیاء علیہم السلام تک پہنچایا، یہ جو عصیان اور نافرمانی کی عادت تھی اِسی کے ساتھ یہ یہاں تک پہنچے، اور جس وقت کفر بالآیات اور قتلِ انبیاء علیہم السلام کا ارتکاب کیا تو اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے اور ذلت اور مسکنت اِن کے اُوپر تھوپ دی گئی۔

سوال:-[1] یہاں ہے یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ، جبکہ تذکرہ تو ہو رہا ہے موسیٰ علیہ السلام کے دور کا، جیسے یہ ذکر ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کھانے کا مطالبہ کیا، تو اُس دور میں موسیٰ علیہ السلام کو یا کسی اور نبی کو اُنہوں نے قتل تو نہیں کیا تھا۔

جواب:- یَقْتُلُوْنَ کا ذکر یہاں جو کیا جا رہا ہے یہ تو ان کے اوپر ضربِ ذلت و مسکنت کی وجہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، کہ اِن کے اوپر ذلت اور مسکنت کیوں چمٹا دی گئی؟ کہ انہوں نے کفر بآیات اللہ کا طریقہ اپنایا اور قتلِ انبیاء کا ارتکاب کیا، یہ قومی طور پر اُن کے ذلیل ہونے کی وجہ ذکر کی جا رہی ہے، تو ضروری نہیں کہ وادی تیہ کے اندر ہی اُنہوں نے کسی کو قتل کیا ہو، یہ تو اُن کی قوم کا بیان ہے۔ اور اِنہوں نے عصیان اور اعتداء کی صفت اختیار کی، جس کے نتیجے میں کفر بآیات اللہ اور قتلِ انبیاء تک پہنچے، اور کُفر بآیات اللہ اور قتلِ انبیاء اِس قوم کے ذلیل ہونے کا سبب بن گیا، یہ خاص طور پر اُنہیں نہیں کہا جا رہا جو وادی تیہ میں تھے، یہ تو قومِ یہود کی ایک کیفیت کو واضح کیا جا رہا ہے، جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہے، اُن کے سامنے قومی حیثیت ذکر کر دی گئی، یہ صرف وادیٔ تیہ والوں کے متعلق نہیں ہے۔

یہودی حکومت کی نفی منصوص نہیں، بلکہ ائمۂ تفسیر کا قول ہے

قرآنِ کریم کی آیات کا مفہوم تو یہی ہے، باقی رہی یہ بات کہ اِن کے اُوپر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی، اِس کا مطلب کیا ہے؟ ائمۂ تفسیر میں سے بعض علماء کا یہ قول آتا ہے کہ ذلت اور مسکنت اِن کے اُوپر تھوپ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ یہ دوسری قوموں کے باج گزار رہیں گے، اُن کے مطیع رہیں گے، اور کہیں بھی اِن کی پُرشوکت باوقار آزاد حکومت نہیں قائم ہو سکتی۔ یہ

(۱) یہ سوال جواب اگلی آیات کے ترجمے کے بعد تھا، آسانی کے لئے یہاں درج کیا گیا ہے۔

آج سے تیرہ سو سال پہلے کے اقوال تفسیر کی کتابوں کے اندر موجود ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی نقل کیا ہے،[1] اور آپ نے سنا ہوگا، عام طور پر یہ لوگوں کی زبان پر ہے، کہ یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوسکتی۔ پھر ان لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ جب یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوسکتی تو پھر یہ اسرائیل جو بن گیا، وہاں تو یہود کی حکومت ہے، پھر یہ بات کس طرح سے بنی؟ جس وقت پہلے پہلے اسرائیل کا وجود ہوا ہے تو اُس وقت یہ اشکالات بہت کثرت سے ہوتے تھے، اور ہمارے سامنے بھی یہ بات کئی دفعہ ہوئی...... یہ اسرائیل اسرائیل جو آپ سنتے رہتے ہیں اس کی عمر زیادہ نہیں ہے، پاکستان پہلے بنا ہے، اسرائیل کا وجود بعد میں ہوا ہے، پاکستان کی عمر اسرائیل سے زیادہ ہے، اسرائیل مملکت بعد میں بنی ہے، دنیا میں دو ملک ہیں جو مذہب کے نام پر رونما ہوئے ہیں، اِدھر پاکستان بنا اسلامی نعرے کے ساتھ، کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہوگا، یہاں اسلام ہوگا، اور اُدھر اسرائیل کا وجود آیا یہودیت کے نعرے پر، ساری دنیا کے اندر یہ دو مملکتیں ہیں جن کا وجود اس نقشے کے اُوپر مذہبی جذبے کے تحت رونما کیا گیا ہے، اسرائیل یہودی جذبے کے تحت آیا اور پاکستان اسلامی جذبے کے تحت آیا، پاکستان پہلے بنا ہے اور فلسطین تقسیم ہوکر یہود کی ریاست بعد میں قائم ہوئی ہے، جیسا کہ چین جو آپ کے قریب مملکت ہے یہ پاکستان سے دو سال چھوٹی ہے، پاکستان سے دو سال بعد چین آزاد ہوا ہے، اور ہم اِن سے پہلے آزاد ہوئے ہیں...... جس وقت یہ اسرائیل حکومت قائم ہوگئی، چونکہ بظاہر وہ یہودیوں کی حکومت ہے، تو پھر یہ سوالات ہوتے تھے، اور لوگوں کے سوال کرنے کا انداز یہی ہوتا تھا کہ قرآن میں تو آتا ہے کہ قیامت تک اِن کی کہیں حکومت نہیں ہوگی، پھر یہ حکومت کیسے بن گئی؟ اُس وقت سے علماء اِس بات کی وضاحت کرتے ہیں، اور اِسی کی وضاحت آپ کے سامنے چند لفظوں میں کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو آپ یہ بات جان لیجئے کہ قرآن میں یا حدیث میں کسی جگہ یہ لفظ نہیں آتے کہ قیامت تک یہود کی حکومت نہیں آسکتی، قرآن تو آپ پڑھتے ہی ہیں، حدیث آپ پڑھ لیں گے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوگی، یا قرآنِ کریم کی کسی آیت کا ترجمہ یہ ہو کہ قیامت تک اِن کی کہیں حکومت نہیں ہوگی، یہ بات غلط ہے، نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ البتہ قرآنِ کریم کی آیت ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ سے استنباط کرتے ہوئے بعض اَئمۂ تفسیر نے یہ بات لکھی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی طرف سے یہ اقوال آئے ہیں کہ ان کے اُوپر ذلت چمٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ لازم ہوگئی، اب اِن سے جدا نہیں ہوگی، جس طرح سے درہم کے اُوپر مہر لگادی جاتی ہے، ضربِ دراہم: مہر لگانا، کہ اُس کے اُوپر نقش ونگار لازم کردیا گیا، اسی طرح سے یہ ذلت اور مسکنت اِن کے اُوپر چمٹادی گئی کہ اب اِن سے جدا نہیں ہوگی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہمیشہ قوموں میں ذلیل قوم ہوگی، حقیر قوم ہوگی، کسی جگہ بھی پُرشوکت اور باوقار طریقے سے آزادانہ زندگی یہ لوگ نہیں گزار سکتے۔ اس آیت کی تفسیر کے طور پر ائمہ تفسیر کے یہ اقوال کتابوں میں موجود ہیں، تو یہ تفسیری درجے کی بات ہے، قرآنِ کریم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ہے کہ اِن کی قیامت تک کہیں حکومت قائم نہیں ہوگی۔

---

(۱) قرطبی، ابن کثیر وغیرہ. لفظ القرطبی: هم اصحاب القبالات. ولفظ ابن کثیر: هم اصحاب القبالات يعني الجزية.

یہود ایک سازشی قوم ہونے کی وجہ سے دُنیا میں ذلیل وخوار رہی ہے

باقی یہ تفسیر کہاں تک صحیح ہے؟ جب یہ ائمۂ تفسیر کی بات ہے تو ہم اِس کو بھی تو غلط نہیں کہہ سکتے، یہ بات پھر کہاں تک صحیح ہے کہ قیامت تک اِن کی حکومت نہیں آسکتی، اور یہ جو حکومت بن گئی ہے پھر اس کا اِس قول کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟ یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے سامنے اِن کی ایک مملکت کا وجود ہو گیا، ورنہ تیرہ سو سال قبل سے لے کر آج سے تیس سال پہلے تک[1] تو بات بالکل واضح تھی کہ اِن کی کہیں حکومت نہیں تھی، دربدر یہ دھکے کھاتے پھر رہے تھے، کبھی کسی ملک میں جاتے، وہاں سے دھکے دے کر اِن کو نکال دیا جاتا، کیونکہ یہ سازشی قوم ہے، سازشیں کرتی ہے، شرارتیں پھیلاتی ہے، دوسرے یہ سود خور ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں معاشیات پر قبضہ کر کے سود کے رنگ میں سارا مال اکٹھا کرنا شروع کر دیتے ہیں، سرمایہ داری کو جنم دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اِن کے خلاف ہمیشہ شورشیں ہوتی رہتی ہیں، اور اِن کو اتنا مارا گیا اور اتنا قتل کیا گیا اور اتنا ذلیل ہوئے کہ قومی سطح پر آج تک کسی قوم کے ساتھ ایسے حالات پیش نہیں آئے جس قسم کے حالات یہودیوں کے ساتھ مسلسل پیش آتے رہے ہیں، حتیٰ کہ جنگِ عظیم میں جرمن کے اندر یہ اتنے پٹے ہیں اور اتنا اِن کو ذلیل کیا گیا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ ہوٹلوں پر لوگوں نے تختیاں لکھ کر لگائی ہوئی تھیں کہ اِس ہوٹل کے اندر کُتا اور یہودی داخل نہیں ہو سکتے، یعنی ممانعت اس طرح سے کر دی کہ اس ہوٹل میں کوئی کُتا اور یہودی نہیں آسکتے، کتے کے آنے کی بھی ممانعت اور یہودی کے آنے کی بھی ممانعت، اس طرح سے لوگ اِن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ ان کی سازشوں کے نتیجے میں عموماً دنیا میں لڑائیاں ہوئیں، یہ ہمیشہ ذلیل رہے ہیں۔ تو اُس وقت تک تو کوئی اِشکال ہی نہیں تھا، اور ساری دنیا ایک نقشہ سامنے پیش کر رہی تھی کہ واقعی یہ قوم ذلیل ہے، اور قیامت تک یہ قوم اُبھر نہیں سکتی۔

اسرائیل کی برائے نام حکومت کی حقیقت قرآنِ کریم کی روشنی میں

پھر جس وقت یہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور برائے نام اِن کی ایک حکومت سی بن گئی، اُس وقت یہ اِشکال ہوا، تو پھر اس اِشکال کی وضاحت کے لئے یہ بات کہنی پڑی کہ قرآنِ کریم میں یہی مسئلہ دوسری جگہ بھی مذکور ہے...... خیال فرما لیجئے!......

آلِ عمران میں ایک آیت آئے گی ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (سورۂ آل عمران: ۱۱۲) اِن کے اُوپر ذلت لازم کر دی گئی، ہاں اگر یہ ذلت سے بچ سکتے ہیں تو بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ: یا تو اللہ کی رسی تھام کر یا لوگوں کی رسی تھام کر، حبل کہتے ہیں رسّی کو، حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے تحت اِن کو تحفظ ہو جائے، جس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ جیسے بچہ ہے اس کو ذلیل نہیں کیا جا سکتا، نہ قتل کیا جا سکتا ہے، نہ اس پر جزیہ رکھا جا سکتا ہے، اسی طرح عورت کے اوپر نہ جزیہ رکھا جا سکتا ہے نہ اُس کو قتل کیا جا سکتا ہے، بوڑھے کو نہ ذلیل کیا جا سکتا ہے، نہ جزیہ رکھا جا سکتا ہے، نہ قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح سے اِن کے علماء، احبار، رُہبان، جو صرف اپنے خیال کے مطابق دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، جنگ میں اور شرارتوں میں حصّہ نہیں

---

(۱) یہ درس سن ۱۹۸۰ء کا ہے، اور یہ بات اُس سن کے مطابق ہے۔ ناقل۔

لیتے، تو اُن کو بھی اسلامی طور پر تحفظ حاصل ہے، کہ نہ اِن کے اُوپر جزیہ رکھا جائے گا اور نہ اِن کو قتل کیا جائے گا، یہ توحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ ہے کہ اللہ کے قانون نے جس کو تحفظ دے دیا وہ کسی درجے میں ذلت سے بچ جائے گا۔ اور حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کے زیرِ سایہ کچھ وقت گزار لیں۔ تو جب قرآنِ کریم میں حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کا لفظ موجود ہے تو اِشکال سرے سے ہی ختم، کیونکہ دنیا میں یہ ایک بیّن حقیقت ہے اور بداہت کے درجے میں ہے کہ یہود قوم اپنے پاؤں پر خود نہیں کھڑی ہوئی، برطانیہ اور امریکہ نے اِن کی سرپرستی کرتے ہوئے اپنے لیے ان کو ایک چھاؤنی بنا کر دی ہے تاکہ مشرقِ وسطیٰ میں عرب ممالک کے اُوپر وہ کنٹرول رکھ سکیں، تو یہ گویا کہ ایک فوجی چھاؤنی بنادی، اور یہود کے نام پر ایک مملکت بنا کر دنیا سے یہودیوں کو لا لا کر وہاں بسانا شروع کر دیا۔ اور آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے اندر جتنی بے چینی اور جتنی پریشانی ہے وہ صرف اسی کے وجود کی بناء پر ہے، اور آج بھی ان کے سر پر امریکہ کا ہاتھ ہے، اسلحہ وہی دیتا ہے، امداد ہر قسم کی وہی دیتا ہے، آج بھی اگر یہ لوگ اِن کے ساتھ تحفظ کے معاہدے ختم کر دیں تو یہ اپنے وجود کو اس وقت بھی باقی نہیں رکھ سکتے، یہ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کی ایک مثال ہے، کہ لوگوں کے سہارے کے ساتھ اور ان کی سرپرستی میں زندہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس میں کوئی خفاء نہیں ہے، جب بھی کسی طرف سے اِن کے ساتھ کوئی لڑنے کی نوبت آتی ہے تو مقابلے میں امریکہ آجاتا ہے، امریکا دھڑا دھڑ اسلحہ دیتا ہے، ساری کی ساری اِن کو امداد دیتا ہے، معاشی طور پر اِن کو وہی سنبھالتا ہے، اور آج بھی اگر وہ ان کی سرپرستی چھوڑ دے تو یہ قوم اس حیثیت میں قطعاً نہیں ہے کہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔ تو اس قسم کی چھوٹی سی مملکت......! اب یہ اسرائیل کا رقبہ اور اِس کا حدودِ اربعہ ہمارے پنجاب کے ایک ضلع کے برابر بھی نہیں ہے، فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کو آدھا تقسیم کر دیا گیا، اور آدھے کے اندر ان کی ریاست بنادی گئی، بہت تھوڑی سی جگہ ہے اور بہت کم اُس کی آبادی ہے، بس یوں سمجھئے کہ امریکہ کی ایک فوجی چھاؤنی ہے، اپنے قدموں پر وہ قطعاً نہیں ہے۔

اسرائیل حکومت ڈاکوؤں کے قبضے کی طرح ہے

دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جہاں یہ نفی کی گئی ہے کہ اِن کی کہیں باوقار حکومت قائم نہیں ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی قوموں کی طرح نہیں ہوگی۔ اب دنیا کا رقبہ کتنا وسیع ہے، اور اس کے اُوپر دہریوں کی حکومتیں ہیں، بت پرستوں کی حکومتیں ہیں، عیسائیوں کی بہت بڑی بڑی حکومتیں ہیں، اس گئے گزرے زمانے میں مسلمانوں کی بھی بڑی بڑی حکومتیں ہیں، لیکن اُن کے مقابلے میں اگر یہود کی اِس مملکت کو دیکھا جائے تو ایک نقطے کی طرح ہے۔ اور اتنی قلیل جگہ کے اوپر اگر یہ کچھ لوگ ڈاکوؤں کی طرح اکٹھے ہو گئے اور دوسروں کے حقوق غصب کر کے اُس کے اوپر یہ مسلط ہو گئے تو ڈاکوؤں کا قبضہ کوئی باعزت زندگی نہیں ہوتی، دس ڈاکو اکٹھے ہو کر کسی شریف آدمی کی کوٹھی پر حملہ کریں اور اُس کے اوپر قدم جما کر بیٹھ جائیں تو اس کو باوقار حکومت نہیں کہا کرتے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک عربوں کے ساتھ مسلسل اُن کا تصادم ہے، اور اُن کو یونہی سمجھا جاتا ہے کہ اِن مغربی اقوام نے اکٹھے ہو کر عربوں کے اوپر ظلم کیا، اور اُن کی جائیدادیں چھین چھین کر یہودیوں کو دے دیں اور ان کو یہاں آباد کر دیا۔ تو ان کی حیثیت ایسے ہی

ہے جیسے کسی دوسرے کی جگہ پر جا کر ڈاکو زبردستی قبضہ کرلیں۔ مزاحمت اُسی طرح سے جاری ہے، اور اگر دوسری قومیں ان کو سہارا نہ دیں تو اپنے وجود کو یہ قطعاً باقی نہیں رکھ سکتے۔ تو اس سلطنت کی وجہ سے جو اشکال پیدا ہوتا ہے اس کو حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے لفظ کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے، اور یہ آیت قرآنِ کریم میں موجود ہے، کہ اللہ کے قانون کے تحت ان کو تحفظ ہو جائے یا یہ ہے کہ لوگوں کے سہارے یہ اپنے آپ کو کچھ سنبھال لیں، ایسا ممکن ہے۔ تو اس تقریر کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا کہ یہود کی حکومت تو ہوگئی، اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہود کی حکومت کہیں نہیں ہوگی، اور یہ کہا جو جاتا ہے یہ بھی ائمہ کے اقوال ہیں، باقی! قرآن اور حدیث میں کوئی اس قسم کی آیت نہیں ہے جس سے یہ صراحتاً ثابت کیا جائے کہ یہود کی حکومت نہیں ہوگی۔ اور روایات میں اتنی بات ثابت ہے کہ دجالِ اکبر کے زمانے میں ان کی حکومت ہوگی، اور ایک شورش سی برپا ہوگی، اور پھر مقابلہ ہوگا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں وہ دجال بھی قتل ہو جائے گا اور سارے کے سارے یہودی بھی ختم ہو جائیں گے، پھر ان کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا۔ تو وہ بھی ایک شورش ہے، جس طرح ایک بغاوت سی برپا ہو جایا کرتی ہے۔ اسرائیل کے حالات اِس وقت بھی ایسے ہی ہیں کہ دوسرے علاقے والوں کے مقابلے میں اُن کی ایک بغاوت اور سرکشی ہے، ایک ظالمانہ زندگی ہے، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے والی بات ہے۔ دجال کے زمانے میں یہ چیز اپنے عروج پر پہنچ جائے گی، اور عروج پر پہنچنے کے بعد مقابلہ ہوگا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ نیست ونابود ہو جائے گا۔ تو ضربِ ذلت ومسکنت کا مطلب یہ ہوا کہ رہیں گے تو یہ ذلیل اور مسکین، باقی! کبھی کسی کے سہارے یا وقتی طور پر ڈاکوؤں کی طرح کسی علاقے پر غالب آجائیں تو اُس کو دیگر اقوام کے مقابلے میں کوئی باوقعت حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا، اور اتنی بڑی دنیا میں اتنے تھوڑے سے علاقے پر اگر وہ قابض ہو بھی گئے تو ساری دنیا کے مقابلے میں ایک نقطے کے برابر ہیں، اور اتنی سی سلطنت کو کوئی باوقار سلطنت نہیں قرار دیا جا سکتا، اس کے باوجود حالات یہ ہیں کہ اگر مغربی اقوام ان کی سرپرستی نہ کریں تو اس وقت بھی اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

اِنَّ	الَّذِیْنَ	اٰمَنُوْا	وَالَّذِیْنَ	هَادُوْا	وَالنَّصٰرٰی	وَالصّٰبِـِٕیْنَ
بیشک وہ لوگ	جو	ایمان لائے	اور جو لوگ	یہودی ہوئے	اور نصرانی	اور صابی،
مَنْ	اٰمَنَ	بِاللّٰهِ	وَالْیَوْمِ	الْاٰخِرِ	وَعَمِلَ صَالِحًا	فَلَهُمْ
جو کوئی بھی	ایمان لائے	اللہ پر	اور یوم	آخر پر	اور نیک عمل کرے	پس ان کے لئے ان کا
اَجْرُهُمْ	عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ	وَلَا خَوْفٌ	عَلَیْهِمْ	وَلَا هُمْ	یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾	وَاِذْ
اجر ہے	ان کے رب کے پاس،	نہ خوف ہوگا	ان پر	اور نہ وہ	غمزدہ ہوں گے ﴿۶۲﴾	اور یاد کیجئے جس وقت

اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ

لیا ہم نے تم سے تمہارا پختہ عہد، اور اٹھایا ہم نے تمہارے اُوپر طور کو، (اور ہم نے کہا) قوت کے ساتھ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے

بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ

تمہیں دی، اور یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تاکہ تم متقی بن جاؤ ۝ پھر تم نے پیٹھ پھیر لی

بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ

اس (سارے حال) کے بعد، اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو البتہ ہو جاتے

الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ

تم خسارہ پانے والوں میں سے ۝ تحقیق جان لیا تم نے ان لوگوں کو جنہوں نے حد سے تجاوز کیا تھا تم میں سے ہفتہ کے بارے میں

فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ

پھر ہم نے کہہ دیا ان سے کہ ہو جاؤ تم ذلیل بندر ۝ پس بنا دیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لئے جو اس واقعہ کے

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى

سامنے تھے اور ان لوگوں کے لئے جو اس واقعہ کے بعد تھے، اور نصیحت متقین کے لئے ۝ اور یاد کیجئے جس وقت کہا موسیٰ نے

لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا

اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو، انہوں نے کہا کیا آپ ہمیں بناتے ہیں

هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ

ٹھٹھہ کیا ہوا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ۝ وہ کہنے لگے تو پکار

لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا

ہمارے لیے اپنے رَبّ کو کہ وہ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک اللہ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ جو نہ

فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝

بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی ہو، متوسط ہو ان دونوں عمروں کے درمیان، تم کرو اس کو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے ۝

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

وہ کہنے لگے کہ تو پکارا پنے رَبّ کو ہمارے لیے کہ وہ ہمارے لیے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک اللہ کہتا ہے

بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی اس کا رنگ خوب گہرا ہو، دیکھنے والوں کو خوش کردیتی ہو ﴿٦٩﴾ وہ کہنے لگے کہ پکار تو ہمارے لیے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۗ وَإِنَّآ إِنْ

اپنے رَبّ کو کہ وہ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ بیشک وہ گائے ہم پر کچھ مشتبہ سی ہو رہی ہے، اور بیشک ہم

شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ

اگر اللہ نے چاہا البتہ سیدھی راہ پا جائیں گے ﴿٧٠﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک اللہ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو جو کام میں لگائی ہوئی نہ ہو

تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۗ قَالُوا

کہ باہتی ہو زمین کو اور نہ ایسی ہو کہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو، بے عیب ہو، اس میں کوئی داغ نہ ہو، انہوں نے کہا

الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾

اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بات کی ہے، پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور قریب نہیں تھا کہ وہ یہ کام کرتے ﴿٧١﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے، وَالَّذِيْنَ هَادُوْا: هَادَ يَهُوْدُ تَهَوَّدَ: یہودی ہونا۔ سورۂ جمعہ میں بھی خطاب اِسی طرح سے آئے گا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا۔ اور هَادَ يَهُوْدُ کا اصل معنی ہوتا ہے رجوع کرنا، سورۂ اعراف میں یہ لفظ اِسی معنی میں آئے گا اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ (آیت:۱۵۶) ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ تو هَادَ يَهُوْدُ تَهَوَّدَ: یہودی بننا۔ وَالَّذِيْنَ هَادُوْا: اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، وَالنَّصٰرٰى: نصاریٰ نَصْرَان کی جمع ہے جیسے نَدَامٰی جمع ہے نَدْمَان کی (مظہری)، اور نصران اُس شخص کو کہتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا ہو، اُن کو نصران کہنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس بستی کے رہنے والے تھے اُس بستی کا نام ناصرہ تھا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیحِ ناصری کہتے ہیں، تو اُن کے ساتھ تعلق رکھنے والے نصران تھے، جس کی جمع نصاریٰ آگئی۔ اس لیے انجیل کا ترجمہ جو آجکل لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس میں عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ناصری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ''اور نصاریٰ، اور وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے'' جو اپنے آپ کو عیسیٰ علیہ السلام کی امت کہلاتے ہیں۔ وَالصّٰبِـِٔيْنَ: یہ صابی کی جمع ہے، یہ بھی اُس وقت ایک فرقہ تھا، جس کی صحیح کیفیات متعین نہیں ہیں، عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ زبور کی طرف

منسوب تھے، اور ستارہ پرستی اختیار کر لینے کی وجہ سے اِن کے مسلک میں بھی شرک داخل ہو چکا تھا۔ ’’بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے‘‘ وَالنَّصٰرٰی کا عطف اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پر ہے اس لیے یہ بھی نصبی حالت میں ہے، اور وَالصّٰبِـِٕیْنَ کا عطف بھی اسی پر ہے اس لیے یہ بھی منصوب آیا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخر پر، وَعَمِلَ صَالِحًا: اور نیک عمل کرے، فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: پس اُن کے لئے اُن کا اجر ہے اُن کے رب کے پاس، وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ: نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ خوف اور حزن کے درمیان فرق آپ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں آ گیا تھا، کہ خوف آنے والے کسی خطرے سے ہوتا ہے اور حزن گزرے ہوئے کسی واقعہ پر ہوتا ہے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ: اور یاد کیجئے! جس وقت لیا ہم نے تم سے تمہارا پختہ عہد، میثاق پختہ عہد کو کہتے ہیں، وُثوق اِس کا مادہ ہے جس کے اندر اعتماد اور پختگی والا معنی پایا جاتا ہے۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ: طور سے طور پہاڑ مراد ہے، اور اٹھایا ہم نے تمہارے اُوپر طور کو، خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ: یہاں خُذُوْا سے پہلے قُلْنَا محذوف ہے، اور کہا ہم نے کہ پکڑو اُس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے، بِقُوَّةٍ: پکڑو قوت کے ساتھ۔ بِقُوَّةٍ کا تعلق خُذُوْا کے ساتھ ہے۔ خُذُوْا بِقُوَّةٍ: جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اِس کو پوری مضبوطی سے تھام لو، پوری قوت کے ساتھ پکڑ لو۔ اور مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ کا مصداق یہاں تورات ہے۔ وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ: اور یاد رکھو اُن باتوں کو جو اُس میں ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم متقی بن جاؤ، تاکہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ، تاکہ تم اللہ کے عذاب سے بچ جاؤ۔ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: پھر تم نے پھر پیٹھ پھیر لی اِس سارے حال کے بعد، ذٰلِكَ کا اشارہ پچھلے واقعہ کی طرف ہے، کہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے طور پہاڑ تمہارے اوپر معلق کر کے تمہیں تورات کے متعلق تاکید کی تھی کہ اِس کے احکام پر مضبوطی سے عمل کرو، اِس ساری کارروائی کے بعد تم نے پھر پیٹھ پھیر لی۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اُس کی رحمت لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ: البتہ ہو جاتے تم خسارہ پانے والوں میں سے، اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت ہے جس نے تمہیں بچا لیا، ورنہ تمہارے کرتوت تو اس قسم کے تھے کہ تمہیں دنیا کے اندر تباہ کر دیا جاتا اور تمہارا خسارہ اور گھاٹا نمایاں ہو جاتا۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ: لَقَدْ کے اُوپر لام جو ہوتا ہے، آپ جلالین میں پڑھیں گے، یہ دال بر قسم ہوتا ہے، تَوطِئَةً لِلْقَسَم اِس لام کو داخل کر دیتے ہیں، گویا کہ اس میں قسم والا مفہوم پیدا ہو گیا، ’’تحقیق جان لیا تم نے، تمہیں معلوم ہے، جان لیا تم نے اُن لوگوں کو جنہوں نے حد سے تجاوز کیا تھا تم میں سے ہفتے کے بارے میں‘‘۔ سبت: ہفتہ، جمعہ سے اگلا دن جو آیا کرتا ہے، ہفتہ کے بارے میں جنہوں نے تم میں سے حد سے تجاوز کیا تھا تم نے ان کو جان لیا، تمہیں وہ معلوم ہیں۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً: پھر ہم نے کہہ دیا اُن سے، یہ کہنا تکوینی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی، ہم نے کہہ دیا اُن سے كُوْنُوْا: ہو جاؤ تم، قِرَدَةً، قِرد کی جمع ہے قِرد بندر کو کہتے ہیں، خٰسِـِٕیْنَ: ذلیل۔ ہو جاؤ تم ذلیل بندر۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم چونکہ تکوینی ہے اس لیے کُن کے ساتھ فَیَكُوْنُ، جو اللہ کہہ دے وہی ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے اِس حکم دینے کے ساتھ یعنی اِس کُن کے ساتھ واقعہ پیش آ گیا کہ وہ بندر ہو گئے نہایت ذلیل قسم کے۔ فَجَعَلْنٰهَا: ہم نے بنا دیا اس واقعہ کو نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا: نکال کا معنی عبرت، گناہوں سے روکنے والی چیز، یعنی اِس واقعہ کی یہ حیثیت تھی کہ لوگ اِس کو دیکھیں تو اللہ کی نافرمانی سے رکیں، ’’پس بنا دیا ہم نے اِس واقعہ کو عبرت‘‘، لِمَا بَیْنَ یَدَیْهَا: اُن لوگوں کے لئے جو اِس واقعہ کے سامنے تھے یعنی جو

اُس وقت موجود تھے، وَمَا خَلْفَهَا: اور اُن لوگوں کے لئے جو اس واقعہ سے پیچھے تھے۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ: مَوْعِظَةً مصدر میمی ہے وعظ سے، وَعَظَ يَعِظُ کا معنی ہوتا ہے نصیحت کرنا، یعنی کسی کے ساتھ ایسی رقت آمیز باتیں کرنا جن کے ساتھ وہ متاثر ہو کر کسی بات کو قبول کرلے، اِس کو کہتے ہیں وعظ۔ قرآنِ کریم میں لفظ مَوْعِظَةً کئی جگہ آیا ہے، ویسے مضارع کے طور پر بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ (سورۂ لقمان: ۱۳) جب لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ اُس کو وعظ کہہ رہے تھے، اور نصیحت اِس کا حاصل معنی کردیا جاتا ہے۔ واعظ ہوتا ہے وعظ کہنے والا۔ موعظہ: نصیحت۔ ''وعظ متقین کے لئے''۔ تو موعظہ اور نکال کے درمیان میں فرق یوں کیا جاسکتا ہے کہ یہ جو سزا کا واقعہ پیش آیا اس کے دو پہلو ہیں، گناہ گار دیکھیں تو گناہ سے باز آجائیں، اور صالحین دیکھیں تو اُن کی اطاعت کی طرف زیادہ رغبت پیدا ہو، فرمانبرداروں کے لئے زیادہ رغبت کا باعث بنے گا اور نافرمانوں کے لئے نافرمانی سے روکنے کا ذریعے بنے گا۔ تو نافرمانی سے روکنے کا ذریعہ بننے کے اعتبار سے وہ واقعہ نکال ہے، اور نیکی کی زیادہ ترغیب دینے کے اعتبار سے وہ واقعہ موعظہ ہے، اس طرح سے دونوں لفظوں کے درمیان فرق کردیا جائے گا۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ: یاد کیجئے! جس وقت کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً: کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک بقرہ ذبح کرو، بقرہ کا ترجمہ گائے کے ساتھ بھی کیا گیا ہے جیسے کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ گائے کے ساتھ ہی کیا ہے، اور اس کا ترجمہ بیل کے ساتھ بھی کیا گیا ہے جیسے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں لفظ بیل استعمال کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ بقرہ کا لفظ اُس نوع کے لئے بولا جاتا ہے جس میں مذکر اور مؤنث دونوں آسکتے ہیں، اور قرائن دونوں قسم کے ہیں کہ وہ مذکر تھا یا مؤنث۔ بہرحال بقرہ کا اطلاق دونوں پر ہے، مذکر بھی ہوسکتا ہے اور مؤنث بھی ہوسکتا ہے، اُس نوع کو کہتے ہیں۔ جیسے شاۃ بکری کی نوع کو کہتے ہیں، اِس میں مذکر اور مؤنث دونوں آسکتے ہیں۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا: اُنہوں نے کہا، موسیٰ علیہ السلام کی جو قوم تھی بنی اسرائیل اُنہوں نے کہا، اِذْ قَالَ مُوْسٰى کا تعلق قَالُوْٓا کے ساتھ بھی لگا سکتے ہیں، تو پھر اُذْكُرْ يَا لِيَذْكُرْ محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے شروع میں جو اِذْ آیا تھا تو اُس میں میں نے ذکر کیا تھا کہ اِذْ کا تعلق مابعد قَالُوْٓا کے ساتھ لگ سکتا ہے، یہاں بھی اسی طرح ہے، ''جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنی قوم کو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ کہنے لگے'' اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا: هُزُوًا: مَهْزُوًّا بِنَا جن کا مذاق اڑایا جائے، کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟، کیا بناتے ہیں آپ ہمیں ٹھٹھہ کئے ہوئے؟ ہمارے ساتھ آپ ٹھٹھہ کرتے ہیں؟، مذاق کرتے ہیں؟ یہ انہوں نے کب کہا تھا؟ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً، جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا اپنی قوم کو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو، تو اب اِذْ کا تعلق قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کے ساتھ ہوگیا، یعنی اُن کی قوم نے اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کب کہا؟، جب موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ اللہ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ اب یہاں دیکھو! ان کا وہی مزاج اور کمینہ پن گفتگو میں کس طرح سے ظاہر ہے، موسیٰ علیہ السلام جن کو وہ اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں، اور ان کے معجزات صبح شام دیکھتے تھے، اب وہ اللہ کا پیغمبر کہتا ہے، اور کہتا بھی اللہ کی طرف نسبت کرکے ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ، اور وہ آگے سے کہتے ہیں تو ہم سے مذاق کرتا ہے۔ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں۔ جاہل کا لفظ جہل سے لیا گیا ہے، جہل کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے،

ایک جہل علم کے مقابلے میں ہوتا ہے، علم کا معنی جاننا اور جہل کا معنی نہ جاننا، جس کو آپ نادان کہتے ہیں، اُس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات کہی نہ ہو اور اُس کی طرف منسوب کر کے کہہ دی جائے کہ اللہ نے یوں کہا ہے، یہ تو نادانوں کا کام ہے، میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں، کہ اللہ نے ایک بات نہ کہی ہو اور میں اُس کی طرف منسوب کر کے کہہ دوں، پھر اس کا مفہوم اس طرح سے ہوگا، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: اللہ کی طرف غلط بات منسوب کرنا، اللہ نے بات کہی نہ ہو اور اُس کی طرف منسوب کر دی جائے کہ اللہ نے کہی ہے، یہ تو نادانوں کا کام ہے، جاہلوں کا کام ہے، میں جاہلوں میں سے ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مجھے بچائے، میں جاہلوں میں سے نہیں ہوں، ایک بات اللہ نے کہی نہ ہو اور میں منسوب کر دوں کہ اللہ نے یوں کہا، تو پھر یہ جہل علم کے مقابلے میں بھی ہے۔ اور ایک جہل آیا کرتا ہے حلم کے مقابلے میں، حلم کو بردباری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اور حلم کے مقابلے میں بھی جہل آتا ہے، حماسہ (ص ۳) میں آپ پڑھیں گے، حماسی شاعر کہتا ہے دوسرے قصیدے میں بَعْضُ الْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ لِلذِّلَّةِ اِذْعَانٌ: کہ جس وقت بعض لوگوں کی طرف سے تو ہمارے ساتھ جہالت کی جائے اور ہم ان کے مقابلے میں حلم سے کام لیں تو یہ ذلت کا اعلان ہے، یہاں حلم جہل کے مقابلے میں ہے، حلم کا معنی بردباری سنجیدگی اور وقار، اور جہل کا مطلب ہوگا اشتعال انگیزی اور غیر سنجیدہ باتیں کرنا، وقار کے خلاف باتیں کرنا، تو جاہل وہ ہوگا جو سنجیدہ نہ ہو، باوقار نہ ہو، بلکہ اوچھی قسم کی اور اشتعال انگیزی کی باتیں کرے، اور اس کے مقابلے میں آئے گا حلم۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ نبی انتہائی سنجیدہ انسان ہوتا ہے، بہت باوقار ہوتا ہے، اور اللہ کی طرف جھوٹ موٹ باتیں منسوب کرنا تو اُوچھے انسانوں کا کام ہے، یہ تو غیر سنجیدہ لوگوں کی حرکت ہے، یہ کسی باوقار آدمی کا کام نہیں ہوتا، تو میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ میں ایسے لوگوں میں سے ہو جاؤں جو کہ غیر سنجیدہ ہیں اور بے وقعت ہیں، اور بے سوچے سمجھے اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں، اِن لوگوں میں سے ہونے سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں، میں کوئی ہنسی مذاق کے طور پر بات نہیں کرتا، ہنسی مذاق کے طور پر بات کرنا اور اللہ کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا تو جاہلوں کا کام ہے، میں بالکل سنجیدگی سے بات کرتا ہوں، اور باوقار ہونے کی حیثیت سے بات کرتا ہوں، میری بات ہنسی مذاق نہیں ہے، اب اِن الفاظ کے استعمال کرنے کا یہ مقصد ہوگا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ: وہ کہنے لگے کہ تو پکار ہمارے لیے اپنے رب کو، يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ: کہ وہ رب بیان کرے ہمارے لیے، واضح کرے ہمارے سامنے، مَا هِيَ: کہ وہ گائے کیا ہے؟ اُس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیسی ہونی چاہیے؟۔ یہ وہی مَا هِيَ ہے جس کو آپ منطق میں مَا هُوَ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کسی چیز کی حقیقت و ماہیت پوچھنی ہو تو مَا هُوَ کہتے ہیں۔ اب یہاں گائے کی حقیقت اور ماہیت تو مخفی نہیں تھی، اس لیے یہاں ما ھُو کا سوال جو کیا گیا ہے...... مَا هِيَ اور مَا هُوَ ایک ہی چیز ہے...... تو یہ حقیقت پوچھنے کے لئے نہیں، بلکہ اس سے اُس کی کیفیات پوچھنی مقصود ہیں، کہ وہ گائے کیا ہونی چاہیے، اُس کی کیفیات کیسی ہوں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ: بیشک وہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اِنَّهَا بَقَرَةٌ: کہ وہ بقرہ جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے هَا ضمیر اُدھر لوٹ رہی ہے، وہ گائے ایسی گائے ہو، لَّا فَارِضٌ: جو نہ تو بوڑھی ہو، وَّلَا بِكْرٌ: اور نہ بالکل بچی ہو، جس کو باکرہ

اور کنواری سے تعبیر کر سکتے ہیں، عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِکَ: عوان متوسط کو کہتے ہیں، ان دونوں عمروں کے درمیان میں ہو، متوسط ہو ان دونوں عمروں کے، بَیْنَ ذٰلِکَ عَوَانٌ: درمیانے درجے کی ہو، بَیْنَ ذٰلِکَ المذکورِ مِنَ الْعُمرَیْنِ یہ دو عمریں جو ذکر کر دی گئیں کہ نہ فارض ہو اور نہ بکر ہو، اِس کے درمیان درمیان میں ہو۔ اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے کہ اِن دونوں عمروں کے درمیان میں پٹھی ہو، یا پٹھا ہو، جب مذکر استعمال کریں گے تو پٹھا کا لفظ، اور جس وقت مؤنث استعمال کریں گے تو پٹھی۔ پٹھی ہو، نہ بالکل بچی اور نہ بوڑھی۔ یا مذکر کے طور پر اگر تعبیر کریں گے تو یوں ہو جائے گا کہ نہ بوڑھا نہ بالکل بچہ بلکہ پٹھا ہو۔ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر انہیں کہتے ہیں کہ زیادہ اینچ پینچ نہ کرو، جو تمہیں کہا جا رہا ہے وہ کام کر لو، فَافْعَلُوْا: کرو تم اُس چیز کو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ قَالُوْا: وہ کہنے لگے ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا: اپنے رب کو پکار ہمارے لیے، کہ ہمارے لیے واضح کرے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو؟۔ قَالَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنَّهٗ یَقُوْلُ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ کہتا ہے اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ: کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی، فَاقِعٌ لَّوْنُهَا: اور اُس کا رنگ خوب گہرا ہو۔ فاقع کا لفظ عربی زبان میں صُفرۃ کی تاکید کے لئے آتا ہے، اَصْفَرُ فاقِع یہ ایسے ہی لفظ ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں پیلا زرد، اب پیلا اور زرد دونوں کا مفہوم ایک ہے، ایک لفظ دوسرے کے لئے بطور تاکید کے بولتے ہیں۔ کالا سیاہ، اب کالا بھی وہی ہے اور سیاہ بھی وہی ہے، لیکن ایک لفظ کو دوسرے کی تاکید کے لئے بول دیا جاتا ہے، عربی میں بھی اس کو کہتے ہیں اسودُ غِربیبٌ۔ غَرَابِیْبُ سُوْدٌ کا لفظ سورۂ فاطر میں آئے گا، تو اُس کا یہی معنی ہوگا کالے سیاہ، یہ دوسرا لفظ بطور تاکید کے ہے۔ لال سرخ، تو لال اور سرخ دونوں کا مفہوم ایک ہے، اسی طرح عربی میں بھی دو لفظ بولے جاتے ہیں احمرُ قانِی یہ لال سرخ کے معنی میں ہے۔ اور چٹا سفید، اب چٹا اور سفید دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، لیکن وہی سفیدی والے مفہوم کو بیان کرنے کے لئے ہم اس قسم کے لفظ بول دیتے ہیں۔ تو اسی طرح سے یہاں صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا کا مطلب یہ ہے کہ وہ تیز زرد ہو اور اُس کا رنگ خوب پختہ ہو، تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ: دیکھنے والوں کو خوش کر دیتی ہو، یعنی ایسی خوشنما ہو کہ جو اُس کو دیکھے خوش ہو جائے۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ: وہ کہنے لگے کہ پکار تو ہمارے لیے اپنے رب کو کہ بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ یعنی پہلے سوال کی ذرا تھوڑی سی وضاحت اور کر دے، اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا: بیشک وہ گائے ہم پر کچھ مشتبہ سی ہو رہی ہے، ابھی ہم پوری طرح سے سمجھے نہیں کہ وہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟ ''بیشک وہ گائے ہم پر کچھ متشابہ سی ہو رہی ہے'' ہمیں اس کی پہچان میں کچھ شبہ پڑ رہا ہے، اس لیے اس کی کچھ وضاحت اور کر دیں، وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ: اور بیشک ہم اگر اللہ نے چاہا تو البتہ سیدھی راہ پا جائیں گے، یعنی گائے کے پہچاننے میں، ابھی ہمیں کچھ شبہ سا ہے، ذرا اور تھوڑی سی وضاحت کر دیں تو پھر ہم ٹھیک اُس گائے کو پہچان جائیں گے، یہاں اِهتداء فی معرفة البقرة مراد ہے، کہ بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم گائے کے پہچاننے میں سیدھی راہ اختیار کر جائیں گے، اچھی طرح سے پہچان جائیں گے، ذرا تھوڑی سی وضاحت اور کر دو۔ قَالَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو، لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ. سَقٰی یَسْقِیْ: سیراب کرنا، حرث کھیت کو کہتے ہیں، لَا تَسْقِی الْحَرْثَ: کھیتی کو سیراب نہ کرتی ہو، یعنی کنویں میں نہ جوتی گئی ہو، پانی نہ کھینچا گیا ہو اُس کے ذریعے سے، اور اثارۃ الارض: زمین کو باہنا، زمین میں ہل جوتنا، لَا تُثِیْرُ الْاَرْضَ: وہ زمین کو باہتی نہ ہو، یعنی ہل نہ جوتی گئی ہو، اور ذلول کہتے ہیں مطیع کی ہوئی، کام میں لگائی ہو، مُذَلَّلَة. ذلول: مطیع

کی ہوئی ذَلول: مذلّلة، کام میں لگائی ہوئی، اُس سے محنت نہ کرائی جاتی ہو، وہ گائے کمیری نہ ہو، جس سے کام لیا جاتا ہو، جیسے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا (سورۂ ملک:۱۵) جس نے تمہارے لیے زمین کو ذَلول بنا دیا، وہ روندی ہوئی ہے، تمہارے سامنے ذلیل ہے، تو یہاں بھی وہی ذَلُوْلٌ کا لفظ ہے، لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ: اب یہاں ذَلُوْلٌ کے ساتھ تُثِیْرُ الْاَرْضَ بطور وصف کے آیا ہوا ہے، اور ذَلول کے اُوپر لَا داخل ہے، تو اِس لَا کے ساتھ اس وصف کی نفی کرنی مقصود ہے،''وہ ایسی کام میں لگائی ہوئی نہ ہو کہ باہتی ہو زمین کو، اور نہ وہ ایسی ہو کہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو'' یوں ترجمہ ہوگا اِس کا، لَا تَسْقِی الْحَرْثَ میں جو لَا ہے یہ لَّا ذَلُوْلٌ کے اندر والے لَا کی تاکید ہے۔ ایسی ذَلول نہ ہو جو باہتی ہو زمین کو اور نہ ایسی ہو کہ وہ سیراب کرتی ہو کھیت کو، مُسَلَّمَةٌ: بےعیب ہو، اُس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو، لَّا شِیَةَ فِیْهَا: بےداغ ہو، اُس میں کسی قسم کا داغ نہ ہو۔ ایک رنگ کے خلاف دوسرا رنگ جو نمایاں ہو جائے وہ شِیَہ ہوتا ہے، مثلاً ساری سفید ہے تو اس میں ایک نشان سیاہ آ گیا تو یہ شیہ ہے، ساری زرد ہو اور اس میں کچھ تھوڑی سی سفیدی آ گئی تو یہ شیہ ہے، لَّا شِیَةَ فِیْهَا: اُس میں کوئی داغ نہ ہو۔ قَالُوْا: وہ کہنے لگے کہ الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ: اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بات کی ہے، حق سے یہاں مراد ہے کہ واقع کے مطابق بات، بالکل ٹھیک بات، حقیقت اب ہمارے سامنے واضح ہوگئی، فَذَبَحُوْهَا: پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا، وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ: اور قریب نہیں تھا کہ وہ یہ کام کرتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

صاحبزادگی کا زعم بنی اسرائیل کے لئے سرکشی کا باعث بنا

سلسلہ وہی واقعات کا چلا آ رہا ہے، اور رکوع کی ابتدائی ایک آیت کو چھوڑ کر وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ سے پھر وہی واقعات ہیں، درمیان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ایک قانون کی وضاحت کی ہے، اور اِس قانون کا حاصل یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی اولاد سمجھنے کی وجہ سے بےجا مفاخرت میں مشغول تھے، اور یہ کہتے تھے کہ چونکہ ہمارے بڑے اللہ کے مقبول تھے، اللہ کے نبی تھے، اس لیے ہم جو کچھ بھی کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں، یہ جو صاحبزادگی کا زعم تھا یہی اُن کے لئے سرکشی کا باعث بنا ہوا تھا، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ:۱۸) یہ نعرہ اُن کا اِسی صاحبزادگی کی بناء پر تھا، کہ ہم اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں، اللہ کے محبوب ہیں، تو جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کو اور اپنے محبوب کو عذاب نہیں دیا کرتا اِسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں بھی عذاب نہیں دے گا، اور اگر ہم اپنی غلطیوں کی بناء پر جہنم میں چلے بھی گئے تو لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (سورۂ بقرہ:۸۰) ایسے ہی چند گنتی کے دنوں کے لئے جائیں گے، بس پھر پھرا کے واپس آ جائیں گے، یہ زعم تھا اُن کو، یہود اپنے یہود ہونے پر نازاں تھے اور نصاریٰ اپنے نصرانی ہونے پر نازاں تھے۔

اللہ کے یہاں قدر صرف ایمان اور عمل صالح کی ہے

اللہ تعالیٰ نے یہاں ان واقعات کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی فرقہ کی فرقہ ہونے کی حیثیت سے کوئی قدر نہیں ہے، چاہے کوئی اپنے آپ کو مؤمن کہلوائے، مسلم کہلوائے، مسلمان کہلوائے، اور چاہے کوئی یہودی ہو، چاہے کوئی نصرانی ہو، چاہے کوئی صابی ہو، فرقہ ہونے کی طور پر کوئی فرقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت ہے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے، اگر مسلمان کہلانے والے بدکردار ہیں اور ان کا ایمان صحیح نہیں تو مسلمان کہلوانا نجات کے لئے کافی نہیں ہے، اگر اپنے آپ کو یہودی کہلوانے والے بدکردار ہیں اور اُن کے عقیدے صحیح نہیں ہیں تو یہودی ہونا کوئی باعث کمال نہیں ہے، اور اپنے آپ کو نصرانی کہلانے والے اگر عقیدہ صحیح نہیں رکھتے اور نیک عمل نہیں کرتے تو نصرانی ہونا اُن کے کوئی کام نہیں آئے گا، اور صابی کہلانے والے اگر عقیدہ صحیح نہیں رکھتے یا ایمان اور اعمال صالحہ کا ارتکاب کرنے والے نہیں ہیں تو صابی کہلوانا اُن کے کوئی کام نہیں آئے گا۔ چاہے کوئی اپنے آپ کو صابی کہلوائے، چاہے نصرانی کہلوائے، چاہے یہودی کہلوائے، چاہے مسلمان کہلوائے، ان عنوانات کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت نہیں ہوتی، جس طرح سے تم اپنے فرقے پر اور اپنی اس گروہ بندی پر ناز کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو ایمان اور عمل صالح کی قدر ہے، لہٰذا جس کے پاس ایمان اور عمل صالح کی دولت ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا اور آخرت میں چھوٹ جائے گا۔

اللہ کی رضا اس کے قانون کی پابندی پر ہے

اب سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے کے لوگ جو اُس وقت موجود تھے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا مصداق وہی ہیں، وہ یقیناً ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال تھے، لیکن اُن کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ اللہ کے ہاں مقبول ہوں گے تو اپنے گروہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہوں گے۔ اسی طرح ہم لوگ مسلمان کہلاتے ہیں، اور کتنی آبادی ہے کروڑوں کے حساب سے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہے، لیکن کتنے ہیں جن کے عقیدے خراب ہیں اور عمل تباہ ہے۔ اب اگر وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے گروہ میں شامل سمجھتے ہیں تو مسلمان کہلانے سے اور اس گروہ میں شامل ہونے سے ان کو کیا فائدہ ہوگا؟ اور آخرت میں کیسے چھوٹیں گے؟ اس لیے ان عنوانات سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دیکھنا یہ ہے کہ صحیح ایمان اور عمل صالح کس کے پاس ہے، لہٰذا ان عنوانات کو اختیار کر کے تم اس فخر کو چھوڑ دو، اور ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرو، اور یہ اس وقت سرورِ کائنات ﷺ کی اتباع میں اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی اس کتاب کی اتباع میں متعین ہے، ان عنوانات پر ناز کرنا اور ان ناموں پر فخر کرنا بالکل بے سود ہے، ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا جب تک ایمان اور عمل صالح کی دولت نہیں ہوگی۔ تو مؤمنین کو بھی ساتھ شامل کر لیا گیا، جیسے کوئی یوں اعلان کرے کہ کوئی موافق ہو، کوئی مخالف ہو، ہمیں پروا نہیں، جو ہمارے قانون کی پابندی کرے گا ہم تو اُس پر نوازش کریں گے، اور جو قانون کی پابندی نہیں کرے گا گڑھے میں آ جائے گا، چاہے ہمارا موافق ہے چاہے ہمارا مخالف ہے، اب موافق تو ہوتا ہی وہی ہے جو قانون کی پابندی کرے، لیکن مخالف کے بارے میں اس بات کو پختہ کرنے کے لئے موافق کا

ذکر بھی ساتھ کر دیا جاتا ہے، بات اسی انداز سے ہوتی ہے کہ کوئی ہمارا فرمانبردار ہو، کوئی ہمارا نافرمان ہو، ہمیں اس کی پروانہیں، جو ہمارے بتائے ہوئے قاعدے کی پابندی کرے گا ہم تو اُس پر خوش ہیں۔ اب اصل میں تنبیہ تو نافرمانوں کو کرنی مقصود ہے، لیکن فرمانبردار کا ذکر ساتھ اس لیے کر دیا جاتا ہے کہ اُن پر اگر ہماری عنایت ہوگی تو اس وجہ سے ہوگی کہ وہ ہمارے قاعدے کے پابند ہیں۔ اسی طرح اِن گروہوں کی فہرست میں مؤمنوں کا ذکر بھی کر دیا، حالانکہ مؤمن تو قاعدے کے پابند تھے، لیکن بات میں قوت اور زور پیدا کرنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ جو مؤمن کہلاتے ہیں، یہ ہوں یا دوسرے فرقے ہوں، ہم نے تو آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر پرکھنا ہے، جس کے پاس ایمان اور عمل صالح ہوگا وہ ہمارے ہاں مقبول ہے اور نجات پا جائے گا، اور جس کے پاس یہ دولت نہیں ہے وہ ہمارے ہاں مقبول نہیں ہے۔ اب یہود اگر ایمان اور عمل صالح اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے اتباعِ کتاب ضروری ہے، نصرانی اگر ایمان اور عمل صالح کی دولت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے اِسی کتاب کی اتباع ضروری ہے، اور صابئین اگر ایمان اور عمل صالح اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو حضور ﷺ پر ایمان لاکر اِس قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ یہ اس قانون کی وضاحت ہے، اور واقعات کے درمیان میں اس لیے ذکر کر دی تاکہ یہود اور نصرانی یہ نہ سمجھیں کہ اب ہمارے لیے مقبول ہونے کا کوئی راستہ نہیں رہا، یا وہ ان عنوانات کے اُوپر فخر نہ کرتے رہیں۔ یہ حاصل ہے اِس پہلی آیت کا جو رکوع کی ابتداء کے اندر آئی، آگے پھر وہی واقعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، اور نصرانی جو عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور صابئین، جو بھی ایمان لائے گا اللہ پر اور یوم آخر پر اور نیک عمل کرے گا، پس ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے'' مطلب یہ ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے، کیونکہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ والی زندگی جنت میں جا کر نصیب ہوگی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد انکار کرنا بغاوت ہے

آگے (وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ میں) جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کا ذکر آپ کے سامنے ضمناً پہلے ہوا تھا، کہ وہ ستر آدمی جو طور سے آئے تھے، اور انہوں نے آکر اپنی قوم کے سامنے ذکر کیا کہ واقعی یہ کتاب تو اللہ کی ہے، لیکن اللہ نے ہمیں کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی حکم مشکل معلوم ہو تو اس کو بیشک چھوڑ دیا کرو۔ یہ درمیان میں انہوں نے تحریف کر دی تھی، جس کے بعد وہ قوم کی قوم اپنے فاسد مزاج کی وجہ سے شرارت پر اتر آئی، کہ اب ان احکام کی پابندی اُن کو خواہ مخواہ مشکل معلوم ہونے لگ گئی، ویسے بھی تورات کے احکام میں بمقابلہ ہماری اس شریعت کے کچھ سختی تھی، اب انہوں نے اجتماعی طور پر کہہ دیا، کہ یہ کتاب تو بہت مشکل ہے، ہم سے تو اس پر عمل ہو نہیں سکتا۔ اب آپ جانتے ہیں کہ پہلے شوق کے ساتھ مطالبہ کر کے کتاب لی، موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی صورت میں کتاب پر ایمان لائے، اور ایمان لانے کے بعد پھر جانا ارتداد کہلاتا ہے۔ کوئی کافر ہو، ایمان لائے یا نہ لائے، اُس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، مسلمانوں کی سلطنت میں کافر کافر ہوتے ہوئے رہ سکتا ہے، جیسے کہ ذمیوں کا باب آپ کی فقہ کے اندر ہے، اُس کا مطلب یہی ہے کہ کافر مسلمانوں کے ساتھ شرارت نہ کرے اور مطیع ہو کر رہنا چاہے تو اپنے کفریہ دین پر رہ سکتا ہے، جس کا

مطلب یہی ہے کہ کافر کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمان ہو، اِس لیے مملکت اسلامیہ میں کافر کے رہنے کی گنجائش ہے۔ لیکن ایک شخص مسلمان ہو جاتا ہے، کلمہ پڑھ لیتا ہے، کلمہ پڑھ کر ہماری جماعت میں شامل ہونے کے بعد اب نکل بھاگنا چاہتا ہے، کفر کی طرف جاتا ہے، یہ ارتداد ہے، یہ ایسے ہے جیسے کسی حاکم کی رعایا کا کوئی فرد باغی ہو جائے، اور باغی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ مخالف کو تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن باغی کو برداشت نہیں کر سکتے، کافر مخالف ہے اور مرتد باغی ہے، اور باغی جس حالت میں بھی ہو اُس کی سزا گولی ہے، یہی وجہ ہے کہ مرتد کو نہیں چھوڑا جاتا، اُس کو صرف تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ یا تو باز آ جاؤ، جو تمہارے شکوک وشبہات ہیں وہ ہم سے دور کروالو، دلائل سے بحث کرلو، اور اگر تم اڑے ہوئے ہو اور باز آنے والے نہیں ہو تو پھر اِس روئے زمین پر تمہارے لیے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تین دن کے بعد اس کو قتل کر دیا جاتا ہے، جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے حکم فرمایا "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ"(۱) اور اسی پر ہی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر اِس وقت تک امت کا عمل ہے، کہ مرتد کی سزا قتل ہے، مرتد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اِس کو آپ جبر نہیں کہہ سکتے، کیونکہ دین کا قبول کرنا اختیاری ہے، لیکن قبول کرنے کے بعد نکلنے کی اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۹۷۱ء) مثالیں دینے میں اور مثالوں کے ساتھ بات سمجھانے میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، پتہ نہیں آپ میں سے کسی نے اُن کی تقریر سنی ہے یا نہیں، پنجابی میں تقریر کیا کرتے تھے، اور مثال کے ساتھ بات کی وضاحت کرنے میں اُن کو بہت مہارت حاصل تھی۔ اِسی مسئلے کو ایک دفعہ ذکر کر رہے تھے، غالباً ساہیوال جامعہ رشیدیہ کے اسٹیج پر میں نے یہ تقریر اُن سے سنی، یا خیر المدارس (ملتان) کے اسٹیج پر، دونوں میں سے کسی جگہ میں نے سنا، وہ دیہاتیوں کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے، کہ دیکھو! تم کسی لڑکی کو نکاح کا پیغام دیتے ہو، جس وقت نکاح کا پیغام دیتے ہو تو اُس کو اختیار ہے کہ قبول کرے یا نہ کرے، تم زبردستی اس کے اُوپر نکاح مسلط نہیں کر سکتے، وہ تمہارے گھر آئے یا نہ آئے اُسے اختیار ہے، لیکن اگر وہ ایک دفعہ تمہیں قبول کر لیتی ہے اور تمہارے نکاح میں آ جاتی، اور تمہاری بیوی بن کر تمہارے گھر میں ایک دفعہ گھس گئی، اب اگر وہ نکلنا چاہے تو فرمانے لگے "گتوں پھڑ کے گھسیٹ لو، کہ ہُن کتھے جانی ایں" (اُس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لو کہ اب کہاں جا رہی ہے)، اب اگر اُس کو اس طرح سے گھسیٹ لیں تو اخلاقی اور قانونی ہر طرح سے جواز ہے۔ اور جس وقت تک اُس نے نکاح قبول نہیں کیا آپ اس کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتے، لیکن جب اس نے ایک دفعہ قبول کر لیا اور بیوی بن گئی، اب وہ بھاگنا چاہے تو اب نہ بھاگنے دو، اب بیشک بالوں سے پکڑ لو، اب تمہیں حق پہنچتا ہے۔ کہتے ہیں بالکل اسی طرح کوئی ایمان نہ لائے تو بڑی خوشی سے نہ لائے، ہم اُس کو مجبور نہیں کرتے، وہ ملک میں زندہ رہ سکتا ہے، ذمی بن کر رہ سکتا ہے، اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کر سکتا ہے، لیکن ایک دفعہ اگر آ گیا اب اُس کو نکلنے کی اجازت نہیں ہے، نکلے گا تو یہ بغاوت ہے، اب اس کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ اپنے اِس عہد کے اُوپر قائم رہو جو تم نے اسلام قبول کر کے کیا ہے۔ اس لیے مرتد باغی ہے اور اِس باغی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۲۳، باب لا یعذب بعذاب اللہ / مشکوۃ ۲/ ۳۰۷، باب قتل اہل الردۃ، فصل اول، عن عکرمہ

تو یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد اور تورات کو قبول کرنے کے بعد اب جو انہوں نے جان چھڑانے کی کوشش کی، تو اب درجہ ارتداد کا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اب اُن کے اُوپر ایسے حالات طاری کیے جن کے بعد اُن کو مجبور کر کے اُسی راستے پر لایا گیا، اُن کے اوپر کوئی اس قسم کی شکل مسلط ہو گئی کہ پہاڑ فضاء میں معلق ہو گیا اور انہیں کہہ دیا گیا کہ بندے بن جاؤ، نہیں تو ابھی پہاڑ گرا، اور تمہیں پیس کر رکھ دیا جائے گا، جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس کو مضبوطی سے تھام لو، ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں کے ساتھ اور کمزور ارادوں کے ساتھ اِس کتاب کو نہ پکڑو، مضبوطی کے ساتھ اور عزم وہمت کے ساتھ اِس کتاب کو لو، اور جو کچھ اِس میں کہا گیا ہے اُسے یاد رکھو۔ اور پہاڑ اُوپر معلق کر کے اپنی شانِ جلال کا مظاہرہ کر دیا، کہ تم ایسے نہ سمجھو کہ تم نے کسی کمزور کے ساتھ عہد معاہدہ کیا ہے، کہ جب چاہا مان لیا اور جب چاہا انکار کر دیا، بلکہ جس کے ساتھ تم نے عہد معاہدہ کیا ہے وہ ایسی طاقتوں والا ہے کہ اگر چاہے تو جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان میں دانے پیس دیے جاتے ہیں تمہیں اسی طرح سے پیس کے رکھ دیا جائے گا۔ اِس طرح سے اُن کے اُوپر یہ مظاہرہ کیا گیا تو تب وہ سیدھے ہوئے اور اُن کے دماغ ٹھکانے آئے، کہ ٹھیک ہے، ہم اِس پر عمل کریں گے، لیکن جس وقت دوبارہ پھر کوئی موقع ملا تو پھر روگردانی کر گئے، یہ تو اس قوم کی سرشت تھی کہ ڈنڈا سر پر دیکھتے تھے تو ذرا ہوش ٹھکانے آ جاتی تھی، اور جہاں ذرا سا معاملہ نرمی میں آتا تو اُس کے بعد پھر بگڑ جاتے، اُن کی بگڑی ہوئی فطرت کا یہ حال تھا۔ چونکہ فرعونیوں کے ہاں مار کھا کھا کے وہ کام کرتے تھے تو مار ہی کھانے کی عادت پڑ گئی تھی، اب اگر ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے تو سیدھے ہی نہیں ہوتے۔ کسی گدھے کو دیکھ لو، کمہار کے ڈنڈے کے آگے تو اس طرح شرافت کے ساتھ چلتا ہے کہ ایک کمہار چالیس گدھے سنبھال لے گا، اور وہ ان کے اُوپر جس وقت اینٹیں لادتے ہیں، آپ نے دیکھا ہو گا جس پر لاد دی جائیں گی وہ آگے کو ہو جائے گا اور دوسرا اُس کی جگہ آ جائے گا۔ اور جب تک اُس کی طرف سے چلنے کا حکم نہیں ہو گا سارے بوجھ اٹھا کر وہیں کھڑے رہیں گے، اور جب اس کی طرف سے حکم ہو گا تو اس وقت چلیں گے۔ اور ایک دفعہ راستہ دکھا دے گا تو سیدھے اُس گھر پہنچیں گے جہاں اینٹیں گرانی ہیں، اور وہاں اینٹیں گرا کے پھر سیدھے وہاں جائیں گے جہاں سے اٹھانی ہیں۔ اور تمہارے مدرسے میں ایک گدھا آ جائے تم سے وہ نہیں سنبھالا جاتا، یعنی اُس کے پیچھے لگ جاؤ، اور اُس کو کہو کہ سیدھا ہو کر نکل جا، وہ نکلتا ہی نہیں، کبھی اِدھر کو بھاگے گا کبھی اُدھر کو بھاگے گا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ تمہارے ہاتھ میں کمہار والا ڈنڈا نہیں ہے، اور یہ قوم ایسی ہے کہ بغیر ڈنڈے کے سیدھی نہیں ہوتی۔ تو اسی طرح سے جب کسی کو عادت پڑ جائے کہ ہمیشہ مار کھا کے سیدھا ہوا کرتا ہے تو اس پر نرمی کا اثر نہیں ہوا کرتا، جب بھی اس کو کسی نرم آدمی کے ساتھ واسطہ پڑے گا وہ اسی طرح سے کبھی دائیں بھاگے گا کبھی بائیں بھاگے گا، سیدھے راستے پر کبھی نہیں جائے گا، اور جب پیچھے سے ڈنڈا آئے تو بالکل سیدھا ہو جاتا ہے۔ تو اسرائیلی بھی فرعونیوں کے ہاں مار کھاتے ہوئے اور ذلیل ہوتے ہوئے چونکہ کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے، اس لیے جب اِن کو ڈرایا دھمکایا جاتا تو ان کی طبیعت کچھ سیدھی ہو جاتی تھی، اور جہاں ذرا نرمی آتی تو پھر بگڑ جاتے تھے، اِن سارے واقعات میں اِن کا یہ مزاج اچھی طرح سے نمایاں ہے۔

''یاد کیجیے! جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، اور تمہارے اُوپر طور کو اٹھایا، کہا ہم نے کہ پکڑو مضبوطی کے ساتھ اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے'' یعنی مضبوط ہاتھوں سے اور مضبوط ارادے سے اِس کتاب کو تھامو، ڈھیلے ڈھالے ارادے کے ساتھ اس

کتاب پر عمل نہیں ہو سکے گا۔" یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ، تا کہ تم متقی ہو جاؤ، اس واقعہ کے بعد تم نے پھر پیٹھ پھیر لی"، فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، یہ اس کا فضل و رحمت ہے کہ اتنی سرکشی کے باوجود پھر تمہیں مہلت دیتا ہے، ورنہ تمہارا یہ کردار اِس قسم کا ہے کہ تمہیں فوراً تباہ کر دیا جائے، اور اس دنیا کے اندر تمہیں باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہ ہو، یہ اُس کا فضل و رحمت ہے کہ اس نے تمہیں مہلت دے دی اور پھر سنبھلنے کا موقع دے دیا، اگر یہ فضل و رحمت نہ ہوتی تو البتہ تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے۔

مچھلیوں کو شکار کرنے کا واقعہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ: البتہ تحقیق جان لیا تم نے اُن لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے بارے میں تجاوز کیا تم میں سے۔ اِس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے یہ واقعہ سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا قصہ ہے، ایک بستی تھی جس کو حاضرۃ البحر کے ساتھ قرآن نے ذکر کیا، سمندر کے کنارے پر آباد تھی، اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ہفتے کا دن معظم تھا، اور اُس کی تعظیم اس طریقے سے تھی کہ یہ دن بالکل خالص عبادت کے لئے رکھا جائے، اِس میں شکار وغیرہ یا دوسرے معاشی مشاغل اختیار نہ کیے جائیں۔ اور یہ لوگ سمندر کے کنارے پر آباد تھے اور اِن کی معاشیات کا تعلق زیادہ تر مچھلی پکڑنے کے ساتھ تھا، اللہ تعالیٰ نے اِن کو آزمائش میں ڈال دیا، کہ ہفتے کے روز مچھلی کثرت کے ساتھ آتی، کہ پانی کے اُوپر تیرتی ہوئی اور اُچھلتی ہوئی نظر آتی، اور ہفتے کے علاوہ باقی دنوں میں اُس کی اتنی آمد نہ ہوتی۔ اب یہ قوم ویسے ہی حیلہ جو تھی، جب انہوں نے دیکھا کہ ہفتے کے روز تو مچھلی ملتی ہے، آگے پیچھے اتنی نہیں ملتی، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کے لئے ان لوگوں نے مختلف قسم کے حیلے بہانے شروع کر دیے۔ ابتداء ابتداء میں حیلوں کے ساتھ شکار کیا، کہ سمندر کے کنارے پر تالاب بنا لیے، گڑھے کھود لیے، ہفتے کے دن اُس میں پانی چھوڑ دیتے، مچھلی اُدھر آ جاتی تو ان کا منہ بند کر دیتے، تو مچھلی اُدھر گھیرے میں آ جاتی (عام تفاسیر)، یا کوئی مچھلی پکڑتے اور اس کی دم میں رسی ڈال کر اس کو پانی میں چھوڑ دیتے، گویا کہ شکار نہیں کیا، جب ہفتے کا دن گزر جاتا تو پھر اُس کو کھینچ کر اپنے کام میں لے آتے، اس طرح سے انہوں نے اپنے ضمیر کو گویا کہ مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم اپنے مفاد کو بھی حاصل کر لیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔ یہ حیلہ چونکہ حکمِ شریعت کے لئے ابطال تھا اور حکم شریعت کی خلاف ورزی تھی، کیونکہ مقصد تو تھا کہ یکسو ہو کر اس دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہو اور دیگر مشاغل اختیار نہ کرو، اور اُنہوں نے اِس طرح سے اپنے لیے مصروفیات پیدا کر لیں۔ تو ابتداء ابتداء میں کہتے ہیں کہ یوں حیلہ کرتے تھے، پھر آہستہ آہستہ گناہ کے اوپر جرأت ہو گئی، اور واضح طور پر شکار کرنے لگ گئے [تفسیر آلوسی، سورۂ اعراف، آیت ۱۶۳ کے تحت]۔

مذکورہ واقعے میں اسرائیلیوں کے تین گروہ اور ان کا انجام

تو اُس بستی میں تین قسم کے لوگ ہو گئے، ایک تو شکار کرنے والے تھے، دوسرے وہ تھے جنہوں نے ابتداء ابتداء میں اُنہیں سمجھایا، انکار کیا، اور بعد میں خاموشی اختیار کر لی کہ جب یہ مانتے نہیں ہیں تو ہم کیا کریں، اور ایک طبقہ وہ تھا جو آخر وقت تک اُن

کو سمجھانے کے لئے کوشش کرتا رہا اور وعظ و نصیحت کرتا رہا، لیکن وہ باز نہیں آئے۔ تو یہ جو شکار کرنے والے تھے ان کے متعلق قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا کہ یہ بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے، اور جو منع کرنے والے تھے اُن کی نجات کا ذکر ہے، اور جو خاموش تھے اُن کے ذکر سے قرآن خاموش ہے، ظاہر یہی ہے وہ بھی نجات پانے والوں میں تھے، لیکن اتنے قابلِ تعریف نہیں تھے جتنے وہ لوگ قابلِ تعریف تھے جو آخر وقت تک سمجھانے کے لئے کوشش کرتے رہے۔ اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آئے گی۔

مذکورہ واقعے کا مقصد

تو ان واقعات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ یہ یاد دلاتے ہیں کہ اُن لوگوں کو تم جانتے ہی ہو، وہ تمہیں معلوم ہی ہیں، تمہاری قوم کا ایک حصہ تھے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کے لئے مختلف قسم کے حیلے کیے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل بندر بنا دیا۔ اور پھر یہ واقعہ لوگوں کے لئے نکال اور موعظہ بن گیا، گناہ گاروں کے لئے گناہ سے روکنے والی چیز بنا، اس اعتبار سے وہ نکال ہے، اور نیکوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مزید عبادت اور اطاعت کی ترغیب کا ذریعہ بنا، اس اعتبار سے یہ موعظہ ہے۔ اُن کو یاد دلانا اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے توڑنے میں تم لوگوں نے حیلے کیے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح سے عذاب آیا، اپنے ان تاریخی واقعات کو یاد رکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو، اب بھی اگر باز نہیں آؤ گے اور اسی قسم کے حیلے بہانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی وہ قدرتیں اب بھی باقی ہیں، اور اب بھی وہ تمہیں عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے۔

تکوینی نظام میں خلاف ورزی نہیں سکتی

''البتہ تحقیق جان لیا تم نے اُن لوگوں کو'' یعنی تمہیں وہ لوگ معلوم ہیں، تمہارے علم میں ہیں، ''جنہوں نے تم میں سے حد سے تجاوز کیا ہفتے کے بارے میں، پس ہم نے انہیں کہہ دیا'' یہ کہنا تکوینی ہے کُنْ فَیَکُوْنُ، جس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی، یہ حکم تشریعی تکلیفی نہیں ہے کہ تم اپنے اختیار کے ساتھ کرو یا نہ کرو، ہماری طرف سے حکم یہ ہے، جس طرح سے نماز پڑھنے کا حکم اللہ نے دیا کہ نماز پڑھو، لیکن یہ حکم تشریعی تکلیفی ہے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو سزا ہوگی۔ لیکن جو تکوینی احکام ہوا کرتے ہیں اُن میں کائنات مسخر ہے، اُس کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی، جیسے اللہ تعالیٰ کسی کو کہہ دے مر جا، وہ فوراً مر جائے گا، یہ نہیں کہ اب اختیار ہے چاہے مرو یا نہ مرو۔ اسی طرح سے یہ کُوْنُوْا کا حکم تکوینی ہے، بندر ہو جاؤ، بس یہ کُن ہو گیا، تو اس کے ساتھ فَیَکُوْن، فوراً واقعہ پیش آجاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ، وہ ہو گئے۔ فَجَعَلْنٰهَا: ہم نے اس واقعہ کو بنا دیا نکال، عبرت، گناہوں سے روکنے والی چیز، ''اُن لوگوں کے لئے جو اس واقعہ کے سامنے ہیں'' یعنی اُس زمانے میں موجود تھے، ''اور ان لوگوں کے لئے جو کہ اس واقعہ سے پیچھے ہیں'' یعنی بعد میں آنے والے، ''اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہم نے اس کو موعظہ بنا دیا'' وعظ و نصیحت بنا دیا جس سے اُن کو نیکی کی طرف زیادہ ترغیب ہو، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف زیادہ رغبت ہو۔

بنی اسرائیل میں ایک قتل پر جھگڑا اور موسیٰ علیہ السلام کی اللہ کے حضور درخواست

آگے (وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً میں) جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کا ابتدائی حصہ اگلے رکوع کے شروع میں آئے گا، یہ واقعہ دو حصوں میں ہے، اس کا ابتدائی حصہ اگلے رکوع کی ابتداء میں ہے۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہو گیا اور قاتل معلوم نہیں تھا، اور جب اس قسم کا واقعہ پیش آجائے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا اور قاتل معلوم نہیں، تو ہمیشہ لوگ ایک دوسرے پر الزام دھرا کرتے ہیں، ایک دوسرے کے متعلق شبہات پیدا ہو جاتے ہیں کہ فلاں نے قتل کیا ہوگا، وہ کہے گا نہیں نہیں! اُنہوں نے قتل کیا ہوگا، جن کے متعلق یہ شبہ کیا جائے گا کہ اُنہوں نے قتل کیا ہے وہ لوٹا کر بات دوسروں پر ڈالیں گے، کہ ہمیں کیا کہتے ہو، ہو سکتا ہے تم نے ہی قتل کیا ہو۔ ایک دوسرے پر بات ٹالنا یہ پیش آجایا کرتا ہے جس وقت کہ مجرم کا پتہ نہ چلے، ہر کسی کا ذہن دوسرے کی طرف جاتا ہے، اور وہ اپنے سے بات کو ٹال کر کسی اور طرف پھینکنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ تدارُء کی کیفیت جس کو قرآنِ کریم ذکر کرے گا وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا: کہ ایک نفس کو تم نے قتل کیا تھا پھر تم اُس نفس کے بارے میں ایک دوسرے پر بات ڈالنے لگ گئے، یہ تدارُء کی کیفیت ہے۔ اور جب یہ قصہ ہو جائے کہ قاتل معلوم نہیں اور ہر ایک دوسرے پر شبہ کر رہا ہے، اور جس پر شبہ کیا جا رہا ہے وہ اُس کو ڈالتا ہے دوسرے پر، ایسے موقع پر اندیشہ ہوا کرتا ہے کہ ساری قوم اور سارا قبیلہ افراتفری میں مبتلا ہو کر کہیں خانہ جنگی نہ پیدا ہو جائے، ایک دوسرے پر جب بات ڈالیں گے اور ایک دوسرے کے متعلق بدگمانی ہوگی تو قومی طور پر آپس میں خانہ جنگی ہو سکتی ہے۔ آخر وہ اسرائیلی تھوڑے سے ہی تھے جو ایک ہی جگہ آباد تھے، اب اُن میں اگر قتل واقع ہو جائے اور ایک دوسرے پر بدگمانی ہو تو کسی وقت بھی یہ جھگڑے کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور خانہ جنگی ہو سکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یا اللہ! قاتل کا سراغ لگا دیا جائے، ہمیں کوئی قاعدہ اور قانون ایسا بتا دیا جائے جس کے ذریعے سے ہم قاتل کو پہچان لیں، تو کم از کم یہ قبائلی جنگ جو آپس میں ہونے والی ہے اور خانہ جنگی کے جو اندیشے پیدا ہو گئے ہیں یہ تو ٹل جائیں، ایک دوسرے پر بدگمانی کی بناء پر افراتفری ہو گئی اور ہر ایک دوسرے کا دشمن معلوم ہوتا ہے، ہر ایک دوسرے پر بدگمان معلوم ہوتا ہے، تو یہ واقعہ ایک فتنہ کی صورت اختیار کر گیا ہے، اس کے ازالے کے لئے ہمیں کوئی قاعدہ اور قانون بتا دیا جائے جس سے ہم پہچان لیں کہ قاتل فلاں ہے، جب مجرم متعین ہو جائے گا تو کم از کم باقی لوگوں کو ایک دوسرے پر بدگمانی نہیں رہے گی۔

اللہ کی طرف سے گائے ذبح کرنے کا حکم اور اس کی وجہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ ایک گائے لے کر ذبح کرو، اور اُس گائے کا ایک ٹکڑا لے کر اس مقتول کو لگا دو، مقتول کی لاش کے ساتھ اُس کو مس کر دو، تو وہ مقتول زندہ ہو جائے گا، اور زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تلقین ہوئی۔ باقی! اس میں کیا مصلحت ہے کہ گائے کو ذبح کیا جائے، پھر اس میں کیا مصلحت ہے کہ گائے کے ٹکڑے کو اُس قتیل

کے ساتھ مس کیا جائے تو وہ قتیل زندہ ہوگا، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی مصلحت اللہ جانتا ہے یا اللہ کا رسول سمجھتا ہوگا۔ بہر حال کسی وجہ سے ہو، گائے چونکہ اِن کے ہاں محترم تھی، تو اس کو ذبح کروانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہو، تا کہ اِن کے دل میں جو گائے کا احترام ہے وہ نکل جائے، اِس طرح سے ان کے اندر جو شرک کے جذبات ہیں، بچھڑے کو پوجنا وغیرہ، اور فرعونیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے گائے کی عظمت اِن کے قلب میں ہے وہ ختم ہوجائے گی، یا جو بھی حکمت اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اُس حکمت کے تحت یہ حکم دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قوم کے سامنے ذکر کر دیا۔

اسرائیلیوں کا اعتراض اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جواب

اب وہ قوم اگر تو رسول پر صحیح طریقے سے ایمان رکھتی اور اللہ کے رسول کی عظمت اُن کے دل میں ہوتی تو بلا چوں چراں اُس کو تسلیم کر لیتے، اُسی وقت ایک گائے لیتے اور ذبح کر دیتے، جس طرح سے ہمیں حکم ہے کہ قربانی کے طور پر ایک گائے ذبح کرو تو ہم ایک متوسط گائے لیتے ہیں اور اللہ کے نام پر ذبح کر دیتے ہیں۔ پھر وہ سفید رنگ کی لے لیتے، سیاہ رنگ کی لے لیتے، بڑی عمر کی لے لیتے، کیسی ہی لے لیتے، اس کو ذبح کرتے، ان کا مقصد حاصل ہوجاتا، کوئی پیچیدگی پیش نہ آتی اور کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ لیکن اُن کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت ہی نہیں تھی اور وہ ہر بات کو اپنی عقل پر پرکھتے تھے اور اللہ کے رسول کی بات کو ایک عام انسان کی بات کی طرح سمجھتے ہوئے اُس کے اندر شبہات نکالنا اور حیلے کرنا اُن لوگوں کی فطرت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ موسیٰ! ہم تو تجھ سے قاتل پوچھتے ہیں کہ تو اس قتیل کا قاتل بتا، تو کہتا ہے کہ گائے ذبح کرو تو قاتل کا پتہ چل جائے گا، یہ کیا مذاق بنایا ہوا ہے؟ یہ کوئی جوڑ ہے دونوں باتوں کا؟ کہ ہم قاتل پوچھتے ہیں کہ اس قتیل کا قاتل کون ہے؟ اور آپ کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرو، اور گائے ذبح کرنے کے ساتھ قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ یہ ہم سے مذاق کر رہے ہو؟ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ یہ کوئی تک کی بات ہے؟، یہ آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟، کہ ہم کچھ کہہ رہے ہیں اور آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔ اب یہ بات تبھی کہی جاسکتی ہے جب اللہ کے رسول کی عظمت نہ ہو اور اللہ کے رسول کا مقام ذہن میں نہ ہو، کیونکہ جب اللہ کا رسول اللہ کی طرف نسبت کر کے ایک بات کہتا ہے تو اُس میں شک شبہ کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے؟، اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بات غلط کہنا کہ اللہ یوں کہتا ہے یہ تو بالکل جاہلوں کا کام ہے، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ تو جاہلوں کا طریقہ ہے کہ اللہ کی طرف منسوب کر کے بات غلط کہہ دی جائے اور اللہ کے احکام میں ہنسی مذاق کو داخل کر لیا جائے، یہ جاہلوں کا طریقہ ہے، میں جاہل نہیں ہوں، میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہوجاؤں۔ جاہل کا ترجمہ کل آپ کے سامنے عرض کر دیا گیا تھا کہ یہاں مطلب ہوگا کہ غیر سنجیدہ آدمی، بے وقعت آدمی، جس کے اندر بردباری حلم اور سنجیدگی نہ ہو، یہاں جاہل کا یہ مفہوم ہے۔ رسول انتہائی سنجیدہ ہوتا ہے، انتہائی باوقار ہوتا ہے، انتہائی متحمل مزاج ہوتا ہے، وہ جو بات کہے گا باوقار طریقے سے کہے گا، سنجیدہ کہے گا، اور اُس کی بات میں استہزا کا پہلو بالکل نہیں ہوا کرتا، اللہ تعالیٰ کے احکام کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح سے استہزاء یا ٹھٹھے کو داخل کر لینا جاہلوں کا کام ہے اور نبی جاہلوں جیسی حرکتیں نہیں کیا کرتا۔

بنی اسرائیل پر سوالات کے نتیجے میں پابندیاں لگتی گئیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تو واضح کر دیا کہ واقعی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن پھر وہی بداعتمادی!...... وہ کہتے ہیں کہ قاتل کی تحقیق کے لئے جو گائے ذبح کرنی ہے آخر وہ گائے بھی خاص قسم کی ہوگی۔ یہ سارے کے سارے قصے بداعتمادی سے پیدا ہو رہے ہیں، ورنہ جس وقت اُن کو پتہ چل گیا کہ واقعی اللہ کی طرف سے حکم ہے تو وہی بات ہے کہ گائے لیں اور ذبح کردیں۔ اب وہ اس جستجو میں پڑ گئے، وہی شکی مزاج!، وہمی مزاج!، کہ جی! گائے کیسی ہوگی جس کے ذبح کرنے کے ساتھ قاتل کی تحقیق ہو جائے گی، تو سوال کر دیا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ ہمیں بتادو۔ اب یہ سوالات جو کر رہے ہیں، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے سوالات کے نتیجے میں اُن پر زیادہ پابندیاں لگتی چلی جا رہی ہیں کہ پھر ان کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں اللہ کا حکم ادا نہیں ہوگا، جیسے جیسے وہ صراحت کرواتے جا رہے ہیں ویسے ویسے اُن پر پابندیاں زیادہ لگتی چلی جا رہی ہیں...... ایک لڑکے سے استاذ یہ کہہ دے کہ جاؤ، باہر بیٹھ کر سبق یاد کرو۔ اب وہ چپ کر کے کتاب اٹھائے، باہر جا کر اس برآمدے میں بیٹھ جائے، اُس برآمدے میں بیٹھ جائے، درخت کے نیچے بیٹھ جائے، مسجد میں جا کر بیٹھ جائے، کتنی وسعت ہے، اتنا حکم سننے کے بعد وہ کتاب لے کر باہر نکل جائے او رکہیں بھی بیٹھ جائے۔ لیکن وہ پوچھتا ہے کہ میں درخت کے نیچے بیٹھوں یا مسجد میں جا کر بیٹھ جاؤں؟ استاذ کہہ دے گا درخت کے نیچے بیٹھو، اب مسجد میں جانے کی گنجائش نہیں رہی۔ میں بیٹھ کر سبق یاد کروں یا کھڑا ہو کے کروں؟ استاذ کہہ دے کہ کھڑے ہو کے کرو، اب بیٹھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ دیکھو! جتنی صراحت ہوتی چلی جائے گی اتنی پابندیاں زیادہ لگتی چلی جائیں گی۔ اب ایک آدمی کو کہا جائے کہ بھئی! بازار جاؤ اور جلدی آجائیو، اب جلدی کا مفہوم کیا ہے، کہ جائے اور اطمینان کے ساتھ کام کر کے آجائے، پندرہ منٹ میں آجائے، بیس منٹ میں آجائے، آدھے گھنٹے میں آجائے، اِس لفظ میں وسعت ہے۔ لیکن وہ کہے جی! آپ بتادیجئے کہ کتنے منٹ تک واپس آجاؤں؟ تو کہہ دیا جائے کہ دس منٹ تک واپس آجاؤ، اب اگر وہ دس منٹ تک واپس نہیں آئے گا تو مجرم ہے۔ ان سوالات کے نتیجے میں جتنی اُوپر صراحت ہوتی چلی جائے گی اتنی پابندیاں زیادہ لگتی چلی جائیں گی۔ اب اگر وہ یہ سوال نہ کرتے اور لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ کی صراحت نہ کی جاتی، تو بڑی عمر کی گائے لے کر ذبح کر دیتے تو بھی ٹھیک تھا، کوئی چھوٹی عمر کی لے کر ذبح کر دیتے تو بھی ٹھیک تھا، اب کہتے ہیں کہ گائے کیسی ہو؟ تو پہلی دفعہ صراحت ہوگئی کہ نہ بوڑھی ہو نہ بالکل بچی ہو، متوسط عمر کی ہو، ایک پابندی لگ گئی۔ اب اگر اسی پر کفایت کرتے تو بھی بات بن جاتی، لیکن وہ پھر کہتے ہیں جی! بتاتو دو اُس کا رنگ کیسا ہو؟ اب جتنے بھی گائے کے رنگ ہو سکتے ہیں سارے ہی اختیار کرنے کی گنجائش تھی، لیکن اب صراحت ہوگئی کہ پیلے رنگ کی ہو، اور اس کا رنگ گہرا ہو کہ دیکھنے والوں کو اچھی لگے، اب یہ اور زیادہ ایک قید بڑھ گئی۔ آگے تیسرا سوال جو کیا تو اُس کے جواب میں کہہ دیا کہ اس میں کوئی عیب نہ ہو، کوئی داغ نہ ہو، اور کسی کام میں نہ لگائی گئی ہو، نہ ہل جوتی گئی ہو، نہ پانی کھینچنے پر لگائی گئی ہو، اس قسم کی گائے ہو۔ دیکھو! پابندیاں در پابندیاں لگتی جا رہی ہیں، آخر اس قسم کی گائے کو تلاش کیا گیا، محنت اور مشقت کے ساتھ تلاش کیا گیا، بہت زیادہ سرمایہ خرچ کر کے تلاش کیا گیا، پھر اُس کو ذبح کیا گیا تو اس حکم پر عمل کرنے کی نوبت آئی۔ اس واقعہ کو یہاں ذکر کر کے ان کے ایک

قومی مزاج کی نشاندہی کرنی مقصود ہے، کہ یہ کسی بیان کرنے والے پر اعتماد نہیں کرتے، بلکہ اپنے شکی اور وہمی مزاج کے تحت شبہات پیدا کر کے اپنے لیے خود مشکلات پیدا کرتے ہیں، اور پھر اُس گائے کے ذبح ہونے کے بعد پھر قاتل کی تحقیق کیسے ہوئی اِس کا ذکر اگلے رکوع میں آرہا ہے۔

سوال:- پہلے آیا تھا: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً، اس میں گائے مطلقاً ہے، پھر بعد میں تخصیص کیوں کی گئی؟

جواب:- وہ تو جیسے جیسے پوچھتے گئے، گائے کا مصداق متعین ہوتا گیا، پیلی بھی اِس کا مصداق ہے، سیاہ بھی اس کا مصداق ہے، جب پوچھا گیا کہ کیسا رنگ اختیار کریں؟ تو ایک کی تعیین ہوگئی۔ اور بڑی عمر والی بھی اس کا مصداق ہے، چھوٹی عمر والی بھی اس کا مصداق ہے، جب پوچھا گیا کہ کیسی ہونی چاہیے؟ تو ایک کی تعیین ہوگئی۔ جس میں داغ ہو وہ بھی اِس کا مصدق ہے، اور جس میں داغ نہ ہو وہ بھی اِس کا مصداق ہے، جب پوچھ لیا گیا تو ایک کی تعیین ہوگئی۔ جب اُن کی طرف سوالات ہوتے چلے گئے تو قیود لگ کر مطلق کا ایک فرد متعین ہوتا چلا گیا۔ تو اِن سوالات سے اُن کا شکی مزاج اور رسول پر بداعتمادی ظاہر ہو رہی ہے، اور ان سوالات کے ذریعے سے اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے چلے جارہے ہیں۔ بقرہ کے افراد مختلف تھے، اُن میں سے جو بھی لے لیتے اس پر عمل ہو جاتا، لیکن سوال کر کے اپنے لیے اُنہوں نے قیود بڑھالیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

یاد کیجیے جس وقت تم نے قتل کیا ایک نفس کو، پھر تم اس نفس کے بارے میں بات ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ نکالنے والا تھا اس چیز کو جس کو

تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ

تم چھپاتے تھے ﴿۷۲﴾ پھر ہم نے کہا کہ لگاؤ تم اُس قتیل کو گائے کا بعض حصہ، اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ

الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ

مردوں کو، اور دکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں تاکہ تم سمجھو ﴿۷۳﴾ پھر تمہارے دل سخت ہو گئے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ

اس کے بعد، پس وہ دل پتھر کی طرح ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت از روئے قساوت کے، اور بیشک پتھروں میں سے بعض

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ

پتھر البتہ ایسے ہوتے ہیں کہ پھوٹتی ہیں ان سے نہریں، اور بیشک بعض پتھر البتہ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پھر نکلتا ہے

مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا

ان سے پانی، اور بیشک بعض پتھر البتہ ایسے ہوتے ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے خوف سے، اور اللہ تعالیٰ

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ

بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو (۷۴) (اے ایمان والو!) کیا پھر تم امید رکھتے ہو کہ یہ تمہاری باتوں کا یقین کرلیں گے؟

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ

حالانکہ ان میں سے ایک گروہ تھا جو اللہ کی کلام کو سنتے تھے پھر اس کو بدل دیتے تھے

مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ

اس کو سمجھ لینے کے بعد، حالانکہ وہ صاحب علم تھے (۷۵) جس وقت ملتے ہیں یہ لوگ ایمان والوں کو تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے،

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ

اور جب تنہائی میں چلا جاتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف، تو کہتے ہیں کیا بیان کرتے ہو تم ان (اہل ایمان) کے سامنے

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

وہ باتیں جو اللہ نے تم پر کھول دی ہیں؟ اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے انہی باتوں کے ذریعے تمہارے رَبّ کے ہاں،

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا

کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ (۷۶) کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جس کو وہ چھپاتے ہیں، اور جس چیز کو

يُعْلِنُوْنَ ۞ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

وہ ظاہر کرتے ہیں (۷۷) اور ان میں سے بعض اَن پڑھ ہیں، وہ نہیں جانتے کتاب کو سوائے خواہشات کے،

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۞ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ

اور نہیں ہیں وہ مگر خیالات گھڑتے (۷۸) پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب کو

بِاَيْدِيْهِمْ ۖ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ

اپنے ہاتھوں کے ساتھ، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، تاکہ حاصل کرلیں اس لکھی ہوئی بات کے ذریعے سے

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ

ثمن قلیل، پس خرابی ہے ان کے لئے اس بات کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی، اور خرابی ہے

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ

ان کے لئے اس چیز کے سبب سے جو انہوں نے کمائی ﴿۷۹﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ مگر چند گنتی کے دن

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ

آپ فرمادیجئے کیا تم نے اختیار کیا ہے اللہ کے پاس کوئی عہد؟ کہ پھر ہرگز خلاف نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے،

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً

یا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جو تم جانتے نہیں ﴿۸۰﴾ کیوں نہیں، جو کوئی برائی کمائے

وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اس کا گناہ اس کا احاطہ کرلے تو یہی لوگ جہنم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۸۱﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۸۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا: یاد کیجئے جس وقت تم نے قتل کیا ایک نفس کو، فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا: پھر تم اُس نفس کے بارے میں بات ایک دوسرے پر ڈالنے لگ گئے۔ اِس لفظ کا مادّہ دَرْءٌ ہے۔ دَرَءَ يَدْرَءُ: دفع کرنا۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہوا ہے فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۂ آلِ عمران: ۱۶۷) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو دور ہٹا کر دکھاؤ۔ اور اِدّٰرَءَ اصل میں تَدَارَءَ تھا، تاء کو دال کر کے دال کو دال میں ادغام کیا تو اِثَّاقَلَ کی طرح اِدّٰرَءَ، باب اِفّاعُل بن گیا، ایک دوسرے کی طرف دفع کرنا، ایک شخص کہتا تھا تم نے قتل کیا ہے اور دوسرا کہتا تھا تم نے قتل کیا ہے، اس طرح سے ایک دوسرے پر بات ڈالنے لگ گئے۔ جیسے ایک جرم پیش آ گیا اور مجرم کا پتہ نہیں، تو ایک دوسرے پر بات یوں ڈالی جایا کرتی ہے، ایک دوسرے پر وہم اور شبہ کرتے ہوئے یونہی کہا جاتا ہے، ایک گروہ نے دوسرے پر بات ڈالی، اُس نے اِس پر ڈال دی، تدارُء کا یہی معنی ہے۔ فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا: تم اُس نفس کے بارے میں ایک دوسرے پر ڈالنے لگ گئے، وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ: اور اللہ

نکالنے والا تھا اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے، نکالنے والے سے مراد ظاہر کرنے والا۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا: پھر ہم نے کہا، اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا: اضْرِبُوْهُ کی ہٗ ضمیر تو اُس قتیل کی طرف لوٹ رہی ہے، بظاہر لوٹے گی نفس کی طرف، چونکہ لفظِ نفس عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کو قتیل کی تاویل میں کر کے ہٗ ضمیر اُدھر لوٹا دیں گے۔ بِبَعْضِهَا کی ھا ضمیر بقرہ کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا، ''پھر ہم نے کہا کہ مارو تم اس قتیل کو اس گائے کے بعض حصے کے ساتھ'' یعنی گائے کا بعض حصہ لے کر اس قتیل کو لگا دو، مارنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو لگا دو، كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى یہ لفظ دلالت کرتے ہیں کہ پیچھے ایک بات محذوف ہے، کہ پھر تم نے ایسا کیا، ہم نے اُس قتیل کو زندہ کر دیا، كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ مُردوں کو، موتی میت کی جمع، وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ: اور دکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سمجھو۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: یہ ثُمَّ استبعاد کے لئے ہے، پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، یعنی اتنا کچھ دیکھنے کے باوجود پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ: پس وہ دل پتھر کی طرح ہیں، اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً: یا پتھر سے بھی زیادہ سخت از روئے قساوت کے، وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ: بیشک پتھروں میں سے بعض پتھر البتہ ایسے ہوتے ہیں کہ پھوٹتی ہیں اُن سے نہریں، اَنہار نہر کی جمع ہے، تفجّر: پھوٹنا۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ: اور بیشک پتھروں میں سے بعض پتھر وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ: پھر ان سے پانی ٹپکتا ہے، پانی نکلتا ہے، مَا چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے مِنْهُ کی ضمیر اور يَشَّقَّقُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے، ترجمہ اگر جمع کے ساتھ کر دیا جائے تو عین موقع محل کے مطابق ہے، کیونکہ کسی ایک پتھر کا ذکر نہیں ہے، ''پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکلتا ہے''، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ: اور بیشک پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے خوف سے۔ هَبَطَ هُبُوْط: اُوپر سے نیچے کو اتر آنا۔ جیسے اِهْبِطُوْا مِصْرًا پیچھے آیا تھا۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ: تطمعون میں خطاب اہلِ ایمان کو ہے، اور فاء سے پہلے اگر اِس کا معطوف علیہ نکالنا ہو تو عبارت یوں نکل آئے گی اَتَسْمَعُوْنَ اَحْوَالَهُمْ فَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ، اے ایمان والو! تم ان یہودیوں کا حال سنتے ہو پھر امید رکھتے ہو کہ یہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے؟، اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ: اَنْ يُّؤْمِنُوْا لِاَجْلِ دَعْوَتِكُمْ کہ تم اِنہیں ایمان کی دعوت دو گے تو تمہاری دعوت کی وجہ سے یہ ایمان لے آئیں گے، تم امید رکھتے ہو؟، اِن کا حال بھی سن رہے ہو کہ یہ کیسے چتر لوگ ہیں، کس قسم کے دھوکے باز اور دنیادار لوگ ہیں، ان کا حال سننے کے بعد پھر تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے؟ تو جب لام کا ترجمہ یوں کر دیا: لِاَجْلِ دَعْوَتِكُمْ تو اِس ایمان سے ایمانِ شرعی مقصود ہے کہ اللہ پر، اللہ کے رسول پر اور قرآن پر ایمان لے آئیں گے تمہاری دعوت کی وجہ سے۔ اور اگر ایمان سے لغوی مفہوم مراد لے لیا جائے تو پھر ترجمہ یوں بھی کر سکتے ہیں ''کیا پھر تم امید رکھتے ہو کہ یقین کر لیں گے یہ تمہاری باتوں کا؟'' (مظہری، آلوسی)۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ: حالانکہ اِن میں سے ایک گروہ تھا جو اللہ کی کلام کو سنتے تھے ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ: پھر اُس کو بدل دیتے تھے۔ حَرَّفَ کا معنی ہوتا ہے صحیح مفہوم سے بات کو ہٹا دینا، جیسے کسی لفظ کو گرا دیا اور حذف کر دیا، یا کوئی محذوف نکال لیا جس

سے بات بگڑ گئی، یا لفظ کے معنی میں تاویل غلط کرلی، کوئی حقیقت مجاز کا قصہ چھیڑ کر مفہوم خراب کردیا، وہ سب باتیں اسی طرح سے ہوتی ہیں، ''پھر بدلتے تھے وہ اُس اللہ کی کلام کو''، مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ: اُس کو سمجھنے کے بعد، مَا عَقَلُوْهُ میں مَا مصدریہ ہے، اُس کو سمجھ لینے کے بعد اُس بات کو بدل دیتے تھے، وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: حالانکہ وہ جانتے تھے، حالانکہ وہ صاحبِ علم تھے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے گزر گیا، لَقُوا اصل میں لَقِيُوْا تھا، جس وقت ملتے ہیں یہ لوگ ایمان والوں کو، قَالُوْٓا اٰمَنَّا: کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ: خَلَا خلوت سے ہے، اور جب تنہائی میں چلا جاتا ہے اُن کا بعض بعض کی طرف، قَالُوْٓا تو کہتے ہیں اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: کیا بیان کرتے ہو تم اُن ایمان والوں کے سامنے، یہ بعض یہودی دوسروں کو کہتے ہیں، کیا بیان کرتے ہو تم اہلِ ایمان کے سامنے، بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: وہ باتیں جو اللہ نے تم پر کھول دی ہیں، لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ: اِس میں لام لامِ عاقبت ہے، تمہاری اِس تحدیث کا انجام یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے اِنہی باتوں کے ذریعے سے، جو باتیں تم ان پر جا کر بیان کرتے ہو ان کی وجہ سے وہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے اللہ کے سامنے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ: کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُس چیز کو جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس چیز کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

لفظِ ''اُمّی'' کی تحقیق

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ: اُمِّيُّوْنَ جمع ہے اُمّی کی، اور اُمّی کا لفظ اُم یعنی ماں کی طرف منسوب ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا (سورۂ نحل: ۷۸)، اِسی قسم کا رہا۔ لکھنا نہیں سیکھا، پڑھنا نہیں سیکھا، کوئی اور اس قسم کے کام نہیں سیکھے، جیسے ماں کے بطن سے آئے تھے ویسے کے ویسے ہی رہے، تو یہ اَن پڑھ کے معنی میں ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بھی سورۂ اعراف میں یہی لفظ استعمال کیا گیا اَلنَّبِيَّ الْاُمِّيَّ (آیت: ۱۵۷)، تو وہاں بھی یہی معنی ہے کہ آپ ﷺ لکھے پڑھے نہیں، جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ویسے ہی رہے، لیکن آپ ﷺ کے لئے اُمّی کا لقب فخر ہے، اور دوسرے لوگوں کو جب اُمّی کہا جاتا ہے تو اُن کی مذمت ہے۔ آپ ﷺ کے لئے فخر اس لیے ہے کہ اِس میں تو کوئی شک شبہ ہی نہیں رہا کہ سرورِ کائنات ﷺ کا علم اور آپ کے بیان کیے ہوئے حقائق و معارف کے سامنے بڑے بڑے عقلمند عاجز آگئے، اور دنیا نے متفق علیہ طور پر آپ ﷺ کو بہت بڑا عقلمند، بہت بڑا علم والا، اور بہت بڑے حقائق ظاہر کرنے والا مان لیا، سرورِ کائنات ﷺ نے جس قسم کے علوم ظاہر فرمائے اُن علوم کے بارے میں کسی کو شک شبہ نہیں ہے۔ تو پھر ایک شخص نے پڑھا کچھ نہ ہو، جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا ویسے ہی تھا، کسی کے سامنے اُس نے شاگردی کے لئے اپنے گھٹنے نہیں ٹیکے، اِس کے باوجود علوم کے دریا بہا دیے، تو یہ ایک فخر ہے۔ مدرسوں میں پڑھ کر، یونیورسٹیوں میں پڑھ کر اور پی ایچ ڈی کر کے اگر کوئی شخص تقریر کرتا ہے یا کوئی مضمون لکھتا ہے یا کوئی تحقیق پیش کرتا ہے، تو یہ کوئی قابلِ تعجب نہیں، یہ ساری دنیا ہی کرتی ہے۔ اور ایک شخص پڑھا بالکل نہ ہو، کسی صاحبِ فن کے سامنے جا کر بیٹھا نہیں، لیکن وہ حقائق اس قسم کے ظاہر کرے کہ اچھے بھلے عقلمند اُس کے سامنے عاجز آجائیں، تو یہ بات اس کے لئے باعثِ فخر ہے۔ اور دوسروں

کے لئے چونکہ اس قسم کے علم لدنی کا اہتمام نہیں، کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست دل دماغ کے اندر علم ڈال دے، عام لوگوں کے لئے قاعدہ اور ضابطہ یہی ہے کہ جس وقت تک کسی استاذ کے سامنے شاگرد بن کر نہیں بیٹھیں گے، اور محنت نہیں کریں گے، کسی کے جوتے سیدھے نہیں کریں گے، اس وقت تک کوئی علم وفن نہیں آیا کرتا، اس لیے کسی شخص کا اُمّی رہ جانا اور پڑھنا لکھنا نہ سیکھنا ایک عام انسان کے لئے عیب ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے اُمّی ہونا فخر ہے، کہ پڑھا کہیں نہیں، شاگردی کسی کی اختیار نہیں کی، کسی علمی ماحول میں نہیں رہے، مطالعۂ کتب نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود علوم کے دریا بہا دیے، اس لیے النبی الامی یعنی حضور ﷺ کے ساتھ اُمّی کا لفظ آپ کی عظمت کے منافی نہیں، بلکہ عظمت کا نشان ہے۔ اور جب عام لوگوں کو کہا جائے اُمّی، اَن پڑھ قسم کے لوگ، تو یہ جاہل کے مفہوم میں ہوتا ہے، جو نہ لکھے نہ پڑھے، اور یہاں اُمیون سے یہی جہلاء مراد ہیں۔ پہلے یہودیوں کے اہلِ علم کا ذکر تھا، جیسے وَهُمْ يَعْلَمُونَ میں آیا، اور یہاں اُن کے اَن پڑھ اور جاہل قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ: اِن میں سے بعض اَن پڑھ ہیں، جاہل ہیں، لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ: نہیں جانتے وہ کتاب کو، وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے، کتاب سے مراد تورات ہے، یہ کتاب کا علم نہیں رکھتے، إِلَّآ أَمَانِيَّ: أَمَانِيَّ أُمْنِيَّة کی جمع ہے، اُمْنِیَّۃ کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے اُس خواہش کو جو انسان اپنے دل کے اندر بنالیتا ہے، خیالی پلاؤ پکاتا ہے، یوں ہوجائے گا، میں ایسا ہوں، اس طرح سے ہوجائے گا، اِس قسم کی خواہشات اور خیالات جو پکا لیے جاتے ہیں، خیالی پلاؤ، اُن کو أَمَانِيَّ کہا جاتا ہے، ''سوائے خواہشات کے یہ کتاب کو کچھ نہیں جانتے'' یعنی تورات کے متعلق ان کا علم اگر ہے تو اتنا ہی ہے کہ وہ بھی ہماری خواہشات کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اپنی خواہشات کے علاوہ وہ کتاب کو کچھ نہیں جانتے، وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ: اور نہیں ہیں وہ مگر خیالات گھڑتے، اپنے دل دماغ میں خیالات بناتے رہتے ہیں، باقی! کتاب کے متعلق اُن کو کوئی علم نہیں ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ: پس خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں کے ساتھ، کتاب سے یہاں مکتوب یعنی لکھی ہوئی بات مراد ہے، جیسے مفتی فتویٰ لکھا کرتا ہے تو وہ فتویٰ کتاب کا مصداق ہے، ''جو لوگ اپنے ہاتھوں کے ساتھ کچھ باتیں لکھ لیتے ہیں''، ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ: پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا: تاکہ اُس لکھی ہوئی بات کے ذریعے سے حاصل کرلیں ثمنِ قلیل، ثمنِ قلیل سے دنیا کا مال ومتاع مراد ہے، اپنے ہاتھوں سے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خود ساختہ بات ہوتی ہے، اور خود ساختہ بات لکھنے کے بعد اُس کو منسوب اللہ کی طرف کردیتے ہیں، اور اپنی اِن باتوں کو جو خود گھڑتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں اِن کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں، ''تاکہ حاصل کرلیں اس کے ذریعے سے ثمنِ قلیل''، فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ: پس خرابی ہے اِن کے لئے اُس بات کی وجہ سے جو اِن کے ہاتھوں نے لکھی، اور خرابی ہے اِن کے لئے اُس چیز کے سبب سے جو انہوں نے کمائی۔ دوہری خرابی ہوگئی، لکھنا اور اللہ کی طرف منسوب کرنا یہ مستقل خرابی کا باعث ہے، چاہے اُس کے اوپر پیسے لیں یا نہ لیں، اور اگر لکھنے کے بعد انہوں نے اُس کو کمائی کا ذریعہ بھی بنالیا تو جو مال اِنہوں کمایا ہے وہ مستقل ان کے لئے بربادی کا باعث ہے، شریعت کی بات جھوٹ موٹ لکھنا اور اللہ کی طرف منسوب کردینا مستقل خرابی، اور پھر جو اس کے ذریعے سے مال کمایا وہ مستقل بربادی کا ذریعہ۔ وَقَالُوا: اور یہ لوگ کہتے ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ

اَیَّامًامَّعْدُوْدَةً: ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ مگر چند گنتی کے دن۔ اَیَّامًامَّعْدُوْدَةً: چند گنتی کے دن، قُلْ: آپ کہیے، فرمادیجئے، ان سے پوچھ لیجئے، قُلْ کا اطلاق اِسی مفہوم میں ہوتا ہے، اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَاللهِ عَهْدًا: اَتَّخَذْتُمْ اصل میں ہے اَاِتَّخَذْتُمْ، پہلا ہمزہ استفہام ہے، اور دوسرا ہمزہ وصلی تھا جو اِس ہمزہ استفہام کے داخل ہونے کی وجہ سے گر گیا، کیا تم نے لیا ہے اللہ سے کوئی عہد؟ تم نے اختیار کیا ہے اللہ کے پاس کوئی عہد؟، فَلَنْ يُّخْلِفَ اللهُ عَهْدَهٗ: کہ پھر ہرگز خلاف نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے، تم نے اس سلسلے میں کوئی اللہ سے وعدہ لے لیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ اُس عہد کے خلاف نہیں کرے گا، اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ: یا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں، بے علمی کے ساتھ اِس قسم کی باتیں کرتے ہو" یا بولتے ہو تم اللہ پر ایسی باتیں جو تم جانتے نہیں" بَلٰى: کیوں نہیں تمہیں آگ لگے گی، مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً: جو کوئی شخص بُرائی کرے، جو کوئی بُرائی کمائے، وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ: اور اُس کی خطیہ، اُس کا گناہ اس کا احاطہ کر لے، گھیر لے، کہ اُس کے اندر خیر اور نیکی کی بات باقی نہ رہے، فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: یہی لوگ جہنم والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کیے، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: یہی جنت والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

اَسْتَغْفِرُ اللهَ۔ اَسْتَغْفِرُ اللهَ۔

تفسیر

گزشتہ واقعے کا تتمہ

رکوع کی ابتدائی آیت اُس واقعہ کا ابتدائی حصہ ہے جس کا ذکر آپ کے سامنے پچھلے رکوع کی آخری آیات میں گزرا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو گائے ذبح کرنے کے لئے کہا تھا، تو یہ کہنے کہ کیا وجہ تھی؟ اُس واقعہ کی طرف اشارہ اِس ابتدائی آیت میں ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اسرائیلیوں میں ایک قتل ہو گیا، قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا، اور جس وقت قاتل کا پتہ نہ چلے تو لوگ ایک دوسرے کے اوپر تہمتیں لگاتے ہیں، اِتہام لگاتے ہیں، بدگمانیاں کرتے ہیں، ہر کوئی دوسرے پر بات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، کہ فلاں نے قتل کیا ہوگا، وہ کہتا ہے کہ نہیں نہیں! فلاں نے قتل کیا ہوگا، اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے، اور اندیشہ تھا کہ آپس میں بدگمانیوں کی وجہ سے یہی قتل آپس میں خانہ جنگی کا باعث نہ بن جائے، کہ مختلف لوگ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نکال لیں کہ تو مجھے کیوں کہتا ہے، میرا نام کیوں لیتا ہے، وہ کہتا ہے تو نے مارا ہے، وہ کہتا ہے تو نے مارا ہے، اس طرح سے آپس میں لڑائی جھگڑا ہو جائے گا، اور بنی اسرائیل آپس میں خانہ جنگی کے اندر مبتلا ہو جائیں گے، اور یہ ایک قتل فتنے کا باعث ہو جائے گا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اِن حالات کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ قاتل کی پہچان کے لئے کوئی طریقہ بتا دیا جائے، قاتل ظاہر ہو جائے، تا کہ یہ خانہ جنگی کی کیفیت ختم ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر چہ براہِ راست بھی وحی کے

ذریعے سے اطلاع دے سکتے تھے کہ فلاں قاتل ہے، اور اسی طرح بغیر کسی قسم کی تدبیر اختیار کرنے کے اُس مقتول کو زندہ کر دیا جاتا اور مقتول بتا دیتا کہ میرا قاتل فلاں ہے، اللہ کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں، لیکن اپنی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اِنہیں کہو کہ گائے ذبح کریں، ذبح کرنے کے بعد گائے کا ایک ٹکڑا لے کر اُس قتیل کے ساتھ لگا دیں، تو وہ قتیل زندہ ہو جائے گا اور زندہ ہونے کے بعد اپنا قاتل بتا دے گا۔ چونکہ یہ سارے کا سارا کام معجزہ کے طور پر ہونے والا تھا، اس لیے اکیلے مقتول کا بیان قاتل کی شناخت میں حجت سمجھا گیا، ورنہ ایک آدمی اگر کہہ دے کہ مجھے فلاں نے مارا ہے تو وہ کافی نہیں ہوتا، لیکن یہاں جو کچھ بھی پیش آ رہا تھا وہ معجزۃً پیش آ رہا تھا، تو یہ یقین تھا کہ وہ قتیل زندہ ہونے کے بعد جس کا نام لے گا وہ صحیح بتائے گا۔ تو اُن کو جس وقت حکم دیا گیا تو اس حکم کے مقابلے میں اُنہوں نے جو حیل و حجت اور مختلف قسم کی بہانہ بازی کی وہ آپ کے سامنے پچھلی آیات میں پہلے آ چکی، لیکن کر کرا کے اُنہوں نے گائے ذبح کر لی، جب گائے ذبح کر لی تو اُسی تدبیر کے ساتھ ایک ٹکڑے کو جس وقت قتیل کے ساتھ لگایا گیا تو وہ قتیل زندہ ہو گیا، زندہ ہو کر اُس نے اپنا قاتل بتا دیا، تو معلوم ہو گیا کہ وہ قاتل اِس قتیل کا بھتیجا تھا، اور اِس قتیل کی لڑکی سے اُس نے نسبت کا مطالبہ کیا تھا کہ اِس کی شادی مجھ سے کر دو، اور اُس نے انکار کیا، تو اِس انکار کرنے کی وجہ سے اس نے اس کو قتل کر دیا[1] ...... اس لیے حدیث شریف میں ایک روایت آتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی امت کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کے فتنوں سے ہمیشہ بچ کر رہا کرو، بنی اسرائیل میں سب سے پہلا جو فتنہ پیش آیا تھا وہ عورت کے سبب سے ہی تھا۔[2] یہی نکاح کی باتیں اور عورتیں حاصل کرنا، آج بھی اگر آپ اخبارات اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جھگڑا فساد کا باعث زیادہ تر اِسی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ جو پیش آیا تھا وہ اسی عورت کے سبب سے تھا...... تو وہ زندہ ہوا، زندہ ہو کر اُس نے اپنا قاتل بتا دیا، قاتل کے سامنے آ جانے کے ساتھ وہ جو خانہ جنگی کی کیفیت تھی، ایک دوسرے پر بات ڈالنے کی بناء پر جو آپس میں بدگمانیاں بڑھ رہی تھیں، اور اندیشہ تھا کہ یہ کسی بڑی لڑائی کا پیشہ خیمہ نہ ہو جائے، وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان تھا کہ بنی اسرائیل کو اس پیچیدگی سے نکال دیا۔

بنی اسرائیل کا واقعہ بعث بعد الموت کی دلیل ہے

قرآنِ کریم کی یہ عادت ہے کہ جس وقت ایک بات بیان ہو رہی ہو اور درمیان میں اُس بات سے ایک جدید فائدہ حاصل کیا جا سکے تو فوراً اُس کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے بعث بعد الموت، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھایا جانا، کہ ہم سب مریں گے اور مرنے کے بعد ایک وقت آئے گا کہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور ہماری زندگی کے تمام اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا، یہ آخرت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقیدوں میں سے ہے، جیسے کہ ابتدائی آیات میں وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کے تحت آپ کے سامنے آ گیا تھا، تین عقیدے بنیادی ہیں، توحید رسالت اور معاد۔ بعث بعد الموت کا عقیدہ وہی معاد والا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ ہمیں زندگی کی طرف لوٹائے گا۔ اور مشرکین مکہ جیسے توحید کا انکار کرتے تھے تو اس کے

---

(۱) دیکھئے: مرقاۃ شرح مشکوۃ، کتاب النکاح فصل اول۔ نوٹ: عام تفاسیر میں قاتل بھتیجا ہی لکھا ہے، نسفی، جلالین، مظہری وغیرہ۔ واللہ اعلم

(۲) مسلم ۲/۳۵۳، باب اکثر اھل الجنۃ الفقراء الخ/ مشکوۃ ص ۲۶۷، عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔ کتاب النکاح فصل اول۔

ساتھ ساتھ اُن کو معاد پر بھی بے انتہاء اشکالات تھے، مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (سورہ یٰس:۷۸) ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو زندہ کون کرے گا؟ جس وقت ہم ہڈیاں ہو جائیں گے، چورا چورا ہو جائیں گے، کیا ہم پھر دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اِس قسم کے اشکالات آگے قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں مشرکین کی طرف سے ذکر کیے جائیں گے۔ اب یہاں چونکہ ان لوگوں کے سامنے واقعہ پیش آیا کہ ایک آدمی قتل کر دیا گیا، مر گیا، مرنے کے بعد اُس کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے زندہ کیا گیا، اُس نے اپنا قاتل بتایا، قاتل بتا کر دوبارہ پھر اُس پر موت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تو یہ ایک واقعہ اور نمونہ پیش آ گیا تو اِس کے ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشارہ فرما دیا کہ دیکھو! جس طرح سے ہم نے اِس مردے کو زندہ کر کے دکھایا ہے، سارے کے سارے مردے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ایسے ہی زندہ کریں گے، اور یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، تم اِسی سے سمجھ جاؤ کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے، دیکھو! ہم نے زندہ کر کے دکھا دیا۔ یہ واقعہ چونکہ پیش آیا تھا اور ساتھ ہی اِس کا وعظ ونصیحت کا یہ پہلو بھی تھا، تو وہ نمایاں کر دیا گیا، كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: اللہ تعالیٰ مردوں کو ایسے زندہ کرے گا، تو اِس واقعہ کو گویا کہ آخرت کے عقیدے کی نظیر بنا لیا گیا، اور اُس کے ساتھ ہی تلقین کر دی گئی کہ جیسے یہ موت کے بعد زندہ ہوا اِسی طرح سے باقی انسان بھی موت کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔ تو درمیان میں یہ بات اس طرح سے آگئی۔

رقّتِ قلب اور قساوتِ قلب کی وضاحت

اب اسرائیلیوں کو چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کی قدرت کے اتنے نمونے دیکھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے، اور ایسے واقعات دیکھنے کے بعد انسان کے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انسان ڈرتا ہے۔ رقت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرتے ہوئے انسان اللہ سے ڈرے، اور قساوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا ارتکاب کرے اور دل کے اندر کوئی ندامت اور کوئی پریشانی محسوس نہ ہو۔ کہتے ہیں فلاں شخص کے دل میں قساوت ہے، بڑا قاسی القلب انسان ہے، تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بُرائی کرتے ہوئے اُس کی طبیعت میں کوئی جھجک پیدا نہیں ہوتی اور اُس کے قلب میں کوئی تاثر نہیں آتا، اور نیکی کا اُس کے دل میں شوق نہیں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں بڑا رقیق القلب ہے تو رقت کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ نیکی کا شوق ہو اور بُرائی کرتے ہوئے انسان کے قلب کے اندر پریشانی کی کیفیت آئے۔ بات بات پر رونے لگ جانا کوئی رقت کی علامت نہیں ہوتی، یا کسی واقعہ کو دیکھ کر رونا نہ آنا قساوت کی علامت نہیں ہے، کہتے ہیں فلاں کا دل بڑا سخت ہے، کیسا واقعہ پیش آجائے وہ روتا نہیں ہے، یہ کوئی شرعی قساوت نہیں جس کی مذمت کی گئی ہے، قلبِ قاسی جس کی مذمت آتی ہے،[1] اُس کا یہ مطلب نہیں ہے، شرعی طور پر سخت دل اِس کو نہیں کہتے، بلکہ قساوتِ قلبی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اِس شخص کا دل اتنا سخت ہو گیا کہ اللہ کے خوف سے متاثر نہیں ہوتا، اس لیے کوئی بُرائی کرنی پڑ جائے تو اِس کو گراں نہیں گزرتی، اِس کے دل میں کسی قسم کی پریشانی اور اِس قسم کے حالات پیدا نہیں ہوتے جس کی بناء پر اُس بُرائی کو چھوڑ دے۔ نیکی کا شوق اور بُرائی کا ترک یہ دونوں علامتیں ہیں قلب کے اندر

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۶۶ باب ما جاء فی حفظ اللسان۔ مشکوۃ ج ۱ ص ۱۹۸ باب ذکر اللہ فصل ثانی۔

رقت کی، اور نیکی کا شوق نہ ہونا اور برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دل کے اندر کسی قسم کی فکر پیدا نہ ہونا یہ علامت ہے کہ قلب کے اندر قساوت ہے۔

اسرائیلیوں کی قساوتِ قلبی

تو اسرائیلیوں کے دل بہت قساوت کی طرف چلے گئے، پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، کیونکہ پتھر میں جتنی بھی سختی ہو، جس مقصد کے لئے اُس کو پیدا کیا گیا ہے وہ سختی اُس مقصد کے منافی نہیں ہے، باوجود اِس سختی کے پھر بھی اُس میں سے چشمے پھوٹتے ہیں، نہریں نکلتی ہیں، اور بعض پتھر پھٹتے ہیں تو اُن میں سے پانی رِستا ہے، قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے، پہاڑوں میں آپ جائیں گے تو یہ واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، کہ کس طرح سے پتھروں سے چشمے پھوٹتے ہیں، کس طرح سے اُن سے پانی ٹپکتا ہے، باوجود اِس بات کے کہ انتہائی سخت ہوتے ہیں لیکن پھر بھی جس مقصد کے لئے اللہ نے اُن کو پیدا کیا وہ مقصد ان سے حاصل ہوتا ہے، اور اُن میں اللہ کا پیدا کیا ہوا اس قسم کا تاثر ہوتا ہے کہ وہ پانی کو جذب کرتے ہیں پھر اس کو ٹپکاتے ہیں، اور بعض پتھر اللہ تعالیٰ کی ہیبت کی وجہ سے بلندی سے پستی کی طرف گر جاتے ہیں، جیسا کہ اسرائیلیوں کے سامنے کوہِ طور کا واقعہ پیش آیا، کہ اللہ کی تجلی ہوئی تو اللہ کی اس تجلی سے متاثر ہو کر وہ پتھر بھی خاکستر ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ ہیں کہ اِن کے سامنے کیسے ہی واقعات ظاہر ہوتے چلے جائیں یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور بالکل متاثر نہیں ہوتے، یہ اِن کے دل کی قساوت ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کے عدمِ تاثر کا شکوہ کیا ہے کہ اتنے واقعات دیکھنے کے بعد بھی وہ متاثر نہیں ہوئے۔

خلاصۂ آیات

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا: یاد کیجئے جس وقت قتل کیا تم نے ایک نفس کو، فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا: پھر تم اُس نفس کے بارے میں تدارُء کرنے لگ گئے، ایک دوسرے پر بات ڈالنے لگ گئے، اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اُس چیز کو جس کو تم چھپاتے ہو۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا: ہم نے کہا کہ مارو اِس قتیل کو اِس گائے کے بعض حصے کے ساتھ، اب آگے وہ عبارت مقدر ہوگی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر تم نے ایسا کیا، اور ہم نے اُس قتیل کو زندہ کر دیا، كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: یہ لفظ اس مقدر مضمون کے اوپر دلالت کرتے ہیں، ایسے ہی زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ مُردوں کو اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی قدرت کی آیات، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سوچو۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، یعنی یہ واقعہ دیکھنے کے باوجود، مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھروں کی طرح ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں، اور بیشک پتھروں میں سے بعض البتہ وہ ہیں کہ پھوٹتی ہیں اُن سے نہریں، اور بیشک اُن پتھروں میں سے بعض پھٹ جاتے ہیں پھر نکلتا ہے ان سے پانی، اور بیشک اُن پتھروں میں سے بعض البتہ وہ ہیں جو گر جاتے ہیں اللہ کے خوف سے، اور نہیں ہے اللہ بے خبر اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو، یعنی پتھروں کے اندر تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا تاثر ہے کہ جس مقصد کے لئے اُن کو پیدا کیا گیا وہ مقصد بھی اُن سے حاصل ہے، اور اتنا سا شعور اِن جمادات کے اندر بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت سے یہ متاثر ہوتے ہیں۔

احادیث سے پتھروں کے شعور کا ثبوت

ہمارے سامنے یہ ساری کی ساری چیزیں بے جان ہیں، لیکن اِن کا شعور اِس درجے کا ہے کہ جو تکوینی احکام اِن سے متعلق ہیں وہ ان کو سمجھتے ہیں، اور ان کے مطابق ان کے اُوپر اثر ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ ہمارے سامنے یہ بے حس بے جان ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اُس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری نبوت سے پہلے یعنی جس وقت میں نے نبوت کا اظہار نہیں کیا تھا اُس سے پہلے وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا،[1] پتھر سے آواز آتی تھی، السلام علیك یا رسولَ الله یا اِس قسم کے لفظوں کے ساتھ پتھر سے آواز آتی تھی۔ اور اُحد پہاڑ پر آپ ایک دفعہ تھے اور اُس میں زلزلہ آیا تو آپ ﷺ نے پاؤں مار کر کہا کہ ٹھہر جا، تیرے اُوپر نبی ہے، صدیق ہے، دو شہید ہیں۔[2] ان سارے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجے میں پتھر کے اندر بھی تاثر ہے، اگرچہ اس درجے کی عقل نہیں کہ اُس کو احکامِ شرعیہ کا مکلف کیا جاسکے، لیکن اِس درجے کا شعور ہو کہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کے ساتھ وہ متاثر ہوتا ہے، اِس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

اہلِ ایمان کو یہود کی طرف سے مایوس کر کے تسلی دی گئی

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ: یہ آیت مسلمانوں کو، اہلِ ایمان کو کچھ تسلی دینے کے لئے ہے، جو بہت زیادہ فکر کرتے تھے کہ یہ یہودی مانتے کیوں نہیں، ہر وقت اُن کو فکر لگی رہتی تھی کہ کسی طرح یہ مان جائیں، اور جب تک یہ امید لگی رہے اور فکر لگی رہے تو آپ جانتے ہیں کہ قلب کے اندر پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک لڑکا بگڑا ہوا ہے، میری طبیعت اُدھر متوجہ ہے، میں اُس کو ہر وقت سمجھاتا ہوں، جب تک مجھے یہ امید لگی رہے گی کہ یہ سمجھ جائے گا تو میں اُس کے پیچھے لگا رہوں گا، میرے دل دماغ میں اِس بارے میں پریشانی رہے گی، لیکن اگر ایک وقت میں مایوسی ہوجائے کہ اس کے پیچھے نہ پڑو، اِس کے پیچھے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سمجھنے والا نہیں ہے، کسی صورت میں نہیں مانے گا، تو یہ مایوسی کی کیفیت ایک درجے میں راحت کا باعث ہوجایا کرتی ہے، وہ فکر اور وہ لگن کسی درجے میں ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اہلِ ایمان جو ہر وقت یہودیوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، کہ اِن کے شکوک وشبہات کو دور کریں، جس طرح سے بھی ہو اِن کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں، یہ مان جائیں، ایمان لے آئیں، ہر وقت فکر تھی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اِن کی کارروائیاں تو تم سن رہے ہو، اِن کے احوال تو تمہارے سامنے ہیں، کہ یہ کیسے ہوشیار لوگ ہیں، کس قسم کے فریب کار ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِن کا کیا معاملہ ہے، تو ایسے لوگوں سے بھی تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے؟ جو براہِ راست اللہ کی بات سن کر اُس کو بھی بگاڑ دیتے ہیں تو تمہاری بات سننے کے بعد اُس پر یقین لے آنا ان سے کیسے

---

(۱) مسلم ۲/۲۴۵، کتاب الفضائل کی ابتداء۔ مشکوۃ ۲/۵۴۰، باب علامات النبوۃ۔ ولفظه: اِنِّی لَاَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ اُبْعَثَ اِنِّی لَاَعْرِفُهُ الْآنَ۔

(۲) بخاری ۱/۵۲۱، باب مناقب عمرؓ۔ مشکوۃ ۲/۵۶۳، باب مناقب هؤلاء الثلاثة۔ فصل اول۔ ولفظه: اُثْبُتْ اُحُدُ فَمَا عَلَيْكَ اِلَّا نَبِيٌّ اَوْ صِدِّيْقٌ اَوْ شَهِيْدَانِ۔

متوقع ہے؟ یہ بات کہہ کر ایک تو یہود کی مذمت ظاہر کرنی مقصود ہے، کیونکہ جب ایک شخص سمجھانے والے کو کہے گا کہ بھائی! چھوڑو، یہ تو ایسا لچر آدمی ہے، اِس نے تو یہ کیا، یہ کیا، یہ خطاب چاہے اُس سمجھانے والے کو ہے کہ اِس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن اِس میں مذمت اُس کی بھی تو نکل رہی ہے، کہ ایسے شخص کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں بھی اسی طرح یہود کی مذمت بھی ہے اور اہل ایمان کو کسی درجے میں تسلی دینا بھی مقصود ہے، کہ اگر یہ سمجھتے نہیں اور مانتے نہیں تو تم فکر نہ کرو، زیادہ اِن کے پیچھے نہ پڑو، یہ تو اس قسم کے چالاک لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بات براہِ راست سن کر بھی اُس میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ یہ اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ستر آدمی طور پر گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی کلام سنی تھی، اور بعد میں آ کر لوگوں کے سامنے ذکر کر دیا تھا کہ تورات کلام تو واقعی اللہ کی ہے، اُسی نے اتاری ہے، لیکن ساتھ اللہ نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جو حکم مشکل معلوم ہو اس کے اوپر عمل نہ کیجیو۔ یہ واقعہ پیچھے ضمناً آیا تھا، اِن لفظوں میں اُسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ: اے اہل ایمان! تم اِن کے احوال سنتے ہو پھر امید رکھتے ہو کہ یہ ایمان لے آئیں گے تمہارے کہنے کی وجہ سے؟ یا، تمہاری باتوں کا یقین کر لیں گے؟ یہ دو ترجمے میں نے آپ کے سامنے کیے، ایک ایمان لغوی کے تحت اور ایک ایمان شرعی کے تحت۔ ''تمہاری دعوت کی وجہ سے، تمہارے کہنے کی وجہ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟'' یہ تو ایمان شرعی ہے۔ یا ''تم امید رکھتے ہو کہ تمہاری باتوں کا یقین کر لیں گے؟'' یہ ایمان لغوی ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک فریق سنتا تھا اللہ کی کلام کو، پھر اُس کو بگاڑ دیتا تھا، پھر اس کو بدل دیتا تھا اُس کے صحیح مفہوم سے، تحریف کا یہی معنی ہے۔ اُس کو سمجھ لینے کے باوجود، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کی کلام ہے، اور اللہ کی کلام کو بدلنا اور بگاڑنا ٹھیک نہیں، صاحبِ علم ہونے کے باوجود وہ اس قسم کی حرکت کرتے تھے، تو جس جماعت کے اہل علم اس قسم کے ہوں کہ جان بوجھ کر اللہ کی باتوں کو بگاڑتے ہوں اُن کے متعلق آپ کیسے توقع رکھیں گے کہ اپنے مفاد کو ختم کر کے اپنی خواہشات کے خلاف تمہاری بات مان لیں؟ یہ ایسے لوگ نہیں ہیں، یعنی صاحبِ علم لوگوں کا یہ حال ہے کہ سمجھ رہے ہیں کہ اللہ کا حکم یہ ہے، اللہ کی بات یہ ہے، لیکن پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی باتوں کے ساتھ صاحبِ علم لوگوں کا یہ معاملہ ہے تو تمہاری باتوں کی اِن کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ اِس لیے اِن سے یہ امید نہ رکھو کہ یہ ہوشیار اور چالاک لوگ تمہارے قابو میں آ جائیں گے۔

یہود کی منافقانہ پالیسی اور چالبازی

اور پھر فریب کار ایسے ہیں کہ جب مؤمنوں کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں اٰمَنَّا: ہم ایمان لے آئے، اور جب اُن کا بعض بعض کی طرف خلوت میں چلا جاتا ہے...... اگلے لفظوں کا حاصل سمجھ لیجئے!...... جب وہ منافقت کے طور پر آ کر اہل ایمان میں ایمان کا اظہار کرتے تو بسا اوقات اپنی صداقت ثابت کرنے کے لئے بعض باتیں جو تورات میں آئی ہوتیں جو سرورِ کائنات ﷺ کی صداقت پر دلیل بنتیں، کوئی پیش گوئی ہوتی، وہ اہل ایمان کے سامنے ظاہر کر دیتے تھے، کہ ہاں بھئی! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، تورات میں یوں آیا ہوا ہے۔ اِس قسم کی باتیں کرتے تا کہ اہل ایمان کو یقین آ جائے کہ واقعی یہ مخلص مؤمن ہیں ...... ارے بھائی! آپ اپنے معاشرے میں بھی یوں دیکھتے ہو، میرا ایک شخص کے ساتھ اختلاف ہے اور لڑائی ہے، ایک تیسرا آدمی حقیقت کے اعتبار

سے ہے تو میرے مدمقابل فریق کا، لیکن وہ منافقت کے طور پر میرے ساتھ دوستی کو ظاہر کرتا ہے، اور مجھ سے کچھ مفاد حاصل کرنے کے لئے میری مجلس میں آکر بیٹھتا ہے، جس وقت وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے آئے گا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں اور اُن کے خلاف ہوں تو وہ لازماً ایسی باتیں کرے گا جن میں اُس دوسرے فریق کی شکایت کا پہلو ہوگا، اور جن میں اس قسم کی بات آئے گی کہ آپ حق پر ہیں اور وہ غلط ہے، فلاں بات جو آپ نے کی تھی وہ ٹھیک ہے، اور انہوں نے اس طرح سے کیا، اس طرح سے کیا، وہ باتیں اس لیے کرے گا تاکہ مجھے یقین آجائے کہ واقعی یہ شخص میرے حق میں مخلص ہے اور اُن کا مخالف ہے، جب تک دوسرے فریق کے متعلق اس قسم کی باتیں نہ کی جائیں تو یہ فریق مطمئن نہیں ہوگا کہ یہ اُن کا مخالف اور میرے موافق ہے۔ تو یہ تاثر دینے کے لئے انسان کو اس پارٹی کے موافق اور دوسرے کے خلاف باتیں کرنی پڑتی ہیں...... اسی طرح سے یہ یہود جو اپنے کسی مقصد کے تحت مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوتے اور ظاہر کرتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، تو بعض باتیں آکر ذکر کردیتے کہ تورات میں واقعی یوں آیا ہے، قرآن نے یہ بات ٹھیک کہی ہے، تورات میں واقعی یہ علامت موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سچے رسول ہیں، اسی لیے تو ہم نے اِن کو مان لیا ہے، اس قسم کی باتیں کرتے تاکہ اہل ایمان کو یقین آجائے۔ لیکن جب خلوت میں چلے جاتے تو دوسرے یہودی اِن کو ملامت کرتے تھے کہ تم وہاں جاکر وہ باتیں بیان کرنی شروع کردیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اُوپر کھولی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہیں وہ جھوٹا ثابت کردیں گے، کل کو کوئی بحث ہوگئی، مناظرہ ہوگیا، ان کے ساتھ کوئی جھگڑے کی نوبت آگئی، تو عنداللہ وہ تمہیں کاذب ثابت کردیں گے اِن باتوں کے ذریعے سے جو تم اُن کو بتاتے ہو۔ اور قیامت کے دن بھی اللہ کے سامنے الزام قائم کریں گے، کہ دیکھو! ان کو پتہ تھا کہ یہ سچے رسول ہیں اور یہ کتاب صحیح ہے، پھر بھی نہیں مانا، یوں اللہ کے سامنے قیامت کے دن بھی تمہیں رسوا کریں گے، اور دنیا کے اندر بھی اللہ کے نزدیک تمہیں جھوٹا ثابت کردیں گے، دنیا میں اللہ کے نزدیک جھوٹا ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری کتاب سے دلیل پیش کرکے کہیں گے کہ اللہ کے نزدیک بات اس طرح سے ہے، اور تم جو کہتے ہو وہ غلط ہے، عِنْدَ رَبِّكُمْ کا معنی دنیا کے اندر بھی پیش آسکتا ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ کے نزدیک جھوٹا ہے، کیا مطلب؟ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی دلیل اُس کو جھوٹا ثابت کررہی ہے، جب اللہ تعالیٰ کی کتاب کی دلیل اُس کو جھوٹا ثابت کرے گی تو عنداللہ وہ جھوٹا ہی ہوا۔ تو قیامت کے دن اللہ کے سامنے جاکر جھوٹے ثابت ہوجاؤ اور اِن کے سامنے مغلوب ہوجاؤ، ایسا بھی ہوجائے گا، اور دنیا میں کبھی بحث ومناظرہ پیش آگیا تو بھی تمہیں جھوٹا کردیں گے، تو تم یہ بےعقلی کیوں کرتے ہو؟ اور اپنے گھر کی باتیں جاکر دوسروں کو کیوں بتاتے ہو؟ دوسرے وقت میں وہ الزام دیں گے۔ اس طرح سے یہودی ملامت کرتے اُن دوسروں کو جو حضور ﷺ کی مجلس میں یا مسلمانوں کی مجلس میں جاکر بعض باتیں ظاہر کردیتے، تو یہ سارے کا سارا فریب اور یہ ساری کی ساری چالبازی اور کتمانِ حق ان لفظوں سے نمایاں ہے۔ ''تو اُن کا بعض بعض کو کہتا ہے کہ کیا بیان کرتے ہو تم اُن مسلمانوں کے سامنے وہ بات جو اللہ نے تم پر کھول دی؟'' یعنی جس کا ذکر تمہاری کتاب میں آیا ہوا ہے لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ: یہ لام لامِ عاقبت ہے، یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے انہی باتوں کے ذریعے سے اللہ کے سامنے، یعنی دنیا میں بھی تمہیں اللہ کے نزدیک وہ جھوٹا ثابت کرسکتے ہیں، اور اللہ کے سامنے قیامت کے دن بھی جھگڑے

میں تمہارے اوپر غالب آ جائیں گے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟ گھر کی باتیں دوسروں کو جا کے بتاتے ہو۔ اب یوں ایک کا دوسرے کو ملامت کرنا یہ سب اُن کی فریب کاری ہے، تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اِن کے اہل علم کے ایسے احوال ہیں، پھر تم اِن سے امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنی شہوات چھوڑ دیں گے اور اپنے مفاد کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر آ جائیں گے؟ یہ امید نہ رکھو، اس لیے اِن کے پیچھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ: یہ اُن کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ان باتوں کو ظاہر نہیں کرو گے اور چھپاؤ گے تو کیا اِن لوگوں کو پتہ نہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُن باتوں کو جو یہ چھپاتے ہیں اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں، تو جب چھپی ہوئی باتیں اللہ کے علم میں ہیں تو اللہ ظاہر کر دے گا، تمہارا یہ جھوٹ کب تک چھپا رہے گا۔

جہلائے یہود کا حال

یہ تو اہل علم کی بات تھی، اب اِن کے اَن پڑھوں کا حال بھی دیکھ لیجئے، وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ: اِن یہودیوں میں سے کچھ لوگ اَن پڑھ ہیں، لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ: وہ سوائے خواہشات کے کتاب کو جانتے ہی نہیں، اُن کے سامنے صرف اپنی خواہشات ہیں، اُن خواہشات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم تورات کے حامل ہیں، ہم انبیاء ﷩ کی اولاد میں سے ہیں، اِس لیے آخرت میں ہمیں اللہ تعالیٰ پوچھے گا ہی نہیں، ہم بخشے بخشائے ہیں، اور اگر جہنم میں چلے بھی گئے تو تھوڑے سے دنوں کے لئے جائیں گے، دوبارہ ہمارے بڑوں کی سفارش کے ساتھ پھر ہم نکل جائیں گے، بس اس قسم کی خواہشات اُنہوں نے اپنے دل میں پکا رکھی ہیں، اور اللہ کے باقی احکام کو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ''اِن میں سے بعض اَن پڑھ ہیں، نہیں جانتے کتاب کو سوائے خواہشات کے، اور نہیں ہیں وہ مگر خیال پکاتے''۔

علمائے یہود کے لئے دوہری خرابی کیوں؟

''پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ حکمِ شرعی لکھتے ہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ'' خود بنا کر جھوٹا فتویٰ لکھ لیتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، ''اللہ کی جانب سے ہے'' یعنی اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کے مطابق ہے، چاہے صراحتاً کتاب میں ہو، چاہے کتاب کی دلیل سے ثابت ہو، جیسے ہم سے کوئی آ کر ایک مسئلہ پوچھتا ہے، استفتاء کرتا ہے، ہم اُس کو حکمِ شرعی لکھ کر دیں گے، چاہے وہ حکم شرعی اجتہادی ہو، لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہوگا کہ شریعت کا حکم یہی ہے۔ تو یہ مسئلہ خود بنا لیتے ہیں جس کی دلیل شرعی موجود نہیں ہوتی، اور اُن کا مقصد ہوتا ہے دنیا کا مفاد حاصل کرنا، اپنی بنائی ہوئی بات کو کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے ہی ہے۔ ''پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ حاصل کر لیں اس کے ذریعے سے ثمنِ قلیل، پس خرابی ہے اُن کے لئے اُس بات کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی، اور خرابی ہے اُن کے لئے اس چیز کی وجہ سے جو انہوں نے کمائی'' یہ دوہری خرابی ہوگئی، غلط حکم لکھ کر شریعت کی طرف منسوب کرنا مستقل خرابی کا باعث ہے، اور پھر اُس سے دنیوی مفاد حاصل کرنا مستقل خرابی کا باعث ہے۔

’’لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً‘‘ کی دل نشین تشریح

اُن کی خواہشات میں سے ایک خواہش یہاں ذکر کی گئی ہے، کہتے ہیں کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ: ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی، اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً: مگر چند گنتی کے دن۔ اِن چند گنتی کے دنوں سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے یہاں اقوال مختلف ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اُن کی مراد یہ تھی کہ یہودی صرف چالیس دن تک جہنم میں جائیں گے جتنے دن تک اِس قوم نے بچھڑا پوجا تھا، یا بعض کہتے تھے کہ جتنے سال کسی یہودی کی زندگی دنیا میں گزری ہے اتنے سال تک زیادہ سے زیادہ جہنم میں جائے گا اس سے زیادہ نہیں جائے گا، یا اتنے دنوں تک ہی جائے گا جب تک کہ کوئی سفارش وغیرہ کا قصہ پیش نہیں آتا، یہ مختلف اقوال مفسرین نے اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کی تفسیر میں لکھے ہیں، لیکن سب سے اچھی توجیہ اِس بارے میں وہی ہے جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں اختیار فرمائی، اُس کا حاصل یہ ہے کہ یہودی یہ کہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ہمارا ایمان صحیح ہے اور ہم تورات کو ماننے والے ہیں، اس لیے ہم اہلِ ایمان میں سے ہیں، اور اہلِ ایمان کے بارے میں ہمیشہ سے یہ حکم شرعی اور عقیدہ شرعیہ چلا آیا ہے کہ اول تو یہ جہنم میں جائیں گے نہیں، اور اگر جائیں گے تو تھوڑی سی سزا بھگتنے کے بعد نکل آئیں گے۔ یہود کہتے تھے کہ ہم بھی مؤمن ہیں، اِس لیے اوّل تو ہم جہنم میں جائیں گے نہیں، اور اگر گئے بھی تو عارضی طور پر جائیں گے، اپنی غلطیوں کی کچھ سزا بھگتیں گے، بھگتنے کے بعد چھوٹ آئیں گے، بہرحال ہم دائمی جہنمی نہیں ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا عقیدہ بھی اپنے متعلق یہی ہے، کہ جب ہم اہلِ ایمان ہیں تو اوّل تو ہم جہنم میں جائیں گے نہیں، اور اگر گئے بھی تو اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتیں گے، بھگتنے کے بعد چھوٹ آئیں گے، آخرکار جنت میں چلے ہی جانا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ اسلام کا بھی عقیدہ اپنے متعلق یہی ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ تو پھر ہمارے اور یہود کے عقیدے میں کیا فرق ہوا؟ یہ عقیدہ فی حدذاتہ بالکل صحیح ہے کہ اہلِ ایمان اوّل تو جہنم میں جائیں گے نہیں، اللہ تعالیٰ ویسے ہی بخش دے گا، اور اگر نہیں بخشے گا تو اُن کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر ان کو عارضی طور پر جہنم میں ڈالا جائے گا، جب اُن کے گناہوں کی سزا پوری ہوجائے گی تو ان کو نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا، یہ عقیدہ حق ہے اور آج اہلِ اسلام کا اپنے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے۔ لیکن یہ بات خواہش کے درجے میں ہے یا واقعہ ہے؟ اس کا ثبوت دینے کے لئے ضروری ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ ’’جس دین کو ہم قبول کیے بیٹھے ہیں، یہی دین حق ہے، اور یہ دین منسوخ نہیں بلکہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے سے کافر نہیں ہوئے، یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے سے کافر نہیں ہوئے، اور انجیل یا قرآن کا انکار کرنے کی بناء پر کفر لازم نہیں آیا‘‘ جس وقت تک وہ یہ بات ثابت نہ کریں اُس وقت تک ان کا یہ عقیدہ غلط ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ اور اگر دلیل کے ساتھ یہ ثابت ہوجائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے سے یہ کافر ہوگئے تو یہ دائمی جہنمی ہیں۔ اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ قرآن کریم کا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے سے یہ کافر ہوگئے تو یہ دائمی جہنمی ہیں، اب ان کا کہنا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً یہ محض ایک غلط خیال ہے جو انہوں نے اپنے دماغ میں پکا رکھا ہے، اب یہ کافر ہیں، اور کافر کا دائماً جہنم میں جانا اُنہی کی کتابوں سے ثابت ہے،

مشرک اور کافر کی بخشش نہیں ہوگی۔ یہ اپنے آپ کو لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً کا مصداق تب بنا سکتے ہیں جب ثابت کریں کہ ''موسیٰ علیہ السلام خاتم النّبیین ہیں، اور تورات خاتم الکتب ہے، قیامت تک کے لئے دِینِ موسوی باقی ہے، اور تورات کی اتباع باقی ہے'' اگر یہود یہ ثابت کر دیں تو پھر وہ اہلِ ایمان ہوں گے، پھر یہ محض خواہش نفس نہیں ہے بلکہ یہ صحیح عقیدہ ہے۔ لیکن ہم اپنی دلیل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم النّبیین نہیں، بلکہ بعد میں عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول آئے، اور تورات خاتم الکتب نہیں بلکہ اُس کے بعد انجیل بھی آئی۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے قبل جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا وہ کافر ٹھہرے، جنہوں نے انجیل کا انکار کیا وہ کافر ٹھہرے، تو اب اُن کا یہ کہنا کہ ہم عارضی طور پر جائیں گے یہ غلط خیال ہے۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآنِ کریم کو نہ ماننا کُفر ٹھہرا، اب چاہے کوئی عیسائی ہو چاہے کوئی یہودی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد وہ کافر ہے، جب کافر ہے تو اب یہ عقیدہ اُس پر صادق نہیں آتا کہ عارضی طور پر جہنّم میں جائیں گے، کیونکہ کُفر کی سزا میں کافر کے لئے دائماً جہنّم میں جانا کُتبِ سابقہ سے بھی ثابت ہے۔

''لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ'' کا عقیدہ اہلِ اسلام کے لئے حقیقت، اور یہود کے لئے محض خواہش ہے

اور ہم جو کہتے ہیں لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً، ہماری یہ خواہش نہیں بلکہ واقعہ ہے، اُس کی وجہ کیا؟ کہ ہم دلیلِ صحیح کے ساتھ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیین ہیں اور قرآن خاتم الکتب ہے، جس وقت تک یہ دنیا آباد ہے اُس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے، جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآنِ کریم کو مانے گا وہ مؤمن ہے، اور مؤمن دائمی جہنّمی نہیں، اوّل تو اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے معاف کر دیں گے، لیکن اگر بداعمالیوں کی وجہ سے پکڑا بھی گیا تو عارضی طور پر جہنّم میں جائے گا، دائمی جہنّمی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا بھی عقیدہ اپنے متعلق یہی ہے، اور یہود بھی اپنے متعلق یہی کہتے تھے، لیکن ہمارے عقیدے کی صحت دلیل کے ساتھ ثابت ہے، اور یہودیوں کی یہ محض خواہش نفس ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ دلیل یہی ہو سکتی ہے کہ اپنے دِین کو باقی ثابت کریں، نجات کا مدار ثابت کریں، موسیٰ علیہ السلام کو اور تورات کو قیامت تک کے لئے ثابت کریں کہ ''موسیٰ علیہ السلام خاتم النّبیین ہیں، اور تورات قیامت تک کے لئے قابلِ عمل ہے'' جس وقت تک دلیل کے ساتھ اِس بات کو ثابت نہیں کیا جائے گا اُس وقت تک مؤمنِ عاصی والا عقیدہ اپنے اُوپر چسپاں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہی بات ہے جس کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے پوچھئے کہ تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ وہ عہد یہی ہے کہ کیا تمہاری کتاب میں دلیل موجود ہے کہ قیامت تک کے لئے تم اسی کے مکلّف ہو؟ تمہاری کتاب میں دلیل موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم الرسل اور خاتم النّبیین ہیں اور ان کا دین قیامت تک کے لئے ہے؟ اگر تو کتاب کے اندر یہ بات آچکی ہے تو اللہ کا تمہارے ساتھ عہد ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، کہ تم اگر اِسی عقیدے پر یہودی ہونے کی حالت میں مر گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دائمی جہنم میں نہیں بھیجے گا۔ بتاؤ! تمہارے پاس کون سی دلیل ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاتم النّبیین ہونا ثابت ہو؟ کون سی دلیل ہے کہ ''قیامت تک کے لئے یہ دین باقی ہے، یہ منسوخ نہیں، اس لیے ہمارا اللہ کے ساتھ عہد ہے، اللہ اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔'' یہود سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا

تمہارے پاس کوئی عہد ہے؟ تمہارے پاس کوئی اس قسم کی دلیل ہے جس سے تم یہ بات ثابت کر سکو؟ جب دلیل نہیں ہے تو پھر دوسری شق یہی ہے کہ تم اللہ پر ایسی باتیں بولتے ہو جس کی تمہارے پاس کوئی علمی دلیل نہیں۔ اور ہم یہی بات کہتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ پر کوئی بے علمی کے ساتھ بات نہیں کہتے، بلکہ اس بات کے لئے علمی دلیل موجود ہے۔ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تقریر اسی طرح سے کی ہے جس سے مسئلہ بالکل بے غبار ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا کوئی شک اور اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

مؤمن ہمیشہ جنّت میں اور کافر ہمیشہ جہنّم میں رہیں گے

بَلیٰ: آگے اللہ تعالیٰ نے یہی قانون بیان کیا کہ کیوں نہیں جاؤ گے تم جہنّم میں ہمیشہ کے لئے؟ اللہ تعالیٰ کا تو قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی بُرا کام کرے پھر وہ بُرائی اُس کا احاطہ کر لے، احاطے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے دل میں بُرائی ہی بُرائی آگئی، ایمان بھی باقی نہیں ہے، کیونکہ اگر قلب میں ایمان باقی ہو تو بُرائی نے احاطہ نہیں کیا۔ ''جو کوئی شخص بُرا کام کرے اور بُرائی اُس کا احاطہ کر لے تو'' اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: یہ لوگ جہنّم والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اور یہ ضابطہ تم پر صادق آتا ہے۔'' اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں یہ جنّت والے ہیں'' هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫
قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے لیا بنی اسرائیل سے پختہ عہد کہ نہیں عبادت کرو گے تم مگر اللہ کی،
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا
اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور رشتہ دار اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، اور کہو
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا
لوگوں کو اچھی بات، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، پھر تم نے پیٹھ پھیری سوائے
قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ
تم میں سے کچھ لوگوں کے، اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے ۝ اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، کہ نہیں بہاؤ گے تم
دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ
اپنے خون، اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے، پھر تم نے اقرار کیا

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ
اور تم گواہ ہو ﴿۸۴﴾ پھر تم ہی یہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے لوگوں کو اور نکالتے ہو تم
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ
اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ کے ساتھ اور ظلم کے ساتھ،
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ
اور اگر آ جائیں وہ لوگ تمہارے پاس قیدی ہو کر تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ بات یہ ہے کہ تم پر ان کا نکالنا
اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ
بھی حرام کیا گیا ہے، کیا پھر تم ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر اور کفر کرتے ہو بعض حصے کا؟ کیا بدلہ ہے
مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ
اس شخص کا جو تم میں سے یہ حرکت کرے مگر دنیوی زندگی میں رسوائی، اور قیامت کے دن لوٹائے جائیں گے وہ
اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
سخت عذاب کی طرف، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۸۵﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾
کو اختیار کر لیا آخرت کے مقابلے میں، پس ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ مدد دیے جائیں گے ﴿۸۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے لیا بنی اسرائیل سے پختہ عہد۔ میثاق کا لفظ پہلے بھی گزر چکا ہے، یہ وثوق سے ہے، پختہ عہد کو کہتے ہیں۔ اُس عہد کی تفصیل یہ ہے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ: لَا تَعْبُدُوْنَ صورۃً خبر ہے اور معنیً انشاء ہے، یعنی اس میں نہی والا معنی ہے، اگر ترجمہ یوں کر لیں کہ "نہیں عبادت کرو گے تم مگر اللہ کی" تو بھی بات ٹھیک ہے، اور "مت عبادت کرو تم مگر اللہ کی" اِس طرح سے بھی ٹھیک ہے۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اِحْسَانًا مصدر ہے، اور اِس کا عامل فعل محذوف ہے، اگر لَا تَعْبُدُوْنَ کی طرف دیکھتے ہوئے اِس کو بھی آپ صورۃً خبر بنانا چاہیں تو پھر تقدیرِ عبارت یوں ہو جائے گی وَتُحْسِنُوْنَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ اور اگر معنی کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو انشاء کی شکل میں لانا چاہیں، جیسے کہ

آگے قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا یہ صورۃً بھی انشاء آیا ہوا ہے، تو پھر یہاں امر کا صیغہ محذوف نکال لیجئے وَاَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اور تم والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اَحْسَنَ اِحْسَان: کسی کام کو اچھی طرح سے کرنا، احسان فی المعاملات یہی ہوا کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جائے، والدین کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرو، اُن کے ساتھ بھی اچھی طرح سے پیش آؤ، اچھا سلوک کرو۔ وَذِی الْقُرْبٰی: اِس کا عطف والدین پر ہے وَاَحْسِنُوا بِذِی الْقُرْبٰی: اور قرابت والوں کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو۔ قربیٰ اور قرابۃ دونوں مصدر ہیں قرابت کے معنیٰ میں۔ ذی القربیٰ: ذی قرابت، رشتہ دار، جن کے ساتھ تمہیں نسبی قرب حاصل ہے، درجہ بدرجہ، ماں باپ، ماں باپ کی شاخیں: بہن بھائی، اور پھر جانبِ اعلیٰ: دادا دادی، نانا نانی، پھر دادا دادی کی اولاد: چچے پھوپھیاں، اور نانا نانی کی اولاد: ماموں خالہ، اسی طرح سے نیچے کو بھتیجے بھانجے، پوتے نواسے، یہ سب ذی قرابت میں داخل ہیں، اور پھر اُن میں سے کوئی ذی محرم ہوتا ہے اور کوئی ذی محرم نہیں ہوتا، ذی محرم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ نکاح حرام ہو، اِس کی قرابت اشد ہوتی ہے، اور غیر ذی محرم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ نکاح حرام نہ ہو۔ جیسے بہن بھانجی بھتیجی پوتی پھوپھی خالہ یہ تو محرم ہیں، ذی قرابت بھی ہیں اور ذی محرم بھی ہیں، اِن کا تو بہت حق ہوتا ہے، اِن سے تو حجاب (پردہ) بھی نہیں۔ اور چچے کی بیٹی، پھوپھی کی بیٹی، خالہ کی بیٹی یہ ذی قرابت ہیں لیکن ذی محرم نہیں ہیں۔ اسی طرح چچے کی اولاد، پھوپھی کی اولاد، خالہ کی اولاد، ماموں کی اولاد، یہ ذی قرابت تو ہوتے ہیں لیکن ذی محرم نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے دوری ہوتی چلی جائے گی حقوق کم ہوتے چلے جائیں گے، جیسے جیسے قرب ہوتا چلا جائے گا حقوق بڑھتے چلے جائیں گے۔ تو بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کی مناسبت سے یہاں اَحْسِنُوْا والا معنیٰ بھی پیدا کیا جاسکتا ہے، اور قرآنِ کریم میں ایک جگہ ذِی الْقُرْبٰی کے اُوپر فعل ظاہر بھی کیا ہوا ہے وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (سورۂ بنی اسرائیل:۲۶) ذی القربیٰ کو حق دیا کرو، لیکن یہاں چونکہ ذِی الْقُرْبٰی پر جری حالت ہے، اس لیے والدین کے اُوپر ہی اِس کا عطف ہوگا، البتہ مفہوم وہ ادا کیا جاسکتا ہے کہ ذی القربیٰ کا حق بھی ادا کرو، لیکن ترکیب اسی طرح سے ہوگی کہ ''احسنوا بالوالدین، احسنوا بذی القربی'' اِس طرح سے اِس کو ادا کریں گے، والدین کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو، اور رشتے دار کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو۔ وَالْيَتٰمٰى: یتامیٰ یتیم کی جمع ہے، یتیم اس نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کا والد مرگیا ہو، بالغ ہوجانے کے بعد اس کو اصطلاح میں یتیم نہیں کہتے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے ''لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ''(1) کہ جس وقت بچہ محتلم ہوجائے تو اُس کے بعد پھر یُتم نہیں رہتا، بلوغ پر آکر یتیمی والا عنوان ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ اگر بلوغ پر ختم نہ کریں، اور بالغ ہوجانے کے بعد اور بڑے ہوجانے کے بعد بھی جس کا باپ فوت ہوجائے اُسے یتیم کہیں، تو پھر تو یا آپ خود یتیم ہوں گے یا آپ کا باپ یتیم ہوگا یا آپ کا دادا یتیم ہوگا، پھر تو کوئی بھی نہیں بچتا۔ جیسے میں خود یتیم ہوں، اور آپ میں سے بعض اگر یتیم نہیں ہیں تو اُن کا باپ یتیم ہوگا، تو آپ یتیم کی اولاد ٹھہرے، اگر باپ بھی یتیم نہیں تو دادا یتیم ہوگا، پھر تو ساری دنیا ہی یتیم بن جائے گی اگر اس کی کوئی حد نہ متعین کی جائے، تو اِس کی حد یہی ہے کہ نابالغی کے زمانے میں یہ عنوان ہوا کرتا ہے کہ یہ بچہ یتیم ہے، اور بالغ ہوجانے کے بعد یُتم والا مفہوم ختم ہوجاتا ہے۔ تو یتامیٰ یتیم کی جمع ہے، ''احسان کرو یتیموں کے ساتھ''، وَالْمَسٰكِيْنِ: مساکین مسکین کی جمع ہے، مسکین کہتے ہیں محتاج کو، یہ لفظ سکون سے لیا گیا ہے،

---

(1) سنن ابی داؤد، ج۲ ص۱۳باب ما جاء متی ینقطع الیتم / مشکوٰۃ ج۲ ص۲۸۴عن علیؓ، باب الخلع، فصل ثانی۔

اور سکون سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے حرکت سے عاجز ہے، اپنی حاجات پوری نہیں کرسکتا، اُس کی ضرورتیں پوری نہیں ہیں، مسکنت اور مسکین کا یہی مفہوم ہوتا ہے، اور محتاج اس کا حاصل ترجمہ ہے، ''اور مسکینوں کے ساتھ''۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا: اب لِلنَّاسِ میں النَّاس کو عام کردیا گیا، اور لوگوں کے لئے بولو اچھی بات، قُوْلُوْا: لوگوں کو کہو قَوْلًا ذَا حُسْنٍ (قرطبی) اچھی بات کہو یعنی عام لوگوں سے بھی جس وقت تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے اور گفتگو کی نوبت آئے تو تمہاری گفتگو کے اندر حسن ہونا چاہیے، اور اِحسان فی القول یہی ہے کہ دوسرے کے ساتھ نرم لب و لہجے کے ساتھ بات کی جائے، اُس کی عزت کا خیال کیا جائے، اُس کے مرتبے کا خیال کیا جائے، دل آزاری کی گفتگو نہ کی جائے، جس طرح سے کسی مسکین اور یتیم نے آکر آپ سے کوئی مطالبہ کرلیا اور آپ اُس کا مطالبہ پورا نہیں کرسکتے تو نرم لب و لہجے کے ساتھ جواب دے دیجئے، قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (سورۂ بقرۃ: ۲۶۳) اچھی بات کہہ دینا اور درگزر کرلینا اُس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے تکلیف پہنچائی جائے۔ تو یتیم و مسکین کے ساتھ بھی اچھا قول اختیار کرو، اور عام لوگوں کے ساتھ بھی اچھا قول اختیار کرو، کہ جب بھی گفتگو کرو نرم لب و لہجے کے ساتھ کرو، اُس میں کوئی دل آزار لفظ نہ ہو، استہزاء نہ ہو، ہتک آمیز اور بے عزتی پر مشتمل کوئی بات نہ ہو جس سے دوسرے کے دل کو تکلیف پہنچے، عام لوگوں کے متعلق بھی نصیحت یہی ہوئی۔ واعظوں کو، مبلغوں کو، ہر کسی کو اِس بات کی رعایت رکھنی چاہیے کہ اُن کی بات میں حُسن ہو، حسن یہی ہے کہ بات اس انداز سے کی جائے خوبصورتی کے ساتھ کہ جس میں بلاوجہ دوسرے کی دل آزاری نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف بھیجا تھا تو وہاں بھی کہا تھا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (سورۂ طٰہٰ: ۴۴) کہ تم دونوں پیغمبر جو جارہے ہو تو اُس کو جاکر نرم بات کرنا، نرم لب و لہجے میں بات کرنا۔ اس لیے ہمارے بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ مسلمان کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو فرعون جیسا نہیں ہے بلکہ فرعون اُس سے بدتر ہے، اور مبلغ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو موسیٰ علیہ السلام جیسا نہیں ہے، جب موسیٰ علیہ السلام کو بھی نصیحت کی جارہی ہے کہ فرعون کے ساتھ بھی نرم لب و لہجے سے بات کرنی ہے، تو دوسرے حضرات کو پھر کس طرح سے اپنے مخاطبین کی دل آزاری کرنے کی اجازت ہوسکتی ہے۔ تو تبلیغ کا یہ اصول ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں موعظۂ حسنہ کا لفظ بیان فرمایا (سورۂ نحل: ۱۲۵) موعظۂ حسنہ: اچھی نصیحت، نرم لب و لہجہ، کہ دلیل قوی ہو اور لب و لہجہ نرم ہو، دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ہوں، یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں جو تبلیغ کے اندر حُسن پیدا کرتی ہیں، ''لوگوں کے لئے اچھی بات بولو''، تو حُسْنًا صفت ہوجائے گی مفعول مطلق کی قَوْلًا ذَا حُسْنٍ کی تاویل کے ساتھ (قرطبی وغیرہ)۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم کرو، نماز کے قائم کرنے کا مفہوم کئی دفعہ آپ کے سامنے آگیا کہ اُس کے آداب، اُس کی شروط اور اُس کے حقوق کی رعایت رکھتے ہوئے وقت پر پابندی کے ساتھ ادا کرنا اقامت ہے۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: اور زکوۃ دو۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ: پھر تم نے پیٹھ پھیری، اِلَّا قَلِيْلًا: سوائے تم میں سے کچھ لوگوں کے، ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا کا اکٹھا ترجمہ یوں کریں گے کہ تم میں سے کچھ لوگوں کے علاوہ باقی پیٹھ پھیر گئے، کچھ لوگوں کے علاوہ تم سب پیٹھ پھیر گئے، وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اس کو جملہ اسمیہ کے طور پر ذکر کردیا اور جملہ اسمیہ کے اندر دوام والا معنی ہوتا ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اِس میثاق سے بھی تم نے پیٹھ پھیرلی، وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے، یعنی یہ تمہاری دائمی عادت ہے کہ بات کرتے ہو، بعد میں اعراض کرجاتے ہو، اپنی کسی بات پر پکے نہیں رہتے، اپنے کسی میثاق کا خیال کرتے ہی نہیں۔

وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ کے اندر اُن کی دائمی عادت کی طرف اشارہ کر دیا (نسفی)۔

سوال:- آپ نے کہا کہ نرم بات کرو، تو "من رای منکم منکرا" والی حدیث کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- وہاں روکنے کا ذکر آیا ہے یا جوتا مارنے کا ذکر بھی ہے؟

سوال:- زبان کے ساتھ روکنے کا ذکر ہے۔

جواب:- زبان کے ساتھ نرمی سے بھی تو روکا جا سکتا ہے۔

سوال:- ہاتھ کا ذکر بھی ہے۔

جواب:- ہاتھ کے ساتھ بھی یہی ہے کہ آپ کسی پر ظلم کر رہے ہیں تو آپ کا ہاتھ پکڑ لیا جائے۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہاتھ کے ساتھ روکنا حاکم کا کام ہے، ذی حکومت ہاتھ کے ساتھ روک سکتے ہیں، ورنہ اگر ہر شخص کو اجازت دے دی جائے کہ جہاں کوئی غلطی کر رہا ہو تم اُس پر ہاتھ اٹھالو، تو یہ ساری خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ کسی بدمعاش کو جا کر روکنے لگو تو وہ آگے سے چاقو نکال لے گا، پھر کیا کرو گے؟ تو یہ خانہ جنگی ہے۔ اور سینما والے گھنٹی بجاتے ہوئے، ڈھول کوٹتے ہوئے، تصویریں اٹھائے ہوئے اعلان کرتے پھر رہے ہوتے ہیں، آپ اِن کے اوپر ہاتھ اٹھائیں گے تو آگے سے وہ بھی ڈنڈا اٹھالیں گے، فساد ہو جائے گا، دس اُن کے حامی آ جائیں گے، بیس آپ کے حامی آ جائیں گے، گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس لیے تغییر بالید حکومت کا کام ہے۔ اور زبان سے منع کرنا اہل علم کا کام ہوتا ہے، اور عام آدمی کا کام ہے دل سے نفرت کرنا، یہ تین درجے اس طرح سے نکلتے ہیں۔ عام آدمی جو کہ بات کو سمجھا نہیں سکتا، کسی چیز کی قباحت اُس کے سامنے دلیل کے ساتھ واضح نہیں ہے، دوسرے کے سامنے دلیل قائم نہیں کر سکتا، دوسرے کے دعوے کو توڑ نہیں سکتا، وہ قولاً کسی کو کیسے منع کرے گا۔ اس لیے قولاً منع کرنا صاحب علم کا کام ہے، جو برائی سے نفرت بٹھائیں اور اس کے خلاف دلائل قائم کریں، لوگوں کے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کریں۔ اور عامی آدمی جو بات کرنے پر بھی قادر نہیں ہے، کسی بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ یہ بری ہے اور کس درجے کی بری ہے، اور اس درجے میں ممانعت کس لب و لہجے کے ساتھ کرنی چاہیے، جو شخص یہ نہیں جانتا اس کو قولاً بھی ممانعت کی اجازت نہیں ہے، وہ اپنے دل کے اندر برائی سے کراہت کرے۔

وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ کے اندر یہی اُن کی دائمی عادت بیان کر دی، "تم ہو ہی اعراض کرنے والے" یعنی تمہاری عادت اسی طرح سے ہے۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ: اور یاد کیجئے! جس وقت ہم نے تم سے پختہ عہد لیا، لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ: یہ اُس میثاق کا بیان ہے، سفکِ دم: خون بہانا، یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ کا لفظ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں آپ کے سامنے آ چکا، سفاک کہتے ہیں خونریز کو جو بہت خون بہاتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ بڑا ظالم آدمی ہے، بڑا سفاک ہے، کتابوں کے اندر یہ لفظ کہیں پڑھو گے تو اُس کا معنی یہی ہوتا ہے خونریز۔ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ: نہیں بہاؤ گے تم اپنے خون، یعنی اپنی برادری، اپنی قوم، اور اپنے قبیلے والوں کو قتل نہیں کرو گے، آپس میں ایک دوسرے کی جان نہیں لو گے، خونریزی نہیں کرو گے۔ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ: اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو مِّنۡ دِیَارِکُمۡ: اپنے گھروں سے ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ: پھر تم نے اقرار کیا، وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ: اور تم گواہ ہو، اِس وقت بھی تم اس بات پر شہادت دیتے ہو کہ واقعی ہم نے اقرار کیا، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا اور وہ اقرار کوئی ایسا نہیں تھا کہ دوسرا آدمی سمجھ جائے جو آپ کی گفتگو

سے ضمناً سمجھ میں آرہا ہے کہ آپ نے اقرار کرلیا۔ بلکہ تمہارا اقرار ایسا تھا گویا کہ تم اس بات کے اُو پر گواہی دے رہے ہو، شہادت کی طرح واضح اقرار تھا، دونوں مفہوموں میں فرق سمجھ گئے؟، ایک تو یہ ہے کہ اِس وقت موجود تم لوگ شہادت دیتے ہو اِس بات پر کہ تم نے اقرار کیا تھا، اور ایک یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا اور ایسے حال میں اقرار کیا کہ تم شہادت دیتے ہو، یعنی شہادت کی طرح واضح اقرار تھا، یہ نہیں کہ تمہاری گفتگو سے ضمناً سمجھ میں آ گیا ہو کہ تم نے اقرار کرلیا، بلکہ بالکل واضح اقرار تھا جس طرح سے شہادت واضح ہوتی ہے (آلوسی وغیرہ)۔ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ: پھر تم ہی یہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے لوگوں کو وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ: اور نکالتے ہو تم اپنے میں سے ایک گروہ کو مِّنْ دِيَارِهِمْ: ان کے گھروں میں سے، تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ: ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو اُن کے خلاف گناہ کے ساتھ اور ظلم کے ساتھ۔ عدوان: تعدی۔ اور اِثم: گناہ۔ گناہ اور ظلم کے ساتھ، یعنی گناہ اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے تم اُن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى: اُسْرٰی اسیر کی جمع ہے، اَسْرٰی اُسَارٰی دونوں طرح سے اسیر کی جمع آتی ہے، اور اگر آجائیں وہ لوگ تمہارے پاس قیدی ہو کر، تُفٰدُوْهُمْ: تو تم اُن کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ: هُوَ ضمیر شان ہے، حالانکہ بات یہ ہے کہ تم پر اُن کا نکالنا بھی حرام کیا گیا ہے، اِخْرَاجُهُمْ یہ مُحَرَّمٌ کا نائب فاعل ہے، حالانکہ حرام کیا گیا ہے تم پر اُن کا نکالنا، اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ: فاء کا اگر معطوف علیہ نکالنا ہو تو اَتَفْعَلُوْنَ هٰذَا فَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ: کیا تم ایسی حرکتیں کرتے ہو پھر ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر اور کفر کرتے ہو بعض حصے کا؟ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ: کیا بدلہ ہے اُس شخص کا جو تم میں سے یہ حرکت کرے، اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: مگر دنیوی زندگی میں رسوائی، اور قیامت کے دن لوٹائے جائیں گے وہ سخت عذاب کی طرف۔ خِزْيٌ رسوائی کو کہتے ہیں، یعنی دنیوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کے علاوہ ایسے شخص کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟، یعنی اُس کی یہی مناسب سزا ہے کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل ہو اور آخرت میں بھی اُس کو سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے،'' اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو''، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ: یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کو اختیار کرلیا آخرت کے مقابلے میں، فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ: اِن سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ: نہ یہ مدد دیے جائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

یہود سے لیا گیا پہلا میثاق اور ان کی عہد شکنی

سلسلۂ واقعات وہی ہے جو اسرائیلیوں کے متعلق چلا آرہا ہے، پہلی آیات کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود یہودیوں کو یاددہانی کرواتے ہیں، کہ تم سے اِن باتوں کا پختہ عہد لیا گیا تھا، اور آج ماننے کے باوجود کہ تورات میں یہ احکام دیے گئے ہیں، تورات پر عمل کرنے کا تم نے وعدہ کیا، اِن احکام کو قبول کیا، اِن پر ایمان لائے، اس کے باوجود آج اِن کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ تو تمہارا تقدس کیا ہوا؟ کتاب کے متعلق ایمان کا دعویٰ ہے اور اتنے واضح واضح

احکام اللہ نے تمہیں دیے تھے جن کا تم نے اقرار کیا، اُن کو مانا، اُن پر عمل کرنے کا وعدہ کیا، لیکن پھر اُن کو توڑتے ہو۔ جس میں پہلی بات ذکر کی گئی کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا۔

والدین کے حقوق کی اہمیت اور اس کی حد بندی

اور دوسری بات ذکر کی گئی کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا قرآنِ کریم کی کئی آیات میں ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد مخلوق میں سب سے بڑا حق انسان پر والدین کا ہے، لیکن والدین کا جب ذکر کیا تو لفظ احسان کے ساتھ ذکر کیا، کہ اِن کے ساتھ برتاؤ اچھا کرو، اِن کو عبادت والے فعل کے ضمن میں ذکر نہیں کیا کہ والدین کی بھی عبادت کرو، بلکہ والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا ذکر کیا ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص جس کا آپ پر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا احسان ہے اور سب سے زیادہ اُس کے حقوق آپ کے ذمے ہیں جب اُس کی عبادت نہیں جا سکتی تو ''تا بہ دیگراں چہ رسد؟'' دوسروں کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی پیشانی اُن کے سامنے جھک جائے، جب یہ رَبِّ مجازی جو دنیا کے اندر تمہارے پیدا ہونے میں واسطہ بنے، تمہاری تربیت اور پرورش کے اندر واسطہ بنے، جب اِن کو سجدہ کرنا جائز نہیں اور اِن کے سامنے جھکا نہیں جا سکتا تو کسی دوسرے کے سامنے جھکنے کا کیا معنی؟ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ حقوق انسان کے ذمے والدین کے ہیں، لیکن توحید ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں والدین کو شریک تو کیا کرنا ہے، اِس سلسلے میں والدین اگر توحید کے عقیدے کے خلاف بات کریں تو ان کی بات ماننی بھی جائز نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں والدین کے حقوق ذکر کرنے کے بعد سورۂ لقمان میں یہ بات ذکر کی گئی ہے وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَـيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ: اگر تیرے ماں باپ تجھے مجبور کریں اس بات پر کہ میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا جس کے شریک ہونے کا تجھے کوئی علم نہیں، فَلَا تُطِعۡهُمَا: تو پھر اِن کی اطاعت نہیں کرنی اور اِن کا کہنا نہیں ماننا، لیکن وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا: دنیا کے اندر اِن کے ساتھ اچھی طرح سے رہنا ہے۔ اِن کا کہنا نہیں ماننا، کہنا کس کا ماننا ہے وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ (سورۂ لقمان: ۱۵) کہنا اُسی شخص کا مانو جس کا رجوع میری طرف ہے، اتباع اُس کی کرنی ہے۔ تو والدین کے ساتھ اچھے معاملے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی عزت کرو، احترام کرو، اُن کی خدمت کرو، اُن کو راحت پہنچاؤ، اور جس قسم کے احکام وہ دیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ اُن کا ٹکراؤ نہ ہو اُن احکام کی تعمیل کرو، یہ سب والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ہے، اُن کے دل کو خوش رکھو، بدنی خدمت، مالی خدمت، اُن کا اعزاز اکرام، جس سے اُن کا دل دماغ خوش رہے اور آپ پر مطمئن رہیں ایسا معاملہ والدین کے ساتھ کرو۔ لیکن ساتھ حد بندی ہے، کہ جہاں اُن کا حکم عبادت کے مفہوم میں آجائے وہ نہیں ماننا، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ اُن کی کوئی بات ٹکرا جائے وہاں اللہ کا حق مقدم ہے، کیونکہ اللہ اُن پر بھی حاکم ہے اور ہم پر بھی حاکم ہے۔ جس طرح سے ماں اور باپ کا حکم اگر ٹکرا جائے تو باپ کا حکم مانا جائے گا، کیونکہ باپ کا حکم ماں پر بھی چلتا ہے اور ہم پر بھی چلتا ہے، اس لیے اگر دونوں کے حکم میں تعارض آجائے تو باپ کی مانی جائے گی، کیونکہ ہماری ماں بھی ہمارے باپ کی محکوم ہے۔ تو اسی طرح سے یہاں بھی ہے کہ جہاں خالق اور مخلوق کی بات ٹکرا جائے

گی تو خالق کی مانیں گے، کیونکہ دوسرا حکم دینے والا بھی مخلوق ہے، وہ بھی اُس خالق کے حکم کا پابند ہے اور ہم بھی اُس کے حکم کے پابند ہیں، پھر مخلوق کے حکم کو خالق کے حکم کے مقابلے میں کس طرح سے لے آئیں؟۔ جو مخلوق اللہ کے حکم کے خلاف حکم جاری کرتا ہے وہ تو اللہ کا باغی ہے، تو ہم اُس باغی کے ساتھ کس طرح سے ہو جائیں؟ ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''(۱) ایک واضح ہدایت دے دی گئی، کہ جہاں خالق کی نافرمانی لازم آئے وہاں مخلوق کا کہنا نہیں مانا جاتا۔ تو والدین کے ذکر کے ساتھ لفظ احسان لایا گیا، کہ اِن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم ہے لیکن اِن کی عبادت نہیں کرنی۔ جس کے انسان پر اللہ کے بعد سب سے زیادہ حقوق ہیں، جو اِس دنیا کے اندر ہمارے لیے پیدا ہونے کا واسطہ بنے، پیدا کرنے والا اگرچہ اللہ ہے لیکن واسطہ تو والدین بنے ہیں، اور رَبّ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہیں، پرورش کرنے والے، رزق دینے والے، تربیت دینے والے اللہ ہیں، لیکن ظاہری طور پر واسطہ والدین ہیں، تو جن کے اتنے حقوق ہیں جب اُن کی عبادت نہیں کی جاسکتی تو کسی دوسرے کو اللہ کی عبادت میں کس طرح سے شریک کیا جائے۔

رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

ذِی الْقُرْبٰی: رشتے داروں کے حقوق ادا کرو، اور اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اور یتیموں کے ساتھ، چاہے وہ یتیم رشتے داروں میں سے ہو، چاہے وہ رشتے داروں میں سے نہ ہو۔ اور اسی طرح سے مسکینوں کے ساتھ، چاہے وہ مسکین رشتے داروں میں سے ہو، چاہے رشتے داروں میں سے نہ ہو، ان سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اچھا برتاؤ یہی ہے کہ ان کی ضروریات کا خیال رکھو، اِن کی سرپرستی کرو، اِن کو نفع کی بات بتاؤ، نقصان سے بچانے کی کوشش کرو، بھوکے ہیں تو کھانا دو، ننگے ہیں تو کپڑا پہناؤ، جیسی ان کی ضروریات ہوں اُن کا خیال رکھو۔

دوستی اور دشمنی کے حلقے میں مؤثر کردار زبان کا ہوتا ہے

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا: عام لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، بات جب بھی کرو اچھے انداز سے کرو، تمہاری زبان اچھی ہونی چاہیے۔ اور یہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر یہی قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اچھی طرح سے اختیار کرلیا جائے تو انسان کی دوستیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، اور اِسی زبان کو اگر غلط استعمال کیا جائے تو دوستوں کے مقابلے میں دشمنوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے اندر راحت دوستوں کے ذریعے سے ہوتی ہے اور پریشانیاں دشمنوں کے ہاتھوں آیا کرتی ہیں، اور اِس دوستی اور دشمنی کے حلقے میں سب سے زیادہ مؤثر کردار زبان کا ہے، کہ کسی سے میٹھا بول بولو گے تو اس کا دل آپ کی طرف کھنچے گا، اور جو آپ کی باتوں سے متاثر ہوگا وہ آپ کو کم از کم نقصان نہیں پہنچائے گا، جس طرح سے کہتے ہیں میٹھے بول میں جادو ہے، کہ انسان میٹھی باتیں کر کے دوسرے کو متاثر کرلیتا ہے۔ اور اگر ہر کسی کے ساتھ تندی، ترشی اور دل آزاری سے پیش آؤ گے تو لفظ تو آپ زبان سے دو چار نکالیں گے لیکن دوسرے کے جذبات آپ کے خلاف ہو جائیں گے، وہ کہیں بھی آپ کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ عزت واحترام اور دلجوئی جتنی زبان کے ذریعے سے انسان کرسکتا ہے، جس میں خرچ کچھ نہیں آتا، زور کچھ نہیں لگتا،

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/۳۲۱ عن النواس ﷺ، کتاب الامارۃ، فصل ثانی۔ نیز مسلم ۲/۱۲۵ پر الفاظ ہیں: لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بنا ہی ایسی دی کہ نہ اِس میں تیل ڈالنا پڑے نہ کچھ اور کرنا پڑے، نہ یہ گھستی ہے نہ گھٹتی ہے۔ اس کو اگر اچھی طرح سے استعمال کرنا آ جائے تو انسان بہت سارے نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ تو قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا یہ معاشرت کا ایک بہت بڑا اچھا اصول ہے، کہ جب کسی کے ساتھ بات کرو اچھے انداز سے کرو۔

یہود کا اَحبار ورُہبان کو رَبّ بنانے کا معنی کیا ہے؟

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ: یہ واضح میثاق ہم نے تم سے لیا تھا لیکن تم پھر پیٹھ پھیر گئے، اور ہر چیز کو ختم کر دیا، نہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ محفوظ رکھا، نہ انسانوں کے حقوق پہچانے، اور نہ وعظ وتبلیغ اور دوسرے معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، یتیموں مسکینوں کا مال کھانے لگ گئے، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم نے کہا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴)، اور خود اللہ کے شریک بن کے بیٹھ گئے کہ اپنے آپ کو ایسا مطاع بنالیا اور ایسے احکام جاری کرنے شروع کر دیے کہ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام پیچھے رہ گئے اور تم پیروں فقیروں کے احکام آگے آ گئے، جیسے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اِن احبار ورُھبان کا نقشہ کھینچا ہے اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۱) کہ ان یہودیوں نے اَحبار ورُہبان کو اللہ کے علاوہ رَبّ بنالیا، اور یہ اَحبار ورُہبان رَبّ بن کے بیٹھ گئے، رَبّ بننے کا وہاں وہی مطلب ہے کہ اللہ کے احکام نہیں بتاتے بلکہ اللہ کے احکام کے خلاف اپنی ہدایات جاری کرتے ہیں، اور لوگ ان کے اتنے عقیدت مند ہو گئے کہ اگر یہ اللہ کے احکام کے خلاف بھی احکام جاری کر دیتے ہیں تو لوگ اِن کی مانتے ہیں، اللہ کی نہیں مانتے، اَحبار ورُہبان کو رَبّ بنانے کا یہی معنی ہے۔

مخالفین پر تردید کے وقت بھی قرآنِ کریم نے انصاف سے کام لیا ہے

کچھ بچ گئے جن کا تورات پر صحیح ایمان تھا، اُس کو اِلَّا قَلِيْلًا کے ساتھ مستثنیٰ کر لیا، یہ قرآنِ کریم کا انصاف ہے کہ عین ایسے موقع پر جب اپنے فریقِ مخالف کے اُوپر تنقید کر رہا ہے، تو بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، جو اُن میں سے اچھے ہیں اُن کو اچھا کہتا ہے اور جو اُن میں سے بُرے ہیں ان کو بُرا کہتا ہے، یہ نہیں کہ جہاں کسی جماعت کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تو جب اُس پر تنقید شروع ہو تو ایک ہی طرف سے رگڑا لگا دیا، اچھے بُرے سب ہی ایک ڈنڈے سے ہانک دیے، صرف ایک جماعتی عنوان کے ساتھ کہ چونکہ اُس جماعت سے ہمارا اختلاف ہے تو جتنے افراد اُس جماعت میں شامل ہیں وہ سارے ہی ہمارے معتوب اور سارے ہی ہمارے مغضوب ہو گئے، یہ بالکل غلط بات ہے۔ ایک فریق ہونے کی حیثیت سے اگر کوئی آپ کا مدمقابل ہے تو اُس میں بعض منصف مزاج اور اعتدال پسند بھی ہوتے ہیں، چاہے اُن کی نسبت اُس جماعت کی طرف ہو، اس لیے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا جایا کرتا، بلکہ اچھوں کو اچھا کہو اور بُروں کو بُرا کہو۔ تو جہاں قرآنِ کریم یہودیوں پر، نصرانیوں پر، اپنے مخالفین پر تبصرہ کرتا ہے، تو اُن میں سے جو اچھے ہیں ان کو اچھا کہتا ہے۔ اسی لیے یہاں فرمایا کہ ساروں نے اس میثاق کو نہیں توڑا، تھوڑے سے بچ گئے جو تورات پر صحیح عمل کرنے والے تھے اور اکثر پیٹھ پھیر گئے۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ: تمہاری تو عادت ہی اعراض کرنا ہے، ایک بار کی بات نہیں، بلکہ

ہر دفعہ بات کر کے پھر جاتے ہو۔ جس وقت تمہیں کوئی نصیحت دی جاتی ہے تو دوسرے وقت میں منہ موڑ جاتے ہو۔ تو وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ میں اُن کی دائمی عادت ذکر کر دی۔

کوئی جماعت بھی اپنے عنوان کے لحاظ سے بُری نہیں

سوال:۔ بری جماعت میں اچھے کس طرح سے؟

جواب:۔ کوئی جماعت بھی اپنے عنوان کے اعتبار سے بُری نہیں ہوتی، بلکہ اُس کا اچھا بُرا ہونا اُس کے نظریات اور اس کے کردار پر ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے جماعتوں کے مختلف عنوان ہیں، ایک پیپلز پارٹی ہے، ایک جمعیت علماء اسلام ہے، ایک جمعیت علماء پاکستان ہے، اِن عنوانوں میں کیا رکھا ہے، ایک سوشلسٹ دہریہ آ کر جمعیت علماء اسلام کا فارم پُر کر دیتا ہے تو کیا جمعیت علماء اسلام کا ٹھپہ لگ جانے کی وجہ سے وہ بہت محترم اور مکرم ہو گیا؟ کہ جب آئے ہم اُس کو منبر پر چڑھالیں اور مصلے پر کھڑا کر دیں، جبکہ ہمیں پتہ ہے کہ وہ سوشلسٹ دہریہ ہے۔ الیکشن کے دنوں میں کتنے مطلب پرست قسم کے لوگ آ کر فارم پُر کر دیتے ہیں۔ اور ایک آدمی اپنی کسی رشتہ داری کی مجبوری سے یا اپنی کسی علاقائی مجبوری سے یا اپنی کسی اور مصلحت کے تحت پیپلز پارٹی کا فارم پر کر دیتا ہے، جس طرح سے کسی غرض کے تحت غلط قسم کے آدمی جمعیت علمائے اسلام میں آ سکتے ہیں تو اپنے کسی مطلب کے تحت اچھے آدمی پیپلز پارٹی میں بھی تو جا سکتے ہیں، کوئی رشتے داری کی مجبوری ہے، کوئی علاقائی مسئلہ ہے کہ چونکہ وہاں تسلط ہے ہی اُن کا، اس لیے ان کے ساتھ ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں سوائے اِس کے کہ ہم اپنا دنیا کا نقصان کریں۔ کیونکہ سیاسیات تو ساری دنیوی نظم کے متعلق چلتی ہیں۔ اسی طرح ایک اچھے عقیدے کا آدمی جمعیت علماء اسلام میں نہیں ہے مجلس احرار میں ہے، اور احرار مثال کے طور پر الیکشن میں جمعیت علماء اسلام کے مقابلے میں آ جاتی ہے تو آپ کی دیوبندیوں کی جماعت ہے، اہل علم کی جماعت ہے، تو کیا صرف اس طرح کی مخالفت ہو جانے کے بعد جتنے آدمی ہیں اُن سب کو بُرا کہنا شروع کر دیں گے؟ اختلاف کے بھی حدود ہوتے ہیں، اُن حدود کی رعایت رکھنی چاہیے، جہاں تک مقابلہ ہو وہاں تک مقابلہ کیجئے، اور جہاں مقابلہ نہیں ہے تو اُن کی اچھائی کی تعریف کیجئے۔ یہی تو بے اعتدالی ہے جس کی وجہ سے سارے کا سارا معاملہ خراب ہوتا ہے، جب حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی (م ۴؍فروری ۱۹۸۱ء) جمعیت علماء اسلام میں تھے تو ہم اُن کی ذات کے توسل کے ساتھ دعائیں کیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ وقت کا ابوذر غفاری ہے، دلق پوش ہے، اپنے پرانے ''ترجمان الاسلام'' اٹھا کر دیکھو، اور اپنے حضرات کے رسائل دیکھو جو اُن کے بارے میں ہوتے تھے۔ لیکن جس وقت ذرا سیاسی اختلاف ہوا تو پھر آپ حضرات نے اُن کے ساتھ جو کچھ کیا اور جو کچھ اُن کے متعلق نظریے تھے وہ بھی آپ کے سامنے ہی ہے، یہ بے اعتدالی ہے۔ سیاسی اختلاف کو سیاسی سطح پر رکھنا چاہیے، جہاں تک کسی کی شخصیت کے ذاتی کمال ہیں اُن کا اعتراف کرنا چاہیے۔ باقی یہ تو سیاسی دنیوی انتظامات ہوتے ہیں، کبھی آپ کا رجحان کسی جماعت کے ساتھ ہوتا ہے، اور دوسرے وقت میں وقتی مصلحت اور ملکی مصلحت ایسی ہوتی ہے کہ دوسری جماعت سے جوڑ ہو جاتا ہے، دنیوی جماعتوں کے اندر ذاتی صفت کسی میں نہیں ہوتی۔

سوال:۔قرائن تو ہوتے ہیں۔ جواب:۔قرائن بھی بدلتے رہتے ہیں۔

ایک بات کا میں گواہ ہوں حضرت مفتی محمود صاحب ﷫ لیہ کے سفر پر گئے، میں بھی ساتھ تھا، سن ۷۰ء کی بات ہے، لیہ میں جورات کو تقریر کی، وہ پوری کی پوری تقریر بھٹو کی حمایت میں اور مودودی کے خلاف تھی، اور اس اسٹیج کے اوپر مفتی صاحب کے یہ لفظ تھے کہ بھٹو سے دین کو خطرہ نہیں ہے اور مودودی سے خطرہ ہے، اس مضمون کو مفتی صاحب نے دلائل کے ساتھ واضح کیا۔ تو اُس وقت ہماری مصلحت یہ تھی، اور ہماری پوری کی پوری قوت بھٹو کے حق میں استعمال ہوئی، لیکن بعد میں قرائن بدل گئے، مصلحتیں بدل گئیں، بھٹو ہمارا مدمقابل آگیا، مودودی سے ہمارا سیاسی اتحاد ہوگیا۔ خود ہمارا حال یہی تھا، ہم ہر محاذ پر جماعت اسلامی کو چیلنج کرتے تھے اور بھٹو کا دفاع کرتے تھے، لیکن دوسرا وقت ہم پر بھی ایسا آیا کہ ہم نے بھٹو کی مخالفت کی اور مودودی کا دفاع کیا۔ اب جس میں ذاتی قباحت ہوا کرتی ہے وہ بھی کسی دوسرے وقت میں اچھا بنتا ہے؟ مثلاً پاخانہ ذاتی طور پر ناپاک ہے، کوئی وقت اس پر آسکتا ہے کہ آپ اس کو پاک کہنے کے لئے مجبور ہو جائیں؟ اور کپڑا عارضی طور پر ناپاک ہے، دھولیں گے تو پاک ہو جائے گا، پھر پلیدی لگ جائے گی پھر ناپاک ہو جائے گا، کبھی ہم اس کو اتاریں گے اور کبھی پہنیں گے، کیونکہ اِس میں نجاست ذاتی نہیں ہے۔ اور جس چیز کے اندر ذاتی نجاست ہے اُس کو ہزار دفعہ دھولو پاک ہوتا ہے؟ یعنی کوئی مسالہ آپ کے پاس ہے کہ پاخانہ دھونے سے پاک ہو جائے؟ اس لیے سیاسی نظریات میں ذاتی قباحت کوئی نہیں ہوتی، یہ مصلحت کے تحت ہوتے ہیں، ایک وقت میں آپ کو روس اچھا معلوم ہوتا ہے تو آپ روس کی حمایت میں بولتے پھرتے ہیں، اور ایک وقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس کے مقابلے میں امریکہ کی سیاست اچھی ہے تو آپ امریکہ کی حمایت کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ تو پھر اختلاف کو اختلاف کے درجے پر رکھا جائے تو ٹھیک ہے۔ ان سیاسی نظریات کی بناء پر کسی کا ذاتی طور پر دشمن بن جانا بے اعتدالی ہے، اس میں نقصان ہوتا ہے کہ پھر نہ کسی کی شرافت کی قدر رہے، نہ دیانت کی قدر رہے، نہ بزرگی کی قدر رہے، پھر اس طرح سے ہو جاتا ہے گویا کہ وہ مرتد عن الاسلام ہی ہو گیا، تو اسلام اور موجودہ ملکی سیاست مترادف لفظ نہیں ہیں، کہ جو شخص آپ کے ساتھ سیاست میں متحد نہیں وہ مسلمان ہی نہیں، اور جو آپ کے ساتھ سیاسی متحد ہونے کے بعد آپ سے کچھ مختلف ہو گیا تو مرتد ہی ہو گیا، یہ بات غلط ہے۔ اختلاف کو اختلاف کی حد تک رکھتے ہوئے اُس کے شخصی اوصاف کی رعایت رکھنی چاہیے۔

اب یہودیوں سے جو ٹکراؤ تھا وہ کس سے مخفی ہے؟ سارا قرآنِ کریم اُن کے مقابلے میں ہے، لیکن اس مخالف جماعت کا ذکر کرتے ہوئے بھی جو اُن میں اچھے آدمی ہیں اُن کو ہمیشہ نکال لیا جاتا ہے اور اُن کی تعریف کی جاتی ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ایک جگہ یہ بھی آیا ہے کہ لَيْسُوْا سَوَآءً (آل عمران:۱۱۳) یہ سارے برابر نہیں ہیں، اور آگے اُن کی تعریف ذکر کی گئی ہے۔

یہود سے لیا گیا دُوسرا میثاق

آگے (وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ میں) جو دوسرے میثاق کا ذکر کیا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ یہود سے اللہ تعالیٰ نے یہ میثاق لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کی جان کی رعایت رکھنی ہے، ایک دوسرے کو قتل نہیں کرنا، یہودی یہودی کو

قتل نہ کرے، اور ایک یہودی دوسرے کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے کہ دوسرا یہودی تنگ آکر اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے، تمہارے پڑوس سے تنگ آکر علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے، ایک دوسرے کو گھروں سے نہیں نکالنا، دو باتیں یہ ہو گئیں، اور تیسری یہ کہ اگر کبھی کوئی یہودی دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائے تو ساری قوم اس بات کی مکلف ہے کہ فدیہ دے کر اُسے چھڑائیں اور آزاد کروائیں، گویا کہ جماعتی نظم کے تحت یہ تین عہد اُن سے لیے گئے تھے، ایک تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہیں کرنا، دوسرے آپس میں ایک دوسرے کو تنگ کر کے علاقے سے نہیں نکالنا، اور تیسری بات یہ تھی کہ اگر کوئی یہودی کسی غیر کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائے تو قومی طور پر تم مکلف ہو اس بات کے کہ اُس کو فدیہ دے کر چھڑانا ہے، یہ تین عہد لیے گئے تھے، اور دیکھو! اس میں سارا قومی فائدہ ہے، قومی مفاد ہے، جماعت کی تنظیم ہے۔

یہودِ مدینہ کا دوستی اور عہد معاہدے میں کردار

مدینہ منورہ کے اردگرد یہود کے قبائل تھے، ایک بنونضیر اور ایک بنوقریظہ، اور مدینہ منورہ کی بستی میں دو قبیلے مشرکوں کے تھے ایک اوس اور ایک خزرج۔ اوس اور خزرج میں قبائلی جنگ رہتی تھی، بنوقریظہ اور بنونضیر کا اِن کے ساتھ معاہدہ تھا، بنونضیر کا معاہدہ خزرج کے ساتھ تھا، اور بنوقریظہ کا معاہدہ اوس کے ساتھ تھا، جس طرح سے سیاسی معاہدے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اب جس وقت اوس اور خزرج آپس میں لڑتے تو یہ اپنے حلیفوں کو بلاتے، تو خزرج کے ساتھ بنونضیر لڑائی میں شریک ہو جاتے اور اوس کے ساتھ بنوقریظہ شریک ہو جاتے، جب آپس میں لڑائی ہوتی اور لڑائی میں جہاں اوس اور خزرج آپس میں قتل ہوتے تو بنوقریظہ اور بنونضیر بھی بالواسطہ لڑائی میں شریک ہوتے اور یہ بھی ایک دوسرے کو قتل کرتے اور یوں خونریزی ہوتی۔ اور جس وقت ایک فریق دوسرے پر غالب آجاتا تو دوسروں کے گھر بھی برباد کرتا اور وہ اپنے علاقے چھوڑنے پر بھی مجبور ہو جاتے، اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگ جاتے، بعد میں پھر آتے اور اس طرح سے مقابلے ہوتے تھے۔ یہ دو باتیں تو ایسی تھیں جو یہود نے ختم کردی تھیں، کہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے بھی تھے، خونریزی بھی کرتے تھے، اور گھر بھی اجاڑتے تھے۔ لیکن اگر ایک قبیلے کا یہودی پکڑا گیا، مخالفوں نے پکڑ لیا، مثلاً بنونضیر کا آدمی اوس والوں نے پکڑ لیا تو بنوقریظہ اپنے حلیفوں کو کچھ دے دلا کر راضی کر کے اُس یہودی کو آزاد کروا دیتے، اور اگر اسی طرح سے بنوقریظہ کا کوئی آدمی خزرج نے پکڑ لیا تو بنونضیر کا چونکہ خزرج کے ساتھ معاہدہ تھا تو وہ اُن کو کچھ دے دلا کر آزاد کروا دیتے۔ جب اُن سے کہا جاتا کہ بھئی! یہ تو تمہارے مخالف ہیں، تم اس طرح سے فدیہ دے کر کیوں چھڑاتے ہو؟، وہ کہتے کہ ہمیں ہماری کتاب کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ کا ہماری کتاب کے اندر حکم ہے کہ اگر کوئی یہودی پکڑا جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑایا جائے، اس لیے ہم یہ فدیہ دے کر اُسے چھڑاتے ہیں۔ اور جب اُن سے کہا جاتا کہ پھر حکم تو یہ بھی ہے کہ آپس میں لڑو نہیں، پھر آپس میں لڑتے کیوں ہو؟ اور یہ حکم بھی ہے کہ ایک دوسرے کے گھر نہ اجاڑو، تو آپس میں گھر کیوں اجاڑتے ہو؟ وہ کہتے کہ کیا کریں، آخر دوستوں کی دوستی کی رعایت بھی تو رکھنی ہوتی ہے، جب ہمارا ایک دوست پٹتا ہے تو ہم اُس کو پٹتا ہوا کیسے دیکھیں؟ تو دوستی کی رعایت میں اور ایک دوسرے کے ساتھ عہد معاہدے کی رعایت میں اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو یوں تلف

کرتے تھے، اور اپنی دینداری اور تقدس کو باقی رکھنے کے لئے کسی کسی حکم میں بڑے پیش پیش ہوتے، کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس لیے ہم یوں کرر ہے ہیں، اور جب دوسرا موقع آتا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو پس پشت ڈال کر دوستیوں کے تقاضے مقدم ہو جاتے۔ تو کسی کسی حکم میں اس تقدس کی رعایت رکھی جائے اور کسی کسی حکم کو یوں مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا جائے یہ یہودیوں کا کردار تھا۔

یہودیوں کا کلابی تقویٰ

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ اِس قسم کے کردار کے لئے لفظ بولا کرتے ہیں کلابی تقویٰ، کلاب کلب کی جمع ہے، کلب کتے کو کہتے ہیں، کتوں والا تقویٰ، کہ کتے کی خصلت ہے کہ جس وقت یہ پیشاب کرنے لگتا ہے تو ٹانگ اٹھالیتا ہے کہ کہیں چھینٹے نہ پڑ جائیں، اور اگر پاخانہ مل جائے تو سارا ہی کھا جائے گا، مردار مل جائے تو شوق سے کھا جائے گا، لیکن جب پیشاب کرنے لگے گا تو ٹانگ اٹھائے گا تا کہ چھینٹے نہ پڑ جائیں، منہ کو گندگی سے نہیں بچاتا نہیں اور ٹانگ کو بچاتا ہے۔ تو کہتے ہیں بعض بعض لوگوں کا تقویٰ ایسے ہی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے احکام کو تو تلف کر دیں گے اور ان کی پروا نہیں کریں گے، اور مستحبات اور سنتوں پر لوگوں سے لڑتے پھریں گے، کہ یوں کیوں کرلیا؟ دایاں پاؤں مسجد میں پہلے کیوں نہیں رکھا؟ بایاں پہلے کیوں نہیں نکالا؟، لڑیں گے تو اس قسم کی باتوں پر، تشدد کریں گے تو اس قسم کی باتوں پر، لیکن حرام کا ارتکاب کرتے ہوئے ڈریں گے نہیں، ظلم کرتے ہوئے بچیں گے نہیں، دوسروں کے حقوق تلف کرتے ہوئے ڈریں گے نہیں، فرائض کو چھوڑ دیں گے، محرمات کا ارتکاب کریں گے، اور مستحبات کے اُوپر اتنا تشدد! کہ ایک دوسرے کی عزت کو ہاتھ ڈالتے ہیں۔ جیسے کہ آج کل ہمارے ہاں چل رہا ہے، کہ ایسی ایسی چیزیں جو زیادہ سے زیادہ اباحت کے درجے میں ہیں، یا زیادہ سے زیادہ مستحبات کے درجے میں ہیں، دیوبندی اور بریلویوں کی اکثر لڑائیاں اِسی قسم کے مسئلوں پر ہیں، کوئی نماز نہیں پڑھتا، اُس سے کسی کو نفرت نہیں اور اُس سے کوئی نہیں لڑتا، اور روٹی پر ختم نہ دے تو ڈنڈے نکل آتے ہیں، جنازے کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگیں تو فساد ہو جاتا ہے۔ زانی سے نفرت نہیں ہے، شرابی سے نفرت نہیں ہے، بے نمازی سے نفرت نہیں ہے، لیکن ایسی باتیں جن کو دلائل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اگر لایا جا سکے تو اباحت کے درجے میں یا استحباب کے درجے میں لایا جا سکے، اُن کی پابندی ایسے ہے جیسے اعلیٰ فرائض ہوتے ہیں، اور ان کے چھوڑنے والے سے نفرت ایسے ہے جیسے کوئی خدا کا باغی ہو گیا ہو، یہ کلابی تقویٰ ہوتا ہے، کہ پیشاب کی چھینٹوں سے تو بچیں اور پاخانہ سارا کھا جائیں۔ اسی طرح سے یہ بھی اپنی دینداری کی دھونس جمانے کے لئے گرفتار یہودی کو تو فدیہ دے کر چھڑاتے، لیکن جب قتل کی نوبت آتی تو بے دریغ گردنیں اڑا دیتے اور گھر اُجاڑ دیتے، جب اُنہیں یاددہانی کرائی جاتی تو یہی مصلحتیں پیش کرتے کہ کیا کریں، دوستوں کی بات ہے، آخر دوستی کے تقاضے سے کرنا ہی پڑتا ہے، ہم اپنے یاروں کو اکیلا کیسے چھوڑ دیں؟ پھر احکامِ شرعیہ کو اس قسم کی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہی ملامت کی کہ یہی تمہاری دینداری ہے؟ کہ جہاں تمہاری مصلحت کے خلاف اللہ کا حکم ہو تو اس کی پروا نہیں کرتے، مصلحت کی رعایت رکھتے ہو، اور پھر دینداری جمانے کے لئے اس قسم کی باتوں پر عمل کر کے لوگوں کو یہ بھی دکھاتے ہو کہ کتاب پر ہمارا عمل ہے؟ بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا کفر کرتے ہو؟۔ جو اس قسم کا طریقہ اختیار کرلے

کہ اپنی مصلحت کے طور پر اللہ کے بعض احکام کو چھوڑتا ہے، اور جہاں کوئی مصلحت حکم کے اختیار کرنے میں ہوتی ہے تو اختیار کرتا ہے، اِن کی سزا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی اشد عذاب کی طرف ان کو لوٹایا جائے گا۔ تو اُن کے تقدس کو پاش پاش کرنے کے لئے یہی دھمکی اُن کو دی گئی، کہ تم جو اپنے آپ کو سمجھتے ہو کہ ہم بڑے تورات کے حامل ہیں، اور بڑے شریعت موسوی کے پابند ہیں، اِس آئینے میں اپنا منہ دیکھو، تمہارا کردار کیا ہے؟ ''یاد کیجئے! جب تم سے عہد لیا گیا کہ نہیں بہاؤ گے تم آپس میں خون، اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو۔ اور تم ہی یہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے لوگوں کو (یہ انہی قبائلی جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ مدینہ منورہ میں اوس اور خزرج کے ساتھ شامل ہو کر یہ لڑتے تھے) اور نکالتے ہو اپنے میں سے ایک فریق کو ان کے گھروں سے''۔ تَظٰهَرُوْنَ: تَظَاهَرَ: ایک دوسرے کی مدد کرنا، مدد کرتے ہو ایک دوسرے کی اُن کے خلاف، یعنی اپنے لوگوں کے خلاف، بِالْاِثْمِ: گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے، گناہ ہو گیا اللہ تعالیٰ کا حق تلف کرنے کی وجہ سے، وَالْعُدْوَانِ: اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے، ظلم ہو گیا حقوق العباد تلف ہونے کی وجہ سے، کہ تمہاری ان حرکتوں سے اپنے بھائیوں کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں یہ عدوان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے یہ اثم ہے۔ تمہارا یہ اقدام اِثم اور عدوان پر مشتمل ہے، اللہ کا حکم ختم کرتے ہو یہ اِثم ہو گیا، اور آپس میں ایک دوسرے کے حقوق تلف کرتے ہو یہ عدوان ہو گیا۔ ''اور اگر تمہارے پاس وہ گرفتار ہو کر آجائیں'' تُفٰدُوْهُمْ: تو تم اُن کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، ''حالانکہ حرام کیا گیا ہے تم پر اُن کا نکالنا بھی''، اور قتل اُس سے بڑھ کر ہے، اس لیے گھروں سے نکالنا بھی حرام اور قتل کرنا بھی حرام، ادنیٰ کو ذکر کر دیا اور اعلیٰ خود آ گیا، اُن کا نکالنا بھی حرام کیا گیا اور اُن کا قتل کرنا بھی حرام کیا گیا۔

لفظِ کُفر کا استعمال تغلیظاً بھی ہوتا ہے

''کیا پھر ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر اور کُفر کرتے ہو بعض کے ساتھ؟'' یہاں کُفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن جو تقریر آپ کے سامنے کی گئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مانتے تو تھے کہ اللہ کے احکام ہیں، لیکن مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے اُن کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے، واقعہ کی تفصیل آپ کے سامنے یہی ذکر کی گئی، مانتے تھے کہ اللہ کے احکام ہیں اور ہم اِن کے مکلف ہیں، ہم سے عہد لیا گیا ہے، لیکن مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے اُن پر عمل نہیں کرتے تھے، اس کو یہاں کُفر کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا، حالانکہ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص اللہ کے حکم کو مانتا ہے، لیکن اپنی کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت اُس پر عمل نہیں کرتا، وہ فاسق ہے کافر نہیں۔ مثلاً نماز کو فرض مانتا ہے لیکن سستی ہے، یا کوئی اس قسم کی دوسری بات ہے، کوئی دکانداری کی مصلحت ہے، پڑھنے کے لئے نہیں آیا، تو ایسی صورت میں اُس کو فاسق کہیں گے کافر نہیں کہیں گے۔ اور یہی صورت یہاں ہے، تو یہاں جو کُفر کا لفظ استعمال کیا گیا یہ کُفرِ عملی ہے، تغلیظاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، جیسے ہماری شریعت میں بھی یوں کہہ دیا جاتا ہے: ''مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ''[1] ترکِ صلوٰۃ کافروں والا فعل ہے، تو اُس کے اُوپر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، حج کے ذکر کے بعد کہا

---

(۱) المعجم الاوسط ۳/۳۲۳ باب الجیم، من اسمه جعفر / نیز ترمذی ۲/۹۰، میں الفاظ یہ ہیں: اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلٰوةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ-

گیا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ آل عمران: ۹۷) حج نہ کرنے کو بھی کُفر کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا، یہ تغلیظاً ہوتا ہے، کہ یہ کافروں والی حرکت ہے، یہ ایسے لوگوں کی حرکت ہے جو سرے سے اللہ کا حکم مانیں ہی نہ۔ ورنہ حکم کو تسلیم کرتے ہوئے عملاً اُس کی خلاف ورزی کُفر نہیں بلکہ فسق ہے، اور فسق کو تغلیظاً کُفر کہہ سکتے ہیں۔

یہود کا دُنیوی اور اُخروی انجام

''کیا بدلہ ہے اُن لوگوں کا جو تم میں سے یہ کام کرتے ہیں، سوائے دنیوی زندگی کی رسوائی کے'' یعنی دنیوی زندگی میں رسوائی، کہ تمہیں ذلیل کیا جائے، تمہاری یہ بُرائیاں ظاہر کی جائیں، اور پھر ان کوتاہیوں کے نتیجے میں تمہیں دنیا میں پٹوادیا جائے، ذلیل کر دیا جائے، اِس کے علاوہ تمہاری اور کیا سزا ہو سکتی ہے، یعنی یہی سزا تمہاری شان کے لائق ہے، یہی تمہیں ملنی چاہیے۔ ''اور قیامت کے دن لوٹائے جائیں گے اشد عذاب کی طرف، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو'' آگے اُن سے خطاب ختم کر کے اب اُن کا ایک حال واضح کیا جا رہا ہے، گویا کہ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ یہی لوگ دنیادار ہیں جو دنیا کو آخرت کے مقابلے میں مقدم رکھتے ہیں، ان کو آخرت کی فکر نہیں، دنیوی مصلحتیں دیکھتے ہیں، یہ گویا کہ اب ان کا غائبانہ حال واضح کیا جا رہا ہے ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو اختیار کر رکھا ہے'' کہ اللہ کا حکم مانیں تو آخرت آباد ہوتی ہے، اور یہ دنیوی مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہیں، اللہ کے احکام کی رعایت نہیں رکھتے، ''اِن سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ مدد دیے جائیں گے۔''

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز

البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے،

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا

اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلائل دیے، اور ہم نے قوت پہنچائی عیسیٰ علیہ السلام کو پاکیزہ روح کے ساتھ، کیا پھر

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز

جب کبھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے تھے تم اکڑ گئے؟ پھر ایک فریق کی تم نے تکذیب کی،

وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ

اور ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے ﴿۸۷﴾ اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردے میں ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کے سبب سے،

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

پس یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس کتاب آگئی اللہ کی طرف سے، وہ تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو ان

مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ

کے پاس ہے، اور اس (کتاب کے آنے) سے قبل یہ فتح طلب کیا کرتے تھے کافر لوگوں کے مقابلے میں، جب آگئی ان کے پاس وہ چیز

مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ

جس کو انہوں نے پہچان لیا تو اس کا انکار کر دیا، پس ان انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ﴿۸۹﴾ بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے بیچا انہوں نے

اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

اپنی جانوں کو، یعنی کفر کیا انہوں نے اس چیز کا جو اتاری اللہ نے، اس بات پر ضد کی وجہ سے کہ اتارے اللہ

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ

اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، پس لوٹے وہ غضب بالائے غضب کے ساتھ

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ

اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۹۰﴾ اور جس وقت انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ نے اتاری،

اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ

وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہم پر اتاری گئی، اور انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اس کے علاوہ ہے، حالانکہ وہ

الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ

حق ہے، تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے، آپ کہہ دیجئے کہ پھر تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے

قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ

(اس کتاب کے آنے سے) پہلے، اگر تم ایمان والے ہو ﴿۹۱﴾ اور البتہ تحقیق آئے موسیٰ تمہارے پاس واضح دلائل لے کر، پھر

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا

بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود موسیٰ کے (جانے کے) بعد، اور تم ظلم کرنے والے تھے ﴿۹۲﴾ اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تم سے پختہ

مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ

عہد لیا، اور تمہارے اُوپر پہاڑ کو اٹھایا (اور کہا ہم نے) پکڑو قوت کے ساتھ اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے، اور سنو،

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ ؕ

انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور ہم نے نہ مانا، اور پلائے گئے وہ اپنے دلوں میں بچھڑے کی محبت اپنے کفر کے سبب سے،

قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ

آپ کہہ دیجئے کہ بری ہے وہ بات جس کا حکم دیتا ہے تمہیں تمہارا ایمان، اگر تم مؤمن ہو ﴿۹۳﴾ آپ یہ فرمادیجئے اگر

کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَۃً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ

تمہارے لیے ہی ہے آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک خالص، دوسرے لوگوں کے علاوہ،

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ

پھر تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو ﴿۹۴﴾ اور ہرگز نہیں تمنا کریں گے یہ موت کی کبھی بھی بسبب ان اعمال کے جو ان کے ہاتھوں نے

اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚۛ

آگے بھیجے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۵﴾ البتہ ضرور پائے گا تو ان کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر،

وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚۛ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ ۚ وَمَا

اور ان لوگوں سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں، ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کو ہزار سال عمر دے دی جائے، اور نہیں ہے

هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

عمر کا دیا جانا اس کو دور ہٹانے والا عذاب سے، اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُن کاموں کو جو یہ کرتے ہیں ﴿۹۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ: البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، کتاب سے تورات مراد ہے، وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ: قَفّٰی: کسی کے پیچھے بھیجنا۔ قَفَا کہتے ہیں سر کے پچھلے حصے کو، جس کو ہم گدی کہتے ہیں، کسی کے پیچھے دوسرے کو لگا دینا یہ قَفّٰی ہے، اور اِقْتِفَاء باب افتعال سے، کسی کے پیچھے چلنا، اقتداء کے معنی میں، "موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہم نے

پے درپے رسول بھیجے، یکے بعد دیگرے رسول بھیجے، ایک دوسرے کے پیچھے بھیجے'' ، پے درپے کا لفظی معنی بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے کے پیچھے، وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ: الۡبَیِّنٰتِ یہ اٰتَیۡنَا کا مفعول ہے، اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلائل دیے۔ الۡبَیِّنٰتِ: واضح معجزات، جو اُن کی نبوت کے دلائل تھے، وَاَیَّدۡنٰهُ: اَیۡدٌ قوت کو کہتے ہیں، اَیَّدَ تائید: قوت پہنچانا، یہ جو آپ ایک دوسرے کی بات کی تائید کیا کرتے ہیں تو وہاں بھی مراد یہی ہوتی ہے کہ میں اِس کی بات کے ساتھ اپنی رائے شامل کر کے اِس کو قوت پہنچاتا ہوں، جیسے کہتے ہیں کہ میں اِس بات کی تائید کرتا ہوں تو تائید کا یہی معنی ہوتا ہے کہ اپنی رائے اُس کے ساتھ شامل کر کے آپ اس کو قوت پہنچاتے ہیں، اسی طرح عام طور پر آپ گفتگو میں یہ جملہ استعمال کرتے ہیں کہ یہ دعویٰ مؤید بالدلیل ہے، تو مؤید بالدلیل کا مطلب یہی ہے کہ اس دعوے کو دلیل کے ساتھ قوت پہنچائی ہوئی ہے، اَیَّدۡنٰهُ: ہم نے تائید کی عیسیٰ علیہ السلام کی، ہم نے قوت پہنچائی عیسیٰ علیہ السلام کو، بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ: پاکیزہ روح کے ساتھ، قُدس مصدر ہے مُقدّس کے معنی میں، الرُّوۡحُ الۡمُقَدَّسَةُ پاکیزہ روح کے ساتھ ہم نے اُس کو قوت پہنچائی، اور روح القدس کا مصداق حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ: کیا پھر جب کبھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول، بِمَا لَا تَهۡوٰۤى اَنۡفُسُكُمُ: ایسی چیز لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے تھے۔ هَوِیَ یَهۡوٰی: چاہنا۔ هَوٰی: خواہش۔ بِمَا میں باء تعدیہ کی ہے، جَآءَ لازم ہے بمعنی آیا، اور باء تعدیہ کی آ گئی تو اب اِس کا ترجمہ ہوگا لایا، اس لیے میں ترجمہ یوں کررہا ہوں ''ایسی چیز لے کر''۔ ''کیا پھر جب کبھی لایا تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے تھے''، اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ: تم اکڑ گئے، تم نے تکبر کیا، حق کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ تکبر کی حقیقت یہی ہے کہ حق بات کو قبول نہ کیا جائے۔ فَفَرِيۡقًا كَذَّبۡتُمۡ: پھر ایک فریق کی تم نے تکذیب کی، ایک فرق کو تم نے جھوٹا بتلایا، وَفَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ: اور ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے۔ وَقَالُوۡا: اور یہ یہود کہتے ہیں قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ: غُلۡفٌ اَغۡلَفُ کی جمع ہے، اَغۡلَفُ اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے اُوپر غلاف چڑھا ہوا ہو، قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ کا معنی ہے ہمارے دل غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے دلوں پر حجاب طاری ہے، ہمارے دل پردے میں ہیں، اِن کے اُوپر غلاف چڑھا ہوا ہے، بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ: بل کا مطلب یہ ہے کہ غلاف نہیں چڑھا ہوا، بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اِن کے کفر کے سبب سے، فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ: قلیلًا مّا: بہت کم، اور یہ نفی کا مفہوم ادا کرتا ہے، ''پھر یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں'' جس کا مفہوم یہی ہے کہ ایمان نہیں لاتے، یا کم ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں تو مان لیتے ہیں جو اِن کی خواہش کے مطابق ہیں، اور جو باتیں اِن کی خواہش کے مطابق نہیں ہیں اُن کو نہیں مانتے، اور ایمان میں تجزی ہے نہیں، کہ تھوڑا سا ایمان لایا جائے اور تھوڑا سا نہ لایا جائے، ایمان تو مکمل ہوتا ہے، اگر اُس میں سے کسی ایک جزء کا بھی انکار ہو تو کفر آ جاتا ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ: اور جب اُن کے پاس کتاب آ گئی اللہ کی طرف سے، اِس کتاب کا مصداق قرآنِ کریم ہے، مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ: وہ کتاب سچا بتلانے والی ہے اُس کتاب کو جو اِن کے پاس ہے، تصدیق کرنے والی ہے اُس کتاب کی جو ان کے پاس ہے، وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ: قَبۡلُ مبنی برضم ہے، کیونکہ اِس کا مضاف الیہ محذوف منوی ہے، اِس کتاب کے آنے سے قبل یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ: فتح طلب کیا کرتے تھے عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا: کافر لوگوں کے مقابلے میں، ''اور اس کتاب کے آنے سے قبل یہ فتح طلب کیا کرتے تھے اُن لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے کفر کیا'' فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا: جب آ گئی ان کے پاس وہ چیز جس کو یہ پہچانتے ہیں، جس کو انہوں نے پہچان لیا، كَفَرُوۡا بِهٖ: تو اُس کا انکار کر دیا،

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: پس اِن انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ: اشتراء کا لفظ، آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کر دیا گیا، کہ اصل کے اعتبار سے تو خرید و فروخت کے مفہوم میں ہوتا ہے، لیکن ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری اُس کے بدلے میں لے لینا، اِس کے لئے بھی اشتراء کا لفظ استعمال ہوتا ہے، "بُری ہے وہ چیز جس کے ساتھ خریدا انہوں نے اپنی جانوں کو، یا، بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنی جانوں کو"، اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: یہ مخصوص بالذم ہے، وہ چیز کیا ہے؟ یعنی کفر کیا انہوں نے اُس چیز کا جو اُتاری اللہ نے، بَغْيًا: کفر کیا آپس میں ضد کی وجہ سے، اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: ضد اِس بات پر کہ اتارے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: جس پر چاہے مِنْ عِبَادِهٖ: اپنے بندوں میں سے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کوئی چیز اتارے اِس بات پر اِن کو ضد ہے کہ ایسا کیوں ہوا، ہماری مرضی کے مطابق کیوں نہیں اتری، جس پر ہم چاہتے وہاں اترتی، اِس بات پر حسد کرتے ہوئے اور ضد کرتے ہوئے انہوں نے کفر اختیار کیا، فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ: پس لوٹے وہ غضب بالائے غضب کے ساتھ، مستحق ہو گئے وہ غضب بالائے غضب کے، غضب پر غضب آ گیا، جس طرح سے آپ نور علیٰ نور کہتے ہیں، اِسی طرح سے اُن کا کفر بھی اللہ کے غضب کا باعث اور حسد بھی اللہ کے غضب کا باعث، یا پہلے وہ تورات کے اندر میثاق لیے گئے تھے اُن کی مخالفت کرنے کی بناء پر بھی مغضوب تھے، اب اللہ کی طرف سے جو نئی کتاب اُتری اِس کا انکار کر کے مزید مغضوب ہو گئے، تو یہ غضب علیٰ غضب ہو گیا، "لوٹے وہ غضب بالائے غضب کے ساتھ، اور کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے" مُهِيْنٌ کے معنی ذلیل کرنے والا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا: اور جس وقت اِنہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ، بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اس چیز پر جو اللہ نے اتاری قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا: وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر جو ہم پر اتاری گئی وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ: اور انکار کرتے ہیں یہ اُس چیز کا جو اُس کے علاوہ ہے، جو اِن پر اتاری گئی اُس پر تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اُس کا انکار کرتے ہیں، وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ: حالانکہ وہ حق ہے، واقع کے مطابق ہے جو کچھ اللہ نے اتارا، اور تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اِن کے پاس ہے۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے، فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ: پھر تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے مِنْ قَبْلُ: اِس کتاب کے آنے سے پہلے، قرآنِ کریم کے آنے سے قبل تم انبیاء ﷷ کو کیوں قتل کرتے رہے؟ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ: اور البتہ تحقیق آئے موسیٰ ؑ تمہارے پاس واضح دلائل لے کر، ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ: پھر موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اتَّخَذْتُمْ کا دوسرا مفعول محذوف ہے، بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود، وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ: اور تم ظلم کرنے والے تھے، شرک کا ارتکاب کرنے والے تھے، کیونکہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)، تم بہت ہی ظلم ڈھانے والے تھے، بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے بڑا ظلم ڈھایا۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تمہارا پختہ عہد لیا، وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ: اور تمہارے اُوپر پہاڑ کو اٹھایا، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ: اور کہا ہم نے کہ لو اُس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے، بِقُوَّةٍ: یہ خُذُوْا کے متعلق ہے، پکڑو اُس چیز کو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمہیں دی ہے، وَّاسْمَعُوْا: اور سنو، قَالُوْا: انہوں نے کہا، سَمِعْنَا: ہم نے سن لیا، وَعَصَيْنَا: اور ہم نے نہ مانا۔ عَصَيْنَا: نافرمانی کرنا، ہم نے سن لیا اور نہ مانا۔ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ: عجل: بچھڑا، اُشْرِبُوْا: پلائے گئے وہ اپنے دلوں میں حُبُّ الْعِجْلِ بچھڑے کی محبت، پلائے گئے کا مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کی محبت اُن

کے دلوں میں سرایت کرگئی، جس طرح سے زمین کے اوپر آپ پانی گرادیں، زمین کو آپ پلاتے ہیں، سیراب کرتے ہیں، تو وہ پانی چوس لیتی ہے، پانی اندر سرایت کر جاتا ہے، تو اسی طرح سے بچھڑے کی محبت اُن کے دلوں میں سرایت کرگئی، بِكُفْرِهِمْ: اُن کے کفر کے سبب سے، قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖ اِيْمَانُكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ بری ہے وہ بات جس کا حکم دیتا ہے تمہیں تمہارا ایمان اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ: اگر تم مؤمن ہو۔ قُلْ: آپ یہ فرما دیجئے، اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ: اگر تمہارے لیے آخرت کا گھر ہے اللہ کے نزدیک خَالِصَةً: خالص مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ: دوسرے لوگوں کے علاوہ، ''دوسرے لوگوں کے علاوہ اگر آخرت کا گھر خالص تمہارے لیے ہی ہے'' فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ: پھر تم موت کی تمنا کرو، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا: لَنْ بھی مستقبل کے استغراق کے لئے آیا کرتا ہے لیکن اَبَدًا اُس کی اور بھی زیادہ تاکید آ گئی، اور ہرگز تمنا نہیں کریں گے اُس موت کی کبھی بھی، بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ: بسبب اُن کرتوتوں کے، اُن اعمال کے جو اِن کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ: البتہ ضرور پائے گا تو اِن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: اور اُن لوگوں سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں، اُن لوگوں سے بھی زیادہ جو کہ شرک کرنے والے ہیں، مشرکوں سے بھی زیادہ اِن کو زندگی کی حرص ہے۔ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ: اِن میں سے کوئی چاہتا ہے لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ: کہ وہ دے دیا جائے عمر ہزار سال، یہ لَوْ مصدریہ ہے، اِن میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ اِس کو ہزار سال عمر دے دی جائے، ہزار سال عمر دیا جانا اِن میں سے ہر کوئی چاہتا ہے، اور ہزار سال محاورہ ہے، یعنی کثرت کے ساتھ، لمبی عمر، باقی! ہزار سال ہی مطلوب نہیں ہوتا، مقصد یہ ہے کہ عمر لمبی ہو، جیسے دعاؤں کے اندر ذکر کیا کرتے ہیں، مرزا غالب کا شعر بھی ہے، بادشاہ کو دعا دیتے ہوئے اس نے کہا تھا:

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تو یہ ہزار کا لفظ مبالغے کے طور پر ہے، کہ ایک تو عمر ہزار سال ہو، پھر ہر برس پچاس ہزار دن کا ہو، ویسے تو سال تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے، لیکن تجھے جو ہزار سال عمر ملے تو اُس میں سے ہر برس پچاس ہزار دن کا ہو۔ تو ہزاروں کا لفظ مبالغۃً بولا جایا کرتا ہے، یہاں بھی اسی طرح سے ہے، ''چاہتا ہے ان میں سے ہر کوئی کہ دیا جائے وہ عمر ہزار سال''، وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ: هُوَ ضمیر اِس ہزار سال عمر کی طرف ہے، یہ ہزار سال عمر کا دیا جانا اُس شخص کو عذاب سے دور ہٹانے والا نہیں، اَنْ يُّعَمَّرَ اُسی هُوَ کا بیان ہے، نہیں اُس کو بچانے والا عذاب سے، کون نہیں بچانے والا؟ عمر کا دیا جانا، ''عمر کا دیا جانا اُس کو عذاب سے دور ہٹانے والا نہیں''، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُن کاموں کو جو یہ کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

بنی اسرائیل کے متعلق واقعات چلے آرہے ہیں، جیسا کہ ترجمے میں آپ نے دیکھ لیا، اُنہی کے قبائح، اور اللہ تعالیٰ کی

نافرمانیاں، اُن کی سنگدلی، استکبار، حسد، تکبر، اہل حق کے ساتھ اُن کی مخالفت اور ضد اِن واقعات کے اندر نمایاں کی گئی ہے، پچھلے رُکوع میں دو دفعہ ذکر آیا تھا کہ بنی اسرائیل سے اللہ نے میثاق لیا، پہلے اخلاقِ عالیہ اور اچھے عقائد کے متعلق، اور پھر اُس کے بعد خاص طور پر اپنے قبائل کے متعلق، کہ آپس میں سفکِ دم نہیں کرنا، ایک دوسرے کا اخراج نہیں کرنا، کوئی گرفتار ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑانا ہے، یہ دو دفعہ میثاق کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا۔

یہود کی دِیدہ دلیری کا ذکر اور اس کا مقصد

اگلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح سے ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب اُتاری تھی جس کے اندر اِن میثاقوں کا ذکر تھا، تو اُس کے بعد بھی ہم رسول پے در پے بھیجتے رہے جو اِن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد یاد دلاتے رہے، لیکن یہ ایسے لوگ ہیں کہ نہ اِنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے قول واقرار کی پروا کی، نہ تورات کے اندر مندرج اِن مواثیق کا خیال رکھا، اور نہ انبیاء علیہم السلام کی تنبیہات سے متنبہ ہوئے، بلکہ انہوں نے بدعملی اختیار کی، اور جس وقت اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آ کر اِن کو اِن کی خواہشاتِ نفس سے روکتا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام اِن کے سامنے ذکر کرتا جو اِن کی ہوائے نفس کے مطابق نہ ہوتے، اِن کی خواہشات کے خلاف ہوتے، تو یہ اتنے دلیر ہیں کہ یا تو اُن انبیاء علیہم السلام کو جھٹلاتے، اور بعض انبیاء علیہم السلام کو انہوں نے قتل ہی کر دیا، اور وہ انبیاء علیہم السلام ایسے تھے جو حاملِ تورات تھے، اور تورات کی ہی وعظ اِن کے سامنے کہتے تھے، تورات کے اندر درج میثاق کی اِن کو یاد دہانی کراتے تھے۔ تو یہ ایسے چور ہیں اور ایسے دلیر چور ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی وعظ سے متاثر نہیں ہوئے، خاص طور پر وہ انبیاء علیہم السلام جو اِنہی کے قبیلے کے تھے، اِنہی کی کتاب کے حامل تھے، تو اِن سے تم کیا توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان جائیں گے؟۔ اِس طرح سے اُن کی قباحت کو ظاہر کیا جا رہا ہے، جس سے اُن کو دنیا کے سامنے ایک قسم کا رسوا کرنا بھی مقصود ہے، تاکہ اُن کی وہ علمی ریاست ختم ہو، لوگوں پر ان کے اثرات ختم ہوں، کہ اگر یہ نہ مانیں تو کم از کم اِن کا حلقۂ ارادت تو کم ہو جائے، جب لوگوں پر اِن کے اثرات کم ہوں گے اور ان کی بدمعاشیاں ظاہر ہوں گی تو کم از کم عوام تو سمجھائے ہوئے سمجھ جائیں گے۔ جیسے ایک پیر ہو اور اس کے پیچھے مرید اندھا دھند لگے ہوئے ہیں، تو اُس پیر کے کردار پر تنقید کی جاتی ہے، بظاہر اُس کو سمجھایا جاتا ہے کہ تو باز آ جا، اب اِس میں دو مقصد ہوتے ہیں، کہ اگر یہ باز آ جائے گا تو بہتر، پھر بھی سارے مرید ٹھیک ہو جائیں گے، اور اگر یہ باز نہیں آئے گا تو کم از کم اِس تنقید کے ساتھ اس کے جو اخلاقی احوال کھلیں گے تو لوگوں کی عقیدت میں فرق آ جائے گا، لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے، اور جب لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے تو پھر سمجھائے ہوئے وہ سیدھے راستے پر بھی آ سکتے ہیں۔ تو اِن اہل کتاب کے جو قبائح ظاہر کیے جا رہے ہیں اِس میں دونوں ہی باتیں ہیں، کہ اُن کو بھی ذہنی مار دینی مقصود ہے کہ تم اِس تکبر کو چھوڑ دو، یہ بدکرداریاں تمہارے لیے اچھی نہیں ہیں، لیکن اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو کم از کم عوام کے سامنے تو اِن اہل علم کا حال آ جائے گا، جب ان اہل علم کا حال عوام کے سامنے آ جائے گا تو عوام پر ان کے اثرات ختم ہو جائیں گے، اور پھر دوسرے کے سمجھائے سے اِن کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول پے در پے بھیجے، اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم نے واضح معجزات دیے، اور عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے روح القدس کے ساتھ قوت

پہنچائی'' یعنی جبریل کے ساتھ، ''کیا پھر تمہارا یہ حال تھا؟'' یعنی تم پر یہ حال طاری ہوا؟ کہ جب کبھی آتا تمہارے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے تھے، اسْتَكْبَرْتُمْ: تم اکڑ گئے، تمہارا معمول یہی ہے کہ جب بھی تمہاری خواہش کے خلاف تمہیں کوئی حکم دیا گیا تم نے تکبر اختیار کیا، ''پھر ایک فریق کو تم نے جھٹلایا، جھوٹا بتلایا، اور ایک فریق کو تم نے قتل ہی کر دیا۔''

حق قبول نہ کرنے پر یہود کا فخر اور اس کی تردید

''اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے!'' یہ بات بطور فخر کے کہتے تھے، کہ ہمارے دل تو اس طرح سے غلاف میں ہیں کہ باہر کی بات جو ہمارے مسلک کے اور ہمارے مذہب کے خلاف ہے ہمارے دلوں پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی، ہمارے دل اس طرح سے پردے میں ہیں کہ تم جو کچھ کہتے رہو، تمہاری بات ہمارے دل پر اثر ہی نہیں کرتی۔ وہ فخر اس طرح سے کرتے تھے، گویا کہ ہم اپنے نظریے پر اتنے پکے ہیں اور اپنے خیالات پر اتنے ٹھوس ہیں کہ ہمارے خیالات اور ہمارے نظریے کے خلاف جو کچھ آئے گا، ہمارے دل کی اپنے نظریات پر اتنی مضبوطی ہے کہ باہر کی کوئی بات اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ خوبی نہیں، مردودو! یہ تو لعنت کا اثر ہے کہ تمہارے دل حق قبول نہیں کرتے، لعنت پڑنے کی وجہ سے حق کے قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے، یہ کونسی فخر کی بات ہے؟ کوئی شخص حق کو قبول نہ کرے اور اپنے غلط نظریے کے اُوپر ڈٹا رہے، تعصب میں مبتلا ہو، تو یہ کوئی دل کی مضبوطی ہے؟ یا دل کے محفوظ ہونے کی علامت ہے؟ یہ تو مردود ہونیکی علامت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے جس کی وجہ سے اپنی خواہشات کے خلاف حق بات انسان قبول نہیں کرتا۔ اُن کو بتایا جارہا ہے کہ یہ تو تمہارے ملعون ہونے کی علامت ہے جو اتنی اتنی واضح باتیں تمہارے سامنے کی جارہی ہیں اور اتنے دلائل کے ساتھ اُن کو مدلل کیا جارہا ہے وہ بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں؟ اور پھر تم فخر کرتے ہو کہ ہمارے دل مضبوط ہیں، اور ہم اپنے نظریات پر اتنے پکے ہیں کہ باہر کی بات سے متاثر ہی نہیں ہوتے، یہ فخر کی بات نہیں ہے۔ کہتے ہیں قُلُوْبُنَا غُلْفٌ: ہمارے دل پردوں میں ہیں، بَلْ کا مطلب یہ ہے کہ پردے نہیں، نہ یہ کوئی فخر کی بات ہے، بلکہ اِن پر اللہ نے لعنت کی اِن کے کفر کے سبب سے، فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ: پھر یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں، کم وہی ہے جو اُن کی اپنی خواہشات کے مطابق ہو، لیکن اس قسم کا کم ایمان کسی کام کا نہیں، جس کی بناء پر قلیلًا مَّا نفی کے لئے ہوگیا، کہ یہ ایمان نہیں لاتے، اِن کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوتا۔

''يَسْتَفْتِحُوْنَ'' کے دو مفہوم

آگے (وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں) بھی اُن کی وہی ضد بیان کرنی مقصود ہے، اِس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے، کہ یہود کے علم میں تو تھا کہ ایک پیغمبر آخر الزمان آنا ہے، اور ایسی کتاب اُس کے اُوپر اترنی ہے، اور یہ یہود منتظر ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اس قسم کا پیغمبر آئے گا اور کتاب آئے گی تو ہم اُس کو قبول کریں گے، کیونکہ اُس کے آنے کے ساتھ ہی ہمارے بدبختی کے دن تبدیل ہونے ہیں، اور ارد گرد کے مشرکین سے یہ کہا کرتے تھے کہ اب تو تم ہم پر زیادتیاں کرلو جو کر سکتے ہو، لیکن جس وقت وہ پیغمبر آجائے گا تو ہم اُس پر ایمان لے آئیں گے اور پھر اُن سے مل کر ہم تمہارا مقابلہ کریں گے، اس طرح سے لوگوں کے

سامنے وہ بیان کرتے رہتے تھے، اور تاریخی واقعات میں یہ بات لکھی ہے کہ انصار مدینہ نے جو سنتے ہی فوراً بغیر کسی تامل کے حضور ﷺ کو قبول کرلیا اور مکہ معظمہ میں جا کر ایمان لے آئے تو اُن کے فوراً ایمان لانے کی وجہ یہی لکھی ہے کہ یہ یہود سے اکثر اس قسم کے تذکرے سنتے رہتے تھے، جب وہ حج کے لئے آئے (جاہلیت کے زمانے میں بھی لوگ حج کرتے تھے) اور یہاں آ کر آپ ﷺ کے حالات دیکھے تو فوراً ان کے ذہن نے کام کیا کہ یہ تو وہی پیغمبر معلوم ہوتے ہیں جن کے یہود منتظر ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہود پہلے آ کر قبول کرلیں اور ان کو ساتھ لے کر پھر وہ ہمارے اُوپر غالب آ ئیں، کیوں نہ ہم پہلے قبول کرلیں اور ان کو ہم اپنے ساتھ شامل کرلیں، یہود کو یہ موقع ہی نہ ملے کہ وہ اِن کو لے لیں، اس لیے انصار نے سنتے ہی فوراً سبقت کی اور اس کو قبول کرلیا، اور ان کے قبول کرلینے کی وجہ سے یہود ضد میں آ گئے۔ تو یہ باتیں چونکہ انصار نے پہلے جاہلیت کے زمانے میں سنی ہوئی تھیں، یہود سے سنتے رہتے تھے، اس لیے جب اس پیغمبر کے حالات معلوم ہوئے تو فوراً قبول کرلیا۔ اس لیے استفتاح کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ کھول کھول کر بیان کرتے تھے،''بیان القرآن'' میں ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے کہ اس سے قبل وہ کھول کھول کر بیان کرتے تھے اُن لوگوں پر جنہوں نے کُفر کیا، یعنی یہ بیان کرتے رہتے تھے کہ ایسا پیغمبر آنے والا ہے۔

اور دوسرا ترجمہ جسے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا کہ فتح طلب کرتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے، جیسے عربی تفاسیر میں لکھا، کہ وہ جب کبھی دشمنوں کے مقابلے میں دعا کرتے تو یوں کہتے کہ اے اللہ! نبی آخرالزمان اور اُس پر اترنی والی کتاب کے وسیلہ سے اور اُس کے طفیل ہمیں فتح نصیب فرما۔ اپنی دعا کے اندر کسی کے ساتھ توسل کرنا اور وسیلہ پکڑنا اس بات کی علامت ہے کہ اُن کے دلوں کو یقین تھا کہ ایک نبی برحق آنے والا ہے، اور وہ اللہ کا اتنا مقبول ہوگا کہ ہم اپنی دعاؤں کے اندر اگر اُس کا تذکرہ کریں گے تو ہماری دعا قبول ہوگی، تو استفتاح کا یہاں یہ معنی ہے کہ فتح طلب کرتے تھے یعنی اِس کتاب کے توسل سے اور اِس آنے والے پیغمبر کے طفیل وہ فتح طلب کیا کرتے تھے، اور عربی تفاسیر میں اُن کی یہی دعائیں نقل کی گئی ہیں، کہ اے اللہ! اِس آنے والے پیغمبر کے طفیل اور اُترنے والی کتاب کے وسیلہ سے ہمیں ہمارے دشمنوں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما، جب اِن دعاؤں کے اندر وہ ذکر کرتے تھے تو ان کو کتنا یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے اور ایک کتاب اترنے والی ہے، اور جب اِن کی جانی پہچانی چیز ان کے سامنے آ گئی تو حسد کی بناء پر انکار کر بیٹھے۔ اِس سے ان کا اخلاقی زوال معلوم ہوتا ہے، کہ کتنی حق پرستی ان کے اندر ہے جو لوگوں کے سامنے بڑے اللہ والے بن کر اور حق پرست بن کر پیش ہوتے ہیں، اِن کی حق پرستی کا یہ حال ہے، ان کا یہ کردار اس طرح سے واضح کیا جا رہا ہے، ان کے پردے کھولے جا رہے ہیں، جس سے یہ بھی ممکن ہے کہ خود متاثر ہو جائیں، اگر خود متاثر نہیں ہوں گے تو کم از کم لوگوں کے سامنے تو اُن کا اخلاقی زوال آئے گا۔''جب آئی اِن کے پاس کتاب اللہ کی جانب سے، جو تصدیق کرنے والی ہے اُس کی جو اِن کے پاس ہے، اور وہ اِس کے آنے سے قبل فتح طلب کیا کرتے تھے کافروں کے مقابلے میں'' یعنی اس کتاب کے توسل سے، یا، کافروں پر اِس کو کھول کھول کر بیان کرتے تھے، بڑے کھل کھل کے اس آنے والی کتاب کے اور آنے والے پیغمبر کے تذکرے کرتے تھے۔ دونوں طرح سے مفہوم ہے۔ کھل کھل کے تذکرے کرتے تھے، واضح طور پر بیان کرتے تھے، یہ مفہوم اختیار کیا گیا ہے بیان القرآن میں۔ اور فتح طلب کرتے تھے، یہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے، اور عربی تفاسیر میں زیادہ تر

فتح طلب کرنے والے معنی کو ترجیح دی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہی بیان کیا گیا ہے کہ اپنی دعاؤں کے اندر اس کتاب کا اور آنے والے پیغمبر کا وسیلہ پکڑتے تھے، دشمنوں کے مقابلے میں فتح طلب کیا کرتے تھے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا: جب اُن کی جانی پہچانی چیز اُن کے پاس آگئی، یعنی یہ نہیں کہ کوئی انجانی چیز تھی، پتہ نہیں تھا کہ کیا آگئی، اِس کے متعلق پہلے کوئی اشارہ موجود نہیں، بلکہ مَّا عَرَفُوْا: جانی پہچانی چیز، جس کو انہوں نے پہچان لیا، ''جب آگئی ان کے پاس وہ چیز جس کو انہوں نے پہچان لیا'' كَفَرُوْا بِهٖ: تو اس کے منکر ہوگئے، اُس کا انکار کر دیا، فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت، جو جان بوجھ کر آنکھیں بند کرتے ہیں اور جانی پہچانی چیز کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ ویسے تو سارا ہی کُفر موجب لعنت ہے، لیکن ایسے کافر! دیدہ دلیری کرنے والے! کہ جس کے تذکرے کرتے تھے، اچھی طرح سے جانتے پہچانتے تھے، وہ چیز سامنے آئی تو فوراً انکار کر دیا۔ لعنت کا معنی پھٹکار، اللہ کی رحمت سے دُوری۔

ضد اور حسد نے یہود کو مغضوب بنا دیا

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ: بُری ہے وہ چیز جس میں اِنہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا، محاورے کے طور پر ترجمہ یوں ہوگا، کیونکہ جب انسان اپنی استعداد صرف کرتا ہے اور مقابلے میں ایک چیز کماتا ہے تو یوں سمجھو کہ اپنی جان صرف کر کے یہ چیز کمائی۔ اِنہوں نے اپنی جانوں کو خرچ کر کے کیا کمایا؟ کُفر! یا مطلب یہ ہے کہ ''جس چیز کے ذریعے سے یہ اپنی جانوں کو اللہ کے عذاب سے چھڑانا چاہتے ہیں وہ چیز بہت بُری ہے''، وہ کونسی چیز ہے؟ کُفر! یہ کُفر کر کے اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں، یعنی داعیہ تو ان کے دل میں یہ ہے کہ ہمیں عذاب نہ ہو، اور اِس عذاب سے بچنے کے لئے اور اپنی جانوں کو چھڑانے کے لئے کیا اختیار کیا؟ کُفر! تو کُفر کے ذریعے سے بھی کبھی کوئی اللہ کے عذاب سے بچا؟ اور یہ اپنی جانوں کو چھڑا سکتے ہیں؟ بُری ہے وہ چیز جس کے ذریعے سے چھڑاتے ہیں یہ اپنی جانوں کو، وہ بُری بات یہ ہے کہ کفر کیا انہوں نے اُس چیز کا جو اللہ نے اتاری۔ اور کفر بھی کس بناء پر کیا؟ حسد کی بناء پر، ضد کی بناء پر۔ اور ضد اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے اتارے، اس بات پر اِن کو ضد ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا کیوں اتار دیا؟ اِس سے ان کو آگ لگ گئی، کہ اگر یہ کتاب دینی تھی تو ہمیں دیتے، پیغمبر اٹھانا تھا تو ہم میں سے اٹھاتے۔ اور ان کے خیال کی تردید اس میں آگئی کہ اللہ پر پابندی لگانا چاہتے ہیں، کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کتاب کیوں اتارتا ہے؟ اس بات پر ان کو ضد ہے۔ یا پھر ترجمہ بیچنے والے مفہوم کے ساتھ یوں کر لیجئے جیسے میں نے ادا کیا کہ ''بُری ہے وہ چیز جس میں کھپایا انہوں نے اپنی جانوں کو، اور وہ چیز یہ ہے کہ کُفر کیا انہوں نے اس چیز کے ساتھ جو اُتاری اللہ نے، ضد کی وجہ سے کفر کیا، ضد اِس بات پر کہ اتارے اللہ تعالیٰ اپنے فضل کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے'' اس بات کو یہ گوارا نہیں کرتے۔ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ: تو اِن کے اِنہی کردار اور اِنہی جذبات کی وجہ سے اِن کے اُوپر مسلسل غضب کی بارش ہوئی، یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوگئے، کفر بھی غضب کا باعث، اور پھر حسد بھی غضب کا باعث، یا پہلے تورات کی مخالفت سے بھی اللہ کے مغضوب ٹھہرے، اور آنے والی جانی پہچانی کتاب اِن کے سامنے آئی، تو اُس کا

انکار جو کیا تو اِس سے مزید غضب میں اضافہ ہوا، تو غضب بالائے غضب کے ساتھ یہ لوگ لوٹے: ''مستحق ہو گئے یہ غضب بالائے غضب کے، اور اِن کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

درحقیقت توراۃ پر بھی یہود کا ایمان نہیں ہے

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ نے اُتاری، اللہ کی اتاری ہوئی بات پر ایمان لے آؤ، تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں گے اسی چیز پر جو ہم پر اتاری گئی، اور وہ انکار کرتے ہیں اُس کے علاوہ ہر چیز کا۔'' وہ کہتے ہیں نہ بھئی! ہمارے اوپر جو کتاب اُتری ہوئی ہے ہمارے لیے تو وہی کافی ہے، ہمارا ایمان تو اُسی پر ہے، ہم تو اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کو مانیں گے، اور جو کتاب ہم پر نازل کی گئی تھی ہم تو اُسی کو ہی مانیں گے، اور اس کے علاوہ ہم اور کسی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یہ خود اُن کے حسد کا اظہار ہے۔ وَهُوَ الْحَقُّ: حالانکہ جو چیز آئی وہ حق ہے، واقع کے مطابق ہے، حق اور واقع کے مطابق ہونا خود تقاضا کرتا ہے کہ اِس کو تسلیم کیا جائے، اور پھر وہ جو بات آئی وہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ جو کتاب ان کے پاس ہے یہ اُس کی مصداق ہے، اُس کو سچا قرار دیتی ہے، یہ بات بھی تقاضا کرتی ہے کہ اِس کتاب کو تسلیم کیا جائے، کیونکہ اس کتاب کو تسلیم کریں گے تو اِن کی تورات سچی ثابت ہوتی ہے، ورنہ اِن کی تورات سچی ثابت نہیں ہوتی۔ یہ تو مقتضی ہیں کہ جو اللہ نے اُتارا اُس کو یہ مانیں، لیکن اس چیز کو وہ تسلیم نہیں کرتے، اِس حق کو چھوڑے بیٹھے ہیں، اور جو کتاب اِن کی کتاب کی مصدق ہے اُس کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اور کہتے ہیں کہ بس ہمارا تو تورات پر ایمان ہے۔

اب اگلی بات کا انداز سمجھ لیجئے.....! گفتگو جب ہوا کرتی ہے تو دو پہلو ہوتے ہیں کہ جب یہ کتاب حق ہے، اور جو تمہارے پاس کتاب ہے جب یہ اُسی کا مصداق ہے پھر تم اس کو کیوں نہیں مانتے؟ یہ تو ایک پہلو ہو گیا۔ پھر تم جو کہتے ہو کہ ہمارا تورات پر ایمان ہے، تو ہم بتائیں تمہارے ایمان کی کیا شان ہے؟ یہ تم نے محض ضد کے طور پر دعویٰ کر رکھا ہے کہ ہمارا تورات پر ایمان ہے، تمہارے ایمان کا حال ہم تمہیں بتاتے ہیں، کہ اگر تم تورات پر اتنے ہی پکے ہو تو کم از کم جو انبیاء اِس تورات کے مبلغ تھے اُن کو تو بدبختو! قتل نہ کرتے، جب اُن انبیاء علیہم السلام کو بھی تم نے قتل کر دیا تو تمہارا کیا ایمان ہے تورات پر؟۔ اگر تم اِسی بات پر ڈٹے ہوئے ہو کہ تمہارا تورات پر ایمان ہے اور تم بڑے سچے پکے مؤمن ہو تو اِس سے قبل جو تورات کے مبلغ آئے تھے تم نے اُن کو قتل کیوں کر دیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم خواہشات کے متبع ہو، تورات وغیرہ پر بھی تمہارا کوئی ایمان نہیں ہے۔ اور آج تم اِس تورات کے اوپر اتنے ڈٹے ہوئے ہو کہ اِس کے مقابلے میں اللہ کی کتاب کی پروا کرنے کے لئے تیار نہیں، اور وہ حال معلوم نہیں؟ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھوڑا سا غائب ہوئے تھے تو پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا، تمہارے ایمان کی یہی شان ہے؟ کہ ذرا نبی آنکھوں سے دور ہوا اور تم بچھڑے کی پوجا کرنے لگ گئے۔ ظالمو! تمہیں خیال نہیں آیا کہ کس طرح سے تم یہ باتیں کرتے ہو، اور پھر کہتے ہو کہ ہم مؤمن ہیں، اگر تم مؤمن ہو تو یہ کردار ہے تمہارا؟ یعنی یہ اُن کو اُن کا حال بتایا جا رہا ہے۔

اور پھر کہا اگر تم دعویٰ ایمان میں سچے ہو تو واقعی یہ ایمان تمہیں بڑی بری باتیں سکھاتا ہے، اِس کا کیا مطلب؟ کہ یہ بری

باتیں جوتم کرتے ہو یہ علامت ہے اِس بات کی کہ تمہارے دل میں ایمان ہے ہی نہیں، اگر واقعی ایمان ہے جس طرح سے تم کہتے ہوتو تمہارا ایمان بڑی بُری باتیں سکھاتا ہے، یہ اُن کے سامنے آئینہ رکھ کر اُن کے اپنے ایمان کی حالت اُن کو دکھائی جارہی ہے، کہ جس پر تم آج ڈٹے ہوا ور آنے والے پیغمبر کو مانتے نہیں، اترنے والی والی کتاب کو نہیں مانتے، یہ حال ہے تمہارے اُس ایمان کا۔ تو قُلْ کے بعد یہی الزامات ہیں جو ان کو دیے جارہے ہیں، ''آپ کہہ دیجئے! کیوں قتل کرتے تھے تم اللہ کے انبیاء کو'' مِنْ قَبْلُ: جو اس کتاب سے پہلے آئے، وہی تورات کے حامل تھے، تورات کے مبلغ تھے، ''اگر تم مؤمن ہو'' یعنی اگر تمہارا اس کتاب پر ایمان ہے تو کم از کم اس کتاب کے حاملین انبیاء ﷺ کو تو تم قبول کرتے، اُن کا انکار کر کے اور تکذیب کر کے ان کو قتل کیوں کیا؟۔ اور موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس واضح معجزے لے کر آئے تھے، پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد، اور تم بالکل صریح ظلم ڈھانے والے تھے۔ ''اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا'' یعنی یہ تورات جس پر آپ آج جمے ہوئے ہو اِس کے بھی تم منکر ہوئے بیٹھے تھے، پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا کر کے منوایا تھا کہ اِس کو مانو، اور اُس وقت مان لیا تھا، اُس کے بعد پھر پھر گئے تھے، اور آج کہتے ہو کہ ہم اللہ کی کتاب کو تسلیم نہیں کریں گے، اِس تورات پر ہی ہم پکے ہیں۔ ''جب ہم نے تمہارا میثاق لیا اور تم پر طور کو اٹھایا، اور ہم نے کہا کہ پکڑو قوت کے ساتھ اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے، اور سنو'' یعنی اللہ کے احکام کو سنو، ''تم نے کہا کہ سن لیا''، زبان سے تو کہا کہ سن لیا، لیکن حال تمہارا اُس وقت بھی یہی تھا، حال کے درجے میں تم کہہ رہے تھے کہ ''مانیں گے نہیں''۔ قال اور حال میں فرق ہوتا ہے، جیسے ایک لڑکے کو سامنے بٹھا کر میں ایک بات کہتا ہوں، کہ بھئی! اس طرح سے کرنا ہے، وہ زبان سے تو کہے گا اچھا جی، لیکن اُس کی آنکھیں اور اس کی ہیئت بتاتی ہے کہ یہاں اچھا جی کہہ رہا ہے، باہر نکل کے کرے گا نہیں، پتہ چل جایا کرتا ہے، جس وقت حال سامنے ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اِس کی زبان اِس کے دل کے مطابق نہیں ہے، اس کا کرنے کا ارادہ نہیں ہے، کہتے ہیں کہ بھئی! زبان سے تو تم سَمِعْنَا کہہ رہے ہو، لیکن تمہارا حال بتارہا ہے عَصَیْنَا، کہ تم نے ماننا تو ہے نہیں۔ اسی طرح سے تم نے اُس وقت سَمِعْنَا کہہ ہی دیا کہ ہاں جی! ہم سن رہے ہیں، لیکن تمہارا حال اِس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ تم سَمِعْنَا جو کہہ رہے تھے یہ اصل کے اعتبار سے عَصَیْنَا تھا کہ ہم نہیں مانیں گے، تو عَصَیْنَا دلالتِ حال ہے (خازن و آلوسی وغیرہ)۔ تو تم اتنے ڈھیٹ اور اتنے بے غیرت ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اتنی سختیاں دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنے دلائل دیکھنے کے بعد بھی تم نہیں مانتے، اور آج بڑے پکے مؤمن بنے بیٹھے ہو، کہ ہمارا تو جی! بس تورات پر ایمان ہے، ہم تو کچھ اور کرنے کے لئے تیار نہیں، ''کہا انہوں نے کہ سن لیا اور ہم نے نہ مانا، اور پلا دیے گئے وہ اپنے دلوں میں بچھڑے کی محبت، اُن کے کفر کے سبب سے'' یہی کافرانہ جذبات تھے جس کی وجہ سے بچھڑے کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ہے تمہارا حال۔

''تو آپ کہہ دیجئے کہ بہت بُری چیز ہے وہ جس کا حکم دیتا ہے تمہیں تمہارا ایمان اگر تم دعوائے ایمان میں سچے ہو'' یہ جو کہتے ہو کہ ہمارا اپنی کتاب پر ایمان ہے، اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو تمہارا ایمان تمہیں بڑی بُری حرکتیں سکھاتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ ایمان تو بُری حرکتیں سکھاتا نہیں، تو یہ بُری حرکتیں کرنا خود اِس بات کی علامت ہے کہ تم دل میں ایمان سے خالی ہو، تمہارے دلوں میں ایمان نہیں ہے۔ الزام دینے کے ساتھ دل کی کیفیت کی نفی پر دلیل قائم کی جاتی ہے، ایک شخص آپ کے ساتھ محبت کا دعویٰ

کرتا ہے، کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے اور بڑی پرانی محبت ہے، ہم کہتے ہیں ہاں جی! بڑی محبت ہے، فلاں وقت پانچ روپے کی ضرورت پیش آئی تھی، پتہ ہے؟ توڑ کے جواب دے دیا تھا، اور فلاں وقت میرے ساتھ فلاں شخص نے دشمنی کی تھی، یاد ہے؟ تو اُس کی حمایت کر رہا تھا، بڑی سچی محبت ہے تجھے میرے ساتھ۔ اب عنوان تو یہی ہوگا کہ ”بڑی سچی محبت ہے“، لیکن الزام دے کر ثابت کیا کیا جائے گا؟ کہ تیری باتیں صرف باتیں ہی باتیں ہیں، باقی تیرے دل میں محبت کوئی نہیں، اگر محبت ہوتی تو ایسی حرکتیں کیوں کرتے؟ تو یہ اندازِ گفتگو اسی قسم کا ہے، کہ تم کہتے ہو کہ ہمارا تورات پر ایمان ہے، تورات پر ایمان ہے تو بچھڑا پوجنا تھا؟ اور تم اتنے پکے ہو موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے طریقے پر چلنے والے نبیوں کو قتل کیوں کر دیا؟ اور یہی تورات جس پر آج ڈٹے بیٹھے ہو، کل کو ڈنڈے دکھا دکھا کر تمہیں منوایا جا رہا تھا تو بھی تم نہیں مانتے تھے، اور آج اللہ کی کتاب کے مقابلے میں اِسی تورات پر ڈٹے بیٹھے ہو، اچھا ایمان ہے تمہارا، بڑی اچھی حرکتیں سکھاتا ہے تمہیں تمہارا ایمان۔ یہ اُن کو الزام دیا جا رہا ہے جس سے ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ تم ضدی ہو، ضد میں آ کر اس قسم کے دعوے کیے ہوئے ہو، ورنہ ایمان تمہارے دلوں میں کوئی نہیں۔

یہود ونصاریٰ جنتی ہونے کے دعوے کے باوجود آخرت کو ترجیح کیوں نہیں دیتے؟

پھر تمہارے یہ دعوے کہ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ (سورۂ مائدہ:۱۸)، لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً (سورۂ بقرہ:۸۰) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں بس جنتی اور اللہ کے محبوب تم ہی ہو، کوئی دوسرا ہے ہی نہیں، تمہارے یہ دعوے جن کے ساتھ تم عوام کو دھوکا دیے بیٹھے ہو کہ آخرت میں نجات انہی کو ہوگی جو کہ یہودی ہوگا، لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا (سورۂ بقرہ:۱۱۲) ہرگز جنت میں نہیں جائے گا مگر وہی جو یہودی ہو۔ نصاریٰ کہتے تھے اَوۡ نَصٰرٰی: کہ جو نصرانی ہو وہی جنت میں جائے گا، دوسرا کوئی نہیں جائے گا۔ اگر تم اتنے ہی قائل ہو اِس بات کے کہ تم اللہ کے محبوب ہو اور آخرت میں تمہارے لیے جنت ہے، تو پھر تمہاری اِس زندگی کے اندر آخرت کو ترجیح دینے کا نقشہ کیوں نہیں نظر آ رہا؟ تمہیں آخرت کا شوق ہونا چاہیے دنیا کی محبت نہیں ہونی چاہیے۔ دیکھو! مجھے آج پتہ چل جائے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بہت بڑی بڑی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، مجھے بالکل سزا نہیں ہوگی، جاتے ہی مجھے جنت مل جائے گی، اور میں بڑا اللہ کا مقبولِ بارگاہ ہوں، تو آج ہی شوق پیدا ہو جائے گا، کہ بھئی! اِس مصیبت بھری زندگی کا کیا فائدہ؟ پھر تو آخرت میں ہی چلنا چاہیے۔ تو اپنی حرکتوں سے، اپنی باتوں سے، اپنے چلنے پھرنے سے، ہر چیز سے آخرت کی محبت ٹپکے، اور ایسے معلوم ہو کہ جس طرح سے ہم یہاں تو مصیبت میں مبتلا ہیں، اصل شوق تو ہمیں آخرت کا ہے، اور اپنی زبان سے بھی یہ ظاہر کرو کہ اس دنیا میں کیا رکھا ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ آخرت کے نام سے تم بدکتے ہو، اور موت کے تصور سے تمہیں ڈر لگتا ہے، چونکہ پتہ ہے کہ ہم نے کیا کیا کفر اور کیا کیا لچریات کر رکھے ہیں، اور آخرت میں جا کر ڈنڈے پڑیں گے، اس لیے دنیا میں جینے کی اور دنیا اکھٹی کرنے کی تمہارے اندر بڑی ہوس ہے، تو یہ محبتِ دنیا اِس بات پر دال ہے کہ آخرت کے بارے میں تم جو کچھ اپنے متعلق کہتے رہتے ہو، یہ تمہارے نظریات صرف زبان زبان پر ہیں، حقیقت میں دل کے

اعتبار سے تم یہ نہیں سمجھتے کہ آخرت میں ہم مقبولِ بارگاہ ہیں، ورنہ تمہیں چاہیے کہ تم موت کی تمنا کرو اور آخرت کی زندگی کو دنیا کے مقابلے میں ترجیح دو۔

یہود میں زندگی کی حرص مشرکین سے بھی زیادہ ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے پیش گوئی کر دی کہ ہرگز کبھی بھی یہ موت کی تمنا نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کو اپنے کرتوت معلوم ہیں کہ ہم نے کیا کچھ کیا ہوا ہے، یہ تو زندگی کے اتنے حریص ہیں کہ مشرک بھی اتنے حریص نہیں، کیونکہ مشرکوں کو تو اتنا خیال ہے کہ مریں گے اور مٹی ہو جائیں گے، اس کے بعد نہ عذاب کا ڈر ہے نہ ثواب کی توقع ہے، اس لیے اگر وہ اس دنیا کی زندگی کو لمبا چاہیں تو کسی درجے میں کوئی بات بھی ہے، کہ اُن کے نزدیک تو دنیا ہی دنیا ہے، یہاں لذت اٹھالو، جو چاہو کرلو، آخرت کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں، اور اُن کو عذاب کا ڈر بھی کوئی نہیں۔ اور یہ تو آخرت کے قائل ہیں، اور آخرت کے عذاب کا تصور ان کے سامنے ہے، جس کی وجہ سے مشرکوں کے مقابلے میں بھی زندگی کی تمنا اِن کے ہاں زیادہ ہے۔

آگے اُن کی تمنا ذکر کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے، کہ کرلیں، کیا ہوتا ہے، ہزار سال بھی عمر مل جائے گی، آخر جانا کہاں ہے؟ پانی نے آخر اِنہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے، اگر ہزار سال بھی زندہ رہو گے تو ہزار سال زندہ رہنے سے کوئی عذاب سے تو نہیں بچ جاؤ گے، یہ اُسی محاورے کے مطابق بات ہے کہ کتنی دیر زندہ رہ لو، آخر آنا تو اِدھر ہی ہے، جس طرح سے ہمارا محاورہ ہے کہ ”پانی نے آخر انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے“ جاؤ گے کدھر؟ تو ہزار سال زندہ رہنے سے بھی تم عذاب سے نہیں بچو گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ
آپ کہہ دیجئے جو کوئی دشمن ہے جبریل کا پس بیشک اتاری ہے وہ کتاب جبریل نے آپ کے دل پر اللہ کے حکم کے ساتھ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى
اس حال میں کہ وہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے ہے، اور راہنمائی کرنے والی ہے اور بشارت دینے والی ہے
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ
ایمان لانے والوں کو ﴿۹۷﴾ جو کوئی شخص دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا، اور جبریل کا اور میکائیل کا، پس بیشک اللہ تعالیٰ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍۚ وَ مَا یَكْفُرُ بِهَاۤ

ایسے کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۸﴾ البتہ تحقیق اتارا ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیوں کو، اور نہیں انکار کرتے ان نشانیوں کا

اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْؕ بَلْ

مگر فاسق لوگ ﴿۹۹﴾ کیا جب کبھی بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو اس عہد کو پھینک دیتا ہے ان میں سے ایک گروہ؟ بلکہ

اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

ان میں سے اکثر اس عہد پر ایمان ہی نہیں رکھتے ﴿۱۰۰﴾ اور جب آ گیا اُن کے پاس رسول اللہ کی جانب سے جو مصداق بننے والا ہے

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ

اس چیز کا جو ان کے پاس ہے، تو پھینک دیا اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ؗ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ

اپنی پشتوں کے پیچھے، گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ﴿۱۰۱﴾ اور پیچھے لگ گئے اس چیز کے جس کو پڑھتے تھے شیاطین

عَلٰى مُلْكِ سُلَیْمٰنَۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا

سلیمان کی سلطنت (کے زمانے) میں، سلیمان نے کفر نہیں کیا، لیکن شیطانوں نے کفر کیا،

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ

سکھاتے تھے وہ لوگوں کو جادو، اور (پیچھے لگ گئے یہ) اس چیز کے جو اتاری گئی دو فرشتوں پر بابل شہر میں یعنی ہاروت

وَ مَارُوْتَؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

اور ماروت پر، وہ دونوں فرشتے نہیں سکھاتے تھے کسی کو جب تک نہ کہہ دیتے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم فتنہ ہیں

فَلَا تَكْفُرْؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖؕ

پس تو کافر نہ بن، پس سیکھتے تھے یہ یہودی ان دونوں سے ایسی چیز جس کے ذریعے جدائی ڈال دیتے تھے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان

وَ مَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِؕ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّ

اور نہیں تھے یہ نقصان پہنچانے والے اس کے ذریعے سے کسی کو مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ، اور سیکھتے تھے وہ چیز جو ان کو نقصان دیتی ہے

هُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ

اور ان کو نفع نہیں دیتی، البتہ تحقیق ان کو علم ہے کہ جو شخص جادو کو اختیار کرے گا اس کے لئے آخرت میں کوئی

خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ

حصہ نہیں، البتہ بری چیز ہے وہ جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ جانتے ⑩۲ اور اگر یہ

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳ ع

لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو بدلہ اللہ کی جانب سے بہتر ہوتا، کاش کہ ان کو علم ہوتا ⑩۳

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ: آپ کہہ دیجئے جو کوئی دشمن ہے جبریل کا، جبریل اور جبرائیل ایک ہی چیز ہے، فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ: پس بیشک اُس جبریل نے اُتارا ہے یہ قرآن (ہٗ ضمیر قرآن یا کتاب کی طرف، کتاب چونکہ عربی میں مذکر ہے اس لیے مذکر کی ضمیر لوٹ سکتی ہے، اور لفظِ کتاب اردو میں مؤنث ہے) بیشک اتاری وہ کتاب جبریل نے آپ کے دل پر، بِاِذْنِ اللّٰهِ: اللہ کے حکم کے ساتھ۔ ''جو کوئی دشمن ہے جبریل کا'' اِس کے بعد جزاء محذوف ہے جس کے اُوپر اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں، جس طرح سے آپ نے ترجمہ سنا اِس طرح سے فقرہ پورا نہیں ہوتا، دونوں باتوں میں جوڑ نہیں ہے کہ ''جو کوئی دشمن ہے جبریل کا پس بیشک اُس جبریل نے اتارا اِس کتاب کو تیرے قلب پر''، بلکہ درمیان میں جزاء محذوف ہے، اگلے الفاظ اُس پر دال ہیں۔ اردو میں ادا کرتے وقت یوں بھی ادا کیا گیا ہے کہ ''جو کوئی دشمن ہے جبریل کا تو وہ جانے''، ''جو کوئی جبریل کا دشمن ہے تو اُس کو غصے اور غیظ کے ساتھ مرجانا چاہیے، بیشک اُس جبریل نے یہ قرآن تیرے قلب پر اتارا ہے''، ''جو کوئی دشمن ہے جبریل کا تو دشمن رہے، لیکن اُس کی عداوت کو قرآنِ کریم کی تکذیب سے کوئی تعلق نہیں، بیشک اُس جبریل نے اتارا ہے یہ قرآن تیرے قلب پر اللہ کے حکم کے ساتھ'' اِس طرح سے بات پوری ہوجائے گی۔ عربی میں الفاظ آپ کے سامنے جلالین میں اور دوسری کتابوں میں یہ نکالیں جائیں گے کہ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَلْيَمُتْ غَيْظًا، (یا)، فَلَا مَسَّ لِعَدَاوَتِهٖ بِتَكْذِيْبِ الْقُرْاٰنِ، انہی الفاظ کا وہ ترجمہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے عرض کیا، جو کوئی شخص جبریل کا دشمن ہے تو وہ اپنے غصے میں مرتا رہے، جلتا رہے، بیشک اُس جبریل نے یہ قرآن تیرے قلب پر اللہ کے حکم کے ساتھ اُتارا ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: مُصَدِّقًا یہ حال واقع ہورہا ہے نَزَّلَهٗ کی ہٗ ضمیر سے، جو قرآنِ کریم یا کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اس حال میں کہ وہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اُس سے پہلے ہے، یہ لفظ آپ کے سامنے بار بار گزر گئے، تصدیق کرنے والی ہے، سچا بتلانے والی ہے، مصداق بننے والی ہے، اور مَا بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد تورات و انجیل ہے، اُن کتابوں کے اندر جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اُن کا یہ مصداق ہے، اور یہ کتاب آ کر اُن کی صداقت کو ظاہر کرتی

ہے، مفہوم اِس کا آپ کی خدمت میں پہلے کئی دفعہ عرض کیا جا چکا۔ ''اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اس سے پہلے ہے''، وَهُدًى: اس کا عطف مُصَدِّقًا پر ہے، هُدًى مصدر ہے بمعنی ہدایت، هَادِيًا کے معنی میں ہے، ''تصدیق کرنے والی ہے اور راہنمائی کرنے والی ہے''۔ بُشْرٰى: مُبَشِّرًا، اور بشارت دینے والی ہے ایمان والوں کو۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ: جو کوئی شخص دشمن ہو اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا، وَرُسُلِهٖ: اور اُس کے رسولوں کا، وَجِبْرِيْلَ: اور جبرائیل کا، وَمِيْكٰىلَ: اور میکائیل کا، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ: پس بیشک اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے، یہاں بھی فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ یہ مَنْ كَانَ کے جواب پر دال ہے، اب یہاں بات اس طرح سے ہوگی ''جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا، وہ کافر ہے، پس بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے'' بات یوں پوری ہو جائے گی، مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ فَهُوَ كَافِرٌ، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (آلوسی)، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ یہ دال بر جزاء ہے، اور جزاء نکل آئے گی فھو کافر (یا) فھو من الکافرین، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ، ایسا شخص کافروں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے شخص کا اللہ دشمن ہے، کیونکہ یہ شخص کافروں میں سے ہے، اور کافروں کا اللہ دشمن ہے، تو اس کا بھی اللہ دشمن ہوا۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ: البتہ تحقیق اتارا ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیوں کو، وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ: اور نہیں انکار کرتے اُن نشانیوں کا مگر فاسق لوگ۔ فاسق فِسق سے ہے، فسق کا معنی خروج عن الطاعۃ، فرمانبرداری سے نکل جانا۔ جو لوگ فرمانبرداری سے نکلے ہوئے ہیں، نافرمان قسم کے لوگ ہیں وہی اُن آیات کا انکار کرتے ہیں۔ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ: اَوَكُلَّمَا کے اُوپر جو واؤ ہے اس کا اگر معطوف علیہ نکالنا ہو تو یوں اُس کو ظاہر کیا جا سکتا ہے اَکَفَرُوا بالآیات وَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ (آلوسی) کیا یہ لوگ واضح آیات کا انکار کرتے ہیں؟ اور جب کبھی بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو اُس عہد کو پھینک دیتا ہے ان میں سے ایک گروہ؟ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: بلکہ ان میں سے اکثر اُس عہد پر ایمان ہی نہیں رکھتے، مانتے ہی نہیں، یقین ہی نہیں کرتے کہ ہم نے کوئی عہد کیا ہوا ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ: اور جب آ گیا اُن کے پاس رسول اللہ کی جانب سے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ: جو مصداق بننے والا ہے اُس چیز کا جو ان کے پاس ہے، نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اُن میں سے ایک فریق نے پھینک دیا كِتٰبَ اللّٰهِ: اللہ کی کتاب کو، وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ: اپنی پشتوں کے پیچھے، كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ پشتوں کے پیچھے پھینک دینا اعراض اور لاپروائی سے کنایہ ہوتا ہے، جس طرح سے آپ کہتے ہیں کہ میری بات تو آپ نے پس پشت ہی ڈال دی، مجھے تو آپ نے پس پشت ہی ڈال دیا، کیونکہ جس کی طرف توجہ ہوتی ہے وہ سامنے ہوتا ہے، اور جس کو پس پشت ڈال دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُدھر توجہ نہیں رہی، اُدھر سے منہ موڑ لیا۔ تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پشتوں کے پیچھے ڈال دیا، پس پشت ڈال دیا، گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ مفعول ہے نَبَذَ کا۔ نَبَذَ فَرِيْقٌ كِتٰبَ اللّٰهِ: ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پھینک دیا، ڈال دیا اپنی پشتوں کے پیچھے۔ وَاتَّبَعُوْا: اللہ کی کتاب کو تو پشتوں کے پیچھے ڈال دیا، اور پیچھے لگ گئے مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ: اُس چیز کے جس کو پڑھتے تھے شیاطین، شیاطین شیطان کی جمع، عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ: ملک کا معنی حکومت، سلطنت۔ عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ: سلیمان علیہ السلام کی مملکت کے زمانے میں، سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانے میں، علیہ السلام۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین جو کچھ پڑھا کرتے تھے اُس کے پیچھے لگ گئے۔ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ: سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا: لیکن شیطانوں نے کفر کیا، يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: تعلیم دیتے تھے لوگوں کو جادو کی، سکھاتے تھے لوگوں کو جادو۔ سحر کا لفظ تصرف عجیب کے لئے بولا جاتا ہے، یعنی ایسی چیز جس کے عجیب وغریب اثرات ظاہر ہوں اُس کو سحر کہہ دیتے ہیں۔ کوئی مقرر اچھی تقریر کرتا ہے، جس کی تقریر سے مجمع بہت متاثر ہو جائے اور جو کچھ وہ سمجھانا چاہتا ہے مجمع کو سمجھالے، جدھر رُخ موڑنا چاہتا ہے مجمع کا رُخ موڑ دے، اس کو کہتے ہیں کہ یہ مقرر بڑا جادو بیان ہے، اِس کی تقریر کیا ہے جادو ہے۔ تو عجیب وغریب اثرات جو ظاہر ہوا کرتے ہیں، جن کے اسباب کچھ مخفی سے ہوں اُن کو سحر سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ ''سکھاتے تھے وہ شیاطین لوگوں کو جادو'' ۔وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ: یہ وَاتَّبَعُوْا کا مفعول ہے، اور مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر اس کا عطف ہے۔ پیچھے لگ گئے یہ اس چیز کے جس کو شیاطین پڑھتے تھے اور اس چیز کے جو اُتاری گئی دو فرشتوں پر بابل شہر میں، بابل شہر کا نام ہے، هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ یہ الْمَلَكَيْنِ کا عطف بیان ہے، فرشتے کون تھے؟ ہاروت اور ماروت، یہ اُن کے نام ہیں، جیسے نحو کی کتابوں میں آپ پڑھا کرتے ہیں اَقْسَمَ اَبُوْ حَفْصٍ عُمَرُ عمر ابوحفص کا بیان ہے، اسی طرح یہاں بھی ہاروت ماروت ملکین کا بیان ہے، ''جو اُتارا گیا دو فرشتوں پر بابل شہر میں یعنی ہاروت اور ماروت پر''، وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ: اور وہ ہاروت اور ماروت، وہ دونوں فرشتے نہیں سکھاتے تھے کسی کو، حَتّٰى يَقُوْلَآ: حتی کے بعد جو مضارع آتا ہے تو کئی دفعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ محاورۃً اُس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، نہیں سکھاتے تھے کسی کو جب تک نہ کہہ دیتے وہ، اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم فتنہ ہیں، ہم آزمائش کا ذریعہ ہیں، فَلَا تَكْفُرْ: پس تُو کافر نہ بن، تُو کفر نہ کر، جب تک آنے والے کو وہ یہ بات نہیں کہہ دیتے تھے کہ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ اُس وقت تک اس کو کچھ سکھاتے نہیں تھے، پہلے اُس کو یہ بتاتے تھے کہ ہم فتنہ ہیں اور تُو کافر نہ بن جانا، پھر اگر کوئی اصرار کرتا کہ ہمیں سکھا دو تو وہ سکھا دیتے تھے۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا: پس سیکھتے تھے یہ یہودی اُن دونوں سے، مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ: ایسا جادو، ایسی چیز جس کے ذریعے سے جدائی ڈال دیتے تھے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان، خاوند بیوی کو آپس میں لڑا دیتے، اِن کے درمیان میں جدائیاں ڈال دیتے، اس قسم کا جادو اُن فرشتوں سے سیکھتے تھے۔ يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ: ہ ضمیر مَا کی طرف لوٹ گئی، سیکھتے تھے اُن دونوں سے وہ چیز کہ فرق ڈال دیتے تھے، تفریق ڈال دیتے تھے اُس چیز کے ذریعے سے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ: بِهٖ کی ضمیر مَا يَتَعَلَّمُوْنَ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور نہیں تھے یہ یہودی نقصان پہنچانے والے اس جادو کے ذریعے سے، اس سیکھی ہوئی بات کے ذریعے سے کسی کو مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ، جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جادو میں تاثیر بھی اللہ کی دی ہوئی تھی، یہ نہیں کہ جادو کے اندر تاثیر ذاتی ہے کہ اللہ نہ بھی چاہے تو اثر دکھا دے، ایسی بات نہیں ہے، اُس کی تاثیر بھی اللہ کے حکم کے تابع ہے، لہٰذا جہاں اللہ کی اجازت ہوتی ہے وہاں اثر ظاہر ہوتا ہے، جہاں اللہ کی اجازت نہیں ہوتی وہاں اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ: اور سیکھتے تھے یہ یہودی، مَا يَضُرُّهُمْ: وہ چیز جو اُن کو نقصان دیتی ہے، وَلَا يَنْفَعُهُمْ: اور اُن کو نفع نہیں دیتی۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا: البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا ہے، اِن کو علم ہے، لَمَنِ اشْتَرٰىهُ کہ جو شخص اِس جادو کو اختیار کرے گا، مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ:

اُس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، خلاق حصے کو کہتے ہیں، وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ: البتہ بُری چیز ہے وہ جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپادیا، جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ جانتے۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا کے اندر اُن کے لئے علم کو ثابت کیا ہے، اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ سے معلوم ایسے ہوتا ہے جیسے اُن کو علم ہی نہیں، کیونکہ اس کا معنی ہے کاش کہ یہ جانتے، کاش کہ اِن کو علم ہوتا۔ تو یہاں وہی آپ کا علم معانی والا قاعدہ چلتا ہے، کہ جس علم کے اوپر اثر مرتب نہ ہو اُس کو جہل کے قائم مقام اُتار لیا جاتا ہے، جیسے ایک شخص اپنے باپ کی شان میں گستاخی کر رہا ہو تو سمجھانے والا اُسے کہتا ہے کہ تجھے پتہ نہیں یہ تیرا باپ ہے، اگر تجھے پتہ ہوتا کہ یہ تیرا باپ ہے تو تو ایسے نہ کرتا، حالانکہ باپ ہونے کا علم تو اُس کو ہے، لیکن جب باپ ہونے کے متعلق علم کے بعد اُس کے اوپر وہ آثار مرتب نہیں ہوئے تو یونہی کہا جاتا ہے گویا کہ اس کو پتہ ہی نہیں کہ یہ اس کا باپ ہے۔ تو اسی طرح سے یہاں ہے، کہ وہ جانتے تو ہیں کہ یہ کُفر ہے، اور اس کے اختیار کرنے سے آخرت برباد ہو جائے گی، آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، لیکن اس پر چونکہ عمل نہیں تھا، جاننے کے باوجود وہ اس جادو کو اختیار کرتے تھے اور اپنی آخرت کو برباد کرتے تھے، تو یوں سمجھو کہ یہ جاہل ہیں۔ حضرت شیخ سعدیؒ کا جو قول ہے: ''علمے کہ راہ بحق ننماید جہالت است!'' (غزلیات سعدی، غزل ۵۵) اس کا بھی یہی معنی ہے، کہ جو علم حق کی طرف راستہ نہیں دکھاتا وہ جہالت کے ہی قائم مقام ہے۔ گلستان (باب ۸ کی ابتدا) میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ:

علم چندانکہ بیشتر خوانی چوں عمل در تو نیست نادانی

علم جتنا بھی پڑھ لو، اگر اُس پر عمل نہیں ہے تو تم نادان کے نادان ہو۔

نہ محقق بود نہ دانشمند چارپائے برو کتابے چند

اگر گدھے کے اُوپر چند کتابیں لاد دی جائیں تو نہ وہ محقق بنتا ہے نہ دانشمند بنتا ہے، چارپائے کے اُوپر اگر چند کتابیں رکھ دی جائیں تو وہ محقق اور دانشمند نہیں ہو جایا کرتا۔

آں تہی مغز را چہ علم وخبر کہ برو ہیزم است یا دفتر

اس بے عقل کو تو اتنا پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے اُوپر ایندھن لدا ہوا ہے یا کتابیں لدی ہوئی ہیں۔

اسی طرح اگر کتابوں کا بنڈل تو سر پہ اٹھایا ہوا ہے، پڑھتے ہیں، علم سب کچھ ہے، لیکن اس کے مطابق عمل نہیں، تو جہالت ہی جہالت ہے ''علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است!'' تو یہاں اُسی محاورے کے مطابق وَلَقَدْ عَلِمُوْا میں اگرچہ ان کے لئے علم کا اثبات کیا گیا ہے، لیکن لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ میں اسی علم کی نفی کی گئی ہے۔ اِن کو پتہ ہے کہ جو شخص اِس جادو کو اختیار کرے اُس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، بری ہے وہ چیز جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپادیا، کاش کہ اِن کو پتہ ہوتا۔ اب اُسی علم کی یہاں نفی ہوگئی۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا: اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے، وَاتَّقَوْا: اور تقویٰ اختیار کرتے، لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ: مثوبۃ ثواب سے لیا گیا ہے، بدلے میں ملی ہوئی چیز کو ثواب کہتے ہیں، تو بدلہ اللہ کی جانب سے بہتر ہوتا، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: کاش کہ اِن کو علم ہوتا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

شانِ نزول

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ: اِس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے، یہود جو سرورِ کائنات ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ انہوں نے مخالفت کا طریقہ اپنالیا، تو مخالفت کے لئے وہ مختلف بہانے بناتے رہتے تھے، اُن میں سے بعض لوگوں نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کون لے کر آتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل لے کر آتے ہیں، وہ کہنے لگے کہ جبریل کے ساتھ تو ہماری دشمنی ہے، کیونکہ ہمارے اُوپر یعنی ہماری قوم پر اور ہمارے بڑوں پر جتنے بڑے بڑے واقعات عذاب کے آئے ہیں اُن سب میں واسطہ یہی بنا ہے، اس لیے ہم اِس کی لائی ہوئی بات کو تو ماننے کے لئے تیار نہیں، البتہ اگر میکائیل لے کر آتا جو کہ رحمت لاتا ہے، بارش لاتا ہے، رزق اُس کی وساطت سے اُترتا ہے، تو پھر ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے، جبریل کی لائی ہوئی بات کو ہم نہیں مانتے، ہماری اُس کے ساتھ دشمنی ہے۔ گویا کہ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کہ عادت تو اپنی بُری ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے بہانے انسان تلاش کر ہی لیتا ہے، ماننا تو اس لیے نہیں تھا کہ اُن کی ریاست میں فرق آتا تھا، سرداری جاتی تھی، اُن کے مالی مفاد کو نقصان پہنچتا تھا، لیکن نہ ماننے کے لئے یوں تو وہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہم اس لیے نہیں مانتے کہ ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے، ہماری سرداری چلی جائے گی، قیادت ختم ہوجائے گی، کیونکہ یہ بات دینداری کے خلاف ہے، ہر سننے والا آدمی اس بات کو بُرا محسوس کرے گا کہ دیکھو! اپنے مالی مفاد کی خاطر یہ حق کو چھوڑے ہوئے ہے، تو سوچا کہ کوئی اور بہانہ تلاش کرو۔ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا دشمن ہے، ہم اپنے دشمن کی لائی ہوئی بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اگر میکائیل وحی لائے تو پھر ہم اس بات کو قبول کر سکتے ہیں، اس طرح سے انہوں نے عداوتِ جبریل کو اِس قرآنِ کریم کے چھوڑنے کا اور اِس کی تکذیب کا بہانہ بنایا۔

قرآن اللہ کی کتاب ہے، جبریل تو محض سفیر ہیں

اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح فرمادیا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کسی کو جبریل کے ساتھ دشمنی ہے تو اُس دشمنی کا یہ اثر نہیں ہونا چاہیے کہ اُس کی لائی ہوئی بات کو جھٹلا دیا جائے اور اُس کو قبول نہ کیا جائے۔ دشمنی تمہیں جبریل کے ساتھ ہوگی، لیکن یہ کتاب تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آئی ہے، اور جبریل تو سفیرِ محض ہے، اگر سفیر کے ساتھ تمہیں محبت نہیں، پیغام لانے والے سے تمہاری دشمنی ہے، تو اُس کا پیغام پر کیا اثر ہے، پیغام کی ذاتی حیثیت دیکھو، کیا ہے؟ بھیجنے والا کون ہے؟ اور یہ کیسا پیغام ہے؟ بھیجنے والا اللہ ہے، اللہ کی اجازت کے ساتھ وہ آیا، اور مصدق ہے لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ، تمہاری اپنی کتاب کا یہ مصدق ہے، اس میں ہدایت اور راہنمائی ہے، اس میں بشارت ہے یہ مبشر ہے، تو جو اللہ کی کتاب کی حیثیت ہوا کرتی ہے کہ وہ کتبِ سابقہ کے لئے مصدق بنے، اچھی باتوں کے لئے راہنمائی کا کام دے، اور اچھے انجام کی خبر دے، وہ صفتیں ساری اِس کے اندر پائی جاتی ہیں، اس سے تمہیں کیا بحث کہ اللہ نے

جبریل کے ہاتھ یہ پیغام بھیج دیا یا کسی اور کے ہاتھ بھیج دیا، تو تمہاری اِس عداوت کو اس کے جھٹلانے سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے تو یہ تفہیم کی بات ہے کہ اِس کو بہانہ نہ بناؤ، یہ تمہارا بہانہ ٹھیک نہیں، سفیر کی ذاتی حیثیت کوئی نہیں ہوتی، چاہے وہ تمہارا دوست ہو چاہے وہ تمہارا دشمن ہو، تم نے دیکھنا یہ ہے کہ پیغام بھیجا کس نے ہے اور پیغام آیا کیا ہے؟ تو بھیجنے والا اللہ ہے، اور پیغام کی حیثیت یہ ہے کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ، اور یہ ہدیٰ ہے اور بشریٰ ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم لانے والے کے ساتھ محبت نہ ہونے کو بہانہ بنالو کہ ہم اِس پیغام کو قبول نہیں کرتے، یہ حماقت ہے، یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے، یہ بات عقل کے مطابق نہیں ہے کہ اس کو بہانہ بنایا جائے۔ اور اگر تمہیں عداوت ہے ہی تو تم اُس عداوت میں جلتے بھنتے رہو، وہ تو اللہ کا سفیر ہے، اللہ کی اجازت کے ساتھ لاتا ہے اور لاتا رہے گا۔ پہلے الفاظ کا مفہوم تو یہ ہوا۔

اللہ سے محبت اور جبریل علیہ السلام سے عداوت یہ دو باتیں جمع نہیں ہوسکتی

اور آگے اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قاعدہ اور ضابطہ واضح کر دیا، کہ تم جو کہتے ہو کہ میکائیل کے ساتھ ہماری دوستی ہے، یا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے دعوے کرتے ہو، اور پھر ساتھ اللہ تعالیٰ کے سفیر سے دشمنی بھی رکھتے ہو، یہ دو باتیں نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سب چیزیں برابر ہیں، کسی شخص کو جبریل سے دشمنی ہو، اُس کے فرشتوں سے ہو، رسولوں سے ہو، میکائیل سے ہو، یا اللہ سے عداوت ہو، سب کا درجہ ایک ہی ہے، یعنی جبریل علیہ السلام سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، میکائیل علیہ السلام سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، رسول سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، فرشتوں سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، ایک کے ساتھ دشمنی اور دوسرے کے ساتھ دوستی کا دعویٰ یہ دو باتیں جمع نہیں ہوسکتیں، کیونکہ جبریل علیہ السلام ہمارا قاصد ہے ہمارا فرستادہ ہے، جو اِس سے دشمنی رکھے گا تو اُس کی دشمنی ہمارے ساتھ بھی ہے، اِن سب دشمنیوں کا درجہ اللہ کے نزدیک برابر ہے، جیسے انسان عداوتِ الٰہی سے کافر ہوتا ہے اسی طرح سے رسولوں کی عداوت سے کافر ہوتا ہے، اور اسی طرح سے فرشتوں کی عداوت سے کافر ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جبریل علیہ السلام کو اس لیے ذکر کر دیا کہ زیر بحث مسئلہ یہی تھا کہ اس کی عداوت سے بھی انسان ایسے ہی کافر ہوگا، اور میکائیل علیہ السلام کے ساتھ اگر کسی کی عداوت ہے تو اس کے ساتھ بھی ایسے ہی کافر ہوگا۔ تو عداوت کفر کا باعث ہے، چاہے جبریل علیہ السلام سے ہو، چاہے میکائیل علیہ السلام سے ہو، چاہے رسول سے ہو، چاہے دوسرے ملائکہ کے ساتھ ہو، چاہے براہِ راست اللہ کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ کے ساتھ عداوت رکھنا اللہ کے ساتھ عداوت ہے۔ اور اگر تم جبریل علیہ السلام سے عداوت کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ عداوت میرے ساتھ ہے، اور اس عداوت کے ساتھ تم کافر ہو گئے، اگر تمہیں عداوت اِن سے ہے تو اللہ کو بھی ایسے کافروں سے عداوت ہے، یعنی تم عداوتِ جبریل علیہ السلام کا نعرہ لگاؤ تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تمہارے ساتھ عداوت کا اعلان کرتا ہے۔ اِس میں ان کا دماغ صاف کر دیا کہ اللہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ اور اُس کے فرستادہ کیساتھ عداوت یہ دو باتیں جمع نہیں ہوسکتیں۔

اولیاء کا دُشمن اور سُود خور، دونوں سے اللہ کا اعلانِ جنگ ہے!

یہاں تو خصوصیت کے ساتھ جبریل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا ذکر ہے، اور اجمالاً ملائکہ اور رُسل کا ذکر آ گیا، لیکن حدیث

شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے اِس مسئلے کو مزید واضح کر کے بیان فرمایا: ''مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ''[1] یہ حدیثِ قدسی ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میں اُس کو لڑائی کا اعلان دیتا ہوں، میری طرف سے اُس کو اعلانِ جنگ ہے۔ شریعت میں دو ہی باتیں ایسی ہیں جن کے اُوپر صراحتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ آیا ہے، ایک کا ذکر صراحتاً قرآنِ کریم میں ہے اور ایک کا ذکر حدیثِ صحیح میں ہے، قرآنِ کریم میں تو سود خوروں کے متعلق ہے کہ اگر سود کھانے سے باز نہیں آؤ گے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان سن لو، سورۂ بقرہ کے آخر میں آئے گا۔ اور حدیث شریف میں عداوتِ اولیاء پر یہ اعلان ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اُس کو اعلانِ جنگ ہے۔

بُغضِ امامِ اعظم سلبِ ایمان کا سبب بنا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اعلانِ جنگ ہوجائے تو اُس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی دامت برکاتہم نے ایک واقعہ بیان فرمایا، جو کسی زمانے میں ''ترجمان'' میں چھپا تھا (یہ ابتدا، ابتدا کی بات ہے، پرانا ریکارڈ کسی کے پاس پڑا ہو تو اُس میں دیکھا بھی جاسکتا ہے)، اور وہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب ؒ جو جامعہ اشرفیہ کے بانی ہیں، اُن کی طرف سے نقل کرتے تھے، کہ مفتی محمد حسن صاحب ؒ مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، غزنوی خاندان لاہور میں ایک اہلِ حدیث خاندان ہے، جن میں سے ایک داؤد غزنوی بہت مشہور سیاسی لیڈر گزرے ہیں، جنہوں نے ہمیشہ ساری زندگی ہمارے اکابر کے ساتھ مل کر کام کیا ہے، جمعیت علماء ہند میں اور احرار میں کام کیا ہے۔ اِن کے والد تھے مولانا عبدالجبار غزنوی، یہ بہت معتدل قسم کا خاندان ہے، اور اہلِ حدیثوں میں سے یہ پیری مریدی کا کام بھی کرتے ہیں، متعصب نہیں ہیں ...... تو آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ یہ غیر مقلد جو اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں، اِن کو حضرت ابوحنیفہ ؓ کے ساتھ تو بہت ہی کِد اور ضد ہے، اور اُن سے بڑا بغض رکھتے ہیں، پھر ان کا زیادہ تر ٹکراؤ ہے ہی حنفیوں کے ساتھ، آپ تو اِس وقت دیکھتے ہیں کہ شیعہ سنی ٹکراؤ ہے، دیوبندی بریلوی ٹکراؤ ہے، اِس سے پہلے دور میں غیر مقلدوں کے ساتھ بھی حنفیوں کا بہت زبردست ٹکراؤ رہا ہے، اسی طرح جیسے اب اِن کے ساتھ ہے، مناظرہ بازی ہوتی تھی، رسالہ بازی ہوتی تھی، اسٹیجوں پر ایک دوسرے کے خلاف تقریریں ہوتی تھیں، اُس دور میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب ؒ بانی مدرسہ خیر المدارس حنفیوں کی طرف سے غیر مقلدوں کے مقابلے میں بڑے کامیاب مناظر تھے، کئی جگہ انہوں نے مناظرے کیے ہیں، سیّد انور شاہ صاحب ؒ جیسے لوگ اِن غیر مقلدوں کے مقابلے میں نکلے تھے، تو حنفیوں کا غیر مقلدوں کے ساتھ بڑا زبردست مقابلہ رہا ہے...... تو ایک نوجوان غیر مقلد مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کے پاس آیا، اور حضرت مفتی محمد حسن صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان کے بھی آپس میں تعلقات تھے، تو اس نے آکر اُس مجلس میں

---

(۱) صحیح البخاری، ج ۲ ص ۹۶۳، باب التواضع / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹۷ عن ابی ھریرۃ ؓ۔ باب ذکر اللہ فصل اول۔

بیٹھے ہوئے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ پر کچھ بدزبانی شروع کردی۔ جس طرح سے نوجوان ہوتے ہیں، جوش میں آکر نہیں دیکھتے کہ کیا بات منہ سے کہی ہے، کیا نہیں کہنی، بزرگوں کے بارے میں ایسے ہی الٹ پلٹ باتیں مارنی شروع کردیتے ہیں، تو اُس نے بھی حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی گستاخانہ لفظ استعمال کیے۔ کہتے ہیں کہ مولانا عبدالجبار صاحب نے اُس کو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ چلے جاؤ یہاں سے، مجھے تجھ سے بے ایمانی کی بُو آتی ہے۔ کچھ دن گزرے وہ شخص مرزائی ہوگیا، ایمان دے بیٹھا، مُرتد ہوگیا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب نے مولانا عبدالجبار صاحب سے پوچھا کہ آپ نے جو اس وقت کہا تھا کہ مجھے تجھ سے بے ایمانی کی بُو آتی ہے، یہ آپ کو کیسے معلوم ہوگیا؟ وہ فرمانے لگے کہ جس وقت وہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بدزبانی کررہا تھا تو فوراً میرے قلب پر وہ حدیث وارد ہوئی: ''مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ'' کہ جو میرے ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اُس کو اعلانِ جنگ ہے۔ اور میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت بڑا اللہ کا ولی مانتا ہوں، اور یہ شخص اُن کے ساتھ عداوت سے بھرا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی کے مقابلے میں لڑائی لڑتا ہے تو اُس کی قیمتی سے قیمتی چیز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی سے عداوت کرلے تو اُس کا ایمان ہی جائے گا۔[1] قیمتی سے قیمتی چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر ہے تو ایمان ہے، باقی! دنیا کوئی حقیقت نہیں رکھتی، سونا چاندی مال دولت ایمان کے مقابلے میں کیا چیز ہے؟ قرآنِ کریم میں کتنی آیتیں اس قسم کی ہیں کہ قیامت کے دن جن لوگوں کے پاس ایمان نہیں ہوگا، اگر زمین وآسمان کا درمیان اُن کو سونے سے بھر کردے دیا جائے تو وہ یہ دے کر بھی اپنی جان چھڑانا چاہیں گے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان کے ساتھ جو چیز حاصل ہوسکے گی وہ اتنے سونے سے حاصل نہیں ہوسکتی جس کے ساتھ زمین وآسمان کے مابین کو بھر دیا جائے۔ سینکڑوں ہزاروں کی بات نہیں ہے، بلکہ زمین وآسمان کا درمیان سونے سے بھر دیا جائے، اُس وقت وہ شخص اتنا سونا دے کر اپنے آپ کو چھڑانے پر آمادہ ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ''[2] اُن کی طرف سے یہ بات قبول نہیں کی جائے گی۔ تو اتنا سونا دینے سے جو چیز حاصل نہیں ہوسکتی وہ ایک کلمۂ ایمان کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، اس سے معلوم کرلیجئے کہ یہ کلمۂ ایمان آخرت میں جاکر کتنا قیمتی ہوگا اور اِس کی قیمت کتنی نمایاں ہوگی، کہ پہاڑوں کے پہاڑ سونا بھی ہو تو وہ کام نہیں آئیں گے جہاں یہ کلمۂ ایمان کام آئے گا۔ یہ جہالت اور حماقت ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر انسان ایمان دے بیٹھتا ہے، چونکہ ابھی اِس ایمان کی قیمت کے ظاہر ہونے کا وقت نہیں آیا، جب اس ایمان کی قیمت ظاہر ہوگی تو پھر آنکھیں کھلیں گی کہ ہم نے چند ٹکوں کی خاطر جو ایمان کو برباد کیا تھا تو کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ بہرحال وہ آیات بتاتی ہیں کہ ایمان کی قیمت کتنی ہے۔ تو دشمن ہمیشہ اپنے دشمن کی قیمتی چیز کو نقصان پہنچاتا ہے، مولانا غزنوی کہتے ہیں اُس وقت میرا دل اِدھر متوجہ ہوا کہ یہ شخص اپنا ایمان گنوا بیٹھے گا، چنانچہ بعد میں ایسے ہی نمایاں ہوگیا۔

---

(۱) دیکھئے: داؤد غزنوی ص ۱۹۱، ص ۳۸۴، مرتبہ سید ابوبکر غزنوی۔ نوٹ: اس کتاب میں واقعے کی نوعیت میں معمولی تغیر ہے، نفس واقعہ اسی طرح ہے۔

(۲) پارہ ۶ سورۃ مائدہ آیت ۳۶۔ پوری آیت یوں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ۔

نیک لوگوں سے عداوت، اللہ کے ساتھ عداوت کی علامت ہے

اس لیے یہ پہلو بہت احتیاط کے قابل ہے کہ جس شخص پر قبولیت کے آثار ہوں، اللہ تعالیٰ کا مقبول نظر آئے، نیکی اس کے اُوپر نمایاں ہو، تو اُس کے ساتھ نفرت کا تعلق رکھنا، اُس کے ساتھ عداوت کا تعلق رکھنا، دل کے اندر بغض اور عناد رکھنا، بسا اوقات انسان کو اِیمان سے محروم کردیتا ہے۔ کسی کے دل میں کیفیت کیا ہے؟ وہ اللہ کے علم میں ہے، ہم ظاہر کے مکلّف ہیں، جس شخص کو ظاہری طور پر دیکھیں گے، کہ یہ اللہ والا ہے، اللہ اللہ کرتا ہے، نیک ہے، اُس کے اوپر قبولیت کے آثار ہیں، تو ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی نسبت کی بناء پر اُس شخص سے محبت رکھنی چاہیے۔ اور اگر آپ کا قلب اُس کے ساتھ محبت نہیں کرتا تو کم از کم اُس کے ساتھ عداوت کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے، یہ عداوت نقصان پہنچاتی ہے۔ اس لیے اولیاءاللہ کا ادب، ان کا احترام، اُن کے ساتھ محبت اِس نسبت کے ساتھ کہ یہ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور اللہ اللہ کرنے والے ہیں، یہ حقیقت میں محبتِ الٰہیہ کی علامت ہے۔ اور اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ اوران نیک لوگوں کے ساتھ عداوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عداوت کی علامت ہے۔ حدیث شریف میں بھی یہ بات آگئی، اور قرآنِ کریم کے اِن الفاظ سے بھی یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کی عداوت کو اپنی عداوت قرار دیا، کہ جو جبریل سے دشمنی رکھے میری اس کے ساتھ دشمنی ہے، وہ کافر ہے اور میں کافروں کا دشمن ہوں، تو عداوتِ جبریل کو عداوتِ الٰہیہ کے قائم مقام کردیا گیا، اس سے بھی اشارہ اس بات کی طرف نکلتا ہے کہ مقبولِ بارگاہ کے ساتھ عداوت رکھنا عداوتِ الٰہی تک انسان کو پہنچا دیتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان ایمان گنوا بیٹھتا ہے۔ بہرحال یہود کو یہ کہا گیا کہ تم خوش نہ ہوؤ کہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ عداوت رکھ کر تم سمجھتے ہو کہ اللہ کے ساتھ ہماری دوستی ہے، یا جبریل علیہ السلام کے ساتھ عداوت رکھ کر تم سمجھتے ہو کہ میکائیل علیہ السلام سے ہماری دوستی ہے۔ جو جبریل کا دشمن ہے وہ میکائیل کا بھی دشمن ہے، جو جبریل کا دشمن ہے وہ اللہ کا بھی دشمن ہے، یہ سب عداوتیں اللہ کے نزدیک برابر ہیں، اس لیے یہ عداوت تمہیں کُفر تک پہنچا گئی، اور تم کافر ٹھہرے، فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ: اور ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔

لفظِ ''فسق'' کی وضاحت

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: یہ ان کے اُوپر دوسرا الزام ہے، کہ ایسے بیہودہ بہانے کرکر کے یہ ایمان سے روگردانی کررہے ہیں، ہم نے تو آپ پر بہت واضح واضح آیات اتاردی ہیں، واضح واضح دلائل اتار دیے ہیں، جن کا کوئی فاسق ہی انکار کرے تو کرے، اور اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ ہے تو وہ ان آیاتِ بینات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، البتہ جس کو عادت ہی فسق وفجور کی ہے، جس نے اپنے اندر نیکی کی صلاحیت ہی ختم کردی، وہ اِن آیات کا انکار کرتا ہے تو کرے۔ تو جو ان آیات کے منکر ہیں گویا کہ وہ فاسق ٹھہرے۔ فسق کا لفظ اصل میں تو بولا جاتا ہے خروج عن الطاعۃ پر یعنی طاعت سے نکل جانا۔ اور طاعت سے نکل جانا ایک تو یہ ہے کہ عقائد میں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول نہ کی جائے، انسان طاعت سے نکل جائے، تو یہ کافر ہے، اس لیے فاسق کافر بھی ہوسکتا ہے، فسق میں عموم ہے، مرتکب گناہِ کبیرہ بھی طاعت سے نکل گیا، وہ بھی فاسق

ہے، اور مکذِّب عقائدِ ضروریہ بھی طاعت سے نکل گیا، وہ بھی فاسق ہے، لیکن جو عقائدِ ضروریہ کی تکذیب کرتا ہے وہ فاسق بھی ہوا اور کافر بھی ہوا۔ اور اگر کوئی عقائد کا حامل ہے، لیکن کسی کبیرہ کا مرتکب ہے تو وہ کافر نہیں ہے، اُس کے لئے صرف فاسق کا لفظ بولا جائے گا۔ فقہی طور پر فاسق کافر کے مقابلے میں آتا ہے، لیکن قرآنِ کریم میں جہاں فاسق کا لفظ ہے یہ عام مفہوم میں ہے جس میں کافر بھی داخل ہے، جیسے کئی جگہ آتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورۂ حشر: ۱۹، وغیرہ)، تو وہاں فسق کا مفہوم ایسے ہی ہے، طاعت سے نکلنے والے، باغی، اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھاگ جانے والے، خروج عن الطاعۃ کرنے والے، لہٰذا کافروں کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

یہود کی عہد شکنی کی عادت، اور کتابُ اللہ کو پس پشت پھینکنا

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا: یہ اُن یہودیوں کو دوسری ملامت ہے، کہ یہ آیاتِ بینات کا انکار کرتے ہیں، اور اِن کی عادت ہی ایسی ہے کہ جس وقت بھی یہ کوئی عہد باندھتے ہیں تو تھوڑے ہوتے ہیں اِن میں سے عہد کی پابندی کرنے والے، جیسے پیچھے بھی آیا تھا اِلَّا قَلِيْلًا، کم لوگ ہوتے ہیں اس قسم کے، باقیوں کی تو عادت یہی ہے کہ اُس عہد کو پھینک دیتے ہیں۔ نَبَذَ: پھینک دینا، لاپروائی کے ساتھ اُس کو چھوڑ دینا، پھینکنے کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ: اِن میں سے ایک فریق اُس عہد کو پھینک دیتا ہے، بلکہ اکثر تو ایمان ہی نہیں لاتے کہ ہم نے کوئی عہد کیا ہوا ہے، وہ سرے سے ہی مکر جاتے ہیں، انکار ہی کر دیتے ہیں، اِس بات پر ایمان ہی نہیں رکھتے، اس طرح سے اُس عہد کو فراموش کر دیتے ہیں، عام عہد کے بارے میں بھی، اور پھر یہ ایک اللہ کا رسول آیا، جس کے متعلق اُن کی کتاب میں عہد موجود ہے، اور اُس رسول کی صداقت کی علامات متعین ہیں، مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ: اِس رسول کو ماننا اپنی کتاب کو ماننا تھا، کیونکہ جب کتاب کے اندر علامات ذکر کی گئی ہیں تو جب وہ علامات اُس رسول پر صادق آئیں گی تو اس رسول کو ماننا اپنی کتاب کو ماننا ہے، لیکن حسبِ عادت اِن میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دیا، پشت کے پیچھے پھینک دیا، یعنی اس طرح سے لاپروائی کر لی جیسے ان کو پتہ ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اُن لوگوں میں سے جو کتاب دیے گئے، اہلِ کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو ہی پس پشت ڈال دیا، كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: گویا کہ اِن کو پتہ ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یہ وہی اُن کا عہد سے اعراض اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کرنا اِس کو بطورِ شکوے کے ذکر کیا گیا ہے، کہ رسول کی مخالفت اِنہوں نے کیا کی کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ہی اپنے پس پشت پھینک گئے، پس پشت پھینکنا کنایہ ہوتا ہے اعراض سے، کہ پرواہ ہی نہیں کی، جیسے کسی بات کو پشت کے پیچھے پھینک دیا جائے تو اُس کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اِسی طرح سے اِنہوں نے بھی اللہ کی کتاب کو پس پشت ہی پھینک دیا۔ اللہ کی کتاب کی تو پروا نہیں کی، البتہ شیاطین کے سکھائے ہوئے جادو کے پیچھے لگ گئے۔ اِس جادو کی تفصیل ان شاء اللہ کل کریں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

جادو اور تعویذات کی حقیقت اور اس کے شرعی احکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ: ان آیات کا ترجمہ تو کل آپ کی خدمت میں عرض

کردیا گیا تھا، صرف مضمون کی تقریر باقی ہے۔ یہود میں جہاں اور بہت ساری خرابیاں آ گئی تھیں اُن میں ایک خرابی سحر و ساحری کی بھی تھی، جادوگری کا پیشہ اِنہوں نے بہت اختیار کرلیا تھا، اور یہ جادو اِن کے اندر کس طرح پھیلا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ انسانوں پر بھی تھی اور جنوں پر بھی تھی، جنوں کے اندر جو شیاطین قسم کے جن تھے وہ جادوگری کا کام جانتے تھے۔ سحر کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تصرف عجیب یعنی عجیب قسم کے اثرات پیدا کردینا ایسے اسباب کے ذریعے سے جو مخفی ہوتے ہیں، ہر کسی کے علم میں نہیں ہوتے۔ جیسے بعض کلمات کے دوہرانے سے اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں، اور بعض چیزوں کو بعض چیزوں کے ساتھ ملانے سے اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں، جادو کے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیل کتابوں کے اندر موجود ہے، بہر حال جس سحر کی شریعت میں مذمت آتی ہے اُس سے مراد ایسا سحر ہے جس میں ارواحِ خبیثہ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے اُن سے استعانت کی جائے، کُفریہ کلمات بولے جائیں، یا حرام ناجائز اور ناپاک چیزوں کو استعمال کر کے کچھ اثرات ظاہر کیے جائیں، یہ جادو کہلاتا ہے۔ اگر تو اُس میں شرکیہ کلمات ہوں پھر تو اُس کا کرنا کرانا یہ سب کُفر و شرک ہے، اور اگر اس میں کفریہ شرکیہ کلمات تو نہیں ہیں، البتہ ناپاک ناجائز اور گندی چیزوں کا استعمال ہے، یا کسی غلط مقصد کے لئے اُس کو استعمال کیا جارہا ہے، بُرے اثرات پیدا کرنے کے لئے، تو پھر وہ گناہ کبیرہ ہے، حرام ہے۔ اور اگر کوئی ناجائز چیز بھی استعمال نہ کی جائے، اور کسی ناجائز مقصد کے لئے بھی استعمال نہ کیا جائے، اور ارواحِ خبیثہ سے استعانت نہ ہو، تو پھر یہ منتر، پھونک مارنا، گنڈا، تعویذ، یہ سب جواز کے درجے میں ہیں، چاہے اُس میں قرآنِ کریم کی آیات استعمال کی جائیں، چاہے کچھ اور الفاظ استعمال کیے جائیں جو تعویذات کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، ہمارے اکابر کے استعمال میں بھی رہے، تو اُس میں ضروری نہیں ہوتا کہ ہر جگہ قرآنِ کریم کی آیت ہی لکھی جائے، قرآنِ کریم کے علاوہ بھی بعض الفاظ ہوتے ہیں جن کے استعمال سے کچھ اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں اور وہ جائز ہیں، ناجائز نہیں ہیں۔ اللہ کا نام استعمال کیا جائے، اللہ کی کلام کا کوئی جزء استعمال کیا جائے، حدیث شریف میں جو اوراد آئے ہیں اُن میں سے کسی وِرد کو استعمال کیا جائے، یا ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کا معنی غلط نہیں، اسی طرح اِن کو ایسے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے جو غلط نہیں، مثلاً کسی بیمار کی شفاء کے لئے، اسی طرح بچھو اور سانپ کے ڈسنے کے بعد جو دم کیا کرتے ہیں تکلیف کے دور کرنے کے لئے، تو اچھے مقاصد کے تحت اگر اِن کو استعمال کیا جائے تو اِن کا جواز ہے۔

یہود نے فنِ جادو کا تقدس کس طرح قائم کیا؟

شیاطین اس قسم کا جادو کرتے تھے جو کُفر اور شرک کے درجے تک پہنچا ہوا تھا، اِنہی سے یہود نے سیکھا، اور یوں ان کے اندر اِس کا رواج ہوا۔ اور اِس پیشے کا تقدس قائم کرنے کے لئے تاکہ لوگ اس کو برا نہ سمجھیں، شیاطین نے یا خود یہودیوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی جادوگر تھے، اور اُن کی جو عجیب وغریب حکومت تھی، کہ ہوا پر اڑتے تھے، یہ کام کرتے تھے، وہ کرتے تھے، یہ ان کے عجیب تصرفات اِسی جادو کے ذریعے سے تھے، یہ انہوں نے پروپیگنڈہ کردیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں، اور اس طرح سے انہوں نے اپنے اِس فن کا تقدس قائم کرنے کی کوشش کی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک اُن

میں جادو کا رواج تھا، اور آپ نے سنا ہوگا، حدیث شریف کے اندر آپ پڑھیں گے، کہ حضور ﷺ پر بھی مدینہ منورہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا تھا، اور کچھ اثرات ظاہر ہو گئے تھے، جس کے اِزالے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبریل کی وساطت سے یہ آخری سورتیں معوذتین اتاریں، اور اِن کے پڑھنے کے ساتھ وہ اثرات زائل ہوئے (عام تفاسیر)۔ تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہود سے شکوہ کیا ہے کہ ہم نے تو اُنہیں کتاب دی تھی، چاہیے یہ تھا کہ اپنی آخرت کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب کی اتباع کرتے، اس پر عمل کرتے، اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے ساتھ دنیا میں بھی سرخرو ہوتے اور آخرت کو بھی آباد کرتے، لیکن ان کی طبیعت ایسی پست اور دنی ثابت ہوئی، کمینہ پن ان میں اس قسم کا آیا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات جو کتابی شکل میں ان کے پاس موجود تھیں وہ تو اِنہوں نے ترک کر دیں اور پس پشت ڈال دیں، اور ایسے تعویذ گنڈے منتر جن میں فساد ہی فساد، اور جنات اور خبیث روحوں کے ساتھ تعلق پیدا کر کے عجیب وغریب قسم کے شعبدے دکھانا، اِس قسم کے مشغلے میں لگ گئے، اِس کو انہوں نے اپنا خوش کن مشغلہ بنالیا، یہ شکوہ اس طرح سے ہے۔ تو پہلی اشاعت تو اِن میں اِنہی جنات اور شیاطین کی وجہ سے ہوئی، چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں انسانوں کے ساتھ جنات بھی خلط ملط رہتے تھے۔

ہاروت وماروت پر جادو کا علم کیوں اتارا گیا؟

دوسرا لفظ قرآنِ کریم میں آرہا ہے وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ: ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں، بابل شہر میں ان کے اوپر جو کچھ اتارا گیا یہودی اُس کے پیچھے لگ گئے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ ہاروت اور ماروت پر جو چیز اتاری گئی تھی وہ کیا چیز تھی؟ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہاروت ماروت سے مراد فرشتے ہی ہیں، جیسے قرآنِ کریم کا ظاہر دلالت کرتا ہے۔ یہاں آکر ہمارے حضرات کی تقریریں دو طرح کی ہیں، ''بیان القرآن'' میں اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''معارف القرآن'' میں تو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہاروت وماروت پر بھی اللہ تعالیٰ نے جادو کے اصول ہی اتارے تھے، جو شیاطین نے لوگوں کو جادو سکھائے اِسی طرح سے ہاروت ماروت پر بھی جادو کے اصول اتارے گئے تھے۔ باقی! اِن دو فرشتوں پر جادو کا علم کیوں اتارا گیا؟ کہتے ہیں کہ اس لیے اتارا گیا کہ انبیاء علیہم السلام لوگوں کے سامنے آتے اور معجزات دکھاتے، معجزات میں بھی لوگوں کے سامنے عجیب وغریب واقعات پیش آتے، جس کا وہ سبب نہیں سمجھتے تھے، اور عام طور پر جاہل یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح سے باقی جادوگر ہیں یہ انبیاء علیہم السلام جو معجزے دکھا رہے ہیں شاید یہ بھی کوئی جادو کا اثر ہے، تو جادوگروں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا امتیاز عوام کے لئے مشکل ہوگیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگروں کی شعبدہ بازیوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ مقابلہ تو قرآنِ کریم میں مذکور ہے، ہوسکتا ہے کہ یہی چیز زور پکڑ گئی ہو، اور آگے انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے ساتھ اِن کے تصرفات، شعبدہ بازی، اور چشم بندی کچھ مشابہ ہو گئے ہوں، اور عوام کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہو۔ اب یہ معجزہ ہے یا یہ جادو کا اثر ہے، اِن دونوں باتوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ جادو کے اصول واضح کیے جائیں، تاکہ پتہ چلے کہ جو اِن اصولوں کے تحت کام ہوتا ہے وہ جادو ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا اِن اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ بھی

ہو سکتا تھا کہ ان اصولوں کی اشاعت انبیاء علیہم السلام سے کرائی جاتی، کہ انبیاء علیہم السلام کہتے کہ دیکھو! جادو یوں کیا جاتا ہے، جو اس قسم کا کام کرے وہ جادوگر ہوتا ہے۔ لیکن جادو کے اندر چونکہ کفریہ کلمات کا استعمال آتا ہے، ارواحِ خبیثہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا پڑتا ہے تو اِس قسم کا کام انبیاء علیہم السلام سے جو سراپا مظہرِ ہدایت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت نہ ہوئی، کہ چاہے ''نقلِ کُفر، کُفر نباشد'' کہ کُفریہ کلمہ صرف اُس کا کُفر ظاہر کرنے کے لئے نقل کیا جائے تو یہ کُفر نہیں ہے، مثلاً آپ کہیں کہ دیکھو! مرزا نے یہ لکھا ہے، اور آپ اُس کا کلمہ کُفریہ ادا کرتے ہیں نقل کے طور پر، تو کُفریہ کلمے کا نقل کرنا کُفر نہیں ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام اگر لوگوں کو جادو سکھاتے کہ دیکھو! جادو یوں ہوتا ہے، یوں ہوتا ہے، اور وہ سراسر کُفر ہوتا، تو بعض لوگ انبیاء علیہم السلام سے سن کر اُس جادو کو استعمال جو کرتے تو اُن کے کُفر میں مبتلا ہونے کا ذریعہ انبیاء علیہم السلام بن جاتے، اور یہ بات انبیاء علیہم السلام کی شان سے بعید ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے دو فرشتے انسانی شکل میں بھیجے اور اُن کو جادو کی تعلیم دی، تاکہ وہ لوگوں کو جا کر جادو سکھائیں، اور اس لیے سکھائیں تاکہ اس فن سے واقف ہونے کے بعد لوگ فرق کر سکیں کہ یہ جادوگر ہے اور یہ جادوگر نہیں ہے۔ جب تک میں یہ نہیں سمجھتا کہ جادو کسے کہتے ہیں اور جادوگر کی صفات کیا ہیں؟ اس وقت تک اگر میرے سامنے کوئی شخص آ جائے تو میں فرق نہیں کر سکتا کہ یہ جائز تعویذ گنڈا کرتا ہے اور یہ ناجائز ہے، جائز اور ناجائز کے درمیان فرق تبھی کر سکوں گا کہ مجھے جائز کے اصول بھی معلوم ہوں اور ناجائز کے اصول بھی معلوم ہوں، اگر میں ناجائز کے اصول نہیں سمجھتا اور ان کا طریقہ کار نہیں سمجھتا تو میں کیسے فیصلہ کر سکوں گا کہ یہ ناجائز ہے اور یہ جائز ہے، جیسے عربی میں کہتے ہیں: ''عَرَفْتُ الشَّرَّ لَا لِلشَّرِّ وَلٰکِنْ لِتَوَقِّیْہِ'' کہ میں شر کو بھی پہچانتا ہوں، میں نے شر کی معرفت بھی حاصل کی ہے، لیکن وہ شر پر عمل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس لیے تاکہ میں شر سے بچ سکوں، کیونکہ: ''مَنْ لَمْ یَعْرِفِ الشَّرَّ مِنَ الْخَیْرِ'' جو شخص خیر سے جدا کر کے شر کو نہیں پہچانتا، یُوْشِکُ اَنْ یَّقَعَ فِیْہِ، بہت قریب ہوتا ہے کہ وہ شر میں واقع ہو جائے۔ تو شر سے کرنے کے لئے بھی پہچاننا ضروری ہے اور بچنے کے لئے بھی پہچاننا ضروری ہے۔

فرشتے جادو کا تعارف کیوں کراتے تھے؟

اب یہ فرشتے جو جادو کا تعارف کراتے تھے تو اس لئے نہیں کراتے تھے کہ تم بھی یوں کرو، بلکہ اس لیے کراتے تھے کہ تم اس کو پہچانو، جو یوں کرتا ہوگا وہ جادوگر ہے اور اس سے بچنا چاہیے، اس لیے جس وقت لوگ اُن کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتے تو فرشتے اُنہیں یہ کہتے کہ دیکھو بھائی! ہم تمہیں سکھا تو دیں گے، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ ہماری حیثیت فتنے کی ہے، ہم آزمائش کے لئے آئے ہیں، اس لیے ہم سے سیکھ کر کہیں کفر میں مبتلا نہ ہو جانا، بلکہ جادوگروں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور جادوگروں کے جادو کو باطل کرنے کے لئے اور جادوگروں کو انبیاء علیہم السلام سے ممتاز کرنے کے لئے سیکھو، اور اگر تم ہم سے سیکھ کر اس کو غلط استعمال کرنے لگ جاؤ گے تو ہم تمہارے لیے فتنہ بن جائیں گے اور تم کفر میں مبتلا ہو جاؤ گے، تو ایسا کفر نہ کرنا، یہ سب کچھ پہلے اُن کو سمجھا دیتے، سمجھانے کے بعد پھر اُنہیں تعلیم دیتے تھے۔

باطل نظریات سے واقفیت کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

آپ اِس کو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی ہے، مثال کے طور پر ہمارے مولانا محمد حیات صاحب (م: رمضان ۱۴۰۰ھ) ہیں، ختمِ نبوّت والے، وہ مرزائیت کے ماہر ہیں، اب کوئی شخص اُن کے پاس جائے اور جا کر کہے کہ مجھے مرزا کی کتابیں پڑھاؤ، وہ کہیں گے ہاں میں پڑھاتا ہوں، اور اِس نیت کے ساتھ پڑھوتا کہ تم مرزے کی حقیقت سے واقف ہوجاؤ اور مرزائیت کی تردید کرو، اور اِن کی دسیسہ کاریاں اور فتنہ پردازیاں تمہارے سامنے آجائیں۔ ان کے یہ اصول ہیں اور اُن کا یہ جواب ہے، ہم پروہ یہ اعتراض کرتے ہیں، یہ اعتراض کرتے ہیں، وہ سارے کا سارا اُس کو پڑھائیں گے، اور اس لیے پڑھائیں گے تاکہ مرزائیت کی تردید اس کے لئے آسان ہوجائے، اور اگر کوئی بدبخت اُن کے پاس پڑھ کر مرزائی ہوجائے، اور جو اعتراضات انہوں نے مرزائیوں کی طرف سے اسلام پر اس کو سکھائے ہیں وہی اعتراضات اسلام پر کرتا پھرے، تو اس میں مولانا حیات کا تو کوئی قصور نہیں، یہ اُس کا استعمال غلط ہوگیا، پڑھانے والے نے صحیح نیت کے ساتھ پڑھایا، لیکن پڑھنے والے نے اُس کا استعمال غلط کرلیا۔ یا کُفریہ کلمات کسی زمانے میں لوگوں کی زبان پر عام طور پر رائج ہوجائیں، اور لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ یہ کلمہ کفر یہ ہے، تو ایک عالم ایک کتاب لکھتا ہے "کلماتِ کُفریہ"، اور اُس میں وہ لکھتا ہے کہ یوں کہنا، یوں کہنا، یوں کہنا یہ سب کفر ہے، اب اُس کا مقصد تو اِس کُفر کی اشاعت سے یہ ہے کہ لوگ اِس کی واقفیت حاصل کرکے یہ کلمات اپنی زبان سے جاری کرنے سے بچیں، لیکن اگر کوئی شخص وہی باتیں یاد کرکے اپنی زبان سے نکالنا شروع کردے تو یہ اِس کتاب کا استعمال غلط ہے۔ اسی طرح پرانے فلسفے کا کوئی ماہر استاذ پڑھاتا ہے، اُس میں فلسفیوں کے غلط عقیدے اور غلط نظریات آتے ہیں، اب ایک آدمی اُس کے پاس فلسفہ پڑھنے کے لئے جائے اور کہے کہ مجھے فلسفہ پڑھادو، وہ کہیں گے کہ ہاں میں پڑھاتا ہوں، لیکن اس نیت سے پڑھنا تاکہ تم اُن کے باطل نظریات سے واقف ہوجاؤ، اور اسلام کے ساتھ اُن کا جو تصادم ہے اس تصادم میں تم اسلام کی طرف سے اِن کا دفاع کرسکو، وہ کہے کہ ہاں میں اسی نیت سے پڑھتا ہوں، تو استاذ پڑھادے گا، لیکن کل کو فلسفہ پڑھ کر اسلام پر ہی اعتراض کرنے لگ جائے، تو گویا کہ اِس استاذ کا پڑھانا اُس کے لئے فتنہ بن گیا اور وہ اِس کفر میں مبتلا ہوگیا، لیکن اِس میں استاذ کا قصور کوئی نہیں۔ اسی طرح کفر کے اُصول بھی ہمارے ہاں پڑھائے جاتے ہیں، عیسائیت کے اصول آپ کو بتائیں گے، مرزائیت کے اصول بتائیں گے، یہودیت کے اصول بتائیں گے، قدیم فلسفہ آپ کو پڑھائیں گے جس میں شریعت کے خلاف اُن کی باتیں ہوں گی، وہ پڑھائے تو اس لیے جاتے ہیں تاکہ اِن باطل نظریات کو سمجھنے کے بعد آپ اِن کا اِبطال کرسکیں، لیکن اگر اس مدرسے میں کوئی یہی عیسائیت، یہودیت اور یہی فلسفہ پڑھ کر اسلام کے خلاف کام کرنا شروع کردے اور اپنے اس علم کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا شروع کردے، وہ اعتراضات جو آپ کو پڑھائے گئے تھے کہ مرزائیت کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراضات ہیں، یہی جاکر شائع کرنے شروع کردے، تو اِس میں استعمال کرنے والے کی غلطی ہے، پڑھانے والے استاذ کی غلطی نہیں ہے۔ تو یہ تعلیم اس لیے دی جاتی ہے تاکہ حق اور باطل کے درمیان میں فرق ہوجائے، تو فرشتے جو کہتے تھے کہ نَحْنُ فِتْنَۃٌ اُس کا معنیٰ یہی تھا کہ اِس کو صحیح نیت کے ساتھ پڑھنا، ہم صحیح نیت کے ساتھ تمہیں

پڑھائیں گے، تاکہ تمہیں پہچان ہوجائے کہ یہ جادو ہے اور یہ معجزہ ہے، اور یہ جادوگر ہے اور یہ نبی ہے، ان کے درمیان میں تم فرق کرسکو، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تم جادو سیکھنے کے بعد جادوگروں کی تردید کی بجائے خود ہی جا کر جادو کرنا شروع کردو، تو تم کافر ہو جاؤ گے، اس لیے نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ: ہم سے سیکھ کر کہیں کافر نہ ہوجانا، فرشتے یہ نصیحت کردیتے تھے، لیکن اس نصیحت کے باوجود یہ یہودی اُن سے جادو کے اصول سیکھتے، سیکھنے کے بعد جادوگروں کی طرح یہ خود بھی شرارت کرنے لگ جاتے، اور نتیجۃً کفر میں مبتلا ہوجاتے۔

جادو کے ساتھ چیز کی ماہیت بدلی جاسکتی ہے یا نہیں؟

ان کے اس کفر کو اور ان کی بدعملی کو نقل کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے جو لفظ بولا ہے وہ یہ ہے کہ ہاروت وماروت سے یہ ایسی چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعے سے یہ انسان اور اس کی بیوی کے درمیان میں تفریق ڈال دیتے، خصوصیت کے ساتھ اُن کا یہ کردار یہاں قرآنِ کریم میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ جادو کا اثر صرف اتنا نہیں ہوتا کہ خاوند بیوی کو لڑادے، جادو کے اثرات اِس سے زائد بھی ہوسکتے ہیں، جادو کے ذریعے سے کسی انسان کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے، کسی انسان کو بیمار بھی کیا جاسکتا ہے، اُس کو اور بھی مختلف تکلیفیں پہنچائی جاسکتی ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ جادو کے ساتھ کسی چیز کی ماہیت بدلی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مثلاً انسان کو پتھر بنادیا جائے، گدھا بنادیا جائے، یا لاٹھی کو مثال کے طور پر سانپ بنادیا جائے اور واقعی وہ سانپ بن جائے، تو کیا اس قسم کی ماہیت تبدیل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یا صرف چشم بندی اور نظر بندی ہوتی ہے کہ دوسرے کے خیال پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ انسان کو یوں معلوم ہونے لگ جاتا ہے جیسے اس طرح سے ہو رہا ہے اور حقیقت اُس میں کچھ بھی نہیں ہوتی۔ بعض حضرات نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اِس کے ساتھ ماہیت بھی بدل سکتی ہے، جیسے کہ حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کا قول غالباً حدیث شریف میں آتا ہے، مشکوۃ شریف، باب الاستعاذہ (فصل ثالث) میں روایت ہے (یہ پہلے یہودی تھے بعد میں مسلمان ہوئے ہیں، تو چونکہ یہود کے مزاج کو جانتے تھے کہ اپنے مخالفین پر وہ کس قسم کا جادو کرتے ہیں) وہ کہتے ہیں کہ میں چند کلمات پڑھتا ہوں، رات کو اپنے تحفظ کے لئے، استعاذہ کے کلمات پڑھتا ہوں، اگر میں یہ کلمات نہ پڑھتا ہوتا تو یہودی تو مجھے جادو کے زور سے گدھا بنادیتے، حدیث شریف میں یہ لفظ ہیں، جس سے اِس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ انسان پر اس قسم کے اثرات بھی جادو سے پڑجاتے ہیں، اور کچھ کلماتِ شرعیہ بھی ایسے ہیں کہ اگر ان کو پڑھا جائے تو جادو کے اثرات سے انسان بچ بھی جاتا ہے، وہ کلمات اُس روایت کے اندر مذکور ہیں، میرا بھی پڑھنے کا معمول ہے: ''اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ لَيْسَ شَىْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِىْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَاَ وَبَرَاَ'' یہ کلمات ہیں جن کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر میں یہ نہ پڑھتا ہوتا تو یہودی مجھے گدھا بنادیتے۔[1] اور انہی کلمات کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو انسان اگر تین دفعہ رات کو پڑھ لے تو چونکہ جادو اکثر وبیشتر لوگ رات کو کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی اس قسم کا ٹونا ٹوٹکا کرے بھی تو اس کے اثرات واقع نہیں ہوتے۔ صبح شام پڑھنے کی عادت اگر ڈال لی جائے تو اس قسم کے تصرف نہیں ہوتے۔ جیسے معوذتین کی تاثیر آپ کے

(۱) مشکوۃ ۱/ ۲۱۸ باب الاستعاذہ فصل ثالث۔ ولفظه: لولا كلماتٌ أقولهنّ لجعلتني يهودُ حمارًا الخ

سامنے یہی نقل کی تھی، کہ معوذتین کے ساتھ قل ہو اللہ ملا کر معوذات کو اگر صبح شام پڑھ لیا جائے، تو اگر غلط کار آدمی اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرے بھی تو اِن کلمات کی برکت سے تحفظ ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان جُدائی شیطان اور یہودیوں کا لذیذ ترین مشغلہ ہے

تو اثرات اور بھی واقع ہوتے ہیں، اور وہ اور اثرات واقع بھی کرتے تھے، لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جن سے خاوند بیوی کے درمیان وہ بگاڑ پیدا کر دیتے، یہ اُن کے اخلاقی زوال کا انتہائی نکتہ ہے جو قرآن کریم نے واضح کیا۔ اِس کو آپ اس طرح سے سمجھ لیجئے...... ! مشکوٰۃ شریف باب الوسوسۃ میں روایت آتی ہے کہ ابلیس اپنے لشکروں کو صبح شام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے، جن کو صبح بھیجتا ہے وہ شام کو آ کر ابلیس کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا شرارتیں کیں اور کرائیں، اور جن کو شام کے وقت بھیجتا ہے وہ صبح آ کے اُس کو رپورٹ دیتے ہیں کہ رات ہم نے کیا کیا کیا اور کیا کیا کرایا، جس وقت اُس کے وہ چیلے چانٹے آتے ہیں اور آ کر بتاتے ہیں کہ ہم نے فلاں شرارت کی، فلاں شرارت کی، وہ کہتا ہے: ''مَا صَنَعْتَ شَیْئًا'' تُو نے کچھ نہیں کیا، یہ بھی کوئی شرارت ہے جو تو کر کے آیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اُس کی ہر شرارت کو تھوڑی قرار دیتا ہے اور برانگیختہ کرتا ہے کہ اور زیادہ شرارت کر۔ اور ایک شطونگڑا آ کر اس کو کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کے پیچھے لگا اور میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں ڈال دی۔ تو سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ اُسے کہتا ہے: نِعْمَ اَنْتَ! تو بڑا اچھا آدمی ہے، اور اُس کو قریب کرتا ہے فَیَلْتَزِمُہٗ سینے سے لگاتا ہے، یعنی اُسے کہتا ہے کہ تو صحیح کام کر کے آیا ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابلیس کی نظر میں سب سے بڑی شرارت یہ ہے کہ خاوند بیوی کے درمیان بگاڑ کرا دیا جائے، اس لیے وہ ایسا کام کرنے والے کی تعریف کرتا ہے، نِعْمَ اَنْتَ کہتا ہے اور اس کو قریب کر کے سینے سے لگاتا ہے۔ تو شیطان کا لذیذ ترین مشغلہ اور سب سے بڑا مقصود خاوند بیوی کے درمیان پھوٹ ڈالنا ہے، اور یہ شیطانوں والا کام اِن یہودیوں نے شروع کر دیا، کہ اِن کا مشغلہ بھی یہی ہو گیا کہ خاوند بیوی کے درمیان میں لڑائی کرا دی جائے۔

خاوند بیوی کی محبّت کی اہمیت

خاوند بیوی کے درمیان لڑائی کرانا اخلاقی زوال کا انتہائی نکتہ کیوں ہے؟ اِس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ انسانی تمدن کی اصلاح کا دارومدار خاندانی حالات کی اصلاح پر ہے، اور اِس تمدن اور معاشرے کا بگاڑ جتنا بھی ہے خاندانی حالات کے بگاڑ پر ہے۔ خاوند بیوی کی آپس میں محبت ہو تو گھروں میں سکون ہوتا ہے، خاندانوں میں سکون ہوتا ہے، اور اِس سکون کے نتیجے میں ہر شخص کا اخلاق محفوظ ہوتا ہے، عورتوں کا اخلاق بھی محفوظ، مردوں کا اخلاق بھی محفوظ، نسب نامے بھی محفوظ۔ اور گھر کے اندر سکون ہو گا تو اطمینان سے آپ کھائیں گے، پئیں گے، سوئیں گے، باہر کے کام بھی آپ اطمینان سے کریں گے، اور پورا معاشرہ آپ کو پُرسکون نظر آئے گا۔ تمدن اور معاشرے کا بگاڑ گھروں کی لڑائی سے شروع ہوتا ہے، جس گھر کے اندر خاوند بیوی کا آپس میں اتفاق نہ ہو اس

(۱) مسلم ۲/۳۷۶ باب تحریش الشیطان/ مشکوٰۃ ۱/۱۸ باب الوسوسہ فصل اول۔

میں کبھی بھی سکون نہیں ہوگا، عورتوں کے اخلاق محفوظ نہیں رہ سکتے، مردوں کے اخلاق محفوظ نہیں رہ سکتے، نسب نامے محفوظ نہیں رہ سکتے، گھروں کا نظم ٹھیک نہیں رہ سکتا، اور اِس بگاڑ کے نتیجے میں دو خاندان بگڑتے ہیں، اُن کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے، دو قبیلے آپس میں لڑتے ہیں، دو قومیں آپس میں لڑتی ہیں۔ ذرا اخبار اٹھا کر دیکھا کرو، تمہیں پتہ چلے کہ عورتوں کی وجہ سے دنیا میں کتنی لڑائیاں ہوتی ہیں، اگر خاوند بیوی کے تعلقات اچھے رہیں تو سارے کا سارا فتنہ وفساد ختم ہوجاتا ہے، اور خاوند بیوی کے تعلقات خراب ہونے کی صورت میں ہی سارا فتنہ پھیلتا ہے۔ اِس لیے شریعت میں اِس کی بہت اہمیت ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے جھوٹ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ جھوٹ بولنا جائز نہیں، لیکن چند ایک مواقع ایسے بتائے جہاں اگر کوئی انسان خلافِ واقع بات کہہ دے تو شرعاً اُس کو جھوٹا نہیں کہیں گے، شریعت میں وہ گناہ نہیں ہے، اُن میں سے ایک موقع یہ بھی بتایا کہ خاوند اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے کوئی خلافِ واقع بات کہہ دے، کہ اگر میں نے اِس کے سامنے سچ بولا تو لڑائی ہو جائے گی، اُس لڑائی سے بچنے کے لئے کوئی خلافِ واقع بات کہہ دیتا ہے، یا بیوی اپنے خاوند کو خوش رکھنے کے لئے کوئی خلافِ واقع بات کہہ دیتی ہے، کہ اگر میں نے صحیح واقعہ ظاہر کردیا تو لڑائی ہوجائے گی، اس لیے اُس واقعہ کو چھپا لیتی ہے اور خلافِ واقع بات کہہ دیتی ہے، تو شریعت نے اِس کی اجازت دی ہے۔[1] اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ جھوٹ جیسا گھناؤنا جرم خاندانی محبت کو برقرار رکھنے کے لئے اور زوجین کی محبت کو برقرار رکھنے کے لئے برداشت کرلیا گیا۔ تو خاندان کے اندر اور خاص طور پر خاوند اور بیوی کی آپس میں محبت کتنی مطلوب ہے، وجہ اُس کی یہی ہے کہ اِس محبت سے ہی انسانی زندگی میں سکون آتا ہے، انسانی اخلاق محفوظ ہوتے ہیں، اور خاندان اچھی نشوونما پاتے ہیں، اور جس وقت اِن کی آپس میں لڑائی شروع ہوجائے تو خاندانی زندگی برباد، خانگی زندگی برباد، گھر سکون نہیں ہوگا تو انسان کو باہر کی زندگی میں بھی کبھی سکون نصیب نہیں ہوگا، نہ بچوں کی تربیت صحیح ہوگی، نہ اولاد صحیح پیدا ہوگی، اخلاق برباد ہوجائیں گے، خاندانوں میں لڑائیاں ہوں گی، برادریاں ٹوٹ جائیں گی، اور آپس میں قتل وقتال گالی گلوچ غیبت وغیرہ جو کچھ ہوتا ہے سب اسی سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی تمدن کی اصلاح اگر ہے تو خاندانی حالات کی اصلاح پر ہے، اور خاندانی تمدن کا بگاڑ اگر ہے تو اِسی خاندانی حالات کے بگاڑ پر ہے۔ تو یہ ایسے رذیل اور کمینے تھے کہ اِن کا مشغلہ یہی تھا کہ جہاں زوجین میں محبت دیکھی برداشت نہ کرسکے، اِس بیوی کو خاوند کے خلاف کیا اور اپنے پیچھے لگا لیا، اُس کو اُس سے بگاڑا اور اُس کے پیچھے لگا دیا، بس عورتوں کو ایک سے توڑنا اور دوسروں سے جوڑنا، یہی ان کا مشغلہ ہوگیا تھا۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اخلاقی زوال کا انتہائی نکتہ ہے، تو باقی چیزیں ذکر کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے یہ جو واضح کیا ہے کہ اس قسم کی باتیں سیکھتے تھے اِس سے اُن کا اخلاقی نقشہ اچھی طرح سے سمجھ میں آ گیا۔ بہرحال ہاروت ماروت نے تو جادو کے اصول اس لیے سکھانے شروع کیے تھے تاکہ جادوگروں میں اور انبیاء ﷺ میں فرق کیا جاسکے، اور جادو کو پہچان کر اُس کو رد کیا جاسکے، لیکن اِنہوں نے وہ سیکھ کر اُس کو اُسی طرح سے استعمال کیا جیسے باقی جادوگر استعمال کرتے تھے، اور یوں یہ کفر میں استعمال ہوئے۔

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۲۵، باب تحریم الکذب / مشکوۃ ۲/ ۴۲۸، باب ما ینہی عنہ من التھاجر ۔لَمْ أَسْمَعْ يُرَخِّصُ فِي شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ كَذِبٌ إِلَّا فِي ثَلَاثٍ...الخ

''مَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ'' کی دُوسری تفسیر

عام طور پر مفسرین نے مَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ کی تقریر یہی کی ہے، اور'' بیان القرآن'' میں یہی تقریر مذکور ہے، اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی'' معارف القرآن'' میں اِسی پر ہی مدار رکھا ہے، لیکن سیّد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ایک تفسیری قول مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''قصص القرآن'' میں نقل کیا ہے اِسی واقعہ کے ضمن میں،[1] وہ کہتے ہیں کہ شیاطین تو سکھاتے تھے جادو، جو کُفریہ اور شرکیہ کلمات پر مشتمل تھا، اور جس کے کرنے کے ساتھ وہ لوگ کافر ہوتے تھے، اور اپنا تقدس جمانے کے لئے اُنہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اِس کو منسوب کر دیا۔ جیسے آج کل بھی آپ حضرات کو شاید معلوم ہے یا نہیں، یہ جاہل قسم کے لوگ جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں اِن کے پاس جو کتابیں ہوتی ہیں ''نقشِ سلیمانی'' کہلاتی ہیں، ''نقشِ سلیمانی'' کے ساتھ ہی اُن کی اشاعت ہوتی ہے، یہ وہی یہودیانہ ذہن ہے کہ جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، کہ ان جادو کی کتابوں کو ''نقشِ سلیمانی'' کے نام سے مشہور کرتے ہیں، یہ بات اُنہی باقیاتِ سیئات میں سے ہے، یہودیوں کی باتوں میں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شیاطین نے تو جادو سکھایا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جس وقت کوئی غلط فن یا کوئی غلط قسم کا علم لوگوں کے اندر رائج ہو جائے تو اُس کے رد کے لئے اللہ تعالیٰ صحیح علم کو لاتے ہیں اور اُس کے ساتھ اُس علم کا رُعب اُتارا جاتا ہے، اور یہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ لوگوں کے اندر تو جادو شائع ہوا، جس میں کُفریہ کلمات تھے، اور وہ تعویذ کرتے تو عجیب وغریب اثرات پیدا ہو جاتے، پھونک مارتے تو عجیب وغریب اثرات پیدا ہو جاتے، اب اُن کے اس علم وفن کے ساتھ اہلِ حق پر یا اہلِ حق کے عوام پر کچھ غلط اثرات پیدا ہو سکتے تھے کہ اِن جادوگروں کی عظمت اُن کے اوپر قائم ہو جائے، اور جادوگروں کی عظمت قائم ہو جانے کے بعد یہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑیں اور جادوگروں کے پیچھے لگ جائیں۔ لہٰذا اِس کے توڑ کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی شکل میں دو فرشتے بھیجے، اور اُن کو صحیح تعویذ گنڈا سکھایا، اللہ تعالیٰ کی کلام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ، صحیح کلمات کے ساتھ، کہ جو اثرات وہ غلط تعویذ گنڈے سے پیدا کرتے ہیں، تم اسی طرح سے یہ نام استعمال کرو یا یہ لفظ استعمال کرو تو اُس میں یہ اثر آ جائے گا، مثلاً وہ کسی خبیث روح کا نام لے کے سر پر پھونک مارتے ہیں تو درد ٹھیک ہو جاتا ہے، تم بسم اللہ پڑھ کر پھونک مارنا تو درد ٹھیک ہو جائے گا، وہ ارواحِ خبیثہ کے ساتھ استعانت کر کے ایک کرتب دکھاتے ہیں، تم سورۂ فاتحہ پڑھ کر (میں مثال دے رہا ہوں) دم کرو گے تو وہی اثرات پیدا ہو جائیں گے۔ جیسے عوام کے اندر ''کالا علم'' اور ''نُوری علم'' یہ دو علم مشہور ہیں، ''کالا علم'' ملنگ اور اس قسم کے لوگ کرتے ہیں، ''کالا علم'' جادو کو کہتے ہیں، کہتے ہیں فلاں آدمی کالا علم جانتا ہے، تو ''کالے علم'' سے یہی جادو مراد ہوتا ہے، اور اس کے مقابلے میں ''نُوری علم'' یہ ہے جو صحیح تعویذ گنڈا ہے، جیسے قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھ دی، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی نام کا وظیفہ کر کے اُس میں اثرات پیدا کیے اور اثرات پیدا کر کے وہ نام استعمال کر لیا، اِس کو نوری علم کہتے ہیں۔ تو گویا کہ اُس کالے علم کے توڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہاروت وماروت

---

(۱) دیکھئے: ''قصص القرآن''، حصہ دوم، ص ۱۴۱ ۔ ۱۵۴، حالات حضرت سلیمان علیہ السلام، بعنوان ''حضرت سلیمان اور بنی اسرائیل کا بہتان''

کو نُوری علم کی تعلیم دے کر بھیجا۔ آج جو ہمارے ہاں بھی تعویذ گنڈے اور اس قسم کی چیزیں منقول ہیں، اِس کی اصل یہی ہاروت ماروت کی تعلیم ہے، جس نے الفاظ کی تاثیرات بتائیں، کہ اِس لفظ کو اتنی دفعہ دہراؤ گے تو اس میں یہ اثرات پیدا ہوجائیں گے، اِس بات کو اتنی دفعہ لکھو گے تو اس میں یہ اثرات پیدا ہوجائیں گے، یہ جو چلّہ کشی اور بار بار جو وِرد کیا جاتا ہے ان الفاظ میں اثرات پیدا کرنے کے لئے، اگر یہ کلماتِ صحیحہ کے ساتھ کیا جائے جس کو میں نے کہا کہ یہ جائز ہے، گویا کہ اُس جادو کے توڑ کے لئے یہ تعلیم دی گئی تھی۔ اب صورت حال یہ ہوگئی کہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ جادوگروں کا پیچھا چھوڑتے، اور یہی تعویذ گنڈا جو صحیح طریقے سے اُن کو سکھایا گیا تھا اِس کو اختیار کرتے، اور اِس کو صحیح مقاصد کے لئے استعمال کرتے، جیسے کسی کو سانپ ڈس گیا تو تم اچھے لفظ بول کر اُس پر دم کرو، یہ جائز ہے۔ بچھو کاٹ گیا، تو تم قرآنِ کریم کی کوئی آیت پڑھ کر اُس پر دم کرو، یہ جائز ہے۔ خاوند بیوی کے درمیان بگاڑ ہے اور اُن کے درمیان محبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، تو تم تعویذِ محبت دے دو۔ کسی کا بچہ باغی ہوا پھر رہا ہے، ماں باپ کا نافرمان ہے، تو اُس کو ماں باپ کے تابع کردو، مسخر کردو۔ کسی کو درد ہے تکلیف ہے، تم پھونک مار کر اس کو ٹھیک کردو۔ تو ان گندے لوگوں کو چھوڑ دو، ان کافروں کو چھوڑو، اِن کی تعلیم کو چھوڑ دو جو کفر کی طرف لے جاتی ہے، اور اِس صحیح طریقے کے ساتھ انہی مقاصد کو حاصل کرو۔ تعلیم تو اس لیے دی گئی تھی لیکن اُن بدبختوں نے اِس صحیح علم کو بھی غلط کرلیا۔

صحیح تعویذ گنڈا بھی تب جائز ہے جب مقصد صحیح ہو

اب یہ واقعہ ہے کہ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں یہ تاثیر ہے کہ اگر اُن کو ایک خاص طریقے کے ساتھ استعمال کیا جائے تو دو آدمیوں میں لڑائی ہوجائے گی، اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (سورۂ مائدہ: ۶۴) اِس آیت کا ورد کرنے کے ساتھ، یا اِس کو خاص طریقے سے لکھ کر دو قبروں کے درمیان میں جاکر دفن کردو تو آپس میں اختلاف ہوجائے گا اور پھوٹ پڑ جائے گی۔ اور یہ پھوٹ ڈالنے کی کہیں ضرورت بھی پیش آسکتی ہے، کہ دو فتنہ پرداز اکھٹے ہوئے ہیں، اور ان کے آپس میں اتفاق نے دنیا کو تنگ کر رکھا ہے، اگر ان کی آپس میں پھوٹ ڈال دی جائے تو بہت سے لوگوں کی جان چھوٹتی ہے، ایسے مقصد کے تحت اگر دو کے درمیان میں پھوٹ ڈالی جائے تو شرعاً جائز ہے، اور اِس آیت کے یہ اثرات ہیں۔ اسی طرح دو آدمیوں کی آپس میں نفرت ہے تو محبت پیدا کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی آیت آپ استعمال کیجئے اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (سورۂ انفال: ۶۳)، اور اسی طرح اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (سورۂ طٰہٰ: ۳۹) یہ آیات محبت پیدا کرنے والی ہیں، اِن کو خاص طریقے کے ساتھ پڑھ کر، یا خاص طریقے سے تعویذ بنا کر اگر استعمال کیا جائے تو دو آدمیوں کے درمیان میں محبت پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسے خاوند بیوی کی محبت نہیں وہاں اِس کو استعمال کرو، یا اولاد اور والدین کی محبت نہیں وہاں اِس کو استعمال کرو، تو یہ بالکل ٹھیک ہے اور ایک جائز مقصد ہے، کیونکہ جس طرح انسان ظاہری طور پر وعظ ونصیحت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ باطنی تصرف ہے، اس لیے تم اِس طرح سے کرو۔ اور اگر کسی لونڈے کو قابو کرنے کے لئے یہی تسخیر شروع کردی، یا کسی پرائی عورت کو پیچھے لگانے کے لئے یہی تسخیر شروع کردی، تو کالے علم والا فائدہ تم نے نوری علم سے حاصل کرنا شروع کردیا، یہ پہلے سے بھی زیادہ

خباثت ہوگئی، کہ اللہ کے نام کو کسی غلط کام کے لئے استعمال کرنا شروع کردو، جن کا جوڑنا مقصود ہے اُن کو توڑنا شروع کردو، اور جن کا توڑنا مقصود ہے اُن کو جوڑنا شروع کردو، اس قسم کے غلط مقاصد کے تحت اگر یہی تسخیر شروع ہوجائے اور دل دماغ کے اوپر اثرات ڈالنے شروع کردیے جائیں تو یہ پہلے سے زیادہ خباثت ہے، کہ ایک آدمی نے ناجائز مقصد حاصل کیا ناجائز طریقے سے، اور ایک آدمی ناجائز مقصد حاصل کرتا ہے اور اللہ کا نام لے کر؟ اس طرح سے اُنہوں نے اُس صحیح علم کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ تو آج بھی مسئلہ اسی طرح سے ہے، اِن روحانی اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا، بالکل واقعہ ہے، دم کرنا ٹھیک ہے، تعویذ لکھنا ٹھیک ہے، لیکن صحیح بات ہو اور صحیح مقصد کے لئے استعمال کی جائے تو اِس میں کوئی کسی قسم کی کراہت نہیں، صراحتاً اِس کا حدیث شریف کے اندر ذکر بھی آتا ہے، اور اُمّت کے اندر پہلے دن سے ہی یہ چیز معمول چلی آرہی ہے۔

صحیح غلط کی تمیز کیے بغیر تعویذ کو دُکان داری کا ذریعہ بنانا حرام ہے

لیکن اِس کو اس طرح سے دُکان داری کا ذریعہ بنالینا کہ چاہے کوئی غلط مقصد کے لئے لے، صحیح مقصد کے لئے لے، فساد کے لئے لے، بگاڑ کے لئے لے، یہ جتنے یاردوست قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ جاتے ہیں، جاکر اپنی محبوبہ کو اور معشوقہ کو قابو میں لانے کے لئے پچاس روپے دیے اور تعویذ لیا، تو یہ دُکان داری کتاب اللہ سے برگشتہ کرنے والی ہے اور یہ یہودیانہ پیشہ ہے، اِس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، چاہے کوئی اللہ کا نام استعمال کرے، چاہے کوئی غیر اللہ کا نام استعمال کرے، پھر یہ سارے کا سارا علم و فن حرام ہوجائے گا، اور جو اِس سے کمائیں گے وہ حرام ہے اگر جائز اور ناجائز میں تمیز نہیں کرتے کہ تعویذ لینے والا کسی صحیح مقصد کے لئے لے رہا ہے یا غلط مقصد کے لئے لے رہا ہے۔ تو تعویذ محبت ہو یا تعویذ عداوت ہو اِس میں صحیح مقاصد بھی ہوتے ہیں اور غلط مقاصد بھی ہوتے ہیں، اگر صحیح غلط کی تمیز کیے بغیر تعویذ دینا شروع کردو گے تو تمہاری کمائی حرام ہے اور تمہارا یہ فعل حرام ہے، اور اگر اس میں جائز اور ناجائز کی تمیز کی جائے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو کوئی شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ فائدہ پہنچائے۔[1] تو وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ سے مراد ہو گیا تعویذ گنڈے کا صحیح علم، جس طرح سے آج بھی یہ دونوں علم برابر سرابر چلتے ہیں، کالا علم بھی چلتا ہے اور صحیح تعویذ گنڈے بھی چلتے ہیں۔ یہ رائے اس لیے بھی کچھ راجح معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں کے اُوپر اہتمام کے ساتھ اِس علم کو اُتارا گیا، اور اُس زمانے میں جبکہ جادو کا زور تھا، تو اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق ایک غلط بات کو رد کرنے کے لئے صحیح راستہ دکھایا گیا۔

یہودیوں کی خباثت اور طبیعت کی پستی

اب یہودیوں کو چاہیے تھا کہ صحیح راستے کو اختیار کرتے اور اُس غلط بات کو چھوڑ دیتے، لیکن اِنہوں نے ان دونوں فرشتوں سے صحیح بات سیکھنے کے بعد پھر اُس کو استعمال غلط کیا، جس کے بعد جیسے وہ جادوگر کفر اختیار کرتے تھے اسی طرح اس صحیح بات کو غلط راستے پر ڈال کر اِنہوں نے بھی کافرانہ راستہ اختیار کرلیا۔ تو اِن آیات میں گویا کہ اُن کی خباثت اور طبیعت کی پستی دکھائی گئی ہے،

---

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۲۴ باب استحباب الرقیۃ / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۸۸ کتاب الطب۔ فصل اول۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو پتہ بھی ہے کہ جو اس قسم کی باتوں کے پیچھے لگ جائے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور جس چیز میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا یہ بہت بُری چیز ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے ثواب کی امید رکھتے، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اتباع کرتے، اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی اطاعت کرتے، تو یہ ان کے لئے بہت بہتر تھا۔

اس طرح سے جادو کا نقشہ سارے کا سارا اِن آیات کے اندر ذکر کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت کردی گئی، کہ یہ کافرانہ کام سلیمان علیہ السلام نے نہیں کیا، بلکہ یہ سارے کا سارا شغل شیاطین کا ہے۔ آج بھی اگر کوئی شخص اس قسم کے جادو کے کرتبوں کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتا ہے تو یہ وہی یہودیانہ اور شیطانوں والا عقیدہ ہے اور اِس قسم کے کاموں کو سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا کفر ہے، یہ اُسی یہودیانہ اور شیطانوں کے پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ اس قسم کے تعویذوں کو اب بھی لوگ ''نقش سلیمانی'' کہتے ہیں۔ اس لیے ''نقشِ سلیمانی'' کے نام سے جن کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے [اگر ان میں سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت مقصود ہے تو] یہ سب کُفر ہے، جیسا کہ اِس آیت کے اندر ذکر کر دیا گیا۔

زہرہ والے واقعے کی حیثیت

سوال:- وہ جو واقعہ آتا ہے کہ عورت آسمان پر چڑھ گئی تھی؟

جواب:- یہ ایک لمبی چوڑی روایت ہے، زُہرہ والی، یہ بعض تفسیروں کے اندر مذکور ہے، لیکن راجح یہی ہے کہ وہ اسرائیلی روایات میں سے ہے، اور وہ کوئی قابلِ اعتماد نہیں، اگرچہ بعض مفسرین نے اُس کو کچھ تاویلیں وغیرہ کر کے صحیح کرنے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن جو قابلِ اعتماد مفسرین ہیں، ابنِ کثیرؒ جیسے،(۱) اور تفسیر کبیر والے امام رازیؒ جیسے،(۲) سب نے اِس کو خرافات میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر اُس واقعہ پر موقوف نہیں، جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے سارا معاملہ بے غبار کر دیا، اِس میں کوئی ضرورت نہیں اِدھر اُدھر کی باتیں مارنے کی، تو ایسی روایت جس کی کوئی صحیح سند نہ ہو، اور بعض محدث اُس کو موضوع کہیں، بعض موضوع نہ کہیں تو ضعیف کہیں، اور وہ اصولِ شریعت کے ساتھ قدم قدم پر ٹکراتی ہو، تو علم کا زور لگا کر اس کو تاویلیں کر کے صحیح کرنے کی بجائے اس سے صرفِ نظر کر جانا چاہیے۔ قرآنِ کریم کے کسی لفظ کی تفسیر اُس واقعہ کے جاننے پر یا بیان کرنے پر موقوف نہیں، میں نے وہ واقعہ آپ کے سامنے نقل نہیں کیا اور آیات آپ کے سامنے حل کر دیں، یہی سب سے ٹھیک طریقہ ہے، اس قسم کی روایات عموماً اسرائیلیات میں سے ہوتی ہیں اور اِن کی ذمہ داری قبول نہیں کی جاسکتی، اور بھی بہت ساری روایات تفسیروں میں آتی ہیں۔

سوال:- دُوسری تفسیر کے مطابق جب اس سے مراد صحیح تعویذ گنڈا ہے تو اِس کی تو انبیاء کی وساطت سے بھی تعلیم دی جاسکتی تھی، ہاروت ماروت کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب:- یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، ویسے تو جو بھی علم وفن دنیا کے اندر آیا اللہ تعالیٰ نے ہی سکھایا ہے، تو یہ تعویذ گنڈا اور

---

(۱) فَدَارَ الْحَدِیثُ وَرَجَعَ إِلَی نَقْلِ کَعْبِ الْأَحْبَارِ عَنْ کُتُبِ بَنِی إِسْرَائِیلَ وَاللّٰہُ أَعْلَمُ (ابن کثیر)

(۲) وَاعْلَمْ أَنَّ ہٰذِہِ الرِّوَایَةَ فَاسِدَةٌ مَرْدُودَةٌ غَیْرُ مَقْبُولَةٍ لِأَنَّہُ لَیْسَ فِی کِتَابِ اللّٰہِ مَا یَدُلُّ عَلَی ذٰلِكَ بَلْ فِیہِ مَا یُبْطِلُہَا مِنْ وُجُوہٍ الخ (تفسیر کبیر)

روحانی تصرفات اگر فرشتوں کے ذریعے سے اللہ نے سکھا دیئے تو اُس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ (پھر کسی سوال پر فرمایا:) یہ اصلاح نہیں ہے، یہ تو ایک فن کی تلقین ہے، اس میں اصلاح کی بات نہیں ہے، یہ تو فن کی تلقین کے لئے ہے کہ یہ روحانی اثرات اس طرح سے بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔

عام طور پر راجح اور ظاہر کے موافق بات یہی ہے کہ یہ فرشتے تھے، مَلَكَیْن کا لفظ جس طرح سے بتاتا ہے، اگرچہ تفسیروں میں یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ دو بزرگ آدمی تھے جن کو اُن کی نیک سیرت کی بناء پر لوگ فرشتے کہتے تھے، اور ان کے اوپر اس علم کا انکشاف ہوا، کہ فلاں نام کے اندر یہ اثرات ہیں، فلاں آیت کے اندر یہ اثرات ہیں، تورات کی فلاں آیت استعمال کرلی جائے تو اُس میں یہ اثرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ قول بھی ہے لیکن یہ ظاہر کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ مستقل تعلیم دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں دو فرشتے بھیجے، جنہوں نے آکر اِس قسم کا روحانی علم لوگوں کو سکھایا تاکہ اُس ''کالے علم'' کا توڑ کیا جاسکے۔

خلاصۂ آیات

پیروی کی انہوں نے اس چیز کی جس کو شیاطین پڑھتے ہیں عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ: عَلٰی عَهْدِ مُلْكِ سُلَیْمٰنَ، سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانے میں۔ سلیمان نے کُفر نہیں کیا، لیکن شیطانوں نے کُفر کیا (یہ سلیمان علیہ السلام کی براءت ہوگئی، کہ یہ جادوگروی سلیمان علیہ السلام کا پیشہ نہیں تھا) سکھاتے تھے لوگوں کا جادو، اور پیروی کی اِنہوں نے اُس چیز کی جو اتاری گئی تھی دو فرشتوں پر بابل میں، ہاروت ماروت پر (ہاروت ماروت یہ مَلَكَیْن کا بیان ہے)۔ نہیں سکھاتے تھے یہ کسی کو جب تک کہ یہ نہ کہہ دیتے کہ سوائے اس کے نہیں کہ ہم فتنہ ہیں، پس تو کافر نہ ہوجانا۔ پس سیکھتے تھے اُن دونوں سے وہ چیز جس کے ذریعے سے جدائی ڈالتے تھے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان۔ اور آگے جو آیتیں ذکر کی گئی ہیں (وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ) یہ وہی توحید کا تحفظ ہے، کہ اگرچہ تعویذ گنڈے میں اثرات ہیں، کالے علم کے ساتھ بھی اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھیے کہ یہ اللہ کے اذن اور اللہ کی مشیت کے تحت ہیں، اگر اللہ نہ چاہے تو کسی چیز میں اثر ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے موحد آدمی کا دل مضبوط ہونا چاہیے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اللہ کی مشیت نہ ہو، یہ وہی عقیدۂ توحید کی حفاظت ہے، تاکہ اِن کے اثرات کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہ سمجھنے لگ جائے کہ ستاروں میں اور اس قسم کے غلط کلمات میں بھی کوئی مستقل اثرات ہیں، کہ یہ پیدا ہوکے ہی رہتے ہیں، ایسی بات نہیں، بلکہ یہ سب اللہ کے اذن سے ہے اور اللہ کی مشیت کے تحت ہے۔ ''اور نہیں ہیں نقصان پہنچانے والے یہ اِس جادو کے ذریعے سے کسی کو مگر اللہ کی اجازت سے، سیکھتے ہیں یہ وہ چیز جو اِن کو نقصان پہنچاتی ہے اور ان کے لئے نافع نہیں، یعنی انجام کے اعتبار سے نقصان اِنہی کا ہے۔ البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا کہ جو شخص بھی اِس کو اختیار کرے گا اُس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، بری ہے وہ چیز جس کے ساتھ انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا، ''جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا'' یعنی جس چیز میں انہوں نے اپنی جانیں کھپا دیں، ساری زندگی چلے کرتے رہے، تعویذ کرتے رہے، گنڈے

سیکھتے رہے، ساری عمر جو اِنہی کاموں کے اندر کھپا دی تو بری ہے وہ چیز جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو انہی اپنے مقاصد خبیثہ کو حاصل کرنے کے لئے لگا دیا، لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ: کاش کہ اِن کو علم ہوتا۔'' اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کی طرف سے بدلہ بہتر ہوتا، کاش کہ یہ جانتے۔'' (کسی سوال پر فرمایا:) شیاطین کا لفظ دونوں پر ہی استعمال ہوتا ہے، شیاطین جن بھی ہوتے ہیں اور شیاطین اِنس بھی ہوتے ہیں، یہاں بھی دونوں مراد لیے جاسکتے ہیں، اور تفسیروں میں بھی دونوں قول موجود ہیں۔ لیکن جنات چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں لوگوں کے ساتھ ملتے تھے تو اُن میں جو شریر قسم کے تھے وہ ان شیاطین کے لفظ کا زیادہ اولیٰ مصداق ہے۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا

اے ایمان والو! راعنا مت کہا کرو، اور کہا کرو انظرنا

وَاسۡمَعُوۡا ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ

اور سنو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے﴿۱۰۴﴾ جو لوگ کافر ہیں خواہ

اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَلَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يُّنَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ مِّنۡ

اہل کتاب میں سے ہوں، خواہ مشرکین میں سے ہوں، وہ نہیں چاہتے کہ اُتاری جائے تم پر کوئی بھلائی

رَّبِّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ

تمہارے رَبّ کی طرف سے، اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے

الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ

فضل والا ہے﴿۱۰۵﴾ جس آیت کو ہم منسوخ کردیں یا اسے بھلادیں تو لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا

مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ

اس جیسی، اے مخاطب! کیا تو جانتا نہیں؟ کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے﴿۱۰۶﴾ کیا تو جانتا نہیں کہ بیشک

اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی، اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ

کوئی خیرخواہ اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۰۷﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے،

كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ

جیسا کہ سوال کیے گئے تھے موسیٰ علیہ السلام اس سے قبل، اور جو کوئی شخص کفر کو لے لے ایمان کے بدلے

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ

پس وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا ﴿۱۰۸﴾ اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ لوٹا دیں تمہیں

مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ

تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا کر، حسد کی وجہ سے جو ان کے دلوں سے پیدا ہونے والا ہے

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ

بعد اس کے کہ ان کے لئے حق واضح ہوگیا، پس معاف کردو اور درگزر کر جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ

بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

اپنا حکم لے آئے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۰۹﴾ نماز قائم رکھو

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ

اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور جو بھلائی تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو گے پاؤ گے اس کو

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ

اللہ کے پاس، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۰﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں

اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مگر وہی شخص جو یہودی ہوا، یا وہی جو نصرانی ہوا، یہ ان کی خواہشات ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنی دلیل اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ

سچے ہو ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں، جو کوئی شخص تابع کردے اپنی ذات کو اللہ کے اس حال میں کہ مخلص ہو، پس اس کے لئے اس کا اجر ہے

رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۱۲

اس رب کے پاس، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ۝۱۱۲

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو!، اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا: رَاعِنَامت کہا کرو، رَاعِنَا نہ کہا کرو، وَقُوْلُوا: اور کہا کرو انْظُرْنَا۔ وَاسْمَعُوْا: اور سنو، وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: وَدَّ يَوَدُّ: چاہنا، خواہش کرنا، مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ یہ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا بیان ہے، جو لوگ کافر ہیں خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں خواہ مشرکین میں سے ہوں، اِس کا مفہوم یہ ہوگیا۔ وہ نہیں چاہتے اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ: کہ اتارا جائے تم پر مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے، وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ: اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ: ''ما'' موصولہ ہے متضمن بمعنی الشرط، جس آیت کو ہم منسوخ کردیں اَوْ نُنْسِهَا: یا اُس کو بھلا دیں۔ نَسِيَ يَنْسٰى: بھولنا۔ اور اَنْسٰى يُنْسِي اِنْسَاء: بھلا دینا۔ جس آیت کو ہم منسوخ کردیں یا اُسے بھلا دیں، نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا: لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا اس جیسی۔ اَتٰى يَاْتِيْ: آنا۔ بِخَيْرٍ پر باء تعدیہ کی آگئی، اس لیے اس کا مفہوم ہوگیا لانا، لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا اُس جیسی۔ اَلَمْ تَعْلَمْ: اے مخاطب! تو جانتا نہیں؟ ''اے مخاطب'' یہ ترجمہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہاں مخاطب کوئی متعین نہیں ہے، جو بھی سامنے آگیا وہی مخاطب ہے، اے مخاطب! تو جانتا نہیں؟ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ: کیا تو جانتا نہیں؟ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہ بے شک اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کی علاوہ کوئی خیر خواہ نہ کوئی مددگار۔ ولی: حمایتی، حمایت کرنے والا، خیر خواہ، سب کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ: کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے، كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ: جیسے کہ سوال کیے گئے تھے موسیٰ علیہ السلام اس سے قبل، وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: جو کوئی شخص کُفر کو لے لے ایمان کے بدلے، جو کوئی ایمان کا تبادلہ کُفر کے ساتھ کرلے، پس وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا: کہ لوٹا دیں تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر، تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنادیں، حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ: یہ وَدَّ کا مفعول لہ ہے، کیوں چاہتے ہیں؟ حسد کے سبب سے، حسد کی وجہ سے، مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ: ترکیبی لحاظ سے وَدَّ کے متعلق بھی ہوسکتا ہے اور حَسَدًا کی صفت بھی بن سکتا ہے (مظہری)، اگر وَدَّ کے متعلق کریں گے تو ترجمہ ہوگا وَدَّ مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ: دلوں کی گہرائی سے چاہتے ہیں، یہ اُن کا چاہنا دلوں کی گہرائی سے ہے، تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں کافر بنادیں، ہمارے محاورے میں بھی یہ لفظ اسی طرح سے آیا کرتا ہے، عبارت

یوں ہو جائے گی وَدَّ مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ: وہ لوگ اپنے تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں کافر بنادیں۔ اور اگر اس کو حَسَدًا کی صفت بنائیں تو پھر عبارت ہوگی حَسَدًا مُّنْبَعِثًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ حسد کی وجہ سے، ایسا حسد جو اُن کی دلوں کی گہرائیوں سے اٹھنے والا ہے، یعنی اُس کا منشا کوئی تمہاری حرکت نہیں، بلکہ ان کے دلوں سے پیدا ہونے والا حسد ہے، دلوں کی طرف سے اٹھنے والا حسد ہے جس کی وجہ سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں لوٹا کر کافر بنادیں، مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ: بعد اس کے کہ اُن کے لئے حق واضح ہو گیا، یعنی ان کا یہ چاہنا حق کے واضح ہونے کے بعد ہے۔ فَاعْفُوْا: یہ عفو سے ہے بمعنی معاف کر دینا، فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا دو لفظ آگئے عفو اور صفح، عفو معاف کر دینے کو کہتے ہیں، اور صفح درگزر کر لینے کو کہتے ہیں، ''معاف کر دو، درگزر کر جاؤ''، لیکن ان دونوں لفظوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے یوں کہہ دیا جاتا ہے: ''العفوُ ترکُ عُقُوبةِ المُذْنِبِ والصفحُ ترکُ تثریبِه'' (آلوسی) مذنِب: گناہگار آدمی، قصوروار آدمی۔ گناہ گار آدمی کو سزا دینا ترک کر دینا کہ مجرم کو سزا نہ دی جائے یہ عفو ہے۔ اور اُس پر ملامت کرنے کو بھی ترک کر دیا جائے یہ صفح ہے، دونوں لفظوں کا حاصل یہ ہوگا کہ نہ سزا دو اور نہ زبان سے ملامت کرو، بالکل درگزر کر جاؤ، ایسا کر دو جیسا کہ کوئی چیز ہی نہیں ہے، سزا بھی نہ دو اور ملامت بھی نہ کرو، اور یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ جب انسان بالکل ہی درگزر کر جائے، اور اُس کی کسی بات کو، کسی حرکت کو، اور کسی فعل کو اہمیت ہی نہ دے، اِن کا پیچھا چھوڑو، اِن سے درگزر کرو، اِنہیں معاف کرو اور درگزر کرو، حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے، جب اِن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے گا چاہے وہ حکم جہاد کا ہو، سزا دینے کا ہو، تو پھر اُس کے مطابق عمل کرنا، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہ آئے (جس وقت حَتّٰی کے بعد مضارع آیا ہوا ہو تو اِس کا ترجمہ محاورۃً نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے) جب تک اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم نہ لے آئے اُس وقت تک تم انہیں معاف کرو اور درگزر کرو، اللہ کے حکم کا انتظار کرو کہ اِن کے بارے میں اللہ کیا حکم نافذ کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ اِن کے بارے میں کوئی حکم نافذ کر دے گا تو پھر اُس کے مطابق عمل کرنا، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ: نماز کو قائم رکھو، وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ دیتے رہو، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ: مِّنْ خَیْرٍ مَا کا بیان ہے، جو بھلائی تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو گے پاؤ گے اُس کو اللہ کے پاس، یعنی اُس کا بدلہ تمہیں اللہ کے پاس مل جائے گا، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ وَقَالُوْا: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا: یہ یہودیوں کا قول ہے، ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہی شخص جو یہودی ہوا، اَوْ نَصٰرٰی: اَوْ کا مطلب یہ ہوا کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ نَصٰرٰی یہ نصرانیوں کا قول ہے، قَالُوْا کی ضمیر یہود و نصاریٰ دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یہود و نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز نہیں جائے گا مگر وہی جو یہودی ہوا یا وہی جو نصرانی ہوا۔ ''مگر وہی جو یہودی ہوا'' یہ یہود کہتے ہیں، اور ''مگر وہی جو نصرانی ہوا'' یہ نصاریٰ کہتے ہیں۔ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ: امانی کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزر چکا، امانی اُمنیۃ کی جمع ہے، اور یہ اُس خیال اور خواہش کو کہتے ہیں جو انسان اپنے دل کے اندر پکا لیتا ہے، ''یہ ان کی خواہشات ہیں، یہ ان کی دلوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں''، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنی برہان، برہان دلیل قطعی کو کہتے ہیں، لے آؤ تم اپنی برہان، یعنی اس دعوے پر، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اگر تم سچے ہو۔ بَلٰی: کیوں نہیں جائے گا کوئی دوسرا شخص، یعنی یہود و نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں کیوں

نہیں جائے گا، اللہ تعالیٰ کا ضابطہ یہ ہے، جس پر یہ ضابطہ فٹ آجائے، جس پر یہ ضابطہ پورا اتر آئے وہ جنتی ہے، مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ: جو کوئی شخص تابع کردے اپنی ذات کو اللہ کے، جو اپنے وجہ کو اللہ کا تابع بنادے، وجہ بول کر ذات مراد ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ کا تابع بنادے، وَهُوَ مُحْسِنٌ: اس حال میں کہ وہ مخلص ہو، محسن سے دل کی کیفیت کی طرف اشارہ کردیا، کہ ظاہری طور پر مطیع ہو اور قلب سے بھی اُس کے اندر صفتِ احسان ہو، اخلاص کے ساتھ جو شخص اپنے آپ کو اللہ کا تابع کردے گا، فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ: پس اس کے لئے اُس کا اجر ہے اُس کے رب کے پاس، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ اُن کے اوپر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ اَسْتَغْفِرُ اللّٰه

تفسیر

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے لفظ میں ترغیب کا پہلا پہلو

ابتدائے قرآن پاک سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب پہلی دفعہ آیا ہے، اور قرآنِ کریم میں پھر یہ متعدد بار آئے گا جس کا شمار تقریباً اٹھاسی دفعہ ہے، اور یہ پہلا موقع ہے جس میں اِس لفظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو خطاب کیا ہے۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے لفظ کے ساتھ خطاب کر کے جو احکام دیے جاتے ہیں تو اُن احکام کی اہمیت ہوتی ہے، اور یہ اہمیت دو طرح سے ہے، ایک تو اس طرح کہ ایمان لانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ ہے، جس وقت آپ ایمان لے آتے ہیں اور یوں کہہ دیتے ہیں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، جو کہ ایمان لانے کا ایک عنوان ہے، تو اِس کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے اللہ کو الٰہ مان لیا، معبود مان لیا، اس کے علاوہ کوئی دوسرا الٰہ نہیں، اور محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول مان لیا، کہ اللہ تعالیٰ کے احکام آپ ﷺ کی وساطت سے ہمیں ملیں گے اور ہم اُن احکام کے مطابق زندگی گزاریں گے، کلمے کے الفاظ جو آپ اپنی زبان سے ادا کیا کرتے ہیں اصل کے اعتبار سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ یہ اطاعت کا معاہدہ ہے، صرف یہی نہیں کہ چند بے حقیقت سے الفاظ زبان سے ادا کرلیے، اور اس طرح سے انسان کفر کی صف سے نکل کر ایمان کی صف میں آجائے، اتنی بات نہیں ہے، بلکہ جس طرح سے باقاعدہ عقد اور معاہدہ ہوا کرتا ہے اسی طرح سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، جس کے ضمن میں تمام ضروریاتِ دین کو تسلیم کرنا آگیا، اور اِس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد ہوگیا کہ ہم الٰہ آپ کو ہی سمجھتے ہیں، معبود آپ ہی ہیں، لہٰذا بندگی کا تعلق آپ کے ساتھ ہی ہوگا، کسی دوسرے کے ساتھ نہیں۔ اِس کلمے کی حقیقت یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت جو کرنی ہے اور اُس کے ساتھ جو بندگی کا معاملہ کرنا ہے تو طریقہ ہم کہاں سے سیکھیں گے؟ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کس طرح کی جائے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کس طرح کی جائے، کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور اُن کو ہم اختیار کریں، اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور ہم اُنہیں ترک کردیں، (بندگی اور عبادت کا یہی مفہوم ہے)، تو وہ ہم کہاں سے سیکھیں گے؟ اپنی عقل کے ساتھ معلوم نہیں کریں گے، کوئی اور ذریعہ اختیار نہیں کریں گے، سرورِ کائنات محمد ﷺ کو ہم

آپ کا قاصد سمجھتے ہیں، اس لیے جو یہ بتائیں گے ہم اُنہی کو آپ کے احکام سمجھتے ہوئے مانیں گے، مرضیات اور نامرضیات کی تفصیل جتنی ہے ہم اِنہی سے پوچھیں گے، یہ ہے اِس کلمے کا حاصل، اور اِس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا اور سرورِ کائنات ﷺ کی اتباع کا عہد ہوگیا، جس میں سارا دین آ گیا۔ اب ایک شخص میرے ساتھ یہ عہد کرلیتا ہے، کہتا ہے کہ میں آج سے آپ کے ساتھ دوستی لگاتا ہوں، میرا آپ کے ساتھ معاہدہ رہا، میں آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہوں، کہ آپ جو کچھ کہا کریں گے میں اُس کو تسلیم کروں گا، یہ معاہدہ ہوگیا۔ دوسری طرف سے یہ بات ہے کہ جب وہ تسلیم کرے گا اور مانے گا تو میری طرف سے اُس کو انعام واکرام ہوگا۔ اب ایک کام پیش آ گیا، تو ایک تو یہ ہے کہ میں نام لے کر کہہ دوں کہ زاہد! فلاں کام کرو، زید! یہ فلاں کام کردو، اِس عنوان میں ترغیب نہیں ہے، جذبات کا ابھارنا نہیں ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ میں کہوں کہ بھئی! جس نے میرے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کیا ہے، آؤ آج یہ ضرورت پیش آ گئی، یہ کام کرو، جس نے میرے ساتھ یہ عہد کیا ہوا ہے کہ ہم تیری ہر بات مانیں گے، میں یہ کہتا ہوں، آؤ، اِس کے مطابق چلو۔ اب آپ جانتے ہیں کہ یہ عنوان جذبات کو برانگیختہ کرنے والا ہے، کہ جن کو یہ کہا جارہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہم ہر بات مانیں گے، جب اِس عنوان کے تحت ان کو بلایا جائے گا تو پھر اُن کے اندر انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی، اُن کو وہ عہد یاد آ جائے گا، کہ جو ہم نے عہد کیا ہوا ہے اُس کے مطابق ہم پابند ہوگئے کہ اب اِس کام کو اس طرح سے کریں۔ ایک تو اِس میں ترغیب اس طرح سے پیدا ہوسکتی ہے، کہ ایمان یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا عہد ہے، تو ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کا معنی یہ ہوگا کہ اے وہ لوگو! جنہوں نے میرے ساتھ یہ عہد کرلیا ہے کہ میرے احکام مانو گے، میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ یہ کام اس طرح سے کرو، تو نام لے کر حکم دیا جائے تو اِس میں ترغیب کا وہ پہلو نہیں ہوتا جو اِس صفت کے ذکر کرنے میں ترغیب کا پہلو ہے، اس میں انسان کے جذبات اُبھر آتے ہیں، کہ جب ہم نے معاہدہ کیا ہوا ہے، ہاتھوں میں ہاتھ دے دیا اور عقد پکا کرلیا، اب ہمارے لیے مناسب نہیں ہے کہ جو ہم نے عہد کیا ہے اس کے مطابق نہ چلیں، فرمانبرداری کا عہد کرنے کے بعد اور تسلیم کرلینے کے بعد پھر بات نہ مانی جائے یہ مناسب نہیں ہے، اِس طرح سے انسان اُن احکام کے ماننے کی طرف زیادہ متوجہ ہوجائے گا۔ تو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ جب خطاب کیا جائے گا تو اِس میں گویا اطاعت کی ترغیب ہے، اور ایک عہد کی یاددہانی ہے۔ یا تو اِس طرح سے اِس میں ترغیب کا پہلو نکلتا ہے۔

ترغیب کا دُوسرا پہلو

یا دُوسرا پہلو بھی اِس میں ہے، وہ یہ کہ آپ کے سامنے دوسرے پارے میں ایک لفظ آئے گا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (آیت:۱۶۵) کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں بڑے سخت ہوتے ہیں، اُن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت بڑی شدید ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت لفظِ عشق تو استعمال نہیں کیا، جو بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ہو قرآنِ کریم میں عشق کا مادہ مستعمل نہیں ہے، لیکن عشق کا مفہوم کیا ہے؟ شدتِ حُب، محبت جس وقت شدت اختیار کی جاتی ہے کہ اُس کے اندر بے کلی کی کیفیت پیدا ہوجائے تو اُس کو عشق کہہ دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ: مؤمنوں کو اللہ کے

ساتھ محبت بڑی سخت ہوتی ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کے لئے اپنی کتاب کے اندر یہ اعلان کر دیا کہ مؤمن میرے عاشق ہوتے ہیں، اور جو بھی مؤمن ہوگا اُس کو میرے ساتھ بہت سخت محبت ہوگی۔ جب اللہ تعالیٰ نے محبت کا اعتراف کر لیا، کہ مؤمنوں کو اللہ کے ساتھ محبت بہت ہوتی ہے، اور بات بھی ایسے ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے حدیث شریف میں جو ایمان کا معیار ذکر فرمایا ہے اُس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ باقی سب کے مقابلے میں محبت کو اولیت کا درجہ دیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی محبت اور اللہ کے رسول کے ساتھ بھی محبت ساری کائنات کے مقابلے میں زیادہ ہونی چاہیے، تب جا کے انسان کا ایمان کامل ہوتا ہے۔[1]

عشق و محبّت کے تقاضے

اور عشق اور محبت جانثاری اور سرفروشی کا مطالبہ کرتی ہے، کہ جس کے ساتھ عشق اور محبت کا دعویٰ کر دیا جائے تو پھر اس دعوے کے ساتھ نافرمانی جوڑ نہیں کھاتی، عاشق اپنے معشوق کا اور محب اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے، ناز برداری کے درجے تک اُس کی اطاعت کی جاتی ہے، اُس کے حکم کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، سب سے بڑی حکمت اُس میں یہی ہوتی ہے کہ ہمارے محبوب کا حکم ہے، اور اگر ہم اِس کے مطابق چلیں گے تو وہ خوش ہو جائے گا، اگر ہم اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ناراض ہو جائے گا۔ اور جو محبِ خالص ہوتا ہے، خالص محبت رکھنے والا ہوتا ہے، اُس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سب سے بڑی سزا ہے، اور محبوب کی رضامندی اس کے لئے سب سے بڑی بشارت ہے، کہ اگر اُس کو معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب میرے پر خوش ہے اور میری یہ ادا اُس کو پسند ہے تو وہ اُس ادا پر جان دیتا ہے، اور اگر اس کو پتہ چل جائے کہ فلاں کام اگر میں نے کیا تو میرا محبوب مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور میری طرف رخ نہیں کرے گا تو سچا محب کسی صورت میں بھی اُس حرکت کے قریب نہیں جا سکتا جس میں یہ اندیشہ ہو کہ میرا محبوب یا میرا معشوق مجھ سے روگردانی کر جائے گا۔ عاشقِ صادق کے نزدیک محبوب کی رضا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے، اور عشق اور محبت بھی انسان کو اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے، یہ جذبہ ایسا ہے کہ اس کے پیدا ہو جانے کے بعد پھر نافرمانی، سرکشی، اور بغاوت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ محبت اور عشق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پھر انسان اپنا قلب معشوق کے سپرد کر بیٹھتا ہے، اور جس کی حکومت قلب پر ہو گئی تو سمجھو کہ صدر مقام قابو آ گیا، جب دار الخلافہ ہی قابو آ جائے تو سارے ملک پر ہی قبضہ ہو جاتا ہے، ایک ایک بستی اور ایک ایک قریہ پر تو کوئی بادشاہ قبضہ نہیں کیا کرتا، جو مرکز پر قابو پا گیا اُس نے ساری حکومت لے لی۔ تو اسی طرح محبت کے ساتھ دل پر قبضہ ہو جاتا ہے، دل پر حکومت قائم ہو جاتی ہے، جب دل پر حکومت قائم ہو گئی تو اب باقی اعضاء میں کیسے جرأت ہو سکتی ہے کہ اُس کے احکام کی فرمانبرداری نہ کریں، وہ تو احکام کے مطابق چلیں گے۔ عشق اور محبت کا یہ تقاضا ہے۔

ضابطے کی اور محبّت کی اطاعت میں فرق!

اطاعت تو انسان کیا ہی کرتا ہے، لیکن جو اطاعت عشق اور محبت کے جذبے سے ہوا کرتی ہے یہ اطاعت لذیذ ہے، مزے لے لے کر انسان اطاعت کیا کرتا ہے۔ اور جو صرف ایک حاکمیت کے درجے میں اطاعت ہوتی ہے اُس میں انسان کے قلب میں

---

(۱) بخاری ص ۷۔ مشکوٰۃ ص ۱۲ ولفظ الحدیث: ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا الخ

وہ سرور نہیں ہوتا، وہ ایک ضابطے کی اطاعت ہوتی ہے۔ ضابطے کی اطاعت میں اور عشق و محبت کی اطاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم استاذ سے محبت نہیں رکھتا، تعلق نہیں ہے، اب وہ استاذ اس کو کسی دن کام کے لئے بلالے تو استاذ کے کہنے کی وجہ سے وہ کام کرے گا تو ضرور، لیکن دل میں کڑھ رہا ہوگا، بہت جلدی تھک جائے گا اور بیزار ہو جائے گا، اُس کے دل میں یہ جذبہ ہوگا کہ اِس ذمہ داری کو ادا کر کے جتنی جلدی فارغ ہو کر چلا جاؤں اتنا ہی اچھا ہے، وہ کام ایسے کرے گا جیسے دباؤ میں آ کر انسان کرتا ہے، اس کے کام میں جان نہیں ہوگی۔ اور ایک طالب علم محبت رکھتا ہے، اور متلاشی رہتا ہے کہ استاذ مجھے خدمت کا موقع دے، اور جب استاذ اُس کو کام کے لئے بلالے تو وہ کام بھی کرے گا اور قلب کے اندر سرور اور خوشی بھی محسوس کرے گا، اور اس کا دل یہ چاہے گا کہ جتنی دیر میں کام میں لگا رہوں اتنا ہی اچھا ہے، اور کام سے فارغ ہو کر پوچھے گا کہ کوئی اور کام بتائیے، مقصد اُس کا یہ ہوتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ وقت اِسی خدمت کے اندر گزارنے کا موقع ملے۔ یہ محبت کے کچھ آداب اور اس کے کچھ تقاضے ہیں۔

حاکمیت اور محبوبیت والا پہلو

جب ایمان والوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت لگالی تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ عشق کا دعویٰ کر دیا، اور اللہ نے تسلیم کر لیا کہ واقعی جو مؤمن ہیں وہ میرے عاشق ہیں، میرے ساتھ بڑی محبت رکھتے ہیں۔ تو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب ایسے ہی خطاب ہے جیسے کوئی کہے او عاشقو! جنہوں نے عشق کا دعویٰ کیا ہوا ہے، جو محبت کے مدعی ہیں، جنہوں نے ہمارے ساتھ عقدِ محبت باندھ لیا، ہمارے عاشق ہو گئے، اب ہم اُنہیں یہ حکم دیتے ہیں۔ اب محب کہہ کر، عاشق کہہ کر، اپنے چاہنے والے کہہ کر، جس وقت کسی کو حکم دیا جائے تو پھر کیسے توقع ہے کہ وہ نافرمانی کرے گا؟ اس لیے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ جب خطاب کیا جائے تو آپ کو آپ کی حیثیت یاد دلا دی جاتی ہے، کہ تم ہو کون جن کو حکم دیا جا رہا ہے؟ تم وہ ہو جنہوں نے عشق کا دعویٰ کیا ہوا ہے، اور ہمارے ساتھ محبت لگائی ہے، اب محبت اور عشق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یوں کہتے ہیں اب اس طرح سے چلو۔ اب اگر اُس طرح سے چلو گے تو آپ اپنے محبت کے دعوے میں سچے ہو، اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم آ جانے کے بعد کسی اور طرف جھانکو اور کسی دوسرے کی رضا جوئی کی کوشش کرو تو پھر اپنے دعوائے عشق کے اندر جھوٹے ہو، کیونکہ عاشق ہو جانے کے بعد معشوق کے علاوہ عاشق کے سامنے کسی دوسرے کی رضا مقدم نہیں ہوتی، سب سے مقدم معشوق کی رضا ہوتی ہے، اُس کے لئے انسان اپنی دولت بھی برباد کر دیتا ہے، اپنا خاندان بھی چھوڑ دیتا ہے، ماں باپ سے فرار ہو جاتا ہے، استاذ سے فرار ہو جاتا ہے، برادری سے فرار ہو جاتا ہے، عزت ذلت اس کے نزدیک کوئی چیز نہیں، معشوق کی رضا سب سے مقدم ہوتی ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کی محبت لگالی جائے گی تو اِس میں بھی وہی جذبات اُبھارے جائیں گے، اس لیے جب بھی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ خطاب کیا جائے تو اس وقت چوکنا ہو جانا چاہیے کہ دیکھو! ہماری حیثیت ہمیں یاد دلا کر اب کوئی حکم دیا جا رہا ہے، معلوم ہو گیا کہ یہ حکم اہم ہے، اور اِس کا پورا کرنا اور اس کے مطابق چلنا ہمارے منصب کا تقاضا ہے، اگر ہم اِس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ہم ایسے ہی لفظوں لفظوں میں محبت کے دعوے کرتے ہیں، اور لفظوں لفظوں میں اطاعت کے نعرے لگا رہے ہیں، اور اُس کے مطابق ہمارا عمل نہیں ہے۔ اِس لفظ کو جب اس حیثیت سے سنا

جائے گا تو یقیناً انسان کے قلب میں اطاعت کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ تو دونوں طرح سے ہی ترغیب کا پہلو ہو گیا، ایک تقریر کے مطابق اس میں حاکیت والا پہلو ہے، اور دوسری تقریر کے مطابق محبوبیت والا پہلو ہے۔

گفتگو میں لفظی حُسن قائم رکھنا چاہیے

تو یَاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے ساتھ یہاں آپ کو ایک حکم دیا جارہا ہے۔ اس حکم کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیجئے کہ بسا اوقات دو لفظ ہوتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہوتا ہے، لیکن لفظی ادب کے طور پر ایک لفظ کا استعمال کرنا اچھا ہوتا ہے، اور ایک لفظ کا استعمال کرنا اچھا نہیں ہوتا، چاہے مفہوم دونوں کا ایک ہوتا ہے۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کا جی متلانے لگ جائے اور طبیعت خراب ہو تو یوں نہ کہا کرو: ''خَبُثَتۡ نَفۡسِیۡ!'' یوں کہا کرو: ''لَقِسَتۡ نَفۡسِیۡ!''[1] اب لَقِسَتۡ اور خَبُثَتۡ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ میرا جی خراب ہو رہا ہے، میرا دل متلا رہا ہے، کبھی کبھی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ قے کی طرف طبیعت مائل ہو گئی، دل متلانا شروع ہو گیا۔ اس کیفیت کو ادا کرنے کے لئے عربی میں دو لفظ ہیں: ''خَبُثَتۡ نَفۡسِیۡ'' اور ''لَقِسَتۡ نَفۡسِیۡ'' آپ ﷺ نے فرمایا: خَبُثَتۡ نَفۡسِیۡ نہ کہا کرو، لَقِسَتۡ نَفۡسِیۡ کہا کرو، ترجمہ دونوں کا ایک ہے، لیکن خَبُثَتۡ کے اندر اپنے دل کی طرف خبیث ہونے کی نسبت جو کر دی تو یہ خبث کی نسبت لفظی ادب کے خلاف ہے، اگرچہ خَبُثَتۡ کا مفہوم وہی ہے جو لَقِسَتۡ کا ہے، یعنی یہ لفظی حسن ہے کہ جس وقت لفظ استعمال کرو تو بھی اچھے لفظ استعمال کرو، ایسا لفظ استعمال میں نہ آئے کہ جو عرفاً یا کسی لغوی دلالت کے اعتبار سے اس میں کوئی قباحت کا معنیٰ پیدا ہو جائے۔ اس سے بھی واضح مثال سے آپ کو سمجھا دوں، ''والد صاحب، اَبا جی، ماں کا خصم'' اِن کے مفہوم میں کوئی فرق ہے؟ مفہوم تو ایک ہے، اب اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ کے والد صاحب تشریف لا رہے ہیں، یا کوئی کہتا ہے کہ آپ کے اَبا جی آ گئے، تو اس کا آپ کی طبیعت پر کتنا اچھا اثر پڑتا ہے، اور اگر کوئی کہہ دے کہ تیری ماں کا خصم آ گیا، اِس کا کتنا بُرا اثر پڑتا ہے، یعنی لفظوں کا مفہوم ایک ہے لیکن مفہوم ایک ہونے کے باوجود دیکھو! اِن لفظوں کے اثرات کیسے ہیں؟ اس لیے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ''والد صاحب'' کہیں، اور اگر آپ ''ماں کا خصم'' کہیں گے تو بے ادبی ہے، چاہے لغوی طور پر مفہوم اس کا ایک ہی ہے۔ اسی طرح آپ کے پاس ایک معزز مہمان آتا ہے، آپ اُسے کہیں گے کہ یہ کھانا کھا لیجئے، تناول فرما لیجئے، یہ چیز نوش فرما لیجئے، ایک تو یوں کہا کرتے ہیں، اِس کے اندر ادب کا پہلو ہے، اور ایک آدمی کے اوپر ناراض ہوتے ہوئے، جس طرح سے گھروں میں بسا اوقات مائیں ناراض ہو کر بچے سے کہتی ہیں کہ ''نگل لے!'' اب دونوں میں لغوی حیثیت سے تو کوئی فرق نہیں ہے، مفہوم تو ایک ہے، لیکن ایک لفظ میں جو محبت ادب اور شفقت نمایاں ہے دوسرے لفظ میں وہ بات نہیں ہے۔ تو بسا اوقات دو لفظ ہوتے ہیں، چاہے اُن کا مفہوم ایک جیسا ہو لیکن ایک لفظ میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی قباحت موجود ہو تو اُس کو استعمال نہیں کرنا چاہیے، اور دوسرا لفظ جس میں کسی حیثیت سے کوئی قباحت موجود نہیں ہے اُس کو استعمال کرنا چاہیے۔

---

(۱) بخاری ۲ / ۹۱۳، کتاب الادب، باب لا یقل خبثت نفسی / مشکوۃ ۲ / ۴۰۸ باب الاسامی، فصل اول.

لفظ ''رَاعِنَا'' کے استعمال میں یہود کی شرارت

یہاں بھی دو لفظ آپ کے سامنے آ رہے ہیں، اس لیے اُن کا ترجمہ نہیں کیا گیا، یہاں بحث صرف لفظی ہے، مفہوم سے بحث نہیں ہے، ایک لفظ ہے رَاعِنَا، اور ایک ہے اُنْظُرْنَا۔ رَاعِ: یہ مراعاۃ سے امر کا صیغہ ہے، ہماری رعایت رکھئے۔ رَاعِ: تُو رعایت رکھ۔ نَا: ہماری۔ ہمارا لحاظ کیجئے، ہماری رعایت رکھئے۔ اور دوسرا لفظ ہے اُنْظُرْنَا، ہماری طرف نظر فرمایئے، نظرِ شفقت فرمایئے، ہماری طرف دیکھئے، ہمارے حال پر نظر کیجئے، مفہوم دونوں کا ایک جیسا ہے، لیکن یہود کی زبان میں رَاعِنَا کا لفظ احمق کے معنی میں ہے، یا رَاعِنَا میں عین کے نیچے کسرہ ہے، اب جس طرح سے ہم جیسے قاری ہوتے ہیں، جہاں کھینچنا نہ ہو وہاں بھی دو ہاتھ کھینچ دیتے ہیں، اگر رَاعِ کی عین کے کسرے کو کھینچ دیں اور رَاعِیْنَا بنا دیں، یہ کسرہ کھینچنے کا تو نہیں ہے لیکن اگر کھینچ دیں تو کیا بن جائے گا؟ رَاعِیْنَا، اور اِس کا معنی بن گیا: ہمارا چرواہا۔ رَاعِی: چرانے والا۔ رَعٰی یَرْعٰی: چرانا۔ اور آگے نَا مضاف الیہ ہے، رَاعِیْنَا: ہمارا چرواہا۔ یہود کی یہ عادت تھی کہ وہ شرارت کرتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے، آپ ﷺ بات کرتے، اور کسی بات کو دوہروانا مقصود ہوتا کہ یہ بات دوبارہ کہہ دیجئے، ہمیں سمجھا دیجئے، ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ہمارا ذرا خیال فرمالیں، اُس وقت وہ لفظ استعمال کرتے رَاعِنَا، اور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے (چونکہ یہ لفظ عربی مفہوم کے اعتبار سے بہت شاندار ہے، اچھا ہے، کہ ایک بات ہوگئی لیکن سمجھ نہیں آئی تو کہہ دیا: رَاعِنَا، یعنی ہمارا خیال فرمایئے، اِس بات کو دوبارہ کہہ دیجئے، ہمیں سمجھا دیجئے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اِس لفظ کو استعمال کرنے لگ گئے، چونکہ اس لفظ کے اندر بظاہر کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن یہود اپنی مجلسوں میں جا کر ہنستے، کہ دیکھو! ہم نے سب کو بے وقوف بنا لیا، ہم رَاعِنَا بمعنی احمق کہتے ہیں، اور ہماری طرف دیکھ کر اُنہوں نے بھی اپنے رسول کو احمق کہنا شروع کر دیا۔ یا وہ مجلس کے اندر بیٹھتے اور رَاعِنَا کی بجائے دِل میں خباثت کی بناء پر عین کے کسرہ کو ذرا کھینچ لیتے، بظاہر معلوم ہوتا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا خیال فرمایئے، حالانکہ وہ توہین آمیز جذبے کے ساتھ یہ لفظ کہتے ''اے ہمارے چرواہے!''، مجلس میں اس طرح سے بات کر کے اپنی خباثتِ نفس کا اظہار کرتے اور اپنی مجلسوں میں جا کر ہنستے۔

''السلام علیکم'' کہنے میں یہود کی خباثت

جیسے حدیث شریف میں واضح طور پر آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت یہود تمہارے پاس آتے ہیں تو یہ ''السلام علیکم'' نہیں کہتے، تم خیال کیا کرو، بلکہ یہ دبی زبان سے ''السام علیکم'' کہہ دیتے ہیں اور لام کھا جاتے ہیں، اور لام کے کھا جانے کے ساتھ اس میں بددُعا والا معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ ''السلام علیکم'' کا معنی تو ہے کہ تم پر سلامتی ہو، یہ دُعا ہے، اور ''السام علیکم'' کا معنی ہے: تم پر موت واقع ہو، ''سام'' موت کو کہتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ تمہاری مجلس میں آتے ہیں تو ''السام علیکم'' کہتے ہیں، اس لیے تم ان کو ''وعلیکم السلام'' نہ کہا کرو، بس ''علیکم'' کہہ دیا کرو،[1] یعنی ان کی وہ بددُعا ان کی طرف ہی رَدّ کر دیا کرو۔ تو اس قسم کی وہ شرارتیں کرتے تھے، اور ان کی اس قسم کی شرارتوں کی طرف نشاندہی قرآنِ کریم میں مختلف الفاظ سے کی گئی ہے، سب

---

(۱) ابوداؤد ۲/۳۵۱ باب فی السلام علی اہل الذمہ/ نیز بخاری ۲/۹۲۵ باب کیف یرد علی اہل الذمہ/ مشکوٰۃ ۲/۳۹۸ باب السلام۔ فصل اول۔

سے واضح لفظ جو اِس سلسلے میں آیا ہے وہ سورۂ مجادلہ میں ہے اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ يَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ: جب یہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو آپ کو سلام ایسے طریقے سے کرتے ہیں جس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے سلام نہیں کیا۔ اور پھر اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اِس کی وجہ سے ہمیں عذاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر یہ اللہ کا سچا رسول ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا جب ہم اِس طریقے سے اِس کے لئے لفظ بولتے ہیں۔ تو اس قسم کی شرارت کرنا اُن کی عادت تھی، کہ ظاہر کچھ ہوتا اور ان کا قصد اور مقصد کچھ کا کچھ ہو جاتا۔

''رَاعِنَا'' کی بجائے ''اُنْظُرْنَا'' کہنے کا حکم

تو اِس لفظ کے اندر اس اعتبار سے قبیح مفہوم آ گیا، کہ اِس میں دوسری زبان کے اعتبار سے احمق والا معنیٰ ہے، یا اس لفظ کے پردے میں کسی شخص کو اپنے دل کی خباثت ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے، کہ وہ رَاعِنَا امر کا صیغہ بنانے کی بجائے راعی اسم فاعل کا صیغہ بنا کر معنی خراب کر لیتا ہے، اور لفظ اُنْظُرْنَا میں اِس قسم کی خباثت نہیں کی جاسکتی، اُنْظُرْ: نظر کر۔ نَا: ہم پر۔ ہم پر نظر کیجئے، ہمارا خیال رکھئے، ہم پر شفقت فرمائیے، نظرِ شفقت فرمائیے، اِس کا مفہوم یہ بن گیا۔ تو جب یہود نے اس لفظ کو غلط جذبے کے تحت استعمال کرنا شروع کیا تو یہ آدابِ نبوی کے خلاف ہے، اس لیے مجلس نبوی کے اندر اس لفظ کا استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممنوع قرار دے دیا گیا، تاکہ کسی خبیث کو یہ لفظ استعمال کر کے اپنے قلبی جذبات کے اظہار کا موقع ہی نہ ملے، کیونکہ صحابہ کرام تو بالکل خلوص کے ساتھ کہتے تھے رَاعِنَا، اور بالکل صحیح مفہوم تھا، لیکن اگر یہ لفظ مستعمل رہے تو وہ لوگ بھی اپنی خباثت کر سکتے ہیں جو اِس کو غلط مفہوم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس لیے اس لفظ کا استعمال کرنا ہی مجلس نبوی کے اندر ممنوع قرار دے دیا گیا، اور اس کی بجائے اُنْظُرْنَا کی تلقین کر دی گئی۔ اب یہاں جس وقت ہم ترجمہ کریں گے تو چونکہ یہ بحث لفظی ہے، مفہوم تو دونوں کا ایک جیسا ہے، تو ہم ترجمے میں یوں نہیں کہیں گے، کہ ''اے ایمان والو! نہ کہا کرو کہ تو ہماری رعایت رکھ، بلکہ کہا کرو کہ تو ہم پر نظر فرما''، کیونکہ اِن دونوں میں فرق واضح کرنا آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا، کیونکہ یہ مفہوم کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے، بلکہ یہ ایک لفظی رعایت ہے، اس لیے ترجمہ یونہی ہوگا کہ ''نہ کہا کرو رَاعِنَا، اور کہا کرو اُنْظُرْنَا''، یہ لفظوں کی تلقین ہے۔

لفظ ''رَاعِنَا'' پر ایک لطیفہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ایک لطیفہ بھی آتا ہے، کہ ایک آدمی حضرت سے ایک دفعہ پوچھنے لگا کہ میں جس وقت تلاوت کروں تو رَاعِنَا کا لفظ چھوڑ دیا کروں؟ کیونکہ ترجمے میں لکھا ہوا ہے کہ ''اے ایمان والو! رَاعِنَا نہ کہا کرو''۔ تو آپ نے فرمایا کہ رَاعِنَا تو پڑھا کر، لیکن ترجمہ دیکھنا چھوڑ دے [ملفوظات حکیم الامّت ۲۵/۱۲۰] کیونکہ بغیر استاذ کے جس وقت انسان اپنے طور پر بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات خرابی کر بیٹھتا ہے۔

تو یہاں آپ کو روکنا مقصود نہیں کہ آپ تلاوت کرتے ہوئے بھی رَاعِنَا نہ پڑھیں، بلکہ اُس مجلس کے اندر اس لفظ کے استعمال کے اوپر پابندی لگا دی، جس سے یہ اصول نکل آیا کہ اگرچہ ایک بات ٹھیک ہو لیکن اگر سننے والے یا بولنے والے اُس کا غلط

مفہوم لیتے ہیں تو ایسے لفظ کو استعمال کرنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ یہاں یہی بات ہوئی۔ اے ایمان والو! رَاعِنَا نہ کہا کرو، اُنْظُرْنَا کہہ لیا کرو۔ اب اُنْظُرْنَا کے پردے میں چونکہ یہود اس قسم کی خباثت کر نہیں سکتے، لہٰذا جو بھی لفظ اُنْظُرْنَا بولے گا وہ صحیح مفہوم میں بولے گا، اور رَاعِنَا کے لفظ میں وہ اس قسم کی گڑبڑ کر سکتے تھے، اس لیے اِس لفظ کے استعمال پر پابندی لگادی گئی۔ اور وَاسْمَعُوْا کا مطلب یہ ہے کہ توجہ سے سنا کرو، خیال کر کے سنا کرو، تاکہ بار بار متوجہ کرنے کی، پوچھنے کی اور دوہرانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے، توجہ سے سنو، وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اور جو یہ لفظ بُرے ارادے کے ساتھ استعمال کرتے تھے وہ کافرین کا مصداق ہیں، اور اِن کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے، کہ آج یہ دل کی بھڑاس اس طرح سے نکالتے ہیں اور سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے ضمن میں اپنے دلوں کی خباثت کو پورا کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہوگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

یہود اور مشرکین کی چالبازیوں سے ہوشیار رہنے کی ترغیب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: کافر لوگ نہیں چاہتے، مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ: یہ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کا بیان ہے، خواہ وہ کافر لوگ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے ہوں، اور لَا الْمُشْرِكِیْنَ کے اُوپر جو لَا ہے یہ مَا یَوَدُّ کے اندر جو نفی کا معنی ہے اُس کی تاکید کے لئے ہے، اگر لفظوں کے تحت آپ ترجمہ کریں گے تو بات اس طرح سے ہوگی "جو لوگ کافر ہیں اہل کتاب میں سے وہ نہیں چاہتے اور نہ مشرکین چاہتے ہیں"، تو اِس "نہ" کے ساتھ اُسی نفی کی تاکید کرنی مقصود ہے جو مَا یَوَدُّ کے اندر آئی ہوئی ہے۔ "نہیں چاہتے کہ اُتاری جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے، اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے"۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اہلِ کُفر کی طرف سے ہوشیار کیا ہے، کہ یہ لوگ تم سے ضد رکھتے ہیں، اور کسی صورت میں پسند نہیں کرتے کہ تمہیں کوئی خیر اور بھلائی اللہ کی طرف سے مل جائے۔ اور اللہ کی طرف سے وحی کا آجانا، کتاب کا اترنا، نبوت کا مل جانا، یہ بہت بڑی خیر ہے جو بنی آدم کو نصیب ہوتی ہے، اور اہل کتاب پہلے سے اِس کے اجارہ دار چلے آرہے تھے، تو وہ کیسے پسند کر سکتے ہیں کہ تم پر کوئی کتاب اترے، تمہیں دین ملے، اور تم میں کوئی نبی آجائے، اور اُن کی ریاست اور سرداری ختم ہوجائے۔ اور ایسے ہی مشرکین ہیں، وہ چاہتے تھے کہ اگر یہ قرآن اترتا تو ہم میں سے کسی رئیس پر اترتا، کسی سردار پر اُترتا، یہ کیا ہوا کہ مفلسوں کا گروہ اِس قرآن کا وارث بن گیا اور وحی ان کے اوپر آگئی، ہم اِن کی اطاعت کس طرح سے کر سکتے ہیں، ہم ان کے ساتھ کس طرح سے مل سکتے ہیں؟۔ تو مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہ کسی صورت میں بھی تمہاری بھلائی نہیں چاہتے، اس لیے اِن کو دشمن سمجھا کرو اور ہمیشہ اِن کی طرف سے ہوشیار رہا کرو، اِن کی حرکتوں پر نظر رکھا کرو، مختلف چالوں کے ساتھ یہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو بسا اوقات خیر خواہ ظاہر کریں گے، لیکن یہ تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں، تمہارے دشمن ہیں، اس لیے اِن کی چالوں پر نظر رکھا کرو اور کبھی بھی ان کے فریب میں نہ آنا۔ جیسے پیچھے

آیا کہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لئے لفظ رَاعِنَا استعمال کرتے تھے، اور مسلمانوں میں بھی اس لفظ کو چلتا کر دیا، اور حقیقت کے اعتبار سے وہ مذاق اڑاتے تھے، اور یہ ان کا استہزاء تھا۔ تو اِس قسم کی چالیں وہ اپنی خباثت کے تحت چلتے تھے، مسلمانوں کو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہوشیار کیا ہے۔

نبوّت پر اہلِ کتاب اور مشرکین کی اِجارہ داری نہیں ہے

اور وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ کے اندر یہ کہہ دیا کہ اہل کتاب کی کوئی اجارہ داری نہیں، کہ جس کو یہ کہیں وہیں نبوت آئے اور وہیں کتاب نازل ہو اور اُنہی کو دینی ریاست ملے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ مالک ومختار ہے، جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لے، وہ فضل عظیم والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت پر اہل کتاب یا مشرکین کوئی ڈپو ہولڈر نہیں ہیں کہ اِن کے پرمٹ کے ساتھ اِس کو جاری کیا جائے، جدھر یہ چاہیں اُدھر اِس کو رواں کیا جائے، ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے، اگر ایک وقت میں بنی اسرائیل کو اس نے نوازا تھا اور دوسرے وقت میں بنی اسماعیل پر نوازش ہو گئی تو کیا ہو گیا، وہ فضل عظیم والا ہے، جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دے۔ اِس میں اُن اہلِ کتاب اور مشرکین کے لئے جواب ہے اُن کے اِس جذبے کا کہ اِن لوگوں کو یہ خیر کیوں نصیب ہو رہی ہے، اللہ کہتا ہے میں رحمت اور فضل والا ہوں، جس کو چاہوں دوں۔

نسخ کے مسئلے پر یہود کے شبہات

اہلِ کتاب خیر خواہی ظاہر کر کے مسلمانوں میں شبہات کی اشاعت کرتے تھے، اور اس طرح سے ان کو ایمان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے، اعتراضات پھیلا کر اللہ کے رسول سے اہل ایمان کو جدا کرنے کی کوشش کرتے، اُن اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا جس کا دفعیہ اگلی آیت (مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ) کے اندر کیا گیا ہے۔ وہ یوں کہتے تھے کہ اگر تمہیں کوئی اچھا دین مل جائے تو ہمیں اس پر کیا اعتراض ہے؟ ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن کیا کریں ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں کہ اُدھر تو تم کہتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کا رسول ہے، تمہاری کتاب بھی مانتی ہے، اور تم بھی کہتے ہو، اور تورات کو تم کہتے ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اور عیسائیوں کی طرف سے بھی یہ بات ہو سکتی تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تم اللہ کا رسول کہتے ہو، اور ان پر نازل شدہ انجیل کو تم اللہ کی کتاب مانتے ہو، اور پھر تم یہ بھی کہتے ہو کہ اس کے بہت سارے حکم منسوخ ہو گئے اور وہ شریعت بدل گئی، اگر وہ اللہ کے احکام تھے اور وہ کتاب اللہ کی کتاب تھی تو اُس کے بدلنے کا کیا مطلب؟ تمہارا قرآن اُس کی بعض چیزوں کو منسوخ کیوں کرتا ہے؟ اگر وہ اللہ کے احکام تھے تو وہ بدل کیسے گئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے پتہ نہیں تھا کہ جو اَب قانون بنا رہا ہوں یہ آگے نہیں چلے گا اور اب تجربے کے ساتھ ثابت ہوا کہ یہ قانون ٹھیک نہیں ہے اس لیے اب نیا قانون دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ کی کتاب ہے تو یہ اللہ کی کتاب نہیں، اور اُس کو اللہ کی کتاب تمہاری کتاب بھی کہتی ہے، تو پھر یہ نئی چیز جو آ رہی ہے، یہ اپنے آپ کو جو رسول کہتا ہے، یہ اللہ کے احکام کو کس طرح سے بدل سکتا ہے؟ اللہ کی باتیں تو اٹل ہوتی ہیں۔ یوں اِس قرآنِ کریم کے اُترنے کے ساتھ پہلی شریعتوں کے اُوپر جو نسخ آیا اِس کے

ذریعے سے بھی لوگوں میں شبہات پیدا کرتے تھے۔اور پھر قرآنِ کریم میں بھی بعض آیات ایسی آئیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعد میں منسوخ کر دیا، خاص طور پر مدینہ منورہ میں جانے کے بعد سب سے پہلا جو نسخ آیا، جس پر یہود ونصاریٰ نے شور مچایا تھا، وہ تحویلِ قبلہ ہے، کہ سرورِ کائنات ﷺ مدینہ میں تشریف لے گئے، تو پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، سولہ یا سترہ مہینے کے بعد رخ بدل دیا گیا بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف، تو اس پر بھی انہوں نے شور مچایا کہ یہ اگر اللہ کا دین ہے تو یہ کیا کہ کل کچھ تھا اور آج کچھ ہے، اللہ کی باتیں کس طرح سے بدل رہی ہیں؟۔تو نسخ کے مسئلے کو لے کر وہ اہل اسلام کے اندر شبہات پھیلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ کی باتیں ہوں تو پھر وہ بدلنی نہیں چاہئیں کہ آج کچھ قانون ہو اور کل کو کچھ ہو جائے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اَحکامِ الٰہی میں تبدیلی کس نوعیت کی ہوتی ہے؟

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں نسخ کے متعلق وضاحت فرمائی، اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی حکم کا بدلنا کبھی تو اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ حکم دینے والے نے کوئی حکم تو دے دیا، لیکن چونکہ اُس کا علم تام نہیں اور اس کی حکمت تام نہیں، اُس کے علم میں بھی جہالت کا شائبہ ہے، اور پُوری حکمت پر بھی اُس کو احاطہ نہیں، جب اُس کو نافذ کیا گیا تو نافذ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حکم ٹھیک نہیں ہے اور اِس کے چلانے میں رکاوٹیں ہیں، یا عوام نے اُس کو قبول نہیں کیا، انہوں نے آگے سے احتجاج کر لیا، اِس وجہ سے اُن رکاوٹوں کو دور نہ کر سکنے اور عوام کو مطمئن نہ کرنے کی وجہ سے حاکم کو اپنا قانون بدلنا پڑ گیا، یا اُس کے نافذ کرنے کے بعد اور اُس کے چلانے کے بعد معلوم ہوا کہ اِس میں تو یہ یہ خامیاں ہیں، ان خامیوں کی بناء پر اُس آئین میں ترمیم کرنی پڑی، ایک تو حکم کا بدلنا اس وجہ سے ہوتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اِس کا منشاء جہالت ہے، کہ قانون بناتے وقت پُورے حالات کا احاطہ نہیں تھا، اور آنے والے حالات کا پتہ نہیں تھا، جس کی بناء پر ایک حکم دے دیا گیا، لیکن جب اُس کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اس میں رکاوٹیں معلوم ہوئیں اور اس کی خامیاں نمایاں ہو گئیں، جس کی بناء پر اُس کو بدلنا پڑا، جس طرح سے آج کل پارلیمنٹ میں عموماً اس قسم کی ترمیمات آئین میں ہوتی رہتی ہیں، اور وہ ترمیمات اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ اس کے نافذ کرنے کے بعد اس کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں، اِس قسم کی ترمیم یا اس قسم کی تنسیخ اللہ کے احکام میں ممتنع ہے، کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم دے اور اس کو پتہ نہ ہو کہ اس حکم میں کیا خرابی ہے، اور جب اُس کو نافذ کیا گیا تو معلوم ہو گیا کہ اِس میں تو یہ خامی ہے، یا ایک حکم دیا اور آگے ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں کہ اُس حکم کو چلایا نہ جا سکا، نافذ نہ کیا جا سکا، یا آگے جمہور نے ماننے سے انکار کر دیا، جس کی بناء پر اُس کو بدلنا پڑا، اس قسم کی تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کے احکام میں نہیں آتیں...... اور ایک تبدیلی ایسی ہوتی ہے کہ ایک مریض طبیب کے پاس جاتا ہے اور اُس کو نبض دکھاتا ہے، اپنے حالات بتاتا ہے، اور وہ ماہر طبیب اُس وقت اس کے مزاج کے مطابق ایک نسخہ تجویز کر دیتا ہے، آٹھ دن وہ مریض نسخہ استعمال کرتا ہے، آٹھ دن کے بعد پھر طبیب کے پاس جاتا ہے، طبیب اُس کی نبض دیکھتا ہے، تو وہ اُس نسخے کو لے کر بعض چیزیں اُس میں سے کاٹ دے گا اور بعض کا اضافہ کر دے گا۔اب اگر وہ جاہل مریض وہاں طبیب کے ساتھ اُلجھ جائے کہ یہ کیا ہوا؟ آٹھ

دن پہلے آپ نے ایک نسخہ لکھا تھا، اور آج اُس کے بعض اجزاء کاٹے جارہے ہیں، بعض بڑھائے جارہے ہیں، کیا پہلا صحیح نہیں تھا یا دوسرا صحیح نہیں ہے؟ اور پہلے آپ کو بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یا اب بے سمجھی کی بات کررہے ہو؟ یہ نسخہ کیوں بدلا گیا؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ اعتراض جہالت سے ناشی ہے، اور جو طب کے فن سے واقف ہو وہ کہے گا کہ مریض کے حالات کے ساتھ ساتھ نسخے میں تبدیلی ہوا کرتی ہے، اور ماہر طبیب وہی ہوا کرتا ہے جو ایک ہی ڈنڈے کے ساتھ سب کو نہ ہانکتا چلا جائے، بلکہ جیسے جیسے مریض کے حالات بدلتے چلے جائیں اس کے مطابق نسخے میں تبدیلی اور کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی انسان کو جو احکام دیے جاتے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں، کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو انسانیت کا دور شروع ہوا، پہلے حالات کچھ اور تھے، عقل بھی خام، تجربہ بھی خام، آبادی بھی تھوڑی، ضروریات بھی کم، جیسے جیسے انسان تجربات کی دنیا میں چلتا گیا اس کا مزاج بدلتا چلا گیا، آبادی بڑھتی چلی گئی، آبادی کے تقاضے مختلف ہوتے چلے گئے، عین حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہدایات بھی آتی رہیں، یہ ہدایات انسان کی تربیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور تربیت ہمیشہ ایک ہی نہج سے نہیں ہوا کرتی، بلکہ جس طرح سے انسان بڑھتا جاتا ہے، اُس کی عقل جوان ہوتی جاتی ہے، اُس کے تجربات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اُسی کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام آتے رہتے ہیں۔

دِینِ اسلام میں تبدیلی کی ضرورت کیوں نہیں؟

حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آگیا کہ انسان اپنے کمال کو پہنچ گیا، اور آنے والے حالات کا ماقبل کے ساتھ اتنا زیادہ اختلاف نہیں رہا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک جامع قانون اِس قسم کا نافذ کردیا گیا کہ اب قیامت تک اِس میں ترمیم اور حک واضافہ کی ضرورت نہیں ہوگی، اور اُس میں بھی اتنی لچک رکھ دی کہ بعض احکام عزیمت کے درجے میں دے دیے اور بعض رخصت کے درجے میں دے دیے، جس قسم کے اعذار پیش آسکتے تھے اُن اعذار کو بنیاد بنا کر پہلے ہی بتادیا کہ اگر اِس قسم کا عذر پیش آجائے تو اُس میں یہ رخصت ہے۔ تو وہ آئین تو مکمل ہے، لیکن حالات کے مطابق اُس کو منطبق کیا جاسکتا ہے، رخصت اور عزیمت کی بحث اِس قانون میں لچک ہے، یہ نہیں کہ ایک لکیر کھینچ دی اور اِس کے اندر کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی، بلکہ عذروں کے پیش آنے کے ساتھ اور حالات کے بدلنے کے ساتھ جو اُس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے وہ بھی پہلے بتادی گئی، اِس لیے اب اُس کو ہم تبدیلی نہیں کہیں گے، بلکہ کہیں گے کہ قانون یہی ہے۔ جیسے تندرست آدمی کو ایک حکم دیا گیا، اور ساتھ یہ لکھ دیا گیا کہ بیمار ہونے کی صورت میں اِس حکم کو یوں کرلینا ہے، اب جس وقت ایک تندرست آدمی دس سال کے بعد بیمار ہوگا اور بیمار ہونے کے بعد جب وہ اس حکم کو بدلے گا تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ تبدیلی اب ہوئی ہے، نہیں، بلکہ قانون اِسی طرح سے ہے جس کے مطابق عمل ہوتا آرہا ہے، اب یہ لچک جو رکھ دی گئی ہے تو اُس کے بعد کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم کسی کو منسوخ کریں اور کسی کو لائیں، علل اور اسباب کو واضح کردیا گیا کہ جب یہ علت آجائے گی اُس وقت یوں کرلینا، جب یہ علت نہیں ہوگی اُس وقت یوں کرلینا، اِن ساری چیزوں کی وضاحت ہوجانے کے بعد اب اِس میں حک واضافہ کی گنجائش نہیں رہی۔

بہر حال اس قسم کی تبدیلی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے علم کا تقاضا ہے، اور انسانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہمدردی کا تقاضا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کا ہمدرد ہے، اُس کا خیر خواہ ہے، اُس کا مربی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم بھی تام ہے، اور وہ حکیم مطلق بھی ہے، اس لیے حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ احکام کا بدلنا عین فطرت کے مطابق ہے۔ تو قرآنِ کریم میں یا اللہ تعالیٰ کے احکام میں جہاں کہیں بھی نسخ آیا تو وہ نسخ اس قسم کا ہے جس طرح سے حالات کے تقاضے کے تحت طبیب کا نسخہ بدلتا ہے، اس لیے یہ حکمت کے عین مطابق ہے اور اِس پر کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اِس آیت کے اندر اِسی حکمت کی طرف اشارہ کیا، کہ جو لوگ نسخ کو لے کر شبہات پھیلاتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں تبدیلی نہیں آسکتی، اور یہ کتاب چونکہ تبدیلی کو ثابت کرتی ہے، اور خود اِس کتاب میں بھی بعض آنے والے احکام منسوخ ہو گئے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کلام نہیں، اگر اللہ کی کلام ہوتی تو یہ آئے دن بدلتی کیوں؟۔ تو یہ شبہ جو پیش کرتے تھے اُس کا ازالہ یہاں کر دیا۔

نسخ کی حقیقت

نسخ کا معنی ہوتا ہے زائل کرنا، اور شرعی طور پر نسخ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول نے ایک حکم دیا، اور اللہ کے علم میں ہے کہ یہ اتنے وقت کے لئے ہے، لیکن اُس کی میعاد بتائی نہیں گئی کہ کتنے وقت کے لئے ہے، جب اللہ کے علم میں اُس کی میعاد ختم ہو گئی تو نیا حکم آ گیا، چاہے نیا حکم یہی آ گیا کہ اب اِس کو ترک کر دو، یا اُس کی جگہ کوئی اور نیا حکم نافذ کر دیا گیا، اب بندہ چونکہ یہ سمجھتا تھا کہ شاید یہ حکم دائماً ہے، اِس لیے اِس کی نظر میں یہ تبدیلی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ تبدیلی نہیں، بلکہ ایک حکم کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد نیا حکم دیا گیا ہے۔ اصولِ فقہ کے اندر آپ نسخ کی بحث میں یہی چیز پڑھیں گے جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، کہ یہ تبدیلی بندوں کے علم میں ہے، اللہ کے علم میں یہ تبدیلی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ میں نے یہ حکم سو سال کے لئے دیا ہے، اور بعد میں نیا پیغمبر بھیجوں گا، اُس وقت یہاں نیا حکم دوں گا۔ تو اُس کی میعاد ہی سو سال تھی، جب سو سال پورا ہو گیا تو اس حکم کی میعاد ختم ہو گئی، آگے نیا حکم آ گیا، لیکن چونکہ انسانوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ حکم کتنی دیر کے لئے ہے، اس لیے انسان یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے حکم کو بدل دیا گیا۔ تو یہ تبدیلی انسان کے علم کے اعتبار سے ہے، اللہ کے علم کے اعتبار سے یہ تبدیلی نہیں ہے۔

نسخ عروج کا ایک ذریعہ ہے

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ: جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں، اَوۡ نُنۡسِہَا: یا بھلا دیں، بھلا دینے کا معنی ہے کہ فراموش کرا دیں، انسان کے دماغ سے ہی ایک چیز نکال دی، جس طرح سے امم سابقہ کے اندر بھی لوگوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے بہت ساری چیزوں کو چھوڑا، پھر انسانیت نے اُس کو فراموش ہی کر دیا۔ یا قرآنِ کریم کی کوئی آیت اللہ نے اُتاری، بعد میں اُس کا لفظ اور اُس کا مفہوم نبی کے ذہن سے ہی نکال دیا، ایسا بھی ہو سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ اعلیٰ کے اندر بھی یہی لفظ ہیں سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ: ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں مگر جو اللہ چاہے، تو نسخ کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ احکام کو سرے سے ذہنوں سے نکال دیا جائے، وہ یاد ہی نہ رہے۔ اور ایک یہ ہے کہ اُس کے الفاظ پڑھے جا رہے ہیں، وہ باقی ہے، سب کچھ ہے، لیکن کہہ دیا کہ

اِس کے اُوپر عمل نہیں کرنا۔'' جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں، نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ: ہم اُس سے بہتر لے آتے ہیں، اَوْ مِثْلِهَا: یا کوئی اُسی جیسا حکم لے آتے ہیں، جو حکمتوں میں اور مصلحتوں میں اُسی جیسا ہوتا ہے، اُس کے برابر سرابر ہوتا ہے، یا اس سے بہتر ہوتا ہے، اِس قسم کی تبدیلی ہم کرتے رہتے ہیں۔ تو گویا کہ نسخ ایک تدریجی ترقی ہے، بہتر سے بہتر کی طرف گویا کہ اس کے ذریعے سے عروج کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ آنے والے حالات کے تحت پہلے سے اچھی تربیت کرتے چلے جاتے ہیں اور احکام دیتے چلے جاتے ہیں، تو یہ عروج اور ترقی کا ذریعہ ہے اچھے سے زیادہ اچھے کی طرف۔

اَلَمْ تَعْلَمْ...... اَلَمْ تَعْلَمْ کا خطاب اسی معترض کو ہے جس کے ذہن میں بھی یہ اعتراض پیدا ہو، اے معترض! تجھے پتہ نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اور تجھے پتہ نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ کی ہی سلطنت ہے زمین اور آسمان میں، اور تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار اور مددگار نہیں ہے، جب اللہ تعالیٰ کی یہ شانیں تجھے معلوم ہیں تو احکام کی تبدیلی پر تیرے ذہن میں کیوں اشکال آتا ہے؟ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے، ایک حکم کو مٹادے اور دوسرا لے آئے اس کو قدرت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہے وہ حاکم ہے، جو حکم چاہے اپنی سلطنت میں دے، وہ تمہارا ولی ہے، نصیر ہے، یار ہے، مددگار ہے، تمہاری مصلحت کی رعایت رکھتا ہے، جو چیز تمہارے لیے مفید پاتا ہے تمہیں اس کا حکم دیتا ہے، ان صفات پر اگر نظر ہو تو نسخ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

متقدمین اور متاخرین کے نزدیک نسخ کا مفہوم

باقی یہ مسئلہ آپ اصول تفسیر میں پڑھیں گے جس وقت کوئی موقع آئے گا، الفوز الکبیر کے اندر یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے، کہ قرآنِ کریم میں بھی کچھ آیات منسوخ ہیں یا نہیں، جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھ میں مدون ہے۔ جلالین کے اندر تو آپ اکثر پڑھیں گے کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی، یہ منسوخ ہوگئی، نسخ کا لفظ بہت عام استعمال کیا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ متقدمین کی اصطلاح میں نسخ کا مفہوم ہے مطلقاً کوئی تبدیلی، چاہے حکم کو سرے سے ختم کر دیا جائے، اور چاہے اس کے اندر کوئی قید لگادی جائے، جیسے مطلق تھا اس کو مقید کر دیا، عام تھا اس میں کوئی خصوص لگا دیا، ان ساری صورتوں کو وہ نسخ سے تعبیر کرتے ہیں، اس لیے وہ آیاتِ منسوخہ کی تعداد پانچ سو تک پہنچا دیتے ہیں، جہاں بھی عفو اور درگزر کا ذکر آئے گا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہہ دیں گے کہ یہ آیت آیاتِ جہاد کے ساتھ منسوخ ہوگئی، اور اس قسم کی اور بھی کئی ساری آیتیں ہیں۔ تو نسخ کا مفہوم ان کے ہاں چونکہ عام ہے اس لیے وہ بہت ساری آیات کو منسوخہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن متاخرین نے نسخ کے مفہوم کو صرف احکام کی تبدیلی کے ساتھ خاص کر دیا، اور وہ حکم بھی وہی جو سرے سے بدل دیا گیا ہو۔ اور عموم میں خصوص آجانا یا مطلق میں کسی قسم کی تقیید آجانا، اس کو وہ اصطلاحی نسخ کے ساتھ تعبیر نہیں کرتے، اگرچہ اِس سے بھی کچھ تبدیلی ہوتی ہے لیکن اصطلاحاً وہ اِس کو نسخ نہیں کہتے۔

آیاتِ منسوخہ کی تعداد پر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

اس تحدید کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ متاخرین نے بیس آیتوں کو قرآنِ کریم میں منسوخ قرار دیا ہے، لیکن اُن بیس میں سے انہوں نے پندرہ کی پھر توجیہ کردی، کہ اگر ان کی ایسی توجیہ کر دی جائے تو کسی نہ کسی درجے میں

یہ آیات معمول بہ رہ سکتی ہیں، البتہ پانچ آیتوں کو انہوں نے منسوخ قرار دیا ہے۔اوران پانچ آیتوں کے متعلق بھی بعض علماء کا قول ہے کہ اگران کی کوئی تاویل ایسی کردی جائے جس کی وجہ سے کسی نہ کسی صورت میں وہ آیات معمول بہ رہ جائیں تو ایسے اقوال بھی موجود ہیں۔ بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق قرآنِ کریم میں پانچ ایسی آیتیں موجود ہیں کہ جن کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ان کا حکم روک دیا گیا اوران پر عمل کی اجازت نہیں رہی، پانچ آیتوں کو انہوں نے منسوخ مانا ہے جو آپ کے سامنے موقع بموقع آتی چلی جائیں گی۔اور بعض علماء نے ان پانچ کے اندر بھی توجیہ کردی، تواس کا مطلب یہ ہوگا کہ جواحکام منسوخ ہوئے وہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے بھی نکال دیے گئے، اور جو الفاظ قرآنِ کریم کے اندر باقی ہیں وہ سب معمول بہ ہیں، کسی کو ہم منسوخ قرار نہیں دیتے، کوئی نہ کوئی توجیہ ایسی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایک مسئلہ آپ کے سامنے آئے گا کہ پہلے پہلے ورثاء کے لئے وصیت کرنے کا حکم تھا، والدین کے لئے، اقرباء کے لئے، اولاد کے لئے مرنے والا وصیت کر کے جائے، کہ اِس کو اتنا دے دینا، اس کو اتنا دے دینا، اِس کو اتنا دے دینا۔اور جب آیاتِ وراثت اتر آئیں تو اس کے بعد وصیت للوالدین منسوخ ہوگئی، جس کی وضاحت سرورِ کائنات ﷺ نے فرمادی کہ: ''لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ''[1] وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے حصے متعین کردیے، اب آپ کچھ کہہ بھی جائیں تو اس کا اعتبار نہیں، بلکہ اللہ کا جو حکم ہے وہی نافذ ہوگا، کہ والد کے لئے اتنا، والدہ کے لئے اتنا، بیوی کے لئے اتنا، اولاد کے لئے اتنا، وہ حصے متعین ہوگئے، اب ان کے متعین ہوجانے کے بعد مرنے والے کو اپنی طرف سے تعیین کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے اُس وصیت والی آیت کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔لیکن حضرت سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے معمول بہ ہونے کی بھی ایک صورت ہے، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے والدین کافر ہیں، تو کافر والدین وارث تو ہوتے نہیں، ایسی صورت میں اگر مرنے والا اُن کے لئے وصیت کرجائے تو نافذ ہے، کیونکہ وصیت کرنے کے لئے تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس کے لئے وصیت کی جائے وہ مؤمن ہو، مؤمن کا کافر وارث تو نہیں ہوسکتا، ورثے میں تو ملت واحدہ کی قید ہے، کہ دونوں کا دین ایک ہو تب وراثت جائے گی، لیکن وصیت نافذ ہوسکتی ہے۔تو مرنے والا مسلمان ہو اور اس کے والدین کافر ہوں، اگر ایسا واقعہ ہوجائے اور مرنے والا وصیت کردے کہ میری ماں کو اتنا دے دینا، میرے باپ کو اتنا دے دینا، تو یہ وصیت نافذ ہے، اور ایسا کرنے کی صورت میں اِس پر عمل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اب اُن والدین کے اندر وارث ہونے والا معنی باقی نہیں رہا، اس طرح سے سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی بعض آیات کے اندر توجیہ کردی، کہ اگر ان کی ایسی صورتیں نکال لی جائیں تو ان آیات کو معمول بہ قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ وہی جو ان کا معروف ترجمہ اور مفہوم ہے اس کے مطابق وہ آیات منسوخ بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔اس کی تفصیل الفوز الکبیر کے اندر آپ کے سامنے آئے گی، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے وہ بیس کی بیس آیات جمع کی ہیں جن کو منسوخ قرار دیا گیا ہے، لیکن ان میں پھر توجیہ کر کے انہوں نے پانچ کو منسوخ مانا ہے، کہ یہ پانچ منسوخ ہیں، اور پھر ان پانچ میں بھی توجیہ کرنے کی گنجائش ہے، جیسے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کردیا۔

---

(۱) ترمذی ۳۲/۲،باب ما جاء لا وصیۃ لوارث/ ابو داؤد ۴۰/۲، باب ما جاء فی الوصیۃ للوارث/ مشکوٰۃ ۲۶۵/۱، باب الوصایا، فصل ثانی۔

نسخ کی صورتیں

بہر حال نسخ واقع ہوا ہے، قرآنِ کریم میں بھی ہوا، اور حدیث شریف کے بعض احکام میں بھی ہوا، باقی! قرآن کا حکم قرآن سے منسوخ، اور حدیث کا حکم حدیث سے منسوخ، یہ تو علمائے اسلام میں متفق علیہ ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں آیا ہوا حکم حدیث سے منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ یا حدیث شریف میں بیان کردہ حکم قرآنِ کریم سے منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ائمہ فقہ کے اندر یہ چیز مختلف فیہ ہے، اصول فقہ میں اس کی تفصیل آئے گی، احناف کے نزدیک یہ صورتیں بھی واقع ہیں، کہ حکم قرآن میں آجائے اور اس کا ناسخ حدیث میں آجائے، یا سرورِ کائنات ﷺ نے ایک حکم نافذ کیا ہو اور اُس کو منسوخ قرآنِ کریم میں کردیا جائے، ایسا بھی واقع ہے۔ اور بعض ائمہ کے نزدیک یہ دو صورتیں واقع نہیں ہیں، صرف دو صورتیں ہیں کہ قرآن کو قرآن سے منسوخ کردیا جائے، اور حدیث کو حدیث سے منسوخ کردیا جائے۔ یہ تفصیل اصولِ فقہ میں آئے گی۔

''اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا'' کے مخاطب یہود ہیں یا اہلِ اسلام؟

اَمْ تُرِیْدُوْنَ: اِس کا خطاب یہود کو ہے یا اہل اسلام کو، دونوں توجیہیں ہیں۔ اگر یہود کو ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے یہودیو! تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں موسیٰ علیہ السلام کے اوپر ٹیڑھے ترچھے سوال کر کے موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کیا اور اس طرح سے تم نے ایک کافرانہ روش اختیار کی، اور وہ موسیٰ علیہ السلام پہ کیسے کیسے سوال کرتے تھے؟ وہ قرآن میں متعدد جگہ آیا ہوا ہے، کہ اُن کی بات صاف ستھری ہوتی لیکن اس کو ماننے کی بجائے اس میں اشکالات نکال نکال کے خواہ مخواہ اعتراض کرنے شروع کردیتے، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت بھی ہوتی، اور اُس کے نتیجے میں اس امت کے اوپر احکام بھی سخت ہوتے چلے گئے، ذبحِ بقرہ میں آپ کے سامنے اس کا ایک نمونہ آچکا ہے۔ اب تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تم زِچ کرتے تھے، سوالات کرکر کے تنگ کرتے تھے، اپنے اِس موجودہ وقت کے رسول کو بھی تم یونہی تنگ کرنا چاہتے ہو؟ یہ ایک تنبیہ کرنی مقصود ہے، کہ اپنی اس روش سے تم باز نہیں آتے؟ تمہارا یہ کافرانہ طریقہ کب تک چلے گا؟ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کو بھی تنگ کیا، اور جو تمہارا رسول یعنی تمہاری طرف مبعوث اِس وقت جو رسول موجود ہے تم اس پر بھی سوال کرکر کے اس کو بھی ایسے ہی تنگ کرنا چاہتے ہو؟ تو پھر یہ یہود کو تنبیہ ہوجائے گی، کہ وہ جو آئے دن حضور ﷺ کے سامنے اس قسم کے اشکالات لاتے رہتے تھے، جس میں محض تنگ کرنا مقصود تھا، یا مسلمانوں میں اعتراضات پھیلاتے رہتے تھے کہ تم اپنے پیغمبر سے پوچھو، یہ بات کیسے ہے، یہ بات کیسے ہے، جس سے اُن کا مقصد محض ایک اذیت اور تکلیف پہنچانا تھا، تو اس پر ان کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔

اور اگر تُرِیْدُوْنَ کا خطاب اہل ایمان کو ہو تو پھر ان کو بھی تنبیہ اسی طرح سے ہوگی کہ موسیٰ علیہ السلام کے امتیوں نے جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو سوال کرکر کے تنگ کردیا، تم بھی ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسے ہی پوچھا کرو؟ خبردار! یہ ادب کے خلاف ہے، عظمتِ نبوی ﷺ کے خلاف ہے، بلاوجہ محض تنگ کرنے کے لئے یا خواہ مخواہ ایک پریشانی پھیلانے کے لئے اعتراضات نہ اٹھایا کرو۔ تو پھر اُن کو اس طرح سے تنبیہ کرنی مقصود ہے۔ اور اس بات کو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ ہمارے پاس رہتے ہیں، اور

زندگی ایک طرز کے مطابق گزار رہے ہیں، ہمارا پڑھنے پڑھانے کا ایک طریقہ ہے، رہنے سہنے کا ایک طریقہ ہے، اور کوئی ہمارا مخالف گروہ ہو، انہوں نے بھی اپنا ادارہ بنایا ہوا ہو، اور ایک طریقے کے مطابق وہ بھی اپنی زندگی گزار رہے ہوں اور ان کا بھی ایک پڑھنے پڑھانے کا طریقہ ہو۔ تو وہ محض یہاں کے منتظمین کو پریشان کرنے کے لئے آپ لوگوں سے ملیں اور کہیں کہ دیکھو! ہمارے ہاں یہ چیز ہے، تمہارے ہاں یہ کیوں نہیں ہے، اور ہم یوں کرتے ہیں، تمہارے استاذ اِس طرح سے کیوں نہیں کرتے؟۔ اب وہ طالب علم اگر تو سمجھ دار ہو تو وہ سمجھ جائے گا کہ بھئی! تمہارا طریقہ اور، ہمارا طریقہ اور، اس طرح سے باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنے طرز پر مطمئن ہے تو ٹھیک چلتا رہے گا، دوسرا آدمی اُس کے ذہن میں اعتراض پیدا بھی کرے گا تو اس کا ذہن اس اعتراض کو قبول ہی نہیں کرے گا۔ یہ ہوتی ہے اپنے مسلک کے اُوپر پختگی، اور اپنے طور طریقے کے اُوپر اطمینان۔ اور اگر ویسے ہی ڈھل مل یقین والا ہو تو وہ کہے گا کہ ہاں! بات تو ایسے ہی ہے، ہمیں پوچھنا چاہیے کہ ہمارے استاذ ہمارے ساتھ یوں کیوں نہیں کرتے؟ آج نیا سوال لے آیا، اُس کا جواب دیا گیا، کل کو نیا سوال لے آیا، اُس کا جواب دیا گیا، یہ تو مستقل دھندا بن جاتا ہے، تو انہیں یہی کہا جائے گا کہ عقلمندو! تم ان کے پاس جا کر بیٹھتے کیوں ہو جو تمہارے ذہن میں اس قسم کے شبہات پیدا کرتے ہیں، تم خود بھی پریشان ہوتے ہو اور ہمیں بھی آ کر پریشان کرتے ہو۔ تو یہ جو سلسلہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی دوسرے کے دماغ میں شبہات پیدا کر کر کے آگے اعتراض کروائے یہ پریشانی کا باعث ہوتا ہے، پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب تمہیں پتہ ہے کہ اُن کا مسلک اور ہے، ہمارا مسلک اور ہے، ہمارا طرزِ طریق اور ہے، اُن کا طرزِ طریق اور ہے، تم ان کے پاس جاتے کیوں ہو؟ کہ وہ تمہارے دل میں اس قسم کے شبہات پیدا کریں، پھر تم لا لا کر اپنے طلبہ کے اندر پھیلاؤ، طلبہ میں پھیلانے کے ساتھ بہت سارے طالب علم ایسے ہوں گے جو اس ذہنی خلجان میں مبتلا ہو جائیں گے، اور اگر تم منتظمین کے اوپر اس قسم کے لوگوں کے سمجھائے ہوئے سوال آ کے کرتے ہو تو یہ آپ کے اساتذہ کی عظمت کے خلاف ہے، آپ کے منتظمین کے ادب کے خلاف ہے، تمہیں اپنے طور پر یہاں رہتے ہوئے اگر کوئی اشکال ہے تو اس کو واقعی سامنے لانا چاہیے، لیکن لوگوں کے پڑھائے ہوئے اعتراض لا کر ہمارے سامنے کیوں کرتے ہو؟ تم اُن سے کیوں متاثر ہوتے ہو؟ کہ خود بھی پریشان ہوتے ہو اور ہمیں بھی پریشان کرتے ہو۔ بسا اوقات انتظامی طور پر اس قسم کی پابندی لگانی پڑتی ہے، اس کے بغیر اطمینان نہیں ہوتا، شکوک شبہات کا سلسلہ تو کبھی ختم ہوا ہی نہیں کرتا، آج کچھ کہہ دیا، کل کچھ کہہ دیا، پرسوں کچھ کہہ دیا، تو اپنے مسلک پر، اپنی جماعت پر اور اپنے طرز وطریق پر مطمئن رہو، اور دوسرا آدمی شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی کرو، اور اسے کہو کہ بھئی! تم اور ہو، ہم اور ہیں، ہم تمہاری باتوں پر توجہ نہیں دے سکتے، بہر حال ہم اپنے طرز وطریق پر مطمئن ہیں، اس طرح سے پھر سارے ماحول کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ تو یہاں یہی پابندی ہے کہ تم یہود کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہو، اور وہ غلط سلط باتیں تمہارے ذہن میں ڈالتے ہیں، اور پھر تم وہی سوال لا لا کر اپنے رسول پر کرتے ہو، تو تمہارا کیا ارادہ ہے، کہ جیسے یہودی ہر وقت اپنے پیغمبر سے اُلجھتے رہتے تھے تم بھی اُلجھنا چاہتے ہو؟ جیسے آگے صراحتاً منع کر دیا جائے گا کہ لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (سورۂ مائدہ: ۱۰۱) بلا ضرورت اس قسم کے سوال ہی نہ کیا کرو، جس کے نتیجے میں کبھی تشدد ہو سکتا ہے اور تمہیں کوئی ناگواری کی کیفیت پیش آ سکتی ہے، اس کی وضاحت اُس آیت میں آ جائے گی، وہاں منع کر دیا گیا۔ تو پھر

تُرِيْدُوْنَ کا خطاب مسلمانوں کو ہوجائے گا ''اے اہل ایمان! کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم پوچھو اپنے رسول سے'' پھر رَسُوْلَكُمْ میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں، پھر ''تمہارا رسول'' وہی ہے جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اور اگر تُرِيْدُوْنَ کا خطاب یہود کو ہو تو پھر رَسُوْلَكُمْ سے مراد رسولِ وقت ہے، جو تمہاری طرف مبعوث ہو کر آیا ہے، تم نے اس کو مانا یا نہیں مانا، بہر حال اس وقت کا رسول ہونے کے اعتبار سے تمہارا رسول یہی ہے، پھر رَسُوْلَكُمْ کے لفظ میں تاویل کی جائے گی۔ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى: جس طرح سے کہ موسیٰ علیہ السلام سوال کیے گئے اِس سے قبل۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ: جو ایمان کے بدلے میں کُفر کو لے لے، جیسے ایذائے نبی کافرانہ روش ہے، اور بات کو سنا ماننا اور مطمئن ہوجانا ایمان والی روش ہے، تمہیں چاہیے کہ ایمان والی روش اختیار کرو، کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سامنے آجائے تو اس کو تسلیم کرلو اور اس پر مطمئن ہوجاؤ، اور دوسروں کے پھیلائے ہوئے شبہات سے متاثر نہ ہوو، اور ان کی باتیں لے کر اپنے رسول کے لئے باعثِ ایذاء نہ بنو، یہ کافرانہ روش ہے، ''اور جو کوئی ایمان کو کفر کے ساتھ بدلے گا وہ سواء السبیل سے بھٹک گیا، سیدھے راستے سے بھٹک گیا''۔ تو انتظامی طور پر یہ ہدایت دے دی گئی کہ غیروں کے شبہات سے متاثر ہو کر اپنے رسول پر اعتراضات کر کے ان کو پریشان کرنا مؤمنانہ شان نہیں ہے، اگر تمہارا ایمان قوی ہے تو تمہیں چاہیے کہ دوسرے کے پیدا کردہ شبہات کو قبول ہی نہ کیا کرو اور ان کی حوصلہ شکنی کیا کرو، جب وہ اس قسم کی باتیں کریں تو ان کی طرف توجہ ہی نہ دو، اور نہ اپنی جماعت میں پھیلاؤ، اور نہ اپنے رسول کے اوپر اس قسم کے اعتراضات کرو۔ آپ اپنے ماحول میں نظر ڈالیں گے تو اس قسم کی خرابیاں عموماً ہوتی رہا کرتی ہیں، کہ لوگ افراد میں اس طرح سے شبہات پیدا کرتے ہیں، پھر اپنے ہی لوگ آکر آگے نقل کرنا شروع کردیتے ہیں، پھر ہر آدمی کے ذہن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اعتراض کو رد کرسکے، بہت سارے لوگ شکی مزاج ہوتے ہیں، کہ جو ان کے سامنے اعتراض کردیا جائے ان کا دماغ اس کو جلدی قبول کرلیتا ہے۔ مثلاً ایک عیسائی وہاں کھڑا ایک اعتراض کررہا تھا، تم آکے جس وقت اس کو مسلمانوں میں نقل کرنا شروع کردو گے تو کئی لوگ ایسے ہوں گے جو شبہ میں مبتلا ہوجائیں گے، تو تم ایسی کافرانہ بات لاکر کیوں اپنے ماحول میں پھیلاتے ہو، اور دوسروں پر اس قسم کے سوال کرکے کیوں پریشانی پھیلاتے ہو۔ تو پھر انتظامی طور پر اس قسم کی تنبیہ کردی جاتی ہے۔

دوسرے کو متاثر کرنے کے لئے ہر آدمی اپنے آپ کو خیر خواہ ظاہر کرتا ہے

یہ ایک اصول یاد رکھیے، دشمن اگر دشمن بن کر آئے اور یہ کہے کہ میں تمہارا مخالف ہوں، اس طرح سے کبھی کسی کے دماغ کو خراب نہیں کرسکتا۔ خراب جب بھی کرتا ہے خیر خواہ بن کے کرتا ہے، جیسے کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو جو چکمہ دیا تھا تو خیر خواہ بن کے دیا تھا: قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (سورۂ اعراف: ۲۱) قسمیں کھائیں کہ میں تو تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، اس لیے تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ ایسے کرلو۔ جب بھی کسی دوسرے کو پھسلایا جاتا ہے خیر خواہ ہونے کی حیثیت میں پھسلایا جاتا ہے، پہلے انسان دل دماغ پر اثر ڈالتا ہے کہ ''میں تیرا خیر خواہ ہوں، دیکھو! اس بات میں میری کوئی غرض نہیں ہے''، اچھا آدمی بھی متاثر کرنے کے لئے یہی بنیاد بنائے گا، اور غلط آدمی بھی اسی اچھے عنوان کو اختیار کرے گا۔ اگر میں اس کو کہہ دوں کہ میں تیرا خیر خواہ نہیں ہوں، تیرا دشمن ہوں، تو پھر میں جو بات بھی اس کو کہوں گا یہ سوچے گا کہ میں اس پر عمل کروں یا نہ کروں، لیکن جب میں اس کے دل دماغ پر یہ اثر

ڈال دوں گا کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں، میں ہمیشہ تیری بھلائی سوچتا ہوں، اور اس کام کے کرنے میں تیرا فائدہ ہے، میرا کوئی فائدہ نہیں ہے، اگر تو یہ نہیں کرے گا تو تیرا نقصان ہے میرا نقصان نہیں ہے، اس بنیاد پر انسان چلتا ہے تو دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ صحیح آدمی کا طریقہ بھی یہی ہوتا ہے، اور غلط کار آدمی بھی دوسرے آدمی کو غلطی میں ڈالنے کے لئے بھی ہمیشہ یہی بنیاد فراہم کرتا ہے، یعنی یہ اِس بنیاد کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کہ کسی کو متاثر کرنے کے لئے بنیاد یہی ہے کہ پہلے تم اس کو یہ ثابت کردو کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، پھر وہ تمہاری بات بھی مان لے گا، تو اچھا آدمی بھی دوسرے کو اچھائی سکھانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرتا ہے، اور برا آدمی بھی دوسرے کو بری راہ پر لانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرتا ہے، اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ بھئی! تو اس کو خیر خواہ نہ سمجھ، یہ تیرا خیر خواہ نہیں ہے، یہ تجھے کہیں سر کے بل گرائے گا، کہیں تیری ناک توڑے گا، پھر دوسری طرف سے تفہیم اس طرح سے ہوا کرتی ہے۔ تو یہاں یہی ہے کہ یہود و نصاریٰ جتنے بھی تھے وہ مسلمانوں کے خیر خواہ بن کر ان کے اندر شبہات پھیلاتے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں، ان سے محتاط رہا کرو، یہ حاسد ہیں اور یہ تمہاری اچھی حالت پر جلتے ہیں، اور خیر خواہ بن کر تمہیں اس قسم کے مشورے دیں گے اور اس قسم کی باتیں کریں گے جن سے تم متاثر ہو جاؤ، اور متاثر ہونے کے بعد اپنی اِس فضیلت کو اور اپنی اس شرافت کو ختم کر بیٹھو۔ اگلی آیت کے اندر یہی دشمنوں کی نشاندہی کی ہے کہ یہ تمہارے خیر خواہ نہیں، اِن کو خیر خواہ نہ سمجھا کرو۔ اور ہر وقت آپ اس بات پر نظر رکھیں، جس وقت بھی کوئی آدمی آپ کو اپنے پیچھے لگانا چاہے گا بنیاد یہی بنائے گا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ میری بات مان لو، اچھا آدمی بھی یہی بنیاد بنائے گا اور برا آدمی اگر آپ کو کسی برائی کی طرف لے جانا چاہے گا تو بھی بنیاد یہی بنائے گا۔

خیر خواہ اور بدخواہ میں فرق کرنا ضروری ہے

اور یہ ایک نازک موڑ ہوتا ہے کہ انسان خیر خواہ اور بدخواہ کے اندر فرق کرلے، جو فرق کرنے میں کامیاب ہوگیا اس نے اپنی زندگی سنبھال لی، اور جو فرق کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، کہ جو بھی اس کے ساتھ آکے میٹھی میٹھی باتیں کرے، ذرا تھوڑے سے چمکدار دانت دکھا دے، اور ادب احترام کے ساتھ چائے کی پیالی پیش کردے، انسان سمجھتا ہے کہ بس یہ میرا بڑا خیر خواہ ہے، پھر جدھر کو یہ لے جائے لے جائے، چاہے بازار میں لے جا کر اس کو گولی ماردے، اس طرح سے انسان دھوکے میں آجاتا ہے۔ اس لیے فرق کرنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر میٹھی میٹھی باتیں کرنے والا، ہر مسکرا مسکرا کے باتیں کرنے والا، خیر خواہی کے دعوے کرنے والا، حقیقت میں خیر خواہ نہیں ہوتا۔ برا آدمی بھی ہمیشہ اپنی برائی دوسرے کے ذہن میں اسی جذبے کے تحت ہی ڈالتا ہے اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت کر کے۔ قرآن کریم سے یہی اصول نکلتے ہیں جن سے انسان اپنی زندگی سنوارتا ہے، ورنہ بظاہر تو یہ یہود و نصاریٰ کے قصے ذکر کیے جارہے ہیں، لیکن زندگی کے اصول انہی سے نکلتے ہیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ: اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ تمہیں لوٹا دیں تمہارے ایمان کے بعد کافر، یعنی لوٹا کر تمہیں کافر بنادیں، حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ: اپنے نفسوں کی طرف سے حسد کی وجہ سے، یعنی یہ اُن کا چاہنا حسد کی بناء پر ہے، اور وہ حسد ایسا ہے جو ان کے دلوں سے پھوٹتا ہے، "بعد اس کے کہ ان کے لئے حق واضح ہوگیا"، وہ جانتے بھی ہیں کہ حق یہ ہے۔

جہاد کا حکم آنے تک اہلِ ایمان کو ہدایات

فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا: جب یہ نشاندہی کر دی گئی کہ یہ تمہیں کافر بنانا چاہتے ہیں حالانکہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے،تو اب تمہیں غصہ چڑھے گا، کیونکہ جب پتہ چل جائے کہ یہ بدخواہ تھا اور خیر خواہ بن کر آیا ہے، جب یہ حقیقت سامنے آجائے تو پھر انسان کو غصہ آتا ہے،تو ابھی غصے میں آکر کہیں ان پر ہاتھ نہ اٹھانا، ذرا صبر کرو، فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا: اس کا ترجمہ آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا کہ عفو اور صفح میں کیا فرق ہے،عفو کا معنی ہوتا ہے سزا نہ دو، صفح کا معنی ہوتا ہے کہ درگزر ہی کر جاؤ، ان کی باتوں کو نظر انداز کر جاؤ، حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ: جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم نہ لے آئے، اس میں اشارہ ہو گیا اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا، جس سے اِن سب موذیوں کا انتظام ہو جائے گا، چنانچہ بعد میں اللہ کا حکم آیا جس کے بعد اہل کتاب سے جہاد بھی کیا گیا، اِن کو جلاوطن بھی کیا گیا، اِن کو قتل بھی کیا گیا، اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہوا۔ ’’بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے‘‘ تم اپنی کمزوری پر نظر نہ رکھو، کہ اِن وڈیروں کو ہم کس طرح سے سنبھالیں گے، جو اس طرح سے ماحول کے اوپر قابض ہیں، نہیں! اللہ تعالیٰ قادر ہے، جس وقت اللہ کا حکم آئے گا تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اس حکم کے مطابق چلنے کے اسباب بھی مہیا کر دے گا، اور جب تک جہاد کا حکم نہیں آتا اس وقت تک اپنی تہذیب نفس میں لگے رہو، اپنے معاشرے کو بناؤ، اور اپنے نفس کی تہذیب کرو۔ نماز کو قائم رکھو، اس سے آپ کی طبیعت بنے گی، جذبات سدھریں گے۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: زکوٰۃ دو، مال کو خرچ کرنے کی عادت ڈالو، اس طرح سے معاشرہ بھی سدھرتا ہے اور آپس میں ربط بھی قائم ہوتا ہے، کہ ایک آدمی کے پاس گنجائش ہے، دوسرے کے پاس گنجائش نہیں ہے، تو جس کو کوئی ضرورت پیش آجائے اور اپنی ضرورت پوری کرنے کی گنجائش نہ ہو تو گنجائش والے اس کے ساتھ تعاون کریں۔ ’’نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اور جو خیر بھی تم اپنے نفسوں کے لئے بھیجو گے اُس کو اللہ کے پاس پاؤ گے، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے‘‘۔

یہود و نصاریٰ کا جنّتی ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید

وَقَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ: یہ بھی اُن شبہات میں سے ایک شبہ تھا جس کو وہ پھیلاتے تھے، کہتے ہیں کہ ہرگز داخل نہیں ہوگا جنت میں کوئی بھی مگر وہ جو یہودی ہوا یا نصرانی ہوا۔ یہ گویا کہ یہود و نصاریٰ نے باوجود اس کے کہ ان کا آپس میں اختلاف تھا لیکن مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا، وہ کہتے تھے کہ مسلمان تو جنت میں جائیں گے ہی نہیں، ہاں یہودی ہو تو جائے گا، نصرانی ہو تو جائے گا، دونوں طرف سے یہ نعرہ لگتا تھا، یہود کہتے ہوں گے کہ یہودی ہوں گے تو جنت میں جائیں گے، نصرانی کہتے ہوں گے کہ نصرانی ہوں گے تو جنت میں جائیں گے، مقصد تھا اہل اسلام کو برگشتہ کرنا کہ اگر تم جنت کے ہی طالب ہو تو جنت بھی اسی راستے پر چلنے سے ملے گی، یہ جو نیا طریقہ سامنے آگیا یہ جنت کا طریقہ نہیں ہے، تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ: قرآن کہتا ہے یہ اِن کے خیالی پلاؤ ہیں، یہ ان کے دل کی خواہشات ہیں جو انہوں نے بنا رکھی ہیں، ان کی بنیاد کچھ نہیں ہے۔

اور انہیں کہو کہ اگر تم سچے ہو تو برہان پیش کرو۔ برہان کا کیا مطلب ہوگا؟ اس کی تقریر بھی پہلے آپ کے سامنے آچکی جس میں آیا تھا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً، کہ تم یہ کہتے ہو کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے، اس دعوے کو برہان سے ثابت کرو، برہان اس بات پر کہ یہودیت کا دین غیر منسوخ ہے اور قیامت تک کے لئے نجات اسی میں منحصر ہے، اسی طرح عیسائیوں سے کہا گیا کہ تم کہتے ہو کہ جنت میں صرف نصرانی جائیں گے، اس عقیدے کے اُوپر برہان پیش کرو، کہ یہ نصرانیت اختیار کرلینا یعنی یہ جو عنوان ہے یہ جنت میں لے جانے کا ٹھیکیدار ہے، اور یہ دائمی دین ہے اور غیر منسوخ ہے، اللہ کا مقبول ہے، قیامت تک یہی دین باقی ہے، اگر برہان کے ساتھ تم اس بات کو ثابت کردو تو پھر تمہارا کہنا ٹھیک ہو جائے گا، لیکن اگر تم اس بات پر برہان پیش نہیں کرسکتے بلکہ دوسری طرف یہ برہان قائم ہے کہ ہر وقت اللہ کے احکام کی پابندی جنت میں لے جانے والی ہے، اخلاص کے ساتھ اللہ کے احکام کو ماننا، اگر ایک وقت میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے تو دوسرے وقت میں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے، اور تیسرے وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے، اللہ کی طرف سے برہان کے ساتھ جو ثابت ہوتا چلا جائے اس کو قبول کرلینا ہی اسلام ہے، اور اسلام ہی جنت کا راستہ ہے، اس لیے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہود یا نصاریٰ کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا، ہم تو کہتے ہیں کہ جو اللہ کا فرمانبردار ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف سے آنے والے احکام کو جو مانے گا وہ جنت میں جائے گا۔ ٹھیک ہے ایک وقت میں یہودیت کا اختیار کرنا ہی اسلام کا تقاضا تھا، اور ایک وقت میں نصرانیت کا اختیار کرنا ہی اسلام کا تقاضا تھا، لیکن اب برہان اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ دونوں دین منسوخ ہیں، منسوخ دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے، لہٰذا اب جو یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کرے گا وہ جنت میں نہیں جائے گا، اب اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ آنے والے پیغمبر کو مانا جائے اور اس کے اُوپر اتری ہوئی کتاب کے مطابق عمل کیا جائے، اس لیے موجودہ وقت کے پیغمبر پر ایمان لانے والے اصل کے اعتبار سے جنت کے راستے پر چل رہے ہیں۔ تو قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ کا یہ مفہوم ہوا۔ اور برہان یہی ہوگی کہ یہودیت کو عنداللہ غیر منسوخ اور پسندیدہ دین ثابت کرو اور قیامت تک کے لئے نجات کا ذریعہ اسی کو ثابت کرو، جس میں آجائے کہ "موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین ہیں، اور تورات خاتم الکتب ہے، اور ہمیشہ کے لئے انسانیت کی کامیابی انہی کے ساتھ واسطہ کردی گئی" دلیل اور برہان اس پر چاہیے تب جا کے تمہارا دعویٰ ثابت ہوگا۔ اور یہی مطالبہ عیسائیوں سے ہے۔ جب تم یہ ثابت نہیں کرسکتے تو پھر یہ تمہارے دل کی بنائی ہوئی باتیں ہیں، تمہارے خیالی پلاؤ ہیں، خواہشات ہیں جن کو تم اپنے دل میں بناتے رہتے ہو، باقی! تمہارا یہ دعویٰ دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ بَلٰی: کیوں نہیں جائے گا کوئی اور۔ ضابطہ یہ ہے کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ: جس نے اپنی ذات کو اللہ کے تابع کردیا، وَهُوَ مُحْسِنٌ: اس حال میں کہ مخلص بھی ہو، دل سے اللہ کے احکام کو مان لے، اِس سے منافق نکل گئے، فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ: اس کے لئے اُس کا اجر ہے اس کے رب کے پاس، نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے، لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ جنت کی زندگی کا عنوان ہے، کیونکہ جنت کی زندگی ہی ایسی ہے جس پر لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ صادق آئے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ

اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی شیٔ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ

الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا

یہود کسی شیٔ پر نہیں، حالانکہ یہ سارے ہی کتاب پڑھتے ہیں، ایسے ہی کہا اُن لوگوں نے جو

يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

علم نہیں رکھتے، بالکل ان کی بات کی طرح، اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن اس چیز میں

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا

جس میں یہ اختلاف کرتے تھے ﴿۱۱۳﴾ کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو روکے اللہ کی مسجدوں سے یعنی ان میں اللہ کا نام لیے جانے سے

اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ

اور کوشش کرے وہ ان مسجدوں کی ویرانی میں۔ یہ لوگ، نہیں مناسب تھا ان کے لئے کہ داخل ہوتے مسجدوں میں

اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں

عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ

بڑا عذاب ہے ﴿۱۱۴﴾ اور اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، جس طرف بھی تم منہ پھیرو وہیں اللہ کی

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ

ذات ہے، اللہ وسعت والے ہیں علم والے ہیں ﴿۱۱۵﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی، اللہ پاک ہے

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ

بلکہ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، سب کے سب اسی کے لئے فرمانبردار ہیں ﴿۱۱۶﴾ بغیر مثال کے پیدا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ

کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کو، اور جس وقت وہ فیصلہ کرتا ہے کسی امر کا پس سوائے اس کے نہیں کہ اس امر کو کہہ دیتا ہے ہوجا

فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ

پس وہ ہو جاتا ہے ﴿١١٧﴾ اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ، یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس

اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ

کوئی نشانی، ایسے ہی کہا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں بالکل ان کی بات کی طرح، ان کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں

قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿١١٨﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ

تحقیق ہم نے واضح کیں بہت ساری نشانیاں اُن لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں ﴿١١٨﴾ بیشک بھیجا ہم نے آپ کو حق کے ساتھ

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾ وَلَنْ

بشیر اور نذیر بنا کر، اور نہیں سوال کیا جائے گا آپ سے جہنم والوں کے متعلق ﴿١١٩﴾ اور ہرگز نہیں

تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ

راضی ہوں گے آپ سے یہود نہ نصاریٰ جب تک کہ آپ ان کے مذہبی طریقے کی اتباع نہ کریں، آپ کہہ دیجئے!

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ

بیشک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے، اور اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بعد

الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾

اس علم کے جو آپ کے پاس آگیا تو نہیں ہوگا آپ کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے کوئی حمایتی نہ کوئی مددگار ﴿١٢٠﴾

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی اس حال میں کہ وہ تلاوت کرتے ہیں اس کتاب کی جس طرح سے تلاوت کرنے کا حق ہے یہی لوگ

بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾ يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاتے ہیں، اور جو کوئی اس کتاب کا انکار کرے پس یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿١٢١﴾ اے بنی اسرائیل!

اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا

یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا، اور یاد کرو اس بات کو کہ میں نے تمہیں فضیلت دی جہانوں پر ﴿١٢٢﴾ اور ڈرو اس دن سے

لَّا	تَجْزِیْ	نَفْسٌ	عَنْ	نَّفْسٍ	شَیْـًٔا	وَّلَا	یُقْبَلُ	مِنْهَا عَدْلٌ

جس دن کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا، اور نہ کسی نفس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا

وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور نہ کسی نفس کو کوئی سفارش کام دے گی اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے ﴿۱۲۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ: اور کہا یہود نے کہ نہیں ہیں نصاریٰ کسی شیٔ پر۔ ''کسی شیٔ پر نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں، شیٔ سے مراد ہوتا ہے معتدبہ شیٔ، ایسی شیٔ جس کا اعتبار کیا جاسکے، یعنی ان کے مسلک کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے، ''یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی شیٔ پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی شیٔ پر نہیں'' اس کا بھی وہی معنی ہے، نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا مذہب بے دلیل ہے، کسی صحیح بنیاد پر قائم نہیں، یہ کسی ایسے طریقے پر قائم نہیں ہیں جس کا اعتبار کیا جاسکے، علی شیءٍ یُعتَدُّ بِہٖ۔ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ: حالانکہ یہ سارے ہی کتاب پڑھتے ہیں، کتاب سے کتاب اللہ مراد ہے، جس کا مصداق یہاں تورات وانجیل ہے، کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ: الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کا مصداق یہاں مشرکین مکہ ہیں، اور ایسے ہی کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، مِثْلَ قَوْلِهِمْ: بالکل ان کے قول کی طرح۔ کَذٰلِکَ کے اندر بھی تشبیہ ہے، اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ کے اندر بھی تشبیہ ہے، جس کا مطلب یونہی ادا کریں گے۔ ''اور ایسے ہی کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے بالکل ان کی بات کی طرح'' یعنی دوبارہ تشبیہ دینے میں تاکید ہوگئی، جس کے لئے اردو کے اندر بالکل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، بالکل ان کی بات کی طرح، یعنی ظاہری الفاظ بھی ویسے ہی اور منشا بھی ویسے ہی۔ فَاللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ: اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان، یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: قیامت کے دن، فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ: اس چیز میں جس میں یہ اختلاف کرتے تھے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ: کون بڑا ظالم ہے اس شخص کے مقابلے میں جو روکے اللہ کے مسجدوں سے، مَسٰجِدَ اللّٰهِ سے بدلِ اشتمال ہے اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ، جو منع کرے اللہ کی مسجدوں سے یعنی منع کرے اس چیز سے کہ ان مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے، یہ ترجمہ اُسی قسم کا ہے جیسے آپ سُلِبَ زَیْدٌ ثَوْبُهٗ کا کیا کرتے ہیں، چھینا گیا زید یعنی اس کا کپڑا، اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ بدل اشتمال ہے مَسٰجِدَ اللّٰهِ سے، ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو روکے، جو منع کرے اللہ کی مسجدوں سے یہ کہ ذکر کیا جائے ان مسجدوں میں اللہ کا نام'' مسجدوں سے روکنے کا مطلب یہ ہوا کہ مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکے۔ بدل کا ترجمہ جب بھی کیا جائے تو اس کو 'یعنی' کے ساتھ ظاہر کردیا جاتا ہے، ''جو منع کرے اللہ کی مسجدوں سے یعنی ان میں اللہ کا نام لیے جانے سے''۔ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا: اس کا عطف مَنَعَ پر ہے، اور کوشش کرے وہ اُن مسجدوں کی ویرانی میں، خراب تخریب کے معنی میں، ان مسجدوں کی تخریب میں کوشش کرے، ویرانی میں

کوشش کرے، اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ: یہ لوگ نہیں مناسب تھا ان کے لئے کہ داخل ہوتے ان مسجدوں میں اِلَّا خَآئِفِیْنَ: مگر ڈرتے ہوئے، یعنی ان لوگوں کے تو لائق یہی تھا کہ مسجدوں میں خوف زدہ ہو کر جاتے، ڈر کر جاتے، نہ یہ کہ مسجدوں کے اندر اودھم مچا کر ان مسجدوں کو ویران کریں، لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: اِن کے لئے دنیا میں رسوائی ہے وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ: اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، خبر کو مقدم کر دیا جس سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا، مشرق اور مغرب سے دونوں جہتیں مراد ہیں، مشرق: سورج کے نکلنے کی جگہ۔ مغرب: سورج کے غروب ہونے کی جگہ۔ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں، فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: اَيْنَمَا تُوَلُّوْا جس طرف بھی تم منہ پھیرو، فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: وہیں اللہ کی ذات ہے، اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں علم والے ہیں۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا: ولد اولاد کے معنی میں ہے، اس لیے واحد جمع اور مذکر مؤنث سب پر بولا جائے گا، اس کا معنی ''لڑکے'' کے ساتھ نہیں کرنا، ''اولاد'' کے ساتھ کرنا ہے۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی، سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے، بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بلکہ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ: ہر چیز اسی کے لئے فرمانبرداری کرنے والی ہے، سب کے سب اسی کے لئے فرمانبردار ہیں۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بدیع بَدَعَ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے کوئی ایسا کام کرنا جس کی مثال اور نمونہ پہلے موجود نہ ہو، اسی لیے آپ ایک لفظ سنا کرتے ہیں بدعت، جیسے کہتے ہیں کہ یہ چیز بدعت ہے، تو بدعت کا بھی یہی معنی ہوتا ہے کہ ایسا فعل جس کا نمونہ شریعت میں موجود نہیں، جس کے لئے کوئی اصل نہیں، کوئی نظیر نہیں، کوئی دلیل نہیں، اس قسم کا نیا نویلا اور انوکھا کام جاری کر لیا جائے اس کو کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے، تو وہ لفظ اسی سے لیا گیا ہے۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے بے نمونہ، یعنی جس کا نمونہ پہلے موجود نہیں تھا، جس کی پہلے کوئی نظیر اور مثال موجود نہیں تھی، نئے طریقے سے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو بے مثال، بے نمونہ۔ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا: اور جس وقت وہ فیصلہ کرتا ہے کسی امر کا، فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ: پس سوائے کے نہیں کہ اس امر کو کہہ دیتا ہے ہو جا، فَيَكُوْنُ: پس وہ ہو جاتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ: کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ، اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ: اس کا عطف بھی يُكَلِّمُنَا پر ہے، تو لَوْلَا کا تعلق جیسے يُكَلِّمُنَا کے ساتھ ہے اسی طرح تَاْتِيْنَآ کے ساتھ ہے، یعنی لَوْلَا تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ، کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: ایسے ہی کہا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں بالکل ان کی بات کی طرح مِّثْلَ قَوْلِهِمْ یہ اُسی طرح سے آ گیا جیسے پہلے ترجمہ کیا تھا۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ: تَشَابَهَ: ایک دوسرے کے مشابہ ہونا، ان کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں، قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ: تحقیق ہم نے واضح کیں بہت ساری نشانیاں لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: بیشک بھیجا ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر، اس حال میں کہ آپ بشیر ہیں نذیر ہیں۔ بشیر: ایسی خبر سنانے والا جس کو سن کر دوسرے پر سرور طاری ہو جائے، اُس کا چہرہ کھل جائے، ایسی خبر کو بشارت کہتے ہیں، جو ایسی بشارت دینے والا ہوتا ہے اس کو مبشر بھی کہا جاتا ہے اور بشیر بھی کہا جاتا ہے۔ اور نذیر ڈرانے والے کو کہتے ہیں، لیکن یہ ڈرانا ایسا ڈرانا ہوا کرتا ہے جو شفقت پر مشتمل ہو، ایسا ڈرانا نہیں جس طرح سے بندوق اٹھا کر آپ اپنے دشمن کو ڈراتے ہیں، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت پر مشتمل ہو، جس طرح سے ماں باپ

اپنے بچوں کو برے انجام سے ڈراتے ہیں، استاذ اپنے شاگرد کو برے انجام سے ڈراتا ہے، کہ دیکھو! اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نقصان ہوجائے گا، یہ کام نہ کرو، تو جو ایسا برا انجام ذکر کیا جاتا ہے جس کے ذکر کرنے میں اپنے مخاطبین پر شفقت ہوا کرتی ہے اس کو انذار کہتے ہیں، اور ایسے ڈرانے والے کو نذیر کہا جاتا ہے یا منذِر کہا جاتا ہے، منذر اور نذیر دونوں لفظ آتے ہیں، جیسے مبشر اور بشیر دونوں لفظ آتے ہیں۔ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ: اور نہیں پوچھا جائے گا آپ سے جہنم والوں کے متعلق، آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق، وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى: لَنْ نفی مستقبل کے لئے آتا ہے، اور اس میں تاکید کا معنی ہوتا ہے، احاطہ بھی ہوتا ہے اور تاکید بھی، کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے آپ سے، جس کے لئے ہم لفظ ''ہرگز'' بھی استعمال کرتے ہیں، ہرگز راضی نہیں ہوں گے تجھ سے یہود نہ نصاریٰ، حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ: جب تک کہ تو ان کے طریقے کا متبع نہ ہوجائے، جب تک تو ان کے طریقے پر نہ چلے اس وقت تک کسی صورت میں بھی یہود و نصاریٰ آپ سے راضی نہیں ہوسکتے۔ ملّت کا معنی طریقہ، لیکن یہ ہر طریقے کو نہیں کہتے، بلکہ اس طریقے کو کہتے ہیں جو کسی مذہب یا روایاتِ مذہب پر مشتمل ہوتا ہے، تو ملّت سے مذہبی طریقہ مراد ہوگیا۔ ہرگز راضی نہیں ہوں گے آپ سے یہود نہ نصاریٰ۔ لَنْ کے اندر جو نفی آئی ہے یہ لَا اسی کی تاکید ہے۔ ترجمے کے اندر بھی ''نہ'' کا لفظ دو دفعہ بولا جارہا ہے، ''ہرگز نہیں'' یہ نفی آگئی۔ ہرگز نہیں راضی ہوں گے آپ سے یہود اور نہ نصاریٰ، یہ ''نہ'' اسی لَا کا ترجمہ ہے، اور یہ اسی مفہوم کی تاکید ہے، یعنی ہرگز نہیں راضی ہوں گے نصاریٰ، حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ: جب تک آپ ان کے مذہبی طریقے کی اتباع نہ کریں۔ حتی کے بعد مضارع جو آگیا، تو اردو کے محاورے کے اعتبار سے اس کا معنی نفی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى: آپ کہہ دیجئے اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے، یعنی جو طریقہ اللہ بتائے وہی حقیقت کے اعتبار سے ہدایت ہے، اسی پر ہی چلنا مہتدی لوگوں کا کام ہے، بیشک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ: اَھواء۔ ھویٰ کی جمع، ھویٰ خواہش کو کہتے ہیں، هُمْ ضمیر انہی یہود و نصاریٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اتَّبَعْتَ کا خطاب حضور ﷺ کو ہے، اور اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: بعد اس علم کے جو آپ کے پاس آگیا، علم کے آجانے کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی اتباع کی، مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ: نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ کے طرف سے کوئی یار نہ کوئی مددگار، یا اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے آپ کے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہیں ہوگا، یہ لفظ دال بر جزاء ہیں، مفہوم یہ ہوجائے گا کہ اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا تو آپ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے، پھر اللہ کی گرفت سے چھڑانے کے لئے آپ کو کوئی یار و مددگار نہیں ملے گا۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ: یہ هُمْ ضمیر سے حال واقع ہے، اس حال میں کہ وہ تلاوت کرتے ہیں اس کتاب کی جس طرح سے تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اور اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ خبر ہے، یہی لوگ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ: اور جو کوئی اس کتاب کا یعنی قرآن کا انکار کرے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: پس یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ذکر کیا گیا تھا کہ یہ لوگ یعنی یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت میں جانے کے لئے یہودی یا نصرانی ہونا ضروری ہے، جس کا مفہوم یہ تھا کہ اسلام کے مقابلے میں یہ یہودیت اور نصرانیت کو طریقِ نجات قرار دیتے ہیں، اور اِن کو اکٹھا کر کے قَالُوْا میں ذکر کر دیا، اگرچہ یہودیت کا نعرہ یہودی لگاتے تھے، اور نصرانیت کا نعرہ نصرانی لگاتے تھے، لیکن اِن کو اکٹھا کر کے جو ذکر کیا تو اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کے مقابلے میں انہوں نے آپس میں ایک متحدہ محاذ بنا لیا تھا، اس لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان نہ ہو، یہودی ہو جائے یا نصرانی ہو جائے، اسلام کے مقابلے میں یہودی نصرانیوں کو گوارا کیے ہوئے تھے اور نصرانی یہودیوں کو برداشت کیے ہوئے تھے، اور تیسرے سوار ان کے ساتھ مشرکینِ مکہ ملے ہوئے تھے، باوجود اس بات کے کہ ان کے عقائد میں تضاد تھا، لیکن اسلام کے مقابلے میں یہ سب آپس میں متحد ہو گئے تھے، ان کا مقصود اسلام سے پھیرنا اور روکنا تھا، چاہے کوئی مشرک ہو جائے، چاہے نصرانی ہو جائے، چاہے یہودی ہو جائے، اس سے ان کو کوئی بحث نہیں تھی، تو ان الفاظ میں اِن کا مذہبی تعصب اور ان کی ضد ذکر کی گئی تھی، اور رَد کے لئے صرف اتنا لفظ بول دیا گیا تھا کہ صرف زبانی دعویٰ کر دینا کہ ہمارا طریقہ نجات کا طریقہ ہے یہ کافی نہیں ہوتا، اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیلِ قطعی لاؤ، برہان پیش کرو، برہان کس بات پر پیش کرو؟ اس کی وضاحت کل آپ کی خدمت میں عرض کر دی تھی، کہ تمہارا طریقہ عند اللہ پسندیدہ طریقہ ہے اور قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقبول ہے، اور اس کے اوپر نسخ نہیں آیا، جس میں ''اپنے نبی کا خاتم النبیین ہونا، اپنی کتاب کا خاتم الکتب ہونا'' اس کا ثابت کرنا ضروری ہے، اور یہ بتانا ضروری ہے کہ قیامت تک کے لئے یہی طریقہ باقی ہے، جس وقت تک اس بات کو برہان کے ساتھ اور دلیل کے ساتھ ثابت نہیں کرو گے، صرف زبانی دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، تو یہ ان کا متحدہ محاذ تھا جس کا پیچھے ذکر کیا گیا۔

تینوں گروہوں کا درحقیقت آپس میں کوئی اتفاق نہیں ہے

اب اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ یہ اسلام کے مقابلے میں ان کی ضد اور تعصب ہے، ورنہ جس وقت یہ اسلام کے مقابل نہ ہوں، آپس میں ہوں، تو پھر آپس میں یہ گتھم گتھا ہیں، آپس میں یہ دست و گریباں ہیں، وہ اُن کا گریبان پکڑتے ہیں، وہ اُن کا گریبان پکڑتے ہیں، وہ کہتے ہیں تم جھوٹے، وہ کہتے ہیں تم جھوٹے، آپس میں ان کا یہ حال ہے، صرف اسلام کی ضد میں انہوں نے آپس میں اتحاد کر لیا ہے، ورنہ ان کا آپس میں کوئی اتفاق نہیں ہے، یہودیوں سے پوچھو کہ نصرانیوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ تو کہتے ہیں بے کار ہیں، بالکل غلط عقیدے ہیں، نہ کوئی بنیاد نہ کوئی دلیل، ایسے ہی لچر باتیں ہیں، یہ کوئی مذہب ہے؟ اور نصرانیوں سے پوچھو کہ یہودیوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کہتے ہیں کافر ہیں، ان کا کیا پوچھنا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو یہ نہیں مانتے،

انجیل کو یہ نہیں مانتے، بالکل بے بنیاد مذہب ہے۔تو آپس میں ایک دوسرے کے متعلق ان کے جذبات ایسے ہیں۔" حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں" کتاب اللہ کا مصداق یہاں تورات وانجیل ہے، کتاب اللہ کے اندر یہ پڑھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے سچے پیغمبر، تورات بھی اللہ کی سچی کتاب، تو یہودیت کی بھی بنیاد صحیح ہے، اور یہودیوں کی کتابوں کے اندر آنے والے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کا اور انجیل کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ نصرانیوں کی بھی بنیاد صحیح ہے، بنیاد سے یہ مذہب غلط نہیں ہیں۔غلط اگر ہوئے تو پہلا مسلک دوسرے مسلک کے آنے سے منسوخ ہوا، اور دوسرا مسلک اسی طرح سے تیسرے مسلک کے آنے سے منسوخ ہوگیا، بأصلہٖ تو ان کو باطل نہیں کہا جاسکتا، یہودیت بأصلہٖ باطل نہیں ہے، صحیح بنیاد پر قائم ہے، نصرانیت بأصلہٖ باطل نہیں ہے، صحیح بنیاد پر قائم ہے۔تو اس قسم کا تعصب اور ضد ایک دوسرے کے مقابلے میں برتنا، کہ بالکل کچھ بھی نہیں، ان کی تو بنیاد ہی صحیح نہیں ہے، ایسے ہی خواہ مخواہ ان کے غلط عقیدے ہیں، یہ بات ان کے تعصب سے ناشی ہے۔اس لیے اگر یہ اسلام کے مقابلے میں اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو آپس میں بھی ان کا اسی طرح سے معاملہ ہے، ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق نہیں ہے، یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی صحیح بنیاد پر نہیں، نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی صحیح بنیاد پر نہیں، حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں، کتاب کے اندر دونوں کو دونوں کی اصلیت معلوم ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ یہودی اپنی کتاب کو پڑھتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے اور تورات کی تصدیق کرتے، جب نبوت کی سب علامتیں ان میں موجود ہیں اور انجیل کے اندر سارے دلائل موجود ہیں جو اس کو کتاب اللہ ثابت کرتے ہیں، تو ان کو چاہیے تھا، اور اِس کتاب یعنی تورات پڑھنے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور انجیل کو قبول کرتے۔اور عیسائی جس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انجیل پڑھی، تو ان کو چاہیے تھا کہ تورات کو اللہ کی کتاب سمجھتے، موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر مانتے، اس طرح سے ایک دوسرے کا احترام ان کو ہونا چاہیے تھا، آنے والے نبی پر ایمان لاتے، کتابوں کو تسلیم کرتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔یہ تو آپس میں تھے ہی، اب تیسروں کی بھی سن لیجئے جاہلوں کی، جن کے پاس نہ کوئی کتاب نہ کسی نبوت کے قائل، وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی حق پر ہیں، باقی کوئی بھی حق پر نہیں۔یہ مشرکین مکہ ہیں، یہ اپنی بانسری اور اپنی ڈفلی بجا رہے ہیں، كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: یہ اس متحدہ محاذ کا تیسرا فرد ہے،" ایسے ہی کہا ان لوگوں نے جن کو علم ہے ہی نہیں" بے علم، جاہل، اَن پڑھ، وہ بھی اسی طرح سے راگنی گانے لگ گئے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے علاوہ باقی سارے غلط، ہم ہی صحیح ہیں، مِثْلَ قَوْلِهِمْ: انہی کی بات کی طرح اُنہوں نے بھی کہہ دیا، یہ اپنی اپنی گا رہے ہیں، اپنی اپنی کہہ رہے ہیں، جس کو کہتے ہیں" اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ!"

قیامت کے دن عملی فیصلہ ہوگا

لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت جائیں گے تو اللہ تعالیٰ عملاً ان کے درمیان فیصلہ کردے گا، کہ کون حق پر تھا کون باطل پر تھا۔یہاں عملی فیصلہ مراد ہے، ورنہ دلائل اور برہان کے ساتھ فیصلہ تو دنیا میں بھی ہو جاتا ہے، لیکن ہر شخص دلیل کو مانا نہیں کرتا اور دلیل سے متاثر ہو کر اپنی ضد کو چھوڑا نہیں کرتا، عملاً فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عملی طور پر ایک طرف کردیں گے کہ یہ اہل باطل

تک اور یہ اہلِ حق ہیں، وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰس:٥٩)، جس وقت یہ اعلان ہوگا اس وقت صف بندی ہو جائے گی، مجرم ایک طرف ہو جائیں گے اور جو اچھے لوگ ہیں وہ ایک طرف ہو جائیں گے، عملاً سب کے سامنے آجائے گا کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا، کیونکہ دلیل اور برہان ہر شخص تسلیم نہیں کیا کرتا، اگر دلیل اور برہان ہر شخص تسلیم کر لے تو دنیا کے اندر کبھی اختلاف باقی نہ رہے، سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ: اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اُن باتوں میں جن میں یہ اختلاف کرتے تھے۔

مساجد کو ویران کرنے میں تینوں گروہوں کا اشتراک

تینوں ہی اپنے لیے حق پر ہونے کے مدعی ہیں اور دوسروں کو باطل قرار دیتے ہیں، آگے اللہ تعالیٰ نے تینوں کا ہی کچھ تھوڑا سا کردار دکھایا ہے، کہ یہ جو مدعی ہیں کہ ہم اہل حق ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے کردار کے آئینے میں اپنا منہ دیکھیں کہ کیا حق والے ایسے ہوتے ہیں؟ پہلی بات جو تینوں کے متعلق مشترکہ کہی جارہی ہے وہ مسجدوں کی ویرانی میں کوشش کرنا ہے۔ یہود نصاریٰ اور مشرکین سب کا کردار ایک جیسا تھا، یہود نے سرورِ کائنات ﷺ پر تحویل قبلہ کے موقع پر جو شور مچایا اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لوگ اسلام سے پھر جائیں، حضور ﷺ کے قبلے کو تسلیم نہ کریں، اس طرح سے مسلمانوں کی مسجدوں کو یہ لوگ ویران کریں۔ یا یہود اور نصاریٰ کی آپس میں پہلے زمانے کے اندر جو لڑائیاں رہیں ان لڑائیوں کے اندر یہ ایک دوسرے کے معابد کا احترام نہیں کرتے تھے، وہ اِن کی عبادت گاہوں کو برباد کرتے اور یہ اُن کی عبادت گاہوں کو برباد کرتے، حتیٰ کہ ان کے آپس میں اختلافات کے نتیجے میں بیت المقدس تک کا احترام باقی نہ رہا، تاریخ میں اس قسم کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ اور مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکا، بیت اللہ کے قریب نہ جانے دیا، حالانکہ اللہ کی مسجد ہر ایک کی مشترکہ جگہ تھی، جو جاتا وہاں عبادت کرسکتا، حتیٰ کہ مسلمان نکلنے پر مجبور ہو گئے، پھر بعد میں حضور ﷺ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو میدانِ حدیبیہ میں انہوں نے روک دیا اور آگے نہیں جانے دیا، اور آپ کی واپسی ہوگئی تھی، یہ ساری صورتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو ویران کرنے والی ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق صحیح ہوا کرتا ہے وہ اللہ کی مسجدوں کو ویران نہیں کیا کرتے، وہ تو اللہ کی مسجدوں کی تعمیر میں کوشش کرتے ہیں، اور یہ مدعی اپنی اپنی جگہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہمارا تعلق اللہ سے صحیح ہے اور ہمارا دین صحیح ہے، لیکن اللہ کے گھر کا احترام کسی کے دل میں بھی نہیں ہے۔

مساجد کی آبادی کی اہمیت اور مسجد کو ویران کرنے کی مختلف صورتیں

مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ: یہ بظاہر اگرچہ انہی کی تردید ہے کہ وہ ظالم تھے، اور اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکتے تھے، لیکن اس سے اصول نکل آیا کہ مسجد کی تعمیر میں کوشش کرنا یہ پسندیدہ عمل ہے اور ایمان کی نشانی ہے، اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (سورۂ توبہ:١٨) اللہ کی مسجدوں کو آباد وہی لوگ کرتے ہیں جن کا اللہ پر ایمان صحیح ہوتا ہے، اور اسی طرح مسجد کی ویرانی میں کوشش کرنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی دلیل ہے۔ ویرانی میں کوشش کرنا یہ بھی ہے کہ مسجد کو بلاوجہ جا کر ڈھا دیا جائے،

لوگوں کو وہاں نماز پڑھنے سے روکا جائے، یا مسجد کے آس پاس اس قسم کا شور وغوغا برپا کر دیا جائے کہ لوگوں کے لئے وہاں نماز پڑھنا اور اللہ کا ذکر کرنا مشکل ہو جائے۔ اور کسی نہ کسی درجے میں یہاں وہ بات بھی آسکتی ہے جو آپس میں معمولی معمولی اختلافات کے بعد تعصب پیدا ہو جانے کی صورت میں ایک فرقے کو دوسرے کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی، یعنی ایک مسجد پر بریلویوں نے قبضہ کر لیا، اور اُن کو پتہ چل جائے کہ یہ دیوبندی ہے تو اُس کو مسجد میں داخل نہیں ہونے دیتے، اور ایک جگہ تعصب شروع ہوا کہ دیوبندی قابض ہیں اور اُن کو پتہ چل جائے کہ یہ بریلوی ہے تو اُس کو مسجد میں نہیں گھسنے دیتے، اپنے عموم کے ساتھ یہ مذمت اِن لوگوں کی بھی ہو سکتی ہے، کہ معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر کسی کو مسجد میں آنے سے روکنا، اور اللہ کا ذکر وہاں نہ کرنے دینا، نماز نہ پڑھنے دینا، درجہ بدرجہ یہ صورت بھی اس میں شامل ہے۔ اور مسجد میں اس قسم کا شور وغوغا برپا کرنا کہ وہاں لوگ نماز نہ پڑھ سکیں، اللہ کا ذکر نہ کر سکیں، یا مسجد کے اردگرد اس قسم کے حالات پیدا کر دینا کہ لوگوں کے لئے مسجد میں آنا مشکل ہو جائے، اور آ کر مسجد میں اللہ کی عبادت نہ کر سکیں، وہ سب اس ظلم کے اندر داخل ہیں۔ ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو روکے اللہ کی مسجدوں کو کہ ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے، اللہ کی مسجدوں کو منع کرے یعنی اس بات کو منع کرے کہ ان کے اندر اللہ کا نام لیا جائے۔''

اسلام ہر کسی کی عبادت گاہ کا احترام سکھاتا ہے

اسلام نے عبادت گاہوں کا احترام سکھایا ہے، اس لیے فقہ میں کتاب الجہاد کے اندر آپ پڑھتے ہیں کہ جس وقت مسلمان کسی ایسے علاقے پر قابض ہو جائیں جو پہلے اہلِ کفر کا علاقہ تھا تو ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے، فقہ کے اندر یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے، کوئی فرقہ ہو اس کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچاؤ، ہاں البتہ وہ خود مسلمان ہو جائیں اور مسلمان ہونے کے بعد اپنے گرجے کو خود ڈھا دیں، اپنے معبد کو خود ڈھا کر مسجد بنالیں، اس کی اجازت ہے۔ لیکن اگر وہ لوگ اپنے مسلک پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو نہ اُن کو ان کی عبادت سے روکا جا سکتا ہے، نہ ان کے عبادت خانے کو ویران کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ذمی اسی طرح سے اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں، جا کے عبادت کرتے ہیں، اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام ہمیں بھی کرنا چاہیے، جو بھی جگہ کسی نے اللہ کی عبادت کے لئے بنائی ہے اس کی بے حرمتی ٹھیک نہیں، اس کے اپنے مسلک کے مطابق اس کی عبادت کی جگہ ہے، وہ عبادت کرے۔

آدابِ مسجد

اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ: اِن لوگوں کے لئے تو یہ ٹھیک ہی نہیں تھا، اِن کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ اس طرح سے ویرانی میں کوشش کریں، ''نہیں تھا ان کے لئے کہ داخل ہوں ان مسجدوں میں مگر ڈرتے ہوئے''، جب بڑے آدمی کی مجلس میں کوئی شخص جایا کرتا ہے تو اس کے اُوپر ایک خوف وہراس کی کیفیت ہوتی ہے، یہ آپ بھی جانتے ہیں، مثلاً آپ کسی بزرگ کی خدمت میں جائیں یا اپنے شیخ کی خدمت میں جائیں تو جس وقت ان کے کمرے میں آپ داخل ہونے لگیں گے تو میرا خیال ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ طبیعت کے اُوپر عظمت کا ایک بوجھ ہوتا ہے، اپنے آپ پر انسان ایک اثر محسوس کرتا ہے، اور اس کی ہیبت

بدل جاتی ہے، اُس کے چہرے پر بھی اثر ہوگا، اس کے بدن پر بھی اثر ہوگا، جیسے آپ دوست احباب کی مجلس میں دندناتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اس طرح سے آپ اپنے استاذ کی مجلس میں یا شیخ کی مجلس میں نہیں جاتے۔ اور ایسے ہی کوئی دنیوی طور پر بڑا آدمی ہو، مثلاً گورنر سے ملنے کے لئے یا صدر سے ملنے کے لئے آپ چلے جائیں، جس وقت آپ اس کے دائرے میں داخل ہوں گے تو کیسا ہی مضبوط قلب کا آدمی کیوں نہ ہو اس کے اوپر ایک اثر نمایاں ہوتا ہے، یہ اصل میں صاحب خانہ کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے، جس کو آپ ملنے کے لئے جا رہے ہیں اُس کی عظمت اگر آپ کے قلب میں ہے تو وہاں جاتے ہوئے یقیناً آپ کے اُوپر اثرات ہوں گے۔ جب مسجد اللہ کا گھر ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر بھی انسان پر ظاہر ہونا چاہیے، جس وقت مسجد میں داخل ہو تو ادب کے ساتھ داخل ہو، سنجیدہ ہیئت میں داخل ہو، ایسے طریقے کے ساتھ داخل ہو جو اِس دربار کے آداب کے طور پر بتا دیا گیا، کہ پہلے دایاں قدم رکھو، دعا کرتے ہوئے داخل ہوؤ، وہاں جا کر اونچی آواز سے نہ بولو، قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاؤ، اور نماز پڑھنی ہے تو نماز پڑھو، نماز سے فارغ ہو گئے تو بیٹھو، اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کرو، اللہ کی طرف دھیان رکھو، ذکر میں مشغول رہو، اور جس وقت فارغ ہو جاؤ تو اسی طرح سے ادب واحترام کے ساتھ اٹھ کر آ جاؤ، یہ ہے اصل کے اعتبار سے مساجد کا ادب۔ اور جو شخص اس طرح سے مسجد میں جاتا ہے اور یوں جا کر اپنا حال ظاہر کرتا ہے تو گویا کہ اس کے قلب کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے، اور وہ اِس دربار کو دربارِ الٰہی سمجھتا ہے۔ پھر وہاں جا کر وہی تعظیم، کہ کبھی ہاتھ باندھ لیے، کبھی ناک زمین پر رگڑ دیا، کبھی اُس کے سامنے بیٹھ گئے، توبہ، استغفار، اپنی معذرت، اس سے مانگنا، سب کچھ ایسے ہی ہے جس طرح سے بڑے کے دربار میں جا کے ہوا کرتا ہے۔ اور اگر انسان چھلانگیں مارتا ہوا اور شور مچاتا ہوا جائے، پھر کوئی اُدھر کو بھاگ رہا ہے، کوئی اُدھر کو بھاگ رہا ہے، یہ سب چیزیں مسجد کے آداب کے خلاف ہیں۔ اور اسی طرح وہاں جا کر دنیا کی باتیں کرنا بھی مسجد کی بے ادبی ہے، جیسے روایات کے اندر صراحتاً منع کیا گیا ہے۔ تو جب مسجد میں جاؤ جوتی اتارو، ادب واحترام کے ساتھ مسجد میں داخل ہوؤ، نماز پڑھنی ہے تو نماز پڑھو، اگر نماز نہیں پڑھنی تو بھی قبلہ رُو ادب کے ساتھ بیٹھ جاؤ، تسبیح پڑھو، درود شریف پڑھو، تلاوت کرو، کوئی صورت اس قسم کی اختیار کرو کہ دیکھنے والا باہر اور مسجد میں فرق محسوس کرے، کہ جس وقت باہر آپ کھیل کے میدان میں پھرتے ہیں یا بازاروں میں پھرتے ہیں یا دوست احباب کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، جو آپ کا حال اس وقت ہوتا ہے مسجد میں جانے کے بعد اُس حال میں فرق یقیناً نمایاں ہو، تب تو ہم سمجھیں گے کہ واقعی آپ اِس مسجد کو اللہ کا گھر سمجھتے ہیں، اور اللہ کے دربار میں آپ حاضری دینے کے لئے آئے ہیں۔ اور اگر آپ کی حالت میں اور کیفیت میں کوئی فرق ہی نہیں، میدانِ کھیل میں بھی آپ کا وہی حال ہے اور مسجد میں بھی وہی حال ہے، جیسے یہاں دندناتے ہو وہاں بھی دندناتے ہو، جیسے یہاں قہقہے لگاتے ہو اور ہنستے کھیلتے ہو وہاں بھی ایسے ہی کرتے ہو، کسی کا منہ اُدھر کو ہے، کسی کا منہ اُدھر کو ہے، کوئی اُدھر کھڑا ہے، کوئی اُدھر کھڑا ہے، تو یہ سب چیزیں مسجد کے آداب کے منافی ہیں، ایسا کرنے والے کے قلب میں یوں سمجھو کہ اللہ کی عظمت نہیں، یا کم از کم اُس کو یہ استحضار نہیں کہ میں اللہ کے دربار میں آیا ہوا ہوں۔ اس لیے مسجد کا ادب یہی ہے کہ انسان اُس میں اس طرح سے جائے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اِن کے لئے مناسب ہی نہیں تھا کہ اس میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے'' اِن کے اوپر خوف وہراس کی کیفیت طاری ہونی چاہیے جس وقت یہ مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ تو جو لوگ مسجدوں کا احترام نہیں

کرتے، مسجدوں کے ویران کرنے میں کوشش کرتے ہیں، اور اللہ کا نام لینے سے مانع بنتے ہیں، مسجدوں میں جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے، ان کے اُوپر خوف کے آثار نہیں ہوتے، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور یہ بات اُن یہودیوں پر بھی صادق آتی تھی، نصاریٰ پر بھی صادق آتی تھی، اور مشرکوں پر بھی صادق آتی تھی۔

تحویلِ قبلہ کے متعلق یہود کی شورش اور اُس کا رَدّ

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: اللہ ہی کے لئے ہے مشرق ومغرب۔ یہ دو جہتیں ذکر کر دیں ورنہ شمال وجنوب بھی ایسے ہی ہے، ساری جہتیں اللہ کے لئے ہیں، جدھر بھی تم منہ کرو اُدھر اللہ کی ذات موجود ہے۔ یہ بنیاد اور تمہید ہے تحویلِ قبلہ کی جس پر یہود نے شور مچایا تھا، جس کا ذکر آگے شروع ہونے والا ہے۔ کہ نماز پڑھنے کے لئے کوئی خاص جہت مطلوب اور مقصود نہیں ہے، کہ اگر ادھر ہی منہ کرو تو اللہ کی عبادت ہوتی ہے، اگر کسی اور طرف منہ کرلو تو اللہ کی عبادت نہیں ہوتی، کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرو تو عبادت ہے، کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرلو تو عبادت نہیں ہے، جیسے شور مچانے والوں نے شور مچایا تھا، اور ان کے شور سے ایسے ہی معلوم ہوتا تھا جیسے اللہ کی عبادت کا یہی طریقہ ہے کہ فلاں طرف منہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسی کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات کوئی ایک جہت میں بند نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ساری کائنات پر محیط ہے، جدھر منہ کرو اُدھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت عبادت کے لئے ایک جہت کو اگر متعین کر دیں تو یہ محض ایک انتظامی چیز ہے، تاکہ اجتماعیت سامنے آجائے، کہ جب لوگ مل کر عبادت کریں گے، سب کا منہ ایک طرف ہوگا، تو ایک اجتماعیت معلوم ہوگی۔ اگر کوئی طرف متعین نہ کی جائے، تو کسی کا منہ کدھر کو ہوگا، کسی کا کدھر کو ہوگا، ایک انتشار معلوم ہوگا۔ اور جب اکٹھے بیٹھ کر عبادت کریں گے تو یہ انتشار قلوب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے جتنی صف سیدھی ہو اور جتنا رخ سیدھا ہو اتنا ہی نماز کے اندر سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ تسویۃ الصفوف بھی اقامتِ صلوٰۃ میں داخل ہے، نماز کے اچھی طرح سے ادا کرنے میں یہ داخل ہے کہ نماز پڑھتے وقت صفیں بھی سب کی سیدھی ہوں۔(۱) یہ ایک انتظامی چیز ہے۔

کوئی جہت بذاتِ خود قبلہ نہیں

یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ کعبہ سے مشرق کی طرف ہیں تو ہمارا قبلہ مغرب کی جانب ہے، اور جو کعبۃ اللہ سے مغرب کی طرف ہیں اُن کا قبلہ مشرق کی جانب ہے، اور جو شمال کی طرف ہیں ان کا قبلہ جنوب کی جانب ہے، اور جو جنوب کی طرف ہیں اُن کا قبلہ شمال کی جانب ہے، تو کوئی ایک جہت متعین نہیں ہے، کہ شمال ہی قبلہ ہے، یا جنوب ہی قبلہ ہے، یا مشرق ہی قبلہ ہے، یا مغرب ہی قبلہ ہے، کوئی جہت جہت ہونے کی حیثیت سے مطلوب نہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک مکان کو اپنی طرف منسوب کر کے قائم کر دیا کہ تم نے رُخ اِدھر کرنا ہے، اگر کوئی شمال میں ہے تو جنوب کی طرف منہ کرے گا، جنوب میں ہے تو شمال کی طرف منہ کرے گا، مشرق میں ہے تو مغرب کی طرف منہ کرے گا، مغرب میں ہے تو مشرق کی طرف منہ کرے گا، اِس میں جہت کی کونسی بات ہوئی؟

---

(۱) بخاری ۱/۱۰۰ باب اقامۃ الصف/ مشکوۃ ۱/۹۸ باب تسویۃ الصف، فصل اول۔

کعبہ جہتِ سجدہ ہے، مسجود لہٗ نہیں ہے

اور یہ جو کعبۃ اللہ کو متعین کر دیا گیا اس میں بھی ہمارا سجدہ کعبے کو نہیں ہے، یاد رکھیے! کعبہ جہتِ سجدہ ہے، مسجود لہٗ نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی بت پرست اعتراض کرے کہ ہم پر تو مسلمان اعتراض کرتے ہیں کہ بتوں کو سجدہ کیوں کرتے ہیں، خود بھی تو کعبے کو سجدہ کرتے ہیں، تو یہ اعتراض بھی جہالت کا اعتراض ہوگا، ہم کعبے کو سجدہ نہیں کرتے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک رُخ متعین کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت یہ کعبہ نعوذ باللہ! ڈھا دیا جائے اور یہاں کوئی پتھر کا نشان باقی نہ رہے، اس کے اوپر بلڈوزر لگا دیں اور سارے پتھر اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں تو بھی ہمارا منہ ادھر ہی ہوگا، یہ عمارت ہو تو بھی ہم اِدھر منہ کریں گے اور یہ عمارت نہ ہو تو بھی ہم اِدھر منہ کریں گے، اس لیے اگر کسی وقت کعبۃ اللہ نعوذ باللہ! گر جائے اور اس کے اوپر عمارت کا نشان نہ رہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ادھر منہ نہیں کریں گے، جہاں اس کے پتھر پھینکے ہوئے ہوں گے ادھر کو منہ کر لیں گے، ایسی بات نہیں ہے، یہ عمارت تو محض ایک نشان ہے، اللہ تعالیٰ نے انتظامی طور پر ایک جہت متعین کر دی تاکہ اس میں ایک اجتماعیت کی شکل پیدا ہو جائے، سکون اور اطمینان اور اجتماعِ قلب کے حاصل کرنے کی ایک صورت ہے کہ سب کا رخ ایک طرف ہو، ورنہ یہ کعبہ کے پتھر اور یہ عمارت ہماری مسجود لہٗ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کے حکم کے تحت بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو جائے تو بھی کوئی بات نہیں، اور کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو جائے تو بھی کوئی بات نہیں۔

آیت ''لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ'' سے مستنبط کچھ مسائل

اسی آیت سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکال لیا کہ جب اللہ تعالیٰ ہر جہت میں موجود ہے، اگر کوئی شخص ایسی جگہ میں نماز پڑھے کہ اس کو متعین طور پر معلوم نہیں کہ کعبہ کدھر ہے، تو اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کر کے کہ یہ نماز کی جہت ہے، اُدھر کو منہ کر کے نماز پڑھ لے نماز صحیح ہے، چاہے بعد میں معلوم ہو جائے کہ اس کی پشت قبلے کی طرف تھی تو بھی اس کی نماز صحیح ہے، یعنی آپ ایک ایسی جگہ چلے گئے جہاں آپ کو معلوم نہیں کہ کعبۃ اللہ کا رخ کدھر ہے، آپ اپنے دل سے فیصلہ کر کے ایک جہت کو جہتِ صلوٰۃ بنا لیجیے، جس وقت آپ نے اس کو جہتِ صلوٰۃ بنا لیا، اپنے دل کا رخ اُدھر کر لیا، وہ اللہ کی طرف ہی سجدہ ہے، چاہے بعد میں تحقیق ہو جائے کہ آپ کی پشت کعبے کی طرف تھی تو بھی آپ کی نماز صحیح ہے۔ اور سفر کی حالت میں اسی سے ایک عموم نکال لیا، کہ سفر میں کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا اگر مشکل ہو تو جدھر کو منہ ہو اُدھر کو منہ کر کے نماز پڑھ لے، جیسے انسان سواری پر بیٹھا ہے، گھوڑے پر بیٹھا ہے، اور مشرق کی طرف جا رہا ہے اور پشت قبلے کی جانب ہے، تو بیٹھا بیٹھا گھوڑے کے اوپر نفل پڑھتا رہے، کیا حرج ہے، منہ دوسری طرف ہو اور اشارے کے ساتھ پڑھتا جائے، نماز ہو جائے گی۔ البتہ فرض نماز کے لئے اترنا ضروری ہے اگر اُترنا ممکن ہو، اگر اُترنا ممکن نہ ہو تو پھر فرض نماز بھی سواری کے اوپر ادا ہو جاتی ہے، ''ممکن نہ ہو'' کا مطلب یہ ہے کہ ایسا بیمار ہے کہ سواری سے اُتر نہیں سکتا، اُس کو پتہ ہے کہ اگر میں اتر گیا تو دوبارہ چڑھ نہیں سکوں گا، یا جیسے جہاد میں یہ صورت پیش آ جاتی ہے کہ دشمن پیچھے لگا ہوا ہے، ٹھہرنے کی گنجائش نہیں ہے، ایسے وقت میں سواری کے اوپر نماز ادا کی جا سکتی ہے جدھر کو بھی رُخ ہو۔ ہاں البتہ جن سواریوں پر بیٹھا ہوا انسان اپنا رُخ بدل سکتا

ہے، (گھوڑے پر اور گدھے پر بیٹھ کر رُخ نہیں بدلا جا سکتا) اُن میں رُخ کا بدلنا ضروری ہے، اس لیے ریل میں یا کشتی میں اگر نماز پڑھیں تو وہاں قبلے کی جانب منہ کرنا ضروری ہے، اُس کو گدھے گھوڑے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سارے کے سارے احکام فقہاء نے اسی آیت کے تحت لکھے ہیں۔ اور جاہلوں میں یہ بہت ہی زیادہ کوتاہی کی بات ہے، آپ نے ریل گاڑی میں دیکھا ہوگا کہ جدھر کو سیٹ کا رُخ ہو بس اُدھر ہی بیٹھ کر نماز پڑھ لیں گے چاہے نیچے فرش کتنا ہی خالی کیوں نہ پڑا ہو۔ اگر چہ کھڑے ہو کر پڑھنے کی گنجائش ہے اور رُخ بدلنے کی گنجائش ہے لیکن نہیں بدلتے، ایسے ہی سیٹ پر بیٹھ کر پڑھ لیں گے جدھر کو سیٹ کا رخ ہوگا، یہ بالکل غلط ہے، اس طرح سے نماز ادا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر آپ کسی کو روکیں گے تو کہیں گے یہ تو بھئی! سفر کا معاملہ ہے، بس ٹھیک ہے جس طرح سے ہو جائے، یہ جاہلیت کی بات ہے، علم کی بات نہیں ہے۔ تو جب بھی ریل گاڑی میں نماز پڑھنے کی نوبت آئے تو رُخ معلوم کرنا چاہیے، جوان آدمی کو کھڑے ہو کر پڑھنی چاہیے، البتہ بوڑھا آدمی جس کو حرکت کے ساتھ گر جانے کا یا چکر آ جانے کا اندیشہ ہے وہ بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے۔ ''جدھر بھی منہ کرو وہیں اللہ کی ذات ہے، بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے۔''

مذکورہ تینوں گروہوں کا عقیدۂ ولدیت میں اشتراک

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا: یہ بھی ایک مشترکہ عیب ہے جس کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، کہ یہ کہتے ہیں، یعنی یہود بھی، نصاریٰ بھی اور مشرکین بھی، کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ہے۔ یہود نے کہا تھا: ''عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ''، اور نصاریٰ نے کہا تھا کہ ''الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ'' (التوبہ: ۳۰)، اور مشرکینِ مکہ ملائکہ کو ''بنات اللہ'' کہتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں: ''جَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا'' (الصافات: ۱۵۸) اللہ اور جنوں کے درمیان انہوں نے رشتہ داری قائم کر دی، کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جنوں کے ہاں شادیاں کرتا ہے، بڑے بڑے جنوں کی لڑکیوں سے شادی کرتا ہے، اور پیدا فرشتے ہوتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا''، اللہ، بیوی جن، اور اولاد فرشتے، یہ مشرکینِ مکہ کا فلسفہ تھا۔ تو اس عقیدۂ اولاد کے اندر بھی یہ سارے کے سارے مشترکہ تھے۔

سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے، اس کے لئے اولاد کی نسبت ایک عیب ہے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

اِنسان کو اولاد کیوں مطلوب ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت عیب ہے جس کو اللہ نے سُبْحٰنَهٗ کے لفظ میں ذکر فرمایا، کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس نے اولاد اختیار کی ہے اللہ اِس عیب سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت عیب کی نسبت کیوں ہے؟ اِس کو اس طرح سے سمجھئے کہ اولاد کیوں مطلوب ہے؟ ہمارے دل میں اگر اولاد کی خواہش ہے تو اُس کا منشا کیا ہے؟ اولاد یا تو انسان اس لیے چاہتا ہے کہ میں اس وقت تو جوان ہوں، اپنی ضروریات پوری کر رہا ہوں، آخر طبعی رفتار کے تحت ایک وقت بوڑھا ہونا ہے، جس وقت اپنی قوتیں جواب دے جائیں گی، اور پھر ہم اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکیں گے، اٹھنا بیٹھنا ہمارے لیے مشکل ہوگا، کھانا پکانا مشکل ہوگا، چلنا پھرنا مشکل ہوگا، ایسے وقت میں پھر اولاد سہارا بنتی ہے، کہ بوڑھے ماں باپ چار پائی پر سوار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اولاد کماتی ہے، انہیں کھلاتی ہے، ان کی خدمت کرتی ہے، اور انسان کا آخری وقت کچھ آرام سے گزر جاتا ہے، تو

بڑھاپے کا خوف انسان پر جو مسلط ہے اُس کے تدارک کے لئے انسان اولاد چاہتا ہے، کہ میرے محتاج ہونے کے زمانے میں اور بڑھاپے کے زمانے میں میری خدمت کرے گی، اور اگر اس وقت بچے نہ ہوئے تو پھر مجھے کون سنبھالے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ اس کے اندر بھی احتیاج ہی احتیاج والا معنیٰ ہے۔ یا اولاد اس لیے مطلوب ہوتی ہے کہ میں نے جائیداد بنالی، میرا کاروبار ہے، دُکان ہے، زمین ہے، مکانات ہیں، کارخانے ہیں، اب میں نے محنت کر کے یہ سارے کے سارے جمع کیے ہیں، اگر میری اولاد نہ ہوئی تو میرے مرنے کے بعد پرائے لوگ لے جائیں گے، میری محنت سے پرائے فائدہ اٹھائیں گے، اس لیے اولاد حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے تاکہ یہ جمع کی ہوئی دولت اپنے ہی کام آئے، کیونکہ اولاد کے جو کام آئے گی تو اس کو انسان یہی سمجھتا ہے کہ گھر کی چیز گھر میں ہی رہ گئی، اور جب اولاد نہ ہو اور دور والے رشتہ دار اس وارثت کو سنبھال لیں تو پھر اس تصور کے ساتھ انسان کو تکلیف ہوتی ہے، کہ محنت میری، مشقت میری، کمائی میری، اور فائدہ دوسرے اٹھالیں گے۔ تو اپنی موت کا تصور کرتے ہوئے اور اپنی وراثت کا خیال کرتے ہوئے انسان کے دل میں اولاد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کی خود غرضی اور احتیاج ہی ہے۔ یا اولاد کا جذبہ اس لیے ہوتا ہے کہ اکیلے آدمی سے کاروبار سنبھالا نہیں جاتا، اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نوکر رکھتا ہوں تو وہ بھی خراب کرتے ہیں، اور اگر اپنے ہی بچے ہوں، اپنی ہی اولاد ہو تو اپنے کاروبار میں شریک ہو جائے گی، اس وقت بھی کام میں ہاتھ بٹائے گی، جائیداد کا انتظام آسان ہو جائے گا، کاروبار کا سنبھالنا آسان ہو جائے گا، تو انسان اپنے لیے اس جوانی میں ہی معاونت چاہتا ہے، کاروبار کے اندر شرکت چاہتا ہے، اس لیے اولاد مطلوب ہوتی ہے۔

اولاد کی نسبت اللہ کی طرف عیب کیوں ہے؟

اب آپ بتائیے کہ ان تینوں میں سے کونسی بات ایسی ہے جس کی نسبت آپ اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے آپ کہیں کہ اللہ کو بھی اولاد کی ضرورت ہے، کیا نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ کو موت کا اندیشہ ہے کہ میرے فنا ہو جانے کے بعد میری اس کائنات کو کون سنبھالے گا؟ کیا اللہ تعالیٰ سے اس وقت یہ کائنات سنبھالی نہیں جاتی، کہ اس کو اپنے معاون اور مددگار کی ضرورت ہے کہ میرا کوئی بچہ ہو تو مجھ کو سنبھالے؟ کیا کوئی ایسا وقت بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعوذ باللہ اعضاء بدن قوتیں جواب دے جائیں گی، اور وہ کمزور اور ضعیف ہو جائے گا، تو اُس وقت بچوں کی ضرورت ہو گی تاکہ اس بڑھاپے کے زمانے میں سہارا بنیں؟ اولاد کی ضرورت جن وجوہ کی بناء پر ہوا کرتی ہے ان میں سے کوئی وجہ بھی اللہ تعالیٰ پر صادق نہیں آتی، اس لیے اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج کی نسبت ہے اور اللہ تعالیٰ احتیاج سے پاک ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اولاد اگر کسی کے گھر میں خلاف جنس پیدا ہو جائے تو یہ مستقل عیب ہے، جیسے انسان کے گھر میں گھوڑا پیدا ہو جائے، یہ عیب ہے، انسان کی اولاد میں بندر آ جائیں یہ عیب ہے، خوبی یہ ہوتی ہے کہ اولاد ہم جنس ہو، اور ہم جنس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو خصوصیات ماں باپ کی ہیں وہی خصوصیات اولاد میں ہوں، مثال کے طور پر باپ اگر حیوانِ ناطق ہے تو اُس کی اولاد حیوانِ ناطق ہونی چاہیے، تبھی یہ خوبی بنے گی۔ ورنہ اگر وہ حیوانِ ناطق نہ ہو، حیوانِ ناطق کے گھر حیوانِ ناہق پیدا ہو جائے تو یہ ایک عیب ہے اور انسان منہ چھپاتا پھرے

گا۔ بھینس کے ہاں بھینس ہی پیدا ہو تو خوبی ہے اور گھوڑی کے ہاں گھوڑا ہی پیدا ہو تو خوبی ہے، بہر حال بچہ اسی نوع اور اسی جنس کا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خوبی ہے، اور اگر خلافِ جنس بچہ پیدا ہو جائے تو ہم بھی اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اولاد کا تصور ہو تو اگر تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کا خلافِ جنس قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کی خصوصیات اس میں موجود نہ ہوں تو یہ تو ہمارے معاشرے میں بھی عیب ہے، اور اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی خصوصیات کا حامل بنایا جائے تو شرک لازم آگیا، اور شرک کا قول کرنا ظلم عظیم ہے، کیونکہ پھر جیسے اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں تو اس کو بھی واجب الوجود ہونا چاہیے، اور جس قسم کی صفات اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں اسی قسم کی صفات اس کو بھی حاصل ہونی چاہئیں، اور اگر ایسا تصور کر لیا جائے تو پھر توحید باقی نہیں رہتی، شرک لازم آگیا، اور شرک ایک مستقل ظلم عظیم ہے۔ اس لیے کسی بھی نہج سے سوچو، اولاد کا فلسفہ جو بھی آپ کے سامنے آئے گا اس فلسفے کے تحت اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت عیب ہی عیب ہے، اس میں کوئی خوبی کا پہلو نہیں ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''شَتَمَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذَالِكَ'' ابنِ آدم مجھے گالی دیتا ہے اور اس کے لئے یہ بات مناسب نہیں تھی، ''شَتْمُهُ إِيَّايَ أَنْ يَقُولَ اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا'' اُس نے جو مجھے گالی دی ہے وہ گالی کیا ہے؟ کہ میرے بارے میں کہتا ہے کہ میرے بچے ہیں، ''سُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا'' میں تو پاک ہوں کہ میں بیوی اختیار کروں یا بچے اختیار کروں،[1] بیوی بچوں کے اختیار کرنے سے میں پاک ہوں، تو میری طرف اولاد کی نسبت کرنا تو مجھے گالی دینے کے برابر ہے، اور گالی اسی طرح سے بنتی ہے کہ یہ ایک عیب ہے اور عیب کی نسبت گالی ہوتی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (سورۂ انعام: ۱۰۱) اس کے لئے اولاد کہاں سے ہوگی؟ اس کی تو کوئی بیوی ہی نہیں ہے! اور اگر اللہ کے لئے کوئی بیوی ثابت کرو گے تو جیسے خاوند اور بیوی کے آپس میں تعلقات ہوتے ہیں کیا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے کہ آپ اس قسم کا تصور اللہ کے متعلق قائم کریں؟ اس لیے اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عیب ہے، اور اس عیب کی نسبت یہود نے بھی کی، نصاریٰ نے بھی کی، اور مشرکینِ مکہ نے بھی کی۔ تو ہر ایک اپنے لیے جنت کا مدعی ہے، ہر ایک اپنے لیے حق پر ہونے کا مدعی ہے، لیکن نظریات ایسے لچر ہیں۔

ایک بھڑ بھونجے نے عیسائی پادری کو خاموش کرادیا

جس وقت ہندوستان میں ابتداءً انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی ہے، آپ اُس زمانے کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کے سامنے ایک بات آئے گی، کہ انہوں نے ظاہری حکومت کو قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے مذہب کو تبدیل کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی، اس لیے پادریوں کا ایک ریلا آیا تھا، جو آ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتا تھا اور اہلِ اسلام کو عیسائیت کی دعوت دیتا تھا، جس کا مقابلہ اُس وقت علماء نے کیا، اور الحمد للہ! اس مقابلے میں وہ عیسائی پادری ہر جگہ شکست کھا گئے اور وہ ارتداد کا فتنہ آگے نہ

(۱) بخاری ۲/ ۶۴۴، کتاب التفسیر. سورۃ البقرۃ/ ۲/ ۷۴۴، کتاب التفسیر. سورۃ قل ھو اللہ/ مشکوۃ ص ۱۳۔ نوٹ: مذکورہ الفاظ دو حدیثوں سے لیے گئے ہیں۔

بڑھ سکا بلکہ رُک گیا، اُس دور کے عجیب وغریب حالات ہیں۔ اسی زمانے میں ایک دفعہ ایک پادری کھڑا دہلی میں تقریر کررہا تھا اور ثابت کررہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اِس بات پر وہ تقریر کررہا تھا، لوگ سن رہے تھے، مجمع کے اندر ایک بھڑ بھونجا بیٹھا ہوا تھا (''بھڑ بھونجا'' اُردو کے اندر ان لوگوں کو کہتے جو بھٹی لگا کر دانے بھونا کرتے ہیں) تو ایک بھڑ بھونجا بیٹھا ہوا تھا، جاہل سا، پڑھا ہوا نہیں تھا، وہ کھڑا ہو کر پادری پر ایک سوال کرتا ہے، کہتا ہے کہ پادری صاحب! آپ کہہ رہے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور بھی اللہ کا بیٹا ہے؟ تو وہ پادری کہنے لگا کہ نہیں! عیسیٰ اللہ کا اکلوتا بیٹا ہے، دوسرا کوئی اللہ کا بیٹا نہیں، تو بھڑ بھونجا کہتا ہے کہ پادری صاحب! کوئی اور ہونے کی توقع ہے؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں، کوئی اور ہوگا بھی نہیں، بس ایک ہی ہے، دوسرے کی توقع بھی نہیں۔ تو بھڑ بھونجا کہتا ہے تیرے خدا میں کیا خوبی ہوئی، میری اتنی عمر ہے اور اتنے سال ہوئے ہیں شادی کو، اور میرے بارہ بچے ہیں اور اتنی طویل مدت میں اللہ کا ایک ہی ہے؟ یہ بات سن کر عیسائی پادری خاموش ہوگیا، اور یہ بات مشہور ہوگئی، چلتی چلتی دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو اس وقت صدر مدرّس ہوتے تھے، (یہ دار العلوم کے پہلے صدر مدرّس ہیں، اور حضرت تھانویؒ کے اُستاذ ہیں) ان تک یہ بات پہنچی، وہ اِس اعتراض کو سن کر عش عش کر اُٹھے، اور کہنے لگے کہ پادری کا باپ بھی آجائے تو اس اعتراض کا جواب نہیں دے سکتا، کہنے لگے کہ اس بھڑ بونجے کا مطلب یہ ہے، (اب اس کو آپ نے علمی انداز میں ادا کیا) کہ بھڑ بھونجا کہنا یہ چاہتا ہے کہ اولاد کا ہونا خوبی ہے یا عیب؟ اگر تو عیب ہے تو ایک بھی عیب، اور اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف نہیں کی جاسکتی، اور اگر یہ خوبی ہے تو جس طرح سے اللہ تعالیٰ کے دیگر کمالات لامتناہی ہیں اور کوئی مخلوق کمالات میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، تو پھر یہ کمال بھی اللہ میں سب سے زیادہ ہونا چاہیے، یہ کیا ہوا کہ آپ اِس کو کمال بھی کہیں اور اِس کمال میں مخلوق اس سے بڑھ گئی؟ اگر اس کو کمال قرار دیں تو پھر یہ کمال باقی کمالات کی طرح لامتناہی ہونا چاہیے، اور اِس کمال میں کوئی مخلوق مقابلہ نہ کرسکے، نہ سانپ کے اتنے بچے ہوں، نہ مچھلی کے اتنے بچے ہوں، نہ دوسری کسی مخلوق کے اتنے بچے ہوں جتنے اللہ کے ہونے چاہئیں، تاکہ یہ لازم آجائے کہ اللہ کے کمال کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، جو بھی اس کا کمال ہے لامتناہی ہے، اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے کمال کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ تو پھر چاہیے تھا کہ اس کی اولاد بھی اتنی ہوتی کہ اس کی مخلوق میں سے کسی کی اتنی نہ ہوتی۔ تو پھر یہ کیا فلسفہ ہوا کہ ایک ہی ہے، اگر عیب ہے تو ایک بھی عیب، اگر خوبی ہے تو سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ تو بھڑ بھونجے کا مطلب یہ تھا کہ یہ اگر خوبی ہے تو اس میں تو میں بارہ گنا زیادہ ہوں کہ اللہ کا ایک اور میرے بارہ۔

نظریۂ اولاد کے رَدّ کے لئے قدرتِ الٰہی کا ذِکر

بہرحال جس حیثیت سے بھی آپ اولاد کے نظریے کو سوچیں گے اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عیب ہی ہے۔ اس لیے فرمایا: سُبْحٰنَهٗ: اللہ اس عیب سے پاک ہے، اللہ کی اولاد نہیں۔ ''بلکہ اُسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے''، ساری کائنات اس کی مملوک ہے، اور بیٹا مملوک نہیں ہوتا، اور اگر کوئی بیٹا ہو ہی جائے تو اس کو اللہ کی صفات کا مالک ہونا چاہیے، پھر چاہیے کہ وہ بھی کائنات کا مالک ہو، اس کو کائنات کے مالک بننے کا استحقاق ہو، ایسا بھی نہیں ہوسکتا، ملکیت اللہ ہی کے لئے قائم ہے،

اور بیٹا مملوک نہیں ہوتا، اور جب ساری کی ساری کائنات اللہ کی مملوک ہے تو اس میں کسی دوسرے کے شرک کی بھی گنجائش نہیں۔ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ: سارے کے سارے اللہ کے فرمانبردار ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سرکشی اور بغاوت کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کو سنبھالنے کے لئے اللہ کو سہارے کی ضرورت ہو، سارے کے سارے اللہ کے مطیع ہیں، فرمانبردار ہیں۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین وآسمان کو وہ نئے انداز سے نئے نمونے سے پیدا کرنے والا ہے، جس کا پہلے نمونہ موجود نہیں، اور قدرت اس کی ایسی ہے (اس کو کیا ضرورت ہے کسی معاون اور مددگار کی) کہ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا: جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے، فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ: تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس امر کے متعلق کہہ دیتا ہے، ہوجا، فَيَكُوْنُ: پس وہ ہوجاتا ہے۔ تو جس کی قدرت کُن فیکونی ہو اس کو اپنے لیے معاون اور مددگار کی کیا ضرورت ہے؟

مذکورہ تینوں گروہوں کے مشترکہ بے جا مطالبات

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ: یہ اگلا ایک مشترک اعتراض آگیا جو کہ یہود نصاریٰ اور مشرکین کی طرف سے تھا۔ اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: وہ لوگ جن کو علم نہیں، جاہل۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی واضح نشانی کیوں نہیں آتی؟ یہود بھی کہتے تھے، نصاریٰ بھی کہتے تھے، اور مشرکین بھی کہتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست ہم سے کلام کرے اور ہمیں کہے کہ یہ ہمارا رسول ہے، یا اس قسم کی کوئی نشانی بھیجے جس کے سامنے ہم مجبور ہوجائیں اِس کو ماننے کے لئے، جیسے کوئی فرشتہ آجائے جو آکر ہمارے ساتھ کلام کرے اور کہے کہ یہ اللہ کا رسول ہے، یا ان کے اشاروں کے ساتھ پہاڑ چل پڑیں، یا ہماری زمین کے اندر چشمے جاری ہوجائیں، یا اِس کے پاس بہت بڑا باغ ہو، یا یہ آسمان پر چڑھ کر دکھائے، یا آسمان سے عذاب ہمارے اوپر گرا کے دکھائے، اس قسم کے ان کے مطالبے ہوتے تھے جو آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ۹۰ تا ۹۳) میں آئیں گے، اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ، ان کے جتنے مطالبے ہیں جو میں نے آپ کا سامنے ذکر کیے ان کی فہرست اُس آیت میں موجود ہے، کہ کبھی کہتے ہیں یوں ہوجائے، کبھی کہتے ہیں یوں ہوجائے۔ ''یا براہِ راست اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کرے''، یعنی اِن سے اگر کلام کرتا ہے تو ہمارے ساتھ کیوں نہیں کرتا۔

اہلِ کتاب کو ''جاہل'' کیوں کہا گیا؟

اِس قسم کی باتیں کرتے تھے، اور یہ باتیں چونکہ جاہلانہ ہیں، اس لیے یہود نصاریٰ مشرکین سب کو لَا يَعْلَمُوْنَ کے اندر لپیٹ لیا گیا، کہ بظاہر اگرچہ وہ علم والے تھے، لیکن جس وقت کوئی شخص اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھائے اور علم کے مقتضیٰ پر نہ چلے تو وہ لَا يَعْلَمُوْنَ کا ہی مصداق ہوتا ہے، ''علمے کہ راہ بحق نماید جہالت است'' (غزلیاتِ سعدی، غزل: ۵۵) ایسے علم کا کوئی فائدہ نہیں جس انسان ہدایت حاصل نہ کرسکے، بلکہ وہ جہالت کے برابر ہے۔

سب کافر صفتِ طغیان میں مشترک ہیں

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان کا یہ اعتراض بھی نیا اعتراض نہیں، بلکہ انبیاء ﷺ کی تاریخ اٹھا کر

دیکھو گے تو انبیاء علیہم السلام کے مخاطبین اکثر و بیشتر ایسے ہی اعتراض کرتے ہیں کہ اِن میں کیا خصوصیت ہے کہ اللہ کی وحی ان پر آتی ہے اور اللہ اِن کے ساتھ کلام کرتا ہے، ہم پر وحی کیوں نہیں آتی۔ جیسے مشرکین کا قول قرآنِ کریم میں نقل کیا ہوا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف: ۳۱)، اور ایسے ہی اور آیات بھی ہیں جن میں ان کا مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیوں نہیں بولتا، ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ ''ایسے ہی کہا ان لوگوں نے جو اِن سے پہلے گزرے ہیں بالکل ان کی بات کی طرح'' مطلب یہ ہوا کہ یہ اعتراض کوئی نیا نہیں ہے، انبیائے سابقین پر بھی لوگوں نے اِسی قسم کے اعتراضات کیے ہیں، تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ: ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں، ان کے دلوں کی آپس میں مشابہت ہے، ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں، جیسے اعتراضات پہلے مشرکوں نے اٹھائے تھے اور انبیاء علیہم السلام کے مخالفین نے اٹھائے تھے اسی قسم کے اعتراض یہ بھی اٹھاتے ہیں۔ سورۂ ذاریات کے آخری رکوع میں ستائیسویں پارے کے دوسرے رکوع میں یہ الفاظ آئیں گے كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ: ان سے پہلے بھی لوگوں کے سامنے جب بھی کوئی رسول آیا تو انہوں نے کہا: سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ: یا جادوگر کہا یا دیوانہ کہا، اِس بات کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَتَوَاصَوْا بِهٖ: کیا یہ جاتے ہوئے ایک دوسرے کو وصیتیں کر جاتے ہیں؟ کہ جب رسول آئے تو تم نے یہی اعتراض کرنا ہے، یعنی ان کے اعتراضات میں اتنی یگانگت ہے اور اتنا اتحاد ہے کہ جو پہلوں نے اعتراض کیا وہی اعتراض پچھلے کرتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جاتے ہوئے ایک دوسرے کو وصیت کر جاتے ہیں کہ جب بھی کوئی رسول آئے تو تم نے یہی اعتراض کرنا ہے۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ: وصیت تو کیا کرنی ہے، کیونکہ بعض اُمتوں کی بعض اُمتوں سے ملاقات تک ثابت نہیں ہے، بس یہ صفتِ طغیان کے اندر مشترک ہیں، جس وقت اِن سب میں سرکشی اور بغاوت والا معنیٰ پایا جاتا ہے تو سرکشی اور بغاوت والے ذہنوں سے اعتراضات ایک ہی قسم کے آیا کرتے ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ: اِن کے قلوب آپس میں ملتے جلتے ہیں، ان کی ذہنیت ایک جیسی ہے۔ اور آپ بھی جس وقت چاہیں اس کا تجربہ کر سکتے ہیں، اگر آپ کی مناسبت کسی شخص کے ساتھ ہو گئی، آپ کا ذہنی اتحاد اُس کے ساتھ ہو گیا، اور آپس میں محبت اور اُنس ہو گیا، آپ ایک دوسرے کے خیالات سے متفق ہو گئے، تو ایک کراچی میں بیٹھا ہے ایک پشاور میں بیٹھا ہے، ایک اعتراض کراچی والے پر کوئی کرے، اور وہی اعتراض پشاور والے پر کوئی کرے، تو جواب دونوں کا ایک جیسا ہو گا، اور ذہن کے اندر جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ ایک ہی نہج کے ہوتے ہیں اور ایک ہی نہج کے اُن کے جوابات ہوتے ہیں، یہ جماعتوں کا اتحاد آپس میں اسی بات پر تو ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ ہر اعتراض کا جواب لیڈر کی طرف سے سب کو سمجھایا جائے، کیونکہ جب مزاج میں یگانگت ہو جاتی ہے تو ذہن کے سوچنے کا طریقہ ایک ہی ہو جاتا ہے۔ تو خوش قسمت ہوتا ہے وہ شخص جس کی ذہنی مناسبت کسی اچھے آدمی سے ہو جائے، تو اُس کے خیالات اچھائی کی طرف جائیں گے، اور بدقسمت ہے وہ انسان جس کی ذہنی مناسبت کسی بُرے انسان کے ساتھ ہو جائے، تو اس کے ذہن کے اندر بُرائی کے وہی طریقے سوجھیں گے، اس لیے مشرق میں بیٹھنے والے اور مغرب میں بیٹھنے والے جو بُرائی کی لائن پر چل رہے ہیں تو بُرائی کا طریقہ ایک ہے، اور اسی طرح مشرق اور مغرب میں بیٹھنے والے جو نیکی کے راستے پر چل رہے ہیں ان کی نیکی کا طریقہ ایک ہے۔

ذہنی مناسبت پیدا کرنے والی دو چیزیں: صحبت اور لٹریچر

اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ ذہنی مناسبت اچھے لوگوں سے پیدا ہو، اور ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے اندر دو چیزیں سب سے زیادہ دخیل ہوتی ہیں، ایک صحبت اور ایک لٹریچر کا مطالعہ، جیسے لوگوں کی کتابیں آپ دیکھیں گے آہستہ آہستہ آپ کا ذہن ویسے ہی بنتا چلا جائے گا، جیسے لوگوں کے ساتھ آپ کی محبت تعلق اور صحبت ہوگی آپ کا ذہن ویسے ہی بنتا چلا جائے گا، سینما دیکھنے والے اور ناول پڑھنے والے شرارتوں کے انداز وہی سوچتے ہیں جس قسم کے اُن کو وہاں سمجھائے جاتے ہیں، آخر آئے دن ڈکیتی اور اغواء کی وارداتیں آپ کے سامنے ڈرامائی انداز کی جو آتی رہتی ہیں یہ کوئی ماں کے بطن سے سیکھ کر نہیں آتے، ذہن کی تربیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ اس قسم کی چیزیں خود بخود سوجھتی ہیں۔ اور اگر آپ اچھی کتابیں پڑھیں گے اور اچھا مطالعہ کریں گے تو ذہن کی ساخت ایسی بنتی چلی جائے گی کہ آپ کے ذہن سے نیکی کی عجیب عجیب صورتیں پھوٹیں گی اور نیکی کی طرف آپ کی رفتار تیز ہوتی چلی جائے گی، جن لوگوں سے محبت رکھو گے اور جن کی صحبت میں بیٹھو گے اسی قسم کی ذہنیت بنتی چلی جائے گی، اور آگے آپ کا عمل اور کردار جتنا بھی ہے وہ اسی سانچے کے اندر ڈھلتا چلا جائے گا، اگر بروں کے پاس بیٹھو گے اور ان کی صحبت اختیار کرو گے تو ان جیسے جذبات بنیں گے، برائی آئے دن آپ کے سامنے نئی سے نئی شکل میں آتی چلی جائے گی، اور اگر نیک صحبت اختیار کرو گے تو آپ کے جذبات اچھے ہوتے چلے جائیں گے، نیکی دن بدن آسان ہوتی چلی جائے گی۔ مشابہتِ قلوب ایک بہت بڑا اصول ہے زندگی کو ایک نہج کے اوپر ڈالنے کا، اور تشابہ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے، محبت پیدا کرنا، صحبت اختیار کرنا، اور اس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا، کتابوں کا مطالعہ کرنا، اگر آپ اِس انداز کے ساتھ چلیں گے تو ذہنی مناسبت آپ کی اُسی طبقے کے ساتھ ہوگی جن کے ساتھ آپ نے تعلق لگالیا اور جن کا آپ نے مواد پڑھنا شروع کر دیا اور رسالے اور کتابیں دیکھنی شروع کر دیں، اُسی انداز کے ساتھ آپ سوچنا شروع ہو جائیں گے اور آپ کا کردار اسی نہج پر آجائے گا۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے کوشش کرنی چاہیے اپنے مسلک کے اکابر کی کتابیں دیکھنے کی، اُنہی کے ملفوظات اور اُنہی کی ہدایات پڑھنے کی، اس سے انسان کے جذبات اُن کے مطابق بنتے ہیں۔ اور غلط کار لوگ اور خاص طور پر جو فاحشہ کی اشاعت کرنے والے ہیں، فحش کی اشاعت کرنے والے ہیں، جیسے ناول اور فلمی رسالے اور اس قسم کی عشق بازی کی حکایتیں، ان سے بہت احتیاط کرنی چاہیے، کہ اِس عمر میں ذہن اثرات جلدی قبول کرتے ہیں، اور ایسا مطالعہ کرنے کے ساتھ انسان کا ذہن غلط لائن پر چڑھ جاتا ہے، پھر اسی قسم کا کردار اس سے نمایاں ہوتا ہے۔ تو مشابہتِ قلوب کے بعد ضروری نہیں کہ کوئی بدمعاش کو بدمعاشی سکھائے، وہ بدمعاش خود بدمعاشی کے اصولوں پر چلتا ہے، اسی طرح اِسی مشابہتِ قلوب کے بعد ضروری نہیں کہ آپ کو علیحدہ علیحدہ ایک ایک نیکی کی تلقین کی جائے، جب آپ کا مزاج بن جائے گا تو پھر نیکی کی صورتیں آپ کے سامنے خود کھلتی چلی جائیں گی۔ تو اِن کے بھی آپس میں دل ملتے ہیں، ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں، جس کی بناء پر ان کے ذہن میں سوالات بھی ایک ہی طرح کے آتے ہیں۔

کفّار کے دو اعتراض اور اُن کا جواب

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: پیچھے اُن کے دو سوال تھے کہ ہم سے اللہ کلام کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اُن کا پہلا اعتراض تو ایسا لچر ہے جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں، اِس سے تو صرفِ نظر کر لی گئی، کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسے نہیں ہیں کہ ہر نتھو خیرے کے ساتھ بات کرتے پھریں اور اس کے اوپر وحی اتارتے پھریں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (سورۂ انعام: ۱۲۴) اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اپنے پیغام کو کہاں اتارے، ہر کسی کی یہ حیثیت نہیں ہے، اللہ چنتا ہے انسانوں میں سے اور فرشتوں میں سے اپنا رسول جو پیغام پہنچانے کا کام دیتا ہے، یہ تو دنیا کا بھی کوئی حاکم جس کو تھوڑی سی حکومت حاصل ہو وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ہر کسی کو اپنے پیغام براہِ راست دیتا پھرے، لوگوں کے دروازے کھٹکھٹا کے کہتا پھرے کہ میں آج یہ حکم دے رہا ہوں، تم یوں کرو۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں والوں اور ایک عارضی سی حکومت والوں کی بھی عظمت ہوتی ہے، کہ ہر کسی کے ساتھ رابطہ قائم کرنا اور ہر کسی کے پاس پہنچنا اور جا جا کے احکام دینا اُن کی عظمت کے منافی ہے، وہ بھی اپنا ایک منادی متعین کر دیتے ہیں جو منادی کر دیتا ہے، اعلان کر دیتا ہے، اور لوگوں پر پابندی ضروری ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جو مالک الملک ہے اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اُس کی عظمت کے بھی یہ منافی ہے کہ ہر کسی سے باتیں کرتا پھرے، وہ بھی اسی طرح سے اپنی عظمت اور اپنی شان کے لائق اپنے نمائندے منتخب کرتا ہے، فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی، اور اُن کے ذریعے سے اپنے پیغام پہنچاتا ہے۔ ہاں! البتہ یہ جو کہتے ہیں کہ کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ یہ اِن کا اندھا پن ہے، نشانیاں تو ہم نے بہت واضح کر دیں، قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ، اور اُن آیات کی تفصیل قرآنِ کریم کی آیات میں کائنات کی مختلف چیزوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، آیاتِ تنزیلی اور آیاتِ آفاقی سب کی وضاحت قرآنِ کریم میں مختلف آیات کے اندر کی گئی ہے۔ ''واضح کر دیں ہم نے آیات ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں''، اور جو یقین نہیں لانا چاہتے اور وہ ایک ہی بات پر اڑے ہوئے ہیں، کہ مرغی کی ایک ٹانگ، ان کو ہزار سمجھاتے رہو وہ اپنی اِس ہٹ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا پہلو

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: یہ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا پہلو ہے کہ یہ شرارتیں کرتے ہیں، مختلف قسم کے اعتراض کرتے ہیں، آپ کو تنگ کرتے ہیں، آپ پروانہ کیجئے، آپ کی حیثیت تو ایک رسول کی ہے، ماننے والوں کو آپ بشارت دینے والے ہیں، دوسروں کو ڈرانے والے ہیں، اگر کوئی شخص آپ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا اور اپنی بدکرداری کی بناء پر جہنم کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہے تو کل آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ جہنم میں کیوں چلے گئے اور یہ سیدھے راستے پر کیوں نہیں چلے، ان کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا، آپ اپنا کام کر کے فارغ ہو جائیے، بےفکر ہو جائیے، اِس غم کے اندر آپ کو گھلنے کی ضرورت نہیں ہے، اِن کی ذمہ داری آپ پر نہیں، آپ کا کام ہے اچھائی اختیار کرنے والوں کو بشارت دینا، بُرائی کرنے والوں کو محبت اور شفقت کے ساتھ سمجھانا اور برے انجام سے ڈرانا، یہ ہے آپ کا فرض، اور وہ آپ ادا کر رہے ہیں، اور اگر کوئی شخص آپ

سے متاثر نہیں ہوتا اور متاثر نہ ہونے کی وجہ سے وہ جہنم کے راستے پر چلتا ہے اور نتیجۃً وہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے تو آپ کو کیا فکر ہے؟ کل کو ہم آپ سے تو نہیں پوچھیں گے کہ یہ جہنم میں کیوں چلے گئے؟۔

خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو، اور تنبیہ کفار کو

باقی! اگر آپ یہ کوشش کریں کہ یہ خوش ہی ہو جائیں تو خوش ہونے کی ان سے توقع نہ رکھیں، یہ اتنے متعصب ہیں کہ جب تک آپ ان کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے اور ان کا دین اختیار نہیں کریں گے اُس وقت تک کسی صورت میں یہ لوگ آپ پر راضی نہیں ہو سکتے، اور ایسا کرنا ممکن نہیں، کیونکہ بالفرض اگر ایسا کریں گے تو آپ بھی معذّب ہو جائیں گے، آپ بھی اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے، اور دلائل قطعیہ قائم ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں، کبھی اللہ کے غضب اور ناراضگی کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے، تو یہ اتفاق آپ لوگوں میں ناممکن ہے، کیونکہ یہ خوش ہوں گے نہیں جب تک کہ آپ ان کا طریقہ نہ اپنائیں، اور آپ ان کا طریقہ اپنا سکتے نہیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں اللہ کی گرفت ہوگی۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے پاس آ گیا علم قطعی، علم کی روشنی صاف ستھری، جس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے، اور اِن کے جو عقائد و نظریات اور خیالات ہیں وہ سارے کے سارے شہوانی ہیں، اپنی خواہشات کی پوجا، اپنی خواہشات سے پیدا شدہ، کیونکہ اگر کوئی ایسی بات بھی تھی جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اب اس کے اوپر اَڑے رہنا یہ بھی ہوائے نفس ہے، تو ان کے پاس اِن کی اَہواء اور ان کی خواہشات ہیں۔ اور علم کے آ جانے کے بعد جاہلوں کی خواہشات کے پیچھے لگنا علم کی توہین ہے، اور اگر علم کے آ جانے کے بعد آپ ان کی خواہشات کے پیچھے لگیں گے تو خبردار! اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ گئے تو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ یہ خطاب چاہے ظاہری طور پر سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، لیکن سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے، اور اس بارے میں غصے کا اظہار یہود و نصاریٰ پر ہے۔ ایک آدمی پر ناراضگی کے اظہار کا ایک یہ بھی طریقہ ہوتا ہے، مثلاً مجھے پتہ ہے کہ اِس شخص کا اُس کے ساتھ اتفاق نہیں، اور یہ میری مخالفت میں کبھی بھی اس کی بات نہیں مان سکتا، لیکن میں کہوں کہ خبردار! اگر اُس کی بات مانی تو ساتھ تجھے بھی سزا ہوگی، تو اس میں سنانا اُس کو مقصود ہوتا ہے کہ وہ سزا کے قابل ہے، اور اگر آپ اس کے ساتھ ہو جائیں گے تو آپ بھی گرفت میں آ جائیں گے۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے، ''ہرگز نہیں راضی ہوں گے آپ سے یہودی نہ نصرانی جب تک کہ آپ ان کے دینی طریقے کے متبع نہ ہو جائیں'' کیونکہ ملّت سے دینی طریقہ مراد ہوتا ہے، جب تک آپ ان کا دین ہی نہ اختیار کر لیں وہ آپ سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے۔

''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے'' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی آئے اس کا قبول کرنا ہدایت ہے، لہٰذا اگر آپ لوگ ہدایت یافتہ ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے طریقہ پر چلو، کیونکہ اِس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی یہ آئی ہے، اور جو دین اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دیا وہ اللہ کی ہدایت نہیں رہی، اس کے اُوپر چلنا گمراہی ہے۔ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ اب یہودیت ہدایت نہیں، نصرانیت ہدایت نہیں، بلکہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام آ جائیں ان کو ماننا ہی ہدایت ہے۔

اتباع کا اُصول

اور اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی، ان کے غلط خیالات کی، اگر آپ ان کی خواہشات کے پیچھے لگ گئے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا۔ دیکھو! اس میں یہ اصول واضح کر دیا گیا کہ علمی طور پر اگر ایک بات ثابت ہو جائے کہ یہ علم کا تقاضا ہے اور یہ بات صحیح ہے، اور دوسری طرف ایک جاہلانہ بات ہو، تو پھر اگر اہل علم اپنے موقف کو چھوڑ کر اہل جہالت کے پیچھے لگ جائیں گے تو یہ قلبِ موضوع ہو گیا، کہ متبوع علم ہے اور جہالت تابع ہے، اور ہم نے اپنی غلط کاری کے ساتھ علم کو جہالت کے تابع کر دیا، کہ اپنے علم کے طور پر ثابت شدہ چیزوں کو ہم چھوڑ دیں اور جاہلانہ نعروں کے پیچھے لگ جائیں، جاہلانہ کردار ہم بھی اپنا لیں تو یہ علم کی بدترین قسم کی توہین ہے، اور اہل علم کو اجازت نہیں کہ علم کو جہالت کے پیچھے لگائیں۔ اور اگر اہل علم ہو کر کوئی جاہلوں کے پیچھے لگے گا اور ان کی باتیں مانے گا تو اس کے لئے پھر یہی وعید ہے جو یہاں ذکر کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جہاں نقل کیا گیا ہے، غالباً سورۂ مریم میں، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو خطاب کر کے سمجھاتے ہیں، وہاں بھی یہی ذکر کیا، يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (آیت: ۴۳)، اے ابا! میرے پاس علم آ گیا جو تیرے پاس نہیں ہے، اب ٹھیک ہے کہ تیری عمر زیادہ اور میری کم، اور تو باپ اور میں بیٹا، لیکن باپ اور بیٹے کا اصول اتباع کا اصول نہیں ہے، بڑی اور چھوٹی عمر کا اصول اتباع کا اصول نہیں ہے، اتباع کا اصول یہ ہے کہ جس کے پاس علم ہو اس کے پیچھے لگو، جاہل کو عالم کے پیچھے لگنا چاہیے، اس لیے میرے پاس علم آ گیا، تیرے پاس علم نہیں ہے، فَاتَّبِعْنِيْٓ: تو باپ ہونے کے باوجود میرے پیچھے چل۔ کہاں یہ اصول کہ جو کچھ ماں باپ کرتے ہیں وہی کرتے چلے جاؤ، اور کہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اُسوہ کہ باپ کو بھی کہو کہ اگر تیرے پاس علم نہیں ہے، میرے پاس علم ہے، تو تجھے باپ ہونے کے باوجود میرے پیچھے چلنا پڑے گا۔ فَاتَّبِعْنِيْٓ: میرے پیچھے چل، اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا: میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ جو سیدھا راستہ دکھائے، چاہے باپ ہو تو باپ کے پیچھے لگ جاؤ، بیٹا ہو تو بیٹے کے پیچھے لگ جاؤ، کیونکہ اتباع جہالت کی نہیں، اتباع عمر کی نہیں، اتباع بڑے چھوٹے ہونے کے اصول سے نہیں ہے، اتباع علم کی ہے، اس لیے جس کے پاس علم ہو اس کے پیچھے لگو گے تو سیدھا راستہ تمہیں مل جائے گا، اور اگر تم یہ کہتے رہو کہ یہ میرا بڑا ہے، میں تو اسی کے پیچھے چلوں گا چاہے وہ جاہل ہو، یہ میرے آباؤ اجداد کا طریقہ ہے، میں تو اسی پر ہی چلوں گا، چاہے آباؤ اجداد جاہل ہی کیوں نہ ہوں، پھر یہ مشرکانہ اصول ہے۔ اس لیے اہل علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جہلاء کے کردار سے مرعوب ہو کر اپنے علم کے تقاضوں کو چھوڑ نہ دیا کریں، اور جاننے بوجھنے کے باوجود جاہلانہ طریقوں کو نہ اپنایا کریں، اس میں علم کی بدترین قسم کی توہین ہے، علم متبوع ہے تابع نہیں ہے، اس لیے اہل علم کو بھی متبوع بننا چاہیے، جاہلوں کے پیچھے نہیں لگنا چاہیے۔ برادری کے قصے، گھریلو معاملات، سیاست کے چکر، جو کچھ بھی ہو، اہل علم کو متبوع ہونا چاہیے۔ اور اپنے علم کے تقاضوں کو چھوڑ کر جاہلوں کے پیچھے لگ جانا علم کی توہین ہے۔ یہاں یہی بات ہے ”اگر تو نے اتباع کی ان کی خواہشات کی (ان کا کردار، ان کے عمل، اُن کے جذبے سب کو خواہشات کہہ دیا گیا، کیونکہ اُن کا دین منسوخ ہو چکا ہے، اب اُس کے اوپر اڑنا محض ہوائے نفس ہے) بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو نہیں ہے آپ کے لئے اللہ کے مقابلے میں، یا، اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔“

منصف مزاج اہلِ کتاب کا ذکر

اب بعض اہل کتاب جو منصف تھے آگے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ میں اُن کی تعریف آ گئی کہ جن کو ہم نے کتاب دی اس حال میں کہ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح سے تلاوت کرنے کا حق ہے، وہ لوگ اس قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے۔ حقِ تلاوت یہ ہے کہ صحیح طور پر پڑھو، اُس کا ترجمہ صحیح کرو، ترجمہ کرنے کے بعد اس کو صحیح سمجھنے کی کوشش کرو، پھر اس کے مطابق عمل کرو، جو ان درجات کے طور پر اللہ کی کتاب کو پڑھتا ہے اس نے تلاوت کا حق ادا کر دیا، کہ الفاظ صحیح، معنیٰ صحیح، اور فہم صحیح، اور پھر اس کے مطابق عمل کا جذبہ۔ تو تورات وانجیل کے حامل جو اس طرح اپنی کتابوں کو پڑھتے ہیں وہ اس قرآن پر بھی ایمان لائیں گے، کیونکہ وہ نیک دل ہیں، اور وہ کتاب کا حق ادا کرتے ہیں، اور کتاب کا حق یہ بھی ہے کہ جو اُس میں سے سمجھ میں آئے اُس کی اتباع کی جائے، وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ: اور جو اس قرآن کا انکار کریں گے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: یہی لوگ گھاٹا پانے والے ہیں، خسارہ پانے والے ہیں۔

تذکرۂ بنی اسرائیل کا اِختتام، اور اِختتام کی اِبتدا سے مناسبت

بنی اسرائیل کے متعلق جو بحث چلی تھی، کہ ان کے معائب ظاہر کیے جا رہے تھے اور اُن کا کردار نمایاں کیا جا رہا تھا، اب وہ اختتام کو پہنچ گیا۔ تو جس آیت کے ساتھ اس مضمون کی ابتداء کی گئی تھی آخر میں وہی آیت دوبارہ دوہرا دی گئی، یہ بھی فصاحت اور بلاغت کا ایک اُصول ہے کہ ایک چیز پر آپ بحث کرنا چاہتے ہیں تو اُس کو عنوان کے طور پر بھی ذکر کرو گے، پھر اُس کی وضاحت کرتے کرتے آخر کلام کو وہیں جا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً یوں کہیں کہ بھائی! تکبر نہ کیا کرو، تکبر بُری بات ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوئی، پھر کہا جائے گا کہ تکبر میں یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے، یہ اس دلیل کے خلاف ہے، اُس دلیل کے خلاف ہے، اِس میں یہ نقصان ہوگا، یہ نقصان ہوگا، لہٰذا ہم آپ کو کہتے ہیں کہ تکبر نہ کیا کرو، تکبر بُری بات ہے۔ دیکھو! جہاں سے بات شروع ہوئی تھی انہی الفاظ پر لا کے ختم کر دی گئی۔ تو اسی طرح سے بنی اسرائیل کے ساتھ کلام جیسے شروع ہوئی تھی، ساری کی ساری تفصیل اور ان کی تاریخ اُن کے سامنے دوہرانے کے بعد انہی لفظوں کے ساتھ پھر ان کو خطاب کیا جا رہا ہے، ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا، اور یاد کرو اس بات کو کہ میں نے تمہیں فضیلت دی جہانوں پر، اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا، اور نہ کسی نفس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا، اور نہ کسی نفس کو کوئی سفارش کام دے گی، نہ وہ مدد کیے جائیں گے''۔ ابتدائے مضمون میں آیت انہی الفاظ کے ساتھ آئی تھی، اور اسی کو اختتام پر ذکر کر کے اب بنی اسرائیل کی تاریخ کو یہاں ختم کیا جا رہا ہے، آگے نیا مضمون شروع ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْاَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالدِّيْنِ وَالْاٰخِرَةِ

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ

جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رَبّ نے چند احکام کے ساتھ، پھر ابراہیم نے ان احکام کو پورا کیا، اللہ نے فرمایا بیشک میں بنانے والا ہوں تجھے

لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ

لوگوں کے لئے امام، ابراہیم علیہ السلام نے کہا "اور میری اولاد میں سے بعض کو"، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو ﴿۱۲۴﴾ اور یاد کیجئے جب

جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

بنایا ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ اور جائے امن، اور (ہم نے حکم دیا کہ) بنایا کرو مقام

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا

ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ، اور ہم نے ابراہیم کی طرف ایک پختہ حکم بھیجا اور اسماعیل کی طرف، کہ تم دونوں پاک رکھو

بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ

میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے ﴿۱۲۵﴾ اور یاد کیجئے جب کہا

اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

ابراہیم علیہ السلام نے اے میرے رب! بنادے اِس جگہ کو امن والا شہر، اور رزق دے اس شہر کے رہنے والوں کو پھلوں سے

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ

یعنی اُن لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائیں گے اللہ اور یوم آخر پر، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "اور اس شخص کو بھی جس نے کفر کیا

فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

میں اس کو فائدہ پہنچاؤں گا تھوڑا سا، پھر میں اس کو کھینچ کر لے جاؤں گا جہنم کے عذاب کی طرف، اور یہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے" ﴿۱۲۶﴾

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ

اور یاد کیجئے جب اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادیں (وہ کہہ رہے تھے) اے ہمارے پروردگار! قبول کر

مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

ہماری طرف سے، بیشک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے ہمارے پرور دگار! بنا تو ہمیں اپنے لیے فرمانبردار

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ

اور بنا تو ہماری اولاد میں سے اپنی فرمانبردار جماعت، اور بتا تو ہمیں ہمارے حج کے طریقے، اور توجہ فرما

عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا

ہم پر، بیشک تو بہت توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اے ہمارے پروردگار! اٹھا ان میں رسول انہی میں سے، جو پڑھے

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ان پر تیری آیات اور تعلیم دے ان کو کتاب وحکمت کی اور ان کو صاف ستھرا کرے، بیشک تو زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ: جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کلمات کے ساتھ، کلمات سے احکام مراد ہیں، فَاَتَمَّهُنَّ: پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان احکام کو پورا کیا، علی وجہ التمام ادا کیا، قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک میں بنانے والا ہوں تجھے لوگوں کے لئے امام۔ اِذِ ابْتَلٰٓى میں جو اِذ ہے اس کا متعلق اگر آپ نکالنا چاہتے ہیں تو یوں بھی نکال سکتے ہیں کہ قابل ذکر ہے وہ وقت جب اللہ نے آزمایا، یا، یاد کیجئے اس وقت کو جب اللہ نے آزمائش میں ڈالا، اور اگر آپ چاہیں تو اس کو قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں جو قَالَ ہے اس قَالَ کے متعلق بھی کر سکتے ہیں۔ قَالَ: اللہ نے فرمایا بیشک میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں، اور یہ کب فرمایا؟ جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رَبّ نے چند احکام کے ساتھ، پھر ابراہیم نے ان احکام کو علی وجہ التمام ادا کر دیا، تب اللہ نے فرمایا کہ میں تجھے لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔ پھر محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور میری اولاد میں سے بعض کو۔ یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کہا کہ میں تجھے بنانے والا ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو، اس کو عطف تلقینی کہتے ہیں، یعنی مجھے بھی بنا اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو امامت کا درجہ دے، اُن کو بھی امام بنا۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ: نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو، میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ عہد سے عہدۂ نبوت مراد ہے، عہدۂ امامت، جس کا ذکر پیچھے آیا ہوا ہے، میرا یہ عہد یعنی امام بنانے والا یہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ ظالم سے مراد گناہ گار، قصوروار۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ: اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے بیت کو، بیت سے بیت اللہ مراد ہے جس کو ہم کعبہ کہتے ہیں، جب بنایا ہم نے بیت کو، مَثَابَةً لِّلنَّاسِ: مَثَابَةً کا لفظ ثَوْب سے لیا گیا ہے، ثوب لوٹنے کو کہتے ہیں، مثابۃ: لوگوں کے لئے مرجع، لوٹنے کی جگہ، جدھر لوگ بار بار لوٹتے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عبادت کا گھر بنا دیا، عبادت خانہ بنا دیا، تو عبادت خانے کی طرف بار بار لوٹنا ہوتا ہی ہے، اس لیے اس کا حاصل ترجمہ اگر کسی نے کر دیا معبد، عبادت کی جگہ، تو بھی صحیح ہے، وہ حاصل ترجمہ ہے،

ورنہ لفظی ترجمہ اس کا یہی ہے لوٹنے کی جگہ۔ جب بنایا ہم نے بیت کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ اور جائے امن، اَمْنًا یہ مامن کے معنی میں ہے مَقَامَ امنٍ، ہم نے اس کو امن کی جگہ بنایا۔ امن: مامن، امن کی جگہ، ذا امنٍ، یا: مَقَامَ اَمْنٍ، جس طرح سے چاہو اس کی تاویل کرلو۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى: اتَّخِذُوْا سے پہلے قُلْنَا محذوف ہے، اور ہم نے حکم دیا کہ بنایا کرو مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ۔ مُصَلًّى: نماز پڑھنے کی جگہ۔ یہ جو آپ مصلّی منگواتے ہیں کہ مصلّی لاؤ، یہ ظرف کا صیغہ ہے بمعنی جائے صلوٰۃ، اسی لیے آپ اس کے لئے دوسرا لفظ جانماز بولا کرتے ہیں، جانماز یعنی جائے نماز، نماز پڑھنے کی جگہ۔ تو مصلّی کا یہی معنی ہوا کرتا ہے، مصلّی عربی لفظ ہے اور جائے نماز فارسی لفظ ہے، جس میں تخفیف کر کے آپ جانماز کہہ لیتے ہیں۔ بناؤ ابراہیم کے مقام کو، مقامِ ابراہیم کو مصلّی یعنی نماز پڑھنے کی جگہ۔ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ: عَهِدَ اِلَيْهِ: پختہ حکم دینا، تاکید کے ساتھ حکم دینا، ہم نے ابراہیم کی طرف ایک پختہ حکم بھیجا اور اسماعیل کی طرف، اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ: طَهِّرَا تثنیہ کا صیغہ ہے، اور اَنْ تفسیر یہ ہے، حکم بھیجا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کی طرف کہ تم دونوں پاک رکھو میرے گھر کو، لِلطَّآئِفِيْنَ: طائفین کا لفظ طواف سے لیا گیا ہے، طاف یطوف: گھومنا۔ لِلطَّآئِفِيْنَ: گھومنے والوں کے لئے، یعنی طواف کرنے والوں کے لئے، اور طواف بیت اللہ کے اردگرد گھومنے کو ہی کہتے ہیں، وَالْعٰكِفِيْنَ: عاکفین عکوف سے لیا گیا ہے جم کے بیٹھ جانا، تو عاکفین کا معنی ہوگا اعتکاف کرنے والے، اعتکاف جب انسان کرلیتا ہے تو ایک جگہ رک کے اور جم کے بیٹھ جاتا ہے، جیسے سورۂ بقرہ میں ہی آئے گا جس رکوع میں صوم کے احکام ذکر کیے گئے ہیں کہ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ (آیت: ۱۸۷) عورتوں کے ساتھ ملا جلا نہ کرو اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو، اور ایک جگہ اور بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام میں یہ لفظ آئے گا مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (سورۂ انبیاء: ۵۲) کیا ہیں یہ مورتیاں جن پر تم جمے بیٹھے ہو، گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہو، تو وہاں بھی عاکفون کا یہی معنی ہے جم کے بیٹھنے والے، اسی طرح ایک جگہ ہے يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ (سورۂ اعراف: ۱۳۸) وہاں بھی یہی معنی ہے کہ وہ اپنے بتوں کے اوپر جمے بیٹھے تھے۔ تو طائفین اور عاکفین کا یہ معنی بھی ٹھیک ہے کہ طواف کرنے والے اور اعتکاف کرنے والے، اور مفسرین نے اس کا یہ معنی بھی ذکر کیا ہے کہ طائفین سے مراد ہیں جو باہر سے آنے والے ہیں اور عاکفین سے مراد ہیں جو وہیں رہنے والے ہیں، یوں بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ: رُكَّع راکع کی جمع، رکوع کرنے والے، سُجُود ساجد کی جمع سجدہ کرنے والے، دونوں لفظوں کا حاصل ہے نماز پڑھنے والے، ''پاک صاف رکھو تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے، اعتکاف کرنے والوں کے لئے، اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے'' رکوع سجدہ سے کرنے والوں سے مطلقاً نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا: اور یاد کیجئے جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اے میرے ربّ! بنادے اِس جگہ کو، هٰذَا کا اشارہ اُس مکان کی طرف ہے، وہ جگہ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کو چھوڑ کر آئے تھے، ''اِس جگہ کو بنادے'' بَلَدًا اٰمِنًا: امن والا شہر، بَلَدًا اٰمِنًا یہ اجْعَلْ کا دوسرا مفعول ہے، بنادے اس جگہ کو امن والا شہر، وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ: اور رزق دے اس بلد کے رہنے والوں کو پھلوں سے، مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یہ اَهْلَهٗ سے بدلِ بعض ہے، یعنی میں یہ دعا سب اہل بلد کے لئے نہیں کرتا، بلکہ ان کے لئے کرتا ہوں جو ان میں سے اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لائیں گے۔ ''رزق دے تو اس شہر کے رہنے والوں کو یعنی ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائیں

گے اللہ پر اور یوم آخر پر"۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ نے جواب دیا وَمَنْ كَفَرَ: اس کا عطف ہے مَنْ اٰمَنَ پر، یہ اسی طرح سے عطف تلقینی ہے، اور اس شخص کو بھی جس نے کفر کیا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام میں آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ، اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ، اور میری اولاد میں سے بعض کو بھی۔ اور یہاں آ گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں کہ رزق دے اس شہر کے رہنے والوں کو یعنی ان میں سے ان لوگوں کو جو اللہ پر ایمان لائیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے فرما دیا اور اس شخص کو بھی جس نے کفر کیا، یعنی رزق اس کو بھی ملے گا جس نے کفر کیا، فَاُمَتِّعُهٗ: میں اس مَنْ كَفَرَ کو فائدہ پہنچاؤں گا قَلِیْلًا: تھوڑا زمانہ، زماناً قلیلاً یا متاعاً قلیلاً، میں اس کو تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا، یا کچھ زمانہ فائدہ پہنچاؤں گا، ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ: پھر میں اس کو کھینچ کر لے جاؤں گا اِلٰی عَذَابِ النَّارِ: جہنم کے عذاب کی طرف۔ اِضْطَرَّ سے متکلم کا صیغہ آ گیا اَضْطَرُّهٗٓ، میں اس کو مجبور کر کے لے جاؤں گا، کھینچ کر لے جاؤں گا اس کو، مضطر کر کے لے جاؤں گا اسے عذابِ جہنم کی طرف، وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ: وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ هِیَ (جلالین) هِیَ مخصوص بالذم نکلے گا، یہ ضمیر لوٹے گی نار کی طرف، "اور یہ نار بہت برا ٹھکانہ ہے"۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ: اور یاد کیجئے جس وقت ابراہیم، (وَاِسْمٰعِیْلُ کا عطف اِبْرٰهٖمُ پر ہے) جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اور اسماعیل، الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ: قواعد قاعدۃ کی جمع، قاعدہ بنیاد کو کہتے ہیں، جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں، بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے یعنی دیواریں اٹھا رہے تھے، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا: یقولان کہہ رہے تھے دونوں کہ اے ہمارے پروردگار! قبول کر ہماری طرف سے، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: بیشک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ: اے ہمارے پروردگار! بنا تو ہمیں اپنے لیے فرمانبردار، وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ: اور بنا تو ہماری اولاد میں سے اپنی ایک فرمانبردار جماعت۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا: مناسك مَنْسَك کی جمع ہے، منسک حج کے اَحکام کو بھی کہتے ہیں، مناسک کا معنی ہو جائے گا حج کے اَحکام ہمیں بتلا۔ اور مطلقاً احکام کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور حج کے ادا کرنے کی جگہ اور قربانی کی جگہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، ہمیں ہمارے مناسک دکھا، عبادت کرنے کے طریقے ہمیں بتا، یا ہمیں حج کرنے کی جگہیں دکھا، کہ حج جو کیا جائے گا، تیری عبادت جو کی جائے گی، کس کس جگہ کی جائے گی؟ اَماکنِ حج کے معنی میں ہے یا اَحکامِ حج کے معنی میں، بتا تو ہمیں ہمارے حج کے قاعدے، طریقے، وَتُبْ عَلَیْنَا: اور ہم پر جوع کر، ہم پر توجہ فرما، "ہماری توبہ قبول فرما" یہ حاصل معنی ہوتا ہے، اصل ہے کہ متوجہ ہو جا ہم پر، "توبہ قبول کر ہماری" اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ: بیشک تو بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے، بیشک تو بہت توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا: اے اللہ! بھیج ان میں یعنی مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یہ جو جماعت تو اٹھائے گا ہماری اولاد میں سے، ان میں بھیج رسول انہی میں سے۔ بَعَثَ یَبْعَثُ: اُٹھانا۔ انہی میں سے ایک رسول اُٹھا، ایک رسول کو مبعوث کر، یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ: جو پڑھے اِن پر تیری آیات۔ تلاوت: پڑھنا، الفاظ کا زبان سے ادا کرنا، وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اور تعلیم دے اِن کو کتاب وحکمت کی، کتاب کی تعلیم دے اور حکمت کی تعلیم دے، حکمت کہتے ہیں دانشمندی کی باتوں کو، جو الفاظ کے معنی کے بعد تفقہ کے طور پر اُس میں سے سمجھی جاتی ہیں۔ تو تعلیم کتاب کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان کو کتاب کے معانی بھی سمجھائے، اور معانی کی تہہ کے اندر جو راز کی باتیں ہیں وہ نکال کر اُن کی تفہیم بھی کرے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رموز ونکات کی بتائی ہوئی باتیں وہی مجموعہ ہے جس کو ہم سنت کہتے ہیں، اس لیے عام طور پر

مفسرین حکمت سے یہاں سنت مراد لیتے ہیں، کیونکہ سنن کا مجموعہ جو ہمارے سامنے ہے وہ، سرورِ کائنات ﷺ کی قولی سنتیں، فعلی سنتیں، یہ وہی راز کی اور تہہ کی باتیں ہیں جو حضور ﷺ نے اللہ کی وحی سے سمجھیں، چاہے وہ لفظی دلالت سے جلدی سے سمجھ میں آئیں چاہے سمجھ میں نہ آئیں، بلکہ تفقہ کے ساتھ اور دانشمندی کے ساتھ وہ باتیں اخذ کی جائیں۔ تو حاصل ترجمہ اس کا یہ ہوگا کہ اس اُمت کو کتاب وسُنت کی وہ تعلیم دے، کتاب سکھائے، کتاب کے معانی سمجھائے، اور معانی کے اندر جو تیرے اسرار رموز اور تہہ کی باتیں ہیں ان کی تفہیم کرے، وَيُزَكِّيهِمْ: اور ان کو صاف ستھرا کرے، ان کا تزکیہ کرے، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: بیشک تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

سیّدنا ابراہیم ؑ کے دو معروف صاحبزادے

انبیاء ﷩ کی فہرست میں حضرت ابراہیم ؑ کو مرکزیت حاصل ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم ؑ کے تشریف لے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوّت آپ کی اولاد میں ہی رکھا، حضرت ابراہیم ؑ کے معروف دو صاحبزادے تھے، ویسے تو مؤرخین دس صاحبزادے لکھتے ہیں، لیکن معروف ومشہور صاحبزادے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آتا ہے وہ دو ہی ہیں، حضرت اسماعیل ؑ اور حضرت اسحاق ؑ۔ حضرت اسماعیل ؑ بڑے ہیں اور ہاجرہ کے بطن سے ہیں، اور حضرت اسحاق ؑ چھوٹے ہیں اور سارہ کے بطن سے ہیں۔ حضرت ابراہیم ؑ نے عراق سے ہجرت کر کے اپنا مرکز شام میں بنایا تھا، حضرت ابراہیم ؑ اصل عراق کے رہنے والے ہیں، جہاں نمرود کی حکومت تھی، اور وہاں سے ہجرت کر کے شام میں تشریف لے گئے تھے، شام مہاجرِ ابراہیم کہلاتا ہے، یعنی ابراہیم کی ہجرت گاہ، وہاں جا کر حضرت ابراہیم ؑ نے اپنا تبلیغ کا مرکز بنایا۔

عبادت کے دو مرکز

آپ کا بھتیجے حضرت لوط ؑ ساتھ تھے، اُن کو اپنی جگہ سے تھوڑی دور فاصلے پر بڑا شہر تھا سَدُوم، اس میں مرکز بنا دیا کہ آپ نے یہاں تبلیغ کرنی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیل ؑ کو بچپن میں ہی حجاز میں اس جگہ لا کر آباد کیا جس کو آج آپ مکہ معظمہ کہتے ہیں، تاریخی واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں، وہ قربانی کے ایام میں اور آگے پیچھے آپ واعظوں سے بہت کثرت کے ساتھ سنتے رہتے ہیں، اگر زیادہ شوق ہے تو کسی واعظ سے سن لینا۔ بہرحال وہ ایک عام چیز ہے۔ تو وہاں لا کر آباد کیا، جس کے نتیجے میں حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد کا ایک مرکز حجاز میں بن گیا، حضرت اسماعیل ؑ کی اولاد یہاں پھیلی، اور حضرت ابراہیم ؑ کی جو اولاد بواسطہ اسحاق ؑ تھی وہ شام کے علاقے میں پھیلی۔ عبادت کے دو مرکز بن گئے، ایک مرکز عبادت کے لئے بیت المقدس کے نام سے موسوم ہوا، اور دوسرا مرکز عبادت کے لئے کعبہ کے نام سے یا بیت اللہ کے نام سے موسوم ہوا۔ سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے قبل علمی ریاست ساری کی ساری حضرت اسحاق ؑ کی اولاد میں تھی، اور بیت المقدس کو

مرکزیت حاصل تھی، عبادت کے لئے مرکز بیت المقدس تھا، اُدھر منہ کر کے یہ یہود و نصاریٰ جتنے تھے نماز پڑھا کرتے تھے، اور علم وہدایت کی وراثت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں چلی آرہی تھی جن کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

تحویلِ قبلہ کا پس منظر

سرورِ کائنات ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لے آئے، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اب علم وہدایت کی وراثت بنی اسرائیل سے منتقل ہو رہی تھی بنو اسماعیل کی طرف، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی دوسری شاخ ہے، یہ مرکزیت اور علم وہدایت کی وراثت اب اِدھر منتقل ہو رہی تھی۔ سرورِ کائنات ﷺ نے ابتداء ابتداء میں پچھلے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے اپنی نماز کے لئے قبلہ بیت المقدس ہی منتخب فرمایا، اس لیے ابتداء ابتداء میں آپ ﷺ نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے، مدینہ منورہ میں جا کر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا تو صریح ہے، مکہ معظمہ میں بھی عام طور پر روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تھے، لیکن ایسے طور پر نماز پڑھتے تھے کہ بیت اللہ بھی سامنے رہے۔ اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے یہ ممکن تھا، مثال کے طور پر یہ ہے (جنوب کی طرف) بیت اللہ اور یہ ہے (شمال کی طرف) بیت المقدس، تو مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے تو ممکن ہے کہ اِدھر (بیت اللہ کے جنوب کی طرف) کھڑے ہو کے نماز پڑھ لی جائے تو سامنے بیت اللہ بھی آجائے گا اور بیت المقدس بھی آجائے گا، اس لیے یہاں تو ممکن ہے، لیکن جس وقت آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں دونوں بالکل مدمقابل ہو گئے، کہ مدینہ منورہ درمیان میں ہے، اور کعبۃ اللہ مدینہ منورہ سے جنوب میں ہے، اور بیت المقدس شمال میں ہے، اب اگر بیت اللہ کی طرف منہ کرتے ہیں تو پشت بیت المقدس کی طرف ہوتی ہے، اور بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں تو پشت بیت اللہ کی طرف ہوتی ہے، یہاں دونوں کو اکٹھا نہیں کیا جا سکتا تھا، تو پھر مدینہ منورہ میں جا کر آپ نے منہ بیت المقدس کی طرف اور پشت بیت اللہ کی طرف کی ہے۔ طبعی طور پر حضور ﷺ کو شوق تھا کہ اگر ہمارے لیے بھی عبادت کا مرکز اور ہمارے لیے قبلہ، جس میں ہم نماز کا استقبال کیا کریں (قبلہ اسے ہی کہا جاتا ہے جدھر منہ کیا جائے) ہماری جہت قبلہ، جس کا ہم نماز میں استقبال کیا کریں، وہی ہو جائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے جدِ اعلیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے، حضور ﷺ کی طبیعت میں یہ شوق تھا کہ ہماری توجہ کعبہ کی طرف کر دی جائے، تاکہ ہماری عبادت کے لئے وہ مرکز بن جائے، سولہ یا سترہ مہینے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، لیکن آپ کا شوق کعبہ کے متعلق تھا، اور اسی شوق میں بار بار نظر اٹھا کر دیکھتے کہ کب اللہ کا حکم آتا ہے، آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا کہ بیت المقدس کی بجائے اِس اُمتِ مسلمہ کے لئے قبلہ بیت اللہ متعین کر دیا گیا، اور آپ ﷺ نے اپنا رخ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔

مدینہ منورہ میں پہلا علمی فتنہ

جس وقت آپ کا رُخ بیت اللہ کی طرف پھرا تو یہود و نصاریٰ نے شور مچا دیا، کیونکہ وہ پہلے سلسلے میں اپنے ساتھ کچھ مطابقت سمجھتے تھے، کہ یہ بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہم بھی اِدھر ہی منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، لیکن جس

وقت آپ نے رُخ دوسری طرف کو بدل لیا تو اُن کو کہنے کا موقع مل گیا کہ دیکھو! یہ ضد میں آ کے یوں کرتے ہیں، دیکھو! کبھی کدھر کو منہ کیے پھرتے ہیں، کبھی کدھر کو منہ کیے پھرتے ہیں، یہ کوئی آسمانی شریعت ہے؟ اس قسم کے اعتراضات انہوں نے اٹھانے شروع کر دیے، تو یہ علمی طور پر پہلا فتنہ تھا جو کہ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد پیش آیا، کہ ایک متعین حکم کے اُوپر نسخ آیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا حکم آ گیا، تو اس وقت کے زمانے کے اہلِ علم لوگ جو بنے ہوئے تھے انہوں نے اس پر اعتراضات شروع کر دیے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر اس مسئلے کی وضاحت فرمائی، اور اس مسئلے کی بنیاد یہاں سے اٹھائی جہاں سے آج آپ نے آیات کی تلاوت کی ہے، اور چار رکوع تک یہی مسئلہ جا رہا ہے، اگلے پارے کے بھی ابتدائی دو رکوع اسی تحویلِ قبلہ کے مسئلے میں ہیں، اور یہاں سے اس مسئلے کی تمہید اٹھائی جا رہی ہے۔ بنی اسرائیل کے تذکرے کو ختم کر کے اب بنی اسماعیل کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرکزیت مل رہی ہے اب اس کی تفصیل شروع ہو رہی ہے۔

اُمتِ مسلمہ کے مرکز کا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق

پہلے تو یہ ثابت کیا کہ بیت اللہ بھی ملتِ ابراہیمی کے ساتھ ہی تعلق رکھتا ہے، اگر بیت المقدس کی آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تو بیت اللہ کی آبادی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہی ہوئی ہے، اسرائیلی اگر اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی پر کہتے ہیں تو اسماعیلی بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں، اس لیے جیسا شرف اِس کا ہے ویسا شرف اُس کا ہے، اس حیثیت سے کوئی فرق نہیں، جیسے تم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو اور اس پر فخر کرتے ہو، تو یہ موجودہ جماعت جو پیدا ہو رہی ہے اور یہ موجودہ پیغمبر جو آیا ہے، یہ بھی تو نسبی طور پر، نسلی طور پر، اور مسلک کے طور پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی منسوب ہے، تو نبوت اگر ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں چلی گئی تو خاندانی شرافت کے طور پر کوئی فرق تو نہیں ہے، وہ بھی تو خاندانِ نبوت ہے۔ اور پھر جس طرح بیت المقدس کی آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کے ہاتھوں ہوئی اسی طرح کعبۃ اللہ کی آبادی بھی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے ہاتھوں ہوئی ہے، تو اس میں کیا فرق ہوا؟۔ تو یہ تاریخ بیان کی کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت اللہ کے ساتھ بھی ہے، کیونکہ اُس وقت یہود و نصاریٰ اِس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اُس جگہ کے ساتھ بھی ہے، اس لیے قرآن نے ساری کی ساری تاریخ واضح کی، جس میں بتایا کہ نہیں! وہاں بھی انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو آباد کیا، اور وہ بھی انہی کی اولاد کا آباد کردہ ہے، اور اس کی دیواریں بھی انہی ہاتھوں کی تعمیر کی ہوئی ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور اسماعیل علیہ السلام کی۔ جیسے اِس مرکز کی آبادی اُن کی طرف منسوب ہے اُس مرکز کی آبادی بھی انہی کی طرف ہی منسوب ہے۔

اُمتِ مسلمہ دُعائے ابراہیمی کا ثمرہ ہے

اور یہ جو اُمتِ مسلمہ پیدا ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں کی برکت سے اس کا ظہور ہوا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی کہ اُن کی اولاد میں یہ جماعت پیدا ہو، اُن کی دُعا کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس جماعت کو پیدا فرمایا، اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اسی جماعت میں سے جو اسماعیل علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو ایک رسول اٹھایا جائے اور

ایک رسول مبعوث کیا جائے، اب تم بتاؤ کہ جو ابراہیم اور اسماعیل دونوں کی اولاد میں سے ہو وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کون ہے؟ اس لیے اِن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ شدید تعلق ثابت ہو گیا کہ صرف ایک محمد ﷺ ہی ایسے تھے جن کی نسبت اسماعیل علیہ السلام کی طرف بھی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی تھی، تو جو دُعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھی کہ ہماری اولاد میں سے (اور ہماری کا مصداق تھا ابراہیم اور اسماعیل دونوں ہیں، جیسے یہاں صراحت کر دی گئی) ہماری اولاد میں سے ایک جماعت اٹھائی جائے، اور اُنہی میں سے ہی ایک رسول مبعوث کیا جائے، تو اس کا مصداق اب اِن کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ملّتِ ابراہیمی کا مفہوم و مصداق، اور آنے والے چار رکوع کا حاصل

جب اس مرکز کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ثابت ہو گیا، اور سرورِ کائنات ﷺ کا اور آپ کی اس جماعت کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ثابت ہو گیا، اور روحانی نسبت قائم ہو گئی، تو پھر آگے ملتِ ابراہیمی کی تفصیل اگلے رکوع کے اندر کی جائے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ کیا تھا، ملت ابراہیمی جس کا دعویٰ یہود و نصاریٰ بھی کرتے تھے، تو وہ ملت ابراہیمی کیا چیز ہے، بتایا جائے گا کہ ملت ابراہیمی ہے اسلام یعنی فرمانبرداری، کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے اُس کو تسلیم کر لیا جائے، اس لیے ایک وقت میں ملتِ ابراہیمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا تھا، اور ایک وقت میں ملتِ ابراہیمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا تھا، اب اگر حضور ﷺ پر ایمان لاؤ گے تو تم ملت ابراہیمی کے متبع ہو، اور اگر تم اِن پر ایمان نہیں لاؤ گے تو تم ملتِ ابراہیمی کے متبع نہیں ہو، اب اِس وقت جو اللہ کے احکام آئے ہیں ملتِ ابراہیمی اُن کے ماننے میں منحصر ہو گئی، کیونکہ اُن کا تو مسلک ہی اسلام تھا، اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۳۱) کہ اللہ کی طرف سے جو آتا جائے اُسے مانتے چلے جاؤ، یہ ہے ملت ابراہیمی، لہٰذا جو اس رسول پر ایمان لائیں گے وہ ملت ابراہیمی پر سمجھے جائیں گے، جو اس رسول پر ایمان نہیں لائیں گے وہ ملتِ ابراہیمی پر نہیں سمجھے جائیں گے۔ اس لیے اب اگلے مرکز کی نشاندہی کرنے سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اطلاع دی کہ ایسا ہونے والا ہے، اور سفہاء اور نادان قسم کے لوگ شور مچائیں گے اور اس طرح سے اعتراضات کریں گے، لیکن ان کے اعتراضات کی پروا نہیں کرنی۔ پھر صراحتاً حکم آجائے گا کہ بیت اللہ کی طرف منہ کر لو۔ اور یہ بات کہ پہلے اُدھر متوجہ کیا گیا پھر اِدھر متوجہ کیا گیا، اگلی آیات میں اُس کی حکمت بھی واضح کی جائے گی۔ چار رکوع تک یہی مضمون چلا جائے گا جس کا تعلق اصل کے اعتبار سے تحویل قبلہ سے ہے، لیکن کعبے کی تاریخ کو بیان کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس کے ساتھ بھی قوی ہے، اور اس کو اپنی عبادت کا مرکز بنا لینا ملتِ ابراہیمی سے خروج نہیں ہے، بلکہ جیسے ان کی اولاد شام میں آباد ہوئی اسی طرح ان کی اولاد حجاز میں بھی آباد ہوئی، باقی جتنے پیغمبر تھے وہ ابراہیم واسحاق کی اولاد میں سے ہیں، اور یہ پیغمبر ابراہیم واسماعیل کی اولاد میں سے ہے۔ خاندانی شرافت کے اعتبار سے، ملت ابراہیمی پر ہونے کے اعتبار سے، ابراہیم کی طرف نسبت کے اعتبار سے، کسی اعتبار سے بھی یہ پیغمبر دوسروں سے مختلف نہیں ہے، تو جیسے یہاں شام کے اندر عبادت کا مرکز بنا تھا اسی طرح حجاز کا مرکز بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی منسوب ہے۔ یہ ساری باتیں بیان کرنے کے لئے یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے، اور چار رکوع تک اسی طرح سے بالترتیب سارے کا سارا مضمون بیان ہوتا چلا جائے گا۔

ابراہیم علیہ السلام کوآزمائش میں ڈالنے کی حکمت

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام اور مرتبہ بیان کیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا، آزمائش میں ڈالا، آزمائش میں ڈالنے کے لئے یہاں لفظ یہ استعمال ہوا کہ اُس کے رب نے اُس کو آزمائش میں ڈالا، اللہ کے اسماء میں سے یہاں رَبّ کا لفظ جو استعمال کیا گیا تو رَبّ کا معنی ہوتا ہے تربیت کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو آزمائش میں ڈالا گیا تھا تو اس لیے ڈالا گیا تھا تاکہ اُن کی تربیت ہو، اور ان کی صلاحیتیں نمایاں ہوں، اور مجاہدے اور ریاضتیں برداشت کرنے کے ساتھ اُن کی استعداد بڑھتی چلی جائے، اور آخر ایک وقت میں ایک بہت بڑا اہم کام اُن کے سپرد کر دیا جائے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ تربیت فرمایا کرتے ہیں، تو آزمائشوں میں ڈال ڈال کے حضرت ابرہیم علیہ السلام کی بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سے تربیت فرمائی، اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے انسان کا مزاج ہی ایسا بنایا ہے کہ امتحانوں میں پڑ کے، ٹھوکریں کھا کے، اور رگڑے کھا کے اس کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کو بھی چند احکام دے کر آزمائش میں ڈالا گیا۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام پر اِبتلائیں اور ان میں کامیابی

وہ احکام کیا تھے جن کے ذریعے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا؟ آپ کی کتابوں کے اندر لکھے ہوئے ہوں گے، یا تو وہی سنن المرسلین ہیں، عادات کے متعلق، کہ یوں داڑھی رکھنی ہے، یوں مونچھیں رکھنی ہیں، یوں مسواک کرنی ہے، اِس طرح سے ناخن کٹوانے ہیں، یوں بغلیں صاف کرنی ہیں، یہ سنن المرسلین کے عنوان سے جو کتابوں میں ذکر کیے جاتے ہیں، اسی طرح سے دیگر احکام عبادت کے متعلق۔ اور پھر واقعات جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ڈالے گئے، سب سے پہلے قوم سے ٹکر ہوئی، ساری قوم کے ساتھ بگاڑ ہوا، ماں باپ کے ساتھ بگاڑ ہوا، پھر علاقہ چھوڑنا پڑا، اور ہجرت کی مشکلات برداشت کیں، حتیٰ کہ اولاد کی جدائی برداشت کرنی پڑی، جدائی ہو جانے کے بعد پھر ایک بچے کو جو اتنی تمناؤں کے ساتھ حاصل ہوا تھا اُس کو ذبح کرنے کا حکم آ گیا، یہ بہت کٹھن منزلیں تھیں جن میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزارا گیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر امتحان میں کامیاب ہوئے۔ کلمات کی تفصیل میں یہ ساری باتیں آتی ہیں، اب اُن واقعات کی تفصیل کرنا مقصود نہیں، کیونکہ یہ کوئی مجلسِ وعظ نہیں ہے، اِس میں اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ تو کلمات کا مصداق یہ سارے واقعات ہو گئے۔ فَاَتَمَّهُنَّ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ سارے احکام جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیے گئے ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو علیٰ وجہ التمام ادا کیا، کامل طریقے سے اُن کو ادا کیا، جب کامل طریقے سے ادا کیا تو گویا کہ امتحان میں پاس ہوئے، جہاں اللہ تعالیٰ اُن کو اِن آزمائشوں کے ذریعے سے پہنچانا چاہتا تھا اُسی طرح سے ان کی استعداد نمایاں ہو گئی۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی مرکزی حیثیت

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام ملا کہ ''میں بنانے والا ہوں تجھ کو لوگوں کے لئے امام''۔ اس آیت کے ترجمے میں

''بیان القرآن'' کے اندر دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں، میں تجھ کو بنانے والا ہوں نبی بنا کر لوگوں کے لئے امام یا اُمت بڑھا کر، یعنی اگر یہ بات نبوّت سے قبل کی ہے تو بشارت ہے کہ میں تجھے نبی بنا کر اِن لوگوں کا امام بنا رہا ہوں، اور اگر یہ نبوّت کے بعد کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ تیری امامت ایک مرکزی حیثیت اختیار کر جائے گی، تیری امت کو اور جماعت کو بہت بڑھا دوں گا، اور دونوں باتیں ہی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام پر ایک دلیل

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً درخواست کر دی کہ یہ امامت کا عہدہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو ملنا چاہیے، یہاں اِمامت سے نبوّت مراد ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ظالموں کو تو یہ عہدہ بالکل نہیں پہنچے گا، جو گناہ گار ہوں گے، نافرمان ہوں گے، باغی ہوں گے اُن کو تو میں یہ قیادت دینے کا نہیں، ہاں البتہ جو ظالم نہیں ہیں، گناہ گار نہیں ہیں، اُن میں سے جس کو میں پسند کروں گا اِمامت کے درجے پر فائز کر دوں گا، امامت سے یہاں عہدۂ نبوت مراد ہے۔ آپ کے سامنے ایک دفعہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ ذکر کیا گیا تھا، جس وقت عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی بحث آیا کرتی ہے تو اِس آیت کو بھی استدلال میں پیش کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہدۂ اِمامت اُس شخص کو ملتا ہے جو ظالمین کا مصداق نہ ہو، اور اگر اُس کے کردار میں اور اُس کے اقوال میں ظلم کا شائبہ پایا جائے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اِس عہدے پر فائز نہیں کرتا۔ تو عصمتِ انبیاء کے مسئلے کو بیان کرتے ہوئے بھی اِس آیت کو استدلال میں لایا کرتے ہیں۔

بیت اللہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی مرجع اور امن کی جگہ رہا ہے

آگے بیت اللہ کی شرافت آگئی ''یاد کیجئے جب ہم نے بنایا بیت اللہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ، مرجع، معبد'' کہ لوگ لوٹ لوٹ کر اِدھر آتے ہیں۔ وَاَمْنًا: اور جائے امن بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی اِس کی یہ حیثیت ہوگئی، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وساطت سے پھیلی، اور وہ لوگ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تبلیغ سے متاثر ہوئے، اُن سب کے لئے مرجع مآب جو کچھ تھا یہ بیت اللہ تھا، وہ اِدھر ہی منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اُن کا تعلق اسی کے ساتھ ہی تھا، اِسی کا احترام کرتے تھے۔ اور اِس کا امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی نمایاں ہوگیا، کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات تکوینی طور پر ڈال دی گئی، کہ بیت اللہ اور بیت اللہ کے اردگرد علاقہ جو کہ حرم کہلاتا ہے، ہمیشہ سے وہ پُرامن جگہ سمجھی گئی، یہاں قتل وقتال جاہلیت کے زمانے میں بھی نہیں ہوتا تھا، حتیٰ کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی حرم کے اندر آ جاتا تو کوئی شخص اس کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا، جتنا لڑنا بھڑنا ہوتا تھا سب باہر ہوتا تھا، حرم کے اندر لڑائی نہیں ہوتی تھی، اِس کا امن کی جگہ ہونا اُس وقت سے ہی نمایاں ہوگیا۔

مقامِ ابراہیم کا تعارف اور اِس کو یہاں ذِکر کرنے کا مقصد

اور پھر مقامِ ابراہیم کا تذکرہ کر کے بالکل مکمل نشاندہی کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے ہیں، کیونکہ

مقامِ ابراہیم جو اس وقت مشہور تھا اور آج تک بھی ہے وہ ایک پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار بناتے وقت اُونچا ہونے کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزۃً اس پتھر کے اندر یہ تاثیر تھی کہ وہ نرم ہو کر جب اُونچا ہونے کی ضرورت تھی اُونچا ہوتا جاتا تھا، اور جس وقت نیچا ہونے کی ضرورت تھی نیچا ہوتا جاتا تھا، اور اُس کی نرمی کی ہی یہ علامت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پاؤں اس کے اُوپر یوں لگے ہوئے ہیں جیسے کیچڑ میں آپ کے پاؤں نیچے چلے جاتے ہیں اور دھنس جاتے ہیں، اس پتھر کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم اتنے اتنے نیچے ہیں، جیسے قدم یوں رکھا ہوا اور نیچے کو ٹخنوں تک چلا گیا، اتنا نشان اُس پتھر پر ہے۔ اور تواتر کے ساتھ جس وقت سے بیت اللہ تعمیر ہوا لوگ اُس پتھر کو احترام کی نظر سے بطور نشانی کے رکھے ہوئے ہیں، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے اور یہ اُن کے پاؤں کا نشان ہے، اور آج بھی الحمد للہ! وہ پتھر محفوظ ہے، اور یہ نقشے اور فوٹو جو آپ دیکھا کرتے ہیں، تصویر میں بیت اللہ کے متصل ایک جگہ گنبد سا نظر آتا ہے، شیشے کا گنبد نما بنایا ہوا ہے، خوشنما سا ڈھانچہ بنا کے اس کے اندر وہ پتھر رکھا ہوا ہے، اور اس کے پاس جا کر شیشے میں سے دیکھیں تو وہ پتھر نظر آتا ہے، میں نے بہت غور سے دو تین دفعہ دیکھا، صاف نظر آتا ہے، اور اس کے اوپر پاؤں کے نشان اسی طرح سے پڑے ہوئے ہیں۔ تو یہ ایک بہت قوی تواتر کے ساتھ ایک قسم کی دلیل تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے ہیں، جب سے یہ بیت اللہ ظاہری وجود میں آیا، یعنی دوسری دفعہ، بنائے ابراہیمی کے تحت، اُس وقت سے یہ پتھر لوگوں کے اندر تواتر کے ساتھ نقل ہوتا چلا آرہا ہے، اور یہ بیت اللہ کے پاس محفوظ تھا۔ تو یہ حکم دے دیا گیا کہ اِس مقامِ ابراہیم کو مصلی بناؤ، یعنی اس کے پاس نماز پڑھا کرو، اس لیے طواف کرنے کے بعد دو رکعت نفل پڑھنا واجب ہے، اور سُنّت یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پاس ان کو ادا کیا جائے، اور اگر وہاں جگہ نہ ملے تو پھر مسجدِ حرام میں یا مسجدِ حرام سے باہر جہاں بھی ادا کر لیے جائیں واجب ادا ہو جاتا ہے، لیکن سُنّت یہ ہے کہ وہ دو رکعت نفل مقامِ ابراہیم کے پاس ادا کیے جائیں۔ پہلے یہ پتھر بیت اللہ کے بالکل قریب تھا، پھر جس وقت اس کا مطاف کچھ وسیع کیا گیا تو بیت اللہ کے قریب سے اُٹھا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں رکھوا دیا تھا جہاں اب رکھا ہوا ہے، یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رکھوایا ہوا ہے، اور اب اسی جگہ ہی ہے، بس اس کو شیشے کا ایک چھوٹا سا گنبد نما مکان بنا کر محفوظ کر دیا گیا ہے، اور فوٹو جس وقت آپ دیکھیں گے تو اس میں ایک طرف وہ نظر آیا کرتا ہے، اس میں وہ پتھر رکھا ہوا ہے۔ یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے ہیں۔

بیت اللہ کو پاک رکھنے کا حکم

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ: ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی طرف حکم بھیجا، کہ پاک صاف رکھو۔ ''رکھو'' یہ دوام کے لئے ہے، اگر ہم اپنی زبان میں کہیں کہ پاک کرو تو اس میں شبہ اِدھر جاتا ہے کہ شاید پہلے پاک نہ ہو، اور ایک ہے کہ اس کو صاف ستھرا رکھنا، جس طرح سے پہلے صاف ستھرا ہے، ظاہری اور باطنی نجاسات سے بچا ہوا ہے، اسی طرح سے اس کو صاف ستھرا رکھو۔ ''صاف ستھرا رکھو میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے، اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور رُکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے'' یہ حکم بھی اللہ کی طرف سے آیا۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی مکہ مکرمہ کے لئے دُعائیں اور ان کی قبولیت

''اور یاد کیجئے جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا کی تھی اس جگہ کے متعلق، کہ اے اللہ! اس جگہ کو بنادے شہر امن والا'' یہ دُعا اُس وقت کی تھی جب آپ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں بٹھا گئے تھے، اور اِن دونوں کے علاوہ یہاں کوئی آبادی نہیں تھی، اور اللہ کے اشارے کے ساتھ یہاں بٹھا کر گئے تھے، پھر دُعا کی کہ یا اللہ! اب تو یہ جنگل ہے، وِیران ہے، اور وادی غیر ذی زرع ہے، جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں، کوئی پیداوار نہیں، میں اپنی اولاد کو یہاں چھوڑ کر چلا ہوں، جیسے سورۂ ابراہیم میں دُعا آئی ہے رَبَّنَآ اِنِّیۡ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ (آیت: ۳۷) وادی غیر ذی زرع، جس کے اندر کوئی نباتات نہیں، ایسی جگہ میں میں اپنی اولاد کو آباد کر چلا ہوں، یا اللہ! تو اس جگہ کو شہر بنادے، اور شہر بھی امن والا۔ اور پھر یہاں کے رہنے والے لوگوں کو ثمرات سے خوب رزق دے، اور میری یہ دعا رہنے والوں میں سے صرف مؤمنوں کے لئے ہے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ مقام ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے چونکہ ظالموں کو ایک دعا سے نکال دیا تھا کہ عہدۂ نبوت ظالموں کو نہیں ملے گا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادب کے طور آئندہ دعا ظالموں کے لئے کی ہی نہیں، بلکہ یہ کہا کہ جو مؤمن ہوں گے میں اُن کے لئے دعا کر رہا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رزق کا معاملہ عہدۂ نبوت والا نہیں ہے، امامت اور عہدۂ نبوت تو ظالموں کو نہیں ملتا لیکن رزق سب کے لئے عام ہے، مؤمنوں کو بھی دوں گا اور کافروں کو بھی دوں گا، لیکن کافروں کے متعلق ایک بات ہے کہ تھوڑا سا کھلاؤں پلاؤں گا، پھر گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دوں گا، یعنی آخرت میں فرق ہوگا، کہ مؤمن دنیا میں بھی رزق کھائے گا مکہ معظمہ میں رہتا ہوا، اور آخرت میں بھی خوشحال، اور جو کفر کرے گا روٹی تو اس کو بھی یہاں ملے گی، لیکن آخر اس کا انجام جہنم کی طرف ہو جائے گا۔ تو کافر اور مؤمن میں فرق آخرت میں جا کر نمایاں ہوگا، دنیا میں دونوں کھائیں گے، اس لیے رزق کا معاملہ ویسا نہیں ہے جیسے عہدۂ نبوت کا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے یہ اثرات ہیں کہ باوجود اس بات کے کہ سارا سنگستان ہے، وہاں کہیں سبزہ پیدا نہیں ہوتا، اب کہیں باہر سے مٹی لے جا کر مٹی ڈال کے سڑکوں کے کناروں پر لوگوں نے کچھ پھول بوٹے لگائے ہوئے ہیں، اب مکہ معظمہ میں کہیں کہیں سبزہ نظر آتا ہے، ورنہ مکہ معظمہ کے پہاڑوں میں اور اردگرد سنگلاخ میں کوئی سبزہ نہیں ہے، بالکل خشک پہاڑ ہیں۔ یعنی اگر آپ دیکھنا چاہیں تو اس کی کچھ تھوڑی سی مثال ہمارا بلوچستان کا علاقہ ہے، جیسے بلوچستان کے پہاڑ بالکل خشک پڑے ہوئے ہیں اُس علاقے کے پہاڑ بھی اسی طرح خشک ہیں۔

اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ ان کو پھلوں سے رزق دینا، اب یہ بھی ایک کمال کی بات ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ان پہاڑوں کو ہٹا کر میدان بنادے، تاکہ میری اولاد یہاں ہل چلایا کرے، ٹریکٹر چلایا کرے اور یہیں پھل پیدا ہوں اور فصل ہو اور سارے کے سارے کاشتکار بن کے بیٹھ جائیں، یہ مطلب نہیں ہے، کیونکہ یہاں کاشتکاری کرنے کے لئے نہیں بٹھائے تھے، کہ وہ بوئیں اور کھائیں اور لہسن پیاز پیدا کریں اور ان کو چاٹیں اسرائیلیوں کی طرح، ایسی بات نہیں تھی۔ وہ تو اس لیے آباد کیے تھے کہ لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ: تاکہ تیری نماز پڑھیں اور تیرے گھر کو آباد کریں، تیری عبادت کریں، اس لیے ان کو اس دھندے میں نہیں ڈالتا، کہ

یہ خود مل جوتیں اور اندر سے نکالیں۔ ''تُو رزق دے ان کو ثمرات سے'' اب رزق پیدا کہیں ہوگا اور آئے گا مکہ معظمہ میں، اور اُس وقت سے دنیا اس نقشے کو دیکھ رہی ہے، کہ رزق کی جتنی وسعت مکہ معظمہ میں ہے شاید دنیا کے کسی خطے میں نہیں، دنیا کے ہر حصے میں پیدا ہونے والا پھل اور دنیا کے ہر حصے میں پیدا ہونے والی سبزی اور جتنی چیزیں دنیا کے اندر بکھری ہوئی ہیں مکہ معظمہ میں آپ کو سب مل جائیں گی، اور شاید اتنی کثرت کے ساتھ پھل فروٹ کسی دوسرے ملک میں نہ جاتا ہو جتنا مکہ معظمہ میں آتا ہے، اور تقریباً ہر موسم میں ہر پھل موجود رہتا ہے، کیونکہ آم اگر اِدھر ختم ہو گیا تو افریقہ کے ممالک میں ہے، کیلا اِدھر ختم ہو گیا تو لبنان کی طرف ہے، کسی دوسری طرف ہے، اور جہاں جہاں بھی اس قسم کی چیزیں ہیں سمٹ سمٹ کے مکہ معظمہ میں آرہی ہیں یُجْبٰۤى اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ (سورۂ قصص: ۵۷) ہر چیز کے ثمرات اِدھر کھنچ کھنچ کے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے رزق کی اتنی وسعت کر دی کہ جو چیز بھی آپ تلاش کرنا چاہیں آپ کو اس جگہ مل جاتی ہے، اتنا وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق دیا۔

اور پھر ایک دُعا کی تھی کہ دیکھو میں تو یہاں اپنی اولاد کو بٹھا چلا ہوں، یہ کہیں اکیلے نہ رہ جائیں کہ بعد میں آنے والے وقت میں اِن پر وحشت دہشت اور اس قسم کی چیزیں طاری ہو جائیں، بلکہ فرمایا کہ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) کچھ لوگوں کے دل بھی اِن کی طرف مائل کر دینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دل ایسے مائل کیے کہ لوگ تڑپ تڑپ کے اور رستے تڑوا تڑوا کے مکہ معظمہ کی طرف بھاگتے ہیں، اور ایک دفعہ جو ہو آتا ہے اس کا شوق بڑھ جاتا ہے، گھٹتا نہیں ہے۔ مفسرین نکتہ بیان کیا کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کرتے ہوئے مِّنَ النَّاسِ کہا کہ لوگوں میں سے بعض کے دل، اور اگر کہیں سارے کا کہہ دیتے تو ساری دنیا مکہ معظمہ میں اُمڈ جاتی، اب اِس آبادی میں سے بعض چن چن کے، ہر علاقے سے، ہر گاؤں سے، ہر ملک سے، کچھ کچھ لوگ اس طرح سے بھاگے ہوئے آتے ہیں کہ مکہ معظمہ کی رونق بحال ہے، کوئی وقت بھی وہاں ایسا نہیں جس میں دنیا کے ہر کونے سے آنے والے لوگ نہ ہوں، کوئی اِدھر سے لبیک لبیک پکارتا ہوا آرہا ہے، کوئی اُدھر سے لبیک لبیک پکارتا ہوا آرہا ہے، ہر وقت ایک رونق لگی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نام کا شور مچا رہتا ہے۔ تو جتنی دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت کی تھیں وہ ساری اللہ تعالیٰ نے قبول کر لیں، رزق بھی وسعت سے دیا، دل بھی اِدھر مائل کر دیے، اور اس کو شہر بھی بنا دیا۔

اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ دُعا تھی کہ ہماری اس تعمیر کو قبول کر، وہ بھی ایسی قبول ہوئی کہ لوگوں میں بھی اس کو محبوبیت کا درجہ ہو گیا، اور قیامت تک آنے والی شریعت کے لئے وہ مرکزِ توجہ بن گیا، کہ اُدھر کو منہ کر کے نماز پڑھیں۔ اِسی ضمن میں وہ دُعا آئی کہ ہماری اولاد میں سے ایک جماعت اُٹھانا جو تیری فرمانبردار ہو اور اُن میں ایک رسول اُٹھانا، یہ ہے اصل میں مقصد یہاں کہنے سے، کہ یہ رسول بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا نتیجہ ہے، جیسے باقی دُعاؤں کی قبولیت تم نے آنکھوں سے دیکھ لی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا کی قبولیت بھی ظاہری طور پر ظاہری شکل میں دیکھ لو، اس لیے یہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں کے مطابق ظاہر ہوا ہے، اب اِس کو مان لینا اور اس کو اپنا لینا اور اس کے طریقے پر چلنا ہی ملّتِ ابراہیمی ہے۔ اس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس جگہ کے ساتھ، اس جماعت کے ساتھ اور اس پیغمبر کے ساتھ اِن الفاظ میں واضح کر دیا گیا۔

خلاصۂ آیات

دے تو رزق یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کا، یعنی جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور یومِ آخر پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اور اس شخص کو بھی جس نے کفر کیا، پھر میں فائدہ پہنچاؤں گا اس کو تھوڑا زمانہ، پھر کھینچ کے لے جاؤں گا اسے جہنم کے عذاب کی طرف، اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یاد کیجئے جب اُٹھاتے تھے ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں، اور کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! ہماری طرف سے قبول فرما، بیشک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ (بنیادیں اُٹھانے کی نسبت دونوں طرف کی، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اینٹ اور پتھر دیوار کے اُوپر لگا رہے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام گارا اور اینٹ پکڑا رہے تھے، جیسا کہ تعمیر کا اُصول ہوتا ہے، تو نسبت دونوں کی طرف ہوگئی، گویا کہ اس کی بنیادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اٹھائی ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی اُٹھائی ہیں، اور طریقہ یہی تھا کہ وہ لگا رہے تھے اور یہ پکڑا رہے تھے، اس طرح سے تعمیر ہوگئی، یہ دونوں کے ہاتھوں سے بنی ہوئی ہے، اور پھر دُعائیں یہ ہیں کہ) اے اللہ! ہماری طرف سے اس کو قبول کر لے، بیشک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ اے اللہ! ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ، اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنے لیے ایک فرمانبردار جماعت بنا، اور ہمیں ہمارے احکام سمجھا، (یا حج ادا کرنے کی جگہیں دِکھلا۔ دِکھلانا اور بتلانا دونوں طرح سے اِس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور مناسک سے مراد احکامِ حج یا مقاماتِ حج جہاں حج ادا کیا جاتا ہے)۔ وَتُبْ عَلَيْنَا: اور ہم پر توجہ رکھ۔ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اور آگے پھر یہ دُعا بھی کی کہ اے ہمارے پروردگار! بھیج اِن لوگوں میں، یعنی یہ اُمتِ مسلمہ جس کی ہم دُعا کرتے ہیں، تو اب اس دُعا کا واضح مصداق وہ رسول ہوگا جو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی ہو اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی ہو، چونکہ دُعا کرنے والے حضرت ابرہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوگیا کہ ایک پیغمبر لازماً ایسا آنا چاہیے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو، اور وہ سوائے اس آمنہ کے لعل صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا نہیں ہے، تو اِس دُعا کا مصداق یہی متعین ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مناصب

''ان میں ایک رسول بھیج انہی میں سے جو ان کے اوپر تیری آیات پڑھے'' یہ الفاظ کی تلاوت آ گئی، جس کا مطلب ہوگا کہ تیری طرف سے کتاب اترے اور کتاب کے الفاظ پڑھ پڑھ کے وہ لوگوں کو سنائے، ان کی تلاوت کرے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ: پھر اس کتاب کی تعلیم دے، تعلیم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ الفاظ بیان کرنے کے بعد ان کا مطلب سمجھایا جائے، کیونکہ صرف ترجمہ دیکھ لینا یا ترجمے کو سمجھ لینا کسی کا مقصد سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، ویسے بھی ترجمہ تو وہ جانتے تھے کیونکہ وہ عربی تھے، اور عربی میں قرآن اترا، اس لیے جو بھی سننے والا تھا ترجمہ تو سمجھتا تھا، معلوم ہوگیا کہ صرف ترجمہ سمجھنا کافی نہیں، بلکہ معلم کی طرف سے اس کی تفسیر سمجھائی جاتی ہے، اُس کا مقصد اور مطلب سمجھایا جاتا ہے، تب جا کے بات بنتی ہے۔ جس طرح سے آپ انگریزی میں لکھی ہوئی ایک ڈاکٹری کی کتاب اٹھالیں، اور کوئی انگریزی خوان ہو اُس کا ترجمہ آپ کے سامنے کرتا چلا جائے، تو اس سے آپ ڈاکٹر تو نہیں

بن جائیں گے، بلکہ ایک استاذ ساتھ ہوگا جو آپ کو عملاً بھی سمجھاتا چلا جائے، تب جا کے وہ فن سمجھ میں آئے گا۔ روحانیات میں بھی اسی طرح سے ہے، کہ صرف الفاظ کا دیکھ لینا یا اُن کے معانی کا جان لینا ماہر بن جانے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ معلم کی ضرورت ہوتی ہے جو کتاب کا مفہوم بھی سمجھائے اور پھر اس میں سے تہہ کی اور راز کی باتیں بھی بتائے جو کہ اجتہاد اور استنباط کے ساتھ نکلتی ہیں، اور حکمت سے مراد وہ اَسرار و رموز ہیں جو سنت کی شکل میں ہمارے سامنے جمع ہو گئے۔ ''اور ان کا تزکیہ بھی کرے'' تزکیہ عمل کی صورت ہے، تو آگے یہ بات ہوئی کہ وہ رسول ان کا تزکیہ بھی کرے، اور تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کا مفہوم دو طرح سے ادا کیا جاتا ہے، پاک صاف کرنا، اور نشوونما دینا، بڑھانا۔ جیسے کہ زکوٰۃ کے لفظ میں دونوں مفہوم ہی ذکر کیے جاتے ہیں، کہ زکوٰۃ پاکیزگی کو بھی کہتے ہیں اور بڑھنے کو بھی کہتے ہیں۔ تو یُزَکِّیْھِمْ میں تزکیہ جو رسول کا فعل ذکر کیا گیا ہے تو یہ ایک عمل سکھانے کی بات ہے، کہ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ عمل بھی کروائے، جس کے ساتھ قلوب اور اذہان صاف ستھرے ہوں۔ اس کے پھر دو شعبے ہوا کرتے ہیں ایک ہے تخلیہ اور ایک ہے تجلیہ، تخلیہ کا معنیٰ ہوتا ہے رذائل سے قلوب کو خالی کرنا، گھٹیا قسم کی عادتیں، گھٹیا قسم کے جذبات، کینہ، بغض، حُبِّ دنیا، اور ذکرِ الٰہی سے غفلت، تکبر، ریاء وغیرہ، یہ قلوب کے اندر جو رذائل ہوتے ہیں ان کو دور کرنا تخلیہ کہلاتا ہے۔ اور دوسرے نمبر پر ہے تجلیہ، تجلیہ کا مفہوم ہوتا ہے کہ قلب کو فضائل کا عادی بنانا، اس کے اندر للّٰہیت اور خلوص پیدا کرنا، شکر اور محبتِ الٰہی کے جذبات کو اُبھارنا یہ تجلیہ کہلاتا ہے۔ تخلیہ اور تجلیہ دونوں کام ہو جائیں تو پھر تزکیہ مکمل ہو جاتا ہے، گویا کہ تخلیہ صاف ستھرا کرنے کا مصداق ہے، اور تجلیہ اچھی صفات کے نشوونما کا مصداق ہے۔

مذکورہ مناصب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وارث کون؟

تو یہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں کام ذکر کیے گئے، تلاوتِ کتاب، تعلیم کتاب و حکمت، اور تزکیہ۔ اُمت مجموعی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہے، اور یہ تینوں شانیں بعض افراد میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ درجہ بدرجہ جمع فرما دیتے ہیں، ورنہ یہ تین فن بن گئے، اور تین شعبوں میں اس کام کو تقسیم کر دیا گیا، تلاوتِ کتاب قاریوں اور حافظوں کے حصے میں آ گئی، اور تعلیم کتاب و حکمت علماء کے حصے میں آ گئی جو قرآن اور حدیث کا مطلب و مفہوم بیان کرتے ہیں، اور تزکیہ کو مشائخ اور صوفیہ نے اپنا لیا۔ تو یہ خانقاہیں اور مدارس علیحدہ علیحدہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تینوں شانوں کا مظہر ہیں، اور امت مجموعی طور پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ان شیئون کی وارث ہے۔ تو صوفیہ کرام جو کام کرتے ہیں وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ہی ہے، یہ تینوں کام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور تینوں کام کرنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں، اور جتنا جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ جس صفت میں سے کسی کو حصہ دے دے اتنا وہ نبی کا وارث سمجھا جائے گا۔

آخر میں صفت ذکر کر دی اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ: عزیز کا مطلب زبردست، غالب، جو ساری کائنات میں زبردست بھی ہے اور اپنی ساری مخلوق پر غالب بھی ہے، لیکن غالب ہونے کے باوجود یوں نہیں کہ وہ جو چاہے کرے، اور حکمت و دانائی اور دانشمندی کی رعایت بھی نہ رکھے، بلکہ ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ حکیم بھی ہے، اور جو بھی اس کا کام ہوتا ہے وہ حکمت و دانائی اور

دانشمندی پر مشتمل ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ زبردست ہے اور حکیم ہے، انہی دونوں صفتوں کو ذکر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، کہ یہ دعائیں قبول کرنا تیرے اختیار میں بھی ہے، اور تیری حکمت کا بھی تقاضا ہے کہ تو اپنی مخلوق کی تربیت کا انتظام کرے، جس طرح اس کے لئے ظاہری آسائش اور ظاہری آرام کا انتظام کیا جاتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

کون اعراض کرتا ہے ابراہیم کے طریقے سے سوائے اس شخص کے جو اپنی ذات میں ہی جاہل ہے

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

البتہ تحقیق چن لیا ہم نے ابراہیم کو دنیا میں، اور بیشک وہ آخرت میں البتہ اچھے لوگوں میں سے ہے ﴿۱۳۰﴾

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

جب کہا ابراہیم کو اس کے رب نے کہ تو فرمانبردار رہو جا، تو ابراہیم نے کہا کہ میں فرمانبردار ہوگیا رب العالمین کے لئے ﴿۱۳۱﴾

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى

وصیت کی اِسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے۔ اے میرے بیٹو! بیشک اللہ تعالیٰ نے چن لیا

لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

تمہارے لیے ایک دین پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو ﴿۱۳۲﴾ کیا تم حاضر تھے

اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ

جب یعقوب کے پاس موت حاضر ہوئی تھی، جب یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

تو یعقوب کے بیٹوں نے کہا تھا کہ ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے بزرگوں یعنی ابراہیم اسماعیل اور اسحاق کے الٰہ کی

اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا

جو ایک ہی الٰہ ہے، اور ہم اسی کے لئے فرمانبردار ہیں ﴿۱۳۳﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گزر گئی، اس جماعت کے لئے وہ چیز ہے جو

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

انہوں نے کمائی، اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور تم پوچھے نہیں جاؤ گے ان کاموں کے متعلق جو وہ کرتے رہے ﴿۱۳۴﴾

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہو جاؤ تم یہودی یا نصرانی، تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، آپ انہیں کہہ دیجئے بلکہ ہم اتباع کریں گے ابراہیم

حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ

کے طریقے کی جو مخلص تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ﴿۱۳۵﴾ تم کہہ دو ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور اُس چیز پر جو

اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

اتاری گئی ہماری طرف، اور اس چیز پر جو اتاری گئی ابراہیم کی طرف اور اسماعیل کی طرف اور اسحاق کی طرف اور یعقوب کی طرف

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ

اور اولادِ یعقوب کی طرف، اور اس چیز پر جو دیے گئے موسیٰ اور عیسیٰ، اور جو کچھ بھی دیے گئے انبیاء

رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

ان کے ربّ کی جانب سے ہم سب پر ایمان لے آئے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، اور ہم اللہ کے لئے فرمانبردار ہیں ﴿۱۳۶﴾

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

اگر یہ ایمان لے آئیں اس چیز پر جس پر تم ایمان لائے ہو تو یہ ہدایت یافتہ ہوں گے، اور اگر یہ پیٹھ پھیریں تو سوائے اس کے نہیں کہ

هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

یہ لوگ ضد میں ہیں، پس عنقریب کافی ہو جائے گا آپ کے لیے اللہ ان کے مقابلے میں، اور وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

(ہم لازم پکڑتے ہیں) اللہ کے رنگ کو، اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ کے مقابلے میں از روئے رنگ کے، اور ہم اس کے لئے عبادت گزار ہیں ﴿۱۳۸﴾

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ

آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے معاملے میں؟ اور وہ ہمارا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے،

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

ہمارے لیے ہمارے اعمال ہوں گے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہوں گے اور ہم سب اللہ کے لئے مخلص ہیں ﴿۱۳۹﴾ یا تم کہتے ہو کہ

اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ

بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ آپ ان سے پوچھئے

ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ

کہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے، کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو چھپائے شہادت کو جو اس کے پاس موجود ہو اللہ کی جانب سے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گزر گئی، ان کے لئے وہ چیز ہے جو انہوں نے کمائی

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور نہیں سوال کیے جاؤ گے تم اُن کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے ہیں ﴿۱۴۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ: رَغِبَ رَغْبَةً، اس کا صلہ فی آئے تو یہ شوق کے معنی میں ہوتا ہے، رَغِبتُ فیهِ: میں نے اس میں رغبت کی، مجھے اس چیز کا شوق ہوا، اور رَغِبَ کا صلہ عَنْ آجائے تو اس میں اعراض والا معنی ہوتا ہے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہی مفہوم ہے اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ (سورۂ مریم: ۴۶) اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے اعراض کرنے والا ہے؟ اور یہاں بھی رَغِبَ کا صلہ عن ہے۔ ''کون اعراض کرتا ہے ابراہیم کے طریقے سے۔ ملّت: طریقہ۔ لیکن ہر طریقے کو ملّت نہیں کہتے بلکہ مذہبی طریقہ جو مذہبی روایات پر مشتمل ہوتا ہے اس کو ''ملّت'' کہتے ہیں، ''ابراہیم علیہ السلام کے مذہبی طریقے سے کون اعراض کرتا ہے'' اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ: سوائے اس شخص کے جو اپنی ذات میں ہی جاہل ہے۔ سَفِهَ سَفَاهَةً: نادان ہونا، اپنے آپ کو نادانی میں مبتلا کرنا، اس کے دونوں معنی ہوتے ہیں، نادان ہونا یہ لازم کا مفہوم ہے، اور اپنے آپ کو نادانی میں مبتلا کرنا یہ متعدی کا مفہوم ہے۔ تو لازم کا ترجمہ ہوگا تو جَهِلَ فی نفسِهٖ سوائے اس شخص کے جو اپنی ذات میں ہی جاہل ہے، ذاتی طور پر ہی جاہل ہے، اپنے آپ کو بھی اچھی طرح سے نہیں پہچانتا، کہ میرے لیے کون سی چیز مفید ہے اور کون سی چیز نقصان دِہ ہے، ایسے شخص کے علاوہ ملّتِ ابراہیمی سے کوئی شخص اعراض نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس کو متعدی کے معنی میں لیں تو پھر مفہوم اس طرح سے ادا کیا جائے گا کہ ''سوائے اس شخص کے جو اپنے آپ کو بیوقوف بنالے، جو اپنے آپ کو حماقت میں ڈال لے، جو اپنے آپ کو نادان

بنالے" ایسے شخص کے علاوہ کوئی شخص ملت ابراہیمی سے منہ نہیں پھیر سکتا۔ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا: البتہ تحقیق چن لیا ہم نے اس ابراہیم کو دنیا میں، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اور بیشک وہ ابراہیم آخرت میں البتہ اچھے لوگوں میں سے ہے۔ صالحین: شائستہ لوگ، نیک لوگ۔ نیکی ہر ایک کی اپنے اپنے معیار پر ہے، انبیاء علیہم السلام صالحین کا اعلیٰ مصداق ہیں۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: یہاں بھی اِذْ کو آپ مابعد قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے متعلق کر کے ترجمہ کر سکتے ہیں، اُذْكُرْ یا اِيْذْ كُرْ محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں، ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں ربّ العالمین کے لئے فرمانبردار ہو گیا، اور یہ ابراہیم علیہ السلام نے کب کہا تھا اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ جبکہ اس کے ربّ نے اسے کہا تھا کہ تُو فرمانبردار ہو جا! تو اِذْ جو ہے یہ قَالَ اَسْلَمْتُ کے متعلق ہو گیا، اس کے لئے عامل علیحدہ نکالنے کی ضرورت نہیں، "جب کہا ابراہیم کو اس کے ربّ نے، تُو فرمانبردار ہو جا! ابراہیم نے کہا کہ میں فرمانبردار ہو گیا ربّ العالمین کے لئے۔" اور حضرت شیخ (الہند) نے "یاد کرو" کا لفظ ترجمے میں بولا ہے، یہ ترجمہ فعل کو محذوف مان کر ہے، "یاد کیجئے جس وقت کہ ابراہیم کو اس کے ربّ نے کہا: تُو فرمانبردار ہو جا! ابراہیم نے کہا کہ میں فرمانبردار ہو گیا ربّ العالمین کے لئے۔" تو اُذْكُرْ عامل محذوف نکال کر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے، اور حضرت شیخ کے ترجمے میں اُذْكُرْ کو محذوف مان کر ترجمہ کیا گیا ہے۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ: ھا ضمیر ملّت کی طرف لوٹ رہی ہے، وصیت کی اسی ملّت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے، يَعْقُوْبُ کا عطف اِبْرٰهٖمُ پر ہے، یہ بھی وَصّٰى کا فاعل ہے، وصیت کی یعنی اپنی اولاد کو یہی تاکیدی حکم دیا، "وصیت کی اسی ملّت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے" تفصیل اُس کی یہ ہے يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ: اے میرے بیٹو! بیشک اللہ تعالیٰ نے چُن لیا تمہارے لیے ایک دین، زندگی گزارنے کا ایک طریقہ، فَلَا تَمُوْتُنَّ: پس تم ہرگز نہ مرنا، اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو، یعنی فرمانبردار ہونے کے علاوہ تمہیں کسی حال میں موت نہ آئے، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مرتے دم تک تم نے اسلام پر ہی ثابت قدم رہنا ہے، ہماری زبان میں محاورے کے مطابق اس مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کیا جائے گا، موت تک تم نے اسی طریقے پر قائم رہنا ہے، تمہیں جب بھی موت آئے اسی طریقے پر چلتے ہوئے آئے۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ: شہداء شاہد کی جمع یا شہید کی جمع، حاضر کے معنی میں، کیا تم حاضر تھے، موجود تھے، مشاہدہ کرنے والے تھے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ: جب یعقوب کے پاس موت حاضر ہوئی تھی، جب یعقوب پر موت کی کیفیت طاری ہوئی تھی کیا تم اس وقت موجود تھے؟ تم مشاہدہ کرنے والے تھے؟ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ: جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ: تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ: تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کہا تھا کہ ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ: وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے آباؤ اجداد کے الٰہ کی، تیرے باپ دادوں کے الٰہ کی، آباء کا ترجمہ ہمارے محاورے میں اس طرح سے کیا جائے گا، لیکن آگے جو لفظ ادا کئے گئے ہیں آباء کی تفصیل میں وہ ہیں ابراہیم اسماعیل اسحاق یہ تین، اسحاق تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے حقیقی والد ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے دادا ہیں، اور اسماعیل چچا ہیں، تو یہاں آباء کا لفظ جب سب پر بولا گیا تو چچا پر اس کا اطلاق توسعاً ہے، چچے کو بھی باپ کہہ دیا گیا، جیسے حدیث

شریف میں آتا ہے: "عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیْهِ"(۱) کہ انسان کا چچا اس کے باپ کی مثل ہی ہوتا ہے۔ تو توسعاً چچے کو بھی باپ کہدیا، یہاں اگر ترجمہ کرنا ہو تو جیسے بیان القرآن میں کیا گیا ہے وہ مفہوم زیادہ اچھا ادا ہو جاتا ہے "ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے بزرگوں کے الٰہ کی" آباء بول کر خاندان کے بڑے لوگ مراد ہیں، اور بڑوں کے اندر باپ بھی آ گیا، چچا بھی آ گیا، دادا بھی آ گیا، "ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے بزرگوں کے الٰہ کی جو ابراہیم اسماعیل اور اسحاق ہیں، اور وہ ایک ہی الٰہ ہے" یعنی الٰہ واحد، اُس کی ہم عبادت کریں گے، اِلٰهًا وَّاحِدًا یہ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ کا ہی مصداق ہے، یہ ان کے لئے حال مؤکدہ بن جائے گا۔ اور اگر بدل کے طور پر ذکر کرنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ یعنی اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ لیکن مبدل منہ یہاں معرفہ آیا ہوا ہے، اور بدل نکرہ ہے، اور آپ نے نحو میں پڑھا ہے کہ معرفہ سے نکرہ عام طور پر بدل نہیں آیا کرتا، اگر چہ یہاں اِلٰهًا وَّاحِدًا کا مصداق مخصوص ہے، اور اس میں معرفہ ہونے والا معنی ہے، کیونکہ یہ الٰہ واحد کوئی غیر معین نہیں ہے، حقیقت کے اعتبار سے اس کا مصداق متعین ہے، اور وَّاحِدًا صفت بھی موجود ہے، اس لیے اگر اس کو بدل بنا دیا جائے تو بھی گنجائش ہے، وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: اور ہم اسی کے لئے فرمانبردار ہیں۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: یہ ایک جماعت ہے جو گزر گئی، لَهَا مَا كَسَبَتْ: اِس جماعت کے لئے وہ چیز ہے جو انہوں نے کمائی، اِن کا کسب ان کے لئے ہے، وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، تمہارا کسب تمہارے لیے ہے، وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور تم پوچھے نہیں جاؤ گے، سوال نہیں کیے جاؤ گے ان کاموں کے متعلق جو وہ کرتے رہے، عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: جو کچھ وہ کرتے رہے تم سے اس چیز کا سوال نہیں کیا جائے گا۔ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہو جاؤ تم یہودی یا نصرانی، تَهْتَدُوْا: تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، یہودی دعوت دیتے ہیں کہ اگر تم ہدایت یافتہ ہونا چاہتے ہو تو یہودیت قبول کرلو، اور نصرانی دعوت دیتے ہیں کہ تم اگر ہدایت یافتہ ہونا چاہتے ہو تو نصرانیت قبول کرلو، قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا: آپ انہیں جواب دے دیجئے کہ ہم نہ تو یہودی بنتے ہیں نہ ہم نصرانی ہوتے ہیں، بلکہ ہم اتباع کریں گے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کی، ایسا ابراہیم جو کہ مخلص تھا، حنیف کا معنی ہوتا ہے جو ادیانِ باطلہ سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف متوجہ ہونے والا ہو، یعنی یہ مخلص ابراہیم جو ادیانِ باطلہ سے ہٹ گیا تھا اور ایک دین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا ہم تو اسی کے طریقے کی اتباع کریں گے، کیونکہ ملت ابراہیمی ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول طریقہ ہے، ہم یہودی نہیں بنتے، نہ ہم نصرانی بنتے ہیں، ہم تو ملت ابراہیمی پر چلیں گے، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور اس ابراہیم کی خصوصیات میں سے سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ تھی کہ وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا، اور تمہارے طریقوں میں کسی نہ کسی درجے میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے، اس لیے تمہارا طریقہ ملتِ ابراہیمی نہیں ہے۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: تم کہہ دو، یہ خطاب مسلمانوں کو ہے بمع رسول اللہ ﷺ کے، یعنی جو تمہیں یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ، تم انہیں کہہ دو کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: ہم اللہ پر ایمان لے آئے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا: اور اس چیز پر ایمان لے آئے جو ہماری طرف اُتاری گئی، وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ: اور اس چیز پر جو ابراہیم کی طرف اتاری گئی اور اسماعیل کی طرف اتاری گئی اور اسحاق کی طرف

---

(۱) مسلم ۱/۳۱۶، کتاب الزکوٰۃ/ مشکوٰۃ ۲/۵۷۰ باب مناقب اهل بیته فصل ثانی۔

اُتاری گئی اور یعقوب کی طرف اور اولادِ یعقوب کی طرف۔ اَسباط سِبط کی جمع ہے، سبط کا معنی اصل میں ہوتا ہے پھیلنا، اور انسان کی نسل جو پھیلتی ہے وہ بھی اس کی سبط کہلاتی ہے، حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے، بارہ بیٹوں سے آگے بارہ خاندان پھیلے، جن میں کثرت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام آئے، تو یہ بنی اسرائیل سارے کے سارے سبطِ یعقوب کہلاتے ہیں، چونکہ بارہ خاندان بن گئے جس کی بناء پر اس کو جمع کے طور پر بھی ذکر کر دیتے ہیں اَسباط، اور قرآنِ کریم میں جس جگہ بھی اسباط کا لفظ آئے اس سے یہی اولادِ یعقوب کے مختلف خاندان مراد ہوتے ہیں، تو جو اولادِ یعقوب کی طرف اتارا گیا ہم اس پر بھی ایمان لے آئے، اور خصوصیت سے آگے موسیٰ اور عیسیٰ کا ذکر کر دیا چونکہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اور نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے، ''اور ہم ایمان لے آئے اس چیز پر جو دیے گئے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام، اور جو کچھ بھی دیے گئے انبیاء علیہم السلام اُن کے رَبّ کی جانب سے ہم سب پر ایمان لے آئے''۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ: ہم اِن انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، ہم ان کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ ''فرق نہیں ڈالتے، یا تفریق نہیں کرتے'' کا یہاں مطلب یہ ہے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، اس اعتبار سے ہم انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں فرق نہیں ڈالتے، تفریق نہیں کرتے، ان کے فرقے نہیں بناتے۔ باقی! فرقِ مراتب کا انکار نہیں ہے کہ کسی نبی کا درجہ اونچا ہو اور کسی نبی کا درجہ نیچا ہو، یہ تو منصوص ہے، تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: یہ رسولوں کی جماعت ہے جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے، تو بعض کا بعض سے افضل ہونا تو قرآنِ کریم میں منصوص ہے، اس لیے فرق سے فرقِ مراتب مراد نہیں، کہ ہم ان کے درمیان میں فرقِ مراتب قائم نہیں کرتے، سب کو ایک جیسا جانتے ہیں، یہ نہیں، بلکہ ایمان کے درجے میں سب ایک جیسے ہیں، ایمان سب پر لانا ضروری ہے، اور اگر کسی ایک کا بھی انکار کرو گے تو یوں سمجھا جائے گا جیسے تم سب انبیاء علیہم السلام کی جماعت کے منکر ہو، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: اور ہم اُس اللہ کے لئے فرمانبردار ہیں۔ فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: جیسے قُوْلُوْٓا کا خطاب صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا اسی طرح مَآ اٰمَنْتُمْ میں بھی خطاب انہی کو ہے، اگر یہ یہود و نصاریٰ ایمان لے آئیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: اس جیسی چیز پر جس پر تم ایمان لائے ہو، بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: مثل کو زائدہ کر لیا جائے تو معنی یوں ہو جائے گا ''اس چیز پر جس پر تم ایمان لے آئے''، اور اگر مثل کو باقی رکھنا ہو تو ترجمہ یوں ہوگا کہ ''اس مذکور کے ساتھ تمہارے ایمان لانے کی طرح یہ لوگ ایمان لے آئیں'' فَقَدِ اهْتَدَوْا: تو یہ ہدایت یافتہ ہو گئے۔ وَإِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر یہ پیٹھ پھیریں، یعنی تمہارے ایمان لانے کی طرح ایمان نہ لائیں، فَإِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ: پس بیشک یہ لوگ ضد میں ہیں، مخالفت میں ہیں۔ شِقَاقٍ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، شَاقَّ مُشَاقَّةً: ایک دوسرے سے اختلاف کرنا، گویا کہ ایک نے ایک شق اختیار کر لی، دوسرے نے دوسری شق اختیار کر لی، تو دونوں کا آپس میں اختلاف ہو گیا، ایک دوسرے سے ضد کرنا، ایک دوسرے سے اختلاف کرنا، ''پس بیشک یہ لوگ ضد میں ہیں، اختلاف میں ہیں'' فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ: پس عنقریب کافی ہو جائے گا آپ کے لئے اللہ اِن کے مقابلے میں، ان کے مقابلے میں آپ کے لئے اللہ کافی ہو جائے گا، وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: اور وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ: یہ مِلَّةَ إِبْرٰهٖمَ سے بدل ہے (آلوسی)، جیسے پیچھے

آیا تھامِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا، تو ملّتِ ابراہیمی کا ہی مفہوم ہے صِبْغَةَ اللہِ۔ یا یوں کہہ لیں: نَلْتَزِمُ صِبْغَةَ اللہِ: ہم تو اللہ کے رنگ کا التزام کریں گے، ہم تو اللہ کے رنگنے کی کیفیت کو اختیار کریں گے، صِبغہ فِعْلَة کا وزن ہے جو کیفیت کے بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے، یعنی جس طرح اللہ رنگ دے، ہم تو اُس طرح سے رنگے جائیں گے۔ صَبَغَ رنگنے کو کہتے ہیں، قرآنِ کریم میں یہ لفظ آئے گا صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (سورۂ مومنون: ۲۰) وہاں صبغ سالن کے معنی میں ہے جس کے ساتھ روٹی لگا کر کھائی جاتی ہے اور اس کا رنگ روٹی کو چڑھ جاتا ہے، صباغ کہتے ہیں رنگ ریز کو، "ہم التزام کریں گے اللہ کے رنگ کا، ہم لازم پکڑتے ہیں اللہ کے رنگ کو"۔ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللہِ صِبْغَةً: اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ سے از روئے رنگنے کے، رنگ کی کیفیت کے اعتبار سے اللہ کے مقابلے میں کون اچھا ہے، یعنی کوئی اچھا نہیں، وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ: اور ہم اس کے لئے عبادت گزار ہیں، ہم اس کے ساتھ بندگی کا تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ

اسی صِبْغَةً کے لفظ پر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر بیان فرمایا کرتے تھے، اور ان کے ملفوظات میں یہ بات لکھی ہوئی ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ رنگ ساز ہے، علماء رنگ فروش ہیں، اور صوفیہ رنگ ریز ہیں"، کہ دین بنایا تو اللہ نے ہے، دین کا مجموعہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ہے، اور علماء رنگ بیچتے ہیں، ان کی دکانوں سے دین کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے، باقی! طبیعت کے اندر اس کو رچا دینا اور دین کا رنگ چڑھا دینا یہ مشائخ کا کام ہوتا ہے، اور یہ رنگ چڑھانا ہی تزکیہ ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر آیا تھا۔ دین کا رنگ چڑھا دیا، بدن کے اندر اُس دین کو اس طرح رچا دیا جیسے رنگ کپڑے کے اندر رچ جایا کرتا ہے۔ اس کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ میرے پاس فارغ التحصیل علماء پڑھنے کے لئے آتے ہیں (چونکہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہی تھا کہ وہ رمضان شریف سے ترجمہ شروع کروایا کرتے تھے، رمضان شریف سارا، شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحج کے موقع پر وہ قرآنِ کریم ختم کرواتے تھے، تو تین یا سوا تین مہینے میں وہ قرآن ختم کرایا کرتے تھے، اور لیتے تھے فارغ التحصیل کو، اور پھر وہ سند دیا کرتے تھے، وہ آپ نے دیکھی ہوگی، آج کل بھی شیراں والا دروازے میں تقسیم ہوتی ہے، جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ہیں، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے، قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے، سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے، سب کے اس سند پر دستخط ہیں، وہ یہ سند دیا کرتے تھے، گویا کہ سب اکابر نے اعتماد کیا ہوا تھا کہ جس کو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سند دے دیں ہماری طرف سے بھی اس کو اجازت ہے، یہ اعتماد تھا ان حضرات کی طرف سے، اب بھی جو سند وہاں تقسیم ہوتی ہے اس پر ان سب حضرات کے دستخط چھپے ہوئے ہیں) وہ فرمایا کرتے تھے کہ فارغ التحصیل علماء میرے پاس آتے ہیں، اگر انہیں یہ کہہ دیا جائے کہ تہجد کی فضیلت پر بیان کرو تو وہ دو گھنٹے تہجد کی فضیلت پر لچھے دار تقریر کریں گے، لیکن جس وقت تہجد کا وقت آئے گا تو سوئے ہوئے ہوں گے، فرض نمازوں تک کے پابند نہیں ہوتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دُکان سے یہ رنگ تو ملتا ہے، وہ بتا تو سکتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ چیز بری ہے، یہ کرنی چاہیے اور یہ نہیں کرنی چاہیے، اس میں یہ فضیلت ہے اور اس میں یہ فضیلت ہے، لیکن خود بھی رنگے ہوئے نہیں ہوتے، کسی دوسرے کو رنگ کیا چڑھانا ہے! اور فرماتے کہ "پھر وہ تین مہینے جو میرے پاس رہتے ہیں،

اللہ کے فضل وکرم سے تہجد گزار ہو جاتے ہیں۔'' یہ ہے جو دِین کا رنگ چڑھتا ہے، ویسے مسئلہ بتانے کے لئے اور تقریر کرنے کے لئے تو علماء کے پاس معلومات کا انبار لگا ہوا ہے، لیکن جہاں تک اپنے اُوپر اُس اثر کو طاری کر لینے اور اُس رنگ کو نمایاں کر دینے کی بات ہے، اِس کی کمی ہوتی ہے، اس لیے جب تک کسی بزرگ کی صحبت میں نہیں جائیں گے، کسی اللہ والے کے پاس نہیں ٹھہریں گے جو خود عمل کرنے کا عادی ہو، جس کے دل کی کیفیات خود اچھی ہوں، اُس کی صحبت اختیار نہیں کی جائے گی اور اس کی زیرِ نگرانی انسان وقت نہیں گزارے گا اس وقت تک عمل انسان کے بدن میں رچتا نہیں ہے، اور یہی تزکیہ کا مفہوم ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ: ہم التزام کریں گے، ہم لازم پکڑتے ہیں اللہ کے رنگ کو، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً: کون زیادہ اچھا ہے اللہ کے مقابلے میں از روئے رنگ کے، وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ: اور ہم اس کے لئے عبادت گزار ہیں، ہم اس کے ساتھ بندگی کا تعلق رکھنے والے ہیں۔ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ: آپ کہہ دیجئے کہ تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے معاملے میں؟ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ: اور وہ ہمارا بھی رب ہے تمہارا بھی رب ہے۔ وہ جھگڑا یہی کرتے تھے کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں اس لیے اللہ ہمیں عذاب نہیں دے گا اور تم بہرحال پکڑے جاؤ گے، جو یہودی نہیں بنتے اور نصرانی نہیں بنتے وہ جہنم میں جائیں گے۔ تو انہیں کہو کہ تم اللہ کے معاملے میں ہمارے ساتھ جو جھگڑتے ہو تمہیں جھگڑنے کیا حق ہے، جیسے وہ تمہارا ہے ویسے ہمارا بھی ہے، وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ: وہ ہمارا بھی ربّ ہے تمہارا بھی ربّ ہے، وَلَنَآ اَعْمَالُنَا: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہوں گے، وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ: اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہوں گے، وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ: اور ہم سب اس کے لئے اخلاص والے ہیں، ہم اللہ کے لئے مخلص ہیں، مخلصاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں، اپنے آپ کو ہم نے خالص اللہ کے لئے کر لیا۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: یا تم کہتے ہو کہ بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہ یہودی تھے یا نصرانی تھے؟، یعنی تم ان کے متعلق بھی یہی دعویٰ کرتے ہو؟ کہ یہ یہودی تھے (جیسے یہودی کہتے ہیں) یا نصرانی تھے (جیسے نصاریٰ کہتے ہیں)۔ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ: آپ اِن سے پوچھیے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو ظاہر کر دیا کہ ملت ابراہیمی پر تھے، اور یہی اسلام ان کا طریقہ تھا، اور تم جو کہتے ہو کہ یہودی تھے یا نصرانی تھے، تمہیں ان کا علم زیادہ ہے یا اللہ تعالیٰ کو علم ہے؟ جیسے آگے سورۂ آلِ عمران کے اندر بھی یہ لفظ آئیں گے مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی تھا، وہ تو ایک مخلص اور اللہ کا فرمانبردار تھا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران: ۶۷) اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ: کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو چھپا لے اس شہادت کو، گواہی کو جو اس کے پاس موجود ہے اللہ کی جانب سے، یعنی یہ کتابوں کا مطالعہ کر کے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا طریقہ یہودیت اور نصرانیت کا نہیں تھا، لیکن اظہار نہیں کرتے، لوگوں کو خواہ مخواہ دھوکا دیتے ہیں، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔'' یہ ایک جماعت ہے جو گزر گئی، اُن کے لئے وہ چیز ہے جو انہوں نے کمائی، اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور نہیں سوال کیے جاؤ گے تم ان کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے۔''

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ کرکے کعبہ کا تعلق ان کے ساتھ واضح کیا گیا، اور اُمتِ مسلمہ کی نشاندہی کی گئی، اور ایک رسول کا ذکر آیا کہ جس کے متعلق حضرت ابراہیم اور اسماعیل نے دعا کی تھی، تو اس رسول کا مصداق وہی ہوسکتا ہے جو اِن دونوں کی اولاد سے ہو، اس سے تاریخی طور پر مکہ معظمہ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کی اولاد میں سے ہونا، اِن چیزوں کی وضاحت ہوگئی۔ اب آگے بتایا جارہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ کیا تھا؟ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی طریقہ ہے، اور قیامت تک کے لئے ملّتِ ابراہیمی میں ہی نجات بند ہے، اور وہ ملّت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ملّت ہے۔

ملّتِ ابراہیمی کی عظمت اور اس کی حقیقت ومصداق

پہلے تو اس کی عظمت کو بیان کیا گیا، کہ ملّتِ ابراہیمی سے اعراض کرنا کسی احمق کا کام ہی ہوسکتا ہے، عقل مند آدمی ملّتِ ابراہیمی کو چھوڑ نہیں سکتا، یہی ملت ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فضیلت دی، اور آخرت میں بھی وہ اعلیٰ درجے والے ہوں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا میں بھی اللہ کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں، اور آخرت میں بھی اعلیٰ درجہ کے شائستہ اور لائق لوگوں میں سے ہوں گے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مقام ہے تو جو اُن کا طریقہ ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا چناہوا اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے ملّتِ ابراہیمی میں نجات ہے، ملّت ابرہیمی کو قبول کرنا عقلمندی ہے، اور اس سے اعراض کرنا حماقت ہے۔

اب آگے یہ تفصیل ہے کہ ملّتِ ابرہیمی کیا چیز ہے؟ ملّتِ ابراہیمی اسلام ہے، اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے اُس کو ماننا۔ ٹھیک ہے کہ ایک وقت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ کا مطالبہ تھا، اس وقت اسلام یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھو، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے تو ملّتِ ابراہیمی کا تقاضا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانو، اور اب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے جن کی نبوّت ورسالت دلیل کے ساتھ ثابت ہوگئی تو اَب ملّتِ ابراہیمی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو مانو۔ یہودیت کا ایک عنوان متعین کرکے، یا نصرانیت کا ایک عنوان متعین کرکے، یعنی یہ دین جو کہ اُصول وفروع کا مجموعہ ہے اس کو متعین کرکے یہ کہنا کہ یہی ملّتِ ابراہیمی ہے اور ہمیشہ یہی رہے گی، یہ تو غلط بات ہے، یہودیت ملّتِ ابراہیمی کا کوئی عنوان نہیں ہے، نصرانیت ملّتِ ابراہیمی کا کوئی عنوان نہیں ہے، چاہے ایک وقت میں ملّتِ ابرہیمی اس شکل میں متشکل ہوئی جس کو یہودیت اور نصرانیت کہتے ہیں، ایک وقت میں یہودیت حق تھا، ایک وقت میں نصرانیت حق تھا، وہ ملّتِ ابراہیمی کی ایک شکل ہے، لیکن دوسرے وقت میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم آجائے گا اس کو تسلیم کرنا ہی ملّتِ ابراہیمی ہے، پھر اپنے قائم کیے ہوئے عنوان پر جمے رہنا کہ

نہیں! ہم تو یہودی رہیں گے یا ہم تو نصرانی رہیں گے اور یہی ملت ابراہیمی ہے، یہ غلط بات ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے فرمانبرداری، کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آ جائے بس اس کو مان لو۔ اور یہ ماننا ہی اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو کہ رَبّ العالمین ہے، رَبّ العالمین ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں وہی ہماری تربیت اور ہماری پرورش کے مطابق ہیں، اُن کو تسلیم کرنا ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واضح طریقہ ہے۔

''اور اسی ملت کی انہوں نے وصیت کی تھی اپنے بیٹوں کو، اور اسی طرح سے یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی تھی''، تو تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام، یا جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اُنہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کچھ ہو جائے تم نے یہودی ہی رہنا ہے، انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کیسا ہی زمانہ آ جائے تم نے نصرانی ہی رہنا ہے، انہوں نے تو یہ وصیت کی تھی کہ اللہ کے فرمانبردار بن کے رہیو، اگر ایک وقت میں یہودیت قبول کرنا فرمانبرداری ہے تو یہودیت کو قبول کرنا ہی وصیت کا تقاضا ہے، اور ایک وقت میں نصرانیت اگر اللہ کی فرمانبرداری ہے تو نصرانیت کو قبول کرنا ہی اسلام اور اُن کی وصیت کا تقاضا ہے، لیکن اِن عنوانوں پر جمے رہنے کی وصیت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے جو حکم آ جائے اُس کو تسلیم کرنے کی اُن کی طرف سے وصیت ہے۔ ''اسی ملت کی وصیت کی تھی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے'' اور ان الفاظ کے ساتھ وصیت کی تھی کہ ''اے بیٹو! بیشک اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لیے ایک دین'' اس دین کا مصداق اسلام ہی ہے، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں اسی بات کو واضح کیا گیا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورۃ آلِ عمران:۱۹) دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے، یعنی دین مقبول، جس کے ساتھ قبولیت ہوتی ہے، جس کے ساتھ آخرت میں نجات ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (سورۃ آلِ عمران:۸۵) وہاں بھی دین کا اطلاق اسلام پر کیا گیا، جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اس لیے یہاں دین کا مصداق وہی اسلام ہے۔ ''اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لیے ایک دین پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم صاحبِ اسلام ہو''، صاحبِ اسلام ہونے کی حالت میں تمہیں موت آئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مرتے دم تک تم نے اسلام پر جمے رہنا ہے، آخر وقت تک تمہاری کیفیت یہ ہو کہ تم ہر وقت اللہ کی طرف سے احکام ملنے کے منتظر ہو، جس وقت بھی اللہ کی طرف سے حکم آ جائے مان لو، موت تک تمہاری کیفیت یہی رہنی چاہیے۔

اور عیسائی اور یہودی جو کہتے تھے کہ ہمیں یہودیت کی یا نصرانیت کی وصیت کی گئی ہے، اُس کی تردید کے لئے آگے یہ لفظ بولے جا رہے ہیں، کہ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی تھی، جب ان پر موت طاری ہونے لگی تھی، موت کی کیفیت ان پر طاری ہوئی تھی کیا تم اس وقت موجود تھے؟ تم مشاہدہ کرنے والے تھے؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم کس چیز کی عبادت کرو گے میرے بعد؟ (عبادت کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا، بندگی کا تعلق رکھنا، اور بندگی کے تعلق کا حاصل بھی یہ ہے کہ جو حکم آئے اُس کو مان لیا جائے) تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کہا تھا کہ ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے بزرگوں کے الٰہ کی (بزرگوں سے مراد ابراہیم اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام) جو کہ ایک ہی الٰہ ہے۔ اِلٰهًا وَّاحِدًا بدل ہو جائے گا ماقبل سے، تو اس کا معنی ہو گا نَعْبُدُ اِلٰهًا وَّاحِدًا، کیونکہ مبدل منہ کو اگر ہٹا دیا جائے اور بدل کو وہاں رکھ دیا جائے تو مفہوم صحیح رہا کرتا

ہے، نَعْبُدُ اِلٰهًا وَّاحِدًا: ہم الٰہ واحد کی عبادت کریں گے، اور اس الٰہ واحد کا تعارف یہ ہے کہ وہی تیرا خدا ہے، وہی تیرے بڑوں کا خدا ہے، تیرا اللہ اور تیرے بڑوں کا الٰہ جو کہ الٰہ واحد کا مصداق ہے ہم اسی کی عبادت کریں گے۔ تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے بھی معاہدہ کیا تھا، وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: اسی طرح سے مسلم رہنے کا انہوں نے معاہدہ کیا تھا کہ ہم اسی کے فرمانبردار بن کے رہیں گے، یہاں بھی وہی اسلام والی بات آگئی۔

یہود ونصاریٰ کے نسلی پندار پر ضربِ الٰہی

اب تم اپنے آپ کو منسوب تو ان کی طرف کرتے ہو لیکن اُن کی ملت اور طریقہ تم نے چھوڑ دیا، اور اسی نسبت پر تم فخر کرتے ہو کہ ہم ان کی اولاد ہیں، اور پھر آخرت میں اسی نسبت کی بناء پر تم نجات کے متمنی ہو، کہ چونکہ ہم بڑوں کی اولاد ہیں، بزرگوں کی اولاد ہیں، انبیاء کی اولاد ہیں، لہٰذا ہم آخرت میں ضرور بخشے جائیں گے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (سورۂ بقرہ: ۸۰)، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ: ۱۸) اس قسم کے دعوے وہ رکھتے تھے، تو اِس نسلی نسبی پندار پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگلے الفاظ میں ضرب لگائی ہے، کہ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، وہ اپنا کردار ساتھ لے گئی، تمہارے لیے تمہارا کردار ہوگا، تمہارے سامنے تو ان کے کاموں کا تذکرہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ کیا کیا کرتے تھے، تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے، تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم کیا کرتے تھے، اس لیے ان کے کارناموں پر تمہارا فخر آخرت میں نجات کے لئے کافی نہیں ہے، تمہیں آخرت میں نجات اپنے کارناموں کی بناء پر ملے گی۔ جیسے حضرتِ شیخ (سعدی رحمہ اللہ) نے گلستاں میں ایک بدوی کی نصیحت جو اس نے اپنے بیٹے کو کی تھی وہ ذکر کی ہے کہ ''يَا بُنَيَّ اِنَّكَ مَسْئُوْلٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَاذَا اكْتَسَبْتَ وَلَا يُقَالُ بِمَنِ انْتَسَبْتَ'' (باب ۷، حکایت ۸) بیٹا! تجھ سے قیامت کے دن یہ پوچھا جائے گا کہ تُو نے کیا کیا ہے؟ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تُو کس کی نسل سے ہے؟ کس کی اولاد سے ہے؟ عملوں کے متعلق سوال ہوگا، نسب اور نسل کے متعلق سوال نہیں ہوگا، اس لیے یہ فخر تم اپنے دماغ سے نکال دو۔ یہ نسلی افتخار اُن میں بہت زیادہ تھا۔

آخرت میں نسب کب مفید ہوگا اور کب مفید نہیں ہوگا؟

باقی! یہاں مفسرین نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ کیا نسب آخرت میں کسی درجے میں نافع بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ یہاں سے تو معلوم ہوگیا کہ اپنا اپنا کسب ہے، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، بڑوں کی کمائی اُن کے ساتھ چلی گئی، چھوٹوں کی کمائی اُن کے ساتھ آئے گی۔ لیکن اس پر یہ مسئلہ چل پڑا کہ کیا آخرت میں یہ نسب کسی درجے میں مفید بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔ اس کے بارے میں مختصری بات اتنی ہے کہ اگر تو اولاد اپنے آباء کے ساتھ عقائد قطعیہ میں اختلاف رکھتی ہے جس کے نتیجے میں کفر اور اسلام کا فرق پڑ جاتا ہے، تو یہ نسب قطعاً مفید نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے، چونکہ ابراہیم علیہ السلام سے عقائد ضروریہ میں اختلاف رکھتے تھے، تو باپ ہونے والی نسبت کام نہیں آئے گی۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا نوح علیہ السلام سے کفر واسلام کا اختلاف رکھتا تھا تو یہ بیٹا ہونا کام نہیں آئے گا۔ نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی یہ نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام سے ایسا اختلاف رکھتی تھیں جس

کی بناء پر کفر واسلام کا فرق پڑ گیا، تو یہ بیوی ہونا کوئی کام نہیں آئے گا۔ ابوطالب حضور ﷺ کے چچا تھے، ابولہب چچا تھا، لیکن ایمان نہیں تھا اس لیے نسبی نسبتی تعلق کام نہیں آئے گا، اس لیے حضور ﷺ نے[1] جب اعلانِ نبوّت فرمایا تو صاف اعلان کر دیا تھا، کہ اپنے آپ کو عذاب سے بچالو، میں اللہ کے مقابلے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا۔ یہ تو بنیادی طور پر بات ہے کہ اگر اولاد کا اپنے آباء کے ساتھ عقائد ضروریہ میں اختلاف ہو گیا تو پھر نسب کوئی مفید نہیں، نہ اُوپر سے نہ نیچے سے، یعنی بیٹے کا اچھا ہونا باپ کے کام نہیں آئے گا اور باپ کا اچھا ہونا بیٹے کے کام نہیں آئے گا، خاوند کا اچھا ہونا بیوی کے کام نہیں آئے گا اور بیوی کا اچھا ہونا خاوند کے کام نہیں آئے گا، جیسے کہ سورۂ تحریم میں دوسری مثال یہ بھی دی گئی، یعنی لوط علیہ السلام کی بیوی اور نوح علیہ السلام کی بیوی کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے فرعون کی بیوی کا ذکر آیا ہوا ہے، کہ فرعون کی بیوی اللہ کے ہاں بخشی جائے گی لیکن فرعون کو اُس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور اگر وہ عقائد ضروریہ میں متبع ہے یعنی مؤمن ہے، ماں باپ بھی مؤمن اور آگے اولاد بھی مؤمن، تو ایسی صورت میں فائدہ پہنچ سکتا ہے، کہ ماں باپ اگر اللہ کے مقبول بندے ہیں تو اولاد کی سفارش کر کے اس کو عذاب سے بچا بھی سکتے ہیں، اور اگر یہ ماں باپ جنت میں ہوئے اور اولاد بھی اپنے ایمان کی برکت سے جنت میں چلی گئی تو ماں باپ کی سفارش کے ساتھ اس کے درجات بھی اونچے ہو سکتے ہیں، جیسے کہ سورۂ طور میں یہ لفظ آئے گا اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (آیت:٢١) ہم اِن مؤمنین کی اولاد کو اِن کے ساتھ لاحق کر دیں گے اور ان کے عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے، یعنی اولاد کے درجات جو بلند کیے جائیں گے تو اللہ کی طرف سے یہ مؤمنوں کا مستقل اکرام ہوگا، یہ نہیں کہ ماں باپ کے کچھ عمل لے کر اولاد کو دے کر برابر کر دیا جائے، جیسے ایک آدمی کے پاس چھ روپے ہیں اور ایک کے پاس چار روپے ہیں، برابری کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ چھ والے سے ایک روپیہ لے کر چار والے کو دے دو تا کہ دونوں کے پاس پانچ پانچ ہو جائیں، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ چھ والے کے پاس تو چھ ہی رہیں لیکن چار والے کو اپنی طرف سے دو روپے دے کر برابر کر دو، تو اللہ تعالیٰ کے اِس فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اولاد میں اور ماں باپ میں برابری کر دی جائے گی، لیکن برابری کرنے کا یہ معنی نہیں ہوگا کہ اُن کو کچھ تھوڑا سا گھٹا کر اور اِن کو اوپر بڑھا کر برابر کر دیں، ایسا نہیں ہوگا، اُن کے عمل میں کمی نہیں کی جائے گی، بلکہ وہ اپنے عمل کے مطابق اُونچے درجے میں رہیں گے، اور نچلی اولاد کو ترقی دے کر اُن کے درجے میں پہنچا دیا جائے گا۔ تو مؤمن ہونے کی صورت میں ماں باپ کا اچھا ہونا اولاد کے لئے مفید ہو سکتا ہے، سفارش کے ساتھ وہ جہنم سے چھڑا بھی سکتے ہیں اور ان کے ساتھ تعلق کی بناء پر درجات بھی بلند ہو سکتے ہیں، کیونکہ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کے اندر پھر آگے یہ تعمیم بھی مفسرین نے کی ہے کہ جس طرح ماں باپ کے ساتھ تعلق آخرت میں مفید ہو سکتا ہے، اسی طرح اساتذہ اور مشائخ کے ساتھ تعلق بھی دونوں طرف سے مفید ہو سکتا ہے، کہ ایک شیخ سے آپ کی محبت ہے، ایک استاذ سے آپ کی محبت ہے، تو یہ تعلق اگرچہ نسب نہیں ہے لیکن نسبت ہے، اور یہ نسبت آخرت میں مفید ہو سکتی ہے کہ ایک آگے چلا گیا تو دوسرے کو پیچھے سے بلا لے گا، سفارش کر کے چھڑا لے یا اُس کے اکرام کے طور اس کے درجات اونچے کر دیے جائیں، ایسا ہو سکتا ہے۔

---

(١) بخاری ١/٣٨٥، باب هل يدخل النساء ١/٥٠٠، باب من انتسب الى آبائه فى الاسلام - ٢/٧٠٢، كتاب التفسير. سورة شعراء/ نيز ترمذى ٢/١٥٢ وغيره

لیکن آپ سمجھ رہے ہیں کہ یہ مفید ہونا چونکہ اس بات پر موقوف ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے، لیکن کس کے پاس یہ ڈگری ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہوگا؟ کوئی ہے کسی کے پاس سرٹیفکیٹ؟ جب یہ سرٹیفکیٹ نہیں ہے تو دنیا کے اندر رہتے ہوئے اس پر فخر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ میرا باپ ایسا ہے، میرا دادا ایسا ہے، ہاں! یہ فخر کرنے کی اور کہنے کی گنجائش مرنے کے بعد قبر میں جا کر ہوگی جس وقت ہم منکر نکیر کے سوالوں کے جواب میں کامیابی حاصل کر لیں گے، اب ہمارے لیے خوشی کی بات ہوگی کہ میرا باپ ایسا، میرا دادا ایسا، اب اُن کی برکت سے میرے درجے بلند ہو جائیں گے، اب یہ کہنے کی گنجائش ہے۔ ورنہ اس زندگی کے اندر رہتے ہوئے جبکہ ایمان کے خاتمے کا ہمارے پاس کوئی یقین نہیں ہے، اللہ کی رحمت سے ہم امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ ایمان پر کرے اور ہمارے عقیدے محفوظ رہیں، لیکن اللہ کی شانِ بے نیازی کے سامنے کیا اعتماد ہے، ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور کانپتے رہنا چاہیے، اس لیے دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہ فخر کرنے کی گنجائش نہیں جب تک اطمینان نہ ہو جائے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ خاتمہ ایمان پر ہو جانے کے بعد پھر یہ نسبت اور نسب مفید ہو سکتا ہے، زندگی میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ مجھے نیکی کرنے کی ضرورت نہیں، چونکہ میرا باپ نیک ہے اس لیے وہ مجھے چھڑا لے گا، مجھے نیکی کرنے کی ضرورت نہیں چونکہ میں فلاں کی اولاد میں سے ہوں وہ ہمیں بچا لیں گے، یہ زندگی میں رہتے ہوئے ایک دھوکا ہے، کیونکہ اگر خاتمہ ایمان پر نہ ہوا تو یہ سب نسب اور نسبتیں دھری رہ جائیں گے، پھر کوئی مفید نہیں ہوں گی، ہاں البتہ مرنے کے بعد جب ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ہمارا ایمان محفوظ ہے اس وقت پھر یہ نسب اور نسبت کام آ سکتی ہے۔ اِسی آیت کے ضمن میں چونکہ مفسرین نے یہ مسئلہ ذکر کیا، اس لیے میں نے بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دیا۔

ملّتِ ابراہیمی کے امتیازات اور اس کے تقاضے

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا: اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، اِسی مضمون کی آیتیں آپ کے سامنے پہلے بھی گزریں، لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: وہاں بھی یہی بات تھی کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہدایت یہودیت میں بند ہے یا ہدایت نصرانیت میں بند ہے۔ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ نہیں! ہدایت ملّتِ ابراہیمی میں بند ہے، اس لیے ہم تو ملّتِ ابراہیمی کو لیں گے، اور ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کے امتیازات میں سے یہ امتیاز ہے اور اس کی خصوصیات میں سے یہ خصوصیت ہے کہ اس میں شرک کی آمیزش نہیں ہے، اور تمہارے طریقے ایسے ہیں کہ اب ان میں شرک آچکا ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۰)، جن میں شرک کی آمیزش آگئی وہ ہدایت کس طرح سے ہوئی؟ اور جن میں شرک کی آمیزش آگئی اس کا ملّتِ ابراہیمی سے تعلق کیا ہے؟ ملّتِ ابراہیمی کی تفصیل تو یہ ہے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔ اس لیے آگے اس کی تفصیل کر دی کہ "ہم اللہ پر ایمان لے آئے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ہم پر اُتارا گیا ہم نے وہ بھی مانا، جو انبیائے سابقین پر اُتارا گیا ہم نے وہ بھی مانا، ہمیں کسی کے ساتھ ضد نہیں کہ چونکہ ہم فلاں پر ایمان لائے ہیں تو فلاں پر نہیں لائیں گے، یہ ملّتِ ابراہیمی نہیں

ہے، اسلام کا تقاضا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو آجائے سب مانو، جو ابراہیم علیہ السلام پر اتارا گیا، اور اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر اُتارا گیا ہم نے سب مانا، اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام دیے گئے اور عیسیٰ علیہ السلام دیے گئے ہم اس پر بھی ایمان لائے، ہم محمدی کہلا کر موسوی ہونے کے مخالف نہیں ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم ایسے ہی مانتے ہیں جیسے اپنے پیغمبر کو مانتے ہیں۔ اور یہ تمہاری ضد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو مان لیا تو عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتا، عیسیٰ علیہ السلام کو مان لیا تو حضور علیہ السلام کو نہیں مانتا، اس قسم کی ضد ہمارے اندر نہیں ہے، ہم تو ملت ابراہیمی پر ہیں، اور ملت ابراہیمی کے یہ سارے تقاضے ہیں۔ ''جو کچھ بھی نبیوں کو ان کے رَبّ کی جانب سے دیا گیا، ہم اِن نبیوں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں ڈالتے'' کہ فلاں ہماری پارٹی کا ہے، فلاں ہماری پارٹی کا نہیں ہے، ان کے بھی فرقے بنالیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں یہ ہماری عادت نہیں، ہم سب کو مانتے ہیں۔ تو یہاں فرق سے مراد ایمان لانے میں فرق کرنا مراد ہے، کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، فرقِ مراتب مراد نہیں ہے، کیونکہ فرقِ مراتب تو منصوص ہے۔ اور حاصل سب کا یہی ہوا کہ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ، یہی ملّتِ اسلامیہ ہے جو آپ کے سامنے مختلف عنوانات کے تحت چلی آرہی ہے، ''ہم اس کے لئے فرمانبردار ہیں!''

صحابہ معیارِ حق ہیں

فَاِنْ اٰمَنُوْا: اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو اِس مذکور پر، تو یہ ہدایت یافتہ ہوجائیں گے، یعنی جدھر تمہیں یہ بلاتے ہیں یہ ہدایت کا راستہ نہیں، ہدایت کا راستہ یہ ہے جس کی تفصیل اُوپر ذکر کردی گئی۔ اور اٰمَنْتُمْ کا خطاب صحابہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، جس میں ایمان کا ایک معیار بھی بیان کردیا گیا، کہ صحیح ایمان وہی ہے کہ اُس طرح سے لاؤ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت لائی ہے، اور اگر آپ ایمان لانے کی یہ صورت اختیار نہیں کریں گے تو ایسی صورت میں وہ ایمان بھی مقبول نہیں ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان میں معیار ہیں، جنّت کو کس طرح سے ماننا ہے؟ دوزخ کو کس طرح سے ماننا ہے؟ قیامت کو کیسے تسلیم کرنا ہے؟ برزخ کو کس طرح سے تسلیم کرنا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا ہے؟ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا ہے؟ دین کو کس رنگ میں قبول کرنا ہے؟ ان سب کے بارے میں معیار صحابہ ہیں، کہ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لائے ہیں اگر اس طرح ایمان لاؤ گے تو ہدایت یافتہ ہوگے، اور اگر اس طرح ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر تم ہدایت یافتہ نہیں ہو۔ اس لیے یہ مسئلہ جو آپ سنتے رہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق ہیں یا نہیں، اور ہمارے اکابر اس بات پر پورا زور لگاتے ہیں، اور اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں، اور وعظ وتقریر اس پر ہوتے ہیں، کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق ہیں۔ تو اُس کے لئے یہ آیت بھی ایک حجت ہے، یہاں خطاب کرکے کہا جارہا ہے کہ جس طرح سے تم ایمان لائے ہو اس طرح سے یہ لوگ ایمان لائیں گے تو ہدایت یافتہ ہیں، ورنہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔ تو جو عقیدہ بھی سامنے آجائے اس کی تفصیلات اور اس پر ایمان لانے کی صورت وہی معتبر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہو۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تسلی

وَاِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر یہ پیٹھ پھیریں، فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ: تو پھر یہ لوگ ضد میں ہیں، مخالفت میں ہیں، آپ کا اب اس میں کوئی قصور نہیں، اگر یہ اس ضد اور مخالفت کی بناء پر نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو عنقریب آپ کے لئے ان کے مقابلے میں اللہ کافی ہو جائے گا۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

خونِ عثمان والا مصحف آج تک محفوظ ہے

آپ حضرات نے سنا ہوگا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس وقت شہید ہوئے ہیں تو کتاب اللہ کی تلاوت فرما رہے تھے، اور آپ پر جس وقت قاتلانہ وار کیا گیا تو خون کے قطرے اِس آیت پر گرے ہیں فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اور یہ قرآنِ کریم جس کے اُوپر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا ہوا ہے آج تک محفوظ ہے، غالباً بخارہ میں کسی کُتب خانے کے اندر ہے، پچھلے دنوں میں اس کا تذکرہ بھی آیا تھا، وہ قرآنِ کریم اِس وقت تک محفوظ چلا آ رہا ہے جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے قطرے گرے تھے اور اسی آیت کے اوپر گرے تھے۔

ہم مختلف رنگوں کے قائل نہیں

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً: یہ ملتِ ابراہیمی کی ایک تفصیل ہے، کہ لازم پکڑا ہم نے اللہ کے رنگ کو، ہم نے تو اللہ کا رنگ قبول کر لیا، تم اپنے اپنے رنگ جو چڑھائے پھرتے ہو ہم ان رنگوں کے قائل نہیں ہیں، ملتِ ابراہیمی ہی اللہ کا رنگ ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کس کا رنگ اچھا ہو سکتا ہے، کون اچھا ہے اللہ سے از روئے رنگ کے، ہم تو اسی کے ساتھ ہی عبدیت کا تعلق رکھتے ہیں، اسی کے لئے ہم فرمانبردار ہیں۔ ''اور آپ انہیں کہیے کہ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں، اور وہ ہمارا بھی رَبّ ہے، تمہارا بھی رَبّ ہے، تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اور ہم اسی کے ساتھ ہی مخلصانہ تعلق رکھنے والے ہیں۔'' اس لیے یہ کوئی بات نہیں کہ جو یہودی نہ ہو، نصرانی نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اس کے عملوں پر جزا نہیں دے گا، یا وہ اللہ کا محبوب نہیں بن سکتا، اللہ تعالیٰ کا مقبول نہیں بن سکتا، یہ بات نہیں ہے۔

سیّدنا ابراہیم وغیرہ کے متعلق اہلِ کتاب کے دعوے کی تردید

اور ہم نے پیچھے یہ ثابت کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت جتنی تھی وہ سب ملتِ اسلامیہ پر تھی، اور یہود و نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا جو طریقہ ہے یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا، اب اُن کے اس دعوے کے اوپر انکار ہے کہ کیا تم یوں کہتے ہو، ''کیا تم بولتے ہو؟ کہتے ہو؟ کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام یہ سارے کے سارے یہودی تھے یا نصرانی تھے؟'' ان کا طریقہ یہودیت والا تھا؟ نصرانیت والا تھا؟ ایسا نہیں ہے، یہودیت تو ایک وقت کے اعتبار سے اصول وفروع کے مجموعے کا نام بن گیا، نصرانیت ایک وقت کے اعتبار سے ایک دین میں اصول وفروع کے مجموعے کا نام بن گیا، ورنہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہی یہودیت

چلا آ رہا ہو، یہ بالکل غلط ہے، یہودیت کی نسبت تورات کی طرف ہے اور نصرانیت کی نسبت انجیل کی طرف ہے، اور یہ دونوں کتابیں ہی حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے بہت بعد آئی ہیں، تو کیسے کہہ سکتے ہو کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام کا طریقہ ہی یہودیت اور نصرانیت والا طریقہ تھا۔ ان کا طریقہ وہی تھا کہ اللہ کی طرف سے جو آ جائے بس اس کو تسلیم کرنا، یہی عبادت ہے، یہی اسلام ہے، یہی ملتِ ابراہیمی ہے، ''آپ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟''

علمائے یہود کے لئے وعید

''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو چھپائے شہادت کو جو اس کے پاس موجود ہے اللہ کی جانب سے'' یہ ان کے اہلِ علم پر انکار ہے، کہ تم کتابوں میں ملتِ ابراہیمی سمجھتے ہو کہ کیا چیز ہے، تورات وانجیل سے ان انبیاء کا طریقہ تمہیں معلوم ہے، لیکن پھر تم لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرتے، گویا کہ اللہ کی جانب سے تمہارے پاس ایک شہادت آئی ہوئی ہے اور تم اس کا اخفاء کر رہے ہو۔ ''اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو'' یہ ایک وعید ہے، کہ تمہارے سب کرتوت اور تمہارا سب عمل اور کردار اللہ کے سامنے ہے، وقت پر اللہ تعالیٰ اِس کے اوپر گرفت فرمائیں گے۔

نسلی افتخار کی دوبارہ تردید

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: چونکہ اُن کے اندر نسلی افتخار کا زعم بہت تھا، اس لیے دوبارہ پھر اس آیت کو ہی دوہرایا جا رہا ہے، اور مسلمانوں کو سنایا جا رہا ہے کہ جس طرح یہودی اِس نسلی افتخار کے اندر گمراہ ہو گئے، اور ان نسبتوں کے اوپر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے کردار کا جائزہ نہیں لیا، تم اس طرح سے نہ کرنا۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: یہ ایک جماعت ہے جو کہ پہلے گزر گئی، لَهَا مَا كَسَبَتْ: اس کے لئے وہ چیز ہے جو اس نے کی، وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کی، وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: تم نہیں پوچھے جاؤ گے ان کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے، یعنی تم سے تمہارے کاموں کا تذکرہ ہوگا اور تمہارے کام پوچھے جائیں گے، ان لوگوں کے کاموں کے متعلق تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ کیا کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي

عنقریب کہیں گے نادان لوگ کس چیز نے پھیر دیا انہیں ان کے اس قبلے سے

كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

جس پر یہ پہلے تھے، آپ فرما دیجئے اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

صراطِ مستقیم کی طرف ﴿۱۴۲﴾ اور ایسے ہی ہم نے بنایا تمہیں معتدل امت تاکہ ہو جاؤ تم

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا

گواہ لوگوں پر، اور ہو جائے رسول تم پر گواہ، اور نہیں

جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ

بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ جان لیں ہم جدا جدا کر کے اُن لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى

ان لوگوں سے جو اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں، بیشک یہ تبدیلی البتہ گراں ہے مگر

الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی، اور نہیں ہے اللہ کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو، بیشک اللہ تعالیٰ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ

لوگوں کے ساتھ البتہ نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۴۳﴾ تحقیق دیکھتے ہیں، ہم آپ کے چہرے کے بار بار اُٹھنے کو آسمان کی طرف،

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

پس البتہ ضرور پھیر دیں گے ہم آپ کو اس قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں، پس پھیر لیجئے آپ اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف،

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

اور جہاں کہیں بھی تم ہوؤ پھیرا کرو اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف، اور بیشک وہ لوگ جو دیے گئے

الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہ بات حق ہے اُن کے رب کی جانب سے، اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۴۴﴾

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ

اور اگر آپ لے آئیں اُن لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہر نشانی، وہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے، اور نہیں ہیں

اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ

آپ اتباع کرنے والے اُن کے قبلے کی، اور نہیں ہے ان میں سے بعض تابع ہونے والا بعض کے قبلے کے، اور اگر

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا بیشک آپ تب ظالموں میں سے ہو جائیں گے ﴿۱۴۵﴾

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی پہچانتے ہیں اِس رسول کو جس طرح سے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور بیشک ایک فریق ان میں سے

لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

ان میں سے البتہ چھپاتا ہے حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۴۶﴾ حق تیرے ربّ کی جانب سے ہے پس اے مخاطب! تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۴۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ: سفہاء سَفِیۡہ کی جمع ہے اور سفیہ سَفِہَ سے ہے، سَفِہَ یَسۡفَہُ سَفَاهَةً، اور یہ لفظ کل بھی آپ کے سامنے گزرا، وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ سفیہ کہتے ہیں نادان کو، بے وقوف کو، جس کو عقل نہ ہو، بے عقل، نادان۔ عنقریب کہیں گے نادان لوگ، لوگوں میں سے سفہاء، لوگوں میں سے نادان لوگ کہیں گے: مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا: کس چیز نے پھیر دیا انہیں ان کے اُس قبلے سے جس پر یہ پہلے تھے۔ قبلہ کا معنی جہت استقبال، جدھر منہ کیا جاتا ہے، ”ان کی جہت استقبال جس پر یہ پہلے تھے اُس سے ان لوگوں کو کس چیز نے پھیر دیا“، قُلْ: آپ فرما دیجئے لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ: اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، یہ دونوں جہتیں بول کر تمام جہات مراد ہیں، یعنی ساری جہتیں اللہ ہی کے لئے ہیں، يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف، راہنمائی کرتا ہے جس

کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا: اور ایسے ہی ہم نے بنایا تمہیں معتدل اُمّت، اُمّت: جماعت، اور وسط سین کے فتح کے ساتھ بمعنی متوسط، معتدل، اعتدال والی، وسط اَوسط کے معنی میں ہے، درمیانی، جس میں افراط وتفریط نہیں پایا جاتا، ''ایسے ہی بنایا ہم نے تمہیں معتدل امت'' لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: شہداء شہید کی جمع، تاکہ ہوجاؤ تم گواہ لوگوں پر، وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا: اور ہوجائے رسول تم پر گواہ۔ وَكَذٰلِكَ: اور ایسے ہی۔ اس کو ماقبل کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود نہیں ہے، بسااوقات كَذٰلِكَ کا لفظ اگلے حکم کے ثابت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، جیسے ہم بھی اپنے محاورے میں کہتے ہیں کوئی آدمی بہادری دکھا رہا ہو، ہم کہتے ہیں کہ بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں، اس میں صرف اس کے لئے بہادری ثابت کرنا مقصود ہے، کسی دوسرے سے تشبیہ دینی مقصود نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم کہیں کہ چالاک آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں، یہاں کسی دوسرے سے تشبیہ نہیں دی جارہی، چالاکی کو اسی کے لئے ثابت کیا جارہا ہے، یہاں بھی اسی طرح ہوسکتا ہے، ''ہم نے تمہیں ایسے ہی معتدل امت بنایا'' یعنی بہت اعلیٰ درجے کی، ''تاکہ تم گواہ ہوجاؤ لوگوں پر اور رسول گواہ ہو تم پر۔'' وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ: جَعَلْنَا دو مفعولوں کو چاہتا ہے، یہاں الْقِبْلَةَ پہلا مفعول ہے، الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ دوسرا مفعول ہے۔ اَلْجِهَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ جان لیں ہم، مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ: علم کا صلہ جس وقت مِن آجائے تو اس میں تمیز والا معنی ہوتا ہے، یعنی جدا کرنا (آلوسی)، تاکہ ہم جدا جدا کرکے جان لیں ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں ان لوگوں سے جو کہ اپنی ایڑیوں پہ پھرتے ہیں، اب ترجمہ صاف ہوجائے گا، علم کے اندر امتیاز والا معنی آگیا، تاکہ ہم علیحدہ علیحدہ کرکے جان لیں، ممتاز کرلیں ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں ان لوگوں سے جو کہ اپنی ایڑیوں پہ پھرتے ہیں۔ اِنقلاب: پلٹا کھا جانا۔ عَقِبَیۡ یہ عَقِبَیۡنِ تھا، عَقِبٌ کا تثنیہ بمعنی ایڑی۔ ایڑیوں پر پھر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جدھر سے آئے الٹے پیر ادھر ہی پھر گئے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً: وان كانت التحويلة لكبيرة (مظہری) اور اِنْ مخففہ من المثقلہ ہے اور لَكَبِيْرَةً پر لام کا آنا اس بات کی علامت ہے، بےشک یہ تحویلہ، یہ تبدیلی البتہ بوجھل ہے، گراں ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی، (اصل میں تھا) اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ. الَّذِيْنَ کی طرف لوٹنے والی ضمیر جو هَدٰى کا مفعول ہے وہ محذوف ہے، ''بیشک یہ تبدیلی البتہ بھاری ہے، گراں ہے'' کبیرہ کا معنی یہاں ثقیلہ، اسی معنی میں یہ لفظ پیچھے بھی آیا تھا اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (سورۂ بقرۃ: ۴۵) نماز کے بارے میں آیا تھا، وہاں بھی کبیرہ کا معنی ثقیلہ ہی کیا تھا، جس کا برداشت کرنا مشکل ہے، ''مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی''۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ: اور نہیں ہے اللہ کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو، اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ البتہ نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ رؤف رَأْفَة سے لیا گیا ہے، رافت نرمی کو کہتے ہیں، شفقت کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ: فِى السَّمَآءِ سے فی جهة السماء مراد ہے، تحقیق دیکھتے ہیں ہم آپ کے چہرے کا بار بار اٹھنا آسمان کی طرف۔ تقلُّب پلٹے کھانے کو کہتے ہیں، یعنی کبھی آپ کا منہ اوپر کو جاتا ہے، کبھی یوں نیچے کو آتا ہے، یہ بار بار جو آپ اس طرح سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں، یہ چہرے کا الٹ پلٹ ہونا، ''بیشک دیکھتے ہیں ہم آپ کے چہرے کے بار بار اٹھنے کو آسمان کی طرف''، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا: پس

البتہ ضرور پھیر دیں گے ہم آپ کو اس قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: پس پھیر لیجیے آپ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف۔ شطر نصف کو بھی کہتے ہیں اور طرف کو بھی کہتے ہیں، یہاں جانب کے معنی میں ہے، پھیر لیجیے آپ اپنے رُخ کو، اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ: فَوَلِّ میں خطاب حضور ﷺ کو ہے، اور آگے اس میں عموم کر دیا کہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ: جہاں کہیں بھی تم ہو، كُنْتُمْ کا خطاب سب اہل ایمان کو ہو گیا، سفر میں، حضر میں، جہاں کہیں بھی تم ہو، حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں موجود ہو اور نماز پڑھنی پڑ جائے، جہاں کہیں بھی تم ہو و پھیرا کرو اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف۔ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ: اور بیشک وہ لوگ جو کتاب دیے گئے البتہ جانتے ہیں کہ یہ بات حق ہے اُن کے رَبّ کی جانب سے، وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ: اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ: اور اگر آپ لے آئیں ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہر قسم کی نشانی۔ أَتَى يَأْتِي: آنا، لیکن یہاں بِكُلِّ آيَةٍ پر باء تعدیہ کے لئے ہے، اسی لیے میں نے ترجمہ لانے کا کیا ہے۔ اور اگر آپ لے آئیں ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہر نشانی، مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ: وہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے۔ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ: اور نہیں ہیں آپ اتباع کرنے والے اُن کے قبلے کی، وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ: اور نہیں ہے اُن میں سے بعض تابع ہونے والا بعض کے قبلے کا، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ: اور اگر آپ نے اتباع کی ان کے خیالات کی، ان کی خواہشات کی مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا، إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ: بیشک آپ تب ظالموں میں سے ہو جائیں گے، ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو اپنا قصور کر لیتے ہیں، اپنا نقصان کر لیتے ہیں۔ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ: وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی يَعْرِفُونَهُ: پہچانتے ہیں اِس رسول کو، كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ: جس طرح سے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ: اور بیشک ایک فریق اِن میں سے البتہ چھپاتا ہے حق کو، وَهُمْ يَعْلَمُونَ: حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ: حق تیرے رب کی جانب سے ہے فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ: پس اے مخاطب! تو شک کرنے والے میں سے نہ ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے پارے کے آخری دو رکوع سے قبلہ کے متعلق تفصیلات آ رہی ہیں، میں نے اُس وقت عرض کیا تھا کہ اصل میں تحویل قبلہ کا مسئلہ پہلا نسخ تھا جو مدینہ منورہ میں جا کر ہوا، اور اِس پر اہل کتاب کی طرف سے اور دوسرے لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے آوازے کسے گئے اور شور برپا کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی اہمیت کی بناء پر تحویل قبلہ کا حکم دینے سے پہلے ہی جس

طرح سے فضاء کو ساز گار کیا جاتا ہے اور اہلِ ایمان کو دماغی طور پر تیار کیا جاتا ہے، اور جس قسم کے شبہات لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے تھے اُن کے جوابات کی تلقین کی جاتی ہے، تو یہ آیات اسی قسم کی ہیں۔

تحویلِ قبلہ پر اُٹھنے والے شبہات کا قبل از وقت سدِّ باب

اور اِس رکوع میں پھر قبلے کے تبدیل ہونے کا صراحتاً حکم آ رہا ہے، جیسے سَيَقُوْلُ میں سین استقبال کے لئے ہے، اس کا مطلب ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا اُس وقت بے عقل لوگ، نادان لوگ، جو سمجھ دار نہیں ہیں، وہ اِس قسم کا اعتراض کریں گے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ آیات قبلے کا حکم آنے سے پہلے اُتری ہیں، اور پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا کہ اس قسم کی باتیں ہوں گی۔ اور جب قبل از وقت آگاہ کر دیا جائے تو پھر اگر اعتراضات ہوں بھی تو انسان گھبراتا نہیں ہے اور کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوتی، وہ سوچتا ہے کہ ہمیں پہلے ہی پتہ تھا کہ ایسا ہونا ہے اور ویسے ہی ہوا، پریشانی ہمیشہ خلافِ امید معاملہ پیش آنے پر ہوا کرتی ہے، اور جب پہلے ہی امید ہو کہ ایسا ہونا ہے تو پھر پریشانی نہیں ہوا کرتی۔ تو سَيَقُوْلُ کے اندر یہی پیش گوئی کی گئی ہے کہ نادان قسم کے لوگ ایسی باتیں کریں گے۔ انہیں نادان اس لیے کہا کہ اصل چیز تو اللہ کا حکم ہے، اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنی تجویز پر اعتماد کرتے ہوئے جو لوگ اعتراضات کرتے ہیں وہ بے عقل ہی ہوتے ہیں، ”کہیں گے کہ اِن مسلمانوں کو ان کے قبلے سے جس پر یہ پہلے تھے کس چیز نے پھیر دیا؟“ یہ کیوں پھر گئے؟ یہود کہیں گے کہ ہماری ضد کی بناء پر یہ ایسا کرتے ہیں، یا کہیں گے کہ ان کو اپنے طرزِ عمل پر ابھی اعتماد ہی نہیں، کہ کبھی کدھر کو منہ کر لیا، کبھی کدھر کو منہ کر لیا۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں تو یہ کیا کہ اللہ آج کچھ کہہ دیتا ہے اور کل کچھ کہہ دیتا ہے؟ اور مشرکین مکہ کہیں گے کہ دیکھو! ہم سے انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور ہمارے عبادت خانے کو چھوڑ کر دوسری طرف انہوں نے رخ کر لیا تھا، اب پھر ہماری طرف بدلتے آ رہے ہیں، اِس قسم کے شبہات پیدا ہوں گے، اور جب یہ واقعہ پیش آیا تو اُس وقت یہ شبہات پیش کیے گئے، اعتراضات کیے گئے، شور مچایا گیا، اور جیسے بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض ضعفاء اور کمزور ایمان کے لوگ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ بددل بھی ہوئے، بہر حال یہ قبل از وقت نشاندہی کی جا رہی ہے کہ اِس قسم کا شور مچنا ہے۔

عبادت کے لئے کوئی جہت ذاتی طور پر متعین نہیں، اصل اللہ کا حکم ہے

جب یہ اعتراض کریں تو آپ جواب میں یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کوئی جہت ذاتی طور پر متعین نہیں ہے، کہ ہم کہیں کہ اِدھر ہی منہ کیا جائے گا تو اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے، اِدھر منہ نہ کیا گیا تو اللہ کی عبادت نہیں ہو سکتی، ایسی کوئی جہت متعین نہیں، مشرق مغرب شمال جنوب جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لئے ہے، جیسے پیچھے بھی یہ لفظ آئے تھے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (سورۂ بقرہ:۱۱۵) مشرق ومغرب سب اللہ کے لئے ہے، جدھر منہ کرو اُدھر اللہ کی ذات موجود ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم اصل ہے، اللہ تعالیٰ مشرق کی طرف منہ کرنے کے لئے کہہ دیں تو وہی قبلہ بن جائے گا، مغرب کی طرف منہ کرنے کے لئے کہہ دیں تو وہی قبلہ بن جائے گا، کسی اور طرف حکم دے دیں تو وہی قبلہ بن جائے گا، اصل اللہ کا حکم ہے۔ باقی ان جہتوں کے اندر کوئی جہت بھی ایسی نہیں

کہ ہم کہیں کہ ذاتی طور پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ منہ اُدھر کیا جائے۔'' آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہے'' اب اس میں جو تلقین کی گئی وہ یہ ہے کہ قبلے کہ تعیین اصل میں اللہ کے حکم کے تحت ہے، جو اللہ کا حکم آجائے اُس کو مان لینا چاہیے، مشرق و مغرب کی بحث فضول ہے۔ یہ ہے ایک اعتدال کا راستہ، جو اہل ایمان کو حاصل ہونا چاہیے، کہ ہر وقت اس بارے میں تیار رہیں کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آئے قبول کرلیا جائے، اصل یہی ہے، یہی صراطِ مستقیم ہے، جس کو اگلی آیت میں ذکر کیا گیا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کردیتا ہے، اور جس کے دل و دماغ میں یہ چیز سما گئی کہ اللہ کا حکم ہی واجب التسلیم ہے، اس میں جھگڑا کرنا مناسب نہیں، یوں سمجھو کہ اللہ کی طرف سے اس کو صراطِ مستقیم نصیب ہوگیا۔ اور جو اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنی رائے پر جمے رہتے ہیں، اور اللہ کا حکم آجانے کے باوجود اس میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں، یوں سمجھو کہ یہ صراطِ مستقیم سے محروم ہیں۔'' جس کو اللہ چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کردیتا ہے''۔

اُمتِ محمدیہ معتدل اُمت ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا: اور یہ صراطِ مستقیم اُمتِ محمدیہ کو نصیب ہوا، یہ اعتدال انہی میں ہی ہے، کہ ہر بات کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد پھر اُس کو قبول کرلیتے ہیں۔ اگر تشبیہ والا معنیٰ ذکر کرنا ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح سے ہم نے کعبہ کو جو کہ تمام عمارات سے افضل ہے تمہارا قبلہ بنادیا، اسی طرح سے ہم نے تمہیں باقی اُمتوں کے مقابلے میں ایک معتدل اُمت بنا کر شرافت بخشی ہے۔ یا اس اُمتِ محمدیہ کی ہی تعریف کرنی مقصود ہے کہ ہم نے تمہیں ایسی ہی اُمتِ معتدلہ بنایا، اعتدال والی جماعت بنایا، یہ تعریف اُنہی کرنا مقصود ہے، جیسے میں نے عرض کیا کہ کسی بہادر کو دیکھ کر کہا جائے کہ بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں، تو اس میں بہادری کا اثبات اسی کے لئے ہوا کرتا ہے، کسی دوسرے کو تشبیہ دینی مقصود نہیں ہوتی۔ یہاں بھی ایسے ہی ہوجائے گا، کہ ہم نے تمہیں ایسی ہی اُمتِ معتدلہ بنایا تاکہ تمہاری شرافت لوگوں کے سامنے ظاہر ہو آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔

''لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' کی پہلی تفسیر

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا: اس کی تفسیر اصح روایات میں یوں آئی ہے کہ قیامت کے میدان میں جب اللہ تعالیٰ تمام اُمتوں کو اکٹھا کرلیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوجائے گا تو کافر لوگ کہیں گے کہ ہمیں آپ کا پیغام کسی نے پہنچایا ہی نہیں، اس لیے ہم اگر غلط راستے پر لگے ہوئے تھے تو ہم معذور ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو مقابلے میں بلائیں گے جو ان پر یہ اظہار کریں گے کہ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا دین پورا پورا پہنچایا، تم کیسے کہتے ہو کہ نہیں پہنچایا۔ اب یہ دو فریق ہوگئے، ایک طرف انبیاء علیہم السلام، دوسری طرف ان کی اُمتیں۔ تو انبیاء علیہم السلام کے حق میں گواہی دینے کے لئے کافروں کے خلاف اُمتِ محمدیہ پیش ہوگی، یہ کہیں گے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے دین پہنچایا، اور ہمیں اس بات کی پوری پوری تصدیق اور پورا پورا یقین ہے، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی زبان سے ہم نے ان باتوں کو سنا، اور ہم اس کا یقین کیے ہوئے ہیں، یہ کافر لوگ غلط کہتے ہیں، اِن تک دین پہنچا ہے۔ اس طرح سے اُن لوگوں کے مقابلے میں اس اُمتِ محمدیہ کی شہادت

ہوگی، اور اس اُمتِ محمدیہ کے قابلِ شہادت ہونے کے اوپر پیغمبر ﷺ کی شہادت ہوگی کہ میری یہ اُمت ٹھیک کہتی ہے کہ انبیاء ؑ نے دین پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، بلکہ پورا پورا دین پہنچایا ہے (مظہری وغیرہ)۔ اِس شہادت کے بعد انبیاء ؑ کے حق میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوجائے گا، گویا کہ ساری مخلوق کے مقابلے میں اُمتِ محمدیہ کی فضیلت اور ان کی شرافت ظاہر ہوجائے گی کہ اتنے بڑے مقدمے میں اِن کو بطور شہادت کے پیش کیا گیا، اور ان کی شہادت کے ساتھ فیصلہ ہوگیا۔ تمہاری یہ فضیلت قیامت کے دن نمایاں ہوگی، اور یہ اِسی اعتدال کا نتیجہ ہوگا جس پر اللہ نے تمہیں بنایا ہے، تمہارے نظریات میں اعتدال ہے، تمہارے عمل میں اعتدال ہے، ہر چیز کے اندر تم افراط وتفریط سے بچے ہوئے ہو، یہی شرافت ہے جس کا ظہور قیامت کے دن ہوگا۔ تو یہ تفسیر صحیح روایات میں آئی ہوئی ہے۔

دُوسری تفسیر

ویسے شہداء ہونے کا ایک یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا رسول تمہارے سامنے آکر گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے احکام یہ ہیں، اور تمہاری شرافت یہ ہے کہ تم لوگوں کے سامنے گواہی دو کہ اللہ کے یہ احکام ہیں، اللہ کے رسول نے احکام تمہیں پہنچائے، تم آگے ساری مخلوق کو پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام اور مرتبہ دیا ہے، جس کا ذکر قرآنِ کریم کی دوسری آیت میں بھی ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰) تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے نکالی گئی، تاکہ لوگوں کو ان کا دین سمجھائیں اور اچھے نظریات کی تلقین کریں۔ تو شہداء کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا رسول تمہارے سامنے آکر گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے احکام یہ ہیں، اور تم مکلف ہو اس بات کے کہ لوگوں کے سامنے یہ گواہی دو اور لوگوں تک اس دین کو پہنچاؤ۔ یہ منصب بھی سب اُمتوں کے مقابلے میں ایک شرافت اور سیادت والا منصب ہے کہ اِن کو امامت کا درجہ دیا گیا، کہ اب یہ لوگوں کی راہنمائی کریں اور لوگوں کو دین سمجھائیں۔

تحویلِ قبلہ کے حکم سے مقصود آزمائش ہے

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَۃَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ: اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر آپ پہلے تھے مگر اس لئے...... یعنی اللہ کے علم میں تو پہلے ہی یہ چیز متعین تھی کہ آخری اُمت کا قبلہ کعبہ ہے، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں گے، لیکن تھوڑے سے دنوں کے لئے جو اِس بیت المقدس والی جہت کو متعین کردیا تو اس سے لوگوں کا امتحان مقصود ہے، کیونکہ عرب کے اندر تعصب بہت زیادہ تھا، نسلی نسبی وطنی ہر قسم کا تعصب تھا، اب جو مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے، مشرکین مکہ اور اردگرد کے لوگ، وہ اپنے اسی وطنیت کے جذبے کے اعتبار سے کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، کہ اپنے وطن کی عبادت گاہ کو چھوڑ کر کسی اور عبادت گاہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، اور یہود ونصاریٰ اپنے تعصب میں مبتلا تھے، وہ کسی صورت میں نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ہم اپنے قبلے کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبلے کو اپنائیں، اور پھر اسرائیلیوں سے یہ مرکز جو اسماعیلیوں کی طرف منتقل ہونا تھا تو یہود ونصاریٰ کے لئے بہت امتحان کی بات تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو حکم دیا کہ عرب والے شام کی طرف متوجہ ہوں تاکہ ان کے اندر وطنیت کے جذبے کو کمزور کیا

جائے، یہ اپنے قبلہ یعنی کعبہ کو چھوڑیں اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، جس میں ظاہری طور پر یہود ونصاریٰ کی موافقت ہے۔ اور بعد میں پھر اس کو اِدھر بیت اللہ کی طرف منتقل کر دیا گیا تا کہ یہود ونصاریٰ کے لئے بھی ایک امتحان کی صورت پیدا ہو جائے، کہ اللہ کے حکم کے تحت یہ اپنے قبلے سے رُخ پھیرتے ہیں یا نہیں پھیرتے، بیت المقدس کو چھوڑتے ہیں یا نہیں چھوڑتے؟ تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے متبع ہیں وہ عربی ہوتے ہونے کے باوجود بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم مل گیا تو انہوں نے اُدھر منہ کر لیا، اور جب بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ملا تو انہوں نے ادھر کر لیا، یہ لوگ کامیاب ہیں اور یہ متبع ہیں۔ اور جو لوگ بیت المقدس کی طرف حکم ملنے پر کہیں کہ ہم تو اپنے کعبہ کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم تو منہ اِدھر ہی کریں گے، یا بیت المقدس کو چھوڑنے کا حکم دیا جائے تو وہ کہیں کہ یہ تو ہمارا اجدی پشتی قبلہ چلا آ رہا ہے، ہم تو اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں، تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو ایڑیوں کے بل پھر گئے، اور یہ متبع نہیں ہیں، یہ اپنی خواہشات کے مطابق چلنے والے ہیں، جب تک کوئی حکم ان کی خواہشات کے مطابق ظاہر کیا جائے تو اس کو مانیں گے، اور جب خواہشات کے خلاف ہو جائے تو اس کو نہیں مانیں گے، یہ لوگ اس قسم کے ہیں۔ تو دونوں جماعتوں کے اندر امتیاز ہو جائے، ہم نے اس لیے تھوڑے دنوں کے لئے دوسری جہت متعین کر دی تھی، ورنہ ہمارے علم میں بھی بات یہی تھی کہ آخری امت کے لئے قبلہ بیت اللہ ہی ہے، کعبہ ہی ہے، ''نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر کہ آپ تھے'' اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ: تا کہ ہم جدا جدا کر کے جان لیں اُن لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں اُن لوگوں سے جو کہ اپنی ایڑیوں پہ پھرتے ہیں۔

''اِلَّا لِنَعْلَمَ'' پر ایک شبہ اور اس کا جواب

اِلَّا لِنَعْلَمَ: مگر تا کہ ہم جان لیں، یہ ترجمہ جس وقت ہم کریں گے اِس میں بظاہر ایک شبہ سا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے علم کے اندر بھی تجدد ہے؟ حدوث ہے؟ کہ پہلے اللہ کو معلوم نہیں اور اب معلوم ہوگا۔ یہاں جو کہا کہ ''یہ کام اس لیے کیا جا رہا ہے تا کہ ہم جان لیں'' یعنی ایسا کرنے کے بعد ہمیں پتہ چل جائے کہ متبع کون ہے اور منقلب کون ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے، واقعہ پیش آئے یا نہ آئے اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے، کہ فلاں منقلب ہے اور فلاں متبع ہے، اور لِنَعْلَمَ کے لفظ سے حدوث کا شبہ پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اس قسم کے واقعات کے ساتھ اللہ کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں یوں ہے اور فلاں یوں ہے، اِن لفظوں کے ظاہر پر حدوثِ علم کا شبہ پڑتا ہے۔ اور عام طور پر مفسرین نے یہی جواب دیا ہے کہ ایک ہے اللہ تعالیٰ کا علم قدیم، جس میں یوں ہے کہ ایسا ہوگا، ایسا ہو کر رہے گا، اللہ کا وہ علم عین واقعہ کے مطابق ہے، اور ایک علم وہ ہے جو واقعات سے متعلق ہے کہ ایسا واقع ہو گیا، آپ جانتے ہیں کہ یہ بات تو تبھی صادق آئے گی جب واقعہ پیش آ جائے گا، یعنی ''ایسا ہوگا'' یہ علم قدیم ہے جو پہلے سے اللہ جانتا ہے کہ ایسا ہوگا، اور ایک ہے کہ ظاہری طور پر ایسا ہو بھی جائے اور اللہ کا علم اس طرح سے متعلق ہو جائے کہ ایسا ہو گیا، یہ جو اللہ کا علم ہے یہ تو تبھی متعلق ہوگا جب واقعہ پیش آ جائے۔ اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم علمِ قدیم کے طور پر تو جانتے ہیں کہ کون متبع ہے اور کون منقلب ہے، لیکن ہم ایک ایسا امتحانی پرچہ دینا چاہتے ہیں جس کے ساتھ ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جائے کہ فلاں متبع ہے

اور فلاں منقلب ہے، اور جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا، دو پارٹیاں بنیں گی، تبھی جا کر ہوگا کہ ہم کہیں گے یہ متبع ہے اور یہ منقلب ہے، تو علم قدیم کے طور پر جو اللہ جانتے ہیں اُس کا ظہور واقعات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے اُردو تراجم کے اندر آپ یہ لفظ پڑھیں گے "تا کہ ہم ظاہری طور پر جان لیں کہ متبع کون ہے اور منقلب کون ہے" تو ظاہری طور پر جان لینے کا لفظ جو آئے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہمارے علم کا ظہور ہو جائے، کہ حقیقت کے اعتبار سے تو ہم جانتے ہیں کہ متبع کون ہے اور منقلب کون ہے، لیکن واقعات کے ساتھ اس علم کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ کے علم میں ہے کہ زید پیدا ہوگا لیکن آپ کو کیسے پتہ چلے کہ اللہ کے علم میں ہے کہ زید پیدا ہوگا؟ آپ کو پتہ اُس وقت چلے گا جب زید پیدا ہوگیا، اب اللہ کا علم ظاہر ہوگیا کہ اللہ جانتا ہے کہ زید پیدا ہوگا، اور اگر زید پیدا نہ ہوتا تو ہمیں پتہ نہ چلتا کہ اللہ کا علم اِس بارے میں کیا ہے، ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کے علم کا ظہور اِنہی واقعات کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اب ہم کہیں گے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ بعض متبع ہوں گے اور بعض اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائیں گے، اور اِس کا پتہ تب چلا جب یہ واقعہ پیش آ گیا، اس لیے اس کا مفہوم یوں ہوگا "تا کہ ہمارا علم ظاہر ہو جائے، تا کہ ہم ظاہری طور پر معلوم کرلیں کہ کون ان میں سے متبع ہے اور کون ایڑیوں کے بل پھرنے والا ہے" یعنی جس کو ہم اس طرح سے جانتے ہیں کہ ایسا ہوگا، ہم ایسے طور پر بھی جان لیں کہ ایسا ہوگیا، اور "ایسا ہوگیا" تبھی ہوگا جب واقعہ سامنے آجائے گا۔ اب اس کا مطلب یوں ہوگا کہ ہم نے ایک ایسی چیز بطور امتحان کے چھوڑی جس کے ساتھ ہمارے سامنے امتیاز ہوگیا، ہم نے واقع کے اعتبار سے جان لیا کہ یہ متبع ہے اور یہ منقلب ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ہمارے سامنے ظہور کی صورت ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسے لفظ آئیں گے "تا کہ اللہ جان لے، تا کہ اللہ کو معلوم ہو جائے" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تا کہ اللہ کا یہ علم ظاہر ہو جائے، ظاہری طور پر بھی اللہ جان لیں، علم قدیم کے طور پر تو جانتے ہیں، اب اللہ کا علم اِس طرح سے بھی تعلق پکڑ لے کہ ایسا واقعہ پیش آ گیا۔ اُردو تراجم اور تفاسیر میں اِس مفہوم کو ان لفظوں میں ادا کیا جائے گا کہ تا کہ ظاہری طور پر ہم جان لیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کے علم کا ظہور ہو جائے، کہ کون متبع ہے اور کون منقلب ہے۔ اور جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ علم کا صلہ مِنْ جائے تو اس میں امتیاز والا معنی آ جاتا ہے، تو ہم اُس کو یوں ادا کریں گے "تا کہ ہم ممتاز کر کے جان لیں، تا کہ ہم جدا کر کے جان لیں ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں اُن لوگوں سے جو ایڑیوں کے بل پھرتے ہیں۔"

ہدایت یافتہ لوگوں پر تحویلِ قبلہ کا حکم کوئی بوجھ نہیں ہے

وَاِنۡ كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً: اور یہ قبلے کی تبدیلی بڑی بوجھل ہے، اِس کا برداشت کرنا بڑا مشکل ہوگا، مگر ان لوگوں کے لئے جن کو اللہ ہدایت دے، اور اللہ کی ہدایت وہی ہے جو يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ میں میں نے ذکر کی، کہ جس کا یہ ذہن بن جائے کہ اصل اللہ کا حکم ہے، بس اُس کو قبول کرنا چاہیے، جنہوں نے یہ نظریہ اپنا لیا ان کو کوئی دشواری نہیں، چاہے بیت المقدس کی طرف متوجہ کر دیں چاہے کعبہ کی طرف متوجہ کر دیں، اور جنہوں نے اپنی طبیعت کو سامنے لانا ہے اور اپنے تعصبات کی پوجا کرنی ہے اُن کو یہ حکم بڑا ناگوار گزرے گا۔ "بیشک یہ تبدیلی بہت گراں ہے مگر اُن لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت دے" اللہ کی ہدایت کا مطلب یہاں یہ ہوا کہ اُن کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ اصل چیز اللہ کا حکم ہے، اُس کو ماننا چاہیے، بس جس کے دل میں یہ جذبہ آ گیا اس کو کوئی گراں

نہیں گزرے گی، تو جن کو یہ گراں گزرے گی وہ اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں، وہ گویا کہ اپنے تعصب کو سامنے لاتے ہیں، اپنی طبیعت کو، اپنی وطنیت کو، اپنی قومیت کو، اور اپنے نسلی جذبات کو مقدم رکھتے ہیں، اس لیے اس قسم کی تبدیلیاں اُن کے لئے ناگوار ہیں۔

''لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ'' میں ایمان کا مصداق کیا ہے؟

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ اگر اِس ایمان سے ایمان ہی مراد لیا جائے یعنی عقائد، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ جو لوگ اعتراض کریں گے کہ اِن کے ایمان کا کیا اعتبار ہے؟ کبھی کدھر کو پھر جاتے ہیں، کبھی کدھر کو پھر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے احکام کے ذریعے سے ایمان ضائع نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی جتنی اتباع نمایاں ہوگی اتنا ایمان اجاگر ہوتا ہے۔ یا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایمان سے نماز مراد ہے کہ بعض لوگوں نے یوں کہا کہ جب اصل قبلہ بیت اللہ ہے تو جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں اُن نمازوں کا پھر کیا درجہ ہوا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہمارے حکم کے تحت ہی پڑھی گئیں، لہٰذا وہ ضائع نہیں ہیں، وہ اللہ کے ہاں مقبول ہیں، اُن کے اُوپر کامل ثواب ملے گا۔ تو ایمان کا لفظ بول کر نماز مراد لے لی، چونکہ نماز ایمان کا ایک اہم رکن ہے اس لیے اس پر ایمان کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ''نہیں ہے اللہ کہ ضائع کرے تمہاری نماز'' ایمان کا مصداق نماز ہے۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ البتہ نرمی کرنے والا ہے، شفقت کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔''

کعبہ کے متعلق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شوق، اور اللہ کی طرف سے اس کی قبولیت

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ: یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق کا بیان ہے، کہ چونکہ آپ ملت ابراہیمی پر تھے، فطری طور پر آپ کو شوق تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیت اللہ کی طرف متوجہ کردے، یہی بنائے ابراہیمی ہمارا قبلہ قرار پاجائے، اور اس شوق کی بناء پر آپ آسمان کی طرف بار بار چہرہ اٹھاتے کہ جبریل علیہ السلام کب کو حکم لے کر آتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی شوق کو ذکر کیا۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ: تحقیق دیکھتے ہیں ہم آپ کے چہرے کا تقلب۔ تقلُّب: پلٹے کھانا، یعنی بار بار اٹھنا۔ فی جهةِ السماءِ: آسمان کی جانب میں۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا: یہ پختہ وعدہ آگیا، کہ البتہ ضرور پھیر دیں گے ہم آپ کو ایسے قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں، جس کے ساتھ آپ کی رضا ہے، ہم ضرور پھیر دیں گے، یہ وعدہ آگیا اور اس کے بعد اگلے الفاظ میں اسی وعدے کا ایفاء ہے۔ پہلے وعدے کے ساتھ خوشی ہوتی ہے، پھر جس وقت اُس وعدے کے مطابق چیز واقع ہوجائے تو پھر مستقل خوشی ہوتی ہے۔ ''پس پھیریئے آپ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف۔''

قبلہ عینِ کعبہ ہے یا جہتِ کعبہ؟

بیت اللہ اور بیت اللہ کے اردگرد والی جگہ مسجد کہلاتی ہے، اور پھر شطر کا لفظ بول دیا گیا کہ ''مسجد حرام کی طرف'' جس سے معلوم ہوگیا کہ قبلہ جہتِ کعبہ ہے۔ فقہ کے اندر آپ مسئلہ پڑھتے رہتے ہیں، کہ جو لوگ مکہ معظمہ میں موجود ہیں، جن کے سامنے وہ

قبلہ ہے اُن کو تو منہ اسی کی طرف ہی کرنا چاہیے، اگر تھوڑا سا بھی اِدھر اُدھر ہو گیا تو اُن کی نماز نہیں ہوگی۔ لیکن جو لوگ دور علاقوں کے رہنے والے ہیں، جن کے سامنے کعبہ کی عمارت نمایاں نہیں ہے، اُن کے لئے جہتِ کعبہ قبلہ ہے، کہ اُس جہت کو بھی منہ کر لیں گے تو نماز ادا ہو جائے گی۔ اب ہم ہزار ہا میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں سے اگر بال برابر بھی ہمارا رُخ تبدیل ہو جائے تو وہاں جاتے ہوئے سینکڑوں میلوں کا فاصلہ بڑھ جائے گا، یہاں سے جس وقت ہم اِس سیدھ میں خط کھینچیں گے تو وہاں جاتے جاتے فاصلے بڑھے گا ہی، کیونکہ خط کی ابتداء میں فاصلہ تھوڑا ہوتا ہے، لیکن جیسے جیسے آگے بڑھاتے جاؤ گے فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ تو اگر بال برابر بھی یہاں سے فرق پڑ جائے تو ناک کی سیدھ میں جب خط کھینچا جائے گا تو بیت اللہ سے کتنے میل ہم دائیں یا بائیں نکل جائیں گے۔ اور بالکل بیت اللہ کی طرف منہ کرنا دور رہنے والوں کے لئے ممکن ہی نہیں، اس لیے جہت کو ہمارا قبلہ بنا دیا گیا، اب عین کعبہ کی طرف منہ کرنا دور والے لوگوں کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اپنی طرف سے کوشش کرو کہ ہمارا منہ کعبہ کی طرف ہی رہے، ورنہ آپ کا خیال اور آپ کی تحری اور آپ کا قصد ہی آپ کے لئے جہتِ قبلہ ہے۔ جس وقت آپ نے سوچ لیا کہ بیت اللہ اِدھر ہے، اور بیت اللہ اُدھر تصور کر کے آپ نے اُدھر منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی تو یہ نماز بیت اللہ کی طرف ہی سمجھی جائے گی۔ جیسے کی تحری میں ایسے ہی ہے کہ بعد میں چاہے پتہ چل جائے کہ آپ کی پشت ہی بیت اللہ کی طرف تھی، منہ آپ نے دوسری طرف کر لیا، تو بھی آپ کی نماز صحیح ہے، کیونکہ آپ نے اپنے تصور اور اپنے خیال میں بیت اللہ کو اپنے سامنے تصور کر کے اُدھر منہ کر کے نماز پڑھی ہے، تو دور رہنے والوں کے لئے یہی چیز قبلہ ہے۔ ہمارے لیے مغربین کے درمیان میں ہے، ایک سردیوں کا مغرب ہے جہاں سردیوں میں سورج غروب ہوتا ہے، اور ایک گرمیوں کا مغرب ہے جہاں گرمیوں میں سورج غروب ہوتا ہے، اِس کے درمیان میں سے جدھر منہ کر لیا جائے وہ کعبے کی طرف ہی سمجھا جائے گا۔ اس لیے اگر رخ کعبہ سے تھوڑا سا ایک طرف ہو جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ جہت ضروری ہے، البتہ انسان اتنا نہ پھر جائے کہ کندھا بیت اللہ کی طرف ہو جائے، اور سینہ دوسری طرف ہو جائے۔ تو شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں یہی عموم کر دیا، ایک تو مسجد حرام یعنی بیت اللہ کے ارد گرد والی جگہ ہے، پھر شطر کا لفظ بھی آ گیا۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ: جہاں کہیں بھی تم ہو وا اپنے چہروں کو اُدھر ہی پھیر لیا کرو، یعنی مدینہ منورہ میں ہیں یا سفر میں ہیں، حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں بھی نماز پڑھنی پڑ جائے تو بھی اپنا منہ اب کعبہ کی طرف کیا کیجیے۔ اِس میں عموم کر دیا سب اُمتیوں کے لئے بھی، اور حضر اور سفر دونوں کے لئے بھی اِس میں عموم آ گیا: ''جہاں کہیں بھی تم ہو پھیرو اپنے چہروں کو مسجدِ حرام کی طرف۔''

ذو قبلتین ہونا آخری اُمت کی علامت ہے

''بیشک وہ لوگ جو کتاب دیے گئے البتہ جانتے ہیں کہ یہ بات حق ہے اُن کے رَبّ کی طرف سے'' وہ جانتے اس اعتبار سے ہیں کہ جو علامات نبی آخر الزمان کی ذکر کی گئی ہیں اُن میں یہ علامت بھی ہے کہ وہ ذو قبلتین ہوں گے، کہ پہلے کچھ مدت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے، آخر آخر اِس آخری امت کا قبلہ بیت اللہ قرار پائے گا، اُن کے سامنے یہ بات واضح ہے لیکن وہ انکار کرتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ اُن کی کارروائیوں سے بے خبر نہیں ہے'' جس قسم کی اُن کی کارروائیاں ہیں وہ سب اللہ کے سامنے ہیں۔

اہلِ کتاب کی ضد، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا ذکر

اور آپ اِن کو منوانے کی فکر نہ کیجئے، آپ اِن کا پیچھا چھوڑ دیجئے، اِن کی ضد کا تو یہ حال ہے کہ اگر اِن لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہیں آپ ہر قسم کی نشانی لے آئیں تو بھی یہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے، کیونکہ ایک اختلاف ہوتا ہے جہالت کی بناء پر، جہالت کا اختلاف تو دلیل کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے، کہ علم کی بات اُن کے سامنے کر دو، جہالت دور ہو جائے گی، وہ بات مان جائیں گے۔ لیکن جو اختلاف تعصب کا اختلاف ہوتا ہے وہاں ہزار ہا دلیلیں پیش کر دو، لیکن ''میں نہ مانوں'' کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔ جہاں تعصب کا اختلاف ہوا کرتا ہے وہ دلائل سے طے نہیں ہوا کرتا، وہاں تو ایک انسان کا مسلک یہ ہے کہ ''میں نہ مانوں، بس جو میری بات ہے وہی ٹھیک ہے''، ہزار دلیلیں لاؤ، وہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ تو ایسی صورت میں پھر اس شخص کو کسی طور پر بھی اپنا ہم مسلک نہیں بنایا جا سکتا، اس لیے ان کا پیچھا چھوڑنا چاہیے۔ تو یہ لوگ متعصب ہیں جو جاننے کے باوجود اختلاف کرتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں کہا کرتے ہیں کہ ''سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے، لیکن جو جاگتا ہوا سو جائے اُس کو کوئی نہیں جگا سکتا'' یعنی ہے وہ جاگتا لیکن اس نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں صرف یہ دکھانے کے لئے کہ میں سویا ہوا ہوں، وہاں ڈھول پیٹتے رہو، جو چاہے کرتے رہو، وہ کیسے جاگے گا؟ یہاں یہی بات ہوتی ہے کہ جاہل کو تو سمجھا کے ہم سیدھے راستے پر لا سکتے ہیں، اگر وہ جہالت کی بناء پر اختلاف کیے ہوئے ہے تو دلیل کے ساتھ اُس اختلاف کو دور کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر ایک عالم جاہل بن جائے اور جاننے کے باوجود وہ اِس بات پر اڑ جائے، اُس کو کسی دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ یہی بات ہے کہ ''اگر آپ اِن لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہر قسم کی نشانی لے آئیں تو یہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے۔'' تو یہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے اور آپ اُن کے قبلے کی اتباع نہیں کر سکتے، کیونکہ اللہ کا حکم آ گیا، لہٰذا اتفاق کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لیے زیادہ اِن کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ: اور نہیں ہیں آپ تابع ہونے والے ان کے قبلہ کے، یعنی اتفاق پیدا کرنے کی ایک تو یہ صورت ہے کہ وہ آپ کا قبلہ مان لیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ ہی اُن کا قبلہ مان لیں۔ وہ تو آپ کا نہیں مانیں گے ضد کی بناء پر، اور آپ اُن کا اس لیے مان نہیں سکتے کہ اللہ نے اُن کا قبلہ منسوخ کر دیا، اور آپ کو حکم دوسرا آ گیا، اور ان کی ضد ختم ہی نہیں ہو سکتی، لہٰذا یہ جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔ اور صرف آپ کے ساتھ ہی ان کا اختلاف نہیں، قبلہ کے مسئلے میں تو ان کا تو آپس میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ نصاریٰ بیت المقدس کے شرقی کنارے کو قبلہ سمجھتے تھے، اور یہود صخرۂ بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے ہیں، تو ان کا آپس میں بھی تھوڑا سا فرق ہے، ''نہیں ہے ان کا بعض تابع ہونے والا اپنے بعض کے قبلے کے۔''

اِتباع علم صحیح کی ہے نہ کہ جہالت کی

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ: اِن کا قبلہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے ٹھیک تھا، لیکن جب وہ منسوخ ہو گیا تو اب اس کو قبلہ سمجھنا دل کی خواہش ہے اور یہ غلط خیال ہے، ''اگر آپ نے اِن کے خیالات کی اتباع کی، اِن کی خواہشات کی اتباع کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو بیشک آپ اس وقت ظالموں میں سے ہو جائیں گے، حق تلفی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے''، گویا

کہ اللہ کی وحی کی حق تلفی ہو جائے گی، اللہ کی حق تلفی ہو جائے گا، آپ کا اپنے اُوپر بھی ظلم ہوگا، اپنا بھی نقصان ہوگا۔ لہٰذا آپ اس علم صحیح کے آجانے کے بعد اِن کے غلط خیالات کے پیچھے نہ لگیں، اِن کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیں۔ یہ آیت آپ کے سامنے بار بار آتی ہے، اس میں یہی بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اتباع کے قابل اصل میں علم کی بات ہے، جہالت قابل اتباع نہیں ہے، آپ اِن لوگوں کے جاہلانہ خیالات کے پیچھے نہ لگیے، اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

اہلِ کتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود اِنکار کرتے ہیں

اور آگے اِن کے تعصب کو ان الفاظ میں نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی اِس رسول کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں''، بیٹا چونکہ پیدا ہوتے ہی گود میں ہوتا ہے، (عرفان کا معنی ہوتا ہے ظاہری علامات کو دیکھ کر پہچاننا، معرفت ظاہری آثار سے ہوتی ہے)، کتنے سارے بچے کھیل رہے ہوں، اور اُن کے اندر اپنا بیٹا بھی کھیل رہا ہو، تو شکل دیکھ کر فوراً پہچانا جاتا ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے، وہاں انسان کو تردّد نہیں ہوتا، یہاں پہچاننا ظاہری حلیہ سے مراد ہے، حقیقتاً بیٹا ہے یا نہیں؟ اس سے بحث نہیں، کیونکہ حقیقتاً بیٹا ہونے میں تو شبہ نکالا جا سکتا ہے، کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور ہم سمجھے ہوں کہ ہمارا بیٹا ہے لیکن حقیقت میں اپنا نہ ہو، اور ایک ہے اُس کو ظاہری رُخ سے دیکھ کر پہچاننا کہ جس کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لڑکوں کے اندر اُس کو پہچاننا بہت آسان ہوتا ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔ تو جتنا وہ نمایاں ہے اللہ کا رسول اِن کے سامنے اتنا ہی نمایاں ہے، کہ علامات کے ساتھ اس کو پہچانتے ہیں کہ واقعی یہ اللہ کا رسول ہے جس کے متعلق یہ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں، ''لیکن ان میں سے ایک فریق البتہ چھپاتا ہے حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں'' جان بوجھ کر اس حق کا اخفاء کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات لوگوں کے سامنے نمایاں نہیں کرتے، ''حق تیرے رب کی جانب سے ہے، اے مخاطب! تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو''، یعنی سچی بات وہی ہے جو اللہ کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ

اور ہر کسی کے لئے ایک جہت ہے، وہ ادھر منہ پھیرنے والا ہے، پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلو، جہاں کہیں تم ہو گے لے آئے گا

بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر کے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۴۸﴾ جہاں سے آپ نکلیں

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ

تو پھیر لیا کریں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف، اور بیشک یہ بات حق ہے آپ کے ربّ کی طرف سے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں سے آپ نکلیں پھیر لیں آپ

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف، اور جہاں کہیں تم ہوؤ تو پھیرا کرو اپنے چہروں کو

شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ

مسجد حرام کی طرف، تا کہ نہ ہو لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی دلیل، سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہیں،

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ۙ

تم اُن سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرتے رہو، اور تا کہ پوری کردوں میں اپنی نعمت تم پر، اور تا کہ تم سیدھی راہ پا جاؤ ﴿۱۵۰﴾

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جیسے کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے، تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاک کرتا ہے

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ۛ

اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور سکھاتا ہے تمہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾ع

پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا، اور میرے شکر گزار رہو اور میری ناشکری نہ کرو ﴿۱۵۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ: وِجْهَةٌ جِهَةٌ کے معنی میں ہے، اور ہر کسی کے لئے ایک جہت ہے، هُوَ مُوَلِّيْهَا: وہ اُدھر منہ پھیرنے والا ہے، فَاسْتَبِقُوا: اِسْتِبَاق باب افتعال ہے، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا، سورۂ یوسف میں لفظ آئے گا اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ (آیت:۱۷) اُس کا معنی بھی یہی ہے کہ ہم نے دوڑ لگائی اور ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے ہم گئے، جیسے مقابلے میں دوڑ لگائی جاتی ہے تو ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کیا کرتا ہے تم ہم نے بھی اسی طرح سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑ لگائی۔ فَاسْتَبِقُوا کا معنی ہوگا ایک دوسرے سے آگے نکلو، الْخَيْرٰتِ: نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلو، ایک دوسرے سبقت کرو۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا: جہاں کہیں تم ہو گے يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا: اللہ تعالیٰ تم سب کو لے

آئے گا اکٹھا کر کے، لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے۔ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ: جہاں سے آپ نکلیں فَوَلِّ وَجْهَكَ: پھیر لیا کریں اپنا چہرہ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: مسجد حرام کی طرف، وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ: اور بیشک یہ بات حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ: اور جہاں سے آپ نکلیں، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: پھیر لیں آپ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف، وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ: اور جہاں کہیں بھی تم ہو، فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ: پھیرا کرو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف۔ شَطْرَهٗ کی ۃ ضمیر مسجد حرام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ: تا کہ نہ ہو لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی دلیل، کوئی حجت، کوئی جھگڑنے کی گنجائش، اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ: سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں، یعنی جن کی عادت ہے ظلم کی اور بے انصافی کی وہ تو جھگڑتے ہی رہیں گے، ورنہ اِن احکام پر عمل کرنے کی صورت میں لوگوں کے لئے کوئی حجت اور دلیل جھگڑے کے لئے باقی نہیں رہے گی۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ: ھم ضمیر الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے، تم اُن کی طرف سے اندیشہ نہ کرو، تم ان سے ڈرو نہیں، وَاخْشَوْنِیْ: اور مجھ سے ڈرتے رہو۔ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ: اور تا کہ پوری کردوں میں اپنی نعمت تم پر، وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: اور تا کہ تم سیدھی راہ پا جاؤ۔ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا: جیسے کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے، یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا: تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات، وَیُزَكِّیْكُمْ: اور تمہیں پاک کرتا ہے، وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ: اور سکھاتا ہے تمہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ فَاذْكُرُوْنِیْ: پس تم مجھے یاد کرو، اَذْكُرْكُمْ: میں تمہیں یاد کروں گا۔ اَذْكُرْ امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ وَاشْكُرُوْا لِیْ: اور میرے شکر گزار رہو، میرا شکر ادا کرو، وَلَا تَكْفُرُوْنِ: ن کے نیچے جو کسرہ ہے یائے متکلم کے محذوف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور میری ناشکری نہ کرو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

مسئلہ تحویلِ قبلہ کا چلا آرہا ہے، اور یہ سارے کا سارا رکوع اسی مسئلے پر مشتمل ہے، چونکہ تحویل کے پیش آجانے کے بعد یہود ونصاریٰ اور مشرکین نے اس مسئلے پہ بہت شور مچایا، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو مختلف پہلوؤں کے ساتھ مؤکد کر کے ذکر کیا، اور اس کی حکمتیں واضح فرمائیں۔

اللہ نے عبادت کے لئے ہر کسی کے لئے رُخ متعین کیا ہے

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا: ہر کسی کے لئے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ کرنے والا ہے، یہود نے بھی اپنا قبلہ متعین کر رکھا ہے، نصاریٰ نے بھی اپنا قبلہ متعین کر رکھا ہے، ہر امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی طرف ایسی بنائی ہے جدھر وہ منہ

کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کی جماعت بھی ایک مستقل جماعت ہے، آپ کی شریعت بھی ایک مستقل شریعت ہے، تو اگر ان کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک جہت متعین کردی تو اُس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، ہر کسی کا قبلہ ہے، یہود کا بھی ہے، نصاریٰ کا بھی ہے، اور اس شریعت کے اندر بھی ایک قبلہ متعین کردیا گیا۔

اصل مقصود عبادت ہے، فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے

یہ چیز اُلجھنے کی اور بحث کرنے کی نہیں ہے، کہ تم اس کے اندر ہی بحث کرتے ہوئے اور اُلجھتے ہوئے اپنا وقت ضائع کرو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے نیکی کرنے کے لئے ایک رُخ متعین کیا ہے، کہ ادھر کو منہ کر کے تم عبادت کیا کرو۔ باقی اصل مطلوب تو عبادت ہے، ان جھگڑوں کو چھوڑو، ان فضول بحثوں کے اندر اپنا وقت ضائع نہ کرو، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ: نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو، جہت جو متعین ہوگئی وہ تو اس لیے ہے تاکہ عبادت کے لئے ایک رُخ ہوجائے۔ اور ہر امت اور ہر جماعت کے لئے کوئی نہ کوئی جہت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، چاہے وہ انہوں نے خود متعین کرلی، چاہے اللہ تعالیٰ کے متعین کرنے سے کرلی، بہر حال ہر کوئی اپنے لیے ایک طرف کو متعین کرتا ہے، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے پہلے قبلے کو منسوخ کر کے اِس جماعت کے لئے ایک جہت متعین کردی۔ اصل مقصود اللہ کی عبادت ہے، اس میں بحث وجدال کرنے کی اور وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، فَاسْتَبِقُوا: ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو نیکیوں میں، نیکیاں کام آنے والی چیزیں ہیں، اگر اس میں بحث کرتے رہو کہ منہ کدھر کرنا ہے؟ اور نیکی کرو نہیں، تو اِس میں خسارہ ہے۔ ''جہاں کہیں تم ہوگے اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا'' اور جب اللہ تعالیٰ کے سامنے سارے موجود ہوجاؤ گے تو یہ جہتیں اپنی حیثیت سے ختم ہوجائیں گی، وہاں تمہارے اعمال دیکھے جائیں گے، چاہے کوئی مشرق کی طرف منہ کرتا تھا، کوئی مغرب کی طرف منہ کرتا تھا، کوئی شمال کی طرف کرتا تھا، کوئی جنوب کی طرف کرتا تھا، جب اللہ کے سامنے آجاؤ گے سارے ایک جیسے ہوجاؤ گے، وہاں پھر اللہ تعالیٰ تمہاری نیکیوں کو دیکھیں گے، تمہارے اعمال کو دیکھیں گے، یہ بحثیں اُس وقت کام نہیں آئیں گی، ساری اطراف کا قصہ ختم ہوجائے گا جس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود ہوجاؤ گے۔ ''جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا''، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے۔

سفر وحضر میں کعبے کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے

مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ: پیچھے جس وقت تحویل کا حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، اُس وقت سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں موجود تھے، گویا کہ نزول کے اعتبار سے وہ حکم حضر میں آیا، اور اب سفر کے بارے میں بھی تاکید کی جارہی ہے، کہ یہ مسئلہ صرف حضر کا ہی نہیں کہ تم نے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا ہے، بلکہ سفر میں بھی کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے، آپ کے لئے بھی اور آپ کی اُمت کے لئے بھی، جو حکم حضر کا ہے وہی حکم سفر کا ہے، یعنی یہ تاکید اس لیے کردی کہ قبلہ کے مسئلے کو سفر کے معاملے میں آہون نہ سمجھا جائے، بلکہ حضر اور سفر دونوں کا حکم ایک ہی ہے، جب بھی نماز پڑھو اُدھر ہی منہ کر کے پڑھو، اگر سفر کے معاملے میں سستی

کروگے تو یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سفر میں اگر قبلہ کے پہچاننے میں دقت پیش آجائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اپنی قوتِ علمیہ کو صرف کرو، آثار دیکھ کر جاننے کی کوشش کرو کہ کدھر قبلہ ہے، جدھر آپ کا دل شہادت دے دے اُدھر کو منہ کرلو۔ بہرحال سفر کرتے ہوئے کیف ما اتفق ہر طرف منہ نہیں کرنا، بلکہ قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے، قصد یہی ہو کہ قبلہ کی طرف منہ کیا جائے، تحری کا معنی ہی یہی ہوتا ہے صواب معلوم کرنے کی کوشش کرنا، کہ درست بات کون سی ہے؟، اپنے طور پر جو تم کرسکتے ہو وہ کرو، آثار دیکھ کر، علامات دیکھ کر، اور اپنے دل کے اندر سوچ کر، جدھر تمہارا دل شہادت دے کہ کعبہ اِدھر ہے بس اُدھر کو منہ کرکے نماز پڑھ لو، بہرحال قبلے کا اہتمام کرنا ہے، بغیر اہتمام کے نماز نہیں پڑھنی۔ ''جہاں سے آپ نکلیں'' یعنی ابتدائے سفر سے ہی، ''جہاں سے آپ نکلیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیرا کریں، بیشک یہی بات حق ہے آپ کے رب کی طرف سے'' وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اِس میں سفر کا حکم آگیا۔

''لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ'' کی پہلی تفسیر

سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کرکے خصوصیت کے ساتھ سفر کے متعلق حکم دیا، پھر اِس میں عموم کیا جارہا ہے آگے ایک حکمت واضح کرنے کے لئے۔ ''جہاں سے آپ نکلیں آپ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیرلیں، اور جہاں کہیں تم موجود ہو'' یہ عموم آگیا، حضر میں ہو، سفر میں ہو، مسجد نبوی میں ہو، بیت اللہ میں ہو، مسجد حرام میں ہو، بیت المقدس میں ہو، جہاں کہیں بھی تم موجود ہو''اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو''۔ یہ جو تکرار کیا گیا ہے یہ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ کے بیان کرنے کے لئے ہے، کہ یہ حکم تمہیں اس لیے دیا جارہا ہے تاکہ لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے، جھگڑنے کی گنجائش نہ رہے۔ جھگڑنے کی گنجائش کس طرح سے؟ عام طور پر مفسرین یوں ذکر کرتے ہیں، کہ کتبِ سابقہ میں خاتم النبیین ﷺ کی علامت کے طور پر یہ چیز مذکورہ تھی کہ وہ ذوقبلتین ہوں گے، جیسے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں بھی اشارہ ہے یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ، اس موقع پر جو اس کو ذکر کیا جارہا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ یہی علامتیں ہیں خاتم النبیین کی، جن کو یہ اہل کتاب بھی پہچانتے ہیں۔ اب اگر نبی آخرالزمان بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرکے نماز پڑھتے رہتے اور یہ قبلہ نہ بدلتا تو یہی لوگ کل کو تمہارے خلاف اپنی کتابیں اُٹھائے پھرتے کہ دیکھو! خاتم النبیین کی جو علامت ہے وہ تو اِن پہ صادق نہیں آتی، وہ تو ذوقبلتین ہے، اور اِن کا تو قبلہ ایک ہی ہے، تو یہ سچے پیغمبر کیسے ہوئے؟ کل کو یہ لوگ اپنی کتابوں کے حوالے دے کر تمہارے ساتھ جھگڑتے، اب ہم نے اِس علامت کو بھی پورا کردیا، اور تمہارا رُخ بیت اللہ کی طرف کرکے نبی آخرالزمان ہونے کی علامات کی تکمیل کردی، اب اِن لوگوں کے لئے جھگڑنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی، جھگڑا ختم ہوگیا، وہ علامت جو اِن کی کتابوں میں ذکر کی گئی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ ہاں! اِن میں سے جو ظالم ہیں، کٹ حجتی کرنے والے، جنہوں نے کسی صورت میں ماننا نہیں، وہ جھگڑتے رہیں گے، اُن کی تو بات ہی کوئی نہیں۔ جنہوں نے نہیں ماننا، جو ظالم قسم کے لوگ ہیں، جو کسی چیز کا حق ادا نہیں کرتے، حق تلفی کرتے ہیں، وہ تو جھگڑتے رہیں گے۔ البتہ منصف قسم کے لوگوں کے لئے جھگڑے کی گنجائش باقی نہیں رہی، بلکہ جھگڑا ختم ہوگیا۔ یہ بھی ایک حکمت ہے اِس تحویل میں کہ تاکہ لوگوں

کے لئے حجت بازی کا موقع نہ رہے۔اس طرح سے بھی اس آیت کے مفہوم کو واضح کیا جاسکتا ہے، اور عام طور پر مفسرین نے اسی طرح سے ہی واضح کیا ہے۔

دُوسری تفسیر

اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے یہ جو تمہیں حکم دے دیا ہے کہ مسجد حرام کی طرف منہ کیا کرو، اِس کے اوپر جم جاؤ، پکے ہوجاؤ، بالکل اِس میں کوئی ڈھیلا پن نہیں دکھانا، حضر میں ہو تو بھی اُدھر منہ کرو، سفر میں ہو تو بھی اُدھر منہ کرو، اگر اس میں ڈھیلا پن دکھاؤ گے کہ لاپروائی برتنی شروع کردو گے تو یہود و نصاریٰ پھر تمہارے لیے جھگڑے شروع کرلیں گے، کہ دیکھو! تم فلاں وقت میں یوں کرتے تھے، فلاں وقت میں یوں کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے نظریے پر پختگی نہیں ہے، تمہیں اِس کے بارے میں اعتماد نہیں ہے، لہٰذا تم اس میں ڈھیلا پن دکھاؤ ہی نہ، کہ کوئی اس مسئلے میں تمہارے ساتھ جھگڑا کرسکے، بلکہ سفر میں، حضر میں، جہاں تک ممکن ہو بس اِسی قبلے کے اُوپر جمے رہنا ہے، اس کے اُوپر پختگی دکھانی ہے، تاکہ تمہاری ثابت قدمی کو اور پختگی کو دیکھ کر کوئی شخص تم سے اس مسئلے میں جھگڑنے کی کوشش ہی نہ کرے۔ ورنہ اگر عملی طور پر ڈھیلا پن دکھاؤ گے تو دوسرے لوگوں کو امید لگی رہے گی کہ شاید بحث مباحثہ کرنے کی ساتھ اِن کا رُخ پھر بدلا جاسکتا ہے، اس لیے تم اس طرح ڈٹ جاؤ اور اس طرح ثابت قدم رہو کہ کسی وقت بھی تمہارا رُخ قبلے سے نہ بدلے، ہر وقت عبادت کے لئے تمہارا منہ قبلے کی طرف ہی رہے، تو دوسرے کسی کو جھگڑنے کی اور حجتیں اُٹھانے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ یہ بھی نفسیاتی طور پر ایک بات ہے کہ انسان اپنے مسلک میں اگر پوری طرح ٹھوس ہوجائے تو پھر دوسرا شخص اُس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا، اور اگر اپنی باتوں میں اور اپنے عمل میں کچھ ڈھیلا پن اور سستی دکھائی جائے تو ہر کسی کو طمع ہوتی ہے کہ شاید بحث وجدال کر کے اِس کو ہم بدل لیں گے اور دوسری طرف اس کا رُخ ہوجائے گا، تو دوسروں کے لئے بحث وجدال کی گنجائش رہا کرتی ہے۔ اور اگر انسان اپنے مسلک پر پوری طرح سے ثابت قدم ہوجائے، اپنے قول اور فعل کے ساتھ اپنے مسلک پر اپنا وثوق اور یقین ظاہر کرتا ہے تو پھر کسی دوسرے کو جھگڑا اُٹھانے کی گنجائش نہیں رہا کرتی۔ یہ مفہوم بھی اِن الفاظ میں ہوسکتا ہے۔

ضدی لوگوں کا علاج اُن سے بحث کرنا نہیں ہے

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ: تاکہ نہ رہے لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی حجت، سوائے اُن لوگوں کے جو اِن میں سے ظالم ہیں، لِلنَّاسِ سے یہود مراد ہیں جنہوں نے شور مچایا تھا۔ ہاں! اِن میں سے جو بے انصاف ہیں، جن کے اندر ظلم ہے، انصاف نہیں ہے، وہ تو پھر بھی جھگڑے اُٹھاتے رہیں گے، اُن کو چھوڑیے، اُن کا علاج یہ نہیں کہ اُن کے ساتھ بحث وجدال کرو، بلکہ اُن کے متعلق جذبہ یہ ہو کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ: اُن کی پرواہی نہ کیجئے، اُن سے کوئی اندیشہ ہی نہ کیجئے کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاسکتے ہیں، شور مچاتے رہیں، تمہارا کیا بگاڑتے ہیں، بولتے رہیں، تمہیں اِن کے ساتھ اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظالم قسم کے لوگ جن کا کام ہی محض بحثیں کرنا ہے اور شور مچانا ہے، اعتراض کرنا ہے، ان کا سمجھنے کا قطعاً ارادہ نہیں ہے، اُن کی طرف سے اندیشہ ہی نہ کیجئے کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاسکتے ہیں۔ وَاخْشَوْنِي: اور ہر وقت مجھ سے ڈرتے رہو، کہ میرے حکم کی مخالفت نہ کرنے پاؤ، چونکہ اگر میرے

حکم کی مخالفت ہوگی تو اس میں تمہارا نقصان ہوگا، میرا خوف اور میری خشیت تمہارے اُوپر غالب رہنی چاہیے، ان مخالفین ظالمین کی کوئی پرواہ نہ کرو۔

تحویلِ قبلہ کی ایک اور حکمت

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ: اور یہ قبلہ جو بدلا گیا تو اس لیے بھی بدلا گیا تا کہ لوگوں کی حجت بازی ختم ہو جائے، اور اس لیے بھی تا کہ میں اپنی نعمت تمہارے اُوپر تام کر دوں، کہ اچھی سے اچھی چیز کی طرف تمہیں متوجہ کروں، اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز تمہیں دوں، اس طرح سے میرا انعام اور میرا احسان تمہارے اوپر پورا ہوتا ہے۔ وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ: اور تا کہ تم سیدھی راہ پا جاؤ، اس وقت یہی سیدھی راہ ہے جو تمہیں سمجھائی جارہی ہے۔

''كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا'' کی تفسیر

كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا: اور یہ قبلے کا تبدیل کرنا اور اعلیٰ چیز کی طرف تمہاری راہنمائی کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ ہم نے پہلے تم پر یہ بنیادی احسان کیا، یا قبلہ کو بدل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عمارت کو ایسے ہی قبول کر لیا گیا جس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا کو قبول کر لیا گیا کہ ہم نے اُن کی دعا کے موافق ایک رسول اُٹھا دیا۔ كَمَاۤ کو آپ دونوں طرح سے ہی ظاہر کر سکتے ہیں، کہ ہم نے قبلہ بدل کر تم پر احسان کیا جیسے کہ تم پر یہ احسان کیا، یا، قبلہ کو تبدیل کر کے اور کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا کر ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بناء کو قبول کر لیا، جس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کی اِس دعا کو قبول کیا جو انہوں نے رسول کے بھیجنے متعلق کی تھی، وہ دُعا بھی قبول ہوگئی اور یہ دُعا بھی قبول ہوگئی، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا (سورۂ بقرہ: ۱۲۷) اے اللہ! ہماری طرف سے اِس کوشش کو قبول فرما۔ تو اس سے اعلیٰ درجے کی اور قبولیت کیا ہوگی کہ باقی رہنے والے دین میں، غیر منسوخ دین میں، قیامت تک رہنے والے دین میں اِس بنائے ابراہیمی کو عبادت کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔ تو جیسے وہ دُعا قبول ہوئی تھی ایسے ہی یہ رسول بھیجنے والی دُعا قبول ہوئی۔ رسول بھیجنے والی دُعا پہلے قبول ہوئی، اور اِس کو ہمیشہ قیامت تک کے لئے قبلہ بنا کر اس عمارت کی قبولیت بعد میں نمایاں ہوگئی۔ ''جیسے کہ بھیجا ہم نے تمہارے اندر ایک رسول تمہی میں سے'' یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا: تم پر ہماری آیات پڑھتا ہے، تلاوت کرتا ہے، یہ آیت اِنہی الفاظ کے ساتھ آپ کے سامنے پچھلے پارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے سلسلے میں گزر گئی، وَیُزَکِّیْکُمْ: اور تمہیں صاف ستھرا کرتا ہے، وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ: اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ: اور تمہیں ایسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم جانتے نہیں ہو، اس آیت میں اِدھر متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اس رسول کی قدر کرو، ایسی باتیں تمہیں بتاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے، تو ان کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہو جاؤ، ان سے اچھی اچھی باتیں سیکھو، اور یہ تمہارا تزکیہ کرتے ہیں، ان سے باطنی ظاہری ہر قسم کی صفائی ستھرائی حاصل کرو، جیسے یہ اللہ نے تم پر احسان کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کی کہ تمہارے اندر تم میں سے ہی ایک رسول اٹھا دیا، اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ بنا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کر لی۔ اور یا یہ مطلب ہے کہ قبلہ بنا کر

اللہ تعالیٰ نے جو تم پر احسان کیا یہ ایسے ہی احسان ہے جیسے تمہارے اندر یہ رسول اُٹھا کر تم پر ایک احسان کیا تھا۔ کامل رسول دیا، کامل کتاب دی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور افضل سے افضل گھر تمہارے لیے قبلہ بنا دیا۔

ذکر اللہ کی حقیقت وفضیلت اور اس کی مختلف صورتیں

فَاذْكُرُوْنِیْٓ: پس تم مجھے یاد رکھو، میرا ذکر کرو، اَذْكُرْكُمْ: میں تمہارا ذکر کروں گا، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ فَاذْكُرُوْنِیْٓ: تم مجھے یاد کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو یعنی میری طاعت کے ذریعے سے، ذکر کی اصل حقیقت اطاعت ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو یاد ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد رکھتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے احکام سے غفلت ہو اور اُس کی نافرمانی کی جائے، پھر زبان کے ساتھ اگر کوئی شخص ''اللہ اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ'' کہتا بھی ہے تو یہ ذکر کی ایک صورت ہے، اس میں ذکر کی حقیقت نہیں ہے۔ ذکر کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانا جائے، اعلیٰ درجے کا ذکر یہ ہے۔ اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی اللہ کے نام کے ساتھ مشغول رکھا جائے، کیونکہ عمل کے ساتھ ساتھ جس وقت اپنی زبان سے بھی اللہ کا نام لو گے تو اس میں برکات اور انوار زیادہ ہوں گے، اِس کی بھی تاکید حدیث شریف میں آتی ہے: ''لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ'' تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہنی چاہیے۔[1] حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عمل اللہ کے عذاب سے اتنا نجات دلانے والا نہیں جتنا اللہ کا ذکر اللہ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہے۔[2] تو عملی زندگی کے ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ پھر زبان سے تسبیح، تحمید، تکبیر، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إلٰہ إلّا اللہ، اللہ اکبر، ان الفاظ کا دوہرانا، اللہ کا نام بار بار لینا، یہ مزید انوار اور برکات حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، قلب کی مناسبت بڑھتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، جس سے مزید عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اس لیے ذکرِ لسانی اپنی جگہ اہم ہے، لیکن اس کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو قبول کیا جائے، جو حکم جس وقت آیا ہے آپ اس کو یاد رکھئے اور اس کے مطابق عمل کیجئے، یہ ہے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ ورنہ نافرمان ہونے کی صورت میں اگر زبان سے کوئی شخص اللہ اللہ کرتا بھی رہے تو یہ اُس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اور اللہ تعالیٰ تمہیں کس طرح یاد کرے گا؟ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اطاعت پر ثواب دے کر، تمہاری اطاعت پر اچھا بدلہ دے کر، تم پر احسانات کر کے یاد کرے گا۔ اور ایسے ہی حدیث شریف میں یوں بھی آتا ہے کہ جب ایک شخص اللہ کو یاد کرتا ہے، اگر مجلس میں یاد کرتا ہے (جس طرح سے ہم اس وقت مجلس میں بیٹھے اللہ کو یاد کر رہے) تو اللہ تعالیٰ ملاءِ اعلیٰ کے سامنے اُن لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ میرا فلاں بندہ مجھے یاد کر رہا ہے، اور یہ کتنا بڑا شرف ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو دے دیں، کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک کسی بندے کا محبت کے ساتھ ذکر کرے اور دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرے، یہ بہت بڑا شرف ہے۔ آپ اِس وقت موجود ہیں اور کچھ اشخاص دنیا میں ایسے ہیں جن کی عظمت آپ کے دل میں ہے، قریب سے قریب تر لے لیجئے، حضرت

---

(۱) ترمذی ۲/۱۷۵، باب ما جاء فی فضل الذکر۔ مشکوۃ ۱/۱۹۸ باب ذکر اللہ۔ فصل ثالث۔

(۲) مشکوۃ ۱/۱۹۹ باب ذکر اللہ۔ فصل ثالث۔ الدعوات الکبیر للبیہقی، رقم: ۱۹ ۔ ولفظ الحدیث: مَا مِنْ شَیْءٍ أَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللهِ مِنْ ذِكْرِ اللهِ۔

مفتی محمود صاحب ہیں، حضرت درخواستی صاحب ہیں، دوسرے بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے سامنے کوئی آ کے ذکر کر دے کہ فلاں بزرگ آپ کو یاد کر رہے تھے، اور آپ کا ذکر کر رہے تھے کہ بڑا اچھا آدمی ہے، جس وقت یہ خبر آپ کو پہنچے گی تو آپ خود اپنے دلوں کا اندازہ لگا لیجئے کہ کتنی خوشی ہوتی ہے، اور انسان اس کو اپنی عزت میں کتنا اضافہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ کی مجلس میں میرا ذکر اچھے الفاظ میں ہو رہا تھا۔ جب اِن اشخاص کی مجلس میں اچھے الفاظ سے کسی کا ذکر ہو تو وہ اپنے لیے اِس کو ایک عظمت اور عزت کی دلیل بناتا ہے، اور اُس کی طبیعت میں سرور اور خوشی آتی ہے، تو درود شریف پڑھنے کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں آپ کا ذکر آجائے، اور اللہ کا ذکر کرنے کے ساتھ اللہ کی مجلس میں آپ کا ذکر آجائے، اور اللہ تعالیٰ ملاءِ اعلیٰ کے اندر آپ کا ذکر کریں، یہ بہت بڑی شرافت ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ یاد کریں گے، اگر کوئی خلوت اور تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُس کو تنہائی میں یاد کرتا ہے، اور اگر کوئی مجلس میں اللہ کو یاد کرتا ہے، اس کے اسماء کا اور اس کی صفات کا تذکرہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی مجلس کے اندر ذکر فرماتے ہیں، یعنی جیسا آپ کا عمل ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ویسی ہی جزاء ملتی ہے۔

ذِکر کی پابندی کی ایک بہترین صورت

اور ذکر کی پابندی کی ایک یہ صورت بھی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے جن مواقع پر دعائیں منقول ہیں، کہ آپ فلاں موقع پر یہ دُعا فرمایا کرتے تھے، فلاں موقع پر یہ پڑھا کرتے تھے، اگر کوئی شخص اُن ادعیہ کی پابندی کرلے تو بھی یوں سمجھا جائے گا جیسے یہ شخص ہر وقت اللہ کو یاد کرنے والا ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ۔[1] کہ آپ اپنے تمام اوقات میں اللہ کو یاد رکھا کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کی یہ صورت بھی ہے، کہ جب بھی آپ کا کوئی حال بدلے، جس وقت بھی آپ کوئی کام کرنے لگیں، تو حدیث شریف میں جو دُعائیں تلقین کی گئی ہیں اگر اُن دُعاؤں کو انسان پڑھتا رہے تو ایسی صورت میں بھی ہر وقت اللہ کا ذکر لازم آجاتا ہے۔ اس لیے دُعاؤں کی پابندی کریں، اور ویسے بھی چلتے پھرتے اللہ کی تسبیح وتحمید زبان پر جاری رکھیں، بہت بڑی برکت کی چیز ہے، اور اِس کے ساتھ مزید نیکی کی توفیق ملتی ہے۔ اور اصل بنیادی طور پر اللہ کی یاد یہی ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کی جائے۔

شکر کی حقیقت وفضیلت اور اس کی مختلف صورتیں

وَاشْكُرُوْا لِيْ: اور میرا شکر ادا کرو، شکر کا اصل معنی ہوتا ہے قدر دانی، کسی کی نعمت کی قدر کرنا شکر ہے، تو مطلب یہ ہے کہ میرے احسانات کی قدر کرو، قدر زبان سے بھی ہوتی ہے، دل سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی ہوتی ہے، اس لیے آپ تعمیم کرتے ہیں کہ شکر ایک لسان سے ہوتا ہے، ایک اُرکان سے ہوتا ہے، ایک جنان سے ہوتا ہے۔ زبان سے شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان ذکر کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مہربانی فرمائی، یہ احسان کیا، زبان کے ساتھ تذکرہ کرنا بھی شکر گزاری ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ

---

(۱) مسلم ۱/۱۶۲ باب ذکر اللہ فی حال الجنابۃ۔ بخاری ۱/۴۴ باب تقضی الحائض الخ۔ مشکوٰۃ ۱/۴۹ باب مخالطۃ الجنب فصل اول عن عائشہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: ''مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ''[1] جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ تم پر انسانوں میں سے کوئی انسان احسان کرے تو اس کی بھی شکر گزاری کرو، جیسے ایک جگہ ہے اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (سورۂ لقمان: ۱۴) میرا بھی شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی شکر ادا کر، والدین کی طرف اس کی نسبت قرآنِ کریم میں صراحتاً آئی ہوئی ہے۔ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ کا مطلب یہ ہے کہ میری نعمتیں جن لوگوں کی وساطت سے ملا کرتی ہیں، جو اِن واسطوں کا شکر گزار نہیں وہ میرا شکر گزار نہیں۔ اگر براہِ راست آپ اللہ کا شکر تو ادا کرتے ہیں لیکن جن واسطوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمت آپ کو ملی ہے اُن کی آپ بے قدری کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اہانت سے پیش آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ بندہ میرا شکر گزار نہیں، میرے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے اُن واسطوں کا شکر ادا کرو جن واسطوں کے ساتھ میری نعمت تمہیں ملی ہے۔ والدین کی شکر گزاری کرو یہ میری شکر گزاری ہے، استاذ کی شکر گزاری کرو، یہ میری شکر گزاری ہے، شیخ کی شکر گزاری کرو، دوسرے جو بھی محسن ہیں، جتنے بھی احسان کرنے والے ہیں، کوئی آپ کو پانی پلاتا ہے، کوئی آپ کو کھانا دیتا ہے، کوئی آپ کو لباس دیتا ہے، کسی صورت میں آپ کے ساتھ زندگی میں کوئی ایسی اعانت کرتا ہے جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ احسان ہے اس کا بھی شکر ادا کرو۔ وہاں بھی شکر کی یہی صورت ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس پر احسان کیا جائے، اگر وہ اس احسان کو چھپالے، کسی کے سامنے ظاہر ہی نہیں کرے کہ فلاں شخص نے میرے پر احسان کیا ہے، تو یہ ناشکری ہے، کفرانِ نعمت ہے۔[2] جس پر احسان کیا جائے اس پر اخلاقاً یہ ضروری ہے کہ احسان کرنے والے کی لوگوں کے سامنے تعریف کرے، کہ دیکھو! فلاں شخص نے میرے پہ یہ احسان کیا ہے، یہ ہے شکر گزاری، اور کتمان (چھپالینا) ناشکری ہے۔ اور احسان کرنے والے کو تعلیم یہ دی گئی ہے کہ وہ اخفاء کی کوشش کرے، وہ لوگوں کو نہ کہے کہ میں نے اس پہ احسان کیا ہے، کیونکہ جس وقت وہ کہے گا کہ میں نے احسان کیا ہے تو اِس میں دوسرے شخص کی تذلیل ہوتی ہے، اور اِسے وہ شخص اپنی اہانت سمجھے گا، اُس کی پستی نمایاں ہوگی، اِس تکلیف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اِس کے احسان کے ثواب کو ضائع کر دیتے ہیں۔ لیکن جس پر احسان کیا گیا ہے وہ محبت کے ساتھ تذکرہ کرے گا تو احسان کرنے والے کے دل میں اور محبت آئے گی، اِس طرح سے آپس میں جوڑ ہوتا ہے۔ تو زبان سے تعریف کرنا، اُس کے لئے دعا کرنا، اُس کی عظمت اپنے دل میں محسوس کرنا، اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت میں کوشش کرنا، یہ انسانوں کی شکر گزاری ہے، والدین کا شکر اسی طرح سے ادا کیجئے، اپنے دوسرے محسنین کا شکر اسی طرح سے ادا کیجئے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُن وسائط کا شکر یہ ادا کیجئے جن کے ذریعے سے آپ کو اللہ کی نعمت ملی ہے، اور پھر ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی کیجئے، زبان سے بھی کہ اللہ نے یہ احسان فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ مہربانی کی، الحمد للہ، اللہ کا شکر ہے۔ اور قلب میں عظمت محسوس کیجئے، اور اپنے احسان کرنے والے محسن کی اطاعت اور فرمانبرداری کیجئے، اس کے احکام کو بجالائیے، یہ شکر کے ادا کرنے کی صورت ہوتی ہے۔

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۷ باب ما جاء فی الشکر۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۶۱ باب العطایا سے اگلا باب۔ فصل اول۔

(۲) سنن الترمذی ج ۲ ص ۲۳ باب ما جاء فی المتشبع الخ۔ مشکوٰۃ ص ۲۶۱ عن جابر رضی اللہ عنہ۔ باب العطایا سے اگلا باب۔ فصل ثانی۔

اللہ کا شکر کرنے سے انعامات واحسانات میں اِضافہ ہوگا

اور اِس کے نتیجے میں پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (سورۂ ابراہیم: ۷) اگر تم میری نعمتوں کی قدر کرو گے تو میں زیادہ نعمتیں دوں گا، تو نعمت میں اضافہ ہو جاتا ہے، انسانوں کے اندر بھی عادت اسی طرح ہے، اگر آپ کے ساتھ کوئی حُسنِ سلوک کرتا ہے، آپ اس کی تعریف کریں گے، اُس کی عظمت دل میں محسوس کریں گے، اس کی عزت نمایاں کریں گے، تو اُس کے دل میں اور داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اِس پہ اور احسان کروں۔ اور اگر کسی نے احسان کیا، اور آپ آگے سے ناقدری کرتے ہیں، الٹا اس کو منہ چڑاتے ہیں، یا اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، یا اپنی طرف سے کوئی محبت کا اظہار نہیں کرتے، تو انسان کے قلب میں جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کے اُوپر احسان کیا جائے، وہ آئندہ کے لئے رُک جاتا ہے۔ تو بندوں کے اندر بھی عادت یہی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت بڑھتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ ''میرا شکر ادا کرو، میرا احسان مانو، میری نعمتوں کی قدر کرو'' وَلَا تَكْفُرُوْنِ: وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور میرے ساتھ ناشکری سے پیش نہ آؤ، میری نعمتوں کی ناقدری نہ کرو۔ اس لیے میں نے جو رسول بھیجا ہے اِس کی بھی قدر کرو، اور اِس کو جو کتاب دی ہے اس کی بھی قدر کرو، اس کی تعلیمات کی قدر کرو، یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی شکر گزاری کی صورت ہے، جس کے ساتھ اِن احسانات کی برکات میں اضافہ ہوگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سوال:- مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ کا قبلہ کیا تھا، آپ ﷺ کدھر منہ کر کے نماز پڑھتے تھے؟

جواب:- اِس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں ہے، کسی آیت میں مذکور نہیں کہ حضور ﷺ پر جب مکہ معظمہ میں نماز فرض کی گئی تھی تو اس وقت آپ ﷺ کا رُخ کدھر متعین کیا گیا تھا، روایات کی طرف دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے صورت یہ بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے پچھلے انبیاء ﷺ کی شریعتوں کی رعایت رکھتے ہوئے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ہی نماز پڑھنی شروع کی تھی، مکہ معظمہ میں بھی آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور مدینہ منورہ میں آ کر بھی اُسی طرح سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، سولہ یا سترہ مہینے کے بعد اِس قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ کی طرف آپ ﷺ کو متوجہ کر دیا گیا۔ اور اس سے وہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا جو آپ کے سامنے آیا کرتا ہے، جو نسخ کی صورتوں میں ذکر کیا تھا، کہ ایک حکم حدیث سے ثابت ہو اور قرآن سے منسوخ کر دیا جائے، یہ اُس کا نمونہ بن سکتا ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔ حضور ﷺ کے حکم کے تحت ہی صحابہ منہ کرتے تھے، اور حضور ﷺ نے بھی از خود اللہ تعالیٰ کے سمجھانے کے ساتھ اِدھر کو منہ کرنا شروع کیا، بہر حال یہ حکم قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ بیت المقدس کا استقبال حدیث کے ساتھ ہوا، سرورِ کائنات ﷺ کے قول سے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر کے بیت اللہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ نسخ کی دو صورتیں کہ کتاب اللہ کا حکم کتاب اللہ سے منسوخ ہو، سنت رسول اللہ کا حکم سنت رسول اللہ سے منسوخ ہو یہ دونوں

صورتیں تو متفق علیہ ہیں، اور آپ اصول فقہ کے اندر پڑھیں گے کہ احناف رحمہم اللہ کے نزدیک یہ صورت بھی واقع ہے کہ حکم حدیث سے ثابت ہو اور منسوخ قرآن سے ہو جائے، یا حکم قرآن سے ثابت ہو اور منسوخ حدیث سے ہو جائے۔ تو یہ اس کی ایک مثال بن سکتی ہے کہ استقبالِ بیت المقدس حدیث سے ثابت تھا اور قرآن نے اس کو منسوخ کر دیا...... دوسری بات بعض حضرات نے یہ بھی کہی، کہ چونکہ آپ ملّت ابراہیمی پر تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اِس عمارت کی نسبت تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم منہ بیت اللہ کی طرف کیا کرتے تھے، بیت المقدس کی طرف نہیں کرتے تھے، لیکن اِس میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی صراحتاً حکم نہیں آیا ہوا تھا...... اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ تطبیق دیتے تھے، کہ حجر اسود اور رُکن یمانی......! اس کو یوں سمجھئے کہ ہمارا منہ بیت اللہ کے دروازے کی طرف ہے، وہاں بیت اللہ میں جس وقت آپ جائیں گے دیکھیں گے، بیت اللہ کا دروازہ مشرق کی طرف ہے، اور ہم مشرق میں رہنے والے ہیں، ہمارے لیے کعبہ مغرب کی طرف ہے، ہم جب اُدھر منہ کریں گے تو ہمارا منہ ادھر واقع ہوتا ہے جدھر بیت اللہ کا دروازہ ہے، ہمارا رُخ اس جہت میں ہے، بیت اللہ کا دروازہ ہماری طرف ہے، اور اس (جنوبی دیوار کے مشرقی) کونے پر حجر اسود ہے، اور یہ (جنوبی دیوار کا مغربی) کونہ رکن یمانی کہلاتا ہے۔ تو بیت اللہ کی جنوبی دیوار کی طرف اگر منہ کیا جائے تو بالکل بیت المقدس سامنے آ جاتا ہے، بیت اللہ اس جہت میں (جنوب کی طرف) ہے، اور مدینہ منورہ یہاں (شمال کی طرف) ہے۔ اس لیے مدینہ منورہ میں آپ کا منہ جب شمال کی طرف ہوتا تھا تو پشت بیت اللہ کی طرف ہوتی تھی، اور جس وقت آپ کا منہ بیت اللہ کی طرف کر دیا گیا تو پشت بیت المقدس کی طرف ہوگئی۔ مدینہ میں رہ کر دونوں صورتیں جمع نہیں کی جاسکتیں، کیونکہ مدینہ منورہ درمیان میں آ گیا، اور میزاب رحمت کعبہ کی شمالی دیوار پر ہے، اور مسجد نبوی کا قبلہ میزاب رحمت کی طرف ہے، اور ہمارا قبلہ بیت اللہ کے دروازے کی طرف ہے۔ تو مکہ میں رہتے ہوئے تو یہ صورت ہو سکتی تھی کہ نماز کے وقت منہ کعبہ کی جنوبی دیوار کی طرف کریں تو دونوں کی طرف بیک وقت رُخ ہو جائے، بنائے ابراہیمی کی رعایت بھی رہ جائے، اور بیت المقدس کی رعایت بھی ہو جائے...... بہرحال جو بھی عملی صورت تھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اور وحی خفی کے ساتھ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر اُس وقت تعیین کے طور پر قبلے کا کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ زیادہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت یہ بات منسوخ ہوگئی۔ تو ذو قبلتین یوں بنے کہ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ تھا، پھر بیت اللہ کی طرف ہو گیا۔ ہمارے سامنے صراحت کے ساتھ یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ پہلے قبلہ بیت اللہ متعین کیا گیا تھا، پھر بیت المقدس کیا گیا اور پھر بیت اللہ بنا دیا گیا، یہ صورت نصوص کے تحت متعین نہیں ہے۔ واضح طور پر کتاب اللہ میں یہی ذکر آیا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ کا نماز پڑھنا اُس وقت نمایاں ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں گئے کہ وہاں بیت اللہ کی طرف پشت ہوگئی، گویا کہ کلیۃً قبلہ بیت المقدس قرار پا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے ساتھ، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو کلیۃً بدل دیا، کہ اب بیت المقدس کی طرف پشت ہوگئی اور بیت اللہ کی طرف منہ ہو گیا۔ باقی! نصوص میں یہ صراحت نہیں ہے کہ مکہ معظمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بیت المقدس کی رعایت نہیں رکھتے تھے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا

اے ایمان والو! مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعے سے، بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾ نہ کہو

لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اُن لوگوں کے متعلق جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے ﴿۱۵۴﴾

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ

البتہ ضرور آزمائش کریں گے ہم تمہاری کچھ خوف اور کچھ بھوک کے ذریعے سے، اور کچھ اموال اور جانوں اور پھلوں کے گھٹانے کے ذریعے سے،

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا

اور آپ بشارت دے دیں صبر کرنے والوں کو ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بیشک ہم

لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

اللہ کے لئے ہیں، اور بیشک ہم اسی کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان پر خصوصی خصوصی رحمتیں ہیں اُن کے ربّ کی طرف سے

وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ

اور عمومی رحمت ہے، اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ پا لی ﴿۱۵۷﴾ بیشک صفا اور مروہ

مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

اللہ (کے دین) کی علامات میں سے ہیں، پس جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں

عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ

کہ ان دونوں کا طواف کرے، اور جو شخص بھی کوئی بھلا کام کرے خوشی کے ساتھ پس بیشک اللہ تعالیٰ

شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

قدر دان ہے اور جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾ بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اُس چیز کو جو ہم نے اُتاری یعنی واضح دلائل

وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ

اور ہدایت، بعد اس کے کہ ہم نے واضح کر دیا اس کو لوگوں کے لئے کتاب میں، یہی لوگ ہیں کہ

يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

ان پر اللہ لعنت کرتا ہے، اور بھی بہت سارے لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنے احوال کو درست کر لیں

وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ

اور ظاہر کر دیں، یہی لوگ ہیں کہ میں اُن پر متوجہ ہوتا ہوں، اور میں تو بہت متوجہ ہونے والا رحم کرنے والا ہوں ﴿۱۶۰﴾ بیشک

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر ہیں یہی لوگ ہیں کہ اِن پر اللہ کی

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ

اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ اس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا

وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے ﴿۱۶۲﴾ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ رحمٰن و رحیم ہے ﴿۱۶۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ: اے ایمان والو! مدد طلب کرو، مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے سے، اے ایمان والو! صبر و صلوٰۃ کا سہارا لو، یہ بھی اِس کا مفہوم ہے، آج کل کے محاورے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مشکلات اور مصائب کے وقت میں صبر و صلوٰۃ کا سہارا لو، ''مدد حاصل کرو صبر و صلوٰۃ کے ساتھ''، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا معنی آپ پڑھتے رہتے ہیں: ''حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ'' ایسی چیز جو نفس کو ناگوار گزرے اُس کے اوپر اپنے نفس کو پابند کرنا، آگے پھر اس کے تین شعبے بن جاتے ہیں۔ نفس کا رجحان ہوتا ہے معاصی کی طرف، گناہوں کی طرف، لذات اور شہوات کی طرف، اور وہاں سے رکنا نفس کو ناگوار ہے، تو ان لذات و شہوات سے، معاصی سے، ذنوب سے اپنے نفس کو روک کے رکھنا یہ بھی صبر ہے، اِس کو صبر عن المعاصی کہتے ہیں۔ طاعات کا کرنا، نیکی کرنا، مجاہدہ و ریاضت نفس کو ناگوار ہوتا ہے، اس ناگوار چیز کے اوپر نفس کو پابند کرنا بھی صبر ہے، اس کو صبر علی الطاعات کہتے ہیں۔ اور جس وقت طبیعت کے خلاف کوئی واقعہ پیش آ جائے جس کو ہم اپنی زبان میں مصیبت کہتے ہیں، اس وقت نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ واویلا کیا جائے، شکوہ شکایت کی جائے، شور مچایا جائے، اِس کیفیت سے اپنے نفس کو روک کر رکھنا اور اُس مصیبت کو برداشت کرنا، کہ شکوہ شکایت کی نوبت نہ آئے، زیادہ چیخنے چلانے کی نوبت نہ آئے، اِس کو صبر علی المصیبت کہتے ہیں۔ صبر کا لفظ ان سب چیزوں کو شامل ہے، اصل

یہ ہوا کہ صبر انسان کے قلب میں ایک کیفیت ہے، یہ اخلاقِ باطنہ میں سے ایک خلق ہے، اور اس کا نتیجہ ہے برداشت، ثابت قدمی اور استقلال۔ اور وہ خلق جس وقت انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے بہت سارے معاملات آسان ہو جاتے ہیں، اگر انسان کے اندر وہ خلق پیدا ہو جائے تو گناہوں سے بچنا آسان، نیکی کرنا آسان، اور اسی طرح سے مصیبتوں کا سہار بھی انسان کی طبیعت میں پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ صبر کی کیفیت حاصل کر کے سہارا لو، اور مشکلات کے مقابلے میں اس کیفیت سے مدد لو، اور نماز صبر کا ایک اعلیٰ فرد ہے، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، جن کو یہ خلق حاصل ہو جاتا ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہو جاتی ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ: لَا تَقُوْلُوْا: مت کہو، یہ نہی کا صیغہ ہے، نہ کہو ان لوگوں کے متعلق، من یقتل مخاطب نہیں ہے، یہ مطلب نہیں کہ ان لوگوں کو خطاب کر کے نہ کہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نہ کہو اُن لوگوں کے متعلق جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں، کیا نہ کہو؟ اَمْوَاتٌ: ھُمْ اموات یہ جملہ ہو کر لَا تَقُوْلُوْا کا مقولہ ہے، لا تقولوا ھُمْ اَمْوَاتٌ یہ نہ کہا کرو کہ وہ مردہ ہیں، نہ کہا کرو ان لوگوں کے متعلق جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں کہ وہ مردہ ہیں۔ بَلْ اَحْیَآءٌ: وہ مردہ نہیں بلکہ ھُمْ اَحْیاء: وہ زندہ ہیں۔ اموات میّت کی جمع، اور احیاء حیٌّ کی جمع۔ وَّ لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: لیکن تم شعور نہیں رکھتے اُن کی زندگی کا، اور شعور کہتے ہیں اس علم کو جو حواسِ ظاہرہ کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، جیسے آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھا، کان کے ساتھ سن لیا، ہاتھ کے ساتھ چھو لیا، یہ حواسِ ظاہرہ کے ساتھ جو معلومات حاصل کی جاتی ہیں اس کو شعور کہتے ہیں، تو وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان کی زندگی کو اپنے حواسِ ظاہرہ کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے۔ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ: البتہ ضرور آزمائش کریں گے ہم تمہاری کچھ خوف کے ذریعے سے، اور کچھ بھوک کے ذریعے سے، اور کچھ اموال اور انفس کے گھٹانے کے ذریعے سے، اور ثمرات کے گھٹانے کے ذریعے سے۔ نَقْص: گھٹانا۔ اموال مال کی جمع، اَنْفُس نفس کی جمع، اور ثمرات ثَمَرَۃ کی جمع، میوہ جات، پھل فروٹ۔ ضرور آزمائش کریں گے ہم تمہاری کچھ خوف و جوع کے ذریعے سے، اور کچھ مالوں جانوں اور پھلوں کے گھٹانے کے ذریعے سے۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ: اور آپ بشارت دے دیں صبر کرنے والوں کو، اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ: صبر کرنے والے وہ لوگ ہیں کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے قَالُوْٓا: وہ کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ: بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں، وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ: اور بیشک ہم اسی کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ: صلوات صلوٰۃ کی جمع ہے، صلوٰۃ رحمت کے معنی میں ہے، اور آگے رحمۃ کا لفظ علیحدہ بھی آ رہا ہے، وہ مفرد ہے، اور صلوات جمع ہے، ''یہی لوگ ہیں کہ ان کے اوپر خصوصی خصوصی رحمتیں ہیں ان کے رَبّ کی طرف سے اور عمومی رحمت ہے'' یعنی ایک رحمت تو ہو گئی جو صبر کے خُلق کی وجہ سے سب پر عام ہے جو بھی صبر کرنے والے ہیں، لیکن پھر صبر کے اندر درجات ہیں، ان درجات کے اعتبار سے ہر ایک کے اوپر خصوصی خصوصی رحمتیں ہیں، رحمتِ عامہ تو سب کو شامل ہے جو بھی صبر کرنے والے ہیں، پھر اپنی اپنی کیفیات کی کمی بیشی کے اعتبار سے ان کے اوپر خصوصی خصوصی رحمتیں بھی ہیں، ''اُن کے اوپر خاص خاص رحمتیں ہیں ان کے رب کی جانب سے اور عمومی رحمت ہے'' وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ: اور یہی لوگ سیدھی راہ پانے والے ہیں۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ: بیشک صفا اور مروہ، یہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ: شعائر شعیرہ کی جمع، شعیرہ علامت کو کہتے ہیں، اللہ کی علامات میں سے ہیں، اللہ کے دین کی علامات

میں سے ہیں، فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ: پس جوشخص کرے حج کرے بیت اللہ کا، اَوِ اعْتَمَرَ: یا عمرہ کرے، فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا: اس پر کوئی گناہ نہیں کہ اِن دونوں کے درمیان گھومے، اِن کا طواف کرے۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا: اور جوشخص بھی کوئی بھلا کام خوشی کے ساتھ کرے، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ قدر دان ہے اور جاننے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی: بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم نے اتاری، مَاۤ اَنْزَلْنَا کا بیان ہے بینات وہدیٰ، واضح واضح باتیں، جو اپنی ذات کے اعتبار سے واضح ہیں اور ان میں راہنمائی کی حیثیت ہے۔ ''جو بینات وھدیٰ ہم نے اتاریں جو لوگ اُن کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لئے واضح کردیا کتاب میں''، اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ: اور بھی بہت سارے لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا: مگر جو لوگ توبہ کرلیں، وَاَصْلَحُوْا: اور اپنے احوال کو درست کرلیں، وَبَیَّنُوْا: اس کا عطف اَصْلَحُوْا پر عطف تفسیری ہے، اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ جو باتیں چھپائی تھیں ان کو ظاہر کردیں، بَیَّنُوْا: ظاہر کردیں، فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ میں اِن پر متوجہ ہوتا ہوں، اِن کی توبہ قبول کرتا ہوں، وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ: اور میں تو بہت متوجہ ہونے والا، بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ مرگئے اس حال میں کہ وہ کافر ہیں، یعنی اُن کو موت کفر کی حالت میں آگئی، اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ: یہی لوگ ہیں کہ اِن پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور لوگوں کی، سب کی لعنت ہے، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: اُس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، لعنت میں ہمیشہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، کیونکہ عذاب لعنت کا اثر ہے، لعنت کا لفظی مفہوم ہے اللہ کی رحمت سے دور کردینا، جب وہ اللہ کی رحمت سے دور ہوگئے تو عذاب میں مبتلا ہوگئے ''ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُس میں'' لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ: نہ اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا، وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ: اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے، وَاِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ رحمٰن ورحیم ہے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رکوع میں ذکر کردہ مضامین

تحویلِ قبلہ کا مسئلہ پچھلے دو رکوع میں ذکر کیا گیا، جس کے ضمن میں آپ کے سامنے یہ بات آئی کہ اس مسئلے میں یہود کی طرف سے بہت پروپیگنڈا ہوا، اور مختلف قسم کے طعن وتشنیع کے ذریعہ سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی گی، ایسے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں، یہود کی طرف سے جو طعن وتشنیع کا سلسلہ جاری تھا اس کے نتیجے میں کبھی یہ نوبت بھی آسکتی تھی کہ ہاتھ اٹھانا پڑ جائے اور اِن کے خلاف جہاد کی نوبت آجائے، اور اُس جہاد کے اندر لوگ شہید بھی ہوسکتے ہیں، اس لیے آگے شہداء کی فضیلت مذکور ہے، شہید بھی صبر کرنے والوں میں سے ایک اعلیٰ فرد ہے، اس لئے صبر کی تلقین کرنے کے بعد صبر فی القتال کی

فضیلت ذکر کردی تاکہ جہاد کی جرأت ہوجائے اور انسان یہ نہ سمجھے کہ جہاد میں جانا تو اپنی زندگی ختم کرنے والی بات ہے، یہ سوچ کر حوصلہ پست نہ ہو۔ اور پھر عمومی واقعات کو جو لوگ برداشت کرتے ہیں اور اُس کے اندر صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی آگے فضیلت ہوگی۔ اور پھر کعبۃ اللہ کے ساتھ جیسے قبلہ کا مسئلہ متعلق ہے کہ ادھر منہ کرکے نماز پڑھی جاتی ہے، اسی طرح وہاں حج بھی ادا کیا جاتا ہے جیسے آیۃ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا (سورۂ بقرہ: ۱۲۸) میں آیا تھا کہ ہمارے مناسک ہمیں دکھا جہاں حج ادا کیا جاتا ہے، تو اس کے متعلق یہ دو پہاڑیاں صفا اور مروہ جو کہ بیت اللہ کے متصل ہیں یہ مناسکِ حج ہیں یعنی حج کے ادا کرنے کی جگہیں ہیں، اور ان کے بارے میں بعض لوگوں کے درمیان کچھ شبہات تھے جن کو یہاں زائل کیا گیا ہے۔ اور آخری آیات میں یہود جو کتمانِ حق کرتے تھے باوجود اس بات کہ اُن کے سامنے سرورِ کائنات ﷺ کی علامات واضح تھیں، اور اسی طرح تبدیل وتحویلِ قبلہ کے متعلق بھی اُن کو علم تھا، لیکن ان باتوں کو وہ لوگوں کے سامنے چھپاتے تھے، خود گمراہ ہوتے تھے اور دوسروں کو گمراہ کرتے تھے، ایسے علم کو چھپانے والوں اور کتمانِ حق کرنے والوں کے متعلق وعید اگلی آیات کے اندر ذکر کی گئی ہے۔ اور پھر یہود ونصاریٰ کا قصہ ختم ہوجانے کے بعد اگلے رکوع میں مشرکین مکہ کے لئے توحید کی تلقین اور توحید کا مسئلہ شروع ہوجائے گا، اور شرک کی تردید ہوجائے گی۔ یہ ہے خلاصہ اِن آیات کا جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں۔

مشکلات میں صبر اور نماز کی تلقین

پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اہلِ ایمان کو صبر کی تلقین کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی خلافِ طبیعت واقعہ پیش آجائے، زندگی میں کوئی مشکل پیش آئے، تو اپنے اِس خُلق سے مدد لو، دل کے اندر سہارنے کا اور برداشت کرنے کا خلق پیدا کرو، جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے گی تو مشکلات کا سہارنا، نیکی کا کرنا اور برائی کا چھوڑنا تمہارے لیے آسان ہوجائے گا۔ جیسے کہ صبر کے معنی کی تفصیل آپ کے سامنے عرض کردی گئی۔ اور اسی طرح نماز سے سہارا لو، نماز بھی ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ مشغول ہونے کے سبب سے بہت ساری مشکلات حل ہوجاتی ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق ذکر کیا گیا: ''اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَى الصَّلٰوةِ''[1] او کما قال، کہ جب بھی حضور ﷺ کو کوئی مشکل معاملہ پیش آجاتا تھا، کوئی پریشان کُن امر پیش آجاتا تھا، تو آپ ﷺ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہوتے تھے، نماز پڑھتے تھے، نماز کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ اُس مشکل کو حل کردیتے۔

مشکلات کے حل کے لئے نماز مؤثر بالخاصہ ہے

باقی! نماز کی وجہ سے مشکل کیسے حل ہوجاتی ہے؟ اِس کا جاننا ضروری نہیں، بعض بعض چیزوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تاثیر رکھی ہے اگرچہ اُن دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہ آئے، جیسے بعض بعض ادویات ایسی ہیں، مفسرین یہاں مثال دیتے ہوئے ذکر کرتے ہیں، کہ ایک پتھر ہے جس کو فرنگی دانہ کہتے ہیں، اس کا ہاتھ کے اندر پکڑنا دردِ گردہ کے لئے مفید ہے، یہ عموماً انگوٹھیوں کے اندر نگینے کے طور پر لوگ لگائے ہوئے ہوتے ہیں کہ بدن کے ساتھ متصل رہے تو دردِ گردہ کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اب اس پتھر کا

---

(۱) تفسیر طبری سورۃ بقرۃ آیت ۴۵ کے تحت/معجم الصحابہ لابن قانع ۱۸۹/۲ /الثقات لابن حبان ۱۶۸/۸۔ وعام تفاسیر۔ نیز دیکھیں ابوداؤد ۱۸۷/۱۔

بدن کے ساتھ متصل ہونا اور اس کا درد گردہ کے لئے مفید ہونا تجربے کے ساتھ ثابت ہے، اگر چہ اس کی کوئی علمی دلیل نہ دی جاسکے۔ اس کا تو خیر آپ کو مشاہدہ نہیں ہے، یا واسطہ نہیں پڑا ہوگا، یہ تو آپ حضرات نے دیکھا ہوگا کہ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، کاغذ کو نہیں کھینچ سکتا، لکڑی کو نہیں کھینچ سکتا، ہلکے سے ہلکے تنکے کو نہیں کھینچ سکتا، لوہے کو کھینچ لیتا ہے، اب یہ واقعہ ہے، مقناطیس کے اندر یہ خاصہ موجود ہے، لیکن اسکی وجہ علمی دلیل کے طور پر نہیں بیان کی جاسکتی، کہ کیا بات ہے، یہ کیوں کھینچتا ہے، اس کو کہتے ہیں کہ یہ تاثیر بالخاصہ ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت کوئی زلزلہ آنے والا ہوتا ہے تو زلزلہ آنے سے ایک لمحہ پہلے مقناطیس کی وہ مقناطیسی قوت ختم ہوجاتی ہے، اب ان واقعات میں جوڑ ہے، تجربے سے ثابت ہے، بارہا تجربے سے ثابت ہے، لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ نہیں بتائی جاسکتی، بس اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے ساتھ اِن کے اندر ایک کیفیت ہے جس کے یہ آثار ہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے کے ساتھ روحانی تسکین کا حاصل ہونا، اور زندگی کی مشکلات کا حل ہونا، مشکل سے مشکل امر کے اندر سہارا مل جانا، یہ چیز تجربے سے ثابت ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے تعلیم فرمانے کے ساتھ، اور دوسرے اولیاء اللہ کے تجربے کے ساتھ، اور آپ خود بھی اس کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ باقی! اس کی وجہ، کہ ایسا کیوں ہوجاتا ہے؟ یہ بتانی ضروری نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عمل کے اندر یہ خاصیت رکھی ہے، کہ اس کے ساتھ قلب کو سکون بھی آتا ہے، اور زندگی کی مشکلات پر اس کے ذریعے سے قابو بھی پایا جاتا ہے، اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ پریشانی کے زائل کرنے کا یہ ایسا نسخہ ہے جس کو آپ مؤثر بالخاصہ کہہ سکتے ہیں، اس کی خاصیت ایسی ہے جو تجربے کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے بیان کرنے کے ساتھ، سرورِ کائنات ﷺ کے وضاحت کرنے کے ساتھ ہمارے سامنے آگئی، اگر چہ اِن دونوں باتوں کے درمیان ہمیں جوڑ معلوم نہ ہو۔

ہماری نمازیں مشکلات کے حل کا ذریعہ کیوں نہیں بنتیں؟

باقی! ہماری نمازیں اگر ہماری مشکلات کے حل کرنے کا باعث نہیں بنتیں، تو بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ہماری نمازیں دوائے کہنہ کی طرح ہیں جن کے اثرات زائل ہوجاتے ہیں۔ خشوع، خضوع، اللہ کی طرف توجہ، اس کے حقوق اور آداب کی رعایت جتنی رکھی جائے گی اتنے اِس میں اثرات زیادہ ہوں گے۔ ورنہ اگر خشوع وخضوع کی رعایت نہ رکھی جائے اور اس کے حقوق وآداب کی رعایت نہ رکھی جائے تو پھر ایک صورت بن جائے گی، آپ جانتے ہیں کہ جس وقت تک کسی صورت کے اندر اس کی حقیقت نہ پائی جائے اس وقت تک اس صورت پر احکام مرتب نہیں ہوا کرتے۔ مثلاً شیر کی ایک صورت بنا کر رکھ لی جائے ربڑ کی، بالکل ہو بہو شیر جیسا ہو، لیکن ایک چوہیا، بلکہ چوہیا کا بھی بچہ اس کو کتر کے رکھ دے گا اور اس کے اندر سوراخ کردے گا، شیر اس چوہیا کے بچے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، چوہیا کا بچہ اس پر غالب آجائے گا، کیونکہ چوہیا کے بچے کی اگر شکل چوہیا جیسی ہے تو اس میں چوہے کی حقیقت بھی موجود ہے، اور شیر جو آپ نے بنایا ہے اس کی شکل تو شیر جیسی ہے لیکن اس میں حقیقت شیر کی نہیں ہے، تو ایسا شیر جس میں شیر کی حقیقت موجود نہیں وہ ایسی چوہیا کا مقابلہ نہیں کرسکتا جس میں حقیقت موجود ہے۔ اس لیے وزن ہمیشہ حقیقت کا ہوتا ہے، صورت کا نہیں ہوتا، آثار ہمیشہ حقیقت پر مرتب ہوا کرتے ہیں، صورت پر مرتب نہیں ہوا کرتے۔ تو ہماری نمازوں میں

اگر چہ صورت نماز والی ہے لیکن خشوع وخضوع نہ ہونے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر نماز والی حقیقت موجود نہیں ہے۔ تو جتنا اللہ تعالیٰ کیساتھ آپ اپنا تعلق قائم کریں گے، خصوصیت کیساتھ نماز کی صورت میں، اتنا ہی دل کو قوت حاصل ہوگی اور زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کی ہمت پیدا ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یہ صبر کا ایک ثمرہ بتادیا کہ جو شخص صابر بن جائے اُس تفصیل کے تحت جو آپ کے سامنے عرض کردی گئی کہ صبر عن المعاصی، صبر علی الطاعات، صبر علی المصیبۃ، حاصل سب کا یہ ہے کہ قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جائے جس کو برداشت کی کیفیت کہہ سکتے ہیں، استقلال اور مستقل مزاجی کی کیفیت کہہ سکتے ہیں، جب یہ کیفیت انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی معیت نصیب ہو جاتی ہے، جب اللہ کی معیت نصیب ہو جائے تو پھر آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں کتنی مشکلات ہیں جن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ تو صبر وصلوٰۃ کے ساتھ استعانت کا ذکر ہوا، سہارا لینے کا ذکر ہوا، مدد طلب کرنے کا ذکر ہوا، کہ ان دونوں کو اپناؤ گے تو مشکلات پر قابو پانا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا۔

شہداء کو نہ مُردہ کہو نہ مُردہ سمجھو

آگے صابرین کا ایک فرد، جو اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے، اللہ کے نام کی سربلندی کے لئے جہاد کرتے ہیں، اور لڑائی جیسی سخت چیز پر صبر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ جان بھی دے دیتے ہیں، ان کی فضیلت مذکور ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ: هُمْ اموات یہ جملہ بن کر لَا تَقُوْلُوْا کا مقولہ ہے، جو اللہ کے راستے میں قتل کردیے جائیں ان کو نہ کہا کرو کہ وہ مردہ ہیں، یہاں تو قول کی ممانعت آئی ہے، اور سورۂ آلِ عمران میں آیت آئے گی لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (آیت:۱۶۹) لَا تَحْسَبَنَّ نہی مؤکد ہے، ہرگز نہ سمجھو ان لوگوں کو، ہرگز گمان نہ کرو ان لوگوں کے جو اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے ہیں اموات، ان کے متعلق اموات ہونے کا خیال اپنے دل میں نہ لاؤ۔ یہاں آ گیا کہ کہو نہیں، اور وہاں آ گیا کہ دل میں خیال نہ لاؤ کہ وہ مردہ ہیں۔ بَلْ اَحْيَآءٌ: بلکہ وہ زندہ ہیں۔ وہاں بھی اُن کے متعلق یہی کہا گیا کہ وہ زندہ ہیں، یہاں بھی اُن کے متعلق یہی کہا گیا کہ زندہ ہیں۔

انبیاء اور شہداء کو زِندہ کہنا قرآن وحدیث کے الفاظ کے زیادہ موافق ہے

بات کو ذرا صاف طور پر سمجھ لیجئے...... اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوا کہ شہداء کے متعلق، اور علماء کی صراحت سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اس فضیلت میں شہداء سے بھی فوق ہیں، اُن کا مقام اونچا ہے، اور حدیث شریف کے اندر انبیاء علیہم السلام کے متعلق بھی ایسے لفظ آئے ہیں "اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ"(۱) جیسے احیاء کا لفظ یہاں شہداء کے لئے بولا گیا، انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی اَحیاء کا لفظ حدیث شریف میں بولا گیا، اور یہاں ان کے لئے عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ کا لفظ بولا گیا تو انبیاء کے لئے بھی حدیث شریف میں

---

(۱) مسند ابی یعلیٰ ج۶ ص ۱۴۷، رقم ۳۴۲۵، تحت عنوان: ثابت البنانی عن انس۔

"یُرْزَقُونَ"(۱) کا لفظ بولا گیا، قرآنِ کریم کی ان آیات کی طرف اور حدیث شریف کی اِن روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم یوں ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ کہیں کہ یہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں، اُن کا قول اور اُن کا مسلک قرآن وحدیث کے ظاہر کے زیادہ مطابق ہے، اور جنہوں نے یہ دعویٰ لیا ہوا ہو کہ یہ مردہ ہیں زندہ نہیں، اُن کا یہ دعویٰ قرآنِ کریم کی آیات اور روایات کے ظاہر کے زیادہ خلاف ہے۔ اتنی بات تو واضح ہوگی یا نہیں؟ (جی)۔ جو یہ کہتا ہے کہ یہ زندہ ہیں ان کا یہ قول قرآنِ کریم کے اور روایات کے اوفق بالالفاظ ہے، الفاظ کے زیادہ موافق ہے۔ اور جو کہتا ہے کہ زندہ نہیں، ان کا یہ قول قرآنِ کریم کے اور روایات کے الفاظ کے زیادہ خلاف ہے۔

انبیاء اور شہداء کی طرف موت کی نسبت کرنا جائز ہے

باقی رہی یہ بات، کہ کیا اِن کو مردہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اور مَاتَ الشَّهِيد کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ مَاتَ النَّبِيُّ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ مسئلہ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اَلشَّهِيدُ مَيِّتٌ، اَلنَّبِيُّ مَيِّتٌ کہہ سکتے ہیں، اس لیے یہاں جو ممانعت ہے لَا تَقُولُوا هُمْ اَمْوَاتٌ، یا وہاں جو ممانعت ہے لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا، دونوں جگہ مراد یہ ہے کہ باقی مردوں کی طرح یہ مردہ نہیں، باقی مردوں کی طرح ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ اِن کی موت میں اور اُن کی موت میں فرق ہے، اور برزخ کی زندگی کے اندر جا کر دوسروں لوگوں کی موت موت ہے اور اِن کی موت حیات کہلاتی ہے، دوسرے مردوں کی طرح انہیں مردہ نہ کہو، کہ جس طرح سے عام لوگ مرجاتے ہیں ویسے یہ بھی مرگئے، جس طرح سے عام لوگوں کو موت آجاتی ہے ان کو بھی موت آگئی، ایسے نہ کہو۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ شہید کے اوپر موت کا ورود ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے اوپر موت کا ورود ہوتا ہے، موت کے ورود سے کسی کو انکار نہیں ہے، موت کی جو بھی کیفیت ہے وہ طاری ہوتی ہے، شہید پر بھی ہوتی ہے، نبی پر ہوتی ہے، لیکن عام لوگوں کی طرح نہیں۔ اس لیے عام لوگوں کی موت کو اگر موت کہا جائے، تو شہداء اور اور انبیاء کی موت حیات ہے، اِس کو حیات سے تعبیر کیا جائے گا۔

موت کیا ہے؟

باقی اِن دونوں باتوں کے درمیان میں فرق کیا ہوا؟ کہ باقی مردہ ہیں، مرنے کے بعد بھی ان کو مردہ کہہ سکتے ہیں، لیکن اُن کی طرح انبیاء علیہم السلام کو اور شہداء کو مردہ نہیں کہا جاسکتا، اس کی کچھ تفصیل ہے، اصل بات یہ ہے کہ جس وقت انسان پر موت طاری ہوجاتی ہے، جو بھی موت کی کیفیت ہے، تو موت کے طاری ہوجانے کے بعد بدن اور روح کا یہ اتصال (یہ تعلق جو اِس وقت ہم لیے بیٹھے ہیں کہ ہماری روح ہمارے بدن کے اندر تدبیر کرتی ہے جس کی بناء پر ہماری آنکھ دیکھتی ہے، ہمارا کان سنتا ہے، ہمارا معدہ ہضم کرتا ہے، اور ساری کی ساری نقل وحرکت خون کی جاری ہے، اور یہ ہمارا جسد خاکی پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک کچھ نہ کچھ حرکات اور کیفیات رکھتا ہے) روح کا یہ تعلق توڑ دیا جاتا ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ ۱/۱۱۸ باب ذکر وفاتہ ودفنہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

رُوح پر موت نہیں آتی

اس تعلق کے ٹوٹ جانے کے بعد روح چاہے کافر کی ہو چاہے مؤمن کی ہو، روح زندہ ہے، کسی کی روح پر موت نہیں آئی، اور روحیں اللہ کی پیدا کردہ ہیں، اس اعتبار سے وہ حادث ہیں، محدَث ہیں، ان کے اندر حدوث ہے، وہ قدیم نہیں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں، لیکن پیدا ہوجانے کے بعد پھر روح کو موت نہیں ہے، آگے اِس کو دوام ہے، اور دوام بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، کہ اگر چاہے تو فنا کردے، لیکن اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اب آئندہ ان کو فنا نہیں آئے گی، اس لیے موت روح پر نہیں آتی، روح زندہ ہے، یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سورۂ الم سجدۃ:۱۱) ملک الموت تمہیں وصول کرکے لے جاتا ہے، یہ روح ہے جس کو ملک الموت نے وصول کرلیا، اور وہ اپنی جگہ محفوظ کرلی گئی، چاہے کسی اچھے مقام میں، چاہے کسی برے مقام میں۔ موت روح کو نہیں آیا کرتی، روح ہر کسی کی زندہ ہے، چاہے وہ کافر ہو چاہے وہ مسلمان ہو، چاہے وہ نبی ہے چاہے غیر نبی ہے، چاہے ولی ہے چاہے کوئی فاسق ہے چاہے کوئی فاجر ہے، روح ہر کسی کی زندہ ہے، اس لیے یہ بحث کرنا کہ فلاں کی روح زندہ ہے، فلاں کی روح زندہ نہیں، یہ خروج عن المبحث ہے۔ روح ہر کسی کی زندہ ہے، روح کو موت نہیں آتی، کافر کی بھی زندہ ہے اور مؤمن کی بھی زندہ ہے، روحیں فنا نہیں ہوتیں، روحیں باقی ہیں، کافر کی بھی باقی ہے مؤمن کی بھی باقی ہے، نبی، غیر نبی، ولی، غیر ولی، صالح، غیر صالح، فاسق فاجر جو بھی ہو، روح کو فنا نہیں ہے، روح کی فنائیت کا عقیدہ مشرکین کا عقیدہ تھا جس کی قرآنِ کریم کے اندر جابجا تردید کی گئی ہے۔

بدن کے ساتھ تعلق ہر کسی کی رُوح کا ہوتا ہے

روح زندہ ہے، اور زندہ ہونے کے بعد اس بات پر بھی اہل حق کا اجماع ہے کہ اِس روح کا برزخ میں اپنے بدن کے ساتھ اتنا سا تعلق کہ جس کے ساتھ برزخ کے اندر اس کو راحت یا تکلیف کا احساس ہو، یہ بھی ہر کسی کا ہوتا ہے۔ برزخ میں کافر کو عذاب ہوگا، اور اہل سنت والجماعت کا راجح قول یہی ہے کہ جسد خاکی کو عذاب ہوتا ہے، یہ ذرات جہاں بھی بکھرے ہوئے ہوں وہاں اللہ کی طرف سے عذاب ہوتا ہے، اور روح جہاں بھی رہے اس سے بحث نہیں ہے، لوٹ کر بدن میں آجائے، یا سجین میں ہو، کہیں بھی ہو، اس کا بدن کے ساتھ اتنا سا تعلق قائم ہوتا ہے جس کے ذریعے سے اس کو عذاب کا احساس ہوتا ہے، اور اگر وہ مؤمن کا بدن ہے تو اس کے ذرات جہاں بھی بکھرے ہوئے ہوں، اِس قبر کے اندر مجتمع ہوں تو اِس روح کا تعلق اتنا سا یہاں ہوگا کہ اس کو راحت کا احساس ہوگا، اور اگر ذرات کہیں بکھرے ہوئے ہوں گے، پرندوں کے پیٹ میں چلے گئے، مچھلیوں کے پیٹ میں چلے گئے، راکھ بن کر یا خاک بن کر ہوا میں اڑ گئے، لیکن اللہ کے علم سے باہر نہیں ہیں، جہاں جہاں بھی اس کے ذرات ہوں گے وہاں وہاں اتنا سا تعلق روح کا ہوتا ہے جس کی بناء پر اس کو راحت کا احساس ہوتا ہے۔ تو برزخ کے اندر مرنے والے کے لئے راحت اور عذاب اہل حق کا مجمع علیہ عقیدہ ہے، جو شخص انکار کرے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے نہ راحت ہے نہ عذاب، بلکہ راحت وعذاب کا سلسلہ قیامت کے بعد شروع ہوگا، گویا کہ وہ کلیۃً ثواب وعذابِ برزخ کا انکار کرتا ہے، اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایسا شخص کافر ہے، عقائد کی کتابوں کے اندر یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے۔

شہداء کی زندگی شعور میں نہیں آسکتی

تو یہ تعلق ہر کسی کا ہوتا ہے، لیکن اِس تعلق کے باوجود ہم کافروں کو کہیں گے کہ یہ مردہ ہیں، برزخ میں زندہ نہیں، عام لوگوں کے متعلق کہیں گے کہ یہ مردہ ہیں زندہ نہیں، لیکن شہداء کو کہیں گے کہ زندہ ہیں، انبیاء کو کہیں گے کہ زندہ ہیں، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ بھی شہداء کے حکم میں ہیں، صالحین کا جو اعلیٰ طبقہ ہے اِن کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ قبور میں زندگی دے دیتا ہے۔ پھر اس زندگی کا کیا مطلب؟ یہ زندگی کس قسم کی ہے؟ اجمالاً آپ نے اتنا جان لیا کہ یہ زندگی عام مردوں کی حیات سے فوق اور زیادہ ہے، اور اُس زندگی کا ہم شعور نہیں کر سکتے، شعور کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ عالم بدل گیا، وہ اِس جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو گئے، اس لیے اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم اپنی اِن مادی آنکھوں کیساتھ ان کی زندگی کا احساس نہیں کر سکتے کہ یہ زندہ ہیں، جب ہم دیکھیں گے تو جیسے باقی مردے پڑے ہوئے ہیں ویسے وہ مردہ پڑا ہوا ہے، ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا، شعور کا یہ معنی ہے کہ ہم ان کو اپنے حواسِ ظاہرہ کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کی زندگی کس طرح کی ہے۔

شہداء کی زندگی معلوم ہونے کے دو ذریعے

باقی! جب ہم اپنے حواس کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتے تو معلوم کس طرح سے ہوگی؟ تو تفسیر مظہری کے اندر قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بَلْ بِالْوَحْيِ اَوِ الْفِرَاسَةِ الصحيحةِ الْمُقْتَبَسَةِ مِنَ الْوَحْيِ کہ اُس حیات کا جاننا یا تو وحی کے ذریعے سے ہوگا کہ وحی بتادے کہ وہ زندہ ہیں اور کیسے زندہ ہیں، یا فراستِ صحیحہ جو وحی سے مقتبس ہوتی ہے، کہ وحی کی اتباع کرتے کرتے انسان کے دل دماغ میں کچھ اس قسم کا نور پیدا ہو جاتا ہے جس کے ساتھ مغیبات منکشف ہونے لگ جاتی ہیں، آپ قبر کے پاس جائیں گے آپ کو وہاں کچھ معلوم نہیں ہوگا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اگر کسی کے باطن کو روشن کر دے اور اس کو فراستِ صحیحہ حاصل ہو جائے وہ اِسی قبر کے پاس جا کر دیکھ لے گا کہ اِس کو عذاب ہو رہا ہے یا ثواب ہو رہا ہے، اور یہ کس کیفیت میں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا

صحیح مسلم میں آتا ہے (اور کل پرسوں ہماری مسلم شریف کے سبق میں گزرا ہے) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ المعراج میں تشریف لے جا رہے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزر ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔[1] یہ حدیث صحیح ہے، حضور فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا ان کی قبر ایک سُرخ سے ٹیلے کے پاس ہے، راستے سے ذرا سی ہٹی ہوئی، اور فرماتے ہیں کہ اگر میں وہاں ہوں تو تمہیں دکھاؤں، میں نے دیکھا کہ وہ قبر کے اندر نماز پڑھ رہے تھے۔ اب عام لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا پتہ نہیں ہے، یہود کو بھی معلوم نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو دیکھ لیا کہ موسیٰ علیہ السلام قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ تو ایک نمونہ میں نے آپ کو دکھایا ہے، ورنہ حدیث شریف کی کتاب میں باب اثبات عذاب القبر پڑھیں گے تو یہ باب سارا بھرا ہوا ہے اِس قسم کے واقعات کے ساتھ، کہ باہر اس روئے زمین پر ہوتے

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۶۸ باب فضائل موسیٰ علیہ السلام۔

ہوئے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بعض حضرات کو احساس ہو جاتا ہے کہ قبر میں کیا ہو رہا ہے۔ بہر حال فراست صحیحہ متعینہ کے ساتھ یہ بات معلوم ہوتی ہے۔

شہداء کے اجسام محفوظ رہنے پر واقعات

پھر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رزق پاتے ہیں، اور روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بدن زمین میں محفوظ رہتا ہے، مٹی اس کو نہیں کھا سکتی، انبیاء ﷩ کے اجساد بھی اسی طرح سے محفوظ ہوتے ہیں، مٹی ان کو نہیں کھا سکتی، اس حیات کا ایک یہ اثر بھی ہوتا ہے۔ باقی اگر کسی شہید کا بدن آپ کو ریزہ ریزہ نظر آئے کہ وہ کھایا گیا، اس کے بارے میں بات اصل میں یہ ہوا کرتی ہے کہ آپ اس کو شہید سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ نیت میں فتور ہونے کی بناء پر یا کسی اور گڑبڑ کی بناء پر وہ اللہ کے نزدیک شہید نہ ہو، ہمارے پاس کونسی دلیل ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ واقعی شہید ہے اور اس کو شہید کی فضیلت حاصل ہوگئی۔ اور اگر اس کا شہید ہونا نص قطعی سے ثابت ہو، جیسے شہدائے بدر ہیں، شہدائے اُحد ہیں، ان کی شہادت نص قطعی سے ثابت ہے، اِن کی قبریں اگر کھولی جائیں اور ان کے جسد اگر محفوظ نہ نکلیں بالفرض! ''بالفرض'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بالکل صحیح واقعات جو تفسیروں میں لکھے ہوئے ہیں، تاریخ کے اندر لکھے ہوئے ہیں، تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، وہ یہ ہیں کہ چالیس پچاس سال کے بعد کسی ضرورت کی بناء پر اگر کسی شہید کی قبر کھولی گئی تو لاش بالکل تر و تازہ نکلی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں (واقعہ اُحد کے چالیس پینتالیس سال بعد) وہاں سے نہر کھدوائی تھی اور اس نہر کے اندر بعض شہداء کی قبریں آتی تھیں، تو آپ نے اعلان کیا کہ وہاں جن جن کی اموات کی قبریں ہیں وہ اپنی ان اموات کو نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیں، اس ضرورت کے تحت وہ قبریں کھولی گئیں، تو کہتے ہیں کہ بدن بالکل تر و تازہ نکلے، بلکہ ایک کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا یہاں ہاتھ رکھا ہوا تھا، جب دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے اس کو اٹھایا گیا تو یہ ہاتھ اپنی جگہ سے ہل گیا، اور نیچے زخم تھا، زخم سے خون ٹپکنے لگ گیا، یہ واقعات تفاسیر میں لکھے ہوئے ہیں (مظہری، آل عمران: ۱۶۹ کے تحت)۔

اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مزار جبل رماۃ کے پہلو میں ہے، اور وہ مقبرے کی شکل ابھی تک باقی ہے، لیکن وہاں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نکال لیا گیا ہے، اور یہ نکالا گیا ہے تقریباً ترکوں زمانے میں، کیونکہ وہاں جگہ پست ہونے کی وجہ سے بارش ہونے کے بعد پانی جمع رہتا تھا، تو سیلاب کی وجہ سے قبر خراب ہو رہی تھی، اب وہاں سے نکال کر ان کو دوسری جگہ دفن کیا گیا کئی سو سال کے بعد، کہتے ہیں جس وقت ان کو وہاں سے نکالا گیا تو اسی طرح تر و تازہ نکلے جیسے دفن کیے گئے تھے، وہ بات بھی اتنی منقح ہو کر رسالوں میں نہیں آئی، وہاں جا کر دیکھیں تو معلوم ہو، یہ مقبروں کے نقشے جو آیا کرتے ہیں وہ اگر ہوں تو میں آپ کو دکھاؤں، اس میں بھی نشان موجود ہے اس مقبرے کا جہاں سے ان کو نکال لیا گیا اور دوسری جگہ دفن کیا گیا۔

اور ایک واقعہ اِسی صدی (۱۹۳۲ء) میں عراق میں پیش آیا، تمام اخباروں میں چھپا، ہزار ہا انسانوں نے دیکھا، یہ تقریباً آج سے کوئی پینتیس چالیس سال پہلے کی بات ہے، وہ تاریخ میرے پاس لکھی ہوئی ہے، رسالوں کے اندر یہاں ہندوستان میں بھی

چھپا، ''صدق لکھنو'' نے چھاپا، وہاں سے دوسرے رسالوں نے لیا، عراق کے اندر واقعہ پیش آیا، ہزارہا انسانوں نے دیکھا، کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ دونوں کی قبریں وہاں ایک قبرستان میں تھیں، اور وہ دجلہ کے کنارے تھا، تو دجلہ کے اندر سیلاب کی صورت بن جانے کی وجہ سے ان قبروں کو آہستہ آہستہ نقصان پہنچتا گیا، حتی کہ سیلاب یہاں تک پہنچ گیا، قریب تھا کہ ان کی قبروں میں داخل ہوجائے، عراق کے بادشاہ کو خواب آتا ہے، یہ حضرات اس کو خواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں سیلاب سے نقصان پہنچنے والا ہے، اس لیے ہمیں یہاں سے نکال کر اور دوسری جگہ دفن کردو۔ ایک دن خواب دیکھا اس نے اعتبار نہیں کیا، دوسرے دن خواب دیکھا، تیسرے دن خواب دیکھا، پھر مجھے کچھ یاد ایسے ہی پڑتا ہے کہ جو وہاں کا قاضی القضاۃ تھا اس کو بھی خواب آیا، اور پھر جس وقت بادشاہ نے اظہار کیا، اظہار کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بھی خواب دیکھا ہے تو پھر وہ سمجھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہے، تو ارادہ کرلیا گیا کہ ان قبروں کو کھول لیا جائے، اعلان ہوگیا، اعلان ہونے کے بعد کہتے ہیں اس نظارے کو دیکھنے کے لئے دوسرے ملکوں سے بھی لوگ پہنچے کہ صحابہ کی قبریں کھولی جائیں گی، جمعہ پڑھنے کے بعد ان قبروں کو کھولا گیا، کہتے ہیں کہ دونوں کے دونوں حضرات کی لاشیں بالکل محفوظ نکلیں، داڑھی کے بال اسی طرح سے سفید تھے، اور جیسے دفن کیے گئے تھے ویسے کے ویسے تھے، ہزارہا لوگوں نے ان کی زیارت کی، زیارت کرنے کے بعد ان کو دوبارہ اچھا نیا کفن دے کر دوسری جگہ دفن کردیا گیا۔ یہ اِسی صدی کا واقعہ ہے، یعنی اُن کی وفات کے کم از کم یوں سمجھو کہ تیرہ سو سال کے بعد۔

اور بالاکوٹ کے شہداء کے متعلق وہاں کے لوگوں سے جا کر پوچھ لو، اگر کہیں کوئی بنیاد کھودتے ہوئے، کہیں کوئی کھدائی کرتے ہوئے، کسی جگہ بھی کوئی شہید کی قبر کی نکل آتی ہے تو آج تک لاشیں صحیح نکلتی ہیں، وہاں جا کر اُن لوگوں سے واقعات سن لو۔

اگر کسی شہید کا جسم محفوظ نہ ہو تو یہ قابلِ اِشکال نہیں

لیکن اِس کے باوجود اگر کسی جگہ کوئی قبر کھولی جائے اور وہ شہید وہاں محفوظ نظر نہ آئے اور اس کی شہادت قطعی ہو، جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ نے بتادیا کہ یہ شہید ہے، شہدائے بدر ہوگئے، شہدائے اُحد ہوگئے، اگر کسی کی لاش محفوظ نہ نکلے تو اُس میں بھی کوئی اِشکال کی بات نہیں ہے، کیوں؟ کہ بسا اوقات زمین کے اندر مٹی کے اجزاء کے علاوہ دوسرے اجزاء اس قسم کے شامل ہوتے ہیں جو انسان کے بدن کو نقصان پہنچاتے ہیں، مثال کے طور پر ایک قطعی طور پر شہید ہے، اگر چاقو کے ساتھ آپ اس کے بدن کو کاٹنا چاہیں گے اور ریزہ ریزہ کرنا چاہیں گے تو ہوجائے گا، لوہا اس کے اوپر اثر انداز ہے، جیسے نبی کی دنیوی زندگی کے اندر اس کو زخمی کیا جاسکتا ہے اور یہ چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں، اسی طرح اگر کوئی کسی شہید کے شہید ہوجانے کے بعد اس کی لاش کو نکال کر آگ میں جلادے تو وہ ریزہ ریزہ ہوکر اڑ جائے گی، یہ دوسری چیزیں اثر انداز ہوجاتی ہیں، اس لیے اجزائے ارضیہ اثر انداز نہیں ہوتے، اگر ان میں اور کسی چیز کی ملاوٹ ہوجائے، جیسے شوریلا پن آگیا، یا نوشادر کی ملاوٹ زیادہ ہوگئی، کوئی اِس قسم کی دوسری چیزیں ہوں، تو ایسے وقت میں لاش کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ اگر اس کی شہادت قطعی ہے اور اس کا بدن محفوظ نہ نکلے تو کوئی ایسی ہی

بات ہوگی جس کی وجہ سے اس لاش کو نقصان پہنچ گیا، ورنہ واقعات تواتر کے ساتھ اس کو ثابت کرتے ہیں کہ شہداء کی لاشیں اپنی قبروں کے اندر محفوظ رہتی ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ کے بارے میں بے شمار واقعات ہیں، حفاظِ قرآن کے بارے میں بے شمار واقعات ہیں۔

دو حفاظ کا واقعہ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک قبرستان کو پانی نے بہادیا، وہاں سے ایک لاش نکلی، اور پانی کے اندر تیرنے لگ گئی، کہتے ہیں کہ اس کا کفن تک اسی طرح سے سفید تھا، اور پھر اس کے بعد ایک دوسری لاش نکلی، وہ بھی اسی طرح سے تیرتی ہوئی پاس کو چلی گئی، اس کا کفن کچھ میلا ہوگیا تھا، پہلے کا کفن بھی میلا نہیں تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر آیا تو آپ نے مراقب ہوکر اس چیز کو معلوم کرنے کی کوشش کی (اب یہ ایک مستقل بات ہے کہ مراقبے کے ساتھ کچھ اس قسم کی چیزوں کا علم حاصل ہوجاتا ہے) تو فرمانے لگے یہ دونوں حافظوں کی لاشیں ہیں، جس کا کفن سفید نکلا یہ اکثر باوضو پڑھتا تھا، اور جس کا کفن کچھ میلا ہوچکا تھا یہ بے وضو قرآن پڑھ لیا کرتا تھا، یعنی ایک تلاوت کے لئے وضو کی پابندی کرتا تھا (زبانی تلاوت بے وضو اور باوضو دونوں طرح درست ہے) لیکن ایک وضو کی بھی پابندی رکھتا تھا تو اس کا یہ شرف نمایاں ہوا کہ اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا، اور ایک بے وضو بھی پڑھتا رہتا تھا تو قرآنِ کریم کی برکت سے اُس کی لاش تو محفوظ تھی، لیکن کفن کچھ میلا ہوگیا تھا۔ تو اس قسم کے بے شمار واقعات آتے ہیں۔

بہر حال اُن کی روح کا تعلق ان کے بدن کے ساتھ اتنا ہوتا ہے کہ اس کے اوپر حیات کے اثرات طاری ہوجاتے ہیں، باقی! آگے درجات ہیں، اور وہ درجات اصحابِ کشف اور اصحابِ فراست اپنی فراست کیساتھ اور کشفیات کے ساتھ معلوم کرسکتے ہیں۔ باقی! یہ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں، اللہ کا ذکر بھی کرتے ہیں، ان کو روزی بھی ملتی ہے، اور اس بدن کیساتھ ان کی روح کا اتنا تعلق ہوتا ہے کہ اس کے اوپر حیات کے آثار دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاری ہوتے ہیں۔ یہ ہے اصل کے اعتبار سے اہلِ سُنّت والجماعت کا عقیدہ اور ہمارے اکابر کا مسلک۔

بدن کے عذاب وثواب کا اِنکار اہلِ سُنّت کا عقیدہ نہیں ہے

اور یہ کہنا کہ روح کا بالکل اس بدن سے تعلق ہی کوئی نہیں، روح علیین یا سجین میں ہے، وہاں اس کے اوپر کیفیات طاری ہوتی ہیں، اور اِس قبر کے اندر یہ جو جسد پڑا ہوا ہے اس میں حیات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، نہ اِس کے لئے علم ثابت، نہ اِس کے لئے سمع ثابت، نہ اِس کے لئے کوئی دوسری راحت اور عذاب اور اَلم ثابت، یہ بات اہلِ سُنّت والجماعت میں سے خصوصیت کے ساتھ اکابرینِ دیوبند کے عقیدے کے خلاف ہے۔ اگرچہ ایک قول ہے کہ صرف روح کو راحت وعذاب ہوتا ہے، بدن کو نہیں ہوتا، لیکن یہ بات علمائے دیوبند اور اہلِ سُنّت والجماعت کی اکثریت کے عقیدے کے خلاف ہے، ہمارے عقیدے کے مطابق جو اِنہی نصوص سے اور اِنہی روایات سے ماخوذ ہے روح کا تعلق قبر میں اس جسد کے ساتھ اتنا ہوتا ہے کہ اس تعلق کی بناء پر اُن کو معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، اس تعلق کی بناء پر وہ اعمالِ صالحہ بھی قبر کے اندر کرتے ہیں، اور اسی تعلق کی بناء پر ان کے لئے سماع بھی ثابت ہے،

اس قسم کی کیفیات کے ہم قائل ہیں، اِسی جسد کے متعلق جو قبر میں مدفون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہیں جا کر اولیاء اللہ مراقبہ کرتے ہیں، وہیں جا کر رابطہ قائم کرتے ہیں، ان کو عذاب ثواب جو کچھ ہے سارے کا سارا اِسی قبر میں، منکشف ہوتا ہے جس کو آپ مٹی کا ڈھیر کہتے ہیں، یہ ہے ہمارے اکابر کا مسلک اس سلسلے میں۔ باقی! کوئی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے، کیونکہ شعور کے ساتھ یہ چیز معلوم نہیں کی جا سکتی، کہ ہم کہیں کہ دیکھنے میں تو یوں معلوم ہوتا ہے، کیونکہ دیکھنے کے ساتھ اِن چیزوں کا پتہ نہیں چلا کرتا، اس کا تعلق دوسرے جہان کے ساتھ ہے، یا تو انسان اُس جہان میں جا کر ان کیفیات کو معلوم کر سکے گا یا روحانیت اتنی ترقی پذیر ہو کہ یہاں رہتے ہوئے عالمِ غیب کے ساتھ رابطہ قائم کیا جا سکے، تو پھر ان کیفیات کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام

اب اتنا آپ جان سکتے ہیں کہ یہ کہنا کہ زندہ ہیں یہ قرآن کریم کے زیادہ موافق ہے اور روایاتِ حدیث کے زیادہ موافق ہے، چاہے آپ زندگی کی کیفیت نہ بتا سکیں، آپ یوں کہیں کہ باقی مردہ ہیں اور یہ زندہ ہیں، یہ عنوان بہرحال اوفق بالقرآن اور اوفق بالحدیث ہے۔ اور یہ عنوان اختیار کرنا کہ زندہ نہیں، یہ قرآنِ کریم کے صراحت کے خلاف ہے، اگر تفصیل آپ نہ بھی جان سکیں، نہ بیان کر سکیں، تو قرآنِ کریم کے الفاظ سے جو عقیدہ ماخوذ ہے وہ یہی ہے کہ مردہ نہیں زندہ ہیں، تفصیل بتا سکیں یا نہ بتا سکیں، تفصیلات آپ نہ جان سکیں، نہ بیان کر سکیں، بہرحال عقیدہ جو قرآنِ کریم کے الفاظ سے ماخوذ ہے، اور حدیث اپنے ظاہر کیساتھ جس کی تائید کرتی ہے وہ عقیدہ یہی ہے کہ زندہ ہیں مردہ نہیں۔ اس لیے حیات النبی کا عقیدہ، حیاتِ شہداء کا عقیدہ، یہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے زیادہ موافق ہے، چاہے آپ اس کی کیفیت کو واضح نہ کر سکیں۔ اور یہ عقیدہ کہ وہ مر گئے، جس طرح سے دوسرے مر گئے یہ بھی مر گئے، اِس طرح سے شور مچانا، یہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے ظاہر کے خلاف ہے اور اسی طرح روایاتِ حدیث کے خلاف ہے۔ اور یہ بات پھر میں آپ کے ذہن میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ موت آئی ہے، شہداء کو بھی آئی ہے انبیاء کو بھی آئی ہے، مَاتَ النبیّ کہہ سکتے ہیں، اَلنَّبِیُّ مَیِّت کہہ سکتے ہیں، اَلشَّھِیْدُ مَیِّت کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ باقیوں کی موت کی طرح موت نہیں اور باقیوں کی طرح برزخ کے حالات نہیں، باقیوں پر حالات اس قسم کے طاری ہوں گے کہ جن کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مردہ ہیں، لیکن اِن کے اوپر برزخ کے حالات ایسے طاری ہوتے ہیں کہ ہم کہیں گے کہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ بس اتنا سادہ سا عقیدہ اگر آپ رکھیں گے تو قرآن اور حدیث کے بالکل موافق ہوگا، جس میں کوئی جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔ جب بھی اس مسئلے پر بحث ہوتی ہیں تو لوگ وہ آیتیں پڑھنی شروع کر دیتے ہیں جن میں موت کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی گئی ہے، اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (سورۂ زمر: ۳۰)، اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (سورۂ آل عمران: ۱۴۴) کہ دیکھو! مات کی ضمیر حضور ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، یہ ایسے ہی خواہ مخواہ کے جھگڑے ہیں، جہالت کے جھگڑے ہیں۔ کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ موت نہیں آئی، لیکن موت باقی لوگوں کی موت کی طرح نہیں ہے۔ میت کہہ سکتے ہیں لیکن باقی اموات کی طرح نہیں، بس یہ فرق عقیدے کے اندر رکھو، اس کے بعد کوئی جھگڑے کی بات نہیں۔ موت کا ورود ہوا ہے، میت اُن کو کہہ سکتے ہیں، مات النبیّ کا لفظ بولا جا سکتا ہے، مات الشھید کہہ

سکتے ہیں، لیکن باقی مردوں کی طرح نہیں۔ اُن کی موت دوسروں کی موت سے متفاوت، اور برزخ کے اندران کی زندگی دوسروں کی زندگی کے مقابلے میں متفاوت ہے، کہ باقیوں کی حیات اس درجے کی ہے جس پر حیات کا لفظ نہیں بولا جاتا، بلکہ یہی کہیں گے کہ برزخ کے اندر وہ مردہ ہیں، لیکن اِن کو اس قسم کی زندگی حاصل ہوگی جس کی وجہ سے ہم کہیں گے کہ باقی مردہ ہیں اور یہ زندہ ہیں، اتنا فرق اپنے ذہن میں رکھو، یہ عقیدہ قرآن اور حدیث کے عین موافق ہے، باقی! تفصیلات میں نہ آپ کو پڑنے کی اجازت، نہ آپ اِس پر قادر۔ وہ کیفیات اگر معلوم کی جاسکتی ہیں تو اصحاب کشف کچھ جانیں، اگر اُن پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ اعتماد کر سکتے ہیں، اگر اعتماد نہیں تو اُس میں کوئی ایسی بات نہیں، بہر حال اتنا فرق منصوص ہے اور اِس فرق کو نہیں مٹایا جاسکتا، کہ جب بھی ان کا حال ذکر کرو تو ایسے ذکر کرو کہ دوسروں سے ممتاز نظر آئیں۔ باقی رہا رُوح کا مسئلہ! تو رُوح ہر کسی کی زندہ ہوتی ہے، کسی کی رُوح کو موت نہیں آتی۔ یہ ہمارے مسلک کی کچھ تفصیل ہے جو میں نے عرض کردی۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: لیکن تم اس کو معلوم نہیں کر سکتے یعنی اپنے مشاعر کے ذریعے سے، اپنے حواس کے ذریعے سے تم ان کو معلوم کر نہیں سکتے، یہ چیز یا تو معلوم ہوتی ہے وحی سے یا فراستِ صحیحہ سے، فراستِ صحیحہ جو کہ وحی سے مقتبس ہوتی ہے، حاصل کی ہوئی ہوتی ہے، یعنی وحی کی اتباع کی وجہ سے انسان کے دل دماغ جو روشن ہوجاتے ہیں تو اس نورِ باطنی کے ساتھ انسان عالم غیب کی بعض چیزوں کو معلوم کر لیتا ہے، اِس کے سامنے وہ چیزیں منکشف ہوجاتی ہیں، تو اُس سے بھی بعض کیفیات معلوم ہوجاتی ہیں۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور کشفِ قبور

اِس میں پھر بڑی وسعت ہے، جس وقت آپ اپنے ہی اکابر کے واقعات پڑھیں گے، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کو ہی لے لیجئے، قریب زمانے میں گزرے ہیں، اِن کو عالم برزخ کا بہت انکشاف ہوتا تھا، اور وہ برملا کہتے تھے۔ اب ایک آدمی تو ہم جیسا ہو، اور وہ کہے کہ میں نے یوں دیکھ لیا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ڈینگیں مارتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، خواہ مخواہ اس کو بڑیں مارنے کی عادت ہے، لیکن جن کے متعلق آپ کا اور آپ کے بڑوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوگ غلط بیانی نہیں کرتے، اِن کے صدق پر، اِن کی دیانت پر، اور اِن کی امانت پر اعتماد ہے، وہ اگر اس قسم کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں تو پھر اِس عقیدت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کہیں کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں، اگرچہ ان کا یہ فرمانا کوئی نص نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی شخص انکار کرے گا تو ہم اس کو کافر نہیں کہیں گے، لیکن جن کی عقیدت ہے، جن کی محبت ہے، جن کے نزدیک یہ لوگ حق بیان کرنے والے ہیں، حق کہنے والے ہیں، وہ تو اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے کانوں کے ساتھ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، یہیں ملتان میں ان کی تقریر تھی، اور وہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان کی زیارت کی، پہلی دفعہ ہی میں نے ان کی وہ تقریر سنی، قاسم برگ کالونی میں تقریر تھی، آج سے کوئی تقریباً ستائیس سال پہلے، ان کا بولنے کا انداز کچھ تیز تھا، ایسے ہی کسی مسئلے کو ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، کہ میں تو کہا کرتا ہوں (یہ لفظ ان کی زبان پر بہت ہوتا تھا) میں تو کہا کرتا ہوں او لاہوریو! او لاہوریو! تمہارے قبرستان میں، میانی صاحب میں (میانی صاحب بہت بڑا قبرستان ہے لاہور کا) کچھ حافظوں کی قبریں بھی ہیں اور کچھ گریجویٹوں کی قبریں بھی ہیں، تم مجھے نہ بتاؤ کہ

یہ قبر حافظ کی ہے اور یہ گریجویٹ کی ہے، اپنے طور پر تم متعین کرلو کہ یہ حافظ کی قبر ہے اور یہ گریجویٹ کی قبر ہے، اور بعد میں تم مجھے لے جاؤ اور لے جا کر وہ قبریں دکھاؤ، تو میں تمہیں اشارہ کرکے بتادوں گا کہ قبرُ ھٰذَا المقبورِ روضۃٌ مِنْ رِیاضِ الجنۃ وقبرُ ھٰذَا المقبورِ حُفرۃٌ مِن حُفرِ النِّیْرَانِ، کہتے ہیں: میرا امتحان کرو، تجربہ کرو، اپنے طور پر تم متعین کرلو کہ یہ حافظ کی قبر ہے اور یہ گریجویٹ کی قبر ہے، بعد میں مجھے لے جاؤ، میں تمہیں بتادوں گا کہ اِس مرنے والے کی قبر روضۃ من ریاض الجنۃ ہے، اور اِس مرنے والے کی قبر حفرۃ من حفر النیران ہے۔ اتنی بات اسٹیج کے اُوپر برملا چیلنج کے ساتھ وہ کہتے تھے، اور یہ شخص وہ ہے کہ جس کی دیانت پر ہمیں اعتماد ہے، امانت پر اعتماد ہے، پھر وہ کہتا ہے کہ مجھے آزماؤ، میں تمہیں بتاؤں کہ حافظ کی قبر کون سی ہے اور گریجویٹ کی قبر کون سی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک نورِ باطن دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ اِس قسم کی کیفیات معلوم ہوسکتی ہیں۔

اندھوں کو چاہیے کہ بینا پر اعتماد کریں

ہم اگر اندھے ہیں اور ہمیں کچھ نظر نہیں آتا تو وہی بات ہے کہ اگر چاند خود نہ دیکھو تو دیکھنے والے پر اعتماد کرلو، خوش قسمتی یہی ہوتی ہے، اور اگر خود بھی نظر نہ آئے اور دیکھنے والوں کو کہو کہ تمہیں بھی نظر نہیں آتا، یہ بدبختی کی علامت ہے۔ اسی طرح سے قبر کی زندگی اولیاء اللہ کی، قبر کی زندگی شہداء کی، قبر کی زندگی انبیاء کی، نصوص سے تو اتنا ہی ثابت ہوا جتنا میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، باقی اصحابِ کشف جس قسم کے واقعات ہمارے سامنے ذکر کرتے ہیں، کہ ان کو انہی قبروں کے اندر اِس قسم کے حالات نظر آتے ہیں تو ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ہاں! البتہ اِن لوگوں کے ساتھ محبت کرکے یہ تمنا رکھنی چاہیے اور وہ طریقے اپنانے چاہئیں، تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس قابل کردے کہ نورِ باطن کے ساتھ کہ ہم بھی اس قسم کی چیزوں کا احساس کرنے لگ جائیں۔ اور سرے سے انکار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سعادت آپ کو کبھی نصیب نہیں ہوسکتی، اور اگر آپ اس کے مطابق اعتقاد رکھیں گے، عقیدہ رکھیں گے، اور ان اولیاء اللہ سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو اس قسم کی فراست رکھتے ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت آپ کا بھی دل دماغ روشن کردے، اور اس قسم کی چیزیں آپ کو بھی معلوم ہونے لگ جائیں، انکار کرنے والے کو کبھی یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

اپنی جان کو میدانِ جہاد میں پیش کرنے والا بھی حکماً شہید ہے

کل کے سبق میں آپ کے سامنے جو مسئلہ ذکر کیا گیا حیاتِ شہداء کا، اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ انبیاء ﷺ کو یہ حیاتِ شہداء سے بھی زیادہ اقویٰ طریقے کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، اس لیے حیاتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی جگہ مسلک برحق ہے۔ اور اولیاء اللہ، اعلیٰ درجے کے صالحین بھی فی حکم الشہداء ہوتے ہیں، اور ان کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس قسم کے کمالات اور فضائل حاصل ہوجاتے ہیں جس قسم کے روایات کے اندر شہداء کے لئے ذکر کیے گئے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "بیان القرآن" میں اس بات کی طرف اِن الفاظ کے ساتھ اشارہ فرمایا کہ شہادت اصل کے اعتبار سے ہے بذل النفس فی سبیل اللہ، کہ اللہ کے راستے میں اپنی جان کو صرف کر دیا جائے، تو اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کیے ہوئے ہے، اور جو اللہ کا حکم آتا ہے وہ اس میں اپنی جان کو کھپا دیتا ہے وہ فی حکم الشہداء ہے، چاہے اس کو میدان میں قتل ہونے کی نوبت نہ ہی آئے، اگر میدان میں ایک آدمی قتل ہو جاتا ہے تو یہ بھی ایک شرف ہے جو اس کو حاصل ہو گیا، ورنہ اگر ایک شخص اپنی جان کو کھپاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت وہ برسرِ میدان قتل نہیں ہوتا، جیسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہیں، کہ ساری زندگی جہاد میں گزار دی لیکن وفات بستر پر ہوئی، اور جس وقت مدینہ منورہ میں بیمار پڑے ہوئے تھے، مرضِ وفات میں مبتلا تھے، اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہ بار بار کہتے تھے کہ دیکھو! میرے بدن میں ایک بالشت جگہ خالی نہیں ہے جس میں تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو، لیکن میں آج گھر میں ایڑیاں رگڑ کر جان دے رہا ہوں، "فَلَا نَامَتْ اَعْيُنُ الْجُبَنَاءِ" [1] اللہ کرے کہ میرے اس حال کو دیکھ کر بزدلوں کی آنکھیں کھل جائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ میدانِ جہاد میں جانا مر جانے کا سبب ہے، اگر لڑائی کے میدان میں جانا موت کا باعث ہوتا تو میں زندہ کیسے رہتا؟ ساری زندگی تو لڑائیوں میں گزار دی، بدن کا کوئی حصہ زخمی ہونے سے باقی نہیں، لیکن موت گھر میں آ رہی ہے، اب بھی بزدلوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں؟ یعنی اپنے اس واقعے کو ذکر کر کے بزدلوں کو تنبیہ کرتے تھے، کہ میرا حال دیکھ کر بزدلوں کی آنکھیں اب تو کھل جائیں، جو اس لیے ڈرتے ہوئے میدانِ جہاد میں نہیں جاتے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں جانا موت کا سبب ہے۔ اب ایسا شخص جس نے ساری زندگی جہاد میں گزار دی اور اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے، لیکن وفات اس کی بستر پر آ رہی ہے، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اِن کا مقام شہداء سے کم ہو گا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ برسرِ میدان ان کی گردن نہیں کٹی، لیکن انہوں نے اپنے طور پر تو کمی نہیں کی اپنے آپ کو پیش کرنے میں، اسی طرح جو شخص اللہ کے راستے میں اپنی جان کھپا دیتا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آتا ہے وہاں وہ اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیتا ہے، وہ شہید فی سبیل اللہ کے قائم مقام ہے، کیونکہ بذل النفس فی سبیل اللہ اُس کی طرف سے ہو گیا، باقی آگے اللہ کی حکمت کے تحت اگر برسرِ میدان اس کی گردن نہیں کٹی تو یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے، یہ اللہ کے بس کی بات ہے۔ ٹھیک ہے کہ دنیا میں اس پر شہید والا حکم نہیں لگتا کہ "اس کو غسل نہیں دیا جائے گا، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھا جائے گا" شہداء کے یہ احکام اسی پر ہی لگتے ہیں جو دنیا کے اندر میدانِ جنگ میں شہید ہوتا ہے، یا جس کو ظلماً قتل کر دیا جائے، اُس پر یہ اَحکام لگا کرتے ہیں۔

حکمی شہداء کی مختلف صورتیں

باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہداء بہت قسم کے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا تھا کہ تم شہید کسے سمجھتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو میری اُمت کے شہید بہت تھوڑے رہ

(۱) تفسیر ابن کثیر سورۃ بقرۃ آیت ۱۴۴ کے تحت۔

جائیں گے، ''اَلْمَبْطُوْنُ شهيدٌ الغريقُ شهيدٌ الحريقُ شهيدٌ صاحبُ الْهَدْمِ شهيدٌ مَنْ قَتَلَهٗ بطنُهٗ فَهُوَ شهيدٌ صاحبُ ذاتِ الجنبِ شهيدٌ''[1] یہ آپ نے لمبی فہرست بیان کردی، کہ اگر صرف قتیل فی سبیل اللہ کو ہی شہید قرار دیا جائے تو میری اُمت کے شہداء تو بہت تھوڑے رہ جائیں گے، جو پانی میں ڈوب کر مرگیا وہ شہید ہے، جو آگ میں جل کر مرگیا وہ شہید ہے، جو کسی عمارت کے نیچے دَب کر مرگیا وہ شہید ہے، جو پیٹ کی بیماری میں مرگیا وہ شہید ہے، جو ذات الجنب کی بیماری میں فوت ہوگیا وہ شہید ہے، جو عورت وضعِ حمل کی حالت میں وفات پا جائے وہ شہید ہے، اس طرح سے آپ نے شہداء کی ایک فہرست بیان کردی، لیکن وہاں بھی حکم یہی ہے کہ آخرت میں ان لوگوں کو شہادت کا درجہ ملے گا، باقی دنیا کے اندر وہ عام موات کی طرح ہیں اور اُن پر دنیا میں شہداء کے اَحکام نہیں لگیں گے، اس لیے اِن کو غسل بھی دیا جائے گا، اور بالاتفاق اِن کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا، ہاں البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو فضیلت اور درجہ شہداء والا دے دیں گے۔ تو جیسے اِس روایت میں شہداء کے اندر تعمیم کی گئی ہے، کہ صرف قتیل فی سبیل اللہ کو شہید نہیں کہتے بلکہ اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جن کو یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، بلکہ ایک روایت میں میری نظر سے گزرا کہ جو شخص پابندی کے ساتھ ہر رات کو الم تنزیل اور سورۂ تبارک الذی پڑھتا رہے، عنداللہ اس کو بھی اس قسم کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، کہ قبر کے عذاب سے بچے گا، اور اِس قسم کی فضیلتیں اس کو بھی حاصل ہوجاتی ہیں،[2] تو اِس میں تعمیم ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کو اگر شہداء کے حکم میں رکھا جائے تو اس میں کوئی بعد نہیں ہے، بذلُ النفسِ فی سبیلِ الله اولیاء اللہ کی طرف سے بھی کامل طریقے سے ہوتا ہے، وہ اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے احکام میں کھپا دیتے ہیں، اس لیے وہ ایسے ہی ہے جس نے اپنی جان اللہ کے راستے میں قربان کردی، باقی اگر برسرِ میدان اُن کی گردن نہیں کٹی تو یہ اللہ کے اختیار میں ہے، بندے کے اختیار میں نہیں ہے، اس لیے اولیاء اللہ بھی شہداء کے حکم میں ہوتے ہیں۔

تدبیرِ عالم میں فرشتے واسطہ ہیں

پھر جس وقت انبیاء علیہم السلام کو بھی ممتاز قسم کی حیات حاصل ہے اور شہداء کو بھی حاصل ہے، اور اولیاء اللہ کو بھی حاصل ہوسکتی ہے، باقی! اللہ کے علم میں ہے کہ کس ولی کا کیا درجہ ہے، تو اِس کے مان لینے کے بعد کیا اِن حضرات کی ارواح کا دُنیا کے واقعات کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ یہ سوال یہاں ہوسکتا ہے، کہ اگر ان کی ارواح کو عام اموات کے مقابلے میں حیات زیادہ

---

(۱) مسلم ۲/ ۱۴۲، باب بیان الشهداء۔ مشکوۃ ۲/ ۳۳۱، کتاب الجهاد فصل اول۔ نوٹ: اس حدیث میں درج ذیل شہداء کو بیان کیا گیا ہے مَنْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ مَاتَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ مَاتَ فِي الطَّاعُونِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ مَاتَ فِي الْبَطْنِ فَهُوَ شَهِيدٌ۔ نیز کچھ احادیث اور بھی ملاحظہ فرمائیں: مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ (بخاری) اَلْمَبْطُونُ شَهِيدٌ وَالْمَطْعُونُ شَهِيدٌ (بخاری) وَالْغَرِيقُ شَهِيدٌ (مسلم) اَلشَّهَادَةُ سَبْعٌ سِوَى الْقَتْلِ فِي سَبِيلِ اللهِ الْمَطْعُونُ شَهِيدٌ وَالْغَرِقُ شَهِيدٌ وَصَاحِبُ ذَاتِ الْجَنْبِ شَهِيدٌ وَالْمَبْطُونُ شَهِيدٌ وَصَاحِبُ الْحَرِيقِ شَهِيدٌ وَالَّذِي يَمُوتُ تَحْتَ الْهَدْمِ شَهِيدٌ وَالْمَرْأَةُ تَمُوتُ بِجُمْعٍ شَهِيدٌ (ابوداؤد) مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ (ترمذی)۔

(۲) دیکھئے مشکوۃ ۱/ ۱۸۹، کتاب فضائل القرآن کا آخر۔ عن خالد بن معدان، بحوالہ دارمی۔

حاصل ہے، اور ان کے لئے مختلف قسم کے احوال حدیث شریف میں پیش کیے گئے ہیں، تو کیا اِن ارواح کا پھر دنیا کے معاملات اور دُنیا کے واقعات کے ساتھ بھی کوئی تعلق رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ یہ بات قابلِ غور ہے۔ اس بارے میں ہمارا مسلک یہ ہے، جس کی تمہید آپ اس طرح سے سمجھ لیجئے، کہ آپ حضرات جانتے ہیں اور اس کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور کسی کے سامنے یہ بات مخفی نہیں ہے، کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہوتا ہے سب کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے، متصرِّف فی العالم اللہ کی ذات ہے، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (سورۂ یونس: ٣) یہ اللہ کی شان ہے، امر کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے، کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے سب کا اختیار اللہ کو ہے یہ بنیادی طور پر عقیدہ ہے، تدبیرِ عالم یعنی دنیا کے اندر جتنے بھی امور ہیں ان سب کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ وہی ہے، اور متصرّف فی الامور وہی ہے، بِیَدِہِ اللَّیْلُ والنھارُ: دن رات کا چکر اسی کے قبضے میں ہے، زمان ہو، مکان ہو، احوال ہوں، جواہر ہوں، اَعراض ہوں، جیسے خالق وہی ہے، اسی طرح خالق ہونے کے ساتھ آئندہ متصرف بھی وہی ہے، کسی دوسرے شخص کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تدبیر اور تصرف کا اختیار حاصل نہیں، یہ عقیدہ ہے، بنیاد اسی پر ہے، کہ اللہ خالق، اللہ مالک، جو کرے اللہ ہی کرے، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی دوسرے کا کوئی زور نہیں، کسی دوسرے کی کوئی طاقت نہیں، تمام کے تمام امور اللہ کے قبضے میں ہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی احتیاج کی بناء پر نہیں، بلکہ اپنی حکمت کے تحت اپنی اس تدبیرِ عالم میں، اِس کائنات میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کا تصرف جاری ہے، اس میں اپنی حکمت کے تحت ملائکہ کو واسطہ بنایا ہوا ہے، فرشتے اہلِ علم کی اصطلاح میں کارکنانِ قضاء وقدر کہلاتے ہیں، یہ قضاء وقدر کے کارکن ہیں، اللہ کی طرف سے جو فیصلہ ہوتا ہے اور جو تقدیر ہوتی ہے اُس کو جاری کرنے والے یہ ہیں۔ موت کون دیتا ہے؟ اللہ تعالیٰ، لیکن کس کی وساطت سے؟ عزرائیل علیہ السلام کی وساطت سے، اور یہ نسبت قرآنِ کریم میں موجود ہے یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ (سورۂ الم سجدۃ: ١١) ملک الموت تمہیں وفات دیتا ہے، تو موت اللہ کی طرف سے آئی لیکن واسطہ کون بن گیا؟ عزرائیل علیہ السلام! وحی اللہ تعالیٰ اُتارتا ہے، علومِ نبوّت اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے، لیکن واسطہ کس کو بنایا؟ جبریل علیہ السلام کو! کہ جبریل علیہ السلام کی وساطت سے وحی آئی، جو علومِ نبوّت انبیاء علیہم السلام پر اُترے اُن میں جبریل واسطہ بن گئے۔ اور عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں کہ یہ بارش اور ہوا وغیرہ کا نظام کس کے ذمے لگایا ہوا ہے؟ میکائیل علیہ السلام کے ذمے! اور اِس جہان کی توڑ پھوڑ کا محکمہ کس کے سپرد کیا ہوا ہے؟ اسرافیل علیہ السلام کے ذمے! کہ جس وقت اِس کو فناء کرنا ہوگا تو اس کو اشارہ ہو جائے گا، وہ نفخِ صور کرے گا، اور اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور ذرہ ذرہ اڑ جائے گا، اب یہ توڑنا پھوڑنا تو اللہ نے ہے، لیکن واسطہ بنا کے اس کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ اسی طرح سے حدیث شریف کے اندر تفصیل موجود ہے کہ جب ماں کے بطن میں بچہ بنتا ہے تو روح ڈالنے کے لئے فرشتہ متعین ہے، اور اُس کی تدبیر پر کہ اب نطفے سے یہ ہوگیا، یہ ہوگیا، اس طرح سے منزلیں طے کرتا ہوا جاتا ہے، جما ہوا خون بنا، گوشت بنا، ہڈیاں بنیں، یہ سب کچھ فرشتوں کی وساطت سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اعمال کا نظام ضبط کرنے کے لئے کراماً کاتبین کے ذمے لگایا ہے، اور آپ کے آگے پیچھے فرشتے پھرتے ہیں جو آپ کا کام کرتے ہیں، آپ کی حفاظت کرتے ہیں، یہ سارے کا سارا نصوص میں موجود ہے، روایاتِ صحیحہ میں موجود ہے، متفق علیہ امت کا عقیدہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان کاموں کے اندر اِن فرشتوں کو واسطہ بنایا ہوا ہے، کلیۃً اختیارات تعالیٰ کے، لیکن واسطے فرشتے بھی بنتے ہیں۔

واسطہ ہونے میں فرشتوں کی حیثیت

اب یہ فرشتے واسطہ جو بنتے ہیں تو اِن کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہے جیسے ایک قاصد کی ہوتی ہے، بلاتشبیہ سمجھانے کے لئے میں عرض کروں، جس طرح سے حاکم اعلیٰ کے دروازے پر ایک خادم کھڑا ہوتا ہے، کہ جو حاکم اعلیٰ کا حکم آجائے اس نے وہی کام آگے جاکر کرنا ہے، ایک انچ نہ اِدھر ہوسکتا ہے نہ اُدھر ہوسکتا ہے، جو حکم اوپر سے آئے گا اس نے اسی کی تکمیل کرنی ہے، جیسے جاہل لوگ کہتے ہیں کہ اِن کو اختیارات حاصل ہوگئے کہ جو چاہیں کریں، ایسی بات نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آجاتا ہے اس کے مطابق یہ چلتے ہیں اور آگے پیچھے بالکل نہیں ہوسکتے، اس لیے ان کے واسطہ بننے کے باوجود بھی یہ عقیدہ برحق ہے کہ سارا تصرف اور ساری تدبیر اللہ تعالیٰ کی ہے، ان کو اپنے طور پر کوئی اختیار نہیں ہے، اس لیے اگر آپ کو بارش کی ضرورت ہے تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے، میکائیل کو آپ نہیں کہہ سکتے، اگر آپ میکائیل کو کہیں گے تو آپ کی یہ فضول حرکت ہے، اور اگر آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے بارش کا اختیار اسے دے دیا ہے، جہاں چاہے برسائے، جہاں چاہے نہ برسائے، تھوڑی برسائے، زیادہ برسائے، کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں، تو آپ نے میکائیل کو اللہ کا شریک بنالیا اور یہ شرک لازم آگیا۔ اسی طرح موت وحیات اللہ کے قبضے میں ہے، تو اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تو درست ہے کہ یا اللہ! ہمیں موت سے بچالے، ہمیں لمبی زندگی عطا فرما، یہ تو صحیح ہے، کیونکہ آپ کا یہ تعلق اللہ کے ساتھ ہے، لیکن اگر آپ عزرائیل کے نام کا وظیفہ پڑھنا شروع کردیں کہ اے عزرائیل! ہماری جان نہ نکالنا، ہمیں چھوڑ دے، ہماری جان نہ نکالنا، یوں عزرائیل کے نام کا وظیفہ پڑھنا شروع کردیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ موت دینا یا نہ دینا عزرائیل کے ہاتھ میں ہے، چاہے کسی کی جان نکالے، چاہے کسی کی جان نہ نکالے، اگر آپ نے یہ عقیدہ بنالیا تو عزرائیل علیہ السلام کو آپ نے اللہ کا شریک بنالیا۔ یا ظاہری طور پر مثال یوں سمجھئے، کہ یہاں آپ اپنے گھر سے دُور بیٹھے ہیں، کبھی کبھی ڈاکیا آتا ہے، کسی کے لئے منی آرڈر لاتا ہے، پیسے لاتا ہے اور آپ کو دے جاتا ہے، جس وقت اس کی وساطت سے آپ کو پیسے پہنچتے ہیں تو آپ کا اس وقت کیا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ پیسے کس نے بھیجے؟ آپ کا یہی خیال ہوتا ہے کہ آپ کے بھائی نے بھیجے ہیں، ماں باپ نے بھیجے ہیں، آپ کے گھر سے آئے ہیں، اور یہ تو نوکر ہے، اگر پیچھے سے آگئے تو ممکن ہی نہیں کہ نہ پہنچا کے جائے، اور اگر پیچھے سے نہیں آئے تو ممکن نہیں کہ یہ آپ کو پیسے دے جائے، اب کوئی جاہل اس قسم کا ہو کہ وہ ڈاکیے کو ہی سجدے شروع کردے، اور کبھی اس کو پانچ پیسے کی شیرینی دے دے، کبھی اِس کو چائے کی پیالی دے دے، اور کہے کہ کل کو میرے لیے منی آرڈر ضرور لانا، مجھے پچاس روپے کی ضرورت ہے کل کو میرا منی آرڈر آجائے، یہ لے چائے کی پیالی، یہ لے پانچ پیسے، میرے لیے منی آرڈر لا دینا، تو آپ اِس کو جہالت کہیں گے، کہ اس کے کیا اختیار میں ہے کہ آپ کو پیسے لا کے دے دے؟ پیچھے سے آگئے تو اس کا باپ بھی نہیں روک سکتا، وہ آپ کو پہنچا کر جائے گا، اور اگر پیچھے سے نہ آئے تو آپ صبح سے لے کر شام تک اِس کو ہزار سجدے کریں، یہ آپ کو لا کر نہیں دے سکتا۔ تو جیسے یہاں آپ سمجھتے ہیں، فرشتوں کی حیثیت بالکل اللہ تعالیٰ کے نظام میں ایسے ہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیز تجویز ہوگئی وہ آپ کو پہنچائیں گے، اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں آئی وہ یہ نہیں دے سکتے، چاہے آپ ان کی آوازیں لگا لگا کے، ان کو

پُکار پُکار کے، اِن کے نام کے وظیفے پڑھ پڑھ کے، اِن کے نام پہ چڑھاوے چڑھا چڑھا کے، آپ اپنا سب کچھ ختم کر لیں تو بھی یہ آپ کو ایک ذرا فائدہ نہیں پہنچا سکتے اگر اللہ کی طرف سے تجویز نہیں ہے۔ یہ ہے توحید۔ اب سرے سے انکار کر دینا کہ نہیں جی! فرشتوں کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں، فرشتے کوئی واسطہ نہیں ہیں، یہ بھی واقعہ کا انکار ہے، اور یہ کہہ دینا کہ بس جو کچھ ہیں یہ فرشتے ہی ہیں، اور جو کچھ کرتے ہیں یہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک دفعہ اِن کو اختیار دے کر فارغ ہو گیا، یہ بھی جہالت اور شرک ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو فارغ کر دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اختیارات صرف اِنہی کو ہی ہوتے ہیں۔ فرشتوں کا قضاء وقدر میں استعمال ہونا تو منصوص ہے، اِس کا تو انکار کیا نہیں جا سکتا، اگر کوئی شخص انکار کرے تو یہ کُفر ہے، اگر کوئی کہے کہ جبریل وحی نہیں لاتا، اللہ تعالیٰ علم براہِ راست بھیجتے ہیں، کوئی کہے کہ عزرائیل جان نہیں نکالتا، اللہ تعالیٰ براہِ راست نکالتے ہیں، تو یہ نصوصِ قطعیہ کا انکار کرتا ہے اور یہ کُفر ہے۔ فرشتوں تک تو یہ بات یقینی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ فرشتے بھی تو غیر اللہ ہیں، اِس لیے مجازی طور پر ان واقعات کی نسبت اِن کی طرف اگر کی جائے کہ عزرائیل موت دیتا ہے، جبریل وحی اُتارتا ہے، میکائیل بارش برساتا ہے، تو سبب بننے کے طور پر یہ نسبت قابلِ گوارا ہے اور برداشت کی جا سکتی ہے، یہ واقع کے مطابق ہے، اور یہ نسبتیں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بھی کی ہیں۔

انبیاء واولیاء کی اَرواح کا تدبیرِ عالم میں واسطہ بننا ممکن ہے، اور یہ عقیدہ شرک نہیں

اب اگلا سوال! کہ فرشتوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی ارواح کو، یا شہداء کی ارواح کو، یا اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی اِس تدبیرِ عالم کے اندر استعمال کرتا ہے یا نہیں کرتا، جیسے فرشتوں کے ذمے کچھ کام لگا دیے ہیں اسی طرح انبیاء ﷺ میں سے کسی نبی کی روح کے ذمے کوئی کام لگا دے، یا اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی روح کے ذمے یہ کام لگا دے، اور شہداء میں سے کسی شہید کی روح کے ذمے یہ کام لگا دے، تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟۔ اس بارے میں پہلی بات تو بنیادی طور پر آپ ذہن میں یہ رکھیے کہ اس کا ذکر نصوص میں نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی شخص انکار کرے کہ ان ارواح کو تدبیرِ عالم میں استعمال نہیں کیا جاتا، فرشتے تو استعمال ہوتے ہیں لیکن اِن ارواح کو استعمال نہیں کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح کے ذمے یا کسی ولی کی روح کے ذمے تدبیرِ عالم میں سے کوئی کام نہیں لگاتے بلکہ سارے کے سارے کام فرشتوں کی وساطت سے ہی ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص یوں کہتا ہے اور اولیاء اللہ کے اس شعبے کے اندر لگنے کا انکار کرتا ہے تو یہ کُفر نہیں ہے، کیونکہ یہ نہ تو قرآنِ کریم کی کسی آیت کا ترجمہ ہے، نہ ہی کسی صحیح حدیث کا ترجمہ ہے، اس لیے اگر کوئی انکار کرتا ہے تو یہ کوئی کفر نہیں، انکار کرنے کی گنجائش ہے۔ اس انکار کرنے کی صورت میں اگر مشکلات پیش آئیں گی اور رکاوٹ پیش آئے گی تو اسی وقت ہی پیش آئے گی جس وقت آپ اپنے اکابر کی اور اولیائے اُمت کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیں گے، وہاں پھر جگہ بجگہ آپ کو روڑے اٹکتے ہوئے نظر آئیں گے کہ پھر ہم یہ کیا کریں؟ یہ کیا کریں؟ اِس واقعہ کا کیا جواب ہے؟ اس کا کیا جواب ہے؟ اِس کا کیا جواب ہے؟ لیکن بہر حال کُفر وشرک سے یہ بات نکل گئی، انکار کرنا کوئی کُفر نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کے اندر یہ بات نص کے طور پر نہیں آئی ہوئی، اسی طرح حدیث شریف میں بھی یہ بات واضح طور پر نہیں آئی

ہوئی، لہٰذا اِس انکار کی ہم گنجائش تصور کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی ارواح کو، یا اولیاء کی ارواح کو، یا شہداء کی ارواح کو نظامِ عالم کے اندر اسی طرح استعمال کر لیتے ہیں جیسے ملائکہ کو استعمال کرتے ہیں، جو پوزیشن ملائکہ کی ہے وہی پوزیشن اِن ارواح کی ہے، جیسے فرشتے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو نافذ کرتے ہیں اور ان فیصلوں کے نافذ کرنے کا واسطہ بنتے ہیں اسی طرح اروحِ انبیاء یا ارواحِ اولیاء یا ارواحِ شہداء بھی واسطہ بنتی ہیں، تو یہ عقیدہ شرک نہیں، کیونکہ جو حیثیت فرشتوں کی وہی حیثیت اِن کی، اس لیے اگر ایسا کہہ دیا جائے تو یہ شرک نہیں ہے، کیونکہ شریک تو عزرائیل کو بھی نہیں بنایا جاسکتا، شریک تو میکائیل کو بھی نہیں بنایا جاسکتا، تو جس قسم کی نسبت اُن کے لئے گوارا ہے اس قسم کی نسبت ان کے لئے بھی گوارا ہے۔ یہ تو ہو گیا اِمکان کا درجہ، کہ اگر کوئی شخص کہے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی روح کے ذمے کوئی کام لگا دے، اولیاء کی روح کے ذمے کوئی کام لگا دے، شہداء کی روح کے ذمے کوئی کام لگا دے، صالحین میں سے کسی کو اس شعبے کے اندر استعمال کر لے، اگر ایسا کہے تو یہ شرک نہیں، یہ بات تو متیقن ہے، کیونکہ جیسے فرشتوں کی حیثیت ہے ویسے اِن کی ہے۔ عقیدہ وہی ہوگا کہ جو اللہ کی طرف سے طے ہوگا انہوں نے وہی کرنا ہے، بذاتِ خود اِن کو کوئی اختیار نہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوگا ویسے ہی کریں گے، اور جو اللہ کی طرف سے اشارہ نہیں ہوگا نہیں کریں گے، جتنا کسی کو ملے گا اتنا دیں گے جتنا اللہ کی طرف سے طے ہوگا، اس لیے ان کے نام کا وظیفہ پڑھنا اور اِن کو پکارنا جائز نہیں، جیسے فرشتوں کی طرف یہ نسبت بالیقین ثابت ہے لیکن ان کو پکارنا اور ان کی فریادیں کرنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے گا تو جیسے فرشتوں کے متعلق رکھے تو مشرک ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے متعلق رکھے تو بھی مشرک ہے، اور اگر عقیدہ اُس طرح سے ہو کہ جیسے فرشتوں کو اللہ استعمال کرتا ہے، باقی! اختیار پورے کے پورے اللہ تعالیٰ کے ہیں، تصرف پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کا ہے، اور تدبیر ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے، فرشتے محض ایک واسطہ بنتے ہیں، ان کا اپنا ذاتی اختیار کوئی نہیں، تو جس طرح سے یہ نسبتیں صرف گوارا ہی نہیں بلکہ منصوص ہیں، اسی طرح اگر اولیاء اللہ کے متعلق بھی کوئی عقیدہ رکھتا ہے تو یہ شرک نہیں ہے، اگر اس درجے میں کوئی عقیدہ رکھتا ہے تو شرک سے وہ نکل گیا۔

اَرواح کا واسطہ بننا واقع بھی ہے، لیکن اس کی حیثیت قطعی نہیں

لیکن اس سے اگلی بحث! کہ یہ تو ہے اِمکان کا درجہ، کہ اگر اللہ تعالیٰ استعمال کر لے تو یہ کوئی منافی نہیں ہے، ایسا عقیدہ شرک نہیں ہے، لیکن کیا اللہ تعالیٰ کرتا بھی ہے؟ کیا یہ واقعہ بھی ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو، یا اولیاء کی ارواح کو، یا شہداء کی ارواح کو فرشتوں کی طرح اس قسم کے کاموں میں لگا دیتا ہے، یہ واقعہ ہے؟، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اس کی دلیل سوائے اولیاء اللہ کے واقعات کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ واقعہ ہے، ایسا ہوتا ہے، لیکن اس کی اگر کوئی دلیل پوچھو تو دلیل اہلِ حق کے واقعات، اولیاء اللہ کے واقعات، اُن کی تحریریں، ان کے ملفوظات، ڈھیر لگے ہوئے ہیں اس معاملے میں، جس کے بعد انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہتی، اس لیے میرا مسلک یہ ہے کہ میں اس کو واقعہ تسلیم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو، اولیاء اللہ کی ارواح کو، صالحین کی ارواح کو اس قسم کی تدبیرِ عالم میں اور اس قسم کے اپنے کاموں میں جیسے فرشتوں کو استعمال کرتا ہے

اسی طرح بعض ارواح کو بھی یہ شرافت دے دیتا ہے اور ان کی وساطت سے بھی اس طرح کے کام ہوتے رہتے ہیں، لیکن اُن کی حیثیت وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام انہوں نے نافذ کرنے ہوتے ہیں، ذاتی اختیار کوئی نہیں، جیسے فرشتوں کو ذاتی اختیار کوئی نہیں اسی طرح ان کو بھی کسی قسم کا کوئی ذاتی اختیار نہیں ہے، جب ذاتی اختیار کوئی نہیں تو نہ اِن کے نام کا وظیفہ پڑھنا جائز، نہ اِن کو نذر و نیاز دینی جائز، اور نہ اِن کو آواز دینی جائز، اور نہ یہ سمجھنا جائز کہ یہی میرا کام کرسکتا ہے کوئی دوسرا نہیں کرسکتا، اس لیے مجھے اسی کے سامنے سجدے کرنے چاہئیں، اس قسم کے معاملات ذاتِ خداوندی کے ساتھ خاص ہیں، اگر کوئی شخص ملائکہ کے متعلق بھی کرنے لگ جائے (جن کی طرف یہ نسبتیں قطعی طور پر واقع ہیں) تو وہ بھی مشرک ہے، اور اگر کوئی اولیاء اللہ کے متعلق کرنے لگ جائے تو وہ بھی مشرک ہے۔ یعنی واقعہ ماننے کی صورت یہ ہے کہ فرشتوں کی طرح ان کو کارکنانِ قضاء وقدر کی صف میں مان لیا جائے، جس کو اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں یہ شرافت دینا چاہے تو دے دے، لیکن اس کے ذاتی اختیار میں کچھ نہیں ہوگا، مانگنا جب بھی ہے اللہ سے مانگنا ہے، فریاد جب کرنی ہے اللہ کے سامنے کرنی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کے لئے کسی فرشتے کو بھیج دے تو بھی گنجائش ہے، کسی ولی کی روح کو بھیج دے تو بھی گنجائش ہے، لیکن بھیجنا اللہ نے ہے، کسی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان ارواح کو بھیجتے ہیں، اور ان ارواح کا دنیا میں آنا جانا واقعات کے ساتھ ثابت ہے، لیکن اس کی حیثیت صرف واقعات کی ہے، البتہ وہ واقعات اولیاء اللہ کی کتابوں میں اور آپ کو علمائے حق کی کتابوں میں اتنی کثرت کے ساتھ ہیں کہ انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

ارواح کی آمدورفت پر حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ

نمونے کے طور پر آپ کے سامنے ایک بات عرض کردوں، یہ میں آپ کے سامنے جو میدان بنا رہا ہوں اگر آپ کے ذہن میں یہ ہوا تو پھر آپ اپنے اکابر کی سوانح پڑھیں، اپنے اکابر کے ملفوظات پڑھیں، ان بزرگوں کے حالات پڑھیں جن کے اہلِ حق ہونے پر آپ کا عقیدہ ہے، تو اُن کی کلام میں آپ کو کسی جگہ رکاوٹ نہیں پیش آئے گی، آپ اس کو جگہ بہ جگہ منطبق کرتے چلے جائیں گے، اور اگر آپ سرے سے ہی اِس بات کے منکر ہوں تو پھر جس وقت بھی آپ ان کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو قدم قدم پر آپ کو اٹکاؤ ہوگا، کہ ہم تو اس بات کو شرک سمجھتے تھے، دیکھو! انہوں نے یوں لکھا ہے، ہم تو اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں اور انہوں نے یوں لکھا ہے، تو پھر یہی حساب ہوگا کہ ان کتابوں کو چھوڑو، بس قرآن اور حدیث کو پڑھنا چاہیے، ان کتابوں کے اندر تو ایسی ویسی باتیں بھی آجاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے اکابر کے ساتھ آپ کو بنیادی طور پر کوئی عقیدت نہیں رہے گی، اور اُن کے ملفوظات اور اُن کتابوں سے آپ محروم ہوجائیں گے۔

یہ میرے ہاتھ میں "فیض الباری" ہے، سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی بخاری شریف کی تقریر، شاید سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو آپ جانتے ہوں گے، حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدر دار العلوم یہی ہوئے، اور آج ہندوستان و پاکستان میں جتنے نامور محدث آپ کے سامنے موجود ہیں سب کے سب سید انور شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، کیونکہ حضرت

شیخ الہند کا دور ختم ہو گیا ہے، حضرت شیخ الہند کا شاگرد شاید کوئی باقی ہو، ہمارے علم میں نہیں ہے، اب اگلا دور جتنا بھی ہے وہ سب سیّد انور شاہ صاحب کشمیری کا ہے، پاکستان کے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی کے شاگرد تھے، اسی طرح مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مدینہ منورہ چلے گئے تھے، انہی کی لکھی ہوئی اور جمع کی ہوئی تقریریں ہیں جو بعد میں چھپوائی گئیں، حضرت بنوری اور مولانا بدر عالم صاحب یہ دو شخص ایسے ہیں جن کی وساطت کے ساتھ سیّد انور شاہ صاحب کے علوم محفوظ ہوئے ہیں، اور ہمارے استاذ حضرت مولانا عبد الخالق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سیّد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ شاہ صاحب ایک مسئلہ لکھتے ہیں، میں آپ کے سامنے صرف بطور نمونہ کے پیش کرتا ہوں، لکھتے ہیں: وَاعْلَمْ اَنَّ التَّفْتَازَانِیَّ نَقَلَ الْاِجْمَاعَ عَلٰی عِلْمِ الْاَمْوَاتِ کہ علامہ تفتازانی نے (جو شرح عقائد اور مختصر المعانی کے مصنف ہیں) نے اموات کے علم پر اجماع نقل کیا ہے کہ اموات کو علم ہوتا ہے، وَاِنَّمَا الْخِلَافُ فِیْ سَمَاعِهِمْ (یہ تفتازانی کی عبارت ہے) اختلاف اگر ہے تو ان کے سماع کے بارے میں ہے، کہ وہ باہر کی بات کو سنتے بھی ہیں یا نہیں، وَکَذَا نَقَلَ اَنْ لَّا خِلَافَ فِیْ نَفْیِ سَائِرِ الصِّفَاتِ غَیْرِ السَّمَاعِ، اسی طرح سے تفتازانی نے نقل کیا ہے کہ علم کے علاوہ باقی صفات مُردوں کے لئے ثابت ہیں یا نہیں، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ منفی ہیں، باقی صفات ثابت نہیں ہیں، یعنی سماع مختلف فیہ، علم بالیقین ثابت، اور ان کے علاوہ باقی صفات کی نفی پر بھی اجماع ہے، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں، فَالْاِیَابُ وَالذَّهَابُ اِن مُردوں کا آنا جانا، کہ یہ کہیں آتے جاتے بھی ہیں یا نہیں، فَالْاِیَابُ وَالذَّهَابُ وَنَحْوُهُمَا مَنْفِیٌّ عَنْهُمْ رَأْسًا یہ سرے سے منفی ہے، اِس کا ثبوت نہیں ہے، علامہ تفتازانی نے یوں لکھا ہے۔ تو علم مجمع علیہ، سماع مختلف فیہ، اور علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ باقی صفات کے منفی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اس لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ کہیں آ جا بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ تو علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات تھی جو شیخ نقل کر رہے ہیں، آگے کہتے ہیں: وَنَقَلَ ابْنُ حَجَرٍ فِیْ فَتَاوَاهُ، علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ (بخاری کے شارح، صاحبِ فتح الباری) نے اپنے فتاویٰ میں یہ نقل کیا ہے، اَنَّ الْاَمْوَاتَ یَتَحَرَّکُوْنَ مِنْ مَّکَانٍ اِلٰی مَکَانٍ اَیْضًا کہ اموات ایک جگہ سے دوسری جگہ آتی جاتی بھی رہتی ہیں، وَاَنْکَرَ الْاِتِّفَاقَ فِیْهِ اور ابن حجر نے اس مسئلے پر اتفاق کا انکار کر دیا ہے، کہ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہتے ہیں کہ ایاب اور ذہاب بالاتفاق منفی ہے، ابن حجر کہتے ہیں کہ میں نہیں مانتا، اس نفی پر کوئی اتفاق نہیں ہے، بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ یہ حرکت کرتے رہتے ہیں، یہ ابن حجر کی کلام آ گئی۔ قُلْتُ: اب حضرتِ شیخ کی بھی سن لیجئے، شیخ ان دونوں جملوں کو نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ نقل کرتے ہیں: قُلْتُ کَلَامُ التَّفْتَازَانِیِّ فِیْ حَقِّ الْاَجْسَادِ دُوْنَ الْاَرْوَاحِ وَاِثْبَاتُ ابْنِ حَجَرٍ فِیْ حَقِّ الْاَرْوَاحِ فَصَحَّ الْاَمْرَانِ۔ کہتے ہیں کہ علامہ تفتازانی کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بدن جہاں پڑے ہیں پڑے ہیں، ان کو حرکت نہیں ہوتی، اور ابن حجر کا مطلب یہ ہے کہ ان کی روحیں آتی جاتی رہتی ہیں، کہتے ہیں کہ تفتازانی کے قول کو اجساد کے ساتھ لگا دیا جائے اور ابن حجر کے قول کو ارواح کے ساتھ لگا دیا جائے، فَصَحَّ الْاَمْرَانِ، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ تو اس سے کیا معلوم ہوا؟ کہ روحوں کی آمد و رفت اور حرکت ہو سکتی ہے، البتہ اجساد جہاں رکھے ہوئے ہیں وہیں ہیں، جیسے علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ ان میں کوئی آنا جانا نہیں ہوتا، ایاب و ذہاب سب منفی ہے۔[1]

---

(۱) دیکھئے فیض الباری ج ۵ ص ۱۵، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل کا آخر۔

یہ تو میں نے آپ کو صرف یہ دکھایا کہ حضرت شیخ نے یہ لکھا کہ اس قسم کی حرکت اموات کے لئے مانی جاسکتی ہے، اور اگر آپ دوسری تفاسیر اُٹھا کر دیکھیں گے، خاص طور پر تفسیر مظہری میں اس مسئلے کی تفصیل ہے، جس میں انہوں نے یہ لفظ لکھے ہیں (کیونکہ میں پوری وضاحت تو آپ کے سامنے کرنا نہیں چاہتا، اس پر تو وعظ وتقریر اور واقعات اگر شروع کروں تو علمائے دیوبند کی کتابوں سے نکال نکال کے آپ کے سامنے ڈھیر لگادوں واقعات کا، وہ تو کوئی ایسی مخفی بات نہیں ہے، میں بنیادی طور پر آپ کے ذہن میں ایک چیز ڈالنا چاہتا ہوں) ''تفسیر مظہری'' کے اندر قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے جب انہوں نے واقعات ذکر کئے تو کہتے ہیں کہ: ''قَدْ تَوَاتَرَ عَنْ كَثِيْرٍ مِنَ الْأَوْلِيَاءِ أَنَّهُمْ يَنْصُرُوْنَ أَوْلِيَاءَهُمْ وَيُدَمِّرُوْنَ أَعْدَاءَهُمْ'' بہت سارے اولیاء اللہ کی حکایات تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، تواتر کے لفظ کا زور آپ سمجھتے ہیں، یعنی اتنے لوگ ان باتوں کو بیان کرنے والے ہیں جن کے متعلق سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، تَوَاتَرَ کا معنی یہ ہوتا ہے، تواتر یہ اہل علم کی اصطلاح ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بات کو نقل کرنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا ممکن ہی نہیں، یہ سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ سارے لوگ جھوٹ بولتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی طرف سے اپنے دوستوں کی نصرت، اپنے دشمنوں کے خلاف اُن کی تدمیر، ان کو ہلاک کرنا، یہ افعال اولیاء اللہ کی طرف سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، یعنی ان کے نقل کرنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ جس کا انکار کرنا ہی ممکن نہیں، اور یہ سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ سارے جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر میں آپ کی خدمت میں بات عرض کر رہا ہوں، کہ اولیاء اللہ کی ارواح سے وفات کے بعد اس قسم کے حالات کا سامنے آنا اہل حق کی کلام میں اتنا زیادہ مذکور ہے کہ جس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اُس کی حیثیت وہی ہے جو میں نے پہلے عرض کر دی کہ جو حیثیت فرشتوں کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے میدان میں گئے کہ اللہ نے تین ہزار یا پانچ ہزار فرشتے اتار دیے، ہزار کا وعدہ، تین ہزار کا وعدہ، اور پانچ ہزار کا وعدہ قرآن میں مذکور ہے، تو اللہ تعالیٰ ملائکہ کو بھیجتے ہیں یہ تو منصوص ہے، اِس کا تو انکار کیا ہی نہیں جاسکتا، باقی! اولیاء اللہ کی ارواح کا ایسے معاملات میں آجانا واقعات کے ساتھ ثابت ہے، اور واقعات کی نوعیت جس قسم کی ہوتی ہے میں نے آپ کے سامنے ذکر کر دی، علمی دلیل کے طور امکان کے درجے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہنا کہ ''اللہ ایسا کر سکتے ہیں'' یہ شرک نہیں، اور واقع ہے یا نہیں اس کا انکار کیا جاسکتا ہے اور اختلاف کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ مسئلہ قرآن وحدیث میں منصوص نہیں ہے، لیکن اہل حق علماء اور اولیائے برحق کی کلام کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، لہٰذا واقع کے طور پر بھی ایسا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارواح کے ذمے بھی تدبیر عالم کے بعض شعبے لگا دیتے ہیں، جیسے فرشتوں کے سپرد کر دیتے ہیں اسی طرح ارواحِ اولیاء کے سپرد بھی کر دیتے ہیں، واقعات کی طرف دیکھتے ہوئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن یہ چیز کفر وایمان کا مدار نہیں، اس لیے اگر کوئی انکار کرے تو انکار بھی کفر نہیں ہے، اور اگر کوئی اقرار کرتا ہے تو یہ بھی شرک نہیں ہے، بشرطیکہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ جیسے ملائکہ ویسے یہ، نہ ملائکہ کو پکارنا جائز، نہ ان کے نام کی نذر و نیاز جائز، نہ ان کو سجدے جائز، نہ ان کے سامنے فریاد جائز، یہ سارے کے سارے کام اللہ کے ساتھ ہو سکتے ہیں، کسی اور کے ساتھ نہیں، مدد اللہ سے مانگو، پھر چاہے اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کے لئے کسی فرشتے کو بھیج دے، چاہے آپ کے بڑوں میں سے کسی بزرگ کی روح کو کہہ دے کہ جا، جا کے یہ کام کر آ، سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے،

اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو نہ بھیجے تو تم ہزار وظیفے پڑھتے رہو، کوئی آنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ تو میں اس چیز کو واقعہ تسلیم کرتا ہوں، لیکن انکار کرنے والوں کی حیثیت میرے نزدیک یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہیں گے کہ اولیاء اللہ کے واقعات اور ان کی کلام اور ان کے ملفوظات پر ان لوگوں کو اعتماد نہیں، باقی! یہ کفر و شرک کی کوئی بات نہیں ہے، نہ انکار کرنے والا کافر، اور نہ اقرار کرنے والا مشرک، بشرطیکہ عقیدہ ان کے متعلق ویسے ہی ہو جیسے کہ ملائکہ کے متعلق ہے، نہ اُن میں کسی قسم کا کوئی اختیار تسلیم کرتا ہے اور نہ اِن میں کسی قسم کا اختیار تسلیم کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت وہ حرکت کرتے ہیں اسی طرح اللہ کے حکم کے تحت یہ حرکت کر سکتے ہیں۔ اس بات کو اگر آپ اپنے ذہن میں رکھیں گے اور پھر اولیاء اللہ اور اکابر دیوبند کی کلام کا مطالعہ کریں گے تو ان شاء اللہ العزیز! آپ کو کسی جگہ کوئی اِشکال معلوم نہیں ہوگا، ورنہ اس کا انکار کرنے کی صورت میں جگہ بہ جگہ آپ کو رکاوٹیں پیش آئیں گی، کہ یہ کیا ہوگا، وہ کیا ہوگا۔

(شاید کسی سوال پر فرمایا) شہداء کے فضائل میں یہ مضمون مذکور ہے کہ اِن کی ارواح فِيْ حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ (جلالین) سبز پرندوں کے پوٹوں میں بیٹھ کر جنّت میں سیر کرتی رہتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے قندیلوں پر آ کر آرام کرتی ہیں، یہ حدیث شریف میں ہے۔ اور بھی جو اللہ تعالیٰ ان کو شرافت دیتا ہے، کرامت دیتا ہے، اس قسم کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ (پھر کسی نے اولیاء اللہ اور وہ شہداء جن پر شہید کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوتے ان کے متعلق سوال کیا تو فرمایا) ہوسکتا ہے، کیونکہ کسی کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کے نزدیک اس قسم کا اس کا مقام ہے، اور اولیاء اللہ کے اجساد بھی قبروں کے اندر محفوظ پائے جاتے ہیں یہ بھی واقعہ ہے، باقی! اس کے متعلق ضابطہ کوئی ذکر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس کا کیا مقام ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، کوئی ضابطہ اس بارے میں ذکر نہیں کیا جاسکتا، البتہ واقعات ہیں، جیسے کل ہی میں نے آپ کے سامنے ذکر کرتے ہوئے دو حافظوں کا واقعہ سنایا تھا حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کا، تو اس قسم کے واقعات پیش آسکتے ہیں، کہ اِن کے اجساد بھی محفوظ رہ جائیں اور اللہ تعالیٰ اِن کو بھی برزخ کے اندر اُسی قسم کے کمالات اور کرامات دے دے جس قسم کے شہداء کے لئے ذکر کیے گئے ہیں، لیکن اللہ کے نزدیک کون ولی ہے اور کس درجے کا ہے، کس کا کیا مقام ہے، اس کا جاننا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے، یہ اللہ کے علم میں ہے، اس لیے کسی کی قبر کھل جانے کے بعد اجساد محفوظ نہ دیکھیں تو کوئی بدگمانی کی بات نہیں، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ شہداء کے اجساد بھی کسی دوسرے سبب سے ریزہ ریزہ اور فنا ہو سکتے ہیں۔

حیاتِ خضر پر بحث اور حضرت مجدد الف ثانی کا مکاشفہ

اسی سلسلے میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق عام طور پر جو مشہور ہے کہ وہ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں، اور اسی طرح دوسرے کام اُن کی طرف منسوب ہیں، اور صوفیہ کثرت کے ساتھ کہتے رہتے ہیں کہ ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، تو یہ مسئلہ علماء میں زیر بحث ہے کہ خضر زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ متکلمین کی اکثریت ان کی وفات کے قائل ہے، اور صوفیہ کی اکثریت ان کی حیات کی قائل ہے، اور صوفیہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی زندگی کا انکار کیسے کریں جب ہم سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، تو جس شخص کا اپنا مشاہدہ ہو وہ کسی کی دلیل کو کیا کرے، بسا اوقات ہوتا ہے نا، کہ اپنے مشاہدے پہ یقین آ جاتا ہے پھر دوسرا آدمی دس دلیلیں دیتا

رہے تو دلیلوں کو کیا کریں، پھر ہم یہی کہیں گے کہ بھائی! دلیل میں تاویل کی گنجائش ہے، جب یہ ایک واقعہ ہے تو اس کو کیا کریں، اب وہ کہتے ہیں کہ جب ہم سے ملتے رہتے ہیں اور اُن سے ملاقات ہوتی رہتی ہے تو ہم کیسے کہیں کہ وہ وفات پا گئے۔ تو صوفیہ کی اکثریت کا مسلک یہ ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور ان کا آنا جانا رہتا ہے، لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ کہف کی تفسیر میں اِس بحث کو اٹھایا اور دونوں طرف کے دلائل ذکر کئے ہیں، کہ جو وفات کا قول کرتے ہیں ان کی یہ دلیل ہے، اور جو حیات کا قول کرتے ہیں ان کی یہ دلیل ہے، دونوں طرف کے دلائل نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ دلائل کے ساتھ فیصلہ مشکل ہے کہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے، یہ مسئلہ الجھا ہوا ہے، دلائل سے اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی، ہاں! کہتے ہیں: لَا يُمْكِنُ حَلُّ هٰذَا الْإِشْكَالِ إِلَّا بِكَلَامِ الْمُجَدِّدِ لِلْأَلْفِ الثَّانِي رضی اللہ عنہ، کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے ساتھ اس اشکال کو حل کیا جا سکتا ہے، کوئی اور صورت اس اشکال کو حل کرنے کی نہیں ہے۔ اب مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی کلام جو یہاں نقل کی اس کا حاصل یہ ہے، کہ جب یہ مسئلہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش ہوا کہ خضر زندہ ہیں یا وفات پا گئے، اور دلائل کے ساتھ مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آیا، تو حضرت مجدد کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف مراقبے کے اندر متوجہ ہوا، کہ مجھے اس مسئلے کا علم دے دیا جائے کہ اس مسئلے کی حقیقت کیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خضر علیہ السلام میرے پاس موجود ہیں، تو میں نے ان سے ہی پوچھ لیا کہ آپ ہی بتا دیں کہ زندہ ہیں یا وفات ہو گئی؟ آپ کے متعلق یہ جھگڑا ہے کہ آپ کو وفات ہوئی یا نہیں ہوئی؟ موت آئی یا نہیں آئی؟ تو آپ ہی بتا دیں۔ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کہنے لگے: اَنَا وَاِلْيَاسُ لَسْنَا مِنَ الْاَحْيَاءِ، میں اور الیاس زندوں میں سے نہیں ہیں، ہماری وفات ہو چکی ہے، ہمیں موت آ چکی ہے، وفات پا گئے ہیں، لٰكِنَّ اللهَ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى اَعْطٰى لِاَرْوَاحِنَا قُوَّةً نَتَجَسَّدُ بِهَا وَنَفْعَلُ بِهَا اَفْعَالَ الْاَحْيَاءِ مِنْ اِرْشَادِ الضَّالِّ وَاِغَاثَةِ الْمَلْهُوْفِ اِذَا شَاءَ اللهُ وَتَعْلِيْمِ الْعِلْمِ اللَّدُنِّيِّ وَاِعْطَاءِ النِّسْبَةِ لِمَنْ شَاءَ اللهُ تَعَالٰى، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری رُوحوں کو اتنی قوت دی ہے کہ ہم اس قوت کے ساتھ متجسد ہو جاتے ہیں، جسد اختیار کر لیتے ہیں، اور ہم زندوں والے افعال کرتے ہیں، جیسے بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھانا، اور متحیر لوگوں کی مدد کو پہنچ جانا جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے، اور اسی طرح قلوب کے اندر علم لدنی کا القاء کرنا اور اسی طرح نسبت کا عطا کرنا یہ ہماری وساطت سے ہوتا ہے، ہم یہ کام کرتے ہیں، اِذَا شَاءَ اللهُ جب اللہ چاہے، جس کے لئے اللہ چاہے۔ اب اذا شاء اللہ لمن شاء اللہ یہ ہے توحید کی حفاظت، کہ جب اللہ چاہے جس کے لئے چاہے، ہم کرتے ہیں، کوئی بھولا بھٹکا جنگل میں پھر رہا ہے اور راستہ نہیں مل رہا، تو میں جاؤں گا، جا کر اس کو سیدھے راستے لگا آؤں گا، اسی طرح کوئی آدمی کسی کام کے اندر متحیر ہے اور اس سے وہ کام نہیں ہوتا تو ہم مدد کے لئے پہنچ جائیں گے، یہ کام ہم کرتے رہتے ہیں، بس بات وہی ہے کہ اذا شاء اللہ اور لمن شاء اللہ، جب اللہ چاہے جس کے لئے چاہے۔ ہماری وفات تو ہو گئی لیکن ہماری روحوں کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی قوت دے دی ہے جس کی بناء پر ہم جسد کی صورت اختیار کر کے اِن کاموں کو کرتے رہتے ہیں۔

اب اگر آپ کا مسلک وہ نہ ہو جس کی وضاحت میں نے آپ کے سامنے کی ہے تو بتلائیے کہ اس کلامِ مجدد کو آپ کیا سمجھیں گے؟ جو بنیاد میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے اگر آپ کے ذہن کے اندر وہ باتیں نہ ہوں تو کیا حضرت مجدد کی کلام کو آپ کسی صحیح محمل پر محمول کر سکتے ہیں؟ تو شرک تو آ جائے گا، چاہے خضر علیہ السلام کی روح کو مانو، چاہے کسی دوسرے کی روح کو مانو، بات تو

ایک ہی ہے۔ تو جیسے ہمارے ان حضرات کے کشف اور مراقبے کے ساتھ حاصل کی ہوئی جو بات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا نظریہ اور ان کا عقیدہ اس بات کو برداشت کرتا ہے۔ اس لیے اِن کو نقل کرنے کے بعد (آگے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے، پھر اس میں ایک لفظ آجائے گا، پھر ممکن ہے کہ آپ چیخیں گے کہ یہ کیا کہہ دیا، وہ کہتے ہیں ''ایک قطب مدار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا معاون بنایا ہے، اور وہ قطب مدار وہ ہوتا ہے جس پر دنیا کا مدار ہے، عالم کی بقاء اسی کی برکت سے ہوتی ہے، اور آج کل وہ یمن میں ہے اور فقہ میں امام شافعی کا متبع ہے، ہم اسی کے ساتھ ہی امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھتے ہیں۔'' اب وہ قطب مدار کیا ہوتا ہے، عالم کی بقاء اس کی برکت سے کیسے ہے، آج کل کے اسٹیجی مذہب میں پھر یہ مشکلات پیش آجاتی ہیں) تو یہ نقل کرنے کے بعد قاضی صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فَبِهٰذَا الْكَشْفِ الصَّحِيْحِ اِجْتَمَعَتِ الْاَقْوَالُ وَذَهَبَ الْاِشْكَالُ: کہتے ہیں کہ اس کشفِ صحیح پر اعتماد کرلیا جائے تو سارے اقوال بھی جمع ہوگئے، جو کہتے ہیں وفات پاگئے ان کی دلیل بھی صحیح، اور جو کہتے ہیں کہ زندہ ہیں ان کی بات بھی صحیح، کہ وہ زندوں جیسے کام جو کرتے پھرتے ہیں، اس لیے کہتے ہیں اِجْتَمَعَتِ الْاَقْوَالُ وَذَهَبَ الْاِشْكَالُ والحمدُ للهِ الكبيرِ المُتَعَالِ۔

سیرت کی کتابوں میں اک باب ہے رحلت کا ناداں یہ سمجھتے ہیں کہ موت ہے ہم جیسی

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

نئے سال کی مبارک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سب سے پہلے تو اس نئے سال کی مبارک باد قبول فرمائیے، آج یکم محرم ہے، اور چودھویں صدی کے آخری سال کی آج اِبتدا ہوگئی، یعنی اب ہم ''۱۴۰۰ھ'' لکھا کریں گے، آج یکم محرم سن ۱۴۰۰ھ ہے، اور جس وقت یہ سال اِختتام کو پہنچے گا اور ۱۴۰۱ھ شروع ہوگا تو اس وقت پندرہویں صدی کی اِبتدا ہوگی۔

ماقبل سے ربط

پچھلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صبر فی القتال کا ذکر فرمایا تھا، اور اللہ کے راستے میں شہید ہونے والوں کی فضیلت بیان کی تھی، اب اگلی آیت میں دوسرے واقعات کے ساتھ جو انسان کی آزمائش ہوتی ہے اس میں صبر کرنے کی والوں کی فضیلت مذکور ہے۔

آزمائش کی مختلف اختیاری واضطراری صورتیں

ترجمہ تو ان آیات کا پہلے ہو ہی چکا ہے۔ ''البتہ ضرور آزمائیں گے ہم تمہیں'' یہ پہلے خبر دے دی، اور خبر دینے کا فائدہ یہ ہوگا کہ جس وقت یہ واقعات پیش آئیں گے اُس وقت ان کے اوپر صبر کرنا آسان ہوجائے گا، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی بتایا ہوا ہے کہ ایسے ہوگا، لہٰذا جب بھی کوئی واقعہ پیش آئے تو اس وقت انسان کی توجہ ادھر ہونی چاہیے کہ یہ اُن واقعات میں سے ہی ہے

جن کی اطلاع پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہوئی ہے، تو پھر انسان کو صبر کرنے کا حوصلہ ہوجاتا ہے، صبر کی طرف طبیعت مائل ہوجاتی ہے۔ ''کچھ خوف کے ذریعے سے'' یعنی دشمنوں کی طرف سے خوف پیش آئے گا، دشمن چھیڑ چھاڑ کریں گے، حملہ کریں گے، وَالْجُوْعِ: جوع دونوں طرح سے ہے، اختیاری بھی اور اضطراری بھی، اختیاری یہ ہے کہ جیسے ہم حکم دیں گے کہ روزہ رکھو، کھاؤ پیو نہیں، اُس میں بھی تمہیں بھوک کی تکلیف ہوگی، اس پر بھی صبر کرنا ہوگا، اور اضطراری یہ ہے کہ قحط وغیرہ آ گیا، وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ: ''مالوں کا گھٹانا'' جیسے حادثات کے ساتھ مال ضائع ہوجاتے ہیں، چوری ہوجاتے ہیں، ''اور انفس کا نقص، انفس کو گھٹانا'' جیسے موت آجاتی ہے، یا جہاد میں شمولیت کے وقت قتل ہوجاتے ہیں، ''پھلوں کا گھٹانا'' قدرتی طور پر حادثات کے ذریعے سے، یا عشر وغیرہ کے ذریعے سے ہم تم سے جو مال وصول کریں گے تو بظاہر مال میں نقص آئے گا، اور زکوٰۃ وصول کریں گے تو یہ بھی مالوں کے اندر ایک اختیاری قسم کا نقص ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ خرچ کرنے کا حکم دیں گے، اور جس وقت تم خرچ کرو گے تو بظاہر تمہیں اپنے مال گھٹتے ہوئے نظر آئیں گے، اس کے ذریعے سے بھی تمہاری آزمائش ہوگی، گویا کہ اضطراری طور پر قدرتی حادثات کے ساتھ بھی مال اور پھل کم ہوں گے، اور اسی طرح اختیاراً بھی تم سے اسلامی فرائض کے طور پر جو کچھ وصول کیا جائے گا اس میں بھی بظاہر تمہیں معلوم ہوگا کہ کمی آرہی ہے، یہ سب چیزیں انسان کے لئے باعث آزمائش ہیں اور ان کے اندر صبر مطلوب ہے، تو انسان مستقل مزاج ہوکر ان چیزوں کو برداشت کرے، اور جانوں کے گھٹنے کے متعلق بھی وہی دو صورتیں آگئیں کہ جہاد کا حکم ہوگا، جہاد پر جانا ہوگا اور وہاں موت آجائے گی، یا قدرتی طور پر جو موت آجاتی ہے۔

آزمائش میں صبر کا مظاہرہ کرنے پر انعاماتِ الٰہی

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ: ان آزمائشوں میں جو لوگ مستقل مزاج رہیں اور صبر کریں ان کو بشارت دے دیجئے، ''اور یہ وہ لوگ ہیں، یعنی صابرین وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچ جائے'' مصیبت سے مراد ہوا کرتا ہے ایسا واقعہ جو انسان کی خواہش کے خلاف پیش آجائے، کہ انسان چاہتا تھا کہ یوں ہوجائے لیکن ہوگیا اس کا الٹ، اس کو انسانی محاورے میں مصیبت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، مثلاً آپ صحت چاہتے ہیں لیکن بیماری پیش آجاتی ہے، یہ ایک مصیبت ہے، آپ اپنے اہل وعیال کا زندہ رہنا چاہتے ہیں لیکن کسی کو موت آجاتی ہے، یہ ایک مصیبت ہے، آپ مالی ترقی چاہتے ہیں لیکن زوال آجاتا ہے، تنزل ہوجاتا ہے، یہ مصیبت ہے، کاروبار کو نقصان پہنچ جاتا ہے یہ مصیبت ہے، غرضیکہ انسان کی زندگی میں جو حادثہ اس کی طبیعت کے خلاف پیش آتا ہے اس کو مصیبت کہتے ہیں۔ تو ''جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں'' یعنی زبان سے بھی کہتے ہیں اور دل سے بھی سمجھتے ہیں، قول کا تعلق زبان کے ساتھ بھی ہے اور دل کے ساتھ بھی ہے، دل سے بھی کہتے ہیں، زبان سے بھی ادا کرتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں، اور اللہ کی طرف ہی ہم لوٹنے والے ہیں، دل میں بھی وہ یہ خیال لاتے ہیں، جس وقت ان کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں، اللہ کے مملوک ہیں، تو پھر اگلی بات دل کے اندر یہ آئے گی کہ جب ہم اللہ کے مملوک ہیں تو اللہ جو چاہے تصرف کرے، ہمارے دل میں کوئی اعتراض نہیں آنا چاہے، وہ تو مالک کا تصرف اپنی مملوکہ چیز میں ہے،

ہمارا اگر بچہ فوت ہو گیا، دیا بھی اسی نے تھا، اللہ ہی کا تھا، اسی کی امانت تھی، اگر ہمارے پاس آیا اور اس نے وقت پر وصول کر لیا تو اس میں کوئی شکوے کی بات نہیں ہے، ہمارے پاس مال تھا تو اللہ کا دیا ہوا تھا، اللہ کی چیز تھی، ہمارے پاس بطور امانت کے تھا، تو اگر مالک نے لے لیا اور اس کو وصول کر لیا تو ہمارے لیے کوئی دکھ کی بات نہیں ہے، حتیٰ کہ اپنی جان اور دوسری چیزیں جو بھی ہیں جب اللہ کی عطا کردہ ہی ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی تصرف فرمائے تو اُس کو حق ہے، اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں، اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کے کسی تصرف پر کوئی اِس قسم کا احساس نہیں کرنا چاہیے جس کو ہم دکھ یا شکوہ یا شکایت سے تعبیر کریں۔ اِنَّا لِلّٰہِ کا یہ مفہوم ہوا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جب دل سے اِس مضمون کو سوچا جائے گا تو یقیناً دل کو قوت پہنچتی ہے، اور زبان سے ادا کرنا بھی دل کے اوپر مؤثر ہوتا ہے، تو دل میں بھی یہ خیال لائیں اور زبان سے بھی ادا کریں، صابرین کی شان یہ ہے۔ اور پھر ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: کہ اگر آج یہ چیز تلف ہو گئی اور اللہ کی طرف لوٹ گئی، تو آخر ہم نے کون سا ہمیشہ باقی رہنا ہے، ہم نے بھی لوٹنا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے اس صبر کا ہمیں اجر دے گا، ہمیں ثواب ملے گا، اور جو چیز ہم سے زائل ہو گئی اِس سے بہتر اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے، یہ بات بھی ایسی ہے کہ اگر انسان اس کو سوچے تو دل کو قوت پہنچتی ہے۔ ''یہی لوگ ہیں کہ جن کے اوپر خصوصی خصوصی رحمتیں بھی ہیں اُن کے رب کی جانب سے اور عمومی رحمت بھی''۔ صبر کا ایک تو عام مفہوم ہے جو ہر صابر میں ہوتا ہے، اور ایک ہیں اس میں خصوصی درجات، کہ کسی نے زیادہ کیا، کسی نے کچھ کمی رہنے دی، تو صَلَوٰتٌ میں ہوگا کہ ہر ایک صابر کے لئے علیحدہ علیحدہ اس کی شان کے مطابق اللہ کی رحمت ہوگی، اور رَحْمَةٌ کا معنی ہو گیا کہ ایک عمومی رحمت ہوگی، جیسے صبر کا عمومی معنی سب صابرین میں پایا جاتا ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ: مہتدون کا یہاں مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت تک رسائی ہو گئی، جنہوں نے حقیقت کی طرف راہ پالی، جنہوں نے اپنے عقیدے کے طور پر اس بات کو سمجھ لیا کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف ہی ہم نے واپس جانا ہے، ہم بھی اللہ کے مملوک، ہماری ساری چیزیں بھی اللہ کی مملوک، اور اس میں جو وہ تصرف کرے ہمیں برداشت کرنا چاہیے، کسی قسم کا شکوہ شکایت نہیں کرنا چاہیے، یہی لوگ ہیں راہ یافتہ، یہی ہیں جنہوں نے ہدایت پائی، یعنی حقیقت تک رسائی انہی لوگوں کی ہوئی ہے، کہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ مالک ہے، وہ جو تصرف کرے کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے، اور کوئی محسوس کرنے کی بات نہیں، تو یہاں مہتدون کا یہ معنی ہوگا کہ جو دل سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنی زبان سے بھی اس مضمون کو ادا کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو حقیقت تک پہنچ گئے، انہوں نے حقیقت کو سمجھ لیا۔

''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ'' کا شانِ نزول

آگے صفا مروہ کا ذکر آرہا ہے، ابتداء میں رکوع کی اجمالی تقریر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ اِس کا تعلق بھی کعبۃ اللہ کے ساتھ ہے، جب حج کرتے ہیں یا عمرہ کے لئے جاتے ہیں تو بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد بیت اللہ سے متصل یہ دو پہاڑیاں ہیں صفا اور مروہ، اِن کے درمیان میں سعی کرنی پڑتی ہے، یعنی دوڑنا پڑتا ہے، سات چکر لگانے پڑتے ہیں، اور یہ طریقہ بھی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہے، حضرت ہاجرہؓ نے جس طرح سے چکر کاٹے تھے اسی طرح سے اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطور یادگار کے باقی رکھا ہوا ہے، اور جو شخص بھی حج اور عمرہ کرنے کے لئے جاتا ہے اس کو اسی طرح سے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ جاہلیت میں مشرکین نے جیسے بیت اللہ کے ارد گرد بت رکھ دیے تھے اسی طرح ان پہاڑیوں پر بھی بت رکھے ہوئے تھے، جب اسلام آ گیا تو بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان پہاڑیوں کے درمیان چلنا پھرنا تو بتوں کی تعظیم کی وجہ سے تھا جو پہاڑیوں کے اوپر رکھے ہوئے تھے، تو یہ جاہلیت کا طریقہ ہے، اب اگر ہم اسی طرح سے چلیں پھریں گے تو اس میں گناہ ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کی یادگاروں میں سے ہے، اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ: صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے دین کے نشانوں میں سے ہیں۔ شعائر شعیرہ کی جمع، شعیرہ علامت کو کہتے ہیں۔

سعی بین الصفا والمروۃ کا شرعی حکم

چونکہ اُن کے دل میں خیال یہی آیا تھا کہ گناہ ہوتا ہے اس لیے ذکر کرتے ہوئے کہہ دیا گیا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ اگر تم سعی کرو، باقی اگلی بات! کہ اگر سعی نہیں کرو گے تو گناہ ہوگا یا نہیں ہوگا، اس کی وضاحت دوسری روایات کے اندر موجود ہے، کہ اگر سعی نہیں کی جائے گی تو گناہ ہوگا، اس کا کرنا ضروری ہے، احناف کے نزدیک واجب ہے، اور اگر کوئی شخص سعی نہ کرے تو واجب کے ترک پر جس طرح سے جرمانہ ہوا کرتا ہے یہاں بھی دم دینا پڑتا ہے، اور باقی ائمہ کے نزدیک فرض ہے، تو لَا جُنَاحَ سے بظاہر جو اباحت کا شبہ پڑتا ہے وہ بات نہیں ہے، شانِ نزول کی طرف دیکھتے ہوئے لَا جُنَاحَ اس لیے کہا گیا کہ لوگوں کے دل میں خیال آیا تھا کہ شاید یہ گناہ ہے، تو کہہ دیا گیا کہ سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں، باقی! کرنا ضروری ہے یا نہیں وہ دوسری روایات سے تاکید ثابت ہے، اور اس کا کرنا ضروری ہے، یہ حج اور عمرہ کے واجبات میں سے ہے، اس کے ترک پر دم آتا ہے، اور باقی ائمہ کے نزدیک فرض ہے کیونکہ ان کے ہاں واجب کا درجہ ہوتا ہی نہیں، ہم جس کو واجب کہتے ہیں وہ ان کے نزدیک فرض ہی ہوتا ہے۔
''بیشک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے دین کے علامات میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے'' فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ: اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان گھومے وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا: اور جو شخص بھی نیکی دل کی خوشی کے ساتھ کرے فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ قدردان ہے اور علم رکھنے والا ہے، ہر نیکی کرنے والے کی نیکی کی اللہ تعالیٰ قدر کیا کرتا ہے۔ یہاں پر وہ احکام ختم ہو گئے جو بیت اللہ سے تعلق رکھتے تھے۔

''اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ'' کا ماقبل کے ساتھ ربط

اور اس مسئلے میں چونکہ یہود نے سب سے زیادہ شور مچایا، حالانکہ ان کو اپنی کتاب سے یہ علم تھا کہ نبی آخر الزمان کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے اور قبلہ بدلے گا، اور آپ ﷺ کی علامات صحیح طور پر وہ جانتے تھے، لیکن کتمان کیا، حق پوشی کی، اور اس حق پوشی کے نتیجے میں لوگوں کو پریشان کیا، گمراہی میں ڈالنے کی کوشش کی، اس لیے اگلی دو تین آیتوں میں ان حق پوش علماء کی

مذمت ہے، یہی ربط ہے اِن آیات کا ماقبل کے واقعات کے ساتھ۔ ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم نے اتاری بینات وہدیٰ سے'' یعنی واضح باتیں، جن کا تعلق راہنمائی سے ہے، ہم نے وہ اتار دیں، اور لوگوں نے چھپانا شروع کر دیا، وِمِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ: بعد اس کے ہم نے وہ باتیں کتاب کے اندر واضح کر دیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا: وہ کھلی کھلی ہدایت کی باتیں جو ہم نے لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کر دیں، اور ہماری اس وضاحت کے باوجود جو لوگ اِن کو چھپاتے ہیں اُن پر اللہ کی لعنت، اور لعنت کرنے والوں کی بھی لعنت، اللاعنون کو عام ذکر کر دیا، جو بھی لعنت کرنے والے ہیں۔

علمائے سُوء اور علمائے خیر کا مصداق

جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق پوش علماء جن کو علمائے سُوء کہا جاتا ہے...... اور علمائے سوء انہیں کہا جاتا ہے جو اپنے علم کے ساتھ حق کو ثابت نہیں کرتے، حق کا اعلان نہیں کرتے، بلکہ اپنے علم کو حق کے چھپانے میں اور باطل کی حمایت میں صرف کرتے ہیں، وہ ہوتے ہیں علمائے سُوء، علمائے سُوء کا ترجمہ عام طور پر لوگ کر دیا کرتے ہیں بدکردار علماء، اور اس سے شبہ اس بات کی طرف جاتا ہے کہ شاید وہ علماء جن کے عمل میں کمزوری ہے، جو کسی اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہیں، یا معاملاتی کمزوری میں مبتلا ہیں، لوگوں کے حقوق ادا نہیں کرتے، جھوٹ بولتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں، ان کے معاملات میں یا اخلاق میں کسی قسم کا سقم ہے، یا وہ عبادات میں پوری طرح سے حصہ نہیں لیتے، عبادات میں کوتاہی کرتے ہیں، تو بدکردار علماء سے ذہن اُدھر کو جاتا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ یہ جو علماء کی تقسیم ہے کہ ایک علمائے خیر ہیں اور ایک علمائے سُوء ہیں، علمائے خیر جن کو ہم علمائے حق کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اور دوسرے علمائے سُوء ہیں، یہ تقسیم اس اعتبار سے نہیں کہ ان کا ذاتی کردار کیا ہے، خالی کردار کے اعتبار سے یہ تقسیم نہیں ہے، یہ تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ وہ اپنے علم کو استعمال کس طرح سے کرتے ہیں، اگر ایک شخص حق کا اعلان کرتا ہے، حق کی حمایت کرتا ہے، اپنے علم کو باطل کی تردید میں استعمال کرتا ہے، اور کسی سے پیسے لے کر اور کسی کے لالچ میں آ کر مسئلہ غلط نہیں بتاتا، جب بھی مسئلہ بتاتا ہے صحیح بتاتا ہے، پھر وہ اگر اپنی ذات کے اندر کچھ کوتاہی کرتا ہے، عبادات زیادہ نہیں کرتا، یا اس کے معاملات میں کوئی نقص ہے، یا اس کے اخلاق میں کوئی سقم ہے، تو اس کو علمائے سُوء میں شمار نہیں کیا جائے گا، یہ علمائے حق میں سے ہے، تو جو اپنے علم کے ساتھ حق کا اثبات کرتا ہے اور باطل کی تردید کرتا ہے، ہمیشہ مسئلہ سچا بتاتا ہے، نہ کسی سے ڈر کر مسئلہ غلط بتائے نہ کسی لالچ میں آ کر مسئلہ غلط بتائے، یہ علمائے حق کی فہرست میں شامل ہے، باقی اس کے کردار میں جو کمی ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اس کو معاف فرمادیں گے، بہر حال وہ علمائے سُوء میں شامل نہیں۔ اور جو لوگ علم حاصل کرنے کے بعد کتمانِ حق کرتے ہیں، حق کی حمایت نہیں کرتے، بلکہ اپنے علم کے زور کے ساتھ بدعات نکالتے ہیں، اور بدعات کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، گمراہی پھیلاتے ہیں، حق کی حمایت نہیں کرتے، باطل کی حمایت کرتے ہیں، تو یہ لوگ جنہوں نے اپنے علم کا استعمال غلط کیا ہے ان کو علمائے سُوء کہا جائے گا۔

علمائے خیر کی فضیلت اور علمائے سُوء کی مذمت

اور حدیث شریف کے اندر سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! بُری چیز کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا

کہ "اَلَا اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَیْرَ الْخَیْرِ خِیَارُ الْعُلَمَاءِ "(۱) کہ بہترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بہتر علمائے خیر ہیں، خیار العلماء ہیں، اور بُری چیزوں میں سے سب سے بدتر چیز شرار العلماء ہیں، یعنی علماء میں سے جو علمائے شر ہیں وہ بدترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بدتر، اور جو علمائے خیر ہیں، خیار العلماء وہ تمام بہترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بہتر ہیں، یعنی علم کی وجہ سے انسان کی پوزیشن یہ ہوگی کہ اچھا ہوگا تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا، بگڑ گیا تو پھر یہ بہت ہی زیادہ بگڑ جائے گا۔ جیسے کہ لطیف چیز کا خاصہ ہے، جس چیز کے اندر لطافت زیادہ ہوا کرتی ہے، جب وہ اچھی ہو تو بہت اچھی ہوتی ہے، اور اگر وہ سڑ جائے خراب ہوجائے، تو پھر وہ خراب بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے، جیسے روٹی ہے اگر سوکھ جائے گی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ زیادہ دیر تک اگر پڑی رہی تو سوکھنے کے بعد وہ اکڑ جائے گی، چبانی مشکل ہوجائے گی، کھانی مشکل ہوجائے گی، لیکن شیرینی اور اس قسم کی لطیف اشیاء اگر صحیح ہوں تو روٹی کے مقابلے میں لذیذ حد سے زیادہ ہوتی ہیں، لیکن اگر یہ باسی ہوجائیں اور سڑ جائیں تو پھر ان میں کیڑے پڑتے ہیں، پھر ناک نہیں دیا جاسکتا، ان میں اتنی بدبو پیدا ہوجاتی ہے، تو جو چیز لطیف زیادہ ہوا کرتی ہے، اعلیٰ ہوتی ہے، جب وہ بگڑتی ہے تو پھر بگڑتی بھی سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح جب کسی انسان کے اندر علم آجاتا ہے تو اگر اچھا ہو اور اس کا رُخ سیدھا ہو تو بہت ہی اچھا ہوگا، اور اگر اس کا رُخ غلط ہوگیا اور یہ بُرا ہوگیا تو پھر تمام بدتر چیزوں سے یہ بدترین ہوتا ہے، عالم بگڑ جانے کے بعد اس قسم کے فتنے اُٹھاتا ہے کہ ایسے وقت میں اگر شیطان فارغ ہوکر سانس لینے کے لئے بیٹھ جائے، کہ اب میرا قائم مقام آگیا، تو یہ بالکل صحیح بات ہوگی، علماء کے بگڑ جانے کے بعد ابلیس کو کسی کارروائی کی ضرورت ہی نہیں رہتی، علماء خود اتنی کارروائیاں کرلیتے ہیں کہ ابلیس بھی اُن کو جھانکتا رہ جاتا ہے، یہ علمائے سُوء وہ ہوتے ہیں کہ جو واضح واضح باتیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں وہ اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لئے، اپنے اغراض کے تحت ان کو بھی چھپاتے ہیں، لوگوں کو بتاتے نہیں ہیں، اپنے اغراض کے تحت حق فروشی کرتے ہیں، یہ ہوتے ہیں علمائے سُوء۔ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ: ایسے لوگوں کے اُوپر کائنات کا ذرہ ذرہ لعنت کرتا ہے۔ جیسے علمائے حق کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز ان کے لئے استغفار کرتی ہے اور دُعا کرتی ہے، حتیٰ کی پانی میں مچھلیاں، بلوں میں چیونٹیاں، یہ ساری کی ساری چیزیں عالمِ حق کے لئے استغفار کرتی ہیں۔(۲) تو اسی طرح بالمقابل علمائے سُوء کے لئے ساری کی ساری چیزیں بددُعا کریں گی، اُن کے اُوپر لعنت کریں گی، کیونکہ علمائے حق کا فیضان ساری کائنات کو پہنچتا ہے اور علمائے سُوء کی نحوست ساری کائنات کے اُوپر پڑتی ہے۔

توبہ کرنے والوں کے لئے رضا کا اعلان

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا: مگر جو لوگ توبہ کرلیں، توبہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پچھلی غلطی کا اقرار کرلیں کہ ہم سے غلطی ہوگئی، وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا: اور اپنے حالات کی اصلاح کرلیں۔ اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ جو حق چھپایا ہے اُس کو ظاہر کردیں، کیونکہ جب ان کی غلطی کتمانِ حق والی ہے، تو اس غلطی کا ازالہ اسی طرح ہوگا کہ حق کو ظاہر کریں، اس کتمان والے جرم سے باز آجائیں۔ بَیَّنُوْا کا اَصْلَحُوْا پر عطف تفسیری ہے، اپنے حالات کو ٹھیک کرلیں، حالات کو ٹھیک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو حق انہوں نے چھپایا ہے اس

حق کو واضح کردیں، اور یہود کے لئے اس حق کو واضح کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ برملا اقرار کریں کہ واقعی یہ پیغمبر سچے ہیں، اور ان کی علامات کتاب میں ذکر کی گئی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایمان لے آئیں، تبھی جا کر حق کا اظہار ہوگا، فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں، وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ: اور میں توبہ قبول کرنے والا ہوں، رحم کرنے والا ہوں۔

کافروں کے لئے پوری کائنات کی لعنت

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ کافر ہیں'' یعنی کُفر پر اُن کا خاتمہ ہوگیا، آخر وقت تک وہ کُفر پر قائم رہے، اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ: یہی لوگ ہیں جن کے اُوپر اللہ کی لعنت ہے، اور فرشتوں کی لعنت ہے، انسانوں کی لعنت ہے، سب کی لعنت ہے، یہ سب کے نزدیک ملعون ہیں، اور اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ اُس کو اپنی رحمت سے دُور ہٹا دے گا، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے بددُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی رحمت سے محروم کردے، جیسے اللہ کسی پر صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ خود رحمت نازل کرتا ہے، اور باقی! انسان اور فرشتے جو کسی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے، اسی طرح اللہ کی لعنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور کردیتا ہے، اور لوگوں اور فرشتوں کے لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے بددُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اپنی رحمت سے محروم کردے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: اس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اور لعنت کا اثر ہے عذابِ خداوندی کے اندر مبتلا ہوجانا، لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ: ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، جتنا عذاب اُن کو دیا جائے گا اس میں تخفیف نہیں ہوگی، وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: یہاں سے توحید کا مسئلہ شروع ہوتا ہے، اس کا تعلق اگلے رکوع کے مضمون کے ساتھ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور دن اور رات کے مختلف ہونے میں اور ان کشتیوں میں
الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
جو چلتی ہیں سمندروں میں ایسی چیز کو لے کر جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا،
مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ
پھر زندہ کیا اس پانی کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد، اور پھیلایا اس زمین میں ہر جاندار کو،

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور اُن بادلوں میں جو مسخر کیے ہوئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان،

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ

البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں ﴿۱۶۴﴾ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اختیار کرتے ہیں اللہ کے علاوہ

اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا

شرکاء، محبت کرتے ہیں اُن سے اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی طرح، اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں سخت ہوتے ہیں،

لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ

اگر سمجھ جایا کریں وہ لوگ جو ظالم ہیں جس وقت تکلیف دیکھتے ہیں کہ بیشک زور

لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ

سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب والا ہے ﴿۱۶۵﴾ جس وقت بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ

اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

جن کی اتباع کی گئی اُن لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی، اور دیکھیں گے وہ عذاب کو، تو ٹوٹ جائیں گے اُن کے آپس کے تعلقات ﴿۱۶۶﴾

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا

اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اتباع کی کاش! کہ ہمارے لیے لوٹنا ہو، پھر ہم بھی لاتعلق ہو جائیں ان سے جس طرح یہ ہم سے

مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

لاتعلق ہو گئے ہیں، اسی طرح دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں اُن کے اعمال حسرتیں ان پر، اور یہ لوگ آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے ﴿۱۶۷﴾

تفسیر (۱)

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر کیا تھا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارا معبود حقیقی، جو معبود بننے

(۱) نظر ثانی کے وقت اس حصے کی ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے خلاصۂ آیات درج نہیں کیا گیا۔

کا مستحق ہے، وہ ایک ہی ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ: وہ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، اہلِ کتاب کے ساتھ مختلف باتوں پر جو مذاکرہ شروع ہوا تھا وہ پچھلے رکوع پر ختم ہوگیا، اب آگے اس امت کو جو بنی اسماعیل میں اٹھائی جارہی ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں، اور آپ ﷺ کی امت بننے والی ہے، اب سورت کے آخری حصے میں اُن کے لئے ہدایات ہیں، اب زیادہ تر تذکرہ حضور ﷺ کی امت کا ہی آئے گا اور آپ ﷺ کے مخاطبین کا ہی آئے گا، اسرائیلیوں کے ساتھ جو گفتگو تھی وہ پچھلے رکوع پر ختم ہوگئی، اب نئی امت کے لئے ہدایات شروع ہونے والی ہیں۔

ایمان کے لئے بنیادی اینٹ عقیدۂ توحید ہے

اس کی ابتداء مسئلۂ توحید سے کی ہے، کیونکہ یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس وقت تک یہ بنیاد مضبوط نہ ہو اس وقت تک انسان آگے صحیح عقائد کا حامل نہیں ہوسکتا، سب سے پہلے جو چیز اختیار کرنی پڑتی ہے، جو ایمان کے لئے بنیادی اینٹ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وحدانیت کا عقیدہ ہے۔ اس کو پہلے تو مثبت انداز میں پیش کیا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: تمہارا مستحقِ عبادت ایک ہی ہے، اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یہ دوسرے انداز میں پیش کردیا، کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، تو نفی و اثبات کے ساتھ اس بات کو صاف کردیا گیا، کہ ایک ہے، اور کوئی نہیں۔ ایک ہے، کس اعتبار سے؟ واجب الوجود ایک ہے، اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا واجب الوجود نہیں ہے، اپنی صفات میں وہ وحدانیت رکھتا ہے، اس کی صفات میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، اس کی جو صفتیں جس حیثیت سے اس کے لئے ثابت ہیں اس طرح سے کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں رخنہ اندازی کرنا شرک ہے

ایک وقت تھا جب وہ اکیلا ہی موجود تھا، اور کوئی دوسری چیز موجود نہیں تھی، اور ایک وقت آئے گا جب سب پر فناء آجائے گی، صرف ایک ہی ہوگا جس پر فناء نہیں آئے گی، ہر لحاظ سے اُس کے لئے وحدانیت ثابت ہے، بس اللہ تعالیٰ کے متعلق پہلا عقیدہ وحدانیت کا ہے، وہ ذات میں ایک ہے، صفات میں ایک ہے، نہ اس جیسی صفتیں دوسرے کے لئے ثابت ہیں اور نہ اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک ہے، بنیادی اینٹ توحید کی یہی ہے، اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ یہی رکھنا پڑتا ہے، باقی جتنے مسائل آئیں گے سب اس کی تفصیل ہیں، کہ ایسا کوئی عقیدہ اختیار کرنا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت میں رخنہ اندازی کرے شرک ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بہر حال محفوظ رکھنا ہے، ہر لحاظ سے وہ تنہا ہے، اس کے درجے میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، نہ ذات کے اعتبار سے، نہ صفات کے اعتبار سے، نہ افعال کے اعتبار سے، نہ کسی دوسرے اعتبار سے، تو آگے جتنی بھی تفصیل آئے گی اس کا حاصل یہی ہوگا کہ ایسا عقیدہ اختیار نہ کرو جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کے اندر رخنہ اندازی کرے، یہاں صاف طور پر یہ بات کہہ دی گئی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، وہ صرف ایک ہے۔

''رحمٰن'' اور ''رحیم'' میں فرق

الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ: جب توحید کا تعارف کروایا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ کو ذکر کیا ہے، بے حد

مہربان، نہایت رحم والا ہے، الرَّحْمٰنُ میں بھی وہی رحمت، اور الرَّحِيْمُ میں بھی وہی رحمت، لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے جس طرح سے اور باتیں بیان کی جاتی ہیں اُن میں سے ایک آسان سی بات یہ ہے کہ رحمٰن میں جوشِ رحمت کی طرف اشارہ ہے اور رحیم میں دوامِ رحمت کی طرف اشارہ ہے، کہ بڑا پُر جوش رحم کرنے والا ہے، اور مسلسل رحم کرنے والا ہے، اُس کی رحمت اپنی مخلوق کے لئے جوش مارتی ہے انتہائی مہربان ہے، اور پھر تسلسل کے ساتھ رحم کرنے والا ہے، یہ نہیں کہ کسی وقت اس کی رحمت مخلوق سے منقطع ہوجاتی ہو، بلکہ اُس کا جو معاملہ بھی مخلوق کے ساتھ ہے وہ رحمت پر ہی مبنی ہے۔

قرآن میں لفظ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کو کثرت سے ذکر کرنے کی حکمتیں

آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ان دونوں ناموں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت کثرت سے ذکر کیا گیا ہے، ہماری کتاب کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے، یہاں بھی اللہ کے ساتھ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ انہی دو ناموں کا تعارف کروایا گیا ہے، اور پہلی سورت سورۂ فاتحہ میں بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو ذکر کیا گیا، اِن دو ناموں کو ذکر کرنے کی جو حقیقی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں اُن کو تو اللہ ہی جانتے ہیں، لیکن واضح طور پر ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے وحدت کا عقیدہ رکھیں گے، کہ اللہ واحد ہے، ساری کائنات میں وحدت اس کے لئے مان لی، کہ کسی درجے میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے، تو اس میں اُس کی عظمت بہت نمایاں ہے، بسا اوقات یہی انتہائی عظمت کا عقیدہ بندوں کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق ایسا تصور پیش کر دیتا ہے کہ جب وہ اتنا عظیم ہے، اتنی عظمت والا ہے، تو ہماری اُس تک رسائی کیسے ہوسکتی ہے؟ اس کو ہماری کیا ضرورت؟ ہم اس کے دربار میں کس طرح سے پیش ہو سکتے ہیں؟ ہماری وہ کیا پروا کرے گا؟ جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں، کہ بھائی! آپ تو بڑے آدمی ہوگئے ہو، اب تمہیں ہماری کیا پروا ہے؟ تو بڑائی بسا اوقات چھوٹوں سے انسان کو غافل سا کر دیتی ہے، لاتعلق سا کر دیتی ہے، لاپروا سا کر دیتی ہے، اس کو کسی کی پروا نہیں ہے، جس وقت کسی کے متعلق یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ بہت عظمت والا ہے تو پھر دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جب وہ اتنی عظمت والا ہے تو اُس کو ہماری کیا پروا، ہماری طرف اس کی کیا توجہ ہوگی، تو یہ عدمِ توجہ والا تصور انسان کے قلب میں آسکتا ہے اور یہ انسان کے قلب میں لاتعلقی پیدا کر سکتا ہے، پھر انسان اس قسم کے ذرائع تلاش کرنے کے لئے نکلتا ہے جن کے ذریعے سے اس عظیم اللہ کے ساتھ وہ ربط پیدا کر لے، اور اس عظیم اللہ کے سامنے اپنی درخواست پیش کر دے، جیسے دنیا میں ایک بہت بڑا بادشاہ ہے، اور آپ سمجھتے ہیں کہ ہم تو غریب مسکین ہیں، ہماری وہاں پر کیا رسائی ہے، وہ تو بہت بڑا آدمی ہے، اُس کے ساتھ بات کرنا ہر کسی کو میسر نہیں آتا، لہٰذا آپ اُن کے ساتھ تعلق رکھنے والے، اُن کے رشتہ دار، اُن کے وزیر، اور اُن کے مشیروں کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں، تا کہ اس عظیم بادشاہ کے سامنے تم جیسے مسکینوں کی فریاد پہنچا دی جائے، ورنہ تمہیں اُس کے محلات کے قریب بھی کون جانے دیتا ہے، اور تمہیں اندر کون گھسنے دیتا ہے، تو یہ جو عظمت کا تصور ہے بسا اوقات یہ اُس عظیم شخصیت کو چھوٹوں سے ایک علیحدگی کا تصور دیتا ہے، کہ وہ علیحدہ علیحدہ سا ہے اس لیے اُس کو اپنے چھوٹوں کی پروا کوئی نہیں، اور چھوٹے اُس کی دربار میں پہنچ بھی نہیں سکتے، اپنی درخواست کیسے پیش کر سکتے ہیں؟ تعلق پیدا

کیسے کر سکتے ہیں؟ وہاں پر اُن کی کیسے رسائی ہو سکتی ہے؟ وہ بہت بڑا اور ہم بہت چھوٹے، اور وہ بہت عظمت والا اور ہم اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ انسان کی طبیعت میں چونکہ قیاس ہے تو اس قیاس کے ذریعے سے وہ دنیوی بادشاہ پر اس بادشاہ کو قیاس کر سکتا ہے، اور ایک علیحدگی علیحدگی سی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس عظمت کے تصور کے ساتھ اُس کا خوف جلال اور رعب طاری ہو جاتا ہے، ہیبت طاری ہوتی ہے، اور ہیبت کا اثر بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اس کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کرتا، جس کے جلال سے انسان ڈرتا ہے، اور یہ بھی وہی دنیوی قیاس ہے، کہ اگر بادشاہ کے متعلق آپ کو معلوم ہو کہ بہت قاہر، بہت بڑا جابر اور بہت بڑا غضب ناک ہے، وہ تو اپنے باغیوں کو اور اپنے انکار کرنے والوں کو یوں سزائیں دیتا ہے، تو پھر کسی کو سامنے جانے کی جرأت ہی نہیں ہوتی، کہ سامنے جا کر معافی مانگ سکے، اس کا جبر اور اس کی قہاریت جب انسان کے سامنے آتی ہے تو انسان ڈرتا ہے، اور کوئی بھی سامنے جانے کی کوشش نہیں کرتا، اور اس صورت میں بھی اس سے صلح کرنے کے لئے اور اُس کو خوش کرنے کے لئے واسطے تلاش کرتا ہے، کسی کو سفارشی درمیان میں لائے گا، اُس سفارشی کو خوش کرے گا، اُس کے جا کر پاؤں دبائے گا کہ یہ میرا قصور کسی طرح سے معاف کروادو، اور میری یہ حاجت اس تک پہنچادو۔ تو یہ جلال اور رعب بھی بسا اوقات بندے کو اُس عظیم شخصیت سے دور ہٹا دیتا ہے، اور میں عرض کر رہا ہوں کہ اسی قیاس کے ذریعے سے جو انسان اپنی دنیوی زندگی میں کرتا ہے، کہ بارُعب شخصیت کے سامنے ہر کسی کو جانے کی جرأت نہیں ہوتی، وہاں بھی انسان پھر اسی طرح سے اس کے خواص کے آگے پیچھے پھرتا ہے، کہ بھائی! ہماری تو ہمت نہیں ہے کہ ہم اس سے جا کر بات کرلیں، ہم تو اُس کے سامنے جاتے ہیں تو ہمارا پتہ پانی ہوتا ہے، اس لیے تم ہی ذرا یہ بات کر دینا اور اس طرح سے کہہ دینا، تو پھر جن کو جا کر بات کرنے کی جرأت ہے، جو اُس کے خواص ہیں، اور جو جا کر اُس کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، اُن کو خوش کرنے کے لئے آپ اُن کے پاؤں بھی دبائیں گے، اُن کو تحفے بھی دیں گے، اور اُن کے گھروں کے چکر بھی لگائیں گے۔ یہ دونوں تصور ہی اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق غلط ہیں، اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ میں انہی دونوں تصوروں کا خاتمہ ہو گیا، کہ اُس کے واحد ہونے کا یہ معنی نہیں کہ وہ اتنی عظیم شخصیت ہو کر پھر وہ چھوٹوں کی پروا نہ کرے، ایسی بات نہیں، اُس کی رحمت تو ہر وقت جوش مارتی ہے، اور تسلسل کے ساتھ اس کی رحمت مخلوق کی طرف متوجہ ہے، تمہیں جو کچھ مل رہا ہے اور تمہاری جو بھی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں سب وہی پوری کرتا ہے، ہر وقت تمہاری طرف متوجہ ہے، اس لیے اس وحدانیت کے عقیدے سے جو عظمت نمایاں ہے اُس کی بناء پر تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کی ہماری طرف توجہ ہی نہیں ہے، وہ ہماری کیا پروا کرے گا، ہماری وہاں تک کیا رسائی ہے، اتنی عظیم ہستی کے ساتھ ہم رابطہ کس طرح سے قائم کر سکتے ہیں، یہ بات غلط ہے، واحد اور عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے، اس کی رحمت ہر وقت جوش میں ہے، اور تسلسل کے ساتھ اپنی رحمت کو مخلوق پر برساتا ہے۔ اور دوسرے اُس کی عظمت سے یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اس کا رعب اور جلال ایسا ہے کہ ہمیں اس کے سامنے جانے کی جرأت ہی نہیں، ایسی بات نہیں، وہ ایک ایسی عظیم الشان ذات ہے جس میں رعب اور جلال بھی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، وہ قہار بھی ہے، وہ جبار بھی ہے، شدید العقاب بھی ہے، ذوانتقام بھی ہے، یہ صفتیں بھی اُس کے لئے کمال درجے کی ثابت ہیں، لیکن جو صفت زیادہ غالب ہے وہ رحمٰن و رحیم ہونے کی صفت ہے، اس لیے ایسی کوئی ڈرنے کی بات نہیں کہ اُس کے سامنے جا کر کوئی درخواست بھی نہ

پیش کر سکو، اور اُس کو براہِ راست تم خطاب نہ کر سکو، اس کا نام لے کر اُس کو تم بلا نہ سکو، یہ بات نہیں ہے، اور یہ دونوں عقیدے ہیں جنہوں نے لوگوں کے اندر شرک کے جراثیم پیدا کیے، اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کی حقیقت اگر صحیح طور پر سمجھ آ جائے تو ان دونوں جذبوں کی ہی جڑ کٹ جاتی ہے، کہ ہمارا اللہ جس کو ہم واحد مانتے ہیں اور عظیم الشان مانتے ہیں، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، اس لیے وہ ہم سے بے توجہ نہیں، اس کی رحمت کے ساتھ ہی ہمارے سارے کے سارے کام بنتے ہیں، اس لیے اُس کا ہمارے ساتھ تعلق ہے، ہمیں بھی ادھر متوجہ رہنا چاہیے۔ اور وہ عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا پُر جلال اور پُر رعب نہیں ہے کہ بندے اُس کو نام لے کر بلا نہ سکیں، اس کو خطاب نہ کر سکیں، براہِ راست اُس کے دربار میں نہ جا سکیں، وہ رحمٰن ورحیم ہے، اور اس کے ساتھ جس طرح سے چاہو براہِ راست رابطہ رکھو، تمہاری وہ براہِ راست ہر وقت سنتا ہے، اور تمہاری ضروریات کی طرف متوجہ ہے۔ تو وحدانیت کے عقیدے سے جو ایک عظمت نمایاں تھی اس کے نتیجے میں دو خیال انسانوں میں پیدا ہو سکتے تھے، اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کے لفظ سے اُن دونوں کا خاتمہ کر دیا گیا، اس لیے جس وقت آپ اپنے اللہ کا اور اپنے معبود کا تصور کریں گے اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کی شان کے ساتھ تصور کریں گے تو پھر انسان کے دل سے محبت اُگلتی ہے، اور قلب کے اندر ایک ربط پیدا ہوتا ہے، کہ پھر تو رحمٰن ورحیم ذات کے ساتھ تعلق رکھنا چاہیے، جو اتنا مہربان ہے اور اتنا تسلسل کے ساتھ مہربانی کرتا ہے، اور ہماری طرف متوجہ ہے، ہمیں اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیے، اور اُس کی مہربانی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، جیسے حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملہ منقول ہے کہ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے، میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی، اس میں بھی یہی سبق دینا مقصود ہے کہ مجھے غضب ناک ہستی کے طور پر تصور نہ کرو، جس سے تم ایسے ہی ڈر جاؤ کہ پھر بلانے کی جرأت نہ کرو، آنے کی جرأت نہ کرو، درخواست پیش کرنے کی جرأت نہ کرو، بلکہ میرا جب تصور کرو تو رحمٰن ورحیم کی شان سے کرو۔ اس لفظ کو جو توحید کا تعارف کرواتے ہوئے اور توحید کا عقیدہ آپ کو بتاتے ہوئے یہاں رکھا گیا تو ایک بنیادی معنی کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے ان دو اسماء کے ذریعے سے شرک کے جراثیم کا خاتمہ ہوتا ہے، ورنہ اگر اللہ کی یہاں وہی غضب ناک ہونے والی شان نمایاں کی جائے (غضب ناک بھی وہ ہے، اس میں کیا شک ہے) تو انسان میں پھر وہی جستجو پیدا ہو جاتی ہے کہ میں کس کو واسطہ بناؤں؟ کس کے ذریعے سے درخواست پہنچاؤں؟ میں اس کو کیسے بلا سکتا ہوں؟ جب وہ اتنا غصے میں ہے تو اُس کا نام لے کر اُس کو کس طرح سے پکاروں؟ جب وہ اتنا غضب ناک ہے تو ایسا نہ ہو کہ میں اس کے غضب کا نشانہ بن جاؤں، پھر اس قسم کے تصورات انسان کے دل میں آتے ہیں۔

آسمان وزمین میں توحید اور رحمتِ باری کے دلائل

اور آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل بھی دی ہے، اور اپنے رحمٰن ورحیم ہونے کی دلیل بھی دی ہے۔ آگے جو فہرست آپ کے سامنے ہے اُس میں دونوں باتیں نمایاں ہیں، اللہ تعالیٰ کا واحد ہونا بھی نمایاں ہے، کہ خالق وہی ہے، کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، مالک وہی ہے، کوئی دوسرا مالک نہیں، متصرف وہی ہے، کوئی دوسرا متصرف نہیں ہے، بادشاہ وہی ہے، اُس کے مقابلے میں کسی دوسرے کی سلطنت نہیں، اس کے لئے بھی اگلے الفاظ دلیل ہیں، اور اسی طرح وہ رحمٰن ورحیم ہے، اُس کی رحمت کس

قدرنمایاں ہے، اس کے لئے بھی اگلے الفاظ دلیل بنتے ہیں۔ تو اللہ کی رحمت بھی نمایاں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، اُس کی خالقیت، اُس کی مالکیت، اُس کی سلطنت وہ بھی ساری کی ساری اگلے الفاظ سے نمایاں ہے۔ ''زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں'' پیدا کرنا ایک تو اس کا وجود ہی ہو گیا، کہ زمین اور آسمان کو وجود دیا، یہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت ہے، اور پھر کن کن حکمتوں اور کن کن مصلحتوں پر ان کو مشتمل بنایا، یہ اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کی دلیل ہے، اور پھر ہمارے لیے اس میں کیا کیا منافع رکھے ہیں، کس طرح سے مخلوق کے لئے ان دونوں کو باعثِ راحت بنایا، یوں اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے کی شان بھی اس میں نمایاں ہے۔ ''پیدا کیا زمین کو اور آسمان کو'' یعنی اُن کو وجود بھی دیا، اور اُن کے خواص اور اُن کے آثار اور اُن کے اندر رحمتوں اور نعمتوں کے خزانے جس طرح سے آپ کے سامنے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی بھی دلیل ہے، کہ خالق وہی ہے، مالک وہی ہے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے کی بھی دلیل ہے۔

دِن اور رات میں توحید ورحمتِ باری کے دلائل

''رات اور دن کے اختلاف میں'' اختلاف کی دونوں صورتیں ہیں، دن گیا اور رات آئی، رات گئی اور دن آیا، تو اس طرح آمد ورفت کے اعتبار سے بھی اختلاف ہے، لیکن دوسرا اختلاف اس اعتبار سے بھی ہے کہ کبھی دن بڑے کر دیے اور راتیں چھوٹی کر دیں، کبھی راتیں بڑی کر دیں اور دن چھوٹے کر دیے، اور اس کے ساتھ ساتھ صفات کا اختلاف بھی ہے کہ دن کو روشنی ہے، گرمی ہے، بدن میں چستی ہے، ہوش مندی ہے، اور رات آتی ہے تو اس میں خنکی ہے، ٹھنڈک ہے، سکون ہے، اطمینان ہے، اسی طرح دن میں اچھلنے کودنے کو جی چاہتا ہے، رات کو لیٹنے اور سونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ دونوں قسم کی صفات کا اختلاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی دلیل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دلیل بھی ہے، یعنی دن ہی دن رہتا تو آپ کو رات کے فوائد حاصل نہ ہوتے، اور رات ہی رات رہتی تو دن کے فوائد حاصل نہ ہوتے، دونوں چیزیں انسان کے لئے تکلیف دِہ ہوتیں، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر دن ہی ہمیشہ کر دے تو کون ہے اِلٰہ جو تمہارے پاس رات لے آئے گا؟ اور اگر ہم ہمیشہ رات ہی تم پر طاری کر دیں تو کون ہے جو تمہارے پاس دن لے آئے گا؟ (سورۂ قصص: ۷۱-۷۲) تو دن اور رات میں رحمت والا پہلو بھی نمایاں ہے، کہ رات والے فوائد علیحدہ ہیں اور دن والے فوائد علیحدہ ہیں، سکون اطمینان خنکی ٹھنڈک یہ ساری کیفیتیں رات کو پیدا ہوتی ہیں، اور روشنی گرمی چستی یہ کیفیتیں دن کو پیدا ہوتی ہیں۔

کشتی میں توحید ورحمتِ باری کے دلائل

وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ: کشتیوں میں جو کہ سمندر میں چلتی ہیں، اس میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے، خالقیت بھی نمایاں ہے، کہ پانی اللہ نے پیدا کیا، کیسا پیدا کیا؟ سیال ہے، بہتا ہے، اس کے اندر پہاڑوں جیسی اور پتھروں جیسی سختی نہیں ہے، اور کشتیاں لوہے اور لکڑی کی بنتی ہیں، اُن کی طبیعت اور ان کا مزاج اللہ نے کیسا بنایا، دونوں کے مزاج بالکل مختلف ہیں، باوجود اس

بات کے کہ پانی میں ڈبونے کی صلاحیت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ ان میں اس قسم کی سازگاری پیدا کردی کہ پانی کشتی کو اُٹھاتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچا دیتا ہے، اور اس میں لوگوں کے لئے کتنے منافع ہیں، اس لیے جہاں اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا یہ بے نظیر نمونہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے واضح ہوتی ہے وہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کی وضاحت بھی ہے، ہماری کتنی ضرورتیں ان کشتیوں کے ساتھ اور دریاؤں اور سمندروں کے ساتھ متعلق ہیں، اور دریا میں یہ کشتیاں چلتی ہیں، سمندر میں جہاز چلتے ہیں، سامانِ تجارت لے کر ہمیں ایک طرف سے دوسری طرف پہنچاتے ہیں۔ اگر یہ ذرائع نہ ہوتے تو ایک خشکی والے دوسری خشکی والوں تک کیسے پہنچتے؟ جبکہ درمیان میں ہزاروں میل پھیلا ہوا سمندر ہے، اس میں بھی اللہ کی رحمت نمایاں ہے۔

بارش کے نظام میں توحید اور رحمتِ باری کے دلائل

''اور اس پانی میں جو آسمان سے اُتارا'' بارش کی شکل میں کس طرح سے قطرہ قطرہ کر کے اللہ تعالیٰ پانی اُتارتے ہیں، آپ کے کچے کمرے اور چھپر بھی برداشت کر لیتے ہیں، اور اگر اتنا کروڑوں من پانی کہیں آبشار کی طرح گرتا تو جس محل پر گر جایا کرتا وہ بھی زمین بوس ہو جاتا، اور زمین میں بھی گڑھے پڑ جایا کرتے، اور ساری کی ساری زندگی تلخ ہو جاتی، جس انسان کے سر پر اُوپر سے نالہ چھوٹ جاتا تو اُس کی کھوپڑی بھی ٹوٹ جایا کرتی، پانچ دس منٹ کی بارش میں جتنے من پانی اُتر آتا ہے اگر یہ کہیں اکٹھا نیچے گرا دیا جاتا تو پھر نہ زمین برداشت کر سکتی تھی نہ آپ برداشت کر سکتے تھے اور نہ آپ کے مکانات برداشت کر سکتے تھے، نقصان ہی نقصان تھا۔ ''پس زندہ کیا اس زمین کو پانی کے ذریعے سے اُس کی موت کے بعد'' یہ ایک مشاہدے کی بات ہے، کہ جب زمین خشک ہوتی ہے تو ایسے ہے جیسے بے جان پڑی ہوئی ہے، آسمان کی طرف سے پانی اُترتا ہے تو اس زمین میں جان پڑتی ہے، نباتات اُگتی ہے، زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے، یہ زمین کی حیات ہے، اور زمین کی حیات اور موت کے لئے محاورے میں لفظ بولا جاتا ہے زمین کا بنجر ہونا اور زمین کا سرسبز و شاداب ہونا، اس لیے اگر یہاں ترجمہ یوں کر دیا جائے کہ ''اس پانی کے ذریعے سے زمین کو سرسبز و شاداب کیا اس کے بنجر ہونے کے بعد'' تو یہ ترجمہ محاورے کے مطابق ہے۔ وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ: اس کا عطف اگر اَنْزَلَ پر کریں تو پھر معنی ہوگا کہ اس چیز میں جو پھیلائی اللہ نے اس زمین میں ہر دابہ سے، جیسے پیچھے سے اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ چلا آ رہا ہے، کہ اس چیز میں، فلاں چیز میں، اسی طرح سے یہ ہو گیا، کہ ''اس چیز میں جو پھیلائی اللہ نے اس زمین میں ہر دابہ سے''، مِن كُلِّ دَآبَّةٍ ما کا بیان ہوگا، ''ہر جاندار میں جس کو اللہ نے زمین پر پھیلایا''، اور اگر اس کا عطف اَحْيٰی پر کریں تو پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا ''اور پھیلایا اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اس پانی کے ذریعے سے ہر دابہ کو'' یہ بات بھی واقعہ کے مطابق ہے، کہ حیوانات کا نشوونما پانا بھی پانی کے ذریعے سے ہی ہے، کہ زمین میں پانی کا ذخیرہ بارش سے ہوا، پھر بارش سے نباتات پیدا ہوتی ہے، اور یہی نشوونما کا ذریعہ ہوتی ہے، ویسے بھی جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر کیڑے مکوڑوں کی کثرت بھی ہوتی ہے، اور نباتات کے پیدا ہونے کے ساتھ باقی حیوانات کو بھی زندگی ملتی ہے، اسی کے ساتھ ہی اس نسل کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔

ہواؤں کی تصریف میں ایک وقت میں لاکھوں فوائد ہیں

وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ: ہواؤں کا پھیرنا، پھیرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ کبھی مشرق کی طرف سے چلتی ہے اور کبھی مغرب کی طرف سے چلتی ہے، کبھی شمال کی طرف سے اور کبھی جنوب کی طرف سے، اور اسی تصریف کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ کبھی نرم چلتی ہے اور کبھی سخت، کبھی ٹھنڈی اور کبھی گرم، اور جب اس کے فلسفے پر آپ غور کریں گے تو اس میں بھی انسان کے لئے سینکڑوں نہیں لاکھوں فوائد ایک وقت میں ہیں، اس کا گرم چلنا بھی انسانی زندگی کے لئے مفید ہے، کہ فصلیں پکتی ہیں، جیسے گندم کے موسم میں جب تک ہوا نہ چلے اُس وقت فصل تیار نہیں ہوتی، اور ایک وقت میں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو اس سے پتے خشک ہوتے ہیں اور جھڑتے ہیں، پھر درختوں کو اور دوسری نباتات کو نئی زندگی ملتی ہے، ان کا پہلا لباس تبدیل کیا جاتا ہے کہ پتے خشک ہو کر گرتے ہیں، پھر نئے پتے آنا شروع ہو جاتے ہیں، دوبارہ باغ و بہار ہو جاتی ہے، تو یہ کیفیات کے اعتبار سے تصریف بھی اس میں شامل ہے، کبھی نرم اور کبھی سخت، کبھی تیز اور کبھی مدہم، کبھی سرد کبھی گرم، یہ کیفیات بھی اُس کی بدلتی رہتی ہیں، اور ان میں سے ہر کیفیت کا انسان کی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: اور اس بادل میں جو کہ مسخر کیا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے تابع کیا ہوا ہے زمین و آسمان کے درمیان، کہ کس طرح سے یہ بادل آتے ہیں، سمندروں سے پانی اٹھا کر لاتے ہیں، اور پھر ہوائیں اُن کو دھکیل دھکیل کر جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں لے جاتی ہیں، اور جتنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے اتنا پانی برساتے ہیں، جہاں حکم ہوتا ہے وہاں برساتے ہیں، اور دنیا کی رونق ساری کی ساری ہی اسی سلسلے کے ساتھ ہے۔

کائنات کی تمام اشیاء کا آپس میں ربطِ منتظم کے ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں۔ يَعْقِلُوْنَ کا لفظ یہاں استعمال کیا گیا، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان چیزوں سے ان کے خالق پر اور اُس کی وحدانیت پر اور اللہ تعالیٰ کے عمومِ رحمت پر استدلال کرنا عقل کا کام ہے، جتنا سوچو گے اتنی ہی یہ بات واضح ہوتی چلی جائے گی، یہ استدلال عقلی ہے، عقل کے ساتھ ہی سوچو کہ یہ چیزیں حادث ہیں، محدَث ہیں، اور اس قسم کے تصرفات ان کے اندر ہوتے ہیں، جب تک اِن کے اُوپر کوئی خالق مالک نہ ہو تو یہ دنیا کا نظم اس طرح سے چل نہیں سکتا، یہ اتنا منظم سلسلہ ہے، زمین و آسمان آپس میں اگرچہ آپ کو مختلف نظر آتے ہیں، لیکن مختلف ہونے کے باوجود ان میں ایک قسم کا اتحاد بھی ہے، اتحاد اس طرح کہ زمین میں یہ صلاحیت ہے کہ آسمان کی طرف سے فیضان آتا ہے اور زمین اس کو قبول کرتی ہے، دونوں ملتے ہیں تو فوائد مرتب ہوتے ہیں، جیسے انسانوں میں آپ نے دیکھا کہ مرد کا مزاج اور ہے، اُس کی ساخت اور ہے، اُس کی خصوصیات اور قسم کی ہیں، عورت کی خصوصیات اور قسم کی ہیں، لیکن اختلاف کے باوجود دونوں میں ایک قسم کا اتحاد ہے، کہ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو عجیب وغریب نتائج نکلتے ہیں، اور انسانی زندگی کے اندر ایک نیا رُخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمین کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، یہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک علیحدہ چیز ہے، آسمان اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک جدا چیز ہے، لیکن دونوں کا آپس میں اختلاف کے باوجود اتحاد ہے، کہ ایک دوسرے کے اثرات کو کس طرح سے قبول کرتے ہیں اور پھر ان سے

کس قسم کے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ستاروں کی دنیا کو آپ دیکھیں گے، باوجود انتہائی اختلافات کے ان کے اثرات میں کس طرح سے آپس میں اتحاد ہے، سورج اور چاند آپ کو علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں، لیکن آپ جس وقت اس کا سائنس کے درجے میں مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنا ان کا آپس میں اتحاد اور اتفاق ہے، کہ ایک دوسرے سے اخذ فیض کر کے کس طرح سے دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو عام کرتے ہیں۔ اسی طرح دن اور رات کا آپس میں اختلاف بھی ہے، لیکن آنے جانے کے ساتھ فوائد کس طرح منطبق ہوتے ہیں۔ کشتی لوہے اور لکڑی کی بنتی ہے، اور پانی کے مزاج کے ساتھ بظاہر ان کی کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی، دونوں چیزوں کا آپس میں اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف کے اندر اتحاد کا پہلو کس طرح ہے کہ دونوں مل کر انسان کے لئے کیسی راحت اور کیسی آرام کی چیزیں مہیا کرتے ہیں، کس طرح سے اس کے لئے سفر آسان ہو گیا، تجارت آسان ہو گئی، انسان کے رزق کے اندر وسعت ہو گئی۔ اور یہی صورت آگے بارش کی ہے، کہ بارش کا نباتات سے تعلق، بارش کا حیوانی زندگی سے تعلق، ان کی تفصیلات میں اگر آپ جائیں تو کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں، کہ ان چیزوں پر بارش کے کیا اثرات واقع ہوتے ہیں، نباتات کے ساتھ بارش کا کیا تعلق ہے، حیوانات کا نباتات کے ساتھ کیا ربط ہے، اور حیوانات اور نباتات دونوں کا بارش کے ساتھ کیا ربط ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح جوڑا ہے جیسے کڑی وار سلسلہ ہوتا ہے، کہ ساری کی ساری چیزیں جڑی ہوئی ہیں، یہ سب اس بات کی علامت بنی ہوئی ہیں کہ ان کے اوپر منتظم ایک ہی ہے جس کی قدرت کام کرتی ہے، ورنہ اگر یہ متعدد ہوتے، کوئی بگڑ کر بیٹھ جاتا، کوئی کچھ ہو جاتا، یہ سارے کا سارا نظم درہم برہم ہو جاتا، جیسے آپ کے سامنے آیت آئے گی لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء: ۲۲) اس میں ایک نکتہ یہی ہے کہ اگر متعدد ہوتے، ہر ایک کی سلطنت علیحدہ علیحدہ ہوتی، تو اس طرح ان چیزوں کے اندر اتحاد نمایاں نہ ہوتا۔ ان کا اتحاد، آپس میں موافقت، اور موافقت کے ساتھ آگے اچھے نتائج کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ دستِ قدرت ایک ہی ہے جس کے تحت یہ سارے کا سارا کارخانہ چلتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت، اس کی وحدانیت، اس کی قدرت، اور اس کی رحمت، سب ان علامات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لئے یہ بات بالکل واضح ہے، جتنا سوچیں گے اتنی نشانیاں نکلتی جائیں گی۔

مشرکین کا طرزِ عمل

یہ توحید کا ذکر تھا، اس کی دلیل کے ساتھ آگے مشرکین کے طرزِ عمل کو بیان کیا، کہ چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے مالک اور خالق کو پہچانتے، اور اس رحمٰن ورحیم کے ساتھ ہی محبت رکھتے، اور اسی کے ساتھ ہی پوری کی پوری انسانیت کا اطاعت ومحبت کا تعلق ہوتا، لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسرے مقابل بنا لیتے ہیں، اور اُن کے ساتھ محبت ویسے ہی کرتے ہیں جیسے اللہ سے کرتے ہیں، کیونکہ محبت کا تقاضا اعمال ہیں، جب قلب کا تعلق کسی چیز کے ساتھ ہوا کرتا ہے تو پھر اس سے اطاعت اور اسی طرح دوسری چیزیں ظاہر ہوا کرتی ہیں، جب انہوں نے صرف اللہ کے ساتھ دل نہیں لگایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور مقابل بنا کر اُن کے ساتھ بھی دل لگا لیا، تو اُن کی اطاعت اور عبادت کا رُخ بھی اس طرف کو ہو گیا، اُن کی محبت میں مبتلا ہو گئے يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ: اُن سے محبت

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کی طرح۔ حُبّ مصدر ہے، اور لفظ اللہ اس کا مفعول ہے، مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔

مؤمن کا اللہ سے تعلق کسی حال میں بھی کمزور نہیں ہوتا

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ: اور جو مؤمن ہیں وہ زیادہ سخت ہیں از روئے محبت کے اللہ کے لئے، مؤمنوں کو اللہ سے محبت سخت ہوتی ہے، مشرکین کو اپنے شرکاء کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی مؤمن کو اللہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے، کہ جس طرح ہمیں فوائد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتے ہیں اسی طرح ہمارے اُوپر مصائب بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں، اگر اولاد دینے والا اللہ ہے ہمارے عقیدے کے مطابق، تو اس اولاد کو واپس لینے والا بھی اللہ ہی ہے، صحت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے تو بیماری کو بھی ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی سمجھتے ہیں، راحت اگر اللہ کی طرف سے ہے تو تکلیف بھی ہم اللہ کی طرف سے ہی جانتے ہیں، ان سب چیزوں کو جاننے کے باوجود ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمزور نہیں ہوتا، بلکہ اس بات کو جانتے ہوئے کہ ہماری اولاد کو اللہ نے مارا، اس بات کو جانتے ہوئے کہ اس مصیبت میں اللہ نے مبتلا کیا، اور اس بات کو جانتے ہوئے کہ فقر و فاقہ جو بھی ہمارے اُوپر آیا ہے ہمارے اللہ کی جانب سے آیا ہے، اس کے باوجود مؤمن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کمزور نہیں ہوتا، بلکہ ان واقعات کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مزید ربط ہوتا ہے۔ یہ ایمان کی ایک عجیب شان ہے کہ ہر لحاظ سے ہر بات کو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف جوڑتا ہے، اگر مؤمن مؤمن ہونے کے اعتبار سے اس کو سوچے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے، اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے، تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، مصیبت آجاتی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے خالق اور میرے مالک نے مجھے آزمایا ہے، مجھے اُس کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے، اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ لیکن مشرکین کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اُن پر کوئی زیادہ سخت مصیبت آجائے تو شرکاء کو بھول جاتے ہیں، پھر صرف ایک اللہ کو پکارنے لگ جاتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم میں اُن کا حال ذکر کیا گیا ہے، اور اگر اُن کو پتہ چل جائے کہ اس مصیبت میں ہمارے اس معبود نے مبتلا کیا ہے تو جو کیفیت مؤمن کے دل کی ہوتی ہے مشرک کے دل کی کیفیت وہ نہیں رہتی، اگر اس کو پتہ چل جائے کہ مجھے مصیبت میں اس نے مبتلا کیا ہے تو اس سے نفرت ہوجائے گی اور اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤمنین کے محب ہونے کا اعتراف

لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ مؤمنوں کا تعلق بہت مضبوط ہے، اب اس میں ایک اقرار آگیا کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت بہت زیادہ ہے، اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ جس کے ساتھ آپ کو محبت کا دعویٰ ہو وہ اقرار بھی کرلے کہ واقعی میرے ساتھ فلاں کو محبت ہے، یہ عاشق اور محب کے لئے ایک بہت بڑا انعام ہے، ورنہ اکثر و بیشتر عاشق کو یہ شکوہ ہوتا ہے کہ میں مرا جا رہا ہوں، اور اس کی میری طرف کوئی توجہ ہی نہیں، وہ جانتا ہی نہیں کہ مجھے اس کے ساتھ کوئی محبت ہے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

بینم بس کہ داند ماہ رویم کہ من نیز از خریداران اویم

کہ میرے لیے یہ بات کافی ہے کہ میرے چاند کو پتہ چل جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں، اگر وہ اتنا ہی اعتراف کر لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں تو بس میرے لیے یہی کافی ہے، یعنی اس کو یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو اندازہ ہی نہیں، اس کو پرواہی نہیں کہ میرے دل کو اس کے ساتھ کتنا تعلق ہے، اس لیے وہ واقعات کے ساتھ، باتوں کے ساتھ، رو کر، چلا کر، جیسے کیسے بھی، یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے تیرے ساتھ محبت ہے، اور تو میری محبت کی قدر کر۔ اور اگر وہ اعتراف کر لے کہ واقعی اُس کو میرے ساتھ محبت ہے تو عاشق کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں مؤمنین کے لئے اعتراف کیا ہے کہ مؤمنوں کو میرے ساتھ بڑی سخت محبت ہوتی ہے، تو مؤمن جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مدعیٔ محبت ہے اس کے لئے ان لفظوں میں بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ اعتراف کرے کہ واقعی مؤمنوں کو میرے ساتھ محبت ہے۔

عشق ومحبّت کے تقاضے

جب آپ کی طرف سے محبت کا دعویٰ ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی ظاہر کر دیا کہ واقعی مؤمنوں کو میرے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے، تو آگے پھر محبت کے آداب، حقوق اور لوازمات خود بخود شروع ہو جاتے ہیں، جن کی تفصیل آپ کی خدمت میں یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے لفظ کے تحت ذکر کی تھی، کہ یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جاتا ہے، اور ادھر یہ ہے کہ مؤمن اللہ کے محب ہوتے ہیں، تو گویا کہ ایمان والوں کو محب قرار دے کر اللہ تعالیٰ احکام دیتے ہیں، اور پھر محبت کا دعویٰ کرنے والوں کی شایانِ شان نہیں کہ محبوب کی طرف سے حکم آئے تو اس کو تسلیم نہ کیا جائے، محبوب کے حکم پر محب مر مٹا کرتے ہیں، اور محبت ایک ایسی چیز ہے کہ جس وقت قلب کے اندر آ جاتی ہے تو پھر اس میں پلٹنا نہیں ہے، بلکہ اس میں یکسوئی ہے، کہ جس کے ساتھ محبت ہو جائے پھر انسان دل کے اعتبار سے، دماغ کے اعتبار سے، ظاہر کے اعتبار سے، باطن کے اعتبار سے اسی کا ہو جاتا ہے، پھر کسی دوسرے کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ جب وہ اسی کا ہو جاتا ہے تو پھر آگے سلسلہ اگر پھیلے گا تو اسی کی وساطت سے پھیلے گا، ایک چیز کے ساتھ آپ کو محبت ہو گئی، جیسے مثال دے دوں، اس سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کا قصہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے، مجنوں کو لیلیٰ کے ساتھ محبت ہو گئی، تو پھر وہ لیلیٰ تک ہی محدود نہیں رہی، لیلیٰ کے شہر کے ساتھ محبت، لیلیٰ کے گلی کوچوں کے ساتھ محبت، مجنوں کہتا ہے:

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا

وَمَا تِلْكَ الدِّیَارُ شَغَفْنَ قَلْبِیْ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّیَارَا

کہ میں دیارِ لیلیٰ میں سے گزرا، کبھی اُس دیوار کو بوسہ دیتا تھا، کبھی اُس دیوار کو بوسہ دیتا تھا، میرے دل میں دیواروں کی محبت نہیں ہے، ہاں! جو اس کے اندر رہنے والے ہیں اُن کی محبت ہے جو میرے قلب میں داخل ہے، اور اُن کی محبت کی وجہ سے میں اُن کے در و دیواروں کو بھی چومتا ہوں۔ اب اس شہر کی نسبت اُس لیلیٰ کی طرف ہو گئی تو اُس کے در و دیوار بھی پیارے ہو گئے۔ بلکہ ایک فارسی شاعر نے تو کہا ہے (معلوم نہیں واقعہ ہے، یا لوگ مثال دینے کے لئے اس طرح سے بنا لیتے ہیں، اور اگر واقعہ بھی ہو تو کوئی بعید نہیں):

پائے سگ بوسید مجنوں، خلق گفتند ایں چہ بود؟ گفت ایں در کوئے لیلیٰ گاہے گاہے رفتہ بود

کہ لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں ایک کتے کو پکڑ کر اس کے قدم چوم رہا ہے، مخلوق کہنے لگی کہ یہ کیا ہوا؟ کتے کے قدم کیوں چوم رہا ہے؟ وہ کہنے لگا میں کتے کے قدم اس لیے چوم رہا ہوں کہ میں نے اس کو کوئے لیلیٰ میں پھرتے ہوئے دیکھا ہے، تو اس کے قدم اس لیے چومے کہ وہ لیلیٰ کے کوچے کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جہاں لیلیٰ کے قدم لگتے ہیں، اب حقیقت کے اعتبار سے دیکھنے والے کہیں گے کہ کتے کے ساتھ محبت ہے، لیکن یہ کتے کے ساتھ محبت نہیں، بلکہ لیلیٰ سے محبت ہے، اور کتے کی لیلیٰ کی طرف نسبت ہوگئی تو اس سے بھی محبت ہوگی۔

اور جس وقت محبت ہو جاتی ہے تو اس کا تذکرہ ہی سب سے لذیذ ہوتا ہے مَن اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ، پھر جتنی اس کے نام میں لذت ہوتی ہے اتنی کسی دوسری چیز میں لذت نہیں ہوا کرتی، اسی طرح ایک اور فارسی شاعر کہتا ہے:

دید مجنوں را یکے صحرا نورد در بیابانِ غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں ے نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نامِ لیلیٰ می کنم خاطرِ خود را تسلّی می دہم

کہ ایک آدمی نے مجنوں کو دیکھا کہ ریگستان میں، صحرا میں، غم کے جنگل میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے، کہتے ہیں کہ ریت کو اس طرح سامنے رکھا ہوا تھا جیسے کاغذ ہوتا ہے، اور انگلی کو قلم بنایا ہوا تھا، ایسے لگتا تھا جیسے کسی کے نام کوئی خط لکھ رہا ہے، انگلی کے ساتھ ریت پر کچھ لکھ رہا ہے، اس نے کہا: اے مجنوں! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ کس کے نام خط لکھ رہے ہو؟ کہتا ہے کہ خط کس کے نام لکھنا ہے! بس لیلیٰ لیلیٰ لیلیٰ، اس کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔ [ملفوظات حکیم الامّت ۲۸/ ۵۰۱] تو یہ عشق کے لوازمات ہیں، کہ پھر اس کا نام سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے، اس کا نام بار بار لینے کے ساتھ دل کو اطمینان چین اور سکون حاصل ہوتا ہے، اور جو چیزیں بھی اس کی طرف منسوب ہوتی چلی جائیں گی ان سے محبت ہوتی چلی جائے گی، اور اس کے برعکس جو چیز اُس کے مخالف ہوتی چلی جائے گی اُس سے دوری ہوتی چلی جائے گی، جو چیز بھی محبوب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہو۔ اس لیے تو اس قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو دل دے بیٹھتے ہیں، اُن کو کوئی نصیحت کرنے کے لئے بیٹھ جائے تو اُن کو بڑی نفرت ہوتی ہے، کہ ہمیں سمجھاتے کیوں ہو؟ کیونکہ جس طرح سے معشوق کے ساتھ محبت ہوتی ہے، اسی طرح عاشق کو اپنے عشق کے ساتھ بھی محبت ہوتی ہے، وہ اس عشق کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مشہور ہے کہ مجنوں کا والد مجنوں کو مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کے سامنے لے گیا، وہاں جا کر اُس کو کہتا ہے کہ دُعا کر کہ اے اللہ! میرے دل سے لیلیٰ کی محبت نکال دے، کہتے ہیں کہ مجنوں رونے لگ گیا، اور دُعا کرتا ہے کہ ''اے اللہ! لیلیٰ کے ساتھ محبت اور بڑھا دے، اللہ اُس پر بھی رحم کرے جو میری اُس دُعا کے اُوپر آمین کہے۔'' اور آگے پھر یہ شعر پڑھتا ہے (اس کا اصل نام قیس ہے، اور یہ عربی ہے، یہ واقعی شخص ہے، فرضی شخصیت نہیں ہے، اور دیوانِ قیس بھی چھپا ہوا ہے، اور

اِس کے حالات جو اس طرح کے منقول ہیں تو موضوع بن جانے کے بعد لوگ مبالغہ بھی کرتے ہوں گے، لیکن واقعہ کے اعتبار سے اس کی اصلیت ہے) تو وہ دُعا کرتا ہوا اللہ کے سامنے کہتا ہے:

اِلٰهِيْ تُبْتُ عَنْ كُلِّ الْمَعَاصِيْ وَلٰكِنْ حُبُّ لَيْلٰى لَا اَتُوْبُ

کہ الٰہی! ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں، لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ کرنے کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔ تو یہ وہی بات ہے کہ عاشق کا معشوق تو معشوق ہوتا ہی ہے، اُس کو اپنے عشق کے ساتھ بھی محبت ہوتی ہے، اس لیے اگر وہ یہ سوچے کہ کسی طرح سے میرے دل سے محبت نکل جائے، ایسا نہیں ہوسکتا، جہاں دل ایک دفعہ لگ جاتا ہے تو یہ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ نفس پر آجائے تو اس سے پھر محروم ہونا نہیں چاہتا، چاہے اس میں کتنی پریشانیاں آئیں:

بُرا نہیں یہ درد، کچھ بھلا بھی ہے!

اس میں لذت اور ذائقہ کچھ اس قسم کا پڑ جاتا ہے کہ پھر انسان اُس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، یہ محبت کے لوازمات ہیں، اور اس کی خصوصیات ہیں، اور جہاں محبوب کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوگی وہاں سے وہ اتنا ہی دور ہٹتا چلا جائے گا، جس کو دیکھے گا کہ یہ رکاوٹ بن رہا ہے اس سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ مجنوں اونٹنی پر سوار ہو کر لیلیٰ کی طرف چلا، اور اُونٹنی نے بچہ دیا ہوا تھا، پیچھے پیچھے بچہ چلا آرہا تھا، اور ان جانوروں کی عادت ہے کہ تھوڑا سا چلنے کے بعد بچے کو دیکھتے ہیں کہ پیچھے آرہا ہے کہ نہیں آرہا، مڑمڑ کر دیکھتے ہیں، تھوڑی دُور چلیں گے، پھر پیچھے کو جھانکیں گے۔ تو تھوڑے وقفے کے بعد اس کی اُونٹنی پیچھے مڑمڑ کر اپنے بچّے کو دیکھتی، اور مجنوں کے سفر میں رکاوٹ پیدا ہورہی تھی، تو دو چار مرتبہ دیکھا، دیکھنے کے بعد اس نے اونٹنی سے چھلانگ لگادی، اور کہنے لگا کہ میرا محبوب آگے ہے اور اس کا محبوب پیچھے ہے، میرا اور اس کا اختلاف ہے، ہمارا نباہ نہیں ہوسکتا، میں آگے کو جھانک رہا ہوں، اور یہ پیچھے کو جھانک رہی ہے [ملفوظات حکیم الامّت ج ۴ ص ۳۲۷]۔

اللہ اور رسول کی محبّت کے تقاضے اور ثمرات

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے، ایک ایک چیز محبت کے تقاضے کے ساتھ دکھائی جاسکتی ہے، کہ محبت کے کیا لوازمات ہیں؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ جس وقت یہ آتی ہے تو پھر کیا رنگ دکھاتی ہے؟ پورے کا پورا باب شریعت کے اندر مطلوب ہے، کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ محبت لگا کر اُس کے دل کے جذبات کیسے ہونے چاہئیں، عشقِ مجازی کے رنگ میں نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ آجاتے ہیں، اللہ سے محبت ہے تو اللہ کے گھر سے محبت ہے، اللہ سے محبت ہے تو اللہ کے رسول سے محبت ہے، اللہ کے رسول سے محبت ہے تو اللہ کے رسول کے شہر سے محبت ہے، اللہ کے رسول سے محبت ہے تو اس کے یاروں سے محبت ہے، اس کے اہلِ بیت سے محبت ہے، اور پھر اس کے فرمان اور اُس کے احکام جتنے ہیں اُن کو قبول کرنے میں اور اُن پر عمل کرنے میں انسان کو لطف محسوس ہوتا ہے، مخالفت ناگوار گزرتی ہے، نافرمانی سے بدکتا ہے، جس وقت قلب کے اندر محبت آجائے تو اُس کے بعد یہ سارے کے سارے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اس لیے محبت کے بغیر ایمان ہی کچھ نہیں "لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى

اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ "[1] حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت نہیں لگاؤ گے مؤمن ہی نہیں ہو گے، آپ کا ایمان خشک اور بے اثر سا ہوگا کہ اُس پر کوئی ایسے آثار مرتب نہیں ہوں گے جب تک اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ محبت سب سے زیادہ نہ ہو۔ مؤمنوں کو جب اللہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو یہ کسی دوسرے کی اُس میں شرکت گوارا نہیں کرتے، شرک سے بچتے ہیں، ہر لحاظ سے اُن کی توجہ اللہ کی طرف ہی ہوتی ہے، مثل مشہور ہے ضَرْبُ الْحَبِيْبِ زَبِيْبٌ کہ محبوب اگر مارتا بھی ہو تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کھانے کے لئے مٹھائی مل گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت اور تکلیف آئے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو دبالیتا ہے، اور دبانے سے کچھ ہائے بھی نکلتی ہے، لیکن مزہ بھی آتا ہے، یہ دونوں باتیں ہوتی رہتی ہیں، یہ ساری کیفیات اس وقت جمع ہوتی ہیں جب انسان محبت کی چاشنی چکھ لے، جب تک اُس کا مزہ نہیں چکھتا خدا کی قسم اِن کیفیات کا پتہ نہیں چلتا، یہ چکھنے کی چیز ہے، صرف لفظوں سے کہنے اور سننے کی بات نہیں ہے۔ جس وقت یہ کیفیات طاری ہو جاتی ہیں تو پھر پتہ چلتا ہے کہ باوجود تکالیف کے آنے کے اور باوجود پریشانیوں کے آنے کے عاشق کے دل میں کس طرح سے لذت اور اطمینان ہوتا ہے، ہائے بھی کہے گا، آنکھوں سے آنسو بھی ٹپکیں گے، سب کچھ ہوگا، لیکن اللہ کے ساتھ تعلق ہونے کی بناء پر قلب ایک عجیب قسم کا سرور اور لطف محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو اطمینان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد: ۲۸) مؤمنوں کے دلوں کو چین اور سکون اللہ کے نام سے آتا ہے، اور یاد رکھو! سکونِ قلب اگر آسکتا ہے تو اللہ کے نام سے ہی آسکتا ہے، کسی دوسری چیز سے نہیں آسکتا۔ تو یہاں اللہ نے اعتراف کیا کہ مؤمنوں کو اللہ کے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے، تو پھر اس محبت کے لوازمات ان مؤمنوں کے ذمے ہیں، جتنا ایمان خالص ہوتا چلا جائے گا اتنی محبت خالص ہوتی چلی جائے گی، جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی اتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا، اور ایمان اور محبت میں اضافہ ہونے کے ساتھ اطاعت وعبادت آسان ہوتی چلی جائے گی، اور اپنے محبوب کی نافرمانی انسان کے لئے بہت تکلیف دہ بات بنتی چلی جائے گی، اور ساری کی ساری زندگی اس طرح ہوگی کہ اللہ کی اطاعت اور عبادت میں انسان کو لذت آئے گی۔

اللہ کی طاقت کا کس وقت پتا چلتا ہے؟

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان مشرکین نے شرکاء تو بنالیے، اگر یہ زیادہ سمجھ نہیں سکتے تو کم از کم جس وقت یہ دنیا میں کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں، اور پھر اپنے ہزار جتن کر کے دیکھ لیتے ہیں وہ تکلیف دور نہیں ہوتی، اگر اس وقت اُن کی سمجھ میں یہ بات آجایا کرے کہ زور سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے، جب اللہ کی گرفت آتی ہے اور یہ کسی عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی قوت اور طاقت چھڑا نہیں سکتی، یہ ایک مشاہدے کی بات ہے، مثلاً آپ کی محبوب ترین شخصیت والد، والدہ، بھائی، بیٹا، اولاد آپ کے سامنے دکھ اور درد میں تڑپ رہے ہیں، اور آپ ہر قسم کے اسباب رکھتے ہیں، پیسوں کی کمی نہیں، ڈاکٹروں کی کمی نہیں، طبیبوں کی کمی نہیں، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو اللہ کی منشا کے بغیر ان کو مصیبت سے چھڑا لے، اگر پیسوں

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۱۲ عن انس ﷺ۔ کتاب الایمان فصل اول / صحیح البخاری ص باب حب الرسول

کے ساتھ بچا جا سکتا تو کم از کم سرمایہ دار نہ کبھی بیمار ہوتے اور نہ مرتے، اور اگر علمی قابلیت کے ساتھ بچا جا سکتا، طب اور ڈاکٹری کے زور سے بچا جا سکتا، تو کم از کم آج جالینوس اور بوعلی سینا زندہ ہوتے، جو اس فن کے ماہر تھے، جو موت اور حیات کا فلسفہ سمجھتے تھے، اور امراض کے علاج میں اُن کو ایک استاذ کی حیثیت حاصل ہے، تو کم از کم یہ زندہ ہوتے، اور حکیم اجمل آج بھی اسی طرح سے جلوہ دکھاتا اگر علاج معالجے کے ساتھ ان چیزوں کو دور کیا جا سکتا۔ اور اگر فوجوں کے ساتھ یا کسی دوسری چیز کے ساتھ اِن عذابوں کو اور تکلیفوں کو دور ہٹایا جا سکتا تو نمرود وشداد اور فرعون عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ ایسے موقع پر پتہ چلتا ہے کہ سارے کے سارے اسباب دھرے رہ جاتے ہیں، کوئی باطنی قوت ہے جو انسان کو اسی طرح سے رگڑا دیتی ہے جس طرح سے وہ چاہتی ہے، اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاتا ہے تو ظاہری اسباب کے ذریعے اس سے بچ نہیں سکتا۔ تو یہ مصائب اور تکلیفیں ہر انسان کو سبق دیتی ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی قوت اللہ تعالیٰ کے ارادے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی، اگر یہ لوگ اس تکلیف کے وقت یہ سمجھ جایا کریں تو کم از کم یہ مشرک نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

شرک سے بچنے کا ذریعہ

اگلے الفاظ میں یہی دعوت دی گئی ہے، کہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے بعد حالات کو سوچنا بھی انسان کے قلب کو باقیوں سے توڑ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے، ان الفاظ کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر دیا گیا تھا، کہ اگر سمجھ جایا کریں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، جب دیکھتے ہیں تکلیف (دوسری رؤیت بصری اور پہلی رؤیت قلبی ہے) تو سمجھ جایا کریں کہ قوت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے، اور اس بات کو بھی سمجھ جایا کریں کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں، اگر یہ سمجھ جایا کریں تو لَمَا اَشْرَکُوْا: یہ شرک نہ کریں، پھر یہ دوسری چیزوں کو دل نہ دے بیٹھیں، جیسے اس وقت ان کا تعلق باقیوں سے کمزور ہو جاتا ہے اور اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہی بات اگر ان کے دل میں اچھی طرح سے بیٹھ جائے کہ قوت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے، کہ جب تک اللہ نہ چاہے کسی تکلیف کو دور نہیں کیا جا سکتا، تو یہ غور کر لینا اور یہ سمجھ لینا ان لوگوں کے لئے شرک سے بچنے کا ذریعہ بن جائے۔

تابعین اور متبوعین کا قصہ

آگے ان کی آخرت کی بدحالی ذکر کی ہوئی ہے، اور وہ اس انداز کے ساتھ کہ دنیا کے اندر بسا اوقات ایک مشرک ہوتا ہے، اور دوسرے محض اس کے پیچھے لگ کر اس کے مسلک کے اُوپر چلتے ہیں، چاہے اُن کا دماغ اُس کو قبول کرے یا نہ کرے، یہ تابعین اور متبوعین کا قصہ جو دنیا کے اندر چلتا رہتا ہے، کہ چھوٹے لوگ جو محنت کش اور مزدور قسم کے ہوتے ہیں، جن کو آپ اپنی اصطلاح میں کمی قسم کے لوگ کہتے ہیں، یہ عموماً بڑوں کے پیچھے لگ کر ان کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں، اُن کے دل دماغ میں اگر کوئی بات آ بھی جاتی ہے تو پھر بھی اپنے بڑوں کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے، اور اُن کے مسلک کو نہیں چھوڑتے، اور بڑے بسا اوقات کسی اغراض کی وجہ سے اَڑ جاتے ہیں، اُن کو اپنے جاہ کا فکر ہوتا ہے، کہ اگر ہم نے اس نئی آنے والی چیز کو قبول کر لیا تو ہم چوہدری نہیں رہیں گے، چودراہٹ دوسری طرف منتقل ہو جائے گی، ہم سردار نہیں رہیں گے، سرداری کوئی دوسرا لے جائے گا، ہماری

ریاست نہیں رہے گی، وہ ان اغراض کی وجہ سے ضد، حسد، حب جاہ، اور حب مال کی بناء پر ان کو نہیں چھوڑتے، اور چھوٹے اس وجہ سے اس پر لگے رہتے ہیں کہ ہمارے بڑے اس مسلک پر ہیں۔

قرآنِ کریم نے چھوٹوں کو بڑوں کے متعلق کیا طرزِ فکر دیا ہے؟

اس لیے قرآنِ کریم نے اکثر و بیشتر یہ عنوان اختیار کیا ہے، جس میں چھوٹوں کو دعوت دی ہے، کہ تم سوچو، ان بڑوں کے پیچھے لگ کر تم جو شرک میں مبتلا ہو اور اللہ کی نافرمانی کر رہے ہو یہ کب تک تمہارے کام آئیں گے، ایک وقت آئے گا جب یہ تم سے بیزار ہوں گے اور تم ان سے بیزار ہو گے، اور پھر اس وقت تم حسرت کرو گے کہ ہائے کاش! ہم ان کے پیچھے نہ لگتے، پھر ان کے اُوپر تم غصہ دکھاؤ گے، کہ آج ہم سے انہوں نے طوطا چشمی دکھائی ہے اور ہمارے کام نہیں آ رہے، اور دنیا میں ہم ان کی خدمت کرتے رہے، اب اگر ہمارا دوبارہ دنیا میں جانا ہو جائے تو ہم بھی ان کو ایسے ہی آنکھیں دکھائیں گے اور ان سے آنکھیں پھیر لیں گے، پھر تم اس قسم کی حسرت و افسوس کرو گے، آج اپنے انجام کو سوچو، اور بڑوں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے نہ لگو، اللہ تعالیٰ کی بات پر کان دھرو، اللہ کے رسول کی بات پر کان دھرو، کیونکہ وہ تمہارے مفاد کی بات کہتا ہے، اور یہ لوگ تم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح سے چھوٹوں کو بڑوں کے متعلق یہ طرزِ فکر دیا ہے، تاکہ اُن کی بڑائی سر سے اُترے، اور سرداری کا رعب یہ اپنے سر سے اتار دیں، اور اتارنے کے بعد صحیح سوچیں اور محض اتباع کی بناء پر جو کفر اور شرک اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ختم ہو جائے۔ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی اتباع کی گئی، یعنی یہ سردار لوگ، مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا: ان لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی، اور یہ سارے عذاب کو دیکھیں گے، اور ان کے تعلقات ٹوٹ جائیں گے، دنیا کے اندر جو ان کے دوستانہ تعلقات تھے وہ ختم ہو جائیں گے۔ "کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اتباع کی کہ کاش! ہمارے لیے لوٹنا ہو جائے، ہم دوبارہ دنیا میں چلے جائیں، تو ہم ان سے لاتعلق ہو جائیں گے، بیزار ہو جائیں گے، جس طرح سے آج یہ ہم سے بیزار ہو گئے ہیں" كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ: اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو دکھائے گا ان کے اعمال حسرتیں، یعنی حسرت اور افسوس بن کر ان کے اعمال ان کے سامنے آئیں گے، وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ: اور یہ لوگ جہنم سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
اے لوگو! کھاؤ اُن حلال پاکیزہ چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو،
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ
بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ سوائے اس کے نہیں وہ شیطان تمہیں حکم دیتا ہے بُرائی کا اور بے حیائی کا

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا

اور حکم دیتا ہے تمہیں اس بات کا کہ تم بولو اللہ پر ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو ﴿۱۶۹﴾ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اتباع کرو

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ

اس چیز کی جو اللہ نے اتاری، وہ کہتے ہیں بلکہ ہم اتباع کریں گے اُس چیز کی جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، کیا وہ

اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اپنے آباء کی پیروی کرتے رہیں گے اگرچہ اُن کے آباء نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ پاتے ہوں؟ ﴿۱۷۰﴾ مثال اُن لوگوں کی جو کافر ہیں

كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ

مثل اس آدمی کے ہے جو پکارے ایسی چیز کو جو نہیں سنتی مگر دعا اور پکار، یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں

فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

پس یہ سمجھتے نہیں ﴿۱۷۱﴾ اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ

اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۷۲﴾ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ نے حرام کیا تم پر مردار

وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہو، پھر جو شخص مجبور کر دیا جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اس حال میں کہ وہ طالب لذت نہ ہو اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۷۳﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ

بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے اتاری کتاب سے، اور اس کے بدلے میں ثمن قلیل حاصل کرتے ہیں

اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ

یہی لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور نہیں کلام کرے گا اللہ ان کے ساتھ

الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ

قیامت کے دن، اور نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے لے لیا گمراہی کو

بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ

ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے، یہ کتنا ہی صبر کرنے والے ہیں آگ پر ﴿۱۷۵﴾ یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾

کتاب ٹھیک ٹھیک اُتاری، اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، وہ دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۱۷۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ:[(1)] یہی لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اب ہم اپنے محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ یوں کردیں گے کہ نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، یہ لوگ جو اللہ کی کتاب کو چھپا کر اس کے عوض میں ثمنِ قلیل حاصل کرتے ہیں یہ اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھرتے، یعنی یہ کھا کر جو اپنے پیٹ بھرتے ہیں یوں سمجھو کہ یہ آگ کھا رہے ہیں، وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اور نہیں کلام کرے گا اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن، وَلَا يُزَكِّيْهِمْ: اور نہ انہیں پاک کرے گا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى: یہی لوگ ہیں جنہوں نے لے لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے، یعنی دنیا میں ضلالت اختیار کی اور ہدایت کو چھوڑا، اور آخرت میں عذاب کو لیا اور مغفرت کو چھوڑا۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ: یہ فعل تعجب ہے مَا اَحْسَنَ زَيْدًا کی طرح، مَا اَحْسَنَ زَيْدًا کا لفظی معنی اگرچہ یوں ہے کہ کس چیز نے خوبصورت کردیا زید کو، ترکیب جس وقت آپ کریں گے تو معنی یونہی ہوگا، لیکن چونکہ اس کو تعجب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زید کتنا ہی خوبصورت ہے، یہ لفظ تعجب کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے، اسی طرح ما اصبرھم کا لفظی معنی تو یہ ہوگا کہ کس چیز نے ان کو صابر بنا دیا آگ پر، کس چیز نے ان کو صبر کرنے والے بنا دیا آگ پر، لیکن جب یہ لفظ فعل تعجب کے طور پر استعمال ہوگا تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ کتنے ہی صابر ہیں یہ لوگ آگ پر، جہنم پر یہ کتنا ہی صبر کرنے والے لوگ ہیں، کیسے صابر ہیں یہ لوگ آگ پر، کیسے صبر کرنے والے ہیں، تو تعجب کے طور پر یہ لفظ بولا جائے گا۔ اسی تعجب کے معنی کو ادا کرنے کے لئے بیان القرآن میں حضرت تھانوی ؒ نے ایک لفظ بولا، شاباش ان کی ہمت پر، کیسے باہمت ہیں آگ پر، شاباش ان کی ہمت پر، بڑے باہمت ہیں آگ پر، بڑے صابر ہیں آگ پر، یہ لفظ تعجب کو ظاہر کرنے کے لئے بولا گیا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ

---

(۱) نظرثانی کے وقت ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے خلاصہ آیات کا ابتدائی حصہ درج نہیں کیا گیا۔

نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب ٹھیک ٹھیک اتاری، واقعی بات کے ساتھ کتاب کو اتارا، جس میں اختلافات کو اٹھانے کے لئے حقیقی اور واقعی بات ظاہر کردی گئی تھی۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ: اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ: وہ دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے توحید کا تذکرہ کرکے مشرکین کی تردید کی تھی، اور جو لوگ انداد بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقابل دوسروں کو اختیار کرتے ہیں اُن پر رد کیا گیا تھا۔ اب یہاں کچھ رسوم شرکیہ کی تردید کرنا مقصود ہے، مشرکوں نے جو طور طریقہ اختیار کرلیا تھا اُس کے متعلق کچھ انکار کیا جارہا ہے، خاص طور پر اُن کے تحلیل وتحریم کے مسئلے میں۔

کسی چیز کو حلال وحرام ٹھہرانا صرف اللہ کا کام ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کو واحد جاننے کا یہ تقاضا بھی ہے کہ احکام دینے کا حق صرف اُس کے لئے تسلیم کیا جائے، کسی چیز کو حلال ٹھہرانا اور کسی چیز کو حرام ٹھہرانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، کسی دوسرے کے لئے یہ منصب نہیں۔ اللہ کا رسول اور نبی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے، جس بات کو وہ صراحتاً قال اللہ کے طور پر کہہ دے اس کو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کا قول ہے، اور جس کو وہ قال اللہ کے طور پر نہ کہے تو ہم کہیں گے کہ اس کو نبی نے حرام ٹھہرایا، نسبت اُس کی طرف ہوگی، لیکن نبی کا یہ منصب خدا کا عطا کردہ ہے، اور دین کے اعتبار سے نبی کی جو بات ہوا کرتی ہے وہ اللہ ہی کی بات ہوتی ہے، اس کی ذمہ داری اللہ پر ہے، چونکہ اس نے اپنا نمائندہ بنا کر تمہارے سامنے بھیج دیا، اب وہ جو کہے گا اس کی ذمہ داری اللہ پر ہے، اس لیے درحقیقت وہ بات اللہ کی طرف منسوب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے قول وفعل کا ذمہ لیا ہوا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی انسان ہونے کی حیثیت سے اس سے کوئی لغزش ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً اس کا بیان آجاتا ہے، نبی کو لغزش پر برقرار نہیں رکھا جاتا، یہ مسئلہ اصول فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا، اس لیے جس بات پر اس کو برقرار رکھا جائے تو یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جائز قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو قبول کرلیا، اب وہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ ہے، چاہے اُس کی ظاہری نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے، اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (سورۂ نجم) کا یہی معنی ہے کہ یہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں فرماتے، جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی شدہ ہوتا ہے، چاہے اُس کے الفاظ وحی ہوں یا نہ ہوں، مضمون جو بھی ہوگا من جانب اللہ ہوگا:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس کا یہی معنی ہے کہ اس کی کہی ہوئی بات اللہ کی کہی ہوئی ہوتی ہے، اگرچہ بظاہر اللہ کے بندے کے منہ سے نکلی ہو۔ تو تحلیل وتحریم کا منصب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے تجویز کرلینا، کہ اس کے کہنے سے کسی چیز کو حلال قرار دے دیا جائے اور اس کے کہنے سے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا جائے یہ بھی شرک کا شعبہ ہے۔

یہود ونصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو کیسے رَبّ بنالیا تھا؟

چنانچہ قرآنِ کریم میں جو یہ آیت اتری اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۱) ان لوگوں نے یعنی یہود ونصاریٰ نے (کیونکہ احبار ورہبان یہود ونصاریٰ کے تھے۔ احبار: حِبر کی جمع، علماء۔ رُہبان راہب کی جمع، درویش، مشائخ، پیر) انہوں نے اپنے علماء کو اور اپنے مشائخ اور درویشوں کو اللہ کے علاوہ رَبّ بنالیا، یہ علماء کو اور اپنے پیروں کو رَبّ کی جگہ سمجھتے ہیں۔ یہ آیت قرآنِ کریم میں موجود ہے، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ، یعنی یہ حاتم جو مشہور سخی گزرا ہے اس کے بیٹے عدی رضی اللہ عنہ، یہ پہلے عیسائی تھے، بعد میں مسلمان ہوگئے، تو سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے آکر انہوں نے یہ اشکال کیا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ اِن یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورُہبان کو رَبّ بنالیا، حالانکہ وہ تو اپنے احبار ورُہبان کو رَبّ نہیں کہتے، قرآن نے یہ الزام کیسے لگادیا؟ یہ عدی بن حاتم نے اشکال کیا۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا وہ اپنے علماء اور درویشوں کے کہنے سے بعض اشیاء کو حرام نہیں ٹھہرا لیتے چاہے اللہ کی کتاب میں اُن کے حلال ہونے کا ہی تذکرہ ہو؟ کہنے لگے ہاں جی! ایسے تو ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشائخ کی بات پر ہی اعتماد کرتے ہیں چاہے اللہ کی کتاب کسی چیز کو حلال ٹھہرائے لیکن اگر مشائخ کہہ دیں کہ حرام ہے تو وہ لوگ بھی اس کو حرام قرار دے دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر اللہ کی کتاب کسی چیز کو حرام ٹھہرائے اور تمہارے علماء اور درویش کہہ دیں کہ حلال ہے تو کیا وہ اس کو حلال نہیں سمجھتے؟ وہ کہنے لگے ہاں جی! ایسا بھی ہوتا ہے، کہ اگرچہ اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی ممانعت آئی ہوئی ہو اور اُس کو حرام ٹھہرایا ہوا ہو، لیکن اگر علماء اور مشائخ کہہ دیں کہ یہ جائز ہے تو وہ اس کو حلال قرار دے دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی اِتخاذِ رَبّ ہے،[1] کہ انہوں نے تحلیل اور تحریم کا منصب اپنے علماء کو اور مشائخ کو دے دیا۔ اس لیے مسئلہ یونہی ہے کہ تحلیل وتحریم اور اس قسم کے احکام دینا بھی اللہ تعالیٰ کا منصب ہے، اللہ تعالیٰ کی نیابت میں اللہ تعالیٰ کی ترجمانی اللہ کا رسول کرتا ہے۔ اگر اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف کسی چیز کا استناد نہ ہو، اُس کی طرف سے تو ہو حلت، اور کوئی فتویٰ دے دے کہ یہ حرام ہے، اور اُس کے ماننے والے یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے اس چیز کو حلال کہا ہے اور اللہ کے رسول نے اس کو حلال کہا ہے اور یہ حرام کہتا ہے، لیکن چونکہ ہمارا پیر ہے، چونکہ ہمارا مولوی ہے، ہم تو اسی کے فتوے پر چلیں گے، اسی کے قول پر عمل کریں گے، چاہے اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تو یوں سمجھو کہ اس نے اس پیر کو یا اُس عالم کو اللہ کا شریک ٹھہرادیا، اور یہ اِتخاذِ رَبّ کا مصداق ہے۔

---

(۱) روح المعانی سورۂ توبہ آیت ۳۱ کے تحت/ نیز دیکھیں: ترمذی ۲/ ۱۴۰ تفسیر سورۂ توبہ/ سنن کبریٰ بیہقی ۱۰/ ۱۱۶۔

تحلیل وتحریم کے اعتبار سے مشرکینِ مکہ کا شرک

اور مشرکینِ مکہ یوں کرتے تھے کہ بہت ساری چیزیں جو فی الواقع اللہ نے حلال ٹھہرائی تھیں اُن کو وہ اپنے بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام کر لیتے، اور بہت ساری چیزیں جو اللہ نے حرام ٹھہرائی تھیں اُن کو اپنے رسم ورواج کے تحت جائز سمجھتے تھے، جیسے مردار کھاتے تھے اور اس قسم کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تھے، جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔ تو تحلیل وتحریم کے اعتبار سے جو اُن کا شرک تھا اِس رکوع میں اس پر انکار کرنا مقصود ہے، اور مسلمانوں کو تاکید کرنی مقصود ہے کہ تم بچ کے رہنا، اور اِن کے طور طریقے سے متاثر ہو کر کہیں تم نہ پھسل جانا، اللہ تعالیٰ نے جو چیز حلال ٹھہرائی ہے اُس کو حلال جانتے ہوئے کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ مشرکین کی ایک یہ عادت یہاں زیرِ بحث آئے گی کہ وہ لوگ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے بتوں کی طرف منسوب کر کے اپنے لیے حرام قرار دے لیتے تھے، جیسے کوئی بکرا ''لات'' کے نام پر چھوڑ دیا کہ یہ ہم نے ''لات'' کو دے دیا، اس کی طرف منسوب کر دیا۔ اسی طرح عزّیٰ کے نام پر چھوڑ دیا، گائے چھوڑ دی، اونٹنی چھوڑ دی، اونٹ چھوڑ دیا، جس طرح سانڈ چھوڑے جاتے ہیں، اور وہ سمجھتے تھے کہ اب یہ ہمارے آلہہ کے نام ہو گئے، ہمارے نہیں رہے، اب ان پر سواری کرنا حرام، ان کا دودھ پینا حرام، ان کا گوشت کھانا حرام، مجاور اس کو کچھ کریں تو کریں، یعنی جن کو سمجھتے تھے کہ یہ بتوں کے مجاور ہیں اور بتوں کے نائب مناب ہیں وہ اس میں کچھ تصرف کریں تو کریں، باقی! مالک اپنے لیے ان کی سواری کو، ان کے دودھ کو، اُن کے گوشت کو اور اس قسم کی چیزوں کو اپنے لیے حرام سمجھتا تھا۔ مختلف انداز کے ساتھ یہ جانور چھوڑے جاتے تھے، جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ مائدہ میں تفصیلاً آئے گا مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (سورۂ مائدۃ: ۱۰۳) اللہ نے بحیرہ سائبہ وصیلہ حام کوئی نہیں بنائے، یہ کافر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ''یہ اللہ کا بتایا ہوا طریقہ ہے، جب ہم یوں کرتے ہیں تو یہ جانور حرام ہو جاتے ہیں''، اللہ نے یہ کوئی نہیں بنائے، بہر حال وہاں اس کی تردید آئے گی۔ تو یہ جانور جو حلال تھے اور اُن سے انتفاع حلال تھا اُن کو بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام قرار دے لیتے، اور جو اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے تھے ان کو اپنے رسم ورواج کے طور پر کھاتے تھے جیسے دَم، میتہ، ما اھل بہ لغیر اللہ، اور خنزیر کا گوشت، یہ حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تھیں اور وہ اپنے رواج کے طور پر ان کو استعمال کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں دونوں پہلوؤں کے اُوپر انکار کرتا ہے کہ تمہارا حلال کو حرام ٹھہرانا بھی غلط، اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے اُن کو تمہارا حلال سمجھنا بھی غلط۔ اور دونوں باتوں کی وضاحت کر کے اہلِ ایمان کو یہ سمجھایا جائے گا کہ تم اِس بات سے بچو، جو حلال ہے اُس کو حلال جانو، اور جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اُس کو حرام جانو۔

فوت شدہ بزرگ کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کا حکم

اب مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی قبر کی طرف یا کسی فوت شدہ پیر اور بزرگ کی طرف نسبت کر کے جانور کو کسی خانقاہ پر لے جا کے چھوڑ دیتا ہے، کہ یہ جانور ہم نے اس بزرگ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس بزرگ کو دیا، اور دینے والے مالک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اس خانقاہ کا متولی ہے وہ تو اس کو استعمال کرے لیکن میرے لیے اس کا استعمال حرام ہو گیا۔ جیسے مرغا لے جا کر چھوڑ

دیا، بکرا لے جا کر چھوڑ دیا، گائے بھینس لے جا کر خانقاہ کی طرف نسبت کر دی کہ ہم نے یہ گائے بھینس اس بزرگ کو دے دی، اور نیت اُن کی یہ ہوتی ہے کہ تا کہ یہ بزرگ خوش ہو جائے اور ہمیں اِس کی رضا حاصل ہو جائے، ایسا جانور مالک کی ملکیت میں باقی رہتا ہے، اور یہ جانور حلال ہے، حرام نہیں ہے، اس لیے مالک کی اجازت کے ساتھ اس کو ذبح کر کے کھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ مالک اپنے طور پر متولیٔ خانقاہ کو دے گیا تو اگر وہ متولیٔ خانقاہ اُس کو بیچ بھی دے تو اس کے خریدنے والے کے لئے بھی اس کا کھانا جائز ہے۔ صرف یہ کہنے کے ساتھ کہ ہم نے یہ جانور اِس بزرگ کو دے دیا اور اُس کی روح کو خوش کرنے کے لئے جانور جو چھوڑ دیا جائے، جیسے مشرکین کے اندر بحیرہ سائبہ وغیرہ کی بات تھی، تو اس کے ساتھ اُس جانور میں حرمت نہیں آتی، البتہ یہ فعل عمل حرام ہے لیکن وہ جانور حلال ہے۔ اور یہاں اِس آیت میں مراد وہی صورت ہے۔ پھر اگر اُس بزرگ کی طرف نسبت کر کے ذبح کر دیا جائے اور اُس کی روح اس جذبے سے نکالی جائے تا کہ اس کے ساتھ وہ بزرگ خوش ہو جائے، اس کی تفصیل مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں آ رہی ہے، یہ وہاں ذکر کریں گے۔ جو جانور زندہ چھوڑ دیا جاتا ہے، اور زندہ جا کر دے دیا جاتا ہے، اس بزرگ کے نام پر ذبح نہیں ہوتا تو یہ جانور حلال رہتا ہے، اِس نسبت کے ساتھ وہ حرام نہیں ہوا، البتہ مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے۔ اسی طرح قبروں پر جو لوگ پیسے یا شیرینی یا اس قسم کی چیز اُس بزرگ کی طرف نسبت کر کے ڈال آتے ہیں ان کا حکم تو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں ذکر کریں گے۔ البتہ اگر کوئی جانور قبر کی طرف منسوب کر کے زندہ چھوڑ دیا جائے جیسے سانڈ چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس صورت میں مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے، پھر چاہے اُس کی اجازت کے ساتھ مجاور استعمال کر لیں یا مجاور کسی دوسرے کو اجازت دے دیں اور وہ بسم اللہ پڑھ کر قاعدے کے مطابق اس کو ذبح کر لے تو ایسی صورت میں وہ حلال ہو جائے گا۔ بہر حال یہ جو مشرکین مکہ حرام ٹھہراتے تھے تو ان کا یہ طریقہ غلط ہے اور یہ عمل حرام ہے، لیکن اس طرح سے چھوڑنے کی صورت میں جانور حلال رہتا ہے، وہ حرام نہیں ہوتا۔ پہلی آیت کے اندر تو اس پر انکار ہے کہ اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اُس میں سے حلال اور طیب کو کھایا برتا کرو، اپنی طرف سے اس کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، اپنی طرف سے اس کو حرام کرنے کی کوشش نہ کرو۔

''كُلُوْا'' سے مراد صرف کھانا نہیں

''کھاؤ برتو'' یہ کہہ کر كُلُوْا میں تعمیم کر دی، کیونکہ ہمارے محاورے میں بھی کھانا صرف یہ نہیں ہوتا کہ منہ کے ذریعے سے اُس کو نگل لیا جائے، اگر کوئی آپ کا دس ہزار دبا کر مکان ہی بنا لے تو بھی آپ یہی کہیں گے کہ میرا دس ہزار روپیہ کھا گیا، جیسے کہتے ہیں کہ یتیم کا مال تھا سارے کا سارا فلاں شخص کھا گیا، اب چاہے اس نے اُس مال کی کار ہی لے لی ہو پھر بھی کہتے یہی ہیں کہ فلاں شخص یتیم کا مال کھا گیا، اسی طرح فلاں شخص سود کھاتا ہے، فلاں شخص رشوت کھاتا ہے، اب وہ رشوت لے کر چاہے اپنے گھوڑے کو چارہ ہی ڈال دے لیکن آپ کہیں گے کہ فلاں کھا گیا۔ اس لیے کھانے سے مراد ہمارے ہاں بھی برتنا ہی ہوتا ہے، کہ اگر کھانے کی چیز ہے تو کھا لی، پینے کی چیز ہے تو پی لی، پہننے کی چیز ہے تو پہن لی، بہر حال جس طرح سے بھی اس کو برتا جا سکے تو یہ برتنا ہمارے محاورے میں بھی کھانے کا ہی مصداق ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ یوں کریں گے کہ مَا فِي الْاَرْضِ میں سے حلال اور پاکیزہ چیز کو کھایا

برتا کرو، اپنے طور پر اس کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، یہ حرام ٹھہرانے کی رسم جو تم نے اختیار کرلی یہ تمہیں شیطان نے سمجھائی ہے، تاکہ تمہیں اللہ کی نعمتوں سے محروم کردے اور آخرت میں بھی تم اللہ کے عذاب میں مبتلا جاؤ، یہ شیطانی طریقہ ہے۔

شیطان اِنسان کا صریح دُشمن ہے جو بے حیائی کا مشورہ دیتا ہے

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ: اِن چیزوں کو حرام ٹھہرا کر، حرام قرار دے کر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یہ شیطان کی پیروی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہیں، اللہ نے جس چیز کو حلال اور پاکیزہ ٹھہرادیا، جو چیز حلال ہے اور صاف ستھری ہے، طبیعت اُس کی طرف رغبت کرتی ہے، لذیذ ہے، اس کو کھاؤ، اور اس کو حرام ٹھہرانا شیطانی طریقہ ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: یہ تمہارے لیے صریح دُشمن ہے، اور تمہیں اس قسم کے طریقے سجھا کر اللہ کی نعمتوں سے محروم کرتا ہے، اور اللہ کی ناراضگی میں تمہیں پھنساتا ہے۔ ''سوائے اس کے نہیں کہ وہ شیطان جو تمہارا دُشمنِ مبین ہے وہ تمہیں حکم دیتا ہے بُری باتوں کا اور بے حیائی کی باتوں کا'' حکم دیتا ہے یعنی مشورہ دیتا ہے، تمہارے دل میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جو تمہیں برائی اور بے حیائی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ سوء عام آگیا، کہ عقل کے نزدیک، فطرتِ صحیحہ کے نزدیک، اور اللہ کے احکام کی رو سے جو بُرا کام ہے سوء کا مصداق ہے۔ اور فحشاء اُس میں سے شدید قسم کے آگئے جیسے زنا، لواطت، ننگے طواف کرنا، اور اس قسم کی کھلی کھلی بے حیائیاں فحشاء کا مصداق ہیں۔ ''اور تمہیں اس بات کا مشورہ دیتا ہے کہ تم اللہ پر ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے'' تم ایک بات منسوب کردیتے ہو کہ ہمیں اللہ نے کہا ہے کہ یوں کیا کرو، حالانکہ تمہارے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہوتی جس کے ساتھ تم ثابت کرسکو کہ کہاں اللہ نے کہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب وہی بات کرنی چاہیے جس کے متعلق انسان کو علم ہو کہ یہ واقعی اللہ کی ہے، اور علمی دلیل کے ساتھ ثابت کیا جاسکے کہ یہ اللہ کا قول ہے، وہی بات اللہ کی طرف منسوب کرنی چاہیے، ورنہ یہ افتراء علی اللہ ہے، اللہ پر جھوٹ بولنا ہے، جس کا عذاب ہوگا، اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ سے وہی افتراء اور بہتان باندھنا مراد ہے۔

عقل وہدایت سے محروم آباء کی اتباع ممنوع ہے

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرو'' یعنی جو طریقہ اللہ نے بتایا ہے اور جو مذہب اللہ نے ظاہر کیا ہے اس کی اتباع کرو، عقل کے مطابق اور فطرتِ صحیحہ کے مطابق یہی بات ہے، کہ جب اشیاء کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، تو اس میں سے کون سی استعمال کرنی ہمارے لیے ٹھیک ہے اور کون سی استعمال کرنی ٹھیک نہیں ہے، یہ اللہ سے پوچھو، جو وہ احکام دے وہی ماننے چاہئیں، اِس کے جواب میں اُن کے ہاں جو دلیل ہے وہ یہی ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کیا ہے، ہم تو صرف اسی طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، تو ان کی دلیل اتباع آباء ہے، جس کے ساتھ وہ اپنے اعمال کے لئے جواز مہیا کرتے ہیں۔ پوچھو کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادے کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا ہے، بس یہ آباء کی اتباع اُن مشرکوں کی سب سے بڑی دلیل ہے، کہ جس طریقے پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہم تو اسی طرح سے کریں گے، ہم اپنے آباؤ اجداد کا طریقہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، یہ مشرکوں کی دلیل ہے۔ تو اس دلیل کو اللہ تعالیٰ ان الفاظ کے ساتھ باطل کرتے ہیں کہ

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ: اتباع اُس کی کی جاسکتی ہے جس کا طریقہ عقل وہدایت کے مطابق ہو، وہ اپنے طریقے کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلیل رکھتا ہو یا نقلی دلیل رکھتا ہو۔ يَهْتَدُوْنَ کا مصداق نقلی دلیل ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے پاس کوئی راہنمائی ہے، وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے یا صحف سے کوئی دلیل بیان کرسکتا ہے۔ اور، اور يَعْقِلُوْنَ کا مصداق عقلی دلیل ہے، کہ استنباط واجتہاد اور قیاس جو کہ اُن احکام کے سمجھنے کا صحیح طریقہ ہے اُس طرح سے کوئی عقلی استدلال کے ساتھ اس کو ثابت کرسکے۔ اگر کوئی آدمی اپنے مسلک کے اُوپر عقل ونقل کے دلائل رکھتا ہے اُس کے تو پیچھے لگنا چاہیے، اور اگر کسی کا طریقہ ایسا ہے کہ نہ اس کے پاس کوئی نقلی دلیل ہو اور نہ کوئی عقلی دلیل ہو، بے عقل اور بے ہدایت، نہ اُن کے پاس عقل ہے نہ نقل، نہ اپنے مسلک کے لئے وہ کوئی نقلی دلیل پیش کرسکیں کہ دیکھو اللہ نے یوں کہا، اور نہ وہ کوئی قیاسِ صحیح یا اجتہادِ صحیح یا کسی اور عقلی دلیل کے ساتھ ثابت کرسکیں، ایسوں کے پیچھے لگنا بے عقل اور بے ہدایت لوگوں کا ہی کام ہے۔ جو ان کے پیچھے لگے گا تو جیسے وہ بے عقل اور بے ہدایت، ایسے ہی یہ بے عقل اور بے ہدایت۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان سے پوچھو کہ تم اپنے آباء کے پیچھے لگے رہو گے؟ اگرچہ تمہارے آباء پرلے درجے کے جاہل بے عقل اور بے ہدایت ہوں۔ ایسے لوگوں کے پیچھے لگنا کون سی عقلمندی ہے؟ تو یہاں اُن لوگوں پر کرنا مقصود ہے جو اپنے ایسے آباء کے پیچھے لگتے ہیں جو عقل وہدایت سے محروم ہوں، کہ ان کے پیچھے لگنے کی اجازت نہیں۔

عقل وہدایت سے معمور ائمہ کرام رحمہم اللہ کی اِتباع محمود ہے

البتہ اگر کسی کا بڑا، چاہے وہ باپ ہو، دادا ہو، پردادا ہو، کوئی پیشوا ہو، جس کے متعلق ہمیں پتہ ہے کہ وہ علوم نقلیہ کا ماہر ہے اور علوم عقلیہ کا ماہر ہے، اور اپنے ہر طریقے پر وہ عقل ونقل کے ساتھ صحیح دلائل رکھتا ہے، لیکن ہم اس پائے کے نہیں ہیں کہ اس کے دلائل کو سمجھ سکیں، ہمیں اس پر اعتماد ہے کہ جو بات کہتا ہے قرآن وحدیث سے کہتا ہے، جو بات کہتا ہے یا تو صراحتاً قرآن وحدیث میں آئی ہوئی ہے یا وہ صحیح طریقے کے ساتھ استنباط کر کے کہتا ہے، تو کسی کے علم پر، عمل پر اور دیانت پر اس طرح اعتماد کر کے اگر کوئی بات مانی جائے تو وہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے، ایسے لوگوں کے تو پیچھے لگنا چاہیے، اگر کسی کے آباؤ اجداد ایسے ہیں کہ عقل اور ہدایت کی دولت سے مالا مال ہیں، اُن کی تو اتباع مقصود ہے۔ اس لیے اس آیت کو ائمہ کرام کی تقلید کی ممانعت کے لئے پڑھنا جہالت ہے، اس سے ائمہ کرام کی تقلید کی ممانعت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بے عقل اور بے ہدایت نہیں، بلکہ اپنے ہر مسلک کے لئے وہ نقلی دلیل بھی رکھتے ہیں اور عقلی دلیل بھی رکھتے ہیں، جس کے ساتھ وہ ثابت کرتے ہیں کہ واقعی یہ حکم خداوندی ہے۔ اور جو بے علمی کے ساتھ ایسے ہی بنا بنا کر باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہ مشرکانہ طریقہ ہے، اور ایسے جاہلوں کے پیچھے لگنے کی اجازت نہیں ہے۔

غیر مقلدین کا جاہلانہ اِستدلال

کبھی کسی غیر مقلد سے آپ کو واسطہ پڑے گا، اور آپ کہیں گے کہ ہمارے امام نے یوں کہا، تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی مشرکوں والی بات ہے کہ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا: ہمارے آباء کا طریقہ یہی چلا آتا ہے، وہ بھی تو یونہی کہتے تھے، تو غیر مقلد فوراً یہ آیت آپ کے سامنے پڑھ دیں گے۔ میں اُس کا جواب آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ یہ بات وہاں صادق نہیں آتی، کیونکہ یہ ان آباء کے بارے

میں ہے جو نہ اپنے مسلک پر کوئی صحیح نقل رکھتے ہیں اور نہ اپنے مسلک کو کسی عقلی دلیل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ اور جو ایسے اہلِ علم ہوں جیسے ہمارے آباء ہیں، کہ نقل کے پابند ہیں اور صحیح دلائل کے پابند ہیں، اور ہمیں ان کے علم پر، دیانت پر، اور عقل پر اعتماد ہے، کہ جو کہتے ہیں وہ اللہ کی بات کہتے ہیں، تو اُن کی بات کو یہ کہہ کر ماننا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اقوال کی ہمارے سامنے تفصیل کرتا ہے، اور اللہ کے رسول کی ہمارے سامنے بات کہتا ہے، چاہے ہم اپنے علم کے ساتھ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں، اس اعتماد کے ساتھ اگر کسی کی بات کو مانا جاتا ہے تو یہ تقلید اس آیت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ ہمارے امام لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ کا مصداق نہیں ہیں۔

عقل وہدایت والے آباء کی اتباع قرآن کی روشنی میں

قرآنِ کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرے میں اللہ تعالیٰ سورۂ یوسف میں اُن کا ایک وعظ نقل کیا ہے جو انہوں نے قیدیوں کے سامنے کیا تھا، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (آیت: ۳۸) اب ابراہیم اسحاق یعقوب علیہم السلام یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء کا مصداق ہیں، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْ: میں نے تو اپنے آباء کا طریقہ اپنایا ہے، میں تو ان کے طریقے کا متبع ہوں، میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کے منکر ہیں، میں تو اپنے آباء کے طریقے پر چلوں گا، اور وہ آباء کون ہیں؟ ابراہیم اسحاق یعقوب علیہم السلام، یہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہیں، جن کے متعلق پتہ ہے کہ وہ عقل وہدایت کی دولت سے مالا مال ہیں، لہٰذا ہم تو اُن کے طریقے پہ چلیں گے۔ یہاں بھی دیکھو! اتباعِ ملتِ آباء کا عنوان کتنا صریح آیا ہوا ہے، اور پہلے پارے میں آپ کے سامنے وہ الفاظ گزر گئے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ (سورۂ بقرہ: ۱۳۳) وہ کہنے لگے ہم اس خدا کو پوجیں گے جس کو تو پوجتا تھا اور تیرے آباء پوجتے تھے، تو معرفتِ الٰہیہ کے بارے میں بھی اپنے آباء پر اعتماد کیا، کہ جو الٰہ اُن کا تھا وہی ہم مانیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کے ورثاء کی تقلید کا حکم

اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ جن آباء کا یہاں ذکر آیا ہے یہ تو سارے کے سارے انبیاء علیہم السلام ہیں، ان کی اتباع تو انبیاء علیہم السلام کی اتباع ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی اتباع کا تو انکار نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہی ہے جو میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں، کہ انبیاء علیہم السلام کی اتباع تو ہو گئی فرض کے درجے میں، وہ تو ایمان کی ایک بنیاد ہے، لیکن ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ''[1] جب نبی نہ ہو تو نبی کے ورثاء جو ترجمانی کریں گے جاہل کے لئے وہی حجت ہے۔ جو شخص براہِ راست اللہ اور اللہ کے رسول کے اقوال سے استفادہ نہیں کر سکتا، اس میں اتنی استعداد نہیں ہے، وہ جاہل ہے، نادان ہے، اتنی عقل اور سمجھ نہیں رکھتا، تو علماء انبیاء کے وارث ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اقوال کی اور اللہ کے رسول کے اقوال کی اشاعت کریں گے، اس لیے جس طرح استفادہ انبیاء علیہم السلام سے کیا جاتا ہے اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے روپوش ہو جانے کے بعد وہی استفادہ آپ کے خلفاء اور آپ کے ورثاء سے کیا جائے گا۔ اس

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۹۷ باب ماجاء فی فضل الفقہ / مشکوٰۃ ص ۳۴ کتاب العلم۔ فصل ثانی۔

لیے حدیث میں ہے: ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ ''(۱) میرے طریقے کو لازم پکڑو اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو، اب خلفائے راشدین بھی تو ہمارے آباء ہی ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ''شارع'' نہیں، ''شارح'' ہیں

تو یہ جو ان لوگوں کی اتباع ہوگی وہ اس جذبے کے تحت ہے کہ یہ اپنی بات نہیں کہتے، بلکہ اللہ کی کہتے ہیں، اور اپنی ہر بات پر اللہ اور اللہ کے رسول کی تعلیم سے دلیل رکھتے ہیں، یا وہ بات صراحتاً آئی ہوئی ہوگی یا قیاس اور اجتہاد کا صحیح طریقہ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے راہنمائی کیا ہے اُس کے مطابق استنباط کرتے ہیں۔ اس لیے اِن استنباط کی ہوئی باتوں کو ماننا اللہ اور اللہ کے رسول کی اتباع ہے، کیونکہ ہم اس لیے نہیں مانتے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، بلکہ ہم اس لیے مانتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ظاہر کی ہے، ورنہ ابوحنیفہ کوئی شارع نہیں ہیں، کہ مستقل ہو جائیں، اور قرآن وحدیث سے نظر ہٹا کر اپنی طرف سے احکام دینے شروع کر دیں، ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ ہم ان کو اللہ اور اللہ کے رسول کے اقوال کا شارح سمجھتے ہیں، اس لیے جو وہ مراد ظاہر کرتے ہیں ہم اُس کو اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سمجھ کر مانتے ہیں، چاہے ہم اُس کو براہِ راست قرآن وحدیث سے سمجھ نہ سکیں، لیکن اُن کی عقل اور اُن کا علم اس درجے کا ہے کہ ہمیں اعتماد ہے کہ جو وہ کہتے ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی مراد کے مطابق کہتے ہیں، ان کی بات کو ماننا حقیقت کے اعتبار سے اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو ماننا ہے، اس لیے یہ تقلید ممنوع نہیں ہے۔ ہاں البتہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے خلاف کوئی کہہ دے، اور اپنے اس قول پر کوئی نقل وعقل سے دلیل نہیں رکھتا، تو یوں کلیۃً دوسرے پر اعتماد کر لینا کہ چاہے اس کی بات اللہ اور اللہ کے رسول کے قول کے خلاف ہی ہو، ہم تو اس کی مانیں گے، یہ شرک ہے، اور یہی تھا مشرکوں کا طریقہ جس پر یہاں انکار کیا جا رہا ہے۔

نام نہاد دیوبندیوں سے سوال

اور اسی طرح بعض حضرات جو اپنے آپ کو علمائے دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہیں، بلکہ بزعم خود سچے پکے دیوبندی صحیح طور پر وہی ہیں، اُن سے اگر کسی وقت آپ کی کسی مختلف فیہ مسئلے میں گفتگو ہو جائے گی، اور آپ اُن کے سامنے کوئی ایسی عبارت پڑھیں گے جو مولانا قاسم نانوتوی کی ہوگی، رشید احمد گنگوہی کی ہوگی، رحمۃ اللہ علیہما، یا حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہوگی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہوگی، ان بزرگوں میں سے کسی بزرگ کی عبارت آپ پڑھیں گے کہ بھائی! انہوں نے یوں لکھا ہے، ہم تو اس بات کو مانتے ہیں۔ تو منہ پھٹ جو ہوتے ہیں وہ فوراً وہاں بھی یہی آیت پڑھ دیں گے، وہ کہیں گے کہ ''یہ کیا طریقہ ہوا؟ اللہ کا قول لاؤ، اللہ کے رسول کا قول لاؤ، یہ کہنا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ مسلک ہے یہ تو وہی مشرکوں والی بات ہے کہ ہم تو اپنے بزرگوں کے مسلک پر چلتے ہیں، ہمیں نہیں پتہ کہ اللہ کا کیا حکم ہے، اللہ کے رسول کا کیا حکم ہے!'' یہاں بھی اُٹھا کر یہی

(۱) ترمذی ج۲ ص۹۶ ساجاء فی الاخذ بالسنۃ/ مشکوٰۃ ص۳۰، عن العرباض رضی اللہ عنہ، باب الاعتصام، فصل ثانی۔

بات ٹھونس دیں گے، کبھی آپ کو واسطہ پڑے گا تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی۔ تو اس وقت بھی آپ لوگوں نے یہی کہنا ہوگا، کہ آپ یہ بات اُس وقت کہیے کہ جن کے نام میں لے رہا ہوں، حضرت مولانا قاسم نانوتوی ؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ، حضرت شیخ الہند ؒ، سید انور شاہ صاحب کشمیری ؒ، جن کے نام میں لے رہا ہوں کیا تیرے خیال کے مطابق یہ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ہیں؟ اگر واقعی آپ کے خیال میں لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ہیں تو ایک دفعہ کہہ دو، پھر پتہ چلے گا کہ ان کے نام پر جو روٹیاں کھاتے ہو، وہ پھر کہاں تک ملتی ہیں! اپنے آپ کو دیوبندیوں کی طرف منسوب کر کے اور اِن بزرگوں کا نام لے کر جو روٹیاں کھا رہے ہو تو کہہ دو کہ یہ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ کا مصداق ہیں، اس لیے ہم ان کے اِستنباطات اور ان کی باتیں ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ ان کی باتوں کو ماننا ایسے ہی ہے جیسے مشرکین اپنے آباء کے طریقے پر چلتے تھے، اور اگر تم ان کو لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ نہیں کہہ سکتے بلکہ يَعْقِلُوْنَ يَهْتَدُوْنَ ہیں، اور یقیناً ہیں، عقل وہدایت کے زیور سے آراستہ ہیں، اور عقل وہدایت کی دولت سے مالا مال ہیں، اس لیے اگر کوئی شخص ان کے اقوال پر اس طرح سے اعتماد کرتا ہے کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن وحدیث کی مراد یہی ہے، اس لیے ان کی بات کو ماننا اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو ماننا ہے، تو جس طرح سے ائمہ کی تقلید ہے اُسی طرح سے اگر ان بزرگوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی باتوں کو مان لیا جائے تو یہ قرآن کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ تو ملتِ آباء ہے جس کی اتباع ہمیں کرنی چاہیے، کیونکہ ہمارے آباء ایسے ہیں جو يَعْقِلُوْنَ يَهْتَدُوْنَ ہیں، یہ نعوذ باللہ لَا يَعْقِلُوْنَ وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ نہیں، کہ ہم کہیں کہ انہوں نے قرآن نہیں سمجھا، ہم نے قرآن سمجھا ہے، اس لیے جو ہم کہہ رہے ہیں یہ تو تم مان لو۔

علم وعمل سے مالا مال ماہرین کا فہم معتبر ہے

اب ایک آدمی کہتا ہے ''دیکھو جی! قرآن میں یوں آتا ہے اور انور شاہ یوں کہتا ہے تو میں کیا کروں، میں تو قرآن کو مانوں گا!'' حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن کو نہیں مان رہا، وہ انور شاہ کے فہم کے مقابلے میں اپنے فہم کو ترجیح دے رہا ہے، وہ تاثر تو آپ کو یہ دیتا ہے کہ میرا فہم صحیح ہے، اور جو میں قرآن سے سمجھ رہا ہوں یہ بالکل ٹھیک ہے، اور جو سید انور شاہ صاحب کشمیری ؒ نے سمجھا یا کسی دوسرے نے سمجھا وہ سمجھا ہوا ٹھیک نہیں ہے، تو اصل میں وہ دعوت اپنے فہم کی طرف دے رہا ہے۔ اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ تمہارے فہم کے مقابلے میں اُن کا فہم اچھا ہے، اور جس طرح سے تم سمجھتے ہو اسی طرح سے ہمیں بھی سمجھنے کا حق ہے، پھر ہمارے فہم کے مقابلے میں تمہارا فہم حجت کیسے ہو گیا؟ پھر جو ہم نے سمجھا ہے ہمیں اُس پر رہنے دو، اور جو تم نے سمجھا ہے تم لیے پھرو۔ یہ اصل کے اعتبار سے قرآنِ کریم کا اتباع نہیں، اپنے فہم کا اتباع ہے، یہ اپنے فہم کو دوسروں کے فہم مقابلے میں زیادہ ترجیح دیتے ہیں، جس کی بناء پر کہتے ہیں کہ اُن کا سمجھا ہوا ٹھیک نہیں، اور ہم جو سمجھ رہے ہیں یہ ٹھیک ہے۔ تو ایسے جو گستاخ ہوا کرتے ہیں، اس قسم کے

جاہل لوگ، حقیقت کے اعتبار سے یہ لَا يَعْقِلُوْنَ ہیں، ان کی بات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ بات وہی صحیح ہے جو ان ماہرین نے جو علم وعقل کے ساتھ مالا مال تھے اور زندگی بھر اُن لوگوں نے قرآن وحدیث میں غوطہ زنی کی، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی مرادات کو واضح کیا، اور ان اَسرار ورموز کو اپنی روشنیٔ قلب کے ساتھ پہچانا، قابلِ اعتماد اصل میں انہی کے فرمودات ہیں۔ اور آج کل کے لوگ جن کو دائیں بائیں کی خبر نہیں ہے، یہ تو وہی مثال ہے جو محاورہ آیا کرتا ہے کہ بندر کو کہیں ادرک کی گٹھی مل گئی اور وہ دکان لگا کے بیٹھ گیا کہ میں بھی پنساری ہوں۔ یہاں بھی یہی حساب ہے، کہیں سے دوورقی رسالہ دیکھ لیا تو زعم پیدا ہو گیا کہ ہم نے اس مسئلے کی حقیقت کو سمجھ لیا، اُردو کے چار حرف جان لیے، اخبار میں کوئی مضمون پڑھ لیا، بس اسی پر اچھلتے کودتے پھرتے ہیں، باقی! علم کی ان لوگوں کو کیا خبر؟ جنہوں نے برسہا برس تک قرآن اور حدیث کی ورق گردانی کی، اور اُس زمانے میں تمام امت نے اُن پر اعتماد کیا، اور آج علمی دنیا کی رونق! انہی لوگوں کی برکت سے ہے، آج اس ملک کے اندر اہلِ حق کا گروہ جس کو ہم سمجھتے ہیں کہ علمائے دیوبند کے متبعین ہیں وہ وہی لوگ ہیں جو ان حضرات کے متبع ہیں، جو ان پر اعتماد کرنے والے ہیں انہی کو ہم اہلِ حق سمجھتے ہیں، حق کا نام ونشان اس ملک کے اندر اِن لوگوں کے دم قدم سے آج تک قائم ہے، اور ہم نے انہی کی برکت سے یہ چار حروف سیکھے ہوئے ہیں، اور انہی کی برکت سے آج بیٹھے ہوئے ہم عزت پا رہے ہیں اور روٹیاں کھا رہے ہیں، تو ان کی بات کو اس طرح سے ٹھکرا دینا کہ ہم قرآن اور حدیث کے مقابلے میں اِن کی بات کو کیا کریں، حقیقت کے اعتبار سے وہ بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہوتی، تمہارے اپنے فہمِ فاسد کے خلاف ہے، تمہیں سمجھ نہیں آتی، اس لیے سمجھتے ہو کہ جو ہم سمجھ رہے ہیں یہی ٹھیک ہے، جو اُنہوں نے سمجھا ہے وہ غلط ہے۔ بس یہ اعتماد آپ کی طبیعت میں ہونا چاہیے کہ یہ ہمارے آباء يَعْقِلُوْنَ يَهْتَدُوْنَ ہیں، قرآنِ کریم سے یہ اشارہ تو نکلتا ہے کہ جو باعقل اور باہدایت ہوں ان کا کہنا ماننے چاہیے، اور جو بے عقل اور بے ہدایت ہوں ان کا کہنا نہیں ماننا چاہیے۔ اس لیے ایسے موقع پر اگر کوئی یہ آیت پڑھتا ہے تو یہ حد سے تجاوز ہے۔

عالم ہو کر جاہل کی اتباع کرنا علم کی توہین ہے

ہاں البتہ جہاں تک جاہل آباء کی بات ہے، جیسے خاندانی رسوم ہوتی ہیں، اب آپ نے علم حاصل کر لیا، آپ علمی دلیل کے ساتھ جانیں گے کہ یہ رسم غلط ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے جو کام کا طریقہ بتایا ہے اُس کے یہ خلاف ہے، اللہ کے رسول کی جو سنت ہے اُس کے یہ طریقہ خلاف ہے، آپ علم اور عقل کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے، لیکن پھر آپ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں صرف اس وجہ سے کہ ہماری خاندانی رسم ہے، چاہے سنت کے خلاف ہے، چاہے شریعت کے احکام کے خلاف ہے، یہ جہالت کی اتباع ہے۔ تو علم والے ہو کر جہالت کی اتباع کرنا علم کی توہین ہے، اس کی ممانعت ہے، یہ پھر وہی بات ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۴۵) یہ حضور ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے، لیکن سنانا دوسروں کو مقصود ہے، کہ اگر علم آ جانے کے بعد آپ نے ان لوگوں کی

خواہشات کی اتباع کی (اور جو بھی شریعت کے خلاف کہتا ہے وہ خواہشات ہی خواہشات ہیں) تو پھر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آپ آجائیں گے، یہ بات وہاں صادق آئے گی جہاں علمی طور پر آپ ایک طریقے کی غلطی سمجھ گئے لیکن خاندان کے رسم و رواج کی پابندی کرتے ہوئے آپ ویسے ہی کرتے ہیں جیسے آپ کے آباء کا طریقہ چلا آرہا ہے، چاہے آپ جانتے ہیں کہ یہ عقل و ہدایت کے خلاف ہے، یہ اتباع ٹھیک نہیں ہے۔

مشرکین جانوروں کی طرح کیسے ہیں؟

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ: اس آیت میں مشرکین کے سُوءِ فہم کو ایک مثال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، کہ ان کی مثال چوپایوں جیسی ہے، جانوروں جیسی ہے، جیسے اُن کو کوئی پکارے، آواز دے، بلائے، تو اُن کے کان تک آواز تو پہنچتی ہے لیکن وہ اُس کا مضمون نہیں سمجھتے، مفہوم اُن کے ذہن میں نہیں آتا، اسی طرح یہ مشرکین بھی جانوروں کی طرح ایسے بدفہم ہیں کہ حق سننے سے بالکل بہرے ہو گئے ہیں، حق بات کہنے سے گونگے ہو گئے ہیں، اور حق دیکھنے سے اندھے ہو گئے ہیں، اب ان کی عقل ٹھکانے نہیں، اور ان کی مثال بالکل جانوروں جیسی ہے۔ اس میں سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دینی مقصود ہے، کہ آپ کے بار بار سمجھانے کے باوجود اگر ان کی طبائع پر اثر نہیں ہوتا تو آپ اس کی فکر نہ کریں، انہوں نے اپنی استعداد خراب کر لی، اب یہ انسان نہیں بلکہ عام حیوانوں کی طرح ہیں، جیسے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی اس قسم کے الفاظ آئیں گے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (سورۂ اعراف: ۱۷۹) یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اور ان الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہاں مثال دی گئی ہے كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ: مثل اُس شخص کے جو پکارتا ہے، تو کافروں کی مثال پکارنے والے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ پکاری ہوئی چیز کے ساتھ ہے، جس کا مصداق ہے مَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً۔ تو جو مثل کا مجرور ہے اور اس کا براہِ راست مدخول ہے وہ مثال نہیں ہے، بلکہ مثال بنتی ہے مَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً۔ اس لیے یا تو یوں کہیے کہ یہ تشبیہ دی گئی ہے مرکب کے ساتھ جس میں مشبہ بہ صرف ایک جزء ہے، پھر ترجمہ یوں ادا کریں گے ''ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، ایسے ہے جیسے کہ اس مثال میں مَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً کو ذکر کیا جا رہا ہے، ایسے ہے جیسے کہ کوئی شخص پکارے ایسی چیز کو جو نہیں سنتی سوائے چیخ و پکار کے''، اور مشبہ بہ جس کو بطورِ مثال کے بیان کرنا مقصود ہے وہ مَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ہے، اور مشبہ ہو جائیں گے الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ کافر لوگوں کی مثال اُس جانور جیسی ہے جو نہیں سنتا مگر چیخ و پکار، تو اس مرکب میں سے ایک جزء مثال ہے، سارا مرکب مثال نہیں ہے۔ یا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے پہلے داعی کا لفظ محذوف نکال لیجئے، مَثَلُ دَاعِی الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: ان کافروں کو بلانے والے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص بلائے، جیسے کوئی شخص بلانے والا ہو، جیسے کوئی شخص آوازیں دیتا ہو ایسی چیز کو جو سوائے چیخ و پکار کے کچھ نہیں سنتی، یعنی آپ ان کو آوازیں دیتے ہیں، راہِ حق کی طرف بلاتے ہیں، سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں، تو یہ آپ کی آواز تو سنتے ہیں، لیکن اُس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، جس

طرح سے کوئی جانوروں کا چرواہا جانوروں کی آواز دے، تو وہ کوئی پُرمعنی بات نہیں سمجھتے، مضامین سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اگرچہ چیخ وپکار اُن کے کان تک جاتی ہے۔

صُمٌّ: یہ بہرے ہو چکے ہیں، اِن کے کانوں کی استعداد خراب ہوگئی، اب آپ جانتے ہیں کہ وہ حقیقتاً تو بہرے نہیں تھے، جب ایک آدمی کوئی نفع کی بات سن کر اُس پر عمل نہ کرے، سنی اَن سنی کردے، وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بہرہ، کیونکہ بات سننے سے مقصد تو ہے اُس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا، جب توجہ کے ساتھ سنی نہیں جائے گی، سمجھی نہیں جائے گی، اور عمل نہیں کیا جائے گا، تو سننا نہ سننا برابر ہے۔ اور یہی مطلب ہے بُكْمٌ کا، بُكْمٌ اَبْكَمُ کی جمع ہے، ابکم کہتے ہیں گونگے کو، جو زبان سے صحیح بات کہتا نہیں۔ عُمْیٌ جمع ہے اعمیٰ کی، اعمیٰ اندھے کو کہتے ہیں، جب ان کے کان آنکھیں اور زبان ماؤف ہوگئی تو فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: پس یہ سمجھتے کچھ نہیں ہیں، اِن کو عقل نہیں ہے، عَقَلَ يَعْقِلُ: سوچنا، لیکن جس وقت آگے مفعول ذکر نہ کیا جائے تو بسا اوقات اسی فعل کی نفی کرنی مقصود ہوتی ہے، تو هُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ کا معنی یہ ہوگا کہ ان کو عقل نہیں ہے، جیسے لَا يَعْلَمُوْنَ کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اِن کو علم نہیں ہے، مفعول ذکر کرنا مقصود نہیں، صرف معنی حدثی کی نفی کرنی مقصود ہے۔

ایمان والوں کو حلال کھانے اور شکر ادا کرنے کا حکم

''اے ایمان والو! کھاؤ تم جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں'' کھاؤ کا معنی وہی جو ذکر کیا تھا کہ کھاؤ برتو، استعمال کرو، یعنی تم اِن مشرکین کی طرح حلال چیزوں کو اپنے طور پر حرام ٹھہرانے کی کوشش نہ کرو، جو کچھ اللہ نے دیا ہے اُس میں سے پاکیزہ لذیذ چیزیں جو تمہیں مرغوب ہیں انہیں کھاؤ اور برتو۔ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ: اور اللہ کے شکر گزار رہو، اللہ کا شکر ادا کرتے رہو، ''اگر تم اسی کو ہی پوجتے ہو'' اگر تم اسی کی ہی عبادت کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ، اور اُن حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو اپنے طور پر مشرکین کی طرح غیر اللہ کی طرف منسوب کر کے حرام نہ قرار دو، یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی ہو جاتی ہے کہ اُس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو خواہ مخواہ حرام ٹھہرایا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بھی منافی ہے، کیونکہ جب غیر اللہ کی طرف ان چیزوں کو منسوب کیا جائے گا، اُن کو نذرانے اور چڑھاوے دیے جائیں گے تو یہ غیر اللہ کی عبادت ہو جائے گی۔ اور اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو، غیر اللہ کی عبادت نہیں کرتے، تو پھر تم حلال چیزوں کے بارے میں اور جانوروں کے بارے میں اس قسم کے تصرف نہ کرو جس طرح سے مشرکین کرتے ہیں۔

کلمۂ ''اِنَّمَا'' کے متعلق ایک سوال جواب

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ: اِنَّمَا حصر کے لئے ہوتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے حرام کیا تم پر میتہ، مشرکین میتہ کھاتے تھے، اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراتے تھے، اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے، تو جو چیز زیر بحث ہے اُن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ جن کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں، حرام تو یہ چیزیں ہیں، اس لیے اس میں حصر اضافی ہے، یہ نہیں کہ ان چار چیزوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں، بلکہ جن چیزوں کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں، اُن کے مقابلے میں یہ حرام

ہیں جن کو یہ حرام نہیں سمجھتے (مظہری وغیرہ)۔ یا دوسرے طور پر یوں کہہ لیجئے کہ ان چیزوں کو حرمت میں بند کرنا مقصود ہے، کہ یہ چیزیں حرام ہی ہیں، ان میں حلت کا شبہ نہیں (تفسیر عثمانی)، اور ایک ہے کہ حرمت کو ان میں بند کرنے کی کوشش کریں، پھر مطلب ہوگا کہ حرام چیزیں یہی ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور حرام نہیں، اِنَّمَا کے ساتھ حصر دونوں طرح سے ادا ہو جاتا ہے، ایک یہ ہے کہ یہ چیزیں حرام ہی ہیں، گویا ان چیزوں کو حرمت میں بند کر دیا، ان کے اندر حلت کا کوئی شبہ نہیں ہے، یہ جو ان کو حلال کہہ رہے ہیں غلطی کر رہے ہیں، یہ چیزیں حرام ہی ہیں، اللہ نے ان کو صرف حرام ہی ٹھہرایا ہے، تو یہ چار چیزیں بند ہو گئیں حرمت میں، اور ایک یہ ہے کہ حرام یہی چار چیزیں ہیں، اس کا مطلب ہوگا کہ حرمت ان چار چیزوں میں بند ہو گئی، ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں ہے۔ اگر تو پہلا معنی لیا جائے کہ ان کو حرمت میں بند کیا جائے کہ یہ چیزیں حرام ہی ہیں، حلال نہیں ہیں، تو پھر اس مضمون پر کوئی شبہ نہیں ہے، واقعی یہ حرام ہیں، ان کے اندر حلت کا کوئی شبہ نہیں۔ اور اگر یوں ترجمہ کیا جائے کہ حرام صرف یہی چار چیزیں ہیں، اور کوئی حرام نہیں، تو پھر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ حرام تو اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں، خود قرآنِ کریم میں بعض چیزوں کا حرام ہونا مذکور ہے، جیسے ابھی اگلی آیت کے اندر ایک بات آئے گی۔ تو پھر اس حصر کا کیا مطلب ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حصر اضافی ہے، یعنی اُن کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں کہنا مقصود ہے کہ وہ حرام نہیں، صرف یہ حرام ہیں، باقی! ان کے علاوہ اور چیزیں بھی حرام ہوں اُس سے یہاں بحث نہیں ہے، اور قرآن اور حدیث سے اور بہت ساری چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہے، یہ حصر اضافی کہلاتا ہے، کہ بعض چیزوں کی نسبت حرمت کو ان میں بند کر دیا گیا، کہ جن چیزوں کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں، بلکہ ان کے مقابلے میں یہ چیزیں حرام ہیں۔

میتہ کی تعریف

''حرام کیا تم پر میتہ کو''۔ ہر وہ جاندار چیز جس کا ذبح کرنا شرعاً ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کرنے کے مر جائے اس کو شریعت کی اصطلاح میں میتہ کہتے ہیں، یہ جو قید درمیان میں لگا رہا ہوں کہ اس کا ذبح کرنا شرعی نقطۂ نظر سے ضروری ہو، پھر بغیر ذبح کرنے کے مر جائے تو اُس کو میتہ کہیں گے، اس سے مچھلی کو نکالنا مقصود ہے، کہ مچھلی جاندار چیز ہے لیکن شرعاً اس کا ذبح کرنا ضروری نہیں، اس لیے بغیر ذبح کرنے کے مرتی ہے، اور وہ حلال ہے۔ اور اسی طرح جس کو آپ عربی میں جراد کہتے ہیں، یہ بھی جاندار چیز ہے، اور اس کو بھی ذبح کرنا ضروری نہیں، اس کو ویسے ہی مار لیا جائے، تو اس کو بھی کھایا جا سکتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ: ہمارے لیے دو میتے اللہ نے حلال کر دیے الْحُوتُ وَالْجَرَادُ: ایک مچھلی اور ایک جراد[1]، یہ جاندار ہیں، لیکن ان کا شرعاً ذبح کرنا ضروری نہیں ہے، یہ بغیر ذبح کرنے کے بھی مر جائیں تو یہ حلال ہیں، اس لیے میتہ کی تعریف میں یہ قید لگائی گئی کہ ہر وہ جاندار جس کا ذبح کرنا شرعاً ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کرنے کے مر جائے۔

---

(۱) ابن ماجہ ص ۲۳۲، باب صید الحیتان، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۶۱، باب ما یحل اکلہ۔ فصل ثانی۔

ذبحِ اختیاری اور ذبحِ اِضطراری کی وضاحت

اور پھر ذبح عام ہے، چاہے ذبح اختیاری ہو یا ذبح اضطراری ہو، اس کی تفصیل فقہ میں آپ پڑھیں گے، ذبح اختیاری تو یہی ہے کہ اگر جانور آپ کے بس میں ہے تو اس کی رگیں کاٹو، جو شریعت نے طریقہ بتایا ہے، یہ تو ذبح اختیاری ہے۔ اور ذبح اضطراری ہوتا ہے شکار میں، کہ شکار کھیلتے وقت اُس کو تیر مار دیا گیا، یا کوئی دھار دار چیز مار دی گئی، وہ جانور دوڑا جا رہا تھا، آپ کے قابو میں نہیں تھا، تو اس کے بدن میں کہیں زخم لگ جائے، وہ حلال ہو جاتا ہے، وہاں رگیں کاٹنی ضروری نہیں ہوتیں اگر آپ کے قابو پانے سے پہلے وہ مر جائے۔ اور اگر آپ نے قابو پالیا اور وہ زندہ ہاتھ آ گیا تو پھر ذبح کرنا ضروری ہے۔ کتے کے شکار میں، باز کے شکار میں، تیر کے شکار میں، سب میں مسئلہ یہی ہے، کہ شکاری کتا سکھایا ہوا، سدھایا ہوا آپ نے چھوڑا، اس نے جا کے جانور کو پکڑا اور اُس کو زخمی کر دیا، لیکن آپ کے پاس آنے سے پہلے وہ جانور مر گیا، وہ حلال ہے، بشرطیکہ اس کو بسم اللہ پڑھ کے چھوڑا ہو، اسی طرح باقی شرائط جو بھی ہیں وہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، میں تو صرف ایک اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ باز کا شکار، کتے کا شکار، تیر کا شکار، اُس میں ذبح اضطراری ہے، کہ زخم کہیں لگ جائے بدن پر، اور قابو آنے سے پہلے اگر وہ جانور مر جاتا ہے تو وہ حلال ہے، وہ بھی ذبح ہے، اُس کو میتہ نہیں کہیں گے۔ اور زندہ جانور کا عضو کاٹ لیا جائے تو وہ میتہ ہے، جیسے کوئی شخص زندہ دنبے کی پیچھے سے چکی کاٹ لے تو وہ حرام ہے، میتہ کے حکم میں ہے، "مَا قُطِعَ مِنَ حَیٍّ فَهُوَ مَیِّتٌ"[1] زندہ جانور کا جو عضو علیحدہ کر لیا جائے وہ حلال نہیں ہے۔ تو میتہ کے بارے میں تو یہی تفصیل ہوئی۔

مُردار کی ہڈیوں، بال اور سینگوں کا شرعی حکم

لیکن اس میں میتہ کو جو حرام کیا گیا ہے تو اس کا کھانا حرام ہے، اور جو چیز کھائی نہیں جاتی جیسے اُس کے بال، ہڈیاں اور سینگ، یہ سب پاک ہیں اور استعمال کیے جا سکتے ہیں، جیسے بھیڑ مر گئی اور مرنے کے بعد آپ اُس کی اون اتار لیں تو استعمال کی جا سکتی ہے، ہڈی استعمال کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس سے گوشت کی رطوبات دور ہو جائیں، اسی طرح سے اس کا چمڑا استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس سے رطوبات زائل کر دی جائیں دباغت کے ساتھ، چاہے مٹی مل کے، چاہے دھوپ میں ڈال کے، چاہے کوئی مصالحہ لگا کے اس کی رطوبات زائل ہو جائیں تو چمڑا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ پاک ہو جاتا ہے، اُس کا استعمال جائز ہے، بیچنا جائز ہے، اور بالوں کا بھی یہی حکم ہے اور ہڈی کا بھی یہی حکم ہے، سینگ کا بھی یہی حکم ہے۔

مُردار کے گوشت اور چربی کا شرعی حکم

البتہ اِس کا گوشت نجس ہو گیا، اب اس کا نہ کھانا جائز، نہ بیچنا جائز، نہ اس کو کسی دوسرے استعمال میں لانا جائز، اور یہی حکم اُس کی چربی کا ہے، اس لیے مردار کی چربی کا بیچنا جائز نہیں ہے، خرید و فروخت اُس کی جائز نہیں، نہ کھانا جائز ہے، ہاں البتہ یہ جو

---

(۱) ابن ماجہ ص ۲۳۲ باب ما قطع من البهيمة وهي حية.

چربی ڈال کر صابون بنا لیتے ہیں تو صابون کا استعمال ٹھیک ہے، اگر چہ اُس چربی کو ڈالنے والے اور خریدنے والے تو گناہ گار ہیں، اُن کے لئے تو جائز نہیں، لیکن جب وہ صابون کے اندر حل ہو جاتی ہے اور اُس کی دوسری جنس بن جاتی ہے تو اس صورت میں فقہاء ﷭ نے لکھا ہے کہ صابن کے طور پر اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے، استعمال کرنے والے گناہ گار نہیں، آپ کے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے جو آپ اُس صابن سے دھوتے ہیں، لیکن جو یہ کاروبار کرتے ہیں، چربی کو خریدتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں وہ گناہ گار ہیں، تو صابن کا استعمال کرنا ٹھیک ہے اگر شبہ ہو کہ اس کے اندر مردار کی چربی ڈالی گئی ہے، کیونکہ چربی تو ڈالتے ہیں لیکن اس میں حلال کی بھی ہوتی ہے، حرام کی بھی ہوتی ہے، مثلاً یہ قصائی جو جانور ذبح کرتے ہیں، یہ موٹی موٹی چربی رکھ لیتے ہیں، بعد میں ٹین بھر کے بیچتے ہیں، یہ حلال ہوتی ہے، اور اسی طرح سے جانور مر جاتے ہیں تو بھنگی جو مرداروں کے چمڑے اُتارتے ہیں وہ بھی چربی نکالتے ہیں، اور نکال کر بیچتے ہیں۔

خون کا شرعی حکم

وَالدَّمَ: اور حرام کیا خون، یہاں تو صرف دَم کا لفظ بولا گیا، اور دوسری جگہ اس کے ساتھ قید لگی ہوئی ہے دَمًا مَّسْفُوْحًا (سورۂ انعام: ۱۴۵) بہایا ہوا خون، اس لیے فقہاء ﷭ کہتے ہیں کہ اس دم کا مصداق صرف وہی خون ہے جو رگیں کاٹتے وقت رگوں سے بہتا ہے، جیسے زخم لگے تو زخم سے خون جاری ہو جاتا ہے، اسی طرح ذبح کرتے وقت جو رگوں سے بہتا ہے یہ دم نجس ہے، اس کا بیچنا ٹھیک نہیں ہے، اس کا کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اور ذبح کرنے کے بعد چمڑا اُتاریں تو جو خون گوشت کو لگا ہوا ہوتا ہے، جیسے آپ کپڑے میں لاتے ہیں تو وہ کپڑے کو لگ جاتا ہے وہ خون پاک ہے، اس لیے اگر گوشت کو نہ دھویا جائے، اُسی طرح سے پکا لیا جائے تو وہ ٹھیک ہے، اور وہ گوشت کی وجہ سے کپڑے پر خون کا نشان آ جائے تو یہ پاک ہے اس کا دھونا بھی ضروری نہیں ہے، کیونکہ نجس وہ خون ہے جو بدن سے بہتا ہے، جیسے زندہ کو زخم ہو جائے، جیسے ہمارے بدن پر زخم ہو جائے تو خون بہنے لگ جاتا ہے یہ نجس ہے، اسی طرح رگیں کاٹنے کے ساتھ جو خون بہتا ہے یہ بھی نجس ہے، اس کی بیع و شراء بھی جائز نہیں۔ اسی پر ہی فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ یہ جو مریض کو خون دیا جاتا ہے، ایک کے بدن سے خون نکال لیتے ہیں اور دوسرے کو دے دیتے ہیں، یہ نکلا ہوا خون بھی نجس ہے، اور بوقت مجبوری یعنی جب ڈاکٹر یہ کہے کہ مریض اتنا کمزور ہے کہ اگر اس کو خون نہ دیا گیا تو یہ مر جائے گا، جیسے زخم ہو کر خون بہت نکل گیا یا آپریشن کرنے لگے اور خون بہت نکل گیا، تو ایسے وقت میں تداوی بالحرام کے اصول کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے، کہ جیسے مجبوری کے وقت میں حرام دوا استعمال کی جا سکتی ہے، اور اختیاری صورت میں حرام دوا نہیں کھانی چاہیے، یعنی جب اس کے متبادل کوئی دوسری دوا ملتی ہو تو ایسی صورت میں وہ حرام دو نہیں کھانی چاہیے، لیکن اگر کوئی مجبوری ہو جائے، مجبوری کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر کہے کہ اس کے بغیر کوئی دوسری دوا نہیں ہے، اور ظن غالب یہ ہے کہ اس کے استعمال کرنے کے ساتھ صحت ہو جائے گی، تو ایسے وقت میں حرام دوا استعمال کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، اسی کے حکم میں خون کو استعمال کرنا بھی ہے، ہاں

البتہ اس کا بیچنا ٹھیک نہیں ہے، جیسے آپ اپنا خون نکلوائیں اور ایک پاؤنڈ خون ہسپتال میں جا کر بیچ دیں، تو آپ کے لئے یہ پیسے حرام ہیں، یہ کاروبار ٹھیک نہیں ہے، البتہ مجبوری کے وقت میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خنزیر کا شرعی حکم

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ: اور خنزیر کا گوشت تم پر حرام ٹھہرایا، یہاں لحم کی صراحت کر دی چونکہ ذکر ماکولات کا ہے، ورنہ خنزیر مطلقاً نجس ہے، اس کے بال بھی نجس، اس کا چمڑا بھی نجس، اس کی ہڈیاں بھی نجس، اس کی کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، حیوانات میں سے متفق علیہ نجس العین یہی ہے، اگرچہ کتے کے متعلق یا ہاتھی کے متعلق بھی بعض روایات فقہ میں ایسی آتی ہیں، لیکن اس میں اختلاف ہے، وہ متفق علیہ نجس العین نہیں ہیں، اور خنزیر ہی ایک ایسا جانور ہے جس کو متفق علیہ نجس العین قرار دیا گیا ہے، یہ منصوص ہے، قطعی طور پر نجس العین ہے، اس لیے اس کی کسی چیز کا استعمال کرنا درست نہیں ہے، نہ بال کا، نہ ہڈی کا، نہ کسی دوسرے عضو کا۔

اللہ کی رضا کے لئے اللہ کا نام لے کر ذبح شدہ جانور کا حکم

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ: وہ چیز جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہو۔ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مصداق کیا ہے؟ اگر جانور اللہ کی رضا کے لئے ذبح کیا جائے اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو یہ متفق علیہ حلال ہے اور قطعی طور پر حلال ہے، اس میں ناجائز ہونے کا کوئی شائبہ نہیں بشرطیکہ کوئی اور عارضہ نہ ہو، اور عارضے کا مطلب یہ ہے کہ چوری کا جانور ہے، اس کو اگر ہم حرام کہیں گے تو یہ دوسرے عارضے کی بناء پر ہے، ورنہ ان حلال جانوروں میں سے جس جانور کو اللہ کی رضا کے لئے ذبح کیا جائے اور اس کے اُوپر بسم اللہ پڑھ لی جائے، یا آپ اُس کو اپنی ضرورت کے لئے ذبح کر رہے ہیں یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم اس سے اللہ کو راضی کرنا چاہتے ہیں، آپ کو گوشت کی ضرورت ہے، مرغی لاتے ہیں، بسم اللہ پڑھ کے ذبح کر لیتے ہیں، وہ آپ کے لئے حلال ہے، چاہے اپنی ضرورت کے لئے ذبح کیا بشرطیکہ اللہ کے نام پر ذبح کر لیا ہو، اور فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (سورۂ انعام: ۱۱۹) یہ الفاظ قرآنِ کریم میں جو آتے ہیں تو اس میں یہی مسئلہ ذکر کیا گیا ہے، کہ جس چیز کے اوپر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کو کھا لیا کرو۔

غیر اللہ کا نام لے کر ذبح شدہ جانور کا حکم

اور ایک صورت یہ ہے (اب اس مسئلے کو ذرا دھیان سے سمجھ لو!) کہ اس جانور کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا، یعنی اُس کو خوش کرنے کے لئے نذرانہ دیا، کہ یہ بکرا ہم فلاں پیر کو دیتے ہیں تاکہ وہ خوش ہو جائے، اور اُس کے نام پر ذبح کرتے ہیں، یعنی اس کے نام پر روح نکالنی مقصود ہے، (اگر زندہ چھوڑا تو وہ مسئلہ کل آپ کے سامنے آ گیا، کہ جب اس کو زندہ چھوڑنا مقصود ہو تو پھر وہ حرام نہیں ہوتا) اگر غیر اللہ کے لئے اُس کی روح نکالنی مقصود ہے اور اُس کو قربان کرنا مقصود ہے، چاہے پیر کے لئے، چاہے پیغمبر کے لئے، چاہے جن کے لئے، بھوت کے لئے، کسی چیز کے لئے ہو، یعنی اُس کی روح کا نکالنا مقصود ہے اس کو خوش کرنے

کے لئے، جس وقت نیت یہ ہو کہ اُس کو نذرانہ بنادیا گیا غیر اللہ کا، چاہے کسی کا بنادیا گیا ہو، مسلمان کا ہو، کافر کا ہو، نبی کا ہو، غیر نبی کا ہو، جن کا ہو، بھوت کا ہو، فرشتے کا ہو، نذرانہ بنادیا گیا کہ یہ فلاں کی نذر ہے، اور اس کی روح نکالنی مقصود ہے اُس کو خوش کرنے کے لئے، اور اُس کو ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لے لیا گیا، یعنی منسوب بھی غیر اللہ کی طرف اور نام بھی غیر اللہ کا لے لیا گیا، ایسی صورت میں وہ حرام قطعی ہے، جس کے اندر حلت کا کوئی شبہ نہیں، اور یہ منصوص قطعی ہے۔ اور مشرکین کے زمانے میں اس کی یہی صورت تھی، کہ وہ بتوں کی طرف منسوب کرتے تھے، اور ذبح کرتے وقت بھی اُسی بت کا نام لیتے تھے، جیسے عربی تفسیروں کے اندر آپ مثال پڑھیں گے باسمِ اللاتِ والعُزّٰی کہہ کے وہ جانور کو ذبح کیا کرتے تھے۔ قطعی طور پر، منصوص، اور واقعہ کے لحاظ سے تو ان الفاظ کا یہی مصداق ہے، کہ غیر اللہ کی طرف اس کو منسوب کیا جائے اور غیر اللہ کا نام لے کر اُس کو ذبح کر دیا جائے۔ اور پھر یہ ایک مسئلہ علیحدہ ہے کہ چاہے غیر اللہ کی طرف منسوب نہ کرو لیکن غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کر دو، اور اللہ کا نام نہ لو تو بھی وہ حرام ہے، جیسے کہ اس آیت کے اندر آئے گا کہ لَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (سورۂ انعام: ۱۲۱) جس کے اُوپر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو وہ جانور نہ کھایا کرو۔ چاہے نذر نیاز اس کو نہ ہی بنایا گیا ہو، لیکن غیر اللہ کا نام لے کر اس کو ذبح کر دیا تو اُس کا مقصد یہی ہے کہ یہ رُوح اس کے لئے نکالی ہے، وہ بھی حرام ہے۔ اور اگر نیت بھی اسی کا نذرانہ ہو، کہ اس ذبح کے ساتھ اُسی کو خوش کرنا مقصود ہے، اور پھر نام بھی اُس کے اُوپر غیر اللہ کے لے لیا گیا ہو، تو وہ قطعاً حرام ہے، جس کے اندر حلت کا کوئی شبہ نہیں ہے، اور واقع کے لحاظ سے اِن الفاظ کا مصداق یہی ہے، کہ مشرکین کے اندر رواج یہی تھا کہ جب وہ غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے تو ذبح کرتے وقت بھی غیر اللہ کا نام لیتے تھے۔

غیر اللہ کی رضا کے لئے اللہ کا نام لے کر ذبح شدہ جانور کا شرعی حکم

اب ایک تیسری صورت پیدا ہوگئی کہ نسبت تو کر دی اللہ کے غیر کی طرف، کہ فلاں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے، نذر نیاز تو بنادی غیر اللہ کی، چاہے فرشتے کی، چاہے پیغمبر کی، چاہے پیر کی، فقیر کی، جن کی، بھوت کی، کسی کی بھی بنادیں، اس سے بحث نہیں، غیر اللہ ہو، اللہ کا غیر ہو، نذر نیاز تو بنادی اس کی، ذبح کرنے سے مقصد تو یہ ہے کہ ہم اُس پر اس کی روح کو نچھاور کرنا چاہتے ہیں، قربان کرنا چاہتے ہیں، لیکن ذبح کرتے وقت نام لے لیا اللہ کا، ذبح کیا اُس کو بسم اللہ پڑھ کر، ایک یہ صورت پیش آگئی، مثلاً گیارہویں والے کے نام کا بکرا دے دیا، اور اس کو ذبح کرنا ہے محض اُس کو خوش کرنے کے لئے، مقصود ہے اُس کی رضا، اس کی روح کو اُس کے اُوپر فدا کرنا مقصود ہے، لیکن ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اُس کو ذبح کر دیا، تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟ جمہور فقہاء رحمہم اللہ اور جمہور علماء رحمہم اللہ اور اکثریت علمائے دیوبند اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اور اس کے لئے بھی حکم یہی ہے کہ یہ صورت نفاق کی ہے، اور نفاق صریح کفر کے حکم میں ہی ہے، کہ جیسے ایک شخص دل سے بھی کافر اور زبان سے بھی کافر، اور ایک دل سے کافر اور زبان سے مؤمن، اور ایک دل سے بھی مؤمن اور زبان سے بھی مؤمن، تو اصل جو ایمان قابلِ اعتماد ہے وہی ہے کہ دل سے بھی مؤمن اور زبان سے بھی مؤمن، اور جو دل سے بھی انکار کرے اور زبان سے بھی انکار کرے وہ بھی کافر، اور جو دل سے انکار کرے زبان سے چاہے اقرار کرے وہ بھی کافر، تو مدار اصل میں دل کے حال پر ہے۔ جب دل کے اعتبار سے اس نے اِہلال اس

کے لئے کردیا، اِس کی نسبت اُدھر کردی، تو اس اِہلال کی وجہ سے اس کے اُوپر بھی حرمت کا حکم لگے گا، لیکن یہ حکم تعدیہ کے طور پر ہو گا، کہ علت کے پائے جانے کے ساتھ اُس حکم کو متعدی کرلیا گیا، ورنہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ کا جو عبارت النص کے طور پر مصداق ہے وہ وہی صورت ہے جو پہلے آپ کی خدمت میں عرض کردی، کہ منسوب بھی غیر اللہ کی طرف کیا جائے اور ذبح بھی اُس کو غیر اللہ کے نام کے ساتھ کیا جائے۔ لیکن اِہلال والی علت پائے جانے کی وجہ سے اس دوسری صورت میں بھی جمہور علماء اور ہمارے علمائے دیوبند کی اکثریت حرام کہتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں مولانا شبیر احمد صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے اس مسئلے میں صراحت ہوگی، اور یہاں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی طرف سے صراحت ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ کے اوپر حاشیہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے۔ دیکھو! یہ عبارت میں آپ کے سامنے پڑھتا ہوں، ذرا اس مسئلے کو اچھی طرح سے سن لیجئے!

"مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ کا یہ مطلب ہے کہ اُن جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت یا جن یا کسی روح خبیث یا پیر یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان ان کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے، اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو، اِن سب جانوروں کا کھانا حرام ہے، گو بوقتِ ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو، کیونکہ جان کو جان آفرین کے سوا کسی دوسرے کے لئے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں، اس لئے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی، اور اس کی تو جان غیر اللہ کے نامزد کردی گئی ہے جو عین شرک ہے، سو جیسے خنزیر اور کتے پر بوقتِ ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی، اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا، ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کردی ہو اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حلت اس میں نہیں آسکتی، البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت سے ہی توبہ اور رجوع کر کے ذبح کرے تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں، علماء نے تصریح کردی ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لئے اس کے نام پر جانور ذبح کیا جائے یا توپ چلنے یا اینٹوں کے پزاوہ (پزاوہ بھٹے کو کہتے ہیں) کے پکنے کے لئے بطور بھینٹ جانور ذبح کیا جائے تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام اور کرنے والا مشرک ہے، اگرچہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: لَعَنَ اللهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللهِ یعنی جو غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کی نیت سے جانور کو ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے، ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے فقراء کو کھلائے، اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچادے، یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کر کے اس کا ثواب اس کو دینا چاہے، کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لئے ہرگز نہیں۔ بعضے اپنی کجروی سے یہ حیلہ ایسے موقع پہ بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نیاز وغیرہ میں ہم کو تو یہی مقصود ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردہ کے نام سے صدقہ کردیا جائے، تو اول تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مضرت کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا، دوسرے ان سے پوچھا جائے کہ جس جانور کی تم نے غیر خدا کے لئے نذر مانی ہے، اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر اور پکا کر فقیروں کو کھلا دیا جائے تو تمہارے نزدیک بے کھٹکے وہ نذر ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟ اگر بلا تامل تم اس کو کرسکتے ہو اور اپنی نذر میں کسی

قسم کا خلل تمہارے دل میں نہیں رہتا تو تم سچے ورنہ تم جھوٹے، اور تمہارا یہ فعل شرک اور وہ جانور مُردار اور حرام'' (تفسیر عثمانی)۔

یہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحریر ہے، یعنی بسا اوقات لوگ منسوب تو کرتے ہیں پیروں کی طرف، جب آپ انہیں کہیں گے کہ یہ تو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللہِ ہے، یہ تو تم نے اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا، تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد ثواب پہنچانا ہے، ورنہ اس جانور کی رُوح ان پر قربان کرنا مقصد نہیں ہے، حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ان سے یہ پوچھو کہ اگر تم یہ جانور ذبح نہ کرو، اس جانور میں مثال کے طور پر دس سیر گوشت ہے، اور کوئی دوسرا شخص جانور کو ذبح کرتا ہے، جیسے قصائی نے ذبح کیا، تو وہاں سے دس سیر گوشت لے کر تم خیرات کر دو، پکا کر فقیروں کو کھلا دو، تو تمہارے دل میں کوئی کھٹکا تو نہیں ہوگا؟ اگر وہ کہیں کہ کوئی کھٹکا نہیں، ٹھیک ہے ہم اس جانور کو ذبح نہیں کرتے، کیونکہ ہمارا مقصد تو صدقہ ہے، تو ہم اس جانور کو ذبح نہیں کرتے، ہم گوشت لے کر دے دیتے ہیں، تو پھر تو وہ اپنی بات میں سچے ہیں کہ واقعی اُن کو ایصالِ ثواب مقصود ہے، رُوح قربان کرنی مقصود نہیں۔ اور اگر وہ کہیں کہ نہیں جی! ہم تو اسی جانور کو ذبح کریں گے جس کو ہم نے پیر کی طرف منسوب کیا ہے، پھر چاہے وہ اپنی زبان سے کہیں کہ اس کی روح پیر کے لئے نکالنی مقصود نہیں، صدقہ مقصود ہے، لیکن وہ اپنے قول میں جھوٹے ہیں اور وہ حیلہ کرتے ہیں، ورنہ اگر صدقہ ہی مقصود ہو تو اتنے پیسے کا گوشت لے کر خیرات کر دو، قصائی سے جا کر خرید لو، پھر جانور کا ذبح کرنا کیوں ضروری سمجھتے ہو؟ یہ ہے حضرت شیخ کا مقصد!

تو یہ مسئلہ صاف طور پر واشگاف الفاظ میں آ گیا، کہ جب نسبت غیر اللہ کی طرف کر دی جائے تو غیر اللہ کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ وہ اِہلال متحقق ہو گیا اور حرمت آ گئی۔ اب اگر اُس اِہلال پر انسان قائم ہے، اور بعد میں چاہے وہ اللہ کا نام لے لیتا ہے، تو یہ ایسے ہی سمجھا جائے گا جیسے کہ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللہِ کی پہلی صورت آپ کے سامنے ذکر کی گئی، اور یہ بھی اسی طرح سے حرام ہوگی۔ ہاں البتہ ایک صورت ہے، کہ غیر اللہ کی طرف منسوب کیا تھا، لیکن اس کے ذبح کرنے سے پہلے پہلے اپنی نیت سے توبہ کر لی، مثلاً کسی نے مسئلہ سمجھا دیا، سمجھانے کے ساتھ اس نے اپنی نیت سے توبہ کر لی، اب اگر اُس کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے گا تو بلاشبہ وہ جانور حلال ہے، کیونکہ وہ اِہلال ختم ہو گیا۔ یہ تو جاندار کی بات ہوئی۔

غیر اللہ کے نام پر دی ہوئی بے جان چیزوں کا شرعی حکم

اور بے جان چیزیں جیسے گیارہویں والے کے نام پر دودھ دے دیا، مٹھائی دے دی، کسی قبر پہ جا کر کھانے چڑھا آئے، شیرینی رکھ آئے، یہ بھی تو ہوتا رہتا ہے، لوگ مزاروں پر جاتے ہیں، جا کر اس قسم کی چیزیں چڑھا دیتے ہیں۔ تو یہ بے جان چیزیں قرآنِ کریم کے ان الفاظ کا مصداق نہیں، یہاں حکم حیوانات کا ہے، لیکن جو اِہلال والی علت حیوانات کے لئے بیان کی گئی ہے اسی علت کے تحت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی صراحت کے مطابق، اور اس کے بعد باقی اکابر دیوبند کی صراحت کے مطابق، اُس میں بھی حرمت آ جائے گی، اس کا کھانا بھی حرام ہو جائے گا، لیکن فرق صرف اتنا ہوگا کہ جانور کی صورت میں ذبح سے پہلے پہلے اگر وہ اپنی اِس فاسد نیت سے رجوع کر لے تو جانور حلال ہے، اور اگر ذبح ہو گیا تو اُس کے بعد پھر وہ حرمت قرار پکڑ گئی، پھر اُس حرمت کو اٹھانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور یہ جو بے جان چیزیں ہیں ان میں کھانے سے پہلے پہلے رجوع

ہوسکتا ہے، اور جب کھالی اور پیٹ میں چلی گئی تو اب حرمت مستقر ہوگئی، مثلاً کوئی چیز مزار پر چڑھادی، قبر پر ڈال آئے، کسی پیر کے نام پر نذرانہ دے دیا، (ایک ہے اللہ واسطے دینا اور ایصالِ ثواب کرنا، اُس کی صورت تو میں نے پہلے آپ کے سامنے عرض کردی، اور ایک ہے کہ صرف اُس کو خوش کرنے کے لئے دیا جارہا ہے) تو ایسی صورت میں کھانے سے قبل قبل اگر اُس کا مالک جس نے دی ہے اپنی اِس فاسد نیت سے رجوع کرلے تو وہ چیز حلال ہوجائے گی، اور اگر اسی نیت پر اس کو کھالیا گیا تو کھانے کے بعد پھر نیت سے رجوع کا کوئی فائدہ نہیں، پھر وہ انسان حرام خور بن گیا جس نے یہ کھائی ہے۔

غیر اللہ کے نام پر دینے والوں کی نیت معلوم کرنے کا طریقہ

اور یہاں بھی لوگ وہی ایصالِ ثواب والی توجیہ اور حیلہ کیا کرتے ہیں، لیکن پوچھنے کے ساتھ حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، جیسے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ایک واقعہ ہے کہ دو طالب علم آپس میں گفتگو کرنے لگے، ایک کہنے لگا کہ یہ جو لوگ بڑے پیر کی نیاز دلاتے ہیں اِن کا مقصد ہوتا ہے اللہ واسطے دینا اور ایصالِ ثواب پیر کے لئے۔ دوسرا کہنے لگا کہ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ ان کا مقصد ہوتا ہے کہ یہ پیر کو ہی دی جارہی ہے، اللہ کو نہیں دی جارہی، پیر کو دینا مقصود ہوتا ہے، اللہ واسطے دے کر ایصالِ ثواب مقصود نہیں ہوتا۔ یہ ابھی آپس میں جھگڑا کر ہی رہے تھے کہ ایک بڑھیا کوئی چیز لے کر آگئی، اور آکر کہتی ہے کہ مولوی صاحب! یہ لو، یہ بڑے پیر کی نیاز دے دو، تو دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ اچھا اَتاں! یوں کروں کہ نیاز تو اللہ کی دُوں اور ایصالِ ثواب بڑے پیر صاحب کو کردُوں؟ کہنے لگی: نہیں نہیں! اللہ کی نیاز تو میں الگ دِلواؤں گی، یہ تو بڑے پیر کی نیاز ہے۔ وہ کہنے لگا لو جی! دیکھ لو،[1] یعنی ایسی صورت میں تحقیق کرنے سے اور کھود کرید کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے دل میں کیا ہے، اگر ایصالِ ثواب مقصود ہے تو پھر وہ چیز حلال ہے، پھر اُس میں کوئی بات نہیں، اور اگر وہی چیز دینی مقصود ہے کہ پیر کے نام کی نیاز ہے، اُسی کو دی جارہی ہے، یعنی اللہ کو درمیان سے نکال دیا، اللہ کا درمیان میں تصور نہیں ہے، تو ایسی صورت میں وہ بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہوگی، لیکن فرق صرف اِس قدر ہوگا کہ اُس کے کھانے سے پہلے پہلے فاسد نیت سے رجوع کیا جاسکتا ہے، اور جانور کے ذبح کرنے سے پہلے پہلے رجوع کیا جاسکتا ہے، جس وقت وہ ذبح ہوجائے گا تو ذبح ہونے کے بعد چاہے آپ نے ابھی کھایا نہیں ہے، کھانے سے قبل رجوع کرنے کا وہاں کوئی فائدہ نہیں ہے، غیر جاندار میں اور جاندار میں یہ فرق ہوجائے گا۔

بعض علماء کی ایک اور رائے

تتمہ کے طور پر آپ کے ذہن میں ایک بات ڈال دُوں، تحقیق بعد میں کرتے رہیو۔ یہ صورت جو میں نے ذکر کی جس کے متعلق میں نے ''جمہور، جمہور'' کا لفظ بولا، تو طالب علمانہ ذہن کے ساتھ آپ کو یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ آپ اس کو متفق علیہ کیوں نہیں کہتے؟ یہ ''جمہور، جمہور'' کی رَٹ کیا لگا رکھی ہے؟ جیسے پہلی صورت میں کہہ دیا کہ یہ متفق علیہ حرام ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، جب غیر اللہ کی طرف منسوب کیا گیا اور غیر اللہ کے نام پہ ذبح کردیا گیا یعنی ذبح کرتے وقت بھی غیر اللہ کا نام لے لیا گیا،

---

(۱) ملفوظات حکیم الامت ج۱۹ ص۸۵، ج۲۳ ص۲۰۰ مطبوعہ تالیفات اشرفیہ ملتان۔

تو اُس کے متعلق میں نے کہا کہ متفق علیہ حرام ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، قطعی طور پر حرام ہے، اور ان الفاظ کا عبارۃ النص کے طور پر مقصود یہی ہے۔ اور دوسرا جو میں نے کہا کہ نسبت غیر اللہ کی طرف کر دی لیکن ذبح کیا گیا اللہ کے نام پر، تو جمہور فقہاء، جمہور علماء، اور علمائے دیوبند کی اکثریت اس کو ویسے ہی حرام قرار دیتی ہے جیسے پہلی صورت میں حرام ہے، لیکن اِہلال والی علت کی تعمیم کے ساتھ۔ ورنہ اُس وقت جب یہ قرآن اُتر رہا تھا مشرکین کے اندر یہ رواج نہیں تھا کہ منسوب غیر اللہ کی طرف کریں اور ذبح اللہ کے نام پر کریں، یہ صورت مشرکین کے زمانے میں موجود نہیں تھی، مشرکین کے زمانے میں صورت یہ موجود تھی کہ منسوب بھی غیر اللہ کی طرف اور ذبح بھی غیر اللہ کے نام پر کرتے تھے، لہٰذا عبارۃ النص کے طور پر تو مصداق وہی صورت ہے، لیکن اِہلال کی علت کی تعمیم کے ساتھ دوسری صورت بھی اِسی حکم میں ہے چاہے اُس کے اُوپر نام اللہ کا لیا جائے۔ لیکن اس مسئلے میں کچھ تھوڑے سے علماء اختلاف کرتے ہیں، اور اس اختلاف کرنے کی گنجائش بایں معنی ہے کہ عبارۃ النص کے طور پر چونکہ یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے، تعمیم علت کے ساتھ اس کو نکالا جاتا ہے، تو اکثریت اُس طرح سے قرار دیتی ہے، اور بعض اقل علماء ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے والے کا فعل حرام ہے، یعنی غیر اللہ کی نذر ماننا حرام ہے، شیرینی وغیرہ غیر اللہ کے نام پر دینا حرام ہے، اِس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے، یہ فعل ممنوع ہے، باعثِ لعنت ہے اور یہ حرام ہے، لیکن اگر اللہ کا نام لے کر اُس چیز کو ذبح کر لیا جائے تو وہ چیز فی حدذاتہٖ حلال ہے۔ دونوں باتوں میں فرق کرلو، فعل حرام ہے، غیر اللہ کے لئے نیاز دینا حرام ہے، اور اسی طرح جانور کے متعلق یہ سوچ لینا کہ اس کی روح ہم فلاں کو خوش کرنے کے لئے نکالنا چاہتے ہیں، یہ فعل حرام ہے، کہ یہ نذر لغیر اللہ ہے، لیکن اگر اُس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو وہ جانور حلال ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح سے جو شیرینی وغیرہ دی جاتی ہے تو دینے والے کے لئے تو حرام ہے کہ اس نیت کے ساتھ دے، لیکن فی حدذاتہٖ وہ چیز حلال ہے، اس لیے اگر کوئی دُوسرا شخص اُس کو کھائے تو اس کے لئے حرام نہیں ہے، بعض حضرات کا قول یہ ہے اور اِس کی بھی کسی درجے میں گنجائش ہے، یعنی اس کو بِاَصلہٖ باطل نہیں قرار دے سکتے، جیسے مجتہد فیہ مسائل میں اکثریت ایک طرف ہو اور قلیل ایک طرف ہوں، اِس مسئلے کی نوعیت ایسی ہے۔ اور اُن کے ہاں اِس آیت کی توجیہ یہ ہے کہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں مَآ سے وہ کلمہ مراد ہے، کہ وہ کلمہ جس کے ساتھ آواز بلند کی جائے اللہ کے غیر کے لئے، تو اِہلال تو بہر صورت حرام ہوا، اور اگر پھر اُس اِہلال پر قائم رہتے ہوئے ذبح بھی غیر اللہ کے نام پر کر لیا تو وہ ماذبح علیٰ غیر اسم اللہ ہو گیا، اس لیے وہ قطعی طور پر حرام ہے۔ اور اگر اُس کو ذبح تو اللہ کے نام پر کیا گیا تو وہ کلمہ تو حرام رہا جو غیر اللہ کی طرف نسبت کی تھی، لیکن یہ جانور اُس حکم میں آ گیا کہ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، جب وہ جانور فی حدذاتہٖ حلال ہے، پھر اُس کو ذبح بھی اللہ کے نام پر کر لیا جائے تو ایسی صورت میں ہم اُس کو حلال ہی قرار دیں گے۔ تو اُن کے نزدیک توجیہ یہ ہوگی، کہ مَا سے مراد کلمہ ہو گا، کہ اس طرح کا اِہلال، اس طرح آواز بلند کرنا، نذر ماننا، یہ تو حرام ہی حرام ہے۔ اور بعد میں اگر وہ ذبح بھی علیٰ غیر اسم اللہ ہو گیا، تو پھر وہ بھی حرام ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں صراحت آ گئی، اور اگر اس کو ذبح علیٰ غیر اسم اللہ نہ کیا گیا تو وہ فعل تو حرام ہے، لیکن یہ جانور جب اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے تو جانور چونکہ فی حدذاتہٖ حلال ہے اور پھر اُس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو اس صورت میں وہ جانور بھی حلال ہے۔ اس مسئلے کے اندر بعض حضرات کی رائے یہ ہے، اگرچہ ہمارے حضرات اکابر جمہور علماء اس کو اُسی طرح سے قرار دیتے ہیں جس طرح سے پہلی

صورت ہے۔ تو سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف بھی یہ دوسرا مسلک منسوب ہے جو میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ اُن کے نزدیک یہ فعل حرام ہے اور وہ چیز حلال ہے، اور ہمارے بعض دوسرے بزرگ بھی ہیں جو اسی مسلک کے ہیں، کہ اُن کے نزدیک یہ فعل حرام ہے لیکن اس چیز کے اندر حرمت نہیں آتی، اگر اس کو اللہ کے نام پہ ذبح کر لیا جائے تو وہ چیز حلال ہوتی ہے، ہمارے استاذ حضرت مولانا عبد الخالق صاحب رحمہ اللہ بانی دار العلوم کبیر والہ (م ۱۳۸۶ھ)، اُن کا بھی یہی مسلک تھا، اور وہ اس مسئلے کی ایسے ہی تفصیل بیان فرمایا کرتے تھے، اور وہی حضرت سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف نسبت کر کے اِس بات کو ذکر کیا کرتے تھے، اور ''فیض الباری'' میں بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ ہے، اور ''مشکلات القرآن'' جو حضرت سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں بھی اس مسئلے پر حضرت نے کچھ بیان فرمایا ہے۔ بہر حال اس میں اِس درجے میں گنجائش ہے جتنی میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔ کہ جمہور کا مسلک یہی ہے، اور عملاً آپ کو یہی اختیار کرنا چاہیے کہ آپ بالکل کھانے سے پرہیز کریں، لیکن اگر کسی کا کوئی مسلک ایسا ہو تو اس کے ساتھ زیادہ اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے کہ مجتہد فیہ مسائل میں ہوا کرتا ہے۔ اِس سے زیادہ اس مسئلے کی تفصیل میں آپ کے سامنے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا۔ ایک ایک صورت علیحدہ کر کے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔ تو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ تو یہ ہو گئی۔ جب مَا سے وہ جانور مراد لیں گے تو پھر بِهٖ کو علیہ کے معنی میں کرنا پڑے گا، جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کر دی گئی ہو، اور جب مَا کلمہ کے معنی میں لیں گے تو پھر باء میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں، پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ وہ کلمہ جس کے ساتھ اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہو، اور یہ دونوں احتمال ''جواہر القرآن'' میں حضرت مولانا غلام اللہ صاحب نے بھی لکھے ہیں، کہ مَا سے مراد کلمہ بھی ہو سکتا ہے اور جانور بھی ہو سکتا ہے۔

مجبور کے لئے کہاں تک حرام کھانے کی اجازت ہے؟

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ: جس شخص کو مجبور کر دیا جائے، یعنی مضطر ہو گیا، حال ایسا ہو گیا کہ اگر کچھ نہیں کھاتا تو مرتا ہے، اور پھر اس کے سامنے اِن حرام چیزوں میں سے کوئی چیز پیش ہو گئی، طالبِ لذت نہ ہو کہ بلا ضرورت کھائے، بلا ضرورت جو کھائے گا تو محض منہ کا ذائقہ اور لذت مقصود ہے، اور عادی یعنی حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، کہ ضرورت سے زیادہ کھائے، ایسی صورت میں فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، یعنی ہے تو یہ حرام لیکن کھانے پر گناہ نہیں ہے، اللہ کی رحمت کے ساتھ اتنی سی اجازت ہو گئی۔ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہیں، یہ نہیں کہ وہ جانور حلال ہو گیا، جانور تو حرام کا حرام ہے، لیکن اس مضطر کے لئے اتنی سہولت ہو گئی کہ اِس کے کھانے پر گناہ نہیں ہے، اگر چہ وہ جانور فی حد ذاتہ حرام ہے۔ اور غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ: یہ مضطر کی حد بندی کر دی، کہ مضطر حقیقت میں وہ ہوتا ہے کہ اگر نہیں کھائے گا تو مرتا ہے، نہ تو وہ طالبِ لذت ہے، نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہے، ضرورت سے پہلے نہ کھائے یعنی بلا ضرورت نہ کھائے، ضرورت سے زیادہ نہ کھائے، اُس وقت کھائے جبکہ اس کا ظن غالب ہو کہ اگر میں اب نہیں کھاؤں گا تو مر جاؤں گا، اور اتنا سا کھائے جس میں اس کا ظن غالب یہ ہے کہ اب میں بچ جاؤں گا، اس سے زیادہ نہ کھائے۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والے رحم کرنے والے ہیں۔''

اہلِ کتاب علماء کی دِین فروشی اور اس کا انجام

آگے دین فروشی کی تحریم کا ذکر آ گیا۔ ایک چیز بسا اوقات حلال ہوتی ہے، لیکن آپ اس کو ناجائز ذریعے سے حاصل کرتے ہیں تو وہ بھی حرام ہے۔ اور یہ حرام کھانے کی عادت اہل کتاب کو تھی، کہ غلط مسئلے بتاتے تھے، فیسیں لیتے تھے۔ تو اس قسم کی فیس جو وہ لیتے تھے دین فروشی کے طور پر، کہ لوگوں کی مرضی کے مطابق مسئلہ نکال دینا، اور اُن کے لئے جائز کو ناجائز، اور ناجائز کو جائز کرتے رہنا، یہ دین فروشی بھی حرام ہے۔ ان محرمات کے ذکر کے بعد جن میں مشرکین مبتلا تھے اب یہ اہل کتاب کے علماء کی دین فروشی کا ذکر ہے، جیسے دوسری جگہ ہے اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴) کہ ان کے بہت سارے علماء اور مشائخ ایسے ہیں جو لوگوں کا مال غلط طریقے سے کھاتے رہتے ہیں، اور وہ غلط طریقہ یہی تھا جس کو دِین فروشی کہتے ہیں، کہ توہمات میں لوگوں کو مبتلا کرنا، اُن کی مرضی کے مطابق مسئلے بتانا، اور دھوکا دے کر اُن سے مال حاصل کرنا تو یہ بھی حرام ہے۔ ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اُس چیز کو جو ہم نے اُتاری کتاب سے'' مِنَ الْكِتٰبِ مَا کا بیان ہو تو مطلب ہوگا کہ جو کتاب ہم نے اُتاری اُس کا کتمان کرتے ہیں، اُس کو چھپاتے ہیں۔ ''اور حاصل کرتے ہیں اُس کے بدلے میں ثمنِ قلیل'' ثمنِ قلیل سے دنیا کا سامان مراد ہے، وہ کتنا ہی کیوں نہ ہو وہ ثمنِ قلیل ہے۔ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ: یہ لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، یعنی اگرچہ بظاہر حلوہ کھاتے ہیں، مٹھائیاں کھاتے ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے جہنم کے انگارے اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں، یہی ان کی کھائی ہوئی چیز آخرت کے اندر آگ کی شکل میں ان کے پیٹ کے اندر بھڑکے گی۔ مال جتنا بھی ہو ثمنِ قلیل ہے، اب یہ نہیں کہ پانچ روپے لے کر تو غلط مسئلہ نہ بتایا کرو، پانچ سو لے کر بتا دیا کرو، یہ مطلب نہیں، کیونکہ دنیا کا سامان جتنا بھی ہے سب ثمنِ قلیل ہے، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (سورۂ نساء: ۷۷) اللہ کے حکم کے مقابلے میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ ''یہی لوگ ہیں جو نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ'' پیٹوں میں بھرنا، یہ محاورے کے طور پر ترجمہ کر رہا ہوں، ورنہ لفظی معنی وہی ہوگا ''نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ''، وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اللہ تعالیٰ اِن کے ساتھ بولے گا ہی نہیں قیامت کے دن، جو یہ دین فروشی کرتے ہیں اور کتمانِ حق کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن بات ہی نہیں کرے گا، یعنی ان پر ناراضگی کا اظہار ہوگا، بات ہی نہیں کرے گا یعنی بلا واسطہ نہیں کرے گا، کیونکہ بات کرنا اور بولنا اسے کہتے ہیں جو محبت اور پیار کا بولنا ہوتا ہے، جیسے ایک طالب علم کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ میں اس سے نہیں بولتا، لیکن جب وہ سامنے آئے تو ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کر دیا جائے تو اس کو کوئی بھی بولنا نہیں کہتا، غصے کے اظہار اور ڈانٹ ڈپٹ کی بات کو بات کرنا نہیں کہتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ محبت اور پیار کی بات نہیں کرے گا (مظہری وغیرہ)، یا یہ مطلب ہے کہ بلا واسطہ بات نہیں کرے گا، جو بھی بات ہوگی فرشتوں کی وساطت سے ہوگی، جلالین کے اندر آپ یہی توجیہ پڑھیں گے۔ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ: اللہ انہیں پاک صاف نہیں کرے گا، یا، ان کی تعریف نہیں کرے گا، دونوں طرح سے مطلب بیان کیا گیا ہے۔ ''پاک صاف نہیں کرے گا'' جیسے گناہ گار مسلمان جہنم میں

جائیں گے، لیکن جہنم کے عذاب سے اُن کے گناہوں کی سیاہی ڈھل جائے گی، بعد میں ان کو جنت میں بھیج دیا جائے گا، لیکن یہ لوگ ایسے نجس العین ہوں گے کہ جیسے پاخانے کو سات سمندروں سے بھی دھولو تو پاخانہ تو پاک نہیں ہوتا، پاخانے کو کوئی پاک کرنا چاہے تو کوئی طریقہ نہیں ہے، جتنا چاہو اُس کو دھولو وہ کیسے پاک ہوگا؟ وہ تو نجس العین ہے، نجاست اُس کی ذات میں شامل ہوگئی۔ اسی طرح کفر و شرک کرنے والے بھی ایسے ہو جائیں گے جیسے نجس العین ہے، یہ جہنم میں کروڑہا سال بھی جلتے رہیں گے تو پاک نہیں ہوں گے۔ بخلاف مؤمن گناہ گار کے، مؤمن کی مثال ایسے ہے جیسے کپڑے کو پیشاب لگ گیا، پاخانہ لگ گیا، اُس کو دھویا جاتا ہے، رگڑا جاتا ہے، ٹھیک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایمان کے ساتھ اگر معصیت ہو تو ڈھل جائے گی، وہ صاف ہو جائے گا، ستھرا ہو جائے گا، صاف ستھرا ہونے کے بعد پھر اُس کو جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ ''اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہوگا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے دُنیا میں گمراہی لے لی ہدایت کے بدلے'' ہدایت کو چھوڑ دیا اور گمراہی لے لی، ''اور آخرت میں عذاب کو اختیار کرلیا مغفرت کے بدلے'' یعنی ایسا کردار انہوں نے اختیار کیا کہ دنیا میں ضلالت اختیار کی اور ہدایت چھوڑی، آخرت میں مغفرت چھوڑی اور عذاب لے لیا۔ فَمَآ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ: یہ فعل تعجب ہے، جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے اس کا ترجمہ کردیا گیا تھا، کہ کتنے ہی صبر کرنے والے ہیں یہ آگ پر، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تعجب کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ بولے ہیں ''شاباش ان کی ہمت پر'' کیسے باہمت ہیں، بڑے دلیر ہیں، بڑی ہمت والے ہیں جہنم میں جانے کے لئے، جنہوں نے یہ کردار اختیار کر رکھا ہے، یہ تعجب کا اظہار ہے۔ اور یہ اِن کا جہنم میں جانا اِس سبب سے ہوا کہ اللہ نے کتاب تو حق کے ساتھ اُتاری، حق کا معنی یہ ہے کہ واقعی بات اس میں بیان کردی تاکہ مختلف فیہ مسائل حل ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے ہر بات واقعی طور پر اس کتاب میں بیان کردی۔ ''اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ دور کی ضد میں ہیں'' یعنی وہ مخالفت کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے، اس لیے ان کا واپس آنا مشکل ہے۔ جب ایک شخص دوسرے کا مخالف ہو جاتا ہے، اور ذرا ذرا بات پر اَڑیاں کرنے لگتا ہے، تو آپ بھی کہا کرتے ہیں کہ وہ تو بہت دُور نکل گیا، اب اِن کا آپس میں اتفاق نہیں ہوسکتا، بات بہت دور نکل گئی۔ تو یہ بھی بہت دور کے اختلاف میں ہیں، ضد میں ہیں، اِن کا اب اِس کے ساتھ اتفاق کرنا مشکل ہوگیا، اب واپس حق کی طرف ان کا آنا مشکل ہے۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ
نیکی یہی نہیں کہ تم پھیرو اپنے چہروں کو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف، لیکن
الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ
نیکی تو اُس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

اور جو دے مال باوجود اس مال کی محبت کے، رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافر کو

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

اور سوال کرنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے، اور وہ لوگ جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ

جس وقت وہ عہد کر لیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں مالی تنگی میں اور بدنی تکلیف میں اور لڑائی کے وقت، یہی لوگ سچے ہیں

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ

اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾ اے ایمان والو! فرض کر دیا گیا تم پر برابری کرنا مقتولوں کے بارے میں، (قتل کیا جائے گا) آزاد

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ

آزاد کے بدلے، اور غلام غلام کے بدلے، اور عورت عورت کے بدلے، پس وہ شخص جس کو معاف کر دیا جائے اُس کے بھائی کی جانب سے

شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

کچھ تو پھر پیچھا کرنا ہے معروف طریقے سے اور ادا کرنا ہے اُس کی طرف اچھے طریقے سے، یہ تخفیف ہے تمہارے ربّ کی طرف سے

وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

اور رحمت ہے، جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۸﴾ اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے

يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ

اے عقل والو! تاکہ تم (خون خرابے سے) بچ جاؤ ﴿۱۷۹﴾ فرض کر دیا گیا تم پر جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اگر وہ مال چھوڑ

خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

کر جائے (فرض کیا گیا) وصیت کرنا والدین کے لئے، اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اچھے طریقے سے، یہ وصیت کرنا لازم کر دیا گیا

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

متقین پر ﴿۱۸۰﴾ جو شخص بدل دے گا اس بات کو بعد اس کے کہ وہ بات اس نے سنی، پس سوائے اس کے نہیں کہ اُس کا گناہ صرف انہی لوگوں

يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ
پر ہوگا جو اس بات کو بدلتے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۱۸۱﴾ جو کوئی اندیشہ کرے وصیت کرنے والے کی طرف سے
جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾
باطل کی طرف میلان کا یا کسی گناہ کا پھر وہ ان لوگوں کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۸۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ: بِرٌّ: نیکی، بھلائی، خیر، وفاداری، ان سب معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اچھا سلوک کرنا، بِرُّ الْوَالِدَيْن: والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ۔ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ یہ لفظ قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے (سورۂ مریم: ۳۲-۱۴)۔ تو بِرّ وفاداری کے معنی میں بھی ہے، بھلائی، نیکی، اچھائی کے معنی میں بھی ہے۔ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ: یہ مصدر کی تاویل میں ہو کر لَيْسَ کا اسم ہے، اور الْبِرَّ خبر ہے، کیونکہ لَيْسَ کی خبر منصوب ہوتی ہے اور اس کا اسم مرفوع ہوتا ہے، ترجمہ یہ ہوگا کہ ''تمہارا اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لینا ہی نیکی نہیں''۔ اور لفظوں کے تحت اگر آپ ترجمہ کرنا چاہیں تو اس طرح سے ہو جائے گا کہ ''نہیں ہے نیکی کہ پھیرو تم اپنے چہروں کو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف'' یعنی اللہ کے ساتھ وفاداری یہی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ: مَنْ اٰمَنَ سے پہلے بِرّ کا لفظ محذوف نکالیں گے تب جا کے حمل ٹھیک ہوگا، ورنہ لفظی ترجمہ بنے گا ''لیکن نیکی وہ شخص ہے جو ایمان لائے اللہ پر''، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح سے فقرہ ٹھیک نہیں بن رہا، اس لیے عبارت یوں ہوگی وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ: لیکن نیکی، نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر (کتاب سے یہاں جنسِ کتاب مراد ہے، اس لیے ترجمہ جمع کے ساتھ کر دیا جائے تو ٹھیک ہے) کتابوں پر اور نبیوں پر۔ وَاٰتَى الْمَالَ: اس کا عطف اٰمَنَ پر ہے، یعنی مَنْ اٰتَى الْمَالَ لیکن نیکی، نیکی تو اس شخص کی ہے جو دے مال، عَلٰى حُبِّهٖ: ہ ضمیر اگر مال کی طرف لوٹائیں تو ترجمہ ہوگا ''باوجود اس مال کی محبت کے''، یعنی دل میں مال کی محبت ہے پھر بھی دیتا ہے۔ اور اگر حُبِّهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹالیں تو معنی ہوگا عَلٰى حُبِّ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بناء پر مال دیتا ہے، یعنی مال کے دینے کا منشاء اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، اور کوئی منشاء نہیں۔ کن کو دیتا ہے؟ ذَوِي الْقُرْبٰى: قربیٰ قرابت کے معنی میں، ذوی القربیٰ: رشتے دار، قرابت والے۔ وَالْيَتٰمٰى: یہ یتیم کی جمع ہے۔ ''رشتے داروں کو، یتیموں کو''۔ یتیم اُس نابالغ بچے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ فوت ہو گیا ہو، نابالغ کی قید ہے، بالغ ہونے کے بعد یتم کا معنی ختم ہو جاتا ہے لَا يُتْمَ بَعْدَ اِحْتِلَامٍ۔[1] وَالْمَسٰكِيْنَ: یہ مسکین کی جمع ہے، اور مسکینوں کو۔ وَابْنَ السَّبِيْلِ: اور مسافر کو۔ ابْنَ السَّبِيْلِ: راستے کا بیٹا، اس کا معنی ہوتا ہے راہ چلتا مسافر، وَالسَّآئِلِيْنَ: اور سوال کرنے والوں کو، وَفِي الرِّقَابِ: فِيْ فَكِّ الرِّقَابِ، اور دے مال گردنوں میں، یعنی گردنوں کے چھڑانے میں مال

---

(۱) ابو داؤد ج ۲ ص ۱۱ باب متی ینقطع الیتم / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۳ باب الخلع، فصل ثالث

خرچ کرے، اس کا مصداق غلام آزاد کرانا، کہ کسی غلام کی قیمت ادا کردی جائے، جیسے مکاتب کو امداد دے دی، یا کسی مقروض کی قرضے سے گردن چھڑا دی، کہ مقروض آدمی کو دے کر اُس کا قرضہ ادا کروادیا، یا خود آپ کا مقروض تھا اُس کا قرضہ معاف کر دیا، تو کسی کا قرضہ ادا کروادینا بھی گردن چھڑانے والی بات ہے۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ: اس کا عطف بھی اٰمَنَ پر ہے، اور نیکی تو اس شخص کی ہے جو قائم کرے نماز اور دے زکوٰۃ۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ: موفون: اسم فاعل کا صیغہ ہے، وفاء کرنے والے۔ الف لام اِس پر الذی کے معنی میں ہے، اور اس کا عطف ہوگا مَنْ اٰمَنَ پر، کیونکہ مَنْ اٰمَنَ یہ لٰكِنَّ کی خبر ہے اور لٰكِنَّ کی خبر مرفوع ہوتی ہے، یہ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے، اسی لیے اَلْمُوْفُوْنَ مرفوع ہے۔ اور جب بِر کا لفظ محذوف نکال لیں گے تو پھر یہ مضاف الیہ کا معنی ادا کرے گا، جیسے وہاں بِر کا لفظ محذوف نکالا تھا، مضاف کو محذوف کر کے مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام ذکر کر دیا گیا تو جو رفع والا اعراب مضاف پر آنا تھا وہ مضاف الیہ پر آیا ہوا ہے، تو مَنْ اٰمَنَ بھی مرفوع ہے اور وَالْمُوْفُوْنَ بھی مرفوع ہے، ''اور نیکی تو اُن لوگوں کی ہے جو اپنے عہد کو وفا کرنے والے ہیں جس وقت کہ عہد کر لیں''۔ وَالصّٰبِرِيْنَ: اس کا عطف اَلْمُوْفُوْنَ پر ہے، اور نحوی قاعدے کے مطابق اس کو والصابرون ہونا چاہیے تھا رفعی حالت کے ساتھ، لیکن اِس کو منصوب کر کے ذکر کر دیا علی الخصوص، اس میں مدح والا معنی پیدا ہوگیا، یہ بھی ایک طریقہ ہے عرب میں، کہ خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے اُس لفظ کا اعراب بدل دیا جاتا ہے، اب چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں بھی بات ویسی ہوتی کہ نیکی توان لوگوں کی ہے جو اپنے عہدوں کے ساتھ وفا کرنے والے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں، موفون کی طرح اس کو مرفوع ہونا چاہیے تھا، لیکن جب یہ اعراب بدل دیا تو اب یہاں فعل محذوف نکالا جائے گا وَاَخُصُّ الصابرین یا وَاَمْدَحُ الصابرینَ اور خاص طور پر میں تعریف کرتا ہوں اُن لوگوں کی جو صبر کرنے والے ہیں، یا نیکی کرنے والوں میں سے خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہوں میں صابرین کا۔ اور صبر کے تین موقع ذکر فرمائے فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ: بأساء: مالی تنگی۔ ضراء: بدنی تکلیف۔ بأس: لڑائی۔ مالی تنگی میں، بدنی تکلیف میں، اور لڑائی کے وقت۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا: یہی لوگ سچے ہیں، جو صدق کے ساتھ موصوف ہیں، یعنی اِن کا قول اِن کے عمل کے مطابق ہے، دعوئ ایمانی میں سچے ہیں، صدق کا یہی معنی ہوتا ہے کہ جو کہتے ہیں اس کے مطابق اِن کا عمل بھی ہے، ''اور یہی لوگ متقی ہیں''۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ: قصاص: برابری کرنا۔ قَاصَّ مُقَاصَّةً باب مفاعلہ سے ہے، اور ویسے باب افتعال سے بھی استعمال ہوتا ہے اِقْتَصَّ۔ الْقَتْلٰى: یہ قتیل کی جمع ہے۔ فرض کر دیا گیا تم پر برابری کرنا مقتولوں کے بارے میں، مقتولوں کے بارے میں برابری کرنا تم پر فرض کر دیا گیا۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ: اَلْحُرُّ يُقْتَلُ بِالْحُرِّ، آزاد قتل کیا جائے گا آزاد کے بدلے، وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ: غلام قتل کیا جائے گا غلام کے بدلے، وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى: اور عورت قتل کی جائے گی عورت کے بدلے، فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ: پس وہ شخص کہ معاف کر دیا جائے اس کو اس کی بھائی کی جانب سے کچھ۔ اس شخص سے مراد قاتل ہے، یعنی قاتل کو معافی مل گئی، مِنْ اَخِيْهِ: اخ کا مصداق ہے مقتول کا وارث، یعنی قاتل کو مقتول کے وارث کی طرف سے کچھ معافی مل جائے، ''پس وہ شخص کہ معاف کر دیا گیا اس کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ''، فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ: تو پیچھا کرنا ہے معروف طریقے سے، وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ: اور ادا کرنا ہے اس کی طرف اچھے طریقے سے، یعنی اُس خون کے معاف ہوجانے کے بعد کچھ مال دینا طے ہوگیا تو مقتول کے ورثاء کو چاہیے کہ قاتل کا پیچھا اچھے

طریقے سے کریں، مال نرمی کے ساتھ مانگیں، اور قاتل کو چاہیے کہ اچھے طریقے سے ادا کردے، نہ مانگنے والا اس کو بلاوجہ تنگ کرکے پریشان کرے، نہ ادا کرنے والا بلاوجہ ٹال مٹول کرکے پریشان کرے، آپس میں معروف طریقے سے اور احسان کے ساتھ اس مالی معاملے کو طے کرلینا چاہیے۔ اگر کچھ خون کی معافی مل گئی، قصاص ساقط ہوگیا، اور اس کے عوض میں دیت آگئی، یا کسی مال پر صلح ہوگئی تو قتیل کے ورثاء کو پیروی کرنی چاہئے مال مانگنے کے لئے معروف طریقے سے، معروف طریقے سے مراد اچھا طریقہ، جو عقلمندوں کے نزدیک جانا پہچانا ہے، اور قاتل کو چاہئے کہ ادا کردے اچھے طریقے سے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ: یہ تخفیف ہے تمہارے رَبّ کی طرف سے اور رحمت ہے، اس نے نرمی کردی، تخفیف کردی، رحمت ہے، مہربانی ہے، فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ: جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے، حد سے تجاوز کرے فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ: اَلباب لُبّ کی جمع ہے، لب عقل کو کہتے ہیں، تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو!، اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم خون خرابے سے بچ جاؤ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: فرض کردیا گیا تم پر جس وقت تم میں سے کسی کو موت حاضر ہوجائے، جب تم میں سے کوئی مرنے لگے، اِنْ تَرَكَ خَيْرًا: خیر کا مصداق یہاں مال ہے، اگر وہ مال چھوڑ کر جائے۔ فرض کردیا گیا تم پر الْوَصِيَّةُ: وصیت کرنا لِلْوَالِدَيْنِ: والدین کے لئے وَالْاَقْرَبِيْنَ: قریبی رشتہ داروں کے لئے، بِالْمَعْرُوْفِ: اچھے طریقے سے، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ: یہ وصیت کرنا لازم کردیا گیا متقین پر، متقین سے یہاں مؤمنین مراد ہیں، فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ: جو شخص بدل دے گا اُس بات کو جو مرنے والے نے کہی ہے بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ: بعد اس کے کہ اُس نے وہ بات سنی، فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ: پس سوائے اس کے نہیں کہ اس کا گناہ صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو اُس بات کو بدلتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا: جو کوئی اندیشہ کرے وصیت کرنے والے کی طرف سے باطل کی طرف میلان کا، جنف کا معنی ہوتا ہے حق سے باطل کی طرف مائل ہونا، اور اس کے مقابلے میں لفظ آیا کرتا ہے حَنَف یعنی باطل سے حق کی طرف مائل ہونا، حنیف کا لفظ اُسی سے لیا گیا ہے، مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (سورۂ بقرہ: ۱۳۵ وغیرہ) ابراہیم حنیف تھے، باطل سے حق کی طرف مائل ہونے والے تھے، "جس شخص کو اندیشہ ہو وصیت کرنے والے کی طرف سے باطل کی طرف میلان کا یا کسی گناہ کا" فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ: پھر وہ ان لوگوں کے درمیان صلح کرادے، حالات ٹھیک کردے، فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

اہلِ کتاب اور مشرکین کے ساتھ پچھلے رکوع کے آخر تک تو اصولی بحث ختم ہوگئی، جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ پہلے زیادہ تر گفتگو اہلِ کتاب کے متعلق چلی آرہی تھی، اور پچھلے رکوع میں شرک اور مشرکانہ رُسوم کی تردید تھی۔ اب یہاں سے آخر سورت تک

اہل ایمان کو ہدایات دی جا رہی ہیں، اور ضمنی طور پر کہیں کفار اور مشرکین کا بھی ذکر آ جائے گا، زیادہ تر احکام اہل ایمان کو دیے جائیں گے۔ پہلی آیت ایک عنوان کے طور پر آ گئی، جس میں سارے کے سارے اصول بیان کر دیے گئے، اور اس سے آگے احکام کی جزئیات شروع ہوں گی۔

کیا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا نیکی نہیں ہے؟

پہلی آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی، کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نیکی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قبلے کی تحویل ہوئی تھی تو اہل کتاب نے اس مسئلے کو بحث کا موضوع بنا لیا، جہاں بیٹھتے اور جدھر جاتے یہی مسئلہ زیر بحث رہتا، کہ بیت المقدس کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ بیت اللہ کی طرف منہ کیوں کر لیا گیا؟ پہلے نبیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، اُدھر ہی منہ کر کے نماز پڑھنی چاہیے تھی، تو اس مسئلے پر انہوں نے بہت بحثیں اٹھائیں، جیسا کہ آپ کے سامنے پہلے اِس کی کچھ تفصیل عرض کر دی گئی۔ اب آپ جانتے ہیں کہ قبلہ، کسی جانب منہ کرنا، جہتِ استقبال، یہ بذاتِ خود کوئی مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ تو عبادت کے اندر یکسوئی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، کہ نماز پڑھنی ہے اس لیے کسی طرف منہ کرنا بھی ضروری ہو گیا، اس کے اندر حسن اگر آیا ہے تو اقامتِ صلوٰۃ کی وجہ سے ہے، باقی! یہ ایک ضمنی سی چیز ہے، اب اس کو اس طرح سے زیر بحث لے آئیں کہ گویا سارے دین کا مدار ہی اس بات پر ہے، یہ حد سے تجاوز ہے، اب اُن کو سمجھانے کے لئے بات یہ کی جا رہی ہے کہ تم اس کے پیچھے اس طرح لگ گئے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ فرمانبرداری اور وفاداری کا معیار صرف یہی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر لو یا مغرب کی طرف منہ کر لو، کسی جہت کی طرف منہ کر لینا یہی ساری وفاداری ہے، دین کا مدار ہی اس بات پر ہے، تم اس بات کو اس طرح سے لے کر بیٹھ گئے جیسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نیکی کا کام ہی نہیں ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نیکی کے کام تو یہ ہیں، اصل ان کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس میں مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنے کی نیکی کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ جس طرح سے اُن لوگوں نے اس کو اپنا موضوعِ سخن بنا لیا تھا، اور ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے، ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ہے ہی نہیں، تو دوسروں کے مقابلے میں اِس کی نفی کرنی مقصود ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص لباس کی اہمیت اتنی اختیار کر لیتا ہے کہ ذرا ذرا بات پر لوگوں سے بحث کرتا ہے، کہ تو نے قمیص ایسی کیوں بنالی، تو نے شلوار ایسی کیوں بنالی، ٹوپی ایسی ہونی چاہیے ایسی نہیں ہونی چاہیے، شلوار ایسی ہونی چاہیے ایسی نہیں ہونی چاہیے، کپڑا یہ استعمال کرنا چاہیے یہ استعمال نہیں کرنا چاہیے، ہر وقت وہ اسی کے پیچھے لگا رہے، کپڑوں کی بناوٹ، اُن کی تراش اور خراش، اور لوگوں کے سامنے تبلیغ کہ یوں کپڑا پہنا کرو، یوں کیا کرو، ووں کیا کرو، اور اس کے علاوہ نماز کی پروا نہیں، روزے کی پروا نہیں، اخلاقِ رذیلہ کی پروا نہیں۔ تو اُس کو سمجھانے کے لئے کہیں گے کہ بھائی! دین سارے کا سارا کپڑوں میں ہی آ گیا؟، دین تو یہ ہے کہ نماز وقت پہ پڑھو، روزہ رکھو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، فرمانبرداری کرو، اس کے مقابلے میں صرف کپڑوں کے اندر کیا رکھا ہے؟، اس کا یہ معنی نہیں کہ کپڑوں کے متعلق احکامِ شریعت نہیں ہیں، لیکن دوسرے احکام کے مقابلے میں چونکہ ان کی حیثیت کمزور ہے تو ادا کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''در عمل کوش و ہر چہ خواہی

پوش'' (گلستان، باب ۲، حکایت ۵) عمل کے متعلق کوشش کرو، پہننے کی کیا بات ہے، جو چاہے پہن لو، اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہننے کے متعلق کوئی احکام نہیں ہیں، مطلب یہ ہے کہ پہننے کے مقابلے میں دوسرے احکام زیادہ اہم ہیں، اب اُن کا تو خیال نہ کرو اور پہننے کے پیچھے لگے رہو اور کپڑوں کو زیر بحث لے آؤ، تو یہ کہا جائے گا کہ بھائی! کپڑوں میں کیا رکھا ہے؟ یہ باتیں خیال کرنے کے قابل ہیں، اور ان کی تم پروانہ کرو اور کپڑوں کے پیچھے لگے رہو تو اُن احکام کے مقابلے میں اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اب ایمان تو لاؤ نہیں، کفر اختیار کیے ہوئے ہو، نماز روزے کی تمہیں پروا نہیں ہے، مالی احکام تم نہیں اختیار کرتے، اخلاق تمہارے ٹھیک نہیں، ایفائے عہد تم نہیں کرتے، بس یہ بحث لگی ہوئی ہے کہ اِدھر کو منہ کیوں کر لیا، اِدھر کو کیوں نہیں کیا، اِدھر کرنا چاہیے، اِدھر نہیں کرنا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کاموں کے مقابلے میں تمہارے نزدیک ایک یہی مسئلہ ایسا اہم ہے؟ ان کے مقابلے میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے، تمہیں خیال ان باتوں کا کرنا چاہیے۔ یہ ہے مطلب اِس لفظ کا، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ مشرق کی طرف منہ کرنا یا مغرب کی طرف منہ کرنا نیکی کا کام نہیں، کیونکہ جب اللہ نے حکم دے دیا کہ نماز پڑھتے ہوئے مشرق کی طرف منہ کرو یا اللہ نے حکم دے دیا کہ مغرب کی طرف منہ کرو تو وہاں منہ کرنا نیکی ہے، لیکن دوسرے احکام اِس کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں، اب ساری توجہ کو اِسی پر ہی مرکوز کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جیسے بعض لوگ ایک مسئلے کو لے لیں گے اور اسی پر ہر وقت اٹھتے بیٹھتے بحث کرتے رہیں گے، نہ نماز کی پروا، نہ روزے کی، ہم کہیں گے بھئی! سارا دین کوئی اِسی مسئلے میں تو نہیں رکھا ہوا، دوسرے کام بھی تو کرنے کے ہیں۔ تو دوسرے کاموں کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ عنوان اختیار کیا جاتا ہے۔ ''مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نیکی نہیں'' یعنی نیکی صرف یہی نہیں جو ہر وقت تم اِس کے پیچھے پڑ گئے، بلکہ نیکیاں تو یہ ہیں، اِن کا خیال کرو۔ تو اس مسئلے کے مقابلے میں دوسرے مسائل کو اہم کر کے ذکر کرنا مقصود ہے۔

دِین کے بنیادی عقائد کی تلقین

''نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے'' سب سے زیادہ بنیادی چیز جو ضروری ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے، اللہ پر ایمان لانے کا مطلب آپ نے جان لیا، کہ اُس کے وجود کو مانو کہ اللہ ہے، اُس کو واحد جانو، وحدانیت کا عقیدہ رکھو، ہر قسم کی اچھی صفات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کتاب میں واضح کی گئی ہیں اُن کے ساتھ اُس کو موصوف جانو، ہر قسم کے نقص سے اُسے پاک جانو، اس کو وحدہ لاشریک قرار دو۔ ''اور یومِ آخر پر ایمان لائے'' یومِ آخر سے مراد ہے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا دن، پچھلا دن، کہ جب یہ ساری دنیا برباد ہو جائے گی اُس کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب ہوگا، اُس کے بعد جنت و دوزخ والی زندگی شروع ہوگی، یہ یوم آخر پر ایمان ہے، اور یہ ضروریاتِ دین میں شامل ہے، اگر کوئی شخص اس میں شک کرتا ہے تو کافر ہے، وہ مؤمن نہیں ہے، یہ بات بنیادی عقائد میں داخل ہے۔ ''اور ایمان لائے فرشتوں پر'' کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں، جس طرح سے اُن کے حالات بتا دیے گئے، کہ نوری مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، جو حکم اللہ تعالیٰ دیتے ہیں وہی وہ پورا کرتے ہیں لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (سورۂ تحریم: ۶) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو

مختلف کاموں پر متعین کیا ہوا ہے، جو کام اُن کے ذمے لگ جائے وہ کام کرتے ہیں، اس کائنات کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کی تقدیر کے نافذ کرنے کے لئے وہ کارکن ہیں، جیسے حالات اُن کے قرآن اور حدیث میں واضح کردیے گئے ان کے مطابق فرشتوں کو مانو۔ وَالْكِتٰبِ: کتاب سے جنسِ کتاب مراد ہے، اللہ کی طرف سے جو کتابیں اُتریں اُن پر ایمان لائے۔ وَالنَّبِيّٖنَ: اور ایمان لائے نبیوں پر یعنی سب نبیوں کو مانے۔ یہ تو عقائد کا درجہ آ گیا کہ نیک بننے کے لئے ایمان اس طرح سے تفصیل کے ساتھ لانا ضروری ہے، کہ اللہ کو مانو، یومِ آخر کو مانو، فرشتوں کو، کتابوں کو، نبیوں کو، یہ چیز اصول کے درجے میں ذکر کردی، اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے اندر سارا دین آ گیا، جب کتابوں کو مان لیا تو جو کچھ کتابوں نے بیان کیا وہ بات بھی ایمان کے درجے میں آ گئی، تو دین کے بنیادی عقائد سارے اِس کے اندر آجاتے ہیں۔

مالی اور بدنی عبادات اور معاملات کی دُرستی کی تاکید

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى: اب آگے عبادات کا درجہ آ گیا، عبادات دو قسم کی ہیں، مالی اور بدنی، بدنی عبادات میں نماز اصولی حیثیت رکھتی ہے، اور مالی عبادات میں زکوٰۃ اصولی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر زکوٰۃ کے ذکر کرنے سے پہلے مال کے دینے کا ذکر جو آ گیا یہ نفلی صدقات ہیں، عَلٰى حُبِّهٖ: اللہ کی محبت کی بناء پر مال کو دے۔ ذَوِي الْقُرْبٰى: رشتے داروں کو، رشتے داروں سے محتاج رشتے دار مراد ہیں، کہ کوئی رشتے دار سامنے آ گیا جو محتاج ہے اور اُس کے پاس اپنی ضرورت کی چیز نہیں ہے اور تمہارے پاس مال ہے تو اس کو دو، اسی طرح یتیموں کو دو، مسکینوں کو، مسافر کو، مسافر سے بھی ضرورت مند مسافر مراد ہے، سوال کرنے والوں کو دو، اور گردنوں کے چھڑانے میں دو۔ جو شخص اپنے مال کو اِن مدّوں کے اندر صرف کرتا ہے یہ ہے اللہ کا وفادار، نیکی تو اِس شخص کی نیکی ہے۔ فِي الرِّقَابِ کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کردیا، کہ رقاب جمع ہے رَقَبَة کی، رقبہ کہتے ہیں گردن کو، اور اِس کے اُوپر مضاف محذوف ہے فِي فَكِّ الرِّقَابِ گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کرے، یعنی غلاموں کے آزاد کرانے میں، جیسے کوئی مکاتب ہے اُس کی امداد کردی، یا کوئی مقروض سامنے آ گیا تو اُس کا قرضہ ادا کر کے اس کی گردن چھڑا دی۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ: یہ بدنی عبادت کا اصول آ گیا، نیکی تو اُس شخص کی ہے جو نماز قائم کرے، وَاٰتَى الزَّكٰوةَ: اور زکوٰۃ دے، زکوٰۃ مالی عبادت کا اصول ہے، لیکن زکوٰۃ سے پہلے اٰتَى الْمَالَ جو ذکر کیا ہوا ہے تو اس میں اہمیت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا اظہار اسی طرح سے ہوتا ہے کہ صرف زکوٰۃ پر اکتفاء نہ کیا جائے بلکہ وقتاً فوقتاً اپنا محبوب مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتا رہے، جیسے چوتھے پارے کی پہلی آیت آئے گی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ: تم ہرگز بِر کو نہیں پہنچ سکتے (یہی بِر کا لفظ وہاں ہے)، تم ہرگز بِر کو نہیں حاصل کرسکتے جب تک کہ اپنے محبوب مال میں سے اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو۔ تو کمال حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے محبوب مال کا خرچ کرنا ضروری ہے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ: پہلے عقائد اور عبادات کا ذکر تھا، اور یہ معاملات کا ذکر آ گیا، کہ جس کسی کے ساتھ عہد کرلو۔ عَاهَدَ یہ دو کا آپس میں ہوتا ہے، یعنی جو کچھ لو اور دو کے اصول پر آپس میں کوئی طے کرلیا، جیسے بیع وشراء ایک معاہدہ ہے، نکاح ایک معاہدہ ہے، اور اسی طرح باقی جتنے معاملات چلتے ہیں وہ عاقدین کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، اور اس کے وفا کا مطلب یہ

ہے کہ اُس عہد کے حقوق ادا کرو۔ ''اور نیکی تو اُن لوگوں کی ہے جو وفاء کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب بھی وہ عہد کرلیں''، یہ معاملات کی دُرستی کا ذکر آ گیا۔

صبر کا مفہوم، اقسام اور اہمیت

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ: یہ اخلاق کا ذکر آ گیا، یعنی باطنی عادات کا اچھا ہونا، کہ انسان کے اندر صبر کی صفت پائی جائے، اور صبر کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا، کہ یہ نفس کی پختگی ہوتی ہے، جس کو ہم برداشت کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس کے تینوں شعبے ہوتے ہیں، کہ نیکی سے طبیعت کراہت کرتی ہے تو طبیعت کو پابند کرو اس نیکی کے کرنے پر، یہ بھی صبر کا تقاضا ہے جس کو صبر علی الطاعت کہیں گے، اسی طرح نفس کا میلان معصیت کی طرف ہے اور روکنا اس کو ناگوار ہے، تو نفس کو معصیت سے روک کے رکھو، اُس کی مکروہ چیز پر اُس کو پابند کرو، یہ بھی صبر کا شعبہ ہے جس کو صبر عن المعصیت سے تعبیر کریں گے، اور اسی طرح خلافِ طبیعت واقعات پیش آ جائیں تو طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے شکوہ شکایت کرنے کا اور چیخنے چلانے کا، لیکن اپنے نفس کو پابند کر کے رکھو، یہ صبر علی المصیبت ہے۔ اور خصوصیت سے یہاں مصیبت والے صبر کا ذکر آ گیا، کہ مالی تنگی پیش آ گئی یا بدنی تکلیف پیش آ گئی، یا کوئی لڑائی جہاد وغیرہ نقصان پیش آ گیا، تو اس میں جمنے والے لوگوں کی میں خصوصیت سے تعریف کرتا ہوں کہ یہ ہیں وفادار قسم کے لوگ، جو مالی تنگی میں بھی مستقل مزاج رہتے ہیں، بدنی تکلیف میں بھی مستقل مزاج رہتے ہیں، اور اللہ کے راستے میں جہاد کی نوبت آ جائے تو اس میں بھی مستقل مزاج رہتے ہیں، یہ ہیں اصل وفادار لوگ، اِن کی میں خصوصیت سے تعریف کرتا ہوں۔ چونکہ صبر جامع ہے تمام خیرات اور تمام نیکیوں کے لئے، کہ اِس کیفیت کے حاصل ہو جانے کے بعد ہر نیکی آسان ہو جاتی ہے، معصیت سے بچنا آسان ہو جاتا ہے جب اپنے آپ کو سنبھالنے کی عادت پڑ جائے۔ کیونکہ صبر کا مفہوم اپنے آپ کو سنبھالنا ہے، کہ اپنے نفس کو سنبھال لیا، اور اُس کے تقاضے کے مطابق اُس کو چلنے نہ دیا، نفس کا تقاضا ہے نیکی سے بھاگنا اور گناہ کی طرف جانا اور خلافِ مزاج بات پیش آ جانے کے بعد شکوہ شکایت اور شور مچانا، تو اپنے نفس کو سنبھال کے رکھو، نیکی سے اِس کو بھاگنے نہ دو، گناہ کی طرف اِس کو جانے نہ دو، اور تکلیف آ جائے تو اس میں بھی سنبھال کے رکھو، کہ اس میں بھی اوچھے پن کے ساتھ شکوہ شکایت چیخنا چلانا نہ پایا جائے، تو یہ چیز چونکہ تمام نیکیوں کے لئے جامع ہے، اور اِس کیفیت کے حاصل ہو جانے کے بعد بہت ساری نیکیاں آسان ہو جایا کرتی ہیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اِن کی وفاداری کی تعریف کی ہے۔ تو دین کے جو اہم شعبے تھے وہ اصولی درجے میں یہاں آ گئے، عقائد آ گئے، عبادات آ گئیں مالی بھی اور بدنی بھی، اور معاملات آ گئے، اور اخلاق آ گئے۔

سچے وفادار کون؟

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا: یہ ہیں سچے لوگ، صدق کا یہاں معنی یہی ہے کہ جو اپنے قول کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، صرف باتیں ہی بنانا نہیں جانتے، جن کا کردار اس قسم کا ہے، یہ ہیں اللہ تعالیٰ کی وفاداری کے دعوے کے اندر سچے لوگ، یہ نیک لوگ ہیں، یہ نیکی کا کردار اختیار کرنے والے ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: اور یہی لوگ متقون ہیں۔ تو اِن کاموں کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یہ کام

کرنے کے ہیں، جو شخص یہ کام کرتا ہے یہ ہے اصل کے اعتبار سے اللہ کا وفادار، یہ ہے نیکی کرنے والا۔ اور صرف یہی کہ مشرق مغرب کی طرف منہ کرنے کی بات کو لے کر بیٹھ جاؤ اور باقی اہم کاموں کو چھوڑ دو تو یہ کوئی وفاداری نہیں ہے۔

قصاص کے متعلق جاہلیت کی بے اِعتدالی اور اِسلام کی تعلیم

اصول کے درجے میں ذکر کرنے کے بعد اب آگے کچھ احکام کی جزئیات آگئیں، پہلا حکم ذکر کیا جا رہا ہے مقتولین کے قصاص کا، اور اس مسئلے کا تعلق امنِ عالم کے ساتھ ہے، جیسے آگے لفظ آئے گا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ: اس میں زندگی کا بچاؤ ہے، امنِ عالم کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ عرب کے اندر جس قسم کا فساد تھا اس کی تفصیل آپ سنتے رہتے ہیں، کہ ذرا سی بات پر دوسرے آدمی کو قتل کر دیا جاتا، اور پھر جس قبیلے کا آدمی قتل ہو جاتا وہ قبیلہ انتقام لینے کے لئے ضد میں آ کر دوسروں کے قبیلوں کے قبیلے ختم کر دیتا، کہ کوئی عورت ہاتھ آ گئی تو اس کو مار دو، بچہ ہاتھ آ گیا تو اس کو مار دو، قاتل کا باپ ہاتھ آ گیا تو اُس کو قتل کر دو، بیٹا ہاتھ آ گیا تو اُس کو قتل کر دو، کوئی قاعدہ اور ضابطہ ہی نہیں تھا، یہ خون ریزی ساری کی ساری چل رہی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اس میں قصاص کی رعایت رکھو، اگر قاتل حُر ہے تو اس کے بدلے میں حُر کو قتل کرو، یعنی قاتل حر ہے تو حر کو قتل کرو، قاتل عبد ہے تو عبد کو قتل کرو، یہ نہیں کہ اگر ایک آدمی کے غلام کا قاتل دوسرے آدمی کا غلام ہے، اور وہ اس غلام کے مقابلے میں اس قاتل غلام کو قتل نہیں کرتا، بلکہ آزاد آدمی کو قتل کرتا ہے، یہ بھی ان کی ایک ضد ہوتی تھی، کہ ایک خاندان جو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں اچھا سمجھتے، وہ اپنے غلام کے عوض میں دوسرے قبیلے کا آزاد لیتے تھے چاہے قاتل غلام ہی ہو، وہ کہتے تھے ہم اس کو کیوں قتل کریں، ہم تو اس قبیلے کا آزاد آدمی لیں گے۔ یہاں برابری کا مقصد یہ ہے کہ جو قاتل ہو اس کو قتل کرو، اگر عبد کو عبد نے قتل کیا ہے تو عبد کو قتل کرو، اگر حُر نے حُر کو قتل کیا ہے تو حُر کو قتل کرو، عورت نے عورت کو قتل کیا ہے تو عورت کو قتل کرو، یہ نہیں کہ قاتل تو عبد ہے لیکن تم اس قبیلے کا آزاد لے لو، قاتل تو عورت ہے لیکن تم اس قبیلے کا مرد قتل کرو، ایسی بات نہیں ہے۔ اور دوسری شق پیش آجانے کی صورت میں کہ عبد قاتل ہے حُر کا تو بھی عبد کو قتل کیا جائے گا، حُر قاتل ہے عبد کا تو بھی حُر کو قتل کیا جائے گا، عورت قاتل ہو مرد کی تو بھی عورت کو قتل کیا جائے گا، مرد قاتل ہو عورت کا تو مرد کو قتل کیا جائے گا، یہاں اس کی نفی کرنی مقصود نہیں ہے کہ حُر کو حُر کے بدلے میں قتل کرو، عبد کے بدلے میں قتل نہ کرو، بلکہ کہنا یہ ہے کہ برابری یوں کرو کہ اگر حُر کا قاتل حُر ہے تو حُر کو قتل کرو، عبد کا قاتل عبد ہے تو عبد کو قتل کرو، یہ نہ ہو کہ عبد کی بجائے تم حُر کو قتل کرو، ایک کی بجائے تم کئی کئی کو قتل کرو۔

قتل کی اقسام اور ان کے اَحکام

اصل حکم تو یہ ہوا کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کر دو تو دونوں کے درمیان برابری ہو جائے گی۔ باقی احکام تفصیل کے ساتھ فقہ میں آئیں گے کہ کون سا قتل ہوتا ہے جس کے بدلے میں قصاص لیا جاتا ہے۔ قتل کی پانچ قسمیں آپ کے سامنے فقہ میں ذکر کی جائیں گی، اُن میں سے صرف ایک قتل ہے جس کو قتل عمد کہتے ہیں، کہ کسی آلۂ قاتلہ کے ساتھ جان بوجھ کر قتل کیا جائے، یعنی استعمال بھی آلۂ قاتلہ کیا ہو اور مارا بھی جان بوجھ کر ہو، کیونکہ بسا اوقات استعمال تو آلۂ قاتلہ ہوتا ہے لیکن انسان مارتا جان بوجھ کر

نہیں ہے، جیسے گولی ماری، لیکن ماری تھی ہرن کو اور چوک کر لگ گئی کسی انسان کو، اب یہاں آلہ تو قاتلہ ہے لیکن اس انسان کو جان کر نہیں ماری۔ یا کوئی چیز نظر آئی، اس کو سمجھا کہ یہ ہرن ہے، اور ہرن سمجھ کے ماردی، لگی اسی کو جس کو ماری ہے لیکن یہ سمجھا تھا کہ یہ ہرن ہے اور حقیقت میں وہ کوئی انسان بیٹھا ہوا تھا، تو یہاں بھی قصد میں خطا ہوگئی، اس کے سمجھنے میں غلطی ہوگئی، یہ صورتیں خطا کی ہیں، اِن کے اندر قصاص نہیں آیا کرتا۔ قصاص اس صورت میں ہوگا کہ آلۂ قاتلہ استعمال کیا ہو یعنی ایسا آلہ جس کے ساتھ عادۃً آدمی کو قتل کیا جاتا ہے، جیسے چھری، چاقو، تلوار، اور آج کل بندوق، پستول، جن کے ساتھ آدمی عموماً قتل کیے جاتے ہیں اِن کو استعمال کرے، اور پھر مارے بھی جان بوجھ کر، جب یہ حالات ثابت ہوجائیں گے کہ اس نے جان بوجھ کر مارا ہے اور اسی کو مارنا مقصود تھا ایسی صورت میں ہم کہیں گے کہ یہ قتلِ عمد ہے اور اس صورت میں قاتل کو مقابلے میں قتل کردیا جاتا ہے۔ اور اگر آلۂ قاتلہ استعمال نہیں کیا، جیسے ڈنڈا مارا اور اتفاقاً وہ مرگیا، یا آثار سے ہم سمجھتے ہیں کہ جس کو گولی لگی اُس کو مارنی مقصود نہیں تھی، تو ان صورتوں میں قصاص نہیں آیا کرتا بلکہ دِیت آتی ہے، یہ سب تفصیل آپ فقہ کے اندر پڑھیں گے۔

قصاص کے ساقط ہونے کی صورتیں

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ: قصاص حق العبد ہے، قتیل کے ورثاء معاف کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اگر بالکل ہی معاف کردیں کہ ہم کچھ بھی نہیں لیتے اِس کا بھی حق ہے، اور اگر کچھ معاف کردیں تو پھر بھی قصاص ساقط ہوجائے گا، مثلاً قتیل کے دو وارث ہیں، اُن میں سے ایک نے معاف کردیا تو قصاص ساقط ہے، اب قصاص نہیں لیا جاسکے گا، بلکہ دوسرے کو مالی معاوضہ دیا جائے گا دِیت کے انداز میں۔ اور اگر ویسے ہی خون چھوڑ دیں اور کہیں کہ ہم اتنے پیسے لے کر معاف کرتے ہیں اور قاتل راضی ہوجائے تو بھی قصاص ساقط ہوجائے گا۔ اگر کچھ معافی مل گئی تو پھر چاہیے کہ مال لیتے وقت قتیل کے ورثاء اُس قاتل کی پیروی کریں، اس کے پیچھے لگیں اچھے طریقے کے ساتھ، یعنی شرافت سے پیسے مانگیں۔ اور دینے والا بھی احسان کے ساتھ اور اچھے طریقے کے ساتھ ادا کردے، یعنی لینے والے کو چاہیے کہ وہ بھی عرف کی رعایت رکھے اور بلاوجہ پریشان نہ کرے، اور دینے والے کو چاہیے کہ وہ بھی بلاوجہ ٹال مٹول نہ کرے، اِس مالی معاملے کو شرافت اور احسان کے ساتھ آپس میں طے کرلیں۔

قانونِ قصاص میں تخفیف، اور خلاف ورزی پر وعید

اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور اس کی مہربانی ہے، ورنہ اگر وہ کہتا کہ قتل کے بدلے میں دوسرے کو قتل ہی کیا جائے گا، اور مالی طور پر معاملہ طے کرنے کی اجازت نہیں ہے، تو اس میں سختی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی کہ چاہو تو تم خون کا بدلہ خون لے لو، اور چاہو تو معاف کردو، چاہو تو مالی معاوضہ لے لو، یہ تخفیف ہے اور اُس کی مہربانی ہے۔ اور اِس مالی معاملے کے طے ہوجانے کے بعد یا معافی مل جانے کے بعد پھر اگر کسی نے تعدی کی، کہ پہلے معاف کردیا پھر قاتل سے بدلہ لے لیا، یا دِیت لے لی پھر خون بھی وصول کرلیا، اس قسم کی اگر کوئی حد سے تجاوز کرے گا فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: تو پھر یہ تجاوز کرنے والا قصوروار ہے، اُس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

قانونِ قصاص کے فوائد وثمرات

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ: اے عقل والو! تمہارے لیے اس قصاص میں زندگی ہے، اگر قصاص کا قانون نافذ کرو گے تو تمہاری اپنی زندگیاں بچیں گی، قتل وغارت اتنی نہیں ہوگی، جب کسی شخص کو یہ یقین آ جائے کہ اگر میں نے قتل کیا تو مقابلے میں میں بھی قتل کر دیا جاؤں گا تو خود بخود وہ بچے گا، جس کو قتل کرنا چاہتا ہے وہ بھی بچ گیا اور جس نے قتل کرنا تھا وہ خود بھی بچ گیا، دونوں کی زندگی بچ گئی، اور جب یہ پتہ ہو کہ ہم چھوٹ جائیں گے، ہمیں کوئی پکڑنے والا نہیں، رشوت دے کر چھوٹ جائیں گے، سفارش سے چھوٹ جائیں گے، قصاص نہیں لیا جائے گا، تو پھر انسان بے باک ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے، قتل وغارت زیادہ ہوتی ہے، اس قانون کے نفاذ میں تمہاری زندگیوں کی حفاظت ہے، حیات کا معنی ہے زندگی کی حفاظت، تمہاری زندگی کی بقاء ہے اے عقل والو! یعنی معاشرہ سدھر جائے گا، قتل وخون بند ہو جائے گا، جان کا امن حاصل ہو جائے گا، کوئی شخص ایک دوسرے پہ ہاتھ نہیں اٹھائے گا، اگر پابندی کے ساتھ تم اِس قانون کے اُوپر عمل کر لو تو اس میں زندگی کی بقاء ہے، زندگی کا بچاؤ ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم بچو اس قتل وخون سے، اس لیے ہم نے تمہیں یہ قاعدہ بتایا ہے، کہ اس قانون کی پابندی کرو گے تو قتل وخون سے بچ جاؤ گے۔ یہ تو جان کے متعلق حکم تھا، اور آگے مال کے متعلق حکم آ گیا۔

وصیت کے متعلق شرعی اَحکام

جس وقت یہ آیت اتری ہے اُس وقت تک ورثاء کے حصے قرآنِ کریم میں متعین نہیں کیے گئے تھے، اس لیے حکم دے دیا کہ مرنے والا خود وصیت کر کے جایا کرے، کہ میری ماں کو اتنا دے دینا، میرے باپ کو اتنا دے دینا، فلاں کو اتنا دے دینا، پھر اُس کی وصیت کے مطابق اُس مال کو تقسیم کر دیا جاتا تھا، اور جو باقی بچ جاتا تھا وہ اولاد کو دے دیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں جس وقت قرآنِ کریم میں حصے متعین کر دیے گئے، کہ ماں کا اتنا ہے، باپ کا اتنا ہے، فلاں کا اتنا ہے، فلاں کا اتنا ہے، جیسے سورۂ نساء میں آپ کے سامنے تفصیل آئے گی، اس کے بعد پھر اقربین کے لئے وصیت ساقط ہو گئی، اب رشتے داروں میں سے جو رشتے دار وارث ہیں جن کے حصے قرآن اور حدیث میں متعین کر دیے گئے اُن کے لئے وصیت نہیں کی جا سکتی، ہاں البتہ ایک شخص رشتے دار ہے لیکن وہ وارث نہیں ہے تو اُس کے لئے وصیت اب بھی کی جا سکتی ہے، اور اب یہ وصیت مستحب ہے، فرض نہیں ہے، جیسے اگر آپ کا باپ بھی زندہ ہے اور دادا بھی زندہ ہے تو باپ وارث ہے، دادا وارث نہیں ہے، تو آپ وصیت کر سکتے ہیں کہ میرے دادے کو میرے مال میں سے اتنا دے دینا، تو آپ کی وصیت ثلث میں نافذ ہو جائے گی، ثلث سے زیادہ نہیں، اسی طرح آپ کا بھائی بھی زندہ ہے اور بھتیجا بھی زندہ ہے، تو بھائی کی موجودگی میں بھتیجا وارث نہیں ہے، ایسی صورت میں آپ وصیت کر سکتے ہیں کہ میرے بھتیجے کو اتنا دے دینا، کیونکہ یہ رشتہ دار اس وقت وارث کی حیثیت میں نہیں ہے۔ اور وارث کے لئے وصیت نہیں ہے: ''لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ''[1] جس کا

(۱) ترمذی ۳۲/۲، باب ما جاء لا وصیۃ لوارث/ مشکوۃ ۲۶۵/۱، باب الوصایا، فصل ثانی

ورثہ متعین قرآن وحدیث میں متعین ہو گیا اُس کے لئے وصیت نہیں کی جائے گی، اُس کو اتنا ہی دیا جائے گا جتنا قرآن وحدیث میں متعین ہو گیا۔ اور اگر کوئی شخص کسی وارث کے لئے وصیت کر ہی دے تو پھر باقی ورثاء کی اجازت پر موقوف ہے، اگر باقی ورثاء اپنا حق چھوڑ دیں اور اس کو زیادہ دینے پر راضی ہو جائیں تو شریعت کو کوئی اعتراض نہیں، لیکن باقی ورثاء پر اُن کی مرضی کے خلاف یہ وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ اور پھر وصیت ثلث میں بند کر دی گئی، ثلث سے زیادہ میں وصیت کرنا جائز نہیں، اگر کوئی شخص ثلث سے زیادہ وصیت کر جائے اس کی اجازت بھی ورثاء دیں گے، اگر ورثاء اجازت دیں گے تو وہ زائد مال دے دیا جائے گا، ورنہ ثلث تک وصیت نافذ ہوگی، زیادہ نہیں نافذ ہوگی، ''لکھ دی گئی تم پر، فرض کر دی گئی تم پر وصیت (اَلْوَصِیَّۃُ: کُتِبَ کا نائب فاعل ہے) جس وقت تم میں سے کسی کو موت آنے لگے''۔ اور وصیت کب کرنی ضروری ہے؟ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا: اگر مال چھوڑ کر جائے، اور اگر مال چھوڑا ہی نہیں تو پھر وصیت بھی کیا کرنی ہے، ''وصیت والدین کے لئے، قریبی رشتے داروں کے لئے معروف طریقے سے''، اچھے طریقے سے، یعنی انصاف کی رعایت رکھو، عرفِ عام کی رعایت رکھو، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ: یہ متقین پر ضروری ہے، یہ بات ضروری طور پر لکھ دی گئی ہے، حق ہے متقین پر، حکمِ لازم ہے متقین پر۔

وصیت میں تبدیلی کرنے والا گناہ گار ہوگا

ایک وصیت کرنے والے نے وصیت کر دی، اور جس کے سامنے وصیت کی تھی اُس نے آگے ادا کرتے ہوئے اُس وصیت کو بدل دیا، مثلاً اُس نے تو کہا تھا کہ اِس کو پچاس روپے دے دینا، لیکن وہ کہتا ہے کہ اس نے کہا تھا پچیس دے دینا، اب حاکم تو اِس کی وصیت کے مطابق فیصلہ کر دے گا، اب حقیقت کے اعتبار سے جو حاکم نے فیصلہ کیا کہ اس کو پچیس روپے دے دو تو اُس کا پچیس روپے حق مارا گیا، لیکن اِس کا گناہ حاکم پر نہیں، اُس تبدیلی کرنے والے پر ہے جس نے وصیت غلط ادا کی ہے، یعنی حاکم کا فیصلہ واقع کے اعتبار سے غلط ہوگا، لیکن اس کا گناہ حاکم کو نہیں ہے، جو بھی تقسیم کرنے والا ہوگا وہ تو بیان سن کر ہی تقسیم کرے گا، بیان دینے والا اگر غلط بیانی کرتا ہے تو نہ مرنے والے پر گناہ نہ حاکم پر گناہ، یہ گناہ اسی کے ذمے ہی ہے جس نے تبدیلی کی ہے۔ ''اور جو شخص بدل دے اُس وصیت کو سننے کے بعد پس اُس کا گناہ اُسی شخص پر ہے جس نے اُس کو بدلا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔''

اصلاح کی نیت سے وصیت میں تبدیلی جائز ہے

ہاں البتہ ایک صورت ہے، کہ وصیت کرنے والے نے وصیت ایسے طور پر کی کہ واقعی اس نے بعض کی حق تلفی کر دی اور وہ حق سے مُڑ گیا، پھر ان سب کے درمیان میں کوئی اصلاحی پہلو اختیار کر لیا جائے تو اس میں چاہے بظاہر وصیت کے اندر تبدیلی ہے، لیکن اس قسم کی تبدیلی جو اصلاح کے لئے کی گئی ہے، جس میں اصلاحِ احوال ہے، اس قسم کی تبدیلی اگر کوئی کرے تو اس کو گناہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ واقعہ پیش آ سکتا ہے کہ وصیت کرنے والے نے تعدی کی، مثلاً قرضداروں کا قرض ادا کرنے کے متعلق کہہ کر

نہیں گیا، دور کے رشتے داروں کو زیادہ دے دیا، قریب والوں کو بالکل محروم کر دیا، مال بے ڈھنگے پن کے ساتھ تقسیم کرنے کے لیے کہہ گیا، ایسے وقت میں کوئی شخص اِس وصیت میں تبدیلی کرا دیتا ہے اور آپس میں حالات کی اصلاح کروا دیتا ہے تو اُس کے اُوپر کوئی گناہ نہیں، بظاہر اگرچہ اس میں تبدیلی ہے لیکن یہ تبدیلی اصلاح کے رنگ میں ہے، اس لیے درست ہے۔ ''جو شخص اندیشہ کرے کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے باطل کی طرف میلان کا یا گناہ کا'' کہ کسی کی وہ حق تلفی کر گیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ خاف یہاں عَلِمَ کے معنی میں ہے، جس کو تحقیق ہوگئی، جس کو معلوم ہوگیا مُوصی کے طرف سے میلان الی الباطل یا کسی قسم کا گناہ، پھر وہ ان ورثاء کے درمیان میں اصلاح کر دیتا ہے، اُن کے حالات کو درست کر دیتا ہے، اصلاح کی کوئی صورت پیدا کر دیتا ہے، فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: اِس پر کوئی گناہ نہیں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ

اے ایمان والو! فرض کر دیا گیا تم پر روزہ رکھنا جس طرح فرض کیا گیا تھا اُن لوگوں پر

مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم متقی ہو جاؤ ﴿۱۸۳﴾ چند گنتی کے دن (روزہ رکھ لیا کرو)، پھر جو تم میں سے

مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ

بیمار ہو یا سفر پر ہو تو اُس کے ذمے ہے شمار کرنا دوسرے دنوں سے، اور اُن لوگوں کے ذمے

يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ

جو طاقت رکھتے ہیں روزے کی فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا، جو شخص شوق کے ساتھ نیکی کرے پس وہ اس کے لئے بہتر ہے،

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو ﴿۱۸۴﴾ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا اس حال میں کہ وہ قرآن

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ

لوگوں کے لئے راہنمائی ہے اور ہدایت اور فرقان کے واضح دلائل ہیں، جو تم میں سے مہینے میں موجود ہو تو اُس کو اس کا روزہ رکھنا چاہیے،

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ

اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو اُس کے ذمے ہے شمار دوسرے دنوں سے، ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق آسانی کا، اور

لَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ

نہیں ارادہ کرتا تمہارے متعلق دشواری کا، اور تاکہ تم پورا کرلو شمار، اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾ وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ

اور تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿١٨٥﴾ اور جب آپ سے سوال کریں میرے بندے میرے متعلق پس میں قریب ہوں، میں قبول کرتا ہوں

دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ

پکارنے والے کی پکار کو جس وقت وہ مجھے پکارے، پس چاہیے کہ لوگ بھی میرے احکام کو قبول کریں اور چاہیے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ

يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ

ہدایت یافتہ ہو جائیں ﴿١٨٦﴾ حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات اپنی عورتوں کی طرف بے حجاب ہونا، وہ عورتیں تمہارے لیے

لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ

لباس ہیں اور تم اُن کے لئے لباس ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تم خیانت کرتے تھے اپنے نفسوں سے،

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ

اللہ نے تم پر توجہ کی اور تمہیں معاف کیا، پس اب اُن کے ساتھ مل جل لیا کرو، اور طلب کرو اس چیز کو جو اللہ نے تمہارے

اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَ اشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

لیے لکھ دی، کھاتے رہو، پیتے رہو، یہاں تک کہ واضح ہوجائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ

سیاہ دھاری سے، پھر پورا کیا کرو روزے کو رات تک، اور نہ ملا جلا کرو اُن عورتوں کے ساتھ

وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ ۙ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ

اس حال میں کہ تم اعتکاف کرنے والے ہو مساجد میں، یہ اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں، تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ، اسی طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات لوگوں کے لئے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں ﴿۱۸۷﴾ اور نہ کھایا کرو اپنے مال آپس میں غلط طریقے سے

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور نہ پہنچایا کرو وہ مال حکام تک تا کہ کھالو تم لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ: اے ایمان والو! لکھ دیا گیا تم پر، یعنی فرض کر دیا گیا، الصِّيَامُ: الصَّوْمُ الصِّيَامُ دونوں مصدر ہیں بمعنی روزہ رکھنا، اور صیام صوم کی جمع بھی آتی ہے، یہاں مصدر کے معنی میں ہے، ''تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا''، كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ جس طرح سے فرض کیا گیا تھا اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ: صُوْمُوْا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ چند گنتی کے دنوں کا روزہ رکھ لیا کرو، یہ منصوب ہوگا صُوْمُوْا مقدر کی وجہ سے۔ اور اگر اس کو الصِّيَامُ کا مفعول بنا دیا جائے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، تو بھی گنجائش ہے، چند معدود دنوں کا روزہ رکھنا تم پر فرض کیا گیا ہے (نسفی وجلالین)، لیکن عام طور پر مترجمین نے صُوْمُوْا کا لفظ نکال کر ہی ترجمہ کیا ہے۔[1]

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا: پھر جو تم میں سے بیمار ہو، مریض کا معنی مرض والا، لیکن یہاں سے ہر بیمار مراد نہیں، ایسا بیمار مراد ہے جس کو روزہ نقصان دیتا ہو، جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ: فَعَلَيْهِ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ پھر اس کے ذمے ہے شمار دوسرے دنوں سے۔ عدت: گنتی، شمار۔ اس کے ذمے ہے گنتی دوسرے دنوں سے، یعنی جتنے روزے چھوٹے ہیں اتنی گنتی دوسرے دنوں سے کر لے۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ: اور ان لوگوں کے ذمے جو طاقت رکھتے ہیں اُس روزے کی، فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ یہ فدیہ کا بیان ہے۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا: جو کوئی شخص شوق کے ساتھ نیکی کرے، رغبت کے ساتھ کوئی بھلائی کا کام کرے، فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ: پس وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: اَنْ تَصُوْمُوْا مصدر کی تاویل میں ہے صیامُکم خیرٌلکم تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: اگر تم جانو، اگر تمہیں علم حاصل ہو جائے کہ روزے میں کیا فضیلت ہے، روزے کی حقیقت تم جان لو، اس کے فوائد تمہارے علم میں آجائیں، تو تمہیں پتا چل جائے کہ روزہ رکھنا بہتر ہے۔ اَنْ تَصُوْمُوْا: صیامُکم تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے تمہارے لیے اگر تمہیں علم ہو۔ شَهْرُ رَمَضَانَ: یہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کی تفصیل ہے، کہ وہ چند دن کون سے ہیں جن میں روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ: جس میں قرآن اتارا گیا، هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ: اس حال میں کہ وہ قرآن لوگوں کے لئے راہنمائی ہے اور واضح دلائل ہیں۔ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ: اس کا ترجمہ دو طرح

---

(۱) وانتصاب أيّاماً ليس بالصيام كما قيل لوقوع الفصل بينهما بأجنبي بل بمضمر دل هو عليه أعني صوموا إما على الظرفية أو المفعولية اتساعا (آلوسی)

سے کیا گیا ہے۔ فرقان: حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز، الفارقُ بین الحقِ والباطلِ، ھُدٰی کا معنی رہنمائی۔ مِنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ کو اگر بینات کے ساتھ لگایا جائے تو پھر ترجمہ یوں ہوگا، عام طور پر مترجمین نے ترجمہ اسی طرح سے کیا ہے "ہدایت اور فرقان کے واضح دلائل ہیں"۔ "اتارا گیا اُس میں قرآن اس حال میں کہ وہ قرآن لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے، اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کے واضح دلائل ہیں"۔ یا هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ کو مِنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ سے علیحدہ کرلو، "بیان القرآن" میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے، اس حال میں کہ وہ قرآن ہدایت ہے لوگوں کے لئے، اور بینات ہے، یعنی اس کا ایک ایک جزء واضح الدلالۃ ہے، اِس طرح سے سمجھو کہ وہ واضح دلائل کا مجموعہ ہے، مِنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ: یہاں ھُدٰی اور فرقان کا مصداق حضرت تھانویؒ نے کُتبِ سماویہ کو بنایا جو کہ لوگوں کی راہنمائی کے لئے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کے لئے اتری ہیں، اور یہ قرآن مُنجملہ ان کتب کے ہے جو ہدایت اور فرقان کے لئے آئی ہیں، تو انہوں نے ترجمہ یوں کیا، گویا کہ یہ تیسری صفت ہوگئی، پہلی صفت هُدًى لِّلنَّاسِ (یہ حال ہے اور حال معنیٰ صفت ہی ہوتا ہے) اترا قرآن اس حال میں کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے، لوگوں کے لئے راہنمائی کرنے والا ہے، اور بینات ہے یعنی واضح دلائل ہیں، اس کا ایک ایک جزء واضح الدلالۃ ہے، اور یہ مُنجملہ ان کتب کے ہے جو ہدایت اور فرقان کے طور پر آتی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابیں آتی ہیں جو لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہیں اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا ذریعہ ہیں یہ قرآن بھی اُنہی میں سے ہے، بیان القرآن میں اِس کا مفہوم یوں ادا کیا گیا ہے، بات دونوں طرح سے ٹھیک ہے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ: جو تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو فَلْيَصُمْهُ: تو اُس کو اُس کا روزہ رکھنا چاہئے، وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا: اور جو کوئی بیمار ہو، اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: یا سفر پر ہو، فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ: فَعَلَيْهِ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ تو اس کے ذمے ہے شمار دوسرے دنوں سے، يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ: ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق آسانی کا، وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ: اور نہیں ارادہ کرتا تمہارے متعلق دشواری کا، وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ: اور تاکہ پورا کرلو تم شمار، وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ: اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ: مَا مصدریہ، علی ھدایتکم اس بات پر کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی، اللہ کی راہنمائی پر اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس وجہ سے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، تاکہ بڑائی بیان کرو تم اللہ کی اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزار ہوجاؤ۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ: اور جب آپ سے سوال کریں میرے بندے میرے متعلق، فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ: پس میں قریب ہوں، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: داعی: پکارنے والا۔ دعوۃ: پکارنا۔ پکارنے والے کی پکار کو میں قبول کرتا ہوں، اِذَا دَعَانِ: جس وقت بھی مجھے پکارے، فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ: پس چاہئے کہ لوگ بھی میری بات کو قبول کریں، میرے احکام کو قبول کریں، وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ: اور چاہئے کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں، لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ: تاکہ وہ ہدایت یافتہ ہوجائیں۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ: الرَّفَثُ یہ اُحِلَّ کا نائب فاعل ہے، رفث کا معنی اصل کے اعتبار سے ہوتا ہے عورتوں کے سامنے شہوانی گفتگو کرنا، ایسی گفتگو کرنا جو محبت اور پیار کی گفتگو ہوتی ہے، جو مقدمہ بنتی ہے عورت کے ساتھ مجامعت کا، اور یہاں بالاتفاق مجامعت مراد ہے، "حلال کردیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات اپنی بیویوں کے طرف بے حجاب ہونا، یہ "بے حجاب ہونا" کنایہ کے طور پر بات ادا کی جارہی ہے، بیویوں کے ساتھ مشغول ہونا تمہارے لیے حلال کردیا گیا روزے کی رات میں، مراد وہی ہے کہ ان کے ساتھ مجامعت حلال کردی گئی، صرف گفتگو مراد نہیں

ہے،''حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات اپنی عورتوں کی طرف بے حجاب ہونا''، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ: وہ عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں، وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ: اور تم اُن کے لئے لباس ہو، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ: اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تم خیانت کرتے تھے اپنے نفسوں سے فَتَابَ عَلَيْكُمْ: اللہ نے تم پر توجہ کی وَعَفَا عَنْكُمْ: اور تمہیں معاف کیا۔ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ: پس اب اُن کے ساتھ مل جل لیا کرو۔ مباشرۃ: ایک دوسرے کے ساتھ اپنا بدن لگا دینا، اِلْصَاقُ الْبَشَرَةِ بِالْبَشَرَةِ چمڑے کو چمڑے کے ساتھ لگا دینا، بدن کی ظاہری سطح لگا دینا، ایک دوسرے کے ساتھ مل لینا، ''آپس میں مل جل لیا کرو'' وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ: اور طلب کرو اس چیز کو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی، یعنی جو قانونِ اجازت اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا اب اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر کرو، وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا: کھاتے رہو، پیتے رہو، حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ: یہاں تک کہ واضح ہوجائے تمہارے لیے سفید دھاری فجر کی سیاہ دھاری سے۔ مِنَ الْفَجْرِ کا تعلق خیطِ ابیض کے ساتھ ہے، فجر کی سفید دھاری واضح ہوجائے رات کی سیاہ دھاری سے۔ خیطِ اسود سے رات کی سیاہ دھاری مراد ہے، اور خیطِ ابیض سے مراد فجر ہے، ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ: پھر پورا کیا کرو روزے کو، اِلَى الَّيْلِ: رات تک، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ: اور اُن عورتوں کے ساتھ ملا جلا نہ کرو، یعنی مباشرت نہ کیا کرو، شہوت کے ساتھ انہیں مس نہ کیا کرو، وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ: اس حال میں کہ تم اعتکاف کرنے والے ہو مساجد میں۔ مساجد، مسجد کی جمع، عٰكِفُوْنَ عاکف کی جمع۔ عَكَفَ عُكُوْف: کسی جگہ جم کر بیٹھنا۔ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ میں یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا (سورۂ بقرۃ: ۱۲۵)، اور یہاں اعتکاف کرنے والے مراد ہیں، مسجد کے اندر جم کے بیٹھنے والے،''اس حال میں کہ تم مسجد میں جم کے بیٹھنے والے ہو، اعتکاف کرنے والے ہو''۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یہ اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں، فَلَا تَقْرَبُوْهَا: تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ، یعنی ان کو توڑنے کے اور ان کی مخالفت کے قریب بھی نہ جاؤ، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات لوگوں کے لئے لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: تاکہ وہ بچتے رہیں، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں، وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: اور نہ کھایا کرو اپنے مال آپس میں غلط طریقے سے، وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ: اور نہ پہنچایا کرو وہ مال حکام تک، لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ: تاکہ کھالو تم لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل اور مابعد سے ربط

احکام کی جزئیات کی تفصیل آپ کے سامنے شروع ہے، اُصول پر ذکر کرنے کے بعد پہلے قصاص کا حکم ذکر کیا گیا تھا جس کا تعلق جان کی حفاظت کے ساتھ ہے، جیسے کہ اُس کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا تھا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ، اس سے معلوم ہوگیا کہ جان کے بچاؤ کے لئے یہ قانونِ قصاص نافذ کیا گیا ہے، اگر اس پر عمل کرو گے تو تمہاری جانیں بچ جائیں گی کیونکہ اس قانون کے ڈر سے کوئی شخص دوسرے کو قتل نہیں کرے گا۔ اور پھر اُس کے بعد مالی تقسیم کے متعلق ضابطہ ذکر کیا گیا تھا، خاص طور پر جو

ورثے کے بارے میں لوگ اُس وقت غلط طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے اُس کی اصلاح کی گئی تھی۔اب یہاں روزے کا ذکر آ گیا، اوراس رکوع کے اختتام میں، جیسا کہ آپ نے آیت کا ترجمہ سنا، مال کے متعلق ایک حکم ہے، مالی تصرفات کے متعلق ہدایت دی گئی ہے۔درمیان میں روزے کا ذکر آ گیا۔روزہ اصل کے اعتبار سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک مصلحانہ عبادت ہے، جس کے ساتھ انسان کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، اور قتل، غارت، مال کا غلط استعمال، حرص، لالچ، اوراس قسم کی شہوات پرستی مال کے اندر گڑبڑ کرنے کا راستہ کھولتی ہے اور انسان کو برانگیختہ کرتی ہے، اور روزہ نفس کے جذبات کو قابو میں لانے کا ایک ذریعہ ہے، اس کے ذریعے سے انسان کے نفس کی اصلاح ہوجاتی ہے، اپنے آپ پر قابو پانے کا طریقہ آ جاتا ہے، روزہ رکھنا صبر کا باعث بنتا ہے، اس لیے شہر رمضان کو شہر صبر بھی کہا جاتا ہے، تو درمیان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عبادت کو ذکر فرمایا، کہ جب کوئی شخص روزے کی حقیقت کو حاصل کرلے گا تو اُس کو اپنے نفس کی خواہشات پر پابندی لگانے کی طاقت حاصل ہوجائے گی، پھر نہ وہ غصے کی حالت میں بے قابو ہوسکتا ہے، نہ حرص ولالچ کے اندر کوئی بے اعتدالی اختیار کرسکتا ہے۔اور بالاتفاق روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے، جیسے نماز فرض ہے اور زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح روزہ بھی فرض ہے۔

ہر شریعت میں روزے کا حکم رہا ہے

یہاں اُس کی فرضیت اور اُس کے کچھ احکام بیان کیے جارہے ہیں۔پہلی آیت کا مضمون صاف ہے،''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کردیا گیا جیسے کہ فرض کیا گیا تم سے پہلے لوگوں پر''، اس میں اشارہ کردیا کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں میں سے ہر شریعت کے اندر اِس کا حکم رہا ہے، جیسے کہ تفاسیر میں موجود ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضور ﷺ تک جتنے انبیاء گزرے ہیں سب کی شریعت میں روزے کا ذکر تھا، چاہے اُس کے احکام میں فرق ہو، تعداد میں فرق ہو، کہ کتنے رکھے جاتے تھے، کیسے رکھے جاتے تھے، اس میں فرق تھا۔جو خصوصیات، جو احکام اور جو حد بندی ہمارے روزں میں ہے اس طرح سے پہلے نہیں تھی، لیکن بہرحال روزہ فرض تھا۔تو یہ ایک ایسی عبادت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتداء سے ہی اپنے بندوں کے لئے مشروع کی ہے۔

متقی بننے کے لئے روزے کا حکم دیا گیا ہے

اور یہ فرض اس لیے کیا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرلو، تقویٰ حاصل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ جب تم رکھو گے تو اس طرح سے آہستہ آہستہ تمہیں اپنی خواہشات پر کنٹرول کرنے کی مشق ہوجائے گی، جیسے کہ روزہ جب رکھا ہوا ہو تو انسان کو بھوک لگتی ہے، اب گھر کے اندر اکیلا بیٹھا ہو، کوئی دوسرا نہیں ہے، اور کھانے کی چیزیں بھی سامنے رکھی ہوئی ہیں، اپنا مال ہے، حلال کا مال ہے، اپنا کمایا ہوا ہے، بھوک بھی بے تابی کی لگی ہوئی ہے، انسان کا جی چاہے گا کھانے کو، لیکن اس تصور کے ساتھ کہ اللہ نے منع کیا ہوا ہے انسان کھانے سے رک جائے گا۔اسی طرح پیاس لگی ہوئی ہوگی، ٹھنڈا پانی موجود ہوگا، گرمی کا موسم ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں، دروازے بند ہیں، لیکن انسان اس تصور کے ساتھ پانی نہیں پیئے گا کہ اللہ نے منع کیا ہوا ہے۔اور ایسے ہی دوسری شہوات اُبھریں،

اور بیوی بھی پاس موجود ہو، باوجود اس بات کے کہ اصولاً وہ حلال ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے پابندی عائد ہونے کے تصور کے ساتھ وہ اپنی بیوی کے ساتھ تعلق قائم نہیں کرے گا۔ وقتاً فوقتاً جب اُس کے جذبات اس طرح سے اُبھریں گے اور اس تصور کے ساتھ اُس پر پابندی لگائی جائے گی تو انسان کو ایک روحانی قوت حاصل ہو جاتی ہے، کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ روزے کے دن میں اگر اللہ کے حکم کے تحت آپ کھانا چھوڑ سکتے ہیں، پینا چھوڑ سکتے ہیں، اور اپنی حلال بیوی کی طرف توجہ کرنا چھوڑ سکتے ہیں، تو آخر وہی اللہ رات کو بھی ہے، اور وہی اللہ رمضان شریف کے علاوہ باقی ایام میں بھی ہے، تو رمضان شریف کے روزوں میں تو احتیاط اور پرہیز کریں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت بھوک برداشت کرلیں، پیاس برداشت کرلیں، اپنے جذبات کو دبالیں، اور باقی گیارہ مہینے پروا نہ کریں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے روزے کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ گیارہ مہینے کے بعد روزوں کا ایک مہینہ پریکٹس کا ہے، کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی، اور اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی عظمت کی پریکٹس کروائی جاتی ہے، اگر کوئی شخص سوچ سمجھ کر رمضان شریف کا مہینہ گزار لے اس تصور کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے چاہے کوئی دوسرا نہ دیکھے، اس لیے مجھے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے، خلوت اور علیحدگی میں بھی نہیں کرنی چاہیے، چاہے کوئی دوسرا دیکھنے والا نہیں لیکن اللہ دیکھ رہا ہے، اس تصور کے تحت جب رمضان شریف کا مہینہ گزرے گا تو یقیناً انسان کے اندر گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور انسان متقی اور پرہیز گار ہو جاتا ہے۔ اور اس چیز کی جتنی مشق اس عبادت میں ہے اتنی کسی دوسری چیز میں نہیں ہے، اس لیے متقی بننے کے لئے تمہیں روزوں کا حکم دیا گیا ہے۔

مریض اور مسافر کے لئے روزے کا شرعی حکم

''چند گنتی کے دن روزے رکھ لیا کرو'' جس کی تفصیل آگے آگئی کہ اِس کا مصداق شہر رمضان ہے، لیکن اس میں بھی اتنی رعایت کردی گئی کہ جو تم میں سے بیمار ہو، یعنی ایسا بیمار جس کو روزہ نقصان دیتا ہے، کہ مرض بڑھنے کا خطرہ ہے یا ہلاکت کا خطرہ ہے۔ یا اسی طرح سفر پر ہو، اور سفر کی تفصیل شریعت میں آگئی، کہ عام سفر مراد نہیں کہ گھر سے نکلے اور روزہ چھوڑنے کی اجازت مل گئی، تمام فقہاء کے نزدیک باجماع امت ایک معتد بہ سفر مراد ہے، جس کی عام طور پر ہمارے ہاں مقدار آج کل کے حساب سے اڑتالیس (۴۸) میل، اور پُرانے زمانے کے حساب سے تین منزل ہے، یعنی اتنا سفر جو انسان تین دن میں طے کرتا ہے، اُس کا اندازہ آج کل اڑتالیس میل ہے، اتنے سفر پر اگر انسان نکلے تو اس کے لئے روزہ چھوڑنا جائز ہے۔ اور عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ وقتی طور پر چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن یہ گنتی بعد میں پوری کرنی ہوگی، اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، کہ اُن چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا تبھی ضروری ہوگی جب اُتنے دن انسان کو مل جائیں، مثلاً اگر بیماری کی وجہ سے ایک مہینہ روزے چھوٹے تو پھر ایک مہینہ تندرست رہے گا تو تبھی اُس پر مہینے کی قضا آئے گی، اگر وہ پندرہ دن تندرست رہا اور پندرہ دن کے بعد مرگیا یا دوبارہ پھر بیمار ہوگیا تو ایسی صورت میں وہ روزے وہی حکم اختیار کرلیں گے یعنی صرف پندرہ دن کی قضا لازم ہوگی۔ اسی طرح مسافر سفر سے واپس آکر جتنے دن گھر ٹھہرے گا اتنے دن کے روزے اُس کے ذمے ہیں، اگر دس روزے سفر میں

چھوٹے تھے، گھر آیا اور چار دن کے بعد مر گیا، تو باقی چھ اُس کے ذمے سے ساقط ہیں، کیونکہ اُن کو قضا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، بہر حال جتنا وقت ملے گا اتنے دنوں کی قضا اُس کے ذمے ہوگی۔

روزوں کے فدیے کا شرعی حکم اور اس کی تفصیل

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ: اس آیت کی تاویل عام طور پر مفسرین نے اس طرح سے کی ہے کہ جب رمضان شریف کے متعلق روزہ رکھنے کا حکم آیا تو لوگ چونکہ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تدریجاً اُن کو عادی بنایا، ابتداء ابتداء میں یہ حکم دے دیا گیا کہ باوجود اس بات کے کہ تم روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو لیکن روزہ رکھنا نہیں چاہتے، کسی وجہ سے طبیعت آمادہ نہیں ہے، تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دے دیا کرو، یہ روزے کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ تو پھر ترجمہ اس طرح سے ہوگا کہ ''اُس شخص کے ذمے جو روزے کی طاقت رکھتا ہے فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا'' جس کی تشریح روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہوگی کہ طاقت رکھتا ہے لیکن روزہ رکھنا نہیں چاہتا، وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دے دے تو اُس کے ذمے سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا، لیکن بعد میں باتفاقِ امت یہ اجازت باقی نہیں رہی، البتہ بوڑھے کے لئے باقی ہے، اور اسی طرح ایسے مریض کے لئے باقی ہے جس کے تندرست ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی، یعنی جس کو روزے دوبارہ رکھنے کی طاقت حاصل ہونے کی توقع نہیں ہے، ایسے لوگوں کے لئے فدیہ دینے کا حکم باقی ہے کہ روزے کے قائم مقام فدیہ دے دیا کریں۔ باقی! تندرست اور صحت مند کے لئے روزے رکھنے فرض ہو گئے، وقت پہ نہیں رکھ سکتا تو دوسرے وقت میں قضا ہے۔ اب فدیہ روزے کا قائم مقام نہیں ہے، یہ اجازت منسوخ ہو گئی، اور اس کو اُس آیت کے ذریعے سے منسوخ کیا گیا جو آگے آئی فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، اسی لیے دوبارہ مریض اور مسافر والے لفظ لوٹا دیے گئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ روزے رکھا کرو اس میں مریض اور مسافر کے لئے وہی اجازت باقی ہے، اور طاقتور کے لئے جو اجازت تھی وہ ختم کر دی گئی، اس لیے مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا اعادہ کر دیا گیا کہ جب روزہ رکھنے کا حکم دے دیا کہ جو بھی اس مہینے میں موجود ہے اُس کو روزہ رکھنا چاہیے، اب فدیہ دینے کی اجازت نہیں ہے، تو پھر اگر یہ عام آ جاتا تو معلوم ہوتا کہ مسافر کو جو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہو گئی، مریض کو جو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہو گئی، طاقتور کو جو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہو گئی، کیونکہ یہ کہا ہے کہ جو شخص بھی اس مہینے کے اندر موجود ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے منسوخ کیا ہے صرف طاقتور کے لئے، اور مریض اور مسافر کے لئے اجازت باقی ہے، اس لیے وہ آیت دوبارہ ذکر کر دی گئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ رعایت بحال ہے۔ عام طور پر تو مفسرین نے تفسیر اسی طرح کی ہے، اور روایات کے ساتھ اِس کی تائید بھی ہوتی ہے، کیونکہ روایاتِ حدیث سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ پہلے پہلے یہ وسعت کر دی گئی تھی کہ طاقت کے باوجود کوئی شخص روزہ نہ رکھے اور روزے کے قائم مقام وہ فدیہ دے دے تو فرض ذمے سے ساقط ہو جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور تاویل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہاں فدیہ سے مراد جس کی تفصیل آگے

طعامِ مسکین کے ساتھ ذکر کی گئی ہے وہ صدقۃ الفطر ہے، اور یُطِیْقُوْنَهٗ کی ہٗ ضمیر کا مرجع طعامِ مسکین ہے، اور یہ ضمیر بظاہر قبل از ذکر ہے لیکن معنیً طعامِ مسکین مقدم ہے، کیونکہ عَلَى الَّذِیْنَ خبر مقدم ہے، فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ مبتداء مؤخر ہے، اور جب لفظاً تو اضمار قبل الذکر ہو اور معنیً اضمار قبل الذکر نہ ہو تو ضمیر پہلے آسکتی ہے۔ تو اصل میں یوں عبارت تھی فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ تو جب مبتدا اپنی جگہ آ جائے اور خبر اپنی جگہ آ جائے تو پھر ضمیر صحیح لوٹ رہی ہے، تو مبتدا چونکہ رُتبۃً مقدم ہوتا ہے اور متکلم کے ذہن میں ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف ضمیر لوٹائی جاسکتی ہے، چاہے اُس کا پہلے ذکر آیا ہوا نہ ہو، یہ اضمار قبل الذکر لفظاً و معنیً دونوں طرح سے نہیں ہے، بلکہ صرف لفظاً ہے، معنیً نہیں۔ تو اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص طعامِ مسکین دینے کی طاقت رکھتا ہے، فدیہ دینے کی طاقت رکھتا ہے، جس کی مقدار ایک مسکین کا کھانا ہے، اُس کے ذمے کھانے کا ادا کرنا ہے، اُس کو چاہیے کہ مسکین کا کھانا ادا کرے، یعنی روزے کے ساتھ ساتھ صدقۃ الفطر کا ذکر بھی آ گیا، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے اِن الفاظ کی تعبیر اس طرح سے کی ہے۔ تو ضمیر ذکر ہو گئی لیکن بعد میں فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ کے ساتھ اُس ابہام کی وضاحت ہو گئی جو بظاہر ضمیر کے اندر پیش آ رہا تھا، اور تمام زبانوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے، کہ ایک ضمیر ذکر کر دی جاتی ہے، پھر جب اس کے متصل اس کی وضاحت ہو جاتی ہے تو پہلے ضمیر کا لے آنا کوئی نقصان دہ نہیں ہوتا، کیونکہ ذہناً وہ مقدم ہے، چاہے لفظوں میں اُس کو مؤخر ذکر کر دیا گیا، جیسے اکبر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر آتا ہے، اس میں یہی اصول استعمال کیا گیا، اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں:

تہذیبِ مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی

اب "یہ" کا اشارہ کدھر ہے؟

تہذیبِ مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی اب میں سمجھا واقعی داڑھی خدا کا نُور تھی

اب اگلے مصرعے سے معلوم ہوا کہ "یہ" کا مصداق داڑھی ہے، یعنی جب ہم نے تہذیب مغرب سیکھی تو یہ غائب ہو گئی، تہذیبِ مغرب آئی اور یہ غائب، اور اب ہمیں معلوم ہوا کہ واقعی داڑھی اللہ کا نور تھی، جو تہذیب مغرب کی ظلمت آئی اور یہ گئی۔ اب یہاں اشارہ پہلے مصرعے کے اندر ہے، اور اس کا مصداق اگلے جملے میں واضح ہو رہا ہے۔ یہاں بھی ذہناً چونکہ مقدم ہے، متکلم کے ذہن میں ہے کہ وہ داڑھی کے متعلق بات کرنا چاہتا ہے، تو اگر پہلے اشارہ ہو گیا یا پہلے ضمیر آ گئی تو اس سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں بھی ذکر چونکہ طعامِ مسکین کا کرنا ہے، اور وہ ذہن میں پہلے موجود ہے، تو ضمیر اگر اُس کی طرف لوٹا دی گئی تو یہ معنیً اضمار قبل الذکر نہیں ہے، چاہے لفظوں میں اضمار قبل الذکر ہے۔ اگر ضمیر نہ لائی جاتی تو عبارت یوں ہوتی عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَ طَعَامَ مِسْكِیْنٍ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ: جو طعامِ مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں اُن کے ذمے طعامِ مسکین ہے، اب طعام مسکین میں تکرار ہو جاتا، تو اس تکرار سے بچنے کے لئے یہی صورت اختیار کی گئی، کہ پہلے اضمار کر دیا، اور آگے جب اُس کا ذکر آ گیا تو اس سے تفصیل سامنے آ گئی۔ تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صدقۃ الفطر پر محمول کیا ہے، اگر اس کو صدقۃ الفطر پر محمول کر دیا جائے تو پھر اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا! جس دن نسخ کی بحث کی تھی تو میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ عام طور پر بیس آیتیں ہیں جن کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے، لیکن اُن میں سے بھی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض آیتوں

کی تاویل کردی، اور تاویل کرنے کے بعد صرف چار یا پانچ آیتیں ایسی رہ گئی ہیں جن کو اُنہوں نے منسوخ مانا ہے۔ تو اِس آیت کو عام طور پر مفسرین منسوخ قرار دیتے ہیں اُس آیت کے ذریعے سے، کہ جو مسافر بھی نہیں اور مریض بھی نہیں، طاقتور ہے، روزہ رکھنے کی طاقت ہے، اُس کو بھی پہلے پہلے اجازت تھی کہ فدیہ دے دے اور روزہ نہ رکھے، فدیہ روزے کے قائم مقام ہوجاتا تھا، اب یہ اجازت منسوخ ہے اگلی آیت کے ذریعے سے۔ لیکن جب شاہ صاحب ﷫ والی یہ تاویل لے لی جائے گی تو پھر اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ عام طور پر مفسرین نے اس کو منسوخ شمار کیا ہے اور شاہ صاحب ﷫ نے اس کی یہ تاویل کردی۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا: جو کوئی نیکی کا کام خوشی سے کرے فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ: تو اُس کے لئے بہتر ہے، یعنی ذے تو ہے ایک مسکین کا کھانا، دو وقت اُس کو کھانا دے دو، یا اس کی مقدار دے دو، جو کہ نصف صاع گندم یا ایک صاع کھجور ہے، اس کی تفصیل آپ فقہ میں پڑھتے ہیں۔ اور اگر خوشی کیساتھ اس میں اضافہ کر دو، زیادہ دے دو، تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر چہ روزہ چھوڑنے کی تمہیں اجازت دے دی گئی لیکن روزہ رکھنا تمہارا بہتر ہے تمہارے لیے اگر تمہیں علم ہو، یعنی اگر تم علم رکھتے ہو اور روزے کی حقیقت کو سمجھ جاؤ تو روزہ رکھنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

تمام آسمانی کُتب رمضان المبارک میں اُتاری گئیں

شَهْرُ رَمَضَانَ: یہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کی تفصیل ہے، کہ وہ ایامِ معدودات کیا ہیں؟ هُوَ شَهْرُ رَمَضَانَ: وہ رمضان کا مہینہ ہے، الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ: جس میں قرآن اُتارا گیا، گویا کہ رمضان کے مہینے میں یہ دوسری فضیلت ہوئی کہ قرآنِ کریم کا نزول اسی میں ہوا۔ دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ: ہم نے اِس قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا، اور یہاں آ گیا کہ قرآن رمضان کے مہینے میں اُتارا گیا، دونوں آیتوں کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے، جب رمضان میں ہے تو جو لیلۃ القدر میں اُترا وہ رمضان میں بھی اُترا۔ اگر چہ یہاں صرف قرآنِ کریم کا ذکر ہے، لیکن باقی روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جتنی کتب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں سب اسی مہینے میں ہی اُتاری گئی ہیں (مظہری)۔ باقی کتب چونکہ جس نبی پر اُتریں وہ مجموعی طور پر دے دی گئیں، اور قرآن تھوڑا تھوڑا اُترا، اس لیے آپ نے نور الانوار میں اور دوسری کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ دفعۃً اِس کا نزول رمضان شریف میں ہوا، یعنی لوحِ محفوظ سے نقل کر کے آسمانِ دنیا پر پہنچا دیا گیا، اور وہاں سے پھر قلیل قلیل مقدار ۲۳ سال میں سرورِ کائنات ﷺ کے اُوپر اُتری۔ زمین پر یہ سارے کا سارا رمضان المبارک میں نہیں آیا، بلکہ لوحِ محفوظ سے اِس کو رمضان شریف میں منتقل کیا گیا، گویا کہ اس کا ایک نزول یعنی دفعی نزول رمضان شریف میں اور لیلۃ القدر میں ہوا، تو وہ رات رمضان شریف میں ہی تھی۔ وہ کون سی رات تھی؟ اُس کی تعیین نہیں کی جاسکتی، اُس میں ابہام ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چوبیس رمضان کی رات تھی جس میں قرآنِ کریم کو اُتارا گیا (مظہری وغیرہ)، تو پھر چوبیسویں کی رات کو لیلۃ القدر کہنا پڑے گا، لیکن اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رمضان میں اس کا نزول ہوا اُس رمضان میں لیلۃ القدر چوبیس کو تھی، اور باقی رمضان میں ادل بدل ہوتی رہتی ہے، جیسے کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

آ گے قرآنِ کریم کی شان بیان کردی گئی کہ یہ لوگوں کے لئے ہادی ہے، اور ہدایت کے لئے ہر ہر جزء اس کا واضح الدلالۃ ہے، بیّن ہے، واضح ہے، مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ کو بینات کے ساتھ لگاؤ تو مطلب ہوگا کہ یہ ہدایت اور فرقان کی واضح دلیلیں ہیں (نسفی وغیرہ)۔ یا واضح الدلالۃ کو علیحدہ کرلو، کہ اس کا ایک ایک جزء واضح الدلالۃ ہے، یہاں بات ختم ہوگئی۔ آگے مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ قرآن کی ایک نئی صفت ہے، کہ یہ مُنجملہ اُن کتب کے ہے جو ہدایت اور فرقان کے طور پر اللہ کی طرف سے آئیں، حضرت تھانوی ؒ کی تاویل کے مطابق ترجمہ اِس طرح سے ہوگا۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ: جوتم میں سے اِس مہینے میں موجود ہوا سے چاہیے کہ روزہ رکھے، اس سے وہ اجازت منسوخ ہوگئی، اور روزے کو لازم قرار دے دیا گیا۔ شَهِدَ کا معنی یہ ہے کہ اس میں موجود ہے یعنی اُس نے اس زمانے کو مکلف ہونے کی حالت میں پالیا، جبکہ وہ معذور بھی نہیں، عقل مند ہے، بالغ ہے، ایسی صورت میں وہ مہینے میں موجود ہے تو اُس کو روزہ رکھنا چاہیے، لیکن مسافر اور مریض کے لئے اجازت بحال ہے کہ وہ مہینے میں روزہ چھوڑ سکتا ہے، بعد میں گنتی پوری کرلے۔ تو جو مسافر یا مریض نہ ہو اور مکلف ہو، اور مہینے کے اندر موجود ہو تو اُس کے ذمے روزہ فرض ہے۔ ''جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو اُس کے ذمے گنتی ہے، شمار ہے دوسرے دنوں سے''۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ: اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے، یہ احسان جتلایا جارہا ہے کہ احکام تمہارے فائدے کے لئے دیے، لیکن اُس میں بھی آسانی کی رعایت رکھی، معذور کو اجازت دے دی کہ روزہ چھوڑ دے۔ ''اللہ تعالیٰ کوئی دشواری کا ارادہ نہیں کرتا'' کہ ایک حکم دے کر اُس میں کوئی آسانی کی تدبیر نہ رکھتا، بلکہ اس کا پورا کرنا بہرصورت ضروری ہوتا، ایسا نہیں کیا گیا۔ اور یہ احکام جو اللہ نے تمہیں دیے ہیں جن کی تفصیل تم نے اُوپر سن لی، شُرِعَ لَكُمْ جملةً مَاذُكِرَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ: تاکہ تم گنتی اور شمار پورا کرلو، مثلاً اُن حکموں میں یہ بھی آیا کہ جو روزے چھوٹ جائیں اُن کو قضا کرلو، اب اگر قضا کا حکم نہ دیا جاتا تو جو روزے چھوٹ گئے تھے اُن کا شمار پورا کرنے کی کوئی صورت نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ اجازت دے دی کہ دوسرے دنوں میں قضا کرلیا کرو۔ اور یہ سارے احکام جو دیے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کا احسان اور اُس کی شفقت ہر طرح سے نمایاں ہے۔ ''تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس طریقہ بتانے پر''، یعنی تمہیں یہ طریقہ بتادیا کہ روزہ رکھ کر تم یہ فوائد حاصل کرو، اور جو چھوٹ جائیں تو بعد میں قضا کرکے فوائد حاصل کرلو، یہ جو تمہیں ہدایت دی ہے اور طریقہ بتلایا ہے اِن کمالات کے حاصل کرنے کا، اِس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اللہ کے شکر گزار ہوجاؤ، اللہ کا احسان مانو۔ ان احکام کے ذکر کرنے کے بعد متوجہ کردیا کہ اِن احکام کی وجہ سے اللہ کا احسان مانو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسے کیسے طریقے بتائے، جو طریقے تمہارے لیے مفید ہیں اور روحانی فضائل حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، اور عذر کی بناء پر چھوٹ جائیں تو بھی طریقہ بتادیا کہ کس طریقے سے تم اُس کمال کو حاصل کرسکتے ہو۔

آدابِ دعا

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ: یہ درمیان میں دعا کے ادب کے طور پر ایک بات ذکر کردی، جب لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ کا ذکر آیا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو تو سرورِ کائنات ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اللہ دور ہے تو ہم اُس کو بلند آواز سے پکاریں،

قریب ہے تو ہم اس کو آہستہ آہستہ بلائیں، آہستہ آہستہ پکاریں، چونکہ یہ نئی نئی چیزیں دی جارہی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت واضح ہورہی تھی، تو لوگوں کے دلوں میں جس قسم کے اشکالات آتے تھے اپنی سادگی کے ساتھ وہ حضور ﷺ کے سامنے واضح کردیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ جب یہ بندے سوال کریں تو اُن کے سامنے یہ بات واضح کردو کہ میں تو بالکل قریب ہوں، اس لیے میرے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں مفسرین نے لکھا کہ دعا سراً کرنا ہی افضل ہے، دعا کے اندر جہر پسندیدہ نہیں ہے، سری دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہے بمقابلہ جہری دعا کے۔ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ: جب آپس سے سوال کریں میرے بندے میرے متعلق تو میں قریب ہی ہوں، میں اُس سوال کو سنتا ہوں، میں جواب دیتا ہوں، اور یا عبارت محذوف ہے کہ انہیں اطلاع دے دو، انہیں یہ بات بتادو کہ میں قریب ہی ہوں، فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ: پس میں قریب ہوں۔

قبولیتِ دُعا پر ایک اِشکال کا مفصل جواب

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: بلانے والے کی پکار کو میں قبول کرتا ہوں جب بھی مجھے بلاتا ہے، بلانے والا جب بھی مجھے بلاتا ہے میں اُس کے بلانے کا جواب دیتا ہوں، میں اُس کے بلانے کو قبول کرتا ہوں۔ یہ آیت اپنے ظاہر کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر دعا قبول ہے، جب بھی اللہ کو پکارو، اللہ کو بلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے پکارنے کو قبول کرتا ہے۔ پھر اس پر اشکال ہوگا، ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے آپ کے دلوں میں ایک بات آئے گی، کہ ہم تو بار ہا دعا کرتے رہتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی، اور اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعا قبول ہے، پھر اس کا کیا جواب؟ یہ اشکال ذہن میں آسکتا ہے، جس کی تفصیل علماء کی کلام میں یوں لکھی گئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بندوں پر اپنی رحمت کا بیان ہے، کہ جب بھی بندہ بلاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، پھر جو وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اگر اُس کا دینا مصلحت ہو تو اللہ تعالیٰ وہی دے دیتے ہیں، اور اگر اُس کا دینا مصلحت نہ ہو یا فی الحال اور فی الفور دینا مصلحت نہ ہو تو کچھ دیر سے دے دیں گے، جیسے بندے کے حق میں بہتر ہوگا، اور اگر وہ چیز دینا مصلحت نہ ہو تو اس کے عوض میں اس جیسی کوئی اور چیز دے دیں گے یا اس کے برابر کوئی تکلیف اور نقصان دور ہٹادیں گے، اگر اِن میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو اس دعا کا ذخیرہ کر کے آخرت میں ثواب پہنچادیں گے، بہر حال اللہ تعالیٰ کو پکارنا خالی نہیں جاتا، جب بھی پکارو اُس پکارنے پر اثر ضرور مرتب ہوتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ بلائے اللہ تعالیٰ متوجہ ضرور ہوتا ہے، تمہاری درخواست لے لیتا ہے، (سمجھانے کے لئے ایک بات عرض کروں) درخواست کے رد ہونے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ تم کسی حاکم کے دروازے پر درخواست لے کر جاؤ، وہ پکڑے ہی نہیں، ایسے ہی رد کردے، ایک تو یہ رد کی صورت ہے، اور ایک ہے کہ وہ درخواست اُس نے لے لی، تو آپ کہتے ہیں کہ درخواست ہماری منظور تو ہوگئی، اب آگے اس کے اُوپر کارروائی کے متعلق حاکم دیکھے گا، دیکھنے کے بعد اگر مناسب سمجھے گا، عدل وانصاف کا تقاضا ہوگا، تو آپ کو وہی چیز دے دے گا جس کی آپ نے درخواست دی ہے، ورنہ آپ کو جواب دے دیا جائے گا۔ ایک درجے کی قبولیت یہ ہے کہ درخواست لے لی گئی، اُس کو زیرِ غور کرلیا گیا۔ تو دنیا کے

اندر تو حاکم ایسا ہے کہ وہ آپ کی درخواست ویسے ہی واپس کردے اور آپ کو اس کے اُوپر کوئی بھی فائدہ نہ پہنچائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ادنیٰ درجے کی قبولیت کہ آپ کی درخواست لے لی جائے یہ تو ہر کسی کے لئے ہوتی ہے جس وقت بھی کوئی دعا کرے، باقی! اس درخواست لینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی، اگر وہی چیز آپ کے لئے مصلحت ہے تو وہی دے دی جائے گی، اور بسا اوقات انسان اپنی کم علمی کی بناء پر ایسی چیز مانگ لیتا ہے جو اُس کے لئے مناسب نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتے ہیں کہ وہ چیز نہیں دیتے، چاہے تم نے اپنے لیے مانگی تھی۔ ایسے واقعات بہت سارے ہوجاتے ہیں، کہ انسان اپنے لیے ایک چیز مصلحت سمجھتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو میرے لیے نقصان دِہ تھی، تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بسا اوقات وہ چیز نہیں دیتا، اور اِسی میں رحمت ہے، یہ رحمت نہیں کہ آپ جو مانگیں دے دیا جائے، کیونکہ آپ کم علم ہیں، اپنے مستقبل کو نہیں جانتے، اور اس چیز کے اثرات کو نہیں جانتے، ہوسکتا ہے کہ آپ ایک ایسی چیز مانگ لیں جو آپ کے لئے مصلحت نہیں، تو اُس کا نہ دینا ہی رحمت ہے۔ جیسے کہ حضرتِ شیخ (سعدی رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ ''پدر را عسل بسیار است ولیکن پسر گرمی دار است'' (گلستان، باب ۳، حکایت ۱۵) کہ باپ کے پاس شہد تو بہت رکھا ہوا ہے، اور بیٹا چیختا ہے، چلاتا ہے، روتا ہے، کہ مجھے شہد چاٹنے کے لئے دو، لیکن وہ دیتا نہیں، کیونکہ باپ کو پتہ ہے کہ بیٹے کا مزاج گرم ہے، اگر میں نے اس کو شہد چاٹنے کے لئے دے دیا تو بیمار ہوجائے گا، شہد کی تو کمی نہیں، لیکن باپ کی بیٹے پر جو مہربانی ہے وہ اس کو اجازت نہیں دیتی کہ اِس کو شہد چاٹنے کے لئے دے دیا جائے۔ یہ مثال دینے کے بعد کہتے ہیں کہ:

آں کس کہ توانگرت نمی گرداند   اُو مصلحتِ تو از تو بہتر داند

کہ تو اللہ سے دولت مانگتا ہے، مال مانگتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تجھے مال و دولت دیتا نہیں، تو اللہ کے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔ جو تجھے تونگر نہیں بناتا، غنی نہیں بناتا، مالدار نہیں بناتا، وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اور بعض روایات میں اس کی تفصیل بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بندے کے متعلق میں جانتا ہوں، کہ اگر میں اس کو غریب رکھوں، مسکین رکھوں، محتاج رکھوں تو اس کا ایمان محفوظ رہے گا، اور اگر اِس کو مال دے دیا تو یہ سرکش ہوجائے گا، باغی ہوجائے گا، ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا، اُس بندے کے اُوپر میری رحمت یہی ہوتی ہے کہ میں اس کو محتاج ہی رکھتا ہوں، اور ایک بندے کا مزاج میں نے ایسا بنایا کہ اگر وہ کھاتا پیتا رہے تو ٹھیک ہے، اور اگر اس کو کسی قسم کی دقت پیش آگئی اور امتحان میں مبتلا ہوگیا تو یہ گڑبڑ ہوجائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو امتحان میں مبتلا نہیں کرتا، اُس کو اسی رنگ میں رکھ لیتا ہے۔[1] اصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت چاہیے، جو برتاؤ بندے کے لئے بہتر ہے اللہ کی طرف سے وہ ہو، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ہے وَآتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (سورۂ ابراہیم: ۳۴) دی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر وہ چیز جو تم نے مانگی، وہاں بھی چونکہ رحمت کا بیان ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا دینا رحمت بھی ہو، ورنہ ہر مانگی ہوئی چیز تمہیں دے دی

---

(۱) وَرُبَّمَا سَأَلَنِي وَلِيِّي الْمُؤْمِنُ الْغِنَى فَأَصْرِفُهُ مِنَ الْغِنَى إِلَى الْفَقْرِ، وَلَوْ صَرَفْتُهُ إِلَى الْغِنَى لَكَانَ شَرًّا لَهُ. وَرُبَّمَا سَأَلَنِي وَلِيِّي الْمُؤْمِنُ الْفَقْرَ فَأَصْرِفُهُ إِلَى الْغِنَى وَلَوْ صَرَفْتُهُ إِلَى الْفَقْرِ لَكَانَ شَرًّا لَهُ (معجم کبیر طبرانی رقم: ۱۹/۲۷) ۔ إِنَّ مِنْ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ مَنْ لَا يُصْلِحُ إِيمَانَهُ إِلَّا الْغِنَى وَلَوْ أَفْقَرْتُهُ لَأَفْسَدَهُ ذٰلِكَ، وَإِنَّ مِنْ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ لَمَنْ لَا يُصْلِحُ إِيمَانَهُ إِلَّا الْفَقْرُ، وَلَوْ بَسَطْتُ لَهُ لَأَفْسَدَهُ ذٰلِكَ (الاولیاء لابن ابی الدنیا، رقم الحدیث: ۱۔ وغیرہ)

جائے اور ہر دعا اگر قبول کر لی جائے تو تم تو مصیبت میں پڑ جاؤ۔ آپ کو یاد ہوگا جس وقت آپ چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے، اور آپ اپنی ماں کو تنگ کیا کرتے تھے، تو پتہ ہے؟ ماں بسا اوقات بڑی چیخ کر، چلا کر، اور بڑے دردِ دل کے ساتھ کہتی ہے ''مَر وے نہیں کسے پاسے، پچھا نہیں چھڈ دے'' (مرتے نہیں کسی طرف، پیچھا نہیں چھوڑتے)، اور اس قسم کی بددعائیں ماؤں کی زبانوں پر کتنی جاری ہوجاتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ دفتر ہی کھول دے کہ جو کسی کے منہ سے نکلے فوراً پورا کردے تو تم میں سے یہاں اِس وقت کوئی موجود ہوتا؟ سارے کنارے لگے ہوئے ہوتے۔ لوگ اپنی جان کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، اپنے مال کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، اور اپنے بچوں کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، تو ایسی باتیں اللہ تعالیٰ جو قبول نہیں فرماتے تو ان کا قبول نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ تو یہاں چونکہ رحمت کا بیان ہے اس لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ چیز دے دی جائے، اُسی وقت دے دی جائے، دیر سے دی دے جائے، اُس کے برابر کوئی دوسرا نفع پہنچا دیا جائے، اُس کے برابر کوئی نقصان ہٹا دیا جائے، اور اگر کچھ بھی نہیں ہوگا تو آپ کی یہ دعا آخرت کے لئے محفوظ رکھ لی گئی، اور آخرت میں اس کا اجر وثواب مل جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں وہ دعائیں جو دنیا میں قبول نہیں ہوئیں، جب اُن پر ثواب ملے گا تو جن کی دعائیں قبول ہوئی تھیں، یا جو دعائیں آپ کی قبول ہوئی تھیں، آپ کے دل میں تمنا ہوگی کہ ہائے کاش! ہماری کوئی دعا دنیا میں قبول نہ ہوتی، تاکہ آج ہم اس کا اجر وثواب یہاں لیتے۔[1] مثلاً ایک دعا کے نتیجے میں دنیا میں آپ نے روٹی حاصل کرلی، لیکن اگر وہی دعا محفوظ رہ جائے اور آخرت میں ثواب مل جائے، تو وہ ثواب دائم ہوگا، قائم ہوگا، باقی رہنے والا ہوگا، تو اِس کے مقابلے میں وہ یقیناً اچھا ہے۔ اس ساری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کو پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا، جب بھی اللہ کو پکارو اُس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں، تمہاری دعا کو قبول کرتے ہیں، پھر قبول کرنے کی یہ مختلف صورتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جیسے بندے کے لئے مصلحت اور حکمت سمجھتا ہے اُسی طرح برتاؤ کردیتا ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ کو پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا، یہ ہے اس کی تفصیل کہ ''جب بھی مجھے کوئی بلانے والا بلاتا ہے، میرا بندہ مجھے پکارتا ہے تو میں اُس کے پکارنے کو قبول کرتا ہوں''۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْالِيْ: بندوں کو چاہیے کہ وہ میرے احکام مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، ایمان کی تفصیل آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ: تاکہ وہ ہدایت یافتہ ہوجائیں۔

روزے کے اَحکام میں بتدریج ترمیم

آگے پھر احکام کی تفصیل مذکور ہے، جب پہلے پہلے روزے شروع ہوئے ہیں تو احکام چونکہ واضح طور پر موجود نہیں تھے اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام عادت تھی، اور ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے روزے کی تفصیل اسی طرح بیان فرمائی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ازخود یہ عادت اپنائی، بایں معنیٰ کہ اردگرد مدینہ میں یہودی آباد تھے اور یہودیوں کے روزے کے احکام یہی تھے، کہ غروب کے وقت افطار کرلیتے اور افطار کرنے کے بعد سونے سے قبل قبل کھا پی سکتے تھے، جو چاہیں کھالیں، پی لیں، بیوی کے پاس چلے جائیں، جونہی نیند آئی روزہ شروع ہوگیا، سونے کے بعد اگر آنکھ کھلے تو پھر کھانے پینے اور بیوی کے پاس

(۱) يَقُوْلُ الْمُؤْمِنُ فِيْ ذٰلِكَ الْمَقَامِ يَالَيْتَهُ لَمْ يَكُنْ عُجِّلَ لَهُ فِيْ شَيْءٍ مِنْ دُعَائِهِ (مستدرک حاکم رقم:۱۸۱۹ / شعب الایمان رقم: ۱۰۹۳)

جانے کی اجازت نہیں تھی، یہود کے روزوں کے احکام اسی طرح تھے، تو صحابہ کرام ؓ نے اُن کے روزوں کی کیفیت سے عادت یہ اختیار کرلی ہو، یا ممکن ہے کہ پہلے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ کی تلقین کے ساتھ ہدایات اسی طرح دی گئی ہوں، بہرحال اِس جزء کی بابت الفاظ روایات میں وضاحت نہیں ہے، جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اِس آیت کی روشنی میں سمجھ میں آتا ہے، کہ یہ عادت جو صحابہ نے اپنائی تھی حضور ﷺ کے کہنے سے اپنائی تھی یا وہ اردگرد اہل کتاب جو کہ اہل شریعت تھے اور وہ بھی روزے رکھتے تھے، تو جب روزے کا حکم آیا اور اسی طرح سے حکم آیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تو اُس کی جو کیفیت متبادر اور متعارف تھی وہی اختیار کرلی گئی۔ لیکن اس میں پھر بعض اوقات گڑبڑ ہوتی، سارا دن محنت مشقت کر کے آتے، جیسے یہ واقعہ پیش آیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی سارا دن محنت مشقت کر کے آئے، روزہ تھا، افطاری کا وقت آیا تو گھر آئے اور آ کر بیوی سے پوچھتے ہیں کہ کچھ کھانے کے لئے ہے؟، وہ کہنے لگی ذرا انتظار کرو، میں کہیں سے لے کر آتی ہوں، وہ اس کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے گئی، اُس کو اتنے میں نیند آ گئی، جب واپس آ کر دیکھا کہ وہ تھکا ہوا تھا اس لیے سو گیا، تو اس نے افسوس کیا کہ اب تو سونے کے بعد کھانا ٹھیک ہی نہ رہا، اُس کا دوبارہ پھر اسی طرح روزہ شروع ہو گیا، اگلے دن دن کے وقت میں مشقت کی وجہ سے اس کو غشی پڑ گئی، بے ہوش ہو گیا۔ اور ایسے ہی جب خاوند بیوی نے رات کو اکٹھے رہنا ہے، تو ایک صحابی کی رات کو آنکھ کھلی، طبیعت راغب ہوئی اور بیوی کے پاس چلے گئے، اس قسم کے واقعات بھی پیش آ گئے، اور پھر وہ چونکہ سمجھتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لیے وہ اپنے دل میں خیال لاتے تھے کہ یہ تو ہم سے خیانت ہو گئی، ایسا نہیں ہونا چاہیے، ان کی طبیعت پر اس بات کا اثر پڑا، تو اپنے ذہن کے اعتبار سے جس کو انہوں نے کوتاہی سمجھا تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے شفقت فرماتے ہوئے وضاحت کر دی کہ ہم نے اس کو معاف کر دیا، آئندہ کے لئے تمہیں اجازت ہے کہ طلوعِ فجر تک جو چاہے کرتے رہا کرو، کھاؤ پیو، بیویوں کے ساتھ رہو، جس طرح سے چاہو معاملہ کیا کرو، اس میں کوئی پابندی نہیں ہے، یہ وضاحت اگلی آیت کے اندر کر دی گئی۔ ''حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات کو بیویوں کی طرف بے حجاب ہونا''، بیویوں کے ساتھ مجامعت کرنا، اس کا اصل معنی ہے بیویوں کے ساتھ محبت پیار کی باتیں کرنا، لیکن صرف باتیں مقصود نہیں ہیں، ہمبستری مقصود ہے، کیونکہ بات کرنا تو اب بھی روزے کے لئے ناقض نہیں ہے، عین روزے کی حالت میں بھی انسان باتیں کر لے تو باتیں کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ہمبستری مراد ہے۔

خاوند بیوی کو لباس کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجوہات

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ: وہ تمہارے لیے لباس ہیں، یعنی تمہارے لیے اوڑھنے بچھونے کی طرح ہیں، جیسے انسان کے ساتھ لباس کا تعلق ہوتا ہے تو وہ عورتیں تمہارے لیے لباس کی طرح ہیں اور تم اُن کے لئے لباس کی طرح ہو، یہ شدتِ تعلق سے کنایہ ہے۔ لباس میں کیا بات ہوتی ہے؟ لباس بدن کے لئے ساتر ہے، کہ اس کے ساتھ انسان کے وہ اعضاء چھپتے ہیں جن کا چھپانا مقصود ہے، اسی طرح بیوی انسان کے لئے ساتر ہے، کہ بہت سارے طبعی جذبات بیوی کے ذریعے سے چھپتے ہیں، اگر بیوی نہ ہو تو اُن کا ظہور انسان کو رسوا کر کے رکھ دے، بیوی ان کے لئے ستر اور پردہ پوشی کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اسی طرح مرد بھی عورت کے لئے پردہ پوشی کا

فائدہ دیتا ہے، جیسے لباس نہ ہونے کی صورت میں انسان ننگا ہو جاتا ہے اور اُس کے عیوب نمایاں ہو جاتا ہے، جو قابل ستر چیزیں ہیں وہ ظاہر ہو جاتی ہیں، تو بیوی نہ ہونے کی صورت میں بھی انسان کے باطنی عیوب نمایاں ہو سکتے ہیں، اور بیوی اُن کے لئے ساتر اور پردہ بنتی ہے، اور مرد عورت کے لئے پردہ بنتا ہے۔ اور ایسے ہی لباس زیب وزینت کا ذریعہ بھی ہے، تو بالکل اسی طرح انسان کی دنیوی زندگی کے اندر زیب وزینت اور ظاہری طور پر عمدگی بھی خاوند بیوی کے آپس کے تعلقات سے پیدا ہوتی ہے، اگر کسی مرد کے پاس عورت نہیں تو اُس کی خانگی زندگی کوئی مزے دار اور آراستہ نہیں ہوا کرتی، بلکہ وہ ایسے ہوا کرتا ہے جیسے بے خانماں، مسافر، خانہ بدوش، کہ جہاں بیٹھ گیا بس بیٹھ گیا، کوئی رغبت ہی نہیں ہوتی کہ فلاں جگہ جا کر رہنا ہے اور وہاں ہمارا ٹھکانہ ہے، ٹھکانے کی طرف رغبت، گھر آنے کی تمنا، گھر آنے کی خواہش، گھر میں آکر رات گزارنے کا تقاضا طبیعت میں اِسی تعلق سے ہوتا ہے، ورنہ انسان بے گھونسلہ پرندے کی طرح ہوتا ہے کہ جس شاخ پہ بیٹھ گئے بیٹھ گئے، جدھر چلے گئے چلے گئے، جس طرح سے خانہ بدوش قسم کا کوئی آدمی ہو۔ وَابْتَغُوْا: اور تلاش کرو اس چیز کو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی، یعنی اس عمل کے نتیجے میں لکھ دی، اولاد وغیرہ، اس کو طلب کرو، یا یہ جو قانونِ اجازت اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اب اِس کو طلب کرو یعنی اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر کرو، ''بیان القرآن'' میں یہی دوسرا مطلب بیان کیا گیا ہے۔

روزے کا اِبتدائی اور اِنتہائی وقت

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى: حتیٰ کے ساتھ جو غایت ذکر کر دی گئی تو یہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اباحت کے لئے ہے، پابندی اٹھانے کے لئے ہے، کہ پہلے جو تم ممانعت سمجھتے تھے وہ پابندی اٹھ گئی، اب کھا سکتے ہو اور پی سکتے ہو، حتیٰ کہ تمہارے لیے طلوعِ فجر ہو جائے۔ ''کھاتے رہو پیتے رہو'' یہ اباحت کی طرف اشارہ ہے، یعنی اپنی طبیعت کی رغبت کے مطابق، ورنہ کھانا پینا ضروری نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کھا سکتے ہو، اب کوئی پابندی نہیں ہے، ''حتیٰ کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاری فجر کی'' الخيط الابيضُ مِنَ الفجر، اور الخيط الاسودُ مِنَ الليل، رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری واضح ہو جائے اُس وقت تک تم کھا پی سکتے ہو، واضح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے کہ طلوعِ فجر ہو گئی، یقین کے بعد پھر کھانا پینا ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک شک ہے کہ ہوئی یا نہیں ہوئی اس وقت تک گنجائش ہے، لیکن جب یقین ہو جائے کہ طلوعِ فجر ہو گئی تو اُس کے بعد پھر کھانے پینے کی اجازت نہیں، اور اگر شک کی حالت میں کھا پی لیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ جب ہم نے کھایا تھا طلوعِ فجر ہو چکی تھی تو انسان گناہ گار نہیں ہوگا البتہ روزے کی قضا کرنا پڑے گی، فقہ کے اندر اِن احکام کی تفصیل موجود ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ شک کی کیفیت پیدا ہونے سے پہلے انسان رُک جائے، لیکن اگر یقین آنے سے پہلے پہلے اس نے کھا پی لیا، اور بعد میں کوئی تحقیق نہیں ہوئی کہ جب ہم نے کھایا تھا طلوعِ فجر ہو چکی تھی تو اس صورت میں روزہ صحیح ہے۔ اور جب یہ روشنی اچھی طرح سے واضح ہو جائے اور یقین ہو جائے تو اُس کے بعد کھانا پینا ٹھیک نہیں ہے۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ: پھر روزے کو پُورا کر لیا کرو رات تک، رات تک روزے کو پورا کرو، یعنی غروبِ شمس تک روزے کی غایت ہے۔

اِعتکاف کی حالت میں مباشرت مطلقاً ممنوع ہے

روزے میں رات کو جو ملنے جلنے کی اجازت دے دی تو آگے اِس پر پابندی لگادی کہ اگر مسجد میں اعتکاف کرلوتو اعتکاف کی راتوں میں بیویوں سے ملنا ٹھیک نہیں ہے، البتہ گفتگو کر سکتے ہو، بیٹھ اٹھ سکتے ہو، لیکن مباشرت یعنی بدن کو بدن کے ساتھ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے تو روزے کی راتوں میں انسان مباشرت کرسکتا ہے، لیکن اعتکاف کی حالت میں پابندی ہے۔ ''نہ مباشرت کیا کرواُن عورتوں کے ساتھ، اپنے بدن نہ لگاؤ اُن عورتوں کے ساتھ اس حال میں کہ تم اعتکاف کرنے والے ہو مسجدوں میں'' یہ بھی مجامعت سے اور مس بالشہوت سے کنایہ ہے۔ ''یہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے ہیں، اِن کے قریب نہ جاؤ'' یعنی ان کی مخالفت تو اپنی جگہ رہی، مخالفت کے قریب نہ جاؤ، توڑو نہیں، اِن ضابطوں کی رعایت رکھو، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے لوگوں کے لئے لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: تاکہ وہ تقویٰ حاصل کریں۔

اموال کو باطل طریقے سے کھانے کی مختلف صورتیں

رکوع کی آخری آیت میں احکامِ صیام کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے مالیات کے متعلق ایک حکم دیا ہے، وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ: اور نہ کھایا کرو اپنے مالوں کو آپس میں غلط طریقے سے، باطل سے مراد بے بنیاد طریقہ ہے، جو احکامِ شریعت کے خلاف ہو، جس کی بنیاد کسی صحیح نظریے پر نہ ہو، اور اس کے اندر وہ ساری صورتیں شامل ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ ایک دوسرے کے مال جائز طریقے سے کھا سکتے ہو، جیسے تجارت کے طور پر تبادلہ کیا جائے، بشرطیکہ اُس تجارت میں بھی کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس میں دھوکا اور فریب ہو، اور اگر اس قسم کے ذرائع اختیار کیے جائیں جن کے ساتھ کسی قسم کا فساد اور خرابی لازم آتی ہے تو وہ سب صورتیں ممنوع ہوں گی۔ اور ایک دوسرے کو ہدیۃً رضامندی کے ساتھ بطور دعوت کے دے دیا جائے تو اس طرح سے بھی ایک دوسرے کا مال کھانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ طیبِ خاطر کے ساتھ ہو، کسی قسم کے جبر اور اکراہ کے ساتھ وصول نہ کیا جائے، خوشی کے ساتھ کسی کو بطور دعوت کے کھلا دے، بطور ہدیہ کے دے دے۔ اور مال حاصل کرنے کے جتنے ناجائز ذرائع ہیں وہ سب اس باطل کے اندر داخل ہیں۔ ''اپنے مالوں کو نہ کھایا کرو'' یعنی مراد یہ ہے کہ اپنے بھائی، اپنے ساتھ رہنے والے اور اپنے معاشرے کے لوگوں کے مالوں کو نہ کھایا کرو، کیونکہ جب تم کسی کا مال غلط طریقے سے کھاؤ گے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے مال کو بھی کوئی دوسرا غلط طریقے سے کھالے گا، کیونکہ جب ایک غلط رواج پڑ جائے اور معاشرہ جب اس غلطی کو اختیار کرتا ہے تو اس کا نقصان ہر کسی کو پہنچتا ہے، غلط فہمی کے طور پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ شاید میں ہی فائدہ اٹھا رہا ہوں اور نقصان دوسروں کو پہنچ رہا ہے، لیکن ہوتا اس طرح سے ہے کہ نقصان خود اس کو بھی پہنچتا ہے، مثلاً ایک آدمی کسی چیز کے اندر ملاوٹ کر کے ناجائز نفع حاصل کرتا ہے، اب اُس کی یہ عادت اگر برداشت کر لی جائے اور وہ اپنی اس عادت کو ترک نہ کرے تو اس کی طرف دیکھ کے دوسرے لوگ بھی ملاوٹ کی کوشش کریں گے، ایک آدمی پانی ڈال کر دودھ بیچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں پیسے کما رہا ہوں، پھر یہ کسی کے ہاں گھی خریدنے کے لئے جائے گا تو اس میں ملاوٹ والا گھی اس کو مل جائے گا، تو اس نے جو ناجائز طور پیسے کمائے تھے وہ ناجائز طور پہ چلے

جائیں گے، کوئی اور چیز خریدنے کے لئے جائے گا تو وہی دھوکا بازی اس کے ساتھ ہو جائے گی، تو جب معاشرے کے اندر ایک خرابی پیدا ہو جایا کرتی ہے تو اس کا نقصان ہر کسی کو پہنچتا ہے، آپ دھوکا دے کر مال حاصل کر رہے ہیں، کل کو آپ کو کوئی دوسرا دھوکا دینے والا مل جائے گا، وہ آپ سے اُسی طرح سے لے جائے گا، تو نقصان میں سارے ہی رہیں گے۔ بخلاف اس کے کہ اگر یہ قاعدہ اختیار کر لیا جائے کہ ہر کوئی سچ بولے، سچائی کے ساتھ مال کمائے، صحیح اصول کے تحت کمائے، تو نہ آپ کسی کا مال غلط طریقے سے لیں گے اور نہ آپ سے کوئی مال غلط طریقے سے لے گا، آپ کا مال بھی محفوظ ہو جائے گا اور دوسروں کا مال بھی محفوظ ہو جائے گا، تو غلط رواج کے نتیجے میں نقصان میں سارے افراد ہی رہا کرتے ہیں۔ باطل کے اندر ہر وہ صورت داخل ہے جس کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، سود، قمار، سٹہ، دھوکا، فریب، چوری، جعل سازی، جتنے طریقے بھی ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، بیع کی ممنوع صورتیں، وہ سب اس میں شامل ہیں۔

''تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ'' کے دو مفہوم

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ: تُدْلُوْا کا لفظ اِدلاء سے لیا گیا ہے، اَدْلٰی یُدْلِیْ اِدلاء۔ اس کا ماخذ دلو ہے، دلو ڈول کو کہتے ہیں، اَدلٰی کا معنی ڈول لٹکانا، سورۂ یوسف کے اندر لفظ آئے گا فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ، اُس نے اپنا ڈول لٹکایا، رسی کے ساتھ ڈول کو پانی تک پہنچایا، اور یہاں بھی اِدلاء کا معنی پہنچانا، اور تُدْلُوْا اُسی لَا کے نیچے داخل ہے، یعنی لَا تَاْكُلُوْا وَلَا تُدْلُوْا۔ بِهَآ کی هَا ضمیر اموال کی طرف راجع ہے۔ ''نہ پہنچایا کرو اُن مالوں کو حکام تک'' لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ: تا کہ لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ تم کھا جاؤ گناہ کے ذریعے سے۔ اِس کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، لوگوں کا مال گناہ کے ذریعے سے کھانے کے واسطے حکام تک مال نہ پہنچایا کرو، تو اِس کا مصداق جو اقرب الی الالفاظ ہے وہ ہے بطور رشوت کے حکام تک مال پہنچانا، کہ تم سمجھتے ہو کہ جس چیز پر ہم دعویٰ کیے بیٹھے ہیں یہ چیز تو پرائی ہے، اور اگر قانون پر عدل وانصاف کے ساتھ نظر ڈالی جائے اور فیصلہ عدل اور انصاف کے ساتھ کیا جائے تو وہ چیز ہمیں نہیں مل سکتی، تو تم اپنے مال حکام تک پہنچا دو یعنی انہیں بطور رشوت کے کچھ مال دے دو تا کہ وہ پرائی چیز آپ کو دے دیں اور اِس ذریعے سے تم دوسروں کا مال کھا جاؤ، ایسی حرکت نہ کیا کرو، گویا کہ اکل بالباطل کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ حاکم کو رشوت دے کر فیصلہ اپنے حق میں کرا لیا جائے۔ اب یہاں ظاہری طور پر اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ جب حاکم نے فیصلہ کر کے مجھے یہ چیز دی ہے، تو میرے لیے یہ حلال ہوگئی، یہ غلط بات ہے، اگر تم رشوت دے کر فیصلہ غلط کرواتے ہو یا غلط اظہار کر کے فیصلہ غلط کرواتے ہو تو وہ چیز تمہارے لیے حلال نہیں ہے چاہے وہ حاکم نے فیصلہ کر کے دی ہے، عدالت کے فیصلے کے تحت تم نے لی ہے، تو بھی وہ گناہ ہے اور اس کا کھانا حرام ہے، اور وہ ظلم میں شمار ہوگا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس خصومت اور جھگڑے لے کر آتے ہو، اور میں ایک انسان ہوں، جس قسم کا بیان تم میرے سامنے دو گے اس قسم کا فیصلہ میری طرف سے ہوگا، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اَلْحَن بِحُجَّتِهٖ ہو، یعنی اپنی دلیل کو بیان کرنے کے لئے بڑا چرب زبان ہے، بڑے اچھے انداز کے ساتھ وہ اپنی

دلیل کو بیان کر دیتا ہے، اور میں اس سے متاثر ہو جاتا ہوں کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے، اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں، اور وہ دل سے جانتا ہے کہ یہ چیز اس کی نہیں، تو میرے فیصلے سے وہ چیز اپنے لیے حلال نہ سمجھ لے، یوں سمجھے کہ میں نے اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے[1] یعنی اس کا کھانا ایسے ہی ہوگا جیسے جہنم کی آگ کو کھالے۔ اب سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے جھوٹی شہادت بیان کر کے کوئی غلط فیصلہ کروالے تو آپ ﷺ کے فیصلے کے تحت بھی وہ چیز حلال نہیں ہوتی اگر انسان دل سے سمجھتا ہے کہ یہ چیز میری نہیں ہے، اسی طرح سے دوسرے حکام ہیں، کہ اگر ان کو رشوت دے کر یا غلط اظہار کر کے فیصلہ اپنے حق میں کروالیا جائے تو عدالتی فیصلہ کے باوجود وہ چیز آپ کے لئے حرام رہے گی۔ اور اس پہلے مفہوم کے مطابق لَاتُدْلُوْا میں معاشرے کے عام افراد کو ممانعت کرنی مقصود ہے، کہ تم اپنے مال بطور رشوت کے پہنچایا نہ کرو، کیونکہ حاکم قانون کا پہرہ دار ہے، اس نے قانون کی حفاظت کرنی ہے، کسی معاشرے کے اندر عدل وانصاف تبھی قائم رہ سکتا ہے جب حاکم دیانت دار ہو اور وہ قانون کے تقاضے کے مطابق فیصلہ کرے، اور اگر لوگ اس کو بددیانت بنانے کی کوشش کریں، اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے کے لئے اُس کے منہ کو یہ خون لگادیں، اس کو رشوت کی چاٹ ڈال دیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری اس بدآموزی کے ساتھ، برا سکھانے کے ساتھ وہ جو آئین کے پہرہ دار تھے وہی آئین کے چور ہو جائیں گے، پھر ان کو عادت ایسی پڑے گی کہ آج تو تم رشوت دے کر ان سے غلط فیصلے کرواتے ہو، پھر عادت پڑ جانے کے بعد ہوگا یہ کہ صحیح فیصلہ بھی وہ بغیر رشوت لیے نہیں کریں گے، جیسے کہ آج کل آپ دیکھ رہے ہیں، کہ لوگوں نے حکام کو مال کھلانے کی ایسی عادت ڈال دی کہ اب اپنا جائز اور واجبی حق بھی آپ اس وقت تک وصول نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کو کوئی بھتا نہ دیں، تو حکام کو یہ بری عادت عوام ڈالتے ہیں، اور اگر عوام اس بات پر ڈٹ جائیں کہ ہم نے حاکموں سے قانون کے مطابق صحیح فیصلہ کروانا ہے، ہم نے غلط فیصلہ کروانا ہی نہیں، تو ہم حاکم کی چاپلوسی کیوں کریں، قانونی چارہ جوئی اس کے سامنے کی جائے اور قانون کے مطابق فیصلہ اخذ کرنے کی اگر ہر کوئی شخص کوشش کرے تو اس کا سدباب ہو سکتا ہے۔ اور رشوت کی ممانعت اس حد تک ہے کہ حاکم اپنی حکومت کے زمانے میں جس وقت تک وہ کسی علاقے میں برسرِاقتدار ہے کسی کی دعوت قبول نہیں کر سکتا، کسی سے ہدیہ نہیں لے سکتا، کیونکہ بسا اوقات غلط فائدہ اٹھانے والے لوگ اس انداز کے ساتھ ہی حاکم کو متوجہ کرتے ہیں، دعوتیں کھلا کھلا کے، ہدیے دے دے کے۔ تو وہ حقیقت کے اعتبار سے ہدیہ نہیں ہوتا، دعوت نہیں ہوتی، بلکہ وہ بھی ایک قسم کی رشوت ہوتی ہے، اس لیے جن کے ساتھ تعلقات حاکم بننے سے پہلے کے ہیں، رشتے داری کا تعلق ہے، دوستی کا تعلق ہے، جب یہاں حاکم نہیں بنے تھے اس وقت بھی آپس میں دعوت کرنے کا اور لینے دینے کا رواج تھا، وہاں سے تو آپ لے سکتے ہیں، اور جو زیرِ حکومت آگئے، جس علاقے میں آپ حاکم بن گئے، اُن کی طرف سے جو دعوت اور ہدیہ ہوتا ہے شریعت میں اس کو بھی رشوت میں شمار کیا گیا ہے، تاکہ کسی طرح سے بھی حاکم کے جذبات پر غلط اثرات نہ پڑیں، اور وہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے، کسی کی رُو رعایت نہ کرے۔ تو

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۶۸ باب من اقام البینة بعد الیمین۔ مشکوۃ ۲/ ۳۲۷، باب الاقضیہ، فصل اول۔

جب اس کو رشوت پہ محمول کیا جائے گا تو پھر تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بطورِ رشوت کے اپنے مال حکام تک نہ پہنچایا کرو تا کہ تم لوگوں کے مالوں میں سے کچھ حصہ گناہ کی ذریعے سے کھا جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو، یعنی جانتے ہو کہ یہ بری حرکت ہے اور تم اس طرح سے گناہ کی بنیاد رکھ رہے ہو، اور ظلم کی رسم بد ڈال رہے ہو، اگر ایسا کرو گے تو سارے کا سارا وبال تمہی پر ہوگا، اور عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کروا لینے کے باوجود بھی وہ گناہ ہی ہے، ظلم ہی ہے، عدالت سے فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ چیز تمہارے لیے حلال نہیں ہو جائے گی، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ حقیقتاً یہ چیز دوسرے کی ہے۔

اور دوسرا مطلب اِس کا ذکر کیا گیا ہے کہ لَا تُدْلُوْا بِحُكُوْمَتِهَا اِلَى الْحُكَّامِ جلالین کے اندر غالباً یہی لفظ ہوں گے، "مالوں کے فیصلے حاکموں کی طرف نہ لے کر جایا کرو" پھر بھی مطلب یہ ہوگا کہ غلط مقدمے کھڑے کر کے حکام کے سامنے نہ لے جایا کرو تا کہ تم اپنے طور پر غلط شہادت کے ذریعے سے، غلط ذرائع اختیار کر کے، اپنے دلائل کے زور سے اور چرب زبانی سے لوگوں کا مال کھا جاؤ، اس طرح کے غلط مقدمے حکام کے پاس نہ لے جایا کرو۔ تو بِهَا کا معنیٰ ہو جائے گا بِحُكُوْمَتِهَا، یعنی اُن مالوں کے فیصلے، ان مالوں کے مقدمے حکام کی طرف نہ لے جایا کرو اس جذبے کے تحت، حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ چیز دوسرے کی ہے۔

مشترکہ طور کوئی چیز کھانے کا حکم

سوال:- دو ساتھی آپس میں مل کر مشترکہ چیز کھا سکتے ہیں یا نہیں؟۔

جواب:- اگر تو دونوں کی طبیعت میں دلی طور پر اتنی سخاوت ہے کہ کوئی کم کھا جائے یا کوئی زیادہ کھا جائے اس کو محسوس نہیں کرتے، اور دونوں کی نیت صاف ہے، خلوصِ نیت کے ساتھ کھا رہے ہیں، یہ کسی کی نیت نہیں ہے کہ میں زیادہ کھا جاؤں اور اچھی چیز کھا جاؤں تو دیانۃً امانۃً اور آئین وقانون دونوں لحاظ سے مشترکہ کھانا بالکل جائز ہے، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر وہ چیز تو ہے مشترکہ، پیسے تو آپ نے اکٹھے بھرے، حق دونوں کا برابر ہے، اور ایک آدمی بدنیت ہو گیا اور وہ خیال کرتا ہے کہ میں اپنے حق سے زیادہ کھا جاؤں، اس لیے وہ دوسرے کے ساتھ شریک ہوتا ہے، اور اس جذبے کے تحت جلدی جلدی کھاتا ہے کہ میں اچھی چیز کھا جاؤں، تو اپنی نیت کے اعتبار سے یہ حرام خور ہے، پھر چاہے واقع کے اعتبار سے وہ زیادہ کھائے یا نہ کھائے، اور اگر واقع کے اعتبار سے زیادہ کھا گیا تو بھی وہ حق دبا گیا۔ تو دو ساتھی اکٹھے مل کر مشترکہ مال تب کھا سکتے ہیں جب دونوں کی طبیعت میں ایک دوسرے کے متعلق ایثار ہو، اور دونوں ہی یہ سمجھیں کہ کوئی کم کھا جائے یا زیادہ کھا جائے اس میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر دوسرے کے ساتھ شریک ہونے میں نیت یہ ہو کہ میں اکیلا کھاؤں گا تو مجھے تھوڑا ملے گا، دوسرے کے ساتھ کھاؤں تا کہ میں جلدی جلدی اُس کا حق بھی ہڑپ کر جاؤں، یا اچھا اچھا مال کھا جاؤں، اس جذبے کے تحت جو شخص کھائے گا وہ اپنی نیت کے اعتبار سے مجرم ہے، اور اس نے گویا کہ دوسرے پر ظلم کرنے کا اور دوسرے کا حق کھانے کا ارادہ کر لیا، تو ایسی صورت میں احتیاط کرنی چاہیے۔

سوال:- طلبہ کی مشترکہ دعوت کا کیا حکم ہے؟

جواب:-اس میں جبرواکراہ ناجائز ہے، طیبِ خاطر کے ساتھ اگر آپس میں پیسے دیے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مجبور اور شرمسار کر کے جو پیسے نکلوائے جاتے ہیں یہ ناجائز ہیں، حدیث شریف میں صاف طور پر آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ ''[1] کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر اس کی دل کی خوشی کے ساتھ۔ اگر جبرواکراہ کے طور پر اس سے چیز نکلوائی جاتی ہے اور آپ کے مجبور کرنے کے ساتھ اس کے دل کو دکھ پہنچا ہے، یا شرمسار کر کے اُس سے آپ نے پیسے نکلوائے ہیں، ایسی صورت میں وہ مال حلال نہیں ہے، اِس میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ اس لیے یا تو مشترکہ دعوت کیا نہ کرو، اور اگر کرنی ہو تو صرف ترغیب کے درجے میں ہو، کہ خوشی کے ساتھ جو کوئی دے دے، تھوڑا دے دے یا زیادہ دے دے اس کو لے لیا جائے، ورنہ اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ دوسرا شخص اس میں جبر محسوس کرتا ہے تو ایسی صورت میں حلال کو بھی حرام کر کے کھانے والی بات ہے، کہ آپ اپنے انہی پیسوں کے ساتھ خود ہی کھا لیتے تو آپ کے لئے وہ حلال اور طیب تھے، لیکن جب دوسرے کو مجبور کر کے اس کو ساتھ ملا لیا تو وہ سارے کا سارا ہی آپ نے ناجائز کر دیا، اس میں طالب علم بہت کوتاہی کرتے ہیں، خیال کرنا چاہیے۔ جیسے بعض طلبہ کسی کی چیز چھپا لیتے ہیں کہ جب تک دعوت نہ کھلاؤ اس وقت تک ہم نہیں دیں گے، یہ تو بالکل ظاہری طور پر ہی بغیر کسی تاویل کے ظلم ہے اور ناجائز ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ
سوال کرتے ہیں آپ سے چاندوں کے متعلق، آپ کہہ دیجئے کہ یہ چاند وقت پہچاننے کا ذریعہ ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے، نہیں ہے
الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ
نیکی کہ آؤ تم گھروں میں اُن کی پشتوں کی جانب سے، لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ سے ڈرے،
وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَ قَاتِلُوْا
آیا کرو تم گھروں میں اُن کے دروازوں سے، اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۸۹﴾ لڑائی کرو
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
اللہ کے راستے میں اُن لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتا
الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ
حد سے تجاوز کرنے والوں سے ﴿۱۹۰﴾ اور انہیں قتل کر دو جہاں بھی تم انہیں پاؤ، اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا،

(۱) سنن دار قطنی ۳/ ۴۲۴، رقم ۲۸۸۵۔ نیز مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۵، باب الغصب۔ ولفظہ: الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ

اور فتنہ زیادہ سخت ہے قتل سے، اور اُن کے ساتھ لڑائی نہ کرو مسجد حرام کے پاس جب تک وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں مسجد حرام میں،

فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

پس اگر وہ تم سے لڑ پڑیں تو پھر تم انہیں قتل کردو، ایسے ہی بدلہ ہے کافروں کا ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۹۲﴾ اور اُن سے لڑائی کرو یہاں تک کہ شرارت باقی نہ رہے، اور ہوجائے اطاعت اللہ کے لئے، پس اگر

انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ

وہ باز آجائیں تو نہیں ہے زیادتی مگر ظالموں پر ﴿۱۹۳﴾ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے، اور ادب آداب کی باتیں

قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

ادلے بدلے کی چیز ہیں، جو کوئی حد سے تجاوز کرے تم پر تو تم اس پر تجاوز کرو جس طرح اس نے تجاوز کیا تم پر، اور اللہ سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا

اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور خرچ کرتے رہو اللہ کے راستے میں اور نہ ڈالو (اپنی جانوں کو)

بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ

اپنے ہاتھوں ہلاکت کی طرف، اور احسان کرو، بیشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾ پورا کرو حج کو اور عمرہ کو

لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ

اللہ کے لئے، اگر تم گھیر لیے جاؤ تو تمہارے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی، اور حلق نہ کروایا کرو اپنے سروں کا جب تک کہ نہ پہنچ جائے

الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ

قربانی کا جانور اپنے حلال ہونے کی جگہ کو، پھر جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۫ فَمَنْ تَمَتَّعَ

تو اُس کے ذمے فدیہ ہے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی سے، پھر جس وقت تم امن میں ہوجاؤ پھر جو شخص فائدہ اُٹھائے

بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ

عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر تو اس کے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی، اور جو ہدی نہ پائے تو اُس کے ذمے ہے تین دن کا روزہ رکھنا

فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ

حج (کے وقت) میں، اور سات دن کا روزہ ہے جس وقت تم واپس لوٹو، یہ دس پورے ہو گئے، یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل

أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں ﴿۱۹۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ: أَهِلَّة ہلال کی جمع ہے، ہلال کہتے ہیں مہینے کے ابتدائی چاند کو، سوال کرتے ہیں آپ سے چاندوں کے متعلق، یعنی چاندوں کے بڑھنے گھٹنے کے متعلق، کہ ہر مہینے چاند بڑھتا گھٹتا رہتا ہے، ابتدائی تاریخوں میں کچھ ہوتا ہے، پھر درمیان میں کچھ، پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے، آخری تاریخوں میں جا کے کچھ ہو جاتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے، علت پوچھنا مقصود نہیں، کہ اس کی وجہ کیا ہے، بلکہ حکمت پوچھنی مقصود ہے، کہ اِس میں حکمت کیا ہے؟ مصلحت کیا ہے؟ دونوں طرح سے یہ سوال ہو سکتا ہے۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ: مواقیت میقات کی جمع، آپ کہہ دیجئے کہ یہ چاند لوگوں کے لئے اوقات متعین کرنے کا آلہ ہیں، وقت پہچاننے کا ذریعہ ہیں، وَالْحَجِّ: اور حج کے لئے وقت کے پہچاننے کا ذریعہ ہیں۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا: نہیں ہے نیکی کہ آؤ تم گھروں میں اُن کی پشت کی جانب سے، وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى: لیکن نیکی تو اس شخص کی نیکی ہے، یہ اصل میں تھا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنِ اتَّقٰى، یہ اُسی قسم کی تاویل ہے جو پہلے آپ کے سامنے گزری، کیونکہ لٰكِنَّ کا اسم الْبِرَّ ہے، اور خبر مَنِ اتَّقٰى ہے، اور مَنِ اتَّقٰى کا حمل بِر کے اوپر نہیں ہو سکتا۔ اگر یوں ترجمہ کریں کہ "نیکی وہ شخص ہے جو اللہ سے ڈرے" تو یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس لیے مَن کے اوپر بِرّ کا لفظ مضاف محذوف ہے "لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ سے ڈرے"، وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا: آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ: قَاتِلُوْا مقاتلہ سے ہے، لڑائی کرو اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں، وَلَا تَعْتَدُوْا: اور حد سے تجاوز نہ کرو، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا، نہیں پسند کرتا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، زیادتی کرنے والے ہیں۔ وَاقْتُلُوْهُمْ: اور انہیں قتل کر دو، حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ: جہاں بھی تم انہیں پاؤ، وَأَخْرِجُوْهُمْ: اور انہیں نکال دو مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ: جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: فتنۃ: شرارت، کسی کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرنا، جبر و اکراہ کے ساتھ

کسی کو حق سے پھیرنا، جس طرح سے مشرکین اہل ایمان کو ستاتے تھے اور ان کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرتے تھے، فتنہ کا مصداق یہاں یہ ہے، گمراہ کرنے کی کوشش، حق سے پھیرنے کی کوشش، شرارت، ''فتنہ زیادہ سخت ہے قتل سے باعتبار گناہ کے، باعتبار نقصان کے''۔ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ: اور ان کے ساتھ لڑائی نہ کرو عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: مسجد حرام کے پاس حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ: حَتّٰى کے بعد نفی کا ترجمہ عام طور پر محاورۃً ہم کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں مسجد حرام میں، نہ لڑو ان کے ساتھ مسجد حرام کے آس پاس جب تک کہ وہ لڑائی نہ کریں تمہارے ساتھ اس میں، فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ: پس اگر وہ تم سے لڑ پڑیں فَاقْتُلُوْهُمْ: تو پھر تم انہیں قتل کردو، كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ: ایسے ہی بدلہ ہے کافروں کا۔ فَاِنِ انْتَهَوْا: پھر اگر وہ باز آجائیں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ: اور ان سے لڑائی کرو، حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: یہاں تک کہ گمراہی، شرارت باقی نہ ہے، وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ: اور اطاعت سب اللہ کے لئے ہوجائے، دین سے اطاعت اور فرمانبرداری مراد ہے، دین اللہ کے لئے ہوجائے، اطاعت اور فرمانبرداری اللہ کی ہوجائے۔ فَاِنِ انْتَهَوْا: پس اگر وہ باز آجائیں فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: پس نہیں ہے زیادتی مگر ظالموں پر، ظالموں کے علاوہ پھر کسی کے اوپر عدوان نہیں، یعنی ظالموں پر عدوان ہے، اور یہ ظالم رہیں گے نہیں تو ان پر عدوان بھی نہیں، اگر یہ ظلم کریں گے تو پھر ان کے اوپر اسی طرح سے تعدی کی جاسکتی ہے۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ: شہر حرام شہر حرام کے بدلے میں ہے وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ: اور حرمات، ذاتُ قصاص، مساوات کی چیزیں ہیں، ادب احترام کی چیزیں ادلے بدلے کی چیزیں ہیں، یعنی اگر تمہارے حق میں کوئی حرمت کو قائم رکھتا ہے تو تم اس کے حق میں حرمت کو قائم رکھو، اور جو تمہارے حق میں کسی حرمت کو قائم نہیں رکھتا تو پھر مقابلۃً تم بھی اُس حرمت کے پابند نہیں ہو، حرمات مساوات کی چیز ہیں، ادب آداب کی باتیں ادلے بدلے کی چیز ہیں، یعنی جیسی رعایت تمہارے ساتھ کوئی رکھے گا ویسی رعایت تم اس کے ساتھ رکھو، جس کا ترجمہ حضرت شیخ (الہند) کررہے ہیں کہ ''ادب رکھنے میں بدلہ ہے'' یہ حاصل ترجمہ ہے، کہ اگر وہ تمہارے ساتھ ادب رکھیں تو تم بھی ادب رکھو، اگر وہ ادب نہیں رکھتے تم بھی نہ رکھو، فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ: جو کوئی حد سے تجاوز کرے تم پر فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ: تم اس پہ تجاوز کرو بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ: اس کے تم پر تجاوز کرنے کی طرح، مَا مصدریہ ہے، یعنی جس طرح انہوں نے تجاوز کیا ہے اسی طرح تم بھی ان پر تجاوز کرلو، جب ان کے تجاوز کے مقابلے میں تجاوز کیا جائے گا تو یہ اعتداء صورۃً ہے، ورنہ حقیقت میں یہ اعتداء نہیں ہے۔ اور پھر مساوات صرف اعتداء میں ہے، مقدار میں نہیں ہوا کرتی، کیونکہ جب لڑائی چھڑ گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ تمہارا ایک آدمی قتل کریں تو تم بھی ایک ہی قتل کرو، ایسا نہیں، بلکہ جب انہوں نے شرارت چھیڑ لی، اعتداء کرلیا، اور حد سے بڑھ گئے تو پھر تم بھی اسی طرح ان کے ساتھ مقابلہ کرو، مقدار کے اندر یہاں برابری نہیں ہے کہ جتنا نقصان وہ تمہیں پہنچائیں تم بھی اتنا ہی نقصان پہنچاؤ، جہاد میں ایسا نہیں ہوا کرتا، بلکہ وہاں تو پھر کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ اپنے آپ کو نقصان سے بچا کر انہیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاؤ، تو یہ تشبیہ صرف اعتداء میں ہے، کہ اگر وہ تم پر اعتداء کریں تو ان کے اعتداء کرنے کی طرح تم بھی اُن پر اعتداء کرلو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے

راستے میں خرچ کرتے رہو، وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ: لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (آلوسی) اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کی طرف نہ ڈالو۔ اور اگر باء کو زائدہ قرار دے دیا جائے اور ایدیکم سے ہی اَنْفُس مراد لے لیے جائیں تو پھر ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت کی طرف، ورنہ لَا تُلْقُوْا کا مفعول محذوف ہے لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ: نہ ڈالو اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کی طرف۔ وَاَحْسِنُوْا: احسان کرو، ہر کام کو اچھی طرح سے کیا کرو، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ: پورا کرو حج کو اور عمرہ کو اللہ کے لئے، فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ: اگر تم گھیر لیے جاؤ، تمہارا محاصرہ ہو جائے، اگر تم روک دیے جاؤ، فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: فَعَلَيْكُمْ مَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: تو پھر تمہارے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی، ہدی اس جانور کو کہتے ہیں جو بطورِ قربانی کے حرم کی طرف بھیجا جاتا ہے، وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ: اور نہ منڈوایا کرو اپنے سروں کو، حلق نہ کروایا کرو اپنے سروں کا، حلق: استرے سے منڈوانا، حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ: جب تک کہ قربانی کا جانور اپنے حلال ہونے کی جگہ کو نہ پہنچ جائے، اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ مَحِل: حلال ہونے کی جگہ۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا: پھر جو شخص تم میں سے بیمار ہو، اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ: یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، یعنی اس مجبوری کی بناء پر سر منڈوانا پڑ جائے احرام کے بعد، جیسے کہ احکام میں آپ کے سامنے تفصیل آئے گی، بیماری کی وجہ سے یا سر میں درد وغیرہ تکلیف ہونے کی وجہ سے اگر سر منڈوانا پڑ جائے فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ: تو پھر اس کے ذمے فدیہ ہے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی سے، یعنی اس کے ذمے فدیہ ہے پھر وہ فدیہ تین قسموں پر ہے، چاہے روزے رکھ لے، چاہے صدقہ دے دے، اور چاہے قربانی دے دے، فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ: پھر جس وقت تم امن میں ہو جاؤ، تمہارا خوف زائل ہو جائے، اِحصار ختم ہو جائے، فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ: مَضْمُوْمَةً اِلَى الْحَجِّ، تو پھر جو شخص فائدہ اٹھائے عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر، فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: فَعَلَيْهِ مَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، پھر اس کے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی، فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ: اور جو ہدی نہ پائے، قربانی کا جانور نہ ملے یا لینے کی حیثیت نہ ہو، فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ: تو پھر اس کے ذمے ہے تین دن کا روزہ رکھنا حج میں، یعنی وقتِ حج میں، جیسے فقہ کے اندر تفصیل آپ پڑھتے ہیں کہ نو تاریخ یعنی یومِ عرفہ آخری دن ہے ان روزوں کے لئے، نو کا بھی روزہ رکھا جاسکتا ہے اور اس سے قبل قبل روزے پورے کر لینے چاہئیں، سات آٹھ نو کا رکھ لو یا اس سے پہلے رکھ لو، اس کے بعد گنجائش نہیں ہے، کیونکہ نو تاریخ کے بعد پھر حج کا وقت گزر جاتا ہے، وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ: اور سات دن کا روزہ ہے جب تم واپس لوٹو، یعنی حج سے فارغ ہو کر جب واپس لوٹو تو سات دن کا روزہ پھر رکھو، تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ: یہ دس پورے ہو گئے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: ذٰلِكَ کا اشارہ اس تمتع کی طرف ہے، عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھانا، جیسا کہ حج تمتع یا حج قران میں ہوتا ہے، کیونکہ تَمَتَّعَ سے مراد یہاں لغوی تمتع ہے، فائدہ اٹھانا، یہ حج تمتع پر بھی صادق آئے گا جس کو فقہاء حج تمتع کہتے ہیں اور اسی طرح حج قران پر صادق آئے گا، ''حج کے ساتھ ملا کر عمرہ سے فائدہ اٹھانا اس شخص کے لئے ہے کہ اس کے اہل مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں''، اس کی تفصیل فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ مواقیت کے اندر رہنے والے نہ ہوں، باہر سے آنے والے ہوں، اس لیے جو مواقیت سے باہر سے آنے والے

ہیں وہ تمتع اور قران کرسکتے ہیں، اور جو مواقیت کے اندر رہنے والے ہیں وہ تمتع اور قران نہیں کرسکتے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ: اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

''یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ'' کی دو تفسیریں

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ: اَھلۃ ہلال کی جمع، آپ سے چاندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تفاسیر میں اِس سوال کی تشریح دونوں طرح سے ہے، کہ پوچھنے والوں نے یا تو یہ پوچھا تھا کہ چاند سورج کی طرح ایک ہی حالت پہ کیوں نہیں رہتا، یہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ یا یہ پوچھا تھا کہ اس کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت کیا ہے؟ ان دونوں باتوں میں سے پہلی بات تو تعلق رکھتی ہے زمین و آسمان کی حرکت کے ساتھ اور ستاروں کے نظم کے ساتھ، جس کے ساتھ تعلق رکھنے والا علم علم نجوم یا علم ہیئت کہلاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو جواب دیا اُس میں یہ تشریح نہیں کی کہ چاند میں کمی بیشی کیوں ہوتی ہے، کہ کبھی یہ کمال کو پہنچتا ہے کبھی نقص کی طرف آتا ہے،، کیونکہ اِس کا جاننا شرعاً غیر ضروری ہے، اور اس کو کماحقہ سمجھ لینا اور جان لینا اُس وقت قرآنِ کریم کے مخاطبین کے بس کی بات بھی نہیں تھی، اگر زمین و آسمان کی حرکت پر بحث کی جاتی کہ فلاں چیز ساکن ہے اور فلاں چیز گھومتی ہے تو اُن کے پاس اِس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط، اور جو نظم اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ستاروں کے اندر قائم کیا ہے، جس کی تحقیقات آج کل سائنسی دنیا میں ہو رہی ہیں، اُس وقت اِس قسم کے اسباب نہیں تھے کہ لوگ ان باتوں کی صداقت کا کسی طرح سے امتحان کرلیتے، اس قسم کی باریکیاں سمجھنا اُن لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی، اور ویسے قرآنِ کریم کا یہ موضوع بھی نہیں کہ اس قسم کی باتیں بیان کرے، قرآنِ کریم تو ہدایت کے لئے اُترا ہے، سعادتِ اخروی کی راہنمائی کرنے کے لئے، کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت عبادت اور بندگی کس طرح کرنی ہے، قرآنِ کریم اس چیز کی وضاحت کرتا ہے، یہ کوئی فلسفے یا ہیئت کی کتاب نہیں ہے کہ اس کے اندر اس قسم کی چیزوں کی بحث اٹھائی جائے، اس لیے جواب میں حکمت بیان کردی۔ اب اگر اُن کا سوال ہی حکمت کے متعلق تھا تو بھی بات واضح ہوگئی، اور اگر اُن کا سوال حکمت کے متعلق نہیں تھا اور بیان حکمت کردی گئی تو اس میں بھی نشاندہی اس بات کی طرف ہے کہ اس چیز کا تم سے تعلق ہے، اِس کو جانو، اور جس چیز کا تعلق نہیں ہے اُس کی بحثوں میں تمہیں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چاند کے گھٹنے بڑھنے کے فوائد

چاند کسی بھی وجہ سے گھٹتا بڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ یہ نظم جاری ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر فائدہ یہ رکھا ہے کہ لوگوں کے لئے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے، اور حج کے لئے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے۔ یہاں دو لفظ بولے مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، کیونکہ اوقات دو قسم کے ہیں، بعض تو ایسے ہیں جن کی تعیین انسان کے اختیار میں ہے، انسانی اعمال پر اُن کی تعیین

ہوتی ہے، جیسے کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو تین مہینے عدت کے گزارنے ہیں، یا آپ کسی کو قرض دیتے ہیں تو معیاد متعین کردیتے ہیں کہ اتنے مہینوں کے بعد لیں گے، معاملات کے اندر جو وقت متعین کیے جاتے ہیں یہ تو آپ کے اختیاری اوقات ہیں، آپ کے عمل کے ساتھ اُن کا اعتبار ہوگا، اور بعض اوقات ایسے ہیں جو شریعت نے متعین کردیے، اُس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں، جیسے رمضان کا مہینہ، حج کا مہینہ، یہ مہینے شریعت کی طرف سے متعین ہیں، ان میں انسان کوئی تغیر وتبدل نہیں کرسکتا، تو مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ کے اندر معاملات کے لئے وقت متعین کرنے کا آلہ ہوگیا، اور اِلْحَجِّ کے اندر عبادات کے لئے وقت متعین کرنے کا آلہ ہوگیا، کہ اللہ تعالیٰ نے اِن کو اوقات کے پہچاننے کا آلہ بنایا ہے، جس کے ساتھ تم اپنے معاملات کے اندر بھی وقت کی تعیین کرتے ہو، اور عبادات کے لئے بھی اِس کے ذریعے سے وقت کی تعیین ہوتی ہے۔ چونکہ شریعت نے اپنی عبادت کا نظم جتنا بھی ہے وہ سارے کا سارا چاند کے مہینوں کے ساتھ لگایا ہے، اور اِس میں آسانی بھی ہے، اور جیسی شریعت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں دی ہے یعنی آسان شریعت، اُس کے مناسب بھی یہی چاند کے مہینے ہی ہیں، کیونکہ سورج کے ساتھ معلوم کرلینا کہ اب کون سا مہینہ ہے اور کون سی تاریخ ہے یہ بہت مشکل ہے، چاند چونکہ ہر مہینے نئے سرے سے شروع ہوتا ہے تو جو لوگ چاند کے ساتھ تھوڑی سی بھی دلچسپی رکھیں گے تو معلوم کرلیں گے کہ آج تین تاریخ ہوگئی، پانچ ہوگئی، آج چودھویں ہوگئی، اب یہ آخری تاریخیں ہیں، پھر نئے سرے سے نکلے گا، پھر نئے سرے سے مہینہ شروع ہوجائے گا۔ اگر بالفرض تاریخ میں اشتباہ ہو بھی جائے تو جب نیا چاند چڑھے گا تو تاریخ کا پتہ چل جائے گا کہ اب کون سی تاریخ ہے، بخلاف اس کے کہ سورج کے ذریعے سے معلوم کیا جائے کہ آج مہینے کی کون سی تاریخ ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے شریعت نے اپنے حساب کتاب کا مدار جتنا بھی ہے وہ چاند کے مہینوں پر رکھا ہے۔ اور دوسری جگہ قرآنِ کریم میں بھی یہی حکمت بیان کی گئی ہے، وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (سورۂ یونس: ۵) اللہ نے چاند کی منزلیں مقدر کی ہیں تاکہ تم اِن کے ذریعے سالوں کو جان لو اور اپنے حساب کو جان لو۔

قمری تاریخ کے استعمال کا شرعی حکم اور فضیلت

چاند کی تاریخ کا ضبط رکھنا اہلِ اسلام پر فرض کفایہ ہے، اگر سارے کے سارے مسلمان ہی بھول جائیں کہ یہ کون سا مہینہ ہے اور آج کون سی تاریخ ہے تو ساری امت ہی گناہ گار ہوگی، کیونکہ رمضان، حج اور اشہر حرم وغیرہ کی تعیین اِسی کے ساتھ ہی ہوتی ہے، بعض جاننے والے موجود ہوں تو فرض ادا ہوگیا۔ پھر جو چیز فرض کفایہ ہوتی ہے اس میں اگرچہ ہر شخص مکلف نہیں ہوتا، بلکہ جماعت میں سے غیر متعین افراد مکلف ہوتے ہیں، لیکن جو شخص اس پر عمل کرتا ہے اُس کو ثواب فرض کے ادا کرنے کا ملتا ہے، جیسے جنازہ فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر ضروری نہیں کہ وہ جنازہ پڑھے، جماعت میں سے چند غیر معین افراد پر ضروری ہے کہ اس کو پڑھ لیں، جب چند آدمی جنازہ پڑھ لیں گے تو سب کے ذمے سے فرض اتر گیا، نہ پڑھنے کی بناء پر باقی گناہ گار نہیں ہیں، لیکن جنہوں نے جنازہ پڑھا ہے اُن کو ثواب ایسے ہی ملا جیسے ایک فرض ادا کیا جاتا ہے، اسی طرح چند لوگ اگر مہینوں کو اور تاریخ کو یاد رکھیں تو فرض تو امت کے سر سے اُتر گیا، لیکن جو شخص مہینے اور تاریخ کو یاد رکھنے کا اہتمام کرے گا اُس کو ثواب ایسے ہی ملے گا جیسے کسی فرض

کی ادائیگی میں ملا کرتا ہے۔ تو عبادات کا نظم تو ہے ہی چاند کے مہینوں کے ساتھ، اِس میں تو کوئی تقدم تاخر ہو ہی نہیں سکتا، باقی معاملات میں یہ بھی جائز ہے کہ آپ سورج کے مہینوں پر مدار رکھ لیں، جنوری فروری کا حساب کرلیں، جیٹھ ہاڑ کا حساب کرلیں، شرعاً یہ جائز ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر یہ حساب بھی چاند کی تاریخوں پر ہی رکھا جائے تو مہینوں کو یاد رکھنے کا ذریعہ بھی ہے، اور تاریخ کو ضبط رکھنے کا ذریعہ بھی ہے، اور اسلامی مہینوں کی دوسروں کے مقابلے میں برتری کا ذریعہ بھی ہے، اسلامی غیرت کا تقاضا بھی ہے کہ اپنے معاملات کو چاند کی تاریخوں پر ہی رکھا جائے، اگرچہ شرعاً یہ ضروری نہیں، دوسری تاریخیں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے خط و کتابت میں، لین دین میں، قرض وغیرہ میں، دوسری چیزوں میں اگر انسان اسلامی مہینوں پر مدار رکھے تو تاریخ یاد رہے گی، مہینہ یاد رہے گا، اور اسلامی مہینوں کی برتری دوسروں کے مقابلے میں ثابت رہے گی، اس لیے یہ فضیلت کی چیز ہے کہ انسان خط و کتابت میں اور دوسری چیزوں میں اسلامی تاریخوں کا ہی اعتبار کرے، اگرچہ دوسری تاریخوں کا استعمال کرنا جائز ہے، لیکن غیرتِ اسلامی کے خلاف ہے، تو حساب کتاب، لین دین، جیسے عربی مدارس میں تنخواہوں کا اور چھٹی وغیرہ کا سلسلہ عربی مہینوں پر ہی رکھا جاتا ہے، تو وہ اِسی تعلق کی بناء پر ہے، یہ اسلامی مہینے کہلاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے خط و کتابت میں اور لین دین میں ان تاریخوں کا اور ان مہینوں کا اہتمام نہیں کرتے، جیسے کہ دوسرے کاروبار یونہی چلتے ہیں، تو آپ ان میں سے کسی سے پوچھ کر دیکھ لیجئے، نہ کسی کو مہینہ معلوم ہوگا نہ تاریخ معلوم ہوگی، بلکہ انہیں اگر کہو کہ بارہ اسلامی مہینوں کے نام ہی بتادو تو انہیں نام بھی نہیں آئیں گے، یہ عدمِ استعمال کی وجہ سے ہے، اور اگر وہ بھی اسی طرح استعمال رکھتے تو نام بھی یاد ہوتے اور نام یاد ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی یاد رہتی۔ فضیلت بہر حال یہی ہے کہ اپنے خط و کتابت میں اور دوسرے معاملات میں اسی تاریخ کو استعمال کرو۔ ''آپ فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے اوقات کے پہچاننے کا آلہ ہیں، یا وقت کے متعین کرنے کا آلہ ہیں، اور حج کے لئے اوقات کی تعیین کا آلہ ہیں۔''

حج کے دوران گھروں میں پشت کی طرف سے جانا احمقانہ حرکت ہے

وَلَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا: اب چونکہ حج کا ذکر آگیا تو اِس مناسبت کے ساتھ بعض باتیں واضح کی جارہی ہیں، کچھ احکام اور کچھ دیگر ضروری باتیں ذکر کی جائیں گی، حج چونکہ جاہلیت میں بھی ہوتا تھا، مشرک بھی حج کیا کرتے تھے، اُن لوگوں نے ایک عادت بنا رکھی تھی کہ جس وقت گھر سے حج کی نیت کرکے چل دیے اور احرام باندھ لیا، پھر اگر کسی ضرورت کی بناء پر گھر آنا پڑ گیا، تو وہ گھر کے دروازے میں سے اندر نہیں آتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار پھلانگ کر آتے، یا پیچھے سے کوئی کھڑکی وغیرہ بنا کر گھر میں داخل ہوتے۔ اور ایسے ہی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حج کرکے وہ واپس آتے تھے تو واپس آکر بھی وہ دروازے سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ مکان کی پشت کی طرف سے آتے تھے، چاہے دیوار پھلانگ کر یا اس میں کوئی کھڑکی وغیرہ بنا کر۔ اِس میں انہوں نے کیا حکمت سوچ رکھی تھی، کس لیے یہ عادت اختیار کر رکھی تھی، اس سے ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، ویسے مفسرین لکھتے ہیں کہ ممکن ہے اُن کا یہ خیال ہو کہ جس دروازے سے ہم گناہوں کا بوجھ لے کر نکلے تھے، اب

پاک صاف ہوکرآئے ہیں، توہم اُس دروازے سے اندر نہ آئیں، جیسے کہ ننگے طواف کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایسی ہی کوئی حکمت سوچ رکھی تھی، کہ جو کپڑے پہن کرہم گناہ کرتے ہیں تواللہ تعالیٰ کے گھر کا چکر لگاتے وقت اور اُس کی عبادت کرتے وقت یہ کپڑے ہمارے بدن پر نہیں ہونے چاہئیں، اس لیے کپڑے اُتار کر اور ننگے ہوکر طواف کرتے تھے، انسانی عقل جس وقت شریعت کی روشنی کے بغیر اپنے لیے کوئی عمل کا طور طریقہ تجویز کرتی ہے تو پھر وہ ایسی ہی حماقتیں کرتی ہے، اب گھر کی پشت کی جانب سے آنا فی حدذاتہ مباح ہے، کہ آپ اپنے گھر جائیں، دروازے سے نہ گزریں، پیچھے سے سیڑھی لگا کر اُوپر سے چڑھ آئیں اور صحن میں اُتر جائیں، یہ مباح ہے، یہ کوئی گناہ اور معصیت نہیں ہے، لیکن اس کو نیکی کا باعث سمجھ لینا یا اس کو ضروری سمجھ لینا کہ اللہ کی رضا اِسی میں ہے، اس کی وجہ سے اس فعل میں بدعت کا معنیٰ پیدا ہوجائے گا اور یہ معصیت بن جائے گی، اب اس سے روکا جائے گا۔

بدعت کی پہچان اوراس کی وضاحت

قرآنِ کریم کی ان آیات سے ایک اصول نکل آیا، کہ جس چیز کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اللہ کے احکام کے تحت اُس کا ضروری ہونا ثابت نہیں، یا شریعت نے اُس کو باعث ثواب قرار نہیں دیا، اس کا نیکی ہونا اور باعث ثواب ہونا شریعت کی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہے، جیسے کہ اباحت کی شان ہوتی ہے کہ اُس کی دونوں جانبیں برابر ہیں، کرو یا نہ کرو، کرو تو گناہ نہیں اور نہ کرو تو ثواب نہیں، یا نہ کرو تو گناہ نہیں اور کرو تو ثواب نہیں، اس کی دونوں جانبیں برابر ہوتی ہیں، پھر اپنی طرف سے اُس کی ایک جانب کو متعین کر کے اُس پر کوئی حکم لگالینا مثلاً اُس مباح کو ضروری سمجھنے لگ گئے، مباح کے درجے سے نکال دیا بغیر کسی دلیلِ شریعت کے، یا اُس مباح کو ناجائز سمجھنے لگ گئے، اُس کے اندر معصیت کا معنیٰ پیدا کردیا بغیر کسی شرعی دلیل کے، یہ حد سے تجاوز ہے، اوراس کے ساتھ بھی وہ حکم بدعت کا معنیٰ اختیار کر جاتا ہے، اب اس کا ترک ضروری ہے، اور بغیر اس عقیدے کے اگر کوئی کرتا ہے تو کرسکتا ہے، اِس میں کوئی شک نہیں۔ مثال کے طور پر فجر کی اذان سے پہلے پانی پینا اور نہ پینا آپ کے لئے دونوں باتیں برابر ہیں، اور شریعت نے کوئی ضروری قرار نہیں دیا کہ آپ فجر کی نماز سے پہلے پانی ضرور پیا کریں، نہ روکا ہے کہ نہ پیا کریں، اب اگر ایک آدمی کہے کہ صبح اُٹھ کر پانی پینا ضروری ہے، جو نہیں پیے گا گناہ گار ہوگا، اور جو پیے گا اُس کو ثواب ملے گا، تو یہی پانی جو روزمرہ آپ پیتے رہتے ہیں اگر عادت کے مطابق پیتے رہیں تو کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں، لیکن جب بغیر دلیل شریعت کے یہ نظریہ بن جائے گا تو ایسی صورت میں یہی بدعت ہوجائے گی، ہمیں اس کی بھی تردید کرنی پڑے گی کہ بھائی! فجر کی نماز سے پہلے پانی پینا جائز نہیں ہے، یہ اُس عقیدے کا ردِعمل ہوگا، پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ جو تشدد اختیار کرلیا گیا ہے کہ پانی ضرور پیو یہ بالکل خلاف شریعت ہے، اب اُس کو خلاف شریعت ثابت کرنے کے لئے ہمیں دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے، اُس کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ جب شریعت نے اس کو مباح قرار دیا ہے، نہ اس کے متعلق حکم آیا ہے نہ نہی آئی ہے، تو تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس کو مامور قرار دے دو، یا تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس کو منہی عنہ قرار دے دو، اس کو باعث ثواب یا باعث عذاب قرار دے دو؟ جب اس قسم کا عقیدہ بن جائے گا تو اس کے بعد وہ بدعت ہوجائے گا، اب اس کو کرنا معصیت ہوجائے گا اور روکنا ضروری ہوجائے گا۔ تو

آج بہت ساری چیزیں ہمارے درمیان ایسی ہی ہیں جو باصلہ شریعت نے مباح قرار دی ہیں، لیکن جہالت کی وجہ سے لوگوں نے اُن کو ضروری سمجھ لیا، جس کی وجہ سے اُن کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا ہو گیا، وہاں پھر یہ نہیں دیکھا جایا کرتا کہ فی حد ذاتہٖ یہ جائز ہے یا نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ جس درجے میں تم ضروری سمجھ رہے ہو کیا شریعت کی دلیل کے ساتھ اس کا ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے؟ اگر ضروری ہونا ثابت نہیں ہوتا اور تم اُس کو ضروری سمجھ رہے ہو تو ایسی صورت میں وہ بدعت ہو جائے گا۔

ایصالِ ثواب میں رائج بدعات

مثلاً ایصالِ ثواب ہے، شریعت نے اِس کے لئے کوئی وقت متعین نہیں کیا، پیر کو کرلو، منگل کو کرلو، بدھ کو کرلو، جمعے کو کرلو، جس دن آپ چاہیں کھانا کھلا کر ایصالِ ثواب کر دیں، قرآنِ کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیں، اکیلا قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیں، اکیلا کھانا کھلا کر ایصالِ ثواب کر دیں، دونوں کام بیک وقت کرلیں، یہ تمام صورتیں شریعت میں درست ہیں اور یہ سب برابر ہیں۔ لیکن ایک آدمی کہتا ہے کہ جب تک کھانے کے ساتھ قرآنِ کریم کو نہیں جوڑا جائے گا اُس وقت تک ثواب نہیں پہنچتا، نہ کھانے کا پہنچتا ہے نہ قرآن پڑھنے کا پہنچتا ہے، یا اگر فلاں دن نہ دیا گیا تو گناہ ہوگا، یا فلاں دن زیادہ ثواب پہنچتا ہے، یہ چیزیں بلا دلیلِ شریعت اختیار کر لی گئی ہیں، اِن کے اُوپر شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی منشا کیا ہے، کس طرح سے ہے، کس طرح سے نہیں، یہ شارع بتا سکتا ہے، اللہ کا رسول واضح کر سکتا ہے، میں اور آپ اپنی عقل کے ساتھ اِس چیز کو واضح نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ تعیینات بدعت ہو جائیں گی، اور یہ فعل معصیت ہو جائے گا، گویا کہ اپنی طرف سے ایک نیا حکم نکال لیا گیا۔ اب یہ کہنا کہ دیکھو جی! کھانے کا ثواب بھی جاتا ہے، قرآن کا ثواب بھی جاتا ہے، دونوں کو اگر اکٹھا کر لیا گیا تو کیا حرج ہے؟ یہ دلیل غلط ہوگی، کیونکہ اتفاقاً ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر تم نے اس کو ضروری سمجھنا شروع کر دیا تو اس پھر یہ بدعت ہو گیا۔

تو یوں جو چیزیں فی حد ذاتہٖ جائز ہوتی ہیں ہمارے اس قسم کے تغیرات اور تصرفات ان میں بدعت کا معنیٰ پیدا کر دیتے ہیں۔

اَذان سے قبل درود شریف پڑھنے کا شرعی حکم

اور یہی صورت ہے اَذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی، کہ فی نفسہٖ درود شریف پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اب اس کی وہ ہیئت اختیار کرنا جس ہیئت کے ساتھ یہ پڑھتے ہیں اور پھر اس کو ضروری سمجھنا (ضروری سمجھنے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی نہیں پڑھتا تو اُس پر انکار ہو، اور اگر کوئی کہتا ہے کہ بھائی! کبھی چھوڑ بھی دیا کرو تو اس پر وہ راضی نہ ہوں، عملاً اس کا التزام کر لیا جائے) یہ بدعت ہے۔ اب کہنا کہ دیکھو! درود شریف پڑھنا تو باعثِ فضیلت ہے، اگر ہم نے پڑھ لیا تو کیا حرج ہے؟ یہ دلیل غلط ہوگی اور اس دلیل کے ساتھ اُس عمل کا جواز نہیں ثابت ہوگا۔ جب شریعت نے ''اللہ اکبر'' سے اذان شروع کر کے ''لا الٰہ الا اللہ'' پر اُس کو ختم کر دیا، تو اَذان کے انداز کے ساتھ صرف یہی کلمات ادا کیے جا سکتے ہیں۔ صرف درود شریف کی بات نہیں، آپ میں سے کوئی شخص اَذان سے پہلے ''بسم اللہ'' بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دے، اور کہے کہ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ ''بسم اللہ'' پڑھ کر اَذان کہنی چاہیے، تو ہم اس کو بھی بدعت کہہ دیں گے، کیونکہ شارع علیہ السلام نے تو ''اللہ اکبر'' سے اذان شروع کر کے ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ختم کی

ہے۔ اچھا! اگر کوئی اذان کہتے ہوئے آخری کلمہ کہہ دیتا ہے ''لا إلہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' تو کیا یہ جائز ہوگا؟ حالانکہ ''لا إلہ الا اللہ'' کے ساتھ ''محمد رسول اللہ'' کا جزء بالکل ہر طرح سے ثابت ہے، لیکن اذان پر چونکہ اضافہ کردیا گیا تو ہم کہیں گے کہ یہ بھی حکمِ اذان کو بدل دیا گیا اور یہ بھی بدعت ہے۔ اور ایسے ہی درود کی بات ہے، اب اس میں یہ بحث کرنا کہ درود تو باعث فضیلت ہے، درود پڑھنا تو باعث ثواب ہے۔ باعث ثواب تو ہے لیکن اُس کو ہر جگہ ضروری تو قرار نہیں دیا جاسکتا، جہاں اِس کو بلا دلیل آپ ضروری قرار دیں گے اُس کے اندر بدعت والا معنی پیدا ہوجائے گا۔ اور اگر اتفاقاً آپ نے پہلے درود شریف پڑھ لیا، پھر ''بسم اللہ'' پڑھ لی آہستہ (اذان کے لب ولہجے کے ساتھ نہ پڑھی، بلند آواز کے ساتھ نہ پڑھی) اور ''اللہ اکبر'' سے اذان شروع کردی، تو کون کہتا ہے کہ ''بسم اللہ'' پڑھنی ناجائز ہے یا درود پڑھنا ناجائز ہے؟ اگر نہ پڑھنے والے پر انکار نہ ہو اور اذان کا لب ولہجہ اختیار نہ کیا جائے اور کبھی اتفاقاً ہوجائے اور اُس کو ضروری نہیں سمجھا جائے اور ''بسم اللہ'' پڑھ لی جائے اور پڑھ کر بعد میں اذان شروع کردی جائے، تو کیا حرج ہے؟ لیکن اگر اذان والا انداز اختیار کرکے ''بسم اللہ'' پڑھی جائے تو یہ بھی ناجائز ہوگی۔

ہر عمل کو اُس کے درجے پر رکھنا ضروری ہے

تو یہ کتنی صاف ستھری بات ہے، کہ جس عمل کو شریعت نے جس درجے میں رکھا ہے اُس درجے پر اُس کا رکھنا ضروری ہے، ایک چیز مستحب ہے اور اُس کو کوئی فرض سمجھنا شروع کردے اور ایسے اُس کا التزام کرے جیسے فرض کا کیا جاتا ہے، اور اُس کے چھوڑنے والے پر ایسے انکار کرے جیسے فرض چھوڑنے والے پر انکار کیا جاتا ہے، تو اس مستحب کا بھی درجہ بدل دیا گیا، اس لیے تغییرِ حکمِ شرع کی وجہ سے یہ بھی بدعت بن جائے گا۔ شریعت میں جو درجہ جس چیز کا ہے اُس درجے پر اُس کا محفوظ رکھنا ضروری ہے، مستحب کو مستحب جانو، اُس کا کرنا باعث ثواب ہے، چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سنّت کا عمل سنّت کے مطابق جانو، فرض کو فرض جانو، واجب کو واجب جانو، اپنے نظریے کے تحت اِن حدود کی حفاظت کرو، ان حدود میں تغییر وتصرف جائز نہیں ہے، مباح کو مباح جانو، مباح کو واجب نہ قرار دے دو، اس قسم کے تغیرات کے ساتھ بھی بدعت والا معنی پیدا ہوجاتا ہے، اور پھر اس کا اختیار کرنا جائز نہیں ہوتا بلکہ منع کرنا ضروری ہوتا ہے، تو اُس میں یہ نہیں دیکھا جایا کرتا کہ فی حد ذاتہ یہ کام جائز ہے یا نہیں، یہاں انکار جو ہوا اور بدعت کا معنی جو پیدا ہوا ہے وہ آپ کی تعیین کے ساتھ اور اُس کو ضروری سمجھنے کے ساتھ ہوا ہے۔

زیارتِ قبور کی فضیلت اور اس کے متعلّق بدعات

زیارت قبور کے لئے آپ جس دن چاہیں جاسکتے ہیں، قبر کی زیارت کرنا مرغوب فیہ ہے، شریعت میں اِس کی ترغیب دی گئی ہے، سردرِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''کُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا'' میں نے پہلے تمہیں منع کیا تھا کہ قبروں کی زیارت کے لئے نہ جایا کرو، اب میں کہتا ہوں کہ جایا کرو، ''فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ'' یہ قبریں انسان کو دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں اور آخرت یاد دلاتی ہیں۔[1] اس مقصد کے تحت قبرستان میں جایا کرو، زیارت کیا کرو۔ اور والدین کی قبر کی

(۱) ابن ماجه ص ۱۱۲ باب ما جاء فی زیارۃ القبور۔ مشکوۃ ۱/ ۱۵۴ باب زیارۃ القبور۔ فصل ثانی۔ نیز دیکھیں مسلم ۱/ ۳۱۴ باب استیذان النبی ربه۔

زیارت کرنے کی تو خاص فضیلت آتی ہے، مشکوٰۃ شریف میں روایت موجود ہے، کہ ہفتے میں، یعنی ہفت روز میں، سات دن میں کم از کم ایک دن اپنے والدین کی قبر کی زیارت کے لئے جانا باعث ثواب ہے، والدین کے حق کی ادائیگی ہے۔[1] لیکن اب کوئی تعیین کرلے کہ دس محرم کو ہی ضرور جانا ہے، آگے پیچھے نہیں جانا، اور دس محرم کو جانا شریعت کا حکم ہے، تو یہی جانا بدعت بن جائے گا، کیونکہ یہ تعیین ہم نے اپنی جانب سے کرلی، شریعت نے یہ تعیین نہیں کی، اب اگر کوئی دس محرم کو روکے تو اس کو روکنے کا حق ہے، اب یہ کہنا کہ ''دیکھو جی! یہ قبروں کی زیارت سے منع کرتا ہے، حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہوا ہے کہ قبروں کی زیارت کرو، اور اس کا یہ روکنا حدیث کے خلاف ہے!'' یہ جہالت ہے، اس لیے کہ یہ روکنا عین شریعت کا منشا ہے، کیونکہ تم نے شریعت کے حکم کو بدل دیا، کہ ضروری نہیں تھا اور تم نے ضروری سمجھ لیا، تاریخ کی تعیین نہیں تھی اور تم نے تاریخ کی تعیین کرلی۔ تو یہ اندازہ لگانا کہ کون سا کام سُنّت کے مطابق ہے اور کون سا سُنّت کے مطابق نہیں ہے؟ اور اس میں بدعت کا معنیٰ کب پیدا ہوگا اور کب پیدا نہیں ہوگا؟ یہ فقیہ کا کام ہے، دین کی سمجھ رکھنے والے کا کام ہے۔ اصولی طور پر یہ بات ذکر کی جاسکتی ہے کہ شریعت میں جو درجہ جس کام کا متعین کیا گیا ہے اُس کو اُس درجے پر رکھ کر کریں تو جائز ہے، اور اگر اس کا درجہ تبدیل کردیں گے تو یہ شریعت کے اندر آپ نے ناجائز تصرف کیا، اس پر گرفت ہوگی۔ اور عملاً اس طرح التزام کرلینا گویا کہ واجب ہے اور اگر اس کے خلاف کبھی کرلیا گیا تو کبھی خلاف کرنے کی صورت میں اس پر اس طرح انکار کیا جائے جیسے واجب کے ترک پر انکار کیا جاتا ہے، تو یہ طرز بھی اُس میں بدعت کا معنیٰ پیدا کردیتا ہے۔ بہرحال ان الفاظ سے یہ ایک اصول نکل آیا جس سے بیسیوں جزئیات کا فیصلہ آپ کرسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا: یہ نیکی نہیں کہ تم گھروں میں اُن کی پشتوں کی جانب سے آؤ، وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنِ اتَّقٰى: لیکن نیکی، نیکی تو اُس شخص کی ہے (مَنِ اتَّقٰى کے اُوپر بِرّ کا لفظ محذوف نکالیں گے، جیسے ترجمے کے اندر اس کی وضاحت آگئی تھی) نیکی تو اُس شخص کی ہے جو اللہ سے ڈرے۔ نیکی کا معیار یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو، اللہ کے احکام کی رعایت رکھو، اپنے طور پر اس قسم کی چیزیں تجویز کرلینا یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے، نیکی تقویٰ ہے، اللہ سے ڈرنا نیکی ہے، ڈرنے والے کا جو کام ہے وہی نیکی ہے جو تقویٰ کے مطابق ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھو، اس کے حکم کی مخالفت نہ ہونے پائے، نیکی کا معیار یہ ہے۔ لہٰذا جس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ثابت ہوجائے اس کے مطابق چلنا نیکی ہے، چاہے وہ حکم شریعت کی عبارۃ النص سے ثابت ہو، دلالۃ النص سے ثابت ہو، اقتضاء النص سے ثابت ہو، جو بھی استدلال کے طریقے ہیں، استنباطِ صحیح، قیاسِ صحیح، ان سے جو حکم ثابت ہوجائے اور جس درجے کا ثابت ہوجائے اُس کے مطابق چلنا تقویٰ ہے اور اُس کے مطابق چلنا نیکی ہے، اور اپنی طرف سے تجویزیں کوئی نیکی نہیں ہیں۔

سوال:- الْبِرَّ سے پہلے بھی مضاف محذوف ہوسکتا ہے؟

---

(۱) مشکوۃ، ۱/ ۱۵۴ باب زیارۃ القبور۔ فصل ثالث/ شعب الایمان، رقم ۷۵۲۲۔ ولفظ الحدیث: من زار قبر ابویه او احدهما فی کل جمعة غفر له وکتب برا۔

. جواب:- وہ بھی ہوسکتا ہے، ولکنّ صاحب البِرّ مَنِ اتقی، حمل دونوں طرح سے ٹھیک ہوسکتا ہے۔ نیکی والا وہ شخص ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ بِرّ کے اوپر من اتقی کا حمل ٹھیک کرنے کے لئے یا تو مَن کے اوپر لفظ محذوف نکال لو ولکنّ البرّ برُّ مَنِ اتّقٰی، یا بِرّ سے پہلے محذوف نکال لو ولکنّ ذَا البِرِّ مَنِ اتّقٰی، یا، ولکنّ صاحبَ البِرِّ مَنِ اتّقٰی، نیکی والا وہ شخص ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا: آیا کرو اپنے گھروں میں اُن کے دروازوں سے، یعنی پشت کی جانب سے آنا کوئی ضروری نہیں ہے جیسے تم نے سمجھ لیا، سیدھے دروازوں کی طرف سے آیا کرو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔ اس حکم کے یہاں بیان کرنے کا موقع محل لفظِ حج کی وجہ سے پیدا ہوگیا، کیونکہ اس رسمِ بد کا تعلق حج کے ساتھ تھا، اس لیے جب حج کا تذکرہ شروع ہوا تو اس رسمِ بد کی تردید ہوگئی، اور ایک اصول اس میں سے معلوم ہوگیا جس سے آپ سینکڑوں جزئیات کا فیصلہ کرسکتے ہیں، جیسے کہ کچھ مختصر سی وضاحت میں نے آپ کے سامنے کردی۔

آیاتِ جہاد کا ماقبل و مابعد سے ربط

آگے کچھ آیات جہاد کے بارے میں آرہی ہیں، اور اُن کے بعد اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ سے پھر حج کے احکام شروع ہوجائیں گے اور اس سے پہلے بھی احکامِ حج کا تذکرہ آرہا ہے۔ درمیان میں جو یہ آیاتِ قتال آگئیں اِن کی مناسبت ماقبل اور مابعد کے ساتھ یہ ہے کہ یہ آیات بھی حج کے مہینے میں اور سفرِ عمرہ کے موقع پر ہی اُتری تھیں۔

مذکورہ آیاتِ جہاد کا شانِ نزول

واقعہ یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے مدینہ منورہ میں جانے کے بعد چھ ہجری کو ایک خواب دیکھا، کہ ہم عمرہ کرنے گئے ہیں، عمرہ کیا، پھر کسی نے حلق کرایا اور کسی نے قصر کرایا، اس خواب کا ذکر سورۂ فتح کے آخری رکوع میں ہے لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ: سچا خواب دکھایا۔ حضور ﷺ نے صحابہ کے ؓ کے سامنے اِس کا تذکرہ کردیا، صحابہ کرام ؓ پہلے ہی بیت اللہ کی زیارت کو ترسے ہوئے تھے، کتنی مدت ہوگئی تھی کہ مشرکین نے وہاں جانے نہیں دیا، اب خواب میں تو یہ تعیین نہیں تھی کہ اِسی سال یہ واقعہ پیش آئے گا، خواب میں تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک وقت میں تمہیں بیت اللہ لے جائے گا، تم عمرہ بھی کروگے اور حلق وقصر بھی کروگے۔ اسی شوق کے ساتھ انہوں نے فوراً تیاری کرلی، اور سرورِ کائنات ﷺ بھی تیار ہوگئے، چودہ سو سے زائد اور پندرہ سو سے کم افراد حضور ﷺ کے ساتھ تھے جس وقت آپ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے (واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے) جب حدیبیہ میں آپ پہنچے تو مشرکین نے آگے سے روک دیا، کہ آپ مکہ میں نہیں آسکتے۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اگر اس بارے میں اصرار کیا جاتا تو لڑائی ہوجاتی، اور حضور ﷺ ابھی اس علاقے میں لڑائی نہیں کرنا چاہتے تھے، تو حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ جیسے کیسے ہو مشرکین کے ساتھ صلح کرلی جائے، صلح ہوگئی، جس کو صلح حدیبیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بظاہر بہت دب کرے صلح کی، ساری اُن کی شرطیں مان لیں جو کچھ بھی انہوں نے کہا، اس معاہدے کے وقت صحابہ کرام ؓ کو بڑی تکلیف ہوئی تھی، لیکن آپ

نے سب کو مطمئن کر دیا کہ جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ اسی میں خیر و برکت دے گا، شرطوں کی تفصیل حدیث شریف کے اندر آتی ہے، اُن کو یہاں ذکر کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اُن شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس سال تو واپس چلے جاؤ، ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے، اگلے سال آنا اور آ کر عمرہ کرنا، تو سرورِ کائنات ﷺ چونکہ محصر ہو گئے، دشمن نے روک لیا، بیت اللہ تک نہیں جانے دیا، تو آپ نے حکم دیا کہ اپنی قربانیاں ذبح کر دو، اور اس کے بعد سر منڈالو، احرام کھول دو، اس طرح سے کر کے حضور ﷺ اُس وقت واپس آ گئے۔ اگلے سال اُس عمرہ کو قضا کرنے کی تیاری ہوئی، چونکہ احرام باندھ کر جس وقت ایک فعل شروع ہو گیا تو وہ واجب ہو گیا، اب اُس کو قضا تو کرنا تھا، اگلے سال ذی قعد کے مہینے میں یہ سفر ہوا، پہلا بھی ذی قعد کا مہینہ تھا، اور اب اگلے سال جو قضا کے لئے گئے ہیں تو یہ بھی ذی قعد کا مہینہ تھا، اور ذی قعد کا مہینہ اشہر حرم میں داخل ہے جن میں لڑنا جائز نہیں۔ اب صحابہ کرام ﷺ کو یہ خیال آیا کہ ہم چلے تو ہیں، اگر مشرکین نے پھر مزاحمت کر لی، اُن کی صلح کا اور ان کے عہد کا پیمان کا کیا اعتبار ہے، اگر کوئی گڑ بڑ کر لی اور ہمیں عمرہ پھر نہ کرنے دیا تو پھر وہاں لڑائی بھڑائی کی نوبت آئے گی، ایک تو ہم نے احرام باندھا ہوا ہوگا، احرام میں بھی لڑنا ٹھیک نہیں، پھر وہ حرم ہے، حرم کے اندر بھی لڑنا ٹھیک نہیں، پھر یہ شہر حرام ہے، شہر حرام میں بھی لڑنا ٹھیک نہیں، تو پھر ہم کیا کریں گے؟ اگر آگے سے مشرکین نے کوئی گڑ بڑ کی تو کیا کیا جائے گا؟ یہ خیالات پیدا ہوئے، اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ہدایات دیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اِن ہدایات کا تعلق اصل میں اُسی سفر کے ساتھ ہی ہے جو عمرے کے لئے کرنا تھا، عمرہ اور حج جن مہینوں کے اندر کیا جاتا ہے ان میں چونکہ یہ واقعات پیش آ رہے تھے اس لیے یہاں ہدایات کے طور پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ یہ ہے اِن آیات کا ربط آیاتِ حج کے ساتھ۔

اِحرام اور حرم میں جہاد کے متعلّق ہدایات

اِن سب آیات کا حاصل یہ ہے کہ تم نے شہر حرام کی بھی رعایت رکھنی ہے، حرم کی رعایت بھی رکھنی ہے، اور اِحرام کی رعایت بھی رکھنی ہے، یہ سب ادب کی چیزیں ہیں، ان میں لڑنا بھڑنا اور شرارت کرنا بالکل جائز نہیں ہے، تم نے محتاط رہنا ہے، لیکن اگر اُنہوں نے گڑ بڑ کی اور اُن کی طرف سے شرارت ہوئی تو پھر مدافعت کے طور پر تمہیں اُن کے ساتھ لڑنا بھی جائز، احرام کی حالت میں لڑنا جائز، حرم کے اندر لڑنا جائز، شہر حرام میں لڑنا جائز، پھر تمہیں اُن کی رعایت رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے آگے کہا گیا وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، کہ ادب آداب کی باتیں تو ادلے بدلے کی چیز ہے، کوئی تمہارے لیے ادب رکھے گا تو تم بھی رکھنا، اور اگر وہ گڑ بڑ کریں اور کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کریں تو پھر اُن کو خوب مارو کہ انہیں اچھی طرح سے سبق پڑھا دو، ان کی کھوپڑیاں کوٹو، یا اُن کو قتل کر دو، یا جس طرح انہوں نے تمہیں مجبور کر کے اس علاقے سے نکال دیا تم بھی اُن کو نکال دو، یعنی اس کے لئے اگر آپ مختصر سا عنوان متعین کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو یہ فرمایا کہ اُس موقع پر ''چھیڑو مت اور چھوڑو مت'' کی پالیسی اختیار کرنی ہے، کہ پہلے تو کسی کو چھیڑو نہیں، اصل تقاضا تو یہی ہے کہ کسی کو چھیڑو نہیں، لیکن اگر کوئی چھیڑ لے تو پھر چھوڑو نہیں، تو یہ پابندی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُٹھا دی گئی۔ چنانچہ حضور ﷺ تشریف لے گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل

وکرم کیا، مشرکین نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی، اور معاہدے کے مطابق انہوں نے وہاں جانے کی اجازت دے دی، تو یہ حضرات گئے، عمرہ کیا، تین دن ٹھہرنے کی شرط تھی کہ تین دن ٹھہر سکتے ہو، تو تین دن ٹھہرے اور پھر واپس تشریف لے آئے۔ لیکن تیاری اپنی اس قدر کر کے گئے تھے کہ اگر چھیڑ ہوگئی اور کسی نے کوئی شرارت کر لی تو ایسی صورت میں اُن کی مدافعت مکمل کی جائے گی، پھر اُن کی رعایت نہیں کرنی۔ تو چونکہ عمرہ کے سفر کے لئے یہ ضرورت پیش آئی تھی جس کے متعلق یہ ہدایات دی جارہی ہیں تو احکام حج اور احکام عمرہ کے درمیان میں یہ آیات قتال رکھ دی گئیں۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ: اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو اُن لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں، لڑو اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں، وَلَا تَعْتَدُوْا: اور تم خود حد سے تجاوز نہ کرو، کہ پہلے لڑائی چھیڑ دو، اور از خود اس قسم کے حالات پیدا کر دو، ایسا نہ کرنا۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے'' اگر مشرکین نے اعتداء کیا تو اللہ اُن سے بغض رکھے گا، اور اگر تم نے اعتداء کیا تو اللہ تعالیٰ کو تم پسند نہیں ہو، اپنی طرف سے تم نے حدود کی رعایت کرنی ہے، لیکن اگر کوئی لڑ پڑے تو پھر اُس کے ساتھ تمہیں لڑنے کی اجازت ہے۔ ''قتل کر دو انہیں جہاں بھی تم اُنہیں پاؤ، اور نکال دو اُن کو اس جگہ سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔''

کون سا فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور کیوں؟

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: فتنہ کا معنی پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، اصل میں یہ لفظ بولا جاتا ہے فَتَنَ الذهبَ والفضةَ سونے اور چاندی کو آگ کے اندر تپانا تا کہ اُس کا کھوٹ ظاہر ہو جائے، یہ ہے اصل کے اعتبار سے فَتَنَ کا معنی، بعد میں ہر اُس واقعہ کو جو مصیبت اور آزمائش کی شکل میں آئے فتنہ کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ مصیبت ہو یا آزمائش کا کوئی دوسرا واقعہ ہو وہ بھی انسان کی اصلیت ظاہر کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، کہ اس میں کتنی برداشت ہے، کتنا صبر ہے، شکر کرتا ہے یا نہیں کرتا، صبر کرتا ہے یا نہیں کرتا، کہاں تک اس بات کو برداشت کر سکتا ہے، تو اس قسم کے واقعات یوں انسان کے لئے آزمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور انسان کی طبیعت کا کھوٹ اور اُس کے دل کے جذبات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں فتنے سے مراد شرارت ہے جو مشرکین کی طرف سے ہو رہی تھی، کہ اہل اسلام کو وہ مجبور کرتے تھے، اِن پر مصائب کے پہاڑ توڑتے تھے، تا کہ یہ اپنے دین سے باز آ جائیں اور شرک کو اختیار کر لیں، یہ اُن کی طرف سے فتنہ تھا اور یہ شرارت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں اگر لڑائی ہوگئی تو فتنہ تو اُن کی طرف سے ہے، شرارت اُن کی طرف سے ہے، تمہیں وہ الزام نہیں دے سکیں گے، کیوں؟ کہ فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، تمہاری طرف سے قتل پایا گیا تو یہ بھی تو اسی فتنے سے ناشی ہے جو انہوں نے اُٹھایا، اس لیے نقصان کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہونے کے اعتبار سے فتنہ زیادہ سخت ہے، کیونکہ یہ فتنہ ہی آگے قتل و قتال کا باعث بنتا ہے، یعنی وہ شرارت جو کہ مشرکین کی طرف سے ہو رہی ہے کہ وہ اہل ایمان کو نیکی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اس لیے قصور انہی کا ٹھہرے گا، قصوروار وہی ہوں گے جو اس قسم کی شرارت کرتے ہیں۔ ''نہ لڑو اُن کے ساتھ مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ اُس حرم میں'' جب تک وہ لڑائی نہ لڑیں اس وقت تک تمہارے لیے حرم میں لڑائی جائز نہیں۔

بیت اللہ میں شرپسندوں کی بغاوت اوران کا انجام

چنانچہ اب یہ جوآپ کے سامنے حرم شریف میں واقعہ پیش آیا[1] وہ جو ریڈیو میں آتا رہا کہ علماء سے فتویٰ لیا گیا ہے، اور فتویٰ لینے کے بعد یہ اقدام کیا گیا ہے، تو اُس کی اصلیت بھی یہی ہے کہ ایک گروپ بغاوت کر کے آ کے قابض ہوگیا، اور آتے ہی انہوں نے محافظین کو ہلاک کردیا، حکومت کے خلاف بغاوت کی، طواف رکوادیا، نمازیں رک گئیں، ساری گڑبڑ مچ گئی، یہ شرارت اور بغاوت ہے جو اُس گروہ کی طرف سے پیش آئی، اور اُن کو وہاں سے نکالنے کے لئے اگر لڑائی لڑنی پڑی تو اس میں قصور اُن کا ہے جنہوں نے شرارت اٹھائی، اور جس نے امن بحال کرنے کے لئے اور حالات کو سازگار کرنے کے لئے ڈنڈا اُٹھایا ہے وہ تو ایک جوابی کارروائی ہے۔ اس لیے ہم اس مسئلے میں سعودی حکومت کو بالکل حق بجانب سمجھتے ہیں، اور جو کچھ وہاں ہوا، حرم کی بے ادبی ہوئی، قتل ہوا، خونریزی ہوئی، طواف رُک گیا، نمازیں رُک گئیں، اس سب کا وبال انہی شرارت پسند عناصر پر ہے جنہوں نے یہ غلط اقدام کر کے اس قسم کے حالات پیدا کیے، تو اُن کو وہاں سے نکالنے کے لئے جو اقدام سعودی حکومت کی طرف سے ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے۔ باقی اگر وہ بادشاہت کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتے تھے اور جمہوریت لانا چاہتے ہیں جیسے کہ آج کل لوگوں نے جمہوریت کا بُت اچھے طریقے سے پُوجنا شروع کردیا ہے، کہ بس جمہوریت آجائے جیسے بھی آجائے، اس قسم کا اگر کوئی وہ اقدام کرنا چاہتے تھے، تو بھی ہم اُن کے اِس اقدام کی کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرسکتے، یہ اقدام کرتے تو جدہ میں کرتے، ریاض میں کرتے، کسی دوسری جگہ کرتے، بادشاہ کا اگر تختہ اُلٹنا مقصود تھا تو کوئی اور طریقہ اختیار کرتے، تو اُن کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی ظاہر کرسکتا تھا، اب چاہے اُن کا مقصد اچھا ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ اقدام جو انہوں نے کیا ہے کہ حرم کے اندر آکر شرارت کی ابتدا کردی، اِس کی کسی صورت میں تائید نہیں کی جاسکتی، اس میں جو کچھ ہوا سارے کا سارا وبال اسی شرارت پسند عنصر پر ہے۔ اس لیے یہ فتویٰ جو علماء نے دیا کہ ان کو نکالنے کے لئے تشدد کیا جاسکتا ہے، بالکل ٹھیک دیا، اور اِنہی آیات سے ماخوذ ہے، اور ان کا حکم اس وقت ایک باغی عنصر کا ہے جنہوں نے آکر اس قسم کی گڑبڑ مچائی، اور اُس فتوے کا ماخذ یہی آیات ہیں۔

''اِن سے نہ لڑو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ تمہارے ساتھ اِس حرم میں لڑائی نہ کریں''، فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ: اگر وہ تم سے لڑپڑیں فَاقْتُلُوْهُمْ: تو پھر تم ان کو حرم میں ہی قتل کردو، پھر تمہیں قتل کرنے کی اجازت ہے، كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ: کافروں کا یہی بدلہ ہے، جو حرم کے اندر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اِن کی جزاء یہی ہے کہ اِن کی حرم کے اندر بھی جان بخشی نہیں ہے، ان کو حرم کے اندر بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔ فَاِنِ انْتَهَوْا: اور اگر یہ شرارت سے باز آجائیں، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: تو اللہ غفور رحیم ہے، پہلے جو حرکتیں کرتے رہے ہیں تو اللہ معاف بھی کردے گا، باز آنے کا مطلب یہ ہے کہ شرارت چھوڑ دیں، اور شرک کرنا اور شرک کے لئے دوسروں کو مجبور کرنا یہ سب شرارت ہے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ: اگر یہ لڑائی چھیڑ دیں تو پھر ان کے ساتھ اس وقت تک لڑو جب تک کہ شرارت ختم نہ ہوجائے، حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: یہ شرارت بازی جب تک ختم نہ ہوجائے اُس وقت تک اِن کے ساتھ لڑو، وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ: اس

---

(۱) یہ واقعہ یکم محرم ۱۴۰۰ھ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ درس بھی اُنہی دنوں کا ہے۔ ناقل۔

وقت تک لڑو جب تک کہ دین اور اطاعت اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔ حتیٰ کے بعد یہ لَا تَكُونَ اور يَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ دونوں کا ترجمہ لکھا ہو گیا، ''ان کے ساتھ اُس وقت تک لڑو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور جب تک کہ دین اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے'' یعنی قانون اللہ کا نافذ ہو جائے، اطاعت اور فرمانبرداری اللہ کی ہو جائے، اُس وقت تک تم اِن سے لڑ سکتے ہو۔ محاورۃً نفی کا ترجمہ کر رہا ہوں ''جب تک کہ دین اللہ کے لئے نہ ہو جائے اُس وقت تک تم اِن کے ساتھ لڑتے رہو، جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اُس وقت تک تم اِن سے لڑ سکتے ہو''۔ فَاِنِ انْتَهَوْا: اگر وہ باز آجائیں فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: پھر تجاوز نہیں ہے، زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر، جس کے لئے ظلم ثابت ہوگا، جو ظلم کرے گا اُسی پر ہی زیادتی کی جا سکتی ہے، اور جو ظلم نہیں کرے گا، ظلم سے باز آجائے گا، اُس پر زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ ''شہر حرام شہر حرام کے بدلے میں ہے'' اگر وہ تمہارے حق میں اِس مہینے کو حرمت والا مہینہ سمجھیں تو تم بھی اُن کے حق میں اِس کو حرمت والا مہینہ سمجھو۔ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ: حرمات، ادب آداب یہ سب مساوات کی چیزیں ہیں، اگر تمہارے لیے کسی حرمت کا کوئی اعتبار کرتا ہے تو تم اس کے لئے اُس حرمت کا اعتبار کرو، اگر تمہارے لیے حرمت کا اعتبار نہیں کرتا تو تم بھی اس کے لئے حرمت کا اعتبار نہ کرو۔

اِعتداء کے مقابلے میں اِعتداء ہے

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ: جو کوئی تم پر حد سے تجاوز کرے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ: تو تم اس پر تجاوز کرو۔ یہاں فَاعْتَدُوْا صورۃً کہہ دیا گیا، ورنہ کسی کی تعدی کے مقابلے میں جزائے تعدی کے طور پر جو معاملہ ہوا کرتا ہے، وہ حقیقت میں تعدی نہیں ہے، مشاکلۃً اس کو اعتداء سے تعبیر کر دیا، کیونکہ یہ تو ہم نے اُس کو سزا دینی ہے جو کہ بالکل حق ہے۔ جیسے دوسری جگہ ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (سورۂ شوریٰ: ۴۰) سیئہ کی جزاء حقیقت میں سیئہ نہیں ہے، لیکن جیسا معاملہ اُس نے کیا جب بطور بدلے کے ویسے ہی اُس کے ساتھ کیا گیا تو صورۃً اُس کو سیئہ کہہ دیا، مشاکلۃً کا یہی معنیٰ ہوتا ہے۔ یہاں بھی اُن کے اعتداء کے جواب میں جو کچھ کیا جائے گا وہ حقیقتاً حد سے تجاوز نہیں ہے، اعتداء نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ نے حد بتا دی کہ تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن صورۃً اور مشاکلۃً اُس کو اعتداء سے تعبیر کر دیا۔ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ کا معنیٰ یہ ہے ان کے اعتداء کرنے کی طرح، جیسے انہوں نے کیا، اور یوں ترجمہ نہیں کرتا کہ ''تجاوز کرو اُن پر مثل اس کے جو انہوں نے اعتداء کیا'' جس کا معنیٰ یوں نکالیں کہ مقدار میں بھی برابری ہو، یہاں مقدار میں برابری والی بات نہیں ہے، کیونکہ جنگ چھڑ جانے کے بعد پھر ہم نے یہ نہیں دیکھنا کہ انہوں نے ہمارے کتنے آدمی مارے اور ان کے کتنے مرے، یہاں تشبیہ مقدار میں نہیں، صرف اعتداء میں ہے، کہ اقدام تم ویسے کر سکتے ہو جیسے انہوں نے کیا، باقی جہاں تک نقصان کی بات ہے تو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنا کچھ بھی نقصان نہ ہو اور اُن کا سارا ہی ہو جائے، اپنا کوئی آدمی نہ مرے اور اُن کے سارے ہی مر جائیں، پھر تو کوشش یوں کرنی چاہیے، جہاد چھڑ جانے کے بعد پھر برابری نہیں۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور ہر معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا: اور یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کی معیت انہی کے ساتھ ہی ہے جو احکام کی رعایت رکھنے والے ہیں، پرہیز کرنے والے ہیں۔

بدنی جہاد کے بعد مالی جہاد کا ذکر

یہاں جب قتال کا ذکر آیا، چونکہ یہ بدنی جہاد ہے، اور اس بدنی جہاد کے لئے مال بھی خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تبھی جا کر جہاد کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اس لیے اِس کے ساتھ لگتے ہی مالی جہاد کا تذکرہ کیا، تو انفاق کا جو یہاں ذکر آ گیا ہے یہ بھی جہاد کا ہی مسئلہ ہے، کہ جہاد میں کامیابی تبھی ہوتی ہے جب جہاد کی تیاری میں اور جہاد کی دوسری ضروریات میں انسان مال بھی خوب خرچ کرے، وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ: اللہ کے راستے میں خرچ بھی کرو، خاص طور پر ایسا خرچ کرنا جس کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے۔

ترکِ جہاد اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ: اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کی طرف نہ ڈالو، اگر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چھوڑ دو گے اور جہاد کی تیاری نہیں کرو گے تو یہ اپنے آپ کو تم خود ہلاکت کی طرف ڈالتے ہو، کیونکہ اس کے ترک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور ہو جاؤ گے، دشمن مضبوط ہو جائے گا، اور ایک دن دشمن تمہیں ہڑپ کر جائے گا، تو تم نے اپنے آپ کو خود بربادی کی طرف ڈالا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے شانِ نزول میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں اُتری ہے،[1] کہ ہم نے جس وقت دیکھا کہ اب مسلمان کافی ہو گئے اور یہ جہاد کر رہے ہیں، تو ہمیں خیال آیا کہ ہم اپنی کاشت کی طرف اور اپنی زمینوں کی طرف متوجہ ہو جائیں، اپنے باغوں کی نگرانی کریں جس طرح ہم پہلے کرتے تھے، تاکہ یہ ضرورت اس طرح سے پوری ہو، تو ترکِ جہاد کا خیال ہمارے دل میں آ گیا، کہ ہم اللہ کے راستے میں جہاد نہ کریں، بلکہ ہم اسی طرح زمینداری میں، کاشتکاری میں، اور باغبانی میں لگ جائیں، جس طرح ہم کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی ہے کہ اگر اس طرح سے جہاد سے دلچسپی چھوڑ دو گے اور اپنی انہی چیزوں کی طرف لگ جاؤ گے، کاشتکاری کی طرف، زمینداری کی طرف، تو یاد رکھو! نتیجۃً ہلاکت آ جائے گی، اس لیے قوم کی زندگی اگر ہے تو جہاد کے ساتھ ہے، اسلام کی سرسبزی شادابی اگر ہے تو جہاد کے ساتھ ہے، اپنے بدن کو بھی اللہ کے راستے میں لگاؤ اور اپنے مال بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

احسان فی العبادۃ اور احسان فی المعاملہ کیا ہے؟

وَاَحْسِنُوْا: اور ہر کام اچھی طرح سے کیا کرو۔ اَحْسِنُوْا اِحْسَان، اِحسان کا معنیٰ ہر کام اچھی طرح سے کرنا۔ احسان فی العبادۃ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ اللہ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، چونکہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے تو اس طرح سے سمجھو کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں، احسان فی العبادۃ تو یہ ہے، اور باقی معاملات میں بھی احسان ہو، یعنی احسان فی المعاملات، جس کی تشریح حدیث شریف کے اندر آ گئی، کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو،[2] ہر شخص کے ساتھ معاملہ ایسا کرو

---

(۱) ترمذی ۲/۱۲۶، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ۔ ولفظہ: وَاِنَّمَا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِيْنَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ لَمَّا اَعَزَّ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ وَكَثُرَ نَاصِرُوْهُ الخ۔

(۲) بخاری ص۱۔ ولفظ الحدیث: لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔

جیسا تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے، یہ احسان فی المعاملہ ہے، ''ہر کام کو اچھی طرح سے کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔''

نفل شروع کرنے کے بعد اس کو پورا کرنا واجب ہے

آگے حج کے احکام ہیں جن میں زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں، فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ ''حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کیا کرو'' یعنی اگر حج یا عمرہ شروع کر لیا تو اللہ کی رضا کے لئے اُس کو تمام تک پہنچایا کرو۔ ہمارا مسلک تو باقی نوافل میں بھی یہی ہے، کہ کوئی نفلی کام ہو جب اس کو شروع کر لیا جائے تو واجب ہو جاتا ہے، اور عمرہ بھی نفل ہے، فرض نہیں ہے، اس لیے جب یہ شروع ہو گیا تو یہ بھی فرض ہو جائے گا، اور اگر کسی نے نفلی حج کا احرام باندھ لیا تو وہ بھی فرض ہو جائے گا۔ لیکن حج اور عمرہ کے بارے میں باقی ائمہ کا بھی اتفاق ہے، کہ شروع کرنے کیساتھ ان کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اِحصار کے احکام

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ: اگر تمہیں روک لیا جائے، مثلاً آگے کوئی جانے نہیں دیتا، جیسے میدانِ حدیبیہ میں ہوا تھا، تو پھر تمہارے ذمے ہے ہدی جو میسر آ جائے، یعنی بکری دے دو، یا گائے کا ساتواں حصہ دے دو، یا اونٹ کا ساتواں حصہ دے دو۔ مسئلہ یہی ہے کہ محصَر قربانی کا جانور دیتا ہے، جب وہ قربانی حرم میں ذبح ہو جاتی ہے تو اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی قربانی کے جانور ذبح کیے اور اس کے بعد احرام کھولا۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ: یہ علامت ہے احرام کھولنے کی، اور سر نہ منڈایا کرو جب تک کہ ہدی اپنے ٹھکانے کو نہ پہنچ جائے، یعنی جب تک حرم میں جا کر ذبح نہ ہو جائے اُس وقت تک احرام نہ کھولا کرو۔

عُذر کی وجہ سے جنایتِ اِحرام کا حکم

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا: اور اگر احصار تو پیش نہیں آیا لیکن کوئی شخص بیمار ہو گیا، جس کی وجہ سے سر منڈانا ضروری ہو گیا، مثلاً سر میں درد رہتا ہے یا کوئی اور تکلیف ہو گئی، جوئیں پڑ گئیں، جیسے حدیث شریف میں قرآنِ کریم کی اس آیت کی تشریح میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے سر میں اتنی جوئیں پڑ گئیں کہ میں بیٹھا ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ میرے سر کے کیڑے میرے چہرے پر گر رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ تیرے کیڑے تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں جی! فرمایا کہ سر منڈا دو اور فدیہ دے دو۔ اور فدیہ کی تشریح اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ یا تین روزے رکھو، یا چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کھانا دو، یا ہدی دو۔[1] جیسے کہ آگے لفظ آئے ہوئے ہیں۔ تو تینوں میں برابر سرابر اختیار ہے، جو کام چاہو کر لو۔ اس سے احرام نہیں کھلے گا، البتہ سر منڈانا چونکہ ایک جنایت ہے، اور اس مجبوری کے طور پر اگر سر منڈایا ہے تو یہ فدیہ دے دیا جائے گا، اور اس کی تینوں چیزوں میں اختیار ہے۔ ''جو تم میں سے بیمار ہو یا اُس کو تکلیف ہو سر کی طرف سے

---

(۱) بخاری ۸۵۰/۲ باب الحلق فی الاذی۔ ولفظہ: قَالَ فَاحْلِقْ وَصُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوْ اَطْعِمْ سِتَّةً اَوِ انْسُكْ نَسِيْكَةً۔

پس اس کے ذمے فدیہ ہے روزوں کا'' یہاں صیام کی تعداد نہیں بیان کی گئی، حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ تین روزے رکھنے پڑیں گے، صیام صوم کی جمع بھی ہے اور مصدر بھی ہے بمعنی روزہ رکھنا۔''فدیہ روزہ رکھنے سے''اس کی تشریح یہ ہوگئی کہ تین روزے رکھیں۔ اَوْصَدَقَةٍ: صدقہ کی تفصیل یہ ہوگئی کہ چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کھانا دیں۔ اور نسک سے مراد قربانی ہے جس کا کم درجہ بکری ہے۔

حج تمتع اور قران کرنے پر دمِ شکر یا دس روزے

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ: اور جب تم امن میں ہو، یعنی کوئی تکلیف نہیں ہے اور دشمن کی طرف سے کوئی احصار نہیں ہے تو ایسی صورت میں سر نہیں منڈایا جائے گا، احرام نہیں کھولا جاتا، پھر اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔''پھر جو شخص فائدہ اٹھائے عمرے کے ساتھ حج کی طرف ملا کر تو اُس کے ذمے ہے جو میسر ہو ہدی''اس کی کچھ تفصیل ترجمے میں ہوگئی تھی، فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں، حج کی تین قسمیں ہیں، حج اِفراد، حج تمتع، حج قران۔ تمتع اور قران یہ دونوں تَمَتَّعَ کا مصداق ہیں، کہ ایک سفر کے اندر دونوں سے فائدہ اٹھایا، ایسی صورت میں قربانی کرنی واجب ہے، اور یہ دمِ شکر ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دم میسر نہ ہو مثلاً پیسے نہیں ہیں، غریب ہے، تو وہ دس روزے رکھے، تین حج سے پہلے ایامِ حج میں، جس کی آخری تاریخ نو ہے، نو تک وہ تین پورے ہو جانے چاہئیں، اور سات حج سے فارغ ہو کر، چاہے مکہ معظمہ میں رکھ لے، چاہے گھر آ کے رکھے، یہ دس روزے قربانی کے قائم مقام ہو جائیں گے۔''جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر اُس کے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی، اور جو شخص قربانی نہ پائے تو اُس کے ذمے ہے تین دن کا روزہ رکھنا، حج کے ایام میں''، فی وقتِ الحج۔''اور سات دن کا روزہ رکھنا جب تم لوٹو'' یعنی حج کر کے لوٹو، حج سے فارغ ہو جاؤ، پھر چاہے وہیں رہ جاؤ، چاہے گھر آ جاؤ۔''یہ دس پورے ہو گئے۔''

تمتع اور قران صرف آفاقی کے لئے ہیں

''اور ایامِ حج میں، اشہرِ حج میں حج اور عمرہ کو اکٹھا کر کے فائدہ اٹھانا اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں''اس کی تشریح روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہے کہ مواقیت کے اندر رہنے والے نہ ہوں، مواقیت سے جو باہر رہنے والے ہیں (احرام باندھنے کے لئے چاروں طرف جو جگہیں متعین ہیں اُن کو میقات کہا جاتا ہے) وہ حج اور عمرہ کو اکٹھا کر سکتے ہیں، اور مکہ معظمہ میں رہنے والے حج اور عمرہ کو اکٹھا نہیں کر سکتے۔''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں''اس لیے حج کو جاؤ یا عمرہ کو جاؤ تو اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کے احکام کی بہت رعایت رکھو، اگر یہ رعایت نہیں رکھو گے اور گڑبڑ کرو گے تو پھر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا

حج (کا وقت) چند معلوم مہینے ہیں پس جو شخص متعین کر لے اُن کے اندر حج کو پس نہیں ہے رفث اور نہیں ہے فسوق اور نہیں

جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

ہے جھگڑا، حج (کے ایام) میں، اور جو تم اچھا کام کرو اللہ اُس کو جانتا ہے، سفر خرچ لے لیا کرو، پس بیشک سفر خرچ کا فائدہ

التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا

سوال سے بچنا ہے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو! ﴿۱۹۷﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم طلب کرو

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَ

اپنے رب کا فضل، جس وقت تم لوٹو عرفات سے تو یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو مشعر حرام کے پاس، اور

اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

یاد کیا کرو اس کو جیسے کہ اُس نے تمہیں طریقہ بتلایا، بیشک بات یہ ہے کہ تم اس سے قبل البتہ ناواقفوں میں سے تھے ﴿۱۹۸﴾

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

پھر تم لوٹا کرو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ

رحم کرنے والا ہے ﴿۱۹۹﴾ جب تم پورے کر لو اپنے حج کے احکام تو یاد کیا کرو اللہ کو اپنے آباء کو یاد کرنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سخت

ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ

یاد کرنا، لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو دے دے ہمیں دنیا میں، اور نہیں ہے ان کے لئے

فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

آخرت میں کوئی حصہ ﴿۲۰۰﴾ اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں بھلائی اور

الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ

آخرت میں بھلائی اور بچا تو ہمیں جہنم کے عذاب سے ﴿۲۰۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے حصہ ہے ان کی کمائی کا اور اللہ تعالیٰ

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ

جلدی حساب لینے والے ہیں ﴿۲۰۲﴾ اور یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو چند گنتی کے دنوں میں، پھر جو شخص جلدی کرلے دو دنوں میں

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ

اُس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو دیر کردے اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ ان کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ بیشک تم اسی کی طرف ہی جمع کیے جاؤ گے ﴿۲۰۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: اَشْهُرٌ شہر کی جمع بمعنی مہینہ، حج معلوم مہینے ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ کا حمل حج کے اوپر ٹھیک نہیں معلوم ہو رہا، اس لیے حج سے پہلے وقت کا لفظ محذوف نکال لیا جائے گا، وقتُ الحجِّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: حج کا زمانہ، حج کا وقت چند معلوم مہینے ہیں، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ: پھر جو شخص متعین کرلے اِن کے اندر حج کو، یعنی حج کی ابتداء کرلے، جو لازم کرلے ان مہینوں کے اندر حج کو، فَلَا رَفَثَ: رَفَث کا لفظ آپ کے سامنے احکامِ صیام کے اندر گزرا ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۸۶) وہاں ہم نے اس کا معنی کیا تھا کہ عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا، اور یہاں بھی اس کا مفہوم یہی ہے، مباشرت اور عورتوں کے سامنے ایسی گفتگو کرنا جو مباشرت کے لئے مقدمہ بن جاتی ہے، شہوانی گفتگو، جذبات کو انگیخت کرنے والی، جس قسم کی گفتگو محبت اور پیار کے جذبات بھڑکانے کے لئے جماع سے پہلے ہوا کرتی ہے اس قسم کی گفتگو اس سے مراد ہے، وَلَا فُسُوْقَ: فسوق اصل کے اعتبار سے خروج عن الطاعۃ کو کہتے ہیں، فرمانبرداری سے نکل جانا، اور یہاں عام گناہ بھی مراد ہوسکتے ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ ممنوعاتِ احرام بھی مراد ہوسکتے ہیں، یعنی احرام کی صورت میں جن کاموں کا کرنا ناجائز ہوگیا، چاہے وہ عام حالات میں جائز تھے، فسوق کا مصداق یہاں وہ بھی ہوسکتے ہیں۔ اور جدال باب مفاعلہ کا مصدر ہے، مجادلہ: آپس میں جھگڑا کرنا۔ یہاں تینوں کی نفی ہوگئی "پس نہیں ہے رفث، اور نہیں ہے فسوق، اور نہیں ہے جھگڑا"۔ صورۃً یہ نفی ہے، معنیً نہی ہے، تو معنی نہی ہونے کی وجہ سے اس کا مفہوم یوں بیان کیا جائے گا "پس عورتوں کے سامنے شہوانی گفتگو نہ کیا کرو اور نافرمانی نہ کیا کرو اور جھگڑا نہ کیا کرو حج کے ایام میں، حج کے وقت میں"، جو ان دنوں میں اپنے اوپر حج کو لازم کرلے اسے چاہیے کہ نہ تو عورتوں کے سامنے شہوانی گفتگو کرے، اور نہ کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب کرے، یا ممنوعاتِ احرام کا ارتکاب نہ کرے، اور نہ کسی قسم کا جھگڑا فساد کرے حج کے ایام میں۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ: اور جو کوئی اچھا کام تم کرو۔ مِنْ خَيْرٍ یہ مَا کا بیان ہے۔ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ: اللہ اُس کو جانتا ہے۔ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى: تَزَوُّد: زادِ راہ لے لینا، سفر خرچ لے لینا، سفر خرچ لے لیا کرو پس بیشک سفر خرچ

کا فائدہ، سفر خرچ کی بھلائی التقویٰ مِنَ السُّوالِ سوال سے بچنا ہے۔ تزوّد سے جب سفر خرچ مراد لیا جائے گا تو پھر تقویٰ سے لغوی مفہوم مراد ہوگا، بچنا، یعنی سوال سے، گداگری سے بچنا۔ خرچ لے کر چلا کرو، اور اس خرچ لے کر جانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم گداگری سے بچ جاؤ گے۔ اور اگر تقویٰ سے دوسرا تقویٰ مراد لیا جائے، اللہ کا ڈر، اللہ کا خوف، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا تَزَوَّدُوْا التَّقْوٰی فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی، تَزَوَّدُوْا کا مفعول التَّقْوٰی نکالیں گے، تقویٰ کا زادِ راہ لے کر چلا کرو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی ہے، یعنی جس وقت سفر پر چلنے لگو تو اس وقت تقویٰ کی صفت اپنے اندر پیدا کرو، بہترین چیز جس کو انسان سفر میں ساتھ لے کر چلتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، تا کہ سفر کے اندر نیکی کرنا آسان ہو جائے اور برائی سے بچنا آسان ہو جائے، اس لیے تقویٰ کی صفت ساتھ لے کر چلو، پھر اس کا یہ مفہوم ہو جائے گا، اور ترجمہ دونوں طرح سے صحیح ہے۔ وَاتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ: مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو! لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ: جُناح گناہ کو کہتے ہیں، تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم طلب کرلو اللہ کا فضل، تَبْتَغُوْا: ابتغاء: طلب کرنا، تلاش کرنا۔ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ: اپنے رب کا فضل، اس کا مصداق یہاں رزقِ حلال ہے، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رَبّ کا فضل تلاش کرلو۔ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ: جس وقت تم لوٹو، مِّنْ عَرَفٰتٍ: عرفات سے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ: تو یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو مشعر حرام کے پاس، مشعر حرام مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے۔ وَاذْكُرُوْهُ: اور یاد کیا کرو اُس اللہ کو، كَمَا هَدٰىكُمْ: جیسے کہ اس نے تمہیں طریقہ بتلایا، جیسے کہ اس نے تمہاری راہنمائی کی، جیسے اُس نے تمہیں ہدایت دی، وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ: اِنْ مُخففہ من المُثقّلہ ہے، یہ اِن شرطیہ نہیں ہے، بیشک بات یہ ہے کہ تم اُس کے ہدایت دینے سے قبل البتہ ناواقفوں میں سے تھے، بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے تھے، تمہیں کوئی طریقہ نہیں آتا تھا کہ صحیح طریقے سے اللہ کو یاد کیسے کرنا ہے، تو اللہ نے تمہیں بتا دیا، اب اُس طریقے پر چلو، اس طریقے کے مطابق اللہ کو یاد کرو، ''بیشک تم اس کی ہدایت سے قبل، اس کے بتلانے سے قبل البتہ گمراہوں میں سے تھے، بھٹکے ہوؤں میں سے تھے، ناواقفوں میں سے تھے''۔ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ: یہ اَفِیْضُوْا وہی ہے جو اَفَضْتُمْ میں گزرا۔ اَفَاضَ اِفَاضَۃً: لوٹنا۔ پھر تم لوٹا کرو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں، وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ فَاِذَا قَضَیْتُمْ: جس وقت تم اپنے حج کے احکام پورے کرلو۔ مناسک مَنْسِك کی جمع، جیسے اَرِنَا مَنَاسِكَنَا (سورۂ بقرہ:۱۲۸) کا لفظ پہلے بھی آیا تھا، جس وقت تم اپنے حج کے احکام پورے کرلو، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ: تو یاد کیا کرو اللہ کو، كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ: تمہارے اپنے آباء کو یاد کرنے کی طرح، جس طرح سے تم اپنے آباء کو یاد کرتے ہو اسی طرح اللہ کو یاد کیا کرو، اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا: یا اُس سے بھی زیادہ سخت یاد کرنا۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا: لوگوں میں بعض وہ ہے۔ مِن تبعیضیہ ہے۔ مَنْ چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے یَقُوْلُ کی ضمیر اس کی طرف مفرد لوٹ رہی ہے، معنی یہ جمع ہے، اگر اس طرح ترجمہ کرلو کہ ''لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے'' تو بھی ٹھیک ہے، اور اس طرح سے کرلو کہ ''جو کہتے ہیں'' تو بھی ٹھیک ہے، معنی کی رعایت کرتے ہوئے اِس کو جمع کے ساتھ بھی ادا کیا جا سکتا ہے، لفظوں کی رعایت کرتے ہوئے مفرد کے ساتھ بھی ادا کیا جا سکتا ہے، ''لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں''۔ اٰتِ کا مفعول یہاں ذکر نہیں کیا گیا کہ کیا دے دے، یعنی جو اُن کو مطلوب ہے، اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا: دے دے ہمیں دنیا میں، وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ

خَلَاقٍ: نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ، خلاق حصے کو کہتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ: اور ان لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے، رَبَّنَآ: اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں حَسَنَةً: بھلائی، اچھی حالت، وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً: اور آخرت میں بھلائی، اچھی حالت، وَّقِنَا: قِ امر کا صیغہ، وَقٰی یَقِیْ: بچانا، وقایۃ اس کا مصدر آتا ہے۔ قِنَا: بچا تو ہمیں، عَذَابَ النَّارِ: جہنم کے عذاب سے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا: یہی لوگ ہیں کہ اِن کے لئے حصہ ہے ان کی کمائی کا، ما کسبوا: جو کچھ انہوں نے کمایا، جو کچھ انہوں نے کیا اُس کا حصہ اُنہیں ملے گا۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ: یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو چند گنتی کے دنوں میں، فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ: پھر جو شخص جلدی کرلے دو دنوں میں، فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: اس پر کوئی گناہ نہیں، وَمَنْ تَاَخَّرَ: اور جو دیر کردے دو دنوں سے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ لِمَنِ اتَّقٰى: ذٰلِكَ لِمَنِ اتَّقٰى یہ جو ذکر کیا گیا ہے یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، کیونکہ احکام کی رعایت وہی رکھا کرتے ہیں، دوسرے لوگ احکام کی رعایت نہیں رکھتے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: اور یقین کرلو کہ بیشک تم اسی کی طرف ہی جمع کیے جاؤ گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع سے حج کے احکام شروع ہوئے تھے، اور یہ آیات جن کا آپ کے سامنے ترجمہ کیا گیا یہ بھی احکامِ حج پر مشتمل ہیں۔

حج کے وقت کی تعیین

پہلے تو حج کا وقت بتایا گیا ہے۔ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ میں حج اور عمرے کے پورا کرنے کا ذکر آیا تھا، ان میں سے عمرہ تو ایک ایسی عبادت ہے جس کے لئے کوئی وقت متعین نہیں، یہ نفل عبادت ہے، سال کے دوران میں جس وقت چاہیں آپ کر سکتے ہیں، لیکن حج کی شان یہ نہیں ہے کہ آپ جس وقت چاہیں کرلیں، اس کے لئے ایک وقت متعین کیا گیا ہے، اور وہ وقت چند معلوم مہینے ہیں، جس کا مصداق ہے شوال، ذی قعدہ اور عشرۂ ذی الحج، ذی الحج کے پہلے دس دن۔ تغلیباً جمع کا لفظ بول دیا گیا، اگرچہ دو مہینے پورے ہیں اور تیسرا پورا نہیں ہے، جیسا کہ ''نورالانوار'' میں آپ نے پڑھا، کہ اصل تو یہ ہے کہ جمع تین پر بولی جاتی ہے، اور یہ تین پورے نہیں، لیکن دو سے زائد ہیں، اس لیے توسعاً اس پر جمع کا لفظ بول دیا گیا۔ اور ان کو حج کے مہینے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حج کے افعال ان مہینوں میں شروع ہوجاتے ہیں، شوال کی پہلی تاریخ سے قبل حج کا احرام باندھنا احناف کے نزدیک مکروہ ہے، اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک وہ احرام منعقد ہی نہیں ہوتا، اُس کے ساتھ حج ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بلا کراہت حج کا احرام شوال میں باندھا

جاسکتا ہے، یکم شوال کو احرام باندھ لیں تو بلا کراہت درست ہے، تو گویا کہ ان دنوں سے حج کے احکام شروع ہو جاتے ہیں، اس لیے شوال اور ذی قعدہ کو بھی حج کے مہینے شمار کیا گیا۔ یہ تو وقت کی تعیین ہو گئی۔

دورانِ حج رَفث، فسق اور جدال کی ممانعت

پھر آگے یہ فرمایا کہ جو شخص حج کو اپنے اُوپر لازم کر لے، یعنی احرام باندھ لے، اُسے پھر اللہ تعالیٰ کا خوف کرتے ہوئے نیکی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور بُرائیوں سے بچنا چاہیے، خصوصیت کے ساتھ یہ پابندی لگادی کہ احرام کی حالت میں عورتوں کے ساتھ بے حجاب نہ ہوا کرو، اگر تو عورت کے ساتھ وقوفِ عرفہ سے پہلے جماع ہی کر لیا جائے تو آپ فقہ میں پڑھتے ہیں کہ حج باطل ہو جاتا ہے، وہ احرام کو کھول بھی نہیں سکتا، وہ حج بھی اُسی طرح سے کرنے پڑے گا، اور پھر ایک دم بطور تاوان کے بھی دینا پڑے گا، پھر اگلے سال دوبارہ حج کرنا پڑے گا، اور اگر وقوفِ عرفہ کے بعد اور حلق سے پہلے جماع کیا تو اونٹ یا گائے متعین ہے اور حج ادا ہو جائے گا، اس کی قضاء ضروری نہیں۔ اور اس سے کم درجے کی مباشرت یا اس قسم کی گفتگو کرنا بھی جنایت کے درجے میں ہے، تو اس کا ایک فرد چونکہ بہت خطرناک ہے، کہ حج ہی سرے سے باطل ہو جاتا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ذکر کر دیا، اگرچہ عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا بھی فسوق کے اندر داخل ہے، لیکن فسوق کے افراد میں سے اس کو مستقل ذکر اس لیے کر دیا کہ اس کی اہمیت زیادہ ہے، کہ اگر کوئی اس قسم کی حرکت ہو جائے تو سرے سے حج ہی باطل ہو جاتا ہے، جس کی تلافی بھی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی، دوبارہ اگلے سال کرنا پڑے گا، اور یہ احرام کو اِس سال کھول بھی نہیں سکتا، حج کر کے کھولے گا، اور پھر اگلے سال قضا بھی کرنی پڑے گی، اور ایک دَم بھی بطور تاوان کے دینا پڑے گا۔ اور فسوق کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کر دی، کہ مطلق گناہ، یعنی جو عام حالات میں گناہ ہیں احرام کی صورت میں ان سے زیادہ اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیے، یا پھر فسوق سے مراد ایسے گناہ ہیں جو احرام کی حالت میں گناہ ہو گئے، اگرچہ عام حالات میں گناہ نہیں ہیں، جیسے خوشبو لگانا، سر کا ڈھانپنا، سلے ہوئے کپڑوں کا پہننا، کسی شکاری جانور کا مارنا، اس قسم کی چیزیں جو ممنوعاتِ احرام میں ہیں، ان سے بچنا یہاں مراد ہے۔ ''فسوق نہیں'' یعنی پھر انسان کو فسق اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اور جدال کا معنی لڑائی جھگڑا، کہ آپس میں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرو، حج چونکہ ایک طویل سفر کا تقاضا کرتا ہے، اور بہت دن اِس میں لگ جاتے ہیں گھر سے نکلے ہوئے، تو اکثر و بیشتر اپنے ساتھیوں کے ساتھ معمولی معمولی چیز میں انسان اُلجھ جاتا ہے، جگہ کے بارے میں، چلنے کے بارے میں، سامان کے بارے میں، اکٹھے ہوں تو اخراجات کے بارے میں کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا ہی رہتا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ممانعت کر دی کہ ان حج کے ایام میں جس وقت آپ نے اپنے اُوپر حج کو لازم کر لیا ہے تو جدال سے بچنا چاہیے۔ اور جیسے بعض روایات میں ہے کہ حج مبرور اور حج مقبول وہی ہے کہ مَالَا جِدَالَ فِيهِ: جس کے اندر لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔ اور صورۃً اس کو نفی کے انداز سے ذکر کر دیا، لیکن معنی یہ نہی ہے، اور نفی کے انداز سے کسی چیز کو ذکر کر دیا جائے تو اس میں بچنے کی زیادہ تاکید ہوتی ہے، گویا کہ ایامِ حج میں ان چیزوں کا وجود ہی نہیں ہے، ایسے طور پر رہنا چاہیے کہ سرے سے ان کا وجود ہی نہ ہو۔ ویسے نہی کا ترجمہ میں نے آپ کے سامنے کر دیا، کہ جو شخص ان مہینوں میں

حج کولازم کرلے اُسے رفث نہیں کرنا چاہیے، فسوق نہیں اختیار کرنا چاہیے، اور جدال نہیں اختیار کرنا چاہیے ایامِ حج میں۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ: اِس میں خیر کی ترغیب دے دی کہ جو بھی اچھا کام کرو اللہ اُس کو جانتا ہے، اُس کی اللہ تعالیٰ تمہیں جزا دے گا۔

''وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ'' کا شانِ نزول اور توکّل کا مفہوم

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى: اس آیت کے شانِ نزول میں یہ لکھا ہے کہ یمنی لوگ (خاص طور پر اہل یمن کا ذکر کیا ہے) حج کرنے کے لئے جایا کرتے تھے تو اپنے ساتھ خرچ اخراجات نہیں لے کر جاتے تھے، خالی ہاتھ گھر سے چلتے، اور وہ کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، اس لیے ہم ظاہری طور پر خرچ لے کر نہیں جاتے، لیکن جس وقت آگے جاتے تو لوگوں کو پریشان کرتے، اُن کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے، گداگری کرتے، خود بھی پریشان ہوتے اور اُن کو بھی پریشان کرتے، یا تو اِس درجے کا توکل ہو کہ پھر فاقہ پیاس بھوک جو کچھ ہو اُس کو برداشت کرے، اللہ کی جانب سے کچھ آ گیا تو کھالیا، ورنہ پھر بھوک پیاس کو برداشت کریں، اگر اِس درجے کا کوئی شخص ہو تو وہ اگر ظاہری اسباب کو ترک کردے تو کسی درجے میں اُس کے لئے جائز بھی ہے، ورنہ اگر یہ مقام کسی کو حاصل نہیں تو اُس کے لئے ظاہری اسباب کا ترک کرنا جائز نہیں ہے، اُس کو ظاہری اسباب اختیار کرنے چاہئیں، اور توکل کا درجہ یہ ہے کہ ظاہری اسباب اختیار کرنے کے باوجود بھروسہ اللہ پہ ہو، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے طور پر جو ہم سے ہو سکا تھا کرلیا، باقی ہماری ضرورت اور حاجت پوری کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، اِن اسباب پر اعتماد نہیں ہونا چاہیے، نظر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت پہ ہو، اُسی کی کارسازی پہ ہو، اپنے اسباب پر اعتماد نہ کیا جائے۔ جیسے ایک آدمی بیمار ہو گیا، اِس بیماری کے ازالے کے لئے مقدور بھر وہ کوشش کرے، اطباء سے مشورہ کرے، ڈاکٹروں سے مشورہ کرے، اُن کے مشورے کے ساتھ اچھی سے اچھی دوا لے لیکن اُس کا یقین یہی ہو کہ اگر اللہ کی طرف سے شفا منظور ہے تو ہو گی، اور اگر اللہ کو شفا منظور نہیں ہے تو یہ ڈاکٹر طبیب اور یہ دوائیاں کچھ نہیں کرسکتیں، اور اگر کوئی شخص اِس کو چھوڑ کر بیٹھ جائے کہ میں دوا کروں گا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں شفا ہے، اگر قسمت میں ہوئی تو مل جائے گی، نہیں تو نہ سہی، ایسا کرنا اُس شخص کے لئے جائز ہے جو قوی القلب ہے، کہ کل کو پھر اُس کی زبان پر کوئی شکوہ شکایت نہ آئے، پھر جو حال آئے اُس کو صبر اور سکون کے ساتھ برداشت کرتا چلا جائے، ایسے شخص کے لئے تو ترکِ اسباب جائز ہے، اور کمزور قلب والے کے لئے کہ جس کا پتہ ہے کہ کل کو تکلیف اگر بڑھ گئی تو شکوہ شکایت اور جزع فزع پہ اُتر آئے گا ایسے شخص کو چاہیے کہ ظاہری اسباب کا سہارا لیے رکھے، ظاہری اسباب اختیار کرے، لیکن دل سے اُس کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، یہ سمجھے کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے، طبیب کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے، دوائیوں کے اندر یہ تاثیر نہیں، جو کچھ نمایاں ہو گا سب اللہ کی قدرت اور اس کے حکم کے تحت ہو گا۔ قلبی کیفیت یہ ہو اور ظاہری اسباب اختیار کیے جائیں تو پھر یہ شخص ظاہر اور باطن کا جامع ہو جائے گا اور اس کی حالت عین سنت کے مطابق ہے، اور یہ صحیح مؤمن ہے کہ ظاہری اسباب کے ساتھ بھی وہ التباس اور اختلاط رکھتا ہے، لیکن اس کا قلب اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اِن اسباب کے اندر اثر پیدا کرنا اللہ کی شان ہے، باقی! انسان چونکہ کمزور ہے تو اُس کو ظاہری اسباب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تو وہ یمنی اِس طرح سے کرتے کہ زاد لے کر نہ جاتے،

پھر سوال کرتے، خود پریشان ہوتے اور دوسروں کو پریشان کرتے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُن کو یہ ہدایت دی گئی کہ تمہارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں، جب گھر سے چلو تو اپنے سفر کے اخراجات لے کر چلو، اور اس کا فائدہ تمہیں یہ پہنچے گا کہ گداگری اور سوال سے بچ جاؤ گے۔ اب بھی اسی طرح ہے کہ جن کے پاس خرچ وسعت کا ہوتا ہے وہ اپنا وقت اطمینان کے ساتھ گزار لیں گے، اور جن کے پاس خرچ وسعت کا نہیں ہوتا، اپنی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، وہ پھر یقیناً وقت پر پریشان ہوتے ہیں۔ یہ مطلب تو ہوگیا شانِ نزول کی طرف دیکھتے ہوئے، اور یہی مطلب زیادہ صحیح ہے، اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ترجمے کے اندر یہی مطلب لیا ہے ''اور زادِراہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر فائدہ زادِراہ کا بچنا ہے سوال سے''، اور ''بیان القرآن'' میں بھی یہی تفسیر اختیار کی گئی ہے۔

بہترین زادِراہ تقویٰ ہے

اور بعض عربی تفاسیر میں دوسرا مطلب بھی لیا گیا ہے کہ تقویٰ سے تقویٰ من اللہ مراد ہے، تو پھر معنیٰ یہ ہوگا تزوّدوا التقوٰی گھر سے جب چلا کرو تو اپنے پاس تقوے کا زاد لے کر چلا کرو، تقوے کے لئے زاد کا لفظ حدیث شریف میں بولا گیا ہے، ایک شخص سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا، جا کر کہنے لگا کہ یا رسول اللہ! میں سفر پر جا رہا ہوں زَوِّدْنِیْ آپ مجھے کوئی زاد دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''زَوَّدَكَ اللهُ التَّقْوٰى''[1] اللہ تعالیٰ تجھے تقوے کا زاد دے، یعنی اس نے اپنے سفر کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا طلب کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے لئے یہی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تجھے تقوے کا زاد دے، یعنی جب تو جائے تو تقوے کا سامان تیرے ساتھ ہو۔ اِسی طرح یہاں مراد یہ لے لیا جائے کہ جب چلو تو تقوے کی صفت حاصل کر کے چلو، اور بہترین زاد جس کو انسان اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے وہ تقویٰ ہے، کیونکہ تقویٰ کی صفت اپنے پاس ہوگی تو گناہوں سے بچنا آسان ہوگا اور نیکی کرنی آسان ہوگی۔ کیونکہ حج کا سفر اتنا لمبا اور اتنا کٹھن ہوتا ہے اور اتنے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں، اس کے ساتھ اگر تقویٰ انسان کے پاس نہ ہو تو یہ سفر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، اس لیے گھر سے چلو تو تقوے کی دولت ساتھ لے کے چلو۔ ''اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرتے رہو'' ڈرنا ہی عقل کا تقاضا ہے، کیونکہ عقل کا تقاضا ہے کہ نفع کی چیز حاصل کی جائے، نقصان سے بچا جائے، اور اللہ تعالیٰ کا خوف انسان کے لئے نفع کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور نقصان سے بچنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دورانِ حج تجارت کی اجازت

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ: اِس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ حج کے سفر میں تجارت وغیرہ کر کے کوئی چیز کما لینا، محنت مزدوری کر کے یا تجارت کر کے رزق حاصل کر لینا، یہ بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جاہلیت میں حج تو لوگ کرتے تھے، لیکن اس حج کو انہوں نے ایک قسم کا میلہ اور منڈی بنا لیا تھا، جاتے، حج کی رسوم بھی ادا کرتے، اور اس کے ساتھ ساتھ میلے لگتے، خرید وفروخت ہوتی، جس طرح عام جشن ہوا کرتے ہیں، اس میں وہ اپنے نفع بھی حاصل کرتے، اور پھر شعراء کی مجلسیں لگتیں، خاندانی مفاخرت ہوتی، اپنے ماں باپ کی تعریف کر کے اور اپنے آباء واجداد کی تعریف کر کے دوسروں کے مقابلے میں فخر کیا

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۸۲ باب ما یقول اذا ودع انسانا / مشکوٰۃ ص ۲۱۴، عن انس رضی اللہ عنہ، باب الدعوات، فصل ثانی۔

جاتا، اس قسم کے مقابلے اور مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم آ گیا کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہونی چاہیے اور اس کے اندر دنیا کی آمیزش نہ ہو، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب ہم حج کے لئے جایا کریں گے تو اس کے اندر تجارت مزدوری کرنا بھی پھر جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اگر یہ کمانے کا کوئی دھندا ساتھ کر لیا جائے تو یہ عبادت اور سفر خالص اللہ کے لئے نہیں رہے گا۔ اس لیے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے یہ بات آئی کہ حج کے سفر میں مزدوری کر کے یا کسی دوسرے طریقے سے اپنے لیے رزق کا کمانا درست ہے یا نہیں؟۔ خصوصیت کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ ہماری یہ عادت تھی کہ ہم اونٹ کرائے پر دیا کرتے تھے، اور لوگ حج کے دنوں میں بھی ہم سے اونٹ کرائے پہ لے لیتے، اور ہم اُن کے ساتھ چلتے اپنے اونٹوں کو سنبھالنے کے لئے، تو حج کی نیت بھی کر لیتے، اور اس سے ہمیں کچھ معاشی فوائد بھی حاصل ہو جاتے، تو یہ ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں؟۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہی سوال ایک شخص نے حضور ﷺ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اُتر آئی، تو آپ ﷺ نے اُسے بلا کر کہا کہ بھائی! تمہارے لیے جائز ہے کہ تم اپنے اونٹ کرائے پر بھی دے دیا کرو، اور تمہارا حج بھی درست ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایامِ حج میں کوئی شخص جائز طریقے سے مزدوری کرتا ہے یا کوئی تجارت کرتا ہے اور اس طرح سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت ہے، اور یہ گناہ نہیں ہے۔

حج میں تجارت کو مقصود نہیں بنانا چاہیے

باقی رہی یہ بات کہ پھر اس حج کے اندر خلوص میں بھی فرق آئے گا یا نہیں؟ اس عبادت میں نقص بھی آئے گا یا نہیں؟، اُس کا مدار نیت پر ہے، اگر تو حاجی صاحب گئے ہی اس لیے ہیں کہ وہاں جا کر کوئی بلیک کریں گے، یہاں سے بلیک کی چیزیں لے گئے، جیسے چرس، بھنگ، یا کوئی اور چیز لے گئے، کہ وہاں جا کر بیچ کے نفع کمائیں گے، اور وہاں سے سمگلنگ کا سامان لے آئے، جیسے کپڑا اور دوسری چیزیں، کہ اِدھر لا کر مہنگی بیچیں گے، اور ایک ہی سفر میں اپنے سال کے اخراجات پورے کر لیں گے، پھر تو مقصود تجارت ہوئی، حج مقصود نہیں ہے، ایسی صورت میں اُس کو ثواب نہیں ملے گا۔ اور اگر گیا تو اصل حج کے لئے ہے، کہ اگر اس نے حج نہ کرنا ہوتا تو یہ مکہ معظمہ کا سفر اختیار نہ کرتا، تجارت اس کو مقصود نہیں ہے، لیکن چونکہ جا رہا ہے، اس لیے وہ خیال کرے کہ کچھ تنگی ہے، چلو تجارت کر کے کچھ کماتا رہوں گا، جس طرح سے نائی اپنے اوزار ساتھ لے جاتے ہیں، وہاں حج بھی کرتے ہیں اور حجامتیں کر کر کے اپنے اخراجات بھی مہیا کر لیتے ہیں، اور اسی قسم کے کام کرنے والے دوسرے لوگ۔ اگر اصل مقصود حج ہو، کہ اگر حج نہ کرنا ہوتا تو یہ طویل سفر اختیار نہ کرتے، تو اس صورت میں اِن کے لئے محنت مزدوری کر کے کمانا اور اس طرح سے اپنی معاشی ضروریات پوری کر لینا بالکل جائز ہے اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو یہ فرق نیت کے اعتبار سے ہوگا کہ ثواب ملے گا یا نہیں، اور اس تجارت کی نیت کے ساتھ حج میں نقص آئے گا یا نہیں، اگر اصل مقصود تجارت ہے اور حج محض بہانہ ہے تو پھر حج کا کوئی ثواب نہیں، اور اگر اصل مقصود حج

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب المناسک، باب الکری ج ۱ ص ۲۴۴۔

ہے اور تجارت ضمنی طور پر انسان اختیار کرلے اپنی معاشیات پوری کرنے کے لئے تو اِس میں کوئی حرج نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ: تم پر کوئی کسی قسم کا گناہ نہیں اِس بات میں کہ تم طلب کرلو اللہ کا فضل۔ رزقِ حلال کو ہمیشہ فَضْلًا مِّن رَّبِّ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کہ یہ بہت بڑا اللہ کا فضل ہے کہ کسی کو رزقِ حلال مل جائے، جہاں بھی قرآنِ کریم کے اندر ذکر کیا گیا اُس کو فضل کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، سورۂ جمعہ کے دوسرے رکوع میں بھی آپ پڑھیں گے، فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ، وہاں بھی فضل اللہ کے ساتھ ہی اِس کو تعبیر کیا ہے۔

وقوفِ عرفہ کی اہمیت

فَإِذَآ أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ: اور جب تم عرفات سے لوٹو، حج اصل کے اندر عرفہ میں ہوتا ہے، وقوفِ عرفہ حج کا اعظم رکن ہے، اس لیے اگر کوئی شخص عرفات میں وقوف نہ کرسکے تو اُس کی کوئی تلافی نہیں، اُس کا حج فوت ہوگیا، اور عرفات میں وقوف نو تاریخ کو زوالِ شمس کے بعد غروبِ شمس تک ہوتا ہے (یہ وقتِ وجوب ہے، اور وقتِ جواز اگلے دن کی طلوعِ فجر تک ہے۔ ناقل) اِس وقت میں عرفات کے اندر جانا ضروری ہے، اور پھر وہاں سے جب لوٹتے ہیں تو اگلی رات مزدلفہ میں گزرتی ہے، تو مزدلفہ میں ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو، اور اللہ کو یاد کرنے میں ایک متعین صورت یہ بھی ہے کہ مغرب اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں اکٹھی پڑھی جاتی ہے جیسے عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت میں کٹھی پڑھی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یاد اس طرح کرو جس طرح اس نے طریقہ سمجھایا ہے

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ: اور یاد اُس طرح سے کرو جیسے اللہ نے طریقہ بتایا، یہ عبادت کا معیار ہے، صحیح عبادت وہی ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، جاہلیت میں بھی لوگ عبادت کرتے تھے، لیکن انہوں نے اُن عبادتوں کے طریقے اور اُن کی شکل وصورت اپنی مرضی سے بنالی تھی، اوقات کی تعیین اور ہیئت وغیرہ سب اپنے خیال کے مطابق اختیار کرتے تھے، جس طرح جی میں آتا تو سمجھتے کہ اللہ کو یاد کرنے کا اور اللہ کی عبادت کا یہی طریقہ ہے، اور اسلام نے اس بات پر پابندی لگادی کہ اللہ کی عبادت تم اپنی مرضی سے نہیں کرسکتے، اُس کی کوئی شکل وصورت اور اُس کے لئے کوئی قید اور کوئی شرط اپنی مرضی کے ساتھ نہیں لگائی جاسکتی، اس قسم کی شرطیں اپنے طور پر بنالینا، جس طرح سے کل آپ کی خدمت میں تفصیل کرتے ہوئے عرض کیا تھا، کہ وقت کی تعیین کرلی جائے یا کوئی اور شکل صورت متعین کرلی جائے، اور اُس کو ضروری سمجھ لیا جائے، کہ اس کے بغیر یہ عبادت ہوگی ہی نہیں، یہ سب جاہلیت ہے، اللہ تعالیٰ کو یاد اُس طرح سے کرنا چاہیے جس طرح سے اللہ نے بتایا، جو طریقہ بتایا ہے اُس کے مطابق یاد کرو گے تو یہ یاد کرنا صحیح سمجھا جائے گا، اور تبھی جا کر اِس ذکر کے فوائد حاصل ہوں گے، اپنی مرضی کے ساتھ حدود وقیود نہیں لگانی چاہئیں، عبادت کے اندر اپنی طرف سے حدود قیود لگانا تغییر شرع ہے، جس کی وجہ سے اُس کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا ہوجاتا ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تاکید کردی کہ اللہ کو اس طرح سے یاد کرو جیسے اس نے طریقہ بتایا، اگر اُس طریقے کے مطابق یاد کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ذکر مقبول ہوگا، اور اگر اُس کے مطابق یاد نہیں کرو گے تو چاہے تم عبادت میں کتنی ہی محنت اٹھالو اور ریاضت کرلو

لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ عمل قبول نہیں ہوگا۔ وجہ اُس کی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز پسند نہیں یہ اصل میں منصبِ نبوّت ہے کہ وہ بیان کرے، اور جو شخص اپنے طور پر تجویز کرلے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، تو گویا کہ درپردہ وہ نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے، اس لیے شریعت میں بدعت کی مذمت زیادہ آئی ہے۔ اور اس مسئلے کی پچھلے سبق میں بھی وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا کے تحت کچھ وضاحت ہوگئی تھی۔

عرفات سے ہوکر مزدلفہ آنے کی ہدایت

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ: پھر لوٹو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں قریش چونکہ اپنے آپ کو بیت اللہ کا مجاور قرار دیتے تھے، تو اس مجاورت کی بناء پر انہوں نے باقی لوگوں سے یہ امتیاز اختیار کر رکھا تھا کہ جب وہ حج کرنے کے لئے جاتے تو مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے، عرفات کی طرف نہیں جاتے تھے، کیونکہ میدانِ عرفہ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ حرم کے اندر ہے، اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم جب بیت اللہ کے مجاور ہیں تو ہمارا حج حرم کے اندر ہی ہوگا، ہم حرم سے باہر کیوں جائیں۔ اور دوسرے لوگ عرفات میں جاتے تھے، اور وہاں سے ہوکر واپس لوٹتے تھے، اور عرفہ کا وقوف حج کا اعظم رکن ہے، جس کے فوت ہوجانے کی صورت میں تلافی بھی نہیں ہوسکتی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں سرورِ کائنات ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ جہاں سے لوگ لوٹا کرتے ہیں، یعنی عرفات میں سے ہوکر مزدلفہ آتے ہیں، اسی طرح آپ بھی وہیں سے لوٹیں جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں، چنانچہ جب حجۃ الوداع کے لئے سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے گئے تو قریش کا خیال یہی تھا کہ پہلے رواج کے مطابق حضور ﷺ بھی مزدلفہ میں ہی ٹھہر جائیں گے، لیکن آپ ﷺ عرفات میں گئے اور عرفات میں جا کر وقوف اختیار کیا، ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت میں پڑھی، وہاں سے ہوکر پھر آپ ﷺ مزدلفہ کی طرف لوٹے، ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ کا یہی معنیٰ ہے، وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ: اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو، اُس سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اَحکامِ حج کی تکمیل پر منیٰ میں شدّت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے کا حکم

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ: جس وقت تم اپنے حج کے احکام پورے کرلو۔ مناسک: احکامِ حج۔ جیسے پہلے بھی یہ لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں آیا تھا: أَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرۃ:۱۲۸) ہمیں ہمارے حج کے طریقے بتا، حج کے احکام بتا، تو یہاں مناسک سے وہی حج کے احکام مراد ہیں، یہ مَنْسِك کی جمع ہے، "حج کے احکام پورے کرلو" یعنی وقوفِ عرفہ بھی ہوگیا، وقوفِ مزدلفہ بھی ہوگیا، اور اس کے بعد دس تاریخ کو جمرۂ عقبہ کی رمی بھی ہوگئی، قربانی بھی کرلی، سر بھی منڈالیا، اور طوافِ زیارت بھی کرلیا، اب یہ حج کے احکام پورے ہوگئے۔ اس کے بعد پھر جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ منیٰ کے اندر ٹھہرا کرتے تھے، اور اُس میں ان کے میلے لگتے، منڈی لگتی، مشاعرے ہوتے، ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاخرت کرتے، ہر قبیلے والے کا زور لگتا کہ اپنے اکابر کے مناقب اور مفاخر بیان کرکے دوسرے کے مقابلے میں برتری حاصل کی جائے۔ تو دو یا تین دن ان کا اسی قسم کا چرچا رہتا تھا، ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر، شعروشاعری، خریدوفروخت، میلے جس طرح سے ہوا کرتے ہیں، یوں یہ منیٰ کے اندر جشن مناتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ حج کے اِن احکام سے فارغ ہو جانے کے بعد پھر منیٰ کے اندر ٹھہرو، اور وہاں پھر اللہ تعالیٰ کو اُسی طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے آباء کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرنا۔ ''جس طرح سے تم اپنے آباء کو یاد کرتے تھے'' اس لفظ کے اندر زور یہی ہے کہ وہ لوگ اپنا پوری طرح سے زور لگا کر اور پوری قوت صرف کر کے اپنے آباء کے مفاخر بیان کرتے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرتے، اب اِن دنوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہیے جیسے آباء کو یاد کیا جاتا تھا، یعنی پورے شغف کے ساتھ، پوری مشغولیت کے ساتھ، اور کامل توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اُس طرح یاد کرو، بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت یاد کرو۔

صرف دُنیا کے طالب

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ: اب یہاں اللہ کو یاد کرنے کے تذکرے کے بعد لوگوں کی دو قسمیں ذکر کر دیں، کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اپنی عبادت میں اور اللہ کو یاد کرنے میں اُن کا مقصود صرف دنیا ہوتی ہے، اور آخرت کے متعلق اُن کا عقیدہ نہیں ہوتا، یا آخرت کی اُن میں طلب نہیں ہوتی، اس لیے جو وہ دعا کریں اور جو عبادت کریں اُن کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر ہمیں اولاد دے دے، مال دے دے، جائیداد دے دے، عزت دے دے، جاہ دے دے، اِس قسم کے ان کے مقصود ہوا کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو اپنی عبادت اور ذکر سے صرف دنیا چاہتے ہیں اُن کو دنیا میں ہم دیں گے، اور کتنا دیں گے؟ جتنا ہم چاہیں گے، کیا ہر مانگنے والے کو دیں گے؟ ایسا نہیں، جس کو چاہیں گے دیں گے مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ (سورۂ اسراء:۱۸) جو چاہیں گے دیں گے، جس کو چاہیں گے دیں گے، اس لیے دنیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ جو کوئی مانگے اُس کو مل جائے اور جتنی مانگے اُس کو مل جائے، یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت نہیں رکھی، دنیا کی تقسیم اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مشیت پہ رکھی ہے، اس لیے جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ اگر کوئی اپنا منتہائے مقصود اِسی کو بنالے تو اُس کی کوشش ضائع جاتی ہے، دنیا کے اندر جو مقدر ہے اُس کو ملتا ہے، اور پھر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا: مَنۡ لفظوں میں مفرد ہے، اس لیے يَقُوۡلُ کی ضمیر مفرد لوٹی، مصداق اس کا جمع ہے، لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں۔ اٰتِنَا کا مفعول یہاں محذوف کر دیا گیا، کوئی چیز متعین ذکر نہیں کی گئی، کیا دے دے، جو اُن کو مطلوب ہے، عزت ہے، مال ہے، دولت ہے، اولاد ہے، صحت ہے، جو بھی اُن کو مطلوب ہے وہ اٰتِنَا کا مفعول ہے۔ وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ: ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اُس کی نیکی کا جو ثمرہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو منظور ہوگا دنیا کی شکل میں اُسے دنیا میں مل جائے گا، اور آخرت میں اس کا عمل بیکار جائے گا۔

دُنیا وآخرت میں اچھائی کے طالب، اور اچھائی کا مصداق

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ: اور ان لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں، جمع کے طور پر اگر ترجمہ کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے،

کیونکہ مَنْ کا مصداق کوئی ایک متعین نہیں، اور ظاہر کی رعایت رکھتے ہوئے مفرد کے طور پر ترجمہ کیا جائے کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے، دونوں طرح سے بات درست ہے۔ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں حسنہ دے دے، اور آخرت میں حسنہ دے دے'' یہاں اٰتِنَا کا مفعول حَسَنَةً ذکر کر دیا گیا، حَسَنَةً کا معنیٰ خوبی، اچھی حالت۔ اب خوبی اور اچھی حالت کا مصداق کیا ہے؟ وہ اللہ کے علم میں ہے، اگر ہمارے لیے اچھی حالت یہ ہے کہ ہمیں اولاد ملے تو اللہ ہمیں اولاد دے دے، اور اگر ہمارے لیے اچھی حالت یہ ہے کہ اولاد نہ ملے تو اللہ تعالیٰ اولاد سے محروم کر دے، اگر ہمارے لیے اچھا یہ ہے کہ مال کثرت سے ملے تو اللہ تعالیٰ مال دے دے، اگر ہمارے لیے اچھا یہ ہے کہ ہمیں مال کم ملے اور فاقہ نصیب ہو تو اللہ تعالیٰ ہمیں وہ حالت دے دے، صحت مفید ہے تو صحت دے دے، عافیت، صحت، علم، عمل، عزت، راحت، جو کچھ بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز کو حسنہ قرار دیں، ہمارے حق میں دنیا کے اندر بھلائی کی شکل میں جو مفید ہو وہ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا کر دے، اس لیے حَسَنَةً کا مصداق کوئی ایک متعین نہیں، بلکہ اللہ کے علم میں ہمارے لیے جو بھی حالت اچھی ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً کے تحت وہ مانگی گئی ہے۔ اور آخرت کی حسنہ تو متعین ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات دے دے، اپنی رضا نصیب فرمائے، اور جنت کے اندر داخلہ نصیب ہو جائے۔ اور وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ کو اہتمام کے ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لے۔

مختلف خصوصیت کی حامل اور جامع دُعا

تو یہ دُعا بہت جامع دُعا ہے جس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی گئی ہے، سرورِ کائنات ﷺ یہ دُعا کثرت سے پڑھا کرتے تھے[1] اور طواف کی حالت میں اس کا پڑھنا مستحب ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ستر فرشتے متعین ہیں، جو شخص وہاں یہ دُعا کرتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ تو فرشتے اُس پر آمین کہتے ہیں۔[2] تو دُنیا اور آخرت دونوں کی خیر کو یہ دُعا جامع ہے۔ بلکہ بعض حضرات نے اُن کتابوں میں جو عملیات کے بارے میں لکھی ہوئی ہیں تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اِس دُعا کو پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیک بیوی دیتے ہیں، وہ عَذَابَ النَّارِ سے اس کا استنباط کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے، کیونکہ دُنیا کے اندر بُری بیوی کا مل جانا بھی جہنم ہے۔ جیسے ہمارے شیخ سعدی رحمہ اللہ کا واسطہ کسی ایسی عورت سے پڑ گیا تھا جس نے انہیں بہت زیادہ پریشان کیا، تو وہ اسی چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے (گلستاں، باب ۲، حکایت ۳۱ میں) فرماتے ہیں کہ:

زنِ بد در سرائے مردِ نکو ... ہم دریں عالم است دوزخِ او

زینہار از قرینِ بد زنہار ... وَقِنَا رَبَّنَا عذابَ النَّار

بُری عورت سے خدا کی پناہ، بُری عورت سے خدا کی پناہ، اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچانا، گویا کہ حضرتِ شیخ نے یہ تاثر دیا کہ دُنیا کے اندر بُری بیوی کا ملنا ایسے ہی ہے جیسے دُنیا کے اندر انسان جہنم میں داخل ہو گیا۔ اس لیے آپ حضرات میں سے جن کی

(۱) بخاری ۲/۹۴۵، کتاب الدعوات، باب قول النبی ربنا اٰتنا الخ/ مشکوۃ ۱/۲۱۸، باب جامع الدعاء، فصل اول

(۲) ابن ماجہ ص ۲۱۲ باب فضل الطواف/ مشکوۃ ۱/۲۲۸، باب دخول مکہ کا آخر۔

شادی نہیں ہوئی وہ کثرت کے ساتھ اس دُعا کو پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نیک بیوی عطا کردیں گے، اور جن کی شادی ہوچکی ہے وہ بھی اگر اس کو پڑھتے رہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی بیویوں کو بھی نیک کردیں گے۔

قرآن وحدیث میں موجود دُعائیں قبولیت کے زیادہ قریب ہیں

بہرحال جو دُعائیں قرآنِ کریم میں آئی ہوئی ہیں یا حدیث شریف میں جن کا ذکر صراحتاً آیا ہوا ہے ان دُعاؤں کا پڑھنا قبولیت کی طرف زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ ایک حاکم ہے جس کے سامنے آپ درخواست دینا چاہتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ آپ اپنے طور پر درخواست کا ایک مضمون تجویز کریں، اُس میں ہوسکتا ہے کہ آپ کسی لفظ میں کمی بیشی کرلیں، کوئی ایسا لفظ لکھ دیں جو حاکم کے مزاج کے مطابق نہیں ہے، یا کوئی اس قسم کا لفظ چھوٹ جائے جس کے ساتھ آپ کا مقصد پوری طرح سے واضح نہ ہو، تو وہ درخواست رَدّ ہوجائے، یا وہ پوری طرح سے آپ کے مقصد کے مطابق نہ ہو، یہ اِمکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ اُس حاکم سے پوچھ لیں جس کو آپ نے درخواست دینی ہے، کہ میں فلاں چیز چاہتا ہوں، اُس کے لئے درخواست کس طرح سے لکھوں؟ اور وہ حاکم خود آپ کو اُس درخواست کا مضمون بتادے، تو جس وقت وہ حاکم آپ کو اُس درخواست کا مضمون بتائے گا اور یہ کہے گا کہ میرے پاس درخواست لاؤ اور اس طرح سے لکھ کر لاؤ اور اس میں یہ مضمون ہونا چاہیے، جب آپ وہ مضمون لکھ کر لے جائیں گے تو پھر وہ درخواست کسی ایسے نکتے کی وجہ سے رَدّ نہیں ہوگی کہ فلاں لفظ کیوں لکھا؟ یا فلاں کیوں نہیں لکھا؟ پھر یہ تو ہوسکتا ہے کہ جو چیز آپ نے مانگی ہے وہ آپ کے لئے مصلحت اور حکمت نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ وہی دے دیں، یا کوئی اور دے دیں، یا اُس کے بدلے میں کوئی آپ سے نقصان ٹال دیں، ایسا تو ہوسکتا ہے، لیکن درخواست کے مضمون کی بناء پر اُس درخواست کو رَدّ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ہمیشہ دُعائیں وہی پڑھنی چاہئیں جو قرآن اور حدیث کے اندر آئی ہوئی ہیں، یہ موجبِ برکت ہیں، اور اُن کے اندر کسی قسم کا کوئی نقصان کا پہلو نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دُنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب فرمائے، اور دُنیا اور آخرت میں اپنی رضا نصیب فرمائے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا: جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کو ملے گا، وہ اِن کا نصیب ہے۔

بُروں کے لئے وعید اور نیکوں کے لئے بشارت اور ترغیب

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں، اِس میں بُروں کے لئے وعید ہوتی ہے، نیکوں کے لئے بشارت ہوتی ہے، کہ بُرے یہ نہ سمجھیں کہ آخرت بہت دور ہے، جس وقت تک آخرت نہیں آتی اُس وقت تک تو عیش اڑالیں، اللہ کے عذاب کو یہ دُور نہ سمجھیں، اللہ تعالیٰ بہت جلدی حساب لینے والا ہے، پتہ نہیں موت کس وقت آجائے گی؟ موت سر پہ کھڑی ہے، بس مرے اور اللہ کے حساب میں آئے، اُسی وقت ہی سزا شروع ہوجائے گی، سمجھو کہ جلدی سامنے آنے والی بات ہے۔ اور نیک لوگ جو نیکیاں کرنے والے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ معاملہ بہت اُدھار کا ہے، پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد یہ جزا ملے گی، ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں، اور اِس کا نتیجہ تمہارے سامنے بہت جلدی آجائے گا، عمل اور جزا میں جتنا بھی درمیان میں

تمہیں فاصلہ نظر آ رہا ہے لیکن جس وقت تم اس جزا کے پاس پہنچو گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے مزدوری مل گئی، یہ درمیان کے فاصلے سب سمٹ جائیں گے، اللہ تعالیٰ بہت جلدی اِس کا حساب کردے گا۔ تو اِس میں دونوں پہلو ہوا کرتے ہیں، بُروں کے لئے وعید بھی ہے اور اچھوں کے لئے اِس میں بشارت بھی ہے اور ترغیب بھی ہے۔

قیامِ منیٰ کے دنوں کے متعلّق وضاحت

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ مَّعْدُوْدٰتٍ کا معنیٰ گنے ہوئے دن، چند گنے ہوئے دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہا کرو، اِس سے وہی ایامِ منیٰ مراد ہیں، جو معدود ہیں، دو یا تین۔ اب آگے بھی ایک خیال کی اصلاح کرنی مقصود ہے، کہ جاہلیت میں بھی دو قسم کے لوگ تھے، بعض کہتے تھے کہ منیٰ میں دو دن ہی ٹھہرنا چاہیے، تیسرے دن ٹھہرنا گناہ ہے، بعض کہتے تھے کہ تین دن ٹھہرنا چاہیے، دو دن کے بعد واپس آ جانا گناہ ہے، یعنی دونوں فریق ایک دوسرے کے عمل کو معصیت قرار دیتے تھے، جو تین دن ٹھہرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جو دو دن میں آ گیا وہ گناہ گار ہے، اور جنہوں نے دو دن کی عادت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھتے تھے کہ جو تین دن ٹھہرتے ہیں یہ گناہ گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کو واضح کر دیا، کہ اگر کوئی دو دن میں جلدی کر کے چلا جائے تو بھی اُس پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر کوئی دیر کر دے اور تیسرے دن (۱۳ ذی الحج) بھی ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، دونوں عمل ہی جائز ہیں، فی حد ذاتہٖ جائز دونوں ہیں، اگرچہ تیسرے دن ٹھہرنا افضل ہے، کہ اگر کوئی شخص دوسرے دن رمیٔ جمار کر کے سورج چھپنے سے پہلے پہلے منیٰ سے نکل آئے تو اس کے ذمے تیسرے دن کی رمی نہیں ہے، لیکن اگر دوسرے دن وہیں منیٰ میں ٹھہرا رہا اور طلوعِ فجر ہو گئی تو پھر تیسرے دن رمی کرنے سے قبل نہیں آ سکتا، پھر تیسرے دن کی رمی واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن باقی ایام کے اعتبار سے فرق صرف یہ ہے (یہ فقہی احکام ہیں، فقہ میں تفصیل آپ پڑھتے ہیں) کہ پہلے دو دنوں میں جمارِ ثلاثہ کی رمی زوالِ شمس کے بعد ہی ہوتی ہے، لیکن تیسرے دن زوالِ شمس سے پہلے بھی ادا ہو جائے گی۔ ''جو جلدی کر لے دو دن میں اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو دیر کر دے اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور یہ سب باتیں اس شخص کے لئے ہیں جو اللہ سے ڈرے'' اور جس نے اللہ سے نہیں ڈرنا اس کے لئے تو نہ کوئی قید، نہ کوئی حد، وہ جو چاہے کرتا رہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا: اور اِس بات کا یقین رکھو، یہ بات ہمیشہ تمہارے علم میں مستحضر رہنی چاہیے، کہ تم اللہ کی طرف جمع کیے جاؤ گے، جب اللہ کی طرف جمع کیے جاؤ گے تو وہاں تمہاری نیکی اور بدی کا پورا پورا حساب ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کا تصور اور یقین اور اس کا استحضار انسان کو تقویٰ اختیار کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے، اور ایسے شخص کے لئے نیکی کی رغبت ہوتی ہے، اور گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، جب یہ تصور رہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور وہاں ہمارا حساب کتاب ہوگا، نیکیوں کی جزا ملے گی، بُرائیوں کی سزا ہوگی، یہ تصور انسان کو بُرائی سے روکنے کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔

سوال:۔ اگر مقصود صرف تجارت ہو تو حج کا فرض ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب:-فرض ادا ہو جائے گا، اگرچہ آخرت میں ثواب نہیں ملے گا۔ یہ مسئلہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص ریاکاری کے ساتھ محض دکھلاوے کے لئے نماز پڑھتا ہے تو فقہی نقطۂ نظر سے اس کی نماز صحیح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا اس پر مرتب نہیں ہوگی، اگرچہ فرض ادا ہو جائے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ

لوگوں میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اُس کی بات آپ کو اچھی لگتی ہے دنیوی زندگی میں اور وہ شخص گواہ بناتا ہے

اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى

اللہ کو اُس چیز پر جو اُس کے دل میں ہے، اور وہ جھگڑے میں ضدی ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے

فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ

علاقے میں تاکہ اس میں فساد برپا کر دے اور ہلاک کردے کھیتی کو اور حیوانات کو، اللہ تعالیٰ

لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ

فساد کو پسند نہیں فرماتے ﴿۲۰۵﴾ اور جس وقت اُسے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر تو غرور اُس کو گناہ پر برانگیختہ کرتا ہے

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ

پس اُس کے لئے جہنم کافی ہے اور البتہ وہ بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۲۰۶﴾ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کھپا دیتا ہے اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی رضا

مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ

چاہنے کے لئے، اور اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ مہربانی کرنے والے ہیں ﴿۲۰۷﴾ اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں

كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

پورے پورے، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ

جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ

تمہارے پاس واضح واضح دلائل آگئے تو یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس بات کا

يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

کہ آجائے اِن کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں اور آجائیں فرشتے اور معاملہ پورا کر دیا جائے، اور امور اللہ کے طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں ﴿۲۱۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ: لوگوں میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اُس کی بات آپ کو اچھی لگتی ہے، يُعْجِبُكَ: آپ کو تعجب میں ڈالتی ہے، عُجب میں ڈالتی ہے، عجب کا لفظ خود پسندی کے معنی میں بھی آیا کرتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص عجب میں مبتلا ہے یعنی خود پسندی میں مبتلا ہے، تو يُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ کا معنی ہے کہ اُس کی بات آپ کو تعجب میں ڈالتی ہے، اس کی بات آپ کو اچھی لگتی ہے، فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دنیوی زندگی میں، اِس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کی گفتگو جو دنیوی زندگی کے بارے میں ہوتی ہے، یا اس کی گفتگو جو اس دنیا میں ہے وہ آپ کو اچھی لگتی ہے، اور آخرت میں جا کر جس وقت ظاہر ہوگا کہ اس کی یہی گفتگو نفاق پر مبنی تھی تو پھر یہ اچھی نہیں لگے گی۔ اور مَنْ چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے يُعْجِبُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے، ورنہ جتنے لوگ بھی اس قسم کے ہوں گے سب اس کا مصداق بن سکتے ہیں۔ وَيُشْهِدُ اللّٰهَ: اور وہ شخص گواہ بناتا ہے اللہ کو، عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ: اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے، وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ: خصام قتال کے وزن پر باب مفاعلہ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے، خَاصَمَ مُخَاصَمَةً خِصَامًا: آپس میں جھگڑا کرنا، تو پھر یہ لفظ خصومت کے معنی میں ہے، اَلَدُّ الْخِصَامِ کا معنی ہوگا: اَلَدُّ فِی الْخُصُوْمَةِ (نسفی)، اور اَلَدّ کہتے ہیں ضدی کو، قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے قَوْمًا لُّدًّا (سورۂ مریم: ۹۷) وہ لُدّ اَلَدّ کی جمع ہے، ضدی لوگ۔ تو یہاں معنی ہوگا ''اور وہ جھگڑے میں بہت ضدی ہے''۔ اور خصام خصم کی جمع بھی بن سکتا ہے، پھر یہ اضافت وہ ہوگی جو مِن کے مفہوم کو لیے ہوئے ہے، ''جھگڑنے والوں میں سے وہ ضدی ہے''، اس کا حاصل مفہوم ہے کہ بہت جھگڑالو ہے۔ وَاِذَا تَوَلّٰی: اور جس وقت وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے سَعٰی فِی الْاَرْضِ: کوشش کرتا ہے زمین میں لِيُفْسِدَ فِيْهَا: تاکہ وہ اُس میں فساد برپا کر دے۔ الْاَرْض سے مدینہ منورہ کا علاقہ مراد ہے۔ جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو کوشش کرتا ہے، دوڑا پھرتا ہے علاقے میں، لِيُفْسِدَ فِيْهَا: تاکہ اُس میں فساد برپا کر دے، وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ: اور ہلاک کر دے کھیتی کو اور نسل کو، نسل کا لفظ حیوانات کے لئے بولا جاتا ہے، تاکہ حیوانات کو اور کھیتی کو ہلاک کر دے، برباد کر دے، تباہ کر دے، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ: اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ: اور جس وقت اسے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ: عزۃ سے یہاں غرور مراد ہے، عزتِ نفس، ''غرور اس کو گناہ پر برانگیختہ کرتا ہے''، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ پکڑتی ہے اُس کو عزت گناہ کے ساتھ، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ عزت اس کو گناہ پر برانگیختہ کرتی ہے، فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ: پس اس کے لئے جہنم کافی ہے، وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ: اور البتہ وہ برا ٹھکانہ ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ: شریٰ یشری بیچنے کے معنی میں ہے، لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو بیچتا ہے اپنی جان کو، جو کھپا دیتا ہے اپنی جان کو، ابْتِغَآءَ

مَرْضَاتِ اللهِ: اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے۔ مَرْضَاتِ مصدر ہے رضا کے معنی میں،، اللہ کی رضا کی طلب میں کھپا دیتا ہے اپنی جان، وَاللهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ: اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والے ہیں، مہربانی کرنے والے ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً: سِلْم: طاعت، فرمانبرداری، یہ صلح کے معنی میں بھی آتا ہے اور طاعت اور فرنبرداری کے معنی بھی آتا ہے، اور یہاں طاعت اور فرمانبرداری مراد ہے، اور اسلام کا مفہوم بھی چونکہ طاعت اور فرمانبرداری ہے، اس لیے سلم کا معنی اسلام بھی کردیا جاتا ہے۔ اے ایمان والو! داخل ہوجاؤ اطاعت میں پورے پورے، داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے پورے، یعنی تمہارا کوئی جزء اور کوئی بات اسلام سے باہر نہ ہو، کامل مکمل داخل ہوجاؤ اسلام میں، تو كَآفَّةً جمیعًا کے معنی میں ہوکر ادْخُلُوْا کی ضمیر سے حال واقع ہوجائے گا، اور السِّلْمِ سے بھی حال واقع ہوسکتا ہے (نسفی، مظہری وغیرہ)، جس کا معنی یہ ہوگا کہ پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ، یہ نہیں کہ کچھ حصہ اسلام کا قبول کرو، کچھ حصہ قبول نہ کرو، بلکہ پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ، اسلام کامل اور مکمل اختیار کرو، اور پہلا مفہوم یہ تھا کہ تم کامل مکمل طریقے سے اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ: خطوات شیطان کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آچکا ہے۔ خطوات خُطْوَة کی جمع ہے، خُطْوَة اصل کے اعتبار سے تو اس فاصلے کو کہتے ہیں جو چلتے وقت دو قدموں کے درمیان میں ہوتا ہے، فُعلة مقدار کے لئے آیا کرتا ہے، خَطَا يَخْطُوْ: چلنا۔ اور خُطْوَة: چلتے وقت جو دو قدموں کے درمیان میں فاصلہ ہوتا ہے ایک دفعہ قدم اٹھانے کے بعد، جو شخص کسی دوسرے کے پیچھے چلے اور دو قدموں کے درمیان میں اُتنا فاصلہ کرتا جائے جتنا فاصلہ اس کے آگے چلنے والے کے قدموں میں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس کا قدم اُس کے قدم پر آتا چلا جائے گا، دونوں میں کامل موافقت ہوجائے گی، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ فوجی جب پریڈ کیا کرتے ہیں اور قطار میں چلتے ہیں تو دونوں کے قدموں کے درمیان فاصلہ برابر ہوتا ہے، اور قدم بالکل ایک دوسرے کے برابر اٹھتے ہیں اور برابر پڑتے ہیں، یہ کامل موافقت ہوتی ہے، اور جو ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں وہ بھی چونکہ اتنا ہی فاصلہ کیے ہوئے ہوتے ہیں تو گویا کہ اگلوں کے رفتار کے ساتھ اُن کی کامل اتباع ہوتی ہے، اس لیے کامل موافقت اور کامل اتباع کے بیان کرنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کے خطوات کا متبع ہے، تو لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کا معنی ہوگا کہ شیطان کے خطوات کی اتباع نہ کرو، یعنی اس کے نقش قدم پر نہ چلو، نقش قدم پر چلنا بھی کامل اتباع سے کنایہ ہوتا ہے، ''شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو'' اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے، مُبِيْنٌ اَبَانَ سے ہے اور یہ لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی آتا ہے، لازم آئے گا تو مبین کا معنی ہوگا واضح کرنے والا۔ متعدی آئے گا تو اس کا معنی ہوگا واضح، بَيِّن کے معنی میں، ''وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، صریح دشمن ہے''۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ: زَلَّ يَزِلُّ: پھسلنا، زَلَّة لغزش کو کہتے ہیں، جیسے زَلَّةُ الْعَالِمِ: عالم کی لغزش۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ: اگر تم پھسل گئے مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ: بعد اس کے کہ تمہارے پاس واضح واضح دلائل آگئے، کھلی کھلی باتیں آگئیں، فَاعْلَمُوْٓا: تو یقین کرلو، اَنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے، وہ تمہیں ہر طرح سے سنبھال سکتا ہے، ہر قسم کی سزا دے سکتا ہے، اور حکیم ہے، حکمت والا ہے، اس لیے فوراً گرنہ پکڑے اور کچھ مہلت دے دے تو یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، یہ نہیں کہ تمہیں پکڑے گا نہیں۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ: نَظَرَ يَنْظُرُ جس طرح سے دیکھنے کے معنی میں آتا ہے اِس میں انتظار کا مفہوم بھی ہے، نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس بات کا کہ آجائے اُن کے پاس اللہ،

فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ: غمام بادل کو کہتے ہیں، اور ظُلَلٍ ظُلَّۃٌ کی جمع ہے بمعنی سائبان، بادل کے سائبانوں میں، وَالْمَلٰٓئِكَةُ: اور آجائیں فرشتے، وَقُضِیَ الْاَمْرُ: اور معاملہ پورا کر دیا جائے، قصہ ختم کر دیا جائے، کام تمام ہوجائے، وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: امور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

اُحکامِ حج کے تذکرہ میں دوقسم کے لوگوں کا ذکر آیا تھا، ایک طالبِ دُنیا اور ایک طالبِ آخرت، طالبِ دُنیا کافر بھی ہوسکتا ہے اور منافق بھی ہوسکتا ہے، اور طالبِ آخرت مؤمن ہی ہے جس کا پیچھے ذکر آیا تھا۔ اُسی کی مناسبت سے یہاں دوقسم کے لوگ ذکر کیے جارہے ہیں، ایک وہ شخص جو دُنیوی مفاد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے حیلے بہانے اختیار کرتا ہے، اور ایک وہ شخص جس کے دل میں آخرت کے طلب ہوتی ہے اور آخرت کی طلب کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی دیتا ہے، اِنہی دو کی یہاں وضاحت کرنی مقصود ہے۔

شانِ نزول کے متعلّق اُصول

پہلی آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا، اس آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ لکھا ہے، لیکن اِس اصول کو ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ آیات شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوتیں، شانِ نزول محض اس لیے بیان کیا جاتا ہے تاکہ کسی درجے میں ایک مصداق محقق ہوجانے کے بعد الفاظِ قرآن کا سمجھنا آسان ہوجائے، کہ جب اس کا مصداق ہمارے سامنے آجائے گا تو اُن الفاظ کا مطلب سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ ورنہ آیت اپنے شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوا کرتی، جو شخص بھی اُس قسم کے احوال کا حامل ہوگا اُس پر قرآنِ کریم کے یہ الفاظ صادق آئیں گے، اور قیامت تک آنے والے حالات پر اس کا انطباق اسی طرح سے ہوتا چلا جائے گا۔

پہلی آیت کا شانِ نزول

ایک منافق تھا جس کا نام غالباً اخنس بن شریق لکھا ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں آتا، زبان کا بڑا فصیح وبلیغ تھا، بڑی چرب زبانی کرتا، سامنے بیٹھ کر بڑی محبت کا اظہار کرتا، بڑا اخلاص کو نمایاں کرتا، اور بات بات میں یوں کہتا کہ اللہ گواہ ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں میرے دل میں یہی ہے، میں آپ کے حق میں بڑا مخلص ہوں، اس طرح سے مشورے دینے کی کوشش کرتا، اور یوں سرورِ کائنات ﷺ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ مقصد اُس کا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل کر کے دُنیوی فوائد حاصل کرے، اور اس کی جو خراب اور خبیث فطرت تھی کہ باہر نکل کر فساد مچاتا تھا، کسی کی کھیتی اجاڑتا، کسی کے جانوروں کو نقصان پہنچاتا، اپنی اِس خبیث فطرت کو چھپانے کا اس نے یہ ذریعہ بنایا ہوا تھا کہ چاپلوسی اور تعریف کر کے آپ ﷺ کی مجلس میں قرب

حاصل کرتا۔ ایسے موقع پر مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ جب لوگ ہمیں دیکھیں گے کہ ہم بڑے مقرب ہیں، اول تو کوئی ہماری شکایت کرنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا، کہ اِس کی شکایت ہم جا کے کیا کریں، اِس کا تو بڑا تعلق ہے، شکایت کرنے کی کوئی جرأت نہیں کرے گا، اور اگر کوئی شکایت کرے گا بھی تو سرورِ کائنات ﷺ اُس کا اعتبار نہیں کریں گے، کہ وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے، دیکھو! اِس قسم کی باتیں میرے ساتھ کرتا ہے، وہ ایسا فساد کہاں کر سکتا ہے، اِس طرح انسان کو اپنی خباثتیں کرنے کے لئے ایک پردہ مہیا ہو جاتا ہے۔ یہ اُس کی بھی عادت تھی اور عام طور پر منافقین نے یہی رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔

منافقین جماعتی نظم میں بدترین قسم کے لوگ ہوتے ہیں

اور اس قسم کے جو لوگ ہوا کرتے ہیں وہ جماعتی نظم میں بدترین قسم کے ہوتے ہیں اور انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو وقت کا حاکم ہے، سردار ہے، مقتدیٰ ہے، پیشوا ہے، اُس کے اردگرد اگر ایسے چاپلوسی کرنے والے لوگوں کا دائرہ ہو جائے، جو اُس تحریک اور اُس جماعت کے حق میں مخلص نہ ہوں، تو وہ اپنے قائد اور اپنے لیڈر کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، کہ وہ اِن کی باتیں سن کر کچھ سمجھ رہا ہوگا اور جماعت کے اندر اردگرد سب فساد ہی فساد ہوگا، اور جس وقت اِن کا دائرہ ٹوٹے گا تو پھر پتہ چلے گا کہ کتنا نقصان ہو گیا، باقی جماعت ساری کی ساری حاکم وقت پر، قائد اور لیڈر پر بداعتماد ہوتی چلی جائے گی، اس طرح سے شیرازہ بکھر جائے گا۔ تو یوں جماعت کا پھیلاؤ رک جاتا ہے، جو مخلص کارکن ہوتے ہیں اُن کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور یہ چاپلوس اور چرب زبان قسم کے لوگ کان بھر بھر کے قائد کو مطمئن کرتے ہیں، اور جن کے ساتھ اُن کی کسی قسم کی مخالفت ہوتی ہے اُن کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں، اِس طرح یہ اپنا عارضی طور پر مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن جماعت کا نقصان ہو جاتا ہے، بداعتمادی پھیلتی ہے، بدگمانی پھیلتی ہے، نظم نہیں رہتا۔

منافقین سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

منافقین نے یہی رویہ اختیار کیا ہوا تھا، اس لیے اِس قسم کے دشمنوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو مطلع کیا ہے کہ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہیں، یہ سب دنیوی زندگی کے خواہاں ہیں، اپنے دنیوی مفاد کی خاطر آپ کے کانوں میں آ کے لگتے ہیں، اور اس طرح آپ کے کان بھرتے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے انتہائی فسادی لوگ ہیں، اِن کی کوشش یہی ہے کہ علاقے کے اندر فساد برپا رہے، کسی کے حیوانات کو نقصان پہنچاتے ہیں، کسی کی کھیتی کو نقصان پہنچاتے ہیں، ایسے لوگوں سے ذرا ہوشیار رہا کیجئے، یہ بڑے جھگڑالو قسم کے لوگ ہیں، بڑے زبان دراز ہیں، آپ کے سامنے کچھ ہیں اور پیچھے کچھ ہیں۔ اِس قسم کے لوگوں کی نشاندہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں بھی فرمائی، اور سورۂ منافقون کے اندر بھی اِن کا کچھ تذکرہ کیا ہے، سورۂ منافقون میں لفظ کچھ اس طرح سے آئے ہوئے ہیں اِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۚ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۚ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۚ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ کہ یہ خوشحال لوگ ہیں، خوش پوشاک ہیں، چہرے صاف ستھرے ہیں، جیسے پالش وغیرہ کر کے چمکے ہوئے ہوتے ہیں، تو یہ چمکتے چہروں والے اور یہ خوش پوشاک جس وقت آپ کے سامنے آتے ہیں تو تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ان کا قد قامت

اوران کے جسموں کی ظاہری ہیئت، ان کی مالش پالش کنگھی پٹی آپ کو بڑی اچھی لگتی ہے، آپ دیکھنے میں ان کو بڑے اچھے سمجھتے ہیں۔ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا: اور پھر یہ بولنے میں اتنے ہوشیار ہیں کہ جب یہ بات کرتے ہیں تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ: آپ ان کی باتوں پہ کان لگاتے ہیں، آپ کو ظاہری طور پر باتیں بڑی اچھی لگتی ہیں، لیکن ہیں یہ اس قسم کے بزدل اور کھوکھلے کہ ہمدردی کے دعوے بہت کرتے ہیں، لیکن جس وقت موقع آئے گا سب بھاگ جائیں گے، کسی وقت بھی کوئی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں، بزدل اتنے ہیں، اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں، کہ جس وقت بھی کہیں سے کوئی شور پکار اُٹھتی ہے تو اِن کے دل اندر سے دھڑکنے لگ جاتے ہیں، کہ پتہ نہیں ہمارے خلاف ہی کوئی آوازہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارے خلاف ہی کوئی شرارت پھیل رہی ہے، چونکہ مجرم ہوتے ہیں، لہٰذا کسی طرف سے بھی کوئی بات ہو تو اِن کو ڈر لگتا ہے کہ یہ ہمارے خلاف ہی تحریک چل رہی ہے اور ہمارے خلاف کوئی آواز اٹھ رہی ہے۔ تو یہ تو ایسے ہیں جیسے بے جان لکڑیاں ہوں، اور اُن کو کوئی اچھا لباس پہنا کے کوئی سہارا دے کر کھڑا کر دے، كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ: یہ تو سہارا دے کے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، اس لیے اِن کے ظاہر پر آپ نہ جائیے، هُمُ الْعَدُوُّ: یہ دشمن ہیں، فَاحْذَرْهُمْ: اِن سے بچ کے رہا کریں۔ تو اِس قسم کے افراد کو تاڑ کے رکھنا قائد کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اگر اِس قسم کے لوگوں کا دائرہ اُس کے اردگرد لگ جائے جو باتوں باتوں سے مطمئن کرنا جانتے ہیں، دل سے مخلص نہیں ہوتے، ہمدرد نہیں ہوتے، اُن کے اندر کوئی قربانی کا جذبہ نہیں ہوتا، بہادر نہیں ہوتے، بلکہ اپنی شرارتوں کو چھپانے کے لئے اور اپنی خباثتوں کو چھپانے کے لئے وہ قائد کے کانوں لگتے ہیں اور دوسروں کے متعلق بدگمانی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، بدترین قسم کے دشمن یہ ہوتے ہیں، جو جماعت کو نقصان پہنچاتے ہیں، مشن کو نقصان پہنچاتے ہیں، اور مخلص لوگوں کی دل شکنی کا باعث بنتے ہیں، تو اِس قسم کے فسادی لوگوں کی نشاندہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں فرمائی ہے۔

خبیث النفس انسان کی عادت

اور پھر اُن کا حال یہ ہے کہ اگر انہیں کوئی یہ کہہ دے کہ تم یہ شرارت نہ کرو، اس بات سے باز آجاؤ، تو اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر اُن کا غرورِ نفس اور اُن کی عزتِ نفس اُن کو مہلت نہیں دیتی کہ وہ نصیحت کرنے والوں کی نصیحت پہ کان رکھیں، بلکہ غرور میں آکر اور زیادہ شرارت کرتے ہیں، اُن کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر کسی کے کہنے سے ہم ایک دفعہ مان گئے تو ہماری کمزوری واضح ہوگی، کہ ہم اِن کے سامنے نیچے ہیں اور نصیحت کرنے والا ہم سے بالاتر ہے۔ یہ خبیث النفس انسان کی عادت ہوتی ہے کہ اگر اُس کو کوئی سمجھائے تو سمجھانے کے بعد وہ مزید ضد میں آتا ہے صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میرے مان جانے کی صورت میں میری عزت کو اور میرے غرور کو نقصان پہنچے گا، کہ لوگ کہیں گے کہ دیکھو فلاں نے اسے روکا تھا یہ رک گیا، تو روکنے والے کی برتری ثابت ہو جائے گی، اس لیے جتنا کوئی روکنے کی کوشش کرے اُس کا غرور اُس کو مزید شرارت پر برانگیختہ کرتا ہے۔

منافقین کا تکبر

اور اِسی قسم کی بات وہاں سورۂ منافقون میں بھی ہے اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ: ان سے کوئی غلطی ہو جاتی

ہے تو جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کی خدمت میں آ جاؤ اور آ کے معافی مانگ لو، اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے گا، لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ: اپنے سروں کو یوں موڑ کے چل دیتے ہیں، وَرَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ: اور تو ان کو دیکھے گا کہ تجھ سے اعراض کریں گے، وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ: اس حال میں کہ وہ تکبر کرنے والے ہوں گے۔ تو وہاں بھی اسی تکبر کی وجہ سے کہا کہ اُن کا تکبر یہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ کی خدمت میں آ کے معذرت کریں اور آپ سے یہ کہیں کہ ہم سے غلطی ہوگئی، ہمیں آپ بھی معاف کر دیجئے، اور اللہ تعالیٰ سے بھی ہمارے لیے استغفار کیجئے، اُن کا تکبر اور اُن کا غرور اُن کو یہ مہلت نہیں دیتا، تو ایسے سرکش لوگ جو باتوں باتوں میں آ کے مطمئن کرنا چاہیں اِن پر کسی صورت میں اعتماد نہ کیجئے، هُمُ الْعَدُوُّ: یہ حقیقت کے اعتبار سے دشمن ہیں۔ تو جیسے سورۂ منافقون کے اندر اِن کی یہ باتیں ذکر کر کے اُن کے بارے میں حضور ﷺ کو محتاط کیا گیا تو یہاں بھی یہی بات ہے۔

شانِ نزول خاص، لیکن مصداق عام ہے

تو چاہے یہ واقعہ ایک شخص کا ہو، لیکن اِس قسم کے سب لوگوں پر صادق آئے گا جو چرب زبانی کے ساتھ اور چاپلوسی کے ساتھ قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اندر سے مخلص نہیں ہوتے، اپنی شرارتوں کو چھپانے کے لئے قائد کے ساتھ، اپنے سردار کے ساتھ، اپنے حاکم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری شرارتیں چھپی رہیں، کوئی ہماری شکایت نہ کرے، اگر کوئی شکایت کر بھی دے گا تو یہ اعتبار نہ کریں، ایسے لوگوں پر یہ آیات صادق آئیں گی جو یہاں قرآنِ کریم کے اندر آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں، کہ "لوگوں میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کی باتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں دنیوی زندگی کے بارے میں"، یعنی اُن کی گفتگو ساری کی ساری دنیوی زندگی کے لئے ہی ہوتی ہے، دنیوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

منافق بار بار قسمیں کیوں کھاتے ہیں؟

اور پھر چونکہ عمل تو اُن کے پاس ہوتا نہیں کہ اپنے عمل کے ساتھ ثابت کر سکیں کہ ہم مخلص ہیں، اُن کی کارروائیاں اُن کے صدق کی دلیل بنیں، وہ کوئی قربانیاں دیتے ہوں، مالی قربانیاں دیتے ہوں، جانی قربانیاں دیتے ہوں، اُن کا کوئی کردار واضح ہو، جس کی وجہ سے پتہ چلے کہ جو یہ زبان سے کہتے ہیں واقعی سچی بات کہتے ہیں، ان کے دل میں بھی یہی ہے، لوگ سمجھ لیں کہ دیکھو! اِن کا عمل اِن کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ اِس سے تو وہ خالی ہوتے ہیں، اور چونکہ انہوں نے باتوں باتوں کے ساتھ ہی مطمئن کرنا ہوتا ہے، وہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں اور کردار کے غازی نہیں ہوتے، تو اپنے اس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے اور اپنی باتوں میں وزن پیدا کرنے کے لئے بات بات پہ قسم کھائیں گے (اللہ کو گواہ قرار دینا قسم سے کنایہ ہے) اگر عمل کا وزن ساتھ ہو، کہ جو انسان منہ سے کہتا ہے عملی زندگی بھی اُس کی تائید کرے، تو اپنے سچے ہونے پر قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے، آپ کہا کرتے ہیں کہ "عطر آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" عطر اپنا ثبوت خود مہیا کرتا ہے کہ میں خوشبودار ہوں، اگر عطار تعریف کر کر کے کہے کہ یہ بہت خوشبودار ہے تو اس طرح سے کوئی چیز خوشبودار ثابت ہوتی ہے؟ عطر تو وہ ہوتا ہے جو خود مہکے، عطر وہ نہیں ہوتا جس کے متعلق عطار

کہے کہ اِس میں سے خوشبوآتی ہے، یہ کہنے کی نوبت کب آئے گی کہ اس میں سے خوشبوآتی ہے؟ جب وہ خود نہ مہکتا ہو۔اسی طرح اگر انسان کا کردار مضبوط ہو، کہ جو وہ منہ سے کہتا ہے اُس کے مطابق اُس کا کردار بھی ہو،تو کیا ضرورت ہے قسمیں کھا کے اپنا اخلاص ثابت کرنے کی؟ آپ کا کردار خود بتائے گا کہ تم کتنے ہمدرد ہو کتنے مخلص ہو، کہ فلاں وقت امتحان آیا تھا تو آپ نے اپنا مال قربان کردیا،فلاں وقت ضرورت پڑی تھی تو آپ نے اپنی جان لگادی، جب یہ واقعات خودنمایاں ہوتے ہیں تو پھر اپنے صدق پر اور اپنے اخلاص پر قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔قسمیں کھانے کی نوبت تبھی آیا کرتی ہے جب کردار قول کی تائید نہ کرے،گفتار اور قسم کی ہو اور کردار اور قسم کا ہو، پھر قسمیں کھا کھا کر اس طرح سے وہ اعتماد جمانے کی کوشش کرتے ہیں، یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ میں یہی بات ہے، کہ اپنے دل کے جذبات اور اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ قرار دیتا ہے۔

منافقین جھگڑالو،فسادی اور متکبر ہوتے ہیں

یہ بہت بدترین قسم کا اور سخت قسم کا جھگڑالو ہے،اس لیے جھگڑنے میں بہت دلیر، باتیں بنانے میں بہت ہوشیار،اور اپنی بات کو جمانے اور بنانے کے لئے اِس کو بڑا سلیقہ آتا ہے۔اور جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر جاتا ہے، پیٹھ پھیر کر جاتا ہے،تو پھر اُس کی ساری کوشش علاقے میں یہی ہوتی ہے کہ یہ دین حق جو اِس علاقے کے اندر ایک اصلاح کی تحریک ہے اور اصلاح کا باعث ہے،جس کے جاری ہونے کے ساتھ شر وفساد ختم ہوتا ہے،اس دین کی مخالفت کرتا ہے،دین کی مخالفت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ علاقے میں فساد برپا کرتا ہے، کہ جس طرح سے پہلے قبائلی جنگیں تھیں،لوگ اخلاق سے آزاد تھے،خوف خدا سے آزاد تھے،قتل وغارت،ایک دوسرے کی لوٹ مار، باغوں اور کھیتیوں کو اجاڑنا،جس قسم کے حالات پہلے تھے تو اِس کی کوشش یہ ہے کہ یہی حالات پھر ہوجائیں،اور اللہ کا قانون جو نافذ ہو رہا ہے،اللہ کا دین جو آرہا ہے، جو ہر کسی کے لئے حفاظت اور اصلاح کا ذریعہ ہے،اُس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے،اور فخر وغرور میں آکر خود بھی نقصان کرتا ہے،اور اِس اسلام کی مخالفت بھی مستقل فساد کا ذریعہ ہے، جیسے اسلام کے آنے سے قبل جنگیں ہوتی تھیں،لوٹ مار ہوتی تھی،لوگوں کی کھیتیاں بھی برباد ہوتی تھیں، جانیں بھی برباد ہوتی تھیں، حیوانات بھی برباد ہوتے تھے،تو اسلام کی مخالفت گویا کہ اِسی قسم کے فساد برپا کرنے کی کوشش ہے۔''کوشش کرتا ہے علاقے میں کہ فساد برپا کردے اُس میں اور ہلاک کردے کھیتی کو اور نسل کو، اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا''اِس قسم کے لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں، جب اللہ کو پسند نہیں تو آپ کو بھی یہ لوگ پسند نہیں ہونے چاہئیں۔

منافقین پر صحبتِ نبوی کا اثر کیوں نہ ہوا؟

سوال :- منافقین حضور ﷺ کی صحبت میں بیٹھتے تھے تو ان پر اثر نہیں ہوتا تھا؟

جواب :- جی ہاں!صحبت میں بیٹھتے تھے اور صحبت کا اثر بھی بہت ہوتا ہے،اِس میں کوئی شک نہیں،لیکن سورج کا عکس آئینے پہ پڑ کے تو چمکا سکتا ہے، کالے توے پر بھی کبھی پڑتا ہوا دیکھا ہے؟ سورج کی شعاع کے ساتھ آئینہ تو چمکے گا،لیکن سیاہ توا نہیں چمکا کرتا،اس لیے جب تک صحبت میں بیٹھنے والے کے اندر اثر کو قبول کرنے کا جذبہ نہ ہو اور وہ دل کے دروازے کھول کر نہ بیٹھے،

عقیدت کے ساتھ نہ بیٹھے، محبت کے ساتھ نہ بیٹھے، اُس وقت تک صحبت کا اثر نہیں واقع ہوا کرتا، صحبت کے اثر کے واقع ہونے کا مطلب یہی ہے کہ جس کی صحبت میں آپ بیٹھے ہیں، آپ اُس کے تابع بن کر بیٹھیے، اس کو اپنا متبوع سمجھئے، اس کی عظمت آپ کے قلب میں ہو، تب تو آپ فائدہ اٹھائیں گے، ورنہ اگر آپ اپنے اغراض لے کر جائیں، برے جذبات کے تحت بیٹھیں، اُس کی عظمت قلب کے اندر نہ ہو، تو سو سال بھی کسی کی صحبت میں بیٹھے رہو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ تو وہ لوگ دنیوی غرض کے لئے آتے تھے، عقیدت اور محبت کیساتھ نہیں آتے تھے، جب عقیدت محبت کیساتھ نہیں آتے تھے، اور ان کا ارادہ ہی نہیں تھا کہ ہم اچھی باتوں کو قبول کریں اور اپنی کمزوریوں پر مطلع ہوں، تو ایسے وقت میں صحبت کا کوئی اثر نہیں پڑا کرتا۔ جیسے حضرتِ شیخ (سعدی رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خس

کہ بارش آسمان سے ہوتی ہے، اس کی لطافتِ طبع میں کوئی اختلاف نہیں، وہ باغ میں بھی ہوتی ہے اور شوریلی زمین میں بھی ہوتی ہے، بارش میں فرق نہیں ہے لیکن باغ کی زمین میں صلاحیت ہے تو وہاں پھول اگتے ہیں، پھل اگتے ہیں، اور شوریلی زمین میں صلاحیت نہیں ہے تو وہاں اول تو کچھ اُگتا نہیں، اُگیں گی تو بیکار اور کانٹے دار جھاڑیاں اور خس وخاشاک (گلستاں، باب ا، حکایت ۴)، تو بیٹھنے والے کی طبیعت میں صلاحیت ہو اور اُس کا سمجھنے سوچنے کا اور متاثر ہونے کا ارادہ ہو، تب اثر واقع ہوا کرتا ہے، ورنہ اثر واقع نہیں ہوتا۔ صحبت کا یہ اصول ہے کہ فائدہ تب اٹھا سکتے ہو جب اپنے آپ کو متبع قرار دو، اور جس کی صحبت میں بیٹھے ہو اس کی عظمت آپ کے قلب میں ہو، اور یہ نیت ہو کہ ہم یہاں سے کچھ حاصل کر کے اٹھیں، تب صحبت میں بیٹھنے کا فائدہ ہوتا ہے، ورنہ بیکار ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ: جب اُسے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر، اُس کی شرارتوں پر اُس کو تنبیہ کی جاتی ہے، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ: تو اُس کا غرور، اُس کی عزت اس کو گناہ پر برانگیختہ کرتی ہے، فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ: اس کے لئے جہنم کافی ہے وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ: اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے، یعنی اِس دنیا کے اندر اگر اس کو کوئی سزا نہ بھی ملے تو جہنم آئے گی تو سب کسریں پوری کر دے گی، اگلا پچھلا سب حساب پورا ہو جائے گا۔

قابلِ اعتماد لوگ اللہ کی رضا کے لئے اپنی جان کو کھپا دیتے ہیں

اور اِس کے مقابلے میں بعض ایسے بھی ہیں جن کو تاڑ کے رکھنا چاہیے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، قابلِ اعتماد بھی لوگ ہیں، جو اللہ کی رضا کے لئے اپنی جان تک کو کھپا دیتے ہیں، جان تک کو قربان کر دیتے ہیں، یہ مخلص لوگ ہیں، تو سارے انسان ایک جیسے نہیں ہوتے، اس لیے اُن مخلصین کا بھی تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جب مکہ معظمہ سے چلے ہیں تو مشرکین نے ان کا راستہ روکا، تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ دیکھو! میرے پاس اتنے تیر ہیں اور یہ تلوار ہے، اور تمہیں معلوم ہے کہ میں اچھا تیر انداز ہوں اور اچھا شمشیر باز ہوں، اُس وقت تک تم میرے تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرے ترکش میں ایک بھی تیر

باقی ہے، اور تیر ختم ہو جانے کے بعد پھر میں تمہارا مقابلہ تلوار سے کروں گا، پھر آگے جو ہوگا ہوگا، اس لیے تم میرے ساتھ مزاحمت نہ کرو، میں تمہیں ایک اور چیز بتا دیتا ہوں، کہ فلاں جگہ میں نے اتنا مال رکھا ہوا ہے، جاؤ جا کر مال لے لو اور میری جان چھوڑ دو۔ وہ روکنے والے اسی پر مطمئن ہو گئے، چھوڑ کر چلے گئے، اب یہ ہجرت کر کے جو آ رہے تھے تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے نہ جان کی پروا کی، نہ مال کی پروا کی۔ یہ تو ایک صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ آیت شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوا کرتی، جتنے بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم ملے، خاص طور پر مکی زندگی میں، انہوں نے اپنی جانیں بھی قربان کیں، اپنا مال بھی قربان کیا، اور مدینہ منورہ میں آنے کے بعد جو انصار آپ کے ساتھ شامل ہوئے اُن میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، صرف بعض منافق تھے جن کا ذکر اُوپر آیا۔

مکہ میں نفاق کیوں نہیں تھا اور مدینہ میں کیوں آیا؟

مکی زندگی کے اندر جو لوگ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اُن میں منافق کوئی نہیں تھا، کیونکہ منافق تو اس لیے نفاق اختیار کیا کرتا ہے کہ ظاہرداری کے اندر اُس کو دنیا کا نفع معلوم ہوتا ہے، لیکن مکہ معظمہ میں تو جو کلمہ پڑھتا تھا اُس پر مصیبت آتی تھی، کلمہ پڑھنے میں اُس کو کیا دنیا کا نفع تھا، اس لیے وہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ نفاق کے طور پر کوئی کلمہ پڑھتا، نفاق تو وہاں آیا کرتا ہے جہاں ظاہر کے ساتھ کوئی فائدہ اٹھانا ہو، اور یہاں اگر ظاہری طور پر ایمان اختیار کیا جاتا اور دل میں ایمان نہ ہوتا تو پٹنا ہی تھا، اور پٹنے کے لئے نفاق کون اختیار کرتا ہے۔ اس لیے مکہ معظمہ میں جو لوگ بھی مؤمن ہوئے، جنہوں نے کافروں سے ماریں کھائیں، پتھر کھائے، گھر بار چھوڑا، ہر چیز کو قربان کیا، اُن کو اپنا علاقہ تک ترک کرنا پڑا، تو یہ علامت ہے کہ انہوں نے اخلاص کے ساتھ ہی ایمان قبول کیا، اُن میں نفاق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے نفاق مدینہ منورہ میں آیا ہے، جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور اسلام قبول کرنے کے ساتھ کچھ دُنیوی مفاد حاصل ہونے لگ گئے تھے، تب اس قسم کے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے دُنیا کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسلام کو قبول کیا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا۔

تو جتنے بھی یہ جانباز قسم کے لوگ تھے، جنہوں نے مال اور جان اللہ کے راستے میں قربان کیا وہ سب اِس آیت کا مصداق ہیں، مقابلۃً اِن کو ذکر کر دیا کہ بعض لوگ ایسے ہیں، یہ اس قابل ہیں کہ اِن کی قدر کی جائے اور اِن کی حوصلہ افزائی کی جائے، جو اللہ کی رضا کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ''لوگوں میں سے بعض وہ ہیں، یا، بعض وہ ہے (مفرد کے ساتھ اگر ترجمہ کریں) جو بیچ دیتا ہے اپنی جان اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے، کھپا دیتا ہے اپنی جان، صَرف کر دیتا ہے اپنی جان اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ ایسے بندوں پر شفقت کرنے والے ہیں'' اللہ تعالیٰ کو بڑی شفقت ہے ان بندوں پر، جیسے پیچھے آیا تھا وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ کہ ایسے مفسدین سے اللہ کو محبت نہیں ہے، اور اس کے برخلاف جو اس قسم کے بندے ہیں کہ اللہ کی رضا کے لئے جان مال قربان کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی بہت شفقت اور بہت مہربانی ہے۔

لب ولہجے سے مؤمن ومنافق کی پہچان ہوجاتی ہے

سوال:- وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ اور اسی طرح وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ میں مطلق ذکر کردیا، تعیین نہیں کی گئی، تو حضور ﷺ کو کیسے پتہ چلے گا کہ کون سا آدمی کس آیت کا مصداق ہے؟

جواب:- اتنا محتاط کردیا کہ آپ کے پاس اردگرد بیٹھنے والے سارے مخلص نہیں اور سارے منافق نہیں، اور حالات کے ساتھ پتہ چل جایا کرتا ہے کہ کون قابل اعتماد ہے اور کون قابل اعتماد نہیں، عنوانات اور اشارے اس قسم کے دے دیے، کہ جن کے حالات اس قسم کے ہوں وہ قابل اعتماد نہیں ہوتے، اور جن کے حالات اس قسم کے ہوں وہ قابل اعتماد ہوتے ہیں، قرآن کریم میں اور بھی بہت ساری آیات ہیں جن میں منافقوں کی علامات بیان کی گئیں، اور جگہ یہ بھی کہ وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ (سورۂ محمد: ۳۰) آپ اِن کو لب ولہجے سے ہی پہچانتے ہیں، کیونکہ مخلص کا اور منافق کا لب ولہجہ مختلف ہوتا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو پتہ چل جائے گا، کہ کون باتونی ہے اور کون کردار والا ہے، اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اِن کو لب ولہجے سے آپ پہچان لیں گے، اور بعض اس قسم کے بھی تھے کہ اُن کا نفاق بالکل چھپا ہوا تھا، ان کا پتہ چلتا ہی نہیں تھا، بہر حال اتنا محتاط کردیا کہ ہر قریب آنے والے کو قابلِ اعتماد نہ سمجھا کرو، ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کے لئے قریب آتے ہیں، اور اُن کی اغراضِ فاسدہ قلب میں ہوتی ہیں، وہ مخلص نہیں ہوتے، جو بھی قریب آجائے اور ذرا سی میٹھی میٹھی باتیں کرے اور دانت دکھائے آپ اسی پر ہی اعتماد کرنا شروع کردیں تو یقیناً آپ کہیں نہ کہیں دھوکا کھا جائیں گے، اس لیے اعتماد کے لئے اُس کا جانچنا، پرکھنا، اُس کے کردار کو دیکھنا، قول اور عمل کے اندر مطابقت کا دیکھنا یہ زندگی کے اندر ایک بہت اہم چیز ہے، جو شخص ہر کسی پر اعتماد کرے اور باتوں میں آجائے اُس کو آپ بھی کہا کرتے ہیں کہ یہ کانوں کا کچا ہے، کجو کچھ جا کر اس کو کہہ دو اُسی کے پیچھے لگ جاتا ہے، اور ایسا آدمی جگہ بہ جگہ دھوکے کھاتا ہے اور ٹھوکریں کھاتا ہے۔

''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً'' کا مفہوم وشانِ نزول

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً: اِس آیت کے متعلق بیان القرآن میں یہ لکھا کہ پیچھے چونکہ مخلص کی تعریف آئی، اور بسا اوقات اخلاص کے جذبے سے انسان کچھ غلو اختیار کر جاتا ہے، اور اُس غلو کی بناء پر بدعت میں مبتلا ہوجاتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے یہ تنبیہ کی ہے کہ اخلاص بھی اعتدال کے ساتھ چاہیے، اور اُس کا معیار یہ ہے کہ اسلام کے احکام پورے پورے کامل مکمل طور پر تسلیم کرو، اور اپنے طور پر نیکی کے جذبے سے ایسی صورتیں نہ بنالو جن کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔ اور شانِ نزول کے طور پر یہاں ایک بات لکھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (یہ یہودیوں کے ایک عالم تھے، سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو یہ پہلے پہلے ہی مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں، پہلی ملاقات میں ہی مسلمان ہوگئے) جب مسلمان ہوگئے تو اِن کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہودی ملت میں ہفتے کے دن کی تعظیم ضروری ہے، ہفتے کے دن کوئی کام کرنا اور کسی قسم کی مشغولیت رکھنا ٹھیک نہیں ہے، اُس دن کو عبادت کے لئے رکھنا ضروری ہے، اور اسلام نے ہفتے کی بے تعظیمی کو واجب نہیں کیا، کہ اس کی تعظیم

نہ کرو، اور اس میں کوئی کام کرنا ضروری ہو، ایسی بات نہیں ہے، اس لیے اگر ہم ہفتے کے دن کو اُسی طرح فارغ رکھیں تو یہودیت کی رعایت بھی رہ جائے گی اور اسلام کے بھی کسی تقاضے کے خلاف نہیں ہے۔ اور اسی طرح اونٹ کا گوشت یہودیوں کے لئے حرام تھا، توراۃ کی تعلیم میں اونٹ کا گوشت حرام قرار دیا گیا تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام سے اِس کی حرمت چلی تھی، ابھی چوتھے پارے کے شروع میں آرہا ہے، اور اسلام میں گوشت کھانا فرض نہیں ہے، اس لیے آپ میں سے کبھی کسی نے اونٹ کا گوشت نہیں کھایا تو آپ کوئی گناہ گار نہیں، اس لیے انہوں نے سوچا کہ اگر ہم اُس کو حلال سمجھتے ہوئے عملاً ترک کردیں کہ نہ کھائیں، اس کا دودھ نہ پئیں اور گوشت نہ کھائیں، تو یہودیت کی رعایت بھی رہ جائے گی اور اسلام کی بھی رہ جائے گی، تو اگر دونوں کی رعایت رکھی جاسکے تو اِس میں کیا حرج ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یا اس قسم کے دوسرے لوگوں نے کچھ اس انداز سے سوچنا شروع کیا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ جب ایک انسان اس انداز سے سوچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے دل میں ابھی تک یہودیت کی عظمت ہے، اس لیے وہ اُس کے احکام کی رعایت کرنے کی طرف متوجہ ہے، جبکہ اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی ملت منسوخ ہوگئی، اب اپنے سارے کے سارے جذبات ملتِ اسلامیہ کے مطابق رکھو، ویسے آپ اتفاقاً ہفتے کو فارغ رہ جائیں تو کوئی بُری بات نہیں ہے، لیکن اس جذبے سے فارغ رہنا کہ یہودیت کا تقاضا ہے، یہ غلط ہے، اور اسی طرح اگر آپ عملاً گوشت نہ کھائیں تو کوئی حرج نہیں، اونٹ کا گوشت ساری زندگی نہ کھاؤ، گناہ گار نہیں ہو، لیکن اس جذبے سے احتیاط کرنا کہ چونکہ یہودیت کا تقاضا ہے کہ اونٹ کا گوشت نہ کھایا جائے، تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ دل دماغ ابھی پوری طرح سے اسلام کے سانچے میں ڈھلا نہیں ہے، کچھ کچھ توجہ دوسری طرف بھی ہے، تو اِس قسم کا اخلاص اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، اس قسم کے جذبات انسان کو بدعت میں مبتلا کردیتے ہیں، اور شریعت اسلامیہ کے ساتھ قلب کا وہ لگاؤ پوری طرح سے نہیں رہتا جس کو یکسوئی کے ساتھ ہم تعبیر کریں، کہ انسان پوری طرح سے شریعت اسلامیہ پر مطمئن ہوگیا اور اِس کی توجہ کسی دوسری طرف نہیں ہے۔ تو ایسے جذبات پر یہاں انکار کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اے ایمان والو! کامل مکمل طریقے سے اسلام میں داخل ہوجاؤ، تمہارے دل اور دماغ میں کسی دوسری ملت کی اور کسی دوسری شریعت کی اس طرح سے عظمت باقی نہیں رہنی چاہیے کہ تم اُس کی بھی رعایت رکھنے کی ضرورت محسوس کرو۔ اِن جذبات کے اوپر کنٹرول کرنے کے لئے یہ آیات آئیں، اس طرح سے بھی اس کا مفہوم صاف ہوگیا، کہ کامل مکمل طریقے سے اسلام میں داخل ہوجاؤ، کسی دوسری چیز کی طرف نہ جھانکو، بس تمہارا اسلام ہی ہے جس کے مطابق تم نے کردار اختیار کرنا ہے، اور اِس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری چیز کی عظمت اپنے قلب میں لانے کی کوشش نہ کرو، ایسا اخلاص جس میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے دین یا دوسری ملت کی بھی عظمت ہو یہ مناسب نہیں ہے۔

مذکورہ آیت کی دُوسری تفسیر

اور اگر کَآفَّۃً کو السِّلْمِ کے ساتھ لگالیں تو بھی مطلب وہی نکلے گا، لیکن تعبیر میں فرق پڑ جائے گا۔ ''کامل مکمل اسلام قبول کرو'' یہ نہیں کہ کچھ کچھ اسلام اور کچھ کچھ کوئی اور چیز، جیسے یہ کہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے، ہماری سیاست جمہوریت ہے، اور ہماری

معاشیات سوشلزم ہیں، اس قسم کی بات اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً کے منافی ہے، کہ کسی شعبے میں تو اسلام لے لیا اور کسی شعبے میں کوئی دوسری چیز لے لی، یا کہا جائے کہ اسلام تو صرف عبادات اور عقائد تک ہے، باقی! تجارت میں دنیا کے اصول اپنائے جا سکتے ہیں، سیاست میں مروّجہ سیاست کو اپنایا جا سکتا ہے، اس قسم کا انداز اگر کوئی رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے بھی کامل مکمل طریقے سے اسلام کو اختیار نہیں کیا، اسلام کو کامل مکمل طریقے سے اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سیاست کے اُصول بھی اسلام سے لو، معاشیات کے اصول بھی اسلام سے لو، تجارت کے اصول بھی اسلام سے لو، جب تمہارے گھر میں سب کچھ موجود ہے تو پھر تم اس کو چھوڑ کر دوسروں سے لے لے کے اِس کی ساتھ پیوند کیوں لگاتے ہو؟ یہ پیوند لگانے کا مطلب یہ ہے کہ تم اسلام پر پُوری طرح سے مطمئن نہیں، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اسلام زندگی کے بعض شعبوں کے اندر راہنمائی نہیں کرتا، یہ بات غلط ہے۔ اسلام کو پورا پورا لے لو، اِس کی کسی بات کو چھوڑو نہیں، اور پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ کہ اسلام کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طرف جھانکنے کی کوشش نہ کرو، تب جا کر سمجھا جائے گا کہ تم کامل مؤمن ہو اور کامل مسلم ہو۔[1] اور اسلام کی واضح واضح ہدایات تمہارے سامنے آ گئیں، اگر ان کے آنے کے بعد پھر تم پھسلتے ہو تو تم شیطان کے متبع قرار پاؤ گے، اور جب شیطان کے متبع قرار پاؤ گے تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے، پھر تمہارے اس قسم کے لُولے لنگڑے اسلام کا اللہ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں ہے، کہ جیسے چاہا قبول کیا، اور جیسے چاہا قبول نہ کیا، اگر واضح واضح دلائل کے آنے کے بعد پھر بھی تم اس قسم کے شیطانوں کے پیچھے لگتے ہو جو تمہیں اس قسم کے سبق پڑھاتے ہیں تو اُن کی اتباع قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح سے اسلام پر مطمئن نہیں یا اسلام کو ایک کامل دین سمجھتے نہیں، تو پھر اس قسم کا تمہارا ناقص عمل اور ناقص عقیدہ آخرت میں کام نہیں آئے گا۔

مختلف فیہ مسائل مدارِ ایمان نہیں

مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ: جس میں تمہارے سامنے واضح دلائل آ چکے ہیں، واضح ہدایات آ چکی ہیں، اُس کے آنے کے بعد بھی اگر تم پھسل جاؤ گے تو پھر اللہ تعالیٰ پکڑے گا۔ یہ تو ہے واضح دلائل آ جانے کے بعد، اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق واضح دلائل نہیں آئے، بلکہ وہ استنباطی ہیں، اجتہادی ہیں، وہاں اگر کسی قسم کا اختلاف ہو جاتا ہے، کہ ایک کہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے اور دوسرا کہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے، وہاں دو راہیں پیدا ہو سکتی ہیں جیسے کہ فقہاء رحمہم اللہ کے ہاں ہے، لیکن فقہاء رحمہم اللہ کی وہ باتیں بینات آنے کے بعد نہیں ہیں، وہ اُنہی مسائل کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں شریعت نے کوئی بینات کے طور پر وضاحت نہیں کی، بلکہ اشارات ہیں، جن سے فقہاء رحمہم اللہ نے استنباط کیا، پھر کسی نے استنباط کسی طرح سے کر لیا اور کسی نے کسی طرح سے کر لیا، اگر ایک کہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے اور دوسرا کہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے تو یہ اختلاف مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ نہیں ہے۔ اس لیے یہ اصول اپنے ذہن میں ہمیشہ مستحضر رکھیے کہ جو مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مختلف فیہ ہو، یا جو مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہو وہ مدارِ ایمان نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں اِس کے لئے کوئی بینات اور واضح دلائل موجود نہیں ہیں،

---

(۱) اسی آیت سے متعلق ایک مضمون ''حاکمِ وقت کا انتخاب اسلام کی روشنی میں'' درس کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

ورنہ بینات اور واضح دلائل اگر موجود ہوتے تو صحابہ اِس مسئلے میں کیوں اختلاف کرتے؟ فقہاء کیوں اختلاف کرتے؟ اس لیے جو اِس قسم کا مختلف فیہ مسئلہ ہوتا ہے وہ مدارِ ایمان قطعاً نہیں ہوتا، وہاں دونوں طرف گنجائش ہوتی ہے، چاہے یہ راستہ اختیار کرلو، چاہے یہ راستہ اختیار کرلو۔ واضح دلائل آ جانے کے بعد تو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں، لہٰذا جو متفق علیہ مسائل ہیں ایمان کا مدار وہ ہیں، اختلافی مسائل میں مختلف راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں، اور وہ اسلام کا تقاضا ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں ہے، ''پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔''

بدعت قابلِ مذمت کیوں؟

یہ مفہوم جو آپ کی خدمت میں واضح کر دیا گیا اسی سے بدعت کا اصول بھی نکل آیا، جیسے پہلے آپ کی خدمت میں میں نے عرض کیا تھا کہ جو چیز اسلام نے باعث ثواب نہیں ٹھہرائی اُس کو باعثِ ثواب سمجھ لینا یہ بھی بدعت کا ایک شعبہ ہے، اپنے طور پر تعیین کر کے کہ یوں کر لینا باعث ثواب ہے، حالانکہ اس کے باعث ثواب ہونے پر اسلام سے کوئی روشنی نہیں پڑتی، اور اسلام میں کوئی اس قسم کا قرینہ اور دلیل نہیں ہے جو اُس کو باعث ثواب قرار دے، اپنے طور پر اُس کو باعث ثواب اگر آپ سمجھنے لگ جائیں گے تو یہ شریعت کے اندر تحریف ہے اور پیوند کاری ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے کچھ احکام تو حضور ﷺ نے واضح کیے، اور کچھ احکام ایسے ہیں جو اپنے دماغ سے آپ افتراء کر رہے ہیں، تو یہ بھی گویا کہ اسلام کو ناقص سمجھنے والی بات ہے، اس لیے اِس قسم کی پیوند کاری بھی برداشت نہیں ہے، باعثِ ثواب وہی چیزیں ہیں جن کو شریعت نے کہہ دیا کہ یہ باعث ثواب ہیں، جو شریعت کی کسی دلیل کے ساتھ باعثِ ثواب ثابت ہوتی ہیں، اور اگر وہ شریعت کی کسی دلیل کے ساتھ باعث ثواب ثابت نہیں ہوتیں اور تم کہو کہ باعث ثواب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس بھی اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ تو بدعت کی ایجاد در پردہ ادّعائے نبوت ہوتا ہے، اس لیے بدعت شرک فی النبوت ہے، کہ جو منصب نبی کا تھا وہ تم نے اختیار کرلیا، نبی کا منصب تھا کہ تمہیں بتائے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا کام پسند ہے اور کون سا پسند نہیں ہے، اور جب تم اپنے دماغ کے ساتھ پسند اور ناپسند کام بنانے لگ جاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مرضی کی تفصیل تمہارے اختیار میں بھی ہے۔ اس لیے شریعت میں جو بدعت کی اتنی مذمت آتی ہے اُس کی وجہ یہی ہے کہ یہ شرک فی النبوۃ کا شعبہ ہے۔ ''بیشک وہ تمہارے لیے دشمن ہے صریح، اگر تم پھسل گئے واضح دلائل آجانے کے بعد تو جان رکھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست، حکمت والا ہے۔''

منکرین کے لئے وعید

آگے بھی وعید ہے کہ جو واضح دلائل آنے کے بعد نہیں سنبھلتے، اور اتنا کھلا کھلا سمجھا دیا جائے پھر بھی نہیں سنبھلتے، تو کیا وہ اللہ کے عذاب کے آنے کے منتظر ہیں؟ اور جب اللہ کا عذاب آئے گا پھر سنبھلے تو کیا سنبھلے، ایسے وقت میں تمہارے سنبھلنے کا اعتبار کوئی نہیں۔ ''اللہ آجائیں'' اس کو قیامت پر بھی محمول کیا گیا ہے، کہ واقعی اللہ آئے گا، اور ایسے معلوم ہوگا جیسے سائبان میں اللہ کی تجلی بھی ہو رہی ہے، اُس کی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا جہاں بھی تذکرہ آئے وہاں یونہی کہنا پڑتا ہے کہ جیسے اُس کی

شان کے لائق ہے۔ فرشتوں کا نزول بھی ہوگا، اللہ کا نزول بھی ہوگا، پھر حق و باطل کا فیصلہ ہوگا، اچھے اور برے کا فیصلہ ہوگا۔ اور اس (یَاْتِیَهُمُ اللّٰهُ) کی عذاب اللہ کے ساتھ بھی تاویل کی گئی ہے، کہ وہ اس چیز کے منتظر ہیں کہ اللہ کا عذاب آجائے بادلوں کی شکل میں، بادلوں کے سائبان آجائیں، اُن میں اللہ کا عذاب ہو، فرشتے ہوں، اور اس طرح سے آکے اِن کو نیست و نابود کر دیا جائے، پھر یہ اس قسم کے عذاب کے منتظر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جو باتوں سے نہیں سمجھتا کیا وہ لاتوں سے سمجھنے کی توقع رکھتا ہے؟ جیسے کہا کرتے ہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، جن کی عادت ہے کہ جب تک ان کو چار پانچ لاتیں نہ لگیں اس وقت تک ان کا دماغ سیدھا نہیں ہوتا، وہ صرف باتوں سے کہاں سمجھتے ہیں۔ تو اگر تم باتوں سے نہیں سمجھتے تو کیا تم پھر لاتوں سے سمجھو گے؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی لاتیں لگیں گی تو پھر بچے گا کچھ نہیں، پھر سمجھنے کا کیا فائدہ۔ کیا یہ لوگ جو بینات سے نہیں سمجھتے وہ اِس بات کے منتظر ہیں؟ کہ آسمان کی طرف سے بادلوں کے سائبان آجائیں، اُن میں اللہ کا عذاب آجائے، فرشتوں کی فوجیں آجائیں، اور تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے، معاملہ ہی طے کر دیا جائے، تم اس بات کے منتظر ہو؟ اور جب اس قسم کا واقعہ پیش آجائے گا، جیسے پچھلی امتوں میں پیش آیا تھا، تو پھر یاد رکھو! سنبھلنے کا وقت نہیں ہوگا۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: اللہ کی طرف ہی امور لوٹائے جاتے ہیں، اس قسم کے واقعات کا اختیار سب اللہ کو ہے، سب امور لوٹ کر اللہ کی طرف جائیں گے، اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہیں دلائل کے ساتھ سمجھائے، اور چاہے تو تمہارے نہ سمجھنے کی صورت میں تم پر عذاب اُتار دے، یہ اللہ کے اختیار میں ہے، اللہ کے رسول کے اختیار میں نہیں ہے، اِس طرح سے وعید دی گئی، کہ واضح ہدایات آنے کے بعد مخالفت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اتباع کرو۔ اور اگر تم اِن واضح دلائل کی اتباع نہیں کرو گے پھر پھسل جاؤ گے تو متبع شیطان سمجھے جاؤ گے، پھر ڈرو اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آجاؤ، پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے، اور اگر دنیا میں نیست و نابود نہ کیے گئے تو آخرت میں تمہارا انجام وہی ہوگا جو کہ متبع شیطان کا ہوتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ

آپ پوچھ لیں بنی اسرائیل سے، ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں، اور جو شخص بدل دے اللہ کی نعمت کو

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا

بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آگئی، پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں ﴿٢١١﴾ مزین کر دی گئی دنیوی زندگی ان

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا

لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، اور ہنستے ہیں وہ کافر مؤمنوں سے، اور وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا وہ

فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ان کافروں سے اُوپر ہوں گے قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار ﴿۲۱۲﴾

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ

لوگ ایک ہی جماعت تھے پھر بھیجا اللہ نے نبیوں کو اس حال میں کہ وہ نبی بشارت دینے والے تھے،

وَمُنۡذِرِيۡنَ ۖ وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ

اور ڈرانے والے تھے، اور اتاری اللہ نے ان کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ تا کہ فیصلہ کردے اللہ تعالیٰ لوگوں

النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ؕ وَمَا اخۡتَلَفَ فِيۡهِ اِلَّا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡهُ

کے درمیان اس بات میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر انہی لوگوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی،

مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ

بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح دلائل آ گئے، (اختلاف کیا) آپس میں ضد اور حسد کی وجہ سے، پس راہنمائی کی اللہ تعالیٰ نے

الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ

مؤمنوں کی اُس حق کی طرف جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا (رہنمائی کی) اپنی توفیق کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ جس کی چاہتا ہے

مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا

راہنمائی کرتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ﴿۲۱۳﴾ (اے مؤمنو!) کیا تم گمان کرتے ہو کہ داخل ہو جاؤ گے

الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ

جنت میں، حالانکہ ابھی تک نہیں آیا تمہارے پاس حالِ عجیب اُن لوگوں کا جو تم سے پہلے گزرے ہیں، پہنچی انہیں

الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا

مالی تنگی اور بدنی تکلیف، اور وہ لوگ ہلائے گئے حتیٰ کہ پکار اٹھے رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے

مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسۡـئَلُوۡنَكَ

اُن کے ساتھ کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ خبردار! بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ

مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ

وہ کیا خرچ کریں؟، آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین کے لئے ہے اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور

الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ

مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے، اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو پس بیشک اللہ تعالیٰ اُس کو جاننے والا ہے ﴿۲۱۵﴾ فرض کر دیا گیا تم پر

الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا

لڑنا اور وہ تمہارے لیے ناگوار ہے، ہوسکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ تم پسند کرو

شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

کسی چیز کو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ ۢ بَيِّنَةٍ: پوچھ لیجئے۔ سَلْ امر کا صیغہ۔ سوال کرلیں، پوچھ لیں بنی اسرائیل سے، كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ ۢ بَيِّنَةٍ۔ مِّنْ اٰيَةٍ ۢ بَيِّنَةٍ یہ کَمْ کی تمیز ہے، ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں، وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ ۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ: اور جو شخص بدل دے اللہ کی نعمت کو بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آگئی، فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ سے پہلے کچھ الفاظ مقدر نکالنے پڑیں گے جس سے بات پوری ہوجائے، پوچھ لیجئے بنی اسرائیل سے ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں، اور انہوں نے ان واضح نشانیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، وہ واضح نشانیاں اللہ کی ایک نعمت تھیں جن سے ہدایت حاصل ہوسکتی تھی، اُنہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اسی طرح گمراہی میں مبتلا رہے، یا ان نعمتوں کی ناشکری کرکے اپنے لیے مزید گمراہی کا سامان پیدا کرلیا، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے عقاب میں اور سزا میں مبتلا ہوئے، اس کو اِن الفاظ سے ادا کیا جارہا ہے کہ ہمارا قاعدہ یہی ہے کہ جو کوئی بھی اللہ کی نعمت کو بدلتا ہے بعد اس کے کہ اس کے پاس آجائے پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں، ان الفاظ میں ہی اشارہ ہوگیا بنی اسرائیل کے انجام کی طرف، جن کے پاس آیات بینات آئی تھیں لیکن انہوں نے اِس نعمت کی قدر نہیں کی۔ مضمون اس طرح سے پورا ہوجائے گا۔ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: سجادی گئی، مزین کردی گئی اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا دنیوی زندگی۔ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یہ زُيِّنَ کا نائب فاعل ہے۔ دنیوی زندگی مزین کردی گئی اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور استہزاء کرتے ہیں، ہنستے ہیں وہ کافر مؤمنوں سے، تمسخر کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں وہ کافر مؤمنوں کا۔ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا: اور وہ لوگ جو متقی ہیں، جنہوں نے تقوی اختیار کیا، فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: وہ اِن کافروں سے اوپر ہوں گے، بالا ہوں گے قیامت کے دن، وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ

حِسَابٍ: اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار، بِغَيْرِ حِسَابٍ سے کثرت کی طرف اشارہ ہے، اور بِغَيْرِ حِسَابٍ کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے بغیرِ حسابِ اعمالِہٖ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اُس کے اعمال کا حساب کیے بغیر اُس کو رزق دیتا ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً: لوگ ایک ہی جماعت تھے، اُمّت جماعت کو کہتے ہیں، یعنی وہ افراد جو کسی وجہ سے آپس میں متحد ہوں وہ اُمّت کہلاتے ہیں، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ: پھر بھیجا اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو، مُبَشِّرِيْنَ: اس حال میں کہ وہ نبی بشارت دینے والے تھے وَمُنْذِرِيْنَ: ڈرانے والے تھے، وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ: اوران کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری، الْكِتٰبَ سے جنس مراد ہے، اس لیے اس کا ترجمہ جمع کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ کتابیں اتاریں، یعنی جماعتِ انبیاء کے ساتھ کتابیں اتاریں، ہر ہر نبی کے ساتھ کتاب کا آنا ضروری نہیں، جب اُس جماعت میں سے چند نبی کتاب لے آئے تو جماعتِ انبیاء کے ساتھ کتاب کا اترنا صادق آ گیا۔ بِالْحَقِّ: کتاب اتاری اُن کے ساتھ حق کے ساتھ، یعنی وہ کتاب حق پر مشتمل تھی، متلبس بالحق تھی، اس کے اندر حق اور سچی بات کو واضح کر دیا گیا تھا، حق کو لے کر وہ کتاب آئی، اتاری اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ کتاب حق کے ساتھ، لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ: تاکہ فیصلہ کر دے اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان، فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: اُس بات میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ کا لفظ قرینہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتاب کا اتارنا لوگوں میں اختلاف واقع ہونے کے بعد ہوا، اس لئے وہاں مفہوم کو پورا کرنے کے لئے یہ لفظ بولے جائیں گے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، لیکن اِس لفظ کو اگر ظاہر کیا جاتا تو تکرار لازم آتا تھا جو فصاحت بلاغت کے خلاف ہے، اور فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ سے یہ مطلب سمجھ خود آ گیا، اس لیے مفہوم اِس کا یہ ہوگا کہ پہلے لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، ایک ہی جماعت تھے، نظریات کے طور پر وہ متحد تھے، پھر اُن کا آپس میں اختلاف ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے جو حق کی اتباع کرنے والوں کو بشارت دینے والے تھے اور حق سے اختلاف کرنے والوں کو ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ سچ پر مشتمل کتاب بھی اتار دی، جس نے آ کے حق کو واضح کر دیا کہ واقعہ یہ ہے، اور اتارنے کا مقصد یہی تھا تاکہ ان کے مختلف فیہ میں مسائل میں اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ: اور نہیں اختلاف کیا اُس کتاب میں یا اُس حق میں اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ: مگر انہی لوگوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آ گئے، بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ: اختلاف کیا آپس میں ضد اور حسد کی وجہ سے، آپس میں ضد کی بناء پر، آپس میں بغی کی وجہ سے، فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: پس راہنمائی کی اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی، لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: اس بات کی طرف جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، مِنَ الْحَقِّ: یہ مَا کا بیان ہے، رہنمائی کی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اُس حق کی طرف جس میں اُن لوگوں نے اختلاف کیا تھا، بِاِذْنِهٖ: اپنی توفیق کے ساتھ، راہنمائی کی اپنے اذن کے ساتھ۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور اللہ تعالیٰ راہنمائی کرتا ہے جس کی چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف، جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف۔ يَهْدِيْ کا پہلا مفعول مَنْ يَّشَآءُ ہے اور دوسرا مفعول صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ہے لیکن بواسطہ اِلٰی۔ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے صراطِ مستقیم کی۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: حَسِبْتُمْ کا خطاب اہلِ ایمان کو ہے، اے مؤمنو! کیا تم سمجھتے ہو، کیا تم خیال کرتے ہو، گمان کرتے ہو، کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں؟، وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ: مَثَلُ سے حالِ عجیب مراد ہے، حالانکہ ابھی تک

نہیں آیا تمہارے پاس حال عجیب اُن لوگوں کا جو تم سے پہلے گزرے ہیں، جس قسم کے عجیب عجیب حالات ان پر پیش آئے تھے ویسے حالات تو تمہیں ابھی پیش ہی نہیں آئے۔ لَمَّا یَاْتِکُمْ: لَمْ اور لَمَّا کے درمیان فرق آپ نحو کے اندر پڑھتے ہیں، لَمْ کے اندر صرف فعل کی نفی ہوتی ہے زمانہ گزشتہ میں، جیسے لَمْ یَضْرِبْ نہیں مارا۔ اور لَمَّا کے اندر ماضی میں نفی کا استغراق ہوتا ہے اور آئندہ کے لئے توقع ہوتی ہے اُس فعل کے واقع ہونے کی، جب ہم کہیں گے لَمَّا یَضْرِبْ تو اس کا معنی کریں گے ''ابھی تک نہیں مارا''، اس میں دو باتیں آگئیں، ایک تو زمانہ گزشتہ کا استیعاب آگیا کہ زمانہ گزشتہ میں نہیں مارا، اور آئندہ کے لئے مار کی توقع آگئی کہ ابھی تک نہیں مارا، اور آئندہ توقع ہے کہ مارے گا۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ لَمَّا یَاْتِکُمْ: ابھی تک نہیں آئے تمہارے پاس وہ عجیب حالات جو اُن لوگوں کے پاس آئے تھے، یعنی جس قسم کے حالات ان لوگوں پر آئے تھے اس قسم کے حالات ابھی تک تم پر نہیں آئے، جس میں اشارہ ہوگیا کہ آنے کی توقع ہے، عنقریب وہ حالات تم پر پیش آئیں گے۔ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ: وہ کیا حال تھا، اُس کا اجمالی سا تذکرہ کردیا، پہنچی اُنہیں سختی، وَالضَّرَّآءُ: اور تکلیف، باساء اور ضراء یہ دونوں لفظ آپ کے سامنے پہلے بھی وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ (سورۂ بقرہ: ۱۷۷) میں گزر چکے ہیں، باساء کہتے ہیں مالی تنگی کو، اور ضراء کہتے ہیں بدنی تکلیف کو، ''پہنچی اُن کو مالی تنگی اور بدنی تکلیف، پہنچی ان کو سختی اور تکلیف'' وَزُلْزِلُوْا: اور وہ لوگ جنبش دیے گئے، ہلائے گئے، زلزلے میں ڈالے گئے، حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: زُلْزِلُوْا حَتّٰی، جس کا ترجمہ محاورۃً یوں کیا جائے گا جیسے روضۃ الادب میں آپ نے پڑھا تھا اَكَلْتُ حَتّٰی شَبِعْتُ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پچھلا فعل اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ حتی کا مابعد متحقق نہیں ہوگیا، محاورۃً اِس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے، اَكَلْتُ حَتّٰی شَبِعْتُ میں نے اتنا کھایا کہ میں رَج گیا، یعنی میرے کھانے کا عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ میں رَجا نہیں، محاورے کے طور پر اِس کا مفہوم یہ ہے۔ مَشَیْتُ حَتّٰی عَیِیْتُ میں چلتا رہا حتی کہ میں تھک گیا، یعنی میرا چلنے کا عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ میں تھکا نہیں، تھکنے تک میرا عمل جاری رہا۔ اسی طرح یہاں ہے کہ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ: وہ لوگ جنبش میں ڈالے گئے، ہلائے گئے، زلزلہ دیے گئے، اتنا زلزلہ دیے گئے، اِتنا جنبش دیے گئے، اتنا اُن کو ہلایا گیا کہ پکار اٹھے رسول وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ: یہ پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اتنا اُن کو زلزلہ دیا گیا، اتنی جنبش دی گئی کہ وہ یہ پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا، خبردار! بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ: آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو مال سے (خیر کا مصداق مال ہے)، جو مال بھی تم خرچ کرو، فَلِلْوَالِدَیْنِ: وہ والدین کے لئے ہے وَالْاَقْرَبِیْنَ: اور قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے وَالْیَتٰمٰى: اور یتیموں کے لئے ہے وَالْمَسٰكِیْنِ: اور مسکینوں کے لئے ہے، وَابْنِ السَّبِیْلِ: اور مسافر کے لئے ہے۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ: اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے۔ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ: قتال باب مفاعلہ کا مصدر ہے، قَاتَلَ مُقَاتَلَةً قِتَالًا: آپس میں لڑنا۔ فرض کردیا گیا تمہارے اوپر لڑنا، وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: اور یہ قتال تمہارے لیے ناگوار ہے، كُرْهٌ مکروہٌ کے معنی میں، یہ تمہیں پسند نہیں، تمہیں طبعاً ناگوار گزر رہا ہے، ''لکھ دیا گیا، فرض کردیا گیا تمہارے اوپر لڑنا اور وہ تمہارے لیے ناگوار ہے''، وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا: ہوسکتا ہے کہ تم

مکروہ جانو کسی چیز کو، تم ناپسند کرو کسی چیز کو، وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا: اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ: اور وہ تمہارے لیے بری ہو، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ حقيقةَ الامر: حقیقت امر اللہ جانتا ہے کہ کون سی چیز تمہارے لیے بہتر ہے، کون سی چیز بہتر نہیں ہے، وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: تم نہیں جانتے۔ یا مطلب یہ ہے کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَصَالِحَكُمْ تمہاری مصلحتیں اللہ جانتا ہے، وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: اور تم نہیں جانتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

گزشتہ رکوع کی آخری آیت اِس مضمون پر مشتمل تھی کہ اگر واضح دلائل کے آنے کے بعد تم پھسل گئے تو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ زبردست ہے، جس میں ایک دھمکی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلائل مل جانے کے بعد جو شخص اُن سے فائدہ نہیں اٹھاتا، اور اُن دلائل سے ہدایت نہیں حاصل کرتا، اور اُن دلائل کے مطابق اپنا عقیدہ اور اپنا عمل نہیں بناتا، تو پھر وہ شخص اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ اِس مضمون کی تائید کے طور پر ہی یہ آگے ذکر کیا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو جو تم سے پہلے صاحب کتاب تھے، اہلِ کتاب تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے پاس کیسی کیسی بینات آئیں، کیسے کیسے واضح دلائل اللہ نے ان کو سمجھانے کے لئے دیے، لیکن جب انہوں نے واضح دلائل سے فائدہ نہیں اُٹھایا تو پھر وہ کس طرح سے اللہ کی گرفت میں آئے، یہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو، وہ تمہیں خود بتادیں گے کہ اُن پر کیا حال گزرا ہے، گویا کہ یہ تائید ہوگئی اُس ضابطے کی جو پیچھے ذکر کیا گیا ہے۔

حاکمِ وقت کا اِنتخاب اسلام کی روشنی میں

کیا حاکمِ وقت کے اِنتخاب کے لئے اسلام میں کوئی متعین طریقہ ہے؟

سوال:- اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً سے معلوم ہوا کہ جو چیز اسلام میں نہ ہو اس کو چھوڑنے کا حکم ہے، تو طریقِ انتخاب بھی اسلام میں نہیں ہے، اس لیے اس کو چھوڑ دینا چاہیے، اور سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔

جواب:- یہ کس نے کہا ہے کہ طریقِ انتخاب کوئی نہیں آیا...... (کسی نے مفتی محمود صاحبؒ کا حوالہ دیا تو فرمایا)......

اُس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا متعین طریقہ جس کو ہم کہیں کہ اس کے خلاف کرنے سے اسلام کا خلاف لازم آتا ہے اس قسم کا کوئی طریقِ انتخاب قرآن اور حدیث میں واضح نہیں کیا گیا۔ باقی رہا یہ کہ انتخاب کا کوئی طریقہ بتایا بھی ہے؟ وہ تو واضح ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ دُنیا سے تشریف لے گئے، تو کسی کو صراحت کے ساتھ متعین نہیں کر کے گئے کہ میرا جانشین یہ ہے، عامۃ المؤمنین کی رائے پر چھوڑ دیا، اور صاف فرمادیا کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مؤمنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی پر متفق نہیں ہوں گے، اس لیے مجھے تعیین کی ضرورت نہیں ہے، پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں اس بارے میں کوئی تحریر لکھ دوں، لیکن میں نے کہا کہ کیا

ضرورت ہے، اللہ اور مؤمنین کسی پر متفق ہی نہیں ہوں گے سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔[1] تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور ﷺ نے کچھ اپنی منشا تو واضح کی قرائن کے ساتھ، لیکن تعیین نہیں کی۔ بلکہ اُس وقت کے اہلِ حل و عقد جو بااختیار، رؤساء اور سردار قسم کے لوگ تھے، جن کو قبیلوں کی سرداری حاصل تھی، مہاجرین اور انصار کے اندر ممتاز شخصیات تھیں، اُن کے مشورے کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہو گیا۔

موجودہ جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں فرق

اور یہی اسلامی جمہوریت ہے اور جمہوری طریقہ ہے، کہ سمجھدار قسم کے لوگ اکٹھے ہو گئے، ''سمجھدار قسم کے لوگ!'' ہر ایرے غیرے کو نہیں، کیونکہ جو لوگ بصیرت نہیں رکھتے اور وہ سمجھتے نہیں کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز اچھی نہیں؟ ان کا وزن ڈالنے کی ضرورت نہیں، آج کل کی جمہوریت میں اور اسلامی جمہوریت میں یہی فرق ہے، کہ اسلام اپنے نظام کا نام شورائی نظام رکھتا ہے، اُس کے لئے جمہوریت کا لفظ نہیں بولتا، شورائی نظام یعنی مشورے کے ساتھ کام کرو، اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورۂ شوریٰ: ۳۸)، شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (سورۂ آلِ عمران: ۱۵۹) یہ لفظ قرآنِ کریم میں آئے ہوئے ہیں، آپس میں مشورے سے کام کرتے ہیں، اور مشورہ جب بھی لیا جایا کرتا ہے سمجھدار لوگوں سے لیا جاتا ہے، جو مسئلہ درپیش ہو اس کے متعلق جو شخص بصیرت رکھتا ہے اس سے رائے لی جائے گی کہ اِس کو کس طرح سے کریں؟ اور آج کل کی جو مغربی جمہوریت ہے اُس میں ہر ایرے غیرے کو ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے، چاہے وہ دائیں اور بائیں میں فرق نہیں کرتا، جیسے کہ علامہ اقبال کہتے ہیں ''گریز از طرزِ جمہوری''[2] یہ جو موجودہ طرزِ جمہوری ہے اس سے بھاگو، اُس کی وجہ یہ ذکر کی کہ اس میں لوگوں کو گنا جاتا ہے، اِن کا وزن نہیں کیا جاتا کہ وزن دار شخص کون ہے؟ رائے کس کی وزنی ہے؟ قواعد کے مطابق کس کی رائے ہے؟ یہاں لوگوں کو گنتے ہیں، لوگوں کا وزن نہیں کرتے، اور پھر یہ بھی کہا کہ کسی پختہ کار کی رائے کے متبع ہو جاؤ، اور اس جمہوری طرز سے بھاگ جاؤ۔ کیونکہ ایک انسان کا فکر دوسو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا، ایک طرف تو ایک انسان ہو اور دوسری طرف دوسو گدھے ہوں، اب اگر گنتی کرو گے تو دوسو گدھے بڑھ گئے، لیکن فکرِ انسانی دوسو گدھوں کے دماغ میں آسکتا؟ اس لیے جو مسئلہ درپیش ہو اُس میں جو پختہ کار لوگ ہیں اُن سے مشورہ لو، مشورہ لینے کے بعد اُس کے مطابق عمل کر لو۔ اب ایک طرف امام غزالیؒ ہے اور دوسری طرف پانچ بھیڑیں چرانے والے بیٹھے ہیں، یا پچاس کان کھودنے والے مزدور بیٹھے ہیں، ایک طرف امام غزالیؒ ہے اور دوسری طرف اس قسم کے جاہل ہیں کہ جن کو علم کا پتہ ہی نہیں کہ ہوتا کیا ہے، اب ایک علمی مسئلہ پیش ہو جاتا ہے، اگر ہاتھ اٹھانے سے فیصلہ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہل اِس عالم پر غالب آجائیں گے، جہالت علم پر غالب آجائے گی، کیونکہ اکثریت دُنیا میں جاہلوں کی ہوتی ہے، اس لیے افراد کے اعتبار سے اکثریت کا اعتبار نہیں ہے اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۂ انعام: ۱۱۶) زمین کے اندر جو لوگ موجود ہیں اگر اُن میں سے اکثریت

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۷۳ باب من فضائل ابی بکر۔ مشکوٰۃ ۲/۵۵۵ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا باب مناقب ابی بکر۔ ولفظہ: ویأبی اللہ والمؤمنون الا ابابکر۔

(۲) پورا شعر یوں ہے: گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کاری شو کہ از مغزِ دوصد خر فکرِ انسانی نمے آید! (پیامِ مشرق، بعنوان جمہوریت)

کی اطاعت تم کروگے تو یہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکادیں گے، اُس کی وجہ کیا ہے؟ کہ عادت یہی ہے اور واقعہ یہی ہے کہ اکثریت جاہل اور نادان ہوتے ہیں، اب اگر اکثریت کے فیصلہ کو مان لیا جائے تو وہ تو جہالت کا فیصلہ ہے، اس لیے اسلام نے اپنے نظام کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ جو لوگ سمجھ دار ہیں، جو اس معاملے میں بصیرت رکھتے ہیں اُن سے رائے لو، مشورہ کر کے جو طے ہوجائے اُس کے مطابق عمل کرو، یہ شورائی نظام ہے، کہ سمجھ دار لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔

حاکم کے اِنتخاب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل

اور اِس کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل ہمارے لئے حجت ہے، کہ اگر وقت کا حاکم پوری طرح دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ یہ شخص اہلیت رکھتا ہے، میرے بعد یہ کام سنبھال لے گا، تو اپنی زندگی کے اندر چند لوگوں سے جن پر وہ اعتماد کرتا ہے مشورہ کر کے ایک آدمی کو نامزد کرسکتا ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسے ہی کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لوگوں کی رائے معلوم کی، جس وقت دیکھا کہ ان پر سب مطمئن ہیں، تو اعلان کردیا کہ میرے بعد ان اُمور کے متولی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، اسی طرح وقت کا حاکم اگر دیانت داری کے ساتھ ایک رائے قائم کر کے کسی کی تعیین کردے تو یہ تعیین بھی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ لیکن یہ تعیین شک اور شبہ سے بالاتر ہونی چاہیے، کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا کوئی رشتہ دار نہیں بنایا، اپنا بیٹا نہیں بنایا، بلکہ جس پر جماعت کے افراد اعتماد کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا معاون سمجھا جاتا تھا اُس کی تعیین کردی، اور ساری قوم نے قبول کرلیا تو یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حاکم کے اِنتخاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل

تیسرے ہمارے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل حجت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سات آدمیوں کی ایک کمیٹی بناگئے تھے، اور کہا تھا کہ یہ مشورہ کر کے جس کو چاہیں متعین کرلیں، جن میں چھ عشرہ مبشرہ تھے جو اُس وقت زندہ تھے، کہ یہ لوگ ہیں جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کیا، بلکہ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں اپنے بعد اُن کی تعیین کرجاتا، میرے پاس تعیین کی ایک دلیل ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "امینُ ھٰذِہِ الامۃِ ابو عُبیدۃَ بنُ الجرّاح" اس اُمت کا امین ابوعبیدۃ بن الجراح ہے، تو میں اُمت کی امانت اِس امین کے سپرد کردیتا، کہ لے بھائی! تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس اُمت کا امین قرار دیا، اِس امانت کو سنبھال، تو جس طرح سے چاہے کر۔ میں اُس کے سپرد کردیتا، تو اس طرح سے بھی آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اُس سے پہلے شہید ہوچکے تھے، وہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، تو چھ عشرہ مبشرہ اس وقت زندہ تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی کمیٹی بنادی، کہ یہ مشورہ کر کے آپس میں جس کو چاہیں ایک کو متعین کرلیں، لیکن چھ کی کمیٹی جو بنائی تو اس میں ہوسکتا تھا کہ تین ایک طرف ہوجائیں اور تین ایک طرف ہوجائیں، اس لیے ساتویں آدمی کا اضافہ کردیا، یعنی اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا، کہ اِس کو مشورے میں بلا لینا، لیکن خلافت میں اس کا حق کوئی نہیں ہے، تو یہ بیٹا تھا، بیٹا ہونے کے اعتبار سے اس شک اور شبہ سے بھی اپنے آپ کو نکال دیا کہ یہ اپنے بیٹے کے لئے خلافت چاہتے ہیں، صراحت کے ساتھ نفی کردی، کہ میرے بیٹے کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں ہے، ہاں البتہ مشورے میں

ان کو شریک کر لینا، جب یہ ساتواں آدمی شریک ہوجائے گا تو اگر کسی طرف چار ہو جائیں کسی طرف تین ہوجائیں، اور یہ ہیں سارے کے سارے ایسے جن پر حضور ﷺ نے اعتماد کیا ہے، تو جس کے بارے میں متفق ہوجائیں گے اُس کی تعیین ہوجائے گی، بہر حال یہ بھی ایک طریق ہے۔

اِسلام شورائی نظام رکھتا ہے

تو ان تینوں طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے، اب وہ لائحہ عمل جو مرتب کیا جائے گا اُس کو ہم ''شورائی نظام'' کہیں گے، اُس کے لئے ''جمہوریت'' کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کریں گے کہ ''جمہوریت'' کا معنی آج یہی ہے کہ ہاتھ گنو، کہ ہاتھ کتنے کھڑے ہوئے ہیں؟ جدھر ہاتھ زیادہ کھڑے ہوگئے بس اُس کے مطابق فیصلہ دے دو، یہ نہیں دیکھنا کہ ہاتھ کھڑا کرنے والا کچھ سمجھتا بھی ہے کہ نہیں سمجھتا، وہی بات جیسے میں نے پہلے عرض کی کہ ''فکرِ یک کس در دماغ دوصد خرنمے آید'' کہ ایک انسان کا فکر دوسو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا، اس لیے تم کسی انسان کے پیچھے لگو، گدھوں کے پیچھے لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر صرف افراد کو گننا مراد ہو تو قرآن صراحتاً کہتا ہے کہ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانعام:۱۱۶) اگر زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی رائے مانو گے تو یہ تمہیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیں گے، وجہ یہی ہے کہ اکثریت متبع شیطان ہے، اور اہل حق، سمجھ دار قسم کے لوگ اور نیک طینت ہمیشہ کم ہوا کرتے ہیں، تو جس قسم کا مسئلہ پیش ہوجائے اُس قسم کے لوگوں کی رائے لینی چاہیے اور ان میں سے پھر اکثریت کا اُصول نکالا جاسکتا ہے، لیکن جمع سارے کے سارے سمجھ دار ہونے چاہئیں، اور جو سمجھ داروں کی رائے ہوگی وہ ساری اُمت کی ترجمانی سمجھی جائے گی، اور اِس کا نام اسلام ''شورائی نظام'' رکھتا ہے۔

حاکمِ وقت کو معزول کرنے کے متعلّق اِسلام کی تعلیمات

اور پھر جس کو ایک دفعہ منتخب کر دیا جائے پھر یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تین سال کے بعد یا پانچ سال کے بعد اُس کی پھر ٹانگ کھینچو، اگر وہ کام سیدھا کرتا جارہا ہے تو اُس کو زندگی بھر رہنے دو، ہاں البتہ اگر وہ اُمت کے مفاد کے خلاف کرنے لگ گیا، راہِ حق سے بھٹک گیا، اور اُس کی گمراہی بالکل واضح ہو گئی، ایسے وقت میں اُس کو اُتارا بھی جاسکتا ہے، لیکن اگر وہ سیدھا چل رہا ہے اور قاعدے کے مطابق کام کر رہا ہے تو اُس کو زندگی بھر مہلت دو کہ وہ خدمت کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو یہ منصب چھوٹا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو یہ منصب چھوٹا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو یہ منصب چھوٹا، اہلِ حق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق تھے، وہ تو باغیوں نے شرارت کر کے شہید کر دیا، وہ ایک علیحدہ بات ہے، اب بھی اگر کوئی شریر آدمی کسی حاکم کو قتل کر دے تو اُس کی جگہ تو دوسرے کو منتخب کر لیا جائے گا، باقی یہ ہے کہ زندگی کے اندر بلاوجہ، کہ اب چونکہ اِس کو چار سال کام کرتے ہوئے ہوگئے، اب کسی دوسرے کو بھی کام کرنے کا موقع دینا چاہیے، قوم سے پوچھ لو کہ اب اِس کے اوپر وہ خوش ہیں یا نہیں، یہ توڑ پھوڑ کا طریقہ اسلام میں نہیں ہے، اگر ایک آدمی منتخب ہوگیا اور وہ کام صحیح کرتا جارہا ہے تو کوئی ضرورت نہیں کہ اُس کی زندگی میں اس کو اِس منصب سے آپ ہٹائیں، ہاں! البتہ اگر وہ غلط ہوگیا، قومی مفاد کے خلاف کرتا ہے، اسلام کے خلاف کرتا ہے، اور وہ

قابلِ برداشت نہیں رہا، تو ایسی صورت میں وہی اہلِ حل وعقد اُس کو ہٹا بھی سکتے ہیں، اور اگر اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، وہ واضح طریقے پر چل رہا ہے، جیسے کتاب وسُنّت کے ساتھ ایک طریقہ اُس کے سامنے متعین ہے، تو پھر زندگی بھر اُس کو برقرار رہنا چاہیے، پھر ہٹانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تو یہ ہدایات ساری کی ساری موجود ہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام میں بھی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل میں بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس طرح سے یہ اُصول چلا ہے اس سے یہ قاعدہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ جمہوریت میں حصّہ کیوں لیا جاتا ہے؟

سوال:- پھر ہمارے لوگ اِس جمہوریت کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ اسلامی شورائی نظام کی کوشش کرنی چاہیے، اس طریقے سے علیحدہ ہٹ کر جو آج کل جمہوریت کا ہے، اپنا طریقۂ انتخاب علیحدہ وضع کر کے اس کے مطابق چلنا چاہیے۔

جواب:- اب یہ جمہوریت چونکہ طاری ہوگئی، اور اِس کو لوگ اپنا چکے، اب اِس کو بدلنے کا طریقہ یہی ہے کہ اِسی ہتھیار کے ساتھ لڑ کر آگے آ کر اِس نظام کو تبدیل کرو، اور اگر آپ یہ موجودہ ہتھیار نہیں اپناتے جس ہتھیار کو یہ غلط لوگ اپنائے بیٹھے ہیں تو وہ آپ کو آگے نہیں آنے دیں گے، اس دعوے کے ساتھ کہ یہ نظام غلط ہے اور ہم اِس کو بدلیں گے، اِس کو تبدیل کریں گے، آگے آنے کے لئے جو اِس غلط پالیسی کے تحت چیز بنی ہوئی ہے اِس کے ذریعے سے آگے آنا، تاکہ آگے بڑھ کر ہم معاملات کی اصلاح کریں، اِس کی بالکل گنجائش ہے، اِس کو غلط کہتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں جب اختیار ملے گا تو ہم اِس میں تبدیلی لائیں گے اِس میں حصہ اگر لیا جائے تو یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

(پھر کسی نے شاید سوال کیا کہ حضرت مفتی محمود صاحب نے کہا تھا کہ موجودہ طریقِ انتخاب اب تبدیل نہیں ہوسکتا۔ تو اس پر فرمایا)..... خیر! یہ سیاسی باتیں عملی طور پر کچھ ایسی ہوں گی جن میں اخباری بیانات پر آپ اعتماد کر کے بات کر رہے ہیں، معلوم نہیں مفتی صاحب کا کیا منشا تھا، لیکن اِس میں حقیقت یہی ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کی جارہی ہے، کہ سمجھ دار لوگ مل کر کسی طریق کو اگر متعین کریں تو اسلام میں اس کی گنجائش ہے، اتنی سی لچک اِس میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء کا انتخاب جس انداز سے ہوا اُس میں کافی راہنمائی موجود ہے اگر کوئی شخص راہنمائی حاصل کرنا چاہے۔

رشتہ دار کو منتخب کرنے کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

باقی اگر عوام کی رائے کے ساتھ جانے والے کے بعد اُس کا رشتے دار ہی منتخب کر لیا جائے اس میں بھی کوئی عیب نہیں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ منتخب ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، حالانکہ وہ بیٹے ہی ہیں، تو یہ کوئی ممانعت بھی نہیں کہ جانے والے کا رشتہ دار نہیں آسکتا۔ اِسی انداز کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اگر دیانت داری کے ساتھ مناسب سمجھا کہ اُمت اگر مجتمع رہ سکتی ہے تو میرے بیٹے پر رہ سکتی ہے، اگر میں نے اِس کو بغیر کسی قسم کی تعیین کرنے کے ایسے ہی چھوڑ دیا اور اپنے زمانے کے اندر کسی ایک پر میں نے جمع کرنے کی کوشش نہ کی، تو اب یہ اتنے پھیل چکے ہیں، کہ پھر وہ کہے گا کہ اِس کو بناؤ، وہ کہے گا اس کو بناؤ، پھر امت آپس میں لڑے گی، بھڑے گی، فساد کرے گی، تو دیانت داری

کے ساتھ اگر اِس کو مناسب سمجھا اور امت کا اجتماعیت والا مفاد اسی میں سمجھا تو اُن کا یہ عمل بھی بالکل ٹھیک ہے، کہ زندگی کے اندر تعیین کر گئے، جیسے حضرت ابو بکر ڈلٹنڈ نے زندگی میں حضرت عمر ڈلٹنڈ کی تعیین کر دی تھی، اور پھر لوگوں سے مشورہ لیا، لوگوں کو اس پر متفق پانے کے بعد اُس کا اعلان کر دیا، تو حضرت معاویہ ڈلٹنڈ نے بھی اگر اسی سے روشنی حاصل کی ہو کہ اپنی زندگی میں ایک کو متعین کر کے باقیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ خلیفہ کے بعد پھر امت انتشار میں مبتلا نہ ہو جائے، اور دیانت داری سے سمجھا ہو کہ میرے خاندان پر تو سارے متفق رہ سکتے ہیں، اور اگر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا تو کوئی کہے گا فلاں ہو، کوئی کہے گا فلاں ہو، پھر وہی انتشار برپا ہو جائے گا، اور اُدھر سرحدوں کے اُوپر باقاعدہ سب جہاد جاری تھے، تو اُمت کو مجتمع رکھنے کی نیت کے ساتھ اگر وہ اپنے بیٹے کی تعیین کرتے ہیں تو یہ بھی کوئی خلافِ شریعت نہیں۔ باقی مدار اُن کی نیت پر ہے، چونکہ وہ سرورِ کائنات ﷺ کی دُعاؤں کے تحت ہادی اور مہدی تھے، اِس لیے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی جگہ وہ نیک نیت تھے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ اِس کا اجر پائیں گے۔

زیرِ درس آیات کی تفسیر

(1) سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: یہ خصوصی طور پر بنی اسرائیل کے لئے زجر و توبیخ ذکر کی گئی ہے، یہ جو فرمایا کہ بنی اسرائیل سے پوچھئے، تو ایک پوچھنا ہوتا ہے کسی چیز کے جاننے کے لئے اور سمجھنے کے لئے، اور ایک ہوتا ہے کسی سے سوال کرنا زجر و توبیخ کے طور پر، ڈانٹنے کے لئے، اُس کو عتاب کرنے کے لئے، جیسے کسی کو بار بار کوئی حکم دیا جائے، کہا جائے یہ کام کر، یہ کام کر، اور اس نے ہر دفعہ سستی کی، کام نہ کیا تو ڈانٹتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ذرا اس سے پوچھو تو سہی، اِس کو کتنی دفعہ میں نے کہا، تو اب یہاں پر اس سے پوچھنا مقصود نہیں، کہ وہ گن کر بتائے کہ اتنی دفعہ مجھے کہا، یہ کہنا زجر و توبیخ کے طور پر ہے، اِسی طرح یہاں پر بھی سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ یہ زجر و توبیخ اور ڈانٹنے کے لئے ہے۔

بنی اِسرائیل پر اِحسانات اور ان کی ناشکری

کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ: یہ ہے جس چیز کے متعلق پوچھنا ہے کہ بنی اسرائیل سے پوچھئے، کتنی واضح دلیلیں ہیں جو ہم نے اُن کو عطا کیں، تورات و انجیل میں کتنے واضح دلائل ہیں جو ہم نے اُن کو عطا کئے یعنی واضح دلائل نبی کی نبوت پر اور اسلام کے حق ہونے پر، لیکن اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ جو کہا پوچھئے بنی اسرائیل سے کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ: اِس سے مراد ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد کو ہم نے کتنی واضح نشانیاں اور واضح دلائل عطا کئے، اس سے مراد بنی اسرائیل کو جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکامات آئے اُن کے حق ہونے پر واضح نشانیاں واضح دلائل پیش کئے، جیسا کہ اُن کے لئے دریا کو پھاڑ دینا، دریا میں اُن کے لئے راستے بنا دینا، اُن کو خیر و خوبی کے ساتھ دریا سے گزار دینا، اور پھر اُن کے دشمن کو غرق کر دینا، اور اُن کے باغات خزانوں محلات اور اُن کی حکومت کا اُن کو مالک بنا دیا، اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جو من و سلویٰ عطا کیا، اُن کے لئے پتھر سے پانی

(1) اس کے بعد ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کچھ حصے کی تفسیر میں جانشین حکیم العصر شیخ منیر احمد منور مدظلہ کی تقریر درج کی گئی ہے۔ ناقل۔

کے چشمے جاری کیے، اور اُن پر بادل کا سایہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا، پھر انہوں نے اللہ سے دال گندم اور سبزیوں کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی وہ خواہش پوری کردی، تو یہ جو اللہ تعالیٰ نے موقع بموقع دلائل عطا کئے یہ مراد ہیں، اس لیے کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ میں ھُمْ سے مراد اُن کے آباؤ اجداد ہیں، لیکن ان موجودہ بنی اسرائیل کی طرف نسبت اس لیے کی گئی کہ بعض اوقات آباؤ اجداد پر جو احسانات ہوتے ہیں اس کی نسبت ان کی بعد والی نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ تو آیاتِ بینات کی دو تفسیریں ہوگئیں، یا تو اس سے مراد دلائل جو نبی ﷺ کی نبوت پر توراۃ وانجیل میں اتارے گئے، یا اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ سے مراد جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وقتاً فوقتاً معجزات عطا کئے، اور بنی اسرائیل کے اُوپر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی، توراۃ کے سچے ہونے کی، اور اپنے احکامات کے حق ہونے پر نشانیاں دکھائیں وہ مراد ہیں۔ لیکن انہوں نے ان واضح نشانیوں کے بعد اللہ کی نعمت کو تبدیل کیا کفر کے ساتھ، اللہ کی نعمت سے مراد یہاں پر یہی واضح نشانیاں ہیں، یہ اللہ کی نعمت تھیں، لیکن انہوں نے ان واضح نشانیوں کو اور واضح دلائل کو دیکھ کر ایمان لانے کی بجائے کُفر کیا۔

نعمتوں پر ناشکری موجبِ عذاب ہے!

وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَۃَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ: ان نشانیوں کے آنے کے بعد بھی انہوں نے پھر کُفر کیا، یہاں پر بعض مفسرین نے کُفر سے کُفر کا حقیقی معنیٰ مراد لیا، اور بعض نے ناشکری والا معنیٰ مراد لیا ہے، کہ انہوں نے اللہ کی اس نعمت کی ناشکری کی، اس ناشکری کی صورت بھی یہی ہے کہ ایمان لانے کی بجائے انہوں نے کُفر کا راستہ اختیار کیا، فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ وَمَنْ یُّبَدِّلْ کی جزاء محذوف ہے کہ بات صرف ان کی نہیں، کہ بنی اسرائیل نے ایسا کیا بلکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو بھی اللہ کی نعمت آنے کے بعد بطور شکر کے اللہ پر اور اللہ کے رسول پر اور اللہ کے دیے ہوئے احکامات پر ایمان لانے کی بجائے کفر کرے تو اللہ کا قانون یہی ہے کہ اُن کو عذاب دیتا ہے دنیا میں، اور اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں اللہ تعالیٰ عذاب دے گا، جس طرح سے بنی اسرائیل جس وقت ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی دنیا میں ہی اُن کے کفر کی سزا دی، تو جو بھی اللہ کی نعمتوں کو ایمان کا ذریعہ بنانے کی بجائے وہی نعمتیں اُن کے لئے جب کفر کا سبب بن جائیں گی اُن کی ناشکری کی وجہ سے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب دے گا، اور عذاب بھی معمولی نہیں، سخت عذاب، کیونکہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔

حُبِ مال اور حُبِ جاہ عموماً کُفر کا سبب بنتے ہیں

اب واضح دلائل اور واضح نشانیاں آجانے کے بعد جو کُفر کیا گیا اِس کا سبب کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کُفر کا سبب بیان فرمایا، اس کا سبب ہے حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال، یہ دونوں چیزیں ہیں جو کفر کا سبب بنتی ہیں، اِسی حب جاہ اور حب مال کو اس عنوان سے یہاں ذکر کیا گیا، زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا: مزین کی گئی اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا دنیوی زندگی، دنیوی زندگی کے مزین کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں مال اور جاہ یہ دو چیزیں ہیں جن سے دنیوی زندگی اُن کو پرکشش نظر آتی ہے، اور دُنیوی زندگی میں یہی مال حاصل کرنے کے لئے اور کوئی بڑا منصب مقام حاصل کرنے کے لئے وہ تگ ودو کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے

دین کی پروانہیں کرتے، ایمان کی پروانہیں کرتے، اللہ کے احکامات کی پروانہیں کرتے، اب ان کو مال اور جاہ کی محبت اندھا بہرا کردیتی ہے، وہ حصولِ مال کے لئے اور حصولِ جاہ کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی کوئی پروانہیں کرتے، رسول کی بھی تکذیب کردی اور اللہ کی بھی تکذیب کردی، اور صرف ایک ہی ان کے سامنے مقصود ہے کہ ہمیں مال و دولت حاصل ہوجائے، اور کوئی ہمیں بڑا مرتبہ حاصل ہوجائے، اور یہی اُن کے لئے بڑی کامیابی ہے۔ ''مزین کردی گئی اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا دُنیوی زندگی'' دُنیوی زندگی کے مزین کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے اسباب، یعنی مال اور کوئی بڑا منصب، یہ اُن کے لئے بڑی پُرکشش چیز بن جاتی ہے۔

تزئین کی نسبت کہیں اللہ کی طرف اور کہیں شیطان کی طرف کیوں؟

یہاں پر زُیِّنَ مجہول صیغہ ذکر کیا گیا، مزین کی گئی، لیکن دوسری آیات کو دیکھا جائے تو کہیں تو نسبت ہے شیطان کی طرف: ''زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ''[1] شیطان نے اُن کے لئے اُن کے اعمال کو مزین کردیا، اور کہیں نسبت اللہ کی طرف ہے: ''كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ''[2] اصل حقیقت یہ ہے کہ تزئین کے کئی معنی ہیں، ایک تزئین کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اِیْجَادُ الشَّیْءِ حَسَنًا'' کسی چیز کو اس طریقے سے پیدا کرنا اور موجود کرنا کہ اُس کے اندر خوبصورتی اور کشش ہو، اور دوسرا تزئین کا معنیٰ ہے کہ کسی چیز کی انسان کے دل کے اندر خواہش اور چاہت اُبھار دینا، اور اُس کی چاہت کو اور اُس کے شوق کو اتنا اُبھار دینا کہ اس کے دین ایمان پر بھی غالب آجائے، تو جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے وہاں تزئین سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر جب ان چیزوں کو پیدا کیا تو اپنے کمالِ قدرت کے مطابق ان کو پُرکشش بنادیا اور ان کے اندر کشش رکھ دی، اور جہاں شیطان کی طرف نسبت کی گئی تو اس سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے دنیا کی ان پرکشش چیزوں کی طرف انسانوں کے دل میں اتنا شوق اور اتنی کشش اور خواہش اُبھار دی کہ اب اُن کا مقصد یہی بن گیا کہ ہماری یہ خواہش اور ہماری یہ چاہت پوری ہونی چاہیے، یہ پرکشش چیزیں ہمیں حاصل ہونی چاہئیں، جس طریقے سے بھی حاصل ہوں، خواہ دین کا انکار کرنا پڑے، خواہ کُفر کرنا پڑے، بدعات کا ارتکاب کرنا پڑے، بس یہ خواہش پوری ہونی چاہئے، تو جہاں یہ معنیٰ ہے اُس کے اعتبار سے شیطان کی طرف نسبت ہے، اور جہاں اللہ کی طرف نسبت ہے وہاں یہ معنیٰ مراد ہے کہ خلقی طور پر کسی چیز کو پرکشش بنادینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ جو چیزیں پُرکشش بنادی ہیں تو یہ پرکشش چیزیں اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور یہی انسان کے لئے دنیا اور آخرت کی ترقی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو پیدا کیا، اور دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لئے کشش رکھ دی، تو اب یہی جو اللہ پاک نے کشش رکھ دی ہے اسی کی وجہ سے ہی دنیا میں جوڑے بنتے ہیں، اسی کی وجہ سے آگے پھر اولاد ہوتی ہے، اور ماں باپ کے دل میں اولاد کے لئے کشش رکھ دی، اولاد کی خاطر ماں باپ کتنی محنت کرتے ہیں، کتنی تکالیف برداشت کرتے ہیں، اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے

---

(۱) پارہ نمبر ۱۰ سورۃ الانفال آیت نمبر ۴۸۔ نیز پارہ ۱۴ سورۃ نحل آیت ۶۳۔ پارہ ۱۹ سورۃ نمل آیت ۲۴۔ پارہ ۲۰ سورۃ عنکبوت آیت ۳۸۔

(۲) پارہ نمبر ۷ سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۰۸، نیز پارہ ۱۹ سورۃ نمل آیت ۴۔

مال ودولت میں ایک کشش رکھ دی، اور ادھر انسان کے دل میں بھی ایک خواہش رکھ دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان خواہشات کے پورا کرنے کے لئے کچھ حدود مقرر کر دیں، ضابطے بنا دیئے، کہ ان حدود کے اندر رہ کر ان ضابطوں کے مطابق اپنی خواہشات تم نے پوری کرنی ہیں، اب ان حدود کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنی ہر خواہش پوری کرے تو پھر یہی خواہشات اُس کے لئے دینی دنیوی ظاہری اور باطنی اعتبار سے ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں، یہ تو ہے کہ اگر وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی خواہشات کو پورا کرے۔

اور اگر ان چیزوں کے اندر یہ خواہش اور کشش نہ رکھی جاتی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ جب کشش نہ ہوتی تو زبردستی تو جوڑ لگ نہیں سکتے، تو پھر یہ جو اولاد کا سلسلہ ہے نہ یہ چلتا، نہ اولاد کے لئے آدمی جتنی تکلیف برداشت کرتا ہے، محنت کرتا ہے، مشقت اُٹھاتا ہے، نہ پھر یہ اُٹھاتا، تو انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے لئے کشش رکھ دی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان کی نسل آگے چلی، اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے مال ودولت کے اندر کشش رکھ دی، پھر انسان اس کے حاصل کرنے کے لئے اتنی محنت اور مشقت کرتا ہے، اور کتنا کچھ کرتا ہے، نئے سے نئے خزانے حاصل کرنے کے لئے اپنی صلاحیتیں استعمال کرتا ہے، دن رات ایک کر کے جستجو میں لگا رہتا ہے، کتنے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مناظر سامنے آگئے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے اندر یہ شوق اور جذبہ نہ رکھتے اور ان چیزوں کے اندر یہ کشش نہ ہوتی تو انسان ان کے حصول کے لئے اتنی محنت نہ کرتا، اتنی جستجو نہ کرتا، تو نہ یہ چیزیں دریافت ہوتیں، نہ چیزیں وجود میں آتیں، اور نہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اس طرح مناظر کھلتے۔ اور اسی طریقے سے اگر ان کے اندر کشش نہ ہوتی تو کبھی بھی یہ چور چوری نہ کرتا، اب چور نے چوری کی، اُس کو ایک کشش اس چیز کے اندر نظر آئی، تو چور کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی، اور اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے اس نے تگ ودو کی، جائز طریقے سے اُس کو نہیں مل سکی تھی تو اُس نے چوری والا طریقہ اختیار کر لیا، لیکن اس کی وجہ سے ہوا کیا؟ چور چوری کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اسی کی وجہ سے کئی لوگ ہیں جن کو روزی مل رہی ہے، جو مکانات بنائے جاتے ہیں، سٹور بنائے جاتے ہیں، پھر اُن کے دروازے لگتے ہیں، پھر ان کو تالے لگتے ہیں، چوکیدار مقرر کیے جاتے ہیں، یہ صرف اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، چوروں سے اپنے مال کو بچانے کے لئے ہے، تو مال کے اندر کشش رکھی اور ادھر انسان کے اندر خواہش رکھ دی، اُس نے اس کے حاصل کرنے کے لئے چوری والا طریقہ اختیار کیا، اس کی وجہ سے مستریوں اور مزدوروں کو بھی رزق مل گیا، اس کی وجہ سے دروازے بنانے والوں کو روزی مل گئی، اور اس کی وجہ سے تالے بنانے والوں کو روزی مل گئی، اس کی وجہ سے تالے مرمت کرنے والوں کو روزی مل گئی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی نسبت سے دیکھا جائے تو اللہ نے بھی ان چیزوں کو پُر کشش بنایا، یہ انسان کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اور اگر انسان تھوڑی سی دور اندیشی سے کام لے اور یہ سوچ لے کہ بجائے اس کے کہ دنیا کی اِن گھٹیا چیزوں سے خواہش پوری کرے، اللہ تعالیٰ نے ایک اگلا جہان بنایا ہے اور جنت کے اندر بڑے اُونچے پیمانے پر اعلیٰ سطح پر خواہشات پوری ہوں گی، میں یہاں خواہشات پوری کرنے کی بجائے ایسی زندگی گزاروں کہ ساری خواہشات جنت میں پوری ہوں، تو یہی انسان کے اندر خواہش اس کے لئے آخرت کے لئے محنت کا ذریعہ بھی بن جائے گی۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ تزئین کی نسبت جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی تو اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے چیزیں پیدا کیں کہ ان کے اندر خلقی طور پر کشش رکھ دی، اور جہاں شیطان کی طرف نسبت کی گئی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسان

کے اندر جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کی خواہش رکھ دی اور اُس کے دل کے اندر اُن کے حصول کا جذبہ رکھ دیا، اُس کو اس طریقے سے اُبھار دینا کہ وہ اس کے دین ایمان پر غالب آ جائے، دین ایمان اس کے سامنے مغلوب ہو جائے، شیطان کی طرف جہاں پر تزئین کی نسبت ہے وہ اس معنیٰ کے لحاظ سے ہے، یہاں پر یہی ہے کہ کافروں کے لئے دنیوی زندگی مزین کر دی گئی، یہاں پر مزین کرنے والا یہی شیطان ہے، اس نے اس طریقے سے کافروں کے اندر یہ جذبات اور خواہشات ابھار دیں، اور مال وجاہ کی اتنی کشش اُن کے اندر پیدا کر دی، کہ اب یہ اپنا اصل مقصد اسی کو سمجھتے ہیں کہ مال حاصل ہو جائے، کوئی مرتبہ ہمیں مل جائے، اور اگر اُن کو یہ بات نظر آتی ہے کہ ایمان لانے میں اور دین اختیار کرنے میں ہمیں یہ کچھ نہیں ملے گا تو وہ دین کا بھی انکار کر دیں گے، اللہ کی کتاب کا بھی انکار کر دیں گے، بلکہ اللہ کے رسول کے ساتھ عداوت پر اتر آئیں گے، اسی لیے قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو مقابلہ کرنے والے تھے وہ اکثر وبیشتر ایسے ہی اہلِ ثروت لوگ تھے۔

ایک اور بات بھی یہاں پر یاد رکھو......! بعض مفسرین نے ایک اور وجہ بیان کی، کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فعل کی نسبت کبھی سبب کی طرف ہو جاتی ہے، اور کبھی نسبت ہوتی ہے بطور حقیقت کے، یہ اُسی بات کا ایک اور عنوان ہے، تو چیزوں کے اندر چونکہ کشش اللہ پاک نے رکھی، اللہ پاک نے اُن کو اس انداز سے پیدا کیا کہ ان کو پُرکشش بنایا، خوبصورت بنایا، تو اس اعتبار سے تو اللہ کی طرف نسبت ہے بطور حقیقت کے، لیکن یہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے اندر پُرکشش چیزوں کی خواہشات رکھ دیں اور چیزوں کو بھی پُرکشش بنا دیا، تو اس میں اس خواہش کو غلط رنگ کے ساتھ پورے کرنے کا راستہ دکھانے والا شیطان ہے، اس نے پھر غلط راستہ دکھایا کہ یہ خواہش تو نے اس طریقے سے پوری کرنی ہے۔ اللہ نے بھی راستہ بتایا شریعت والا، کہ خواہشات پوری کرو اس شریعت کے راستے پر چلتے ہوئے، لیکن شیطان نے اُن کو ایک اور غلط راستہ دکھایا گناہوں والا، معصیت والا، تو چونکہ شیطان پھر اس غلط راستے پر اُن کو چلاتا ہے ان خواہشات کے پورا کرنے کے لئے، تو شیطان گویا کہ سبب بن گیا ان غلط راستوں پر اُن کو چلانے کے لئے اور ان کی خواہشات پوری کرانے کے لئے، اُس نے وسوسے ڈالے، اُسی نے اُن کے دل کے اندر غلط راستوں کا شوق ڈال دیا، اُن کو ادھر لگا دیا، اس لیے پھر شیطان کی طرف نسبت کر دی گئی۔

تزئینِ دُنیا کا نتیجہ

وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا: یہ اسی تزئینِ دنیا کا نتیجہ بیان کیا، کہ چونکہ اُن کے سامنے دنیوی زندگی مزین کر دی گئی اس لیے اب کسی کی عزت وذلت کا پیمانہ اور معیار اُن کے ہاں وہی دنیوی زندگی کی آسائشات عیش وعشرت اور مال وجاہ بن گیا، جس کے پاس اُن کو مال ودولت اور دنیا کے اعتبار سے اونچا منصب نظر آتا ہے وہ اُن کے نزدیک صاحب عزت ہے، اور جس میں وہ مال ودولت اور اُونچا مرتبہ نظر نہیں آتا وہ اُن کے نزدیک حقیر اور ذلیل ہے، انہوں نے پھر عزت وذلت کا پیمانہ اُس کو بنا لیا، اس لیے جو مؤمنین ایمان لائے تھے اُن کے پاس چونکہ مال ودولت نہیں تو یہ پھر اُن مؤمنین سے استہزاء کرتے اور اُن کو گھٹیا سمجھتے، اُن کا مذاق اڑاتے، اور ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ جس کے دل میں آخرت کا فکر نہیں، خوفِ خدا نہیں، اور دین کی محبت نہیں، دنیا کی محبت کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی ہے، دنیا کی عظمت اُس کے دل میں ہے تو وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے، کہ اگر اُس کو کوئی مال و دولت والا نظر آجائے گا تو اس کے لئے تو پھر بے تاب ہو کر اور آگے بڑھ کر استقبال کرے گا، خواہ وہ چور ڈاکو بدمعاش کیوں نہ ہو، اور اگر اُس کے پاس مال و دولت نہیں، دنیا کا کوئی اعلیٰ منصب اُس کے پاس نہیں، تو پھر بڑے سے بڑا ولی کیوں نہ ہو اُس کے نزدیک وہ حقیر ترین ہوگا، اس لیے کہ وہ اس کے اعتبار سے عزت وذلت کے معیار پر پُورا نہیں اترتا، نہ اس کے پاس مال، نہ اس کے پاس کوئی منصب، اس لیے یہ اُس کو حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھے گا۔

مؤمنین کو تسلی

وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا: یہاں سے مؤمنین کے لئے تسلی ہے، اللہ نے اُن کو تسلی دی، کہ یہ دنیا کی چندروزہ بہار ہے، کہ مال و دولت والے مال و دولت کی وجہ سے یا کسی بڑے منصب کی وجہ سے اپنے آپ کو باعزت سمجھتے ہیں اور ایمان والوں کو گھٹیا سمجھتے ہیں، لیکن قیامت والے دن جو ایمان والے ہیں، اہل تقویٰ لوگ ہیں یہ اُن پر بلند ہوں گے مقام کے لحاظ سے بھی اور مرتبے کے لحاظ سے بھی، اللہ تعالیٰ ان کو بہت اونچا مقام بھی عطا کریں گے، اور اسی طرح اونچا مرتبہ بھی عطا کریں گے، تفسیر روح المعانی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ محل بھی اُونچے اُونچے اُن کو دیں گے، مرتبہ بھی اُن کو بہت اونچا عطا فرمائیں گے، تو تسلی دی گئی کہ دنیا کی اس تکلیف سے اور اُن کے طعن و تشنیع اور ان کی تحقیر سے گھبرانا نہیں، بلکہ تمہاری نظر اس بات پر ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وہاں یہ ساری کمی پوری کردیں گے، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی اللہ تعالیٰ تمہیں نعمتیں عطا کریں گے، چنانچہ دوسری جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کا ذکر کیا وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ'' (سورۃ المطففین: ۳۱) دُنیا میں یہ اِستہزا کرتے ہیں، لیکن قیامت والے دن ایمان والے ان کے ساتھ اِستہزا کریں گے، کہ اِستہزا کرنے والو! اب بتاؤ، وہ مال و دولت تمہارے کام آئے؟ وہ کوٹھیاں تمہارے کام آئیں؟ وہ مرتبہ اور منصب جس پر تم فخر کیا کرتے تھے آج وہ تمہارے کام آئے؟ تو یہ پھر ان سے اِستہزا کریں گے۔ سورۂ مؤمنون میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ'' (سورۃ المؤمنون: ۱۱۰) کہ تم نے ان ایمان والوں کو دنیا کے اندر اِستہزا کا ذریعہ بنایا، اور اتنا اِستہزا کیا کہ تم نے میرے ذکر کو یعنی شریعت کو اور قرآن کو ہی تم نے بھلا دیا، اتنے تم اِستہزا میں لگے اور ان کے ساتھ اِستہزا کرتے رہے، اور انہوں نے تمہارے اِستہزا پر اور ایذارسانی پر صبر کیا، آج میں نے ان کے صبر کی وجہ سے اُن کو کامیاب کردیا، اور وہ اپنے مقصد کو پا گئے۔ اسی طریقے سے نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی تو یہی کیا، اپنے ایمان نہ لانے کا انہوں نے یہی عذر بیان کیا: ''مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا'' (سورۃ ہود: ۲۷) گویا کہ ایمان لانے والوں کو انہوں نے بھی گھٹیا سمجھا، ''وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ'' (سورۂ شعراء: ۱۱۱) اور مشرکین مکہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی شرط لگائی تھی کہ یہ جو ایمان لا چکے ہیں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ان کے بارے میں کہا کہ یہ تو بہت گھٹیا لوگ ہیں، ہم ان کے ساتھ بیٹھنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں، ہم ان کے ساتھ بیٹھنا گوارہ نہیں کرتے، لہٰذا ہم ایمان تب لائیں گے

اور آپ کی بات تب سنیں گے کہ جب ہم آئیں تو یہ نہ آئیں، اگر یہ آئے ہوئے ہوں گے تو ہم نہیں آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو سختی کے ساتھ یہ حکم دیا وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (سورۂ انعام: ۵۲) کہ خبردار! ان غریبوں کو نہیں ہٹانا۔ اور حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو مشہور ہے جس پر پوری سورت اُتری: عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ (سورۃ عبس: ۱ تا ۱۰) تو اللہ نے ان فقراء کو یوں تسلی دی۔

ایک اور انداز سے تسلی

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: یہاں سے دوسری تسلی دی کہ اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب، یعنی اتنا زیادہ جو حساب میں ہی نہیں آسکتا، کیونکہ حساب میں تھوڑی چیز آتی ہے، اللہ اُن کو اتنا دیتا ہے جو حساب سے ہی باہر ہے، اللہ تعالیٰ اَن گنت اور بے شمار رزق عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اس میں ان فقراء کے لئے تسلی ہے کہ یہ تقسیمِ الٰہی ہے، اللہ نے کسی کو زیادہ دے دیا اور کسی کو تھوڑا دے دیا، تو اگر اللہ نے اُن کو زیادہ دے دیا اور تمہیں تھوڑا دیا، اور اس تھوڑے ہونے کی وجہ سے تمہیں گھٹیا اور حقیر سمجھتے ہیں اور تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اِستہزا کرتے ہیں تو اللہ کی اس تقسیم پر تمہیں راضی رہنا چاہیے، اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیے، ایک تو ان کے لئے یہ تسلی۔ اور دُوسرا بعض نے یہ کہا کہ اس کے اندر تسلی یوں دی گئی کہ اللہ نے دُنیا میں تمہیں تھوڑا دیا ہے، لیکن قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اتنا دے گا کہ بِغَيْرِ حِسَابٍ، اس لیے اللہ یہ کمی وہاں پوری کردے گا وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۱) وہاں جو مانگو گے، جو چاہو گے، سب ملے گا، یہاں پر بس اللہ کی چاہت تم پوری کردو، وہاں اللہ تمہاری چاہتیں پوری کرے گا، اس لیے اس اِستہزا کی اور ایذا رسانی کی یہاں کوئی پروا نہ کرو اور دین پر پختہ رہو۔

پہلے تمام لوگ عقیدۂ توحید پر تھے

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً: یہاں سے واضح دلائل اور نشانیوں کے بعد بھی، واضح معجزات دیکھنے کے بعد بھی ان کے اسلام سے اعراض وانحراف اور انکار کرنے کا دوسرا سبب بیان کیا، پہلا سبب بیان کیا تزئین دنیا، یعنی حبِ مال اور حبِ جاہ، اور دوسرا سبب بیان کیا بغض، کینہ، حسد، عداوت، عناد، یہ چیزیں ہیں جو حق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، ایک تو یہاں یہ بیان کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ یہ جو اللہ کی نعمت کو کفر میں تبدیل کیا، اللہ کی نعمت کیا تھی؟ واضح دلائل، واضح معجزات، واضح احکامات، یہ اللہ کی نعمت تھی، لیکن انہوں نے ایمان لا کر ایمان کی نعمت حاصل کرنے کے بجائے ان آیات کے ساتھ کفر کیا، اس تبدیلِ نعمت اور کفر کا سبب بھی بیان کیا، فرمایا کہ ”لوگ پہلے ایک جماعت تھے“ ایک جماعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سارے کے سارے لوگ عقیدۂ توحید پر تھے، یہ کب تھے؟ جب اللہ تعالیٰ نے عہدِ الست لیا تھا، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى (الاعراف: ۱۷۲) تو سب نے عقیدۂ توحید اختیار کیا، پھر اسی طریقے سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں بھی سارے ایک عقیدے پر تھے، یا اس سے مراد یہ

ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا اور اس وقت کا فر و مشرک سارے غرق ہو گئے، تو جو بچ گئے تھے وہ سارے عقیدۂ توحید پر تھے، اُمَّۃً وَّاحِدَۃً تھے۔

سلسلۂ انبیاء کا سبب اور اس کا مقصد

پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، یہاں پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت یہی ہے کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا: ایک جماعت تھے پھر اس کے بعد انہوں نے اختلاف کیا کہ کوئی عقیدۂ توحید پر قائم رہا اور کوئی عقیدۂ توحید کا منکر بن گیا، اور جو اختلاف کرنے والے اور حق راستے سے ہٹنے والے تھے اُس وقت بھی اُن کا یہی انداز تھا، اور اب بھی یہی انداز ہے کہ ان کے پاس دلائل نہیں ہوتے، شکوک وشبہات ہوتے ہیں، حق کے بارے میں وساوس ڈالنا اور شکوک وشبہات پیدا کرنا۔ تو ایسی صورت میں پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا، حق وباطل میں فرق کرنے کے لئے، حق کا داعی بنا کر، اور حق وباطل کی پہچان کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا اور آسمانی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا، یہ ہے فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ۔ نحو کی اصطلاح میں یہ فَبَعَثَ کی جو فاء ہے اس کا نام ہے فاء فصیحیہ، فاء فصیحیہ سے پہلے اس کا معطوف علیہ مقدر ہوتا ہے اور وہ سبب ہوتا ہے، تو یہی اختلاف سبب بنا سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے شروع کرنے کا، تاکہ وہ انبیاء علیہم السلام آ کر حق وباطل کے درمیان فرق کریں، اسی لیے قرآنِ کریم کی ایک صفت ہے الفرقان، حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا، تو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ: جو خوشخبری دینے والے تھے مؤمنین کو جنت کی، اور ڈرانے والے تھے کافروں کو دوزخ سے، تو انبیاء علیہم السلام کی یہ دونوں صفتیں تھیں مبشر اور منذر، تبشیر اور انذار یہ دونوں کام پیغمبروں نے کئے، مؤمنین کو جنت کی بشارت دی اور کفار کو دوزخ سے ڈرایا۔

تعینِ حق کے لئے کتاب کا نزول

وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ: اور اللہ نے پھر ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری، بِالْحَقِّ: اور جو کتاب اللہ تعالیٰ نے اتاری، چونکہ حق اور باطل کے دونوں سلسلے موجود تھے، اور اشتباہ ہو گیا تھا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ذریعے سے حق کا تعین کیا کہ یہ حق ہے، لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ: تاکہ اللہ فیصلہ کر دے، اللہ کا نبی فیصلہ کر دے، اور وہ کتاب فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان، کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ: اس چیز میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا، انہوں نے اختلاف کیا تھا حق کے اندر، کہ کوئی حق کو ماننے والا تھا اور کوئی حق کے مقابلے میں حق کی نقل پیش کر کے اُس کو حق بتانے والا اور اصلِ حق کا انکار کرنے والا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور نبی کے ذریعے سے فیصلہ کرنے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا۔

آپس میں اختلاف کا سبب

آگے اللہ تعالیٰ نے سبب بتایا کہ یہ اختلاف انہوں نے کیوں کیا؟ اور اختلاف کن لوگوں نے کیا؟ فرمایا کہ یہ جو اختلاف کیا بَغْیًا بَیْنَھُمْ: آپس میں ضد حسد عناد اور عداوت کی وجہ سے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، تو اصل اختلاف کا جو سبب ہوتا ہے وہ

یہی اندرونِ خانہ کبھی تو شکوک وشبہات ہوتے ہیں، لیکن یہاں پر جو انہوں نے اختلاف کیا یہ تھا ضد حسد عناد اور عداوت کی وجہ سے، اور اختلاف بھی کیا مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ کہ اُن کے پاس واضح واضح احکامات اور دلائل آچکے تھے، لیکن واضح احکامات اور واضح دلائل آجانے کے بعد پھر بھی انہوں نے ضد وعناد کی وجہ سے اختلاف کیا، ایک ہے کہ اختلاف اس وجہ سے ہو کہ کوئی چیز واضح نہ ہو، غیر واضح ہونے کی وجہ سے اختلاف ہو، لیکن یہاں پر تو واضح دلائل اور واضح احکامات اللہ تعالیٰ کے آچکے جن کو کہا جاتا ہے اَحکامِ محکمہ، اس کے باوجود پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔

طالبِ حق کو ہدایت نصیب ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ نے جب انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کا فرق واضح کیا، اب حق واضح ہوگیا، لیکن حق کو تسلیم کس نے کیا؟ اس حق پر ایمان کون لایا؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ: کہ جس حق میں وہ اختلاف کر رہے تھے اس کی طرف اللہ نے ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے تھے، یعنی اُن کے اندر ضد نہیں تھی، عناد نہیں تھا، اور اُن کے اندر کوئی کینہ نہیں تھا، ان نقائص سے وہ پاک تھے، اور ایمان کا ارادہ رکھتے تھے، اُن کے اندر ایمان کی طلب تھی، ہدایت کی پیاس تھی، تو ایسے جو طالب حق لوگ تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہدایت دی اس حق کی طرف جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے، بِاِذْنِهٖ: اپنی توفیق کے ساتھ اور اپنے فضل کے ساتھ، اس سے معلوم ہوا کہ واضح احکامات بھی ہوں، واضح دلائل بھی ہوں، تو بھی ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے اندر ضد اور عناد نہ ہو، ضد اور عناد آجائے تو پھر سمجھانے والے پیغمبر ہوں اور سمجھنے والا ابولہب اور ابوجہل ہو تو بھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی پتہ چلا کہ یہ ہدایت نصیب اُسی کو ہوتی ہے جس کے اندر حق کی طلب ہو، جس کے اندر ایمان لانے کا اور ماننے کا ارادہ اور عزم ہو، اُس کو ہدایت نصیب ہوتی ہے، وہ اللہ سے ہدایت مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو ہدایت دے دیں گے فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ۔ تفسیر مظہری وغیرہ میں اس کی چند مثالیں بیان کی گئی ہیں، کہ یہود ونصاریٰ نے ایک اختلاف کیا قبلہ کے مسئلے میں، یہود کا قبلہ بیت المقدس کے مشرق کی طرف تھا اور نصاریٰ کا مغرب کی طرف تھا، فَهَدَانَا اللّٰهُ لِلْكَعْبَةِ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت کی کعبہ کی طرف، اسی طرح روزوں کے بارے میں اختلاف ہوا، کہ روزے کس مہینے میں رکھنے زیادہ فضیلت والے ہیں فَهَدَانَا اللّٰهُ لِشَهْرِ رَمَضَانَ۔ اسی طرح ایام کے بارے میں اختلاف ہوا، کہ ایام میں سے کون سا دن عبادت کے لئے زیادہ فضیلت والا ہے، نصاریٰ نے اتوار کو اختیار کیا اور یہود نے ہفتہ کے دن کو ترجیح دی فَهَدَانَا اللّٰهُ لِلْجُمُعَةِ۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے بارے اختلاف پیدا ہوا، کہ اُن کا مذہب کیا تھا؟ یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھے فَهَدَانَا اللّٰهُ لِلْحَقِّ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو حق بات تھی اس کی طرف ہماری راہنمائی کی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی انہوں نے اختلاف کیا، یہود نے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بہت بدزبانی کی، عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا، اور العیاذ باللہ ولد الزنا کہا، حضرت مریم علیہا السلام کے

بارے میں تہمت کی بات کی، اور نصاریٰ نے اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اللہ بنا دیا فَهَدَى اللّٰهُ لِلْحَقِّ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو حق بات تھی اللہ نے ہماری اُس کی طرف راہنمائی کی۔

اختلاف مذموم اور اختلافِ محمود کی تفصیل

دوسری جگہ یہ بھی آتا ہے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران:۱۰۵) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے اللہ کے واضح احکام اور واضح دلائل آجانے کے بعد پھر اختلاف کیا، اِس سے بات سمجھ میں آگئی کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں، ایک ہے اختلاف واضح احکامات اور واضح دلائل آجانے کے بعد، ان واضح احکامات میں اختلاف کرنا یہ اختلاف مذموم ہے، اور یہی اختلاف ہے جس کے نتیجے میں ۷۳ فرقے بنیں گے، اور ۷۲ دوزخ میں جائیں گے، تو محکمات اور واضح احکامات میں جو اختلاف ہے یہ اختلاف ۷۲ کو دوزخ میں لے جائے گا اور فقط ایک جنت کے اندر جائے گا۔ اور ایک اختلاف ہے غیر واضح مسائل میں جس کو اجتہادی اختلاف کہا جاتا ہے، یہ دوزخ میں لے جانے والا نہیں، بلکہ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق، کہ اگر مجتہد دُرست اِجتہاد کرے تو دوہرا اَجر، اور اگر اس نے اِجتہاد میں خطا کی تو ایک اَجر پھر بھی اللہ تعالیٰ دے دیں گے۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجتہدِ مُصیب بھی اجر کا مستحق ہے اور مجتہدِ مُخطی بھی اَجر کا مستحق ہے، اور اَجر ملے گا جنّت کے اندر، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجتہدِ مصیب بھی جنّت میں اور مجتہدِ مخطی بھی جنّت میں، اسی طرح دونوں کے پیروکار بھی جنّت میں، صرف اتنا ہے کہ جو مجتہد مصیب ہے اُس کے درجے زیادہ اُونچے ہیں اور اُس کو ثواب دُگنا ملے گا، مجتہدِ مخطی اور اس کے پیروکاروں کو درجہ کم ملے گا اور ثواب بھی کم ملے گا، لیکن بہر حال وہ بھی جنّت میں ہی ہوں گے، اس لیے یہاں پر جس اختلاف کی مذمت کی گئی اور جس اختلاف سے منع کیا گیا وہ ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ، بینات سے مراد واضح دلائل، واضح اَحکامات، تو جو واضحات میں اختلاف کرتا ہے یہ ہے وہ اختلاف جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنے گا۔

اللہ کس کو ہدایت دیتا ہے؟

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف، یعنی جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔ اور اللہ ہدایت کس کو دینا چاہتا ہے؟ جو اللہ سے ہدایت مانگتا ہے، جو طالبِ ہدایت ہے، اس کے اندر ضد نہ ہو، عناد نہ ہو، اور جن کے اندر ضد اور عناد ہوتی ہے وہاں تو ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (سورۃ البقرۃ:۷) وہاں تو اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے، اور اسی طرح وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (سورۃ الانعام:۲۵) اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی، تو اُن کو اللہ ہدایت نہیں دیتا، اللہ ہدایت انہی کو دیتا ہے اور اللہ کی مشیت انہی کو ہدایت دینے کی ہے جن کے اندر ضد و عناد نہ ہو، بلکہ اُن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ ہو، اور اُن کے دل کے اندر سچی طلب ہو، اور وہ اللہ سے ہدایت مانگیں اللہ ان کو ہدایت دیتا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری ج ۲ ص ۱۱۹۶ باب اجر الحاکم اذا اجتهد فاصاب/ صحیح مسلم باب ج ۲ ص ۷۶ بیان اجر الحاکم

اللہ کی طرف سے مؤمنین پر امتحان اور اس کا مقصد

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: اللہ تعالیٰ نے وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا سے ایمان والوں کو ایک تسلی دی، وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ سے دوسری تسلی دی، اَمْ حَسِبْتُمْ سے تیسری تسلی دی، نیز جب حق و باطل کا اختلاف ہوتا ہے اور معرکہ حق و باطل چلتا ہے تو پھر بعض دفعہ اہلِ حق کو مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں، اب آگے مضمون جو چل رہا ہے ایک تو اہل ایمان کو تسلی دینا مقصود ہے، اور دوسرا اُن کے اندر استقامت، ثابت قدمی اور پختگی پیدا کرنا مقصود ہے، اور تیسری چیز اُن کے اندر ایک بہادری دلیری اور شجاعت پیدا کرنا مقصود ہے، اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: کیا تم نے گمان کیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ پہلے لوگوں کے اُوپر جو حالات گزرے وہ حالات ابھی تمہارے اُوپر آئے ہی نہیں، جو پہلے لوگوں کے اوپر حالت آئی مصیبتوں کی، تکلیفوں کی، ایذا رسانیوں کی، وہ حالت تمہارے اُوپر نہیں آئی، تو تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ایسے ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ اور مصیبتیں اور تکلیفیں تمہیں پیش نہیں آئیں گی؟ جیسے سورۂ عنکبوت کے شروع میں ہے الٓمّٓ ۞ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ: کیا اللہ سچے اور جھوٹے لوگوں کو جدا نہیں کرے گا۔ اصل یہی ہے کہ یہ سچے اور جھوٹے مل جاتے ہیں، کوئی پتہ نہیں چلتا کہ ان میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے، منافق قسم کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں، اہل حق کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، اور وہی ہیں جو اندر گھس کر اہل ایمان کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں، اُن کے دین ایمان کو خراب بھی کرتے ہیں، شکوک و شبہات بھی پیدا کرتے ہیں، اندر گھس کر یہ مارِ آستین بن جاتے ہیں، جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اُن کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لئے اور اُن کو جدا جدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایسی بھٹی گرماتے ہیں جس سے یہ میل کچیل الگ ہو جائے، یہ منافقین کا گروہ الگ ہو جائے، اور مخلصین سے منافقین نکھر کر سامنے آ جائیں، مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰى یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (آل عمران: ۱۷۹)، تو اللہ تعالیٰ پھر اس طریقے سے ان کو جدا کرتے ہیں، اب جدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نام بتا دے کہ فلاں ایسا ہے، فلاں ایسا ہے، تو یہ بتانا نبی کریم ﷺ کی زندگی کے ساتھ مختص ہو جاتا، آپ پر تو وحی اُترتی لیکن آپ کے بعد تو پھر یہ صورت نہ بنتی، جبکہ اللہ کا یہ اصول دائمی ابدی ہے، کہ جب اس طریقے سے حق و باطل میں اختلاط ہو جائے، کوئی پتہ نہ چلے کہ اہل حق کون ہیں اور اہل باطل کون ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اُن کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے مصیبتوں اور تکلیفوں کی بھٹی گرماتے ہیں، اب ہوتا کیا ہے؟ کہ جو مخلص ہوتے ہیں وہ تو حق کی خاطر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن جو منافق قسم کے لوگ ہوتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اہل حق کے ساتھ رہنے میں مصیبتیں ہیں، تکلیفیں ہیں، آزمائشیں ہیں، رگڑے لگتے ہیں، اور وہ یہ رگڑے سہہ نہیں سکتے، تو پھر وہ ایک طرف ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ایک طرف ہو جائیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ بجگہ تسلی دی، اور اُن کے اندر استقامت اور ثابت قدمی پیدا کی، اور اُن کے اندر شجاعت بہادری اور ایمانی قوت اُبھاری کہ اگر ایسا وقت آ جائے کہ دین کی خاطر مصیبتیں تکلیفیں اُٹھانی پڑیں تو خندہ پیشانی کے ساتھ یہ مصیبتیں تکلیفیں اٹھاؤ۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: کیا تمہارا گمان ہے کہ تم جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے؟، وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ: حالانکہ ابھی تک نہیں آئی تم پر وہ حالت جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی، مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ: یہاں سے جو پہلے لوگوں کی حالت ہے اُس کی تفصیل ہے کہ اُن کی کیا حالت ہوئی، ان پر مالی تنگی آئی، بدنی تکلیفیں بھی آئیں، اُن پر اتنی تکلیفیں آئیں کہ وہ جھنجھوڑ دیے گئے، ہلا کر رکھ دیے گئے، اس قدر اُن پر تکلیفیں آئیں، اُن کا رسول بھی، اور رسول پر جو ایمان لیکر آئے تھے وہ بھی اللہ کے سامنے فریاد کرنے لگے مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ: اللہ! تیری مدد کب آئے گی؟ تو نے جو وعدہ کیا تھا، اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (سورۂ مؤمنون:۵۱) وہ تیرا وعدہ کب پورا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ: اللہ کی مدد قریب ہے، بس ذرا صبر کرو، استقامت اختیار کرو، ثابت قدمی اور پختگی دکھاؤ، جمے رہو، اللہ کی مدد آئے گی۔

اُممِ سابقہ کے مؤمنین پر تکالیف کا ایک نمونہ

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ اور اسی طرح وہ صحابہ جن کو ستایا گیا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر اپنی پریشانی کا اظہار کیا، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے سائے میں تشریف فرما تھے، تو حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اَلَا تَسْتَنْصِرُ لَنَا! اَلَا تَدْعُوْ اللّٰهَ لَنَا! آپ ہمارے لیے اللہ سے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ آپ ہمارے لیے دُعا کیوں نہیں کرتے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كَانَ الرَّجُلُ فِیْمَنْ قَبْلَكُمْ یُحْفَرُ لَهٗ فِی الْاَرْضِ فَیُجْعَلُ فِیْهَا کہ تم ابھی اس تکلیف پر گھبرا گئے ہو؟ تم سے جو پہلے لوگ تھے ان میں سے ایک آدمی کو پکڑا جاتا اور زمین میں اس کے لیے گڑھا کھودا جاتا، اس زندہ کو اس گڑھے کے اندر ڈال کر، فَیُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِهٖ فَیُشَقُّ بِاثْنَتَیْنِ اس کے سر کے اُوپر آری رکھ کر اُس کو آری کے ساتھ دو ٹکڑے کر دیا جاتا، وَیُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَا دُوْنَ لَحْمِهٖ مِنْ عَظْمٍ اَوْ عَصَبٍ لوہے کی کنگھی بنا کر اُس کے ساتھ اُن کی ہڈیوں سے گوشت نوچ لیا جاتا، وَمَا یَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِیْنِهٖ لیکن اتنی سخت سے سخت تکلیف بھی اُس کو اُس کے دین سے نہ پھیر سکتی، اتنی استقامت اور ثابت قدمی دکھاتے۔ ”وَاللّٰهِ لَیُتِمَّنَّ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰی یَسِیْرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ اِلٰی حَضْرَمَوْتَ لَا یَخَافُ اِلَّا اللّٰهَ اَوِ الذِّئْبَ عَلٰی غَنَمِهٖ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ“[1] اللہ کی قسم! اللہ اس دین کے معاملے کو کامل کرے گا، اللہ اس کو غالب کرے گا حتیٰ کہ اتنا غالب کر دے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا، اور سوائے اللہ کے اس کے دل میں کسی کا خوف نہیں ہوگا، دشمن اس طرح مغلوب ہو جائے گا، اور حتیٰ کہ بھیڑیے بکریوں کو نقصان پہنچانا چھوڑ دیں گے، لیکن تم ذرا جلدی کر رہے ہو، اس لیے ذرا صبر دکھاؤ، استقامت اختیار کرو، ایمانی قوت پر قائم رہو، تو یہ حقیقت میں آئے گا، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی۔

اِنفاقِ مال کی ترغیب اور اس کے مصارف

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ: اب ظاہر بات ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فقر و فاقہ کی وجہ سے طعنے دیئے جا رہے تھے اور اُن کو ستایا جا رہا تھا، تو جو اہلِ ثروت ہیں اُن کے دل میں جذبہ پیدا ہوا ہوگا، کہ ہم کچھ مال خرچ کریں، اُن کی امداد کریں، اُن کی پریشانی

(1) صحیح البخاری ج۱ ص۵۱۰ باب علامات النبوۃ فی الاسلام. ج۲ ص۱۰۲۷ عن خباب بن الارت رضی اللہ عنہ باب من اختار الضرب.

میں کام آئیں، تو پھر آپ سے پوچھا ہوگا کہ اللہ کے راستے میں ہم کیا کچھ خرچ کریں؟۔ اسی طرح جب کفار کے مظالم کا ذکر کیا تو اب ان مظالم کے سدباب کے لئے ایک تدبیر بتائی، یہ تدبیر کیا ہے؟ القتال القتال القتال، اس کی تدبیر قتال ہے، قتال کفار کے ظلم وستم کے سدباب کے لئے ہے، لیکن یہ قتال موقوف ہے انفاقِ مال پر، اس لیے پھر اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کے بتانے سے پہلے انفاقِ مال کا حکم ذکر فرمایا، اور اس کے بعد پھر قتال کا۔ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا مَاذَا یُنْفِقُوْنَ: کونسی ہے وہ چیز جس کو وہ خرچ کریں؟ تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہلوایا، قُلْ: فرما دیجئے مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ: جو مال بھی تم خرچ کرو پس وہ خرچ کرو والدین کے لئے اور قرابت داروں کے لئے، وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ: یتیموں کے لئے اور مسکینوں کے لئے، وَابْنِ السَّبِیْلِ: اور مسافرین کے لئے، مسافرین کے اندر مجاہدین بھی آ گئے۔ اب سوال تو یہ تھا کہ کونسی ہے وہ چیز جس کو وہ خرچ کریں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو جواب ذکر فرمایا، اس انداز سے کہ اس کا جواب بھی دے دیا اور ایک مزید فائدے کی بات بھی بتا دی، کیا چیز خرچ کریں؟ اس کا جواب دیا مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ: جو مال بھی خرچ کر سکتے ہو کرو، خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، مِّنْ خَیْرٍ یہ مَا کا بیان ہے، اور مَا عموم کے لئے ہے، کہ جو مال بھی خرچ کر سکتے ہو، خواہ تھوڑا خواہ زیادہ، اپنی گنجائش کے مطابق جو بھی خرچ کر سکتے ہو کرو، یہ تو اس کا جواب آ گیا کہ کونسی چیز خرچ کریں، تو جواب یہی ہوا کہ جو خرچ کر سکتے ہو۔ اور آگے مزید ایک بات بتائی کہ جو مال خرچ کرو اُس کا مصرف یہ ہے، والدین کے لئے، قرابت والوں کے لئے، یتیموں مسکینوں کے لئے، مسافرین کے لئے، یہ مصرف بھی بتا دیا، اور جو اصل سوال کیا گیا تھا اُس کا جواب ضمناً آ گیا۔ اور جو زائد بات بتائی جا رہی ہے یعنی مصرف، اُس کو زیادہ صراحت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا، اشارہ اس بات کی طرف کیا گیا ہے کہ مال خواہ تھوڑا خرچ کرو یا زیادہ، وہ تو اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرو، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مال صحیح مصرف میں خرچ کرو، اگر تھوڑا مال ہو اور صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے تو یہ عنداللہ قبولیت کا اور نجات کا ذریعہ بن جائے گا اور کامیابی کا ذریعہ بن جائے گا، اور اگر مال تو زیادہ سے زیادہ مقدار میں خرچ کیا لیکن صحیح مصرف پر خرچ نہیں کیا تو اس پر مطلوبہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوگا، اور اللہ کی رضا بھی حاصل نہیں ہوگی، تو اس لیے اصل چیز یہ ہے کہ صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ: یہ پھر آگے ترغیب دی انفاقِ مال کی، کہ جو نیکی بھی تم کرو گے، اور اسی طریقے سے یہاں تعمیم کرنا مقصود ہے کہ صرف انفاقِ مال نہیں، انفاقِ مال کے علاوہ اور بھی بہت سارے کارِ خیر ہیں، تو جو نیکی بھی تم کرو گے، مال خرچ کرنے والی، یا اس کے علاوہ بیماروں کی تیمارداری کرنے والی، مجاہدین کے گھروں کی دیکھ بھال کرنے والی، مجاہدین جو جہاد میں چلے جاتے ہیں اُن کے گھر کے بھی کچھ مسائل ہوتے ہیں، تو جو پڑوسی ہوتے ہیں پیچھے رہنے والے، اُن کا کام یہی ہے کہ وہ یہ فریضہ انجام دیں، تو جو نیکی بھی تم کرو گے مال خرچ کرنے والی، جہاد کرنے والی، مجاہدین کی خدمت کرنے والی، اور بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسا ہوتا تھا کہ میں جمعہ پڑھنے جا رہا ہوں، اور تو اپنے مال کی بھی خبر گیری کرنا اور میرے مال کی بھی، وہ جو نماز پڑھنے کے لئے گیا یہ پیچھے اُس کے مال کو سنبھالتا، اگلا جمعہ آیا تو پہلے جمعے میں جو کام کاج کرنے والا تھا وہ جمعہ پڑھنے کے لئے جاتا، اور دوسرا پیچھے رہتا اور اُس کے کام کاج کو بھی سنبھالتا، تو اسی طرح مجاہدین کچھ جہاد کے لئے چلے گئے، لیکن اُن کے

پیچھے کئی کام ہوں گے، تو پھر جواُن کے پیچھے رہنے والے ہیں وہ خدمات سرانجام دیں، تو مَاتَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ کے اندر عام لفظ استعمال کیا گیا کہ جو نیکی بھی تم کرو گے اللہ تمہیں بدلہ دے گا، فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ: کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے، وہ جانتا ہے، تمہاری وہ نیکی ضائع نہیں جائے گی۔

کراہتِ طبعی اور کراہتِ عقلی

انفاقِ مال کے بعد اب آگے قتال کا حکم ہے، انفاقِ مال کے ساتھ آلاتِ جہاد تیار ہو گئے، تو اب آگے قتال کا حکم آرہا ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: فرض کیا گیا ہے تم پر قتال حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔ ایک کراہت عقلی ہوتی ہے اور ایک طبعی ہوتی ہے، اگر اللہ کی طرف سے حکم ہو اور کراہت عقلاً ہو یہ کُفر ہے، جب کوئی عقل کے اعتبار سے اس کو ناپسند سمجھے اور نہ مانے تو یہ کُفر ہے، اور ایک کراہت طبعی ہے، کہ عقل کے اعتبار سے تو وہ مانتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور فرض ہے، لیکن طبیعت پر گراں ہے، جو عقلاً کراہت ہوتی ہے یہ اختیاری ہے، اور جو طبعاً کراہت ہوتی ہے یہ غیر اختیاری ہوتی ہے، اس لیے یہاں کراہت سے کراہت طبعی مراد ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے، ناگوار ہے، یہ جو کہا کہ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ یہ فرضیتِ قتال والے حکم کی تاکید ہے، کہ خواہ تم قتال کو پسند نہیں کرتے لیکن قتال تمہارے اوپر فرض ہے، اس لیے یہ کراہت طبعی قتال میں رکاوٹ نہیں بنی چاہیے۔

کراہتِ طبعی کا اِزالہ کیسے ممکن ہے؟

آگے اللہ تعالیٰ نے اس کراہت طبعی کا ازالہ فرمایا جو جہاد اور قتال میں مانع بن سکتی ہے، ازالہ کے لئے یہ فرمایا کہ یہ جو تمہاری کراہت ہے یہ کراہت بے اعتباری ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو لیکن اسی میں تمہارے لیے بہتری ہو، اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم پسند کرو لیکن وہ تمہارے لیے نقصان دِہ ہو، یعنی انسان کی پسند تو ایسے ہی ہے جیسے چھوٹے بچّے کے سامنے انگارے رکھ دیے جائیں اور وہ چمک رہے ہوں تو وہ کس طرح سے اُچھل اُچھل کر اُن تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اور جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے، اس کا جی یہ چاہتا ہے کہ دوڑ کر پہنچ جائے، لیکن جب ماں کی نظر پڑتی ہے تو وہ تڑپ جاتی ہے، وہ دوڑ کر آتی ہے، فوراً اس کو پیچھے کھینچتی ہے، اب بچّہ چیختا ہے، چلاتا ہے، اکڑ اکڑ کر وہ گرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ادھر ہی زور لگاتا ہے، ماں اُس کو کھینچ لیتی ہے، ماں جانتی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، لیکن بچّے کو نہیں پتہ۔ اسی طرح کڑوی دوائی ہے، جب ماں بچّے کو پلانے لگتی ہے تو بچّے کی کیا حالت ہوتی ہے، بچّہ کبھی منہ ادھر پھیرے گا، کبھی ادھر پھیرے گا، کبھی ہاتھ مار کر گرانے کی کوشش کرے گا، اخیر ماں کیا کرتی ہے، کہ اُس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھنسا لیتی ہے اور گھٹنوں کے ساتھ اُس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیتی ہے، قابو کر کے چمچ اُس کے منہ میں رکھتی ہے، اُس کے دانت کھول کر دوائی پلٹ دیتی ہے، اب ضد میں پھر بھی وہ کوشش کرتا ہے کہ میں نہ نگلوں، لیکن جب تک وہ حلق سے نیچے نہیں اُتر جاتی ماں چمچ باہر نہیں نکالتی، اب دیکھو! بچّہ اُس دوائی کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ وہ اُس کے لئے مفید ہے، اور وہ انگاروں کو پسند کرتا ہے حالانکہ وہ اُس کے لئے نقصان دِہ ہیں، اللہ کے

علم کے مقابلے میں انسانوں کی مثال یہی ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اس میں تمہارے لیے بہتری ہو، اور ایک چیز کو تم پسند کرو اور اس میں تمہارے لیے شر ہو، وہ نقصان دہ ہو، کیوں؟ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ: اللہ انجام کو جانتا ہے اور تم انجام کو نہیں جانتے، اس لیے اللہ کا علم کامل ہے، تمہارا علم ناقص ہے، تو جب اللہ فرماتے ہیں کہ قتال فرض ہے تو یقیناً قتال میں فائدہ ہی فائدہ اور خیر ہی خیر ہے، اور ترکِ قتال میں نقصان ہی نقصان ہے، اس لیے اگر طبعی کراہت تمہارے اندر ہے تو اُس کو نکال باہر کرو، اللہ کے علم پر یقین رکھو، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کو خوشدلی سے قبول کر کے قتال کرو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ

وہ آپ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے کے متعلق یعنی اس میں قتال کے متعلق، فرمادیجئے کہ اس میں قتال بڑا گناہ ہے،

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ

اور اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے راستے کے ساتھ کُفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور مسجد حرام والوں کو

مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ

مسجد حرام سے نکالنا زیادہ بڑا گناہ ہے اللہ کے نزدیک، اور فتنہ زیادہ بڑا گناہ ہے قتل سے، اور وہ ہمیشہ

يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ

تم سے قتال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں پھیر دیں تمہارے دین سے اگر وہ طاقت رکھیں، اور جو کوئی

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ

تم میں سے پھر جائے گا اپنے دین سے پھر وہ مرے گا اس حال میں کہ وہ کافر ہے پس یہ لوگ ہیں کہ باطل ہوگئے

اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ

اُن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں، یہ لوگ ہیں آگ والے، وہ لوگ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

ہمیشہ رہیں گے اس میں ﴿۴۷﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لئے، یہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۴۸﴾

تفسیر

شانِ نزول

''وہ آپ سے پوچھتے ہیں'' یہ پوچھنے والے کون تھے؟ یا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، یا مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ سے یہ سوال کیا۔ ''شہرِ حرام کے متعلق پوچھتے ہیں'' قِتَالٍ فِيْهِ یہ الشَّهْرِ الْحَرَامِ سے بدل الاشتمال ہے، یعنی شہرِ حرام میں قتال کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل تفاسیر میں یوں آتی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، اُن کو ایک سریہ کا امیر بنا کر جمادی الاخریٰ کے اخیر میں بھیجا، اور یہ بھیجا بھی آپ نے جنگ بدر سے دو مہینہ قبل، اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آپ نے ایک خط لکھ کر دیا، اور آپ نے جب بھیجا تو یوں فرمایا کہ یہ خط لے لے، اللہ کا نام لے کر چل، لیکن دو دن چلتے رہو، اور اُس کے بعد تم پڑاؤ کے لئے اُترو تو اس وقت پھر خط کو کھولنا، اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے سامنے اس خط کو پڑھنا، اس خط کے اندر جو کچھ حکم لکھا ہوا ہے اُس کے مطابق عمل درآمد کرنا، لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر جبر نہیں کرنا۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ وہ خط لے کر چلے، اس طریقے سے وہ دو دن چلتے رہے، دو دن چلنے کے بعد جب اُترے تو خط کو کھولا، اور وہ خط اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنایا، اس میں یہ بھی تھا کہ بطن نخلہ میں جا کر ٹھہر جائیں، اور وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرے گا، اس قریش کے قافلے کا انتظار کرو، اور اس قافلے پر حملہ کرنا ہے لَعَلَّكَ تَأْتِيْنَا مِنْهَا بِخَيْرٍ شاید کہ آپ اس قافلے سے ہمارے پاس کوئی خیر لے آئیں، کوئی مال لے آئیں، جب خط پڑھ کر سنایا تو پہلے خود حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بھی پتہ نہیں تھا، کہ خط میں کیا لکھا ہوا ہے، اب پڑھنے سے پتہ چلا تو پڑھ کر فرمانے لگے سَمْعًا وَطَاعَةً ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، پھر اپنے ساتھیوں کو کہا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے منع فرمادیا ہے کہ میں تم میں سے کسی پر اِکراہ اور جبر کروں، لہٰذا فَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الشَّهَادَةَ فَلْيَنْطَلِقْ وَمَنْ كَانَ يَكْرَهُ فَلْيَرْجِعْ کہ جو تم میں سے شوقِ شہادت رکھتا ہے وہ تو چلے، اور جو اُس کو ناپسند کرتا ہے وہ لوٹ جائے، اس کے بعد پھر چل پڑے، جب یہ چلے مَضٰى أَصْحَابُهٗ مَعَهٗ اُن کے باقی ساتھی بھی اُن کے ساتھ چل پڑے، اور یہ کل آٹھ ساتھی تھے جو اس مقصد کے لئے آپ ﷺ نے بھیجے، اور آٹھوں کے آٹھوں وہاں سے چل پڑے، حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ جب بطن نخلہ جو مقام رسول اللہ ﷺ نے بتایا تھا کہ تم نے وہاں جا کر پڑاؤ کرنا ہے اور وہاں سے قریش کا قافلہ گزرے گا، اس سے یہ کچھ پیچھے تھے کہ اس قافلہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اونٹ تھا، جس پر یہ باری باری سوار ہوتے تھے، وہاں وہ اونٹ گم ہو گیا، تو یہ دونوں حضرات اُس اونٹ کی تلاش میں پیچھے رہ گئے، وہاں سے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے باقی چھ ساتھیوں کو لے کر چلے گئے، اور بطن نخلہ میں جا کر پڑاؤ کیا، یہ مکہ اور وادیٔ طائف کے درمیان میں جگہ تھی۔ اب وہاں پر اس قافلے کی انتظار میں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں، کہ قریش کا قافلہ وہاں

سے گزرا، اور اُن کے پاس کشمش اور اسی طرح طائف سے کچھ تجارتی سامان وہ لے کر آرہے تھے، اس قافلے کے اندر عمرو بن حضرمی، حکم بن کیسان (یہ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے)، عثمان بن عبداللہ، اور نوفل بن عبداللہ، یہ چار آدمی بھی تھے، جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ان اصحاب کو دیکھا، تو اُن کے اُوپر گھبراہٹ طاری ہوگئی، اور جہاں یہ صحابہ ٹھہرے ہوئے تھے، اُن کے کچھ فاصلے پر وہ بھی اترے، تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ جو قریش کا قافلہ ہے یہ تم سے ڈر گئے ہیں اور گھبرا گئے ہیں، تو ہوسکتا ہے ادھر اُدھر چھپیں (ہوتا یہی ہے کہ جب کوئی گھبرا جائے تو پھر وہ بچاؤ کی تدبیریں اختیار کرتا ہے) اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اُن کے دل سے خوف اور ڈر نکال دیا جائے تاکہ وہ بے فکر ہو کر وہاں پر رہیں۔ اب ترکیب یہ سوچی کہ ایسا کرو کہ اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور اس کو اُن کے سامنے کرو، چنانچہ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ (یہ بھی اُن چھ ساتھیوں میں تھے) کا سر مونڈا، اور اُن کے سامنے کر دیا، جب انہوں نے اُن کے گونے سر کو دیکھا تو اُن کے دل سے خوف دور ہوگیا، اور وہ کہنے لگے کہ یہ تو عمار کی قوم ہے، وہ قوم کوئی اتنی جرأت مند اور لڑائی والی نہیں، تو وہ بے فکر ہوگئے، ترکیب کامیاب رہی، اور ادھر پھر یہ صورت تھی کہ صحابہ کے خیال کے مطابق یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن تھا، حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ہمارے پاس یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے (اس کے بعد رجب شروع ہوجائے گا جو شہرِ حرام ہے)، لہٰذا آج رات ہی ان پر حملہ کر دینا چاہیے، جبکہ فی الواقع رجب شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ قتال کے شروع ہوجانے کے بعد یہ پہلا سریہ تھا جو نبی کریم ﷺ نے اس قافلے کے تعاقب میں بھیجا، سب سے پہلے اس قافلے میں واقد بن عبداللہ سہمی رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے تیر مارا عمرو بن حضرمی کو، اور سیدھا اس کو جا کر لگا اور اُس کو قتل کر دیا فَكَانَ اَوَّلَ قَتِيْلٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ سب سے پہلا تھا جو مشرکین کا آدمی یہاں پر قتل ہوا، اور ان میں سے حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو قید کر لیا، تو ایک کو قتل کر دیا اور دو کو قیدی بنا لیا، اور چوتھا اُن کا ساتھی نوفل تھا وہ بھاگ گیا، وہ ان کے ہاتھ نہ آیا، جو سامان لے کر جا رہے تھے وہ سامان بھی اُن کے ہاتھ لگا اور دو قیدی بھی، صحابہ رضی اللہ عنہم اُن کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ادھر قریش نے شور مچانا شروع کر دیا کہ قَدِ اسْتَحَلَّ مُحَمَّدٌ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَسَفَكَ الدِّمَاءَ وَاَخَذَ الْحَرَائِبَ کہ دیکھو! محمد ﷺ نے شہرِ حرام کو حلال سمجھ لیا، اس میں خون ریزی کو حلال سمجھ لیا، مال کا لینا حلال سمجھ لیا، اور مکہ میں جو مسلمان تھے اُن مسلمانوں کو بھی طعنے دینے شروع کر دیے کہ دیکھو! تمہارے محمد ﷺ نے شہرِ حرام کا لحاظ نہیں رکھا، اور ایک قافلہ مدینہ بھیج دیا اور اس مسئلہ کو بہت اٹھایا، اس پر نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو بھی تھوڑا سا ڈانٹا، آپ نے اُن پر کچھ ناگواری کا اظہار فرمایا، کہ میں نے تمہیں شہرِ حرام میں قتال کرنے کا حکم تو نہیں دیا تھا، تم نے شہرِ حرام میں قتال کیوں کیا؟ چونکہ یہ رجب کی ہی رات تھی، تو شہرِ حرام میں یہ قتال ہوا، اور یہ قتال ممنوع تھا، اس کے ذریعے سے جو انہوں نے مال حاصل کیا اور قیدی آئے نبی کریم ﷺ نے اُن کا معاملہ موقوف کر دیا، اور آپ نے لینے سے ہی انکار کر دیا، اسی طرح باقی مسلمانوں نے بھی ذرا ناگواری کا اظہار کیا اور سخت الفاظ کہے، حضور ﷺ کہنے لگے: لِمَ صَنَعْتُمْ مَالَمْ تُؤْمَرُوْا بِهٖ؟ جس کا

تمہیں حکم نہیں تھا وہ کام تم نے کیوں کیا؟ تو جب نبی کریم ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور باقی مسلمانوں نے بھی سختی کی تو سریہ والوں پر بڑی گھبراہٹ طاری ہوگئی، اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب نبی کریم ﷺ بھی ناگواری کا اظہار کر رہے ہیں اور دوسرے مسلمان بھی ہمارے اُوپر ناراض ہو رہے ہیں، تو ہماری تو خیر نہیں ہے، یہ تو ہم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو یہ ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ عمرو بن حضرمی کو بھی انہوں نے قتل کیا ہے، جب اُن کے سامنے یہ بات آئی کہ ہم نے بہت بڑا گناہ کیا، کہ مال اُن کا لے آئے اور دو آدمیوں کو قید کیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا کہ ہم نے تو اس سے بھی بڑا ایک کام کیا کہ عمرو بن حضرمی کو قتل بھی کر کے آئے ہیں، تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، اور اس کے اندر گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سریہ والوں کی حوصلہ افزائی کی، اور اہلِ مکہ جو مدینہ والوں کو پریشان کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ پریشانی بھی دُور کر دی۔ تو اس کے بعد پھر نبی کریم ﷺ نے اس مال کو بھی لیا، اور اس مال میں سے خمس کو جدا کیا، اور باقی مال ان سریہ والوں میں تقسیم کر دیا، قتال کے شروع ہو جانے کے بعد سب سے پہلا یہ مال تھا جو قتال کے ذریعے سے حاصل ہوا، اور سب سے پہلا خمس تھا جو نبی کریم ﷺ نے وصول کیا، اور یہ پہلی غنیمت تھی جو ان مجاہدین پر آپ ﷺ نے تقسیم فرمائی۔ یہاں پر تو معاملہ ٹھیک ہوگیا، لیکن اہلِ مکہ میں جو مسلمان تھے اور اُن کی قید میں تھے، وہ اُن کو طعنے دے رہے تھے، تو اُن کے بارے میں ایک پیغام حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھیجا، کہ اگر وہ تمہیں طعنہ دیں تو تم بھی اُن کو جواب میں کہنا، کہ تم وہی تو ہو جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہاں سے نکالا، وہی تو ہو جنہوں نے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روکا، یعنی قرآنِ کریم میں جو الفاظ ذکر کیے گئے یہی لکھ کر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھیجے، کہ تم اُن کو یہ جواب دو۔ پھر اہلِ مکہ نے ایسا کیا، کہ نبی کریم ﷺ کے پاس اپنا پیغام بھیجا، کہ ہمارے جو دو قیدی ہیں حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ، ان دونوں کا فدیہ لے لو اور ان کو رہا کر دو۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہم اُن کو فدیہ لے کر نہیں چھوڑیں گے، جب تک کہ سعد اور عتبہ ہمارے پاس نہ آئیں، چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور عتبہ رضی اللہ عنہ جس وقت آگئے تو پھر نبی کریم ﷺ نے اُن کو بھی رہا کر دیا (خازن، مظہری، وغیرہ)۔ تو یہ آیات جو آگے بیان کی گئی ہیں ان سب آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے اُن سریہ والوں کو تسلی دی، اور شہرِ حرام میں قتال کرنے کی وجہ سے جو ان کو پریشانی لاحق ہو رہی تھی اللہ نے ان کی وہ پریشانی دُور کی۔

بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جاتا ہے

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ: وہ آپ سے پوچھتے ہیں شہرِ حرام کے متعلق، یعنی اس میں قتال کے متعلق۔ فرما دیجئے **قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ**: اس میں شک نہیں کہ شہرِ حرام میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن جس گناہ کا سدِ باب کرنے کے لئے یہ قتال ہوا ہے وہ اس قتال فی الشهر الحرام سے کئی گنا بڑھ کر ہے، اور یہ شرعی قاعدہ بھی ہے اور تحقیقی قاعدہ بھی ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جاتا ہے، جیسے پاؤں کا انگوٹھا ہے اس پر اگر کسی شوگر والے کا پھوڑا ہو، یا کینسر ہو، اب ڈاکٹر کہتا

ہے کہ جب تک یہ انگوٹھا نہیں کاٹیں گے آپ کی ٹانگ نہیں بچے گی، یہ بڑھتا بڑھتا چھ مہینے سال تک آپ کی پوری ٹانگ ختم ہو جائے گی، لہٰذا انگوٹھا کٹوادو تاکہ باقی ٹانگ بچ جائے، جب ڈاکٹر یہ کہے گا تو اب یہ اپنے انگوٹھے کٹوانے کی ڈاکٹر کو فیس بھی دے گا، دوائیوں کا خرچ بھی برداشت کرے گا، سفارش بھی کروائے گا، اور کہے گا کہ دیر نہ ہو اور میرا انگوٹھا کٹے، حالانکہ انگوٹھا کاٹنا بھی تو ایک ضرر ہے، لیکن بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹا ضرر برداشت کیا جا رہا ہے، تو یہ ایک عقلی اصول بھی ہے اور شرعی اصول بھی ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹا ضرر برداشت کیا جاتا ہے۔

شہرِ حرام میں قتال سے بڑھ کر گناہ

تو اسی طرح یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہی جواب دیا کہ شہر حرام میں قتال ہوا، لیکن اس قتال فی الشہر الحرام کے مقابلے میں جو کچھ تم کر رہے ہو صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ یہ اللہ کے نزدیک اس قتال فی شہر حرام سے بڑھ کر گناہ ہے، ایک گناہ نہیں، کئی گناہ تم نے کئے۔ ان کے سدباب کے لئے اگر قتال فی شہر حرام ہوا ہے، تو وہ اَہون چیز ہے، اس لیے تم اس کبیرہ کو تو دیکھ رہے ہو، اور اپنے اکبر الکبائر کو نہیں دیکھ رہے؟۔ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کے راستے سے روکنا، یہ ایک گناہ، وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس کا عطف ہے سبیل اللہ پر، اور یہ صَدٌّ عَنْ کے تحت ہے، مسجد حرام سے روکنا، یہ دوسرا گناہ، اور كُفْرٌۢ بِهٖ: اللہ کے راستے کے ساتھ (اللہ کے راستے سے مراد ہے اللہ کا دین) کفر کرنا، یہ تیسرا گناہ، وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ: اور مسجد حرام والوں کو مسجد حرام سے نکالنا، یہ جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہوں نے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا، حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ اُن کے لئے وہاں پر رہنا مشکل ہو گیا، نبی کریم ﷺ کے خلاف اور آپ کو ختم کرنے کے لئے کیا کچھ سازشیں تیار کر لی تھیں، تو یہ سب اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ، اَیْ اَكْبَرُ وِزْرًا عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کے نزدیک یہ زیادہ بڑا گناہ ہے، وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ: پانچویں چیز یہاں فتنہ ہے، اس سے مراد ظلم شرک اور کفر ہے، اور اسی طرح پیغمبر کے ساتھ عداوت، مسلمانوں کی تحقیر، فتنے کے اندر یہ سب کچھ آ گیا، اور اسی طرح یہ جو بیت اللہ کے اندر بت رکھے ہوئے تھے، اللہ کے گھر میں بت پرستی ہو رہی ہے، اور اللہ کے دین سے بغاوت ہو رہی ہے، اور بیت اللہ کا ننگا طواف ہو رہا ہے یہ جو کچھ تھا یہ سارا فتنہ ہے اور یہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔

مجاہدین کو تسلی

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ: بعض دفعہ جب اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے تو جو مجاہدین ہوتے ہیں بعض اوقات اُن کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے بھی ناگواری کا اظہار کیا اور باقی مسلمانوں نے بھی اُن کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے، تو ان حالات میں کچھ نہ کچھ جذبات پر زد پڑتی ہے، حوصلے پست ہو جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جذبۂ قتال کو اُبھارنے کے لئے اور مزید پختہ کرنے کے لئے فرمایا وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا: کہ یہ طعنے دینے والے تمہارے بارے میں دل کے اندر اتنی عداوت رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ قتال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں

تمہارے دین سے پھیر دیں، اور قتال ہے ہی تمہیں دین سے پھیرنے کے لئے، اس بڑے مقصد کی خاطر ہے، اس لیے تم اپنے اندر اس فتنے کے کچلنے کا جذبہ زندہ رکھو، اور تم بھی اُن کے مقابلے میں قتال کے لئے تیار رہو۔

مُرتد کے اعمال کا حکم اور اس کا انجام

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ: چونکہ اُن کا مقصد تھا دین سے پھیرنا، تو اب اللہ تعالیٰ نے آگے اس کا انجام بتایا کہ جو تم میں سے دین سے پھرے گا (فَيَمُتْ کا عطف ہے يَّرْتَدِدْ پر) اور پھر وہ مرے کفر کی حالت میں، یعنی موت تک اس کُفر پر پکا رہا تو اُن کے اعمال باطل ہو گئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اعمال سے مراد ہیں اعمالِ صالحہ، اُن کے جو نیک عمل ہیں یہ دُنیا وآخرت کے اعتبار سے باطل ہیں، آخرت کے اعتبار سے تو باطل ہیں ہی، کہ جب کسی نے کفر اختیار کرلیا اور اسی کفر پر موت آئی تو اب آخرت میں اس کے اعمال باطل ہیں، اُن پر کچھ نہیں ملے گا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی قیمتی کپڑے اکٹھے کرے پھر اُن کو آگ لگادے، کُفر کی آگ کے ساتھ اپنے سب اعمال پھونک دیے، ان پر آخرت میں کوئی اجر نہیں ملے گا، اور یہ کہا کہ دنیا میں بھی وہ باطل ہیں۔ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: یہ لوگ ہیں آگ والے، اس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ایک تو یہاں پر یہ آیت ہے کہ جو تم میں سے دین سے پھر گیا اور دین سے پھرنے کے بعد موت تک اسی ارتداد پر اور کفر پر قائم رہا اس کے اعمال باطل ہو گئے، اور ایک آیت آگے چھٹے پارے میں آتی ہے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: جو کوئی کفر کرے گا ایمان کے ساتھ، یعنی ایمان لایا اور پھر اس نے ایمان کے ساتھ کفر کیا، فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ: اُس کا عمل باطل ہو گیا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ اب یہاں پر یہ ہے کہ جو کفر کرے فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ اور پھر کُفر کی حالت میں ہی وہ مرے أُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ تو یہاں موت علی الکفر کا بھی ذکر ہے، لیکن وہاں پر یہ ہے کہ جس نے ایمان کے بعد کفر کیا فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ: وہاں موت علی الکفر کا ذکر نہیں ہے۔ تو دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ اصل میں جو حابطِ عمل ہے یعنی باطل کرنے والی چیز ہے وہ ارتداد ہے، کہ جب ایمان کے بعد اُس نے کفر اختیار کیا تو کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اُس کے اعمال باطل ہو گئے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اُس آیت میں ہے، چونکہ وہاں پر موت علی الکفر کا ذکر نہیں، لہٰذا کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اُس کے اعمال باطل ہو گئے، اب آگے خواہ وہ بعد میں توبہ تائب ہو جائے تو بھی اُس کے اعمال باطل ہو چکے، یا کُفر پر موت آجائے تو بھی اُس کے اعمال باطل ہو گئے۔ دونوں آیتوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جب اس نے کُفر اختیار کرلیا تو کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اُس کے اعمال باطل ہو گئے، اب اگر توبہ کرے جیسا کہ وہاں پر موت علی الکفر کا ذکر نہیں ہے، تو بھی اُس کے اعمال باطل، اور اگر موت تک کُفر کے اُوپر قائم ہے تو بھی اعمال باطل۔ اب اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ کہ ایک آدمی نے حج کیا، پھر مرتد ہو گیا، پھر توبہ کرلی، تو کیا پہلے والے حج سے اس کا فرض ادا ہو گیا یا دوبارہ حج کرے؟ تو ان آیات سے معلوم ہوا کہ وہ اگر صاحبِ استطاعت ہو تو حج دوبارہ کرے، پہلے والا اس کا حج باطل ہو گیا، لہٰذا اُس کو نئے سرے سے حج کرنا پڑے گا۔

اہلِ سریہ لغزش کے باوجود ثواب سے محروم نہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا: اب اس قتال پر ثواب ملے گا یا نہیں، اور اس بارے میں آپ ﷺ سے اصحاب سریہ نے پوچھا بھی تھا کہ کیا ہمیں ثواب ملے گا یا ثواب نہیں ملے گا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری اور اُن کو تسلی دے دی، کہ تمہیں ثواب بھی ملے گا، اللہ کی رحمت بھی تمہیں نصیب ہوگی۔ ''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لئے، یہی لوگ ہیں جو امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی''، باقی اگر اُن سے کوئی کمی کوتاہی ہوئی ہے تو جو اُن کے دل میں ندامت آئی اور پھر اللہ کے سامنے توبہ استغفار کیا تو وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ ان کو بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے، اللہ بخش بھی دیں گے، مزید رحمت بھی فرمائیں گے، یا یوں کہہ لو کہ پیچھے دو چیزیں ذکر کی گئی ہیں یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ یہاں سے لے کر هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ تک، تو اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی کہ ان کے ذمے معصیت نہیں، یہ غفور ہونے کا اثر ہے، اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا یہاں سے تسلی دی کہ ان کو ثواب بھی ملے گا، اللہ کی رحمت بھی اُن کو نصیب ہوگی، یہ رحیم ہونے کا اثر ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ
لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ
اور لوگوں کے لئے منافع ہیں، اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے، اور آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ
مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ
کیا خرچ کریں، آپ کہہ دیجئے کہ ضرورت سے زائد کو خرچ کرو، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات کو واضح کرتا ہے
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
تاکہ تم سوچو ﴿۲۱۹﴾ دنیا میں اور آخرت میں، اور آپ سے سوال کرتے ہیں
الْیَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ
یتیموں کے متعلق، آپ کہہ دیجئے کہ اُن کے لئے اصلاح کرنا بہتر ہے، اور اگر اُن کا خرچ آپس میں ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں،
وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ
اور مصلحت رکھنے والے سے مصلحت کو فوت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا،

اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى یُؤْمِنَّ ؕ

بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۲۰﴾ اور نکاح نہ کرو مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں،

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا

اور البتہ ایمان والی باندی بہتر ہے مشرک عورت سے اگر چہ وہ تمہیں اچھی لگے، اور نہ نکاح کرو اپنی عورتوں کا

الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

مشرکین سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، البتہ ایمان والا غلام بہتر ہے مشرک سے

وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا

اگر چہ وہ تمہیں اچھا لگے، یہ لوگ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

جنت اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے، اور لوگوں کے لئے اپنے احکام کو واضح کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

تفسیر

"خمر" کا حقیقی اور مجازی معنیٰ

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ: وہ آپ سے سوال کرتے ہیں خمر اور میسر کے متعلق۔ قرآن وحدیث میں خمر کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو خمر کے دو اطلاق ہیں، یا یوں کہو کہ خمر دو معنوں میں مستعمل ہے، ایک خمر کا حقیقی معنیٰ، اور دوسرا خمر کا مجازی معنیٰ، ایک خمر کا اطلاق حقیقی ہے اور دوسرا مجازی ہے، حقیقتاً خمر کہا جاتا ہے کہ انگور کا کچا پانی جب وہ پڑا پڑا جوش مارنے لگ جائے اور سخت ہو جائے یعنی اُس کے اندر قوتِ مسکرہ پیدا ہو جائے، وہ اس حد کو پہنچ جائے کہ نشہ پیدا کرے، اور جھاگ پھینکنے لگے۔ تو تین چیزیں آگئیں۔ ۱۔ جوش مارے۔ ۲۔ اس کے اندر قوتِ مسکرہ پیدا ہو جائے۔ ۳۔ اور تیسری چیز یہ کہ جھاگ پھینکے، قذف بالزبد کی شرط امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے، اور ان کا دوسرا قول جس کو صاحبین نے ترجیح دی وہ یہی ہے کہ قذف بالزبد یعنی جھاگ پھینکنا شرط نہیں ہے، صرف اُس میں جوش آ جائے اور قوتِ مسکرہ پیدا ہو جائے تو یہ خمر کا مصداق ہے، تمام اہل لغت کا اتفاق ہے کہ خمر کا حقیقی معنیٰ یہی ہے، اور دوسرا خمر کا معنیٰ مجازی کا ہے، وہ خمر حقیقتاً نہیں لیکن خمر کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کو بھی خمر کہا جاتا ہے، اور وجہ تشبیہ کیا ہے؟ مشابہت کس چیز میں ہے؟ مشابہت اس چیز میں ہے کہ جیسے خمر نشہ لاتی ہے اسی طرح وہ چیزیں جن کو خمر مجازاً کہا گیا اُن کی بھی مقدار

اتنی پی لی جائے کہ جس سے نشہ آ جائے، تو چونکہ وہ زیادہ مقدار میں پی لینے سے نشہ لاتے ہیں اس لیے ان کو بھی خمر مجازاً کہا گیا۔

لفظِ ''خمر'' کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں

جیسا کہ زِنا کا ایک اطلاق حقیقی ہے اور ایک مجازی ہے، زِنا حقیقی تو ہے بدکاری، حرام طریقہ سے عورت کے ساتھ اپنی جنسی خواہش پوری کرنا، اسی کے بارے میں بعض بزرگوں کا قول ہے اَلْغِنَاءُ رُقْيَةُ الزِّنَا، گانا یہ زِنا کا ایک تعویذ ہے، اور اسی کے بارے میں حکم دیا وَلَا تَزْنُوا (بخاری، ص ۷) زِنا نہ کرو، وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (سورۂ اسراء: ۳۲)، اور اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا (سورۂ نور: ۲) یہاں پر بھی زانیہ اور زانی سے حقیقی معنیٰ مراد ہے، اور اسی کے مرتکب پر حد جاری ہوتی ہے۔ لیکن حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آنکھ کا غلط دیکھنا آنکھ کا زِنا ہے، کانوں سے غلط سننا کانوں کا زِنا ہے، ہاتھ سے پکڑنا ہاتھ کا زِنا ہے، پاؤں سے چل کر جانا پاؤں کا زِنا ہے۔[1] تو اس کو بھی زِنا کہا گیا لیکن یہ مجازی معنیٰ میں ہے، یہاں اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھوں سے اگر کوئی غلط دیکھے تو یہ زِنا ہے، لہٰذا اس کے اُوپر بھی حدِ زِنا جاری کی جائے، اس نے شہوت کے جذبے سے عورت کو ہاتھ لگایا تو اُس کے اُوپر بھی حد جاری کی جائے کہ اُس نے زِنا کیا ہے، ایسا نہیں، کیونکہ یہاں زِنا کا مجازی معنیٰ مراد ہے، اس لیے زِنا حقیقی کا حکم یہاں جاری نہیں ہوگا۔ اسی طرح شرک اور کُفر کا ایک حقیقی معنیٰ ہے کہ اللہ کے اَحکامات میں سے جو قطعی حکم ہے اس کا انکار کر دینا، جیسے نماز کا انکار کرنا کُفر ہے، لیکن اگر نماز کو دِل سے تسلیم کرے کہ یہ فرض ہے اور عملاً نماز نہ پڑھے تو جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر بھی کُفر کا اطلاق ہوا ہے ''مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ''۔[2] اب نماز کا انکار کرے تو یہ کُفر حقیقی ہے، اور اگر نماز کا مقر ہو اور دِل سے تسلیم کرے، فرضیت مانے، لیکن عملاً نہ کرے تو اس کو بھی کُفر کہا گیا ہے اور یہ کُفر مجازاً ہے۔ اسی طرح اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا، اللہ کی الوہیت میں، صفات میں، ذات میں کسی کو شریک کرنا تو شرک حقیقی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اِنَّ يَسِيْرَ الرِّيَاءِ شِرْكٌ''[3] لیکن یہ شرک مجازاً ہے۔ اور ہمارے عرف میں بھی اسی طرح ہے، مثلاً شیر کا لفظ ہم بولتے ہیں تو ایک ہے شیر کا حقیقی معنیٰ جنگل کا درندہ، جنگل کا بادشاہ، اور ایک بہادر آدمی ہو اُس کو بھی شیر کہا جاتا ہے، لیکن یہاں شیر کا معنیٰ مجازی ہے کہ یہ شیر کی طرح بہادر ہے، اگرچہ شیر کی بہادری بہت اُونچے درجہ کی ہے، اور اُس کی بہادری اس کے مقابلہ میں کم ہے، لیکن بہرحال اس کے اندر بہادری ہے اس لیے اس کو بھی شیر کہہ دیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک آدمی دکان پر گیا اور اُس نے دیکھا کہ پلاسٹک کے شیر پڑے ہوئے ہیں، پلاسٹک کی کار رکھی ہے، پلاسٹک کا ہوائی جہاز رکھا ہے، پوچھتا ہے کہ یہ شیر کتنے کا ہے؟ اس نے کہا بیس روپے کا ہے، یہ گھوڑا کتنے کا ہے؟ یہ تیس روپے کا ہے، یہ کار کتنے کی ہے؟ یہ دس روپے کی ہے، یہ ہوائی جہاز کتنے کا ہے؟ یہ پچاس روپے کا ہے، اب کیا پچاس روپے کا ہوائی جہاز مل سکتا ہے؟ تو اُن کو ہوائی جہاز کہنا، کار کہنا، شیر کہنا مجازاً ہے، لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ یہ شیر کتنے کا ہے، اور شیر کی شکل بھی بنی ہوتی ہے، تو ہر زبان میں لفظ دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں، حقیقی معنیٰ میں بھی اور مجازی معنیٰ میں بھی۔ اور خمر کا لفظ

---

(۱) دیکھئے مسلم ج ۲ ص ۳۳۶ باب قدر علی ابن آدم الخ / مشکوٰۃ ص ۲۰ باب الایمان، فصل اول۔

(۲) معجم اوسط رقم ۳۳۴۸، باب الجیم، من اسمہ جعفر۔

(۳) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵ باب الریاء، فصل ثالث۔

جب حقیقی معنیٰ میں استعمال ہو تو حقیقی معنیٰ تو اس کا یہی ہے کہ انگور کا کچا پانی جو ویسے ہی پڑا پڑا بغیر پکائے جوش مارنے لگ جائے اور اس کے اندر شدت پیدا ہو جائے، لیکن زیادہ سخت ہو کر اتنا گاڑھا نہ ہو کہ اُس کے اندر قوت مسکرہ نہ رہے، یعنی وہ اس حد کو پہنچ جائے کہ اس کے اندر نشہ دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور جھاگ پھینکے، یہ ہے خمر کا حقیقی معنی، اور قرآنِ کریم میں اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ (سورۂ مائدہ: ۹۰) میں خمر کا یہی حقیقی معنیٰ مراد ہے، اسی کو کہا گیا کہ حرام ہے۔ دوسرا ہے خمر کا مجازی معنیٰ وہ یہ ہے کہ اُس کے اندر یہ صلاحیت اور قوت پیدا ہو جائے، کہ وہ نشہ دے تو جس کے اندر بھی نشہ دینے والی قوت پیدا ہو جائے اُس کو خمر کہا جائے گا۔

''خمرِ مجازی'' کی دو قسموں کی تفصیل

خمر مجازی کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ① پہلی قسم میں مختلف صورتیں شامل ہیں، مثلاً انگوروں کا پانی تھا لیکن اس میں شدت پیدا ہوئی ہے اس قدر پکانے کے ساتھ کہ ایک تہائی سے زائد باقی رہے، یہ خمر حقیقی نہیں بلکہ خمر مجازی ہے، کیونکہ خمر حقیقی وہ ہوتی ہے جو بغیر پکانے کے جوش مارنے لگ جائے۔ اور اسی طرح تر کھجوروں کا پانی جو ایسے ہی پڑا پڑا جوش مارنے لگ جائے، اور اس میں قوتِ مسکرہ پیدا ہو جائے، یہ بھی خمر مجازی ہے، کیونکہ خمر حقیقی انگوروں کا پانی ہوتا ہے اور یہ کھجوروں کا پانی ہے۔ اسی طرح کشمش پانی میں بھگو کر رکھے تھے کہ پانی جوش مارنے لگ گیا اور اس میں نشہ کی قوت پیدا ہوگئی، یہ بھی خمر مجازی ہی ہے (اس کو عرف عام میں نقیع الزبیب یا ماء الزبیب کہتے ہیں) کیونکہ خمر حقیقی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، تو یہ تینوں صورتیں خمر مجازی کی پہلی قسم کی ہیں ان کو بھی خمر کہیں گے لیکن ان کو خمر کہنا مجازاً ہوگا۔ ② اور خمر مجازی کی دوسری قسم یہ ہے کہ کھجور، کشمش یا کسی بھی چیز کو پانی میں بھگو کر رکھیں، یا ان کو پکائیں اور اس سے صرف مٹھاس حاصل ہو، نشہ کی کیفیت پیدا نہ ہو، تو یہ بھی خمر ہی کی قسم ہے کیونکہ تھوڑی سی غفلت کے ساتھ اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے اس کو خمر کہا جائے گا، چہ جائیکہ اس کا دوسرا نام نبیذ بھی ہے، چاہے وہ تمر کا نبیذ ہو، زبیب کا نبیذ ہو، شہد کا، گندم کا، جَو کا، جوار کا، یا اور کسی بھی چیز کا۔ یہ سب مجازاً خمر کی تعریف میں داخل ہیں۔

''خمرِ حقیقی'' اور ''خمرِ مجازی'' کا حکم

جب خمر کی یہ مختلف اقسام بن گئیں تو ان کے حکم میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہوگا۔ ان میں سے جو خمر حقیقی ہے اُس کا حکم تو یہ ہے کہ یہ نجس ہے نجاست غلیظہ کے ساتھ، جیسے قرآن پاک میں اس کا حکم بیان کیا گیا ہے رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (حوالہ مذکورہ) اگر یہ کپڑے پر لگ جائے تو جو پیشاب پاخانہ کے لگ جانے کا حکم ہے اس خمر کا بھی وہی حکم ہے، اس کی بیع وشراء بھی حرام ہے، اور اس کا پینا قلیل ہو یا کثیر، نشہ دے یا نشہ نہ دے، حرام ہے، اس میں حرام ہونے کا دارومدار نشہ پر نہیں، نشہ نہ دے تو بھی حرام ہے، اس کا پینا ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی پیشاب پی لے، نجاست کھا لے، اسی طرح اس میں حد کا دارومدار بھی نشہ پر نہیں ہے، اگر کوئی ایک دو قطرے بھی پی لے جو حلق سے نیچے اتر جائیں اگرچہ نشہ نہ آئے تو بھی اُس پر حد جاری ہوگی یہ تو خمر حقیقی کا حکم ہے۔

اور خمر مجازی کی پہلی قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کا مطلقاً پینا حرام ہے، خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر ہو، اگر تھوڑی مقدار میں پیئے جس سے نشہ نہ آئے تو وہ بھی حرام ہے، اصل میں خمر کی دوسری قسم میں قوتِ مسکرہ بمقابلہ تیسری قسم کے چونکہ زیادہ ہے تو یہ خمر حقیقی کے

زیادہ قریب ہے اس لیے اس کا بھی مشابہت کی بناء پر حکم یہی ہوگا، کہ اس کا قلیل وکثیر پینا حرام ہے، البتہ یہ ہے کہ اس قسم میں حد اس وقت لگے گی جب نشہ آئے، قلیل مقدار میں اگر کوئی پی لے تو اُس کے اُوپر تعزیر تو ہے لیکن جو شربِ خمر کی حد ہے وہ اُس وقت جاری ہوگی جب نشہ آجائے، اس کا دارومدار نشہ پر ہے، باقی! اس کا بیچنا ناجائز ہے، اور ایک قول کے مطابق یہ نجاستِ غلیظہ ہے اور دوسرے قول کے مطابق نجاستِ خفیفہ ہے۔ اور خمر مجازی کی دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ اتنی مقدار میں پینا کہ جس سے نشہ آجائے وہ تو حرام ہے، وہاں مقدارِ مسکر حرام ہے، اور اگر اس سے قلیل مقدار میں کوئی پی لے تو یہ جائز ہے، حرام نہیں ہے، اس کا بیچنا بھی جائز ہے، اور اسی طرح اگر کپڑے پر لگ جائے تو نماز بھی ہوجائے گی، اور اس میں حد اس وقت لگے گی جس وقت نشہ آجائے۔

اور جو خمر حقیقی ہے وہاں پر حد کا دارومدار سکر پر نہیں، اُس کا دارومدار اس کی ذات پر ہے، کہ اگر کوئی شخص اس کے چند قطرے بھی پی لے تو بھی اُس پر حد جاری ہوگی، اور خمر مجازی کی آخری جو دو قسمیں ہیں اُن میں حد تب جاری ہوگی جب ان میں نشہ آجائے ان دو قسموں میں حد کا دارومدار سکر پر ہے۔ لیکن پھر خمر مجازی کی دو قسموں میں بھی فرق یہ ہے کہ خمر مجازی کی پہلی قسم میں قلیل ہو یا کثیر اس کا پینا حرام ہے، اور جو خمر مجازی کی دوسری قسم ہے اس میں مقدارِ سکر سے کم اگر پی لی تو اس کا پینا جائز ہے۔

حرمتِ خمر پر مختلف روایات میں تطبیق

اب حدیث پاک میں دیکھا جائے تو ایک حدیث میں (جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے اور حکماً مرفوع ہے) یہ لفظ آتے ہیں "حُرِّمَتِ الْخَمْرُ بِعَيْنِهَا قَلِيلُهَا وَكَثِيرُهَا وَالسُّكْرُ مِنْ كُلِّ شَرَابٍ"[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ خمر حقیقی تو ذات ہی حرام ہے، لہٰذا جو خمر کے احکامات ہیں اُن کا تعلق خمر حقیقی کی ذات کے ساتھ ہے، سکر کے ساتھ نہیں ہے، تو اس میں پینے کی حرمت کا تعلق بھی ذات کے ساتھ ہے، حد کا تعلق بھی ذاتِ خمر کے ساتھ ہے، خرید وفروخت کے ممنوع ہونے کا تعلق بھی اُس کی ذات کے ساتھ ہے، اُس کے نجس ہونے کا تعلق بھی اُس کی ذات کے ساتھ ہے، لہٰذا اُس کی تو ذات ہی حرام ہے، اُس کے پینے پر حد جاری ہوجائے گی خواہ نشہ نہ بھی دے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی وَالسُّكْرُ مِنْ كُلِّ شَرَابٍ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی جو مشروبات ہیں اُن سے بھی نشہ آتا ہے، لیکن اُن سے کتنی مقدار حرام ہوگی؟ اتنی مقدار کہ نشہ آجائے وہ بھی حرام ہے۔ لیکن ان میں خمر مجازی کی یہ جو پہلی قسم ہے اُس میں چونکہ سکر غالب ہے، اور وہ خمر حقیقی کے زیادہ قریب ہے مشابہت کے لحاظ سے، لہٰذا اس میں پینا تو قلیل وکثیر دونوں صورتوں میں حرام ہوگا، البتہ حد اس وقت جاری ہوگی جب نشہ آجائے، اور جو دوسری قسم ہے اس میں چونکہ نشہ والی کیفیت بمقابلہ پہلی کے کمزور ہے اور اس کو نبیذ کہا جاتا ہے، اور نبیذ کا پینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے،[2] لیکن اتنی مقدار کہ جس سے نشہ آجائے وہ ناجائز ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ شام سے ایک مشروب میرے پاس لایا گیا، جب پکایا گیا تھا تو اس کے دو ثلث ختم ہوگئے تھے اور ایک ثلث باقی رہ گیا، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جو حرام حصہ تھا وہ

---

(۱) سنن نسائی ج ۲ ص ۳۳۱ باب ذکر الاخبار التی اعتل بها من اباح الخ / طحاوی ج ۱ باب ما یحرم من النبیذ.

(۲) صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۶۸ باب اباحة النبیذ نیز ص ۱۶۹، ص ۱۷۰۔

ختم ہو گیا اور جو باقی رہ گیا وہ حلال ہے۔[1] تو اس سے پتہ چلا کہ اگر قوتِ مسکرہ اُس کے اندر کمزور ہو جائے تو پھر وہ حلال ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک سخت قسم کا نبیذ پیا کرتے تھے (طحاوی)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ کچھ لوگوں کی مہمانی کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کو ایک مشروب پلایا، اور اس مشروب کے پینے سے بعض لوگوں کو نشہ آ گیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن پر حد جاری کی، ان میں سے ایک آدمی نے کہا یہ عجیب بات ہے کہ آپ ہمیں پلاتے بھی ہیں اور پھر حد بھی لگاتے ہیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اِنِّی اُحِدُّكَ لِلسُّكْرِ''[2] کہ میں تم پر حد لگاتا ہوں نشہ کی وجہ سے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبیذ شدید پی تھی، اور ان کا فتویٰ بھی ہے کہ جتنی مقدار سے نشہ نہ آئے وہ جائز ہے (طحاوی)۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر اتنی مقدار میں نبیذ پی لے جس سے نشہ نہ آئے تو یہ جائز ہے، لیکن جب نشہ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ مقدار حرام ہو گی، اس کو چھوڑ دے، اور اس سے اگر سکر آ جائے تو پھر حد بھی جاری ہو گی۔ یہ ہیں ان کے احکامات۔

باقی جو حدیث پاک میں آتا ہے: ''كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ''[3] ہر مسکر خمر ہے، تو یہ خمر کہنا یہاں مجازاً ہے، اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا: ''مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ''[4] یہ ہے خمر حقیقی کے بارے میں کہ اُس کی کثیر مقدار اور قلیل مقدار دونوں حرام ہیں، اور خمر مجازی کی پہلی قسم یہ نشہ دینے میں خمر حقیقی کے قریب قریب ہے اس کا بھی یہی حکم ہو گا کہ اس کی قلیل و کثیر مقدار حرام ہے، باقی خمر کی جو تیسری قسم ہے یعنی نبیذ، اس کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پینا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پلانا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ کہ قلیل مقدار جس سے نشہ نہ آئے وہ تو جائز ہے، لیکن اتنی کثیر مقدار جس سے نشہ آئے وہ حرام ہے، یہ انہوں نے خود یہاں پر فرق کیا ہے، اسی طرح طحاوی شریف (جلد دوم) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شدید نبیذ تھا جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا، لیکن کم مقدار میں کہ جس سے نشہ نہ آئے، یہ جو فقہ میں اشتداد اور شدید کا لفظ آتا ہے، اس سے مراد یہی ہے کہ جس کے اندر قوتِ مسکرہ پیدا ہو جائے، حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شدید نبیذ لایا گیا جس میں پانی ڈال کر آپ نے پی لیا،[5] جبکہ خمر حقیقی کے اندر پانی ڈال کر پینا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی پیشاب کے اندر پانی ڈال کر پی لے، تو اس سے وہ پاک نہیں ہو جاتا، بلکہ ایک من پانی ہو اور اس میں تھوڑا سا پیشاب گر جائے تو وہ بھی ناپاک ہو جائے گا، اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ جب یہ یمن گئے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ گندم، جو اور شہد کا نبیذ بنا کر پیتے ہیں اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِشْرَبَا وَلَا تَسْكَرَا (طحاوی) کہ تم دونوں پیو تو سہی لیکن نشہ کی مقدار نہ پیو۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۵ ص ۵۰۰ باب فی الطلاء من قال اذ ذهب ثلثاه فاشربه نیز نسائی ج ۲ ص ۳۳۴ (قدیمی کتب خانہ)۔

(۲) بدائع صنائع ج ۵ ص ۱۱۶۔ نیز اس طرح کا جملہ حضرت عمرؓ سے بھی منقول ہے، دیکھیں: طحاوی ج ۲ باب ما یحرم من النبیذ.

(۳) مسلم ج ۲ ص ۱۶۷ باب بیان ان کل مسکر خمر / مشکوۃ ج ۲ ص ۳۱۷ باب بیان الخمر. فصل اول.

(۴) ترمذی ج ۲ ص ۸ باب ما جاء ما اسکر کثیرہ / مشکوۃ ج ۲ ص ۳۱۷ باب بیان الخمر. فصل ثانی

(۵) نسائی ج ۲ ص ۲۸۴، ذکر الاخبار التی اعتل بها الخ

حرمت خمر کی مختصر تاریخ

باقی خمر کی جو حرمت کی تاریخ ہے وہ یہ ہے کہ مرحلہ وار شراب حرام ہوئی ہے، پہلے نمبر پر سورۂ نحل کے اندر اللہ تعالیٰ نے ابتداءً ابتداءً اس کو ایک نعمت کے طور پر ذکر فرمایا ہے وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا (سورۂ نحل:٦٦) یہاں سے مراد بھی خمر ہے، کہ اللہ کی نعمتوں میں سے یہ نعمت ہے کہ تم انگور اور کھجور کے پھلوں سے سکر بناتے ہو یعنی خمر بناتے ہو، اور پھر یہ (زیرِ درس) آیت نازل ہوئی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ آپ سے خمر اور میسر کے متعلق پوچھتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا گیا قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ: فرما دیجئے کہ اس میں نقصان بڑا ہے، ہاں کچھ لوگوں کے لئے نفع بھی ہے، کہ اس کے ذریعے سے کچھ قوت حاصل کریں، اور اس کے ذریعے سے تجارت کرکے مال کمائیں۔ پھر تیسرے مرحلہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں دعوت تھی (عصر کے بعد ہوگی) دعوت کھائی، اس میں شراب بھی پی، کیونکہ ابھی تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا، جب مغرب کی نماز پڑھی تو امام صاحب نے سورۂ کافرون پڑھی اور زبان سے الفاظ یہ ادا ہوگئے: ''لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' کیونکہ نشہ کی حالت میں تھے، تو اس پر پھر یہ آیت اُتری: ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ''[۱] کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ نشہ دور نہ ہو جائے، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ شراب حرام ہے لیکن ایسے وقت میں پینا حرام ہے کہ جب نماز پڑھیں تو نماز میں نشہ والی حالت ہو، لیکن اگر کوئی آدمی اس طرح پیے کہ نماز تک نشہ ختم ہو جائے مثلاً صبح کی نماز اور ظہر کے درمیان وقفہ بہت ہے صبح کی نماز پڑھ کر پی لے پھر ظہر تک نشہ ختم ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، عشاء کی نماز پڑھ کر کوئی پی لے اور صبح تک نشہ ختم ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے، یا کوئی آدمی پینے کے بعد کوئی ایسی چیز استعمال کرے جس سے نماز سے پہلے پہلے نشہ ختم ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ چوتھے مرحلہ میں پھر وہ آیت اتری جو ساتویں پارے میں ہے اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، اب قطعی طور پر خمر حرام ہوگئی، لہٰذا جب قطعی طور پر اس کی حرمت ہے تو جو آدمی اس کی حلت کا قائل ہوگا وہ قرآنِ کریم کے ایک قطعی حکم کا منکر ہے، اور وہ کافر ہوگا۔ یہ اس کی حرمت کی مختصر تاریخ ہے۔

''مَیْسِر'' کی تعریف اور اس کا حکم

اور اس آیت میں دوسری چیز میسر ہے جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، میسر مصدر ہے، اور یہ تقسیم کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اور یاسر تقسیم کرنے والے کو کہتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے، جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ ایک اونٹ ذبح کیا جاتا، اور پھر ہر ایک کے حصہ کا قرعہ نکالتے تھے، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے اور بعض بالکل محروم رہتے، اور جو شخص محروم رہتا وہ پورے اونٹ کی قیمت ادا کرتا، اور وہ سارا گوشت فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے، اس میں چونکہ فقراء کا فائدہ تھا اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت نمایاں ہوتی تھی، اس لیے اس کو باعث فخر سمجھتے، اور اس میں شریک نہ ہونے والے کو کنجوس کہتے تھے، اور

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۳۲، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ النساء۔

اسی طرح جوئے کی اور بھی مختلف صورتیں ہیں، ابتدائے اسلام میں جیسے شراب حلال تھی اسی طرح جوا اور قمار بھی حلال تھا، اور بعد میں جس آیت میں خمر کی حرمت بیان کی گئی ہے اسی آیت میں میسر کی حرمت بھی بیان کی گئی ہے، یہاں پر صرف اس کے نقصان کی طرف اشارہ کیا ہے، حرمت بعد میں بیان کی گئی، جیسا کہ شراب کے مسئلہ کی وضاحت آپ کے سامنے آچکی ہے۔

[1] اور قمار کے حکم میں ہی ہیں آج کل یہ جو لاٹریاں چلتی ہیں، یہ جو لاٹری ڈالا کرتے ہیں، عام طور پر اخباروں میں اشتہار آتا رہتا ہے، کہ فلاں چیز خریدو اور اس میں سے جو اُن کا فارم وغیرہ رکھا ہوا ہوتا ہے وہ نکلے گا، وہ پُر کر کے اپنا نام لکھ کر فلاں جگہ ڈال دو، یا روپے روپے کے ٹکٹ خریدو، یہ بانڈ جس طرح سے تقسیم ہوتے ہیں، اتنے کا خریدو، ڈال دو، جس وقت لاٹری ہوگی تو جس کا نام نکلے گا اس کو سائیکل ملے گی، کسی کو مشین ملے گی، کسی کو کچھ ملے گا، یہ ساری کی ساری قمار کی صورتیں ہیں، یہ بھی اسی طرح حرام ہیں، اور اس کے نتیجے میں بھی دولت بے اعتدالی کے ساتھ تقسیم ہوتی ہے، دولت کی تقسیم میں جو اعتدال شریعت کو مطلوب ہے وہ باقی نہیں رہتا، اور انسان میں کم ہمتی بھی آتی ہے، ہر وقت انسان یہ سوچتا ہے کہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، دماغ لڑانے کی کیا ضرورت ہے، اس قسم کی آسان آسان صورتیں اختیار کرو جن کے ساتھ بیٹھے بٹھائے انسان کو مال حاصل ہو جائے، تو یہ چیزیں عملی سستی کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ تو اس قسم کے جتنے معاملات ہیں سارے کے سارے شریعت نے حرام ٹھہرا دیے ہیں۔

گویا کہ خمر اور میسر کے سلسلے کی یہ پہلی آیت ہے جس کو آپ کی سامنے پڑھا جا رہا ہے، ''آپ سے سوال کرتے ہیں خمر اور میسر کے متعلق''۔ میسر: جوا۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اِن دونوں میں بڑا گناہ ہے'' اِن دونوں میں بڑے گناہ کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے ارتکاب میں گناہ ہے، اگر اِن کے ارتکاب میں گناہ قرار دیا جائے تو اِن کا ممنوع ہونا یہیں سے نکل آئے گا، حالانکہ اس آیت کے اترنے سے خمر اور میسر ممنوع نہیں ہوئے، اس لیے اس کا مطلب یوں ہوگا کہ اِن دونوں کے سبب سے بڑا گناہ لازم آتا ہے، وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ: اور اِس میں لوگوں کے لئے کچھ فوائد بھی ہیں، وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا: اور اِن دونوں کی وجہ سے جو گناہ لازم آتا ہے وہ بڑا ہے ان دونوں کے نفع سے، جس میں اشارہ کر دیا کہ اِن کا ترک اولیٰ ہے۔

ضرورت سے زائد مال کب خرچ کرنا چاہیے

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ: اور آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ اس قسم کا سوال آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں بھی گزرا، وہاں اُس کے مصارف کو اہمیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا، کہ خرچ کہاں کہاں کرنا چاہیے، اور یہ بات کہ کتنی مقدار خرچ کرنی چاہیے اُس کے بارے میں اجمال چھوڑ دیا گیا کہ جو بھی تم خرچ کرو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں اُس کا اجر دے گا، لیکن خرچ اِن مواقع میں کرنا چاہیے، وہاں چونکہ والدین کا اور اقربین کا ذکر بھی آیا تھا اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں سے نفلی صدقہ مراد ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ والدین کو نہیں دی جاتی، اسی طرح اقربین جس میں انسان کی اولاد بھی آجاتی ہے اور نواسے پوتے بھی آجاتے ہیں، ان کو بھی زکوٰۃ نہیں دی جاتی، تو اِن مصارف کا بیان بتاتا ہے کہ یہاں سے نفلی

---

[1] یہاں سے حضرت حکیم العصرؒ کی تقریر ہے۔

صدقات مراد ہیں، فرض زکوٰۃ مراد نہیں، اِسی لیے وہاں مقدار کا تعین نہیں کیا گیا۔ اور یہاں اس سوال کو دوبارہ دوہرایا گیا، یہاں مصارف نہیں ذکر کیے گئے، البتہ مقدار کے بارے میں ہدایت دے دی گئی۔ قُلِ الْعَفْوَ: آپ کہہ دیجئے کہ عفو کو خرچ کیجئے، عفو کا کیا معنیٰ؟ عفو کا مفہوم دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، جو آسان ہو، اور جو ضرورت سے فاضل ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ عفو جَهد کی نقیض ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس چیز کو خرچ کرو جس کا خرچ کرنا تمہارے لیے آسان ہے، اور اس کے خرچ کرنے کی وجہ سے تم پر کوئی مشقت لازم نہ آئے، اسی سے یہ بات نکل آئی کہ جو ضروریات سے زائد ہے وہ خرچ کرو، بسا اوقات انسان کی اپنی ضرورت اٹکی ہوئی ہوتی ہے، اگر اپنے سرمائے کو اپنی ضرورت میں صرف نہ کیا جائے اور اللہ کے نام پر خرچ کر دیا جائے تو انسان کے دل میں بسا اوقات اپنی ضرورت کے پیش آ جانے کے بعد یہ وسوسہ آ جاتا ہے کہ میں نہ دیتا تو اچھا تھا، اب مشقت میں پڑ گیا۔ اب اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بعد پچھتانا کہ میں نے خرچ کیوں کر دیا، نہ کرتا تو اچھا تھا، اِس سے بہتر یہ ہے کہ انسان پہلے سے دے ہی نہ۔ اس لیے پہلے اپنی ضرورتیں پوری کرو، اور اپنی ضرورت میں ہی داخل ہے اپنے بال بچوں کی ضرورت، اپنے متعلقین جن کا خرچ آپ کے ذمے ہے، پہلے اُن کی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد پھر اس سے جو زائد بچے وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو، تو گویا کہ اِس میں عفو کے خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

زائد از ضرورت مال جمع رکھنے کا شرعی حکم

عفو کا خرچ کرنا شریعت نے واجب نہیں ٹھہرایا (اِس بات کو بھی ذرا سمجھ لیجئے!) عفو کے خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، یوں کہا گیا ہے کہ اپنی ضرورتوں کا خیال کیا کرو، ضرورتوں کا خیال کرنے کے بعد جو بچے وہ خرچ کیا کرو، باقی! ضرورتیں پوری کرنے کے بعد جو بچ جائے اُس کا خرچ کرنا ضروری ہے؟ اُس کا خرچ کرنا واجب ہے؟ اور ضرورت سے زائد مال انسان اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا؟ کیا اِس آیت کا یہ مقصد ہے؟ اگر یہ مقصد ہے تو باتفاقِ امت یہ منسوخ ہوگا، اور ایک خاص وقت میں یہ ہدایت آئی تھی جب مدینہ منورہ میں بہت زیادہ تنگی تھی، اُس وقت کسی کے لئے جائز نہیں تھا کہ اپنی ضرورت سے زائد چیز انسان اپنے پاس رکھے، اور بعد میں جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے وسعت دے دی تو وسعت دینے کے بعد اپنی ضرورتوں سے زائد اپنے پاس رکھنا جائز ہے، جبکہ انسان صدقاتِ واجبہ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرض کیے ہوئے صدقات کو ادا کرتا رہے، اُن کے ادا کرنے کے بعد بھی اگر انسان کے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو اس کو پاس رکھا جا سکتا ہے، تفسیر مظہری کے اندر قاضی ثناء اللہ صاحب ؒ نے اس کی یہی تفصیل ذکر کی ہے کہ ایک وقت تھا جب مدینہ منورہ میں بہت تنگی تھی، اُس وقت حکم یہی تھا کہ جو ضرورت سے بچے وہ صَرف کر دو۔ قرآنِ کریم میں جس وقت وہ آیت اتری وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورۃ توبہ: ۳۴) جو سونے اور چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہیں، دفن کر کے رکھتے ہیں، یعنی ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں، اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے اِنہیں عذابِ الیم کی بشارت دے دیجئے، جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام ؓ پر ذرا گرانی سی محسوس ہوئی، کہ اِس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ سونا چاندی گھر کے اندر محفوظ رکھنا بالکل جائز نہیں، اور انسان اپنی طبیعت

کی کمزوری کی بناء پر اپنے مستقبل کے لئے کچھ نہ کچھ جوڑ کے رکھتا ہے، تو اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح سے رکھو ہی نہیں، جو بھی رکھے گا اس کو عذابِ الیم کی بشارت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا کہ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سونا چاندی گھر میں رکھنا بالکل جائز نہیں، اور اگر کوئی حلال کما کر اور ذریعے سے جمع کر کے گھر میں رکھے گا اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرے گا تو کیا اس کو عذاب کی بشارت ہے؟ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے میراث اسی لیے متعین کی ہے تاکہ یہ تمہارے بعد والے لوگوں کے لئے ہوجائے،[1] اگر مال ضرورت سے زائد گھر میں رکھنا ٹھیک ہی نہیں تو یہ وراثت کی تقسیم کا اصول کیا ہوا؟، اللہ تعالیٰ نے یہ جو کہا کہ ترکہ یوں تقسیم کیا کرو، یوں تقسیم کیا کرو، تو ترکے میں تبھی وہ چیزیں آئیں گی کہ اگر انسان کچھ بچا کے رکھتا ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے مَابَلَغَ اَنْ تُوَدّٰی زَکَاتُهٗ فَزُکِّیَ فَلَیْسَ بِکَنْزٍ کہ یہاں جو کنزِ فضہ اور کنزِ ذھب پر وعید آئی ہے تو کنز کا مصداق وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو، اور اگر اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ اس کنز کا مصداق نہیں جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ وعید آئی ہے۔[2] اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک یہی تھا کہ گھر کے اندر ضرورت سے زائد سونا چاندی رکھا جاسکتا ہے، لیکن جو فرض مقدار زکوٰۃ ہے وہ ضرور ادا ہونی چاہیے۔ ہاں البتہ اگر کوئی ایسا وقت آ گیا کہ معاشرے میں اتنی تنگی آ گئی کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں، اور آپ کے پاس ضرورت سے زائد موجود ہے، اس وقت آپ اخلاقاً پابند ہیں کہ دوسروں کے ساتھ رواداری کیجئے، اُن کے ساتھ مواسات اور خیر خواہی سے پیش آیئے، اور حکومتِ وقت اسلامی نقطۂ نظر سے اگر ضروری سمجھے کہ عوام کی ضرورت پورا کرنے کے لئے فاضل سرمایہ لوگوں سے لے لیا جائے، اور پھر عوام میں اُس کی صحیح تقسیم کر کے عوام کی ضرورت پوری کر دی جائے، دیانت دارانہ طور پر حکومت اگر ضروری سمجھے تو ایسے وقت میں فاضل سرمایہ جس کا عام طور پر خرچ کرنا مستحب ہے حاکمِ وقت اُس کو ضروری قرار دے سکتا ہے اور بوقتِ ضرورت لوگوں سے سرمایہ لے کر مفادِ عامہ کے لئے اُس کو خرچ کر سکتا ہے، اُس اصول کے تحت جو شریعت نے قائم کیا کہ مفادِ عام کے لئے ضررِ خاص کو برداشت کر لیا جاتا ہے، اگر اس قسم کی تنگی آجائے کہ بیت المال میں بالکل سرمایہ نہیں ہے اور اس قسم کی ضرورتیں اٹکی پڑی ہیں جن کے ساتھ ساری قوم کا تعلق ہے، کہ اگر ان کو پورا نہ کیا گیا تو قومی طور پر نقصان ہوگا، اور بعض لوگوں کے پاس سرمایہ زائد پڑا ہے جو اُن کی ضرورت کا نہیں، خواہ مخواہ انہوں نے ذخیرہ کیا ہوا ہے، اور وہ از خود خرچ نہیں کرتے، تو شریعت نے جس کو مستحب قرار دیا ہے حاکمِ وقت مصلحتِ وقت کے تحت اور اس ضرورت کے تحت جس کو دیانت دارانہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس فاضل سرمایہ کو ان سے حاصل کر کے قومی مفاد میں نہ لگایا گیا تو قومی سطح پر نقصان ہے، ایسی صورت میں مالک کے مرضی کے خلاف اُس فاضل سرمایہ کو لے کر قومی ضرورت کے لئے صرف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ہنگامی اور وقتی ضرورت ہے، جس میں مالک کی مرضی کے خلاف اُس کے مال میں تصرف کر لیا جائے۔ عام حالات میں جب اس قسم کی تنگی نہ ہو فاضل سرمایہ رکھا جاسکتا ہے، ہاں البتہ جتنا اُس میں سے اللہ تعالیٰ توفیق دے نفل کے طور پر خرچ کرتے رہو گے تو باعثِ فضیلت ہے، اور فرض مقدار اُس میں سے ادا کرنی ضروری ہے۔

---

(۱) ابوداؤد ج ۱ ص ۲۳۵ باب فی حقوق المال/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۶، کتاب الزکاۃ فصل ثانی

(۲) ابوداؤد ج ۱ ص ۲۱۸ باب الکنز ما هو/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۶۰ باب ما یجب فیه الزکاۃ فصل ثانی

توقُلِ الْعَفْوَ کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اگر خرچ کرنا ہے تو ایسی چیز خرچ کرو جس کے خرچ کرنے کے بعد تمہیں مشقت نہ پیش آئے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں قوت پیدا کی ہے کہ تم اپنی ضرورتیں ختم کر سکتے ہو، اور اس قسم کے ایثار اور ہمدردی کے بعد پھر تم پچھتاؤ گے نہیں، تو یہ بھی فضیلت کا درجہ ہے، اِس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جس وقت کوئی ایسا موقع آتا تھا گھر کا سارا سامان اٹھا کر دے دیتے تھے، روایات کے اندر موجود ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات روایات کے اندر موجود ہیں کہ خود بھوکے رہتے تھے اور مسافروں کو کھلا دیتے تھے، حتیٰ کہ اپنے بچوں کو بھی بھوکا رکھتے تھے، اور یہ سب اُن کے مناقب میں اور ان کی فضیلت میں شمار ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر پہلے اپنی ضرورت پوری کریں اور اس کے بعد دوسروں کے لئے صَرف کریں تو یہ بھی جائز ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوی القلب بنایا ہے کہ آپ مشقت برداشت کر سکتے ہیں، تو آپ خود بھوکے رہیں اور دوسرے کو کھلا دیں، خود اچھا کپڑا نہ پہنیں اور دوسرے کو پہنا دیں، تو یہ ایک فضیلت ہے جس کو حاصل کرنے کی اگر ہمت ہے تو بڑی خوشی سے کیجئے، ناجائز نہیں ہے۔ اِن میں صرف اجازت دی گئی ہے کہ پہلے اپنی ضرورتیں پوری کر کے اُس کے بعد خرچ کرو، یہ تمہارے لیے ضروری نہیں ہے کہ اپنی ضرورتیں ختم کرو اور دوسروں کو دے دو، اس طرح سے مشقت میں نہ پڑو، ضرورتیں پہلے پوری کرلو، اس کے بعد جو زائد بچے وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ: اسی طرح سے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات کو واضح کرتا ہے، اپنے احکام کو نمایاں کرتا ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ: تاکہ تم سوچو دنیا اور آخرت کے معاملات میں، تاکہ دنیا اور آخرت کے معاملات میں غور کرلیا کرو، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے دنیا و آخرت کے معاملات کو طے کیا کرو۔

یتیم کے مال کے متعلّق صحابہ کا سوال اور اللہ کی طرف سے جواب

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى: آپ سے یتامیٰ کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ یتامیٰ کے متعلق سوال کا مطلب یہ تھا کہ جیسے ہمارے ہاں یتیموں کے حقوق کی کوئی نگہداشت نہیں ہے، کوئی حفاظت نہیں ہے، یتیم کے مال کو لوگ بلا تکلف ہڑپ کر جاتے ہیں، کھا جاتے ہیں، عرب کے اندر بھی اسی طرح سے تھا، کہ اگر کوئی یتیم اپنی تولیت میں آگیا تو اُس کے مال میں احتیاط نہیں کی جاتی تھی، لوگ بے احتیاطی کے ساتھ اُس کے مال کو بھی اپنے مال میں شامل کر کے کھا جاتے تھے، قرآنِ کریم میں حکم آیا اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (سورۂ نساء: ۱۰) کہ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں کے اندر آگ بھرتے ہیں، جب یہ وعید آگئی تو جن کے پاس یتیم بچے تھے انہوں نے اُن کا مال بالکل علیحدہ کر دیا، اُن کے ساتھ رَل مل کے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا، اُن کے کھانے کی چیز علیحدہ پکائی جاتی، علیحدہ رکھی جاتی، ایک تو اِس کے ساتھ گھروں کا کام بڑھ گیا، کہ یتیم بچے کے لئے ہر قسم کا انتظام علیحدہ کیا جائے، اور پھر اُس میں ایک گڑبڑ یہ بھی ہوگئی کہ بسا اوقات یتیم بچے کے لئے کوئی چیز تیار کی جاتی، وہ بچہ استعمال نہیں کرتا، اور وہ یتیم بچے کی طرف سے صدقہ خیرات بھی نہیں کی جا سکتی، اور گھر والے کھاتے نہیں کہ ممانعت آگئی، کہ جو یتیم کا مال کھائے گا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے، اس طرح سے یتیم کا مال الٹا ضائع ہونے لگ گیا۔ یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ ایک یتیم بچہ آپ

کی تولیت میں ہے، آپ نے اس کے لئے ایک دن اس کے مال میں سے پیسے خرچ کر کے ایک چیز پکالی، لیکن اس نے انکار کر دیا کہ میں نہیں کھاتا، میری طبیعت نہیں چاہتی، یا اُس کی ضرورت سے زیادہ پک گئی اور اس نے تھوڑی کھائی، باقی بچ گئی، دوسرے وقت کے لئے بھی نہیں رکھی جاسکتی کہ خراب ہو جائے گی، کسی کو صدقہ خیرات کے طور پر بھی نہیں دی جاسکتی، تو اِس سے یتیموں کے مال کے تحفظ کی بجائے الٹا نقصان ہونے لگ گیا، تو اِن مشکلات کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! اب یتیموں کے معاملے میں کیا کریں، اِس کی کچھ وضاحت چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جواب دیا کہ اصل بات تو یہ ہے کہ یتیموں کی مصلحت کی رعایت رکھو، اُن کا مال ضائع نہ ہونے پائے، اگر علیحدہ رکھنے میں مصلحت ہے تو علیحدہ رکھو، اور اگر ساتھ شامل کر کے کھانے میں مصلحت ہے، کہ اُن کا کھانا ساتھ شامل کر لیا جائے، ایک وقت انہوں نے نہیں کھایا تو تم ان کے حصے کا کھالو، دوسرے وقت میں اپنے حصے کا انہیں کھلا دو، اِس طرح سے اگر مصلحت ہو تو کوئی بات نہیں، وہ تمہارے بھائی ہیں، دینی بھائی ہیں، اور بھائی آپس میں مل جل کر کھالیا کرتے ہیں، اِس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن پیشِ نظر یہ رہنا چاہیے کہ یتیم بچے کی مصلحت کس چیز میں ہے، جو شخص مصلحت کی رعایت رکھنے والا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے، اور جو شخص مصلحت کو خراب کرنے والا ہے کہ محض اِس مخالطت کو اُس یتیم بچے کے مال کے کھانے کا بہانہ بنالے، کہ برائے نام اپنا شامل کر لیا اور زیادہ اُس کا ڈال لیا، اور اس طرح سے بہانہ بنا کے کھا گئے، تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے۔ تو مفسد وہ ہوگا جو مصلحت کی رعایت نہیں رکھتا، اور مصلح وہ ہوگا جو مصلحت کی رعایت رکھتا ہے۔ اس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مخالطت کی اجازت دے دی، کہ ہر وقت تمہارے دماغ میں یتیم کی مصلحت رہے، اگر مصلحت علیحدگی میں ہے تو اُسے علیحدہ رکھو، اگر مصلحت ساتھ شامل کرنے میں ہے تو ساتھ شامل کر لو، ایک وقت میں اگر اُس کا بچا ہوا کھانا کھاتے ہو تو دوسرے وقت میں اپنی طرف سے کھلا دو، اُس کے خرچ کا حساب رکھو، اِس میں کوئی خرابی نہیں، اصل مقصود یتیم کی مصلحت کی رعایت ہے۔ ''آپ سے پوچھتے ہیں یتیم بچوں کے متعلق، آپ کہہ دیجئے کہ اُن کے لئے مصلحت کی رعایت رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے''، اصلاح کا معنی ہے اُن کے حال کی اصلاح، ان کے مال کی اصلاح، جس کے لئے اجمالی لفظ ہم نے استعمال کیا کہ اُن کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے۔ ''اور اگر تم اُن کے ساتھ مخالطت کرلو'' یعنی ان کے مالوں کے ساتھ اپنے مال کو ملالو، کھانے پینے کو خلط ملط کر لو تو بھی کوئی حرج نہیں، فَاِخْوَانُکُمْ: وہ تمہارے بھائی ہی ہیں، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ: یہاں چونکہ مِنْ آگیا تو علم کے اندر تمیز والا معنی ہے، جس طرح سے ترجمہ کرتے ہوئے آپ کو سمجھا دیا گیا تھا، مصلحت رکھنے والے سے مصلحت کو فوت کرنے والے کو علیحدہ کر کے اللہ تعالیٰ جانتا ہے، ان کو جدا جدا جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون ہے، جو اپنی نیت کے اعتبار سے فساد کرنے والا ہوگا، یتیم کی مصلحت کو خراب کرنے والا ہوگا، وہ بھی اللہ کو معلوم ہے، اور جو مصلحت کی رعایت رکھنے والا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہیں مخالطت کی اجازت دے دی وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا، یہ بھی کہتا کہ رکھو جدا جدا، اور پھر یہ بھی کہتا کہ یتیم کا مال بھی ضائع نہ ہونے پائے، اس سے تمہیں مشقت ہوتی، لیکن اللہ نے مہربانی کر کے تمہیں مخالطت کی اجازت دے دی، اب یتیم کی مصلحت کی رعایت رکھنا تمہارے ذمے ہے۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

مشرکین کے ساتھ نکاح کا مسئلہ

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی اور مشرکین کی آپس میں مناکحت تھی، ایک دوسرے سے نکاح کرتے تھے، مکہ معظمہ میں خاوند مسلمان ہوگیا اور بیوی مشرکہ ہے، بیوی مسلمان ہوگئی اور خاوند مشرک ہے، جس طرح سے پہلے نکاح ہونے کے بعد یہ دونوں صورتیں پیش آسکتی ہیں، کہ نکاح ہو یا ہوا ہے پھر خاوند مسلمان ہوگیا اور بیوی مشرک رہی، یا بیوی مسلمان ہوگئی اور خاوند مشرک رہا، اسی طرح سے ابتداء بھی ایسی حالت میں ہوسکتی تھی کہ ایک شخص کلمہ گو ہو مسلمان ہو، کسی مشرکہ کے ساتھ نکاح کرلے، یا ایک عورت مؤمنہ ہوگئی اور اس کا کسی مشرک کے ساتھ نکاح ہوگیا، یہ صورت گوارا تھی اور برداشت تھی۔ گزشتہ امتوں کے اندر بھی اس کی اسی طرح سے گنجائش تھی، آپ کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ ہے، قرآنِ کریم میں دونوں کی بیویوں کا ذکر آیا ہوا ہے، کہ نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافرہ تھی، اور اسی طرح سے لوط علیہ السلام کی بیوی بھی کافرہ تھی، اور دونوں کفر کی حالت میں اس دنیا سے گئی ہیں، ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا (سورۂ تحریم: ۱۰) اس آیت میں دونوں کا اکٹھا ذکر آیا ہوا ہے، ویسے دوسری آیات میں بھی ان کا ذکر ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ شریعتوں میں بھی زوجین کا دین کے اعتبار سے متحد ہونا ضروری نہیں تھا، مؤمن کے نکاح میں کافر عورت رہ سکتی تھی، اور ابتداءً اسلام میں بھی اسی طرح سے تھا۔ مدینہ منورہ میں جس وقت اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا، اور اتنے مرد اور عورت مسلمان ہوگئے کہ ان کی آپس میں ضرورت پوری ہوسکتی تھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ممانعت آگئی کہ مسلمان مشرکہ کے ساتھ نکاح نہ کرے، اور کوئی مسلمان اپنی مؤمنہ بیٹی یا بہن کو کسی مشرک کے نکاح میں نہ دے، اس آیت نے آکر ممانعت کردی، اب کسی مؤمن کا مشرکہ کے ساتھ یا مؤمنہ کا مشرک کے ساتھ نہ تو ابتداءً نکاح ہوسکتا ہے۔ اور اگر مرد اور عورت آپس میں زوجین ہیں، اور پھر ان میں سے کوئی ایک کافر ہوگیا جیسے مرزائی ہوگیا یا اس قسم کا اس نے کوئی مشرکانہ عقیدہ اختیار کرلیا تو نکاح ٹوٹ جائے گا، اسی طرح اگر عورت اس قسم کا عقیدہ بدل لیتی ہے تو بھی نکاح ٹوٹ گیا، اور اگر دونوں اکٹھے ہی کافر ہوجائیں اور پھر دونوں اکٹھے ہی مسلمان ہوجائیں تو پھر یہ نکاح باقی رہتا ہے، نکاح ٹوٹنے کی صورت وہ ہوگی کہ جس میں دونوں کے درمیان میں عقیدے کا اختلاف ہوجائے، یہ جزئیہ صراحتاً فقہ کے اندر موجود ہے کہ دونوں اکٹھے کافر ہوجائیں اور دونوں اکٹھے مؤمن ہوجائیں تو ایسی صورت میں دوبارہ نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، پہلا نکاح باقی ہے، چنانچہ منکرین زکوٰۃ جو تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں، اور اسی طرح مسیلمہ کذاب کو ماننے والے لوگ، ان سب کے نکاح کی تجدید نہیں کرائی گئی، اسی سے فقہاء کا استدلال ہے کہ اگر زوجین اکٹھے مرتد ہوجائیں اور پھر دونوں بیک وقت مسلمان ہوجائیں تو سابقہ نکاح باقی رہتا ہے، اور اگر آپس میں تقدم تاخر ہوگیا تو پھر نکاح ٹوٹ جاتا ہے، چاہے مرد کافر اور مشرک ہوجائے، چاہے عورت کافرہ اور مشرکہ ہوجائے۔

اہلِ کتاب کے ساتھ نکاح کا مسئلہ

البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہاں مشرکات سے کیا مراد ہے؟ اگر یہاں مشرکین اور مشرکات سے مراد مطلقاً غیر مسلم

ہوں، کہ جو مسلمان نہیں، سرورِ کائنات ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھتے، تو پھر اِس میں سے اہل کتاب کو خاص کرنا پڑے گا، کہ اگر چہ یہود ونصاریٰ غیر مسلم تھے لیکن اس کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمن مردوں کو ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے، جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں آئے گا وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، تو پھر اِس میں سے اِن کو مستثنیٰ کرنا پڑے گا قرآنِ کریم کی اُس آیت کے ذریعے سے۔ اور اگر مشرکات سے مراد غیر اہل کتاب ہوں یعنی بت پرست اور اس قسم کے کافر، تو پھر اُن (اہل کتاب) کا حکم وہاں مذکور ہے اور باقیوں کا حکم یہاں آ گیا۔ لیکن بظاہر معلوم ایسے ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے مشرکین اور مشرکات کا عنوان اہل کتاب کے لئے اختیار نہیں کیا، اہل کتاب کا جہاں بھی ذکر آیا ہے ان کو اہل کتاب کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اور اس عنوان کے ساتھ ذکر کر کے ان کے کفر کو واضح کیا گیا ہے۔ باقی! جہاں بھی مشرکین یا مشرکات کا ذکر آجائے، شرک کا ذکر ہو، اس کا مصداق عموماً مشرکین مکہ اور اس قسم کے دوسرے مشرک قرار پائیں گے، اہل کتاب اِن کے اندر شامل نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک یہی تھا، کہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح ہو سکتا ہے، اس مسئلے میں صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اختلاف منقول ہے۔

سوال:- مشرکین مؤمنات کے ساتھ نکاح کرتے تھے؟

جواب:- اِس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تو مشرک کا نکاح مؤمنہ کے ساتھ ہوتا تھا، اور مؤمن مرد کا نکاح مشرکہ کے ساتھ ہوتا تھا، اِس آیت کے اترنے کے بعد یہ ممانعت ہوئی ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح اب تک باقی ہے، بشرطیکہ اہل کتاب اُن عقیدوں پر ہوں جو اُن کے عقیدے سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود تھے۔

سوال:- نکاح کی کیا صورت تھی؟

جواب:- نکاح کی صورت بخاری شریف کتاب النکاح میں اس کی تفصیل مذکور ہے، شرک کے زمانے میں نکاح کرنے کے چار طریقے تھے، جن میں سے ایک طریقہ باقی رہا اور باقی تین ممنوع ہو گئے، بہر حال جو بھی طریقہ تھا، اُس وقت نکاح کا جوڑ لگتا تھا، جس کی بناء پر خاوند بیوی ہوتے تھے اور اُن کی اولاد ثابت النسب سمجھی جاتی تھی۔

اگر اہل کتاب اُن عقیدوں پر نہ ہوں جو سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں اُن کے عقیدے تھے، بلکہ سرے سے توحید کے منکر ہو جائیں، دہریے ہو جائیں، خدا کے وجود کے قائل نہ ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قائل نہ ہوں، توراۃ اور انجیل کو اللہ کی کتاب نہ سمجھیں، آخرت کے قائل نہ ہوں، جس طرح عام طور پر آج جدید تہذیب کے لوگ آخرت کے قائل نہیں، اور اسی طرح توحید ورسالت کے متعلق اُن کا کوئی عقیدہ نہیں ہے، دہریے ہیں، چاہے وہ اپنے آپ کو سیاسی سطح پر عیسائیوں یا یہودیوں کے اندر شمار کرواتے ہوں، یہ مشرکین اور عام کافروں کے حکم میں ہیں، ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔ اہل کتاب اور اہل اسلام کا بنیادی عقائد کے اندر تو آپس میں اتحاد تھا، تعبیرات میں اختلاف تھا، یا سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے میں اختلاف تھا۔ وہ بھی مدعیٔ توحید تھے اور ہم بھی مدعیٔ توحید ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ انہوں نے بعض عقیدے ایسے اختیار کر لئے جو شرک ہیں، لیکن اپنے طور پر وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے تھے، یہودی موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے تھے، توراۃ کو اللہ کی کتاب مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے،

اسی طرح باقی تمام ضروریات مثلاً فرشتوں کے قائل، جنات کے قائل، حساب و کتاب کے قائل، سب چیزیں اُسی طرح سے تھیں، یہ کافر ٹھہرے سرور کائنات ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے، باقی جتنے اصول دین ہیں سب کو بظاہر وہ مانتے تھے۔ اور اسی طرح عیسائی بھی توحید کے مدعی تھے، انجیل کو اللہ کی کلام قرار دیتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا فرستادہ مانتے تھے، اور فرشتوں کے قائل تھے، آخرت کے قائل تھے، قیامت کے قائل تھے، ہر چیز کے قائل تھے، اور وہ اگر کافر ٹھہرے تو سرور کائنات ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے، اور اسی طرح اُن کے بعض عقیدے ایسے تھے جن کو قرآن نے شرک کہا اور وہ اپنے طور پر اُن کو شرک نہیں سمجھتے تھے۔ آج بھی اگر کوئی عیسائی توحید کا مدعی ہے، اور انجیل کو اللہ کی کلام سمجھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اتری ہوئی ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چاہے اُس کا عقیدہ ابنیت کا ہے جس کی بناء پر یہ عقیدہ شرک ہے، اور حضور ﷺ کے زمانے میں بھی جو عیسائی تھے وہ ابنیت کے قائل تھے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (سورۂ مائدہ: ۱۷)، قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۰)، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (سورۂ مائدہ: ۷۳) اس قسم کے عقیدے جو عیسائیوں کے ذکر کیے گئے ہیں چاہے یہ عقیدے ہوں اس کے باوجود بھی نکاح درست ہے۔ ہاں البتہ اگر وہ آخرت کے منکر ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل نہ رہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابوں کے آنے کے قائل نہ رہیں، فرشتوں کا انکار کر دیں، تو چونکہ یہ عقائد اس وقت اہل کتاب کے نہیں تھے، اس لیے اس قسم کے عقیدے اختیار کرنے کے بعد اصطلاحاً وہ شخص اہل کتاب میں شامل نہیں ہے، اور اس کا حکم عام کافروں اور مشرکوں والا ہے کہ اُن کی عورتوں کے ساتھ نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ اور مؤمنہ عورت کے ساتھ کسی غیر مسلم کا نکاح درست نہیں، چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو چاہے غیر اہل کتاب میں سے ہو۔ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو دو حکموں میں مستثنیٰ کیا گیا ہے، ایک ان کے ذبیحے کو مسلمانوں کے لئے حلال ٹھہرایا گیا ہے بشرطیکہ اللہ کے نام پر ذبح کریں، اور ایک اِن کی عورتوں کو اہل ایمان کے لئے حلال قرار دیا گیا ہے، دونوں کا ذکر اکٹھا ہی سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ: مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کیا کرو، حَتّٰى يُؤْمِنَّ: جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ: ایمان والی باندی بہتر ہے مشرکہ آزاد عورت سے، کیونکہ اَمَةٌ کے مقابلے میں جب مشرکہ کو ذکر کیا جا رہا ہے تو اس سے مشرکہ آزاد مراد ہے، یعنی چاہے وہ مشرک عورت آزاد ہے اور اپنے مال اور جمال کے اعتبار سے تمہیں وہ اچھی لگ رہی ہے تو بھی اس کے مقابلے میں مؤمنہ باندی بہتر ہے۔ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دیا کرو، یعنی اُن عورتوں کو جن کا نکاح کرنا تمہارے اختیار میں ہے، جیسے بیٹی بہن وغیرہ، ان کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دیا کرو، حَتّٰى يُؤْمِنُوْا: جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ: البتہ ایمان والا غلام بہتر ہے مشرک آزاد سے، وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ: اگرچہ وہ مشرک اپنی صورت و شکل اور جاہ و مال کے اعتبار سے تمہیں اچھا ہی لگے۔ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ: یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں، اس لیے اِن کے ساتھ مناکحت جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہے، وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ: اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم کے ساتھ، وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ: اور لوگوں کے لئے اپنے احکام کو واضح کرتا ہے، لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ

سوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق، آپ کہہ دیجئے کہ وہ (دمِ حیض) گندی چیز ہے، جدا رہا کرو تم عورتوں سے

فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ

حیض کے زمانے میں، اور اُن کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ اچھی طرح سے پاک ہو جائیں

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ

تو تم اُن کے پاس آیا کرو اس جگہ سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں کثرت سے توبہ کرنے والوں سے

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ

اور محبت کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے والوں سے ۝۲۲۲ تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت ہیں، پس آیا کرو تم اپنے کھیت کے پاس

اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

جس طرح سے چاہو، اور آگے بڑھایا کرو اپنے نفسوں کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو

اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ

کہ تم اس سے ملاقات کرنے والے ہو، اور آپ ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دیں ۝۲۲۳ اور نہ بنایا کرو اللہ (کے نام) کو

عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ

آڑ اپنی قسموں کے سبب سے اِس کام سے کہ تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور اصلاح کرو

النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ

لوگوں کے درمیان، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ۝۲۲۴ نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے اُس لغو کے سبب سے جو

اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، لیکن مؤاخذہ کرے گا تم سے بسبب اُس کام کے جس کو تمہارے دل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۲۵ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ

بخشنے والا ہے بردبار ہے ۝۲۲۵ اُن لوگوں کے لئے جو اپنی عورتوں سے ایلاء کرلیتے ہیں انتظار کرنا ہے چار

اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَاِنْ عَزَمُوا

مہینے کا، اگر وہ رجوع کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿٢٢٦﴾ اور اگر انہوں نے عزم کیا ہے

الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ

طلاق کا پس بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں ﴿٢٢٧﴾ اور وہ عورتیں جن کو طلاق دے دی جائے وہ انتظار میں رکھیں

بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ

اپنے نفسوں کو تین حیض تک، اور حلال نہیں اُن عورتوں کے لئے کہ چھپا لیں اُس چیز کو جو پیدا کی

اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ

اللہ تعالیٰ نے اُن کے رحموں میں، اگر وہ ایمان لاتی ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر، اور اُن عورتوں کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں

بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ

اُن عورتوں کو لوٹانے کا اُس مدت میں اگر ارادہ کریں وہ حالات کو درست کرنے کا، اور اُن عورتوں کے لئے مثل اُس چیز کے ہے جو

عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ ع

اُن کے ذمے ہے معروف طریقے سے، اور مردوں کے لئے اُن عورتوں پر درجہ ہے، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں ﴿٢٢٨﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْمَحِيْضِ: یہ مصدر میمی ہے اَلْمَجِيْءُ اور اَلْمَبِيْتُ کی طرح، حَاضَ يَحِيْضُ حَيْضًا: سیلان، بہنا۔ پھر یہ شریعت کی اصطلاح میں متعین ہوگیا عورتوں کے اس خون کے لئے جو عادت کے طور پر اُن کو آتا ہے، چونکہ وہ صحت مند عورت کے لئے مہینے میں ایک دفعہ آہی جاتا ہے اس لیے اُس خون کو ماہواری کا خون کہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ مہینے میں ایک دفعہ آئے، لیکن عادت کے طور پر صحت مند عورت کے لئے چونکہ مہینے میں وہ خون ایک دفعہ آتا ہے، تین دن سے لے کر دس دن تک، اس لیے عرف عام میں اس کا نام ماہواری کا خون ہوگیا، تو یہاں محیض سے وہی دمِ حیض مراد ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ: سوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق، قُلْ هُوَ اَذًى: اذیٰ کہتے ہیں تکلیف دِہ چیز کو، یا قابل نفرت چیز کو، حدیث شریف میں لفظ آتا ہے اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ،[1] تکلیف دِہ چیز کا راستے سے ہٹا دینا، وہاں اذیٰ تکلیف دِہ چیز کے معنیٰ میں ہے، تو اسی طرح جو قابل نفرت

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۴۷، باب عدد شعب الایمان/ مشکوٰۃ ص۱۲ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

چیز ہوا کرتی ہے اس کو بھی اذیٰ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ وہ دمِ حیض اَذیٰ ہے'' یعنی قابلِ نفرت چیز ہے، گندی چیز ہے۔ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ: فَاعْتَزِلُوا: جدا رہا کرو النِّسَآءَ: عورتوں سے فِي الْمَحِيْضِ: حیض میں یعنی حیض کے زمانے میں، فی وقتِ المحیض۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ: اور اُن عورتوں کے قریب نہ جایا کرو، قریب جانا کنایہ ہے جماع سے، حَتّٰى يَطْهُرْنَ: جب تک کہ وہ پاک نہ ہوجائیں، حتی کے بعد اردو محاورے میں نفی کا ترجمہ، یہ آپ کی خدمت میں ہمیشہ عرض کرتا رہتا ہوں، قریب نہ جایا کرو اُن عورتوں کے جب تک کہ وہ پاک نہ ہوجائیں، فَاِذَا تَطَهَّرْنَ: پھر جب وہ اچھی طرح سے پاک ہوجائیں فَأْتُوْهُنَّ: تو تم اُن کے پاس آیا کرو، مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ: اُس جگہ سے جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں کثرت سے توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے والوں سے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ: حَرْث اصل کے اعتبار سے مصدر ہے، حَرَثَ يَحْرُثُ: کھیتی بونا، بیج ڈالنا، سورۂ واقعہ کے اندر یہ لفظ آئے گا اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ: مَا تَحْرُثُوْنَ: جو تم بیج ڈالتے ہو، جو تم بوتے ہو۔ اور یہاں حرث موضعِ حَرث کے معنی میں ہے، بیج ڈالنے کی جگہ، جس کے لئے ہماری زبان میں لفظ استعمال ہوتا ہے کھیت، ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت ہیں'' یعنی کاشت کرنے کی جگہ ہیں، فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ: پھر آیا کرو تم اپنے کھیت کے پاس جس طرح سے چاہو، اَنّٰى کیف کے معنی میں بھی ہوتا ہے جو کیفیت کے عموم پر دلالت کرتا ہے، اور اینَ کے معنی بھی ہوتا ہے جو مکان کے عموم پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہاں کیف کے معنی میں ہے، کیفَ شِئْتُمْ جس طرح سے چاہو تم اپنی بیویوں کے پاس آؤ۔ اور پھر حَرث بول کر کھیتی کے ساتھ بھی اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے یہاں ترجمہ کھیتی کے ساتھ کیا ہے، مقصد ایک ہی ہے، وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ: آگے بڑھایا کرو اپنے نفع کے لئے، کس چیز کو آگے بڑھایا کرو؟ مفعول یہاں محذوف ہے، آگے بڑھایا کرو اپنے نفسوں کے لئے وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ: اور یقین کرلو کہ بیشک تم اُس اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ: عُرضة: نشانہ، ہدف۔ اصل کے اعتبار سے عُرضة کہا جاتا ہے حجاب کو اور رکاوٹ کو، مثلاً جس وقت تیر اندازی کی جاتی ہے تو آگے جو چیز کھڑی کرلی جاتی ہے جو تیر کو روکے، جس پر نشانہ مارا جاتا ہے، اس کو عُرضة کہتے ہیں، تو گویا کہ تیر کے آگے گزرنے سے وہ آڑ بن جایا کرتا ہے، اس اعتبار سے نشانے کے معنی میں، آڑ یا حجاب کے معنی میں لفظ عُرضة کو استعمال کیا جاتا ہے، ''اللہ کو آڑ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کے سبب سے، یا، اللہ کو نشانہ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کے لئے'' اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ: لِئَلَّا تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ: نہ بنایا کرو اللہ کو رکاوٹ اور آڑ اپنی قسموں کے سبب سے اس کام سے کہ تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور لوگوں کے درمیان میں اصلاح کرو۔ اور ''لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے اور نیکی اختیار کرنے سے اللہ کے نام کو رکاوٹ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کے سبب سے'' یوں بھی ترجمہ صحیح ہے، اللہ کے نام کو رکاوٹ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کے سبب سے، رکاوٹ نہ بنایا کرو نیکی کرنے سے اور تقویٰ اختیار کرنے سے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے سے۔ اور یوں بھی اس ترجمے کو ادا کر سکتے ہیں کہ ''اللہ کو نشانہ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کے لئے تاکہ تم نیکی نہ کرو، تقویٰ نہ اختیار کرو، لوگوں کے درمیان اصلاح نہ کرو'' وضاحت اس کی بعد میں آجائے گی، ترجمے کو دونوں طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے

والا ہے۔ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ: نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے، بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ: اُس لغو کے سبب سے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ: لیکن مؤاخذہ کرے گا تم سے، بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ: بسبب اس کام کے جس کو تمہارے دل کرتے ہیں، تمہارے دل کے کسب کے سبب سے اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرے گا، اور قسموں میں جو لغو پیش آجاتا ہے اس کے اعتبار سے مؤاخذہ نہیں کرے گا، تو لغو کا مصداق ہوجائے گا کہ قسم کھانے کا ارادہ نہیں تھا زبان سے نکل گئی، دل نے کسب اور قصد نہیں کیا کہ میں قسم کھاؤں۔ یا لغو کا مصداق ایسی قسم ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے خیال کے مطابق سچی کھائی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خلاف واقع بات تھی اور جھوٹ تھی، لیکن چونکہ جھوٹ بولنے کا آپ کے دل نے قصد نہیں کیا اس عتبار سے وہ قسم بھی لغو کا مصداق ہوجاتی ہے، مثلاً آپ یہ سمجھتے ہیں کہ زید آگیا، کسی کو آتے ہوئے آپ نے دیکھا تھا اور آپ نے سمجھ لیا کہ زید آگیا، اور کسی کے سامنے قسم کھا کے ذکر کردیا کہ زید آگیا، اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو کوئی اور شخص تھا، آپ کو مغالطہ لگا، تو اس قسم کے اوپر کوئی مؤاخذہ نہیں، کیونکہ اس میں آپ نے جھوٹ بولنے کا قصد نہیں کیا، تو لغو کا مصداق یہ بھی ہے، اور ایک ہے کہ ارادہ تھا ہی نہیں، بلاقصد زبان سے قسم نکل گئی، جس طرح سے عام طور پر گفتگو میں بسا اوقات تکیہ کلام کے طور پر ہی قسم جاری ہوجایا کرتی ہے، لغو کا مصداق وہ بھی ہے، تفصیل اِس کی بعد میں آجائے گی۔ اور کسبِ قلب یہ ہے کہ دل قصد کے ساتھ قسم کھاتا ہے، جھوٹ بولنے کا قصد کرتا ہے، انسان جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے اور قسم کھاتا ہے، تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ مؤاخذہ فرمائیں گے۔ ''لیکن مؤاخذہ کریں گے تم سے تمہارے قلب کے کسب کرنے کے سبب سے'' مَا کو اگر مصدریہ بنالیا جائے تو کَسَبَتْ کو مصدر کی تاویل میں کرلیں گے، تمہارے دلوں کے کسب کرنے کے سبب سے اللہ تعالیٰ تم پر مؤاخذہ کریں گے، گرفت کریں گے، وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں، بردبار ہیں، تحمل کرنے والے ہیں۔ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِہِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْہُرٍ: اُن لوگوں کے لئے جو کہ اپنی عورتوں سے ایلاء کرلیا کرتے ہیں۔ یُؤْلُوْنَ ایلاء سے لیا گیا ہے، اور ایلاء فقہ کے اندر آپ پڑھتے ہیں، عورتوں سے ترکِ تعلق پر قسم کھالینا کہ میں اپنی بیوی کے قریب نہیں جاؤں گا، اس کا مادہ اَلَا یَاْلُوْ ہے جس کا معنی ہوتا ہے کوتاہی کرنا، اور اٰلیٰ اِیْلَآءً اب یہ اصطلاحی لفظ ہوگیا، عورتوں سے ترکِ تعلق کی قسم کھالینا، کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا، اس میں کوتاہی والا معنی نمایاں ہے، ''جو لوگ اپنی عورتوں سے ترکِ تعلق پر قسم کھالیتے ہیں اُن کے لئے'' تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْہُرٍ: چار مہینے کا انتظار کرنا ہے، تربُّص انتظار کرنے کو کہتے ہیں، فَاِنْ فَآءُوْ: اگر وہ رجوع کرلیں، لوٹ آئیں، فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ''رجوع کرلیں'' یعنی قسم توڑ دی اور اپنی بیوی کے پاس چلے گئے، اپنی قسم کے خلاف کرلیا۔ ''اللہ تعالیٰ بخشنے والے رحم کرنے والے ہیں'' کہ قسم کے توڑنے کی بناء پر جو گناہ ہوا، جب قاعدے کے مطابق اس کا کفارہ دے دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ: اور اگر اُن لوگوں نے طلاق کا ہی عزم کر رکھا ہے، یعنی وہ رجوع نہیں کرتے، رجوع نہ کرنا یہی عزمِ طلاق ہے، ''اور اگر انہوں نے عزم کیا ہے طلاق کا پس بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں'' پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ فَیْ نہیں کرتے، لوٹتے نہیں ہیں، قسم توڑ کر بیوی کی طرف واپس رجوع نہیں کرتے، تو ایسی صورت میں احناف کے نزدیک چار مہینے گزرتے ہی طلاق واقع ہوجایا کرتی ہے، گویا کہ رجوع نہ کرنا یہی عزمِ طلاق ہے کہ انہوں نے طلاق کو پختہ کر

دیا ۔فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں۔ وَالۡمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ ثَلٰثَۃَ قُرُوۡٓءٍ: اور وہ عورتیں جن کو طلاق دے دی جائے یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ: وہ اپنے نفسوں کو انتظار میں رکھیں، ثَلٰثَۃَ قُرُوۡٓءٍ: تین قروء۔ قروء قرء کی جمع ہے، اِس کا معنی حیض بھی آتا ہے اور طہر بھی آتا ہے، احناف کے نزدیک یہاں حیض مراد ہے، تین حیض تک وہ اپنے نفسوں کو انتظار میں رکھیں، وَلَا یَحِلُّ لَہُنَّ: اور حلال نہیں اُن عورتوں کے لئے اَنۡ یَّکۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیۡۤ اَرۡحَامِہِنَّ: کہ چھپالیں اس چیز کو جو اللہ نے پیدا کی اُن کے رحموں میں، جو چیز اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے اس کا چھپانا اُن کے لئے حلال نہیں۔ ''جو چیز پیدا کی ہے'' اس کا مصداق بچہ بھی ہے اور دمِ حیض بھی، اِنۡ کُنَّ یُؤۡمِنَّ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ: اگر وہ ایمان لاتی ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر۔ وَبُعُوۡلَتُہُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّہِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ: بُعُوۡلَۃ۔ بعل کہتے ہیں خاوند کو، جیسے دوسری جگہ آیا ہوا ہے ہٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا (سورۂ ہود: ۷۲) یہ میرا بعل بوڑھا ہو گیا، بعل سے خاوند مراد ہے، ''اِن عورتوں کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں اِن عورتوں کے لوٹانے کا'' فِیۡ ذٰلِکَ: اس مدت میں، یعنی جو تین حیض پیچھے ذکر کی گئی ہے، اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا: اگر ارادہ کریں وہ خاوند حالات کو درست کرنے کا۔ وَلَہُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: اور اُن عورتوں کے لئے مثل اس چیز کے ہے جو ان کے ذمے ہے معروف کے ساتھ، لَہُنَّ: ان عورتوں کے لئے، عَلَیۡہِنَّ: جو ان کے ذمے ہے، یعنی مردوں کے حقوق جو عورتوں کے ذمے ہیں اسی کی مثل عورتوں کے لئے حقوق مردوں کے ذمے بھی ہیں، لَہُنَّ کا یہ معنی ہوا، ان عورتوں کے لئے مردوں کے ذمے ہے مثل اس چیز کے جو ان عورتوں کے ذمے ہے، بِالۡمَعۡرُوۡفِ: معروف طریقے سے، عرف کے مطابق، وَلِلرِّجَالِ عَلَیۡہِنَّ دَرَجَۃٌ: اور مردوں کے لئے ان عورتوں پر درجہ ہے، یعنی مردوں کو اِن عورتوں پر فوقیت حاصل ہے، وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ: اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

تفسیر

''یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ'' کا شانِ نزول

پچھلے رکوع کے آخر میں نکاح کا ذکر ہوا تھا، اِسی سے کلام منتقل ہو گئی بیوی کے بعض احکام کی طرف۔ اِس رکوع کی پہلی آیت یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ کے شانِ نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا تھا کہ ایامِ حیض میں بیوی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جا سکتا ہے؟ اور اِس پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ منورہ کے اردگرد یہود آباد تھے، اور وہ اہلِ علم سمجھے جاتے تھے، یہود کا طریقہ یہ تھا کہ جس وقت عورت کو یہ ایام آجائیں تو اُس کو گھر سے علیحدہ کر دیتے تھے، علیحدہ کمرے میں اُس کو ٹھہراتے، اُس کے ساتھ ایک کمرے میں نہیں رہتے تھے، اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہیں تھے، جب کھانے پینے سے اور ساتھ رہنے سے بھی پرہیز تھا تو دیگر معاملات بوس و کنار جیسے کہ بیویوں کے ساتھ ہوا کرتے ہیں اُن کو وہ کس طرح سے جائز سمجھ سکتے تھے، اس طرح عورت کو وہ اپنے ماحول سے کاٹ کر ایک طرف کر دیتے تھے۔ اور بعض تفاسیر (نسفی وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے برعکس نصاریٰ کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ ایامِ حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ تو ایک طرف افراط اور ایک طرف تفریط۔ اس لیے صحابہ کرام ؓ نے سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے، ہم ان ایام میں بیوی کے

ساتھ کیا معاملہ کیا کریں؟ تو اُن کے سوال کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے قول اور عمل کے ساتھ ان آیات کی وضاحت فرمائی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ آپ سے یہ حیض کے دنوں میں عورت کے ساتھ برتاؤ کے متعلق پوچھتے ہیں، حیض کے متعلق سوال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حیض کے ایام میں عورت کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ تو آپ انہیں کہہ دیں کہ یہ قابلِ نفرت چیز ہے، گندی چیز ہے، پلید چیز ہے۔

حالتِ حیض میں بیوی سے علیحدگی کی حد کیا ہے؟

عورتوں سے حیض کے زمانے میں دور رہا کرو، فَاعْتَزِلُوا: اعتزال اختیار کیا کرو، علیحدگی اختیار کیا کرو۔ اب اس علیحدگی کی حد کیا ہے؟ عورتوں سے کتنا علیحدہ رہنا چاہیے، بظاہر تو یہ لفظ اشارہ کر رہا ہے اُسی معاملے کی طرف ہی جس قسم کا معاملہ یہود نے اختیار کر رکھا تھا، جب ہم یہ کہیں گے کہ عورتوں سے علیحدگی اختیار کرو تو اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے منشائے خداوندی کو ظاہر فرمایا، صحاح کے اندر روایت موجود ہے، اور خاص طور پر نسائی شریف میں اُس روایت کے اُوپر ترجمۃ الباب بھی یہ قائم کیا گیا ہے تاویلُ قولِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ: اللہ تعالیٰ کے قول وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ کا مطلب۔ اور اُس کے نیچے سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے روایت نقل فرمائی، جس میں یہ الفاظ ہیں أَنْ يَصْنَعُوا بِهِنَّ كُلَّ شَيْءٍ مَا خَلَا الْجِمَاعَ۔ اسی طرح ایک حدیث میں الفاظ ہیں: ''اِصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ''[1] کہ اپنی بیویوں کے ساتھ ہر معاملہ کر سکتے ہو سوائے وطی کے، نکاح سے یہاں وطی مراد ہے۔ تو اعتزالِ نساء سے مراد ہو گیا وطی سے اعتزال، جو مقامِ حیض ہے، جس طرح سے قُلْ هُوَ اَذًى کے اندر اشارہ کیا گیا کہ وہ گندی چیز ہے، قابلِ نفرت چیز ہے، تو جس مقام میں وہ گندی چیز موجود ہوگی، قابلِ نفرت چیز موجود ہوگی، علیحدگی بھی اُسی سے اختیار کرنی ہے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے عمل کے ساتھ بھی اس بات کو واضح فرمایا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حیض کے زمانہ میں حضور ﷺ ہمیں چادر باندھنے کا حکم فرما دیا کرتے تھے، اور پھر ہمیں ساتھ بھی لٹا لیا کرتے تھے،[2] تو معلوم ہوا کہ بوس وکنار جائز ہے۔ اور اسی طرح سے فرماتی ہیں کہ میں ایک گوشت والی ہڈی لیتی، اُس میں سے کچھ کھاتی، وہ ہڈی مجھ سے حضور ﷺ لے لیتے، اور جہاں سے میں نے منہ رکھ کے کھایا ہوتا تھا وہیں حضور ﷺ منہ رکھ کے کھاتے،[3] اس طرح سے حضور ﷺ کا اپنی بیویوں کے ساتھ معاملہ فرمانا اور اس عمل کو ظاہر کرنا یہ اس نفرت کو ختم کرنے کے لئے ہے جو یہود نے حائضہ عورت کے متعلق قائم کر رکھی تھی۔ اور فرماتی ہیں کہ میں پانی پیتی تو بچا ہوا پانی حضور ﷺ مجھ سے لے لیتے، جس جگہ سے منہ لگا کر میں نے پانی پیا ہوتا تھا رسول اللہ ﷺ بھی وہیں منہ لگا کر پانی پیتے تھے،[4] تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ حائضہ

---

(۱) مسلم ۱/۱۴۳، باب جواز غسل الحائض الخ۔

(۲) بخاری ۱/۴۳، باب مباشرۃ الحائض۔ مشکوۃ ۱/۵۶، باب الحیض۔ ولفظہ: وکان یامرنی فاتزر فیباشرنی وانا حائض۔

(۳) مسلم ۱/۱۴۳، باب جواز غسل الحائض الخ۔ مشکوۃ ۱/۵۶، باب الحیض۔ فصل اول۔ وَأَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ

(۴) حوالہ مذکورہ۔ ولفظہ: كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ فَيَشْرَبُ

عورت کا لعابِ دہن بالکل پاک ہے، اور اس کا جھوٹا بالکل پاک ہے، اس کے ساتھ لیٹنا جائز ہے، باقی بدن کے ساتھ مباشرت جائز ہے، بدن کو بدن کے ساتھ لگا لینا اور بوس و کنار جس طرح سے محبت پیار ہوتا ہے سب کچھ ٹھیک ہے، البتہ وطی بالاتفاق حرام ہے، موضعِ دم سے بچنا ضروری ہے، اور ناف سے لے کر گھٹنوں تک حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک استمتاع ممنوع ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ پابندی احتیاط کی بناء پر ہے، کہ ناف سے لے کر گھٹنے تک اگر کوئی شخص اس جگہ کو بھی ننگی کر کے بدن کو بدن کے ساتھ لگائے گا تو بہت خطرہ ہوتا ہے کہ انسان خطرے والی جگہ میں واقع ہو جائے گا، اس لیے یہ پابندی ضروری ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان رانوں پر استمتاع نہ کیا جائے، اور باقی بدن کے ساتھ جس طرح سے چاہیں استمتاع کر سکتے ہیں، جھوٹا بھی جائز ہے اور بوس و کنار ہر طرح سے جائز ہے، حضور ﷺ نے اپنے عمل کے ساتھ اس بات کو واضح فرما دیا۔ حتی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہاں تک فرماتی ہیں کہ اعتکاف کے دنوں میں حضور ﷺ اپنا سر مبارک مسجد سے باہر گھر کی طرف کر دیا کرتے تھے، تو میں اُس کو دھو بھی دیتی اور کنگھی بھی کرتی باوجود حائضہ ہونے کے۔[1] اور میں حائضہ ہوتی اور رسول اللہ ﷺ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے اور قرآنِ کریم بھی پڑھتے رہتے،[2] جس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سارے کے سارے معاملات درست ہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کے اِن اقوال اور اِن افعالِ مبارکہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اِس قول کا مطلب واضح ہو گیا، کہ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ سے مراد یہ ہے کہ وطی سے دور رہو، عورتوں کے ساتھ وطی کرنی ٹھیک نہیں، یہود نے جس طرح سے عورتوں کو اِن ایام میں قابلِ نفرت چیز بنا دیا تھا تو یہود کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے، اور نہ ہی نصاریٰ کا طریقہ ٹھیک رہا کہ ان کے نزدیک کسی چیز سے بھی پرہیز نہیں تھا، حتی کہ وطی کرنی بھی جائز تھی۔ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ کا یہ معنیٰ ہوا۔

حیض ختم ہونے کے بعد وطی کب جائز ہے؟

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ: اُن کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، یہاں بھی قریب جانے سے قربان یعنی وطی مراد ہے، یعنی اُن سے وطی نہ کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔ يَطْهُرْنَ یہ مجرد سے ہے، اصول فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھیں گے کہ بعض قراءتوں میں یہاں ہے يَطَّهَّرْنَ، اور دو قراءتیں دو آیتوں کے قائم مقام میں ہوتی ہیں، تو دونوں پر عمل کیسے ہوگا، کیونکہ يَطْهُرْنَ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ طاہر ہو جائیں یعنی اُن کا وہ خون ختم ہو جائے، اور يَطَّهَّرْنَ میں مبالغہ آ گیا، جس کا معنیٰ ہے کہ وہ اچھی طرح سے نہا دھو کر صاف ستھری ہو جائیں۔ تو عورت جس وقت حائضہ ہو تو حیض ختم ہونے کے بعد وطی اُس کے ساتھ کب جائز ہے؟ ہمارے مسلک میں تفصیل آپ کے سامنے موجود ہے، فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھتے رہتے ہیں، کہ اگر تو خون کا انقطاع ہوا ایامِ حیض پورے ہونے کے بعد یعنی دس دن کے بعد، تو اب چونکہ حیض کے آنے کا امکان ہی نہیں، بالیقین اُس کا حیض ختم

---

(۱) ابن ماجہ ۱/ ۴۶، باب الحائض تتناول۔ ولفظہ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُدْنِي رَأْسَهُ إِلَيَّ وَأَنَا حَائِضٌ وَهُوَ مُجَاوِرٌ تَعْنِي مُعْتَكِفًا فَأَغْسِلُهُ وَأُرَجِّلُهُ نیز بخاری ۱/ ۴۳

(۲) بخاری ۱/ ۴۴، باب قراءۃ الرجل فی حجر الخ مشکوۃ ۱/ ۵۶، باب الحیض۔ فصل اول ولفظہ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَّكِئُ فِي حِجْرِي وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ۔

ہوگیا، اس صورت میں بغیر غسل کے بھی اُس کے ساتھ وطی کی جاسکتی ہے۔ اور اگر خون دس دن کے اندر ختم ہوا ہے تو ایسی صورت میں عورت پہلے غسل کرلے، اس کے بعد وطی کی جائے، یا حیض کے ختم ہونے کے بعد اتنا وقت گزر جائے کہ عورت کے ذمے ایک نماز واجب ہوجائے، کیونکہ جب شریعت اُس کے ذمے ایک نماز واجب کردے گی تو گویا کہ شریعت نے اُس کو طاہرہ کے حکم میں داخل کرلیا، جب وہ طاہرہ کے حکم میں داخل ہوگئی تو اب اُس کے ساتھ وطی بھی کی جاسکتی ہے۔ ایام حیض کی کم مدت کے اندر یعنی دس سے کم دن کے اندر حیض ختم ہو تو حیض ختم ہوتے ہی وطی درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں دس دن کے اندر اندر دوبارہ خون کے عود کر آنے کا امکان ہوتا ہے، اگر دوبارہ خون عود کر آیا تو آپ کی یہ وطی حیض کے زمانے میں ہوجائے گی اور آپ گناہ گار ہوجائیں گے۔ اس لیے یا تو نہا کر طہارت والی جانب غالب آجائے، یا حیض کو بند ہوئے ہوئے اتنی دیر ہوجائے کہ شرعاً اس کے ذمے ایک نماز واجب ہوجائے، جس وقت نماز اس کے ذمے واجب ہوجائے گی تو گویا کہ شریعت نے اس کو فی حکم الطاہرۃ کردیا، پھر اس کے ساتھ وطی کی جاسکتی ہے۔ تو دونوں قراءتوں میں یوں فرق ہوجائے گا۔ حَتّٰى يَطْهُرْنَ: جب تک کہ پاک نہ ہوجائیں، حتی کے بعد نفی کا ترجمہ کرنا ہے، اس بات کی طرف ہمیشہ آپ کو متوجہ کرتا رہتا ہوں۔

''اَمَرَكُمُ اللّٰهُ'' سے کیا مراد ہے؟

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ: جس وقت وہ اچھی طرح سے پاک صاف ہوجائیں، فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ: پھر آیا کرو اُن کے پاس اُس جگہ سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا، اَمَرَكُمُ اللّٰهُ: اللہ نے تمہیں حکم دیا، بظاہر اس کا ترجمہ یہی ہے، لیکن یہ حکم اللہ کا کہاں ہے؟ کہ فلاں مقام میں وطی کیا کرو، فلاں مقام میں جماع کیا کرو، یہ حکم صراحتاً کتاب اللہ کے اندر مذکور نہیں، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اِس امر الٰہی سے مراد ہے وہ امر جو کہ فطرۃ اللہ کے تحت انسان کی طبیعت میں ودیعت رکھا گیا ہے، جیسے ہم یہ کہیں کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ منہ سے کھاؤ، اب یہ سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص اگر ناک میں لقمہ ڈالنا چاہے، یا آنکھ کے اندر کوئی لقمہ ڈالنا چاہے، یا کسی اور طریقے سے پیٹ میں کوئی چیز پہنچانا چاہے تو ہم کہیں گے یہ امر الٰہی کے خلاف ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے طور پر اس قابل منہ بنایا ہے کہ اس کے ذریعے سے لقمہ پیٹ کے اندر پہنچایا جائے، کوئی دوسرا سوراخ اللہ نے اس قابل نہیں بنایا کہ اُس کے ذریعے سے تم لقمہ پیٹ میں ڈالو۔ جب فطرت کے تقاضا یہی ہے تو فطرت کے تقاضے کے تحت گویا کہ یہ فطری امر ہے جو اللہ نے دے دیا کہ یہ مقام اِس کام کے لئے ہے، لہٰذا اُس مقام کو اُسی کام کے لئے استعمال کرنا یہ امر الٰہی کے تحت ہے۔ تو یہ فطرت کے طور پر اللہ کا حکم ہے کہ فلاں مقام کے اندر آؤ جو مقام اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس مقصد کے لئے بنایا ہے، جس میں انسان کی قضائے شہوت والی حاجت بھی پوری ہوتی ہے، اور اس کے تحت بقائے نسل والی اور جہان کی آبادی والی حکمت بھی متحقق ہوتی ہے، اس لیے مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ سے قُبُل مراد ہے، اور امر سے وہ امر الٰہی مراد ہے جو فطرت کے طور پر انسان کی طبیعت کے اندر رکھا ہوا ہے۔ ''پاک ہوجانے کے بعد اُن کے پاس آؤ وہاں سے جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا۔''

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں اچھی طرح سے توبہ کرنے والوں کو اور پسند فرماتے ہیں اچھی

طرح سے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔ تَطَہُّر، متطہرین کے معنی صاف ستھرا رہنے والے، پاکیزہ رہنے والے، اِن کو اللہ پسند فرماتے ہیں۔ توبہ باطنی گناہوں سے صفائی کا ذریعہ ہے، جیسے تطہُّر ظاہری میل کچیل سے صاف ہونے کا ذریعہ ہے، تو توبہ اور تطہُّر دونوں کا ذکر کر دیا کہ صاف ستھرے رہو، اور اگر کبھی کوئی غلطی ہو جائے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی امر واقع ہو جائے اور باطنی میل کچیل تمہیں حاصل ہو جائے تو توبہ کر کے اُس کو صاف کرو۔

”نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ“ کا شانِ نزول

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ: اِس آیت کے شانِ نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہود کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ وہ عورت کے ساتھ وطی ایک متعین طریقے سے کرتے تھے، کہ اُس کو چت لٹا لیا جائے اور چت لٹا کے اس کے ساتھ مجامعت کی جائے، اور وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص دُبر کی جانب سے قُبُل میں وطی کرے یعنی اس کو الٹا لٹا لے اور دبر کی طرف سے وطی قبل میں کرے اور ایسی صورت میں اگر حمل ٹھہر جائے تو بچہ اَحول پیدا ہوتا ہے، احول بھینگے کو کہتے ہیں، جس کو فارسی میں لوچ کہتے ہیں، اس کی نظریں پھری ہوئی ہوتی ہیں، دونوں آنکھوں کا زاویہ ٹھیک نہیں ہوتا، دونوں آنکھیں مل کر نہیں دیکھتیں، بلکہ ہر آنکھ مستقل دیکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس کو ایک چیز کے دو نظر آیا کرتے ہیں، جیسے گلستان (باب ۸) میں فقرہ موجود ہے: ”یک دو بیند لوچ“ کہ لوچ اور بھینگا ایک چیز کو دو دیکھا کرتا ہے، چیز ایک پڑی ہوئی ہوگی لیکن جس وقت وہ دیکھے گا تو اس کو دو نظر آئیں گی، یہ آنکھ مستقل دیکھے گی اور یہ آنکھ مستقل دیکھے گی، دونوں کی روشنیوں میں اتحاد نہیں ہوتا، اُس کو عربی میں ”احول“ کہتے ہیں، اور فارسی میں ”لوچ“ کہتے ہیں، اُردو میں ”بھینگا“ کہتے ہیں۔ تو یہود کہتے تھے کہ بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال بھی سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے آیا کہ کیا اُن کا یہ نظریہ ٹھیک ہے؟ شانِ نزول کے اندر یہ واقعہ بھی نقل کیا ہوا ہے (بخاری)۔ اور دوسرا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہوا ہے (چونکہ زوجین کا آپس میں تعلق انسان کی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے، اور اِس تعلق کے اندر انبساط اور پوری طرح سے آپس میں طبیعتوں کا ایک دوسرے سے لذت اٹھانا، یہ انسان کی زندگی کی تعمیر میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے، اخلاق کی صفائی میں اور ماحول کی اچھائی میں اِن چیزوں کا بہت دخل ہے) کہ انصار کے اندر تو مجامعت کا طریقہ ایک ہی تھا، لیکن مکہ معظمہ کے رہنے والے جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں گئے تھے اُن کے ہاں عادت تھی کہ مختلف حرکات کے ساتھ عورت سے لذت لیتے تھے، یعنی کبھی بیٹھ کر، کبھی لیٹ کر، کبھی الٹے، سیدھے، جیسے بھی حرکت کی جا سکے بیویوں کے ساتھ اس طرح سے کھیلنا اور مختلف انداز کے ساتھ استمتاع کرنا مہاجرین کے اندر عادت تھی جو مکہ معظمہ سے آئے تھے۔ تو مدینہ منورہ میں آ کر مہاجرین نے انصار کی لڑکیوں سے بھی شادی کی، تو کہیں زوجین کا آپس میں اختلاف ہو گیا، کہ خاوند نے اُس کو اُسی طرح استعمال کرنا چاہا جس طرح ان کے ہاں مروج تھا، اور ان کی عادت تھی، اور اس عورت نے انکار کیا۔ یہ اختلاف سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے گیا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بارے میں بھی راہنمائی فرما دی،[1] جس کا

---

[1] ابوداؤد ۱/ ۲۹۳ باب فی جامع النکاح۔ وَكَانَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ قُرَيْشٍ يَتَلَذَّذُونَ مِنْهُنَّ مُقْبِلَاتٍ وَمُدْبِرَاتٍ وَمُسْتَلْقِيَاتٍ فَلَمَّا قَدِمَ الْمُهَاجِرُونَ الخ

حاصل یہ ہے کہ اُن کا یہ نظریہ غلط ہے، جماع کرنے کے لئے جگہ تو متعین ہے، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرث قرار دیا، کھیتی کی جگہ، کھیت، جس میں بیج ڈالا جاتا ہے، باقی! اُس کھیت تک پہنچنے کے لئے طریقہ کوئی متعین نہیں، جیسے زوجین کی طبیعت میں انبساط ہو اُسی طرح درست ہے۔ اور اِس میں شریعت کی حکمت یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں محبت اور پیار کرنے کے لئے جتنے جذبات ہوں اُن کی تسکین بیوی کے ساتھ کر لے، تا کہ اُس کی طبیعت میں تشنگی باقی نہ رہے، کہ پھر اُس کو فسق وفجور کا راستہ اختیار کرنا پڑے اور کسی دوسری طرف نگاہ اٹھانی پڑے، بلکہ اس کے جتنے جذبات ہیں اس کو تسکین بیوی کے ساتھ دینی چاہیے۔ ہاں البتہ آنے کے لئے مقام متعین ہے جس کو حرث قرار دیا گیا، جس میں نطفے کا ڈالنا گویا القاءِ بذر کی طرح ہے، جیسے بیج ڈال دیا، اور بچہ پیداوار کی طرح ہے۔ تو مقام متعین ہے، باقی! آنے کی کیفیت کوئی متعین نہیں۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ: حرث مصدر ہے بیج ڈالنے کے معنی میں، اور یہاں موضع حرث مراد ہے جس کو ہم اپنی زبان میں کھیت کہتے ہیں، ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت ہیں۔''

بیوی کے ساتھ اِستمتاع میں محل خاص ہے، کیفیت عام ہے

فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ: آیا کرو تم اپنے کھیت میں، اَنّٰى شِئْتُمْ: اس سے مراد ہے كيف شئتم، کیونکہ اَنّٰى اَيْنَ کے معنی بھی ہوتا ہے اور كَيْفَ کے معنی میں بھی ہوتا ہے، اگر تو اس کو كيف کے معنی میں لیں گے تو کیفیت میں تعمیم ہوگی کہ حالت کوئی متعین نہیں، چاہے بیٹھ کر اپنا دل بہلاؤ، چاہے لیٹ کر بہلاؤ، اوپر لیٹ کر بہلاؤ، نیچے لیٹ کر بہلاؤ، جو کیفیت بھی اختیار کر لو، جس طرح سے تمہاری طبیعت کی خواہشات پوری ہوتی ہیں، یہ جائز ہے، جس وقت كيف کے معنی میں کریں گے تو پھر یہ معنی نکلے گا۔ اور اگر اَيْنَ کے معنی میں کریں تو محل کی تعمیم ہو جائے گی، حالانکہ بیوی کے استعمال کرنے میں محل کی تعمیم نہیں ہے، اور اِس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ لواطت اپنی بیوی کے ساتھ بھی حرام ہے، یعنی قضائے شہوۃ فی الدبر اپنی بیوی کے ساتھ بھی حرام ہے، چاہے اس کے بدن کے ہر حصے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاوند کے لئے حلال کیا ہے کہ انسان اُس سے استمتاع کر سکتا ہے، ہاتھ پھیر سکتا ہے، لگا سکتا ہے، لیکن قضائے شہوت فی الدبر کے متعلق تقریباً ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اپنی زوجہ منکوحہ کے ساتھ بھی یہ حرام ہے، اس لیے اَيْنَ کے معنی میں ہم نہیں کریں گے کہ جس سے محل کی تعمیم کا اشارہ نکلے اور اس سے بیوی کے ساتھ قضائے شہوت فی الدبر کے جواز کا اشارہ ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ بس ایک یہ مقام اور محل ممنوع ہے اور اس کے علاوہ استمتاع کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں بیوی کے ساتھ سب جائز ہیں۔

منصوبہ بندی اور برتھ کنٹرول کے سب طریقے ممنوع ہیں

فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ: اب یہاں جو لفظ حرث استعمال کیا گیا ہے، اس میں توجہ فرمایئے، کہ بیوی کو حرث قرار دیا گیا، اور یہ کاشتکار لوگ جانتے ہیں اور آپ حضرات بھی سنتے ہوں گے، کہ کھیت کے بارے میں صاحبِ کھیت کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ایسے طریقے اپنائے جائیں کہ اُس سے پیداوار زیادہ سے زیادہ لی جائے، اچھی سے اچھی پیداوار لی جائے، جب اچھی سے اچھی پیداوار حاصل کرنی ہوگی تو انسان اوقات کا خیال بھی کرتا ہے، اور باقی چیزیں جتنی ہوتی ہیں اُن سب کی رعایت کرتا ہے، جیسے کھاد

استعمال کرتا ہے، دوسری چیزیں استعمال کرتا ہے جس سے پیداوار زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ تو اس سے اس بات کی طرف تو اشارہ نکلتا ہے کہ زوجین کے تعلق سے مقصود کثرتِ اولاد ہے، تاکہ بقائے نسل ہو اور اس دنیا کی آبادی ہو، اور سرورِ کائنات ﷺ نے بھی فرمایا: ''تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ''[1] ایسی عورت سے نکاح کیا کرو جو زیادہ بچے دینے والی ہو، زیادہ محبت کرنے والی ہو ''فَاِنِّیْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ'' میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے دُوسری اُمتوں کے مقابلے میں کثرت میں فخر کروں گا کہ میری اُمت بہت ہے، اور اُمت کے اندر کثرت جو پیدا ہوگی تو وہ کثرتِ اولاد کے ساتھ پیدا ہوگی، اس لیے فرمایا کہ کوشش کیا کرو کہ ایسی عورت حاصل کرو جو بچے زیادہ دینے والی ہو۔ وَدُود اور وَلُود ہو محبت کرنے والی ہو، بچے زیادہ دینے والی ہو، اُس کے ساتھ نکاح کرو۔ یہ ساری چیزیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اولاد کی کثرت مطلوب ہے، اور اِس سے اس نظریے کی کتنے واضح انداز کے ساتھ تردید ہو جاتی ہے جو اس کھیت کو بنجر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کو آج کل آپ خاندانی منصوبہ بندی یا برتھ کنٹرول کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ پیدائش کے اوپر کنٹرول کیا جائے، خاندانی منصوبہ بندی کے تحت ایک دو بچے حاصل کرنے کے بعد اس عورت کو اس قابل کر دیا جائے کہ پھر وہ اور بچہ نہ جنے، تو یہ بنجر بنانے کی جو کوشش ہے کہ اس کھیت میں سے کچھ پیدا نہ ہو، یہ فطرت کے خلاف ہے جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، لفظِ حرث خود اس نظریے کی تردید کے لئے کافی ہے، یعنی یوں تو ہوسکتا ہے کہ جب اِس کو حرث قرار دیا گیا تو انسان کوشش کرے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو، اور یہی شریعت میں مطلوب ہے، جیسے میں نے حدیث شریف آپ کے سامنے پڑھی۔ لیکن یہ بالکل شریعت اور فطرت کے خلاف ہے کہ انسان ایسے انداز اختیار کرے کہ اس کھیت میں شہوت رانی تو کرتا رہے اور اپنی خواہشات تو پوری کرتا رہے لیکن اُس میں سے پیداوار کچھ حاصل نہ ہو، یہ نظریے کی غلطی ہے اور شریعت اِس عمل کی کسی صورت میں اجازت نہیں دے سکتی، اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کی جتنی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، برتھ کنٹرول کے لئے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ سارے ممنوع ہیں۔

''قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ'' کے مختلف مفہوم

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ: اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو۔ کیا چیز آگے بھیجو؟ یہاں قَدِّمُوْا کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا، اس کا مفعول یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کو آگے بھیجو، پھر اس بات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ زوجین کے تعلقات میں چونکہ استلذاذ ہے، لذت ہے، تو اِدھر متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اِسی عیش وعشرت میں مبتلا نہ رہو، اِسی لذت پرستی میں لگے نہ رہو، بلکہ اپنے لیے نیک اعمال کا اہتمام کیا کرو، یہ بھی مقصد ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر اس جگہ اس کے ذکر کرنے کا یہ مقصد بھی ہوگا کہ زوجین کا آپس میں تعلق اعمالِ صالحہ کے جذبے کے ساتھ ہو، نیکی نیتی کے ساتھ، اچھی نیت کے ساتھ اپنی بیوی سے تعلق قائم کرو، تاکہ تمہارے یہ معاملات بھی اعمالِ صالحہ میں شمار ہو جائیں۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی

---

[1] سنن ابی داؤد ج۱ ص۲۸۰، باب النهی عن تزويج من لم يلد/ مشکوٰۃ ص۲۶۷ کتاب النکاح، فصل ثانی۔

بیوی کے پاس جاتا ہے اور قضاءِ شہوت کرتا ہے تو اس کو بھی صدقے کا ثواب ملتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! شہوت پوری کرنے پر بھی ثواب ملتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بتلاؤ، اگر اسی شہوت کو وہ کسی حرام جگہ میں پورا کرتا تو گناہ ہوتا یا نہ ہوتا؟ اور جب وہ جائز جگہ پوری کرے گا تو ثواب بھی ملے گا۔[1] تو جب نیک نیتی کے ساتھ یہ کام کیا جائے تاکہ ہمیں عفت حاصل ہو، عصمت حاصل ہو، ہماری طبیعت میں گناہ کا اور بدکاری کا جذبہ نہ رہے، بیوی کے ساتھ اس جذبے کے تحت جب انسان معاملہ کرے گا تو اس کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اس کا یہ عمل بھی نیک اعمال میں شمار ہوگا۔ اس نیت کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد دے اور ہم اُس اولاد کو دین پڑھائیں گے، وہ دین کی خدمت کرے گی، حافظ قرآن ہوگی، عالم ہوگی، نیک ہوگی، ہم مرجائیں گے، ہمارے لیے دعائیں کرے گی، کیونکہ نیک اولاد بھی انسان کے لئے صدقہ جاریہ ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں صراحتاً آتا ہے، کہ انسان مرجاتا ہے اور مرنے کے ساتھ اس کے اعمال ختم ہوجاتے ہیں، لیکن چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ثواب اس کو پہنچتا رہتا ہے، اُن میں ایک ولدِ صالح بھی ہے،[2] کہ بچہ جنا، اس کو نیک بنادیا، دیندار بنادیا، اس کو علم دین پڑھادیا، قرآن پڑھادیا، اب وہ جب نیکی کرے گا اور والدین کے لئے دعائیں کرے گا تو والدین کے لئے ثواب جاری رہے گا، تو یہ صدقۂ جاریہ ہے، اس لیے ولدِ صالح حاصل کرنے کی کوشش کرو، صرف قضائے شہوت ہی مقصود نہ ہو۔ اور یوں بھی بقائے نسل کا سامان پیدا کرو، ایسے حالات پیدا کرو کہ تمہاری نسل باقی رہے، اور اسی کے ساتھ اس دنیا کی آبادی ہے، جو دنیا کے اندر دنیوی زندگی میں تمہارے وارث ہوں گے، تمہاری جائیداد سنبھالیں گے، دوسری چیزوں میں تمہارے قائم مقام ہوں گے۔ تو قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کے اندر یہ ساری باتیں شامل ہیں، اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجو یعنی اپنے مستقبل کے لئے فکر و، آخرت کے لئے بھی، اور دنیا میں مستقبل کے لئے بھی، دنیا میں مستقبل کے لئے فکر یہی ہے کہ اولاد حاصل کرنے کی کوشش کرو، جو تمہارے قائم مقام ہوگی، تمہاری نسل باقی رہے گی، تمہارے لیے صدقہ جاریہ ہوگی، اور نیک اعمال کا اہتمام کرو جو آخرت میں تمہارے لیے کام آنے والے ہیں، دونوں طرح سے اِس مفہوم کو واضح کیا جاسکتا ہے، "آگے بھیجو اپنے نفسوں کے لئے"، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ: اللہ تبارک وتعالیٰ اس قسم کی باتیں احکام کے ذکر کرنے کے بعد جو فرمایا کرتے ہیں ان کا یاد رکھنا اصل کے اعتبار سے اُن احکام پر عمل کو آسان کردیتا ہے، "اس بات کا یقین کرلو کہ تم اس اُللہ سے ملنے والے ہو" جب اللہ تعالیٰ سے تمہاری ملاقات ہوگی تو پھر اگر اللہ کے احکام کی رعایت رکھی ہوگی تو تمہیں ثواب ملے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت نہیں رکھی ہوگی تو سزا ہوگی، یہ تصور ہے جو انسان کے لئے عملی زندگی کو آسان کردیتا ہے۔ "اور ایمان والوں کو خوشخبری سنادو" یعنی ایمان والوں کو خبر دے دو کہ ان کے سامنے ایسی حالت آنے والی ہے جس سے وہ خوش ہوجائیں گے۔

---

(۱) مسلم ۱/۳۲۵ باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی/مشکوٰۃ ۱/۱۶۸، باب الصدقة.

(۲) مسلم ۲/۴۱ باب ما یلحق الانسان/مشکوٰۃ ص ۳۲، کتاب العلم.

قسم کی اہمیت، اَقسام اور اَحکام

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ: عورتوں سے متعلق احکام کا سلسلہ شروع ہے، اور دو تین آیتوں کے بعد آپ کے سامنے اِیلاء کا مسئلہ آرہا ہے، اور ایلاء میں بھی چونکہ قسم ہوتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ پہلے یہاں قسم کے حکم کو واضح فرماتے ہیں، پھر آگے اُس خاص قسم کے حکم کو واضح فرمائیں گے جس کا تعلق عورت کے احکام سے ہے۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ عظیم الشان ہے، اُس کے نام کی عظمت کو پہچانو، کثرت کے ساتھ ایسے ہی قسمیں نہ کھاتے رہا کرو، پھر خاص طور پر ایسی قسم کھانا جس میں کسی نیکی کا ترک ہو، مثلاً آپ یہ قسم کھالیں کہ میں اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک نہیں کروں گا، بِرالوالدین کے ترک کرنے پر آپ نے قسم کھالی، بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کروں گا، کسی کے ساتھ بولوں گا نہیں، یا کسی بُرے کام پہ قسم کھالی کہ میں وہ کام کروں گا، تقوے کے خلاف قسم کھالی، یا کسی نیک کام کے متعلق قسم کھالی کہ میں یہ نہیں کروں گا، یا کسی وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی اور آپ نے قسم کھالی کہ میں آئندہ کے لئے لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرواؤں گا، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اللہ کے نام کو برائی کرنے کا اور نیکی سے روکنے کا ذریعہ بنالیا، اور اِس طرح کی قسم اللہ کے نام کی عظمت کے خلاف ہے، ایسی قسمیں نہ کھایا کرو، اس لیے مسئلہ بھی یونہی ہے کہ اگر کوئی اِس قسم کی قسم کھالے جس کے نتیجے میں کوئی گناہ لازم آتا ہو یا کسی نیکی کا ترک لازم آتا ہو تو اس قسم کا توڑنا واجب ہے، اور قسم کو توڑ کر اس کے بعد کفّارہ دینا ضروری ہے، کفّارے کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ: اپنی قسموں کے لئے اللہ کو عُرضہ نہ بنالیا کرو، نشانہ نہ بنالیا کرو، یا، اپنی قسموں کی وجہ سے اللہ کو آڑ نہ بنالیا کرو، رکاوٹ نہ بنالیا کرو۔ کس بات سے؟ کہ تم اچھا برتاؤ کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور لوگوں کے درمیان میں اصلاح کراؤ۔ ''لوگوں کے درمیان اصلاح کرانے سے، تقویٰ اختیار کرنے سے، اور اچھا برتاؤ کرنے سے اللہ کے نام کو قسموں کے سبب سے آڑ نہ بنالیا کرو'' گویا کہ اللہ کی قسم کھالی، اب کہو کہ چونکہ ہم نے اللہ کی قسم کھالی، اس لیے ہم اچھا برتاؤ نہیں کریں گے، چونکہ ہم نے اللہ کی قسم کھالی اس لیے ہم یہ گناہ ضرور کریں گے، یا چونکہ میں نے قسم کھالی اس لیے میں فلاں نیکی کا کام نہیں کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان نیکی کے کاموں سے تم نے اللہ کے نام کو آڑ بنالیا، حالانکہ اللہ کے نام سے تو نیکی کرنی چاہیے، نہ کہ اللہ کے نام کے آنے کے ساتھ نیکی چھوڑنی چاہیے۔ تو اِس قسم کی قسم جو بِر کے چھوڑنے پر ہو، تقویٰ کے ترک کرنے پر ہو، اصلاح بین الناس کے خلاف ہو، یہ قسم جائز نہیں، اگر اللہ کے نام کی اس طرح قسم کھالی جائے تو یہ اللہ کے نام کی عظمت کے منافی ہے، اس لیے اِس قسم کا توڑنا ضروری ہے اور اس کا کفّارہ دینا ضروری ہے۔

پھر اس کے متعلق آگے حکم آگیا کہ قسم اٹھانے میں دو طرح کے حالات ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ بلا قصد زبان پر قسم جاری ہوگئی، قسم اٹھانا مقصود نہیں تھا، تکیہ کلام کے طور پر زبان سے لفظ نکل گیا، اس کو کہتے ہیں لغو فی الیمین، اِس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، اگر اُس کے خلاف ہوجائے تو نہ دنیا میں کفّارہ ہے اور نہ آخرت میں گناہ ہے۔ اور ایک ہے کہ آپ نے قصد کے ساتھ قسم اٹھائی پھر اگر مستقبل کے متعلق اٹھائی ہے تو وہ یمین منعقدہ ہے، جس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے، اگر اس کے مطابق عمل نہیں کرسکو گے

توقسم ٹوٹ جائے گی اور کفارہ دینا پڑے گا۔اور اگر ماضی کے متعلق خلاف واقع قصداً قسم اٹھائی ہے تو اس کو یمین غموس کہتے ہیں. اس پر آخرت میں مؤاخذہ ہے، دنیا میں اس پر کفارہ نہیں ہے اگر جان بوجھ کر کوئی جھوٹی قسم کھائے، اور جھوٹی قسم ہمیشہ ماضی کے واقعہ کے متعلق ہوتی ہے، خلاف واقع قسم اٹھالینا، مثلاً آپ نے ایک کام کیا ہے اور قسم اٹھالی کہ میں نے نہیں کیا، یا آپ نے ایک کام نہیں کیا اور قسم اٹھالی کہ میں نے کیا ہے، اور قسم بھی جان بوجھ کر اٹھائی، جس کو ہم جھوٹی قسم کہتے ہیں، یمین کاذب، اس کو یمین غموس کہا جاتا ہے یعنی غوطہ دے دینے والی قسم، جو اللہ کے غضب میں اور نارِ جہنم میں انسان کو غوطہ دے دے گی، غَمَسَ ڈوبنے کو کہتے ہیں، تو یمین غموس پر مؤاخذہ آخرت میں ہے، دنیا میں اِس پر کفارہ نہیں آتا۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ: نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے اُس لغو کے سبب سے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، لغو کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کردی گئی۔ ''لیکن مؤاخذہ کرے گا تم سے تمہارے قلوب کے کسب کرنے کے سبب سے'' مَا کو مصدر یہ بنالو، یا ''بسبب اس چیز کے جس کو کمایا تمہارے دلوں نے'' یعنی جو تم قصد کے ساتھ قسم اٹھاؤ اس پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرے گا، اب مؤاخذہ کس طرح کرے گا، اس کی تفصیل روایات کے تحت آگئی کہ اگر جھوٹی قسم اٹھائی ہے تو مؤاخذہ آخرت میں ہوگا، اور اگر قصد کے ساتھ کسی آنے والے واقعہ کے متعلق قسم اٹھائی ہے تو اس پر مؤاخذہ یوں ہوگا کہ اس کے مطابق عمل کرو، اگر عمل نہیں کرو گے تو پھر مؤاخذہ دنیوی ہے جس کو کفارہ کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے۔

''اِیلاء'' کی تعریف اور اُس کا حکم

آگے قسم کی وہ خاص قسم مذکور ہے جس کا تعلق عورتوں سے ہے، اِس کو فقہ کی اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں، ایلاء کا معنی ہے اپنی بیوی سے ترکِ تعلق کی قسم کھالینا کہ میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا، اِس کا حکم یہ ہے کہ چار مہینے کے اندر اندر اگر قسم کھائی ہے، مثلاً دو مہینے قریب نہیں جاؤں گا، تین مہینے نہیں جاؤں گا، ساڑھے تین قریب نہیں جاؤں گا حتیٰ کہ چار مہینے سے اگر ایک دن بھی کم ہو تو پھر یہ یمین منعقدہ کی طرح ہے، اگر اُس کے تقاضے کے مطابق عمل کرلو گے تو کوئی گرفت نہیں ہے، اور اگر اُس کے خلاف ہو گیا تو کفارہ دینا پڑے گا، مثلاً قسم کھائی کہ تین مہینے تک میں بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا، پھر وہ شخص تین مہینے نہیں گیا، توقسم پوری ہوگئی، اور اگر تین مہینے سے پہلے اس نے بیوی سے جماع کرلیا تو قسم ٹوٹ گئی اور کفّارہ دینا پڑے گا۔اور اگر چار مہینے کی قسم کھائی ہے یا چار مہینے سے زائد کی یا اس کی کوئی مدّت ہی متعین نہیں کی، اِن تینوں صورتوں میں، یعنی چار مہینے متعین کردیے، یا چار مہینے سے زیادہ متعین کردیے، مثلاً چھ یا سات مہینے کی قسم کھالی، یا مطلقاً قسم کھالی، مدت کوئی متعین ہی نہیں کی، اب اگر چار مہینے کے اندر اندر اُس کو توڑ دو گے تو کفارہ واجب ہوگا، اور اگر چار مہینے کے اندر نہیں توڑو گے تو چار مہینے پورے ہوتے ہی احناف ﷭ کے نزدیک طلاقِ بائنہ واقع ہوجائے گی، باقی ائمہ کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ عورت قاضی کے پاس اِس فیصلے کو لے جائے گی، قاضی خاوند سے کہے گا کہ یا رجوع کر یا طلاق دے، اور اگر خاوند دونوں باتوں سے انکار کردے تو قاضی اپنے طور پر طلاق دے دے گا، ہمارے ہاں چار مہینے گزرتے ہی طلاق واقع ہوجاتی ہے، گویا کہ چار مہینے کے اندر رجوع نہ کرنا یہی عزمِ طلاق ہے، کہ اُس نے

طلاق کا پختہ قصد کر رکھا ہے، اس لیے چار مہینے کے بعد فوراً طلاق واقع ہو جائے گی اور وہ طلاق بھی بائنہ ہوگی۔ ''اُن لوگوں کے لئے جو اپنی بیویوں سے اِیلاء کر لیتے ہیں'' یعنی اُن سے ترکِ تعلق کی قسم کھا لیتے ہیں، ''انتظار کرنا ہے چار مہینے کا''، فَاِنْ فَآءُوْ: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا، لوٹ آئے اپنی بیویوں کی طرف، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے، یعنی قسم کا کفارہ دے دیں، تو کفارہ دینے کے ساتھ ان کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ ''اور اگر انہوں نے طلاق کا ہی پختہ ارادہ کر رکھا ہے پس بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے'' تو ان کے ارادے کے مطابق چار مہینے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور چار مہینے کے اندر رجوع نہ کرنا یہی عزمِ طلاق ہے جس کی بناء پر چار مہینے پورے ہوتے ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

عدتِ طلاق کی مختلف صورتیں

چونکہ طلاق کا ذکر آیا، اور آپ فقہ میں پڑھتے رہتے ہیں کہ عورت کو جب طلاق ہو جائے تو اُس کے بعد پھر عدت شروع ہو جاتی ہے، اس لیے آگے عدت کا مسئلہ ذکر کر دیا۔ عدت کا مسئلہ کیا ہے؟ یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عورتیں جن کو طلاق دی جاتی ہے روک رکھیں اپنے نفسوں کو تین قروء یعنی تین حیض تک۔ آپ کے سامنے چونکہ عدت کی تفصیلات ہیں، اس لیے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ تین حیض عدت اُنہی عورتوں کی ہے جو بالغہ ہوں، جنہیں حیض آتا ہے، اگر حیض والی عورت نہیں جیسے بچی کو طلاق ہوگئی، یا بوڑھی ہے جس کا حیض کا زمانہ ختم ہو گیا تو اُس کی یہ عدت نہیں ہوگی، اُن کی عدت اٹھائیسویں پارے میں سورۂ طلاق میں آئے گی کہ اُن کی عدت تین مہینے ہے۔ اور پھر اس میں یہ بھی ہو گیا کہ حیض والی عورت تین حیض تک اپنے نفس کو روک رکھے گی، اگر وہ عورت حاملہ ہو تو وہ حائضہ نہیں ہوتی، اس لیے اُس کی عدت وضعِ حمل ہے، اُس کی عدت حیضوں کے ساتھ نہیں ہوگی، اور اِس کا ذکر بھی سورۂ طلاق میں آئے گا۔ اور ایسے ہی عدت اس عورت کی ہوا کرتی ہے جس کے نکاح کے بعد خاوند کے ساتھ ملنے کا اُس کو اتفاق ہو گیا ہو، خلوتِ صحیحہ ہوگئی یا وطی ہوگئی، تب جا کے عدت آیا کرتی ہے، اور اگر طلاق دے دی گئی اور ابھی تک اُسے مس نہیں کیا، فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (سورۂ احزاب: ۴۹) پھر کوئی عدت نہیں ہے، فوراً جدائی ہو جایا کرتی ہے، لہٰذا اِن مطلقات سے مراد وہ عورتیں ہوں گی جن کے نکاح کے بعد خاوند کے ساتھ ملنے کا اتفاق بھی ہو گیا ہو، اور اگر ملنے کا اتفاق نہ ہوا ہو تو پھر عدت نہیں ہے۔ اسی طرح آپ فقہ کے اندر یہ تفصیل بھی پڑھتے ہیں کہ تین حیض حُرہ کی عدت ہے، اگر وہ باندی ہو تو اس کی عدت نصف ہوتی ہے، قاعدے کے مطابق ڈیڑھ حیض ہونا چاہیے، لیکن حیض کی چونکہ تنصیف نہیں ہوتی اس لیے اُس کو دو حیض قرار دے دیا گیا۔ اور اگر وہ باندی ایسی ہو کہ اُس کی عدت مہینوں کے ساتھ ہو تو وہاں ڈیڑھ مہینہ اُس کی عدت ہوگی، کیونکہ مہینے کی تنصیف ہو سکتی ہے۔ یہ قیدیں آپ ساری کی ساری لگالیں گے دوسری آیات اور روایات کی طرف دیکھتے ہوئے جو قرآنِ کریم میں اور سرورِ کائنات ﷺ کے اقوال میں موجود ہیں۔ تو یہاں ہر عورت کی عدت بیان نہیں کی گئی جس کو بھی طلاق ہوئی ہو، بلکہ اِن قیدوں کا ساتھ لحاظ ہوگا، یعنی ایسی عورت جو بالغہ ہو، اور اُس کو حیض آتا ہو حاملہ نہ ہو، اور نکاح ہونے کے بعد خاوند کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا ہو، اور حُرہ ہو، تب جا کے اُس کی عدت یہ ہوگی کہ اپنے نفس کو وہ تین حیض تک روک کے رکھے۔

عورتوں کو صحیح بیان دینے کی تاکید

وَلَا یَحِلُّ لَہُنَّ: اور اِن عورتوں کے لئے حلال نہیں کہ چھپائیں اُس چیز کو جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے رحموں میں پیدا کی ہے اگر وہ ایمان لاتی ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر، یعنی اگر وہ عورتیں مؤمن ہیں تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُن کے رحموں کے اندر پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں نہیں بلکہ ظاہر کردیں، اگر تو اُن کو حیض آرہا ہے تو بتادیں کہ ہمیں حیض آ گیا، تاکہ عدت مشتبہ نہ ہوجائے، اور اگر انہیں حیض نہیں آتا بلکہ حمل ظاہر ہوگیا تو حمل بتادیں، کیونکہ عدت کے بارے میں مدار عورت کے قول پر ہی ہوتا ہے، وہ کہے کہ مجھے اب حیض آیا اور اب ختم ہوگیا، اُسی پر مدار رکھا جائے گا، جس وقت وہ تین حیض بتادے گی تو عدت ختم ہوجائے گی۔ اور اگر اُس کو حیض نہیں آیا، بلکہ وہ طاہرہ ہے، اور طہر کی مدت چونکہ متعین نہیں، وہ چھ مہینے بھی ہوسکتی ہے، لیکن وہ جھوٹ ہی بولتی رہے اور کہے کہ مجھے تین حیض آ کر ختم ہوگئے تو قاضی تو فیصلہ کردے گا کہ عدت ختم ہوگئی، حالانکہ واقع کے اعتبار سے ابھی اُس کو ایک حیض بھی نہیں آیا، اس کے جھوٹ بولنے کے ساتھ سارے کا سارا معاملہ خلط ملط ہوجائے گا، اس لیے اُسے کہا گیا ہے اگر تیرا ایمان اللہ پر ہو اور یومِ آخر پر ہو تو جو کچھ تیرے پیٹ میں پیدا ہوا اُس کو چھپانا نہیں ہے، حمل ہو تو حمل بتا، اور اگر خون آرہا ہے تو یہ بتا کہ حیض کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا؟

طلاقِ رجعی کی صورت میں عدّت کے اندر خاوند رُجوع کرسکتا ہے

عدت کے متعلق دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عدت کے اندر اندر جبکہ عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو، ایک یا دو، جیسے کہ مطلقات میں صراحتاً طلاق کا ذکر آیا ہوا ہے تو خاوند رجوع کرسکتا ہے۔ رجوع کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے اپنے الفاظ واپس لیے، میں اپنی بیوی کے ساتھ رجوع کرتا ہوں، بس رجوع ہوجائے گا۔ اور عملاً رجوع یہ ہوا کرتا ہے کہ اس کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرلے جس قسم کا بیویوں سے ہوتا ہے، بوس وکنار کرلیا، محبت کرلی، یہ عملاً رجوع ہوگیا۔ اور یہ حق خاوند کو ہے چاہے بیوی راضی ہو یا نہ ہو، کیونکہ اصل میں نکاح کے ختم ہونے کا حکم لگتا ہے عدت کے ختم ہونے کے بعد، اور جب تک عدت باقی ہے ابھی نکاح باقی ہے، اور یہ حکم طلاقِ صریح میں ہے، بائنہ میں نہیں، بائنہ میں عدت کے اندر اندر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، عدت کے بعد بھی ہوسکتا ہے اور عدت سے پہلے بھی بشرطیکہ تین طلاقیں نہ دی ہوں، جیسے کہ مسئلہ آگے آرہا ہے، اور اگر طلاق صریح دی ہوئی ہے لفظ طلاق کے ساتھ، جس کو ہم طلاق رجعی کہتے ہیں، وہاں پھر جدید نکاح کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ خاوند کا یہ کہہ دینا کہ میں طلاق واپس لیتا ہوں، میں اِس کو بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں، یہ رجوع ہوگیا، بیوی راضی ہو یا نہ ہو، یہ حق خاوند کو ہے، یہی مسئلہ آگے ذکر کیا گیا ہے۔ "اِن عورتوں کے شوہر، خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں اِن کو لوٹانے کا اِس مدت کے اندر اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں"۔ یہ شرط جو لگائی گئی ہے کہ اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں یہ اولویت کے لئے ہے، یعنی رجوع تو بہرحال ہوجائے گا، چاہے ارادہ اصلاح کا نہ ہو، تنگ کرنے کا ہی ہو، لیکن تنگ کرنے کی نیت سے رجوع کرنا جائز نہیں، یعنی ایسا کرنا نہیں چاہیے، ورنہ اگر کوئی کرلے گا تو شریعت نے حق خاوند کو دیا ہے، رجوع ثابت ہوجائے گا، یعنی یہ لوٹانا تب چاہیے جبکہ اصلاحِ احوال کا ارادہ ہو، محض تنگ کرنا مقصود

نہ ہو، محض تنگ کرنے کی نیت سے اگر کوئی رجوع کرے گا تو رجوع اگرچہ ہو جائے گا لیکن رجوع کرنے والا خاوند گنہگار ہوگا۔

اِسلام نے ہی عورت کے مقام کو نمایاں کیا ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: عورتوں کے لئے ہے مثل اُس چیز کے جو عورتوں کے ذمے ہے، اِس میں قرآنِ کریم نے ایک بہت بڑا اصلاحی پروگرام دیا ہے، اُس زمانے کے اعتبار سے اِس کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ سرورِ کائنات ﷺ جس وقت تشریف لائے تھے تو اُس معاشرے میں عورتوں کو کسی قسم کی کوئی عزت حاصل نہیں تھی، ان کو بالکل جانوروں کی طرح سمجھا جاتا تھا، ماں باپ کے مال میں یہ وراث نہیں قرار دی جاتی تھیں، بلکہ بیوی ہونے کی حیثیت سے خاوند کی وارث بھی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ خاوند کے مرنے کے بعد جب اُس کی وارثت تقسیم ہوتی تو اس کی بیوی بھی ساتھ ہی ورثاء کے قبضہ میں چلی جاتی، پھر چاہے وہ اپنے نکاح میں رکھیں، چاہے کسی دوسری جگہ نکاح کر کے اس کا مہر وصول کرلیں، نہ اُن کو مال میں تصرف کا حق ہوتا تھا، نہ جان میں تصرف کا حق ہوتا تھا، اِس قسم کے ظلم ان کے اوپر ہوتے تھے، بالکل جانوروں کی طرح ان کی حیثیت تھی، اسلام نے آ کر عورت کے مقام کو ممتاز کیا اور اُس کو انسانوں میں انسان ہونے کی حیثیت سے برابر کا مقام دیا۔

عورت اور مال زندگی کی ضرورت بھی ہیں اور فتنہ بھی

لیکن برابر کا مقام دینے کا یہ مطلب بھی نہیں، کہ مغربی تہذیب کی طرح عورت کو بالکل ہی آزاد کر دیا جائے، کہ مرد کی حکومت بھی اِس کے اوپر نہ رہے، عورت کے بارے میں یہ دو قسم کے جرائم ہمیشہ مخلوق نے کیے ہیں، یا تو اِس کو انتہائی گرایا اور ذلیل کیا، یا پھر اس کو بالکل برابر حیثیت میں چڑھایا، اور اتنا چڑھایا کہ مرد پر بھی یہ غالب آگئی، اور یہ دونوں چیزیں ہی نظامِ عالم کو برباد کرنے والی ہیں۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ دنیا کے اندر دو چیزیں ایسی ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن وہ دونوں بہت بڑا فتنہ بھی ہیں، ایک عورت اور ایک مال، نہ تو مال کے بغیر اس دنیا کی آبادی رہ سکتی ہے، مال بھی اِس زندگی کے اندر نہایت اہم چیز ہے، اور نہ عورت کے بغیر اس دنیا کے اندر کوئی شادابی رہ سکتی ہے، عورت بھی اس دنیا کے اندر آبادی میں ایک بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے، دونوں ہی انسان کی زندگی میں ضروری ہیں، لیکن یہ دونوں بہت بڑا فتنہ بھی ہیں، اس لیے حدیث شریف میں اِن دونوں کے متعلق ہی ہوشیار کیا گیا ہے، قرآنِ کریم میں بھی ہے اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، یہاں مال اور اولاد کا لفظ ہے (سورۂ تغابن: ۱۵)، اور ایک جگہ ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (سورۂ تغابن: ۱۴) کہ تمہاری بعض بیویاں تمہاری دشمن ہوتی ہیں، اِن سے بچ کے رہا کرو، اولاد بھی اور بیویاں بھی تمہاری دشمن ہیں۔ اور فتنة النساء کا ذکر حدیث شریف میں تو بہت ہی ہے، کہ عورت بہت بڑا فتنہ ہے، اس سے ہوشیار رہا کرو، بنی اسرائیل کے اندر بھی فتنہ عورت کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے بعد جتنی چیزیں چھوڑی ہیں اُن میں سب سے زیادہ انسانوں کو نقصان پہنچانے والی چیز عورت ہے، حضور ﷺ نے بیان فرمایا: ''مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ''[1] میں

(۱) بخاری، ۲/ ۷۶۳، باب ما يتقى من شوم المرأة/ مشكوٰة ۲/ ۲۶۷، كتاب النكاح فصل اول

نے اپنے پیچھے مردوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز عورتوں کے مقابلے میں اور کوئی نہیں چھوڑی۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے: ''اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ''(۱) یہ عورتیں ہوشیار آدمی کی عقل کو زائل کردینے والی ہیں۔ تو دونوں کے متعلق یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے، کہ مال اور عورت دونوں دنیوی زندگی میں نہایت ضروری ہیں، اِن کے بغیر دنیوی زندگی نہیں گزرتی، دنیا کی آبادی نہیں رہ سکتی، لیکن دونوں ہی فتنہ ہیں، اس لیے ان کے متعلق ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ آج اگر دنیا کے اندر دیکھو گے تو جتنے لڑائی جھگڑے اور فساد ہیں، یا تو مالی جھگڑے ہیں، حتی کہ سرمایہ داری سوشلزم وغیرہ سارے مالی جھگڑے ہیں، اور لڑائیاں بھڑائیاں اپنے ماحول کے اندر جتنی ہوتی ہیں سب لین دین کے پیچھے ہوتی ہیں، کہ فلاں نے میرا یہ دبا لیا، فلاں میرا یہ لے گیا، فلاں چیز نہیں دیتا، فلاں چیز لے گیا، یہی مالیات کے جھگڑے ہوتے ہیں، یا پھر عورت کے پیچھے جھگڑے ہوتے ہیں، اخبار اٹھا کر دیکھ لیا کرو، ہر روز آپ کے سامنے واقعات آئیں گے کہ فلاں عورت کو قتل کردیا، فلاں عورت کو اِغواء کرکے لے گئے، اُس کے آشنا کو قتل کردیا، یہ کردیا، وہ کردیا۔ اکثر و بیشتر لڑائیاں اور قتل قتال جو بھی ہے وہ عورت کے سبب سے ہوتا ہے۔ تو یہ مالیات کے جھگڑے اور عورتوں کے جھگڑے دنیا کے نظام میں انتہائی تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

عورت کے متعلّق اِسلام کی تعلیم اِعتدال پر مبنی ہے

اور شریعت نے جو اعتدال بتایا وہ یہ ہے کہ نہ تو اِس کو جانور سمجھو، بلکہ یہ تمہاری شقیقہ ہے، جس طرح تم آدم کی اولاد ہو یہ بھی آدم کی اولاد ہے، اِس حیثیت سے تم دونوں برابر ہو، سورۂ نساء کی ابتدائی آیت کے اندر یہی ذکر کیا گیا، کہ مرد کے لئے اِس کو سکون کی چیز بنایا گیا ہے، اور آدم علیہ السلام کی نسل ہونے کے اعتبار سے اِس کے حقوق مرد کے برابر ہیں، اِس کو اِس طرح سے ذلیل نہیں کیا اور نیچے نہیں گرایا۔ لیکن عورتوں کے اُوپر برتری مردوں کی قائم رکھی کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) مرد عورتوں کے اُوپر حاکم ہیں، عورتوں کو سنبھالنے والے ہیں، عورتوں کو سیدھا رکھنے والے ہیں۔ تو حکومت مرد کی برقرار رکھی اور عورت کو مرد کے ماتحت قرار دے دیا، ان دونوں باتوں کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو عورت دنیا کے اندر فتنہ نہیں بن سکتی۔ اِس لیے یہاں جو کہا گیا ہے کہ عورتوں کے لئے بھی حقوق ہیں جیسے حقوق اِن کے ذمے ہیں، وجوب کے اندر وہ حقوق برابر ہیں اگرچہ دونوں حقوق کی نوعیت علیحدہ علیحدہ ہے، یہ نہیں کہ جیسا حق مرد کا عورت پر ہے، ویسا ہی حق عورت کا مرد پر ہے، ایسے نہیں، بلکہ عورت مامورہ ہے، محکومہ ہے، اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے حاکمیت دی ہے، اِس کو درجے کے اعتبار سے فضیلت دی ہے، عورت کے ذمے خاوند کی اطاعت ہے، خاوند کے ذمے عورت کی اطاعت نہیں ہے، لیکن وجوب کے اندر اُس کے کچھ حقوق بھی ہیں کہ اُس کے کھانے کا خیال کرو، اُس کے پہننے کا خیال کرو، اُس کی رہائش کا خیال کرو، اور کبھی آپس میں اگر اختلاف ہوجائے تو اُس کو مارنے پیٹنے کی کوشش نہ کرو، کبھی تنبیہ کرنی ہی پڑ جائے تو ہلکے انداز سے تنبیہ کرو، جیسے قرآنِ کریم میں تفصیل آئے گی کہ پہلے تو اُس سے تعلق چھوڑ دو، اتنی سی تنبیہ کافی ہے، اور اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر وعظ و نصیحت، وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (سورۂ نساء: ۳۴) اور هِجران فی المَضاجِع، اور پھر آگے ضرب

---

(۱) بخاری، ۱/۴۴، باب ترک الحائض الصوم/ مشکوٰۃ ص ۱۲، کتاب الایمان، فصل اول، عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ

یہ مطلب بھی ہے کہ کچھ مار بھی سکتے ہو، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ مارنا ہو تو ایسے طور پر مارو کہ نہ ہڈی ٹوٹے، نہ بدن پر نشان پڑے،[1] یہ ہدایات ساری کی ساری موجود ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اس لیے ان کی طبیعت کے اندر کچھ نہ کچھ کجی ضرور ہوتی ہے، اُس کجی کو برداشت کرتے ہوئے ان سے استمتاع کیا کرو، اور اگر ان کو بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائیں گی، اور ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری آپس میں جدائی ہو جائے گی،[2] بالکل اِس کو سیدھا کرلو اور اچھی طرح اس کی طبیعت راست ہو جائے ایسا ممکن نہیں، عورت کی فطرت میں کچھ نہ کچھ کجی ضرور رہتی ہے، بلاوجہ ہی خاوند سے جھگڑا ڈال لے گی، خاوند کے رشتہ داروں سے جھگڑا ڈال لے گی، اور اس کی چوں چوں چیں چیں کسی نہ کسی معاملے میں جاری رہتی ہے، اس کو برداشت کیا کرو، اس کو اگر پوری طرح سے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر تمہارا تعلق آپس میں قائم نہیں رہ سکتا، یہ ہدایات بھی ساری کی ساری دے دیں۔ تو یہ ایک ایسی اعتدال کی راہ ہے کہ اگر اِس کو اپنا لیا جائے تو عورت کی عزت اپنی جگہ بحال، ماں ہونے کے طور پر بھی اِس کا احترام انسان کے ذمے ہے، بیٹی ہونے کے طور پر بھی یہ شفقت کا تقاضا کرتی ہے، بہن ہونے کے طور پر بھی یہ محبت کا تقاضا کرتی ہے، اور بیوی ہونے کی حیثیت سے بھی اِس کے حقوق ہیں، گویا کہ ایک عورت کے ساتھ چار قسم کے تعلق مردوں کے ہو گئے، کسی مرد کی وہ ماں ہوگی تو وہ بیٹا ہونے کے اعتبار سے اِس کا احترام کرے اور اس کی خدمت کرے، کسی کی یہ بہن ہوگی تو بھائی ہونے کے طور پر وہ اس کے ساتھ محبت کرے، کسی کی یہ بیٹی ہوگی تو باپ ہونے کے طور پر وہ اِس کے ساتھ محبت کرے گا، کسی کی یہ بیوی ہوگی تو خاوند کے ذمے اس کے حقوق لگا دیے، تو اِس کی راحت کا اور اِس کے آرام کا کتنا انتظام کر دیا، ہر قسم کی معاشرے کے اندر اس کو عزت بھی دی، لیکن اِس کو عملی زندگی کے اندر مرد کا محکوم رکھا ہے، مرد کے برابر اِس کو اس طرح سے نہیں چڑھایا جاسکتا کہ یہ اپنے اُوپر مرد کی حکومت بھی تسلیم نہ کرے، اگر اِس طرح سے اس کی رسی چھوڑ دی جائے تو پھر دنیا کے اندر فساد ہی فساد ہے، پھر کسی طریقے سے امن نہیں قائم ہو سکتا اگر عورتوں کو مردوں کے اوپر غلبہ دے دیا جائے یا مردوں کی حکومت سے اِن کو نکال کے بالکل آزادی دے دی جائے۔

عورت کی راحت اُس کی محکومیت میں ہے

تو بالکل آزادی، اور دنیوی زندگی کے اندر اِن کی مردوں کے برابر کی حیثیت، اِس کو شریعت برداشت نہیں کرتی، ہاں! البتہ اِن کے حقوق اتنے رکھ دیے ہیں کہ اگر مرد اُن حقوق کو ادا کریں جو مردوں کے فرائض میں شامل ہیں تو عورت اِس دنیا کے اندر عزت اور راحت سے وقت گزارے گی، اِس کے لئے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ برابر ہونے کی حیثیت میں اگر کہو کہ معاشیات میں بھی یہ انسان کے ساتھ برابر کی شریک ہو، جیسے مرد کماتا ہے عورت بھی کمائے، جس طرح سے آج یہ نظریہ ہے کہ دکانیں بھی عورتیں چلائیں، کارخانوں میں کام بھی عورتیں کریں، بازار میں بھی عورتیں کاروبار کر رہی ہوں، یہ عورت کی فطرت پر ظلم ہے، عورت کے

---

(۱) مسلم ۱/ ۳۹۷ باب حجۃ النبی۔ مشکوۃ ۱/ ۲۲۵ باب قصۃ حجۃ الوداع۔ ولفظہ: فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ۔

(۲) مسلم ج ۱ ص ۴۷۵ باب الوصیۃ بالنساء۔ بخاری ج ۱ ص ۴۶۹ باب خلق آدم۔ مشکوۃ ج ۲ ص ۲۸۰ باب عشرۃ النساء، فصل اول۔

ساتھ ہمدردی نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ شوبازی کے لئے اور باہر پھرنے کے لئے چونکہ اُس کو موقع ملتا ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ مجھے آزادی مل گئی، یہ آزادی نہیں ہے، یہ فطرت کے خلاف ایک حرکت ہے۔ عورت کا بدن بھی اس قسم کی مشقتوں کا متحمل نہیں، پھر اس معاشرے کے اندر عورت پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے خاوند کے حقوق ادا کرنے کی، حمل اٹھانے کی، اور بچہ جننے کی، پھر بچوں کو پالنے کی، یہ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ اِن کے ساتھ ساتھ عورتوں کو معاشی ذمہ داریاں نہیں سونپی جاسکتیں، اگر معاشی ذمہ داریاں سونپی جائیں گی تو گھریلو زندگی برباد ہوجائے گی، نہ بچے صحیح طور پر جنے جائیں گے، بچے سے عورت گھبرانے لگ جائے گی، اور اگر بچہ جنا گیا تو اُس کو صحیح طور پر وہ پالے گی نہیں، پھر وہ نوکروں کے سپرد کرنا پڑے گا، بچے کی صحیح تربیت کسی صورت میں نہیں ہوسکتی۔ ورنہ خاوند ایک دفعہ بیوی کے پاس چلا جائے اور اس کے نتیجے میں عورت حاملہ ہوجائے تو دو سال کے لئے عورت مشغول ہوجاتی ہے، حمل کے زمانے میں وہ کسی کام کی نہیں رہتی، نہ کوئی محنت کرسکتی ہے نہ مشقت، پھر بچہ جننے کے بعد اُس کی چالیس دن تک وہ کمزوری نہیں جاتی، پھر اس کے بعد بچے کو دودھ پلانے کا زمانہ آگیا، بچے کو سنبھالنا، کھلانا، پلانا، نہلانا، وغیرہ، بچہ اُس خدمت کا مطالبہ کرتا ہے جس میں وہ ماں کا محتاج ہے۔ اگر عورت اِن کاموں کو سنبھالے گی تو معاشی ذمہ داریاں وہ نہیں لے سکتی، اس لیے اسلام نے یہ اعتدال کا راستہ بتایا ہے کہ عورت انسان ہونے کے اعتبار سے تمہارے برابر تو ہے، لیکن معاملات میں عورتوں پر مردوں کو فوقیت حاصل ہے، تب جا کے نظم ٹھیک رہے گا، یہ نہیں کہ عورتوں کا کوئی حق ہی مردوں کے ذمے نہیں۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ: جیسی ذمہ داری اِن عورتوں پر ہے اسی طرح اِن کے لئے حقوق مردوں کے ذمے بھی ہیں معروف طریقے سے، جو شریعت میں جانا پہچانا ہے یا عرفِ عام میں جانا پہچانا ہے، اُس کے مطابق عورتوں کے لئے حقوق ہیں مردوں کے ذمے، جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمے ہیں، تفصیل روایات میں موجود ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ: مردوں کے لئے عورتوں کے اُوپر فوقیت ہے، فضیلت ہے، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ
طلاق دو مرتبہ ہے، پھر روک لینا ہے اچھے طریقے سے یا رخصت کردینا ہے اچھے طریقے سے،
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ
اور حلال نہیں تمہارے لیے کہ لو تم کچھ بھی اس میں سے جو تم نے ان عورتوں کو دیا ہے، مگر ایسے وقت میں کہ خاوند بیوی دونوں اندیشہ کریں
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ
کہ وہ نہیں قائم رکھ سکیں گے اللہ کے ضابطوں کو، پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ زوجین اللہ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

تو اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس مال میں جس کے ساتھ عورت اپنے آپ کو چھڑائے، یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں

فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

پس تم ان سے تجاوز نہ کیا کرو، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ان ضابطوں سے تجاوز کرے گا پس یہی لوگ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ

ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾ پھر اگر وہ زوج اس عورت کو طلاق دے دے تو وہ عورت حلال نہیں اس کے لئے اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے وہ

زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ

اس کے علاوہ اور خاوند سے، پھر اگر یہ دوسرا خاوند اُس کو طلاق دے دے تو کوئی گناہ نہیں اُس بیوی اور پہلے خاوند پر کہ ایک دوسرے کی طرف

اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

رجوع کرلیں اگر ان دونوں کا خیال یہ ہو کہ وہ اللہ کے قاعدوں کو قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ کی حدود ہیں، بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اِن کو

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں ﴿۲۳۰﴾ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو پھر وہ اپنے وقت مقررہ کو پہنچنے لگیں،

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ

تو تم اُن کو روک لیا کرو معروف طریقے سے یا چھوڑ دیا کرو معروف طریقے سے، اور نہ روکا کرو ان عورتوں کو

ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا

نقصان پہنچانے کے لئے تا کہ تم زیادتی کرو، اور جو کوئی ایسا کام کرے گا پس تحقیق اُس نے اپنے اُوپر ہی ظلم کیا، اور نہ قرار دیا کرو

اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ

اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے اور یاد کرو اُس چیز کو جو اُتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر یعنی کتاب اور

الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

حکمت، اِس بات کے ساتھ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾

تفسیر (۱)

نکاح اور طلاق کی حکمتیں اور ضوابط

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے کچھ قواعد وضوابط بنائے ہیں۔عورتوں کے متعلق احکام کا سلسلہ شروع ہے، اِس رکوع سے طلاق کے متعلق کچھ ہدایات دی جارہی ہیں، اِس دنیا کی آبادی کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کی رعایت رکھتے ہوئے مرد وعورت کو آپس میں جوڑا ہے، یعنی مرد کا رجحان عورت کی طرف اور عورت کا رجحان مرد کی طرف یہ فطری چیز ہے، جیسا کہ تمام حیوانات میں نر کا رجحان مادہ کی طرف اور مادہ کا رجحان نر کی طرف ہوتا ہے، اب اگر اس سلسلہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جو عورت جس مرد کے ساتھ چاہے اپنی خواہش پوری کرلے، اور جو مرد جس عورت سے چاہے اپنی خواہش پوری کرلے، تو پھر انسان اور حیوان کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت جو قوم اور قبیلوں کے بنانے سے ہے وہ بھی متحقق نہ ہوتی، انسان بھی جانوروں میں سے ایک جانور ہوتا، حیوانوں میں سے ایک حیوان ہوتا، جس طرح سے حیوانوں کی نسل نر اور مادہ کے ملنے کے ساتھ چلتی ہے، لیکن اُن میں کوئی قوم، کوئی خاندان، کوئی قبیلہ نہیں ہوتا، جہاں جس کا تقاضا ہوتا ہے وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرلیتا ہے، اس کے ساتھ آگے نسل کا بڑھنا تو متحقق ہو گیا، لیکن اُن میں کسی قسم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، تو اس طرح سے آزاد چھوڑنا حیوانیت ہے، اس میں انسان کا کوئی شرف نمایاں نہیں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا تو اُن کے لئے اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے ایک نہایت مہذب قاعدہ بنادیا، اور اس کے اُوپر کچھ پابندیاں عائد کردیں، کہ مرد وعورت کا آپس میں تعلق شرافت کے تحت ہونا چاہیے، اور اس تعلق کی کوئی اہمیت ہونی چاہیے، جانوروں کی طرح صرف قضاء شہوت کا ذریعہ نہ ہو، کہ نہ اس کے بعد مرد کسی قسم کی ذمہ داری محسوس کرے، اور نہ ہی عورت کا خاص آدمی کے ساتھ تعلق ہونے کی بناء پر اُس کی ضروریات کا کوئی کفیل ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے کچھ قاعدے اور ضابطے بنائے، اور نکاح کو صرف دنیاوی معاملہ قرار نہیں دیا، بلکہ اُس میں عبادت کا معنی بھی پیدا فرمایا، جیسے آپ جانتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک نکاح بھی عبادت کا ایک شعبہ ہے، اس لیے نکاح کرنا عبادت ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی سنت ہے جیسا کہ فرمانِ نبوی ہے: ''اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ ''(۲) اِن قاعدوں اور ضابطوں کی تفصیل قرآن وحدیث میں بھی موجود ہے، اور فقہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

نکاح سے شریعت کا اصل مطلوب کیا ہے؟

پہلا ضابطہ یہ ہے کہ ہر عورت ہر مرد کے لئے حلال نہیں، بلکہ بعض عورتیں حلال ہیں اور بعض عورتیں حرام ہیں، جس کی تفصیل قرآنِ کریم میں بھی ہے اور حدیث شریف میں بھی ہے، اس میں بھی ایک عظمت اور شرافت کا پہلو ہے کہ جن عورتوں کے

(۱) نظر ثانی کے وقت اس حصے کی ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے خلاصۂ آیات درج نہیں کیا گیا۔

(۲) مشکوۃ ص ۲۷ باب الاعتصام۔فصل اول / بخاری ج ۲ ص ۷۵۷ باب الترغیب فی النکاح / مسلم ج ۱ ص ۴۴۹ باب استحباب النکاح۔

ساتھ خاص تعلقات ہوں ان کو نکاح کے لئے مرد کے واسطے حلال نہیں ٹھہرایا گیا۔اور پھر نکاح کرنے کے لئے کچھ قاعدے بتائے کہ یہ کوئی خفیہ معاہدہ نہیں، کہ اندر بیٹھ کر مرد وعورت آپس میں بات طے کر کے قضاء شہوت کرلیں، اس کی اجازت نہیں دی گئی، اگر یہ خالص معاملہ ہوتا تو طرفین آپس میں مختار ہوتے، جب چاہے کر لیتے، رات کو کرتے، دن کو کرتے، خفیہ کرتے، سامنے کرتے، اور جب چاہتے اس کو توڑ دیتے، تو ایسے اُن کا بھاؤ کیا جاتا جیسے گاجر اور مولی کی بیع وشراء ہوتی ہے۔ پھر اس میں یہ پابندی بھی لگائی گئی کہ یہ خفیہ نہیں ہوسکتا، علی الاعلان کرنا پڑتا ہے، اِس میں کم از کم دو گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے، اور پھر اس میں عورت کے حقوق کی تفصیل بتائی، مرد کے حقوق کی تفصیل بتائی۔ شریعت کا اصل منشاء یہ ہے کہ مرد وعورت کا آپس میں جو جوڑ لگے یہ دائماً نشاط اور سرور کا ذریعہ بنے، اور قوم اور قبیلے کے پھیلنے کا باعث ہو، دنیا کی آبادی کا باعث ہو، اس لیے جوڑنے کے جذبے کے تحت یہ نکاح ہوتا ہے، اور ہمیشہ زندگی بھر اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے ہوتا ہے، اس میں توڑنے کا پہلو نہیں ہوتا، ایسے حالات اختیار کیے گئے کہ زوجین کا تعلق قوی سے قوی ہو اور دائماً قائم رہے۔ اگر نکاح ہوجانے کے بعد ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہوئے اگر زندگی گزاریں تو شریعت کا عین مطلوب ہے، لیکن بسا اوقات یہ جوڑ لگانے میں تجویز کی غلطی ہوجاتی ہے، کہ مرد اور عورت کا مزاج آپس میں یکسانیت نہیں رکھتا، یا کچھ اور عوارض بھی پیش آسکتے ہیں جن کی بناء پر اگر اُن کو زبردستی جوڑے رکھنے کی کوشش کریں گے تو سوائے اس کے کہ دونوں کی زندگی تلخ ہو اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، اب اگر علیحدگی کے لئے کوئی ضابطہ نہ بتایا جاتا تو یہ بھی فطرت کے ساتھ ایک جنگ ہے، کہ ایک مرتبہ جوڑ لگانے کے بعد کوئی صورت ہی نہ ہو، چاہے لڑیں چاہے مریں، اس طرح مرد اپنی جگہ انتہائی تنگ ہوگا، اور عورت اپنی جگہ انتہائی تنگ ہوگی، اور نکاح کے اندر جو حکمتیں اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھی ہیں، کہ انسان امن وچین اور سرور کے ساتھ زندگی گزارے، اور گھروں کے اندر سرور اور نشاط کی کیفیت ہو یہ حکمت باطل ہوجاتی ہے اگر ناگزیر حالات میں بھی علیحدگی کی اجازت نہ دی جائے۔

اللہ کے نزدیک سب سے قابلِ نفرت چیز طلاق ہے

اس لیے شریعت نے اس نکاح کو ختم کرنے کا طریقہ بھی بتایا جس کو طلاق، خلع، یا فسخ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، اور اجازت تو دے دی لیکن اس کو ناپسندیدہ قرار دیا، اس لیے ناگزیر حالات میں ہی کوئی شخص اس سے فائدہ اٹھائے، عورت کو کھیل نہ بنالیا جائے، اس لیے اس علیحدگی کے لئے بھی شریعت نے بڑے کڑے اور سخت ضابطے مقرر فرمائے، حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں: ''اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللهِ الطَّلَاقُ''[1] کہ جو چیزیں حلال ہیں ان میں سے سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے، کہ اگر کوئی شخص اس کو حلال سمجھ کر استعمال کرنا چاہے تو ذہن میں یہ بات رہے کہ اگرچہ حلال کردی گئی ہے، لیکن ہے اللہ کو ناپسندیدہ، اس لیے جب تک ناقابلِ برداشت صورت پیدا نہ ہوجائے اُس وقت تک یہ

(۱) ابوداؤد ج۱ص ۲۹۶ باب فی کراهية الطلاق۔ مشکوۃ ج۲ص ۲۸۳ باب الخلع والطلاق فصل ثانی

نوبت نہ آئے، کیونکہ شریعت آپس میں جوڑنا چاہتی ہے، توڑنا نہیں چاہتی، توڑنے کے لئے بہت سخت پابندیاں لگادی گئیں، کہ اگر ایسا کروگے تو پھر یہ توڑنا تمہارے لیے صحیح ہے، اگر ایسا نہیں کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے۔

طلاق کے متعلق جاہلیت کا ظالمانہ طریقہ اور اِسلام کا عادلانہ طریقہ

اب یہاں سے زوجین کے تعلق کو توڑنے کے قاعدوں کی وضاحت کی جارہی ہے، جاہلیت میں رواج تھا کہ ایک شخص بیوی کو تنگ کرنے کے لئے طلاق دیتا، لیکن جب اُس کی عدت ختم ہونے لگتی تو پھر رجوع کر لیتا تا کہ یہ کسی اور سے نکاح نہ کر سکے اور رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا، پھر دوبارہ طلاق دے دیتا، پھر جب عدت ختم ہونے لگتی تو پھر رجوع کر لیتا، اس طرح عورت کو درمیان میں لٹکائے رکھتے تھے، اور بدترین قسم کی سزا عورت کو دیتے تھے، اور کوئی حد متعین نہیں تھی کہ کتنی دفعہ وہ طلاق دے دیں اور کتنی دفعہ رجوع کرلیں، اس میں عورتوں پر ظلم تھا، عورتوں کے حقوق تلف ہوتے تھے، نہ وہ شوہر والی سمجھی جاتیں نہ بلا شوہر، شوہر والی اس لیے نہ سمجھی جاتیں کہ شوہر ان کے ساتھ شوہر والا تعلق نہ رکھتا، اور بلا شوہر اس لیے نہ سمجھی جاتیں کہ نکاح کی قید موجود ہوتی، اس ظلم وستم کا خاتمہ اللہ تعالیٰ نے کیا کہ ایسی طلاق جس کے بعد رجوع کیا جاسکتا ہے وہ دو مرتبہ ہوسکتی ہے، ایک مرتبہ طلاق دے دو تو اس کے بعد بھی تمہیں رجوع کا حق ہے، دو مرتبہ طلاق دے دو پھر بھی رجوع کا حق ہے، لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو پھر رجوع کا حق نہیں رہا، بلکہ آپس میں رضامندی کے ساتھ بھی نکاح کرنا چاہیں گے تو نکاح نہیں ہوسکتا، یہ پابندی لگادی، اور تین درجے اس لیے رکھے تا کہ اگر کوئی شخص غصے میں آکر طلاق دے ہی دے اور اُس کے بعد سنبھل جائے تو اصلاحِ احوال کی گنجائش رہے، یہی وجہ ہے کہ احسن طریقہ اور سنت کے مطابق طریقہ یہی ہے کہ جب بھی کوئی نوبت آجائے تو سوچ بچار کر کے (یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے نصیحت سے کام لے، اگر نصیحت سے کام نہیں چلا تو پھر تنبیہ سے کام لے، اور اگر تنبیہ سے بھی کام نہیں چلا تو حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (سورۂ نساء: ۳۵) پنچائتی صورت اختیار کی جائے، کہ مرد و عورت کے خاندان میں سے فیصل متعین کر دیے جائیں جو اس جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کریں، ان سب صورتوں کے ناکام ہوجانے کے بعد پھر نوبت طلاق کی آئے گی) پھر بھی طلاق ایسے انداز سے دو کہ صرف ایک دفعہ طلاق دو، تا کہ بعد میں عدت کے اندر رجوع کرنے کی گنجائش ہو، اور اگر دوبارہ طلاق دینی ہے تو دوسری طلاق بھی اسی طرح صریح لفظ سے دو، تب بھی عدت کے اندر دوبارہ رجوع کرنے کی گنجائش باقی رہے گی، اور اگر تیسری طلاق دے دی تو پھر تم نے اپنا سارا حق استعمال کر لیا، اس کے بعد رجوع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی، بلکہ اب رضامندی کے ساتھ بھی نکاح کرنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن تین پوری ہونے سے قبل اگر عدت گزر جائے اور نکاح کا تعلق ختم ہوجائے اُس کے بعد رضامندی سے نکاح ہوسکتا ہے۔ یہ ترتیب اس لیے قائم کر دی تا کہ جلد بازی میں کوئی اپنا نقصان نہ کر بیٹھے، درجہ بدرجہ آگے کو بڑھو تا کہ ندامت ہونے کی صورت میں اُس کے تدارک کی گنجائش باقی رہے۔ باقی! طلاق کا سُنّت طریقہ کیا ہے؟ یہ سب اَحکام فقہ کے اندر موجود ہیں۔

طلاقِ ثلاثہ پر غیر مقلدین کا مسلک اِجماعِ اُمت کے خلاف ہے

اور اِس بات پر فقہاء اربعہ بلکہ ساری امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص تین طلاقیں بیک وقت دے دے تو وہ واقع ہوجاتی ہیں، اگرچہ اس نے ناجائز کام کیا، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کام کیا، سرورِ کائنات ﷺ کی نزدیک ناراضگی کا کام کیا، لیکن تین طلاقیں دینے کی صورت میں طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اس میں موجودہ دور کے غیر مقلد اختلاف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں اکٹھی دے دی جائیں تو ایک ہی سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ اجماعِ اُمت کے خلاف ہے، اَئمہ اربعہ کا بھی اس بات پر اتفاق ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہی اس پر اتفاق ہوگیا تھا۔

غیر مقلدین کا مسلک علمائے عرب کے بھی خلاف ہے

پچھلے دنوں جب میں عمرے پر گیا تھا،[1] تو وہاں مدینہ یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا، وہاں اِس مسئلے کی کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں، کہ وہاں کے سب سے بڑے عالم عبدالعزیز بن باز ہیں، اور آج کل اُن کی حیثیت ویسے بھی قاضی القضاۃ کی ہے، پہلے وائس چانسلر تھے یونیورسٹی میں، وہ بھی تین کو ایک قرار دیتے تھے جس کی وجہ سے وہاں غیر مقلد اس مسئلے کو بہت اُچھالتے تھے، اور مدینہ منورہ کا جو قاضی ہے، مسجدِ نبوی کا اِمام، اُس کا مسلک تھا کہ تین تین ہی ہیں، ایک نہیں ہے، اُن کی آپس میں کچھ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ سعودی عرب میں ایک طریقہ جاری ہے کہ جس وقت کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اُس کو علماء کے مجمع میں پیش کرتے ہیں، ایک مجلسِ مشاورت ہے، اُس میں اس مسئلے کو پیش کرتے ہیں، پوری بحث کے بعد جو طے ہوجائے وہ سعودی عرب کا قانون بن جاتا ہے، تو یہ مسئلہ بھی اس مجلس میں پیش ہوا، ان ارکان میں بن باز بھی تھے، انہوں نے اپنا مطالعہ ضبط کیا، اور پھر اجتماعی طور پر اس مسئلے پر بحث ہوئی، بحث ہونے کے بعد المقدور کے عنوان سے جو فیصلہ قرار دیا گیا وہ یہی ہے کہ تین تین ہی ہیں، اس مسئلے سے اختلاف کی بناء پر بن باز نے اختلافی نوٹ لکھا، لیکن اکثریت کی رائے کے ساتھ یہ بات طے ہوگئی کہ تین تین ہی ہیں، اس کے بعد سعودی عرب میں یہ قانون بن گیا کہ اگر کوئی شخص ایک دفعہ بھی تین طلاقیں دے دے تو تین ہی واقع ہوں گی، اُن کی ساری بحث اور اُن کا سارا مواد کتابی شکل میں چھپ کر اُن دِنوں آگیا تھا، اور ایک ہی نسخہ مدینہ یونیورسٹی کی لائبریری میں آیا تھا، جو میں نے وہاں دیکھا اور اُن سے طلب کیا کہ یہ دے دو، تمہارے پاس تو اور آجائے گا، وہ کہنے لگے نہیں چونکہ اور نسخے ابھی نہیں آئے نہیں، اس لیے یہ نسخہ ہم نہیں دے سکتے، ورنہ میرا خیال تھا کہ میں اس کو لے آتا (یہ رسالہ "احسن الفتاویٰ" جلد ۵ میں چھپا ہوا ہے۔ ناقل)۔ اور بن باز نے بھی اس کے خلاف فتویٰ دینا چھوڑ دیا، چاہے اس کا مسلک وہی ہے، لیکن وہ اس پر فتویٰ نہیں دے گا، چنانچہ بعض حضرات نے پھر اس کو یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے خط لکھا، تو اس نے جواب یہی دیا کہ قاضیٔ مدینہ سے رُجوع کرو، اور قاضی کا مسلک پہلے ہی یہی تھا کہ تین تین ہیں۔ چنانچہ اس مسئلے کے طے ہونے کے بعد جو جمعہ میں نے مسجدِ نبوی میں پڑھا اُس جمعہ میں مسجدِ نبوی کے امام نے خطبہ ہی اسی مسئلے پر دیا، اور وہ میرے پاس ریکارڈ ہے، اور اس میں اس نے اس مسئلے کی وضاحت کی ہے۔ تو جمہور کا مسلک یہی ہے، اس

(۱) حضرت حکیم العصر رحمہ اللہ کا یہ پہلا سفرِ حرمین تھا، جو کیم جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ بمطابق ۱۰ اپریل ۱۹۷۸ء کو شروع ہوا تھا۔

میں اختلاف اگر کیا ہے تو اہلِ ظاہر نے کیا ہے، اور اس کے بعد ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، اور ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو لے کر غیر مقلد بھی اسی طرح فتویٰ دیتے ہیں۔

غیر مقلدین کے فتویٰ پر عمل کی وجہ سے زندگی بھر زِنا ہوگا!

پچھلے دنوں یہاں شہر کہروڑپکا میں بھی ایک واقعہ پیش آیا، کہ ایک مرد نے اپنی عورت کو تحریری طلاق دی، اس پر صریح انداز میں تین طلاقیں لکھی ہوئی ہیں، صریح انداز میں یہ کہا ہوا ہے کہ میں نے اپنا تن تجھ پر حرام کیا، میرا اب تیرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، پہلے وہ حضرت جاوید شاہ صاحب[1] کے پاس لے کر آئے تو انہوں نے کہا ہمارے نزدیک تو اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بالکل نکاح نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ صورت اختیار نہ کی جائے جس کو ''حلالہ'' کہتے ہیں۔ وہ اس مسئلے کو لے کر شہر کے ایک غیر مقلد مولوی کے پاس گیا، اس نے واضح طور پر لکھا کہ تین ایک ہیں، تین نہیں، اس لیے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، اس کے بعد وہ اس کو لے گئے مولوی عبداللہ[2] اہلِ حدیث کے پاس، اس نے الجواب صحیح لکھ کر اس پر دستخط کردیے، پھر وہ اس کو میرے پاس لے کر آئے، مجھے یہ نہیں بتایا کہ پہلے ہم حضرت شاہ صاحب سے بات کر گئے ہیں، میں نے جب وہ اسٹام دیکھا تو میں نے کہا: اس کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں، چاہے غصے میں دی، چاہے رضامندی سے دی، تحریر اسٹام پر ہے، اس کے ہوتے ہوئے قطعاً نکاح نہیں ہوسکتا جب تک کہ حلالہ کی صورت اختیار نہ کی جائے، پھر انہوں نے مجھے وہ مسئلہ نکال کر دیا کہ اس کو پڑھو یہ کیسے لکھا ہوا ہے، میں نے کہا: مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ اس قسم کے فتوے دیتے ہیں، اگر تم حنفی ہو اور اپنے آپ کو ''مقلد'' کہتے ہو تو یہ قطعاً جائز نہیں، اگر نکاح کرو گے تو نکاح نہیں ہوگا اور یہ زندگی بھر کے لئے زِنا ہوگا، اس لیے ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے: دیکھو تو سہی! انہوں نے کیا دلائل دیے ہیں؟ میں نے کہا: مجھے ان کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، یہ سب دلائل ہمیں زبانی یاد ہیں، اور پھر باتوں سے ہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مُصِر ہیں، اور نکاح کرلیں گے، اور وہ اس کی ذمہ داری اس مولوی پر اور اسی طرح مولوی عبداللہ غیر مقلد پر ڈالیں گے، انگریز کے دور میں بھی یہ مسئلہ کئی دفعہ عدالتوں میں زیرِ بحث آچکا ہے، ہمارے حضرات نے ہمیشہ اس پر بحث کی ہے اور فیصلہ اسی طرح ہوا کہ تین تین ہیں، ایک نہیں۔

''حلالہ'' کی حکمت، صورت اور اُس کا مقصد

پھر تین طلاقیں ہوجانے کے بعد بھی شریعت نے ایک اصلاح کی صورت باقی رکھی ہے، اُس کی صورت یہ بنادی جس میں طویل راستہ طے کرنا پڑتا ہے، اور مقصد شریعت کا یہ ہے کہ تین طلاقیں ہوجانے کے بعد خاوند بیوی کی آپس میں ایک دوسرے سے توجہ ہٹ جانی چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا جوڑ لگانے میں اتفاق کی امید نہیں، اتنی مہلت دینے کے بعد پھر بھی اُن کا معاملہ

---

(۱) سید جاوید حسین شاہ صاحب مدظلہ، مدیر و شیخ الحدیث جامعہ عبیدیہ فیصل آباد۔ آپ حضرت حکیم العصر رحمۃ اللہ علیہ کے قدیم اور محبوب تلامذہ میں سے ہیں۔ اور اُن دنوں جامعہ باب العلوم میں مفتی و اُستاذ الحدیث تھے۔

(۲) پروفیسر عبداللہ بہاولپوری، یہ انتہائی متعصب غیر مقلد تھا۔

اسی طرح ہو یا طبیعت کی تیزی کی وجہ سے انہوں نے اس رائے سے فائدہ نہیں اٹھایا اور یکدم اپنا پورا حق استعمال کرلیا تو یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دوبارہ جوڑا جائے، اصل مقصد شریعت کا یہ ہے کہ زوجین جنہوں نے تین طلاقوں کا حق استعمال کرلیا اب ایک دوسرے سے توجہ چھوڑ دیں، یہ عورت کسی اور جگہ جا کے شادی کرلے، ہمیشہ ساتھ رہنے کی نیت کے ساتھ شادی کرے، شادی ہونے کے بعد اگر اتفاق ایسا ہوگیا کہ دوسرا خاوند مرگیا یا دوسرے خاوند نے طلاق دے دی تو اب یہ دوبارہ اگر پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو اجازت ہے، آپ جانتے ہیں جب اتنی مدت گزر گئی اور ندامت اور پچھتانے کے بعد جب اُن کو پتہ چل جائے گا کہ ہم اپنا اتنا نقصان کر بیٹھے ہیں تو آئندہ اس قسم کے جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کریں گے اور ذرا احتیاط رہیں گے، ورنہ شریعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اب اس مرد اور عورت کا تعلق کاٹ دیا جائے، اُن کی توجہ ایک دوسرے سے ہٹا دی جائے، عورت اطمینان کے ساتھ کسی اور جگہ جا کر نکاح کرے، پھر کسی وجہ سے وہاں سے اگر جدائی ہوگئی، کہ خاوند مرگیا یا اس کے ساتھ مرد عورت والا تعلق قائم کرنے کے بعد اگر اتفاقاً جدائی ہوگئی پھر پہلے خاوند سے نکاح کیا جاسکتا ہے، اصل مقصد تو یہ ہے، جب یوں ہوجائے گا تو اس میں کوئی کراہت اور کوئی خباثت نہیں، وہ دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں۔ اب قانون کا مقصد تو یہ ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس قانون کے پردہ میں اس نیت کے ساتھ اس عورت کا نکاح دوسرے سے کرتا ہے، اور دوسرا بھی سمجھتا ہے کہ میرے پاس یہ صرف اس لیے بھیجی جارہی ہے کہ بیوی بنا کے میں اس کو نہیں رکھوں گا، اور نہ ہی رکھنا مقصود ہے، بلکہ شریعت کے ایک ضابطہ کو ظاہری طور پر پورا کرنا مقصود ہے، کہ نکاح ہوجائے، ایک رات گزار لے، وطی ہوجائے، بعد میں طلاق ہوجائے گی تاکہ پہلے خاوند سے نکاح کرلے، اگر اس قسم کا واقعہ پیش آجائے تو فقیہ اس ظاہری واقعہ کی طرف دیکھتے ہوئے فتویٰ یہی دے گا کہ قرآنِ کریم کے ظاہر کا تقاضا پورا ہوگیا، اب اس پہلے خاوند کے ساتھ یہ نکاح کرسکتی ہے، کیونکہ قانون کی ظاہری سطح کو پورا کرلیا گیا، باقی اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ چونکہ نیت پر ہے، اب اگر اس نیت سے نکاح کیا گیا ہے کہ صرف ایک ہی رات کے لئے جانا ہے پھر واپس آجانا ہے، اور نکاح کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ میں اس کو دائماً رکھنے کے لئے نکاح نہیں کررہا، بلکہ میں نے صرف اس کو رات رکھنا ہے، پھر واپس کردینا ہے، اس قسم کا معاملہ حقیقت کے اعتبار سے عنداللہ لعنت کا باعث ہے، گناہ ہے، حضور ﷺ نے اس طرح کرنے والے کو ''التَّیْسُ الْمُسْتَعَار''[1] کہا ہے کہ جس طرح کرائے کا سانڈ لے لیا جائے، اور اس کو بے غیرتی اور بے حیائی قرار دیا، اس لیے عنداللہ تو اس کی حیثیت بہت بُری ہے، لعنت ہے، خباثت ہے، بے حیائی ہے، بے غیرتی ہے، کرائے کا سانڈ ہے، باطنی حال یہی ہوگا، لیکن ظاہری قانون پورا ہونے کے بعد مفتی فتویٰ دے دے گا کہ اب یہ پہلے خاوند کے لئے حلال ہے۔

حیلے کے ساتھ شرعی حکم سے بچنا باعثِ لعنت ہے

قانون کی ظاہری سطح اور ہوا کرتی ہے، باقی اُس کو استعمال کرنے کے لئے دل کے جذبات کیسے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے دل کے جذبات کا اعتبار ہوگا، حیلے جتنے بھی ہیں سب کی یہی صورت ہے، مثال کے طور پر زکوٰۃ واجب تب ہوتی ہے

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۹ باب المحلل والمحلل لہ

جب کسی شخص کے پاس مال ایک سال تک ملکیت میں رہ جائے، آج مثال کے طور میں نیا سال شروع ہو رہا ہے، یکم محرم ۱۴۰۰ھ ہے، آج کسی کی ملکیت میں ایک ہزار روپیہ آ گیا، اب جس وقت یہ سال گزرے گا تب زکوٰۃ فرض ہوگی، سال پورا ہونے سے ایک ماہ قبل گیارہ ماہ پورے ہونے کے بعد وہ ایک ہزار اپنے بھائی کو ہدیہ کر دیتا ہے، تو اب اُس کی ملکیت میں چونکہ گیارہ ماہ رہا، سال پورا نہیں ہوا، اس لیے زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، اب وہ ہزار روپیہ اس بھائی کے پاس چلا گیا، پھر جس وقت اس پر گیارہ ماہ گزرے تو اُس نے وہی ہزار اس بھائی کو ہبہ کر دیا، تو زکوٰۃ اُس پر بھی واجب نہیں ہوئی، اب اگر تو اتفاقی بات ہو کہ میرے پاس دس ہزار تھا، ابھی دس ماہ گزرے تھے زکوٰۃ کا وقت نہیں آیا تھا، میں نے بطور امداد کسی کو دے دیے، تو یہ اتفاقی بات ہے، عند اللہ بھی کوئی گناہ نہیں، زکوٰۃ بھی کوئی نہیں آئی، لیکن اگر زکوٰۃ سے بچنے کی نیت کے ساتھ یوں کیا گیا کہ ایک سال بیوی سب کچھ خاوند کو دے دے اور اگلے سال خاوند سب کچھ بیوی کو دے دے، مقصد یہ ہو کہ زکوٰۃ واجب نہ ہو، جس وقت مسئلہ کسی فقیہ کے پاس جائے گا، دار الافتاء میں مفتی کے پاس آئے گا تو وہ یہی لکھے گا کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ مفتی نیت سے بحث نہیں کرتا، باقی اگر کسی شخص نے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یہ حیلہ ڈھونڈا ہے، اور اس قانون کے پردے سے فائدہ اٹھایا ہے تو اللہ کے نزدیک یہ خباثت ہے، اس کے اُوپر ایسے ہی گناہ ہوگا جیسے تارکِ زکوٰۃ کا ہوتا ہے، لیکن یہ معاملہ آخرت کا ہے، دنیا میں یہ بات زیرِ بحث نہیں آئے گی، دنیا میں مسئلہ یہی بتایا جائے گا کہ جب ملکیت پر سال نہیں گزرا تو زکوٰۃ فرض نہیں ہے، شرعی ضابطوں میں بھی یوں حیلے کر کے لوگ جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہری سطح کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کے اوپر گرفت نہیں ہو سکے گی، جیسے دنیا میں ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں آپ نے سنا ہوگا کہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں چینی منتقل کرنے پر پابندی ہے، اب اگر ایک صوبہ والے اسی کو مٹھائی بنا کر دوسرے صوبہ میں منتقل کر دیں، مقصد تو ہے چینی منتقل کرنا لیکن اُس کی ظاہری شکل مٹھائی والی بنالی، تو قانون کی گرفت سے بچ جائیں گے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ انہوں نے اپنا مفاد حاصل کر لیا، قانون جو بنایا گیا تھا کہ لوگ یوں نہ کریں، یہ بات اس حکمت کے منافی ہے، لیکن ظاہری قانون کی گرفت میں نہیں آ سکتے، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جس وقت تک انسان کا دل دماغ مسلمان نہیں ہوتا، قاعدوں اور ضابطوں سے کسی کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا، دل دماغ مسلمان نہ ہو تو حیلہ کے ساتھ انسان ہر قاعدے سے بچ سکتا ہے، کوئی نہ کوئی حیلہ اس قسم کا نکال لے گا جس سے ظاہری قانون سے بچ جائے گا، لیکن دل اور دماغ میں اگر قانون کی عظمت موجود ہے اور انسان اُس کی حکمت کو سمجھتا ہے تو اس قسم کی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو حلالہ کی اصل حقیقت تو یہ ہے، لیکن لوگوں نے اس قانون کی ظاہری سطح کو باقی رکھتے ہوئے حیلے کے طور پر یہ بھی کرنا شروع کر دیا، اور یہ کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ شادی ایک ہی رات کے لئے کی جا رہی ہے، اور نکاح کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ مجھے بیوی کے طور پر نہیں دیا جا رہا، محض اس حرمت کو ختم کرنا مقصود ہے، اور وہ ایک رات رکھتے ہیں، صبح کو طلاق دے دیتے ہیں، تو گویا قانون کی ظاہری سطح پوری کر دی لیکن اس میں شریعت کی جو حکمت تھی اس کا لحاظ نہیں رکھا، اب ایسا کر لیں گے تو پہلے خاوند کے لئے وہ حلال ہو جائے گی، کیونکہ ضابطہ پورا کر دیا گیا، لیکن نیت کے فساد کی بناء پر یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعثِ لعنت ہے۔

تو یہ ہیں قاعدے اور ضابطے جو یہاں بتائے جارہے ہیں، کہ بہت محتاط طریقہ کے ساتھ یہ معاملہ طے کرنا چاہیے، جوش میں آکر اور جلد بازی میں انسان اپنے سارے حق کو استعمال نہ کرلے، کہ اس کے بعد پھر پچھتا وا ہو اور اصلاح کی صورت نہ رہے۔ یہ ہے طلاق کی تفصیل جو آپ کی خدمت میں عرض کردی گئی۔

''خلع'' کا مفہوم اور اس کے اَحکام

طلاق کا مسئلہ ذکر کرتے ہوئے درمیان میں خلع کا مسئلہ مذکور ہے، عام حالات میں مرد کو چاہیے کہ اگر عورت کو طلاق دیتا ہے تو جو کچھ مہر میں عورت کو دے چکا اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ دے چکا وہ واپس نہیں لینا چاہیے، یہ بات مرد کی مردانگی کے خلاف ہے، جب اُس نے اس سے استمتاع کرلیا، بیوی بنا کے اُس کو اپنے گھر لے آیا، اب جو کچھ اُس کو محبت اور پیار کے انداز میں دیا تھا، تعلقات کے دنوں میں دیا تھا، اب اُس کا واپس لینا کوئی شرافت اور عقلمندی نہیں ہے، لیکن اگر صورتحال ایسی پیدا ہوجائے کہ مرد سمجھتا ہے کہ قصوروار عورت ہے، میں اُس کو رکھنا چاہتا ہوں، یہ نہیں رہنا چاہتی، اور عورت یہ سمجھتی ہو کہ قصوروار مرد ہے، یعنی قصور مرد کا متعین نہیں، اگر قصور مرد کا متعین ہو تو پھر کچھ بھی واپس لینا حرام ہے، لیکن اگر صورتحال ایسی پیدا ہوگئی کہ مرد سمجھتا ہے کہ میں تو رکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ نہیں رہتی، اور عورت یہ سمجھتی ہو کہ میں رہنا چاہتی ہوں لیکن یہ نہیں رکھتا، اگر اس قسم کا حال پیدا ہوگیا کہ دونوں کا خیال یہ ہے کہ اب ہماری طبیعتوں میں اتنا اختلاف آگیا کہ اب ہم اللہ کے قاعدوں کا لحاظ نہیں رکھ سکیں گے، معاشرت کے اصول ہم نہیں اپنا سکتے، ایک دوسرے کے لئے باعث راحت نہیں رہ سکتے، ایسی صورت میں اجازت دیدی گئی کہ عورت کچھ دے کر اپنی جان چھڑالے، اور مال کی مقدار مہر سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے، جتنا خاوند نے اُس کو دیا ہے اُس کے اندر اندر وہ معاملہ طے کرلیں تو یہ درست ہے، یعنی ایسی صورت میں جب ظلم مرد کی طرف سے متعین نہ ہو، پھر نہ اُس مال کے دینے میں گناہ، نہ لینے میں گناہ ہے، اور حاکم کی عدالت میں اگر یہ فیصلہ چلا جائے وہ بھی اسی طرح فیصلہ کرے گا کہ مہر کی مقدار کے اندر ہی معاملہ کیا جائے، اور یہ علیحدگی طلاقِ بائنہ ہے، اور اس کے بعد عدت اسی طرح گزارنی پڑے گی جس طرح طلاق کے بعد گزاری جاتی ہے، لیکن اس میں رجوع نہیں ہوسکتا، کیونکہ جب عورت نے مال دے کر طلاق خریدی ہے تو مرد کو واپس لینے کا اختیار نہیں ہے، ہاں البتہ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

خلاصۂ آیات

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ: یہاں سے طلاقِ صریح مراد ہے، یعنی جس کے بعد رجوع ہوسکتا ہے، یہ دو مرتبہ ہے، مَرَّتٰنِ کہنے میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ دو طلاقیں بھی یکدم نہیں دینی چاہئیں، بلکہ مرۃً بعد مرۃٍ دینی چاہئیں، جیسا کہ فقہ کے اندر تفصیل موجود ہے، دو طلاقیں ہوجانے کے بعد بھی تم اُن کو اچھے طریقہ سے روک سکتے ہو، معروف طریقہ سے، یعنی جس کا دستور شرفاء کے اندر ہے، لیکن نقصان پہنچانے کے لئے روکنا نہ ہو، اور یا اچھے طریقہ سے بھلائی کے ساتھ اُس کو رخصت کردو، اور رخصت کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ رجوع نہ کرو، خود چلی جائے گی، اور جاتے ہوئے اُس کو کچھ نہ کچھ سامان جس کو لفظ متعہ کے ساتھ فقہ کے اندر ذکر کیا گیا

ہے اُس کو دے کر رخصت کرنا چاہیے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ: اگر تم خوف کرو، یہ خطاب عام مسلمانوں کو ہے یا اس کے مخاطب حکام ہیں۔
فَاِنْ طَلَّقَهَا: یہاں طَلَّقَهَا سے تیسری طلاق مراد ہے۔ حَتّٰى تَنْكِحَ: یہاں نکاح سے عقد مراد ہے، کیونکہ اس کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے، اور نکاح کی نسبت تو عورت کی طرف ہوتی ہے، وطی کی نسبت عورت کی طرف نہیں ہوتی، وطی کرنا مرد کا فعل ہے، تو کتاب اللہ سے تو صرف عقد ہی کا معنیٰ سمجھ میں آتا ہے، اور وطی کی زیادتی صحیح روایت کے ذریعہ سے ہے جو متفق علیہ ہے، کہ صرف عقد کرنا کافی نہیں کہ ایجاب وقبول ہوا اور اس کے بعد طلاق دے دی، بلکہ بیوی بنا کے اُس کو رکھنا بھی مقصود ہو، اور اس کے ساتھ مجامعت بھی ہو جائے تب جا کر پہلے خاوند کے لئے وہ حلال ہوگی، اس کی قید صحیح حدیث کے ساتھ لگائیں گے جو مجمع علیہ ہے۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا: اللہ کے احکام کو مذاق قرار نہ دیا کرو، اور مذاق قرار دینے کی اگر ظاہری صورت ہو کہ ظاہری مذاق ہو تو یہ بالکل کفر ہے، اور یہ بھی مذاق بنانے والی بات ہے کہ ان کی عظمت دل میں نہ ہو اور حیلے بہانوں کے ساتھ اُن سے بچنے کی کوشش کریں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو تم ان عورتوں کو روکا نہ کرو

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

اس بات سے کہ وہ نکاح کرلیں اپنے تجویز کردہ خاوندوں سے، جب وہ مرد وعورت راضی ہو جائیں معروف طریقے سے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

یہ بات، نصیحت کیا جاتا ہے اس کے ذریعے سے وہ شخص جو تم میں سے ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخر پر،

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ

یہ بات تمہارے لیے زیادہ پاکیزگی اور طہارت کا باعث ہے، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾ بچہ جننے والی عورتیں دودھ پلائیں

اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ

اپنے بچوں کو دو سال پورے، یہ بات اُس شخص کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہے، اور اس شخص کے ذمے جس کے لئے بچہ جنا گیا ہے

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

اُن عورتوں کی روزی اور اُن کا لباس ہے معروف طریقے سے، کوئی نفس تکلیف نہیں دیا جاتا مگر اُس کی وسعت کے مطابق،

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى

نہ نقصان پہنچائی جائے والدہ اُس کے بچہ کے سبب سے، اور نہ وہ شخص جس کے لئے بچہ جنا گیا ہے اپنے بچہ کے سبب سے، اور

الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا

وارث کے ذمے بھی ایسی ہی چیز ہے، اگر والد اور والدہ ارادہ کرلیں دودھ چھڑانے کا ان دونوں کی طرف سے رضامندی

وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

اور مشورے سے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم ارادہ کرو کہ دودھ پلواؤ اپنے بچوں کو، پھر بھی تم پر کوئی گناہ نہیں

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

جب سپرد کردو تم وہ چیز جو تم نے دینی ٹھہرائی ہے اچھے طریقے سے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو

بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ

دیکھنے والا ہے ﴿۲۳۳﴾ اور جو لوگ تم میں سے وفات دے دیے جاتے ہیں اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ بیویاں روک رکھیں اپنے

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا

نفسوں کو چار ماہ اور دس دن، پھر جس وقت وہ اپنی معین مدت کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا

وہ کریں اپنے نفسوں میں معروف طریقے سے، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۲۳۴﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اِس میں

عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ

کہ نکاح کا پیغام تم اشارۃً دیدو یا اس کو تم اپنے دلوں میں چھپا رکھو، اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک ضرور تم عورتوں کا تذکرہ کرو گے

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا

لیکن نہ وعدہ کیا کرو ان عورتوں سے خفیہ طور پر، مگر یہ کہ کہو تم قاعدے کے مطابق، اور عزم نہ کیا کرو

عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

عقد نکاح کا جب تک کہ لکھی ہوئی چیز (عدت) اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

اُن چیزوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں، پس اُس سے ڈرتے رہا کرو، اور یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے بردبار ہے ﴿۲۳۵﴾

تفسیر[1]

آیت کا شانِ نزول

عورتوں کے ساتھ معاملات کا سلسلہ چلا آرہا ہے، پچھلے رکوع میں بھی طلاق اور عدت کے متعلق کچھ احکام ذکر کیے گئے ہیں، اور یہ رکوع بھی اسی قسم کے احکام پر مشتمل ہے، پہلے طلاق کا مسئلہ واضح کیا گیا ہے، اس کے بعد رضاعت کے مسئلہ کی کچھ تفصیل ہے، اور اس کے بعد عدتِ وفات کا ذکر ہے، یہ تین مسائل ہی اس رکوع میں بیان کیے گئے ہیں۔ طلاق کے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ جاہلیت میں ایک رسم تھی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا اور پھر اُس کی عدت بھی گزر جاتی، اس کے بعد اگر وہ عورت کسی اور جگہ نکاح کرنا چاہتی تو سابقہ خاوند رکاوٹیں ڈالتا، کہ یہ عورت وہاں نکاح نہ کر سکے، اور اس کو وہ اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا کہ پہلے یہ میری بیوی تھی، اب یہ فلاں شخص کی بیوی بن جائے گی، چاہے قانوناً وہ اُس کی بیوی نہیں رہی، لیکن اس تعلق کی بناء پر اس کو وہ اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا تھا، کہ جو میری بیوی تھی اب وہ کسی دوسرے کی بیوی بن جائے۔ اور بسا اوقات یوں ہوتا تھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کی طرف سے مطلقہ ہوگئی، اور اُس کی عدت گزر گئی، نکاح ختم ہوگیا، بعد میں وہی خاوند جس نے طلاق دی تھی اپنے کیے پر پشیمان ہوا، اور عورت کا بھی دل پہلے خاوند کے ساتھ لگا ہوا تھا، عدت گزر جانے کے باوجود اور نکاح منقطع ہوجانے کے باوجود اُن دونوں کا آپس میں رجحان ہوگیا، پھر وہ چاہتے ہیں کہ ہم دوبارہ آپس میں نکاح کر کے اپنی اسی قسم کی زندگی اختیار کرلیں، لیکن عورت کے اولیاء رکاوٹ ڈالتے تھے کہ جس شخص نے پہلے ہماری بچی کو طلاق دے کر جدا کر دیا ہے اب ہم دوبارہ اُس کے ساتھ نکاح نہیں کریں گے، ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ اور عام طور پر پہلی طلاق کی بناء پر دلوں کے اندر عداوت کا پیدا ہوجانا، یا جس نے پہلے طلاق دے دی اس کے گھر میں لڑکی کے دوبارہ جانے کو اپنی عزت کے خلاف سمجھنا، اس قسم کے جذبات اس رکاوٹ کا باعث بنتے تھے۔ چنانچہ اس کے شانِ نزول میں ایسے واقعات لکھے ہوئے ہیں، معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، انہوں نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح کسی کے ساتھ کیا، لیکن نباہ نہ ہوسکا، اُن کے بہنوئی نے اُن کی بہن کو طلاق دے دی، عدت ختم ہونے کے بعد اُس کا پھر رجحان ہوا کہ میں اسی سے شادی کرلوں، اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کا رجحان بھی اُدھر ہی تھا، جس وقت اس نے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے بات کی تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں نے تیری عزت کی تھی کہ اپنی بہن تیرے نکاح میں دے دی، لیکن تو نے یہ قدر کی کہ اُس کو طلاق دے دی، بالکل کسی صورت میں بھی اپنی بہن کا نکاح تجھ سے نہیں کروں گا، اور قسم کھالی کہ ایسا نہیں ہوسکے گا، پھر جس وقت یہ آیت اُتری اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کر دی گئی کہ مرد عورت کا اگر آپس میں

(۱) نظرِ ثانی کے وقت اس حصے کی ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے خلاصۂ آیات درج نہیں کیا گیا۔

رجحان ہو جائے تو رو کا نہ کرو، اِس آیت کے سنتے ہی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے توبہ کی اور اپنی قسم کو توڑ دیا، اس کا کفارہ دیا، اور اپنی بہن کا نکاح اُس کے سابق شوہر کے ساتھ کر دیا۔[1] تفاسیر کے اندر یہ واقعہ بھی لکھا ہوا ہے، اور غالباً جلالین میں بھی اس کے شانِ نزول میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے، تو یہ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں کہ سابق خاوند کسی اور جگہ نکاح نہ کرنے دے اور رکاوٹ ڈال دے، یا اولیاء سابق خاوند سے نکاح نہ کر دیں اور رکاوٹ ڈالیں۔

عورت کو نکاحِ ثانی سے روکنا جہالت ہے

اور بعض خاندان ایسے ہیں جن میں یہ جاہلیت چلی آ رہی ہے، کہ اگر کوئی لڑکی پہلے خاوند سے بیوہ ہو جائے یا مطلقہ ہو جائے تو اُس کو کسی دوسری جگہ نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں دیتے، اس کو بھی اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں، کہ ہماری لڑکی مختلف شوہروں کے ہاں جائے، راجپوتوں کے بعض خاندانوں میں ابھی تک یہ رسم چلی آ رہی ہے، اصل کے اعتبار سے یہ ہندوؤں والی رسم ہے کہ وہ نکاحِ ثانی کے قائل نہیں، اور راجپوت بھی چونکہ اصل کے اعتبار سے ہندو تھے، اس لیے اِس قسم کی جاہلانہ رسمیں اُن میں اب تک باقی ہیں، یہ نکاحِ ثانی کے قائل نہیں ہیں، تو ایسی صورت بھی پیش آ سکتی تھی کہ لڑکی کو اُس کے خاوند نے طلاق دے دی، طلاق کے بعد اس لڑکی کا رجحان ہے کہ میں نکاحِ ثانی کروں، لیکن اولیاء اجازت نہیں دیتے، اور اس کی منشاء بھی وہی جاہلانہ غیرت، جاہلانہ اکڑ، اور اپنی ناک کو اُونچا رکھنے کا جذبہ، اور یہ خیال کرنا کہ ہماری لڑکی کا کہیں دوسری جگہ جانا بے غیرتی کا باعث ہے، ایسے واقعات کے لئے یہ ہدایت دی گئی، کہ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، پھر اُس کی عدت پوری ہو جائے، اور وہ کسی شخص کو تجویز کر لیں کہ میں اُس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہوں (اس میں دونوں صورتیں ہیں، چاہے تجویز کردہ خاوند پہلا ہی ہو جس نے پہلے طلاق دی ہے، یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو) فَلَا تَعْضُلُوْ کا خطاب عام ہے، پہلے ازواج کو بھی، اور اولیاء کو بھی کہ پھر تم روکا نہ کرو، جس وقت ان مرد عورت کی آپس میں تراضی ہو جائے، اور ہو وہ عرفِ شرع کے مطابق اور شرفاء کے عرف کے مطابق، یعنی نکاح کے لئے جس قسم کے حدود و قیود متعین کیے گئے ہیں وہ ان حدود و قیود کے مطابق ہو، کہ لڑکی اپنے ہمسر خاندان میں نکاح کرنا چاہتی ہے، مہرِ مثل کے ساتھ کرنا چاہتی ہے، عدت کے بعد کرنا چاہتی ہے، اور اس میں کسی قسم کی شرعی یا عرفی رکاوٹ نہیں ہے تو ایسے وقت میں نکاح کرنے سے روکا نہ کرو، اس کو نکاح کرنے دیا کرو، لَا تَعْضُلُوْ کا خطاب دونوں کو ہو جائے گا، سابقہ خاوند کو بھی چاہیے کہ وہ کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالے، اور اولیاء کو بھی چاہیے کہ رکاوٹ نہ ڈالیں، جس وقت کہ مرد عورت آپس میں معروف طریقہ سے راضی ہو جائیں۔

قوانین کے ذِکر کے ساتھ ذہنی تربیت اور اس کی اہمیت

یہ اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ بیان کر دیا، اب اِس پر عمل کو سہل کرنے کے لئے اگلے الفاظ کہے جا رہے ہیں، اور یہی قرآنِ کریم کی خصوصیت ہے۔ دنیوی قانون اور اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ فرق ہے کہ دنیوی حکومتیں قانون بناتی ہیں اور اس قانون کو قوت کے ساتھ نافذ کرتی ہیں، نافذ کرنے کے بعد چونکہ ذہنی تربیت اُس کے مطابق نہیں ہوتی تو لوگ اس وقت تک اس

(1) بخاری ج ۲ ص ۶۳۹ باب قوله واذا طلقتم النساء، ج ۲ ص ۷۰۷، ج ۲ ص ۸۰۳۔

قانون کی رعایت رکھا کرتے ہیں جب تک انہیں یہ ڈر ہو کہ ہم حکومت کی گرفت میں آجائیں گے، اور اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ حکومت کی گرفت میں نہیں آؤں گا، اور خفیہ طور پر، جعل سازی کے ساتھ، کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کر کے بچا جا سکتا ہے، تو پھر انسان اس قانون کی پروا نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جو قانون ہمیں دیا اُس کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت بھی فرمائی، اور ذہنی تربیت فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ اس کو پھر کسی دنیوی حکومت کے ڈر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے خوف کے ساتھ اپنی آخرت کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے اُس پر عمل کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے دل دماغ کے ساتھ اسلام کو قبول کر لیا، چاہے دنیا کے اندر کسی قسم کی گرفت کا اندیشہ نہ ہو، چاہے انہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، خلوت میں، علیحدگی میں، کوئی خفیہ پولیس نہیں، کسی قسم کی شکایت کا ڈر نہیں ہے، وہ لوگ ایسی جگہوں میں بھی اس قانون کا پاس رکھتے ہیں، کیونکہ اُن کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی، کہ یہ قانون اللہ کا ہے اور اللہ سے تم چھپ نہیں سکتے، اگر دل میں اُس کے خلاف جذبہ رکھو گے یا ظاہری طور پر اُس کے خلاف کوئی عمل کرو گے، چاہے دنیا کے اندر تمہیں کوئی پکڑے یا نہ پکڑے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، اس لیے تم اللہ تعالیٰ کے خوف کے تحت اس قانون کو اپناؤ اور اس کے اُوپر عمل کرو، یہ اس قانون کو اپنانے کے لئے ذہنی تربیت ہے، اس تربیت کے قبول کر لینے کے بعد پھر انسان یہ نہیں سوچا کرتا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا، کوئی مجھے اس کے اوپر ملامت کرے گا یا نہیں کرے گا، مجھے دنیا میں اس کے اُوپر سزا ہو گی یا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا استحضار کرتے ہوئے انسان اس قانون کے اوپر عمل کرتا ہے۔ پھر اس میں ایک مربیانہ شان یہ بھی ہے کہ وہ اس قانون کی عظمت کو دل دماغ میں اتارتا ہے، کہ قانون بیان کیا پھر اُس کی مختلف مصلحتوں کو طرف اشارہ کر دیا، جیسے یہاں آئے گا ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یہ بات انہیں کہی جا رہی ہے جن لوگوں کا اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان ہے، اب قیامت پر ایمان اور اللہ پر ایمان یہ دونوں باتیں تقاضا کرتی ہیں کہ اس بات کو قبول کرو، ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ: پھر یہ بات جو تمہیں کہی جا رہی ہے تمہارے نفع کے لئے کہی جا رہی ہے، کہ یہ قاعدہ تمہارے لیے زیادہ صفائی ستھرائی کا باعث ہے، اب تو تم اپنے اختیار کے ساتھ اپنی بہن کو یا بیٹی کو دوسرے کے نکاح میں نہیں دیتے، کہ اس سے ہماری ناک نیچی ہو جائے گی، لیکن تم جانتے نہیں کہ انسان کے فطری جذبات کیسے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت خواہش سے مغلوب ہو جائے، جائز طریقہ تم اس کے لئے مہیا نہیں کرتے، پھر خفیہ آشنائیاں لگیں گی جس کے نتیجے میں فرار اور اغواء کے واقعات روزمرہ پیش آتے ہیں، پھر جس وقت یہ کسی کے ساتھ یاری لگا کر گھر سے نکل جائے گی یا کوئی اس کو اغواء کر کے لے جائے گا، یہ واقعات جب سامنے آئیں گے تو پھر اُونچی ناک بالکل ہی کٹ جائے گی، تو اخلاق کی صفائی ستھرائی اور گناہوں سے بچنا اسی طریقہ سے ہے کہ مرد عورت کا آپس میں رجحان ہو جائے تو نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالا کرو۔ یہ مصلحت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور تیسری بات ساتھ یہ کہہ دی کہ اپنے طور پر اپنی عقل کے ساتھ جو تم مصلحتیں تجویز کرتے ہو یہ مصلحتیں کوئی حقیقی مصلحتیں نہیں ہیں، تمہارا علم ناقص ہے، تمہاری عقل ناقص ہے، تم اپنے لیے جو سوچ لیتے ہو کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے، حقیقت میں فائدہ نہیں ہوتا، تمہارے مصالح اور تمہارے فوائد کو اللہ زیادہ جانتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ جو کچھ کہہ دے اس پر اعتماد کرو، یقین رکھا کرو کہ تمہارا

فائدہ اسی میں ہے۔ یہ جتنی باتیں کہی جارہی ہیں یہ ساری کی ساری اس قانون کو قبول کرنے کے لئے دل اور دماغ کی تربیت ہے، جب انسان ان باتوں پر غور کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون پر عمل کرنا آسان ہوجائے گا، اور انسان اس پر خوشی کے ساتھ عمل کرے گا۔ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ: یہ بات نصیحت کی جاتی ہے اُس شخص کو جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخر پر، یعنی جس کا اللہ پر ایمان ہوگا اور یوم آخر پر ایمان ہوگا وہ اس بات کو قبول کرے گا، اور جس کا اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان نہیں وہ قانون کی پابندی کہاں کرتا ہے؟ پھر وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے۔ اور آگے اس قانون کی عظمت اور فائدے کی طرف اشارہ کردیا، کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزگی اور ستھرائی کا ذریعہ ہے کہ مرد وعورت کا آپس میں رجحان ہونے جانے کے بعد رکاوٹیں نہ ڈالا کرو، ورنہ پھر خفیہ آشنائیاں ہوجائیں گی، جس کے نتیجہ میں پھر اغواء اور فرار کے واقعات پیش آتے ہیں، کہ وہ مرد جس کا اُس لڑکی کی طرف رجحان ہوتا ہے، اور لڑکی بھی اُس کے ساتھ ساز باز ہوتی ہے، جب اولیاء اپنی مرضی سے نکاح نہیں کرنے دیں گے پھر وہ گھر سے بھاگتی ہیں، اور اگر تم اُن کے جذبات کی رعایت رکھو کہ جدھر رجحان ہوگیا وہیں نکاح کرنے دو اور اپنی جاہلانہ غیرت کو چھوڑ دو، اگر تم اپنی رضامندی کے ساتھ اُن کا نکاح کردو گے تو کم از کم اس قسم کے ذلت آمیز واقعات تو سامنے نہیں آئیں گے، اور ان کے جذبات کی رعایت رہ جائے گی، عزت بحال رہ جائے گی، اس لیے اپنے طور پر تم مصلحتیں نہ سوچا کرو، تمہاری عقل ناقص ہے، تمہارا علم ناقص ہے، تم جانتے نہیں کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، جو کچھ اللہ بتائے اسی میں تمہاری مصلحت ہے، تم اپنی مصلحتیں نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے۔

اُحکامِ رضاعت

یہاں تک طلاق کا قصہ ختم ہوگیا، اب آگے رضاعت کا مسئلہ آگیا یعنی بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ، کیونکہ نکاح ہوتا ہے تو نکاح کے بعد اولاد بھی ہوتی ہے، اور اولاد ہونے کے بعد اُن کے دودھ پلانے کا مسئلہ پیش آتا ہے، اور بسا اوقات ماں باپ کی آپس میں جدائی ہوجاتی ہے، تو پھر وہ بچہ کشاکشی کا باعث بن جاتا ہے کہ دودھ کون پلائے؟ کس کے ذمہ یہ چیز ہے؟ اس لیے یہ احکام واضح طور پر بتائے جارہے ہیں۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ: ''بچہ جننے والی عورتیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دوسال، یہ اس شخص کے لئے ہے جو رضاعت کی مدت کو پورا کرنا چاہے''، اگر پوری مدت دودھ پلانا چاہتے ہو تو دوسال تک پلاؤ، اس کا مطلب کیا ہے کہ دوسال سے زائد دودھ پلانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں جمہور کا مسلک یہی ہے کہ دوسال سے زائد دودھ نہیں پلانا چاہیے، اور اَحناف کا فتویٰ بھی اسی بات پر ہے۔ ایک قول امام ابوحنیفہ ؒ کا آتا ہے اور بعض آیات وروایات کے اشارہ سے اس کا جواز نکلتا ہے کہ اگر دوسال سے چھ ماہ زائد بھی کوئی عورت دودھ پلانا چاہے تو یہ جائز ہے اور اُس کے ساتھ بھی رضاعت ثابت ہوجاتی ہے، اگر کسی بچے نے سوا دوسال کا ہونے کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو رضاعت کا تعلق قائم ہوجائے گا، اس لیے اس صورت میں نکاح وغیرہ میں احتیاط کرنی چاہیے، اور ڈھائی سال کے بعد امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک بھی جائز نہیں، اور امام زُفر ؒ کا ایک قول تین سال تک کا ہے، اور تین سال کے بعد بالاتفاق رضاعت کی مدت ختم ہوجاتی ہے، اس میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں، تین سال کا بچہ ہوجانے کے بعد اگر کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو پینا جائز نہیں، اور اس دودھ کے ساتھ احکامِ رضاعت متعلق نہیں ہوتے۔

دُودھ پلانے کی اُجرت کے متعلّق تفصیل

والدات تو دودھ پلائیں گی، اور اُن عورتوں کا رزق اور اُن کا لباس اُن بچوں کے والدوں کے ذمہ ہے جن کے لئے یہ بچے جنے گئے، اب اُن کے ذمہ دو طرح سے ہے، اگر تو بچے کی والدہ بچے کے والد کے نکاح میں ہے، یعنی بچہ جننے کے بعد بھی نکاح قائم ہے، پھر یہ روٹی کپڑا خاوند کے ذمہ بیوی ہونے کے اعتبار سے ہے، پھر وہ دودھ پلائی کی الگ اجرت نہیں لے سکتی، یہ خرچ بیوی ہونے کی حیثیت سے لے گی۔ اور اگر جدائی ہوگئی، جیسے بچہ پیدا ہونے سے پہلے طلاق ہوگئی، یا بچہ ہوتے ہی کسی طرح سے جدائی ہوگئی، اور عدت بھی ختم ہوگئی، اب اس دودھ پلانے والی عورت کا روٹی کپڑا اجرتِ رضاعت کے طور پر اُس کے باپ کے ذمہ ہے، کیونکہ جس وقت طلاق ہوجائے اور عدت ختم ہوجائے تو بیوی والا نان نفقہ تو رہا نہیں، اور چونکہ اس بچے کو دودھ پلاتی ہے تو دودھ پلائی کی اجرت کے طور پر نان نفقہ لے سکتی ہے۔ بہرحال جب بچے کی ماں بچے کو دودھ پلائے گی تو اس کا خرچ بچے کے باپ کے ذمے ہے، چاہے بیوی ہونے کی حیثیت سے، چاہے مرضعہ ہونے کی حیثیت سے، اتنی دیر تک وہ خرچہ لے سکتی ہے، اگر نکاح قائم ہے تو بیوی ہونے کی حیثیت سے خرچ لے گی، پھر دودھ پلانے کا خرچ اُس کو علیحدہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ جس طرح بچہ مرد کا ہے اسی طرح عورت کا بھی ہے، ہاں البتہ اگر علیحدگی ہوگئی تو دودھ پلانے کی ذمہ داری باپ پر آتی ہے، اگر والدہ کے سر پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے تو وہ اپنے رزق وکسوہ کی صورت میں اُس اجرت کو وصول کرسکتی ہے۔ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی دستور کے مطابق، جس قسم کا دستور اُس وقت شرفاء کے ہاں ہو، یعنی اگر مرد وعورت دونوں ہی امیرانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو خرچ وسیع دیا جائے گا، اور اگر دونوں ہی غریب ہیں تو خرچ غریبوں کے دستور کے مطابق دیا جائے گا، اور اگر مرد امیر ہے عورت غریب گھرانے کی ہے یا مرد غریب ہے اور عورت دولت مند گھرانے کی ہے تو متوسط خرچ دیا جائے گا،[1] نہ بالکل امیرانہ، نہ بالکل غریبانہ، یعنی دستور کے مطابق خرچ دو۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا: نہیں تکلیف دیا جائے گا کوئی شخص مگر اپنی وسعت کے مطابق، گنجائش سے زیادہ تکلیف کسی کو نہیں دی جائے گی، باپ جتنا خرچہ برداشت نہ کرسکے اس پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی، والدہ اگر دودھ پلانے کے قابل نہیں، اُس کو کوئی تکلیف ہے، تو اُس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ تو دودھ ضرور پلا، ان معاملات کے اندر اس قانون کو مدنظر رکھا جائے گا، جتنی جس میں گنجائش ہے اُسی کے مطابق اُس کو تکلیف دی جائے گی، ناقابل برداشت تکلیف کسی انسان کو نہیں دی جائے گی، اسی کو آگے واضح کرکے کہا جارہا ہے کہ ”والدہ کو اُس کے بچے کے سبب سے نقصان نہ پہنچایا جائے“ کیا مطلب؟ کہ واقعی معذور ہے اور تم کہو کہ نہیں! یہ ضرور دودھ پلائے، یہ اُس بچے کی وجہ سے ماں کو تکلیف پہنچانے والی بات ہے، اور اگر ماں کو کوئی کسی قسم کا عذر نہیں اور باپ بیچارہ مسکین ہے وہ کسی پرائی عورت کا خرچ برداشت نہیں کرسکتا، تو ماں بلاوجہ بچے کے باپ پر ذمہ داری ڈالے کہ میں تو دودھ نہیں پلاتی، یہ بلاوجہ بچے کے باپ کو نقصان پہنچانے والی بات ہے، یعنی آپس میں مروت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اس معاملہ کو طے کیا جائے، نہ بلاوجہ بچے کی ماں کو تکلیف پہنچاؤ، نہ بلاوجہ بچے کے باپ کو تکلیف پہنچاؤ۔

---

(۱) صاحب ہدایہ نے خصاف کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور مرد مالدار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد اور مالداروں سے کم۔ اور کرخی کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت سے فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے واللہ اعلم (معارف القرآن)۔

یتیم کا خرچ کس کے ذِمّے ہے؟

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ: اور اگر کسی بچے کا باپ موجود نہیں، بچہ یتیم ہے، تو پھر خرچ کس کے ذمہ ہے؟ اس کو قرآنِ کریم نے ایک ہی لفظ کے اندر ادا کر دیا، کہ پھر خرچہ وارث کے ذمہ ہے، یعنی بچے کے وارث کے ذمہ ہے، بچے کے وارث کا مطلب یہ ہے کہ اس بچے کے جتنے رشتہ دار موجود ہیں، دیکھو! کہ اگر آج یہ بچہ مرجائے تو اس کا وِرثہ کس کس کو کس اندازے کے ساتھ پہنچے گا؟ تو جس کو جس اندازے کے ساتھ وِرثہ پہنچتا ہے اسی اندازے کے ساتھ اُس کا خرچہ برداشت کیا جائے گا، وِرثہ حقیقت میں بچے کا ہو یا نہ ہو یعنی وارث بننے کی اہلیت کس میں ہے، مثلاً ایک بچے کا باپ مرگیا، اُس کی ماں موجود ہے، اُس کا دادا موجود ہے، اب آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی بچے کی ماں اور اُس کا دادا موجود ہو تو بچے کے مرنے کے بعد جس وقت آپ وراثت کا مسئلہ پوچھیں گے تو وراثت میں تیسرا حصہ ماں کا ہے اور دو حصے دادا کے ہیں، دو ثلث دادا کے اور ایک ثلث ماں کا، اب اس بچے پر تین روپے خرچہ آئے گا تو ایک روپیہ ماں ادا کرے گی اور دو روپے دادا ادا کرے گا، اس طرح سے جو بھی وارث موجود ہوں، مثلاً بھائی بہنیں موجود ہیں، تو اگر یہ مرے تو بھائیوں کو اور بہنوں کو کس حساب کے ساتھ اُس کا وِرثہ پہنچے گا، اسی تناسب کے ساتھ اُن سے اس کا خرچہ وصول کیا جائے گا، تو وارث کے لفظ کے اندر یہ ساری تفصیل آگئی کہ نابالغ بچے کا خرچہ باپ کی عدمِ موجودگی میں اُس کے ورثاء پر ہوتا ہے، کہ جس نسبت کے ساتھ اُس کا وِرثہ اُن کو پہنچ سکتا ہے اسی نسبت کے ساتھ اُن سے خرچ وصول کیا جائے گا۔

مدتِ رضاعت سے قبل دُودھ چھڑانے کا حکم

فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا: اگر بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں دونوں کی طرف سے رضامندی سے اور مشورے سے، مشورہ اور رضامندی اس لیے تا کہ بچے کی مصلحت کو دیکھ لیا جائے، بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ ماں کا مزاج ٹھیک نہیں، جس کی بناء پر دودھ بچے کو موافق نہیں آرہا، یا بچے کی صحت عورت کے دودھ کی متحمل نہیں اور اطباء کی طرف سے یہ تجویز ہو گیا کہ بکری کا دودھ پلاؤ، یا آج کل ڈبے کا دودھ پلاؤ، اس قسم کی اگر تجویز ہو جائے تو آپس میں مشورہ کر کے وہ دودھ اگر چھڑا لیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، ماں باپ پر کوئی گناہ نہیں، کم مدت کے اندر وہ دودھ چھڑا سکتے ہیں۔ اور آج کل زیادہ رواج یہی ہوتا جا رہا ہے کہ مائیں پلاتی نہیں، اور بچے ڈبے پر پلتے ہیں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، شرعاً جائز ہے، لیکن جہاں تک والدہ اور اولاد کے تعلق کی بات ہے اس فطری تعلق میں یقیناً کمی آجاتی ہے، یعنی جن گھروں کے اندر بچے ڈبوں پر پلتے ہیں اُن میں وہ فطری تعلق جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتا ہے، اس میں یقیناً کمی آجاتی ہے، کہاں تو دو سال تک بچے نے ماں کا دودھ ہی چوسنا اور پینا ہے، اور کہاں پیدا ہوتے ہی ڈبوں کے دودھ پر لگا دیا، بڑا فرق پڑتا ہے، یہ جو فطری طریقہ ہے مصلحت اسی کے اندر ہے، اگرچہ شرعاً جائز ہے کہ دودھ پلایا جائے، اب جتنا رجحان اس طرف جو ہو جائے گا کہ عورتیں بھی معاشی زندگی میں شریک ہو جائیں، یہ بھی ملازمتیں کریں، یہ بھی دکانیں کھولیں اور کاروبار کریں، پھر بچے ڈبوں پر ہی پلیں گے، جنیں گی اور جن کر ہسپتال میں دے دیں گی یا نوکروں کے سپرد

کردیں گی اور خود ملازمت کرنے کے لیے دفتروں میں جایا کریں گی، اور بچے دوسروں کے ہاتھوں پلیں گے، پھر آپس میں وہ تعلقات کیسے قائم رہ سکتے ہیں؟

یورپ کا معاشرہ ماں باپ والی فطری محبت سے خالی ہے

چنانچہ یورپ نے اگر اس زندگی کو اپنایا ہے تو وہ اس فطری محبت سے خالی ہو گیا، یعنی آپ یقین جانیے کہ یورپ میں ایک دوسرے کے ساتھ فطری محبت نہیں رہی، ماں باپ کو اولاد سے کوئی تعلق نہیں، اولاد کو ماں باپ سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے وہاں یہ رسم ہے کہ اگر باپ بھی ملنے کے لئے بیٹے کے گھر جائے تو اپنا خرچ ساتھ لے جائے گا اور جا کے ہوٹل میں ٹھہرے گا، اور اتنی لاتعلقی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ماں باپ کو تو شاید یاد ہو کہ ہم نے کتنے بچے جنے ہیں، باقی عام لوگوں کو پتہ نہیں کہ ہم کتنے بہن بھائی ہیں، آپس میں تعلق ہی نہیں رہا، جیسے دانہ دانہ بکھر گیا ہو، پیدا ہوئے اور مینڈکوں کی طرح اپنا اپنا وقت گزارا اور مر گئے۔ اب تو عام طور پر وہاں یہ رواج ہوتا جا رہا ہے، کہ ولدیت لکھی ہی نہیں جاتی کہ فلاں فلاں کا بیٹا ہے، کہتے ہیں بس نام اور فوٹو کافی ہے، اور یہ طریقہ اپنانے پر وہ لوگ مجبور ہیں، کیونکہ بہت سارے لوگوں کو اپنے باپ کا پتہ ہی نہیں ہے، اور واقعہ کے اعتبار سے کنواری ماؤں کی اولاد ہوتی ہے، جب اُن کی ماں ہی کنواری ہے تو باپ کہاں سے بتائیں؟ آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے، ''الحق'' کے اندر رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ امریکہ میں ساٹھ فیصد بچے ولد الحرام ہیں، جو ناجائز تعلق کا نتیجہ ہیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ نصف سے زائد ہیں، اور للاکثر حکم الکل کے تحت سارے حرامزادے ہو گئے، تو جب اُن کو اپنے باپ کا پتہ ہی نہیں ہوگا، عورتیں حاملہ ہوتی ہیں، باوجود برتھ کنٹرول کے اور ہر قسم کے اسباب مہیا ہونے کے نطفہ ٹھہر جاتا ہے، ہسپتال میں جاتی ہیں، بچہ جن کے ہسپتال کے سپرد کر آتی ہیں، اور جہاں جہاں یہ مغربی تہذیب آتی جا رہی ہے وہاں یہی اثرات ہیں۔

عیسائیوں کی آبادی حرامی بچوں کی وجہ سے بڑھ رہی ہے

اور معاف کرنا، آپ تو مسجدوں مدرسوں میں بیٹھنے والے درویش ہیں، آپ کو علم نہیں، ہمارے معاشرے کے اندر بھی یہ چیز کثرت سے ہو گئی ہے، اگر اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو ملتان ''مشن ہسپتال'' میں جا کر دیکھ لیں، یہ عیسائیوں کا ہسپتال ہے، اکثر و بیشتر اس قسم کے ناجائز بچے وہاں پیدا ہوتے ہیں، اور وہ ہسپتال والوں کے سپرد کر دیتے ہیں، اور وہاں مستقل کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے اندر بچے پنگھوڑوں میں رکھے ہوئے ہیں، اور اُن کو نرسوں کے ذریعے سے پالا جاتا ہے، اور پھر اُن کو عیسائی بناتے ہیں، اور عیسائیوں کی آبادی زیادہ تر انہی حرامی بچوں کی وجہ سے بڑھ رہی ہے، لڑکی کو بمقابلہ لڑکے کے زیادہ خوشی سے قبول کرتے ہیں، کیونکہ لڑکی اُن کے زیادہ کام کی ہے، مسلمان جوڑوں کی ناجائز اولاد نتیجۃً عیسائی بنتی ہے اور ہسپتالوں میں پلتی ہے، یعنی سینکڑوں کے حساب سے بچے ہسپتالوں میں یہاں پاکستان میں بھی پل رہے ہیں، جب اس قسم کے بچے ہوں گے، اُن کو کیا پتہ کہ ماں کون ہے؟ باپ کون ہے؟ بہن کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ وہ انہی کے ہسپتالوں میں پلیں گے، انہی کے سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے، اور تعلیم پانے کے بعد انہی کے مذہب کی اشاعت کریں گے، اور انہی کے کارکن بنیں گے، اور یہ بات وہاں عام ہے کہ ہسپتال میں

بچہ جن کر ہسپتال کے سپرد کر دیا، اور اگر کسی کی جائز اولاد ہو تو ہسپتال میں خرچ دیتے ہیں اور وہ خرچ کے ذریعے سے پلتا ہے، اگر ناجائز اولاد ہو تو حکومت سرپرستی کرتی ہے، تو یہ جو لاتعلقی ہوگئی کہ آپس میں محبت نہیں رہی اور ہمدردی نہیں رہی اس میں ان چیزوں کا بہت بڑا دخل ہے، فطری طریقے جب سے ہم نے چھوڑ دیے اُس کا اثر آخر یہی ہے کہ فطری محبت میں بھی زوال آ گیا، اور جیسے جیسے یہ چیز آتی جائے گی ویسے ویسے بات بڑھتی جائے گی۔

پرائی عورت سے دُودھ پلانے کا مسئلہ

''اگر تم ارادہ کرو دودھ پلوانے کا'' یعنی ماں دودھ نہیں پلاتی، اور ان کا مشورہ ہو گیا کہ کسی پرائی عورت سے دودھ پلوالیں، جس طرح عرب میں رواج تھا کہ بچوں کو باہر کی عورتوں کے سپرد کر دیا جاتا تھا، تو بھی کوئی حرج نہیں، ہاں البتہ یہ بات ہے کہ جو اُن کی اجرت طے کر و وہ اچھے طریقہ سے اُن کو دے دو، یہ نہ ہو کہ بچہ کو دودھ تو پلوالو اور جو دینا طے کیا تھا وہ نہ دو، اس طرح اگر اُن کی حق تلفی کرو گے تو یہ بُری بات ہے، پھر تمہیں گناہ ہو گا، جو دینا طے کیا ہے اگر وہ تم اچھے طریقے سے دیتے رہو اور پرائی عورتوں سے دودھ پلوالو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ آگے پھر وہی بات ہے کہ ''اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے''، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو یہ قوت کی گولی دی جاتی ہے، جس سے ایمان کو قوت حاصل ہونے کے بعد ان احکام پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اگر یہ تصور رکھا جائے کہ ہمارا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں، ہماری ہر ہر حالت کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اور جان رہا ہے، تو پھر انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر جرأت نہیں ہو گی۔

بیوہ کی عدّت کے متعلق اَحکام

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ: اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، اب یہ بیوہ عورت کی عدت کا مسئلہ آ گیا، کہ یہ روک کے رکھیں اپنے نفسوں کو چار ماہ دس دن، تو عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے، لیکن یہ اس عورت کے لئے ہے جو حاملہ نہ ہو، اگر حاملہ ہے تو عدت وضع حمل ہے، جب حمل وضع ہو گیا تو عدت ختم ہو گئی، چاہے گھر کے اندر اگر جنازہ پڑا ہوا ہے یعنی خاوند کے فوت ہونے کے فوراً بعد بچہ پیدا ہو گیا تو اس کی عدت ختم ہو گئی، اس کے بعد اُس کو نکاح کرنے کی اجازت ہے، حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، یعنی خاوند کے مرتے وقت عورت حاملہ تھی، جب وضع حمل ہو جائے گا تو عدت ختم ہو جائے گی، اس کا ذکر اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ طلاق میں ہے۔ اور اسی طرح یہ چار ماہ دس دن کا حکم آزاد عورت کا ہے، اگر باندی کسی کے نکاح میں ہو اور اُس کا شوہر فوت ہو جائے تو اُس کی عدتِ وفات دو ماہ پانچ دن ہے۔ ''جس وقت یہ عورتیں اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو پھر اُن پر کوئی حرج نہیں، جو چاہیں اپنے نفسوں میں تصرف کریں، لیکن یہ تصرف معروف کے مطابق ہونا چاہیے'' یعنی اگر وہ عورت عدت ختم ہونے کے بعد اپنا نکاح کرنا چاہتی ہے، اپنے کسی ہمسر خاندان میں کرنا چاہتی ہے، مہرِ مثل کے ساتھ کرنا چاہتی ہے، ایسی جگہ کرنا چاہتی ہے جہاں شرعاً نکاح کرنے کی اجازت ہے، تو تمہیں کیا ضرورت ہے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی، جو کریں ٹھیک ہے، ہاں البتہ اگر وہ عرف کے

خلاف چلیں، مثلاً عدت کے اندر نکاح کرنا چاہیں، یا ایسی جگہ نکاح کرنا چاہیں جہاں شرعاً نکاح کرنا ٹھیک نہیں ہے، پھر اگر نہیں روکو گے تو گناہ گار تم بھی ہوئے، اور اگر وہ قاعدے کے مطابق اپنے نفسوں میں تصرف کرنا چاہتی ہیں تو پھر کوئی گناہ نہیں، ''اللہ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے''۔ ہاں البتہ چار ماہ دس دن تک عورت جو فارغ ہوگئی اس مدت کے اندر اس عورت کے ساتھ تم نکاح کی صراحتاً گفتگو نہ کرو، کہ وعدہ کرلو کہ عدت ختم ہوگی تو ہم تیرے ساتھ نکاح کرلیں گے، اس قسم کی گفتگو بھی نہ کرو، اس عورت کے ساتھ تمہارا میل جول محض ہمدردی کے ساتھ ہونا چاہیے جو محض تعزیت پر مبنی ہو، کہ اُس کو صبر کی تلقین کرو، کیونکہ اس کے خاوند کے فوت ہوجانے کی وجہ سے اس پر صدمہ ہے، اس لیے اُس کے ساتھ ہمدردی کی گفتگو ہونی چاہیے، اُس کے خاوند کے فوت ہونے کے بعد فوراً نکاح اور رنگ رلیاں منانے کے پروگرام بنانا شروع کردینا یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ہاں البتہ جب ایسا موقع ہوتا ہے کہ کسی عورت کا شوہر فوت ہوجائے تو لوگوں کی توجہ ہوجاتی ہے کہ اب یہ عورت فارغ ہوگئی ہے، اور اُس کی طرف نکاح کی رغبت ہوسکتی ہے، تو اگر اشارے کنائے سے کوئی بات کہہ دو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس سے بھی انسان کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے، بس اُس کے کان میں بات ڈال دی تا کہ اُس کو پتہ چل جائے کہ یہ بھی میری طرف رغبت رکھتا ہے، بعد میں کوئی نکاح کا پیغام آئے تو وہ تجویز کرسکتی ہے کہ کون مناسب ہے۔ اشارہ کرسکتے ہو، یا دل کے اندر کسی بات کو چھپالو کہ جب اس عورت کی عدت ختم ہوجائے گی تو ہم اُس کیساتھ نکاح کریں گے، اس قسم کی بات کا کوئی حرج نہیں، البتہ صراحتاً اُن سے وعدہ لے لینا اور چپکے چپکے اُن سے اس قسم کے عہد و پیمان لینا مناسب نہیں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ

کوئی گناہ نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو عورتوں کو جبکہ تم نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

اور تم نے اُن کے لئے مہر متعین نہیں کیا، اور انہیں فائدہ پہنچایا کرو، وسعت والے پر اس کا اندازہ ہے

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اور تنگدست پر اس کا اندازہ ہے، فائدہ پہنچانا معروف طریقے سے، یہ بات لازم کردی گئی ہے خوش معاملہ لوگوں پر ۝

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ

اور اگر تم اُن عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم اُن سے مس کرو اور حال یہ ہے کہ تم نے متعین کیا ہے

لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا

اُن کے لئے مہر، پھر جو تم نے متعین کیا اُس کا نصف تمہارے ذمے ہے، مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کر دیں یا درگزر کر جائے

الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؕ

وہ شخص جس کے قبضے میں عقدِ نکاح ہے، اور تمہارا درگزر کر جانا تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۷﴾

اور نہ بھولا کرو آپس میں مہربانی کرنے کو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۲۳۷﴾

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾

نگہداشت رکھو نمازوں کی اور خاص طور پر درمیان والی نماز کی، اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے اس حال میں کہ فرمانبردار ہو ﴿۲۳۸﴾

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا

پس اگر تمہیں خوف ہو پس نماز پڑھ لیا کرو پاؤں پر کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے، پس جس وقت تم بے خوف ہو جاؤ تو یاد کیا کرو

اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ

اللہ کو جیسے کہ اللہ نے سکھایا تمہیں وہ طریقہ جو تم جانتے نہیں تھے ﴿۲۳۹﴾ اور وہ لوگ جو تم میں سے وفات دیے جاتے ہیں

وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ

اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وصیت کیا کریں اپنی بیویوں کے لئے سال تک نفع پہنچانے کی اس حال میں کہ اُن کو نکالا نہ جائے

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ

پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بارے میں جو وہ کریں اپنے نفسوں میں

مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا

معروف طریقے سے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۴۰﴾ طلاق دی ہوئی عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے معروف طریقے سے، لازم ہے

عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

اللہ سے ڈرنے والوں پر ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات تاکہ تم سوچو ﴿۲۴۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ - لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ: کوئی گناہ نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو عورتوں کو، مَا لَمۡ تَمَسُّوۡھُنَّ: جبکہ تم نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا، اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَھُنَّ فَرِیۡضَۃً: اور تم نے ان کے لئے فرض متعین نہیں کیا، نہیں متعین کیا اُن کے لئے فریضہ، فریضہ سے مہر مراد ہے۔ تَفۡرِضُوۡا کا عطف اَوۡ کی وساطت سے تَمَسُّوۡ پر ہو جائے گا، اور یہ بھی لَمۡ کے نیچے داخل ہے، یعنی مَا لَمۡ تَفۡرِضُوۡا لَھُنَّ فَرِیۡضَۃً۔ وَّمَتِّعُوۡھُنَّ: اور انہیں فائدہ پہنچایا کرو، عَلَی الۡمُوۡسِعِ قَدَرُہٗ: موسع: وسعت رکھنے والا، وسعت والے پر اس کا اندازہ ہے، وَعَلَی الۡمُقۡتِرِ قَدَرُہٗ: اور تنگدست پر اس کا اندازہ ہے، مَتَاعًۢا بِالۡمَعۡرُوۡفِ: فائدہ پہنچانا معروف طریقے سے مَتِّعُوۡا مَتَاعًا۔ حَقًّا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ: یہ بات لازم کردی گئی ہے خوش معاملہ لوگوں پر، اور محسنین سے مراد یہاں مؤمنین ہیں، کیونکہ مؤمن خوش معاملہ ہوتا ہے۔ وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡھُنَّ: اور اگر تم اُن عورتوں کو طلاق دے دو، مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡھُنَّ: قبل اس کے کہ تم اُن کو مس کرو، وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَھُنَّ فَرِیۡضَۃً: اور حال یہ ہے کہ تم نے اُن کے لیے مہر متعین کیا ہے، تم نے متعین کی ہے اُن کے لئے متعین کی ہوئی چیز، مراد یہاں مہر ہے، فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ: پھر جو تم نے متعین کیا اُس کا نصف تمہارے ذمے ہے، اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ: مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں، اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ: یا درگزر کر جائے وہ شخص جس کے قبضے میں ہے عقدِ نکاح، یعنی عقدِ نکاح کا باقی رکھنا اور توڑنا جس کے قبضے میں ہے، اس سے مراد خاوند ہے۔ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا: اس کا خطاب مردوں کو بھی ہوسکتا ہے، پھر معنی یوں ہوگا ''اے مردو! تمہارا درگزر کر جانا تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے''، اور مجموعی طور پر اہل حقوق کو بھی خطاب ہوسکتا ہے جس میں تغلیباً عورتیں بھی شامل ہوجائیں گی ''اے اہل حقوق! تمہارا درگزر کرنا تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے''، اس میں ترغیب ہوجائے گی کہ عورت کو بھی چاہئے کہ معاف کردے، اور مرد کو بھی چاہئے کہ معاف کرے، یعنی ایک دوسرے سے بڑھ کر عفو کی کوشش کرنی چاہئے، اہل حقوق جتنے بھی ہیں اُن کو چاہئے کہ اپنے حقوق سے درگزر کرنے کی کوشش کریں۔ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ: آپس میں مہربانی کرنے کو نہ بھولا کرو، آپس میں احسان کرنے کو نہ بھولا کرو، اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ: حٰفِظُوۡا امر کا صیغہ ہے محافظۃ سے، نگہداشت رکھو نمازوں کی، محافظت کیا کرو نمازوں کی، عام طور پر نمازوں کی بھی، اور خاص طور پر صلوۃِ وسطیٰ کی، وَالصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی یہ تخصیص بعد التعمیم ہے، عموم کے بعد خصوص ہے، درمیان والی نماز، بیچ والی نماز، وَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ: اور کھڑے ہوجاؤ اللہ کے لئے اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو۔ قٰنِتِیۡنَ کا معنی فرمانبردار، اور عام طور پر تفسیروں میں اس کا مفہوم ذکر کیا گیا ہے قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ سَاکِتِیۡنَ اللہ تعالیٰ کے لئے چپ کر کے کھڑے ہوا کرو، باتیں نہ کیا کرو، چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز میں کلام کی ممانعت اِسی آیت کے ساتھ ہوئی ہے، جس وقت تک یہ آیت نہیں اتری تھی اُس سے قبل لوگ نماز میں آپس میں بات بھی کرلیا کرتے تھے۔ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ: پھر اگر تمہیں خوف ہو، فَرِجَالًا اَوۡ رُکۡبَانًا: فَصَلُّوۡا رِجَالًا اَوۡ رُکۡبَانًا۔ رِجَالًا اَوۡ رُکۡبَانًا یہ صَلُّوۡا کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ رِجال راجل کی جمع ہے پاؤں پر کھڑا ہونے والا، اور

رُکبان راکب کی جمع ہے، سواری کی پشت پر سوار ہونے والا۔ پھر تم نماز پڑھا کرو پاؤں پر کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے، اس حال میں کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ہو یا اس حال میں کہ تم سواری پر چڑھے ہوئے ہو، پاؤں پر کھڑے کھڑے پڑھ لو یا سواری پر چڑھے چڑھے پڑھ لو، پاؤں پر کھڑا ہونا یہ رِجالًا کا مفہوم بیان کیا جارہا ہے، جو راجل کی جمع ہے۔ یہاں پیدل اور پیادہ والا مفہوم ہم بیان نہیں کریں گے، کیونکہ پیدل چلتے چلتے نماز پڑھنی درست نہیں ہے، جب رکوع سجدے کی گنجائش نہ ہو تو کھڑے کھڑے اشارے سے نماز پڑھی جاسکتی ہے لیکن چلتے ہوئے نہیں پڑھی جاسکتی، البتہ جب سواری پر ہوں گے سواری چل رہی ہوگی اور آپ اپنی جگہ ٹک کر بیٹھے ہوئے ہوں گے تو پھر آپ نماز پڑھ سکتے ہیں، اس لیے اس کا مفہوم یوں ذکر کرنا ہے "پس نماز پڑھ لیا کرو پاؤں پر کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے"۔ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ: پس جس وقت تم بے خوف ہو جاؤ، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ: تو پھر یاد کیا کرو اللہ کو، كَمَا عَلَّمَكُمْ: جیسے کہ اللہ نے تمہیں تعلیم دی، مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ: اس کی جو تم جانتے نہیں تھے، جیسے اللہ نے سکھایا تمہیں وہ طریقہ جو تم جانتے نہیں تھے۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ: اور وہ لوگ جو تم میں سے وفات دے دیے جاتے ہیں وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا: اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ: فَلْيُوْصُوْا وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ انہیں چاہیے کہ وصیت کیا کریں اپنی بیویوں کے لئے، مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ: سال تک نفع پہنچانے کی، غَيْرَ اِخْرَاجٍ: اس حال میں کہ اُن کو نکالا نہ جائے، اُن بیویوں کو گھروں سے نکالا نہ جائے، فَاِنْ خَرَجْنَ: پس اگر وہ خود نکل جائیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ: تو تم پر کوئی گناہ نہیں فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ: جو کچھ وہ اپنے نفسوں میں معروف طریقے سے کریں، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ: طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے متاع ہے معروف طریقے سے، ان کے لئے نفع کی چیز ہے معروف طریقے سے، یعنی ان کو فائدہ پہنچانا چاہیے، خرچ دینا چاہیے معروف طریقے سے، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ: لازم ہے متقین پر، اللہ سے ڈرنے والوں پر، یہاں بھی متقین کا مصداق مؤمنین ہیں، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سوچو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مہر کے متعلق طلاق کی صورتیں اور ان کا حکم

سلسلۂ احکام پچھلی آیات میں آپ کے سامنے آچکا، یہ رکوع بھی طلاق کے مسائل پر ہی مشتمل ہے۔ پہلی صورت جو ذکر کی جارہی ہے، کہ اگر طلاق کی نوبت ایسی حالت میں آجائے کہ نکاح کرتے وقت مہر متعین نہیں کیا، اور نکاح کے بعد عورت کے ساتھ مس کرنے کی نوبت نہیں آئی، مس کرنا جماع سے کنایہ ہے، اور خلوتِ صحیحہ بھی جماع کے حکم میں ہے، کہ جس وقت خاوند بیوی ایسی جگہ تنہا ہو جائیں کہ اگر وہ آپس میں خاص تعلق قائم کرنا چاہیں تو کوئی چیز مانع نہ ہو اس کو خلوتِ صحیحہ کہا جاتا ہے، فقہی نقطہ نظر سے

یہ جماع کے قائم مقام ہے، جیسے کہ فقہ کی کتابوں کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں جبکہ نکاح ہونے کے بعد مس کی نوبت نہیں آئی، اور نکاح کے اندر مہر بھی متعین نہیں کیا گیا، تو طلاق ہو جانے کی صورت میں عدت واجب نہیں ہوتی، اور جب مہر متعین نہیں کیا گیا تو ایسی صورت میں اِس عورت کو کچھ نفع پہنچانا ضروری ہوتا ہے، جس کی کم از کم مقدار یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑوں کا دے دیا جائے، یعنی اُس کو رخصت کرتے وقت اور اپنے سے اُس کا تعلق قطع کرتے وقت کچھ نہ کچھ احسان اور کچھ نہ کچھ اُس کے ساتھ معاملہ ایسا کرنا چاہیے، تاکہ طلاق کے ساتھ جو تلخی ہوئی ہے اُس کی کچھ تلافی ہو جائے، کم از کم ایک جوڑا دے دیا جائے، اور مرد اپنی حیثیت کے مطابق معاملہ کرے، اگر کشادہ دست ہے تو اچھی قسم کے کپڑے دے دے، اور اگر تنگ دست ہے تو گھٹیا دے دے، صرف کپڑے ضروری نہیں، کم از کم یہ ہے، اور اُس سے زائد جتنا بھی احسان کر لیا جائے بہتر ہے۔ جیسے کُتبِ تفسیر میں روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے ہی معاملے میں اپنی بیوی کو جس کو طلاق دے دی تھی، دس ہزار درہم ادا کیے،[1] تو جتنی حیثیت ہو اُس کے مطابق اُس سے معاملہ کرنا چاہیے، مقصد یہ ہے کہ اِس طلاق کے ساتھ جو جانبین کے اندر ایک تلخی سی پیدا ہو جاتی ہے رخصتی کے وقت اُس کی کچھ تلافی ہو جائے اور یہ آئندہ کے لئے عداوت اور نفرت کا ذریعہ نہ بنے، پہلی آیت کے اندر حکم یہ ذکر کیا گیا ہے...... اور اگر نکاح کرتے وقت مہر متعین کر لیا گیا تھا، لیکن مس سے قبل جدائی ہو گئی، جماع کی نوبت نہ آئی ہو اور نہ خلوتِ صحیحہ کی نوبت آئی ہو، تو ایسی صورت میں متعین کیے ہوئے مہر کا نصف دینا مرد کے ذمے ہے، آدھا مہر ادا کرنا ہوگا۔ یعنی آدھا مہر ذِمے لگ گیا، باقی! آگے دو صورتیں ہیں، اگر عورت معاف کر دے تو وہ آدھا بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا، یا مرد درگزر کر جائے اور سارا ہی دے دے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے، یہ پھر اپنی خوشی پر ہے، شرعی طور پر نصف مہر مرد کے ذمے ہے۔ اگر نکاح کے وقت کل مہر دے دیا گیا تھا تو آدھا وہ واپس لے سکتا ہے لیکن اگر درگزر کر جائے اور نہ لے تو اُس کی مرضی، اور اگر عورت نے نکاح کے وقت مہر وصول نہیں کیا تھا تو اب آدھا مہر وہ وصول کر سکتی ہے لیکن اگر معاف کر دے اور کچھ بھی نہ لے تو اس کی مرضی، یہ دونوں شقیں زوجین کے اختیار میں ہیں۔ آگے ترغیب دے دی کہ ایک دوسرے کے ساتھ عفو اور درگزر کا معاملہ کیا کرو، اگر خاوند دے چکا ہے تو اُسے چاہیے کہ درگزر کر جائے اور نصف واپس نہ لے، اور اگر عورت نے وصول نہیں کیا تو اُس کو چاہیے کہ درگزر کر جائے اور وہ آدھا بھی نہ لے، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ اِس جدائی کے وقت بھی فضل اور احسان کا معاملہ ہو، عداوت کی بنیاد نہ بنے۔ تو درگزر کرنے کی ترغیب دے دی...... دو صورتوں کا حکم تو یہ آ گیا، باقی دو صورتیں اس کے علاوہ رہ گئیں، کہ نکاح کے وقت مہر بھی متعین ہوا اور عورت کے ساتھ جماع یا خلوتِ صحیحہ کی نوبت آ گئی، تو ایسی صورت میں کل مہر مرد کے ذمے ہوتا ہے، یہ صورت بھی دوسری آیات کے اندر مذکور ہے...... چوتھی صورت یہ ہے کہ نکاح کے اندر مہر تو متعین نہیں کیا، لیکن نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ کی نوبت آ گئی تو ایسی صورت میں مرد کے ذمے مہر مثل ہے، یعنی جو مہر عورت کے خاندان کی لڑکیوں کا ہے اسی کے مطابق مہر اس لڑکی کو دیا جائے گا۔

---

(۱) آلوسی اور قرطبی میں ہے: فبعث إليها بمتعة بعشرة آلاف صدقة لها من صداقها وعشرة آلاف صدقة۔ نیز دیکھیں مظہری اور خازن وغیرہ۔

مطلقات کے متاع کا مطلب

اورآیات کے اندر جس متاع کا ذکر آرہا ہے کہ مطلقات کو متاع دیا کرو، کچھ نہ کچھ برتنے کا سامان دیا کرو، اِس کی تفصیل بھی یہی ہے کہ جس کا مہر متعین نہیں کیا گیا تھا اور طلاق قبل از وطی ہوگئی اُس کو تو جوڑا دینا ہی متاع ہے، اور یہ واجب ہے۔ اور جس کا مہر متعین ہوگیا تھا اور طلاق قبل از وطی دی گئی اُس کے لیے متاع نصف مہر ہے جو کہ لازم ہے۔ اور جس کا مہر متعین تھا اور وطی بھی ہوگئی تھی اُس کا متاع جو فرض ہے وہ یہ ہے کہ پورا مہر ادا کرو۔ اور جس کو وطی کے بعد طلاق دی لیکن مہر متعین نہیں کیا گیا تھا اُس کے لئے متاع یہ ہے کہ مہر مثل ادا کردیہ تو ہے فرض۔ اور اگر متاع سے مراد کپڑوں کا جوڑا ہی لیا جائے تو پھر پہلی قسم کی عورت کے لئے اِس کا ادا کرنا واجب ہے اور باقیوں کے لئے مستحب ہے، تو اِس متاع کی تفصیل یہ ہے، یعنی عقلاً چار ہی صورتیں ہوسکتی تھیں کہ طلاق قبل اَز وطی ہوئی یا بعد از وطی، اور مہر متعین ہے یا نہیں، اِن چاروں صورتوں کا حکم میں نے آپ کے سامنے علیحدہ علیحدہ واضح کردیا۔ تو متاع کا مصداق اگر کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک عورت کے لئے واجب اور باقیوں کے لئے مستحب ہے، اور اگر متاع سے اُس کو مطلق فائدہ پہنچانا مقصود ہو جس کے اندر مہر بھی داخل ہے، تو پھر اُس کی تفصیل یہ ہے جو آپ کے سامنے عرض کردی گئی۔

اَحکامِ طلاق کے درمیان نماز کا ذِکر کیوں؟

یہ تو آ گئی طلاق اور مہر کے متعلق بات۔ درمیان میں ایک حکم ذکر کیا جارہا ہے نمازوں کے متعلق، کہ نمازوں کی محافظت کیا کرو، محافظت کا معنی ہوتا ہے اُس کے آداب کی رعایت رکھنا، وقت پر ادا کرنا، خشوع خضوع کے ساتھ ادا کرنا، تمام آداب اور شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے نمازوں کو پڑھنا۔ اس سے پہلے بھی طلاق کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی یہی ازواج کے مسائل آپ کے سامنے آرہے ہیں، کہ معتدۃُ الوفات کے متعلق کچھ کہا جارہا ہے، کچھ مطلقات کے متعلق کہا جارہا ہے، درمیان میں نماز کا ذکر کردیا، جس وقت یہ احکام کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُس وقت بھی توحید اور توحید کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر تھا، اب یہ احکام کا سلسلہ اختتام کو پہنچ رہا ہے تو آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پھر نماز کے متعلق تاکید کردی، اور آگے جو دو حکم آئیں گے معتدۃُ الوفات کے متعلق اور عام مطلقات کے متعلق، یوں سمجھئے کہ یہ پہلے احکام کا تتمہ ہے، ورنہ سلسلۂ احکام یہاں ختم کیا جارہا ہے، اور اُس کے آخر میں نماز کی تاکید کردی، اول وآخر جب نماز کا ذکر ہوگیا تو اِس سے نماز کی اہمیت واضح ہوگئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان معاملات میں جن کے اندر جھگڑا فساد اور کشاکشی آجایا کرتی ہے، جیسے یہاں طلاق کے احکام ذکر کیے جارہے ہیں، تو اِن کو احسن طریقے سے طے تبھی کیا جاسکتا ہے جب انسان کے اندر تواضع ہو اور انسان کے اندر برداشت پیدا ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہو، اور نماز ایک ایسی چیز ہے جس کی پابندی اور محافظت کی جائے، اُس کے حقوق اور آداب کو ادا کیا جائے، تو انسان کے اندر تواضع بھی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی قوی ہوتا ہے۔ جب تواضع پیدا ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہوجائے تو پھر اہلِ حقوق کے حقوق ادا کرنے آسان ہوجاتے ہیں، تو ان جھگڑے فساد کے اندر نماز کا ذکر گویا ایک مصلح کی حیثیت سے ہے، کہ جب انسان اس کی رعایت رکھے گا، نماز پڑھے گا، تو یہ جھگڑے فساد کے معاملات جتنے بھی ہیں اِن کو تواضع کے ساتھ نہایت احسن

طریقے سے ادا کیا جاسکے گا، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جس وقت انسان کا مضبوط ہوگا، غفلت نہیں ہوگی، تو پھر ان احکام کی پابندی انسان کے لئے آسان ہوجائے گی، اس اعتبار سے اِن احکام کے درمیان میں نماز کا ذکر ایک مصلح کی حیثیت سے آگیا۔

صلوٰۃِ وسطیٰ کا خصوصیت سے ذِکر کیوں؟

محافظت علی الصلوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ صلوٰۃِ وسطیٰ کا ذکر آیا، صلوٰۃِ وسطیٰ کا لفظی معنیٰ ہے بیچ والی نماز، درمیانی نماز، وسطیٰ کا لفظ اوسط کا مؤنث ہے۔ اِس صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق کیا ہے؟ اِس میں اگرچہ اقوال متعدّد ہیں، جتنی نمازیں پڑھی جاتی ہیں سب اس کا مصداق بنائی گئی ہیں مختلف اقوال کے تحت، لیکن راجح قول جو روایاتِ صحیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے اور جمہور مفسرین نے جس کو ترجیح دی ہے وہ یہی ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق عصر کی نماز ہے۔ عصر کی نماز کو صلوٰۃِ وسطیٰ اس لیے کہہ دیا کہ اس میں دو نمازیں تو ایک طرف دن کی آجاتی ہیں فجر اور ظہر، اور دو نمازیں رات کی آجاتی ہیں مغرب اور عشاء، اور یہ نماز دن کے اختتام پر ہے، اور یہ ہر کسی کی انتہائی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے، کہ کاشتکار لوگ، زمینوں میں کام کرنے والے، وہ بھی جس وقت دن کو ختم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو کام کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، اور بازاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ تجارت کرنے والے، وہ بھی اسی طرح سے شام کا وقت آجاتا ہے تو اپنے حساب کتاب کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جو مسافر چلے جارہے ہوتے ہیں تو چونکہ دن غروب ہونے والا ہوتا ہے تو وہ بھی اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ جو دن کا آخری حصہ ہے جو رات کے آنے سے پہلے ہوا کرتا ہے، اِس میں ہر شخص اپنے کام کو سمیٹ کر اطمینان اور سکون کی زندگی اختیار کرنے کے لئے گھروں کی طرف بھاگتا ہے، تو ایسے وقت میں نماز میں غفلت ہوجاتی ہے، جس کی بناء پر خصوصیت سے تاکید کردی، کہ اس نماز کا خیال رکھا کرو۔ سرورِ کائنات ﷺ جس وقت غزوۂ احزاب میں مشغول تھے تو ایک دن کچھ مشرکین کی طرف سے ایسی چھیڑ چھاڑ جاری رہی کہ آپ عصر کی نماز نہیں پڑھ سکے، عصر کی نماز آپ کی قضاء ہوگئی، تو آپ ﷺ نے اس وقت مشرکین کے لئے بددعا کی، بخاری شریف میں روایت آتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اِن کی قبور کو اور ان کے بیوت کو آگ سے بھر دے، انہوں نے ہمیں صلوٰۃِ وسطیٰ سے روک دیا، صلوٰۃِ وسطیٰ نہیں پڑھنے دی،[1] اور وہ عصر کی نماز قضا ہوئی تھی، اس روایت کی طرف دیکھتے ہوئے راجح یہ ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق صلوٰۃِ عصر ہی ہے، اور اس کی مزید تاکید کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔

خوف کی حالت میں نماز کا حکم اور اُس کا طریقہ

اور پھر ایک محافظت یہ ہے کہ اوقات کا خیال کرو، آداب کا خیال کرو، اچھی طرح سے پڑھو امن کی حالت میں، وہ تو طریقہ یہی ہے جس طرح آپ نماز پڑھتے ہیں۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان لڑائی کے اندر مشغول ہو، اور اطمینان کے ساتھ نماز نہ پڑھی جاسکے، تو اس آیت کے اندر یہ کہا جارہا ہے کہ نماز کو قضا نہیں کرنا، اگر تم باقاعدہ رکوع سجدے کے ساتھ نماز نہیں پڑھ

---

(١) بخاری ١/١٠٣١ باب الدعاء علی المشرکین۔ ولفظه: مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوتَهُمْ وَقُبُورَهُمْ نَارًا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطَى حَتَّى غَابَتِ الشَّمْسُ.

سکتے تو کھڑے کھڑے ہی اشارے کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرو، چاہے قبلہ کی طرف منہ ہو چاہے نہ ہو۔ اگر دشمن کے ساتھ مشغولیت ایسی ہوگئی، مثال کے طور پر ہمارا دشمن ہمارے سامنے کھڑا ہے، اور وہ ہے مشرق کی جانب ہے، اب ہم اگر نماز پڑھنے کے لئے مغرب کی طرف منہ کریں گے تو پیچھے سے حملے کا اندیشہ ہے، کہ دشمن ہمیں نقصان پہنچادے گا، تو آپ مشرق کی طرف منہ کر لیجئے۔ اور اسی طرح رکوع سجدہ کرتے ہوئے اگر خطرہ ہے کہ وہ حملہ کر دے گا، ہماری اس حالت سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو رکوع سجدہ نہ کرو، اشارے کے ساتھ نماز پڑھ لو، تاکہ دشمن کے سامنے ڈٹے رہو اور کھڑے رہو، قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی ضروری نہیں۔ اور اگر سواریوں پر چڑھے ہوئے ہو تو سواری پر چڑھے ہوئے بھی اشارے کے ساتھ نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

حجیتِ حدیث پر دلیل

اور جب امن کی حالت ہو جائے اور خوف زائل ہو جائے تو پھر قرآن کہتا ہے کہ نماز اسی طرح سے پڑھو (یہاں فَاذْكُرُوا اللهَ سے نماز کا پڑھنا مراد ہے) نماز اُسی طرح سے پڑھو جیسے اللہ نے تمہیں سکھائی۔ اب اِس میں خیال فرمالیجئے! نماز پڑھنے کا حکم تو قرآن میں آیا ہوا ہے، کہ نماز کو قائم کرو، نماز کا خیال رکھو، نماز پر مداومت اختیار کرو، لیکن یہ پڑھنی کس طرح ہے؟ اِس کی تفصیل قرآنِ کریم میں نہیں ہے، یہ تفصیل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال اور اپنے افعال کے ساتھ ہمیں سکھائی ہے، تو یہاں جو اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی نسبت اپنی طرف کی ہے کہ جیسے اللہ نے تمہیں تعلیم دی ویسے نماز پڑھا کرو، اِس سے مراد تعلیم نبوی ہے، کیونکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے، جب معلم بنا کر بھیجا ہے تو اس کتاب کی جو تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے بالواسطہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ کی ہی ہے، تو یہاں پھر مطلب یہ ہوگا کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں نماز پڑھنی سکھائی ہے، پڑھ کر دکھائی ہے، اور پڑھنے کے متعلق بتلایا ہے، اس طرح سے پڑھو جس وقت کہ تمہیں اطمینان کی کیفیت حاصل ہو جائے۔

بیوہ کو ایک سال تک گھر میں رکھنے کی وصیت کا حکم

نماز کی تاکید اور اِن چند احکام کے بعد پھر آگے مسئلہ آ گیا کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے اور اس کی بیوی پیچھے موجود ہے، (اُس وقت تک میراث کے احکام کی تفصیل نہیں آئی تھی) تو حکم یہ دیا کہ اپنے پچھلوں کو وصیت کر جایا کرو کہ میری بیوی کو سال تک میرے گھر میں رہنے دینا اور اِس کو نان نفقہ دیتے رہنا۔ عدت تو چار مہینے دس دن متعین ہوگئی لیکن اس کو گھر رہنے کی اجازت ایک سال کے لئے وصیت کے ذریعے سے ہوگئی، تو چار مہینے دس دن کے اندر تو اُس کو گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے، یہ تو شرعی حق ہے، اور اگر چار مہینے دس دن کے بعد وہ از خود جانا چاہے تو تمہیں روکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر وہ شریعت کے مطابق اپنے نفس کے اندر کوئی تصرف کر سکتی ہے تو تم نہ روکو، تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، ہاں البتہ اگر وہ چار مہینے دس دن کے اندر نکلنا چاہتی ہے، یا عدت پوری ہونے سے قبل نکاح کرنا چاہتی ہے، پھر جو لوگ روک سکتے ہیں اگر نہیں روکیں گے تو وہ بھی گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ اور آخری آیت کے اندر پھر وہی ذکر کر دیا کہ مطلقات کو کچھ نہ کچھ متاع دیا کرو، کچھ فائدہ پہنچایا کرو، جس کی تفصیل وہی ہے جو آپ کی

خدمت میں عرض کردی گئی۔ یہ عام مطلقات کے متعلق ذکر آگیا، تو اُس میں ایک ہے فرض درجے کا متاع، جو عورت کو دینا ضروری ہے، اور ایک ہے مستحب۔ مستحب وہی ہے کپڑوں کا جوڑا، اور اسی طرح مہر کے علاوہ کوئی اور سامان اُس کو دے دینا، یا اس کے اوپر احسان کردینا، اس کا ادا کرنا مستحب ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جو نکلے اپنے گھروں سے حالانکہ وہ ہزاروں تھے موت سے ڈر کر

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کہہ دیا تم مر جاؤ، پھر اللہ نے اُنہیں زندہ کیا، بیشک اللہ تعالیٰ مہربانی والا ہے لوگوں پر

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

لیکن اکثر لوگ قدر نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستے میں لڑو اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۚ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ

کون ہے وہ شخص جو قرض دے اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض، پھر زیادہ کردے اللہ تعالیٰ اُس قرض کو اس کے لئے کئی گنا، اللہ تنگ کرتا ہے

وَيَبْصُۜطُ ۖ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ

اور کشادہ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کی طرف

مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ إِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ قَالَ

موسیٰ علیہ السلام کے بعد، جب کہا اُنہوں نے اپنے نبی کو کہ مقرر کر ہمارے لیے ایک بادشاہ، لڑیں گے ہم اللہ کے راستے میں، اس نے کہا

هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوْا ۖ قَالُوْا وَمَا لَنَآ أَلَّا

کیا تم اس بات کے قریب ہو کہ تم لڑو گے نہیں؟ اگر فرض کردیا گیا تمہارے اُوپر لڑنا، وہ کہنے لگے کیا ہو گیا ہمیں کہ ہم نہیں

نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ

لڑیں گے اللہ کے راستے میں، حالانکہ نکال دیے گئے ہم اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے، پس جب اُن پر لڑنا فرض کردیا گیا

تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

تو وہ پیٹھ پھیر گئے مگر اُن میں سے تھوڑے سے، اللہ تعالیٰ ظالموں کو جاننے والا ہے ﴿۲۴۶﴾ اور کہا انہیں اُن کے نبی نے کہ بیشک اللہ تعالیٰ

قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ

نے متعین کیا ہے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ، وہ کہنے لگے کہ کیونکر ہوگی اس کے لئے حکومت ہم پر اور ہم زیادہ حق رکھنے والے ہیں

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ

سلطنت کا بمقابلہ اُس کے، اور حال یہ ہے کہ وہ مال کی وسعت نہیں دیا گیا، اُس نبی نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ نے چنا ہے اُس کو

عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ

تم پر، اور زیادہ کیا ہے اُس کو از روئے کشادگی کے علم میں اور جسم میں، اللہ تعالیٰ دیتا ہے اپنا ملک

مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖۤ

جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے ﴿۲۴۷﴾ اور کہا انہیں اُن کے نبی نے کہ بیشک اس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے

اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

کہ آجائے گا تمہارے پاس صندوق، اُس میں اطمینان ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جن کو چھوڑا

اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ

موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے، اٹھا لائیں گے اُس تابوت کو فرشتے، اس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لیے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ

اگر تم یقین کرنے والے ہو ﴿۲۴۸﴾ جب جدا ہوئے طالوت لشکر لے کر تو کہا بیشک اللہ تعالیٰ

مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ

آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر کے ذریعے سے، پس جس شخص نے اس نہر میں سے پی لیا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے، اور جو اس میں سے

فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا

نہیں چکھے گا پس بیشک وہ مجھ سے ہے، مگر جو شخص اپنے ہاتھ کے ساتھ چلو بھر لے، پس پیا انہوں نے اس نہر سے مگر ان میں

مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا

سے تھوڑے، جب طالوت اور جو ایمان لانے والے اُس کے ساتھ تھے اس نہر سے گزر گئے تو کہنے لگے کہ نہیں ہے طاقت ہمارے لیے

الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا

آج جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے کی، کہا اُن لوگوں نے جو اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ ملنے والے ہیں

اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

اللہ تعالیٰ سے، کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آ گئیں بڑی جماعت پر اللہ کے حکم کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

مستقل مزاج والوں کے ساتھ ہیں ﴿۲۴۹﴾ جب یہ سامنے آئے جالوت اور اُس کے لشکروں کے تو کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ڈال ہمارے اُوپر

صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ؕ فَهَزَمُوْهُمْ

صبر اور ہمارے قدم جما دے اور کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد کر ﴿۲۵۰﴾ پس انہوں نے شکست دے دی ان جالوتیوں کو

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ

اللہ کے اذن کے ساتھ، اور داؤد علیہ السلام نے قتل کردیا جالوت کو، اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت دی اور حکمت دی

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ

اور تعلیم دی اُس کو ان باتوں کی جو چاہا، اگر نہ ہو اللہ تعالیٰ کا دفع کرنا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعے سے،

لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

تو یہ زمین خراب ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ مہربانی والا ہے لوگوں پر ﴿۲۵۱﴾

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم پڑھتے ہیں ان آیات کو آپ پر ٹھیک ٹھیک، اور بیشک آپ البتہ رسولوں میں سے ہیں ﴿۲۵۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ: اَلَمْ تَرَ کا خطاب عام ہے، ہر مخاطب کو کہا جا رہا ہے۔

اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا۔ ''اے مخاطب'' کا لفظ جو بولا جاتا ہے یہ عموم پیدا کرنے کے لئے ہے۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو نکلے اپنے گھروں سے وَهُمْ اُلُوْفٌ: اُلوف اَلف کی جمع بمعنی ہزار، حالانکہ وہ ہزاروں تھے، حَذَرَ الْمَوْتِ: خَرَجُوْا حَذَرَ الْمَوْتِ موت سے ڈر کر، موت سے بچنے کے لئے، یہ خَرَجُوْا کا مفعول لہ ہے، فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا: پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں کہہ دیا کہ تم مرجاؤ، یہ حکم تکوینی ہے، جس کے بعد اِس کا وقوع ضروری ہوتا ہے، اس لیے مُوْتُوْا کے بعد لفظ محذوف ہوگا فَمَاتُوْا، جیسے کہ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اس پر قرینہ ہے، پھر اللہ نے انہیں کہہ دیا تم مرجاؤ، وہ مر گئے، پھر اللہ نے انہیں زندہ کیا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ: بیشک اللہ تعالیٰ مہربانی والا ہے لوگوں پر، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ: لیکن اکثر لوگ قدر نہیں کرتے، شکر کا اصل معنی ہوتا ہے قدر دانی۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: واؤ کو اگر عاطفہ بنالیا جائے تو اِس کا معطوف علیہ نکالا جاسکتا ہے تَفَكَّرُوْا فِيْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِس قصہ میں، اس واقعہ میں غور کرو اور اللہ کے راستے میں لڑو، غور کرنے کی دعوت اس لئے دی گئی کہ میدان سے بھاگ کر انسان بچ نہیں سکتا، موت جہاں آنی ہے آنی ہے، اس لیے موت کے ڈر سے جہاد نہ چھوڑ و، اور اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو، یوں مناسبت ہوجائے گی دونوں باتوں میں۔ اس واقعہ میں غور کرو، تفکر کرو، اور اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو، وَاعْلَمُوْا: اور یقین کرلو، اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: کون ہے وہ شخص جو قرض دے اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض، فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ: پھر بڑھائے اللہ تعالیٰ اُس قرض کو اُس کے لئے اَضْعَافًا كَثِيْرَةً: اضعافاً ضِعف کی جمع ہے، مِثل کے معنی میں، اَضْعَافًا كَثِيْرَةً: بہت ساری مثلیں، اَمْثَالًا كثيرةً، یعنی اس قرض کے امثالِ کثیرہ اللہ تعالیٰ بڑھا دے، جس کا مفہوم ہم اپنی زبان میں ادا کریں گے ''پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے کئی گنا زیادہ کردے، بہت گنا زیادہ کردے''، وَاللّٰهُ يَقْبِضُ: اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے، وَيَبْصُۜطُ: اور کشادہ کرتا ہے۔ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ دونوں کا مفعول محذوف ہے، والله يقبض الرزق ويبسط الرزق اللہ تعالیٰ روزی تنگ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ روزی کشادہ کرتا ہے، وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا نہیں بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کی طرف، مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى: موسیٰ علیہ السلام کے بعد، اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ: جب کہا اُن اسرائیلوں نے اپنے وقت کے نبی کو، جو اُس وقت نبی موجود تھا، جس کا نام روایاتِ تفسیر میں صَمُوْئِیل یا اَصْمُوَئِیل علیہ السلام ہے، جب کہا انہوں نے اپنے نبی کو، ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا: بَعَثَ يَبْعَثُ: اُٹھانا، یہاں مقرر کرنے کے معنی میں ہے، مقرر کر ہمارے لیے ایک بادشاہ، نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: نُقَاتِلْ یہ ابْعَثْ کا جواب ہے، یعنی جب آپ ہمارے لئے بادشاہ متعین کردیں گے تو ہم اللہ کے راستے میں لڑیں گے، مختصر مفہوم اِن الفاظ میں ادا کیا جائے گا ''متعین کر تو ہمارے لئے بادشاہ کہ لڑیں ہم اللہ کے راستے میں'' یعنی اُس بادشاہ کی قیادت میں، قَالَ: اس نبی نے کہا هَلْ عَسَيْتُمْ: کیا قریب ہو تم، یعنی تم سے یہ توقع ہے؟ تم سے یہ احتمال ہے؟ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ: اگر فرض کردیا گیا تمہارے اوپر لڑنا، هَلْ عَسَيْتُمْ اَلَّا تُقَاتِلُوْا: کیا تم اس بات کے قریب ہو کہ تم لڑو گے نہیں؟ کیا اِس بات کا احتمال ہے کہ تم لڑو گے نہیں؟ اگر تم پر لڑنا فرض کردیا گیا۔ اَلَّا تُقَاتِلُوْا یہ عَسَيْتُمْ کی خبر ہے، عَسَيْتُمْ افعالِ مقاربہ میں سے ہے۔ قَالُوْا: وہ اسرائیلی کہنے لگے، وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ: کیا ہوگیا ہمیں کہ ہم نہیں لڑیں گے اللہ کے راستے میں، حالانکہ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا: نکال دیے گئے ہم اپنے گھروں سے وَاَبْنَآئِنَا: اور اپنے بیٹوں سے۔ اَبْنَآئِنَا سے پہلے اس کی مناسبت سے فعل نکال لیا جائے

گا، ”نکال دیے گئے ہم اپنے گھروں سے اور جدا کر دیے گئے ہم اپنے بیٹوں سے“، ہماری اولاد گرفتار ہوگئی ہمارے پاس نہیں رہی، ہمارے مکان ہم سے چھن گئے، جب یہ داعیہ موجود ہے تو ہم کیوں نہیں لڑیں گے۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ: جب ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: تو وہ پیٹھ پھیر گئے مگر ان میں سے کچھ تھوڑے سے، یہ لفظی ترجمہ ہے۔ اور ”اُن میں سے کچھ لوگوں کے علاوہ باقی سب پیٹھ پھیر گئے“ یہ بامحاورہ ترجمہ ہوگیا، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالموں کو جاننے والا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ: اور کہا انہیں ان کے نبی نے اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا: بیشک اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے تمہارے لئے طالوت بادشاہ۔ طالوت نام ہے۔ طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ متعین کیا ہے۔ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا: وہ کہنے لگے کہ کیونکر ہوگی اُس کے لئے حکومت ہم پر، وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ: اور ہم زیادہ حق رکھنے والے ہیں سلطنت کا، مِنْهُ: بمقابلہ اس کے، یعنی طالوت کے مقابلے میں ہم سلطنت کا حق زیادہ رکھتے ہیں، اس کو ہم پر سلطنت کس طرح سے ہوگی، وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ: اور حال یہ ہے کہ وہ مال کی وسعت نہیں دیا گیا۔ سَعَةٌ وَسِعَ سے، اصل میں واؤ ہے، مثال واوی ہے، جیسے وَهَبَ سے هِبَةٌ اور وَعَدَ سے عِدَةٌ آجاتا ہے، اسی طرح سَعَةٌ وَسِعَ يَسَعُ سے ہے، ”نہیں دیا گیا وہ مال کی وسعت“، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ: اُس نبی نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے چنا ہے اِس طالوت کو تم پر، وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ: اور زیادہ کیا ہے اُس کو از روئے کشادگی کے علم میں اور جسم میں، علم وجسم میں وسعت کے اعتبار سے وہ زیادہ ہے، علم سے یہاں علم سیاست مراد ہے، جنگ وجدال کا علم، ملکی انتظامات کا علم، وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ: اللہ تعالیٰ دیتا ہے اپنا ملک جس کو چاہتا ہے، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ: اور کہا انہیں اُن کے نبی نے، بیشک اِس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ: کہ آجائے گا تمہارے پاس صندوق، فِيْهِ سَكِيْنَةٌ: اُس میں سکون ہے، اطمینان ہے، مِّنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے ربّ کی طرف سے وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ: اور بچی ہوئی چیزیں ہیں اُن میں سے جن کو چھوڑا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلقین نے، مفسرین کہتے ہیں کہ آل کا لفظ یہاں مقحم (زائد) ہے، مطلب یہ ہوگا کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام جو چیزیں چھوڑ گئے ہیں اُن میں سے کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں، یعنی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے تبرکات اُس صندوق میں ہیں۔ اور مِمَّا تَرَكَ میں جو مِن ہے یہ بَقِيَّةٌ کا بیان ہے، کچھ بچی ہوئی چیزیں جو اُن چیزوں میں سے ہیں جن کو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں، تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ: اٹھالائیں گے اس تابوت کو فرشتے، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ: اِس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ: جس وقت جدا ہوئے، یعنی اپنے شہر سے نکلے لڑائی کے لئے، جب جدا ہوئے طالوت لشکر لے کر، جنود جند کی جمع، جند لشکر کو کہتے ہیں، لشکروں کے ساتھ جب طالوت باہر نکلا، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ: کہا طالوت نے بیشک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر کے ذریعے سے، فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ: پس جس شخص نے اُس نہر میں سے پی لیا، فَلَيْسَ مِنِّيْ: وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے، یعنی وہ میرے ساتھ جہاد پر نہیں جاسکے گا، وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ: اور جو اُس میں سے نہیں چکھے گا پس بیشک وہ مجھ سے ہے، یعنی میری جماعت سے ہے، میری جماعت میں شامل رہے گا، اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ: غرفہ مقدار کے لئے ہے، جو ایک دفعہ چلّو بھرنے کی مقدار ہے، ”لیکن جو شخص اپنے ہاتھ کے ساتھ چلّو بھرلے وہ بھی میرے ساتھ رہے گا“، اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ کا تعلق فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ کے ساتھ ہے، جو اُس نہر میں سے

پی لے گا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے، مگر جو اپنے ایک ہاتھ سے چلو بھر لے وہ میری جماعت میں سے ہے، یعنی وہ میرے ساتھ رہے گا، لیکن اِس کو جدا کر کے اس لیے بیان کر دیا کہ اِس میں تین درجے نکلیں گے، کہ جو پیٹ بھر کر پی لیں گے وہ تو بالکل علیحدہ، اور جو بالکل نہیں چکھیں گے وہ سب سے کامل، اور یہ درمیانہ طبقہ ہوگا جو زیادہ سے زیادہ ایک چلو بھر کر پی لیں، کہ نہ تو وہ اُن کی طرح پیچھے چھوڑ دیے جائیں گے جنہوں نے پیٹ بھر کر پی لیا، اور نہ ان کا وہ مرتبہ ہوگا جنہوں نے بالکل نہیں چکھا، یہ رخصت کا درجہ ہے، یعنی ایک چلو بھر کر پی سکتے ہیں۔ فَشَرِبُوْا مِنْهُ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: اُن میں سے کچھ لوگوں کے علاوہ (یہ "علاوہ" إِلَّا کا ترجمہ کر رہا ہوں) سب نے اُس نہر سے پانی پی لیا، فَشَرِبُوْا مِنْهُ: پس پیا اُنہوں نے اُس نہر سے، إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: مگر ان میں سے کچھ لوگ، یعنی کچھ لوگ بچے، باقی سب نے اُس نہر سے پانی پی لیا۔ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: هُوَ ضمیر منفصل ہے، جَاوَزَ کی ضمیر پر اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ کا عطف ڈالنے کے لئے، کیونکہ ضمیر مرفوع متصل پر عطف ڈالا جائے تو اس کو پہلے ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ مؤکد کیا جاتا ہے، جیسے جِئْتُ اَنَا وَزَيْدٌ۔ جس وقت طالوت اُس نہر سے گزر گئے، وہ خود بھی اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لانے والے تھے، جو ایمان لانے والے اس کے ساتھ تھے، قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ: کہنے لگے، نہیں ہے طاقت ہمارے لئے آج، بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ: جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے کی، باء مقابلے کے لئے ہے، جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں۔ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ: کہا ان لوگوں نے جو اس بات کا خیال رکھتے تھے، اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ: کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں، یعنی جن کا آخرت کے متعلق عقیدہ پختہ تھا، کامل درجے کے مؤمن تھے، قَالَ کا مقولہ یہ ہے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ: مِّنْ فِئَةٍ تمیز ہے، کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آگئیں بڑی جماعت پر اللہ کے حکم کے ساتھ، وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ مستقل مزاجوں کے ساتھ ہے، ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، صبر کا مفہوم ہے استقلال۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ: بَرَزَ: باہر نکلنا، جب یہ میدان میں نکلے، سامنے آئے جالوت اور اس کے لشکروں کے، قَالُوْا: کہنے لگے رَبَّنَآ: اے ہمارے پروردگار! اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا: ڈال ہمارے اوپر صبر، ہمیں صبر کی توفیق دے، وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا: اور ہمارے قدم جمادے، وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: اور کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد کر۔ فَهَزَمُوْهُمْ: پھر انہوں نے شکست دے دی اُن جالوتیوں کو، بِاِذْنِ اللّٰهِ: اللہ کے اذن کے ساتھ۔ ہزموا کی ضمیر طالوتیوں کی طرف لوٹ گئی، جو طالوت کے ساتھ آئے تھے، اور هُمْ ضمیر جالوت اور اس کے لشکروں کی طرف ہے۔ ان طالوتیوں نے ان جالوتیوں کو شکست دے دی اللہ کے حکم کے ساتھ۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ: اور داؤد علیہ السلام نے قتل کر دیا جالوت کو، داؤد سے داؤد نبی مراد ہیں جو اُس وقت تک پیغمبر نہیں ہوئے تھے، اور طالوت کے ساتھ اس لشکر میں تھے، وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ: اور اللہ تعالیٰ نے اُس داؤد کو سلطنت دی اور حکمت دی، وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ: اور تعلیم دی اُس کو ان باتوں کی جو چاہا، جو اللہ نے چاہا اُن میں سے باتوں کی تعلیم دی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ: اگر نہ ہو اللہ تعالیٰ کا دفع کرنا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعے سے، لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ: البتہ خراب ہو جائے زمین، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: لیکن اللہ تعالیٰ مہربانی والے ہیں جہانوں پر، پہلے بعض سے شریر مراد ہیں، فسادی لوگ، اور دوسرے بعض سے صالحین مراد ہیں، اگر اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کو نیک لوگوں کے ذریعے سے دفع نہ کرے تو یہ زمین خراب ہو جائے، شرارت ہی شرارت پھیل جائے، لیکن

اللہ تعالیٰ مہربانی والا ہے لوگوں پر۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ: یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم پڑھتے ہیں ان آیات کو آپ پر ٹھیک ٹھیک، وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بیشک آپ البتہ رسولوں میں سے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

موت سے ڈر کر جہاد نہ کرنا عقیدۂ تقدیر کے منافی ہے

یہاں سے انفاق فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ تیسرے پارے میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا ذکر آئے گا، مختلف طریقوں سے اس کی ترغیب دی جائے گی، اور یہاں ابتداء میں انفاق اور قتال دونوں کو ذکر کیا ہوا ہے، اور پھر ایک واقعہ کے ذریعہ سے قتال پر برانگیختہ کیا ہوا ہے اور جہاد کی ترغیب دی ہوئی ہے۔ پہلی بات جو بطور تمہید کے ذکر کی گئی اُس کا حاصل یہ ہے کہ ترکِ جہاد میں بسا اوقات یہ چیز دخیل ہوتی ہے کہ انسان موت سے ڈرتا ہے، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم جہاد میں جائیں گے تو وہاں قتل ہو جائیں گے، مر جائیں گے، اور اگر گھروں میں چھپ کے بیٹھے رہیں گے تو بچ جائیں گے، اور یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کے بیان کردہ عقیدۂ تقدیر کے خلاف ہے، اہل ایمان کو جو بنیادی عقیدے سکھائے گئے ہیں اُن میں اِس عقیدے کو اہمیت حاصل ہے کہ موت کا وقت متعین ہے، چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب القدر میں آپ پڑھیں گے کہ روح ڈالنے سے قبل اللہ تبارک وتعالیٰ جو فیصلے بچے پر ثبت کرتے اور لکھواتے ہیں، اُن میں سے ایک فیصلہ یہ بھی ہے کہ اس کی عمر کتنی ہے، یہ کب مرے گا۔[1] تو موت کا وقت انسان کے اندر روح ڈالنے سے پہلے ہی متعین کر دیا جاتا ہے، موت اپنے وقت سے نہ آگے ہو سکتی ہے نہ پیچھے ہو سکتی ہے، جیسے ایک جگہ فرمایا اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (سورۂ نساء: ۷۸) تم چونا گچ قلعوں کے اندر بھی اگر بند ہو گئے تو بھی تمہیں موت پالے گی، جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں پہنچ جائے گی، موت سے انسان نہیں بچ سکتا۔ جب یہ عقیدہ ہے تو پھر یہ سوچنا کہ اگر ہم لڑائی میں جائیں گے تو مر جائیں گے اور گھر بیٹھے رہیں گے تو بچ جائیں گے، یہ بری بات ہے اور اس عقیدے کے خلاف ہے۔

موت سے ڈر کر بھاگنے والے اسرائیلیوں کا واقعہ

اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، اور اُس واقعہ کے ضمن میں یہی عقیدہ سمجھاتے ہیں۔ جس واقعہ کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے یہ بنی اسرائیل کا واقعہ ہے، تفسیروں کے اندر اِس کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے، ایک تو یہ ہے کہ ایک وقت میں اسرائیلیوں کے کسی شہر پر کوئی وبا پھوٹی، جیسے طاعون پھیل جاتی ہے جس میں کثرت کے ساتھ موتیں واقع ہوتی ہیں، اِس وبا سے

---

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۲۰ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ، باب الایمان بالقدر، فصل اول / بخاری ۱/ ۴۵۶، باب ذکر الملائکہ۔ ولفظ البخاری: وَيُقَالُ لَهُ اكْتُبْ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ۔

بچنے کے لئے ڈر کر اسرائیلی ہزاروں کی تعداد میں شہر سے نکل گئے اور باہر جا کر جنگل میں آباد ہو گئے، اِس خیال سے کہ اگر ہم شہر کے اندر رہیں گے تو اِس وبا کے اثر سے مرجائیں گے، تو موت سے بچنے کے لئے وہاں سے نکل بھاگے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو یہ سبق سکھانا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف بھاگ کر جانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں ہے، حکم دے دیا مُوْتُوْا، اور اللہ کا حکم آنا ہی تھا کہ سب پر موت طاری ہوگئی، کچھ دیر کے بعد اُس زمانے کے جو پیغمبر تھے جن کا نام حزقیل علیہ السلام لکھا ہے، انہوں نے دُعا کی کہ اے اللہ! انہیں دوبارہ زندگی دے، یہ جو تُو نے اِن کو تنبیہ کی ہے اب کافی ہوگئی، اُن کی دُعا کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی دے دی۔ تو یہ نمونہ دکھا دیا کہ موت اور حیات دونوں ہی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب مارنا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا، اور جب زندگی دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اِس واقعے کے ذریعے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس عقیدے کا مشاہدہ کرا دیا، آنکھوں کے سامنے دکھا دیا، کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، موت سے بھاگ کر کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہ واقعہ اُن کے لئے فضل بایں معنیٰ تھا کہ اُن کو دوبارہ زندگی مل گئی، اور اس واقعہ کا بیان کرنا ہمارے لیے اللہ کا فضل بایں معنیٰ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمارے عقیدے کی اصلاح ہوگئی، تو چاہیے کہ اس عقیدے کی قدر کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں یہ نہ سوچا جائے کہ شاید ہم اِس طرح سے کریں گے تو مرجائیں گے، کیونکہ مرنے کا وقت متعین ہے، مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ کا حکم جس وقت آجائے بازی لگا دے، باقی! موت تو بہرحال آنی ہے، اگر اِس میدان میں نہیں جاؤ گے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ اگر جاتے تو مرجاتے اور تمہاری زندگی ختم ہو جاتی اور اب تمہاری حیات باقی ہے، ایسی بات نہیں ہے۔

موت سے ڈرنا نفاق کی علامت ہے

چنانچہ جب غزوۂ اُحد کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں آپ کے سامنے آئے گا، وہاں بھی منافقوں کی کلام نقل کی جائے گی، اللہ تعالیٰ وہاں بھی جواب کچھ اسی انداز سے دیں گے، منافق جو جہاد میں شریک نہیں ہوئے تھے، جب اُن کے قبیلے کے لوگ میدانِ جہاد میں شہید ہو گئے تو اُس وقت منافقوں نے کہا تھا کہ لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا: اگر یہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ کیے جاتے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کو جواب دیا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۂ آلِ عمران: ۱۶۸) کہ اگر تمہاری تدبیر پر چلنے سے کوئی شخص موت سے بچ سکتا ہے تو ذرا اپنے آپ کو تو بچا کے دکھا دو، جس وقت تمہارا وقت آجائے گا اور تم مرنے لگو گے اُس وقت تم ذرا تدبیروں پر عمل کر کے اپنے سے موت کو ہٹا کر دکھانا اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اگر تم اپنی جانیں نہیں بچا سکتے، جب موت آئے گی اُس وقت تمہاری جانیں نکال لی جائیں گی اور ایک سانس بھی تمہیں زائد لینے کا موقع نہیں ہوگا، پھر یہ تم کیسے کہتے ہو کہ ہماری تدبیر پر چلنے سے انسان موت سے بچ جائے گا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا فرمان

یہی بات ہے جس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی زندگی کے آخری حصے میں لوگوں کے سامنے واضح کیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ یہ ایمان لانے کے بعد اسلامی فوجوں کے سپہ سالار رہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی

میں بھی، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ابتدائی زندگی میں بھی، بہت علاقے اِن کی وساطت سے فتح ہوئے ہیں، بہت کامیاب سپہ سالار تھے، حضور ﷺ نے اِن کو سیفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللہ کا خطاب دیا، کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے،(۱) اس لیے ''سیف اللہ'' ان کا لقب ہے، تعجب کی بات ہے کہ اِن کا انتقال میدانِ جہاد میں نہیں ہوا، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اِن کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا تھا، پھر کچھ عرصے کے بعد اِن کو واپس آنے کا حکم دے دیا تھا، تو یہ مدینہ منورہ میں آ گئے تھے، اور اِن کا انتقال گھر میں ہوا ہے۔(۲) اور آخر وقت میں فرماتے تھے کہ میرے بدن کا ایک بالشت حصہ خالی نہیں ہے جس میں تیر یا نیزے یا کسی دوسری چیز کے زخم کا نشان نہ ہو، میرا سارا بدن چھلنی ہے، ساری زندگی میں نے جہاد میں گزار دی، لیکن آج میں اونٹ کی طرح گھر میں ایڑیاں رگڑ کے جان دے رہا ہوں، فَلَا نَامَتْ اَعْیُنُ الْجُبَنَاءِ (ابن کثیر) بزدلوں کی آنکھوں کو نیند نہ آئے، یعنی اللہ کرے کہ اُن کی آنکھیں کھل جائیں، میرا حال دیکھ کر اُن کو عبرت ہو جائے کہ میدانِ جہاد میں جانا کوئی مرنے کا باعث نہیں، اگر لڑائی میں شرکت کرنا موت کا باعث ہوتا تو خالد بن ولید کسی میدان میں جان دیتا، لڑتا ساری زندگی رہا، زخمی سارا بدن ہو گیا، لیکن موت گھر میں آ رہی ہے۔ تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی واقعہ ذکر کر کے فرمایا کہ اِس کے اندر غور کرو، غور کرنے کے بعد اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو، تاکہ تمہارا یہ عقیدہ مضبوط ہو جائے کہ لڑنے سے بھاگنا زندگی بچانے کا ذریعہ نہیں ہے۔

یا تو یہ کسی وبا سے ڈر کر نکلے تھے، اور بعض روایات سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن نے حملہ کیا تھا تو یہ جہاد سے جی چرا گئے، اور دشمن سے ڈر کر اپنی جگہ سے بھاگ گئے، اور ہزاروں کی تعداد کہیں جا کر چھپ گئے، وہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِن کے اُوپر موت طاری کر دی، آگے واقعہ کا حاصل اُسی طرح ہے کہ پھر اُس وقت کے نبی کی دُعا سے انہیں دوبارہ زندگی ملی، اور اللہ تعالیٰ نے اِس واقعے کو اُس وقت کے لوگوں کے لئے بھی عبرت بنایا، اور ہمارے سامنے جو نقل کیا جا رہا ہے تو ہمارے لیے بھی اِس واقعہ کو عبرت بنا دیا، جس میں یہی بتایا کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی میں انسان کا اپنا نقصان ہے، ورنہ موت نے تو اپنے وقت پر آنا ہے، موت وحیات کا رشتہ براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تو ساری تقریر عام مفسرین کے مطابق ہے کہ عام مفسرین نے اِس سے موتِ حقیقی موت مراد لی ہے، اُسی کے مطابق ہی یہ بات میں نے آپ کے سامنے نقل کر دی۔

آیتِ بالا کی دُوسری تفسیر

ویسے موت وحیات کا لفظ جیسے حقیقی موت اور حقیقی زندگی کے لئے بولا جاتا ہے، اسی طرح موت وحیات کے لفظ میں کچھ وسعت بھی ہے، ایک قوم اگر اخلاقی طور پر مردہ ہو گئی، جذبۂ جہاد اُن میں نہیں رہا، دشمن کے سامنے مرعوب ہو گئے، غلام بن گئے، ذلیل ہو گئے، اُس کو بھی کہتے ہیں کہ یہ قوم مردہ ہے، اِن میں زندگی کے آثار نہیں، اور پھر جب وہ جہاد کرتے ہیں، اپنی کھوئی ہوئی عزت کو واپس لے آتے ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں قوم زندہ ہے، زندہ قوموں کا شعار یہ ہے کہ وہ جان نہیں چرایا کرتے، مال خرچ

(۱) بخاری ج۱ ص۵۳۱ باب مناقب خالد بن الولید / مشکوٰۃ ج۲ ص۵۴۳ باب فی المعجزات فصل اول

(۲) یہ ایک قول ہے، دوسرے قول کے مطابق حمص کے علاقے میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں ان کی وفات ہوئی (دیکھیں کتب رجال، تہذیب وغیرہ)۔

کرنے سے بچا نہیں کرتے، بلکہ اپنی عزت اور وقار کو باقی رکھنے کے لئے یا اللہ کے نام کو بلند رکھنے کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں، زندہ قوموں کا شعار یہ ہے، اور جو مردہ قومیں ہوتی ہیں اُن کو نہ اپنی عزت کا احساس ہوتا ہے نہ اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے، جس طرح چاہے کوئی دوسرا ایک آدمی ڈنڈا لے کے سب کو آگے لگا لے، جب کوئی قوم مردہ ہو جائے تو اُس کا حال یہی ہوا کرتا ہے۔ تو موت کا لفظ اخلاقی مُردنی اور جذبۂ جہاد کے سرد ہونے سے بھی کنایہ ہو سکتا ہے، اور حیات سے مراد ہو گا کہ دوبارہ اُن کے اخلاق اُبھر آئے۔ چونکہ بعض تفاسیر کے اندر اس طرح سے مراد واضح کی گئی ہے، تو لفظوں کے تحت اِس کی بھی گنجائش ہے، مطلب یہ ہو گیا کہ اسرائیلی تھے تو ہزاروں کی تعداد میں، لیکن وہ اخلاق سے عاری ہو گئے، جذبۂ جہاد سے خالی ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا کہ مرو، جاؤ، کہیں جاؤ، مر جاؤ، یعنی دنیا کے اندر ذلیل ہو جاؤ، تو ان کے اوپر مُردنی چھا گئی، اور ان میں کسی قسم کی عزت اور زندگی کے آثار نہ رہے، جیسے بے جان ڈھانچے ہوتے ہیں اُن کا حال یہ ہو گیا، جب انہوں نے جہاد کو چھوڑ دیا اور محنت مشقت کرنی چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ذلت کی طرف دھکیل دیا، اللہ تعالیٰ نے بھی کہا کہ جاؤ، مرو، یعنی ذلت کی طرف ان کو پھینک دیا، لیکن پھر کسی نبی کے آنے سے اُن کی دوبارہ تربیت ہوئی، اس تربیت کے ذریعے سے پھر انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس لی، اس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کے اندر دوبارہ زندگی کے آثار پیدا کیے۔ یہ واقعہ قوموں کے لئے عبرت ہے، کہ جو قومیں آرام طلب ہو جایا کرتی ہیں، محنت اور مشقت سے گھبرانے لگ جاتی ہیں، وہ زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہیں، اور جو قومیں محنت کرتی ہیں، مشقت کرتی ہیں، جان اور مال کی قربانی جن کے اندر ہوا کرتی ہے، اصل زندگی اِنہی قوموں کی ہوتی ہے۔ تو یہ واقعات جو دنیا کے اندر پیش آئے، اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے نقل کرتا ہے، یہ اُس کی مہربانی ہے کہ اس قسم کے واقعات تمہیں سنا کر تمہیں سیدھے راستے کی طرف لے جاتا ہے، لوگوں کو چاہیے کہ اِن واقعات کی قدر کریں، پچھلی تاریخ پر نظر ڈالیں، کہ دنیا کے اندر یہ دستور چلا آتا ہے کہ محنت ومشقت سے جان بچانے والی قومیں مردہ ہو جاتی ہیں، اور جو جہاد اجتہاد کوشش اور مشقت کو اپنا شعار بناتی ہیں اصل زندگی اُنہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ اِس واقعہ کی طرف متوجہ کر کے جہاد کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہے۔ تفسیروں کے اندر یہ بھی منقول ہے، اور لفظوں کے تحت اس کی بھی گنجائش ہے، لیکن عام طور پر مفسرین نے موت وحیات سے حقیقی موت وحیات مراد لی ہے۔

سوال:- حقیقی موت اگر مراد لیں تو اشکال ہے کہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ مارنے کے بعد قیامت کے دن زندہ کروں گا؟

جواب:- عام عادت اسی طرح سے ہے، کہ عام مُردے حساب کتاب کے لئے قیامت کے دن ہی زندہ کیے جائیں گے، ورنہ قرآنِ کریم میں کتنی آیات آپ کے سامنے آئیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ذکر کیا گیا اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (آلِ عمران:۴۹) وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے اللہ کے اذن کے ساتھ، تو وہاں آپ کو اشکال نہ ہوا؟ کہ وہ کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ مارنے کے بعد تو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندگی قیامت کو دیں گے۔

سوال:- وہ تو معجزہ ہے!

جواب:- تو نبی کی دُعا کے ساتھ کسی واقعے کا ظاہر ہو جانا بھی تو معجزہ ہی ہے!

سوال:- اللہ نے یہاں فرمایا ہے کہ میں نے سب کچھ کیا، نبی کی تو یہاں بات ہی نہیں ہے؟

جواب:- زندہ کرنے والا اللہ ہے لیکن نبی کی دُعا کے ساتھ، اور وہاں بھی باذنِ اللہ کی قید جب آگئی تو عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا ہی ہوتی تھی اور زندہ اللہ ہی کرتے تھے، ورنہ موت وحیات اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دی، اور یہ جو عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی قیامت میں ملے گی تو عام عادت اسی طرح ہے، لیکن معجزۃً اگر کسی مُردے کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے تو یہ اُس عام عادت کے منافی نہیں ہے۔ یہ واقعات قطعی ہیں، قرآنِ کریم میں ان کا ذکر کیا ہوا ہے۔

''اَلَمْ تَرَ'' کے ساتھ خطاب بطور محاورہ کے ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ: اَلَمْ تَرَ کے ساتھ جو خطاب کیا گیا ہے یہ بطور محاورے اور بطور مثال کے ہے، جیسے ہم کسی عجیب بات کو جب شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''آپ نے دیکھا نہیں؟ یوں ہو گیا'' حالانکہ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ دیکھا نہیں ہے، ''کیا آپ کو پتہ نہیں چلا؟ یہ واقعہ یوں ہو گیا''۔ اب ''پتہ نہیں چلا؟ دیکھا نہیں؟'' یہ الفاظ محاورۃً کلام کی ابتدا میں آجایا کرتے ہیں جس وقت کوئی عجیب واقعہ پیش آجائے۔ اس لیے محلِ تعجب میں قرآنِ کریم بھی اَلَمْ تَرَ کے ساتھ تعبیر کرتا ہے، کہ یہ واقعہ ایسا ہے جو دیکھنے کے قابل تھا، کیا آپ نے دیکھا نہیں؟ آپ کو اِس کی رؤیت حاصل نہیں ہوئی؟ اور یا پھر رؤیت سے رؤیت قلبی مراد لے لیں گے، پھر بھی اِلیٰ کے ساتھ جب اِس کو متعدی کیا گیا ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ یہ واقعہ یوں یقینی ہے گویا کہ آنکھوں کے سامنے ہے، دیکھنے کی چیز ہے، کیا آپ نے دیکھی نہیں؟ یعنی زیادہ واضح ہونے کے اعتبار سے گویا کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہے۔ تو محلِ تعجب میں، یعنی کوئی عجیب واقعہ نقل کرتے ہوئے یہ الفاظ کلام میں آجایا کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ خطاب ایسے شخص کو کیا جاسکتا ہے جس نے وہ واقعہ نہ دیکھا ہو۔ جیسے میں آپ کے سامنے کہوں، ہمارے محاورے میں بھی اسی طرح آتا ہے ''حرم پر حملہ کرنے کے لئے لوگ آئے تھے، انہوں نے قبضہ کرنا چاہا تھا، دیکھا؟ پھر اُن کا انجام کیا ہوا؟'' اب یہ ''دیکھا؟'' کا لفظ یہاں جو آیا تو آپ نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کا جو انجام ہوا وہ یقیناً آپ کے سامنے آگیا اور اس طرح یقین کے ساتھ سامنے آگیا گویا کہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ: آپ نے دیکھا نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا؟ تو محلِ تعجب میں اس قسم کے لفظ کلام کے اندر آیا کرتے ہیں، تو یہاں بھی وہی بات ہے، لہٰذا خطاب ایسے شخص کو کیا جانا کہ جس نے وہ واقعہ دیکھا نہ ہو، یہ کوئی قابلِ اعتراض نہیں ہے، ''کیا آپ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جو نکلے اپنے گھروں سے حالانکہ ہزاروں تھے، موت سے بچنے کے لئے یا موت کے ڈر سے (دونوں طرح سے اس لفظ کو ادا کر سکتے ہیں) پھر اللہ نے انہیں کہہ دیا مر جاؤ، پس وہ مر گئے، پھر اللہ نے انہیں زندگی دے دی، بیشک اللہ مہربانی والا ہے لوگوں پر، لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہیں'' اس قسم کی باتوں کی قدر نہیں کرتے۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس واقعہ میں غور کرو، تفکر کرو، اور اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو، اور یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کو قرض کیوں کہا گیا؟

جہاد جیسے جانی ہوتا ہے اسی طرح مالی بھی ہوتا ہے، اب آگے مال کے خرچ کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ جہاد میں جب تک مال خرچ نہ کیا جائے بسا اوقات جہاد میں کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ مال بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر اس کو بھی ذکر کر دیا۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کو یہاں لفظ قرض سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ بھی ایک قسم کی انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب ہے۔ آپ کے محاورے میں قرض کی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص قرض لیتا ہے، بشرطیکہ وہ مفلس اور ظالم نہ ہو، تو لیا ہوا قرض واپس یقیناً دیتا ہے، اگر وہ مفلس ہے کہ اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تو بھی وہ واپس نہیں دے گا اور آپ کا دیا ہوا ضائع ہو جائے گا، اور اگر وہ ظالم ہے کہ دوسرے کا حق دبا لیتا ہے تو بھی آپ کا دیا ہوا ضائع ہو سکتا ہے، کہ آپ سے اس نے لے لیا لیکن آپ کا حق وہ واپس نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی مفلس بھی نہیں اور ظالم بھی نہیں تو جو آپ سے قرض لے گا وہ آپ کو واپس یقیناً دے گا۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رات کے آخری حصے میں جو اپنے بندوں کو خطاب کرتے ہیں، تو حدیث شریف میں کچھ اس قسم کے جملے آتے ہیں: "مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَہٗ مَنْ یَّسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَہٗ مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَ لَہٗ"[1] کون مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کرلوں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اس کو دے دوں، کون مجھ سے استغفار کرتا ہے کہ میں اسے معاف کر دوں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتے ہیں: "مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدُوْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ"[2] کون قرض دیتا ہے ایسے کو جو نہ تو مفلس ہے کہ اُس کے پاس کچھ نہ ہو، اور نہ وہ ظالم ہے کہ کسی کی حق تلفی کرے، نہ وہ عدوم ہے نہ ظلوم ہے، عدوم اس کو کہتے ہیں جس کے پاس ہو کچھ نہیں، اور ظلوم اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کی حق تلفی کرنے والا ہو، کیونکہ یہ دو ہی باتیں ہیں جن کی بناء پر دیا ہوا قرض ضائع جاتا ہے، کہو جس کو آپ دے رہے ہیں یا تو وہ مفلس ہے تو آپ سوچیں گے کہ یہ قرض لینے کے لئے آ گیا، آج میں اس کو دے دوں، یہ واپس کہاں سے کرے گا، اس کے پلے تو ہے کچھ نہیں، اس لیے بھی آپ اس کو دیتے ہوئے ڈریں گے، یا پھر وہ شخص ایسا ہے کہ اس کو لے کر دبا لینے کی عادت ہے، وہ اگر قرض لینے کے لئے آ گیا تو آپ کہیں گے کہ میں اس کو کیوں دوں، یہ پھر واپس نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ دونوں صفتیں ذکر کرتا ہے، کہ نہ میں عدوم ہوں نہ ظلوم ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے نام پر جو خرچ کرو گے وہ تمہاری طرف ایسے ہی واپس آئے گا جیسے تم کسی غیر ظلوم اور غیر عدوم کو قرض دو۔ تو لفظِ قرض استعمال کر کے اصل میں یہی ترغیب ہے کہ دیا ہوا واپس ضرور آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کے بڑھا کر دینے کی حسی مثال

پھر یہی نہیں کہ جتنا دو گے اتنا ہی واپس آئے گا، بلکہ تمہیں یہ تحریر دی جا رہی ہے کہ جتنا دو گے اُس سے کئی گنا بڑھ کر واپس آئے گا۔ اب یہاں دیکھئے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ عجیب ہے، ایک چیز تو آپ کے مشاہدے میں ہے، اُس پر تو

(۱) بخاری ۱/۱۵۳ باب الدعاء فی الصلاۃ فی آخر اللیل۔ مشکوٰۃ ۱/۱۰۹ باب التحریض علی قیام اللیل۔ فصل اول۔

(۲) مسلم ۱/۲۵۸ باب الترغیب فی قیام رمضان سے پہلے۔ مشکوٰۃ ۱/۱۰۹ باب التحریض علی قیام اللیل۔ فصل اول۔

آپ کا عمل ہے، اور جس پر آپ کو ایمان بالغیب کے طور پر کہا جا رہا ہے اُس میں ہمیں تردد ہے اور اُس میں دل پر وہ اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عادت اپنائی ہے کہ آپ سے جو لیتا ہے، یعنی آپ اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھا کر واپس کرتا ہے، ایک تو اس کی مثال کاشتکار ہیں، زمین کاشت کرنے والے، اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق یہ کچھ مال مٹی میں بکھیرتے ہیں، اور وہ جتنا بکھیرتے ہیں اس سے کتنا بڑھ کر واپس آتا ہے۔ اب یہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ بڑھا کر واپس کرتے ہیں اس لیے ہر کوئی جرأت کرتا ہے کہ گھر سے مال اٹھاتا ہے اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جا کر مٹی میں بکھیر دیتا ہے اِس امید پر کہ زیادہ واپس آئے گا، کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت کسی عارضے کی بناء پر اللہ تعالیٰ دنیا میں کچھ تھوڑا واپس کر دیں یا پورا نہ لوٹائیں، آپ کے اعمال کی غلطی کی بناء پر یا کسی دوسری چیز کی بناء پر کبھی وہ چیز اللہ تعالیٰ دنیا میں واپس نہیں بھی لوٹاتے، لیکن اکثر عادت اِسی طرح ہے اور دنیا کی بناء اسی طرح سے ہے کہ جتنا بکھیرتے ہیں اس سے زیادہ واپس لے لیتے ہیں، اب اللہ کی یہ عادت تو چونکہ ہمارے سامنے ہے اس لیے ہم بالکل بلا جھجک بیج بکھیرتے ہیں اور ہمارے دل میں کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرا طریقہ جو ایمان بالغیب کے طور پر بتایا جا رہا ہے، کہ اللہ کے نام پر مساکین کو دو، یتیموں کو دو، قومی کاموں میں لگاؤ، جہاد کی تیاری کرو، مسافروں کی خدمت کرو، بیواؤں کی خدمت کرو، یہ ایسے ہے جیسے تم مجھے قرض دے رہے ہو، مطلب یہ ہے کہ تمہارا دیا ہوا ضائع نہیں جائے گا، بلکہ جتنا دو گے اُس سے بڑھ کر واپس آئے گا، اب یہ چیز چونکہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، صرف ایمان بالغیب ہی اس کا تقاضا کرتا ہے، تو یہاں بہت سارے لوگوں کو تردد ہو جاتا ہے، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بہت جگہ یہ چیز بیان کی، تو گویا کہ ایک قسم کی تحریر تمہیں دی جا رہی ہے کہ ذمہ داری میری ہے، تم اِس طرح سے خرچ کرو، جتنا خرچ کرو گے میں دنیا میں یا آخرت میں اس سے زیادہ کر کے تمہیں لوٹا دوں گا۔ تو یہاں قرض کے لفظ کے ساتھ یہی اثر ڈالنا مقصود ہے، ورنہ نعوذ باللہ وہ مفہوم نہیں جس قسم کا بدطینت یہودیوں نے سمجھ لیا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ (سورۂ آلِ عمران: ۱۸۱) کہ اللہ تعالیٰ جب قرض مانگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تو فقیر ہے، اور ہم مالدار ہیں، جس طرح فقیر مالدار سے مانگا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی ہم سے مانگتا ہے، یہ مقصد نہیں ہے جس قسم کا اِن خبیثوں نے سمجھا تھا، اور اس کی تردید اُس جگہ آئے گی۔ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (سورۂ فاطر: ۱۵) تم سارے اللہ کے محتاج ہو، اللہ غنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بندوں پر مہربانی، اور آزمانے کا طریقہ

اللہ غنی ہے، لیکن یہ اُس کی اپنے بندوں پر شفقت ہے کہ دیتا بھی خود ہے، اور پھر کہتا ہے کہ لاؤ مجھے دو۔ جیسے آپ بچوں کے ساتھ دل بہلاتے ہیں، بچے کو ایک روپیہ دے دیا، اور پھر کہہ دیا کہ یہ روپیہ مجھے دے دے، میں تجھے دو کر کے دے دوں گا، اگر بچہ خوشی کے ساتھ وہی روپیہ آپ کی طرف واپس لوٹا دے اور آپ ایک کی بجائے خوش ہو کر دس دے دیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے مہربانی اور شفقت کرنے کے لئے بچے کو اس طرح سے دیا، دے کر لیا، اور لے کر اُس کو بڑھا کے دے دیا، پہلا روپیہ بھی آپ کا ہی دیا ہوا تھا، بچے نے اگر آپ کے ہاتھ پر دوبارہ رکھ دیا تو اُس نے کون سا آپ پر احسان کیا؟ اسی طرح یہاں

ہے کہ دیا ہوا جو کچھ بھی ہے سب اللہ کا ہے، ہم ماں کے بطن سے کچھ نہیں لے کے آئے ''ہمہ چیزِ مَن چیزِ تُست'' جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے سب تیرا دیا ہوا ہے، لیکن جب وہی چیز واپس لوٹا کر دی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ خوش ہو کر اور بڑھا کے دے دیتے ہیں، یہ اُس کا بندوں پر مہربانی کا اور بندوں کو آزمانے کا ایک طریقہ ہے، ورنہ کوئی احتیاج کی بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ تو قرض کے لفظ سے تعبیر کرنا اِسی ترغیب دینے کے پہلو سے ہے۔ ''کون ہے جو قرض دے اللہ کو قرضِ حسن'' قرض کے ساتھ حسن کی قید لگادی کہ اچھا قرض، اچھے کا مطلب یہ ہے کہ حلال مال میں سے دو اور خلوص کے ساتھ دو، ریاکاری مقصود نہ ہو، اِس قسم کے جذبات کے ساتھ جو دیا جائے گا وہ قرضِ حسن ہے اور اُس کو اللہ تعالیٰ قبول کریں گے۔

صدقے کا ثواب سات سو گنا پر بند نہیں

''اور پھر بڑھائے گا اللہ تعالیٰ اُس دینے والے کے لئے کئی گنا زیادہ''، یعنی کم از کم دس، اور سات سو گنا کا ذکر تو قرآنِ کریم میں صراحتاً ہے، لیکن اُس سے آگے بھی کہہ دیا وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ (سورۂ بقرہ:۲۶۱) اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے گا بڑھا دے گا۔ اور اُس بڑھانے کو ایک مثال کے ساتھ حدیث شریف میں واضح کیا گیا ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نام پر خلوص کے ساتھ ایک کھجور دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھاتے جاتے ہیں، بڑھاتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُحد پہاڑ کے برابر وہ ہو جاتی ہے۔[1] اب آپ اندازہ کیجئے کہ ایک کھجور اور اُحد پہاڑ، دونوں کے درمیان میں کیا نسبت ہے؟ وزن کے اعتبار سے دیکھیں گے تو کھجوریں شمار میں نہیں آسکتیں، کہ اُحد پہاڑ کے وزن میں کتنی آسکتی ہیں، اور اگر پتھروں کو کھجوروں کے برابر توڑ توڑ کر کھجوریں بنائی جائیں تو آپ اندازہ کیجئے کہ کتنی بن جائیں گی۔ اس لیے یہ سات سو گنا پر بند نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ خلوص کی طرف دیکھتے ہوئے اور اسی طرح بوقتِ ضرورت جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو اُس وقت کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ فرماتے رہتے ہیں، جتنا خلوص ہوگا اتنا بڑھ جائے گا، اور جتنا ضرورت کے وقت انسان خرچ کرے گا اتنا بڑھ جائے گا، مختلف عوارض ہیں جن کی بناء پر ثواب میں اضافہ ہوتا ہے، تو یہ سات سو پر بند نہیں ہے۔

صدقہ کرتے ہوئے تنگی کا خوف نہیں ہونا چاہیے

اور پھر خرچ کرتے ہوئے تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ اگر ہم اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے تو خود تنگدست ہو جائیں گے۔ یہاں بھی وہی بات ہے، کہ مال کو روک کے رکھنا کوئی رزق کی کشادگی کا باعث نہیں، اور اللہ کے نام پہ خرچ کرنا کوئی رزق کی تنگی کا باعث نہیں، یہاں بھی رزق کا قبض اور رزق کا بسط براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس طرح جہاد میں جانا کوئی موت کا باعث نہیں، اور جہاد سے ڈر کر گھر میں بیٹھے رہنا بچنے کا باعث نہیں، اِسی طرح مال کو روک کے رکھنا رزق میں وسعت کا

---

(۱) ابن کثیر سورۃ البقرۃ: ۲۷۶ کے تحت۔ نیز دیکھیں بخاری ۱/ ۱۸۹/ مسلم ۱/ ۳۲۶/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۶۷، باب فضل الصدقۃ۔ نوٹ: آخری تین میں اُحد کی جگہ جبل کا لفظ ہے۔

ذریعہ نہیں، اور خرچ کرنا کوئی تنگی کا ذریعہ نہیں، بلکہ رزق کا قبض اور رزق کا بسط براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے یہ جذبہ بھی تمہارے لیے خرچ کرنے سے مانع نہ بنے۔ "اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے اور کشادہ کرتا ہے" یعنی رزق کو۔ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ: اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے، جب لوٹ کر اُس کے پاس جاؤ گے تو تمہارا پائی پائی کا حساب تمہارے سپرد کر دیا جائے گا اور تمہاری دی ہوئی چیز ضائع نہیں جائے گی۔

طالوت کا جالوت کو شکست دینے کا واقعہ

اب آگے ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں پیش آیا تھا، اور اِس کو بھی جہاد کی ترغیب کے طور پر ذکر کر رہے ہیں۔ بات وہی ہے کہ اسرائیلیوں میں ایک دور ایسا آیا جو انتہائی انتشار کا دور تھا، افراتفری کا دور تھا، نہ تو اُن کے اندر کوئی قوت رہی، نہ کوئی تنظیم رہی، بدانتظامی عام ہوگئی، اور دشمن اُن پہ چڑھ آیا، اُن کے بہت سارے شہر چھین لیے اور بہت سارے آدمیوں کو قید کر کے لے گیا۔ اب کئی سالوں کے بعد اسرائیلیوں کو خیال آیا تو اپنے وقت کے نبی جن کا نام میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا صمویل یا صموئیل، اُن سے کہنے لگے کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ متعین کر دیجئے جو ہماری سیاسی تنظیم کرے اور ہماری تربیت کرے، تاکہ ہم اُس کے ساتھ مل کر جہاد کریں اور اپنا کھویا ہوا علاقہ اور اپنے گرفتار شدہ بچوں کو آزاد کروا لیں۔ تو وہ نبی چونکہ اِن کی عادتوں کو جانتے تھے، اس لیے ان سے کہا کہ دیکھو! کہیں ایسا خطرہ تو نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کہہ کر تم جہاد کا حکم تو لے لو، اور اللہ تعالیٰ بادشاہ متعین کر کے کہہ دیں کہ اِس کے ساتھ مل کر جہاد کرو، اور جب وقت آجائے تو پھر تم گھروں میں بیٹھے رہ جاؤ، چونکہ پہلے کئی نقشے اس قسم کے دیکھے جا چکے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بھی، جب کہہ دیا تھا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۲۴) تو جا اور تیرا رب جائے، اور جا کے لڑتے رہو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، اِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (مائدہ: ۲۲) پہلے دشمن وہاں سے نکل جائیں، جب وہ نکل جائیں گے تو ہم پھر ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ تشریف لے آئیں گے۔ اِس قسم کا حال چونکہ اُن کا پہلے دیکھا ہوا تھا اس لیے نبی نے احتمال ذکر کیا کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ کی طرف سے حکم لے لو اور لینے کے بعد پھر تم سستی کرو۔ وہ کہنے لگے نہیں جی! یہ کیسے ہوسکتا ہے، اب تو ہم لٹے پٹے بیٹھے ہیں، دشمن ہمارے علاقے لے گئے، ہمیں گھروں سے نکال دیا، ہمارے بچوں کو گرفتار کر کے لے گئے، ایسے وقت میں ہم کیوں نہیں جہاد کریں گے؟ ضرور کریں گے۔ اُس نبی نے اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کر طالوت کو نامزد کر دیا کہ یہ تمہارا بادشاہ ہے، اِس کی قیادت میں تم اپنی تنظیم کرو اور تنظیم کر کے جہاد کرو۔ اب طالوت حضرت بنیامین کی اولاد میں سے تھے، اور یہ بارہ قبیلے جو بنی اسرائیل کے چلے آرہے تھے اُن میں سے بنیامین کا قبیلہ ایسا تھا جو افراد کے اعتبار سے بھی کم، اور مال کے اعتبار سے بھی باقی قبائل کے مقابلے میں کم سمجھا جاتا تھا، طالوت بہت غریب گھرانے کا تھا، اور خاندانی افراد بھی اِن کے کم تھے، لیکن اُن میں علمی استعداد تھی، وہ انتظام کرنا جانتا تھا، علم سے یہاں علم سیاست مراد ہے، کہ جنگ کرنے کے اصول کیا ہیں، اور لوگوں کو منظم کس طرح کرنا ہے، ملک کا انتظام کس طرح سنبھالنا ہے، اِس قسم کی صلاحیت اُن میں بہت تھی، اور قد و قامت بھی ماشاء اللہ ایسا تھا کہ دیکھ کر دوسرے پہ رعب پڑے، بدن مضبوط جوانوں جیسا، مضبوط اور اونچے لمبے قد

کے، جس کو کہتے ہیں ڈیل وڈول والے، کہ دیکھ کر دشمن پر ہیبت طاری ہوتی تھی، البتہ مال نہیں تھا اور کسی اُونچے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے، ظاہری طور پر یہ خاندان باقیوں کے مقابلے میں پست سمجھا جاتا تھا۔

طالوت کی تعیین پر بنی اسرائیل کا اعتراض، اور آج کی ذہنیت

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے طالوت کی تعیین ہوئی تو اسرائیلی اپنے مزاج کے مطابق پھر بگڑ بیٹھے، وہ کہنے لگے یہ کیسے بادشاہ؟ نہ اِس کے پاس پیسے، نہ اِس کے پاس کوئی دولت، نہ یہ کوئی اُونچے خاندان کا، اس کے مقابلے میں تو ہم زیادہ حقدار ہیں، یعنی وہ سمجھتے تھے کہ جس کے پاس مال زیادہ ہو اور جو اُونچے خاندان سے تعلق رکھے وہی اقتدار پہ آنا چاہیے، اقتدار اُسی کا ہی کام ہے، چاہے وہ حد درجے کا نالائق ہی کیوں نہ ہو، چاہے سیاست نہیں جانتا، انتظام کرنا نہیں جانتا، بہادر نہیں ہے، دشمنوں کی چالوں کو نہیں سمجھتا، لیکن قیادت اسی کو ملنی چاہیے جس کے پاس پیسے بہت ہوں۔ یہ پُرانا ذہن چلا آرہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کل چونکہ دولت مند لوگ ہی کامیاب ہو کر سامنے آتے ہیں تو ساری قوم کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں، یعنی یہ نہیں دیکھتے کہ قابلیت کس میں ہے، جو پیسے زیادہ خرچ کرلے کامیاب ہو جائے چاہے کنجر ہی کیوں نہ ہو، پھر جس وقت وہ کنجر سامنے آجائے گا تو قوم کو کنجر ہی بنائے گا، اور بزدل قسم کے آدمی جب سامنے آجائیں گے تو کیا بہادری دکھائیں گے اور کیا قومی مسائل کو حل کریں گے؟۔ آج ہمارے ہاں بھی اقتدار اُنہی کو ملتا ہے، انتخاب وہی لڑ سکتے ہیں، اور وہی اپنے علاقوں میں کامیاب ہوتے ہیں جن کے پاس پیسے بہت ہیں، اور یہاں یہ نہیں دیکھتے کہ علم کس کے پاس ہے، تقویٰ کس کے پاس ہے، قومی مسائل کو کون سمجھتا ہے، ان کے حل کرنے کی استعداد کس کے اندر ہے، یہی وجہ ہے کہ قومی مسائل حل نہیں ہوتے، اور یہ سارے کا سارا معاملہ خراب ہو رہا ہے۔

وقت کے نبی کا جواب، اور حسی نشانی کے ساتھ قوم کا اطمینان

جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو نامزد کیا تو بنی اسرائیل نے بھی اِسی ذہن کے ساتھ اعتراض کیا۔ اُس نبی نے جو جواب دیا اُس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے چنا ہے، اللہ کے چنے ہوئے پر تم کیوں اعتراض کرتے ہو؟۔ دوسری بات یہ ہے کہ بادشاہ بننے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور بدنی قوت کی ضرورت ہے وہ طالوت کو تم سب سے زیادہ حاصل ہے، اس لیے اِس ظاہری دلیل کے ساتھ بھی فوقیت اُس کو ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ سلطنت اور ملک اللہ کا ہے، جس کو چاہے دے دے۔ اور چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ وسعت والا ہے، اگر چاہے گا تو اِس کو بھی وسعت دے دے گا، یہ کونسی بات ہے کہ آج غریب ہے تو یہ ہمیشہ غریب ہی رہے۔ اِس طرح سے ان کو مطمئن کیا۔ اور پھر اس نبی نے ایک حسی نشانی پیش کی کہ اِس لڑائی میں، جس میں دشمن اِن پر غالب آ گئے تھے، ایک تابوت جس کو بطور تبرک کے یہ اپنے سامنے رکھا کرتے تھے، بلکہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز بھی اُس کی طرف منہ کر کے پڑھا کرتے تھے، قبلہ کی جگہ اُس کو استعمال کرتے تھے، لڑائی وغیرہ میں جاتے تو اُس کو آگے آگے رکھتے تھے، اس کی برکت سے اِن کو فتوحات ملتی تھیں، لیکن جب یہ اپنے اخلاق سے عاری ہو گئے، دشمن کے سامنے مغلوب ہوئے، تو دشمن کا حملہ جو ہوا تو اِن کا تابوت بھی چھین کر لے گیا، اور یہ اُن کے لئے بہت ہی زیادہ صدمے کی بات تھی کہ ہمارا وہ تابوت جو روحانی

مرکز تھا وہ بھی گیا، اور وہ دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ اُس نبی نے کہا کہ اِس کی سلطنت کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ تابوت تمہارے پاس آجائے گا، فرشتے اٹھا کر چھوڑ جائیں گے، یہ پکی علامت ہوگی کہ طالوت اللہ کی جانب سے بادشاہ ہے، چنانچہ واقعہ ایسے ہی ہوا کہ دشمن وہ تابوت جس شہر میں رکھتے وہیں وباء پھوٹ پڑتی، جدھر رکھتے وہیں کوئی نہ کوئی بیماری پھیل جاتی، جب بار بار انہوں نے تجربہ کیا تو کہنے لگے کہ یہ تابوت ہی رکھنے کے قابل نہیں ہے، تو ایک گاڑی کے اوپر رکھ کے بیل جوڑ کر گاڑی کو ہانک دیا، اور وہ بیل بغیر کسی ظاہری سبب کے فرشتوں کی راہنمائی کے ساتھ گاڑی کو کھینچ کر طالوت کے دروازے کے سامنے آکھڑے ہوئے، یوں اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی امداد کے ساتھ فرشتوں کی وساطت سے تابوت واپس بھیج دیا۔ جب یہ حسی نشانی پائی گئی تو قوم مطمئن ہوگئی۔ اِس تابوت کے اندر توراۃ تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سے لے کر آئے تھے، اور موسیٰ علیہ السلام کے کچھ ملبوسات، ہارون علیہ السلام کے کچھ ملبوسات، اسی طرح من وسلویٰ کا کچھ نمونہ اُس تابوت میں تھا، اور اس سے یہ لوگ برکت حاصل کیا کرتے تھے، اس کے آنے کے بعد وہ مطمئن ہوگئے، جب مطمئن ہوگئے تو اب طالوت نے تنظیم شروع کی، اور تنظیم بنانے کے بعد جہاد کا اعلان کیا تو اِس جوش میں بھیڑوں کی طرح سارے اسرائیلی اکٹھے ہوگئے کہ ہم جہاد کرنے کے لئے جاتے ہیں۔

طالوت کی طرف سے قوم کا امتحان اور اس کا نتیجہ

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اگر فوج کے اندر اس قسم کے آدمی شامل ہوجائیں جو بزدل ہوں اور مشقت برداشت نہ کر سکیں تو وہ باقیوں کے بھی قدم اکھاڑنے کا باعث بن جاتے ہیں، اور یوں منتخب کرنا کہ تو آجا، تو نہ آ، تو پیچھے ہٹ جا، یہ بسا اوقات مصلحت نہیں ہوتا۔ تو حضرت طالوت نے یہ کیا کہ اُن کو ایک امتحان میں ڈال دیا اللہ کی اجازت کے ساتھ، جس سے پتہ چلے گا کہ کون مشقت اٹھا سکتا ہے اور کون مشقت نہیں اٹھا سکتا۔ سفر کر کے جا رہے تھے، گرمی کا موسم تھا، پیاس سے مرے جا رہے تھے، طالوت نے اعلان کر دیا، کہ آگے نہر آنے والی ہے، پانی پینے کی کسی کو اجازت نہیں ہے، جو پانی پیئے گا وہ میرے ساتھ نہیں جا سکتا، اور جو نہیں پیئے گا وہ میرے ساتھ رہے گا، ہاں البتہ ایک چلو بھرنے کی اجازت ہے، یہ اعلان کر دیا، اب یہ اعلان بالکل ایسے موقع کے مطابق تھا کہ حکم کے تحت کون پیاس کی مشقت برداشت کرتا ہے اور کون برداشت نہیں کرتا، اِس اعلان ہوجانے کے بعد جو لوگ پانی پیٹ بھر کے پی لیں گے وہ ساتھ لے جانے کے قابل نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام کی پابندی نہیں کریں گے اور کوئی مشقت نہیں اٹھائیں گے۔ اب وہ پیاس سے مرے جا رہے تھے، جب گئے تو سارے ہی نہر پر ٹوٹ پڑے، کسی نے نہیں دیکھا کہ ہمارے حاکم اعلیٰ اور ہمارے قائد نے کیا اعلان کیا ہے، کسی نے پروا نہیں کی، بہت تھوڑے سے بچ گئے جن کی تعداد حدیث شریف میں آتی ہے کہ تین سو تیرہ تھے جو طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کر کے اگلے میدان میں گئے۔[1] اور باقی جنہوں نے پیٹ بھر کر پانی پیا تھا، طالوت نے بھی اُن کو مسترد کر دیا، اور کہتے ہیں کہ خود بھی ان کے اوپر ایسی سستی طاری ہوئی کہ ان کے اندر جہاد کی

---

(۱) ترمذی ۱/۲۸۸، باب ماجاء فی عدۃ اصحاب بدر۔ ولفظہ: عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كُنَّا نَتَحَدَّثُ أَنَّ أَصْحَابَ بَدْرٍ يَوْمَ بَدْرٍ كَعِدَّةِ أَصْحَابِ طَالُوتَ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَثَلَاثَةَ عَشَرَ۔

جرأت نہ رہی۔ بخاری شریف میں کئی روایتوں[1] کے اندر ذکر کیا گیا کہ اہل بدر کی تعداد اُتنی تھی جتنے لوگ طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کر کے گئے، تو وہاں سے یہ بات صراحتاً معلوم ہوگئی کہ طالوت کے ساتھ بھی تین سو تیرہ رہ گئے تھے، اور باقی سارے کے سارے پیچھے رہ گئے۔

طالوت کے بعض ساتھیوں کی گھبراہٹ اور دُوسروں کی طرف سے تسلی

جب یہ تین سو تیرہ نہر کو عبور کر کے گئے، اب یہ لگے خیال کرنے کہ یہ تو جماعت بڑی تھوڑی رہ گئی، اور اُدھر جالوت جو مقابلے میں آرہا تھا وہ بڑا جابر بادشاہ اور بڑا فاتح تھا، جس نے پہلے اِن کو مار مار کے بھگایا تھا، اُس کا رعب بھی تھا، تو بعض لوگوں کی زبان سے نکلا کہ لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ: آج ہم جالوت اور اُس کے لشکروں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے، ہمارے اندر طاقت نہیں ہے۔ اور جو زیادہ قوی الایمان تھے وہ کہنے لگے کہ دیکھو! تعداد کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، فتح اور نصرت تعداد پر موقوف نہیں ہے، کئی دفعہ ایسے ہوجاتا ہے کہ چھوٹی سی جماعت بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے، جو مستقل مزاج رہیں اور اللہ کے احکام پر جمنے والے ہوں فتح اصل میں اُن کی ہوا کرتی ہے، كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ، یہ اعلان جو کیا تو اس سے دل بڑھا دیا۔

دونوں لشکر آمنے سامنے، اور جالوت کی شکست

طالوت تین سو تیرہ کو لے کر میدان میں چلے گئے، مقابلے میں جالوت اور اُس کی فوجیں آگئیں، جس وقت یہ فوجیں آئی ہیں تو سب سے پہلے جالوت آگے آیا۔ پُرانے زمانے میں جنگ کا یہ طریقہ تھا کہ جب فوجیں بالمقابل کھڑی ہوجاتیں تو پہلے ایک طرف سے ایک جوان نکلتا تھا، دوسری طرف سے ایک جوان نکلتا، یوں پہلے ایک ایک اور دو دو مقابلہ کرتے تھے، پھر گھمسان کی لڑائی ہوجاتی تھی (جیسے میدانِ بدر میں بھی پہلے تین مشرک آئے تھے، جنہوں نے آکر للکارا تھا، تو پھر اِدھر سے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور عبیدہ بن حارثؓ کو حضور ﷺ نے میدان میں اُتارا تھا) ابتداء یونہی ہوتی تھی، جالوت نے آکر جس وقت للکارا تو اُس کے مقابلے میں حضرت داؤد علیہ السلام گئے، داؤد علیہ السلام طالوت کی فوج میں تھے اور تھے ابھی چھوٹے، انہوں نے جاکر جس وقت مقابلہ کیا تو جیسے اُس وقت گوپیے کے ذریعے سے پتھر پھینکنے کا رواج تھا، تو ایک پتھر جو پھینکا تو اُس کے جاتے ہی پیشانی میں لگا اور جالوت گر گیا، بس جالوت کا گرنا تھا کہ اِدھر مسلمان جو طالوت کے ساتھ تھے ان کا حوصلہ بڑھ گیا، اور جالوت کی فوجوں کے حوصلے ٹوٹ گئے، اور پھر مقابلے میں جالوت کی فوجیں شکست کھا گئیں اور طالوت کی فوجیں فتح پا گئیں۔ تو اس واقعہ کو بیان کر کے کیا بتلایا؟ ہمیں کیا سبق دیا؟ کہ دیکھو! جو مستقل مزاج تھے، ایمان میں پختہ تھے، تھوڑے ہونے کے باوجود بہت سارے دشمن پر غالب آگئے، اس لیے تم بھی اپنی قلتِ تعداد کو نہ دیکھو، مستقل مزاج رہو، اللہ کے احکام کی پابندی کرو، اور جو تمہارا قائد ہے اُس کی ہدایات کی پابندی کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح فتح دے گا جس طرح طالوت کے آدمیوں کو جالوت کے مقابلے میں فتح دے دی تھی۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۵۶۴، باب عدۃ اصحاب بدر میں تین روایات ہیں۔ ایک روایت یوں ہے: كَانُوْا عِدَّةَ أَصْحَابِ طَالُوْتَ الَّذِيْنَ جَازُوْا مَعَهُ النَّهَرَ بِضْعَةَ عَشَرَ وَثَلَاثَمِائَةٍ۔

جہاد کی حکمت

اور پھر آگے جہاد کی ایک حکمت بتادی، کہ اگر وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ ان شریروں کا سر اچھے لوگوں سے نہ کٹوائے تو زمین میں سارے کا سارا فتنہ وفساد ہی ہو جائے گا، تو جہاد اس لیے ضروری ہے تا کہ شرارت کا خاتمہ ہو، شرارت کے خاتمے کے لئے جہاد ضروری ہے، یہ بھی ایک ترغیب کا پہلو ہے، کہ جہاد کرو گے تو عالم سے فساد ختم ہوگا، اور اگر جہاد نہیں کرو گے تو نافرمان قسم کے لوگ، شریر قسم کے لوگ، اور ظالم قسم کے لوگ آبادیوں پر مسلط ہو جائیں گے، پھر دوسرے لوگوں کی نہ عزت محفوظ رہے گی، نہ جان محفوظ رہے گی، نہ مال محفوظ رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے پٹوا کر دنیا میں امن قائم کرتا ہے۔

دلیلِ رسالت

پھر یہ واقعہ جو بیان ہوا امم سابقہ کا ہے، سرور کائنات ﷺ نے کہیں پڑھا نہیں، کسی سے سنا نہیں، اس کو صحیح جزئیات کے ساتھ ذکر کر دینا علامت ہے اس بات کی کہ حضور ﷺ پر وحی آتی ہے، اور اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے آپ کو اس قسم کے واقعات کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی دلیل رسالت ہے، تو آخری آیت میں اس واقعہ کے دلیل ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔

١٦ر صفر (١٤٠٠ھ) کو دوسرا پارہ ختم ہوا۔ اِن شاء اللہ! ١٧ر صفر سے تیسرا پارہ شروع ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ

یہ رسول، ہم نے فضیلت دی اِن میں سے بعض کو بعض پر، اِن رسولوں میں سے کوئی وہ ہے جس سے اللہ نے کلام کی، اور اونچا کیا

بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

ان میں سے بعض کو از روئے درجات کے، اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو واضح دلائل دیے، اور ہم نے قوت پہنچائی اُس کو

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

پاکیزہ روح کے ساتھ، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو اِن سے پیچھے ہیں، بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح دلائل آ گئے،

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ

لیکن انہوں نے اختلاف کیا، پھر اُن میں سے بعض وہ ہیں جو ایمان لے آئے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا، اور اگر

اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا

اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۵۳﴾ اے ایمان والو! خرچ کرلو اس مال میں سے

رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ

جو ہم نے تمہیں دیا قبل اس کے کہ آ جائے ایسا دن جس میں خرید و فروخت نہیں اور نہ دوستی ہے اور نہ شفاعت ہے، اور انکار کرنے والے

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ

ہی ظلم کرنے والے ہیں ﴿۲۵۴﴾ اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ زندہ ہے، تھامنے والا ہے، نہیں پکڑتی اس کو اونگھ اور نہ نیند، اسی کے لئے ہے

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اُس کے سامنے مگر اس کی اجازت کے ساتھ، جانتا ہے وہ

مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا

ان سب حالات کو جو لوگوں کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہیں، نہیں احاطہ کر سکتے لوگ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا، مگر اسی چیز کا جو

شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ چاہے، وسیع ہے اُس کی کرسی آسمان و زمین سے، زمین و آسمان کی حفاظت اُس پر گراں نہیں گزرتی، اور وہ بلندی والا ہے عظمت والا ہے ﴿۲۵۵﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ تِلۡكَ الرُّسُلُ: یہ رسول، رُسل رسول کی جمع ہے، فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ: ہم نے فضیلت دی اِن میں سے بعض کو بعض پر، بڑھایا ہم نے اِن میں سے بعض کو بعض پر، مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ: اِن رسولوں میں سے کوئی وہ ہے جس سے اللہ نے کلام کی، وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ: اور اِن میں سے بعض کے درجات اونچے کیے، یا، بعض کو اونچا کیا درجات میں، کیونکہ دَرَجٰتٍ تمیز ہے اور محول عن المفعول ہے، معنی کے اعتبار سے یہ رَفَعَ کا مفعول بنتا ہے، رَفَعَ دَرَجَاتِ بعضھم ان میں سے بعض کے درجات کو اونچا کیا، یا، بعض کو اونچا کیا از روئے درجات کے، بعض کو اونچا کیا درجات میں، جس طرح سے چاہیں آپ اس معنی کو ادا کر سکتے ہیں۔ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ: اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلائل دیے، وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ: ہم نے تائید کی، ہم نے قوت پہنچائی اُس عیسیٰ علیہ السلام کو پاکیزہ روح کے ساتھ، روح القدس کا مصداق جبریل علیہ السلام ہیں، وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ: اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو اِن سے پیچھے ہیں مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ: بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آ گئے، وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا: لیکن انہوں نے اختلاف کیا، فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ: پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایمان لے آئے وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ: اور اِن میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا، وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا: اور اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ: لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا: اے ایمان والو! اَنۡفِقُوۡا: خرچ کرو۔ لیکن یہاں اَنۡفِقُوۡا چونکہ ترغیب کے لئے آیا ہے اس لیے بیان القرآن میں اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ اردو محاورے کے اعتبار سے ترغیب پر دلالت کرتا ہے "اے ایمان والو! خرچ کر لو اُس چیز میں سے جو ہم نے تمہیں دی" یعنی ابھی وقت ہے، پھر وقت نہیں ملے گا، جیسے ہم کہتے ہیں "فائدہ اٹھا لو اس چیز سے"، تو ایسے موقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے کہ ابھی وقت ہے فائدہ اٹھانے کا، فائدہ اٹھا لو، اور پھر بعد میں اگر فائدہ اٹھانا چاہو گے تو فائدہ اٹھانے کا کوئی وقت نہیں ہوگا۔ "اے ایمان والو! خرچ کر لو اُس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا" مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ: قبل اس کے کہ آ جائے ایسا دن، لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ: جس میں خرید و فروخت نہیں، وَلَا خُلَّةٌ: اور نہ اُس دن میں دوستی ہے۔ خُلَّةٌ: دوستی، آشنائی۔ وَّلَا شَفَاعَةٌ: اور نہ اُس دن میں شفاعت ہے۔ "قبل اس کے کہ ایسا دن آ جائے جس میں خرید و فروخت نہیں، جس میں دوستی نہیں، جس میں شفاعت نہیں" وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ: اور انکار کرنے والے ہی ظلم کرنے والے ہیں، کافر ہی ظلم کرنے والے ہیں۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی، اَلۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ: وہ زندہ ہے، صاحب حیات ہے، اَلۡقَيُّوۡمُ قَامَ يَقُوۡمُ سے لیا گیا ہے بمعنی کھڑا ہونا، اور قَيُّوۡم اور قَيَّام اُسے کہا جاتا ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہو، حاصل مفہوم بیان کرنے کے لئے اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے تھامنے والا "وہ زندہ ہے تھامنے والا ہے سنبھالنے والا ہے"۔ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ: سِنَةٌ کہتے ہیں اونگھ کو، یہ نیند کا ابتدائی درجہ ہے جو آنکھوں پر اثر انداز ہوتی ہے، نہیں پکڑتی اُس اللہ کو اونگھ، وَّلَا نَوۡمٌ: نہ نیند، لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ: اُسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ: کون ہے جو سفارش کرے اُس کے سامنے مگر اس کی اجازت کے ساتھ، يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ: جانتا ہے اللہ تعالیٰ اُن سب

حالات کو (مَا عموم کے لئے ہے) جو لوگوں کے سامنے ہیں وَمَا خَلْفَهُمْ: اور جو اُن لوگوں کے پیچھے ہیں، مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: اگلے پچھلے حالات، اِن لوگوں کے اگلے پچھلے حالات اللہ تعالیٰ جانتا ہے، وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ: نہیں احاطہ کرتے یہ لوگ اللہ کے علم میں سے کسی شئی کا، علم سے یہاں معلومات مراد ہیں، اللہ کی معلومات میں سے کسی شئی کا احاطہ نہیں کرتے، اِلَّا بِمَا شَآءَ: مگر اسی چیز کا جو اللہ چاہے، یعنی اللہ کی معلومات میں سے اتنی معلومات ہی انسان کے علم میں آسکتی ہیں جتنی اللہ دینا چاہے، ورنہ اللہ کی معلومات کا احاطہ کوئی نہیں کرسکتا، وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: وسیع ہے اس کی کرسی آسمان وزمین سے، اس کی کرسی زمین اور آسمان کی گنجائش رکھتی ہے، وَلَا يَئُوْدُهٗ: اَدَ يَؤُدُ اَوْدًا: کسی چیز کا اتنا بھاری ہونا کہ اس کو سنبھالنا مشکل ہوجائے، وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا: زمین وآسمان کی حفاظت اُس پر گراں نہیں گزرتی، اِن دونوں کی حفاظت یعنی زمین اور آسمان کی حفاظت اُس پہ بھاری نہیں ہے۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ: اور وہ عُلو والا ہے اور عظمت والا ہے، علو میں یہ مفہوم آجائے گا کہ اس میں کوئی نقص کی صفت نہیں پائی جاتی، اور عظمت میں یہ مفہوم آجائے گا کہ اس میں ہر صفتِ کمال پائی جاتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں طالوت اور جالوت کا واقعہ بیان کیا گیا تھا، اور پھر اس قسم کے واقعہ کو صحیح انداز کے ساتھ بیان کرنا جبکہ نہ آپ ﷺ نے کسی کتاب میں پڑھا، نہ آپ اہل علم کی صحبت میں رہے، یہ سرورِ کائنات ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کی دلیل ہے، اِس لیے آخری آیت میں وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کہہ کر سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اعلان کیا گیا تھا، کہ یہ واقعات ہم آپ پر بیان کرتے ہیں، یہ آیات ہم آپ پر پڑھتے ہیں، اور آپ رسولوں میں سے ایک ہیں، جو ہمارے بھیجے ہوئے ہیں لوگوں کو ہمارے پیغام پہنچانے کے لئے، تو اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں رسولوں کا ذکر آ گیا اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اعلان ہوگیا۔ تو مرسلین کا ذکر آنے کے ساتھ درمیان میں رسولوں کے متعلق ایک بات آ گئی، جو سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی پر مشتمل ہے۔

انبیاء میں کلی فضیلت حضور ﷺ کے لئے ہے

تو تِلْكَ الرُّسُلُ کا معنی یہ ہوا کہ یہ رسول جن کا پیچھے اَلْمُرْسَلِيْنَ میں ذکر آیا، یہ رسولوں کی جماعت ایسی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہی سب بھیجے ہوئے ہیں، رسالت کا شرف سب کو حاصل ہے، لیکن ہم نے اِن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، بعض کو بعض کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے، کسی رسول میں اللہ نے کوئی کمال رکھا، کسی میں کوئی کمال رکھا، کوئی رسول کمالات سے خالی نہیں، لیکن جزوی فضیلت ہر کسی کو دوسرے کے مقابلے میں ہے، کہ ایک رسول کے اندر کوئی خصوصیت ایسی ہے جو دوسرے رسول میں نہیں ہے۔ اور کلی فضل اور من کل الوجوہ فضیلت دلائل کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ثابت ہے، جیسے

حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا فَخْرَ. بِیَدِیْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ: میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں، اور میں یہ بات کوئی فخر کے طور پر نہیں کہتا یعنی اظہارِ واقعہ کے طور پر یہ بات بیان کرتا ہوں، اور قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہی ہوگا: ''وَمَا مِنْ نَّبِیٍّ یَوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِیْ''(۱) آدم اور آدم کے علاوہ جتنے رسول گزرے ہیں وہ سارے کے سارے میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، اور یہ جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے یہ اعلان فرمایا جس میں یہ بات آ گئی کہ کلی فضیلت سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ہے، ویسے کوئی رسول فضائل سے خالی نہیں، ہر رسول میں کوئی نہ کوئی ایسی فضیلت موجود ہے جو دوسرے میں موجود نہیں، من وجہ ہر کسی کو دوسرے سے افضل کہہ سکتے ہیں۔

مسئلہ تفضیلِ انبیاء علیہم السلام پر آیات و روایات میں تعارض اور اُس کا حل

تو حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللهِ انبیاء کے درمیان فضیلت نہ بیان کیا کرو، کہ ایک کو دوسرے کے مقابلے میں فضیلت دو۔ لَا تُخَیِّرُوْنِیْ عَلٰی مُوْسٰی: مجھے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں افضل نہ قرار دو، خیر نہ قرار دو۔ ''لَا اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی''(۲) میں نہیں کہتا کہ یونس بن متّی سے کوئی بھی بڑھیا ہے، یونس بن متّی سے حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی آپس میں تفضیل نہیں کرنی چاہیے، اور قرآنِ کریم میں آیت آئی: ''لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' (سورۂ بقرۃ: ۲۸۵) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے۔ ان روایات اور ان آیات کا آپس میں مطلب کس طرح سے واضح ہوگا؟ تو اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی رسول بنایا اُس کو کچھ نہ کچھ خصوصیات ایسی دی ہیں جو دوسروں میں موجود نہیں ہیں، اس کو کہتے ہیں فضیلتِ جزوی، ایسی فضیلت ہر پیغمبر کو دوسرے پر ہے، مثلاً یہ جو لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللهِ کا لفظ حدیث شریف میں آیا ہے وہ ایک واقعہ کے ضمن میں ہے، مدینہ منورہ میں ایک مسلمان کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، آپس میں گفتگو کرتے ہوئے مسلمان نے قسم کھائی: وَالَّذِی اصْطَفٰی مُحَمَّدًا عَلَی الْعَالَمِیْنَ! قسم اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو عالمین کے مقابلے میں چُن لیا! اور آگے سے یہودی نے قسم کھائی: وَالَّذِی اصْطَفٰی مُوْسٰی عَلَی الْعَالَمِیْنَ! کہ قسم اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو عالمین کے مقابلے میں چُن لیا! تو وہ انصاری مسلمان کہنے لگا: وعلی محمدٍ؟ کہ محمد ﷺ کے مقابلے میں موسیٰ کو چُنا؟ فَلَطَمَ وَجْهَ الْیَهُوْدِیِّ اور یہودی کے منہ پر ایک تھپڑ لگایا یہ کہتے ہوئے کہ کیا محمد ﷺ کے مقابلے میں بھی اللہ نے موسیٰ کو چُنا ہے؟ یعنی وہ موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو یہودی کے منہ سے سن نہیں سکا، اس لیے غصے میں آکر ایک تھپڑ لگا دیا۔ یہودی سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آیا، اور آکر واقعہ ذکر کیا، اُس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا یہ انداز اچھا نہیں ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان میں تم اس طرح سے بات کرو جس میں کسی دوسرے کی تنقیص یا تحقیر لازم آتی ہو۔ تمہیں کیا پتہ موسیٰ علیہ السلام کی شان کا؟ قیامت کے دن جب لوگ سارے کے سارے بے ہوش ہوں گے، میں بھی بے ہوش ہوں گا، اور میرا خیال یہ ہوگا کہ سب سے پہلے ہوش مجھے آئی ہے، فَاَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یُّفِیْقُ میں پہلا ہوں گا جس کو ہوش آئی ہے، لیکن جس وقت میں دیکھوں گا تو

(۱) سنن الترمذی ج ۲ ص ۲۰۳ باب فی فضل النبی ﷺ / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۱۳ عن ابی سعید ؓ، باب فضائل سید المرسلین، فصل ثانی۔

(۲) پہلی اور تیسری حدیث بخاری ار ۴۸۵ باب قول اللہ وان یونس الخ۔ اور دوسری حدیث بخاری ار ۳۲۵، مشکوٰۃ ۲ر ۵۰۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے، یعنی وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آگئے، یا اللہ تعالیٰ نے اُن کو ویسے ہی مستثنیٰ کرلیا اور وہ بے ہوش ہی نہیں ہوئے۔[1] یہ دیکھو! اُن کی جزوی فضیلت بیان کردی کہ مجھے ہوش بہر حال موسیٰ علیہ السلام کے بعد میں آیا، یا تو موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہی نہیں ہوئے، بلکہ صعقہ طور کے عوض میں اُن کو اس بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیا گیا، طور پر جو اللہ کی تجلی دیکھ کر بیہوش ہوگئے تھے بس اس بیہوشی کی وجہ سے آخرت میں اب وہ بیہوش ہی نہیں ہوئے، یا اگر بیہوش ہوئے تھے تو اُن کو مجھ سے پہلے ہوش آگئی۔ یہ اُن کی ایک جزوی فضیلت بیان کردی، اور اُس وقت سمجھایا کہ تم لوگ اپنی رائے کے ساتھ اپنے خیال کے مطابق انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے کے مقابلے میں فضیلت نہ دیا کرو۔ کون افضل ہے اور کون افضل نہیں؟ یہ اللہ جانتا ہے، اور کسی نبی کے کمالات وہی ذکر کیے جاسکتے ہیں جو اللہ نے بتادیے، باقی! اللہ کے نزدیک مرتبہ کس کا بلند ہے اور کس کا بلند نہیں ہے، یہ کسی دوسرے کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں! البتہ شرعی دلیل کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے بیان کے ساتھ یا اللہ کے رسول کے بیان کے ساتھ جو فضیلتیں اور کمالات اُن کے لئے ثابت ہیں اُن کا تذکرہ کیا جائے گا۔

مختلف انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ایک خصوصیت کو یہاں واضح کیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست بات کی، مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ انبیاء میں سے بعض وہ ہے کہ اللہ نے اس کے ساتھ کلام کی، اِس کا مصداق اس دنیا میں رہتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، کہ طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی کلام اُن کے ساتھ براہِ راست ہوئی بلاواسطہ فرشتوں کے۔ اور سورۂ شوریٰ میں ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (آیت:۵۱) اُس کا مطلب یہ ہے کہ اِس دنیا کے اندر رہتا ہوا آمنے سامنے ہوکر بلا حجاب گفتگو کوئی بشر نہیں کرسکتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام سے بات تو ہوئی ہے، لیکن مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ہوئی ہے، بغیر حجاب کے نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ کی ذات سامنے نمایاں نہیں تھی، اللہ تعالیٰ کی آواز اور اللہ تعالیٰ کی گفتگو براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنی، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمال ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ کمالات دیے، کہ جبریل ہر وقت اُن کی تائید کے لئے اُن کے ساتھ رہتے تھے، اور واضح واضح معجزات جن کا قرآنِ کریم میں اعلان کیا گیا، مردوں کو زندہ کرتے تھے، ابرص کو تندرست کردیتے تھے، مادرزاد اندھوں کو اچھا کردیتے تھے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصوصی معجزات ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر ذکر کیے گئے، اور یہ معجزات یعنی اِحیائے موتیٰ، اِبرائے ابرص اور اکمہ اتنی وسعت کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی دوسرے نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیے۔ اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آئے گا وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (سورۂ اسراء:۵۵) ہم نے بعض نبیوں کو بعض کے مقابلے میں فضیلت دی، اور داؤد علیہ السلام کو ہم نے زبور دی۔ تو انبیاء علیہم السلام میں بہت کم ہیں جن کو کتابیں ملی ہیں، اور اُن میں خصوصیت حضرت داؤد علیہ السلام کی ہوئی کہ اُن کو زبور دے دی، اُن کے ہاتھ میں لوہے کو نرم کردیا۔ سلیمان علیہ السلام کے ایسے معجزات قرآنِ کریم نے ذکر کیے جو دوسروں میں نہیں پائے جاتے۔ اور اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ قرآنِ کریم نے کچھ اس انداز میں کیا ہے، کہ

---

(۱) دیکھیں بخاری ۱/۳۲۵، کتاب الخصومات کا شروع۔ مشکوۃ ۲/۵۰۷، باب بدء الخلق۔ نوٹ: وعلی محمص، کے الفاظ بخاری ۲/۶۶۸ پر ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی اُن پر کچھ گرفت ذکر کی گئی ہے، تو کوئی اُن واقعات کو پڑھ کے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق یہ خیال نہ کرے کہ یونس علیہ السلام نعوذ باللہ کوئی ایسی شخصیت تھی جن میں کوئی نقص یا کوئی کمی پائی جاتی تھی، اس لیے سرور کائنات ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ کہا کہ لَآ اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ کوئی بھی یونس بن متی سے بہتر ہے (حوالہ گزر چکا) یونس بن متی کو تو اللہ نے بہت بہتری دی۔ اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ جو کہتا ہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے۔[1] اور خصوصیت کے ساتھ یونس بن متی علیہ السلام کا نام لے کر ذکر اس لیے کیا کہ قرآنِ کریم میں ایک جگہ لفظ آگئے فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (سورۂ قلم: ۴۸) اپنے رب کے حکم پر جما رہ، اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جانا، مچھلی والے سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر گرفت کی تھی تو کسی کا ذہن اِدھر نہ جائے اور یونس علیہ السلام کی تحقیر اُس کے ذہن میں نہ آجائے، اس لیے فرمایا کہ میں تو نہیں کہتا کہ یونس بن متیٰ سے بھی کوئی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہر پیغمبر کے ساتھ اُس کی حکمت کے تحت ہے، سب کو اللہ نے فضیلت دی ہے، کسی کو کسی نہج سے، کسی کو کسی نہج سے، کلی فضیلت دلائل کے ساتھ سرور کائنات ﷺ کے لئے ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی ساری جماعت چونکہ جماعت حقہ ہے، اس لیے اُن سب پر ایمان لانا ضروری ہے، ایک نبی کا دامن پکڑ کے دوسرے کی تحقیر کفر ہے، اتنی وسعت ہر کسی کے ذہن میں اگر ہو تو مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احترام کریں گے، اور یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام کریں گے، عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور حضور ﷺ کا احترام کریں گے، اور یہ جو اپنے اپنے فرقے کا تعصب ہے اُس کے اندر یقیناً کمی آجائے گی۔

علماء اور اولیاء کی تحقیر برکات سے محرومی کا باعث ہے

یاد رکھئے! علمائے کرام اور مشائخ بھی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، جیسے کہ پہلے پارے کے آخر میں يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کے ضمن میں آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، کہ سرورِ کائنات ﷺ کی تزکیہ کی شان مشائخ میں نمایاں ہے، اور تعلیمِ کتاب وحکمت کی شان علماء میں نمایاں ہے، اور تلاوتِ کتاب کی شان قاریوں میں نمایاں ہے، یہ سارے طبقات ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے درجات کے ساتھ حضور ﷺ کی جانشینی سے نوازا ہے۔ جب یہ انبیاء علیہم السلام کے ورثاء ہیں تو اس ضابطے کا تقاضا یہی ہے کہ اِن کے متعلق بھی کچھ ایسے ہی جذبات ہوں، چاہے آپ کا تعلق ایک عالم سے ہے، اور اسی طرح آپ کا روحانی تعلق کسی ایک شیخ سے ہے، لیکن جہاں تک دوسرے مشائخ اور دوسرے علماء کا تعلق ہے اُن کا احترام آپ کے دل دماغ کے اندر اس نسبت سے باقی ہونا چاہیے کہ یہ بھی سارے کے سارے دین کے حامل ہیں، اور یہ سارے کے سارے سرورِ کائنات ﷺ کی جانشینی میں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، تعلیمِ کتاب وحکمت کرتے ہیں، تبلیغ کرتے ہیں، جیسا جیسا اللہ تعالیٰ نے مقام دیا اُس کے مطابق یہ لگے ہوئے ہیں، سب کا احترام دل کے اندر ہونا چاہیے، ایک کا دامن پکڑ لینے کے بعد دوسروں کی تحقیر یا تنقیص یا ان پر تنقید اس انداز کے ساتھ کہ معلوم ہو یہ کچھ بھی نہیں ہے، یہ بھی انبیاء علیہم السلام کے اِن جانشینوں کے ساتھ ایک قسم کا ظلم ہے۔ اور اگر آپ اپنے دماغ

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۶۲، کتاب التفسیر سورۃ النساء کا آخر۔ ولفظ الحدیث: مَنْ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى فَقَدْ كَذَبَ.

کے اندراتنی وسعت رکھیں گے کہ اپنے اساتذہ کا ادب ضرور کریں، لیکن جو آپ کے اساتذہ میں شامل نہیں، اہل علم ہونے کی وجہ سے اُن کا احترام بھی آپ کے دل میں ہو، اپنے شیخ کی آپ تعظیم ضرور کریں، احترام کا تعلق اُس کے ساتھ ضرور رہو، لیکن باقی مشائخ کا بھی ادب احترام اور عظمت آپ اپنے دل دماغ میں محسوس کریں، پھر یہ فرقہ بازی، تعصب اور پارٹی بازی جو ہوجایا کرتی ہے اِس میں یقیناً کمی آجائے گی۔ فساد یہیں سے آتا ہے کہ ایک شخص ایک کا دامن پکڑ لیتا ہے اور پھر دوسروں کو سمجھتا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہیں، اور پھر اپنے شیخ کی یا اپنے استاذ کی اس طرح سے فضیلت بیان کرتا ہے کہ دوسرے کی اُس میں تحقیر ہوجاتی ہے، اور یہ انداز غلط ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قسم کا انداز تو ویسے ہی کفر تک پہنچا دیتا ہے، اور اولیائے امت کے ساتھ یا علمائے امت کے ساتھ اس قسم کا انداز کہ ایک کے ساتھ اعتقاد لگا لینے کے بعد دوسروں کی انسان تحقیر کرے یا اُن کی عظمت اپنے دل میں نہ رکھے، یہ بہت ساری برکات سے محرومی کا باعث بن جاتا ہے۔ تو اَلْمُرْسَلِیْنَ کے تذکرے کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں رسولوں کا ذکر کردیا، جس میں بعض بعض انبیاء علیہم السلام کے کمالات کی طرف اشارہ کردیا، اور بتا یہ دیا کہ یہ ساری کی ساری جماعت باکمال ہے، کسی کو فضیلت اللہ تعالیٰ نے کسی انداز کے ساتھ دی اور کسی کو فضیلت کسی انداز کے ساتھ دی۔

خلاصۂ آیات

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض کے مقابلے میں بڑھایا، بعض کو بعض پر فضیلت دی، اِن میں سے بعض وہ ہے جس سے اللہ نے کلام کی، یعنی براہِ راست بلاواسطہ فرشتوں کے، اس کا اتم مصداق دنیا کے اندر رہتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، اور مقصد بھی یہاں دنیا میں ہی اِس کمال کے عطا کرنے سے ہے، ورنہ روایات سے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی کلام براہِ راست ہوئی، اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حاشیے کے اندر اِسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ بعض ان میں ایسے ہیں کہ ان سے بات کی خدا تعالیٰ نے جیسے آدم اور موسیٰ علیہ السلام۔ اور لیلۃ المعراج میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی گفتگو بلاواسطہ فرشتوں کے ہوئی، لیکن یہ ہے عالم آخرت میں، یعنی اِس دنیا میں رہتے ہوئے اِس زمین پر ایسا نہیں ہوا، جس طرح سے مرنے کے بعد ہم آخرت میں منتقل ہوجائیں گے تو وہاں اہل جنت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی گفتگو براہِ راست ہوگی، فرشتوں کا واسطہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ براہِ راست سلام کہیں گے اور جنتی سنیں گے، اسی طرح وہ زمانِ آخرت ہو تو بھی ٹھیک ہے، اور اب اگر کوئی شخص عالم آخرت میں پہنچ جائے، اِس زمین کی حدود سے خارج ہوجائے، اللہ تعالیٰ اُس کو وہیں پہنچا دے جہاں جنت ہے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام بیٹھے ہیں، زندہ بیٹھے ہیں، اِسی زندگی کے ساتھ بیٹھے ہیں، عالم دنیا سے چلے گئے، عالم آخرت میں ہیں، اگرچہ زمانِ آخرت نہیں آیا لیکن مکانِ آخرت ہے جس کے اندر وہ موجود ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی گفتگو بلاواسطہ اگر ہو تو اُس کی نفی نہیں، اِس دنیا میں رہتے ہوئے اِس زمینی زندگی میں بیداری کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کی گفتگو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوئی، کسی دوسرے کے ساتھ بلاواسطہ نہیں ہوئی۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ: بعض کو بعض پر درجوں میں فضیلت دی، یعنی من وجہ فضیلت، کسی کا کوئی درجہ بڑھایا اور کسی کا کوئی درجہ بڑھا دیا۔ ''اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو ہم نے واضح

دلائل دیے، اور ان کو روح القدس کے ساتھ قوت دی'۔ تو سارے رسولوں پر ایمان لانا اور ان کے کمالات کا معتقد رہنا ایمان کی بنیادی شرط ہے۔

اِنسانوں کا آپس میں اختلاف اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے

اگلے الفاظ (وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ) میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے، کہ رسول تو بڑے بڑے درجوں والے آئے لیکن اُن پر سب لوگ ایمان نہیں لائے، بلکہ کسی نے مانا اور کسی نے نہ مانا، کسی نے اُن کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ایمان قبول کیا اور کسی نے نہ قبول کیا۔ اب اِس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ آپ کا خالق ہے، آپ کے جذبات اور آپ کے خیالات سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فطری طور پر انسانوں کو بھی مجبور پیدا کر دیتا کہ سوائے ایمان اور نیکی کے وہ کوئی راستہ اختیار نہ کر سکتے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو ایسا پیدا کیا اور اُن کی مشینری کچھ اس قسم کی بنائی کہ جب بھی وہ چلتی ہے اللہ کے احکام کے مطابق چلتی ہے، اُن کو معصیت کرنے کا اختیار ہی نہیں، اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کو بھی ایسا بنا دیتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ پھر انسانوں کے اندر یہ جو اختیار والا کمال ہے اللہ تعالیٰ یہ چھین لیتا، انسانوں کو اختیار حاصل نہ ہوتا، ایک ہی طرح سے اُن کی خلقت رکھی جاتی اور وہ اُسی طرح سے اُس کے مطابق چلتے جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ انسانوں کو اختیار دیا جائے، جب یہ اختیار والا کمال انسان کو ملا تو اُس کا لازمی نتیجہ ہے کہ آپس میں اختلاف بھی ہوا، اور اس پر پھر وہ حکمتیں مرتب ہوں گی جو اللہ کو مطلوب ہیں۔

اِختیار کے نتیجے میں اِختلاف آتا ہے

اب یہ اختلاف جو انسانوں کے اندر ہوتا ہے یہ انسانوں کی صفتِ اختیار کی بناء پر ہے، جس طرح سے یوں سمجھیں، مثال کے طور پر آپ کی خدمت میں عرض کروں، انسان کے کمالات میں سے اختیار ایک بہت بڑا کمال ہے، کہ یہ جدھر کو چاہے جا سکتا ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، اپنے آپ کو مختار محسوس کرتا ہے، اس کی مشینری اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی کہ اِس کا گیر ہر طرف لگتا ہے۔ اگر آپ حضرات کو ایک چیز طے کر کے بطور حکم کے سنا دی جائے کہ آپ نے یوں کرنا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ آپ سارے اُس طرح سے کرنے لگ جائیں، اور اُس کے خلاف آپ سوچنا ہی چھوڑ دیں گے، بس ایک حکم دے دیا گیا، اس کے مطابق آپ چل پڑیں گے، جیسے میں کہہ دوں کہ یہیں سے اُٹھو اور جا کر مسجد کے صحن میں بیٹھو، کسی لڑکے کو کمروں میں جانے کی یا کسی اور طرف جانے کی اجازت نہیں ہے، وہاں جا کے دھوپ میں بیٹھ کے سبق یاد کرو، یہ بات میں نے آپ کے اختیار پر نہیں رکھی، تو آپ سارے کے سارے یہیں سے اٹھیں گے اور جا کر مسجد کے صحن میں دھوپ میں بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگ جائیں گے، اور اگر میں آپ کو اختیار دے دوں کہ جاؤ، جا کر سبق یاد کرو، تمہاری مرضی ہے درسگاہوں کے سامنے چبوترے پہ بیٹھ جاؤ، مرضی ہے مسجد میں بیٹھ جاؤ، مرضی ہے اپنے اپنے کمروں میں جا کے بیٹھ جاؤ، میں نے تو سبق یاد لینا ہے، مجھے اس سے بحث نہیں کہ تم کہاں بیٹھتے ہو۔ تو کیا آپ حضرات کا اتفاق ہو جائے گا کہ ہم کہاں بیٹھیں؟ کوئی کمروں کی طرف چلا جائے گا، کوئی چبوترے کی طرف چلا جائے گا، کوئی کہیں چلا جائے گا، تو

دیکھو! اختیار کے نتیجے میں اختلاف آتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ انسانوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اختیار کی صفت ختم ہو جانی چاہیے جو کہ انسان کا ایک خصوصی امتیاز ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اُس اختیار کو کوئی صحیح استعمال کرے، کوئی غلط استعمال کرے، لیکن اختلاف نتیجہ اختیار کا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں مختار نہ بناتا اور اختیار نہ دیتا اور تمہیں ایک ہی طرح کے پیدا کر دیتا تو سارے کے سارے ایک ہی راستے پہ چلتے، تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایمان کے سلسلے میں لوگوں کو مجبور نہیں کیا، کہ لوگ ایمان ضرور لائیں، بلکہ اُن کو مختار کر دیا، وہ اپنی عقل کے ساتھ سوچیں، دلائل کے اندر غور کریں، جو ایمان لانا چاہے لائے، جو نہیں لاتا نہ لائے۔

رسول اللہ ﷺ کو تسلی

رسولوں کی جماعت آئی، فضیلتیں لے کر آئی، کمالات لے کر آئی، لوگوں کے سامنے جس وقت انہوں نے دین واضح کیا، سب نے نہیں مانا، اپنے اختیار کی صفت کی بناء پر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا، پھر اس کے نتیجے میں آپس میں لڑائیاں بھی ہوئیں، (جیسے پیچھے لڑائی کا ذکر آیا تھا وہ بھی تو آخر اسی اختیار کا ہی نتیجہ ہے)، اس لیے آپ بھی تسلی رکھیں اگر سارے کے سارے لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، نہ یہ کوئی افسوس کی بات ہے، یہ تو پہلے سے عادت اسی طرح سے چلی آ رہی ہے، جب آپ پر بھی بعض لوگ ایمان لائیں گے اور بعض لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو اس کے نتیجے میں آپ کے ساتھ لڑائی بھی ہوگی۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کے لئے بطور تسلی کے یہ لفظ بیان فرمائے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے بعد آنے والے لوگ آپس میں نہ لڑتے۔ کیسے نہ لڑتے؟ کہ اللہ چاہتا تو ان کو ایک ہی راستے پہ چلا دیتا، اِن کے اختیار کی صفت کو ختم کر دیتا، یہ سارے کے سارے فرمانبردار ہوتے، صحیح راستے پہ چلنے والے ہوتے، نہ آپس میں اختلاف ہوتا نہ لڑائی ہوتی۔ ''بعد اس کے کہ اِن کے پاس واضح دلائل آ گئے، لیکن انہوں نے آپس میں اختلاف کیا'' کوئی ایمان لایا اور کوئی ایمان نہ لایا بلکہ کفر کیا۔ ''اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے''۔ اور یہاں ''جو چاہتا ہے'' کا مصداق یہ ہوا کہ اللہ نے یہی چاہا کہ انسانوں کو مجبور نہ کیا جائے، انسانوں کو اختیار کی صفت دے دی جائے، اور اپنے اِس اختیار کی صفت کے ساتھ وہ آزادی کے ساتھ مانیں یا اختلاف کریں، اللہ نے یہاں یہی چاہا، اِسی میں حکمت ہے، اور اسی کے نتیجے میں مؤمن اور کافر بھی موجود رہیں گے، اسی کے نتیجے میں آپس میں لڑائی بھی ہوگی، اللہ تعالیٰ کی مشیت یہاں یہی ہے، اس لیے اگر آپ کے سمجھانے سے یہ لوگ نہ سمجھیں تو آپ اِس پر افسوس نہ کریں، آپ کے لئے یہ کوئی زیادہ حسرت اور افسوس کی بات نہیں ہونی چاہیے، پہلے انبیاء ﷺ سے بھی لوگوں کا طریق یہی چلا آ رہا ہے۔

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا'' کا ماقبل سے ربط

یہاں تک جو مضمون آپ کے سامنے آیا یہ اصل کے اعتبار سے وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی تفصیل چلی آ رہی تھی، کہ لڑنے کا حکم دیا تھا اور اُس لڑنے کے حکم کی وضاحت کے طور پر اور ترغیب وتشویق کے طور پر طالوت اور جالوت کا قصہ سنایا گیا، پھر اس واقعہ کے دلیلِ نبوت ہونے کے اعتبار سے اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کا تذکرہ آ گیا، اور اسی مناسبت سے رسولوں کا کچھ ذکر ہو گیا۔ اب

پھر مضمون عود کرتا ہے اُسی سابق بات کی طرف، کہ جس وقت یہ مضمون شروع ہوا تھا تو دو باتیں ذکر کی گئی تھیں ایک انفاق فی سبیل اللہ اور ایک قتال فی سبیل اللہ، قتال فی سبیل اللہ کی کچھ وضاحت ہوگئی، اب یہاں سے انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، آگے بقیہ سورت میں زیادہ تر مسئلہ انفاق فی سبیل اللہ سے ہی متعلق ہے، درمیان میں ضمنی طور پر کچھ مضمون اور آجائیں گے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کیسے آسان ہوگا؟

یہ آیت ترغیب کے لئے ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دیر نہ کرو، معلوم نہیں پھر نیکی کا موقع رہے گا یا نہیں۔ ''خرچ کرلو'' یہ جلدی کرنے کی ترغیب ہے۔ ''اے ایمان والو! خرچ کرلو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا''، جہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ انفاق کا حکم دیتے ہیں وہاں مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ کا لفظ بولتے ہیں، یہ لفظ مستقل ایک ترغیب ہے اور انفاق کے حکم میں آسانی پیدا کرنے والا ہے، کہ جب آپ سوچیں گے کہ اللہ تعالیٰ جو ہمیں خرچ کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں وہ چیز بھی تو اُسی کی دی ہوئی ہے، اپنی حکمت کے تحت وہ چیز اُس نے ہمیں دی، ہماری طرف منسوب کردی کہ یہ تمہارا مال ہے، اور پھر کہا کہ اُسی میں سے میرے راستے میں خرچ کرو، اور پھر وہ خرچ کرنا بھی ایسا کہ جس کا نفع بھی لوٹ کے تمہاری طرف ہی آئے گا، اِن باتوں میں اگر انسان غور کرے تو غور کرنے کے بعد انفاق اُس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔ ''خرچ کرلو اُس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا قبل اِس کے کہ ایسا دن آجائے'' حاصل اس کا یہ ہے کہ جب وہ دن آجائے گا تو اگر دنیا میں کوئی نیکی نہیں کی تو اب اُس کی تلافی نہیں ہوسکے گی۔

قیامت کے دن خرید وفروخت اور دوستی کام نہیں آئے گی

تلافی کی کیا صورت ہے؟ جس طرح سے دنیا میں بازار لگتے ہیں، خرید وفروخت ہوتی ہے، آپ ایک چیز دیتے ہیں، دوسری لے لیتے ہیں، وہاں ایسا موقع نہیں ہوگا کہ آپ کسی سے نیکیاں خرید لیں، وہاں نیکیوں کی کوئی خرید وفروخت نہیں ہوگی، کہ نیکی یا ایمان وہاں سے تم خرید لو، ایسا نہیں ہوسکتا، یہ صورت تو بالکل ہی واقع نہیں ہے۔ اور پھر دوسرے نمبر پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز وقت پر آپ نے حاصل نہ کی، ضرورت پیش آگئی، کسی دوست کے پاس تھی، آپ اُس کی اٹھالاتے ہیں استعمال کرنے کے لئے، دنیا میں یہ طریقہ بھی چلتا رہتا ہے، کہ اگر ایک وقت آپ کے پاس ایک چیز موجود نہیں ہے، کسی دوست کے پاس موجود ہے، تو آپ جاتے ہیں، دوست سے پیسے بھی لے آتے ہیں، چیز بھی لے آتے ہیں، اور وقت پر فائدہ اٹھالیتے ہیں، تو قیامت کے دن بھی یہ یاری دوستی چل جائے اور کوئی شخص دوستی کے تعلق کی بناء پر تمہیں اپنی نیکیاں دے دے ایسا بھی نہیں ہوگا، وہاں سب نفسی نفسی ہوگی، افراتفری ہوگی، کوئی شخص اپنی نیکیوں کا ایثار کسی دوسرے کے لئے نہیں کرے گا، یعنی یہ صورت بھی یا تو بالکل واقع نہیں ہے، اور اگر واقع ہوگی تو بالکل شاذ ونادر، وہ بھی بعض ضعیف روایتوں کے اندر کچھ اس قسم کے واقعات آتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی نیکی دوسرے کو دے دے گا، لیکن وہ اتنی شاذ ہوگی جس کا وقوع عام نہیں ہے، اور اگر اُن روایات کا اعتبار نہ کیا جائے تو یہ بھی واقع نہیں۔

عقیدۂ سفارش میں صحیح اور غلط پہلوؤں کی تفصیل

اور ایک تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آپ کسی گرفت میں آ گئے، آپ کا کوئی تعلق والا حاکم کے پاس جاتا ہے، اور جا کر سفارش کر کے کہہ سن کے آپ کو چھڑا لیتا ہے، یہ صورت بھی وہاں نہیں ہوگی، وہاں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اختیاری نہیں ہوگی، جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ اجازت نہیں دیں گے اُس وقت تک یہ واقع نہیں ہوگی، جب اللہ کی اجازت کے بغیر واقع نہیں ہوگی تو یہ صورت بھی اختیاری نہیں ہے، اور قابل اعتماد یہ بھی نہ ہوئی۔ قابل اعتماد وہ چیز ہوتی ہے جو واقع ہو، پھر کثیر الوقوع ہو، اور پھر اپنے اختیار میں ہو۔ سفارش اختیار میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے تو ہوگی، نہیں اجازت دیں گے تو نہیں ہوگی، جس کے لئے اجازت دیں گے ہوگی، جس کے لئے اجازت نہیں دیں گے نہیں ہوگی، تو پھر یہ کوئی قابل اعتماد ذریعہ نہ ہوا نجات پانے کا، اس لیے اس پر بھی اعتماد نہ کرو۔ جاہلیت کے زمانے میں سفارش کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ تھا جس نے لوگوں کے اندر آخرت کی اہمیت ہی ختم کر دی، جب یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارا تعلق ایک ایسے آدمی سے ہے جو بہر حال ہمیں چھڑا لے گا، آج دنیا کے اندر فتنہ وفساد کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ ایک آدمی کا کسی بڑے آدمی سے تعلق ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں، اول تو پوچھے گا کوئی نہیں، اور اگر میں کسی گرفت میں آ بھی گیا تو فلاں جائے گا اور جا کر چھڑا لے گا، جب یہ اعتماد انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو بدعملی آ جاتی ہے۔ اور دنیا کے اندر بھی آپ دیکھتے ہیں کہ زمینداروں کے پاس بیٹھنے والے، بڑے لوگوں سے تعلق رکھنے والے، حاکم کے رشتے دار اور اُس کے دوست، یہ لوگ قانون کی پروا نہیں کیا کرتے، اکثر وبیشتر بدعملی اختیار کر لیتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ ہم فلاں سے تعلق رکھتے ہیں، اول تو ہمیں کوئی پکڑے گا نہیں، اور اگر پکڑے بھی گئے تو فلاں چھڑا لے گا۔ یہ ''فلاں چھڑا لے گا'' والی جو بات ہے یہ انسان کے اندر بدعملی پیدا کرتی ہے، قانون کا احترام نہیں رہتا۔ اور سفارش کا نظریہ ایسا ہے جو حق کو باطل کر دیتا ہے اور باطل کو حق کر دیتا ہے، مثلاً قانون کی گرفت میں آ گیا تو حق تو یہ ہے کہ اِس شخص کو سزا دی جائے، لیکن دوسرا اپنی طاقت اور زور کو استعمال کر کے اُس کو چھڑا لے گا تو اِس حق کو باطل کر دے گا، خلافِ حق فیصلہ کروا لے گا، قانون اور آئین کے خلاف فیصلہ کروا لے گا، یہی ظلم ہے اور عدل کے خلاف ہے۔ سفارش کے اس نظریے کا وقوع دنیا کے معاملات میں ہو تو دنیا کا نظم خراب، اور اگر آخرت کے معاملے میں کسی نے سفارش کا عقیدہ اپنا لیا تو آخرت کے بارے میں اس کے اعمال خراب، یہود نے یہی عقیدہ اپنایا، نصاریٰ نے بھی عقیدہ اپنایا، اور مشرکین مکہ نے یہی عقیدہ اپنایا، وہ کہتے تھے کہ جب ہمارا ان کے ساتھ تعلق ہے جو اللہ کے چہیتے ہیں تو اول تو اللہ کی گرفت ہوگی نہیں، ہوگی تو یہ چھڑا لیں گے، پھر کیا ضرورت ہے نیکی اختیار کرنے کی؟ کیا ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کی؟ اللہ تعالیٰ نے اِس نظریے کو باطل کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے جو بھی ہوں گے اُس کے علم کی وجہ سے ہوں گے، وہ اگلے پچھلے سب حالات کو جانتا ہے، علم کے مطابق اللہ کے فیصلے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی معلومات میں کسی نے کوئی اضافہ نہیں کرنا، سفارش کا ایک حاصل یہ بھی ہوتا ہے کہ فلاں بات آپ کے ذہن میں نہیں، اس کی طرف توجہ کرو، یہ شخص چھوڑنے کے قابل ہے، اس قسم کا اضافہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس لیے جو حق ہوگا وہی فیصلہ ہوگا، کوئی کہہ سن کے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تبدیل کروا کے حق کو

باطل نہیں بنا سکتا، یہ پابندی اس طرح سے لگادی۔ ہاں بعض بعض نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ یہ اعزاز دیں گے، کہ حالات تو اُس آدمی کے پہلے ہی چھوٹنے کے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے اس شخص کے اندر ایمان ہے، چھوٹ سکتا ہے، کچھ سزا بھی ہوسکتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی کہ اس کو چھوڑ دیا جائے، ایک آدمی کی عزت نمایاں کرنے کے لئے اللہ کہہ دے گا کہ تو اِس کی سفارش کردے، میں چھوڑ دوں گا، جس کو سفارش کی اجازت ہوگی وہ حق بات کہے گا، باطل بات نہیں کہے گا، اور اس کے کہنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ اُس کو جو چھوڑ دیں گے اِس میں محض اس سفارش کرنے والے کی عزت میں اضافہ کرنا مقصود ہوگا اور اس کا اعزاز مقصود ہو گا، یہی وجہ ہے کہ کافر کے معاملے میں سفارش نہیں ہو سکے گی، چاہے اس کا باپ ہو، چاہے بیٹا ہو، چاہے کوئی دوست ہو، وہ زبان ہی نہیں کھول سکے گا۔ بہرحال نجات پانے کا یہ ذریعہ اختیاری نہیں، اس لیے اس پر بھی اعتماد نہ کرنا، ''نیکی کرلو ایسا دن آنے سے قبل کہ پھر تم اس نیکی کی تلافی نہیں کرسکو گے، نہ خرید وفروخت کے ذریعے سے، نہ یاری دوستی کے ذریعے سے، نہ کسی کی سفارش کے ذریعے سے'' وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: کافر ہی ظالم ہیں، کافرون کا مصداق خاص طور پر یہاں وہ ہیں جو ایسے دن کے منکر ہیں، جو ایسے دن پر یقین نہیں رکھتے وہی ظالم ہیں، جو اپنے آپ پہ ظلم کرنے والے ہیں، اپنی حق تلفی کرنے والے ہیں، وہ فکر نہیں کرتے کہ ہم اپنے لیے کچھ کرلیں۔

آیت الکرسی کا ماقبل سے ربط

اب یہاں جو وَّلَا شَفَاعَةٌ کا لفظ آیا تھا اِس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت نمایاں ہے، اور ایسے طور پر حاکمیت نمایاں ہے کہ اُس کے فیصلوں کو تبدیل کروانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے، اُس کے فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کرا سکتا، کوئی زبردستی نہیں کرسکتا کہ اللہ کچھ کرنا چاہے اور آگے دوسرا کوئی کچھ کردے، تو شفاعت کی نفی سے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت نمایاں تھی اِسی سے مضمون عقیدۂ توحید کی طرف منتقل ہوگیا، کیونکہ جاہلیت کے زمانے میں عقیدۂ شفاعت مستقل شرک کا ایک شعبہ بنا ہوا تھا، اِس مناسبت سے (اگرچہ ذکر تو انفاق کا ہے، اور آگے بھی انفاق کے ہی احکام آئیں گے) یہ مضمون توحید کی وضاحت کی طرف منتقل ہوگیا۔

آیت الکرسی کی فضیلت

اگلی آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں، حدیث شریف میں اِس کی بہت فضیلت آئی ہے، ایک روایت میں ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی شخص نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا رہے جنت میں جانے سے اُس کے لئے صرف موت مانع ہے، کہ مرے گا تو مرنے کے بعد فوراً اُس کے لئے جنت ہے،[۱] یعنی برزخ میں بھی اس کے جنت والے حالات ہوں گے، اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اُس کو جنت دے گا۔ اور اسی طرح جس گھر کے اندر آیت الکرسی پڑھی جائے شیطان اُس گھر کے قریب نہیں آتا۔[۲] عظمت والی آیت ہے، فضیلت کے لحاظ سے قرآن کریم کی سب آیات کے مقابلے میں اس کو عظمت حاصل ہے،

---

(۱) مشکوۃ ۱/۸۹ باب الذکر بعد الصلوۃ فصل ثالث/ شعب الایمان ۴/۵۶۔

(۲) دیکھیں بخاری ۱/۳۱۰، باب اذا وکل رجلا الخ/۱/۴۶۳، باب صفۃ ابلیس۔ وغیرہ۔

سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا، (اُبی بن کعب جن کو سید القراء کہتے ہیں، "اَقْرَؤُهُمْ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ"[1]) کہ "اَیُّ آیَةٍ فِی الْقُرْآنِ اَعْظَمُ" قرآنِ کریم میں بڑی آیت کون سی ہے، یعنی عظمت کے لحاظ سے اعظم آیت کون سی ہے۔ تو انہوں نے کہا آیت الکرسی۔ تو حضور ﷺ نے شاباش دینے کے لئے جیسے ہاتھ مارا جاتا ہے اُن کو ہاتھ بھی مارا، اور فرمایا کہ ابوالمنذر! تجھے علم مبارک ہو،[2] کہ واقعی تو نے یہ صحیح سمجھا کہ عظمت کے لحاظ سے یہ آیت قرآنِ کریم کی آیات میں سے اعظم ہے۔ اور وجہ اُس کی یہی ہے کہ ان الفاظ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقیدۂ توحید کو بہت جامعیت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے، یہ آیت عقیدۂ توحید کی بہت ساری جزئیات پر مشتمل ہے جس کی بناء پر اس آیت کو عظمت حاصل ہے۔

آیت الکرسی اور اکابرین وعاملین کا عمل

اکابر کے معمول میں بعض آیات ہیں جن کو بطور وظائف کے وہ پڑھتے ہیں، اور اُس کی برکات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مظہری نے چند آیات کو آیاتُ العِزّ سے تعبیر کیا ہے، کہ اگر کوئی شخص اِن کی پابندی کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو دنیا میں عزت سے نوازتے ہیں، جن میں سے ایک آیت یہ بھی ہے، اور دوسرے نمبر پر آیت اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، اور شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ تک، اور اسی طرح سے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا، اِن آیات کی تلاوت کی فضیلت آتی ہے۔ تو یہ چھوٹے چھوٹے وظائف ہوتے ہیں، اِن کو اگر انسان اختیار کرلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ برکات نصیب فرماتے ہیں، اللہ کے نام میں بڑی برکت ہے۔ اور روایات میں جس کا ذکر آجائے وہ تو پھر پیٹنٹ چیز ہوجاتی ہے جو سرورِ کائنات ﷺ فرمادیں، مثلاً یہ صحیح روایات میں آگیا کہ آیت الکرسی پڑھنے کے ساتھ شیطان بھاگتا ہے، اور آپ کو معلوم ہوگا کہ جو جنات کا عمل کرنے والے ہیں یہ بھی ذکر کیا کرتے ہیں کہ اگر کسی کو جن لگ جائے تو آیت الکرسی پڑھی جائے، اور جنات کے کسی قسم کی تکلیف پہنچانے کا خطرہ ہو تو آیت الکرسی پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ اِن سب شریر چیزوں سے حفاظت فرمادیتے ہیں، تو اُن عاملین کے تجربے میں بھی یہ بات آئی ہوئی ہے۔

آیت الکرسی کی تشریح

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ، یہ تو نام ہے اُس ذات کا جو کہ جامع ہے صفاتِ کمال کے لئے، مُستَجمِع لِجمیعِ صفاتِ الکمال، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں اُس کے سوا، معبود صرف وہی ہے، عبادت کا حق صرف اُسی کا ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں۔ اَلْحَیُّ: وہ زندہ ہے، صاحبِ حیات ہے، حیات کی صفت اُس کے لئے کمال درجے کی ثابت ہے، نہ کبھی موت اُس پر وارد ہوئی نہ کبھی وارد ہوگی، سراپا حیات ہے۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حیات، علم، اور قدرت، یہی صفتیں ہیں جو اُمہاتِ صفات کہلاتی ہیں، باقی

(۱) مشکوۃ ۲/ ۵۶۶، باب مناقب العشرۃ، فصل ثانی/ ترمذی ۲/ ۲۱۹، باب مناقب معاذ بن جبل۔

(۲) مسلم ۱/ ۲۷۱، باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی/ مشکوۃ ۱/ ۱۸۵، کتاب فضائل القرآن، فصل اول۔

جتنی صفتیں ہیں ان سب کا مدار اِنہی پر ہے، حیات علم اور قدرت۔ تو وہ زندہ ہے، اُس میں موت کا شائبہ نہیں، نہ کبھی اُس پہ موت طاری ہوئی نہ کبھی طاری ہوگی، جیسے روایات میں حیّ کے ساتھ لا یموت کا لفظ ساتھ آتا ہے "حیٌّ لا یموتُ"[1] اَلْقَيُّوْمُ: خود قائم ہے بغیر کسی کے سہارے، اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، سنبھالنے والا ہے، اِس طور پر سنبھالنے والا ہے کہ اگر وہ نہ سنبھالے تو کوئی چیز اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی، ساری کائنات کو سنبھالنے والا وہی ہے۔ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اِن دونوں لفظوں کا مجموعہ بہت سی دعاؤں میں سرورِ کائنات ﷺ نے استعمال فرمایا، اس لیے اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ دونوں ناموں کا مجموعہ یہی اسمِ اعظم ہے، اکثر و بیشتر دعاؤں میں سرورِ کائنات ﷺ یہی لفظ استعمال فرماتے تھے، یاحیُّ یاقیومُ برحمتِكَ اَسْتَغِيثُ (ترمذی)...... اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِی لا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الحیُّ القَيُّوْمُ (ابوداؤد)۔ اور اس دُعا میں اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ بھی پڑھ سکتے ہیں، اور استغفر الله الذی لا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الحیَّ القَيُّوْمَ و اَتُوْبُ اِلَيهِ یعنی ان کو منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں ہیں، بلکہ حضرت انور شاہ صاحب کشمیری ؒ نے اِس کے منصوب ہونے کو ہی ترجیح دی ہے، استغفرُ اللهَ میں جو لفظِ الله ہے اُس کی صفت بنے گی الحیَّ القَيُّوْمَ۔

اللہ تعالیٰ نیند اور اُونگھ سے پاک ہے

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ: نہ اُس کو اونگھ پکڑتی ہے نہ نیند۔ اب یوں سمجھو کہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کے لئے یہ بات بطور دلیل کے ہے، یا اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کا نتیجہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "النومُ اخو الموتِ"[2] نیند موت کی بہن ہے، کہ جس وقت انسان سویا ہوتا ہے تو اس پر بھی کچھ آثار اس قسم کے نمایاں ہوتے ہیں جیسے کہ موت کے بعد نمایاں ہوتے ہیں، پنجابی میں بھی آپ کہتے ہیں "سویا مویا یک برابر"، کہ جو آدمی سویا ہوا ہو اور کوئی شخص اس کی کوئی چیز اٹھا کر لے جائے یا اور کوئی گڑبڑ ہو جائے تو اُس کو بسا اوقات پتہ ہی نہیں چلتا، ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ سو گیا انسان جیسے مر گیا۔ جب نیند موت کی بہن ہے، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا جنتی سویا بھی کریں گے اَيَنَامُ اَهْلُ الْجَنَّةِ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ النومُ اَخُو الموتِ ولا موتَ فی الجنة: نیند تو موت کی بہن ہے اور جنت میں موت نہیں (حوالہ گزر چکا)، جب موت نہیں ہے تو موت کے آثار بھی جنتیوں پر طاری نہیں ہوں گے، جنتی سویا نہیں کریں گے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ جو کہ سراپا حیات ہے اور نیند کے اندر موت کا شائبہ پایا جاتا ہے تو وہ اللہ تبارک و تعالیٰ پر کیسے طاری ہو سکتی ہے؟ تو اس کے حی ہونے کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ نہ اُس کو اونگھ آئے نہ نیند، نہ ہلکے درجے کی نیند نہ گہری نیند۔ سِنَةٌ کہتے ہیں اُس نیند کو جس کا اثر آنکھوں تک رہ جاتا ہے، اور نوم سے مراد ہے جو شدت کی نیند آجاتی ہے جس میں دماغ پر کچھ بے ہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اَلْحَيّ ہونے کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ، کہ قیوم کا معنی ہوا خود قائم رہنے والا اور دوسروں کو قائم رکھنے والا، اور آپ جانتے ہیں کہ دوسرے کو قائم وہی رکھ سکتا ہے اور خود قائم وہی رہ سکتا ہے (جس کو ہم اپنے الفاظ میں ادا

(۱) ترمذی ۱۸۱/۲، باب ما یقول اذا دخل السوق

(۲) مشکوٰۃ ۵۰۰/۲، باب صفۃ الجنۃ کا آخر۔ شعب الایمان ۴۰۹/۶، رقم ۴۴۱۶۔

کریں گے) کہ جس کے ہر وقت حواس ٹھکانے ہوں اور وہ چست ہو۔ اور جس پر ذرا سی اُونگھ طاری ہو جاتی ہے وہ اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا، کبھی گردن کدھر کو جائے گی، کبھی کدھر کو جائے گی، کبھی آگے کو گرے گا، کبھی پیچھے کو۔ تو نیند کی حالت میں تو انسان اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا، جب اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا تو کسی دوسری چیز کو کیسے سنبھالے گا؟، کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوگی تو کتاب گر جائے گی، کوئی اور چیز آپ کے ہاتھ میں ہوگی تو وہ گر جائے گی۔ کبھی بس کے اندر سفر کرو تو یہ نظارہ دیکھا کرو، کہ سواریوں میں اور ڈرائیور میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کہ سواریاں تو چونکہ اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتیں بس کو سنبھالنے کی، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ اگر پچاس سواریاں ہیں تو کسی کی گردن دائیں طرف لٹک رہی ہے، کسی کی بائیں طرف لٹک رہی ہے، کوئی آگے کو جھوم رہا ہے کوئی پیچھے کو جھوم رہا ہے، وہ اپنے آپ کو بھی سنبھالے نہیں بیٹھے ہوتیں، اور اگر یہی کیفیت ڈرائیور پر طاری ہو جائے تو بس بھی گئی اور پچاس کی پچاس جانیں بھی ساتھ ہی گئیں، اُونگھ آئی نہیں اور ایکسیڈنٹ ہوا نہیں، تو بس چونکہ ڈرائیور نے سنبھالنی ہے، اس لئے ڈرائیور کو چوکنا ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ اُس وقت سمجھ لیا کرو کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ قیومیت کا ایک ادنیٰ سا مظہر ہے، کہ اگر ڈرائیور پر اونگھ یا نیند طاری ہو جائے تو یہ بس نہیں سنبھالی جا سکتی، کیونکہ ذرا اُونگھ آئی اور جھٹکا لگا اور گئے۔ تو جس نے ساری کائنات کو سنبھالنا ہے اس کے لئے اِس قسم کی غفلت یا اُس کے لئے اونگھ اور نیند کا کیا سوال؟۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قیوم ہونے کا بھی تقاضا ہے کہ اُس کے اوپر نہ اُونگھ طاری ہو نہ نیند طاری ہو۔

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ: اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اللہ تعالیٰ کے جو دو نام آئے ہیں، لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا تعلق دونوں کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے، جیسے کل کے سبق میں آپ کے سامنے وضاحت کی گئی تھی، کہ اللہ تعالیٰ چونکہ سراپا حیات ہے، اُس کے اُوپر موت طاری نہ ہوئی نہ ہو سکتی ہے، اور نیند میں موت کی مشابہت پائی جاتی ہے، لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ پر طاری نہیں ہو سکتی۔ اور وہ قیوم ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے، خود قائم ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، اور جس نے دوسرے کو سنبھالنا ہو اُس پر بھی کسی قسم کی غفلت طاری نہیں ہو سکتی، اس لیے قیوم ہونے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر نیند بالکل طاری نہ ہو، نہ ادنیٰ نہ اعلیٰ۔ سِنَةٌ یہ نیند کا ادنیٰ حصہ ہے، ابتدائی حصہ، اور نوم میں غفلت تام ہوتی ہے، اور غفلت کی صورت میں دوسرے کو سنبھالا نہیں جا سکتا۔

ایک مثال سے وضاحت

اِس کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو ایک مثال کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں، وہ مثال ایک ناقص سی مثال ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی اِس صفتِ قیوم کو سمجھانے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو کماحقہٗ ہم اپنے الفاظ میں واضح نہیں کر سکتے، لیکن ایک ادنیٰ سی مثال پیش کرتا ہوں، جیسے آپ کے سامنے میں نے ایک حسی اور ظاہری مثال دی تھی کہ بس کا ڈرائیور بس کو سنبھالے ہوئے ہوتا ہے، اور اندر جو سواریاں ہوتی ہیں وہ بے فکر ہوتی ہیں، وہ تو سو بھی جاتی ہیں، غافل بھی ہو جاتی ہیں، اِدھر اُدھر لڑھکتی رہتی ہیں، لیکن اگر یہی کیفیت ڈرائیور پر طاری ہو جائے تو بس کسی صورت میں قابو میں نہیں رہ سکتی۔ تو ڈرائیور اللہ تعالیٰ کی صفتِ قیومیت کا مظہر ہوتا ہے، جس وقت وہ گاڑی کو چلاتا ہے۔ اِس سے بھی واضح مثال آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے ذہن میں ایک چیز کا تصور کرتے ہیں، آنکھیں

بند کر کے سوچو، زید کا تصور لے آؤ، یا کسی انسان کا تصور آپ اپنے دماغ میں لے آیئے، تو فوراً آپ نے اپنے دماغ میں ایک تصویر بنالی، یہ تصویر آپ کے دماغ کے ساتھ قائم ہے، اور آپ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ یہ اُس وقت تک ہی قائم ہے جب تک آپ اِدھر متوجہ رہیں گے، آپ کی توجہ ایک لمحہ کے لئے ہٹی اور وہ تصویر معدوم ہوئی۔ آپ اپنے ذہن میں تصور کر لیجئے، کہ آپ کھرڑ پکا کے اسٹیشن پر کھڑے ہیں، اور گاڑی آرہی ہے، اور لوگ سوار ہونے کے لئے تیار کھڑے ہیں، یہ سارے کا سارا نقشہ آپ اپنے ذہن میں لے آیئے، تو گویا کہ ایک عالم آپ کے ذہن میں آباد ہو گیا۔ یہ آباد کس وقت تک ہے؟ جس وقت تک آپ اِس کی طرف متوجہ ہیں، اور ذرا آپ کی غفلت ہوئی اور آپ کا خیال دوسری طرف ہوا تو یہ یکسر مٹ جائے گا۔ یہ بالکل ایک ویسی ہی مثال سمجھ لیجئے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا تعلق جو اپنی کائنات کے ساتھ ہے، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہی قائم ہے، زمین ہو، آسمان ہوں، جو کچھ بھی ہے، تحت الثریٰ سے لے کر فوق الثریا جتنا بھی عالم ہے، سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے قصد ارادے اور توجہ کے ساتھ قائم ہے، تو جس وقت تک اللہ تعالیٰ اِن کو سنبھالے رہے گا یہ سنبھلے ہوئے ہیں اور اِن کا وجود ہے، اور اگر کسی وقت بھی اللہ کی توجہ ہٹ جائے تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ عالم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا، اُسی وقت یہ سارے کا سارا سلسلہ ختم ہو جائے گا، اس لیے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ یہ قیوم ہونے کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے، کہ وہ خود قائم ہے اور دوسروں کو سنبھالنے والا ہے، تو اِس قیومیت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ اُس کے اُوپر کوئی ادنیٰ درجے کی غفلت طاری ہو نہ اعلیٰ درجے کی۔ تو ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہیں، کسی وقت مخلوق کی طرف سے غافل نہیں ہیں، لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (سورۂ ابراہیم: ۴۲) ظالم جو کچھ کرتے ہیں اِن سے اللہ تعالیٰ کو بے خبر نہ سمجھو، اللہ غافل نہیں ہے، كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (سورۂ رحمٰن: ۲۹)۔

اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور حاکمیت کا ذِکر

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: یہ اُس کی مالکیت کا ذکر آ گیا، اُسی کے لئے ہے (یہ لام ملکیت کے لئے ہے) اُسی کا مملوک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، سب میں ملکیت اُسی کی ہے۔ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ بول کر ساری کائنات مراد ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ: یہ اُس کی حاکمیت آگئی کہ اپنی کائنات کے اندر وہی حاکم ہے، وہی مدبر ہے، اپنے علم کے ساتھ جو عدل و حکمت کا تقاضا ہوتا ہے وہ فیصلہ کرتا ہے، ایسا کوئی شخص نہیں جو اُس کو اُس کی مرضی کے خلاف مجبور کر لے، کہ اللہ تعالیٰ ایک فیصلہ کرنا چاہے اور دوسرا اُس کی مرضی کے خلاف اُس کو مجبور کر لے، اُس کے سامنے کسی کو دَم مارنے کی طاقت نہیں ہے، کوئی بول نہیں سکتا، لَا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا: ایسے الفاظ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ آتے ہیں،[1] کوئی بول نہیں سکے گا جب تک رحمٰن اجازت نہ دے، جس کو اجازت ہوگی وہی بات کر سکے گا، پھر بات بھی وہ حق کہے گا، خلافِ حق کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کافروں کے لئے تو کسی کو سفارش کرنے کی اجازت ہی نہیں دیں گے، اُن کے حق میں تو شفاعت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوگا، اور مؤمنوں میں سے جس کے حق میں کسی کو بولنے کی اجازت دیں گے اس کی شفاعت

---

(۱) پارہ ۳۰، سورۂ نبأ۔ نیز یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورہ ہود: ۱۰۵) وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (سورۂ طٰہٰ: ۱۰۸) وغیرہ

ہوگی، اور یہ اجازت دینا بھی محض شفاعت کرنے والے کا ایک اعزاز ہے، کہ چھوڑنا تو اللہ نے ہے لیکن یہ کہلوا دیا کہ تم کہہ دو میں چھوڑ دیتا ہوں، اِس میں اُس کی عزت بڑھانا مقصود ہے جس سے کہلوا کے چھڑوالیا۔ باقی! کوئی شخص یہ اعتماد نہیں کرسکتا، کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہوگا، اور کوئی شخص اِس بارے میں مطمئن نہیں ہوسکتا کہ میرے بارے میں کسی کو کہنے سننے کی اجازت ہوجائے گی، اس لیے جولوگ اپنی بدعملی کے لئے اِس بات کو سہارا بناتے ہیں، کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں، فلاں کے شاگرد ہیں، فلاں کے مرید ہیں، ہمارا فلاں کے ساتھ تعلق ہے اور وہ اللہ کے محبوب ہیں، ہمیں وہ چھڑالیں گے، اِس اعتماد پر وہ اگر کوئی بدعملی اختیار کرتا ہے تو یہ پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ ''کون ہے جو اُس کے سامنے سفارش کرے مگر اُس کی اجازت کے ساتھ'' یعنی اُس کی اجازت کیساتھ ہی کوئی بول سکے گا، اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے سامنے نہیں بول سکتا، یہ اُس کی حاکمیت ہے اور اُس کی قہاریت ہے۔

اللہ کے لئے اِحاطۂ علمی کا اِثبات اور مخلوق سے اس کی نفی

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: اُس کا علم تام ہے، جو کچھ مخلوق کے سامنے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے، جو کچھ حاضر ہے اور جو کچھ غائب ہے، ماضی اور مستقبل، سب اللہ تعالیٰ جانتا ہے، جب اُس کا علم محیط ہے تو جو اُس کا فیصلہ ہوگا اُس کے اپنے علم کی بناء پر ہوگا، کوئی بول کر اُس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا؟ اس لیے جہاں بھی شفاعت کے نظریے کی نفی آتی ہے وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ ساتھ ساتھ اپنے علم کو ذکر فرماتے ہیں۔ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ: اللہ تعالیٰ تو مخلوق کے علم کو محیط ہے، مخلوق کا کوئی حال اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں، جتنی چیزیں مخلوقات کے علم میں ہیں وہ تو سب اللہ کے علم میں ہیں، لیکن اللہ کی معلومات میں سے کسی چیز کا لوگ احاطہ نہیں کرسکتے، اِلَّا بِمَا شَآءَ: مگر اتنی مقدار کا ہی جو اللہ چاہے، اِس میں سب مخلوق کے متعلق یہ اعلان ہوگیا، چاہے کوئی نیک ہے چاہے کوئی بد ہے، چاہے کوئی پیغمبر ہے چاہے کوئی فرشتہ ہے، کسی میں طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ کرلے، ہاں اُتنی مقدار ہی کسی کے علم میں آسکتی ہے جتنی اللہ چاہے، تو جس کے پاس جو علم ہوگا وہ عطائی ہوگا، اللہ تعالیٰ جتنا دے اتنا ملے گا، اور جو نہ دے اُس کا علم حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ علمی ہے۔

لفظ ''کرسی'' کی وضاحت

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: کرسی کا مفہوم متعین ہے، بیٹھنے کے لئے جو چیز اونچی بنالی جاتی ہے اُس کو ''کرسی'' کہہ دیتے ہیں، جس طرح تخت کے لئے ''عرش'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایک شخص اپنی مملکت میں جس اونچی نشست پر بیٹھ کر احکام جاری کرتا ہے اور مخلوقات کا نظم کرتا ہے اُس کو ہماری زبان میں کرسی یا تخت کہا جاتا ہے، ''فلاں شخص فلاں ملک میں تخت نشین ہے'' اِس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اُس ملک کے اندر حکومت اُس کی چلتی ہے، ''فلاں تخت نشین ہوگیا'' یعنی بادشاہ بن گیا اور اُس ملک کی حکومت اسے حاصل ہوگئی۔ اور آج اِس اقتدار اور اختیار کے لئے کرسی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، انگریزی میں کرسی کو چیئر کہتے ہیں، فلاں شخص چیئرمین ہے، چیئرمین کا معنی ہوتا ہے کرسی سنبھالنے والا، کرسی پر بیٹھنے والا آدمی، مَین آدمی کو کہتے ہیں، چیئرمین کا معنی کرسی کا مالک، کرسی کا آدمی جو اس کرسی کو سنبھالے گا۔ تو جس کو جس حلقے کے اندر اقتدار حاصل ہوجائے اُس کو کہتے ہیں کہ یہ فلاں شعبے کا چیئرمین

ہے، جیسے بھٹو صاحب پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے، اسی طرح ہر کمیٹی میں ایک چیئرمین ہوتا ہے، کرسی والا۔ اس لیے جس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مدمقابل کوئی نہیں، مجھ سے کوئی شخص اقتدار اور اختیار چھین نہیں سکتا، وہ کہتا ہے میری کرسی بڑی مضبوط ہے، کیا مطلب؟ کہ مجھ سے کوئی اقتدار اور اختیار نہیں چھین سکتا۔ تو کرسی نشین ہونا یا تخت نشین ہونا اقتدار اور اختیار کے حاصل ہونے سے کنایہ ہوتا ہے۔ عام طور پر سیاسی میدانوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے ''فلاں شخص کو کرسی مل گئی، یہ کرسی کی ہوس میں پھر رہے ہیں، یہ کرسی کے پیچھے مر رہے ہیں، اِن کو اپنی کرسی کی فکر ہے''، تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اِس سے یہی چار ٹانگوں والی کرسی مراد ہوا کرتی ہے؟ یہ تو ہر کسی کے گھر میں ہوگی، بیٹھ کے شوق پورا کرلو، اگر تمہیں کرسی کا شوق ہے تو گھر میں ہر کوئی کرسی پر بیٹھتا ہے، اپنا شوق پورا کرلے۔ لیکن اس سے یہی لکڑی کی کرسی مراد نہیں ہوتی بلکہ کرسی پر بیٹھ کے انسان کو جو حاکمیت حاصل ہوتی ہے، اختیار اور اقتدار جو حاصل ہوتا ہے اس سے مراد وہ ہوتا ہے، یہ لفظ اختیار اور اقتدار کے لئے بولا جاتا ہے۔

''اِستواء علی العرش'' کا مطلب

تو اللہ تعالیٰ جو کہتے ہیں: استویٰ علی العرش، اِس لفظ کا جو مبدأ ہے اُس کو کسی مثال سے واضح نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ کا عرش کیسا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اُس کے اُوپر مستوی کیسے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی کرسی کیسی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کے اوپر کس طرح سے بیٹھے ہیں؟ اِس کو کسی مثال کے ساتھ واضح نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہیں جو اُس شان کو واضح کردیں، اس لیے ہم اِس مبدأ کو تو متعین نہیں کرسکتے، لیکن اِس کا جو منتہا ہے وہ متعین ہے، کہ اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تخت نشین اِس کائنات میں وہ ہے، ساری کی ساری کائنات پر حکومت اُس کی چلتی ہے، اور اِس کا کوئی ذرہ اُس کی حکومت اور اقتدار سے باہر نہیں ہے، اِس کائنات کی کرسی پر اللہ بیٹھا ہے، کیا مطلب؟ کہ یہ ساری کی ساری کائنات اُسی کی حکومت کے نیچے ہے، اور کوئی ذرہ اللہ تعالیٰ کی اِس اقتدار کی صفت سے باہر نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے اقتدار کا احاطہ، کہ زمین وآسمان سب اُس کی کرسی کے نیچے ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے عرش کے نیچے ہے، عرش اور کرسی یہ دو علیحدہ علیحدہ وجود ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی شان ہے اُس نے اپنی شان کے لائق یہ بنائے ہوئے ہیں، موجود چیز ہیں، صرف اس کا یہی مجازی معنی نہیں کہ اقتدار کی طرف اشارہ ہے، بلکہ یہ واقعہ ہے، لیکن ہم اُس واقعہ کو کسی مثال سے واضح نہیں کرسکتے۔ عرش معلوم ہے، کہ تخت کو کہتے ہیں، استواء معلوم ہے، کہ ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن اب اِس کی کیفیت کہ اللہ عرش پر کیسے ٹھہرتا ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کرسی نشین کیسے ہے؟ ''کَیْفِیَتُہٗ مَجْھُوْلٌ وَالْاِیْمَانُ بِہٖ وَاجِبٌ وَاِنْکَارُہٗ کُفْرٌ''[1] اس کا انکار کرنا کفر ہے، اِس پر ایمان لانا واجب ہے، کیفیت اِس کی مجہول ہے، واقعہ صحیح ہے، لیکن اُس کا جو اثر ہے اُس اثر کو ہم بیان کرسکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کہیں کہ اللہ دیکھتا ہے، اور ہم جس وقت دیکھنے کا

---

(۱) یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے دیکھیں کتب عقائد وکتب تفسیر سورہ بقرہ آیت ۲۹۔ سورۃ آل عمران آیت ۷۔ سورۃ اعراف آیت ۵۴ کے تحت۔ ولفظ عامة الكتب: الاستواء غير مجهول، والكيف غير معقول، والإيمان به واجب، والسؤال عنه بدعة (قرطبی، خازن، مظہری، آلوسی وغیرہ)۔

تصور کرتے ہیں تو فوراً آنکھ کا خیال آتا ہے، کہ آنکھ ہے جس کے ذریعے سے ہم دیکھتے ہیں، تو دیکھنے کے لئے آنکھ مبدأ بنتی ہے، ہمارے ہاں دیکھنے کی ایک صورت متعین ہے، کہ یوں ہم آنکھ کھولتے ہیں، اِس طرح سے رخ کرتے ہیں، تو جو چیز ہماری آنکھ کے سامنے آجاتی ہے نظر آجاتی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو اُس میں یہ تصور قطعاً نہ کیجئے (اگر چہ اُس کے لئے عین کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا (سورۃ ہود: ۳۷) ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ، فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (سورۃ الطور: ۴۸) تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بیشک عین کا لفظ استعمال ہوا ہے) لیکن یہ تصور ہم اپنے ذہن میں نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ بھی ایسی ہی ہے، یہ تشبیہ لازم آجائے گی، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۃ الشوریٰ: ۱۱) اللہ جیسی کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ ہم اس کو تشبیہ دے دیں۔ لیکن اِس دیکھنے کا جو منتہا ہے، کہ مبصرات یعنی جو چیزیں دیکھنے میں آیا کرتی ہیں وہ انسان کے علم میں آجائیں، جو آنکھوں کے ساتھ معلومات حاصل کرنے کی ہیں وہ انسان کے علم میں آجائیں، وہ معنی متعین ہے کہ کوئی بھی چیز جو مبصر ہے یعنی دیکھی جاتی ہے وہ اللہ سے مخفی نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، تو جو منتہا ہے وہ تو متعین ہے، باقی اِس صفت کے مبدأ کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ کی شان کے لائق ہمارے پاس کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح سے یہ معنی تو یقینی ہوا کہ اِس کائنات کے اندر کرسی نشین اللہ ہے، یہ ساری کائنات اُسی کی کرسی کے نیچے ہے، یعنی اسی کے اقتدار کے نیچے ہے، حکومت اُسی کی چلتی ہے، باقی کرسی کا نقشہ، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کرسی کے اوپر بیٹھے کس طرح سے ہیں؟ کرسی نشین کس طرح سے ہیں؟ اس کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ یہاں پھر وہی بات ہوگی سُبْحَانَهٗ مَا اَعْظَمَ شَانَهٗ لَا يُحَدُّ وَلَا يُتَصَوَّرُ (سلم العلوم) کہ اُس کا کوئی تصور نہیں قائم کیا جا سکتا، ہم اِس پر قادر نہیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا تصور اِس طرح سے قائم کرلیں، کیونکہ جو بھی کریں گے تشبیہ لازم آجائے گی، اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ میں اِس تشبیہ کی نفی ہے ......تو وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا مفہوم یہ ہوا کہ اس زمین وآسمان پر حاکمیت اُسی کی ہے، اقتدار اسی کا ہے، تصرف اسی کا چلتا ہے، اِس کائنات میں کرسی نشین وہی ہے، عرش نشین وہی ہے، تخت نشین وہی ہے، کسی دوسرے کی حکومت نہیں چلتی، کہ تم یہ کہو کہ فلاں شعبہ فلاں کے سپرد ہے، بیٹا فلاں دیتا ہے، بارش فلاں دیتا ہے، رزق فلاں دیتا ہے، اُن کے دروازے جا کر کھٹکھٹاؤ، اُن کی چوکھٹ پر جاکے پیشانی رگڑو، یہ بات غلط ہے۔ یہ سارے کا سارا اقتدار اور اختیار جو کچھ ہے سب اللہ کو ہے، سب کچھ اُسی کی کرسی کے نیچے ہے۔

سوال: - کیا عرش کی بھی کوئی صورت متعین ہے جو حضور ﷺ نے بیان کی ہو کہ یہ ایسے ہے؟

جواب: - نہیں! وہ بھی سمجھانے کے لئے ایک بات ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش چار فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے، اور قیامت کے دن آٹھ ہو جائیں گے، وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (سورۂ حاقہ)، اور فرشتوں کی شکل ایسی ہے، وہ اتنے بڑے بڑے ہیں، اور وہ اِس شکل وصورت کے ہیں، تو یہ بھی الفاظ ہیں ذہن کے اندر صرف اِس بات کا یقین ڈالنے کے لئے کہ عرش کا وجود ہے۔ اب اتنا بڑا عرش سمجھ لیجئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ساتوں آسمان اُس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ڈھال میں سات درہم ڈال دیے جائیں (تفسیر طبری وغیرہ)۔ اب درہم تو چونّی (چار آنے کے سکّے۔ ناقل) کے برابر ہوتا ہے، اور ڈھال کافی بڑی

ہوتی ہے جس کے اوپر تلوار کے وار کو روکا جاتا ہے، اب اس کے اندر سات درہم ڈال دیے جائیں تو ان درہموں کی اس ڈھال سے کیا نسبت ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ تو عرشِ الٰہی کے مقابلے میں ساتوں آسمان ایسے ہیں۔ اب اس کا بھی تو آپ کوئی تصور نہیں کر سکتے، نہ آسمان پورا آپ کے تصور میں آئے، اور نہ عرش پورا آپ کے تصور میں آئے۔ بہر حال یہ کہیں گے کہ اس کا عرش ساری کائنات پر محیط ہے، اور سب زمین و آسمان اس کے عرش کے نیچے ہے، الفاظ یہی بولیں گے، اور اس کا منتہا متعین ہے، کہ حکومت ساری کائنات میں اللہ کی ہے، اقتدار اُسی کا چلتا ہے، اختیار اسی کا چلتا ہے، اس کی کائنات کے کسی کونے میں کوئی دوسرا آدمی کوئی حکومت نہیں رکھتا، یہ مفہوم جو ہے منتہا کے اعتبار سے یہ متعین ہے، باقی ظاہری طور پر تو واقعی جو ظاہری حکومتیں ہوتی ہیں ان کی کرسی بھی ہوتی ہے، جس وقت وہ اپنی حاکمانہ شان کے تحت اپنے دربار میں یا اپنے دفتر میں آتے ہیں جہاں بیٹھ کر انہوں نے سارے احکام دینے ہوتے ہیں اور انتظام کرنا ہوتا ہے، تو ان کے لئے ایک خاص کرسی ہوتی ہے جس کے اوپر آکے بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا...... ہم ایک دفعہ نواب بہاولپور کے محل میں گئے تھے تو اُس کی جو مخصوص کرسی تھی جس پر بیٹھ کر وہ اپنا دربار لگایا کرتا تھا، چند لمحے میں بھی اُس پر بیٹھا ہوں، اور وہاں بیٹھ کر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے تصور کر لیا، کہ یہ ریاست کا حاکم بھی اِس کرسی پر عارضی طور پہ ہی بیٹھا ہے اور ہم بھی عارضی طور پر بیٹھ گئے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اُس کا عارضی طور پر بیٹھنا کئی سالوں میں پورا ہوا، ہمارا چند لمحوں میں پورا ہو گیا، بہر حال ہے تو عارضی طور پر ہی۔ تو چند لمحے کے لئے ہم بھی ریاست بہاولپور میں تخت نشین ہو گئے......

وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: وسیع ہے اُس کی کرسی زمین و آسمان سے، یعنی اُس کی کرسی میں زمین و آسمان سمائے ہوئے ہیں، اُس کی کرسی سب پر حاوی ہے۔

زمین و آسمان کے نظام کو سنبھالنا اللہ پر گراں نہیں ہے

وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا: ھما ضمیر السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کی طرف راجع ہے۔ دنیا کے اندر عارضی طور پر، حسی اور ظاہری طور پر اگر کسی علاقے کا کوئی بادشاہ ہو جاتا ہے، تخت نشین ہو جاتا ہے، تو بسا اوقات اس کا انتظام سنبھالنے سے عاجز آجاتا ہے، اُس کا انتظام سنبھالتا ہوا تھک جاتا ہے، کسی وقت اُس کے بس سے یہ بات باہر ہو جاتی ہے، لیکن یہاں زمین و آسمان کا سنبھالنا اللہ تعالیٰ کو کوئی گراں نہیں گزرتا، اللہ پر کوئی بھاری نہیں ہے، اَدَ اَوْدًا کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ کسی چیز کا اس قدر گراں ہونا کہ اُس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ اِن دونوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ پر گراں نہیں ہے، کہ اللہ ان کو سنبھال نہ سکے، وہ ایسا حاکم نہیں کہ اپنے ماتحت ملک کو سنبھال نہیں سکے، کبھی کسی طرف کوئی تحریک شروع ہو جائے، کبھی کسی طرف کوئی تحریک شروع ہو جائے، اور نظم سارے کا سارا خراب ہو جائے، ایسی بات نہیں، اللہ تعالیٰ اِس کو خوب سنبھالنے والا ہے، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو گراں نہیں گزرتی۔ وَهُوَ الْعَلِیُّ: وہ علو والا ہے، الْعَظِیْمُ: عظمت والا ہے۔ علو اور عظمت یہ دو لفظ جو بولے گئے، علو سے مراد یہ ہے کہ اُس میں کوئی نقص کی صفت نہیں پائی جاتی، اور عظیم سے مراد ہے کہ اُس میں ہر صفت کمال پائی جاتی ہے۔ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ کا مفہوم ایسے ہی ہے جیسے کہ سبحان اللہ والحمد للہ کے تحت آپ ذکر کیا کرتے ہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ

دین کے معاملے میں اکراہ نہیں، تحقیق واضح ہوگئی ہدایت گمراہی سے، پھر جو کوئی انکار کرے طاغوت کا اور اللہ پر ایمان لے آئے

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ

پس تحقیق اُس نے مضبوطی سے تھام لیا مضبوط حلقے کو، اُس کے لئے ٹوٹنا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ مددگار

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــــُٔــھُمُ

ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لے آتے ہیں، نکالتا ہے اُن کو تاریکیوں سے نور کی طرف، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن کے یار و مددگار

الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

طاغوت ہیں، وہ اُن کو نکالتے ہیں نور سے تاریکیوں کی طرف، یہی لوگ جہنم والے ہیں، اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۵۷﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: دین میں اکراہ نہیں، دین کے بارے میں اکراہ نہیں۔ اَکْرَہَ اِکْرَاھًا: دوسرے کو خلافِ مرضی مجبور کرنا۔ دین کے معاملے میں اکراہ نہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ: تحقیق واضح ہوگئی ہدایت گمراہی سے، گمراہی اور ہدایت دونوں آپس میں واضح ہوگئیں، کسی قسم کا کوئی اشتباہ اور اختلاط باقی نہیں رہا۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: پھر جو کوئی انکار کرے طاغوت کا، طاغوت کا لفظ طغیان سے لیا گیا ہے، سرکش ہو جانا، اپنی حد سے تجاوز کر جانا، جیسے کہتے ہیں دریا میں طغیانی آگئی، یہ طغیانی کا لفظ یہیں سے لیتے ہیں، جس وقت وہ دریا اتنا اچھل آتا ہے کہ اپنی حدود سے باہر ہو جاتا ہے تو اُس کو کہتے ہیں کہ دریا میں طغیانی آگئی۔ طَغَا الْمَآءُ قرآنِ کریم میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے، پانی حد سے بڑھ گیا، لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (سورۂ حاقہ:۱۱) جب پانی کو طغیانی آگئی، حد سے بڑھ گیا، تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کرلیا۔ اسی طرح ''باغی طاغی'' یہ دو لفظ اردو میں بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں، سرکش کو کہتے ہیں۔ تو طاغوت ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو حدودِ عبدیت سے نکل جائے، خود اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کا اقرار نہیں کرتا اور دوسروں کو بندگی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، خود سرکش ہے اور دوسروں کو سرکش بناتا ہے، اُسے کہا جاتا ہے طاغوت۔ تو جو بھی اس کائنات کے اندر ایسا ہو کہ خود اللہ کے مقابلے میں سرکش ہے اور دوسروں کو سرکش بنانے کی کوشش کرتا ہے اُس کے لئے طاغوت کا لفظ بولا جائے گا۔ اِس کا مصداق شیطان بھی ہوسکتا ہے، اور ہر وہ گمراہ اور بددین لیڈر جو کسی غلط راستے کی طرف لے جا رہا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کرتا ہو، اس کو طاغوت کہیں گے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: جو طاغوت کا کفر کرے، اور اللہ پر ایمان لے آئے پس تحقیق اس نے مضبوطی سے تھام لیا عروہ کو۔ عروہ کہتے ہیں حلقے کو، جیسے ایک رسی لٹک رہی ہو اور اس میں حلقہ بنا ہوا ہو تو جب انسان اس رسی کے حلقے کو مضبوطی سے سنبھال لے گا تو پھر وہ گرتا نہیں۔ وُثْقٰی کہتے ہیں مضبوط کو، یہ اوثق کی مؤنث ہے،

عروۂ وثقی: مضبوط حلقہ، پس تحقیق سنبھال لیا اس نے مضبوط حلقے کو۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا: اِس حلقے کے لئے ٹوٹنا نہیں ہے، ایمان باللہ ایک ایسا حلقہ ہے جو کبھی ٹوٹے گا نہیں، ہاں غفلت کے ساتھ چھوٹ سکتا ہے، تو چھوڑو تم نہیں اور ٹوٹے گا یہ نہیں، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

تفسیر

''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کا صحیح مطلب

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا کیا معنی ہے؟ دین کے بارے میں اکراہ نہیں ہے۔ ظاہری طور پر اِس کا مفہوم یہ ہے کہ دین قبول کرنے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہدایت اور ضلالت واضح ہوگئی، اب انسان کو چاہیے کہ اپنے اختیار کے ساتھ سوچ سمجھے، اگر ہدایت کو اختیار کرے گا تو دنیا اور آخرت میں اللہ کی رضا اس کو حاصل ہو جائے گی، اور اگر وہ ضلالت اختیار کرنا چاہے تو اس میں بھی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت بھی کسی شخص کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کرسکتی، کسی کافر کو ڈنڈا دکھا کر مسلمان نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ اگر کوئی کافر فتنہ وفساد کو چھوڑ دے، اور اسلامی حکومت کا ماتحت ہو جائے، رعایا بن کے رہنا چاہے، فرمانبرداری کے اظہار کے طور پر جزیہ ادا کرے، فتنہ وفساد نہ کرے، تو اپنے کفر پر باقی رہتا ہوا زندگی گزار سکتا ہے، رعایا بننے کے بعد اسلامی سلطنت میں اُس کو تحفظ حاصل ہوگا، اُس کی جان محفوظ ہوگی، اُس کا مال محفوظ ہوگا، اُس کی عزت محفوظ ہوگی، اس کے اوپر یہ جبر نہیں کیا جاسکتا کہ تو اپنا عقیدہ بدل لے، جزیہ کا فلسفہ یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ بچے جن سے فساد کا خطرہ نہیں، عورتیں جو کہ اسلامی آئین کے خلاف کسی قسم کا فساد برپا نہیں کرسکتیں، اور بوڑھے کھوسٹ جن کے اندر یہ طاقت نہیں رہی کہ کسی قسم کا فتنہ اُٹھائیں، ان سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا، یہ ویسے ہی اپنے عقیدے پر باقی رہ سکتے ہیں جیسے کیسے ہیں۔ لیکن اگر کوئی عورت اندرا گاندھی کی طرح لیڈر بن جائے اور فتنہ اُٹھاتی پھرے، یا کوئی بوڑھا بیٹھا ہوا تجویزیں بتا بتا کے لوگوں میں بغاوت پھیلاتا ہے، تو ایسوں کو قتل کیا جاسکتا ہے، اور یہ سزا فساد کی ہے، کفر کی نہیں ہے، اگر فساد نہیں کرتے تو ایسی صورت میں اِن سے کچھ نہیں لیا جائے گا، اور نوجوان جو کہ فساد برپا کرسکتے ہیں اگر وہ فساد چھوڑنے کا عہد کرلیں اور اُن کے عہد کا یہ عنوان ہے کہ سالانہ طور پر ایک ٹیکس ادا کریں، جب یہ ادا کرتے رہیں گے تو یہ علامت ہوگی کہ یہ حکومت کے فرمانبردار ہیں، اس لیے ان کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا، یہ اپنی اُسی طرح سے عبادت کرسکتے ہیں، اپنے عبادت خانوں کو آباد کرسکتے ہیں، اپنے نظریے اور اپنے عقیدے کے اوپر زندہ رہ سکتے ہیں، اس لیے دین کے بارے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص دین کو قبول کرلیتا ہے اور مسلمان ہو جاتا ہے، مسلمان ہونے کے بعد جب اس نے اس آئین کو قبول کرلیا (عقیدے کے قبول کرنے پر تو مجبور نہیں کیا جاسکتا) لیکن جب وہ عقیدے کو قبول کرلے تو اس کے بعد اِس عقیدے کے احکام اُس پر نافذ ہوں گے اور ڈنڈے کے ساتھ نافذ ہوں گے، قانونی اکراہ اور قانونی جبر اسلام میں ہے۔ اور اگر یہ قانونی جبر اور قانونی اکراہ بھی نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ کلمہ پڑھ لو، پھر تم سانڈ کی طرح آزاد ہو، جو چاہو کرتے

پھرو، زنا کرو، چوری کرو، ڈاکے ڈالو، نماز نہ پڑھو، قتل کرو، زکوٰۃ نہ دو، تمہیں چھٹی ہے، بس ایک دفعہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اسلام قبول کرلو، اس کے بعد تم بالکل ایک آزاد حیوان کی طرح زندگی گزار سکتے ہو، یہ بات نہیں ہے۔

لادین لوگ ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کا غلط مفہوم بیان کرتے ہیں

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جو شخص اسلام کو قبول کرے گا، تو قبول کرنے کے بعد اُس کو اس آئین کی پابندی کرنی پڑے گی، زنا ڈنڈے مار مار کے چھڑوایا جائے گا، شراب سُرین کُوٹ کُوٹ کے چھڑائی جائے گی، اور اگر کوئی شخص کسی کی خون ریزی کرے گا تو اُس کو اُس خون ریزی کے عوض میں اُڑا دیا جائے گا، اگر کوئی چوری کرے گا تو اس کا ہاتھ کو کاٹ دیا جائے گا، اِس کی چھٹی نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اب تمہیں کچھ نہیں کہا جاسکتا، کہ کوئی بدمعاش یہ استدلال کرے کہ یہ جو کوڑے لگتے ہیں یہ تو بالکل مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں، اسلام میں تو ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، دین کے معاملے میں جبر ہی نہیں، کسی کی مرضی نماز پڑھے، کسی کی مرضی نہ پڑھے، دین تو ایک نجی زندگی کا معاملہ ہے، اِس کو قانونی رنگ دے کر لوگوں کے اوپر پکڑ دھکڑ کرنا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف ہے۔ اِس سوال کا جواب آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، کہ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا، کوئی شیطان تمہیں یہ مغالطہ نہ دے دے، لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا یہ معنی قطعاً نہیں ہے، اگر یہ مفہوم ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ لا الٰہ الا اللہ پڑھو، اور اس کے بعد بیشک آزادانہ زندگی گزارو، کوئی پابندی نہیں۔ لادینی حکومتیں جتنی ہیں وہ مذہب کو ایک نجی معاملہ قرار دیتی ہیں، اس لئے ان کے ہاں جو قانون بنایا جائے گا اُس میں یہ بات تو ہوگی کہ وہ موجودہ حکومت کے قانون کے خلاف کرے گا تو اُس کو سزا ہوگی، اُس قانون کی پابندی ہوگی، اور اُس کو زبردستی اس قانون کا پابند بنایا جائے گا، آئین کے اندر جس بات میں سزا ہوگی جب کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو حکومت اُس کو سزا دے گی، باقی! مذہب اُن کے نزدیک ایک نجی معاملہ ہے، اس لئے کوئی عقیدہ رکھا جائے، کوئی عمل اختیار کیا جائے جو حکومت کے آئین کے خلاف نہیں ہے تو حکومت میں چھٹی ہوتی ہے۔ لادینی حکومتوں کا نظریہ یہی ہے، مثلاً نماز ہے، چونکہ اُن کے آئین میں کوئی دفعہ ہے نہیں، اس لئے کوئی پڑھے گا تو بھی وہ نہیں پکڑیں گے، نہیں پڑھے گا تو بھی وہ نہیں پکڑیں گے، اور ایسے ہی دوسرے فرائض، یہ اس کو نجی معاملہ قرار دے دیتے ہیں، کہ مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے۔

گناہوں پر سزا جاری کرنا ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کے خلاف نہیں

لیکن اسلامی حکومت اُصولی طور پر اللہ کی حکومت ہے، اور اللہ کے قانون کی پابندی اصولاً اس میں تسلیم ہوتی ہے، اس لئے کوئی ظاہری گناہ کرے، باطنی گناہ کرے، علی الاعلان کرے، خفیہ کرے، اللہ کے آئین کے خلاف جس وقت ہوگا اللہ پکڑے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُس کے پکڑنے کے دو طریقے ہیں، مخفی جرائم جتنے ہیں ان کو آخرت میں پکڑے گا، اور علی الاعلان جرائم جتنے ہیں وہ اُس نے حاکم کو اپنا قائم مقام بنا کر اختیار دے دیا کہ جو اس قسم کا جرم کرے اُس کو یہ سزا دیا کرو۔ اس لئے حاکم واضع قانون نہیں ہے، بلکہ اُس قانون کو نافذ کرنے والا ہے جو قانون اللہ نے بنا کے دیا ہوا ہے، اور جو مخفی گناہ ہیں جن کے اُوپر وقت کا حاکم

دسترس نہیں رکھتا، نجی زندگی کی جو باتیں ہیں اُن پر بھی پکڑ ہوگی، نجی زندگی بھی آزاد نہیں ہے، لیکن وہ پکڑ براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کریں گے جس کا علم محیط ہے، تو مخفی گناہ جو ہوں گے وہ تو اللہ کی گرفت میں آئیں گے، چاہے دنیا میں سزا دے دے بیماری کی شکل میں، فقر کی شکل میں، کسی دوسری شکل میں، چاہے آخرت میں پکڑ لے۔ اور جو گناہ علی الاعلان ہوں گے اُن کی پکڑ کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب اور اپنے خلیفے کو اختیار دے دیا، اور اُس کو پابند کر دیا کہ اگر کوئی اِس قسم کا جرم کرنے والا جرم کرتا ہوا پکڑا جائے تو اُس کو یہ سزا دینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جرائم اگر حاکم کے سامنے ثابت ہو جائیں تو حاکم کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے، اُس سزا کا دینا ضروری ہے، اور اللہ کے حکم کے تحت وہ سزائیں دی جاتی ہیں۔ تو ایک تو یہ پابندی ضرور ہوگی، اور اس میں پکڑ دھکڑ بھی ہوگی، مار دھاڑ بھی ہوگی، یہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں، بلکہ دین کے اندر داخل ہو جانے کے بعد دین کے فرائض میں یہ بات شامل ہو جاتی ہے کہ آپ کو اُس آئین کا پابند ہونا پڑے گا، اور اگر آپ پابندی نہیں کریں گے تو اللہ کا خلیفہ جو اِس ملک پر مسلط ہے وہ اِس بارے میں آپ کو پکڑ دھکڑ کرے گا اور مجبور کر کے آپ کو سیدھے راستے پر چلائے گا، یہ ایک بیّن حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام صرف یہی ہے کہ بس عقیدہ قبول کرلو اور اس کے بعد تمہیں چھٹی، کوئی پوچھنے والا نہیں، اور یہ بالکل کلیۃً دین کا انکار ہے۔

اِسلام قبول کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑنا بغاوت ہے

اور دوسرا شعبہ اِس میں یہ آ گیا کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد پھر اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں، یعنی دین پر باقی رکھنے کے لئے جبر کیا جائے گا، اگر قبول کرنے کے بعد پھر کوئی انکار کرتا ہے تو یہ بغاوت ہے، جیسے ایک آدمی پاکستان کا باشندہ ہی نہ بنے، وہ پاکستان کے قانون کا پابند نہیں، اور اس حاکم کا فرمانبردار ہونے کا پابند نہیں ہے، لیکن ایک دفعہ جو پاکستان کا باشندہ بن گیا اور اس نے پاکستان کے قانون کو قبول کر لیا اب اگر اس آئین کے خلاف وہ بھڑکاتا ہے یا خود آئین کا انکار کرتا ہے کہ میں فلاں چیز کو نہیں مانتا، یہ باغی ہے، اور باغی کی سزا دنیا کے تمام عقلمندوں کے نزدیک گولی ہے یا پھانسی۔ اب اگر دنیا کا قانون اپنے خلاف بغاوت کو برداشت نہیں کرتا اور بغاوت کے نتیجے میں کسی کو لٹکا دیتا ہے یا کسی کو گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے تو کسی کے نزدیک بھی یہ بے انصافی نہیں، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی حکومت اِسی طور پر قائم کر لی جائے کہ اس کے آئین کو قبول کرنے کے بعد اس کے خلاف کوئی بغاوت کرتا ہے تو یہاں بھی گولی سے اڑا دینا یا اُس کو قتل کر دینا عدل وانصاف کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت میں مسلمان ہو جانے کے بعد کسی کو مرتد ہونے کا حق نہیں ہے، ہاں اسلام قبول نہ کرے اس کا اُس کو اختیار ہے، کہ ہمارے آئین کو قبول ہی نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی اس حکومت کو اس معنی میں قبول نہ کرے، وہ اسلام نہ لائے، تو اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن لے آنے کے بعد پھر اس کو وفادار رکھا جائے گا، پھر اگر اس کے خلاف وہ چلتا ہے تو باغی ہے تو جو سزا باغی کی ہوا کرتی ہے وہی اس کو دی جائے گی۔ قول واقرار کر لینے کے بعد پھر اس کے اوپر پابند کیا جاسکتا ہے۔

جیسے حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری ؒ فرمایا کرتے تھے، کہ ایک لڑکی آپ کے نکاح میں آئے یا نہ آئے اُس کو

اختیار ہے، وہ اس نکاح کو قبول کرے یا نہ کرے، تم کسی کو کھینچ کر زبردستی اپنے گھر نہیں لا سکتے، لیکن ایک دفعہ اگر اس نے رضامندی کے ساتھ ایجاب و قبول کرلیا اور آپ کے نکاح میں آنا قبول کرلیا پھر اگر وہ نکل کر جائے تو فرمایا کرتے تھے کہ "بیشک گُتوں پھڑ کے گھسیٹ لو، پھر توانوں حق پہنچدا ئے" (پھر چاہے تم اُس کے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لو، تمہیں حق پہنچتا ہے) نہ نکلنے دو، جب وہ اپنے اختیار کے ساتھ ایک دفعہ آ گئی اب اُس کو جانے کا اختیار نہیں ہے، اب اُس کو آپ پابند کر سکتے ہیں، اسی طرح یہاں اسلام کو قبول نہ کرے اُس کی مرضی، لیکن قبول کر لینے کے بعد چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، اِس پر اس کو پابند رکھا جائے گا، اس لئے لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کافر کو دین کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح سے اس کو بیان کیا جائے تو بھی اپنی جگہ بات بالکل صحیح ہے۔

"لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" کا دُوسرا مطلب

ورنہ اس کا صحیح مطلب یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا مطلب وہی ہے جو پیچھے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا تھا کہ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور ضلالت واضح ہو گئی، اب اللہ کی طرف سے اکراہ نہیں ہے کہ سارے کے سارے لوگ اس دین کو ضرور قبول کریں، یعنی اس اکراہ کو فطری اکراہ پر محمول کرلیں، کہ اللہ تعالیٰ نے فطرۃً انسان کو مجبور نہیں کیا کہ وہ حق کو ضرور قبول کرے، بلکہ حق اور باطل دونوں کو واضح کردیا، اور اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے کا فطری طور پر اختیار دے دیا، اب جو شخص اپنے اختیار کے ساتھ قبول کرے گا اللہ سے اجر پالے گا، اور جو قبول نہیں کرے گا اللہ کے ہاں سزا پائے گا۔ تو اِس کو فطری اکراہ پر محمول کردیا جائے کہ انسان کو اختیار دے کے اُس کو آزاد چھوڑ دیا، لیکن اگر وہ قبول کرتا ہے تو اُس کو اس کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اللہ کا حلقہ مضبوط ہے، طاغوت کا سہارا قابلِ اعتماد نہیں

"ہدایت اور ضلالت واضح ہوگئی اب جو شخص طاغوت کا انکار کرے" یعنی جتنی طاقتیں اللہ تعالیٰ کے خلاف چلنے والی ہیں، یا لوگوں کو اللہ کے خلاف چلنے کی ترغیب دیتی ہیں، اُن کا دامن چھوڑتا ہے، اور اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ کا دامن پکڑتا ہے، تو اس نے مضبوط حلقے کو تھام لیا، یہ بہت مضبوط سہارا ہے، اِس سہارے کی طرف سے کبھی تمہیں دھوکا نہیں دیا جائے گا، جس کا دامن تم نے تھاما ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا، یہ تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے گا، یہ حلقہ ٹوٹنے والا نہیں ہے، یہ مضبوط حلقہ ہے، اور تم اِس کے ذریعے سے نجات پا جاؤ گے، بخلاف اس کے کہ جو شخص طاغوت کا دامن پکڑتا ہے یہ دھوکے کا حلقہ ہے، اور یہ کسی نہ کسی وقت تم سے غداری کر کے تمہیں کسی ایسے ذلت کے گڑھے میں پھینکے گا کہ پھر تمہارے لئے کوئی سہارا نہیں ہوگا۔ اس حلقے کو تم اپنے اختیار کے ساتھ چھوڑ تو سکتے ہو، تمہاری غفلت سے یہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ تو سکتا ہے، لیکن یہ رسی ٹوٹنے والی نہیں ہے، یہ مضبوط رسی ہے جس نے بھی پکڑ لی۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے لئے ”طاغوت“ کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہے

”طاغوت“ کے لفظ کی میں نے وضاحت کر دی کہ طاغوت اس کو کہیں گے جو اپنی ذات کے اعتبار سے سرکش ہو گیا، اور لوگوں کو سرکش بنانے کی کوشش کرتا ہے، تفسیروں کے اندر عام طور پر اس کا معنی لکھا ہوا ہوگا کہ طاغوت: سرکش، وَکُلُّ مَاعُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللهِ ہر وہ شخص جس کی پوجا اللہ کے علاوہ کی گئی وہ طاغوت کا مصداق ہے۔ یہ لفظ آئیں گے، اُس کا معنی بھی یہی ہوگا، کہ اس کا مصداق شیطان یا وہ لوگ جو اپنی عبادت کی طرف بلاتے ہیں، عبادت کرنے والوں کی عبادت پر خوش ہوتے ہیں، ان کو ہم کہیں گے کہ یہ حدِ عبدیت سے باہر نکل گئے۔ اور ایسی شخصیت جو اللہ کی عبادت کی دعوت دے، اور لوگ اُس کو زبردستی معبود بنالیں، وہ خود اللہ کا بندہ ہو اور اللہ کی عبادت کی طرف ہی بندوں کو بلاتا رہا ہو، لیکن اُس کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد لوگوں نے زبردستی اس کی تعلیمات کے خلاف اُس کو معبود بنالیا یہ مَاعُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللهِ کا مصداق تو بن گیا، لیکن اس کے اوپر طاغوت کا لفظ بولنا جائز نہیں، کیونکہ طاغوت تو انتہائی درجے کا مذمت کا عنوان ہے۔

کتاب ”بلغة الحیران“ کی غلطی

کسی زمانے میں ایک کتاب لکھی گئی تھی، اب تو خیر وہ ناپید ہوگئی، آپ کی معلومات کے لئے ذکر کرتا ہوں، بُلغة الحیران کتاب کا نام آپ نے سنا ہوگا، اُس کتاب میں اِنہی آیات کی تفسیر میں یہ لفظ بھی چھپ گیا، اور اب بھی اس میں موجود ہے، کہ طاغوت کا معنی کلُّ مَاعُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللهِ، اور اِس معنی کے اعتبار سے ”طاغوت“ کا لفظ انبیاء پر اور اولیاء پر بھی بولا جاسکتا ہے، جن کی لوگوں نے عبادت کی۔ تو جو اُس کتاب پر اعتراضات تھے، جس کی وجہ سے اس کتاب کے خلاف اشتعال پھیلا، اُن میں سے ایک عبارت یہ بھی تھی۔ اب اُس پر حضرت مولانا غلام اللہ صاحب نے جو اصلاحی کام کیا ہے اور ”جواہر القرآن“ کے نام سے تفسیر چھاپی ہے اُس میں سے یہ عبارت نکال دی ہے۔ پُرانی بلغة الحیران میں ہے، ”جواہر القرآن“ میں یہ عبارت نہیں ہے، اور یہ لغزشِ قلم ہے، ہم حُسنِ ظن کے طور پر یہی کہہ سکتے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی ولی کے لئے ”طاغوت“ کا لفظ استعمال کریں، ”طاغوت“ تو ایک مذمت کا عنوان ہے، اور ایک ولی جس نے اللہ کی اطاعت اور عبادت میں وقت گزارا، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ترغیب دی، غیر اللہ کی عبادت سے روکا، اُس کا کیا قصور اگر لوگوں نے بعد میں اس کی عبادت شروع کر دی؟ وہ طاغوت کیوں بن گیا؟ ”طاغوت“ کا لفظ استعمال کرنے میں بے ادبی کا معنی پایا جاتا ہے، اس لئے ہم اُس عبارت کو قلم کی لغزش قرار دیتے ہیں۔ راعِنا کا لفظ جس کے اندر یہود نے ایک مذموم معنی کا ارادہ کر لیا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے وہ برداشت نہیں کیا، یہ تفصیل آپ کے سامنے گزری تھی، اُس میں چونکہ ایک بے ادبی کا پہلو نکل آیا تھا، چاہے استعمال کرنے والے اس کو صحیح معنی میں استعمال کریں، لیکن اس لفظ کو مقامِ نبوت کے مناسب نہیں سمجھا گیا۔ تو ”طاغوت“ کا لفظ تو بھی مذمت کے معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لئے اولیاء اور انبیاء کے لئے اِس لفظ کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ”طاغوت“ اُس کو کہیں گے جو سرکش ہو اور لوگوں کو سرکشی کی تعلیم دیتا ہو۔ تو بلغة کی

اِس عبارت پر اعتراض صحیح ہے اور ہم اس کو لغزشِ قلم قرار دیتے ہیں، کہ یہ ان لغزشوں میں سے ایک لغزش ہے جو اہلِ علم سے ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے، اور بعد میں جو اُس پر اصلاحی کام ہوا اور دوسری تفسیر جو چھاپی گئی جواہر القرآن، اُس میں یہ عبارت نکال دی گئی ہے۔

سوال:- ادھر اللہ کے راستے میں لڑنے کا حکم ہے، اور ادھر ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کہا گیا ہے؟

جواب:- اللہ کے راستے میں لڑنے کا جو حکم ہے، وہ ہے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (البقرہ: ۱۹۳، وغیرہ) فتنہ وفساد نہ رہے، فتنہ وفساد کے دفع کرنے کے لئے ہے، اس لیے جس وقت وہ ہتھیار ڈال دیں اور مطیع ہو جائیں، اسلام کے ساتھ اُن کا ٹکراؤ نہ رہے، لوگوں کے اندر ان کا گمراہی پھیلانے کا جذبہ ختم ہو جائے، ایسی صورت میں ان کو پناہ دی جاسکتی ہے۔ کافروں کے ساتھ مصالحت اور مسالمت کی اسلام میں اجازت ہے، یہ نہیں کہ جو کافر سامنے آجائے بس اس کا سر کوٹ دو۔ اسلام کے قانون کا جس وقت آپ مطالعہ کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی، کہ جہاد فساد کو دفع کرنے کے لئے ہے، چاہے فسادِ عقیدہ ہو چاہے فسادِ عمل ہو۔ لیکن جب کوئی اس قسم کے فساد سے باز آجائے، اور مخلوق کے اندر گمراہی نہ پھیلائے، اور کفر اسلام کے مقابلے میں سر نہ اٹھائے، نیچا ہو جائے، ایسی صورت میں اس کو امن ہو جاتا ہے، اور پناہ دے دی جاتی ہے۔ جزیہ کا آئین واضح طور پر اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلتا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: ''اللہ یار اور مددگار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لے آتے ہیں، نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن کے اولیاء، اُن کے یار و مددگار طاغوت ہیں، وہ اُن کو نکالتے ہیں نور سے ظلمات کی طرف''، یعنی اللہ کے ساتھ تعلق ہو جانے کے بعد پھر آئے دن جہالت اور کفر و شرک کی ظلمت چھٹتی جاتی ہے، اور نورانیت انسان میں بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو کفر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، یعنی وہی جنہوں نے اپنی مرضی کے ساتھ کُفر اختیار کر لیا، تو پھر اُن کی دوستیاں شیطانوں سے لگ جاتی ہیں، اور وہ آئے دن ان کو ہر قسم کے نور سے، فطرت کے نور سے، شریعت کے نور سے، عقل کے نور سے نکال کر ظلمات کی طرف لے جاتے جاتے ہیں، ان کا عمل اور کردار ایسا ہو جاتا ہے کہ نہ عقل اس کی تائید کرے، نہ فطرت اس کی تائید کرے، نہ شریعت اُس کی اجازت دے۔ ''وہ ان کو نکال کر ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں، یہی لوگ جہنم والے ہیں، اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ
کیا نہیں دیکھا تو نے اُس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم کے ساتھ ان کے رب کے بارے میں اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو

الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ

سلطنت دی تھی، جب کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اُس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں،

قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ

ابراہیم نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ لاتا ہے سورج کو مشرق سے، تو لے آ اُس کو مغرب سے، پس مبہوت ہو گیا وہ جس نے

كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ

کفر کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو ﴿۲۵۸﴾ یا کیا آپ نے ایسے شخص کی طرف دیکھا جو گزرا ایک بستی پر

وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ

جو گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر، اُس نے کہا کہ کیونکر زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ اِس بستی (کے باشندوں) کو اس کے

مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ

مرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے اُس کو موت دے دی سو سال تک، پھر اُس شخص کو اٹھایا، اللہ تعالیٰ نے کہا تو کتنا ٹھہرا، اس نے کہا کہ

لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ

ٹھہرا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ تو ٹھہرا سو سال، دیکھ تو اپنے کھانے کی چیز کی طرف اور پینے کی چیز کی طرف

لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ

کہ وہ باسی نہیں ہوا، اور دیکھ تو اپنے گدھے کے طرف، اور تا کہ بنا دیں ہم تجھے لوگوں کے لئے نشانی، اور دیکھ تو گدھے کی ہڈیوں کی طرف

كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ

ہم اُن کو کیسے اُٹھاتے ہیں پھر اُن کے اُوپر کیسے گوشت چڑھاتے ہیں، پس جب اُس شخص کے لئے یہ سارا حال ظاہر ہو گیا، تو اُس نے کہا کہ

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ

میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۵۹﴾ اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا دے مجھ کو کہ

تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ

تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں لاتا؟ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں، لیکن تا کہ میرے دل کو

قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ

اطمینان آجائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لے پرندوں میں سے چار پرندے، پھر اُن کو اپنی طرف مائل کرلے، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر

مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶۰

اُن میں سے ایک ٹکڑا، پھر اُن کو بلا، آئیں گے وہ تیرے پاس دوڑتے ہوئے، اور تو یقین کرلے کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ۝۲۶۰

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ: کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا، جس نے حجت بازی کی، حَاجَّ مُحَاجَّةً باب مفاعلہ، جس نے جھگڑا کیا ابراہیم کے ساتھ فِيْ رَبِّهٖٓ: ابراہیم کے رَبّ کے بارے میں، یا، اپنے رَبّ کے بارے میں، اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ: اَن کے اوپر باء مقدر ہے بِاَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ: اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی، اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: یہ جھگڑا کب واقع ہوا؟ یہ حجت بازی کب ہوئی؟ جب کہا ابراہیم نے میرا رَبّ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، حیات دیتا ہے اور موت دیتا ہے، قَالَ: اس نے کہا، اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، اَنَا اُحْيٖ: میں ہی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ قَالَ اِبْرٰهٖمُ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ: اَتٰى يَاْتِيْ اِتْيَان: آنا، اور اس کے بعد باءِ تعدیہ کی آگئی، تو اب یہ لانے کے معنی میں ہے، بیشک اللہ تعالیٰ لاتا ہے سورج کو مشرق سے، فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ: لے آ تو اس سورج کو مغرب سے فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ: جس نے کفر کیا تھا وہ مبہوت ہوگیا، متحیر ہوگیا۔ بُهِتَ: مبہوت ہوگیا، متحیر ہوگیا وہ شخص جس نے کفر کیا تھا، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ نہیں منزلِ مقصود تک پہنچاتا ظالم لوگوں کو، ہدایت نہیں دیتا اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو۔ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ: یا کیا دیکھا آپ نے اس شخص جیسے کی طرف جو گزرا تھا ایک بستی پر۔ اَرَاَيْتَ مِثْلَ الَّذِيْ مَرَّ کیا آپ نے ایسے شخص کی طرف دیکھا جو گزرا ایک بستی پر، وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا: عروش عرش کی جمع، عرش چھت کو کہتے ہیں، خَاوِيَةٌ سَاقِطَة کے معنی میں، ''جو گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر''، کیونکہ مکانات کے گرنے کا عام طور پر طریقہ یہی ہے کہ پہلے ان کے اوپر کے کنگرے، کنارے، مینار، چھت، یہ بلندیاں پہلے پستی کی طرف آیا کرتی ہیں، اُس کے بعد پھر دیواریں گرا کرتی ہیں، تو خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا کا یہی معنی ہے کہ ان کی چھتیں اور ان کی بلندیاں سب گرگئی تھیں، اور ان کے اوپر پھر دیواریں بھی گرگئی تھیں، قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ: اس شخص نے کہا یعنی گزرنے والے نے، کیونکر زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ اِس قریہ کو، یعنی اس قریہ کے باشندوں کو، بَعْدَ مَوْتِهَا: اِس کے مرنے کے بعد، اس قریہ کو اللہ تعالیٰ کیونکر زندہ کرے گا اِس قریہ کی موت کے بعد، اس کی ویرانی کے بعد اس کو آباد کیونکر کرے گا، یا اس کے اہل کے مرنے کے بعد ان کو زندہ کیونکر کرے گا۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ نے اُس کو موت دے دی، اماتہ: مار دیا اللہ تعالیٰ نے اُس کو، مِائَةَ عَامٍ: سو سال تک، یعنی سو سال تک اللہ نے اس کو مردہ رکھا، موت طاری کردی اس پر سو سال تک، یعنی موت کے طاری ہونے کے ساتھ جو کیفیت آتی ہے اس کیفیت کو سو سال تک اس پر طاری رکھا۔ مارے رکھا اللہ تعالیٰ نے

اس کو سو سال تک، یوں مفہوم ادا کر دیجئے۔ ثُمَّ بَعَثَهٗ: پھر اس شخص کو اٹھایا، قَالَ كَمْ لَبِثْتَ: اللہ تعالیٰ نے کہا تو کتنا ٹھہرا؟ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: اس نے کہا کہ ٹھہرا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ نہیں، بلکہ تو ٹھہرا سو سال، فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ: دیکھ تو اپنے کھانے کی چیز کی طرف۔ طعام: کھانے کی چیز۔ وَشَرَابِكَ: اور پینے کی چیز کی طرف۔ شراب مشروب کے معنی میں۔ لَمْ يَتَسَنَّهْ: کہ وہ سڑا نہیں، باسی نہیں ہوا، بُسا نہیں ہے، تُسنے نہیں پایا، وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ: اور دیکھ تو اپنے گدھے کی طرف، وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ: واؤ کا معطوف علیہ محذوف ہے اَمَتْنَاكَ ثُمَّ اَحْيَيْنَاكَ لِتَعْتَبِرَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ہم نے تجھے موت دی اور پھر ہم نے تجھے زندہ کیا تا کہ تجھے بھی اطمینان حاصل ہو جائے اور تا کہ ہم تجھے بنا دیں نشانی لوگوں کے لئے، وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ: اور دیکھ تو گدھے کی ہڈیوں کی طرف، یہاں عظام سے گدھے کی ہڈیاں مراد ہیں، كَيْفَ نُنْشِزُهَا: ہم ان کو کیسے اُبھارتے ہیں، کیسے اُٹھاتے ہیں، ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا: پھر ان کے اوپر کیسے گوشت چڑھاتے ہیں۔ كَسَا يَكْسُوْ: پہنانا۔ کس طرح سے پہناتے ہیں ہم ان کو گوشت، ہم کس طرح سے ان ہڈیوں کو اُبھارتے ہیں، اٹھاتے ہیں، یعنی جوڑتے ہیں جس طرح ہڈیاں جڑی ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے اوپر اٹھا کر، اور پھر کیسے ہم ان کو گوشت پہناتے ہیں، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ: پھر جب اس شخص کے لئے یہ سارا حال ظاہر ہو گیا، قَالَ: تو اس شخص نے کہا، اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: میں یقین کرتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ: اور قابل ذکر ہے وہ وقت جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا رَبِّ: اے میرے پروردگار! اَرِنِيْ: دکھا دے مجھ کو، كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى: تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اَوَلَمْ تُؤْمِنْ واؤ کا معطوف اگر نکالنا ہو تو اَلَمْ تَعْلَمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ تو جانتا نہیں تو ایمان نہیں لاتا؟ یا، اَتَسْئَلُ هٰذَا وَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تو یہ سوال کرتا ہے اور تو ایمان نہیں لاتا؟ تیرا ایمان نہیں ہے اس بات پر؟ قَالَ بَلٰى: ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں، ایمان تو ہے، وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ: وَلٰكِنْ سَئَلْتُ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ میں نے یہ سوال اس لیے کیا ہے تا کہ میرے دل کو اطمینان آ جائے۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لے پرندوں میں سے چار پرندے فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ: پھر ان کو تو اپنی طرف مائل کر لے، اپنے ساتھ ہلا لے، جب تو آواز دے تو تیری طرف وہ آ جایا کریں، ہلانے کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا: جُزْءًا کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ثُمَّ اجْعَلْ سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے، اُن کو اپنی طرف ہلا لے، پھر بعد میں ان کو ذبح کر، ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر، پھر رکھ ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ٹکڑا، ہر پہاڑ سے مراد ہے جو ارد گرد تیرے پاس پاس ہیں پتھروں کی چٹانیں، اُن کے اوپر ان کے اجزاء بکھیر دے،" رکھ دے تو ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ٹکڑا" ثُمَّ ادْعُهُنَّ: پھر تو ان کو بلا، يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا: آئیں گے تیرے پاس وہ دوڑتے ہوئے،، حالانکہ پرندوں کا کام اڑنا ہے، لیکن یہاں کہا کہ اڑ کر نہیں آئیں گے، زمین پر چلتے ہوئے آئیں گے تا کہ خوب اچھی طرح سے تجھے مشاہدہ ہو جائے، پرواز کر کے آئیں تو اُس میں اشتباہ ہو سکتا ہے کہ شاید کوئی اور پرندے آ گئے ہوں، تیرے سامنے زندہ ہو کر تیری طرف قدموں پر دوڑتے ہوئے آئیں گے، وَاعْلَمْ: اور تو یقین کر لے، اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور مذکورہ بالا رکوع کے مضامین

اصل مسئلہ تو چلا تھا پچھلے رکوع کی ابتدا میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ، پھر وہاں سے کلام منتقل ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بیان کی طرف اور توحید کے عقیدے کی وضاحت کی طرف۔اس کے بعد یہ ذکر آ گیا تھا کہ جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی دستگیری فرماتے ہیں، اور اُن کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے رہتے ہیں، اور جو کافر ہوتے ہیں اُن کے اولیاء شیطان بن جاتے ہیں، وہ اُن کو نور کی طرف سے نکال کے ظلمات کی طرف لے جاتے رہتے ہیں۔اس مضمون سے تعلق کے طور پر آگے تین مثالیں دی جارہی ہیں، جن میں ایک مثال کافر کی ہے، کہ کس طرح سے شیطان اُس پر مسلط ہوا، کہ واضح سے واضح دلیل اُس کے سامنے آئی، روشنی اُس کے سامنے آئی، اُس کی آنکھیں چندھیا تو گئیں لیکن اس نے حقیقت کو دیکھا نہیں، جیسے وہ تاریکی میں پڑا ہوا تھا ویسے کا ویسے ہی پڑا رہا، اور اُس کو اس حق اور اس نور کے قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ متحیر تو ہوگیا، حیران تو ہوگیا، آنکھیں تو اُس کی چندھیا گئیں اِس روشنی کے سامنے، لیکن اُس نے اس نور کو قبول نہیں کیا، اور اس کو حقیقت نظر نہیں آئی۔اور دو مثالیں اللہ تعالیٰ کے مقبولین کی دیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کیا، اُن کے دل میں اگر کسی معاملے میں کوئی تردد پیدا ہوا تو فوراً اللہ نے دستگیری کر کے اُن کو اعلیٰ منزل تک پہنچایا، یہ اس بات کی مثال ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو کس طرح رہنمائی کرتا ہوا ترقی کی طرف لے جاتا ہے، اور پہلی مثال کافر کی ہے کہ جب اُس کا تعلق اللہ کے ساتھ نہیں تھا، شیطان اُس پر مسلط تھے، تو واضح سے واضح دلیل آنے کے بعد بھی اُس نے حق کو قبول نہیں کیا۔ایک رکوع میں یہ تین مثالیں اس مناسبت سے آ گئیں، اور آگے پھر مضمون اصل موضوع کی طرف منتقل ہو جائے گا، مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہاں سے پھر وہی انفاق کا ذکر شروع ہو جائے گا، گویا کہ جو مضمون آپ کے سامنے ذکر کیا جارہا ہے یہ استطرادی ہے جو اَلشَّیْءُ یُذْكَرُ بِالشَّیْءِ کے طور پر آ گیا کہ ایک شئ کی مناسبت سے دوسری شئ کو ذکر کر دیا گیا، اس طرح سے بات یہاں تک پہنچ گئی، آگے پھر مسئلہ وہی انفاق فی سبیل اللہ کا شروع ہو جائے گا۔

ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرے کا واقعہ

پہلا واقعہ جو بطور مثال کے ذکر کیا جارہا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس زمانے کے بادشاہ نمرود کا ہے، تقریباً مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ الَّذِیْ حَآجَّ سے مراد نمرود ہے، نمرود عراق کا بادشاہ تھا، اور اُس زمانے میں اکثر و بیشتر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کا رب بھی قرار دیتے تھے۔مصر، عراق اور چین کے بارے میں صراحت تاریخ میں موجود ہے کہ یہاں کے لوگ مشرک تھے، بت پرست تھے، اور جو اُن کے دیوتا تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے اُن میں سے بادشاہ کو سب سے بڑا اوتار قرار دیتے تھے، اور بادشاہ کے ساتھ اُن کے ویسے ہی روابط تھے جیسے روابط رب کے ساتھ اور اپنے معبود کے ساتھ ہوا کرتے

ہیں، کہ اُسی کو سجدہ کرنا اور اُسی کو ہی اپنے لئے سب کچھ سمجھنا۔ مصر کا ذکر تو فرعون کے ذکر کے ضمن میں آیا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (پارہ ۳۰ سورۂ نازعات) وہ بھی رَبِّ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، باقی چھوٹے چھوٹے دیوتا اور بھی تھے، بڑا دیوتا وہ تھا۔ اسی طرح عراق کے باشندے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، یہ اصولاً ستاروں کو پوجتے تھے، اور ان ستاروں میں ان کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا، اور جو وقت کا بادشاہ ہوتا تھا اُس کو یہ سورج کا اوتار سمجھتے تھے، کہ سورج کے قائم مقام ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ سورج متشکل ہو کر بادشاہ کی شکل میں سامنے آتا ہے، تو وہ سمجھتے تھے کہ ہم اس کی پوجا جو کرتے ہیں تو اس طرح سے ہم اپنے بڑے دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ تو نمرود بھی اُس زمانے کے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو اپنی رعایا کا رَبّ سمجھتا تھا، اور اپنی قوم کا سب سے بڑا اوتار بنا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت ہوش سنبھالا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوّت مل گئی، اور آپ علیہ السلام نے اس بات کا اعلان کیا کہ رَبِّ حقیقی اور رَبّ العالمین اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے ربوبیت ثابت نہیں ہے، توحید کا اعلان فرمایا، ستاروں کی الوہیت کا ابطال کیا جس کی تفصیل سورۂ انعام میں آئے گی، مختلف انداز سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو ہے، اپنے باپ کے ساتھ ہے یہ گھریلو تبلیغ ہے، پھر قوم کے ساتھ ہے یہ عوامی تبلیغ ہے، اور پھر درجہ بدرجہ یہ بات شاہی دربار تک پہنچ گئی، اور بادشاہ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ کوئی شخص میری ربوبیت کے خلاف لوگوں کو کسی اور ربوبیت کی طرف متوجہ کر رہا ہے، جس سے میرا حلقۂ اثر کم ہو جائے گا، تو اس کو خطرہ محسوس ہوا اور ابراہیم علیہ السلام کو اس معاملے میں گفتگو کرنے کے لئے اپنے دربار میں بلا لیا، کہ میں نے سنا ہے کہ تو رب کسی اور کو قرار دیتا ہے اور مجھے رب نہیں سمجھتا، کیا بات ہے؟ اس بات کی تحقیق کے لئے سامنے بلا لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس وقت گئے، تاریخ میں جیسے واقعہ کی تفصیل ہے کہ اُس دربار کا یہ دستور تھا کہ جو آتا بادشاہ کو سلام کے طور پر سجدہ کیا کرتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے تو آپ نے سجدہ نہیں کیا، اُس نے پوچھا اور گرفت کی کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو سجدہ اپنے رَبّ کو کرتا ہوں، رَبّ کے علاوہ میں کسی دوسرے کو سجدہ نہیں کرتا۔ گفتگو شروع ہو گئی، نمرود کے لئے یہ بات ایک عجیب سی تھی کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو رَبّ قرار دیا جائے، اُس نے سوال کیا کہ تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی بات کہی کہ اگر اُس میں غور کیا جائے تو جاہل سے جاہل آدمی بھی اُس دلیل کو اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے، کہ اس بادشاہ کے سامنے یہ تو حقیقت تھی کہ اس سے قبل اِس کا باپ بادشاہ ہوگا، اور اُس سے قبل اِس کا دادا بادشاہ ہوگا، باپ دادا نہ ہو تو کوئی دوسرا تھا، بہرحال جس کے مرنے کے ساتھ یہ آیا پہلے بادشاہ وہ تھا، اور وہ بھی اسی طرح اپنے آپ کو رَبّ کہلاتے تھے، تو ان کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہونی چاہیے کہ اگر موت وحیات اُن کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ مرتے کیوں، اور بادشاہت چھوڑ کر یہاں سے کیوں جاتے؟ جب وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکے تو معلوم ہو گیا کہ موت وحیات اُن کے ہاتھ میں نہیں ہے، اور اسی طرح نمرود کو بھی اسی ماحول کے مطابق یہ یقین ہونا چاہیے کہ میں نے بھی ایک دن مرنا ہے، اور مرنے کو کسی انسان کا جی نہیں چاہتا، لیکن مرتا ضرور ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ موت وحیات کسی دوسری قوت کے ہاتھ میں ہے، انسانوں میں سے کسی کے ہاتھ بھی نہیں، چاہے وہ خدا بنا بیٹھا ہو چاہے وہ معبود بنا بیٹھا ہو، چاہے کچھ بنا بیٹھا ہو۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی بات کی طرف متوجہ کیا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ آپ علیہ السلام کا خیال یہ ہوگا کہ یہ ایک ایسی واضح بات ہے جس کے سمجھنے میں نمرود کو کوئی

وقت پیش نہیں آئے گی، فوراً سمجھ جائے گا کہ واقعی کوئی اور طاقت اُوپر مسلط ہے جس کے ہاتھ میں ہماری حیات وموت ہے، اگر حیات وموت ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو ہمارے بڑے کیوں مرتے؟ آج تخت نمرود کے پاس نہ ہوتا، نمرود کے باپ دادے کے پاس ہوتا، جو پہلے بادشاہ بنا تھا وہ اس کو چھوڑ کر کیوں جاتا؟ یہاں اپنا عجز نمایاں ہوجانا چاہیے، اور اُس کا ذہن اِدھر متوجہ ہوجانا چاہیے کہ واقعی ہمارے اُوپر کوئی قوت ہے جو اپنی مشیت کے تحت ہمیں زندگی دیتی ہے، اور اپنی مشیت کے تحت اُس زندگی کو واپس لے لیتی ہے اور ہمیں موت دے دیتی ہے، تو ایک اُوپر والی بالائی قوت کی طرف توجہ ہوجائے گی، اِس کو احساس ہوجائے گا کہ واقعی ہمارے اُوپر کوئی اور بھی ہے۔ لیکن جب انسان یہ ارادہ کرلے کہ میں نے نہیں سمجھنا تو ہر دلیل کے اندر انسان کچھ نہ کچھ اینچ پینچ کرلیتا ہے، یا تو وہ اتنی بھدی عقل کا تھا کہ وہ بات کو سمجھا نہیں، یا اُس نے جان بوجھ کر اِس بات کو بگاڑا، وہ کہنے لگا کہ یہ صفت تو مجھے بھی حاصل ہے، میں ہی زندگی دیتا ہوں، میں ہی موت دیتا ہوں، جیسا کہ تفاسیر میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو بلایا، قتل کردیا، کہتا ہے دیکھو! میں نے ماردیا، موت دے دی، اور ایک ایسا شخص جس کا قتل ہونا طے ہوچکا تھا کہ اس کو پھانسی دینی ہے، اِس کو قتل کرنا ہے، اُسے آزاد کردیا، کہتا ہے دیکھو! میں نے زندگی دے دی، حالانکہ یہ ایک سراسر مغالطہ تھا، زندگی دینے کا مطلب یہ ہے کہ بے جان چیز میں زندگی ڈالو، یہ نہیں کہ زندہ چیز کو زندہ رہنے دو، اِحیاء تو بے جان چیز میں زندگی ڈالنے کو کہتے ہیں، اور ایک زندہ چیز کو تم نے ذبح نہیں کیا اور ایسے ہی چھوڑ دیا یہ زندہ چھوڑا ہے زندہ کیا نہیں ہے، یہ حیات دینا نہیں کہلاتا۔ اور موت دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے اختیار کے ساتھ اُس کی جان نکالو، موت وہ دیا کرتا ہے جس کے اختیار کے ساتھ جان نکلتی ہے، کہ اگر چاہے تو وہ باقی رکھے، چاہے تو وہ نکال لے، اس بات کو سمجھ لیجئے! اَلْقُدْرَةُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّيْنِ قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے، جو شخص ضدین پر قادر نہیں ہے وہ قادر نہیں بلکہ مجبور ہے، مثلاً ایک شخص کی ٹانگیں بے کار ہوگئیں، اور وہ بیٹھا ہے، وہ مُقعد ہے، آپ اُس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اپنی قدرت سے بیٹھا ہے، کیونکہ یہ عاجز ہے اور بیٹھنے پہ مجبور ہے۔ اور آپ کی ٹانگیں صحیح ہیں، آپ چاہیں تو کھڑے بھی ہوسکتے ہیں، چاہیں تو بیٹھ بھی جائیں، تو اب کہا جائے گا کہ آپ اپنی طاقت سے اور اپنے اختیار سے بیٹھے ہیں۔ اب میری آنکھ میں اللہ نے بینائی رکھی ہوئی ہے، میں اگر چاہوں تو آنکھ کھولوں، وہ سامنے کی کتابیں مجھے نظر آجائیں گی، اور اگر چاہوں تو بند کرلوں، نظر نہیں آئیں گی، یہاں کہا جائے گا کہ میں اپنے اختیار سے دیکھتا ہوں، اور مجھے دیکھنے کی قدرت حاصل ہے، کہ چاہوں تو دیکھوں اور چاہوں تو نہ دیکھوں، اور اگر ایک شخص کی آنکھوں میں نور ہی نہیں ہے، اور وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتا، تو آپ اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ نہ دیکھنے پر قادر ہے، کیونکہ یہ نہ دیکھنے پر مجبور ہے، اِس کو نہ دیکھنے پہ قادر نہیں کہیں گے۔ اس لئے آپ دیوار کو اندھا نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ دیکھنے پر قادر نہیں، اس لیے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ نہ دیکھنے پر قادر ہے، قدرت وہاں ہوا کرتی ہے جہاں تعلق جانبین کے ساتھ ہو، کہ چاہے تو یوں کردے، چاہے تو یوں کردے، دونوں شقوں پر اگر قدرت حاصل ہے تو پھر ہم کہیں گے کہ یہ قادر ہے، اور اگر اس کے پلے ایک ہی ہے دوسری نہیں ہے تو وہ مجبور ہے قادر نہیں ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ اگر ٹانگوں میں طاقت نہیں، بیٹھا ہے، تو ہم اُس کو یہ نہیں کہیں گے کہ اِس کو بیٹھنے پر قدرت ہے، بلکہ یہ بیٹھنے پر مجبور ہے، اسی طرح آپ لوگ چھری کے ساتھ بکری کی رگیں کاٹتے ہیں، رگیں کاٹنا تو آپ کا کام ہے، باقی! روح کا نکالنا آپ کا کام نہیں ہے، اگر روح کا نکلنا

بھی آپ کی قدرت کے ساتھ ہو تو آپ چاہیں تو اُس کو روک بھی سکیں، اگر روح کا نکلنا آپ کے اختیار میں ہو تو آپ کی قدرت تب مانی جائے کہ یہ موت آپ کی قدرت سے آ رہی ہے کہ اس سبب کے پیدا کرنے کے بعد اگر چاہو تو تم روح کو نکلنے دو، اور چاہو تو نہ نکلنے دو، لیکن آپ جانتے ہیں کہ رگیں کٹ جانے کے بعد آپ کی مجبوری سے موت آتی ہے، آپ کو اس موت کے بارے میں اختیار نہیں، کیونکہ اگر آپ اُس روح کو روکنا چاہیں تو روک نہیں سکتے، رگیں اسی طرح سے قائم ہیں تو آپ اس کی روح نکالنے پر قادر نہیں، اور رگیں کاٹ لینے کے بعد آپ اُس کی روح کو روکنے پر قادر نہیں، اب اگر روح باقی ہے تو اللہ کی قدرت کے ساتھ باقی ہے، اور رگیں کٹنے کے بعد اگر نکلے گی تو اللہ کی قدرت کے ساتھ نکلے گی، اس لئے رگیں کاٹنے کی نسبت تو آپ کی طرف ہے، لیکن موت دینے کی نسبت اللہ کی طرف ہے، کیونکہ روح آپ کے اختیار سے نہیں نکلی، وہ اللہ کے اختیار سے نکلی ہے، اگر آپ کے اختیار سے نکلتی تو رگیں کٹنے کے باوجود آپ اجازت دیتے تو نکلتی، آپ اجازت نہ دیتے تو نہ نکلتی۔ اس لئے جس شخص نے تلوار کے ساتھ کسی کی گردن اڑائی ہے ہم اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ موت اس نے دی ہے، گردن کا کٹ جانا ایک ظاہری سبب ہے، اور روح کا نکلنا انسان کے اختیار کے بغیر ہے، اگر انسان کے اختیار سے ہوتا اور انسان اس بارے میں مختار اور قادر ہوتا تو چاہتا تو روح نکلنے دیتا اور نہ چاہتا تو نہ نکلنے دیتا، یہ ہے جس کو قدرت کہتے ہیں۔ اب احیاء اور اِماتت دونوں صفتیں اس تفصیل کے تحت اللہ کے لئے ثابت ہیں، کسی دوسرے کے لئے نہیں، لیکن اُس نے ظاہری طور پر ایک کو زندہ چھوڑ دیا، یہ حیات باقی جو رہ گئی تو وہ کہتا ہے کہ میں نے زندہ کیا، اور ایک آدمی کو قتل جو کر دیا تو کہتا ہے میں نے قتل کیا، تو یہ احیاء اور اماتت تو مجھے بھی حاصل ہے، جو آپ نے علامت بیان کی ہے اپنے رب کی وہ تو میرے اندر بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا اس دلیل سے تو میری ربوبیت کی نفی نہیں ہوتی۔ اب اصول تو یہ ہے کہ جو دلیل بیان کی گئی اگر مدمقابل شخص نے اُس پر کوئی اعتراضات کیے ہیں تو پہلے اُس کے اعتراضات کا جواب دیا جائے اور اپنی دلیل کو صاف کیا جائے، مناظرے کا اصول یہ ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح نہیں کیا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف مجادل یا مناظر ہی نہیں بلکہ وہ تو داعی الی الحق تھے، وہ سمجھ گئے کہ اس میں اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خواہ مخواہ وقت کی اضاعت ہے، یہ بات سمجھنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل کی طرف آ گئے۔ فرمانے لگے کہ میرا رب وہ ہے جو ہر روز مشرق سے سورج کو چڑھاتا ہے، تو ذرا اس کو ایک دن مغرب سے چڑھا کر دکھا دے، فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ: اس بات کے سامنے کافر مبہوت ہو گیا، اُس کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے، کیونکہ جب وہ اپنے آپ کو رب قرار دیتا ہے تو اُس کے لئے قدرت ثابت ہونی چاہیے، اب وہ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ مشرق کی طرف سے ہر روز میں چڑھاتا ہوں، کیونکہ وہ بھی جانتا ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے، میں نہیں چڑھاتا، دوسرے یہ ہے کہ اگر وہ کہے کہ میں چڑھاتا ہوں تو اب ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک دن مغرب سے چڑھا کر دکھا دو، تب ہم سمجھیں گے کہ تم قادر ہو، اور وہ سمجھتا تھا کہ میں یہ کیسے کہہ دوں، کیونکہ اگر وہ کہتا کہ میں چڑھاتا ہوں، تو سوال پھر واضح ہو گیا کہ ٹھیک ہے تو چڑھاتا ہو گا، لیکن ہمیں کیا پتہ کہ تو چڑھاتا ہے کہ نہیں چڑھاتا، اگر تو چڑھاتا ہے اور یہ تیرے اختیار سے چڑھتا ہے تو پھر ایک دن ہمیں اپنی قدرت دکھا دے، اور ادھر کی بجائے اِدھر سے چڑھا دے، لیکن اگر تو اس کی رفتار کو نہیں بدل سکتا اور اس کے طلوع ہونے کو نہیں بدل سکتا تو معلوم ہو گیا کہ یہ تیرے بس میں نہیں، اس کا لانا اور اس کا چھپانا کسی اور کے بس میں ہے۔ اور پھر

سورج ہی اُن کا سب سے بڑا دیوتا تھا، جس کا یہ اپنے آپ کو قائم مقام قرار دیتا تھا کہ میں اُس کا مظہر ہوں، تو گویا کہ سورج کے مسئلے کو ذکر کر کے ہی اُس پر اتمامِ حجت کر دیا، اب یہاں وہ مبہوت ہو گیا، آگے سے کچھ بول نہیں سکا، جواب نہیں دے سکا، لیکن اُس نے حق کو قبول بھی نہیں کیا، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستگیری نہ ہو اور شیطانی قوتیں انسان کے اُوپر مسلط ہو جائیں تو حق کی روشنی کتنی ہی تیز سامنے آ جائے آنکھیں چندھیا تو جاتی ہیں لیکن حقیقت نظر نہیں آتی، یہی ہے جس کو آگے فرمایا کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: جو لوگ اس قسم کے بے انصاف ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو غلط استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اکرامات کو شکر کا ذریعہ بنانے کی بجائے اپنے غرور اور گھمنڈ کا باعث بنا لیتے ہیں، ایسے لوگوں کو حق سمجھنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ پہلی مثال تو یہ ہو گئی، ابتداء میں جو الفاظ آئے تھے ''کیا آپ نے دیکھا اس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم علیہ السلام سے ابراہیم علیہ السلام کے رَبّ کے بارے میں''، جھگڑا کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ: کہ اللہ نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی، تو سلطنت کا مل جانا اللہ کا بہت بڑا انعام تھا، چاہیے تھا کہ شکر گزار ہوتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا، لیکن یہی انعام اس کے لئے غرور اور گھمنڈ کا باعث بن گیا، یہ انعام اُس کو سرکشی کی طرف لے گیا، نیاز مندی کی طرف نہیں لایا۔ یہ بھی ایک قسم کا اس پر ایک اعتراض ہے، کہ اللہ کی دی ہوئی سلطنت کو اس نے اللہ سے بغاوت کا ذریعہ بنایا، اور ظالم بھی وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اُس کی معصیت میں صرف کرتا ہے، اور اُس کی اطاعت میں صرف نہیں کرتا، اُس کو شکر گزاری کا ذریعہ نہیں بناتا، بلکہ کُفران کا باعث بنا لیتا ہے، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

حضرت عُزیر علیہ السلام کی موت اور پھر زندہ ہونے کا واقعہ

آگے دوسری مثال مذکور ہے، اَلَّذِيْ مَرَّ: جو شخص گزرا تھا، یہ گزرنے والا کون تھا؟ قرآنِ کریم میں اِس کی کوئی صراحت نہیں، البتہ اکثر مفسرین نے یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا قرار دیا ہے، یہ اسرائیلی پیغمبر ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۰)، اور یہ اُن کا واقعہ ہے۔ ایک بستی اجڑی ہوئی تھی، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی سے مراد بیت المقدس کی بستی ہے، جو بخت نصر ظالم بادشاہ نے حملہ کر کے یہاں کے لوگوں کو قتل بھی کیا اور بستی کو آگ لگا دی، ڈھا دی، ویران کر دی، کھنڈرات پڑے ہوئے تھے، حضرت عزیر اپنے گدھے پر سوار (جیسے اُنْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ سے معلوم ہوگا) گزر رہے جا رہے تھے۔ اب نبی جو بھی ہوتا ہے آپ جانتے ہیں کہ عقائدِ صحیحہ کا حامل ہی نہیں ہوتا بلکہ اُس کو اُن عقیدوں پر پختہ یقین ہوتا ہے، رَیب اور شک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن یقین ہونے کے باوجود (ذرا خیال فرمائیے!) ایک بات کا یقین ہے کہ ایسے ہوگی لیکن جب تک مشاہدہ نہ کر لیا جائے تو بسا اوقات دل اور دماغ میں ایک پریشانی کی سی کیفیت ہوتی ہے کہ معلوم نہیں کیسے ہوگی؟ جیسے زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بشارت دے دی کہ آپ کے ہاں لڑکا ہوگا، اور وہ چونکہ ظاہری اسباب کے خلاف بات تھی، تو کہا اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ (سورۂ مریم: ۲۰) بیٹا کیسے ہوگا، اس کے پیدا ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ میں دوبارہ جوان ہوں گا؟ یا مجھے کوئی نئی شادی کا حکم دیا جائے گا؟ کیا صورت ہوگی؟ اب اللہ کے کہنے کے بعد یقین تو آ گیا کہ لڑکا ہوگا، لیکن کیونکر ہوگا؟ یہ ذہن میں ایک سوال اُبھرتا

ہے، جیسے آپ کے سامنے آج کل کی نئی مصنوعات کے متعلق تذکرہ کیا جائے، کہ ایک مشین ہے اور وہ اس طرح کام کرتی ہے، خود حساب کرتی ہے، خود میزانیں بناتی ہے، اور اُس کا حساب بالکل صحیح ہوتا ہے، تو آپ اِس کمپیوٹر کے متعلق اتنی خبریں سن چکے ہیں کہ آپ کو یقین ہے کہ ایسا ہے، لیکن جب تک آپ اس کو دیکھ نہیں لیں گے اس وقت تک طبیعت میں تردد سا رہے گا کہ وہ کیسی ہوگی؟ کیسے حساب کرتی ہے؟ تو یہ جو کیسے کا سوال ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہوگا یہ یقین کے بعد بھی ایک کیفیت ہے جو مشاہدے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے، اُس کیفیت کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی کے متعلق آپ نے سُن لیا کہ وہ دس من وزن اپنے دانتوں کے ساتھ اٹھالیتا ہے، آپ کو یقین آ گیا کہ اٹھالیتا ہے، لیکن دل میں ایک چاہت سی ہوگی کہ کبھی اس کو اٹھاتا ہوا دیکھیں تو یقین آئے، وہ دانتوں کے ساتھ کیسے اٹھالیتا ہے؟ ہم تو دو سیر وزن اٹھانا چاہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے دانت ٹوٹنے لگے، پھر جس وقت آپ جائیں گے اور وہ آپ کے سامنے اُسی طرح سے منہ کے ساتھ اٹھائے گا تو پھر آپ کو ایک اطمینان کی کیفیت حاصل ہو جائے گی کہ واقعی جو ہم نے سنا تھا بات صحیح ہے۔ تو یقین آ جانے کے بعد بھی جس وقت تک اس چیز کا مشاہدہ نہ ہو اُس وقت تک انسان کے دل میں اس قسم کے سوالات اُبھرتے ہیں کہ کیونکر ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کیا صورت پیش آئے گی؟ اس قسم کی کیفیات انبیاء ﷩ پر بھی طاری ہوتی ہیں، وہ اپنے درجے کے مطابق اطمینان کے طالب ہوتے ہیں، چاہے جو اطمینان انہیں حاصل ہوتا ہے وہ ہم سے لاکھ گنا زیادہ ہو، لیکن پھر بھی اُن کے درجے کے مطابق اس قسم کے سوالات دماغ میں اُبھر سکتے ہیں۔ عزیز علیہ السلام کے دل میں بھی ایسی ہی بات آئی، اللہ تعالیٰ نے فوراً دستگیری فرمائی، اور اُن کے دل میں کیفیت دیکھنے کے لئے جو سوال ابھرا تھا تو اللہ نے مشاہدہ کروادیا، مشاہدہ کروانے کے بعد دیکھو! ایمان میں کتنی ترقی ہوگئی، ایمان کتنا بڑھ گیا، کہ بالکل اطمینان کے درجے تک آگئے، پہلے بھی ایمان تھا، یقین تھا، سب کچھ تھا، لیکن مشاہدے کے ساتھ یقیناً اس میں ترقی ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کی دستگیری کر کے آگے کو لے جاتا ہے۔

جب اُن کے دل میں یہ سوال اُبھرا تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بھی اور ان کے گدھے پر بھی موت طاری کر دی، اور سو سال تک اُن پر موت طاری رہی، سو سال کے بعد اٹھایا، پہلے تو اللہ نے یہ سوال کیا کہ کتنی مدت یہاں ٹھہرے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ، کوئی زیادہ مدت تو معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دن یا دن کا بعض حصہ نہیں، بلکہ تو ایک سو سال تک یہاں اسی طرح پڑا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے بتانے سے یقین آ گیا کہ واقعی سو سال کے بعد اٹھا ہوں۔ لیکن پھر اللہ نے فرمایا میری قدرت دیکھو، کھانے پینے کی چیز تیرے ساتھ تھی، وہ جیسے تھی ویسی کی ویسی پڑی ہے، اس پر مرورِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس لئے اللہ تعالیٰ کسی چیز کو محفوظ رکھنا چاہے تو اُس کا نمونہ دیکھ لو، آدمی کے بدن سے روح نکالنے کے بعد اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتے ہیں، اُس میں کوئی تغیر نہیں آنے دیتے، تو جس چیز کو بچانا چاہیں اور محفوظ رکھنا چاہیں اُس کا نمونہ بھی موجود ہے، کہ سو سال گزر گیا، نہ تیرے کھانے میں کیڑے پڑے، نہ اس میں بو آئی، نہ یہ باسی ہوا، جیسا تھا تازہ بتازہ ویسا موجود ہے۔ اور دوسرا نمونہ گدھے میں دیکھ لو، کہ ہڈیاں بکھری پڑی ہیں، چمڑے کا نام ونشان نہیں ہے، ریزہ ریزہ ہو گیا، بوسیدہ ہو گیا، جیسے کسی جانور کو مرے ہوئے سو سال ہو گیا ہو ویسا

ہڈیوں کا پرانا ڈھانچہ اور ریزے ریزے ہوئے پڑے ہیں۔ اب دیکھو! یہ جو ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں اور ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں، ہم اِن کو کس طرح سے اُٹھا کر اِس کی بنیاد بناتے ہیں، عمارت بناتے ہیں، اور پھر تیرے سامنے کس طرح ہم اس پر گوشت چڑھاتے ہیں، وہ سارے کا سارا نمونہ گدھے کو زندہ کر کے دکھا دیا۔ جس وقت اُس شخص نے یہ سارے کا سارا نمونہ اپنے سامنے دیکھ لیا، اور اللہ نے یہ بتا دیا کہ ہم نے تجھے مارا، زندہ کیا، یہ نمونہ اس لیے دکھایا ہے، تا کہ تجھے بھی اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے، اور تا کہ دوسروں لوگوں کے لئے تو نمونہ بھی بن جائے، دوسروں کے سامنے عقیدۂ آخرت کے لئے ایک بہت واضح دلیل مہیا ہو جائے۔ یہ سارا حال دیکھنے کے بعد وہ شخص پکار اُٹھا اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: میں جانتا ہوں، میں جان گیا، مجھے علم حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اب یہ مطلب نہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اللہ کی قدرت کا یقین آیا، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہمارے سامنے کوئی عجیب واقعہ پیش آتا ہے تو ہم کہتے ہیں سبحان اللہ، اللہ کی عجیب قدرت ہے، اب قدرت کا عقیدہ تو ہمارا پہلے بھی ہوتا ہے، لیکن اُس واقعہ کو دیکھ کر ہم اس عقیدے کا استحضار کرتے ہیں، یہاں اسی طرح اس نے بھی اپنی زبان سے پکارا کہ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

برزخ میں گزرے ہوئے زمانے کا احساس نہیں ہوتا

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ برزخ کا زمانہ کتنا ہی طویل گزرے لیکن جس وقت انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ایسے ہی ہوگا جیسے صبح شام کی بات تھی، جیسے دوسری جگہ ہے كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا (سورۂ نازعات)، آج تو یہ کہتے ہیں کہ قیامت بہت دُور ہے، پتہ نہیں ہوگی یا نہیں ہوگی، لیکن جب ہم ان کو مارنے کے ہزار ہا سال بعد بھی اُٹھائیں گے تو ایسے لگے گا: كَاَنَّهُمْ لَمْ يَلْبَثُوْٓا: گویا کہ یہ ٹھہرے ہی نہیں اِلَّا عَشِيَّةً: مگر شام کا وقت اَوْ ضُحٰىهَا: یا اس شام کی صبح بھی ساتھ، یعنی پورا دن یا آدھا دن، اِن کو معلوم ایسے ہوگا۔ اور ایک جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے پوچھے گا كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ: تم کتنے سال ٹھہرے؟ تو وہ کہیں گے لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (سورۂ مومنون: ۱۱۳)، یعنی وہ گزرا ہوا وقت ایسے معلوم ہوگا جیسے ایک دن پورا یا دن کا بعض حصہ، یہ نہیں کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے وقت ایسے ہوتا ہے، بلکہ انسان کو احساس ایسے ہوتا ہے، گزرے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا۔

آیتِ مذکورہ سے عدمِ سماعِ موتی پر اِستدلال دُرست نہیں

اب اِن لفظوں پر ایک بات ایسے ہی چھوٹی سی کہہ دوں (اگرچہ آپ حضرات کے ذہن میں تو معلوم نہیں وہ سوال اُبھرا ہے یا نہیں اُبھرا؟) کہ بعض حضرات جس وقت انبیاء علیہم السلام کی حیات پر یا سماعِ موتی پر بحث کرتے ہیں تو اُن کا مستدل ایک یہ آیت بھی ہے۔ ایک تفسیر چھپی ہوئی ہے، اور اِس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کرتے ہوئے اُس میں لفظ یہ استعمال کیے گئے ہیں کہ ”یہ حال ہے موت کا اُس شخص کی زبانی جو سو سال موت کو دیکھ کر آیا، اور لوگ پھر بھی کہتے ہیں کہ مردے سنتے ہیں“ یہ تفسیر میں چھپے ہوئے الفاظ

ہیں، گویا کہ اِس واقعے سے استدلال ہو گیا کہ مردے نہیں سنتے، کیونکہ اللہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تو کتنی مدت ٹھہرا؟ اُس کو اتنا ہی نہیں پتہ کہ میں کتنی مدت ٹھہرا تو اُس کی زندگی کا کیا سوال؟ اس کو اتنا ہی نہیں پتہ کہ میں کتنی مدت ٹھہرا، وہ کہتا ہے ایک دن ٹھہرا ہوں یا نصف دن ٹھہرا ہوں، حالانکہ وہ سو سال ٹھہرا تھا۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ اِن کو مرنے کے بعد کچھ پتہ نہیں ہوتا، قصہ ہی ختم۔ تو اِس آیت پر چونکہ یہ تذکرہ ہوتا رہتا ہے اس لئے میں نے آپ کے ذہنوں کو متوجہ کیا، شاید ویسے آپ کے ذہن میں یہ سوال نہیں آیا۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ یاد رکھیے (آپ کو ایک عجیب بات بتا دوں) کہ گزرے ہوئے وقت کا پتہ نہ چلنا حیات کے خلاف نہیں ہے، ایک آدمی زندہ ہوتا ہے لیکن اِن کے باوجود اُس کو گزرے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا، آپ کہیں گے یہ عجیب بات ہے کہ زندہ ہوتا ہے اور گزرے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا؟ حالانکہ قرآنِ کریم ہی کہتا ہے، اصحابِ کہف کا قصہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کیا کہا ہے، کہ وہ مار دیے تھے یا سلا دیے تھے؟ ضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ: ہم نے اُن کے کانوں پہ تھپکی دے دی تھی، سو گئے، مرے تو نہیں تھے؟ اصحابِ کہف سوئے تھے یا موئے تھے؟ سوئے تھے، ضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا: ہم نے کئی سالوں تک اُن کے کان کے اوپر تھپکی دے دی۔ اور وہ کتنے سال تھے؟ اللہ تعالیٰ نے کتنی تھپکی دی تھی، وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا: اپنی غار کے اندر وہ تین سو سال ٹھہرے، اور اُس کے اُوپر نو کا اضافہ، یعنی تین سو نو سال وہ اپنی غار کے اندر ٹھہرے، اس کے بعد قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ: پھر ہم نے ان کو اٹھایا۔ تو یہ تین سو نو سال تک زندہ تھے یا مردہ تھے؟ (زندہ تھے)۔ اور جس وقت یہ اٹھے تو آپس میں گفتگو کرتے ہیں كَمْ لَبِثْتُمْ: کتنا ٹھہرے ہو؟ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: وہ کہنے لگے کہ ہم ایک دن ٹھہرے ہیں یا بعض دن ٹھہرے ہیں۔ کسی نے کہا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ: اللہ کو پتہ ہے کتنی مدت ٹھہرے ہو۔ تو ایک آدمی کو وقت کے گزرنے کا پتہ نہ چلے یہ اس بات کی علامت نہیں کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ یہ میں نے ویسے ایک بات کہی، مسئلہ یہاں زیرِ بحث یہ نہیں۔

باقی رہا کہ اُن کو بالکل پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا، اس بارے میں ایک سوال آپ اپنے ذہن کے اندر اٹھائیے، کہ احادیثِ صحیحہ میں آتا ہے جس کا انکار بالاجماع کفر ہے، کہ مرنے کے بعد برزخ میں جس وقت انسان منتقل ہو جاتا ہے تو اُس کے پاس منکر نکیر آتے ہیں، حساب و کتاب ہوتا ہے، حساب و کتاب ہونے کے بعد اچھا آدمی ہو تو اُس کے سامنے جنّت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، اور اگر بُرا آدمی ہو تو اُس کے سامنے جہنّم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ، برزخ کی کتنی تفصیل ہے جو روایاتِ صحیحہ میں پیش کی گئی ہے۔ اور وہ عقیدہ قطعی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ثوابِ برزخ اور عذابِ برزخ کا انکار اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک کُفر ہے، عقائد کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، اگرچہ تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک عقیدے کی بات ہے روایاتِ صحیحہ کے تحت وہ عقیدہ قطعی ہے۔ اب ایک آدمی برزخ کے اندر ثواب اور عذاب کا انکار کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا، اور وہ آپ کے سامنے اس بات سے استدلال کرے کہ ''یہ حال ہے موت کا جو سو سال موت کو دیکھ کر آیا، اُس نے تو نہ جنت کی کھڑکی کھلتی ہوئی دیکھی، نہ اس نے جہنم کی کھڑکی کھلتی ہوئی دیکھی، نہ اس نے کوئی ثواب دیکھا نہ اس نے کوئی عذاب دیکھا، اگر یہ کیفیات اُس نے دیکھی ہوتیں تو اُس کو پتہ نہ ہوتا؟ کہ میں کہاں وقت گزار کے آیا ہوں۔ اگر اس نے یہ

سلسلہ دیکھا ہوتا، کوئی جہنم دیکھی ہوتی، جنت دیکھی ہوتی، اس کے سامنے کوئی فرشتے آئے ہوتے، کوئی انہوں نے سوالات کیے ہوتے، تو اس کو اتنا بھی پتہ نہ ہوتا کہ میں کتنا وقت گزار کے آیا ہوں۔ یہ آیت تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرنے والے کو کچھ پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوا اور کیا نہیں، اس لئے وہ سو سال کے بعد بھی اُٹھے تو ایسے ہوتا ہے جیسے ابھی سویا ہوا اٹھا ہو۔ اگر کوئی اس آیت سے عذاب برزخ اور ثواب برزخ کے انکار کے لئے استدلال کرے اور اسی طرح لفظ بولے کہ ''یہ حال ہے موت کا اس شخص کی زبانی جو سو سال موت کو دیکھ کے آیا، اسے پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ ایسے ہی تھا جیسے سویا اور اٹھا، معلوم ہوا کہ نہ فرشتے آئے، نہ کوئی جنت کی کھڑکی کھلی، نہ کوئی جہنم دیکھی، نہ فلاں چیز دیکھی، نہ فلاں چیز دیکھی، اگر دیکھی ہوتی تو اس کے سامنے کوئی تفصیلات ہوتیں، اور اُسے معلوم ہوتا کہ میں کتنا وقت گزار کے آیا ہوں۔ تو ثواب اور عذاب کے انکار کے لئے اگر وہ اس آیت سے استدلال کرتا ہے تو پھر آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ لازماً آپ کو یہاں کوئی بات ایسی کہنی پڑے گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہاں مقصود کیا ہے، اور اس قسم کے اجمالی الفاظ کے ساتھ احوالِ برزخ کی تفصیل کو مرتب نہیں کیا جاسکتا۔

آج تک کسی نے اس آیت سے اِستدلال نہیں کیا

یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں جہاں بھی سماعِ موتی پر بحث آئی ہے، اسلاف میں سے کسی نے اِس آیت سے استدلال نہیں کیا، موجودہ دور کے لوگ اس سے استدلال کرنے لگے ہیں۔ سماعِ موتی کی بحث کتابوں کے اندر مذکور ہے، لکھی ہوئی ہے، پُرانے زمانے سے لکھی چلی آرہی ہے، شروحات کے اندر اِن اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے، لیکن آج تک کسی نے سماعِ موتی کے انکار کے لئے اس آیت سے استدلال نہیں کیا، سماعِ موتی کے اثبات یا انکار کے لئے جن آیتوں سے استدلال کیا جاتا ہے وہ متعین ہیں، اور یہ آج کی نئی ریسرچ ہے جو کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں پچھتر آیتیں ہیں جو عدمِ سماع پر دلالت کرتی ہیں، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر اِس وقت تک آپ نقول اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ سماع کے بارے میں لوگوں کی آراء مختلف ہیں، بعض صحابہ کہتے ہیں کہ ہے، بعض کہتے ہیں کہ نہیں ہے، شاید جدید محققین کے نزدیک قائلینِ سماع کے قرآن میں یہ پچھتر آیتیں نہیں تھیں اور منکرینِ سماع کے قرآن میں ہوں گی۔ یہی بات ہے؟ کہ ایک مسئلہ پچھتر آیتوں کے تحت واضح کیا گیا ہو، اور صحابہ کرام سے لے کر اِس وقت تک وہ مسئلہ مختلف فیہ ہو، کوئی قائل ہو اور کوئی منکر ہو۔ کیا قائلین سماعِ موتی کے قرآن میں یہ پچھتر آیتیں نہیں تھیں؟ یا یہ کہو کہ جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔

یہ آیت نبی کے متعلق ہے، اور سماعِ انبیاء علیہم السلام تو متفق علیہ ہے

دُور کی بات کو چھوڑیئے، ''فتاویٰ رشیدیہ'' اُٹھا لیجئے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ، علماء دیوبند کے جدِ اعلیٰ، کہتے ہیں کہ سماعِ موتی کا آج فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، یہ مسئلہ پہلے سے مختلف فیہ ہے، اس کو مختلف فیہ قرار دینے کے بعد کہتے ہیں کہ ''یہ اختلاف عام مردوں کے بارے میں ہے، انبیاء علیہم السلام کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ اُن کے لئے سماع ثابت ہے''، اب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تو انبیاء علیہم السلام کے سماع کو متفق علیہ قرار دیں، اور عام لوگوں کے متعلق مختلف فیہ قرار دیں،

چاہے دلیل کے ساتھ ترجیح کوئی عدمِ سماع کو دے دے یا سماع کو دے دے، دونوں باتوں کی گنجائش ہے، مختلف فیہ مسئلے میں یہی بات ہوا کرتی ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ اتفاق ہے، اب اس واقعہ کو حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بنایا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے کہ مرنے والے کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے، اور عدمِ سماع کے لئے اس کو دلیل بنایا جائے، تو کیا پھر اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سنتے ہیں؟، اگر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کی صراحت کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے سننے کے مسئلے کو متفق علیہ مان لیا جائے تو ایک نبی کے واقعہ سے استدلال کس طرح سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔

اس آیت سے اِستدلال کے بعد تمام اَحوالِ برزخ کی بھی نفی کرنی پڑے گی

میں اِس مسئلے میں دلائل کے تحت آپ کے سامنے تفصیل نہیں کرنا چاہتا، میں دلائل کے تحت تفصیل وہاں کروں گا جہاں وہ آیت آئے گی جس پر علماء سماع کے مسئلے کو ذکر کرتے ہیں، "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى"(1) یہ آیت ہے جس پر سماع کے مسئلے کو ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن زیرِ درس آیت پرانی تفاسیر اور پرانے مباحث میں سماع اور عدمِ سماع کے لئے مستدل نہیں ہے، یہ آج کی نئی تحقیق ہے، میں تو آپ کے سامنے صرف یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِس واقعہ کا سماع کے ساتھ تعلق ہے یا نہیں، میں کہتا ہوں کہ اس واقعہ کا سماع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس قسم کے اجمالی الفاظ کے ساتھ احوالِ برزخ کی تفصیل مرتب نہیں کی جاسکتی، اگر ان اجمالی الفاظ سے برزخ کی تفصیل آپ مرتب کرنا چاہتے ہیں تو عذاب وثواب کا بھی کوئی قصہ یہاں سے معلوم نہیں ہوتا، جس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اُس بات کو ہی یہاں لو۔ یہاں تو صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ سوسال تک اس شخص پر موت طاری رکھی، نہ اس کو آخرت میں منتقل کرنا مقصود تھا، نہ اس کو برزخ کے احوال کی طرف منتقل کرنا مقصود تھا، اپنی ایک نشانی واضح کرنے کے لئے اس کو دوبارہ دنیا کی طرف لانا تھا، اور اُتنی سی کیفیت واضح کی جس کے لئے ظاہری طور پر وہ نشانی بن گئے، باقی مرنے کے بعد اُن پہ کیا گزرا اور کیا نہیں گزرا، یہ تفصیل یہاں بیان کرنی مقصود نہیں ہے، احوالِ برزخ کی تفصیل اِس آیت سے اخذ نہیں کی جاسکتی، یہ اجمالی الفاظ جس مقصد کے لئے یہاں آئے ہیں ان کو اسی مقصد پہ رکھیے، برزخ میں منتقل ہونے کے بعد کیا حال ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا، اس کے لئے دوسری آیات وروایات موجود ہیں، یہ آیت برزخ کے احوال بیان کرنے کے لئے نہیں آئی، اگر برزخ کے احوال بیان کرنے کے لئے آئی ہوتی تو پھر چاہیے تھا کہ کوئی شخص کہہ دے کہ مرنے کے بعد سوسال تک تو کچھ ہوتا نہیں، اُس کے بعد کا ہمیں پتہ نہیں، حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دفن کرنے کے بعد لوگ ابھی واپس آرہے ہوتے ہیں، جوتیوں کی کھٹ کھٹ کی آواز ابھی مردے کے کان میں جارہی ہوتی ہے اتنے میں فرشتے آجاتے ہیں، اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسال تک کچھ نہیں ہوتا، تو قرآن اور حدیث کو بازیچۂ اطفال نہیں بنایا جاسکتا کہ قدم قدم پہ ان کا آپس میں ٹکراؤ پیش کیا جائے، یہ آیت احوالِ برزخ کے بیان کرنے کے لئے ہے ہی نہیں، اس لئے احوالِ برزخ کی تفصیل آپ اس آیت سے اخذ نہ کیجئے، یہی

(1) پارہ ۲۰ سورۂ نمل آیت ۸۰۔ پارہ ۲۱ سورۂ روم آیت ۵۲۔

وجہ ہے کہ اسلاف میں سماعِ موتی یا حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے لئے اِس آیت کو بطور مستدل کے پیش نہیں کیا گیا، اور یہ مسئلہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى کے تحت آئے گا، وہاں ذکر کریں گے کہ کتنی آیتیں ایسی ہیں کہ جن سے عدمِ سماع معلوم ہوتا ہے، اور جو سماع کے قائل ہیں وہ اُن کی کیا تفصیل کرتے ہیں، اور جو سماع کے قائل نہیں ہیں وہ اُن روایات کی کیا تفصیل کرتے ہیں جو حدیث شریف میں آئی ہوئی ہیں، دلائل کی تفصیل ان شاء اللہ العزیز! وہاں کریں گے۔

سوال:- کیا یہ کہیں آتا ہے کہ قیامت کے دن کافر اُٹھیں گے تو اُن کو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ کتنی مدت برزخ میں ٹھہرے ہیں۔

جواب:- آیت تو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ، قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ، تو قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ محشر کے دن بھی لوگ اسی قسم کا احساس لیے ہوئے ہوں گے، اب ان آیتوں کو دلیل بنا لو کہ واقعی برزخ میں کچھ بھی نہیں ہوا، وہ تو ایسے تھا جیسے سوئے اور اٹھے، لہٰذا احوالِ برزخ کی جتنی تفصیل احادیث میں ذکر کی گئی ہے وہ نعوذ باللہ ساری کی ساری ایسے ہی من گھڑت ہے۔ اس لیے یہ آیت جس مقصد کے بیان کرنے کے لئے آئی ہوئی ہے وہ واضح ہے، باقی! اَحوالِ برزخ کے لئے یہ آئی ہی نہیں، کہ برزخ میں کیا گزری اور کیا نہیں گزری، اُس کے لئے جو آیات وروایات موجود ہیں اُن کی تفصیل وہاں سے اخذ کریں گے۔ اگر اس طرح سے الفاظِ قرآن پر ہی جم کے بیٹھنا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آئے کوئی ماں کا لعل، مجھے بتائے کہ کہاں سے اشارہ نکلتا ہے کہ برزخ میں بھی کچھ راحت اور عذاب کے قصے گزرتے ہیں، یہ آیات تو ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں گزرا، انسان ایسے ہوگیا جیسے سونے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت برزخ کے احوال بیان کرنے کے لئے آئی ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی، جو چیز واضح کرنا مقصود ہے وہ واضح ہے، کہ سو سال تک اس پر موت کی کیفیت طاری کی، یعنی اس کو موت دینے کے بعد سو سال تک اس کیفیت پر باقی رکھا، آخرت کی طرف منتقل کرنا مقصود نہیں، اس لیے اگر برزخ کے احوال نہ بھی طاری کیے ہوں تو چونکہ دوبارہ اس کو زندگی کی طرف لانا ہے، تو ان کی تفصیلات اگر نہیں سامنے آئیں تو کوئی بات نہیں، مقصد یہاں یہ ہے کہ اس کو موت دینے کے سو سال کے بعد اللہ نے زندہ کر دیا۔ ورنہ پھر نفی ہر چیز کی کرنی پڑے گی، صرف سماع کی نہیں، ایک سماع کی نفی کرتے کرتے ہر چیز کا انکار کرنا پڑے گا کہ کچھ بھی نہیں ہوتا، اور یہ عقیدہ کفر ہے، یہ میں آپ کو بتا دوں، عقائد کی کتابوں کے اندر لکھا ہوا ہے کہ سرے سے برزخ کے عذاب وثواب کا انکار کرنا کفر ہے، تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مرنے کے بعد قیامت سے پہلے قبر میں راحت اور عذاب کے قصوں کا پیش آنا قطعی ہے۔ اس لیے یہ آیت مستدل نہیں ہے، نہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے لئے، نہ سماعِ موتی کے لئے، نہ برزخ کے احوال کے لئے، اسی لئے اسلاف نے اس مسئلے کو ذکر کرتے ہوئے اس آیت سے کبھی استدلال نہیں کیا۔ وہ مسئلہ جہاں آئے گا ان شاء اللہ العزیز وہاں اُس کو ذکر کریں گے۔

ابراہیم علیہ السلام اور پرندوں کا واقعہ

رکوع کی تیسری اور آخری مثال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا؟ سوال کیفیت کے متعلق ہے، باقی اِس بات پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ

کرے گا، اُس کی قدرت میں شک نہیں ہے، جیسا کہ پچھلی مثال میں آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا، کہ ایک بات کے یقین ہونے کے باوجود جب تک اُس کا مشاہدہ نہ کرلیا جائے بسا اوقات انسان کے ذہن میں مختلف قسم کے سوال اُبھرتے رہتے ہیں، مشاہدہ کرنے کے بعد حق الیقین حاصل ہوجاتا ہے، پھر قلب کو ایک سکون اور اطمینان آجاتا ہے۔ تو یقین کے بعد اطمینان کا ایک اور درجہ ہے، یقین ہونے کے باوجود جس وقت تک مشاہدہ نہ کی گئی ہو اُس وقت تک قلب میں اس طرح سے تردد کہ یہ کیسے ہوگا، اس قسم کے سوال ابھرتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اِحیاء موتی کی کیفیت پوچھی تو اللہ تعالیٰ کا آگے سوال یہ ہے کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ: کیا تو جانتا نہیں اور ایمان نہیں لاتا؟ یا، تو پوچھتا ہے اور تیرا ایمان نہیں ہے؟ ایمان کس بات پر؟ اِحیاء موتی پر۔ حضرت ابراہیم کا جواب یہ ہے کہ بَلٰی! کیوں نہیں، ایمان تو ہے، لیکن میں سوال اس لئے کرتا ہوں تا کہ مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہوجائے۔ اب اللہ تعالیٰ کے اس سوال سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے یہ شبہ ہی ختم ہوگیا، کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال کسی شک کی بناء پر تھا، ورنہ کوئی غلط کار کہہ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اِحیائے موتی پر یقین نہیں تھا اس لئے سوال کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے سوال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب نے اس شبہ کی جڑ کاٹ دی۔ اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ"(1) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، یعنی اگر ابراہیم کو اس معاملے میں شک ہوتا تو ہمیں بدرجہ اولیٰ ہوتا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کے بارے میں ہمیں بھی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کریں گے، تو ابراہیم علیہ السلام کو شک کیسے گزر سکتا تھا؟ اس لیے یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کے طور پر نہیں تھا، ہاں البتہ یقین ہونے کے باوجود کیفیت پوچھی جارہی ہے اور اطمینانِ قلب کے لئے یہ سوال کیا جارہا ہے۔

اِطمینانِ قلب کا مفہوم

اطمینان کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اِطْمَأَنَّ: اِقْشَعَرَّ کی طرح، سکون پکڑنا، جیسے ایک چیز رسی کے ساتھ آپ نے لٹکائی ہوئی ہے، تو وہ جب ہلتی ہے تو یہ مطمئن نہیں، جس وقت وہ اپنے وزن کے ساتھ بالکل سیدھی ٹھہر جائے گی اُس وقت کہیں گے کہ اب یہ مطمئن ہوگئی، اب اس میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت نہیں رہی، اب اس میں اطمینان پیدا ہوگیا، یہ سکون ہے، یا مثلاً دِیا جلا کے رکھا ہوا ہے اور ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو کبھی اس کی لاٹ اِدھر کو جاتی ہے کبھی اِدھر کو جاتی ہے، یہ اس کی غیر مطمئن کیفیت ہے، اور جس وقت اس کی سیدھی لاٹ یوں ٹِک جائے گی اور اس میں اِدھر اُدھر حرکت نہیں رہے گی تو اُس کو کہتے ہیں کہ اِطْمَأَنَّ السِّرَاجُ دیا ٹک گیا، اس کی لَو میں اطمینان پیدا ہوگیا۔ انسان کے قلب کی بھی یہی کیفیت ہے کہ یہ پلٹے کھاتا رہتا ہے، کبھی کدھر کو، کبھی کدھر کو، اور جب پوری طرح سے کوئی بات کیفیت کے تحت مشاہدے میں آجاتی ہے تو پھر اس کی حرکت ختم ہوجاتی

(1) مشكوة ص۵۰۶ / صحيح البخاري ج۲ ص۶۵۱ باب بدء الخلق. فصل اول، باب اذا قال ابراهيم رب ارني / صحيح مسلم ج۱ ص۸۵، باب زيادة طمانية القلب

ہے، یہ جو کیفیت ہے کہ کبھی کدھر کو خیال گیا اور کبھی کدھر کو خیال گیا، یہ کیفیت ختم ہو کر اپنے ایک موقف پر ٹک جاتا ہے، اِس کو کہتے ہیں اطمینانِ قلب۔

اِطمینانِ قلب سے پہلے اور بعد کی کیفیت

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ جب انسان کے دل کا تعلق قوی ہو جائے تو دنیوی امور کے بارے میں بھی انسان کا دل ٹک جاتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کا تعلق مضبوط نہ ہو تو پھر فکر کے طور پر کبھی کدھر کو جا رہا ہے، کبھی کدھر کو جا رہا ہے، کسی وقت بھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آتا، قرآنِ کریم میں جو ذکر کیا گیا کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد: ٢٨) اُس کا معنی بھی یہی ہے کہ یہ پھر بے بس سا ہو کے جھولتا ہے، کبھی کسی طرف کو، کبھی کسی طرف کو، کبھی اولاد کا فکر، کبھی مال کا فکر، کبھی کاروبار کا فکر، کبھی فلاں چیز کا اندیشہ، کبھی فلاں چیز کا خوف، ہر وقت یہ پلٹے کھاتا رہتا ہے، لیکن جب اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر یہ اپنی جگہ ٹک جاتا ہے، پھر کوئی فکر اور کوئی پریشانی اِس کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی، یہ اطمینان اگر قلب کے اندر آ سکتا ہے تو عام حالات میں اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی آ سکتا ہے، اس لیے وہاں بھی یہی اطمینان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۗ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا بَلٰى: کیوں نہیں وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ: ولکن سَئَلْتُ لیطمئن قلبی، میں نے یہ سوال اس لیے کیا ہے تاکہ میرے دل میں اطمینان آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ: اب یہ مشاہدہ کروایا جا رہا ہے، کہ چار پرندے لے لو، چار اس لیے تاکہ چاروں طرفوں سے اِس کا مشاہدہ ہو جائے، پرندے کون کون سے لیے تھے قرآنِ کریم میں اِس کا ذکر نہیں ہے، اسرائیلی روایات میں ذکر ہے کہ مور، مرغ، کوا، کبوتر، یہ چار پرندے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لیے۔ پھر فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ مائل کر لو، مائل کرنے کا مطلب یہ ہے جس طرح ایک چیز مانوس ہو جاتی ہے، کہ جب وہ آواز دے تو دوڑی ہوئی آتی ہے، جیسے بکریوں والوں کے ساتھ بکریاں مانوس ہو جاتی ہیں، بھیڑوں والوں کے ساتھ بھیڑیں مانوس ہو جاتی ہیں، لوگ کبوتر رکھتے ہیں اور بٹیر رکھتے ہیں اور مانوس کر لیتے ہیں، پھر جب ان کو آواز دیتے ہیں تو وہ بھاگے ہوئے آتے ہیں، صُرْهُنَّ کا معنی یہی ہے، یہ صَارَ يَصُوْرُ سے ہے مائل کرنے کے معنی میں، صُرْهُنَّ اِلَيْكَ: ان کو اپنی طرف مائل کر لو، وہ آپ کے ساتھ مانوس ہو جائیں، کہ جس وقت آپ آواز دیں تو وہ بھاگے ہوئے آئیں، یہ کیفیت پیدا ہو جائے، مائل کرنے کے بعد آگے لفظ یہ آ رہے ہیں ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا: کہ پھر ہر پہاڑ پر اِن میں سے ایک جزء کو رکھ دے، اس جزء سے مراد یہ ہے کہ ان کو ذبح کر لو، ذبح کرنے کے بعد ان کے اجزاء علیحدہ علیحدہ کر لو، جیسے تفسیری روایات میں تفصیل ذکر کی گئی ہے، کہ اِن سب کا اکٹھا کر کے قیمہ کر لو، جس میں سارے اجزاء آپس میں خلط ملط ہو جائیں، خلط ملط ہونے کے بعد پھر ان اجزاء کو اپنے اردگرد جو پہاڑ ہیں یعنی پتھر چٹانیں، اِن کے اوپر بکھیر دو، چاروں طرف۔ بکھیر دینے کے بعد پھر ان کو اپنی طرف بلانا، یہ آپ کی طرف دوڑے ہوئے آئیں گے، تو اس وقت آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

موحد کی جستجو اور مشرک کے اِنکار میں فرق

کیونکہ اِس میں جو چیز انسان کے لئے کچھ تردد کا باعث بنتی ہے ایک کیفیت معلوم کرنے کے لئے، وہ یہی چیز ہے کہ بکھرے ہوئے اجزاء کو اللہ تبارک وتعالیٰ اکٹھا کس طرح کریں گے۔ قدرت پر یقین ہونے کے باوجود کیفیت کی جستجو تو پختہ کار مؤمن کو بھی ہوسکتی ہے، لیکن مشرکین مکہ اِسی چیز کو انکار کا باعث بناتے تھے کہ جب اجزاء بکھر جائیں گے، کچھ ہوا اڑا کر لے جائے گی، کچھ پانی بہا کر لے جائے گا، کچھ مختلف قسم کے درندے کھا جائیں گے، ذرہ ذرہ بکھر جائے گا، ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی، تو پھر یہ کیسے زندہ ہوسکتی ہیں؟ یہ ''کیسے'' کا سوال وہ بطور انکار کے کرتے تھے، جس کا مطلب تھا کہ زندہ نہیں ہوسکتیں، مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ (سورۂ یس: ۷۸) کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جس وقت کہ وہ بوسیدہ ہوجائیں گی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جو مشاہدہ کروایا، تو وہ بھی یہی تھا کہ اجزاء بکھر گئے، بکھرنے کے بعد خلط ملط ہوگئے، اِس کے بعد جس وقت وہ زندہ ہونے لگے تو مور کے اجزاء الگ اکٹھے ہوگئے، مرغ کے الگ اکٹھے ہوگئے، کبوتر کے الگ اکٹھے ہوگئے، اور کوے کے الگ اکٹھے ہوگئے، وہ سارے اکٹھے ہوتے ہوئے نظر آئے، کہ اللہ تعالیٰ نے اجزاء کو کس طرح سے سمیٹا اور اکٹھا کر کے بنا کے کھڑا کر دیا، تو اب یہ کیفیت مشاہدے میں آگئی کہ بکھرے ہوئے اجزاء یوں اکٹھے ہوجائیں گے، یہ اللہ تعالیٰ نے مشاہدہ کروادیا۔

اِحیائے موتیٰ کی سب سے بیّن دلیل

ویسے جہاں بھی اس قسم کا سوال قرآنِ کریم میں اٹھایا گیا ہے وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ اِن کو زندہ وہی کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، یہ جواب بتاتا ہے کہ وہ انکار کرتے تھے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے انکار کو رد کرنے کے لئے دلیل یہ دی کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ تو پہلی مرتبہ پیدا کرنے کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے (اب اس لفظ پر ذرا غور فرمالیجئے!) اُن الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا اور اِس انکار کی وجہ تمہارے دل میں یہ آتی ہے کہ اجزاء بکھر جائیں گے، اکٹھے کیسے ہوں گے؟ یہ اکٹھے نہیں ہوسکتے، یہ بات تمہاری عقل میں نہیں آتی، تو تم اپنی ابتدائی خلقت کے اندر غور کرو، تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ ابتدائی خلقت میں غور کس طرح سے؟ کہ تم بنے کس طرح سے ہو، تمہاری بنیاد کہاں سے چلی، رَحم میں نطفہ آیا، حیض کے خون کے ساتھ تربیت ہوئی، بچہ بن کے باہر آگیا، غذا کھاتے کھاتے ہم جوان ہوگئے، یہ ہمارا وجود بن گیا۔ اب اس پر ذرا غور کیجئے کہ نطفہ کیا چیز ہے؟ غذا کا خلاصہ ہے، ایک آدمی نے غذا کھائی، غذا کے بعد بدن کے اندر ایک نطفہ پیدا ہوا، یہ غذا کا خلاصہ ہے، اور وہ غذا جتنی اُس نے کھائی تھی اُس کے اثرات اِس میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ غذا کیا کھائی تھی؟ گندم کھائی، معلوم نہیں کس کس کھیت کی پھوٹی ہوئی تھی جو آپ کے منہ میں آئی، سبزیاں آپ نے کھائیں، معلوم نہیں کہاں کہاں سے آئی تھیں، کہاں کہاں سے پھوٹی تھیں، گوشت آپ نے کھایا، معلوم نہیں کس کس جانور کا کھایا، اور جس جانور کا آپ نے گوشت کھایا معلوم نہیں کہاں کہاں سے اس نے چارہ کھایا تھا، دودھ آپ نے پیا، معلوم نہیں کتنے جانوروں کا پیا، اور جن کا دودھ آپ نے

پیا ہے معلوم نہیں انہوں نے کہاں کہاں چرا تھا، ادویات آپ نے استعمال کیں، کوئی امریکہ سے آئی، کوئی جرمن سے آئی، کوئی کہیں سے آئی، کوئی کہیں سے آئی، یہ ادویات آپ نے استعمال کیں، ان کا اثر بدن کے اندر آیا، تو یہ آپ کے ذرات امریکہ افریقہ، کہاں کہاں بکھرے پڑے تھے جو دوائی کی شکل میں آگئے، پانی آپ نے پیا، معلوم نہیں کہاں کہاں کا پیا، اور اس کے اثرات بدن کے اندر آگئے، تو یہ سب کے سب جمع ہونے کے بعد ایک نطفے کی شکل میں آیا، اور پھر ماں کا خون جو بچے کی تربیت کا ذریعہ بنتا ہے وہ بھی تو غذا کا خلاصہ ہے، اور ماں نے کیا کچھ کھایا، کھانے کے بعد آپ کے سارے کے سارے اجزاء جہاں بکھرے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے اکٹھے کر کے خون کی شکل میں پہنچا دیے۔ پھر آپ پیدا ہو گئے، جس وقت آپ پیدا ہوئے تھے تو چھ انچ کے، نو انچ کے، یا ایک فٹ لمبے تھے، اور اب اِس وقت آپ چھ فٹ لمبے ہو گئے، یہ آپ کی تعمیر غذا کے ذریعے سے ہوئی ہے، گویا کہ جو غذا کھاتے ہیں وہ آپ کے بدن کو لگتی جا رہی ہے، جس سے آپ کی تعمیر ہو رہی ہے، اور آپ بتا سکتے ہیں؟ کہ کہاں کہاں آپ نے کھایا اور کیا کیا کھایا؟ اور اس کھانے کے اندر کس کس دھرتی کے اور کس کس زمین کے ذرات آئے ہیں؟ مثلاً کیلا آپ کھاتے ہیں، وہ سندھ سے آیا، معلوم نہیں کس کس کھیت سے آیا، سیب آپ کھاتے ہیں، کشمیر کی طرف سے آئے، معلوم نہیں کہاں کہاں سے آئے، پانی آپ پیتے ہیں پتہ نہیں کن دریاؤں اور کن چشموں کا آیا، ادویات آپ نے کھائیں، معلوم نہیں کہاں کہاں سے آئیں، گوشت آپ نے کھایا، اور جن جانوروں کا کھایا معلوم نہیں وہ کہاں کہاں چرے تھے، دودھ آپ نے پیا اور معلوم نہیں کن کن جانوروں کا پیا اور وہ کہاں کہاں سے چر کے آئے تھے، تو اِس وقت بھی ہمارا وجود ساری دنیا کے اندر پھیلے ہوئے ذرات کو اکٹھا کر کے اللہ نے بنایا ہے، یہ نہیں کہ ایک ہی جگہ سے مٹی کی ٹوکری بھری اور اس کو گوندھ کے بت بنا کے کھڑا کر دیا، کہ یہ تو اجزاء سارے کے سارے اکٹھے تھے تو بنانا آسان ہو گیا اور مرنے کے بعد یہ اجزاء بکھر جائیں گے پھر دوبارہ اکھٹے کس طرح سے ہوں گے، ایسی بات نہیں۔ اب جو ہمارا وجود بنا ہوا ہے یہ بھی تو متفرق اجزاء کا مجموعہ ہی ہے، یعنی جو کچھ آپ کھاتے ہیں وہ آپ کے بدن کے ساتھ لگتا جا رہا ہے، تو جہاں سے وہ آیا وہاں کی چیز آپ کے بدن میں آگئی، مٹھائی کی شکل میں آگئی، غذا کی شکل میں آگئی، پھلوں کی شکل میں آگئی، دودھ کی شکل میں آگئی، پانی کی شکل میں آگئی، ادویات کی شکل میں آگئی، عالم کے اندر آپ کے حصے بکھرے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ اکٹھے کر کے آپ کا وجود بنا دیا، تو اگر دوبارہ وہ اسی طرح سے بکھر جائیں گے تو پھر اُن کو دوبارہ اکٹھا کرنا کیا مشکل ہے، اس لیے کہا قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (سورۂ یٰس: ۷۹) اِن کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ بنایا تھا، تو پہلی دفعہ بھی ذرات کو اکٹھا کر کے بنایا ہے تو دوبارہ ذرات کو اکٹھا کر کے بنانا اس کے لئے کیا مشکل ہوگا۔ تو مشرک تو یہ سوال کرتے تھے انکار کی بناء پر، اس لیے اُن کا جواب اِس انداز سے دیا گیا، اور کیفیت کے متعلق سوال مؤمن صادق کے دل میں بھی آسکتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ مشاہدہ کروا دیا۔

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کروایا گیا، واقعہ پیش آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے مری ہوئی چیزوں کے اجزاء اکھٹے کر کے اُن کو زندہ کیا، ہمارے سامنے نقلِ صحیح کے طور پر یہ بات آگئی، تو آخرت میں مردوں کے زندہ کرنے کے لئے ہمارے سامنے بھی ایک دلیل واضح ہو گئی۔ یہاں جزء سے اُن پرندوں کے اجزاء بدنی مراد ہیں، کہ ذبح کر کے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن

کے جزء علیحدہ علیحدہ پہاڑوں پر ڈال دو، ثُمَّ ادْعُهُنَّ: پھر اُنہیں بلاؤ، یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا: تیرے پاس وہ بھاگتے ہوئے آئیں گے، وَاعْلَمْ: اور تو یقین کر لے اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ: کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، ہر چیز پر قادر ہے، اور حکیم ہے کہ اس کا جو کام بھی ہوتا ہے حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ سَعْیًا کے متعلق ذکر کر دیا تھا کہ بھاگتے ہوئے آئیں گے، اڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ اڑ کر آئیں تو بسا اوقات اشتباہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی اور طرف سے کوئی جانور اڑ کر آ گیا ہو، وہ سامنے بنیں گے، اور قدموں پر چل کر آپ کی طرف آئیں گے، جس سے آپ کو خوب اچھی طرح سے مشاہدہ ہو جائے گا کہ یہ وہی ہیں جو میں نے ذبح کیے تھے اور ذبح کرنے کے بعد ان کے اجزاء بکھیرے تھے۔ اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اولیاء کی دستگیری کرتا ہے، کہ جہاں ان کے دل میں کوئی اس قسم کا سوال اُبھرا جو کسی قسم کی روشنی کا طالب ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس قسم کی کیفیت کو دور کر کے اُن کے دل کو آئے دن منور کرتا رہتا ہے تو یہ مثال بھی اسی کی ہو جائے گی جو پچھلی آیت میں آیا تھا، یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔

اگلے رکوع کا ماقبل کے ساتھ ربط

اگلا رکوع جو آپ کے سامنے آ رہا ہے اِس کا تعلق ماقبل کے ساتھ دے دیا گیا تھا، کہ اصل اِس کا تعلق ہے قرآنِ کریم کے اِس حکم کے ساتھ کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ، جس میں انفاق فی سبیل اللہ کا مسئلہ شروع ہو رہا ہے، اور یہ درمیان کی باتیں الشیء بالشیء یذکر کے طور پر آ گئی تھیں، کسی مناسبت کے طور پر مضمون دوسری طرف کو منتقل ہوتا چلا گیا، یہ ضمنی باتیں درمیان میں استطراداً آ گئیں، اب اصل مسئلے کی طرف پھر رجوع ہو گیا، کہ انفاق فی سبیل اللہ کے فضائل اور اس کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کے راستے میں اس دانے کی طرح ہے جو اُگاتا ہے سات بالیاں،

فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ

ہر بالی میں سو دانہ ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے ﴿۲۶۱﴾ جو لوگ

یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ

خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں پھر نہیں پیچھے لگاتے اپنے خرچ کرنے کے احسان جتلانے کو اور نہ تکلیف پہنچانے کو،

لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

اُن کے لیے ان کا اجر ہے اُن کے رب کے پاس، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بہتر ہے ایسے صدقے سے جس کے پیچھے تکلیف پہنچانا ہو، اللہ تعالیٰ غنی ہے اور بردبار ہے ﴿۲۶۳﴾ اے ایمان والو!

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ

اپنے صدقات کو باطل نہ کر دیا کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر، اُس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ

اور نہیں ایمان لاتا اللہ پر اور یوم آخر پر، پس اُس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک چٹان ہو، اس کے اُوپر مٹی ہو پھر پہنچے اُس کو زوردار بارش،

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ

پھر چھوڑ دے وہ بارش اُس پتھر کو چٹیل، نہیں قادر ہوں گے وہ لوگ اُس کام میں سے کسی شیء پر جو انہوں نے کیا، اللہ تعالیٰ

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

نہیں ہدایت دیتا کافر لوگوں کو ﴿۲۶۴﴾ اور مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا

اور اپنے دلوں کو مضبوط کرنے کے لئے، اُن کی مثال ایسے ہے جیسے ایک باغ ہو اونچی جگہ میں، اُس کو موٹے موٹے قطروں والی بارش

وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

پہنچ جائے پھر دے وہ اپنا پھل دوگنا، اور اگر اُس کو موٹے قطروں والی بارش نہ پہنچے تو اُس کے لئے پھوار ہی کافی ہے، اللہ دیکھنے والا

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ

ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو ﴿۲۶۵﴾ کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کے لئے باغ ہو

نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ

کھجوروں کا اور انگوروں کا، جاری ہوں اس کے نیچے سے نہریں، اس شخص کے لئے اس باغ میں

كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ

ہر قسم کے میوے ہوں، اور اس کو بڑھاپا پہنچ جائے اور اس کے لئے کمزور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، پھر پہنچ جائے اُس باغ کو

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾
بگولا جس میں آگ کا اثر ہو پھر وہ باغ جل جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے آیات کو تا کہ تم غور کرو ﴿۲۶۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ: مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کے راستے میں، كَمَثَلِ حَبَّةٍ اُس دانے کی طرح ہے، اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ: جو اُگاتا ہے سات بالیاں، (لفظوں میں غور فرمائیے) ''مثال ان لوگوں کی جو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو مثل دانے کے ہے''، دانہ تو اُس مال کی مثال ہے، لوگوں کی مثال نہیں ہے، ممثّل لہ تو ہیں الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ، اور مثال دی جارہی ہے كَمَثَلِ حَبَّةٍ کے ساتھ، کہ وہ دانے کی طرح ہیں، حالانکہ وہ لوگ دانے کی طرح نہیں بلکہ ان کے خرچ کیے ہوئے مال اس دانے کی طرح ہیں، اس لیے یہاں ابتداء میں مضاف محذوف نکال لیا جائے گا مَثَلُ نَفَقَاتِ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ، یہ لفظ مقدر نکالیں گے تو آپس میں بات صحیح ہو جائے گی، ترجمہ یوں ہوگا ''جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے مال کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک دانہ ہو جو سات بالیاں اگائے'' اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ: اگاتا ہے وہ سات بالیاں، سنابل سُنْبُلَة کی جمع ہے، سنبلۃ کا معنی ہے جس طرح سے گندم کا سٹا ہوتا ہے۔ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ: ہر بالی میں، ہر سٹے میں، مِّائَةُ حَبَّةٍ: سو دانہ ہے۔ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ: اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستے میں، ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا: پھر نہیں پیچھے لگاتے اپنے خرچ کرنے کے مَنًّا وَّلَآ اَذًى: احسان جتلانے کو اور نہ تکلیف پہنچانے کو۔ مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا: احسان جتلانا۔ مَآ اَنْفَقُوْا: جو مال انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے، یا اپنے خرچ کرنے کے پیچھے، ما موصولہ یا مصدریہ، اپنے خرچ کرنے کے پیچھے نہیں لگاتے وہ احسان جتلانے کو اور نہ تکلیف پہنچانے کو، لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: ان کے لئے اِن کا اجر ہے ان کے رب کے پاس وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ یہ غمزدہ ہوں گے۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ: اچھی بات کہنا، وَّمَغْفِرَةٌ: اور درگزر کرنا، خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ: بہتر ہے ایسے صدقے سے يَّتْبَعُهَآ اَذًى: جس کے پیچھے تکلیف پہنچانا ہو، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ غنی ہے، اور تحمل والا ہے، بردبار ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کر دیا کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر، كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ: اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنے مال کو، رِئَآءَ النَّاسِ: لوگوں کو دکھانے کے لئے، وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: اور نہیں ایمان لاتا اللہ پر، وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اور یومِ آخر پر، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ: پس اس کی مثال اس چٹان جیسی ہے، صفوان چکنے پتھر کو کہتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک چٹان ہو، عَلَيْهِ تُرَابٌ: اُس کے اوپر مٹی ہو، فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ: پھر پہنچے اس کو زوردار بارش، وابل کہتے ہیں موٹے موٹے قطروں والی بارش کو، فَتَرَكَهٗ صَلْدًا: پھر چھوڑ دے وہ بارش اُس صفوان کو، اُس پتھر کو چٹیل، صَلْدًا کا معنی صاف ستھرا، جیسے

رَأْسٌ صَلْدٌ: سر کی صفت جس وقت آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے گنجا سر، جس کے اوپر کوئی بال نظر نہیں آتا، تو یعنی وہ چٹان کو ایسے کر دے جیسے گنجا سر ہوتا ہے، اس پر کسی قسم کی نباتات اور گھاس کا پتا نظر نہ آئے، فَتَرَكَهٗ صَلْدًا: پھر چھوڑ دے وہ وابل، چھوڑ دے وہ بارش اُس پتھر کو صاف ستھرا، لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ: نہیں قادر ہوں گے وہ لوگ کسی شئی پر، مِّمَّا كَسَبُوْا: اس چیز میں سے جو انہوں نے کیا، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا کافر لوگوں کو۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ: اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو، ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: مرضات رَضِیَ یَرْضٰی کا مصدر ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: اور اپنے دلوں کو مضبوط کرنے کے لئے، دلوں کو جمانے کے لئے، ثابت کرنے کے لئے، كَمَثَلِ جَنَّةٍ: ان کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک باغ ہو بِرَبْوَةٍ: اونچی جگہ میں، رَبوۃ اونچی ہموار جگہ کو کہتے ہیں، ایک باغ ہو اونچی ہموار جگہ میں، اَصَابَهَا وَابِلٌ: اس کو موٹے موٹے قطروں والی بارش پہنچ جائے، فَاٰتَتْ اُكُلَهَا: پھر دے وہ اپنا پھل، ضِعْفَيْنِ: دوگنا، اُکل کہتے ہیں اس چیز کو جو کھائی جاتی ہے، مراد یہاں پھل ہے، فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ: اور اگر اس کو وابل نہ پہنچے، موٹے قطروں والی بارش نہ پہنچے فَطَلٌّ: فَطَلٌّ يَكْفِيْهِ تو اس کے لئے پھوار ہی کافی ہے، شبنم ہی کافی ہے۔ طل شبنم کو بھی کہتے ہیں اور ہلکی ہلکی بارش جس کو ہم اپنے ہاں کہتے ہیں پھوار یا بوندا باندی، وہ بھی کافی ہے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُس کام کو جو تم کرتے ہو۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ: کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ: کہ اس کے لئے باغ ہو کھجوروں کا، وَّاَعْنَابٍ: اور انگوروں کا، تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جاری ہوں اس کے نیچے سے نہریں، لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: اُس شخص کے لئے اُس باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں، وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ: اور اُس کو بڑھاپا پہنچ جائے، کِبَر بڑھاپے کو کہتے ہیں، وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ: اور اس کے لئے کمزور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ: پھر پہنچ جائے اُس باغ کو بگولا، اِعصار کہتے ہیں بگولے کو، جس کے لئے آپ غالباً واورو ڑا کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یہ جو تیز ہوا آیا کرتی ہے گھومتی ہوئی اور چکر کاٹتی ہوئی، اردو میں تو اسکو بگولا کہتے ہیں، اور عام طور پر پنجابی میں اس کے لئے واورو ڑا کا لفظ بولتے ہیں، اور آپ کیا کہتے ہیں؟ (واولوجڑاں)، بہرحال مطلب سمجھ میں آ گیا؟ وہ جو تیز ہوا آیا کرتی ہے چکر کاٹتی ہوئی، کہ جو چیز بھی اس کے چکر کے اندر آ جائے اس کو اُڑا کے اور توڑ پھوڑ کے پھینک دیتی ہے، اِعصار سے یہی مراد ہے۔ فِيْهِ نَارٌ: اس میں آگ کا اثر ہو۔ فِيْهِ نَارٌ ''اس میں آگ ہو'' کا یہ معنی نہیں کہ آگ کی لپٹیں لاٹیں نکل رہی ہوں، بلکہ لُو کا اثر، گرمی کا اثر، تیز گرمی مراد ہے، فَاحْتَرَقَتْ: پھر وہ باغ جل جائے، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ: اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے آیات کو لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ: تا کہ تم غور کرو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ترجمے کے ساتھ ہی آپ سمجھ گئے کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کے آداب بیان فرما رہے ہیں، تا کہ وہ انفاق انسان کے لئے دنیا اور آخرت میں نافع ہو، اور اُس انفاق کو اِس قسم کی کوتاہیوں سے بچا لیا جائے جن کوتاہیوں کا ارتکاب

کرنے کے بعد وہ انفاق ضائع ہو جاتا ہے، دنیا اور آخرت میں اُس کی برکات انسان کو نصیب نہیں ہوتیں، اور جو حکمتیں شریعت کو مطلوب ہیں وہ حکمتیں بھی اس پر مرتب نہیں ہوتیں اگر اُن آداب کو چھوڑ دیا جائے اور اُن شرائط کی رعایت نہ رکھی جائے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کا مصداق

پہلی آیت تو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دے رہی ہے، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے ہر وہ خرچ کرنا مراد ہے کہ جو انسان اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے، چاہے جہاد میں خرچ کرے، چاہے قومی ضرورتوں میں خرچ کرے، خدمتِ خلق میں خرچ کرے، اہلِ حقوق کے حقوق کو ادا کرے، اہلِ حقوق کے حقوق ادا کرنا بھی انفاق فی سبیل اللہ ہے، اس لئے انسان اگر اپنی اولاد پر صحیح طریقے سے خرچ کرتا ہے تو حدیث شریف میں آتا ہے اس میں بھی صدقے کا ثواب ہے،[1] حتیٰ کہ اگر جائز طریقے سے اپنی ضرورتیں صرف کرنے میں خرچ کرتا ہے تو اِس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ صدقے کا ثواب دیتے ہیں۔ اہلِ حقوق کے حقوق ادا کرنا، ذی قرابت کے حقوق ادا کرنا، مساکین اور یتیموں کے حقوق ادا کرنا، خدمتِ خلق کے طور پر خرچ کرنا، جہاد میں خرچ کرنا، دین کی نشر واشاعت کے لئے خرچ کرنا، یہ سارا فی سبیل اللہ ہے، جس میں سے اِس کے بعض افراد فرض ہیں، اور بعض افراد مستحب ہیں، مختلف درجات کے طور پر اِن کے احکام آپ کے سامنے آتے رہتے ہیں، کہ ایک مقدار ایسی ہے جو فرض ہے جس کو عام طور پر قرآنِ کریم اِیتائے زکوٰۃ کے ساتھ تعبیر کرتا ہے، اور باقی صدقات خیرات جتنے ہیں اُن میں درجہ بدرجہ کسی میں تاکید زیادہ ہے کسی میں کم، بہر حال انفاق فی سبیل اللہ سب کو شامل ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت وآداب ایک مثال کی روشنی میں

اِن کی مثال یہ دی گئی کہ جو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اُن کا خرچ کیا ہوا مال اللہ کے نزدیک ایسے بڑھتا ہے جیسے تم حسی طور پر دیکھتے ہو کہ ایک کاشتکار ایک بیج ڈالتا ہے، اور جس وقت وہ پھوٹتا ہے تو اس میں سے سات شاخیں نکلتی ہیں، اور ہر شاخ کو ایک سٹہ لگتا ہے، اور ایک سٹے کے اندر سو دانہ ہوتا ہے، تو گویا ایک دانہ تھا اور نتیجۃً سات سو دانہ حاصل ہو گیا۔ اِسی طرح جب تم اللہ کے نام پر کوئی چیز دیتے ہو بشرطیکہ پاک مال میں سے ہو، جس طرح سے کاشتکار جب بوتا ہے تو بیج اُس کا اچھا ہونا چاہیے، مناسب وقت پر بوئے، پھر اس کی اُس طرح سے نگہداشت کرے جس طرح سے کہ زراعت کے آداب ہیں، اگر بیج اچھا نہیں تو نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا، زمین اچھی نہیں تو نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا، اور اس کے وقت کی اور اس کے سیراب ہونے اور سیراب نہ ہونے کی، زمین کے سوکھے گیلے ہونے کی اگر رعایت نہیں رکھی گئی تو نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا، پھوٹنے کے بعد اگر اس کی نگہداشت نہ کی گئی تو نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا، یہ مثال تبھی فٹ آتی ہے کہ ایک اچھا کاشتکار ہے، موقع محل کے مطابق بوتا ہے، اچھا بیج بوتا ہے، مناسب وقت میں بوتا ہے، پھر اس کے اگنے کے بعد اس کی نگہداشت کرتا ہے، تو ہی جا کے اس کو سات سو دانہ حاصل ہوگا، اِس مثال کے اندر یہ ساری باتیں مطلوب ہیں، حلال مال میں سے خرچ کرو، صحیح جگہ خرچ کرو، نیک جذبات کے تحت خرچ کرو، خرچ ہونے کے بعد پھر اُس کو

---

(۱) مسلم ۱/۳۲۲ باب فضل النفقۃ علی العیال/مشکوٰۃ ۱/۱۷۰ باب افضل الصدقۃ۔

محفوظ رکھو، کہ احسان جتلا کر یا تکلیف پہنچا کر اُس کا نقصان نہ کر بیٹھو، ایسے وقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ سات سو گنا اس کو کر دیتے ہیں۔ اور سات سو پر بھی بند نہیں، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ بڑھاتے رہتے ہیں جس کے لئے بڑھاتے ہیں، جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اور جتنا برموقع خرچ کیا جائے گا اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب میں اضافہ فرماتے ہیں، جیسے آپ کے سامنے مثال عرض کی تھی کہ حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک کھجور اگر کوئی شخص اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی پرورش کرتے ہیں، بڑھاتے جاتے ہیں، بڑھاتے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے۔(۱) اب اُحد پہاڑ کے برابر ہو جانے کے بعد وزن کرو تو کیا اُحد پہاڑ کے وزن میں سات سو کھجور آئے گی؟ یا کھجور کے برابر اس کے ٹکڑے کیے جائیں تو کیا سات سو ٹکڑے بنیں گے؟، اُس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سات سو پر بھی پابندی نہیں ہے، جتنا اخلاص بڑھتا جائے گا جتنا موقع محل کے مطابق خرچ کیا جائے گا اتنا اللہ تعالیٰ ثواب زیادہ دیتے چلے جائیں گے۔ یہ تو ترغیب ہے کہ اللہ کے راستے میں دیا ہوا مال کس طرح سے بڑھتا ہے، دیتے کم ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جا کر وہ کتنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

اِنفاق کے ثواب کو باقی رکھنے کی شرائط

اب آگے اِس خرچ کرنے کے بعد اُس کو باقی رکھنے کے آداب مذکور ہیں، کہ تمہارے لئے اِس کا ثواب باقی کیسے رہے گا؟ اُس کا حاصل یہ ہے کہ جب تم اللہ کے نام پر دو، چاہے حلال مال میں سے دیا ہے، اور چاہے بالکل مستحق کو دیا ہے، لیکن اگر اُس دینے کے بعد تم نے احسان جتلانا شروع کر دیا یا تکلیف پہنچانی شروع کر دی تو تمہارا دیا ہوا باطل ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ احسان جتلانا اور تکلیف پہنچانا دونوں کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ احسان جتلانا یہ بھی ایک تکلیف پہنچانا ہی ہے، یعنی بسا اوقات ایک شخص جو مال کسی محتاج کو دیتا ہے تو اُس کو ایک احساسِ برتری حاصل ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں اعلیٰ ہوں اور دوسرے کو سمجھتا ہے کہ یہ ادنیٰ ہے۔ پھر اگر دل میں تنگی ہے، وسعت نہیں ہے، حلم اور بردباری انسان کو حاصل نہیں، اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا ہے لیکن قلبی وسعت نہیں دی، تو پھر وہ اس شخص سے امیدیں لگا لیتا ہے کہ جب میں نے اِس کو یہ دیا ہے تو اب یہ میرا بندہ بن کے رہے، میرا غلام بن کے رہے، میرا خدمت گار بن کے رہے، میرے سامنے یہ آنکھ نہ اٹھائے، اور اگر اُس کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جو اِس کی توقع کے خلاف ہے تو یہ اُس کو جتاتا ہے اور ذلیل کرتا ہے، کہ دیکھا میں نے تجھے یہ دیا، میں نے تجھے یوں کیا، اس طرح سے ذلیل کرتا ہے، یا اُس سے خدمت اور بیگار لیتا ہے اِس زور سے کہ چونکہ اُس کو صدقہ اور خیرات دیا ہے، یہ چیزیں ساری کی ساری ایسی ہیں جن کے ساتھ انسان کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنے صدقات سے فائدہ تبھی اٹھا سکو گے کہ جس کو دو، نہ اس کی تحقیر کرو اور نہ اس سے خدمت اور بیگار لے کر اُسے تکلیف پہنچاؤ، اور نہ کسی وقت اُس کو طعن وتشنیع کر کے اُس کو تکلیف پہنچاؤ، اگر اُس کو احسان جتلا کر یا طعن وتشنیع کر کے یا اس سے

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت ۲۷۶ کے تحت۔ نیز بخاری ج۱ ص۱۸۹، مسلم ج۱ ص۳۲۶، مشکوٰۃ ص۱۶۷ باب فضل الصدقۃ۔ نوٹ: آخری تین کتب میں جبل کا لفظ ہے۔

بیگار لے کر اور خدمت لے کر اس کو تکلیف پہنچاؤ گے تو تم نے جو کچھ دیا تھا انہی اغراضِ فاسدہ کے تحت دیا تھا، یہ اللہ کے لئے نہیں ہے، جس کی بناء پر تمہارا وہ ثواب ضائع ہو جائے گا، تمہارا وہ صدقہ باقی نہیں رہے گا۔ تو اس میں کتنی حکمت کی بات ہوگئی، کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو محتاج بنایا ہے اور بعض کو مال دیا ہے، اور دونوں کو آزمایا ہے، مقصد شریعت کا یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں جڑ کے رہیں، اور جڑ تبھی سکتے ہیں کہ وسعت والا محتاج کی امداد کرے، اور پھر اس سے کوئی غرض اور مطلب نہ رکھے، بلکہ اُس کے دل میں جذبات یہ ہوں کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (پارہ ۲۹: سورۂ دہر) ہم نے تو تمہیں اللہ کے لئے یہ کھانا دیا ہے اور تمہیں کھلایا ہے، باقی ہم تمہاری طرف سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کوئی شکرگزاری چاہتے ہیں، یعنی دے کر انسان اپنے آپ کو فارغ کرلے، اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر محتاجوں کو مالداروں کے ساتھ ایک محبت رہے گی، اور آپس میں معاشرہ جڑا رہے گا، کیونکہ معاشرے کے جڑنے میں بنیادی چیز احتیاج ہے، کہ جب ایک دوسرے کی طرف احتیاج ہوتا ہے تب آپس میں ربط پیدا ہوتا ہے، اور اگر احسان جتلانا شروع کردیں گے تو بسا اوقات ایک شریف آدمی کسی ضرورت کی بناء پر دوسرے سے ایک چیز لے لیتا ہے، لیکن جب دوسرے کی طرف سے احسان جتلایا جاتا ہے تو پھر تکلیف ہوتی ہے، پھر لینے میں اُتنی راحت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنا اِس احسان جتلانے اور طعن وتشنیع میں انسان تکلیف محسوس کرتا ہے، تو پھر وہ حکمت باطل ہوگئی۔ اس لیے یہ ادب سکھایا کہ کسی کو دو تو اس کے بعد احسان نہ جتلایا کرو، تکلیف نہ پہنچایا کرو، ورنہ تمہارے صدقے کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایک سائل تمہارے سامنے آجاتا ہے اور اپنی ضرورت پیش کرتا ہے، تمہارے پاس گنجائش نہیں ہے، تو نرم بات کہہ کر اُس کو ٹال دو، کہ معاف کرو بھائی، اِس وقت ہمارے پاس گنجائش نہیں، کسی دوسرے وقت میں آجانا، نرم لب ولہجے کے ساتھ کہہ دیا جائے۔ اور اگر سائل کی طرف سے کوئی بدتمیزی ہو، اصرار ہو، وہ اپنی حاجت کی بناء پر تمہارے ساتھ لپٹتا ہے، اصرار کرتا ہے، تو اس سے درگزر کرو، اس کی وجہ سے اُس پر سختی نہ کرو، یہ کیفیت اختیار کرلینا کہ نہ ہونے کی صورت میں نرم جواب دے دینا اور سائل کی بدتمیزی کے مقابلے میں درگزر سے کام لینا اُس صدقے سے بہتر ہے جو دینے کے بعد پھر احسان جتلایا جائے۔ نہ دینے کا ارادہ ہو تو عذر کردو، نرم الفاظ کے ساتھ اُس سائل کو ٹال دو، لیکن دے کر احسان جتلانا یا اس کو ذلیل کرنا یہ ٹھیک نہیں ہے، ''اچھی بات اور درگزر کرنا بہتر ہے اس صدقے سے جس کے پیچھے اَذیٰ ہو'' اَذیٰ کا لفظ عام ہے، اس میں احسان جتلانا بھی آگیا۔

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنانے کی کوشش کرو

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ غنی ہے، اُس کو غناء حاصل ہے، حلیم ہے بردبار ہے۔ یہاں دیکھو! اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ذکر کی گئیں، اللہ غنی ہے اور غنی ہونے کے ساتھ ساتھ بردبار ہے، اور ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ''[1] کے تحت اِس وقت چونکہ اغنیاء کو خطاب کیا گیا ہے، جن کے پاس مال ودولت ہے، یہ باتیں ان کو سمجھائی جارہی ہیں، تو انہیں کہا جارہا ہے کہ تمہیں بھی اللہ کا اخلاق حاصل کرنا

(۱) تفسیر رازی سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹ کے تحت۔ شرح القسطلانی ج ۵ ص ۱۴۱ ۳۴۔ نوٹ: یہ جملہ مرفوعاً با سند نہیں ملا۔

چاہیے، کہ اگر ظاہری طور پر تمہیں غناء حاصل ہو گیا اور تم لوگوں کی نظر میں غنی ہو گئے تو ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت حلم کو بھی اپناؤ، اللہ تعالیٰ کو دیکھو! کتنے خزانوں کا مالک ہے، اور کتنا محتاجوں کو کھلاتا پلاتا ہے، اور محتاج آگے سے کیسی کیسی گستاخیاں کرتے ہیں، کھاپی کر اللہ تعالیٰ کی کس طرح نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سب کچھ برداشت کر جاتا ہے، اسی طرح اگر تمہیں بھی غناء حاصل ہے اور تم کسی حاجت مند کی مدد کر بیٹھو اور پھر وہ حاجت مند تمہارے ساتھ کسی سخت روی سے یا ترش روئی سے پیش آتا ہے، یا تمہاری وہ رعایت نہیں رکھتا تو بردباری سے پیش آیا کرو، اور جلدی سے مشتعل ہو کر اسے تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ تو یہ دو صفتیں ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی طرف متوجہ کیا ہے، کہ بندوں کو چاہیے کہ اللہ کے اِس اخلاق کو اپنائیں، اور وہ بھی یہی صفتیں حاصل کریں۔ غناء حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ حلم بہت بڑی بات ہے، عام طور پر دیکھنے میں یونہی آیا کرتا ہے کہ مالدار نازک مزاج ہو جاتے ہیں، اور ذرا اُن کے مزاج کے خلاف اگر پیش آ جائے تو بہت جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں، ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے، پھر وہ سائل کے ساتھ یا دوسرے محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ بہت بداخلاقی سے پیش آتے ہیں، گالی گلوچ اور بے عزتی کرنے پر اتر آئیں گے، یہ اچھی بات نہیں ہے، اگر اللہ نے مال دیا ہے تو انسان کا حوصلہ بھی بڑا ہونا چاہیے، اور اُن لوگوں کے ساتھ جو اِس سے اپنی ضرورتیں متعلق کیے ہوئے ہیں بڑے حوصلے سے معاملہ کرنا چاہیے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ غنی بھی ہے اور غنی ہونے کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے۔ تخلقوا بأخلاق اللہ کے تحت بندوں کو بھی یہی صفتیں اپنانی چاہئیں۔

بغیر خلوص کے خرچ کیے ہوئے مال کی پہلی مثال

آگے ایک مثال کے ساتھ اِسی مضمون کو پختہ کیا جا رہا ہے کہ ریاکاری کے طور پر اگر خرچ کرو گے تو تمہارے صدقات کا کوئی ثواب نہیں ملے گا، جس طرح مَن واَذیٰ کے ساتھ صدقہ باطل ہو جاتا ہے اسی طرح ریاکاری کے طور پر اگر خرچ کیا جائے تو بھی صدقہ باطل ہو جاتا ہے، اس کی مثال یوں دی کہ جیسے پہاڑی علاقوں میں ایک پتھر ہے، اور اس کے اُوپر کچھ مٹی جمع ہو گئی، اور ایک آدمی نے سمجھ لیا کہ اِس کے اوپر اگر بیج بو دیا جائے گا تو فصل حاصل ہو جائے گی، نیچے پتھر ہے، عارضی طور پر اُس پر مٹی سی پڑ گئی، اور اُس کے اندر بیج ڈال دیا، لیکن بارش آتی ہے، اوپر سے پانی کا ریلا آتا ہے، چونکہ مٹی نرم اور تھوڑی ہوتی ہے، عارضی طور پر بیٹھی ہوتی ہے، تو وہ ساری مٹی کو بہا کر لے جاتا ہے، اور وہ چٹان بالکل صاف ستھری چٹیل باہر نکل آتی ہے، تو جیسے اِس مثال میں اُس کاشتکار کو کچھ حاصل نہیں ہوتا جو اِس قسم کی چٹان پر بیج ڈال دیتا ہے، جب بارش آتی ہے تو سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے، ایسے ہی جو ریاکاری کے طور پر خرچ کرتے ہیں، اللہ پر اُن کا صحیح ایمان نہیں ہے (یہ دیکھو! ریاکاری کے ساتھ اللہ پر ایمان نہ ہونے کا تذکرہ آ گیا، جس میں اِس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ریاکاری وہ کرے جس کا اللہ پر ایمان نہیں، جس کا اللہ پر ایمان ہے اور اُس نے آخرت میں ثواب لینا ہے اُس کو ریاکاری کی کیا ضرورت ہے؟ گویا کہ ریاکاری اگر جوڑ کھاتی ہے تو اُن لوگوں کے ساتھ جوڑ کھاتی ہے جو اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، مؤمن کے لئے ریاکاری مناسب نہیں، کیونکہ مؤمن کا تو اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے، اس نے تو آخرت میں جا کے ثواب لینا ہے، تو اُس کو دکھلاوے کا جذبہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے)۔ "اے ایمان والو!

اپنے صدقات کو باطل نہ کیا کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر، مثل باطل کرنے اس شخص کے'' یعنی جو ایسا شخص ہو وہ بھی اپنے خرچ کرنے کو باطل کر لیتا ہے، تقدیرِ عبارت ہے کَاِبْطَالِ الذی ینفق ماله، تا کہ لا تبطلوا کی مثال ہو جائے ''مثل باطل کرنے اس شخص کے جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان لاتا اللہ پر اور یوم آخر پر، مثال اُس کی ایسے ہے جیسے کہ ایک چٹان ہو، اُس کے اُوپر مٹی ہو، پھر اُس کو موٹے موٹے قطروں والی بارش پہنچ جائے، پھر اُس چٹان کو وہ صاف ستھرا چھوڑ دے''، جیسے یہاں سب کچھ بے کار گیا، کوئی نباتات حاصل نہیں ہوگی، اسی طرح ریاکاری، عدمِ ایمان، مَن واذیٰ، یہ بھی بوئی ہوئی فصل کو یوں وقت پر تباہ کر دیتے ہیں، اور صدقات اِن کی رَو میں بہہ جاتے ہیں، اور پھر اُن پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا: ایسے لوگ جو صدقات کر کے مَن واذیٰ کرتے ہیں، یا صدقات ریاکاری کے طور پر کرتے ہیں، یا اُن میں صحیح ایمان نہیں ہوتا، یہ اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہوں گے، جس طرح سے وہ کاشتکار اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہیں جس نے بے عقلی کے ساتھ ایسے پتھر پر بیج بو دیا جس کے نیچے مٹی کی تہہ مضبوط نہیں ہے، پانی آیا اور سب کو بہا کر لے گیا، جس طرح اپنی محنت سے اُسے کچھ نہیں ملتا اسی طرح اِن لوگوں کو بھی اپنی محنت سے کچھ نہیں ملے گا۔ ''اللہ تعالیٰ کافروں کو اُن کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا'' اور نیکی سے مقصد ہوتا ہے آخرت میں اجر و جزاء پانا، کافر لوگ اِس سے محروم رہیں گے۔ لَا یَهْدِیْ سے یہاں ہدایت الی الجنۃ مراد ہے، جو کہ آخری مقصود ہے انسان کا دنیا کی محنت و مشقت سے، اللہ تعالیٰ کافروں کو جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا، کمال تک نہیں پہنچائے گا۔

خلوص سے خرچ کیے ہوئے مال کی مثال

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: اب اُن کے مقابلے میں دوسری مثال آ گئی، کہ جو لوگ اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، اور اس لیے خرچ کرتے ہیں تا کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں، کیونکہ نیکی کرنے کے ساتھ مزید نیکی کی توفیق ہوتی ہے، جیسے روزے رکھے جاتے ہیں تا کہ تقویٰ کی صفت مضبوط ہو، اسی طرح اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے بھی قلب میں نیکی کی صلاحیت بڑھتی ہے، تو وہ اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں، اُن کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک اُونچی ہموار جگہ ہے، اور اس کے اُوپر باغ ہے، کیونکہ اونچی ہموار جگہ میں آب و ہوا صاف ستھری ہوتی ہے، اگر ہلکی سی پھوار ہو جائے وہ بھی کافی ہو جاتی ہے، تو بھی وہ باغ اپنا پھل دے دیتا ہے، اسی طرح اگر دل میں خلوص ہے، اللہ کی رضا طلبی ہے، تو زیادہ خرچ کرو گے تو زیادہ ثواب لے لو گے، اور اگر تھوڑا خرچ کرو گے تو ضائع وہ بھی نہیں جائے گا، اُس کی مثال اس طرح سے دے دی۔ ''جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لئے، اُن کی مثال ایسے ہے جیسے کہ باغ ہو اونچی جگہ میں''، ربوۃ: اونچی ہموار جگہ۔ اَصَابَهَا وَابِلٌ: پہنچے اس کو موٹے قطروں والی بارش، پھر دے وہ باغ اپنا پھل دگنا، اور اگر اُس کو موٹے قطروں والی بارش نہ پہنچے، فَطَلٌّ یَکْفِیهِ تو اس کے لئے پھوار ہی کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

مرزائیوں کی تلبیس

رَبوہ کا لفظ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی ہے، وَاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ (سورۂ مؤمنون: ۵۰) عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آیا کہ ہم نے اُس کو ٹھکانہ دیا رَبوہ پر، ایک ہموار اونچی جگہ پر، جو کہ ٹھہرنے کے قابل تھی اور جاری پانی والی تھی۔ مرزائیوں نے اسی وجہ سے اپنے ٹھکانے کا نام رَبوہ رکھا ہے،[1] یہی اشتباہ پیدا کرنے کے لئے، کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ٹھکانہ دیا تھا، یہ بھی چونکہ مثیلِ مسیح بنے بیٹھے ہیں، تو انہوں نے بھی اپنی قرارگاہ کا نام رَبوہ رکھا ہے، وہ یہیں سے ماخوذ ہے، اور وہ ہے بھی دریا کے کنارے، اور دریا کے مقابلے میں ہے بھی کچھ تھوڑا سا اونچا، تو اسی مناسبت سے لوگوں میں اشتباہ پیدا کرنے کے لئے اِنہوں نے اپنے شہر کا نام یہ رکھا ہے، اور پہلے پہلے تو ہم نے سنا ہے کہ شاید انہوں نے اُس عمارت پر جو ان کا قصرِ خلافت تھا یا کوئی دوسری عمارت تھی، مجھے یاد پڑ رہا ہے، اُس پر یہ آیت بھی لکھی ہوئی تھی وَاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ، وہ بھی یہی اشتباہ پیدا کرنے کے لئے۔

بغیر خلوص سے خرچ کیے ہوئے کی ایک اور مثال

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ: یہ ایک اور مثال کے ساتھ ترغیب دے دی، کہ جو خرچ کیا کرو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا کرو، اگر اللہ کی رضا کے لئے خرچ نہیں کرو گے تو تمہاری یہ محنت بے کار جائے گی، اس کو ایک اور مثال سے سمجھایا، مثالوں کے ساتھ یہ بات دل میں اتاری جا رہی ہے، مثال یہ دی کہ فرض کرو کہ ایک شخص جس نے اپنی جوانی کے زمانے میں محنت کر کے ایک باغ لگایا، باغ بھی بہت عمدہ، جس کا اچھے سے اچھا نمونہ یہ مہیا کر سکتے ہیں کہ اس کے اردگرد کھجوروں کی قطاریں، اس کے اندر انگور، اور پھر مختلف قطعات میں مختلف پھل، اور اسی طرح اندر جگہ چھوڑی ہوئی ہے جس میں مختلف فصلیں ہوتی ہیں، ہر قسم کا دانہ غلہ پھل فروٹ اُس کو حاصل ہوتا ہے، اور اردگرد کھجوروں کی باڑ اس لیے ہے تاکہ آندھی اور گرم ہوا وغیرہ آئے تو وہ اس کو روک لے، سندھ میں آپ کبھی جائیں گے تو کیلے کے باغوں کے اردگرد وہ لوگ اونچی اونچی دوسری فصل لگاتے ہیں، جو ٹھنڈی ہوا سے رکاوٹ پیدا کرتی ہے، پھر وہ پھل اچھا آتا ہے، تو اردگرد کھجور کے درختوں کی قطاریں لگالی جائیں تو یہ بھی گرمی اور تیز ہوا اور آندھی وغیرہ سے اُس باغ کی حفاظت کرتے ہیں۔ پھر پانی اُس میں وافر ہے، نہریں بہہ رہی ہیں، اور خوب اچھی طرح سے پھل لگتا ہے، جوانی میں اُس نے محنت کی اور اُس باغ کو کمال تک پہنچا دیا۔ اب یہ شخص بوڑھا ہو گیا، بوڑھا ہونے کا ذکر اس لئے کر دیا کہ بوڑھا ہونے کے بعد دوبارہ محنت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، پھر اُس کے بچے بھی ہیں، یہ نہیں کہ بے اولاد ہے اکیلا اگر کوئی نقصان ہو بھی جائے تو وہ کہے کہ کیا پرواہ ہے، اکیلا آدمی ہوں، کہیں روٹی مل جائے گی، وقت کاٹ لیں گے، گزارہ کر لیں گے، نہیں! بلکہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کا خرچ اس کے ذمے ہے، اور بچے چھوٹے اس لیے فرض کیے کہ وہ بڑے بھی نہیں جو آئندہ کے لئے اعانت کریں اور معاشی ضروریات کو پورا کر لیں، وہ معاون بھی نہیں بن سکتے، الشان کا بوجھ ہے، تو خود بوڑھا ہو گیا اور بچے چھوٹے چھوٹے ہیں، اور اتفاق ایسا ہوا کہ آگ کا ایک بگولا

---

(۱) الحمدللہ! مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ اور دیگر علماء کی کوششوں سے ۴ فروری ۱۹۹۹ء کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے اس شہر کا نام ربوہ ختم کر کے چناب نگر رکھ دیا گیا ہے۔

آیا جس میں انتہائی گرم ہوا تھی، اور وہ سارے باغ کو جلا کر رکھ گیا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ ایسے وقت میں انسان کو کتنی حسرت ہوتی ہے، کہ نہ تو دوبارہ باغ لگانے کی ہمت ہے کیونکہ خود ضعیف اور بوڑھا ہو گیا، اور نہ کوئی دوسرا معاون ہے کیونکہ بچے ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں، اور پھر ایسا بھی نہیں کہ اس پر کوئی خرچ کا بوجھ نہ ہو، بلکہ اہل وعیال کا بوجھ بھی کافی ہے، اس صورت میں انسان کو انتہائی پریشانی ہوتی ہے، تو کیا تم ایسا بننا چاہتے ہو؟ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے اُوپر یہ مثال فٹ آجائے؟ جب یہ سوال ہوگا تو بات واضح ہے کہ ہم تو ایسا نہیں بننا چاہتے، تو اگر ایسا نہیں بننا چاہتے تو پھر ہر کام میں خلوص پیدا کرو، ورنہ تم زندگی بھر نیکیاں کرتے رہو گے، اگر اُس میں خلوص نہیں ہے تو مرنے کے بعد جو کہ اصل فائدہ اٹھانے کا وقت ہے آپ کو ایسا معلوم ہوگا جیسے لگا لگایا باغ اُجڑ گیا، اور پھر اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ جیسے اس بوڑھے کو دنیا کے اندر ایسے موقع پر باغ اُجڑ جانے سے حسرت ہوگی، اسی طرح مرنے کے بعد جو اصل فائدہ اٹھانے کا وقت ہوگا اُس وقت جب تم دیکھو گے کہ ہماری ساری کی ساری نیکیاں ریا کاری کی وجہ سے یا صحیح جذبات نہ ہونے کی بناء پر ضائع ہو گئیں، اور پھر وہ موقع ایسا ہوگا جس میں تلافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، پھر یہ حسرت وافسوس ہوگا۔ اس لے اگر تم اِس بوڑھے جیسے نہیں بننا چاہتے تو اپنی زندگی کی نیکیوں کو ضائع نہ ہونے دو، اور ان کے اندر خلوص اور صحیح جذبات پیدا کرو تاکہ وقت پر اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس مثال کے ساتھ گویا کہ اِس کی قباحت واضح کی گئی کہ ریاکاری کے جذبے سے اور دوسرے غلط جذبات کے تحت خرچ کیا جائے تو جب فائدہ اٹھانے کا وقت آئے گا اُس وقت تم کھڑے جھانکو گے اور کوئی چیز تمہارے لیے مفید نہیں ہوگی۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ: کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے، اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ: کہ اس کے لئے باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا، جاری ہوں اس کے نیچے سے نہریں، جس طرح سے باغوں میں کھالیاں چلتی ہیں، پانی آتا ہے، کبھی اُدھر کو جاتا ہے، کبھی اُدھر کو جاتا ہے، یہ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہے۔ ''اور اس شخص کے لئے اُس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں'' یعنی زیادہ انگور اور کھجور، باقی ہر قسم کی پیداوار اُس میں ہو، جیسے باغوں میں مختلف قطعات کے اندر مختلف درخت لگا لیے جاتے ہیں، خالی جگہوں میں فصل بو لی جاتی ہے، تو انسان کو غلہ جات بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے میوے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ ''اور اس کو بڑھاپا پہنچ جائے اور اس کے لئے کمزور بچے ہوں، پھر پہنچ جائے اس باغ کو بگولا جس میں آگ کا اثر ہو پھر وہ باغ جل جائے''، تو کیا تم ایسا بننا چاہتے ہو؟ تم اِس مثال کو اپنے لیے پسند کرتے ہو؟۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ: اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نشانیاں واضح کرتا ہے، آیات واضح کرتا ہے، مثالیں دیتا ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ: تاکہ تم سوچو اور غور کرو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ
اے ایمان والو! خرچ کرو عمدہ چیزیں اُن چیزوں میں سے جو تم نے کمائیں، اور ان چیزوں میں سے جو

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ

ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالیں، اور نہ ارادہ کرو ان میں سے ردی چیز کا کہ خرچ کرتے ہو تم اس کو اور نہیں ہو تم

بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ

لینے والے اُس شئی کو مگر یہ کہ تم اس میں چشم پوشی کر جاؤ، اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے تعریف کیا ہوا ہے ﴿۲۶۷﴾ شیطان

يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ

ڈراتا ہے تمہیں محتاجی سے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا، اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے بخشش کا

وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ

اور زیادہ دینے کا، اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں علم والے ہیں ﴿۲۶۸﴾ اللہ دیتا ہے حکمت جس کو چاہتا ہے، اور جو دین کی سمجھ دے دیا گیا

فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ

پس تحقیق وہ بہت زیادہ بھلائی دے دیا گیا، اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے ﴿۲۶۹﴾ جو نفقہ تم خرچ کرو یا

نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ

جو نذر تم مانو پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾ اگر

تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ

تم صدقات کو ظاہر کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے، اور اگر تم اُن صدقات کو چھپاؤ اور دے دیا کرو یہ صدقات فقراء کو

فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اور دور ہٹائے گا اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی

خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

خبر رکھنے والا ہے ﴿۲۷۱﴾ اُن کی ہدایت آپ کے ذمے نہیں، لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

جو مال تم خرچ کرتے ہو پس وہ تمہارے اپنے نفع کے لئے ہے، اور نہیں خرچ کرتے تم مگر اللہ کی رضا چاہنے کے لئے، اور جو مال بھی تم

مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ
خرچ کرو تمہاری طرف پورا کردیا جائے گا، اور تم نقصان میں نہیں ڈالے جاؤ گے ﴿۲۷۲﴾ صدقات اُن فقراء کے لئے ہیں جو
اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ
اللہ کے راستے میں روکے ہوئے ہیں، نہیں طاقت رکھتے زمین میں چلنے پھرنے کی، ناواقف آدمی اُن کو مالدار سمجھتا ہے
مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ
سوال سے بچنے کی وجہ سے، اے مخاطب! تو اُن کو پہچانتا ہے اُن کی علامت سے، وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر،
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۲۷۴﴾
پوشیدہ طور پر اور کھلے طور پر پس اُن کے لئے اُن کا اجر ہے اُن کے رَبّ کے پاس، نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۷۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: اے ایمان والو!، اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ: مَا كَسَبْتُمْ: جو تم نے کمایا، طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ: اپنی کمائی میں سے پاکیزہ عمدہ چیزیں، ''اپنی کمائی ہوئی چیزوں میں سے عمدہ اشیاء میں سے خرچ کرو''، وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: اور اُس چیز میں سے جو نکالا ہم نے تمہارے لیے زمین سے، جو اشیاء ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالیں اُن میں سے عمدہ اور پاکیزہ چیزوں سے خرچ کرو۔ طَيِّبٰتِ کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے۔ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ: تیمم: قصد کرنا۔ وَلَا تَيَمَّمُوْا: نہ قصد کرو، اَلْخَبِيْثَ: ردی چیز کا، مِنْهُ کی ضمیر مَا كَسَبْتُمْ اور مَآ اَخْرَجْنَا میں جو مَا آیا ہوا ہے اس کی طرف لوٹ رہی ہے، جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے نکالا اُس میں سے ردی چیز کا قصد نہ کرو، کہ خرچ کرتے ہو تم اُس کو، وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ: اور نہیں ہو تم لینے والے اُس شئ کو، اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ: مگر یہ کہ تم اس میں چشم پوشی کر جاؤ، اِغماض کا مفہوم ہوتا ہے کہ شرما شرمی اور چشم پوشی کے طور پر کام کرلیا، لحاظ کرلیا، یعنی وہی ردی چیز جو تم اللہ کے راستے میں دے رہے ہو اگر کوئی شخص تمہیں تمہارے حق کے عوض میں دے یا ہدیہ اور سوغات کے طور پر دے تو تم اس کو لینے کے لئے تیار نہیں، ہاں البتہ لحاظ ملاحظے کے طور پر آنکھیں نیچی کرلو، اور آنکھیں نیچی کر کے لحاظ کرتے ہوئے لے لو، یہ علیحدہ بات ہے، ورنہ تمہارا دل نہیں چاہتا اُس کو لینے کے لئے، اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ کا یہ معنی ہے، نہیں لینے والے ہو تم اس کو مگر یہ کہ تم اس بارے میں اِغماض کر جاؤ، چشم پوشی

کر جاؤ، وَاعْلَمُوْٓا: اور یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ: وَعَدَ یَعِدُ. اَلْوَعْدُ اَلْوَعِیْدُ دونوں اس کے مصدر آتے ہیں، وعد آ کا مطلب ہوتا ہے خیر میں وعدہ کرنا، اور وعید کا استعمال شر میں ہوتا ہے، جس کا مفہوم بیان کر دیا جاتا ہے ڈرانا، تو یہاں ترجمہ یوں کر سکتے ہیں کہ شیطان ڈراتا ہے تمہیں محتاجی سے، اگر چہ وہ لفظ استعمال کرنا بھی ٹھیک ہے کہ شیطان وعدہ کرتا ہے تم سے فقر کا۔ تو وعدہ کا لفظ بول لو یا ڈرانے کا لفظ بول لو دونوں طرح سے ترجمہ صحیح ہے، لیکن عام طور پر محاورے میں وعدہ کسی اچھے کام کے لئے بولا جاتا ہے، اور جب کسی خطرناک چیز کے متعلق کہا جائے کہ اگر تو نے ایسا کیا تو ایسا ہو جائے گا، تو اس میں وعید والا معنی ہوتا ہے، ان دونوں لفظوں کے درمیان میں اسی طرح سے فرق ہے، ''شیطان ڈراتا ہے تمہیں محتاج ہونے سے، اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا''، وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا: اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے بخشش کا اور زیادہ دینے کا، فضل کا، وَاللّٰہُ وَاسِعٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں عَلِیْمٌ: علم والے ہیں۔ یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ: دیتا ہے حکمت جس کو چاہتا ہے، حکمت کا مفہوم مختلف الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے، اس کا معنی دانشمندی بھی کر دیا جاتا ہے، اور یہ لفظ سنت کے لئے بھی بولا جاتا ہے، علم صحیح کے لئے بھی بولا جاتا ہے، عمل صالح کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اس کے مصداق مختلف آتے ہیں، حتیٰ کہ نبوت بھی اس کا مصداق آجاتا ہے، اصل کے اعتبار سے حکمت کا مفہوم ہوتا ہے یقین اور عمل کی پختگی جس کی بنیاد بصیرت صحیحہ پر ہو، یعنی معرفۃ الاشیاء عَلٰی مَا ھِیَ عَلَیْہِ چیزوں کو اُس طرح سے پہچاننا جو اُن کی حقیقت ہے، پھر اُس کے مطابق مضبوطی کے ساتھ عمل کرنا، اصل کے اعتبار سے حکمت کا مفہوم یہ ہے، اور یہی اعلیٰ درجے کی دانشمندی ہے، یہی اعلیٰ درجے کی عقلمندی ہے، اور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہر چیز کی حقیقت کو پہچانو، پھر اس کے مقتضی کے مطابق صحیح عمل کرو۔ اس کا مفہوم جو ''دین کی سمجھ'' کے ساتھ ادا کر دیا جاتا ہے اُس کا بھی حاصل یہی ہے، کیونکہ دین بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ ہر چیز کو صحیح پہچانو، اور پھر اُس کے مقتضی کے مطابق صحیح اور مضبوط عمل کرو، دنیا کی حقیقت کو پہچانو، آخرت کی حقیقت کو پہچانو، پھر دنیا کی حقیقت جس قسم کے عمل کا مطالبہ کرتی ہے اُس طرح سے عمل کرو، اور آخرت کی حقیقت جس قسم کے عمل اور جذبات کا مطالبہ کرتی ہے اُس طرح سے عمل کرو اور ویسے جذبات رکھو، یہی دینی سمجھ ہے، ''دیتا ہے اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ جس کو چاہتا ہے''، وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ: جو دین کی سمجھ دے دیا گیا فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا: پس تحقیق وہ بہت زیادہ بھلائی دے دیا گیا، خیر کثیر کا مصداق دین کی سمجھ ہے، وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے، وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ: جو نفقہ تم خرچ کرو یا جو نذر تم مانو، نذر کا معنی ہوتا ہے اپنے اوپر کسی چیز کو واجب کر لیا، فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ: پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ: اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں، ظالم: حق تلفی کرنے والا، اور یہاں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے مراد ہیں، کہ جو اپنے ثواب کو گھٹانے والے اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ: تُبْدُوا اِبْدَاء سے ہے، ابداء: ظاہر کرنا۔ اگر تم صدقات کو ظاہر کرو، فَنِعِمَّا ھِیَ: فَنِعْمَ مَا ھِیَ. مَا شَیْئًا کے معنی میں ہے اور نِعْمَ کی ھو ضمیر سے تمیز ہے اور فاعل کے قائم مقام ہے، ''یہ بھی اچھی بات ہے''، فَنِعْمَ مَا ھِیَ اگر تم صدقات کو ظاہر کرلو تو یہ ظاہر کرنا بھی اچھی بات ہے، یعنی نِعْمَ شَیْئًا اِبْدَاءُھَا ان صدقات کا ظاہر کرنا بھی اچھی بات ہے، وَاِنْ تُخْفُوْھَا: اور اگر تم ان صدقات کو چھپاؤ، ان کا اخفاء کرو، وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ: اور اِن کو فقراء تک پہنچادو،

دے دیا کرو تم یہ صدقات فقراء کو، فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ: اور دور ہٹائے گا اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ: ان کی ہدایت آپ کے ذمے نہیں، نہیں ہے آپ کے ذمے ان کی ہدایت، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ: لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ: اور جو کچھ تم بھلائی سے خرچ کرتے ہو، خیر سے مراد اچھا مال، جو مال تم خرچ کرتے ہو پس وہ تمہارے اپنے نفع کے لئے ہے، اور نہیں خرچ کرتے تم مگر اللہ کی رضا کو چاہنے کے لئے، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ: اور جو مال بھی تم خرچ کرو، يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ: تمہاری طرف پورا کر دیا جائے گا۔ یہ مَا شرطیہ ہے، اس لئے تُنْفِقُوْا کے آخر سے بھی نون گرا ہوا ہے اور يُّوَفَّ بھی مجزوم ہے، جو مال تم خرچ کرو تمہاری طرف پورا ادا کر دیا جائے گا، وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ: اور تم ظلم نہیں کیے جاؤ گے، یعنی تم نقصان میں نہیں ڈالے جاؤ گے، تمہارا حق گھٹایا نہیں جائے گا۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: الصدقات للفقراء، صدقات اُن فقراء کے لئے ہیں، فقراء فقیر کی جمع، الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جو اللہ کے راستے میں محصور کر لیے گئے، جو اللہ کے راستے میں گھرے ہوئے ہیں، مشغول کیے ہوئے ہیں، جو روکے ہوئے ہیں اللہ کے راستے میں، لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ: ضرب فی الارض: چلنا پھرنا، نہیں طاقت رکھتے وہ زمین میں چلنے پھرنے کی، يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ: تعفف: عفت حاصل کرنا، بچنا، سوال نہ کرنا، اور جاہل سے ناواقف آدمی مراد ہے، ناواقف آدمی اُن کو مالدار سمجھتا ہے، يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ: اغنیاء غنی کی جمع، ناواقف آدمی اُن کو اغنیاء سمجھتا ہے، مالدار سمجھتا ہے سوال سے بچنے کی وجہ سے، چونکہ وہ سوال سے بچتے ہیں، کسی کے سامنے سوال نہیں کرتے، تو ناواقف سمجھتا ہے کہ یہ غنی ہیں، مالدار ہیں، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ: اے مخاطب! تو اُن کو پہچانتا ہے اُن کی علامت سے، سیما علامت کو کہتے ہیں، جیسے سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (سورۂ فتح: ۲۹)۔ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا: نہیں سوال کرتے وہ لوگوں سے لپٹ کر، اَلْحَفَ اِلْحَافًا کا معنی ہوتا ہے سوال میں اصرار کرنا، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ: جو مال بھی تم خرچ کرو گے فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ: جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں، سِرًّا: پوشیدہ طور پر، وَّعَلَانِيَةً: اور کھلے طور پر، فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: پس ان کے لئے ان کا اجر ہے اُن کے رب کے پاس وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

انفاق فی سبیل اللہ کے احکام چلے آ رہے ہیں، اُس کے آداب ذکر کیے جا رہے ہیں، اور اس کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی شرطوں کا ذکر تھا، اور اُس ثواب کے باقی رہنے کے لئے کن چیزوں کی رعایت رکھنا ضروری ہے اِس کا ذکر تھا، اگلا رکوع بھی سارے کا سارا اسی کے ہی احکام و آداب پر مشتمل ہے۔

زکوٰۃ، عُشر اور نفلی صدقات کی ترغیب

پہلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ جو کچھ تم کماتے ہو، اس سے اموالِ تجارت مراد ہیں، کاروبار کے ساتھ تجارت کر کے جو کچھ کما لیتے ہو، یعنی اموالِ تجارت، مَآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: یہ زمین کی پیداوار ہے، جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا، ان دونوں میں سے ہی، یعنی خواہ تم نے اس کو کاروبار کر کے کمایا ہے، اور خواہ زمین کی پیداوار تمہیں حاصل ہوئی، دونوں میں سے ہی اللہ کے راستے میں عمدہ چیز خرچ کیا کرو۔ مالِ تجارت میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے اُس کو زکوٰۃ کہتے ہیں اور فرض کے درجے میں ہے، اور زکوٰۃ کی مقدار سے زائد جو کچھ دیا جائے وہ نفلی صدقات ہیں، پہلے عرض کر دیا تھا کہ صدقات عام ہیں، فرض کو بھی شامل ہیں، اس لیے انفاق فی سبیل اللہ زکوٰۃ کو یعنی فرض مقدار کو بھی شامل ہے، اور نفلی طور پر جو اللہ کے راستے میں مال خرچ کیا جاتا ہے اُس کو بھی شامل ہے۔ تو مَا كَسَبْتُمْ میں سے جو فرض مقدار ادا کی جائے گی اُس کو زکوٰۃ کہتے ہیں، اور اُس کے علاوہ نفلی طور پر جو خرچ کیا جائے اُس کو خیرات یا صدقات کے ساتھ عام طور پر تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور مَآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: زمین سے جو کچھ ہم نے تمہارے لیے نکالا، یعنی پیداوار، پیداوار میں سے جو خرچ کرنا ہے اس کے دو درجے ہیں، ایک ہے کہ زمین خراجی ہو تو اُس میں خراج آتا ہے، لیکن یہاں مفسرین کی صراحت کے مطابق عشر مراد ہے، کہ مسلمان کی زمین پر اصل کے اعتبار سے عُشر آتا ہے، کیونکہ عشر کے اندر عبادت کا معنی ہے۔ اور مَآ اَخْرَجْنَا کا لفظ چونکہ عام ہے تو حضرت ابو حنیفہ ﷫ کے خیال کے مطابق عشر چونکہ ہر چیز میں ہوتا ہے، جو چیز بھی پیدا ہو، اُس کے لئے کوئی نصاب بھی شرط نہیں اور ثمرہ باقیہ ہونا بھی شرط نہیں ہے، ثمرہ باقیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز ہو جو کچھ مدت کے لئے باقی رہ سکے، جلدی خراب ہونے والی چیز نہ ہو، صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کا خیال یہی ہے کہ ہر چیز میں عشر نہیں آیا کرتا، بلکہ ایسی چیز میں عشر آیا کرتا ہے جس کا ثمرہ باقی رہ سکے، جیسے غلہ جات ہیں جو جلدی خراب ہونے والے نہیں ہیں، اور اسی طرح ایک خاص مقدار تک پیدا ہو تو پھر عشر واجب ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کے اس ظاہری لفظ سے حضرت ابو حنیفہ ﷫ کی تائید ہوتی ہے، کہ جو کچھ بھی ہم نے تمہارے لیے نکالا اُس میں سے اللہ کے راستے میں عمدہ خرچ کرو، یہ مَا عموم کو چاہتا ہے۔ اور یہ دو لفظ بول کر احاطہ کر لیا گیا زکوٰۃ کا بھی اور عشر کا بھی، اور اُس مال میں سے صدقات کا بھی جو انسان تجارت سے کماتا ہے، اور اس میں سے صدقات کا بھی جو زمین پیدا ہوتا ہے۔ ''خرچ کرو عمدہ چیزیں ان چیزوں میں سے جو تم نے کمائیں، اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالیں۔''

خبیث اور طیب مال کا معیار

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ: اس میں سے ردی کا قصد نہ کیا کرو خرچ کرنے کے لئے، کہ جو گھر استعمال کرنے کی نہ ہوئی، تھی، فضول، اپنے کام کی نہیں ہے، اچھی اچھی چھانٹ کے اپنے لیے رکھ لی، بچا کھچا جو ہوا تو کہہ دیا چلو یہ اللہ کے راستے میں دے دو، فقراء میں تقسیم کر دو، ایسا نہ کیا کرو۔ ردی ہونے کا معیار کیا ہے، ردی کس کو قرار دیا جائے گا، مثلاً ایک چیز ہمارے سامنے پڑی ہے اُس میں سے کس حصے کو ہم کہیں گے کہ یہ خبیث کا مصداق ہے اور ردی ہے، اور کس حصے کو کہیں گے کہ یہ عمدہ ہے، اُس کا معیار بتا دیا

کہ تمہارا حق کسی شخص کے ذمے لگا ہوا ہے اور وہ تمہارے حق کے طور پر وہ چیز تمہیں دینا چاہے، تو تم اُس کو دیکھ کر ناک چڑھاتے ہو، لینے کو تمہارا جی نہیں چاہتا، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے حق کی ادائیگی نہیں ہے، لیکن ظاہری طور انکار بھی نہیں کرتے، بسا اوقات دوسرے کا خیال کرتے ہوئے، لحاظ کرتے ہوئے، شرما شرمی لے لیتے ہو، شرما شرمی لینے کا کوئی اعتبار نہیں، دل نہیں تمہارا چاہتا لینے کو۔ اگر تمہارے حقِ واجبی کے طور پر تمہیں کوئی ادا کرے تو تمہارا دل اس کو دیکھ کر منقبض ہو جاتا ہے، تم اس کو لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، چاہے پھر بعد میں شرما شرمی لے ہی لو۔ اسی طرح اگر حقِ واجبی کے طور پر نہیں، بلکہ تمہیں کوئی ہدیہ اور سوغات کے طور پر کوئی چیز دیتا ہے، اور وہ اس قسم کی ردی چیز ہے کہ تمہارا لینے کو جی نہیں چاہتا، تم کہتے ہو کہ یہ کیا چیز ہے جو میرے لیے لے کر آیا ہے، نکمّی سی چیز، میرے کس کام کی، اس قسم کی ردی چیز، چاہے بعد میں پھر شرما شرمی تم لے ہی لو۔ تو جس چیز کو دیکھ کر تمہارے دل کے اندر انقباض پیدا ہوتا ہے، تم اس کو اپنے حق میں وصول نہیں کرنا چاہتے، یا اس کو ہدیہ اور تحفہ میں لے کر خوش نہیں ہونا چاہتے، وہ تمہارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہے، چاہے بعد میں دینے والے کا لحاظ کرتے ہوئے شرما شرمی لے کر رکھ ہی لو، یہ سمجھ لیا کرو کہ یہ ردی کا مصداق ہے، اس کو بھی اللہ کے راستے میں خیرات نہ کیا کرو۔ بلکہ عمدہ چیز جس کو تم خوشی کے ساتھ لیتے ہو، جس کو لے کر تمہارا دل خوش ہوتا ہے، عمدہ سے عمدہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا کرو۔ یہ معیار بتا دیا کہ ردی چیز وہ ہے جس کو تم لینے کے لئے تیار نہیں، اور جس کو لے کر تم خوش نہیں ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اچھی سے اچھی چیز دو جو تمہارے لئے خوشی کا باعث ہے۔ لیکن یہ حکم اُس کو ہوگا جس کے پاس عمدہ چیز بھی موجود ہو، یعنی اگر کمائی ہوئی چیزوں میں عمدہ بھی ہیں اور ردی بھی موجود ہیں، اسی طرح مَآ اَخْرَجْنَا میں عمدہ بھی ہیں اور ردی بھی موجود ہیں تو پھر اُس میں سے خبیث کا قصد کر لینا ٹھیک نہیں، لیکن اگر اتفاق سے کسی شخص کے ہاں ہے ہی ردی مال، جیسے خربوزے پیدا ہوئے لیکن وہ میٹھے نہیں، سارے پھیکے ہیں، یا سارے ہی ایسے ہیں جن کا ایک پہلو مرا ہوا ہے، اسی طرح دوسری چیز جو بھی پیدا ہوئی، گھٹیا قسم کی ہے، تو پھر جو پیدا ہوئی اُسی میں سے دے دو، پھر تو تم اِس کے مکلف نہیں ہو کہ اِس ردی کی جگہ تم اعلیٰ سے اعلیٰ چیز حاصل کر کے دو، اگر سارے کا سارا ہی گھٹیا مال ہے تو پھر اُس میں سے دینے کا کوئی حرج نہیں۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے، اُس کو تمہاری چیزوں کی ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے، وہ نعوذ باللہ کوئی محتاج ہونے کے طور پر تم سے نہیں لیتا، کہ تم ردی سے ردی بھی دے دو گے تو لے کر خوش ہو جائے گا، وہ تو بے نیاز ہے، وہ اپنا دیا ہوا مال تم سے خرچ کرواتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اللہ کے نام پر اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے کتنا خرچ کر سکتے ہو، اور کیسا خرچ کر سکتے ہو، یہ تمہاری آزمائش ہے، جیسے دوسری جگہ ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (پارہ ۴ کی ابتدا) تم کمال کو اور اعلیٰ درجے کی نیکی کو حاصل نہیں کر سکتے، جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جس مال سے تمہیں محبت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہی تمہاری آزمائش کرتا ہے۔ حمید کا معنی ہے تعریف کیا ہوا، یہ لفظ حمد سے لیا گیا ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ میں رُکاوٹ پیدا کرنے کے لئے دو شیطانی طریقے

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ: اس میں بھی انفاق کی ترغیب اور اس پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے، اور انسان کے

دلی جذبات کے تحت شیطان کی طرف سے جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اُس کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ بسا اوقات کوئی موقع ایسا آجاتا ہے کہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے، تقاضا ہے، کسی بھی اعتبار سے، مثلاً قومی ضرورت کے لئے، یا کوئی فقیر محتاج سامنے آگیا، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مستحق ہے کہ اس کو دیا جائے، تو اُس وقت دل میں ایسے خیالات آنے لگ جاتے ہیں کہ آج اگر اس کو دے دیں گے تو کل کو ہمیں ضرورت پیش آئے گی ہم کیا کریں گے، کل کو ہم محتاج ہو جائیں گے پھر ہماری ضرورت اٹکی ہوئی ہوگی، اس لئے مستقبل کے واسطے اِس مال کو محفوظ رکھ لو، اِس کو خرچ نہ کرو، ورنہ ہم محتاج ہو جائیں گے تو پھر تکلیف ہوگی، اِس قسم کے خیالات آنے لگ جاتے ہیں، تو قرآنِ کریم یہ نشاندہی کرتا ہے کہ جب اس قسم کے خیال آئیں کہ مستقبل میں فقر کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور اُس کی وجہ سے انفاق میں رکاوٹ پیدا ہو تو سمجھ لیا کرو کہ یہ وسوسہ تمہارے دل میں شیطان ڈال رہا ہے۔ شیطان اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے دو طرح سے روکتا ہے، ایک تو مستقبل میں فقر اور احتیاج سے ڈرا کر، اور ایک تمہیں فحشاء کے اندر مبتلا کر کے۔ اَمَرَ یَاْمُرُ حکم دینے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، حکم یہ نہیں کہ صراحتاً حاکم ہونے کے طور پر دیا جائے، بلکہ دل کے اندر کوئی مشورہ ڈال دیا جائے یا ترغیب دے دی جائے تو یہ بھی امر کا مصداق ہے۔ تو دوسرا طریقہ بے حیائیوں میں ڈالنا ہے، اور بے حیائیوں میں ڈالنا انفاق سے مانع اس طرح بن جاتا ہے، کہ ایک شخص جس وقت عیاشی میں مبتلا ہو گیا، مے نوشی کرتا ہے، زنا کاری کرتا ہے، سینما بینی کرتا ہے، فضول خرچی کی اُس کو عادت پڑ گئی، تو اُس کی آمدنی اتنی نہیں ہوگی جو اس کے فضول کاموں کے لئے کافی ہو جائے، جب اُس کی آمدنی اتنی ہوگی نہیں جو فضول کاموں سے فاضل ہو، اور وہ فضول کاموں کی جب عادت ڈال لے گا تو اُس کی ساری کی ساری آمدنی اِن بے حیائی کے کاموں میں چلی جائے گی، اللہ کے راستے میں خرچ کرے گا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے زمیندار اور بڑے بڑے سرمایہ دار رات کو جس قسم کی عیش وعشرت، عیاشی بدمعاشی، شراب نوشی، جوئے بازی کرتے ہیں، اُس میں تو راتوں کو وہ ہزاروں روپے قربان کر دیں گے، لیکن اگر صبح کے وقت کوئی گداگر اُن کے سامنے آجائے تو وہ اپنے پاس پانچ روپے دینے کی بھی گنجائش نہیں پاتے، اِن فضول کاموں میں اپنے مال کے صرف کرنے کی وجہ سے اُن میں ہمت نہیں ہوتی کہ کسی دوسرے کام میں صرف کریں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تو اپنے خرچ پورے نہیں ہوتے ہم آگے کسی کو کیا دیں۔ تو اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے شیطان کے یہ دونوں طریقے ہیں، کہ پہلے تو مستقبل میں ڈراتا ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ گے پھر کیا کرو گے، اس لئے جمع کر کے رکھو، اور پھر فضول کاموں میں تمہیں مبتلا کر دیتا ہے، جب بے حیائی کے کاموں میں مبتلا ہو جاؤ گے، فحشاء کی طرف لگ جاؤ گے، تو پھر تمہاری آمدنی میں اس کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی سے روکا ہے لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (سورۂ اسراء: ۲۷) یہ آیت بھی انفاق کے ضمن میں ہی آئی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں تبذیر کی عادت پڑ جائے گی، بے موقع خرچ کرنے کی عادت پڑ جائے گی، تو پھر تم اپنے اندر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی گنجائش ہی نہیں پاؤ گے۔

شیطانی رُکاوٹیں دُور کرنے کا طریقہ

اس لیے اگر تم اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چاہتے ہو تو پہلے تو اپنے قلب کو مضبوط کرو، کہ جب اللہ حکم دیتا ہے اور اپنے

دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو مستقبل کا ذمہ دار بھی وہی ہے، ہم اللہ کی مغفرت اور بخشش حاصل کرنے کے لئے اللہ کے راستے میں خرچ کریں، یہ جذبہ طبیعت میں ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر یقین ہو کہ آج اگر ہم دے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کل کو زیادہ کر کے ہماری طرف لوٹائے گا، جیسے پہلے مثال دی تھی کہ تم ایک خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ سات سو بنا دیتا ہے، دنیا میں بھی برکت ہوتی ہے جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ صدقے کے ساتھ کسی کے مال میں کمی نہیں آتی،[1] یعنی معنوی طور پر اُس میں اضافہ ہی ہوتا ہے، برکات اُس میں بڑھتی ہیں، اس کے ساتھ مال گھٹتا نہیں، اللہ کے اِس وعدے پر یقین ہوگا تو تم انفاق کر سکو گے۔ اور پھر اپنے آپ کو فضول خرچی سے روکنے کی کوشش کرو، جب تمہارے دل میں ہوگا کہ ہم نے اللہ کے نام پر پانچ روپے دینے ہیں تو پھر تم بچانے کی کوشش کرو گے اور فضول خرچی نہیں کرو گے، فضول خرچی سے رکو گے، عیاشی بدمعاشی میں مال کو خرچ کرنے سے بچو گے، اور اللہ کے راستے میں دو گے، اللہ کی مغفرت کے وعدے پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ ملنے کے وعدے پر دو گے، یہ جذبات جب قلب میں پیدا ہو جائیں تو سمجھو کہ اللہ کی تعلیم کو قلب قبول کر رہا ہے، یہ فرشتے کی طرف سے الہام ہو رہا ہے، اور اگر فقر کا اندیشہ ہو جائے اور فضول خرچیوں کی طرف طبیعت راغب ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ شیطان دل پر مسلط ہو گیا اور یہ جذبات تمہارے دل میں شیطان اُبھار رہا ہے۔ تو چونکہ اکثر و بیشتر انفاق فی سبیل اللہ میں اِس قسم کی چیزیں مانع ہوا کرتی ہیں اس لیے اُس رکاوٹ کو یہاں اٹھایا جا رہا ہے۔ ''شیطان تمہیں ڈراتا ہے فقر سے'' یعنی مستقبل میں محتاج ہونے سے تمہیں ڈراتا ہے، ''اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا'' فحشاء کا مصداق یہاں بخل بھی بنایا گیا ہے کہ بخل کا حکم دیتا ہے، پھر تو ماقبل کے ساتھ یہ بطور تاکید کے جُڑ گیا، کہ فقر سے ڈراتا ہے اور بخل کا حکم دیتا ہے۔ اور یا پھر فحشاء سے مراد وہی بے حیائی کے کام ہیں جن میں انسان کا سرمایہ پانی کی طرح جاتا ہے، یعنی آپ دودھ پینا چاہیں تو جتنے پیسوں کے ساتھ آپ اپنا پیٹ بھر لیں گے، اگر آپ کو شراب کی عادت پڑ جائے تو اُس سے سو گنا زیادہ پیسے خرچ کر کے آپ اپنا وہ وقت گزاریں گے، فحشاء کے اندر مبتلا ہونے کے بعد کمائی پانی کی طرح جاتی ہے، نکاح کر کے بیوی گھر میں لے آؤ تو گھر کے اخراجات جو بیوی کی وساطت سے ہوتے ہیں وہ اتنے نہیں ہوتے جتنے انسان کو رنڈیوں کے پاس جانے کی عادت پڑ جائے تو ایک ایک رات میں سرمایہ برباد کرتا ہے، گھر میں مہینے کا خرچ اتنا نہیں ہوتا جتنا وہاں ایک رات میں خرچ ہو جاتا ہے، تو جب اس قسم کے بے حیائی کے کاموں میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر مال سراسر اِدھر ہی خرچ ہونے لگ جاتا ہے، پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی، اس طرح سے شیطان تمہیں بے حیائی کے کاموں کی طرف متوجہ کر کے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ ''اور اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے تمہارے ساتھ مغفرت کا اپنی جانب سے'' کہ اگر تم میرے راستے میں خرچ کرو گے تو میں تمہارے گناہ معاف کروں گا ''اور زیادہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔'' تو شیطان کے خیال کے مقابلے میں اِس رحمانی خیال پر اپنے دل کو مضبوط کرنا چاہیے۔ ''اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، علم والا ہے۔''

---

(۱) ترمذی ۲/ ۵۸ باب ماجاء مثل ادنیا الخ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۱، باب استحباب المال۔ فصل ثانی۔ ولفظہ: ثَلَاثَةٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ.

حکمت کیا ہے اور کس کو ملتی ہے؟

لیکن یہ باتیں سمجھنا کام کس کا ہے؟ جس کو دین کی سمجھ مل جائے، اور جس کو دین کی سمجھ مل گئی سمجھو اُس کو خیر کثیر مل گئی، کہ وہ اپنی دنیا کو بھی سنبھال لیتا ہے اور آخرت کو بھی سنبھال لیتا ہے، وہ شیطان کی حقیقت کو سمجھتا ہے، فحشاء کی حقیقت کو سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی حقیقت کو سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے وعدے کی حقیقت کو جانتا ہے، دنیا کا فانی ہونا اُس کے سامنے منکشف ہے، اور آخرت کا باقی ہونا اُس کے سامنے منکشف ہے، اور وہ اِس نسبت کو جانتا ہے کہ اللہ نے مجھے دیا ہے، اور وہ اِس بات کو بھی سمجھتا ہے کہ اللہ کے حکم کے تحت عمل کرنے میں کیا فائدہ ہے، اس قسم کی چیزوں کی سمجھ جس کو مل جائے سمجھو خیر کثیر اُس کو مل گئی، وہ اپنی دنیا بھی سنوار لیتا ہے اور اپنی آخرت بھی سنوار لیتا ہے۔ یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ: جس کو اللہ چاہتا ہے حکمت دیتا ہے، اور اللہ کس کو چاہتا ہے؟ یہ آپ کے سامنے بار ہا ذکر کیا جا چکا، کہ جو آدمی اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ نیک راستہ اختیار کرنا چاہے اللہ کی مشیت اُس کو خیر کی توفیق دینے سے متعلق ہو جاتی ہے، اور جو اپنے قصد اور ارادے کو کسی بُری چیز سے متعلق کرنا چاہتا ہے تو اللہ کی مشیت اُس کو بُرائی کی طرف دھکیل دیتی ہے، اللہ کی مشیت کا تعلق اسی طرح اِن ظاہری اسباب کے ساتھ ہو کر انسان کے لئے نمایاں ہوتا ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو جائے گی، اور جتنا اعراض کرنے کی کوشش کرو گے اللہ کی طرف سے وہی راستہ تمہارے لئے آسان ہو جائے گا۔ تو حکمت یعنی دانشمندی کہ ہر چیز کی حقیقت کو سمجھو، اور پھر اس کے مقتضی پر عمل کرو، دنیا کا فانی ہونا اگر آپ کے سامنے منکشف ہو گیا، کہ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ دنیا فانی ہے، تو پھر اس کے لئے جمع کرنا کوئی عقلمندی نہیں ہوگی، وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهٗ[1] اِس دنیا کے لئے جمع وہی کرتا ہے جس کو عقل نہیں، کیونکہ پتہ نہیں صبح چھوٹ جائے یا شام چھوٹ جائے، پھر ایسی چیز کو جمع کر کے رکھنا اور ایسے جذبے کے تحت جمع کر کے رکھنا کہ جس سے انسان فائدہ نہ اٹھا سکے، دنیا کی حقیقت اگر منکشف ہو جائے تو پھر انسان اس کے لئے کہاں جمع کرتا ہے۔ اور اگر آخرت کا باقی ہونا انسان کے سامنے منکشف ہو جائے اور یہ حقیقت اچھی طرح سے سمجھ میں آجائے تو پھر انسان زیادہ سے زیادہ ذخیرہ آخرت میں جمع کرنے کی کوشش کرے گا کہ جہاں دائماً ابداً اُس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ تو حکمت کے تحت یہ ساری کی ساری باتیں آجاتی ہیں، اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہر چیز کی حقیقت انسان کو سمجھ میں آجائے، اور یہ جذبہ انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو دوست و دشمن کی پہچان ہو جائے گی، نفع ونقصان کی پہچان ہو جائے گی، پھر ان بنیادوں پر انسان کے عمل میں مضبوطی آجاتی ہے۔

''نذر'' محمود نہیں لیکن اس کا پورا کرنا واجب ہے

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ: جو مال بھی تم خرچ کرو (نفقہ کا مصداق مال) یا جو بھی تم نذر مانو پس بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے، نذر کا مطلب ہوتا ہے اپنے اوپر کسی دوسری چیز کو واجب کر لینا، ایک تو انفاق ہے اللہ کے حکم کے تحت، جیسے فرض زکوٰۃ، اور ایک ہے نفلی طور پر، کہ جب موقع آیا اللہ کے راستے میں دے دیا، کھانا دے دیا، لباس دے دیا، پیسے دے دیے، یا کوئی

---

(۱) مسند احمد، رقم: ۲۴۴۱۹۔ مشکوۃ ۲/ ۴۴۴، کتاب الرقاق فصل ثالث۔ ولفظ الحدیث: اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ وَمَالُ مَنْ لَّا مَالَ لَهٗ وَلَهَا یَجْمَعُ الخ۔

اور چیز اللہ کے راستے میں دے دی، اور ایک انفاق کی صورت یہ بھی ہے کہ تم اپنے اُوپر خود لازم کرلو جس کو نذر کہتے ہیں، اور نذر بدنی بھی ہوتی ہے، کہ آپ کہیں اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں چار روزے رکھوں گا، اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں اتنے نوافل پڑھوں گا، اور نذر مالی بھی ہوا کرتی ہے، کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا، مثلاً بیمار تندرست ہوگیا تو میں اللہ کے راستے میں یوں دوں گا، تو یہ واجب ہوجاتی ہے، پھر اُس کام کے ہوجانے کے بعد اُس کا خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے، اِس کو نذر کہا جاتا ہے، تو نذر ماننا اگرچہ شریعت کی نظر میں کوئی محمود اور اچھی چیز نہیں، لیکن اگر کوئی مان لے تو اِس کا وجوب آجاتا ہے۔

''ظالمین'' کا مصداق اور ان کے لئے وعید

''اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں'' ظالموں کا مفہوم یہاں یہی ہے، کیونکہ ظلم کا اصل مصداق ہوتا ہے وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ کہ چیز کو کسی غیر محل میں رکھنا، جہاں رکھنی چاہیے تھی وہاں نہیں رکھی، اس لئے جتنے معاصی ہیں وہ سب ظلم کا مصداق ہوتے ہیں، اپنے نفس کے حقوق ادا نہ کرنا بھی ظلم ہے، اور جن کو اللہ نے مال دیا ہے اور وہ مال کے حق کو نہیں پہچانتے، فضول خرچیوں میں مال اڑاتے ہیں، فقر کے اندیشے سے جمع کر کر کے رکھتے ہیں، یہ بھی ظالم ہیں جو اپنا ثواب گھٹاتے ہیں، اور اپنے حقوق کو تلف کرتے ہیں، یہ آج اِس مال کے سہارے لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم جمع کر کے رکھیں گے تو کل کو یہ ہمارے کام آئے گا، لیکن کل کو یہ مال چھن جائے گا، پھر یہ تہی دامن کھڑے ہوں گے، کوئی اِن کا دستگیر اور کوئی اِن کا مددگار نہیں ہوگا۔ اور جو لوگ اللہ کے وعدے پر یقین کرتے ہیں اللہ کی نصرت اُن کے ساتھ ہر وقت رہتی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور جو مال پر اعتماد کر کے بیٹھ جاتے ہیں، تو مال ساتھ دے گا نہیں، پھر یہ بے سہارا رہ جائیں گے، یہاں ظالمین کا مصداق موقع محل کے مطابق یہی ہے۔

صدقات میں اِخفاء کی فضیلت وفوائد

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ: اس آیت میں صدقات کے متعلق ایک اور ادب واضح کیا جارہا ہے، کہ یہ خفیہ دینے چاہئیں یا علی الاعلان دینے چاہئیں۔ اصل کے اعتبار سے فی حد ذاتہ فضیلت تو اخفاء کو ہے، کہ چھپا کردو، چھپا کر دینے میں دینی فائدہ بھی ہے کہ انسان ریاکاری سے بچتا ہے، اور دنیوی فائدہ بھی ہے کہ کسی دوسرے شخص کو اِس کے مال کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اِس کے پاس کتنا مال ہے، مثال کے طور پر اگر آپ لوگوں کو بتادیں گے کہ میری ایک لاکھ زکوٰۃ نکلی ہے تو لوگ اندازہ کرلیں گے کہ آپ چالیس لاکھ کے مالک ہیں، اور مال ایک ایسی چیز ہے کہ جب کسی کے پاس معلوم ہوتا ہے تو چور، اچکے، لٹیرے، بدمعاش سارے ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں، ایک آدمی خالی ہاتھ جارہا ہو تو قدرتی بات ہے کہ اُس کے دل میں کوئی تردد نہیں ہوتا، کوئی خوف نہیں ہوتا، کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، بڑے اطمینان کے ساتھ چلتا جائے گا، اور اگر اُس کے پاس پیسے ہیں تو چاہے بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن اس کا دل دھڑکے گا کہ کہیں کوئی چور نہ آجائے، کہیں کوئی ڈاکو نہ آجائے، میری کوئی جیب نہ کاٹ لے، اور انسان چھپتا ہوا اور بچتا بچاتا ہوا چلتا ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ جہاں مال ہوتا ہے تو اپنے دل میں بھی اس قسم کے خدشات پیدا ہوجاتے ہیں، اور ادھر چور، اچکے، لٹیرے، ڈاکو بھی بہت متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے اگر اخفاء کے ساتھ دیا جائے گا تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اس کے پاس کتنا مال ہے، اِس طرح

سے دنیوی خطرات سے بھی کسی حد تک بچاؤ ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہو گیا دینے والے کے لئے فائدہ۔ اور ایک فائدہ اِس میں اور بہت بڑا ہے کہ بسا اوقات ایک آدمی اپنی ذات میں خوددار ہے، باوقار ہے، اور وہ اپنا محتاج ہونا کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا، اُس کو اگر علی الاعلان کسی سامنے صدقہ دیا جائے گا تو وہ لیتا ہوا شرماتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ میری عزتِ نفس کے خلاف ہے کہ دیکھنے والے لوگ کیا کہیں گے کہ میں لوگوں سے خیرات اور صدقے لے کے کھاتا ہوں؟ بسا اوقات محتاج ہونے کے باوجود انسان کی طبیعت کے جذبات ایسے ہوتے ہیں۔ اور جب خفیہ دیا جائے گا تو اُس کی خودداری بھی بحال رہ جائے گی، اور اُس کی طبیعت پر بھی اس قسم کے اثرات نہیں ہوں گے، وہ بھی اس بات کو اپنی عزتِ نفس کے خلاف نہیں سمجھے گا۔ اس لئے فی حد ذاتہٖ تو کمال یہی ہے کہ انسان اخفاء کے طور پر دے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے، جہاں سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ "سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ"[1] سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، اُن میں سے ایک وہ آدمی بھی ہے جو ایسے طور پر خرچ کرتا ہے کہ جو اُس کے دائیں ہاتھ نے دیا اُس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہیں ہے، یعنی خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے، تو اِخفاء کا ذکر اُس حدیث میں بھی ہے۔

صدقات میں اظہار کے فوائد

تو فی حد ذاتہٖ تو فضیلت اِس کو ہے، لیکن بسا اوقات کسی عارضے کی بنا پر اِبداء افضل قرار دے دیا جاتا ہے، یعنی عارضی طور پر ظاہر کرنے کو افضل کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کے متعلق لوگوں کو بدگمانی ہے کہ یہ زکوٰۃ نہیں دیتا، ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو بدگمانی سے بچانے کے لئے زکوٰۃ ظاہر کر کے دے دے، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ واقعی زکوٰۃ دیتا ہے اور فرض کو ادا کرتا ہے۔ اور کبھی موقع محل ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے تو دوسروں کو ترغیب نہیں ہوتی، اور اگر وہ سب کے سامنے دیتا ہے اس جذبے کے تحت کہ میں دے رہا ہوں تو میری طرف دیکھ کر دوسرے لوگوں میں بھی اقتداء کا جذبہ پیدا ہوگا، اُس طرح سے علی الاعلان دینا بسا اوقات افضل ہو جاتا ہے، کہ ایک نے دیا، پھر اس کی طرف دیکھ کر باقیوں کو بھی شوق ہو گیا، وہ بھی دینے لگ گئے، تو می چندوں میں اور اجتماعی چندوں میں بسا اوقات یہ چیز مفید ہوتی ہے، کہ ایک کی طرف دیکھ کر دوسرے کو ترغیب ہوتی ہے، دوسرے بھی دیکھ کر دینے لگ جاتے ہیں، ایسے موقع پر اِبداء کو افضل قرار دے سکتے ہیں، اور فی حد ذاتہٖ جواز دونوں کا ہے، چاہے اصل کے اعتبار سے افضلیت اخفاء کو ہے لیکن عارض کے طور پر یہ افضلیت ابداء کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ اچھے جذبات کے تحت، نیکی کے جذبات کے تحت، للّٰہیت کے ساتھ اگر انسان کسی موقع پر ابداء کو مفید سمجھتا ہے تو ابداء کو اختیار کر لے، اور اگر دیانت داری کے ساتھ کسی موقع پہ اِخفاء کو افضل سمجھتا ہے تو اخفاء کو اختیار کرے، نہ ابداء ممنوع ہے، نہ اخفاء ممنوع ہے، ریا سے بچنا اور اللہ کی رضا کا مقصود ہونا دونوں جگہ ضروری ہے، افضلیت عوارض کے طور پر آ سکتی ہے کہ کہیں اِخفاء افضل ہوگا کہیں اِبداء افضل ہوگا، یہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انسان موقع محل کے مطابق دیکھ لیا کرتا ہے۔ ناجائز کوئی بھی نہیں ہے، نہ ابداء ناجائز نہ اخفاء ناجائز، عام

(۱) بخاری ۱/۱۹۱، باب الصدقة باليمين/ مشکوۃ ۱/۶۸ باب المساجد، فصل اول۔

طور پر اخفاء افضل ہے، اور عوارض کے طور پر ابداء بھی افضل ہوسکتا ہے۔ ''اگر تم صدقات کو ظاہر کرو فَنِعِمَّا هِيَ: تو یہ بھی اچھی بات ہے، اِن کا ظاہر کر کے دینا بھی اچھا ہے، اور اگر تم اِن کو چھپاؤ اور فقراء کو دے دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ: بظاہر اِس کو اخفاء کے ساتھ لگایا، کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ دُور ہٹائے گا، یہ گناہوں کا معاف ہونا اخفاء کے ساتھ خاص نہیں ہے، لیکن ظاہری طور پر اس کو اس کے ساتھ جو لگا دیا تو مفسرین کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان کی کمزوری کا ایک علاج ہے، کہ بسا اوقات انسان مال خرچ کرتا ہے، اور اُس کا جی چاہتا ہے کہ میں خرچ بھی کروں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے تو خرچ کرنے کا کیا فائدہ ہوا، یہ انسان کی طبیعت میں ایک بات آتی ہے، تو یہ کہہ دیا کہ اگر کسی دوسرے کو پتہ نہیں تو اللہ تعالیٰ کو تو پتہ ہے، اور جو فائدہ خرچ کے اُوپر تم چاہتے ہو یعنی اللہ کی مغفرت وہ بہر حال ہوگی چاہے کسی کو پتہ نہ چلے، بلکہ جب اخفاء کے ساتھ دیا جائے گا تو چونکہ اس میں خلوص زیادہ نمایاں ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت زیادہ ہوگی، کیونکہ جو فائدہ تمہیں مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف کردے وہ تو اللہ کے جاننے پر ہے، مخلوق کے جاننے پر تو نہیں ہے، اس لئے مخلوق کو نہ بھی پتہ چلے، اور تم نے اخفاء کیا ہو، تو بھی اللہ تمہارے گناہ معاف کرے گا۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے عملوں کی خبر ہے۔

نفلی صدقہ محتاج کافر کو دینا بھی باعثِ ثواب ہے

ایک ادب اب آگے بتایا جارہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ خرچ کرنا باعث ثواب ہے، اس میں مسلم اور کافر کی بھی تمیز نہیں، اگر کوئی محتاج سامنے آجائے تو اُس کی مدد کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ صرف زکوٰۃ کے بارے میں پابندی ہے کہ یہ کافر کو نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اس کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ''[1] کہ یہ مال مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے فقراء پر لوٹا جاتا ہے، زکوٰۃ کے بارے میں تو یہ تعلیم ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لو اور مسلمانوں کے فقراء پر لوٹاؤ، اس لیے اِس کا مصرف کافر نہیں ہے، کافر کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ہاں البتہ زکوٰۃ کے علاوہ باقی خیرات صدقات کافر کو دیے جاسکتے ہیں، اس میں مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، جیسے قربانی کا گوشت عیسائی کو دیا جاسکتا ہے، اور اسی طرح دوسرا کوئی محتاج کافر سامنے آگیا، ننگا ہے، اس کا کپڑا پھٹا ہوا ہے، اس کو کپڑا دے دو، جوتی ٹوٹی ہوئی ہے جوتی دے دو، تو بوقتِ ضرورت کافر کی امداد کرنا بھی باعث ثواب ہے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں تو یہاں تک آیا ہے کہ کسی حیوان کو بھی اگر تم محتاج پاتے ہو تو اس حیوان پر احسان کرو، اِس پر بھی اللہ ثواب دیتا ہے، بخاری شریف میں روایت موجود ہے، اور مشکوٰۃ میں فضائل صدقات میں بھی موجود ہے، کہ ایک فاحشہ عورت نے ایک محتاج کتے کو مشقت اٹھا کر ایک کنویں سے پانی نکال کر پلا دیا، اپنے موزے کے ساتھ اپنا دوپٹہ باندھ کر اس سے پانی نکال نکال کر کتے کو پلایا، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی مغفرت کردی۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا اس قسم کے حیوانوں کی خدمت کرنے میں بھی

---

(۱) بخاری ۱/ ۱۸۷، کتاب الزکاۃ کی پہلی حدیث/ مشکوۃ ۱/ ۱۵۵، کتاب الزکاۃ کی پہلی حدیث۔

ثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں جو چیز بھی تر جگر رکھتی ہے یعنی جو جاندار ہے اُس کی خدمت کرنے میں اللہ تعالیٰ ثواب دیتا ہے۔[1] تو محتاج کوئی بھی ہو اس محتاج کی امداد کرو۔

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ خیال پیدا ہوا تھا جس کی یہاں اصلاح کی جارہی ہے کہ صدقات صرف مسلمانوں کو دینے چاہئیں، کافروں کو نہیں دینے چاہئیں، تاکہ وہ لوگ اسی ترغیب کے ساتھ ہی اسلام قبول کرلیں، جب وہ دیکھیں گے کہ صدقات ہمیں نہیں ملتے تو چلو مسلمان ہوجائیں گے، مال کی لالچ میں ہی سہی، اس جذبے کے تحت وہ کافروں کو نہیں دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں راہنمائی فرمائی کہ ان کی ہدایت تمہارے ذمے نہیں کہ اِن کو لانے کے لئے تم اِس قسم کے حیلے کرو، محتاج کی مدد تو بہر حال کرو، باقی! اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو کریں، نہیں کرتے تو ان کی مرضی، تمہارا مدد کرنا اور اِن کو صدقہ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعث ثواب ہے، محتاج آجائے تو اُس کی امداد کرو، چاہے مسلمان ہے چاہے کافر ہے۔

''بوستاں'' میں حضرت سعدیؒ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ نقل کیا، کہ آپؑ کی عادت تھی کہ جس وقت تک کوئی مہمان نہ آجائے اُس وقت تک کھانا نہیں کھایا کرتے تھے، ایک دفعہ کوئی مہمان نہ آیا، کھانے کا وقت آگیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام انتظار میں تھے کہ کوئی آئے تو میں کھانا کھاؤں، کوئی نہ آیا تو باہر نکل گئے، کہ کوئی مسافر آتا جاتا ہو تو اسی کو دیکھ کر پکڑ لائیں، جب گئے تو ایک بوڑھا آتش پرست جارہا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اُسے پکڑ لائے کہ آؤ کھانا کھا کے جانا، اُس کو دستر خوان پر لا کے بٹھالیا، جب دستر خوان پر بٹھایا تو اُس سے کہا کہ اللہ کا نام لے لو جس نے یہ کھانا دیا ہے، تو وہ کہنے لگا کہ میں تو اللہ کو نہیں جانتا، میں تو اللہ کا نام نہیں لیتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو غصہ آیا تو دستر خوان سے اٹھادیا کہ چل! جب تو اللہ کا نام نہیں لیتا تو تجھے یہ کھانے کا حق نہیں ہے، تو حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی، کہ یہ آج تیرے دستر خوان پر آیا، اور اللہ کا نام نہ لینے کی وجہ سے تو نے اِس کو دستر خوان سے اٹھادیا، یہ کتنے سالوں کا بوڑھا ہے، آخر اتنی مدت سے میں بھی تو اِسے کھلا ہی رہا ہوں، تو بوستاں میں لفظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ:

گر او مے برد پیشِ آتش سجود تو واپس چرا مے بری دستِ جود

کہ اگر یہ آگ کے سامنے سجدہ کرتا ہی ہے تو کرتا رہے، لیکن تو سخاوت کا ہاتھ اس سے کیوں کھینچتا ہے۔[2] تو اُس میں بھی یہی بتایا گیا کہ محتاج، حاجت مند، ضرورت مند آجائے تو ایسے شخص کو بوقتِ ضرورت دینا اور کھلانا باعث ثواب ہے، چاہے کوئی کافر ہے چاہے کوئی مسلمان ہے، تو لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ میں یہی بات بتائی گئی، اِن کو راستے پر لانا آپ کے ذمے نہیں ہے، (هُدٰی کا یہاں مفہوم یوں ادا کریں گے) اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے صحیح راستے پر پہنچادیتا ہے۔ ''جو مال تم خرچ کرو اپنے فائدے کے لئے خرچ کرتے ہو، اور نہیں خرچ کرتے تم مگر اللہ کی رضا کے لئے'' یہ اُسی فائدے کا بیان ہے، کہ تم نے تو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا ہے، اور اللہ کی

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۱۸، باب فضل سقی الماء - ۱/ ۴۶۷، باب اذا وقع الذباب فی الشراب/ مشکوۃ ۱/ ۱۶۸ باب فضائل الصدقۃ. واللفظ للمشکوۃ.

(۲) بوستاں، باب دوم، حکایت در اخلاق پیغمبراں، ص ۱۰۰- آغاز حکایت: شنیدم کہ یک ہفتہ ابن السبیل۔

رضا تمہیں حاصل ہو جائے گی، اگر کوئی ہدایت قبول کرتا ہے تو کرے، نہیں قبول کرتا تو نہ کرے، ''جو مال تم خرچ کرو تمہاری طرف پورا ادا کر دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہیں کی جائے گی'' اس لیے اس کا فائدہ بہر حال تمہاری طرف لوٹ کر آنے والا ہے۔

صدقات کا سب سے اعلیٰ اور اچھا مصرف

بوقتِ ضرورت خرچ تو ہر کسی پر کیا جا سکتا ہے لیکن اِن صدقات کا اعلیٰ مصرف یہاں نمایاں کیا جا رہا ہے، کہ اِن کا سب سے اچھا مصرف کون سا ہے؟ تو فرمایا کہ یہ صدقات اُن محتاجوں کے لئے ہیں جو اللہ کے راستے میں گھیر لیے گئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی دینی خدمت میں مشغول ہیں۔ اُس وقت اِس کا مصداق اصحابِ صفہ تھے، یعنی سرورِ کائنات ﷺ کے مدرسے کے طالب علم، جو ہر طرف سے تعلقات قطع کر کے آ بیٹھے تھے، یہ فقراء اور مساکین کا گروہ تھا، جن کا کوئی ذریعہ آمدنی، کوئی جائیداد، کوئی کاروبار نہیں تھا، مسجد میں ایک چبوترہ تھا، اُس کے اوپر بیٹھے رہتے تھے، اور حضور ﷺ جب آتے اِن کے پاس بیٹھتے، اِنہیں قرآن پڑھاتے، اور اِنہیں اپنی باتیں یاد کرواتے، اور کہیں سے کوئی صدقہ خیرات آ جاتا تو اِن میں بانٹ دیتے، اور اِن کا گزارہ اسی پر ہی تھا، فاقوں پر فاقے اٹھاتے تھے، لیکن قرآن وحدیث یاد کرتے تھے، جب کہیں باہر سے کوئی مطالبہ آتا کہ ہمارے پاس کوئی مبلغ بھیج دو جو دین کی تبلیغ کرے، تو اِن میں سے جس نے قرآن زیادہ یاد کیا ہوتا، جو زیادہ سمجھدار ہوتا، حضور ﷺ اُس کو مبلغ بنا کر بھیج دیتے تھے۔ مسجد کے ساتھ ہی اِس مدرسے کی بنیاد سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی زندگی میں رکھی، جس میں آنے والے طالب علم ساٹھ ستر اور اُسی تک چلے جاتے تھے، یہ اصحابِ صفہ کہلاتے تھے، یہ مساکین کا گروہ تھا جو دینی خدمات کے لئے رُکے بیٹھے تھے، کہ جہاں حضور ﷺ اِن کو بھیجیں چلے جائیں، دن کو حضور ﷺ کے گھر کی ضروریات پوری کرتے تھے، گھر پانی بھرتے تھے، ایندھن لا کے دیتے تھے، اسی طرح دیگر جو ضروریات ہوا کرتی ہیں، اور حضور ﷺ اِن کے اوپر شفقت فرماتے، اصولاً اِن کا خرچ حضور ﷺ کے ذمے تھا، بس صدقہ خیرات جو آ جاتا وہ اِن میں تقسیم ہو جاتا، باقی یہ اپنے طور پر کوئی ذریعہ معاش اختیار کیے ہوئے نہیں تھے۔ اور اِسی کا مصداق آج کل عربی مدارس کے طلبہ ہیں، کہ وہ بھی ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے دین کے لئے آ کے بیٹھ جاتے ہیں، تو طلبہ بھی اور طلبہ کو پڑھانے والے بھی محصر فی سبیل اللہ ہو گئے، جو دینی خدمت کے لئے روک لیے گئے، لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ: کاروبار کے لئے وہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے، یہاں طاقت نہ رکھنے کا یہ معنی نہیں کہ اُن کی ٹانگیں بے کار ہیں، اپاہج ہیں، ہل نہیں سکتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مشغولیت اتنی ہے کہ اگر وہ دوسرے کاموں میں لگ جائیں گے تو دین کا کام کس طرح سے کریں گے؟ اور اِسی کا مصداق ہیں مجاہد اور غازی، کہ اگر وہ دکانیں اور کاشتکاری کرنے لگ جائیں، ریڑھیاں لگا کر بازار میں کھڑے ہو جائیں، تو پھر اُن کے اوقات اتنے فارغ کہاں ہوں گے جو یہ دینی کام کر سکیں۔ اس لیے اپنے صدقات خیرات تلاش کر کر کے اِن لوگوں تک پہنچایا کرو جو دینی ضرورت میں مشغول ہونے کی وجہ سے کاروبار کے لئے چل پھر نہیں سکتے، کوئی دوسرا کاروبار نہیں کر سکتے۔ ''کر نہیں سکتے'' کا معنی یہ نہیں کہ اِن کے اندر استعداد نہیں ہے، صلاحیت نہیں ہے، یہ ٹوکری نہیں اٹھا سکتے، یا ریڑھی نہیں لگا سکتے، یا کسی دوسرے شغل کے اندر لگ کر، کاشتکاری کے ساتھ، تجارت کے ساتھ، مزدوری کے طور پر کچھ کما نہیں

سکتے، یہ مطلب نہیں، بلکہ مشغولیت اُن کی ایسی ہے، وہ محصَر فی سبیل اللہ ہوگئے، اللہ کے راستے میں گھیر لیے گئے، اگر وہ اِن کاموں میں لگتے ہیں تو دین کا کام نہیں ہوتا، اور دین کا کام کرتے ہیں تو کمانے کی فرصت نہیں ہے کہ کسی دوسرے کام کے ذریعے سے کما لیں۔ اور پھر اِن میں عزتِ نفس ہے، اپنے مقام کا احساس ہے، لوگوں سے مانگتے نہیں پھرتے کہ ہم بھوکے ہیں ہمیں روٹی دو، اور اِس صاف ستھرے رہنے کی وجہ سے اور نہ مانگنے کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو غنی ہیں، اِن کو کیا ضرورت ہے کسی چیز کی، یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ: جو اِن کے حال سے واقف نہیں وہ ان کو مالدار سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ تو بڑے مالدار ہیں، غنی ہیں، مِنَ التَّعَفُّفِ: سوال سے بچنے کی وجہ سے، چونکہ لوگوں سے مانگتے نہیں ہیں...... آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ جب سے ہم نے یہ پابندی لگائی ہے کہ باب العلوم کے طالب علم کسی کے گھر کھانا کھانے نہیں جائیں گے، تو عام لوگ یہ کہتے ہیں کہ اِن کے پاس بڑا سرمایہ ہے، ان کو ضرورت ہی کیا ہے کہ ان کے بچے لوگوں کے گھروں میں جا کے کھائیں، اس طرح سے پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ان کے پاس بڑا سرمایہ ہے، بڑے خزانے ہیں، اس لئے یہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ کھانا کھانے کے لئے کسی کے گھر جائیں، تو نہ جانے کی وجہ سے اُن کا تاثر یہ ہے، آپ لوگ صاف ستھرے ہیں، خودداری کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں، کسی سے سوال نہیں کرتے، کسی کے گھر کھانا کھانے کے لئے نہیں جاتے، تو جو لوگ حالات سے واقف نہیں ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ بہت خزانوں کے مالک ہیں، اِن کے پاس پیسے ہی اتنے ہیں، اس لیے یہ کچھ مستغنی سے ہوگئے، حالانکہ جو ہمارا حال ہے وہ آپ سمجھتے ہی ہیں، کہ صبح شام کا قصہ چلتا ہے، ہماری اِس مہینے کی تنخواہیں پرسوں تقسیم ہوئی ہیں، اتنی دیر کے ساتھ!! لیکن وقت ہے، الحمد للہ گزرتا جا رہا ہے، جو حالات سے واقف نہیں وہ یقیناً یہی سمجھے گا کہ اِن کو ضرورت ہی نہیں...... تو اِس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آپ حضرات جو دین کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کی اصل شان یہی ہے کہ تعفف اتنا ہونا چاہیے کہ دیکھنے والے جو آپ کے حالات سے واقف نہیں ہیں وہ دیکھ کر تمہیں یہ سمجھیں کہ تم محتاج نہیں ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کہتے ہیں تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ: تو ان کے حالات، علامات، اور نشانات کو دیکھ کر پہچانتا ہے، (سیما کا معنی نشان)، کہ اگرچہ سوال نہیں کرتے، لیکن اِن کے حال سے یہ بات نمایاں ہے کہ جب ان کا کوئی کاروبار نہیں، کہیں سے کوئی آمدنی نہیں، چہرے پر تواضع، مسکنت، عبادت اور ریاضت کے آثار ہیں، تو یقیناً یہ لوگ ضرورت مند ہیں، تُو اِن کو ان کی علامات دیکھ کر پہچان سکتا ہے۔ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اِن فقراء کا اعلیٰ مصداق عربی مدارس کے طلبہ کو ہی قرار دیا ہے، کہ مالدار لوگوں کو چاہیے کہ اِن کی ضرورتیں معلوم کر کر کے ان کی امداد کیا کریں، یہ ضروری نہیں کہ یہ تم سے مانگنے کے لئے آئیں اور تمہارے سامنے اپنی حاجات کو نمایاں کریں، کیونکہ یہ اللہ کے دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اور اگر یہ کمانے میں اور مال اکٹھا کرنے میں لگ جائیں گے تو پھر یہ خدمات جاری نہیں رہ سکتیں۔

سلسلۂ اِنفاق کی آخری آیت

آگے اِس سلسلے کی آخری آیت مذکور ہے ''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں'' یعنی یہ اوقات کی تعمیم آگئی، ضرورت پیش آجائے تو رات کو خرچ کرو، اور ضرورت پیش آجائے تو دن کو خرچ کرو، وقت کی کوئی تعیین نہیں۔ اور سِرًّا

وَّعَلَانِیَۃً: یہ حال کی تعمیم آ گئی ۔ چھپ کر اور علی الاعلان یعنی ظاہری طور پر، فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ: ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ: اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا نہ غمزدہ ہوں گے، یہ آخرت میں کامیابی کا عنوان ہے، کہ آخرت میں ان کو انتہائی درجے کی اطمینان کی زندگی نصیب ہوگی جو خوف وحزن سے خالی ہوگی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ
جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں اٹھیں گے وہ مگر جیسے کہ اٹھتا ہے وہ شخص جس کو خبطی بنا دیا ہو شیطان نے
مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ
لپٹ کر، یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ بیع سود کی طرح ہے، اور اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے بیع کو اور
حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ
حرام ٹھہرایا ہے سود کو، پس وہ شخص جس کے پاس نصیحت آ گئی اس کے رب کی طرف سے پھر وہ رک گیا تو اُس کے لئے ہے جو کچھ پہلے ہو گیا،
وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾
اور اُس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اور جو کوئی لوٹے گا پس یہی ہیں جہنم والے اور اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۷۵﴾
یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کسی ناشکرے گناہ گار کو ﴿۲۷۶﴾ بیشک وہ لوگ جو
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی اُن کے لئے اُن کا اجر ہے اُن کے رب کے پاس،
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا
نہ اُن پر کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۷۷﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور چھوڑ دو
مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ
جو سود باقی ہے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۲۷۸﴾ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان سن لو،

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ

اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہیں، نہ تم ظلم کرو گے نہ تم ظلم کیے جاؤ گے ﴿۲۷۹﴾ اور اگر تنگی والا ہے

فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۗ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا

تو مہلت دینا ہے کشادگی تک، اور تمہارا صدقہ کر دینا بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور ڈرو اس دن سے

تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

جس میں تم لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اُس نے کیا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۲۸۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا: جولوگ ربا کھاتے ہیں، ربا کا معنی سود، اور کھانے سے مراد ہے لینا، یعنی جو سود لیتے ہیں، چاہے اُس کو لباس میں استعمال کرتے ہیں، چاہے عمارت میں استعمال کرتے ہیں، چاہے اپنے پاس جمع رکھتے ہیں، جس صورت میں بھی اُس کو استعمال کیا جائے یہ اکل ربا کا مصداق ہے۔ جولوگ سود کھاتے ہیں لَا يَقُوْمُوْنَ: نہیں اٹھیں گے اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ: مگر جیسے کہ اٹھتا ہے وہ شخص جس کو خبطی بنا دیا ہو شیطان نے لپٹ کر، شیطان سے جن مراد ہے، یعنی جن کے لپٹنے کی وجہ سے کوئی بدحواس ہوگیا ہو، جس طرح وہ شخص اٹھتا ہے اِسی طرح سودخوار اٹھیں گے، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا: یہ اس سبب سے ہے کہ اُنہوں نے کہا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا: سوائے اس کے نہیں کہ بیع سود کی طرح ہے، وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا: اور اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے بیع کو اور حرام ٹھہرایا ہے ربا کو، فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: پس وہ شخص جس کے پاس نصیحت آ گئی اس کے رَبّ کی طرف سے فَانْتَهٰى: پھر وہ رک گیا فَلَهٗ مَا سَلَفَ: پس اُس کے لئے ہے جو کچھ پہلے ہوگیا، جو پہلے گزر گیا وہ اسی کے لئے ہے، وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ: اور اُس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اللہ کے سپرد ہے، اللہ کے حوالے ہے، وَمَنْ عَادَ: اور جو لوٹے دوبارہ اُسی قول وفعل کی طرف جس کا ذکر پیچھے آیا، یعنی سود لینا اور اُس کو مثل البیع حلال قرار دینا، جو کوئی عود کرے گا اس قول وفعل کی طرف فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: پس یہی ہیں جہنم والے هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ: اور صدقات کو بڑھاتا ہے، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ: اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کسی ناشکرے کو گنہگار کو۔ كَفَّارٌ: بہت کُفر کرنے والا، یا بہت ناشکری کرنے والا۔ اَثِيْمٌ: گنہگار۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور انہوں نے نماز قائم کی، وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: اور زکوۃ دی، لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: اُن کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رَبّ کے پاس وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ ان پر کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا: ذَرُوْا امر کا صیغہ ہے، اور چھوڑ دو جو سود باقی ہے مِنَ

الرِّبٰوٓا کا بیان ہے، جو سود باقی ہے اُسے چھوڑ دو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو، فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا: اگر تم نے ایسا نہیں کیا، یعنی اگر تم ایسا نہیں کرو گے، (اِن کے ساتھ ماضی کے اندر مضارع کا معنی پیدا ہو جاتا ہے) اگر تم آئندہ ایسا نہیں کرو گے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: تو سن لو اللہ کی طرف سے اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان سن لو، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ: اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں، رأس المال اصل مال کو کہتے ہیں، لَا تَظْلِمُوْنَ: نہ تم ظلم کرو گے وَلَا تُظْلَمُوْنَ: نہ تم ظلم کئے جاؤ گے، وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ: اور اگر تنگی والا ہے فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ: پھر مہلت دینا ہے کشادگی تک، وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: اور صدقہ کر دینا تمہارا بہتر ہے تمہارے لئے اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: اگر تم جانتے ہو، وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ: اور ڈرو اُس دن سے جس میں تم لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ: پھر پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اُس نے کیا ہے وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں صدقہ اور خیرات کے متعلق احکام تھے جس کا عنوان قائم کیا گیا تھا انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ اُس کی تاکید، اُس کی ترغیب، دنیا اور آخرت میں اُس کے فوائد، اور اُس کے آداب اور شرائط آپ کے سامنے گزشتہ دو رکوع میں ذکر کیے گئے ہیں۔ اب انفاق فی سبیل اللہ کے بالکل برعکس سود کا لینا، سود کا کھانا، اِن آیات میں مذکور ہے۔

صدقہ، سود اور قرض میں فرق

انفاق فی سبیل اللہ اللہ کے ہاں مرغوب ہے، اور سود کا لینا اللہ کے ہاں انتہائی درجے کا مبغوض ہے، سود کا لینا حرام ہے اور دنیا اور آخرت میں صدقہ کے برخلاف متضاد نتائج کا حامل ہے، جیسے صدقہ خیرات میں ہمدردی مواسات اور خیر خواہی کا معنی پایا جاتا ہے، کہ ایک آدمی اپنی محنت کے ساتھ کماتا ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ضرورت مند لوگوں کو مفت تقسیم کر دیتا ہے، اپنی محنت کی کمائی لوگوں میں بانٹ دیتا ہے، اِس میں انسانی ہمدردی مواسات اور خیر خواہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا جذبہ ہے، اور آخرت پر یقین ہے، یہ چیزیں انفاق فی سبیل اللہ کا منشاء بنتی ہیں۔ اور اِس کے برعکس انسانیت کے لئے انتہائی درجے کا ظالم، درندہ صفت اور خونخوار بھیڑیا ہے وہ سرمایہ دار جس کے پاس مال جمع ہے، اور وہ کسی غریب کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کے لئے تیار نہیں، کسی کی بوقتِ ضرورت دستگیری نہیں کرتا، بلکہ اگر کوئی محتاج اُس کے پاس پیسہ لینے کے لئے آتا ہے تو وہ جتنے اُس کو دیتا ہے اُس سے زائد لینے کی شرط ٹھہراتا ہے، تو اِس کے دل میں مال کی محبت ہوتی ہے، دنیوی زندگی کی قدر ہوتی ہے، اللہ کے احکام کی پروا نہیں، آخرت کی پروا نہیں، انسانوں کیساتھ ہمدردی نہیں، اس لئے یہ معاملہ بالکل صدقہ خیرات کے برعکس ہے۔ ایک تیسری

صورت ہے کہ کسی کو بغیر سود کے قرض دے دینا، وہ درمیانی صورت ہے، کہ اگر مفت میں اپنا مال دوسرے کی ملکیت نہیں کر سکتے اور بوقت ضرورت دوسروں کو دے نہیں سکتے تو قرض دے دیا کرو، اور پھر پورے کا پورا واپس لے لیا کرو، اس کے اوپر بڑھوتری اور زیادہ لینا ظلم اور زیادتی ہے، اور اس میں انسانیت کے ساتھ ہمدردی کا پہلو نہیں ہے۔ تو انفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے اخذ ربا کا قصہ ہے، اور اگلے رکوع میں قرض کے متعلق کچھ احکام ذکر کیے گئے ہیں، اس طرح سے مالیات کے متعلق یہ احکام پورے ہو جاتے ہیں، کہ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے محتاج انسانوں کی دستگیری کرے، اور اگر بالکل دے نہیں سکتا تو بطور قرض کے دے دے جو دوسرے وقت میں وصول کر لے، یہ دونوں صورتیں درجہ بدرجہ جائز ہیں اور مرغوب فیہ ہیں، اور تیسری صورت کہ کسی کو دے کر پھر اس سے زیادہ لینا، جس کو سود یا ربا کہتے ہیں، یہ حرام ہے اور انسانیت پر ظلم ہے، درمیان میں اُس کی مذمت بیان کر دی۔ یہ تقریباً سات آیتیں ہیں جن میں سود کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے۔

جاہلیت میں سُود کی مروّجہ صورت

رِبٰوا: رَبَا یَرْبُوا بڑھنے کے معنی میں، رَبوۃ کا لفظ آپ کے سامنے پہلے گزرا، کہ جو پست زمین کے مقابلے میں کوئی زمین پھولی ہوئی اور بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اور قرآنِ کریم میں اس سے فعل بھی استعمال ہوا ہے: ''مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیۡۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ'' (سورۂ روم: ۳۹) کہ جو تم ربا دیتے ہو تا کہ دوسروں کے مالوں میں جا کر بڑھ جائے وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔ ربا کا ترجمہ سود کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، سود فارسی کا لفظ ہے جس کا معنی ہوتا ہے نفع، جیسے سود وزیاں کا لفظ عام طور پر آپ بولتے رہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں جس وقت اُترا ہے اُس وقت جاہلیت میں یہ لفظ متعارف تھا، اور اس کے معاملات لوگوں میں جاری تھے، اور اس کے متعلق لوگوں کو پوری واقفیت تھی کہ ربا کس کو کہتے ہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں تو کیا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ وانجیل میں بھی اس کی حرمت مذکور ہے، یہود کو بھی حکم تھا کہ سود نہیں لینا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ملعون اور مغضوب ہونے کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے: ''وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ'' (سورۂ نساء: ۱۶۱) اُن کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو روک دیا گیا تھا کہ سود نہیں لینا، اس سے معلوم ہو گیا کہ کتب سابقہ میں بھی یہ لفظ معروف تھا، اس لیے لوگوں کے اندر یہ مروج تھا، لوگ اس کے مطابق معاملات کرتے تھے، اس کے مفہوم میں کوئی خفاء نہیں تھا۔ اُس وقت ربا کی صورت تھی قرض دے کر زیادہ لینے کی شرط ٹھہرانا، جیسے ایک آدمی آپ کے پاس آ گیا، وہ آپ سے دس روپے ایک مہینے کے لئے لیتا ہے، تو آپ کہتے ہیں کہ ایک مہینے کے لئے میں آپ کو دس روپے دیتا ہوں، لیکن ایک مہینے کے بعد گیارہ روپے واپس لوں گا، یہ سود اُس وقت جاہلیت کے زمانے میں مروج تھا، قرض دے کر اس کے اوپر زیادتی کی شرط ٹھہرانا۔ پھر اگر اُس میعاد پر اُس کو وہ ادا نہ کرتا تو اُس سود کو اصل رقم میں شامل کر کے آگے سود اور بڑھا دیتے، کہ اب اگر آپ وقت پر نہیں دے سکے تو میں آئندہ مہینے میں دو روپے اور لوں گا، اب گیارہ کی بجائے اگلا مہینہ ختم ہو جائے گا تو تیرہ روپے لے لیں گے، اگر اگلے مہینے بھی نہ ہو سکا تو پھر کہتے کہ اچھا! اگر اس مہینے بھی تم

نہیں دے سکے تو آئندہ مہینہ اور رکھ لو، اب آئندہ مہینے کے میں تین لوں گا، تو تیرہ کے اوپر تین اور شامل ہو کر اگلے مہینے میں سولہ ہو جاتے، اس طرح محتاج کے احتیاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سود کئی کئی گنا ہو جاتا، بلکہ اصل رقم کے مقابلے میں بھی بڑھ جاتا، جیسے کہ ہندوستان میں مہاجنوں میں بھی یہی طریقہ تھا، جس کو سود در سود کہتے ہیں، کہ سودی رقم کو اصل رقم میں شامل کر کے اوپر مزید نفع لگا دیا، جس کے نتیجے میں سود کی رقم اصل سے بڑھ جاتی ہے، اسی کو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے ساتھ تعبیر کیا ہے، یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آلِ عمران: ۱۳۰) اے ایمان والو! سود نہ کھایا کرو کئی کئی گنا زیادہ، کیونکہ اُس وقت واقعہ یہی تھا کہ سود کئی کئی گنا ہو جاتا تھا، بلکہ بسا اوقات اصل کے مقابلے میں بھی بڑھ جاتا تھا۔ یہ سود اُس وقت مروج تھا جس کے اوپر قرآنِ کریم کی طرف سے صراحتاً نہی آ گئی کہ یہ صورت تمہارے لئے جائز نہیں، کہ کسی کو تم قرضہ دو، نقدی دو، اور وقت متعین کر کے اُس کے اُوپر کوئی اضافہ لو، کیونکہ یہ جو آپ اضافہ لیں گے یہ بلاعوض ہے، مثلاً دس روپے جو آپ نے دیے وہ ویسے کے ویسے آپ کو مل گئے، اور اس کے اوپر جو ایک روپیہ آپ زائد لے رہے ہیں یہ کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی اصطلاح میں رِبا کا مفہوم یہی ہے زیادت بلاعوض، کہ نقد دے کر اُس پر زیادتی بلاعوض لینا، اور یہی مروج تھا، اور اسی کے اوپر صراحتاً قرآنِ کریم میں انکار کیا گیا ہے۔

مزید چھ چیزوں میں سُود حدیث کی روشنی میں

اِس کے علاوہ بعض صورتیں جن کا جاہلیت کے زمانے میں رواج تھا لیکن لوگوں کا ذہن لفظِ رِبا سے اِدھر منتقل نہیں ہوتا تھا، سرورِ کائنات ﷺ نے رِبا کے مفہوم میں اُن کا اضافہ فرما دیا، کہ اِس کو صرف نقد اور قرض کے ساتھ ہی خاص نہ رکھا، بلکہ فرما دیا کہ ''اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ يَدًا بِيَدٍ فَمَنْ زَادَ اَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ اَرْبٰى ''[1] کہ سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور، نمک، اِن چھ چیزوں کا تبادلہ جب بھی کرو برابر سرابر کرو اور نقد بنقد کرو، اگر ایک طرف سے زیادہ ہو جائے گا اور ایک طرف سے کم ہو گا تو یہ بھی سود میں شامل ہے۔ اسی لیے جو بیوع جاہلیت میں مروّج تھیں اور ان کی طرف رِبا ہونے کا اور سود ہونے کا ذہن نہیں جاتا تھا، جیسے محاقلہ اور مزابنہ، مزابنہ یہ ہے کہ کھجوریں درختوں پر لگی ہوئی ہوتیں، ایک شخص جاتا اور کہتا کہ مجھ سے یہ دس صاع خشک کھجوریں لے لو اور یہ درخت والی کھجوریں مجھے دے دو، چاہے اوپر کھجوریں کم ہیں چاہے زیادہ ہیں، زیادہ ہوں گی تو میرا نفع، کم ہوں گی تو میرا نقصان، ''اِنْ زَادَ فَلِيْ وَاِنْ نَقَصَ فَعَلَيَّ ''[2] اس طرح سے خشک کھجوریں دے کر درخت خرید لیتے، اِس میں بھی کمی بیشی کا امکان تھا۔ اور محاقلہ یہ ہے کہ کھڑے کھیت کو غلہ دے کر خرید لیتے، مثلاً گندم کا کھیت ہے، بیس من گندم دے دی اور کہہ دیا کہ یہ کھیت میرا ہے، چاہے کم ہو چاہے زیادہ ہو، تو یہ بیوع کی قسمیں چلتی تھیں، سرورِ کائنات ﷺ نے اِن سے بھی روک دیا۔ چھ چیزوں کا ذکر تو صراحتاً آ گیا، کہ مقابلہ کرتے وقت اِن کو برابری کے ساتھ کرنا

---

(۱) مسلم ۲/ ۲۵، باب الصرف۔ مشکوۃ ۱/ ۲۴۴، باب الربا، فصل اول

(۲) بخاری ۱/ ۲۵۰، کتاب البیوع، باب بیع الزبیب بالزبیب

ہے، اوران میں نسیہ یعنی ادھار کی کیفیت بھی پیدا نہیں کرنی، نقد بنقد ہو اور برابر سرابر ہو، اس طرح ان کو بیچ سکتے ہو، ان میں کمی بیشی سود ہے، یوں سرورِ کائنات ﷺ نے تعمیم فرمادی۔

کیا قرآن میں مذکور رِبا غیر واضح ہے؟

اب آگے کچھ وضاحت باقی رہ گئی جو سرورِ کائنات ﷺ نے صراحتاً بیان نہیں فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ دُنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے لئے آپ ﷺ نے ابوابِ ربا کو واضح کر کے بیان نہ فرمایا،[1] ہمارے لئے اشتباہ باقی رہ گیا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ حضور ﷺ اس کی تفصیل بیان فرما دیتے، اُس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآنِ کریم میں جو رِبا کا لفظ آیا ہوا ہے اِس کے مفہوم میں کوئی اشتباہ باقی رہ گیا، یہ تو صاف ستھری بات ہے، عرب کے ماحول میں جو رِبا مروّج تھا قرآنِ کریم کا لفظ اُسی مفہوم پر محمول ہے، وہ تو قطعی طور پر حرام ہے، اس میں تو شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں، کہ کسی کو نقد رقم دے کر زیادہ لی جائے، مدّت متعین کر کے اُس کے اوپر نفع لیا جائے، اِس میں تو کوئی اشتباہ نہیں اور اِس میں کوئی اجمال یا ابہام باقی نہیں ہے۔

سُود کی دیگر مستنبط صورتیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا تعلق اِس بات کے ساتھ ہے کہ یہ چھ چیزیں جو حضور ﷺ نے بیان فرمائیں، کیا یہی چھ مقصود ہیں یا بعض دوسری چیزیں بھی اِن کے حکم میں داخل کی جاسکتی ہیں؟ اور آئندہ جا کر فقہاء کے اختلاف کا یہی منشاء بنا، کہ فقہاء اِدھر گئے ہیں کہ یہ چھ ہی مقصود نہیں بلکہ اِس میں سے علت کا استنباط کر کے ہر فقیہ نے اپنی اپنی جگہ اِس کی تعمیم کی ہے، اور یہ جو تعمیم اجتہادی ہوئی ہے یہی وہ اشتباہ کی صورتیں ہیں جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ ہمارے سامنے اِن کی تفصیل نہیں آئی۔ یہ صورتیں فی حکم الربا ہو جائیں گی، قطعی حرام وہی رہے گا جو قرآنِ کریم کے زمانے میں مروّج تھا، اور یہ چھ چیزیں بھی قطعیت میں آئیں گی، کیونکہ ان کے اُوپر اجماع ہے، ان میں تو کوئی اجتہاد کی گنجائش نہیں، یہ چھ بھی قطعی طور پر ربا میں آگئیں، اِن کے علاوہ باقی جو فقہاء کے اجتہاد کے طور پر علت کی تعمیم کے ساتھ ثابت ہوں گی وہ صورتیں اشتباہ کی ہیں، اس لیے اُن کو ہم فی حکم الربا رکھیں گے، اور قطعی حرام تو اُن کو قرار نہیں دیں گے، لیکن بہرحال وہ بھی فقہاء کے بیان کرنے کے ساتھ حرام ہیں، اس لیے بعض چیزوں کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ وہ چیز بھی اِس ربا کے حکم میں آتی ہے یا نہیں آتی۔ مثال کے طور پر چاول بالاتفاق ائمہ اَربعہ کے نزدیک ربا میں داخل ہیں، ان کا حکم وہی ہے جو گندم والا ہے، لیکن چونہ قلعی وغیرہ جو کھانے میں شامل نہیں اور سونے چاندی کا بھی مصداق نہیں، مثلاً ایک وقت آپ کے پاس ضرورت مند آتا ہے، کہتا ہے کہ سیمنٹ کی ایک بوری دے دو، اور آپ کہتے ہیں کہ لے جاؤ لیکن پندرہ دن کے بعد دو بوریاں لوں گا، تو یہ بھی حکمِ ربا میں آتی ہیں یا نہیں؟ احناف کے نزدیک آتی ہیں، کیونکہ انہوں نے اِن چھ چیزوں سے استنباط کر کے اِن کی علت نکالی اتحادِ جنس وقدر، اور وہ چونے اور قلعی پر بھی صادق آتا ہے، اور

(۱) ابن ماجہ ۱ر ۱۶۴۔مشکوۃ ۱ر ۲۴۶، باب الربا. ولفظہ: اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا ...... نیز بخاری ۲ر ۸۴۳، اور مسلم ۲ر ۴۲۲، پر حضرت عمر کا فرمان ہے: ثَلَاثٌ وَدِدْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ لَمْ يُفَارِقْنَا حَتّٰى يَعْهَدَ اِلَيْنَا عَهْدًا اَلْجَدُّ وَالْكَلَالَةُ وَاَبْوَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الرِّبَا.

دوسرے ائمہ کے نزدیک یا سونا چاندی ہو یا کھانے کی چیز ہو، کیونکہ باقی چار چیزیں جو شمار کی گئی ہیں کھجور، نمک، جَو، گندم، یہ کھانے کی چیزیں ہیں، ان میں غیر ماکول چیز کوئی نہیں نقل کی گئی، اس لیے نقدین کے علاوہ باقی چیزوں میں سود وہاں حرام ہوگا جہاں وہ چیز ماکولات میں سے ہوگی، اقتیات یعنی خوراک میں سے ہوگی، جن کو قُوت بنایا جاتا ہے، اور جو چیز قُوت میں نہیں آتی، جیسے لوہا، تانبا، چونا، قلعی، جو چیز ماکولات میں شامل نہیں ہے اگرچہ ہے وہ کیلی یا وزنی، احناف کے نزدیک یہ حرام ہوگی، یہ فی حکم الربا ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک یہ حرام نہیں ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک یا نقدین اور یا وہ چیزیں جو خوراک میں آتی ہیں اور ذخیرہ کر کے رکھی جاسکتی ہیں۔ تو ان جزئیات میں اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا تعلق انہی جزئیات کے ساتھ ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ صراحتاً بیان فرما دیتے تو بڑی اچھی بات تھی، ہمارے سامنے یہ ابواب کچھ مشتبہ رہ گئے۔

اور حضرت عمرؓ کے یہ کہنے کی کیا وجہ تھی؟ کہ قرآنِ کریم کی آیات میں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں سُود پر انتہائی شدت آئی ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ صرف رِبا کے مسئلے میں آیا ہے، کہ اگر باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان سن لو، اور حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اُوپر انتہائی سختی بیان فرمائی، یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی شخص رِبا کا ایک درہم کھاتا ہے تو یہ چھتیس دفعہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے، بلکہ یوں فرمایا کہ سود کے ستر درجے ہیں، یعنی یوں سمجھو کہ سود کا جتنا گناہ ہے اُس کا سترواں حصہ یعنی اُس کا نچلواں حصہ، اُس کو اگر آپ لے لیں تو ایسے ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے،(1) اور کامل درجے کا سود تو یوں سمجھو کہ وہ ستر دفعہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ٹھہرا دیا گیا۔ قرآن وحدیث میں اتنا کسی بارے میں شدت نہیں آئی جتنا سود کے بارے میں آئی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جب اِس میں اتنی شدت ہے تو پھر دل دھڑکتا ہے کہ بعض ایسی صورتیں جن کے بارے میں اشتباہ پیدا ہو گیا کہ یہ سود میں شامل ہیں یا نہیں، تو ایک مؤمن یہ چاہتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی بیان فرما دیتے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم اِس کو سمجھیں کہ یہ سود نہیں ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی سود میں شامل ہو، اور ہم بھی رگڑے میں آجائیں، یہ بات بیان کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں حقیقتاً رِبا ہے اُس کو بھی چھوڑ دو، اور جس میں شبہ پیدا ہو جائے اُس کو بھی چھوڑ دو،(2) احتیاط کا تقاضا یہ ہے۔ اس لئے ہماری فقہ کا مدار اِسی بات پر ہے، حقیقتاً سود وہاں ہوگا جہاں اتحادِ جنس اور قدر ہو گی، ہم اس کو حقیقتاً سود قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں، اور سود کا شبہ وہاں پایا جاتا ہے جہاں ان میں سے ایک چیز پائی جائے، دونوں نہ ہوں، اس لئے ہم کہتے ہیں اُس کو بھی چھوڑ دو۔ مثلاً صرف قدر ہو یا صرف اتحاد ہو، وہاں بھی تفاضل کو چھوڑ دیا جاتا ہے، اشتباہ پیدا ہو جانے کی صورت میں بھی اُس کو ترک کر دیا جاتا ہے، احتیاط کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ اس بارے میں قرآن اور حدیث کے اندر شدت بہت زیادہ آئی ہے۔

---

(1) دونوں احادیث مشکوٰۃ ۲۴۶/۱، باب الربا فصل ثالث پر ملاحظہ فرمائیں۔

(2) إِنَّ اٰخِرَ مَا نَزَلَتْ اٰيَةُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ ابن ماجہ ۱/ ۱۶۴- مشکوٰۃ ۲۴۶/۱ باب الربا۔

سودی نظام کی خرابیاں

اور آج دنیا کو اِس شدت کی حکمت کا احساس ہوگیا، کہ آج سودی نظام کا ہی نتیجہ ہے کہ ساری دنیا جنگ کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے، اِن سود خوروں کے طرزِ عمل کے ردِعمل کے طور پر سوشلزم اور کمیونزم کے فتنے دنیا کے اندر جو اٹھے ہیں اور دنیا کے اندر آج جتنا بھی فتنہ وفساد اور لڑائیاں ہیں وہ ساری کی ساری اِسی سودی نظام کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں، کہ اِس نظام سے بعض طرف مال بے انتہاء اکٹھا ہونا شروع ہوگیا، اور لوگ ضرورت سے زیادہ سرمایہ دار ہونا شروع ہوگئے، اور دوسری طرف جو قومی سطح پر سود ادا کرنے والی قومیں تھیں وہ انتہائی درجے کی مفلس ہوتی چلی گئیں، اور اِس افراط وتفریط کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ جدال اور فساد جتنا ہے آپ کے سامنے آگیا، تو سودی نظام نے ساری کی ساری دنیا کو بے چینی، پریشانی، لڑائی، اور جنگ وجدال میں مبتلا کررکھا ہے۔ آج سودخوری سرمایہ داروں میں انتہاء کو پہنچ گئی ہے، اور پچھلے زمانے میں چونکہ اتنے وسیع پیمانے پر سودخوری نہیں ہوتی تھی، ایک آدمی محلے کے مال کو کھینچ لیتا، یا چار آدمی مل کر شہر کے مال کو کھینچ لیتے، اتنی وسیع پیمانے پر نہ تجارت تھی نہ لین دین تھا، اب تو بڑے شہروں میں بیٹھے ہوئے ہیں، کمپنیاں بنی ہوئی ہیں، اور دنیا کے کناروں سے مال سمٹ سمٹ کر اُن کی طرف آرہا ہے، جس طرح پاکستان اب انتہائی مقروض ہے، اور یہ کروڑہا روپیہ سالانہ سود ادا کرتا ہے، بغیر کسی محنت اور مشقت کے اُن کو کروڑوں روپے سالانہ پہنچ جاتے ہیں، اور دوسری طرف قومیں کی قومیں فقر وفاقہ میں مبتلا ہورہی ہیں، جس کے نتیجے میں افراط وتفریط ہوگئی، اور افراط وتفریط کی وجہ سے پھر آپس میں لڑائیاں ہوگئیں۔ تو قرآن اور حدیث نے اِس پر جو شدت ڈالی ہے اور اِس کی سختی کے ساتھ ممانعت جو کی ہے اب عالمی طور پر اِس کی حکمت لوگوں کے سامنے آرہی ہے کہ واقعی مالیات کا نظام جو افراط وتفریط کی طرف چلا جاتا ہے اِس میں بنیادی حیثیت اِس سود کو حاصل ہے۔ تو رِبا کا مفہوم بھی متعین ہوگیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اِس قول کی وجہ بھی سامنے آگئی، اور اِس کا مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے آگیا کہ کون کون سی چیزیں اِس میں آتی ہیں اور کون کون سی چیزیں نہیں آتیں۔ ’’جو لوگ رِبا کھاتے ہیں، سود لیتے ہیں، نہیں اٹھیں گے مگر جیسے کہ اٹھتا ہے وہ شخص جس کو خبطی بنادیا ہو جن نے لپٹ کر‘‘ جن کسی کو لگ جائے تو وہ بدحواس سا ہوجاتا ہے، اور ہذیان، بکواس اور بیہودہ بولنا اُس میں بہت زیادہ ہوتا ہے، ایسے ہی یہ سودخور قیامت کے دن قبروں سے جب اٹھیں گے تو اِن کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوگی جیسے پاگل اور مجنون ہوتے ہیں۔

حرمتِ رِبا پر مشرکین کا اِعتراض اور اِس کا جواب

اور یہ اِس وجہ سے کہ اُنہوں نے بات ہی بڑی بے عقلی کی کہی تھی، یعنی دنیا کے اندر بے عقلی کا مظاہرہ کرتے رہے، وہ کہتے تھے کہ بیع بھی تو رِبا کی طرح ہے، یعنی اگر رِبا کو حرام کہتے ہو تو پھر بیع کو بھی حرام کہو، کیونکہ خرید وفروخت جو بھی ہوتی ہے آخر نفع کے لئے ہی ہوتی ہے، اور رِبا میں بھی اگر ایک آدمی نفع لیتا ہے تو پھر اِس میں کون سی حرمت کی بات ہے؟ یعنی بیع تو حلال ہے اور رِبا حرام ہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ رِبا کو حرام کہنے کی وجہ کوئی نہیں، اگر رِبا حرام ہے تو بیع کو بھی حرام کہو، یوں نہیں کہتے تھے کہ بیع حلال

ہے تو ربا کو حلال کہو، بلکہ وہ کہتے تھے کہ اگر ربا کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔ اللہ تعالیٰ نے آگے جواب دیا کہ دونوں برابر نہیں، بیع کو اللہ نے حلال ٹھہرایا، ربا کو اللہ نے حرام ٹھہرایا، جب اللہ احکم الحاکمین ہے، ایک چیز کو وہ حلال ٹھہراتا ہے اور ایک کو حرام ٹھہراتا ہے، تو اُس کے بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس طرح سے مقابلے میں استہزاء اڑائیں۔ اب معلوم ہو گیا کہ لوگوں کی نظر میں بیع کا مفہوم بھی متعین تھا اور ربا کا مفہوم بھی متعین تھا، یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ربا کی حقیقت کیا ہے اور بیع کی حقیقت کیا ہے، قرآنِ کریم جس زبان میں اترا اور جس ماحول میں اترا وہ سب لوگ جانتے تھے کہ بیع کا مصداق یہ ہے اور ربا کا مصداق یہ ہے، ایک مالی معاملہ تھا اُس کو وہ ربا کہتے تھے، اور اِس کے علاوہ جو اجناس کا تبادلہ ہوتا تھا جنس کے ساتھ، یا پیسوں کا جنس کے ساتھ، اُس کو وہ بیع کہتے تھے۔ ایک وقت میں آپ دس روپے کی گندم بیچتے ہیں، اور دوسرے وقت میں وہی گندم آپ کو پندرہ روپے کی خریدنی پڑ جاتی ہے، اِس میں کوئی سود نہیں، کیونکہ گندم کی طرف احتیاج، اس کی ضرورت، اور اِس کا اندازہ جو مالیت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اِس کا کوئی معیار نہیں ہے، اگر یہ چیز وافر مقدار میں موجود ہو اور خریدار کم ہوں تو اِس کی مالیت گر جاتی ہے، اگر کم مقدار میں موجود ہو اور طالب زیادہ ہوں تو اِس کی مالیت بڑھ جاتی ہے، اس کی مالیت کا اندازہ حالات کے تقاضے سے ہوتا ہے، اور روپے کی مالیت تو متعین ہے، اِس میں تو نہ کمی نہ بیشی، ایسے وقت میں اگر ایک روپیہ دے کر کوئی ایک آنہ بھی زائد لیتا ہے تو وہ آنہ نفع میں آیا اور یہ بغیر کسی معاوضے کے زیادتی ہے، بخلاف اِس کے کہ جب اجناس کا تبادلہ اجناس سے ہوتا ہے یا نقد کا تبادلہ اجناس سے ہوتا ہے، یہاں مالیت کا اندازہ کہ یہ کتنی مالیت کی ہے، یہ حالات کے تحت ہوتا ہے، اس لئے بڑھتے بھی رہتے ہیں اور گھٹتے بھی رہتے ہیں، سونا چاندی میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، سونا چاندی جیسے دیا ہے ویسے کا ویسا واپس آجائے گا، اُس کی بات حالات کے تحت نہیں ہوتی، اِس لیے بیع حلال ہے اور ربا حرام ہے۔

''جس شخص کے پاس نصیحت آگئی اُس کے رَبّ کی طرف سے پھر وہ رک گیا''، فَلَهٗ مَا سَلَفَ: وہ پہلے جو لے چکا وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا، یعنی جاہلیت کے زمانے میں جو اُس نے سود اکٹھا کر لیا وہ اُسی کا ہی ہے، وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا۔ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ: اور اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر دل سے تائب ہوا ہے تو آخرت میں بھی اِس کا گناہ معاف ہے اور گرفت نہیں ہوگی، اور اگر اُوپر اُوپر سے اِس نے قانون کو قبول کر لیا، لیکن اس کا دل صاف نہیں ہے تو اللہ کے حوالے، تمہیں اس سے بحث نہیں کہ یہ دل سے تائب ہوا ہے یا نہیں۔ اور جو دوبارہ اس قول وفعل کی طرف لوٹے گا، یعنی سود لے گا یا سود کو بیع کی طرح حلال جانے گا یہ لوگ جہنم والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ خلود تب ہوگا جب کفریہ قول صادر ہوگا، اور جہنم میں جانا صرف عملِ حرام کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی سود لیں گے تو جہنم والے ہیں، اور اس کو بیع کی طرح حلال قرار دیں گے تو جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

سُود کے نقصانات اور صدقات کے فوائد

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے''، یہ واقعہ ہے کہ سودی نظام آخر مخلوق کے لئے تنگی کا باعث بن

جاتا ہے، یہ ایسے ہے جیسے ایک آدمی کے بدن پر ورم آجائے، بظاہر وہ موٹا ہوتا ہوا نظر آئے گا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی قوت نہیں ہے، یعنی سود خور جو بظاہر آپ کو سرمایہ دار بنتا نظر آتا ہے یہ سرمائے کا اکٹھا ہونا غیر فطری ہے، یہ ایسے ہے جیسے بدن کے اُوپر موٹاپا حقیقتاً قوت کے اعتبار سے تو نہ آئے، ویسے ورم ہو جائے، اُس کے لئے بھی نتیجۃً یہ نقصان دِہ ہے، دنیا اور آخرت میں اس کی نحوستیں بڑھتی ہیں، معاشرے میں انسان مبغوض ہو جاتا ہے، اُس کے دشمن زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں، مال کی حرص زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے مال سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، یوں سمجھو کہ اُس کے حق میں مال کم ہی ہے چاہے بظاہر اُس کے پاس زیادہ ہی جمع کیوں نہ ہوتا چلا جائے۔ اور صدقات کو اللہ بڑھاتا ہے، کہ مال سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دیتا ہے، برکات نصیب ہوتی ہیں، جو صدقہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں معاشرے میں محبوب بن جاتے ہیں، لوگ اُن کے ساتھ محبت کرتے ہیں، ان کو عزت راحت اور سکون نصیب ہوتا ہے، جو کہ مال سے اصل مقصود ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ محلے میں اگر ایک آدمی سود خور ہو تو سارا معاشرہ اُس سے نفرت کرے گا، اس لیے اُس کو حقیقتاً عزت حاصل نہیں ہوتی، پھر جب دشمنیاں نمایاں ہوتی ہیں تو ہر وقت اُس کا دل بھی دھڑکتا ہے، اور پھر مال کا حرص اُس میں اتنا آجاتا ہے کہ اپنے مال سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے خود بھی وہ پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے اردگرد والوں کو بھی پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور جو صدقہ خیرات کا عادی ہوتا ہے لوگوں کے دلوں میں اُس کی محبت ہوگی اور عزت ہوگی، اور جب وہ اردگرد سب محبت کرنے والوں کو دیکھے گا تو اُس کو بھی راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے، اور مال کی محبت اُس کے دل میں نہیں ہوگی تو خود بھی مال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے، اس طرح سے دنیا اور آخرت میں یہ مال اُس کے لئے برکت کا باعث بن جاتا ہے۔ اور ملکی سطح پر اور دنیا کی سطح پر بھی بات اسی طرح ہے کہ سودی معاملہ مخلوقِ خدا کو تنگی میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے، اور صدقہ وخیرات کا جذبہ مخلوقِ خدا کو راحت میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جیسے مال بٹے گا اور تقسیم ہوگا تو یوں معلوم ہوگا جیسے ساری دنیا ہی مالدار ہے اور راحت سے وقت گزار رہی ہے، اور جب ایک طرف یہ اکٹھا ہونا شروع ہو جائیگا تو ایسے معلوم ہوگا جیسے ساری دنیا ہی بھوک کی ماری اور کنگال ہے۔ تو شخصی طور پر بھی اسی طرح ہے کہ سود خور مال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اُس کا راحت سکون ختم ہو جاتا ہے، اور عالمی سطح پر بھی ایسے ہی ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا کسی کافر کو گنہگار کو'' گنہگار: جو عملاً سود لینے والے ہیں، اور کافر: جو سود کو حلال قرار دینے والے ہیں۔ اور کَفَّار کا معنی ناشکرا بھی کر سکتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو مال کی نعمت دی، اور وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا کہ مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچائے، بلکہ الٹا مخلوقِ خدا کے لئے وبال بنتا ہے۔

آگے سود خوروں کے مقابلے میں نیکوں کا ذکر آ گیا ''بیشک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں اُن کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رَبّ کے پاس، اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔''

سُود کی قانونی حُرمت اور سُود خوروں کے لئے وعید

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو'' یعنی جاہلیت کے زمانے میں اگر لوگوں کے ساتھ تمہارے

سودی معاملات چلتے تھے اور آج تم نے وہ وصول کرنا ہے تو تم چھوڑ دو، یہ گویا قانونی درجے میں اس کی حرمت نافذ ہوگئی، اس لیے اگر کسی مسلمان نے کافر سے قرض لیا ہوا ہے اور وہ کافر آئین اسلام کے تحت آ گئے، جیسے واقعہ بھی پیش آیا تھا، تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو منع کر دیا کہ سود نہیں دینا، اور جو ماتحت کافر تھے اُنہیں کہہ دیا کہ تمہیں بھی لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس میں اُن کو یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ اسلام نے کافروں کا حق مارا اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا، لیکن سرورِ کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جب یہ اعلان فرمایا کہ سود کا لین دین بند ہے، تو اُس میں ساتھ ہی یہ کہا کہ سب سے پہلا سود جو میں معاف کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں وہ میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے،[1] کہ جس جس سے اُس نے لینا ہے قطعاً نہیں لیا جائے گا، وہ سب کو معاف ہے۔ اپنی طرف سے معافی کا اعلان پہلے کیا ہے، اس لیے مسلمانوں پر بھی پابندی لگائی کہ جو تم نے لینا ہے وہ لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح اپنے ماتحت جو کافر موجود تھے انہیں بھی کہہ دیا کہ تم نے اگر کسی مسلمان سے سود لینا ہے تو وہ بھی لینے کی اجازت نہیں ہے، گویا کہ مملکت اسلامیہ کے اندر قانونی پابندی لگ گئی، اس لیے کوئی ذمی بھی کسی دوسرے کے ساتھ سودی کاروبار نہیں کر سکتا، یہ قانون سب کے لئے عام ہے، یہ نہیں کہ کافر کافر رہتا ہوا مملکت اسلامیہ میں یہ معاملہ کر سکتا ہے، بلکہ یہ قانونی پابندی ہے، مملکت اسلامیہ میں رہتا ہوا کوئی کافر بھی سودی کاروبار کا مجاز نہیں ہے۔

''اگر تم نے ایسا نہ کیا'' یعنی آئندہ ایسا نہیں کرو گے تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان سن لو، اگر ایسے باز نہیں آؤ گے تو پھر مار پٹائی ہوگی، لڑائی کا یہی معنی ہے، اگر کوئی جتھا اکٹھا ہو جائے اور کہے کہ ہم تو سود لیں گے، اگر مسلمان ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود سود چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو باغی ہیں، جس طرح باغیوں کے ساتھ لڑا جاتا ہے اور اُن کو قتل کیا جاتا ہے اِن کے ساتھ بھی ایسے ہوگا۔ اور اگر وہ حلال ہی کہنے لگ جائیں تو مرتد ہیں، تو بھی مملکت اسلامیہ میں نہیں رہ سکتے، ایک آدھ آدمی ہو تو اُس کو تو ویسے ہی ڈنڈے سے صاف کر لیا جائے گا، فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کے اندر یہ ساری صورتیں شامل ہیں، کہ اگر کوئی جتھا اکٹھا ہو گیا اور وہ اس کو حلال قرار دینے لگ گئے تو اُن کے ساتھ مرتدوں جیسا معاملہ ہوگا، اور اگر وہ حرام تو سمجھتے ہیں لیکن عملاً چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو اُن کے ساتھ باغیوں جیسا معاملہ ہوگا، مار مار کے ان کو سیدھا کر لیا جائے گا۔ ''اور اگر تم توبہ کر لو گے'' فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ: تو تمہیں تمہارے اصل مال مل جائیں گے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر توبہ نہیں کرو گے تو اصل بھی ضبط ہو جائے گا، کیونکہ مرتد ہونے کی صورت میں بھی مال چھین لیا جاتا ہے، باغی ہونے کی صورت میں بھی مال چھین لیا جاتا ہے، اصل مال تمہیں تب ملیں گے اگر اِس قانون کو قبول کرو اور پچھلے سے توبہ کرو، ورنہ وہ بھی ضبط کر لیے جائیں گے۔ لیکن اب یہ خیال نہ کرنا کہ جب سود نہیں لینا تو ہم نے مفت دوسرے کے پاس پیسے کیوں چھوڑے ہوئے ہیں، کہ اگر کوئی تنگدست ہو تو تم اُس کو تنگ کرنا شروع کر دو، ایسی بات نہیں، ''اگر تمہارا مدیون تنگدستی والا ہے تو مہلت دینا ہے میسرہ تک'' یعنی اُس کو تنگ نہ کرو بلکہ اُس کو کشادگی تک مہلت دو، ''اور صدقہ کر دینا تمہارا بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو''۔ ''ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے'' یہ قانونِ شریعت میں ایک خاص بات ہے کہ اللہ تعالیٰ قانون نافذ کرتا ہے تو آگے پیچھے اس قسم کے جذبات اُبھارتا ہے جن کے ساتھ

(۱) مسلم ج ۱ص ۳۹۷ باب حجۃ النبی ﷺ / مشکوٰۃ ج ۱ص ۲۲۵ باب قصۃ حجۃ الوداع فصل اول۔

اُس قانون کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اللہ کی یاد دہانی کی جاتی ہے، آخرت کی یاد دہانی اور اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، جس کی بناء پر اُس قانون کا قبول کرنا اور عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے،''ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اس نے کیا ہے، اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے''۔ شریعت میں دو ہی گناہ ہیں جن پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ کا ذکر آیا ہے، ایک کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے یعنی سود کا نہ چھوڑنا، اور ایک کا ذکر حدیث شریف میں ہے: ''مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ''[1] جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اُس کو جنگ کا اعلان ہے، اور علماء یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جس گناہ پر جنگ کا اعلان ہو گیا اس کے ارتکاب کے بعد سلبِ ایمان کا خطرہ ہے، کیونکہ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ لڑتا ہے تو اُس کی قیمتی سے قیمتی چیز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں ہے، جس کی بناء پر اندیشہ ہے کہ ایسے شخص کا ایمان ہی سلب نہ ہو جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ

اے ایمان والو! جب تم آپس میں کوئی ادھار کا معاملہ کرو کسی وقتِ معین تک تو اسے لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ لکھے

بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ

تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ، اور نہ انکار کرے کاتب لکھنے سے، جیسے کہ اللہ نے اسے تعلیم دی ہے اسے لکھ دینا چاہیے،

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ

اور چاہیے کہ لکھوائے وہ شخص جس کے ذمے حق ہے، اور چاہیے کہ وہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اُس کا رب ہے، اور نہ گھٹائے

مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ

اُس حق میں سے کسی چیز کو، پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق ہے نادان ہو یا ضعیف البدن ہو یا وہ طاقت نہیں رکھتا

اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ

لکھوانے کی تو چاہیے کہ لکھوائے اس کا ولی عدل کے ساتھ، اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں میں سے، اور اگر

(۱) بخاری ۲/ ۹۶۳، باب التواضع۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۷، باب ذکر اللہ۔ فصل اول۔

لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

وہ دو گواہ مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں اُن میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو بوجہ بھول جانے اُن دونوں عورتوں میں سے

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ

کسی ایک کے پھر یاد دلا دینے اُن دونوں میں سے ایک کے دوسری کو، اور گواہ انکار نہ کیا کریں جب اُن کو بلایا جائے

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ

اور اکتایا نہ کرو اس معاملے کو لکھنے سے، چھوٹا ہو یا بڑا، اُس کی مدت تک، یہ لکھنا زیادہ انصاف کا باعث ہے

عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ

اللہ کے نزدیک، اور زیادہ درست رکھنے والا ہے گواہی کو، اور زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے مگر

اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ

یہ کہ وہ تجارت نقد تجارت ہو جس کو تم لیتے دیتے ہو آپس میں، پس تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اس کو نہ لکھو،

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ

اور گواہ بنالیا کرو جب تم آپس میں خرید و فروخت کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچائے لکھنے والا اور گواہ، اگر تم ایسا کرو گے تو یہ گناہ ہے

بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَ

جو چمٹنے والا ہے تمہارے ساتھ، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ﴿۲۸۲﴾ اور

اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ

اگر تم سفر پر ہو اور نہ پاؤ تم لکھنے والے کو تو قبضے میں دی ہوئی مرہونہ اشیاء (وثوق کا باعث ہیں)، پھر اگر اعتبار کرلے

بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ

تم میں سے بعض بعض کا تو چاہیے کہ ادا کر دے وہ شخص جس کا اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو، اور چاہیے کہ ڈرے اللہ سے

رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

جو اس کا رب ہے، اور گواہی کو چھپایا نہ کرو، اور جو گواہی کو چھپائے گا تو بیشک اُس کا دل گناہ گار ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے

تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ

عملوں کا علم رکھنے والا ہے ﴿۲۸۳﴾ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اگر ظاہر کرو گے تم اُس بات کو جو

اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

تمہارے دلوں میں ہے یا اُس کو چھپاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا محاسبہ کرے گا اُس کے ذریعے سے، پھر بخش دے گا جس کو چاہے گا،

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ

اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۸۴﴾ ایمان لے آیا

الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ

رسول اُس چیز پر جو اُتاری گئی اُس کی طرف اُس کے رب کی جانب سے، اور ایمان لے آئے مؤمن، ہر کوئی ایمان لے آیا

بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر (یہ کہتے ہوئے کہ) ہم فرق نہیں ڈالتے ان رسولوں میں

مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا

میں سے کسی کے درمیان، اور ان سب نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور قبول کر لیا، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار!

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا

اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے ﴿۲۸۵﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اس کی وسعت کے مطابق، اُس نفس کے لئے ہے جو کچھ

كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ

اُس نے کمایا، اور اُسی پر ہی پڑے گا جو کچھ اُس نے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے مواخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا

اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي

ہم چوک جائیں، اے ہمارے پروردگار! اور نہ لاد ہم پر مشکل احکام جیسا کہ لاد دیے تھے تو نے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪

اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم سے نہ اٹھوا ایسی چیز جس کی ہمیں طاقت نہیں، اور ہم سے درگزر کر جا،

وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

اور ہمیں بخش دے، اور ہمارے اوپر رحم کر دے، تو ہمارا کارساز ہے، پس تو ہماری مدد کر کافر لوگوں کے خلاف ﴿۲۸۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ: اے ایمان والو! جب تم آپس میں کوئی دَین کا معاملہ کرو کسی وقتِ معین تک، فَاكْتُبُوْهُ: تو اُسے لکھ لیا کرو، وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ: اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ، وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ: کاتب انکار نہ کرے لکھنے سے۔ اَبٰی یَاْبٰی: انکار کرنا۔ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ: جیسے کہ اللہ نے اُسے تعلیم دی ہے فَلْيَكْتُبْ: اُسے لکھ لینا چاہئے، وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ: اور چاہئے کہ لکھوائے وہ شخص جس کے ذمے حق ہے وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ: اور چاہئے کہ وہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اُس کا رب ہے وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا: اور نہ گھٹائے اُس حق سے کسی چیز کو۔ مِنْهُ کی ضمیر حق کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بَخس: کم کرنا، گھٹانا۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا: پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق ہے کم عقل ہو، نادان ہو، اَوْ ضَعِيْفًا: یا ضعیف البدن ہو، جیسے چھوٹا بچہ ہے یا بہت بوڑھا ہے جو بات اچھی طرح سے لکھا اور سمجھا نہیں سکتا، اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ: یا وہ طاقت نہیں رکھتا لکھوانے کی، مثال کے طور پر ضعیف بھی نہیں ہے، سفیہ بھی نہیں ہے، لیکن گونگا ہے، یا کاتب نے جس زبان میں اُس تحریر کو لکھنا ہے یہ مدیون وہ زبان نہیں جانتا، اپنی زبان میں سمجھا نہیں سکتا، فَلْيُمْلِلْ: پس چاہئے کہ لکھوائے اُس کا کارکن فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ: ولی سے ولیٔ امر مراد ہے کارکن، اس کا متولیٔ امور، اس کا وکیل، چاہئے کہ لکھوادے اس کا کارکن، کارگزار، عدل کے ساتھ، انصاف کے ساتھ۔ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ: اور دو گواہ بنالیا کرو مِنْ رِّجَالِكُمْ: اپنے مردوں میں سے فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ: اور اگر وہ دو گواہ مرد نہ ہوں فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ: تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں اُن میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو مِنَ الشُّهَدَآءِ: یہ مَن کا بیان ہے، شہداء میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو اُن میں سے ایک مرد یا دو عورتیں گواہ بنالیا کرو، یا، ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں، اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى: اَنْ تَضِلَّ: لِاَنْ تَضِلَّ بوجہ بھول جانے اُن دونوں عورتوں میں سے کسی ایک کے، پھر یاد دلادے اُن دونوں میں سے ایک کے دوسری کو، اَن مصدریہ ہے، وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ: شہداء شہید کی جمع، گواہ انکار نہ کیا کریں، اِذَا مَا دُعُوْا: جب اُن کو بلایا جائے، وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ: سَئِمَ يَسْئَمُ: اکتانا، اکتایا نہ کرو اُس معاملے کو لکھنے سے، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہٗ ضمیر دَین کی طرف جارہی ہے جو اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ میں آیا تھا، وہ دَین، تداین، جو آپس میں تم نے قرض کا معاملہ کیا ہے، چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کو لکھنے سے اکتایا نہ کرو اس کی مدت تک، یعنی اُس کی مدت تک لکھنے سے اکتایا نہ کرو، یہ لکھنا زیادہ انصاف کا باعث ہے اللہ کے نزدیک، اور زیادہ درست رکھنے والا ہے گواہی کو، اور زیادہ قریب ہے اِس بات کے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے، اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً: تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ: تَكُوْنَ کا اسم ہے اَلتِّجَارَةُ، اور تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ خبر، مگر یہ کہ وہ تجارت کوئی نقد تجارت ہو، یا، اِلَّا اَنْ تکونَ المعاملةُ تجارةً حاضرةً وہ معاملہ نقد تجارت ہو، تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ: جس کو تم

ادل بدل کرتے ہو، لیتے دیتے ہو آپس میں، اَدَارَ یُدِیْرُ: گھمانا، جس کو تم گھماتے ہو یعنی لیتے دیتے ہو آپس میں، فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ: پس تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اُس کو نہ لکھو، وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ: اور گواہ بنالیا کرو جب تم آپس میں خرید وفروخت کرتے ہو، آپس میں بیع کرتے ہو، وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ: لَا یُضَآرَّ معروف کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے اور مجہول کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے، معروف کا ہوگا تو ترجمہ یوں ہوگا کہ کاتب نقصان نہ پہنچائے اور نہ گواہ نقصان پہنچائے، اور مجہول ہوگا تو ترجمہ یوں کریں گے کہ نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والا اور نہ نقصان پہنچایا جائے گواہی دینے والا، بیان القرآن میں ترجمہ مجہول کے ساتھ کیا گیا ہے، اور حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ معروف کے ساتھ کیا ہے۔ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِکُمْ: اگر تم کروگے، یعنی کاتب اور شہید نقصان پہنچائے گا، یا کاتب اور شہید کو نقصان پہنچایا جائے گا، اگر تمہاری طرف سے ایسا واقعہ پیش آیا تو یہ گناہ ہے جو لگا ہوا ہے تمہارے ساتھ، چمٹا ہوا ہے تمہارے ساتھ، فُسُوْقٌ لَازِمٌ بِکُمْ، باء کا متعلق محذوف نکال لیں گے، فسق کے اندر لزوم والا معنی آجائے گا، ''یہ گناہ ہے جو چمٹنے والا ہے تمہارے ساتھ''، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے، وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ وَاِنْ کُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ: اور اگر تم سفر پر ہو، وَّلَمْ تَجِدُوْا کَاتِبًا: اور نہ پاؤ تم لکھنے والے کو، فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ: رِهَان رَهن کی جمع ہے مرہون کے معنی میں، پھر کچھ اشیاء رَہن رکھی ہوئی ہیں جو قبضے میں دی ہوئی ہیں وہ ضمانت کا ذریعہ ہیں، یوں بات پوری ہوجائے گی۔ پھر قبضے میں دی ہوئی مرہونہ اشیاء وثوق کا باعث ہیں، اس کے ذریعے سے وثوق حاصل کرلیا کرو، فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا: پھر اگر اعتبار کرلے تم میں سے بعض بعض کا، فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ: پھر چاہئے کہ ادا کردے وہ شخص جس کا اعتبار کیا گیا ہے اَمَانَتَهٗ: اپنی امانت کو، امانت سے مراد حق لازم ہے جو اُس کے ذمے ہے، جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ اپنے ذمے لگے ہوئے حق کو جو دوسرے کی امانت ہے اس کو ادا کردے، وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ: اور چاہئے کہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رَبّ ہے، وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ: گواہی کو چھپایا نہ کرو، وَمَنْ یَّکْتُمْهَا: جو اس شہادت کو چھپائے گا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ: پس بیشک اُس کا دل گنہگار ہے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کا علم رکھنے والا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ: اگر ظاہر کروگے تم اس بات کو جو تمہارے دلوں میں ہے اَوْ تُخْفُوْهُ: یا اس کو چھپاؤ گے یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ محاسبہ کرے گا اس کے ذریعے سے تمہارا، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ یحاسب محاسبہ سے ہے۔ فَیَغْفِرُ: پھر بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا، وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ: ایمان لے آیا رسول اس چیز پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے، اور ایمان لے آئے مؤمن، کُلٌّ اٰمَنَ: ہر کوئی ایمان لے آیا، ہر کسی نے اعتقاد جمالیا اللہ کے ساتھ اور اُس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ، قَآئِلِیْنَ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: یہ کہتے ہوئے، گویا کہ لَا نُفَرِّقُ یہ اٰمَنَ کی ھو ضمیر سے حال واقع ہے، ہر کوئی ایمان لے آیا یہ کہتے ہوئے کہ ہم تفریق نہیں کرتے، فرق نہیں ڈالتے ان رسولوں میں کسی کے درمیان، یعنی

بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں، ایسا نہیں ہے، وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: اور ان سب نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور قبول کرلیا، مان لیا، اطاعت کرلی، غُفْرَانَكَ: نَطْلُبُ غُفْرَانَكَ ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار!، وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ: اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: نہیں تکلیف دیتا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق، اس کی گنجائش کے موافق، لَهَا مَا كَسَبَتْ: اس نفس کے لئے ہے جو کچھ اس نے کمایا، وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ: اور اسی پر ہی پڑے گا جو کچھ اس نے کیا۔ لَهَا نفع کے لئے ہے، تو مَا كَسَبَتْ سے مراد نیکی ہوجائے گی، اور علیٰ ضرر کے لئے ہے تو مَا اكْتَسَبَتْ سے مراد گناہ ہوجائے گا، یعنی جو اپنے اختیار کے ساتھ نیکی کرے گا وہ اسی کے نفع میں ہے، اور جو اپنے اختیار کے ساتھ گناہ کرے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ: اے ہمارے پروردگار! ہم سے مؤاخذہ نہ کر، اِنْ نَّسِیْنَآ: اگر ہم بھول جائیں، اَوْ اَخْطَاْنَا: یا ہم چوک جائیں، خطا کرجائیں، بھول چوک کا لفظ اردو میں بھی بولا جاتا ہے، نسیان تو یہ ہوتا ہے کہ یاد نہ رہے، اور خطاء یہ ہوتی ہے کہ یاد تو تھا اور کرنے بھی لگے تھے ہم صحیح بات اور صحیح کام، لیکن چوک گئے، زبان سے غلط بات نکل گئی یا ہاتھ سے غلط حرکت ہوگئی، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ: اے ہمارے پروردگار! اور نہ لاد ہم پر، اِصْرًا: مشکل احکام، اِصر بوجھ کو کہتے ہیں، یہاں سے مشکل احکام مراد ہیں، كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا: جیسے کہ ڈال دیے تھے تو نے اُن لوگوں پر، لاد دیے تھے تو نے اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے ہیں، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا: اے ہمارے پروردگار! ہم سے نہ اٹھوا ایسی چیز جس کی ہمیں طاقت نہیں، وَاعْفُ عَنَّا: ہم سے درگزر کرجا، وَاغْفِرْ لَنَا: اور ہمیں بخش دے، وَارْحَمْنَا: اور ہمارے اوپر رحم کردے، اَنْتَ مَوْلٰىنَا: تو ہمارا مولیٰ ہے، کارساز ہے، فَانْصُرْنَا: پس تو ہماری مدد کر، عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ: کافر لوگوں کے خلاف۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

مالی معاملات کا تذکرہ شروع تھا، جن میں سے پہلے صدقہ خیرات کے احکام ذکر کیے گئے تھے اور آداب ذکر کیے گئے تھے، اور اُس کے بعد سود اور رِبا کا مسئلہ ذکر کیا گیا تھا، اِس رکوع کے اندر قرض کے کچھ احکام ذکر کئے گئے ہیں۔

مال کے ساتھ دُوسروں کو فائدہ پہنچانے کے تین طریقے اور ان کی تفصیل

میں نے عرض کیا تھا کہ مال کے ساتھ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے یا دوسروں کے کام آنے کے تین ہی طریقے ہیں، یا تو صدقہ خیرات کے طور پر دوسروں کو دو، اس کے تو بہت فضائل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ خرچ کیے ہوئے مال کو کئی کئی گنا بڑھاتا ہے، اور خرچ کرنے والے کو دنیا اور آخرت میں فائدہ پہنچاتا ہے، اُس کی تفصیل پہلے آپ کے سامنے

دورکوع میں بلکہ اس سے بھی زائد آیات میں کی گئی۔ اور اُس کے بالکل مخالف سمت میں سود ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے، قطعی حرام ہے، اور سود کھانے والے کی مذمت کی گئی، باز نہ آنے والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ دیا گیا، اور حدیث شریف کی روایات میں بھی آپ کے سامنے یہ بات واضح کی گئی کہ یہ موجب لعنت اور بہت زیادہ بری بات ہے، چونکہ یہ سنگدلی کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس ضرورت سے زیادہ مال موجود ہے پھر وہ بوقتِ ضرورت کسی محتاج کا ہاتھ نہیں پکڑتا اور اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتا، بلکہ اپنی سنگدلی کے طور پر الٹا اُس کے احتیاج سے فائدہ اٹھاتا ہے، تو پچھلی آیات میں اِس کی مذمت کی گئی تھی۔ تیسرا معاملہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ضرورت سے زائد سرمایہ موجود ہے اور کوئی حاجت مند آجائے تو اس کو بطور قرض کے ہی دے دو، وہ اپنا وقت پورا کرلے، اور اس کے بعد جو آپ نے دیا ہے وہ آپ کی طرف واپس آجائے گا۔ تو قرض دینا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک محبوب چیز ہے، اگر کوئی محتاج قرض لینے کے لئے آجائے تو قرض دے دینا چاہیے، اِس کا بھی صدقے کی طرح ہی ثواب ہے، بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرضے میں فضیلت بایں معنی زیادہ ہے کہ آپ جب کسی کو صدقہ خیرات کے طور پر دیں گے تو ہوسکتا ہے کہ کسی کو بے ضرورت بھی پہنچ جائے، کہ ایک آدمی کو ضرورت نہیں تھی اور آپ نے صدقہ اور خیرات کے طور پر کوئی چیز دے دی، لیکن جو قرض مانگنے کے لئے آجائے یہ تو بہر حال اُس کے محتاج ہونے کی دلیل ہے، اور پھر قرض دینے کے بعد جتنے دن تک آپ اس کو مہلت دیے رکھیں گے اور وہ آپ کے مال سے فائدہ اٹھائے گا اُتنے دنوں تک یہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔

قرض کے بارے میں کچھ ہدایات

لیکن چونکہ اُس میں پیسے دے کر پھر واپس لینے ہوتے ہیں تو اُس میں جھگڑے اور اس قسم کے اختلافات کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اِن آیات میں کچھ ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھتے ہیں جو آپ کو جھگڑا فساد سے بچانے والی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہی گئی کہ جب بھی آپس میں کوئی قرض کا معاملہ کرو کسی وقت معین تک، تو اُس کو لکھ لیا کرو، قرض کا معاملہ دونوں طرح سے ہوتا ہے، بسا اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ قرض کے طور پر نقد پیسے دے دیے اور وقت متعین کردیا کہ ایک مہینے کے بعد واپس دینے ہوں گے، تو بھی لکھ لو، تحریر میں لے آؤ۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی چیز خریدی ہے جس میں پیسے نقد دے دیے اور مبیعہ کو ادھار کرلیا جیسے بیع سلم میں ہوتا ہے، تو اس کو بھی لکھ لینا چاہیے۔ اسی طرح خرید وفروخت میں چیز آپ نے لے لی اور پیسے آپ کے ذمے لگ گئے یہ بھی قرض کا معاملہ ہے، اس کو بھی لکھ لینا چاہیے۔ تین صورتیں آگئیں، یا تو ہے کہ نقد پیسے آپ نے دیے اور نقد ہی واپس لینے ہیں، جس کو عام طور پر ہم قرض سے تعبیر کرتے ہیں، اور ایک یہ ہے کہ چیز آپ نے خریدی اور پیسے نقد نہیں دیے، جس کو ہم ادھار سے تعبیر کرتے ہیں، اور ایک یہ ہے کہ پیسے نقد دے دیے مال نقد نہیں لیا، جس کو بیع سلم سے تعبیر کرتے ہیں، تداینتم بدین کے اندر یہ ساری صورتیں آجاتی ہیں۔ ''اے ایمان والو! جب آپس میں قرض کا معاملہ کرو'' اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى میں اس

بات کی طرف نشاندہی کردی کہ ادھار ہو، قرض ہو، یا بیع سلم ہو، اس کا وقت متعین کر لینا چاہیے، تاکہ پھر بعد میں کوئی جھگڑے کی صورت پیش نہ آئے، وہ کہے کہ میں نے پیسے اب نہیں دینے، پھر دینے ہیں، حدیث شریف میں جس طرح سے تفصیل آتی ہے کہ اَجل متعین کی جائے، اور اجل بھی ایسی متعین کی جائے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو، جیسے مہینہ متعین کرلیا اور اُس کی تاریخ متعین کرلی، اور جس میں اختلاف کی گنجائش ہو وہ اجل متعین کرنا بھی ٹھیک نہیں، جیسے کہہ دے کہ جس وقت میری بھینس بچہ دے گی اس وقت قرضہ واپس کروں گا، یا جس وقت آم پک جائیں گے تب قرضہ ادا کروں گا، کیونکہ اس میں موسموں کے اعتبار سے تقدم تاخر ہو جاتا ہے...... ''اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ'' کاتب کو بھی عدل کی رعایت رکھنی چاہیے، یہ نہیں کہ لکھانے والا کچھ لکھائے اور وہ کچھ لکھ دے۔ اور آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کاتب کو تعلیم ہے، کہ اگر کوئی ضرورت مند اُس کے پاس لکھوانے کے لئے آجائے تو چاہیے کہ وہ لکھ دیا کرے، اللہ تعالیٰ نے اُس کو کتابت کا انعام دیا ہے، کتابت کی تعلیم دی ہے، اُسے لکھنا آتا ہے تو ضرورت مند کی دستگیری کرنی چاہیے، وقت پر انکار نہ کرے، ''نہ انکار کرے کاتب لکھنے سے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے اس کو لکھ دینا چاہیے''...... اور پھر جس وقت لکھنے کے لئے بیٹھیں گے، تحریر ہوگی، تو بول بول کر لکھوانا چاہیے اُس شخص کو جس کے ذمے حق ہے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اقرار نامہ ہوتا ہے، وہ اُسی کی زبان سے ہی جاری ہونا چاہیے، مثلاً بیع سلم کی صورت میں جس کے ذمے مبیعہ ہے، یا ادھار بیع کی صورت میں جس کے ذمے ثمن ہے، یا جس نے قرض لیا ہے، اُسے اپنی زبان سے بول کر کاتب کو لکھوانا چاہیے'' چاہیے کہ لکھائے وہ شخص جس کے ذمے حق ہے، اور یہ لکھواتے وقت بھی اللہ سے ڈرے'' یعنی کسی قسم کی کمی بیشی کرنے کی کوشش نہ کرے، لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا: اس حق میں سے کوئی کمی نہ کرے...... ''اور اگر وہ شخص جس کے ذمے حق ہے بے عقل سا ہے، اپنے امور کا خود متولی نہیں، سفیہ ہے، یا وہ ایسا ضعیف ہے کہ خود اپنی زبان سے نہیں لکھوا سکتا، جیسے بہت زیادہ بوڑھا ہے، بولنے سے تکلیف ہوتی ہے، یا بچہ ہے، اداء پر قادر نہیں، ''یا وہ کسی وجہ سے لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا'' جیسے گونگا ہے، یا وہ زبان نہیں سمجھتا، کاتب کو سمجھا نہیں سکتا، ''تو پھر جو اُس کا کارکن ہے، اُس کا ولیٔ امور، اُس کو لکھوا دینا چاہیے، اور وہ بھی انصاف کی رعایت رکھے''...... ''اور پھر اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالیا کرو'' فیصلے کا مدار اصل کے اعتبار سے شہادت پر ہے، فیصلہ جات میں نہ گزشتہ زمانے میں اور نہ ہی آج، عدالتوں میں تحریر کا اعتبار نہیں ہوتا جب تک اس تحریر پر شہادت نہ ہو، جیسے فقہ میں لکھا ہوا ہوتا ہے: ''اَلْخَطُّ يُشْبِهُ الْخَطَّ''(۱) کہ خط خط کے مشابہ ہو سکتا ہے، اس لئے تحریر صرف ایک یاددہانی اور وثوق کا ذریعہ ہے، ورنہ فیصلہ اصل کے اعتبار سے شہادت پر ہوتا ہے، خط کے اندر اختلاف ہو سکتا ہے، جب تک اُس پر شہادت نہ ہو اُس وقت تک وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتا، اس لیے لکھتے وقت دو گواہ بھی بنالیا کرو۔ اصل تو یہی ہے کہ اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو گواہ بناؤ، رجال کا لفظ بول دیا جس سے معلوم ہوگیا کہ گواہ بالغ ہونے چاہئیں، پھر رِجَالِكُمْ کا لفظ بولا اور يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا سے خطاب چلا آرہا ہے،

---

(۱) المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۱۹۱ مطبوعہ بیروت/ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۲ ص ۷۰۳ مطبوعہ بیروت۔

معلوم ہوگیا کہ گواہ مؤمن ہونے چاہئیں، اور آگے مِمَّنْ تَرْضَوْنَ آ گیا جس سے معلوم ہوگیا کہ پسندیدہ ہونے چاہئیں، مِمَّنْ تَرْضَوْنَ سے اُن کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ فریقین کے نزدیک وہ قابل اعتماد ہوں، مِمَّنْ تَرْضَوْنَ: جن کو تم پسند کرتے ہو، تو اِس میں سے عدالت کی طرف اشارہ نکل آئے گا، اور یہی شرطیں ہیں جو فقہاء لگایا کرتے ہیں کہ گواہ عاقل ہو، بالغ ہو، مسلم ہو، اور عادل اور پسندیدہ ہو جس پر فریقین اعتماد کریں...... اور اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں دو گواہوں کے قائم مقام ہو جائیں گے، صرف خالص عورتوں کی شہادت ایسے معاملات میں معتبر نہیں ہے، ایک مرد ساتھ ہو اور دو عورتیں ہوں، عورتوں کے اندر تعدد اس لئے ہے کہ عورتیں بسا اوقات اپنا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں، اُن دونوں میں سے ایک غلطی کر رہی ہو یا بیان کا کوئی حصہ چھوڑ رہی ہو تو دوسری اُس کو یاد دلا دے گی، دونوں کا بیان مل کر مرد کے بیان کے قائم مقام ہو جائے گا...... وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا: گواہوں کو تاکید کی جا رہی ہے کہ جب انہیں گواہ بننے کے لئے بلایا جائے تو انہیں چاہیے کہ انکار نہ کریں، ایک دوسرے کیساتھ تعاون کرنا چاہیے، کیونکہ حقوق کے تحفظ اور صحیح فیصلے کا مدار شہادت پر ہوتا ہے، اگر ایک دوسرے کے معاملے میں انسان گواہ بنانہ چاہے یا بنے نہیں تو آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملات صحیح طریقے سے ادا نہیں ہو سکتے۔ إِذَا مَا دُعُوْا: جب اُن کو گواہ بننے کے لئے بلایا جائے تو ان کو انکار نہیں کرنا چاہیے، لَا تَسْئَمُوْٓا: اکتانہ جایا کرو، اکتاؤ نہیں اِس معاملے کو لکھنے سے، چھوٹا ہو یا بڑا، لکھنا اُس کا اُس کی مدت تک، یعنی ہر معاملے کو اس کی مدت تک لکھ لیا کرو، چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اِس سے اکتایا نہ کرو۔

اِس رُکوع کے اَحکام وجوبی نہیں بلکہ اِستحبابی ہیں

اِس رکوع میں جتنے احکام دیے جا رہے ہیں امر یا نہی کی صورت میں، فقہاء کے نزدیک یہ استحباب کے لئے ہیں، اگر آپس میں ایک دوسرے کا اعتبار کر لیا جائے، کہ قرضہ دے دیا، ادھار کر لیا، اور تحریر نہیں لی یا گواہ نہیں بنائے تو یہ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شفقت ہے کہ آپ کو ایسے طریقے بتائے جا رہے ہیں کہ کل کو آپس میں کوئی جھگڑے کی نوبت نہ آ جائے، کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، اس لئے احتیاط رکھو، کل کے فساد سے بچنے کے لئے آج احتیاط بہتر ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ دیکھتے ہیں کہ صبح شام رات دن ہم تو چھوٹی موٹی چیزیں خریدتے رہتے ہیں، صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا میں تو چھوٹی موٹی چیزیں آ ہی جاتی ہیں، ادھار بھی ہوتا رہتا ہے، کوئی پانچ روپے قرض لے گیا، کوئی دس روپے قرض لے گیا، کوئی پچاس قرض لے گیا، تو ان اَحکام کے مطابق اُن کا لکھنا اور گواہ بنانا عام طور پر ہمارے معمول میں نہیں ہے، تو یہ احکام اولویت کے لئے ہیں، صرف آپ کو نقصان سے بچانے کے لئے، کہ اگر یہ لکھ لو گے اور گواہ بنا لو گے تو جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی، معاملہ آسانی کے ساتھ طے ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں لکھو گے تو ہو سکتا ہے کبھی کوئی جھگڑے کی نوبت آ جائے، پھر پریشانی پیش ہوگی، اس مضرتِ دنیوی سے اور جھگڑا و جدال سے بچانے کے لئے یہ احکام دیے جا رہے ہیں، ورنہ آپس میں اگر ایک دوسرے کا اعتبار کر لیا جائے تو بھی کوئی بات نہیں، جیسے آخر میں کہہ دیا جائے گا کہ اگر ایک دوسرے کا اعتبار کر لو تو بھی کوئی بات نہیں ہے۔ جس کا اعتبار کیا گیا ہے، جس پر اعتماد

کر کے دوسرے نے قرضہ دے دیا، اُسے چاہیے کہ پھر اپنے حق کو پہچانے، جو امانت دوسرے کی اس کے ذمے لگی ہوئی ہے وہ ادا کرے۔

یہی حکمت ذکر کی جارہی ہے لکھنے میں اور گواہ بنانے میں، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ زیادہ انصاف کا باعث ہے، کہ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، اور شہادت کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے، کہ جب لکھا ہوا موجود ہوگا اور گواہ اس لکھے ہوئے کو دیکھیں گے تو اُن کو سارا واقعہ یاد آجائے گا، اور پھر یہ لکھا ہوا آپ کے پاس پڑا ہوا ہوگا، گواہی اُس کے اُوپر ہوگی، اقرار والے کا اقرار لکھا ہوا ہے، تو آپ کے دلوں میں شبہ نہیں پڑے گا کہ کہیں وہ دبا نہ جائے، گویا کہ ایک وثوق کی چیز آپ کے پاس موجود ہے، اَدْنٰٓی اَلَّا تَرْتَابُوْٓا: یہ زیادہ قریب ہے کہ تم آپس میں شک میں نہیں پڑو گے، اِرتیاب: شک میں پڑنا، یعنی تمہیں اطمینان رہے گا کہ جو واقعہ ہے صحیح صحیح لکھا ہوا ہے، اور اِس پر گواہ بھی موجود ہیں، لہٰذا مدیون جس کے ذمے حق لگا ہوا ہے وہ پھر نہیں جائے گا، انکار نہیں کرے گا، کوئی حق تلفی نہیں ہوگی، ورنہ آپس میں بداعتقادی ہو جانے کی صورت میں یہ شبہات پیدا ہو جاتے ہیں کہ میں نے دے تو دیا، معلوم نہیں کہ وہ دے گا یا نہیں دے گا، اقرار کرے گا یا نہیں کرے گا، تو یہ اِس قسم کے شبہات سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

باہم معاملے میں ضبطِ تحریر اور گواہوں کے فوائد

ہاں البتہ اگر کوئی معاملہ نقد بہ نقد کیا ہے، کہ چیز لی اور پیسے دیے، جیسے بازار میں جاتے ہیں، پانچ روپے یا دس روپے کی چیز لیتے ہیں اور پیسے اُسی وقت دے دیتے ہیں، تو پھر کوئی حرج نہیں کہ نہ لکھا کرو۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بڑی خرید وفروخت آپس میں کی ہے تو گواہ بنالو، جیسے چار پانچ ہزار کی بھینس خریدی ہے تو چاہے پیسے نقد دے دیے لیکن پھر بھی دو آدمی موجود ہوں، تاکہ پھر کوئی غلط بیانی نہ کردے، بھینس والا کل کو آپ کے دروازے پر کھڑا ہو جائے کہ تو پیسے تو دے کر نہیں آیا اور بھینس لے آیا، اب بھینس تو سب کو نظر آرہی ہوگی کہ واقعی اُس کی ہے جو اِس کے گھر بندھی ہوئی تھی، اور پیسے دیے ہوئے کسی کو نظر نہیں آئیں گے، تو پھر معاملے کو کس طرح طے کرو گے؟ اس لیے ایسا موٹا سودا اگر کوئی ہو جس میں زیادہ رقم لی دی جاتی ہے، جیسے کوئی گاؤں خریدا ہے، کوئی زمین خریدی ہے، کوئی بڑا کارخانہ خریدا ہے، چاہے پیسے نقد دے دیے، پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ گواہ بنالیے جائیں۔

شہادت کی اہمیت اور آج کا نظامِ عدالت

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ: کاتب اور گواہ کو چاہیے کہ وہ بھی نقصان نہ پہنچائے، یعنی صحیح لکھے اور صحیح گواہی دے، اور کاتب اور گواہ کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے، یہ بھی ایک بہت بڑی حکمت کی بات ہے، آپ حضرات کو ابھی واسطہ نہیں پڑا، آج ہمارا نظامِ عدالت جو خراب ہے اُس کی وجہ یہی ہے کہ نظامِ شہادت ٹھیک نہیں ہے، اول تو کوئی شخص جلدی سے گواہ بننے کی کوشش نہیں کرتا، کیونکہ گواہ بن جانے کے بعد جو پھر کئی کئی سالوں تک عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں، اُس سے انسان تنگ آجاتا ہے، آئے دن تھانے والے گواہوں کو بلائے بیٹھے ہوں گے، اور آئے دن عدالتوں میں حاضری ہوگی، کاروباری آدمی کے کاروبار کا

نقصان ہوتا ہے، ملازم آدمی کو بار بار چھٹیاں لینی پڑتی ہیں، مزدور آدمی کو اپنا کام چھوڑنا پڑتا ہے، مقدمہ جو شروع ہوتا ہے تو کئی کئی سال تک ختم ہی نہیں ہوتا۔ اور پھر فریق مخالف کی طرف سے گواہوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں، اُن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، آپس میں عداوتیں ہوجاتی ہیں، کہ ہمارے خلاف تم گواہی کیوں دے رہے ہو، اور بہت بڑے فتنے کھڑے ہوجاتے ہیں، جس سے شریف آدمی ڈرتا ہے، اور وہ کہتا ہے کہ دفع کرو، جس کا معاملہ ہے خود نمٹتے پھریں گے، ہمیں گواہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے آدمی گواہ بنتے نہیں جو صحیح بات کہیں، اور گھٹیا قسم کے لوگ گواہ بنا لیے جاتے ہیں، اُن سے پھر جو چاہو کہلوا لو، اور جیسے چاہو اُن کو ڈرا دھمکا کر انکار کروا لو، جب نظام شہادت خراب ہوگیا تو پھر نظام عدالت تو ساتھ خراب ہونا ہی تھا، کیونکہ عدالت کا دارومدار ہی شہادت پر ہے، جب تک گواہ صحیح نہیں ہوں گے اور واقعہ صحیح بیان نہیں کریں گے اس وقت تک حاکمِ وقت صحیح فیصلہ کیسے دے سکتا ہے۔ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ کاتب اور شہید میں بھی جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ کسی فریق کو نقصان نہ پہنچائے، کہ جھوٹا بیان نہ دے اور جھوٹی تحریر نہ دکھائے، اور اسی طرح لوگوں کو بھی چاہیے کہ اُس کاتب کو اور اُس گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں، تبھی جا کر وہ صحیح بات بیان کریں گے اور وقت پر جا کر گواہی دیں گے، اگر اُن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی تو نقصان سے بچنے کے لئے وہ بھی اپنے بیان بدل لیں گے یا گواہی ادا کرنے سے انکار کر دیں گے، پھر حقوق کا تحفظ نہیں ہوگا، حقوق آپس میں تلف ہوجائیں گے۔ ''اگر تم ایسا کرو گے تو یہ گناہ ہے جو تمہیں چمٹا ہوا ہے، اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے'' یہ احکام کے بیان میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ اور اللہ تعالیٰ کے تقوے کی تلقین (یہ پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا) کہ یہ اسلامی آئین کی خصوصیت ہے کہ انسان کے جذبات کو ساتھ ساتھ سنوارتا ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ کی اِن صفات پر اعتماد ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ انسان کو حاصل ہوگا تو پھر جیسے کیسے بھی حالات ہوں انسان صحیح بات کہنے کی کوشش کرے گا اور صحیح کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو احکام کا قابل قبول ہونا اِنہی صفات کے استحضار سے ہوتا ہے، اور انسان کا عمل سیدھا تبھی ہوتا ہے جب تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے اِس علم کا استحضار ہو، کہ اگر میں کوئی کوتاہی کروں گا تو اللہ تعالیٰ سے چھپی نہیں رہے گی۔

اور اگر تم سفر پر ہو اور وہاں کوئی کتابت کا سامان نہیں ملتا، کاغذ قلم نہیں ہے، یا کوئی لکھنے والا موجود نہیں، تو پھر کچھ اشیاء دوسرے کے قبضے میں بطور رہن کے دے دیا کرو، یہ وثوق کا ذریعہ بن جائیں گی۔ کتاب الرہن فقہ کے اندر جو پڑھتے ہیں وہ سب اِسی کے احکام پر مشتمل ہے، اور یہ بھی استحباب کے طور پر ہی ہے۔

دَین اور شہادت کے متعلق مزید ہدایات

''پھر اگر اعتبار کرلے بعض بعض کا'' یعنی وہ رہن بھی نہیں لیتا اور تحریر بھی نہیں کرتا اور گواہ بھی نہیں بناتا، کوئی ایسی بات

نہیں، مثلاً آپ گئے، اس نے ہزار روپیہ اٹھا کر آپ کو دے دیا، یا اسی طرح کوئی دوسرا معاملہ کرلیا اور اعتبار کرلیا؛ ''تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے حقِ لازم کو ادا کرے، جو اس کے ذمے حق ہے وہ ادا کرے، اور اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رَبّ ہے'' یہ نہ کہے کہ جب دوسرا کوئی دیکھنے والا نہیں، کسی دوسرے کے علم میں نہیں، تو میں انکار کردوں یا کوئی گڑبڑ کردوں، ایسا نہیں کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کر جو اُس کا پروردگار ہے صاحبِ حق کا حق صحیح صحیح ادا کرنا چاہیے، ''گواہی کو چھپایا نہ کرو'' اگر تمہارے علم میں کوئی واقعہ ہے، تم گواہ بنے ہوئے ہو، تو جب ضرورت پیش آجائے اس کو ادا کرو، گواہی کو چھپایا نہ کرو، ''جو کوئی شہادت کو چھپائے گا تو بیشک اس کا دل گناہ گار ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔''

آخری رُکوع کا حاصل

آخری رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں اُن کا حاصل بھی یہی ہے کہ انسان ظاہر و باطن سے اللہ تعالیٰ کے سامنے صاف ستھرا رہے، اور پھر دُعا بھی کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو جو جان بوجھ کر ہوجائیں یا غلطی سے ہوجائیں، جیسی کیسی بھی ہیں، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، اور تکوینی مصائب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وہ بھی ہم پر کوئی ناقابلِ برداشت صورت میں نہ آئیں، اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترتے ہیں وہ بھی ایسے مشکل مشکل نہ ہوں جس قسم کے پہلی اُمتوں پر اُتارے گئے تھے، یہ دُعائیں تلقین فرمائیں۔

سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت

اور حضور ﷺ نے آخری دو آیتوں (امن الرسولُ سے لے کر آخر تک) کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے، کہ اگر کوئی شخص رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لے تو یہ رات کے وظائف کے قائم مقام ہوجاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ شر سے محفوظ رکھتے ہیں۔[1] کَفَتَاہُ کا لفظ جو حدیث شریف میں آیا ہوا ہے، کہ سورۂ بقرہ کی یہ دونوں آیتیں جو پڑھ لے وہ دونوں آیتیں اس کے لئے کافی ہوجاتی ہیں، عام طور پر تو اس کا مطلب یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر اور اَوراد وظائف وغیرہ نہ ہوسکیں تو یہ پڑھی ہوئی کافی ہیں، لیکن سیّد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ذمے ہے کہ رات کو کچھ نہ کچھ قرآنِ کریم ضرور پڑھے، قرآنِ کریم کا یہ حق ہے، اگر قرآنِ کریم نہ پڑھا جائے تو قرآنِ کریم کو یہ شکایت ہوگی، لیکن اگر کوئی شخص سورۂ بقرہ کی یہ دو آیتیں ہی پڑھ لیتا ہے تو قرآنِ کریم کے حق کی ادائیگی کے لئے اِن دو آیتوں کی تلاوت کافی ہے، یعنی اور کچھ نہ ہوسکے تو کم از کم یہ دو آیتیں ضرور پڑھ لینی چاہئیں (فیض الباری ج ۵ ص ۲۶)۔

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ باب فضل البقرۃ۔ مشکوٰۃ ص ۱۸۵ فضائل القرآن۔ فصل اول ولفظہ: اَلْاٰیَتَانِ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ مَنْ قَرَأَهُمَا فِيْ لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ.

خیالات کی قسمیں اور اَحکام

''اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اگر ظاہر کرو تم اُن باتوں کو جو تمہارے دل میں ہیں، یا تم اُن کو چھپاؤ، اللہ تم سے محاسبہ کرے گا''، اب مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ کے اندر عموم ہے، جس سے بظاہر ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ دل کے جو خیالات بھی ہیں وہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے، اور آپ جانتے ہیں کہ خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ ہیں جو انسان سوچ سوچ کر اپنے دل میں بٹھاتا ہے، جس میں فعلِ قلب کے طور پر انسان کا اختیار ہے، جیسے آپ ایک ارادہ کرتے ہیں، عزم کرتے ہیں، دل کے اندر آپ حسد بغض وغیرہ کسی کے متعلق رکھتے ہیں، اپنے قلب کے اندر کوئی عقیدہ جماتے ہیں، یہ افعال اختیار یہ ہیں جو قلب سے صادر ہوتے ہیں۔ اور بعض کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا اختیار قلب سے صادر ہوتے ہیں جس کو ہم وسوسے سے تعبیر کرتے ہیں، برے سے برا خیال دل میں آجاتا ہے، اگرچہ انسان چاہتا ہے کہ نہ آئے لیکن پھر بھی آجاتا ہے، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آتے تھے، مشکوۃ میں باب الوسوسہ میں روایات ہیں، آکر کہتے تھے کہ یارسول اللہ! ہمارے دلوں میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہونا تو گوارا کرلیں گے، لیکن اُن باتوں کو اپنی زبان پر لانا گوارا نہیں کرتے، اس قسم کے خیالات انسان کے دل میں آتے ہیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے وضاحت فرمادی، کہ اس قسم کے غیر اختیاری خیالات پر گرفت نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات اس قسم کے وسوسوں کا آنا انسان کے ایمان کی علامت ہے، اور بُرے خیالات کے آنے سے قلب کے اندر انقباض کا پیدا ہونا یہ بھی علامت ہے اس بات کی کہ انسان کے قلب کا مزاج صحیح ہے اور اِس کا ایمان درست ہے۔[1] البتہ جو اختیاری امور ہوں گے، جیسے آپ حسد کرتے ہیں، بغض کرتے ہیں، یہ اخلاقِ رذیلہ میں سے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبت، اللہ کے رسول کی محبت، آخرت کا شوق، یہ اخلاقِ حمیدہ میں سے ہیں، اسی طرح شکر صبر وغیرہ یہ سب اخلاقِ فاضلہ ہیں، اچھے اخلاق پر ثواب ہے اور اخلاقِ رذیلہ پر گرفت ہے، اسی طرح عقائدِ فاسدہ آپ قلب کے اندر رکھیں گے تو ان پر گرفت ہے، عقائدِ صحیحہ رکھیں گے تو ان پر ثواب ہے۔ تو امورِ اختیاریہ جو قلب سے صادر ہوتے ہیں اُن کے اُوپر اللہ تعالیٰ کا محاسبہ ہے، واقعہ یہی ہے، اور غیر اختیاری پر نہیں، لیکن یہاں چونکہ لفظ مَا عام آیا ہوا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذہن اِدھر چلا گیا، جس کی بناء پر انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ذکر کیا کہ یارسول اللہ! اس وقت تک تو اللہ کے احکام ایسے آئے جو ہمارے بس میں تھے، اب اگر دل کے خیالات پر بھی محاسبہ شروع ہوگیا تو پھر ہم میں سے بچے گا کون؟، کیونکہ دل کے خیالات تو قابو اور بس میں نہیں ہیں، اور ایسے ایسے خیال آجاتے ہیں جن کو ہم اپنی زبان پر لانا بھی نہیں چاہتے۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے ادب کے طور پر یہ بات سکھائی کہ تمہیں اس سے کیا؟ اللہ کی طرف سے جو حکم ہو تمہیں قبول کرنا چاہیے، ایسا نہ کرو جیسے یہودیوں نے کہا تھا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا، کہ سن لیا لیکن

---

(۱) ابوداؤد، ج ۲ ص ۳۴۱ باب فی رد الوسوسہ۔ مشکوٰۃ ص ۱۹ باب فی الوسوسۃ۔ فصل ثانی۔

مانیں گے نہیں،[1] ہمارا کام تو ہے کہ جو اللہ کی طرف سے آجائے ہم قبول کرلیں، باقی! اللہ کی مرضی جس طرح چاہے معاملہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین پر اِسی طرح ایمان کا اظہار کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی آیا اُس کو قبول کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی تعریف کی، اور اُس کے بعد اِس کی وضاحت کردی کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زائد کسی کو تکلیف نہیں دیا کرتا، اس لئے مافی انفسکم سے مراد بھی ایسی چیزیں ہیں جو تمہارے اپنے بس میں ہیں اور تمہاری گنجائش میں ہیں، اور جو تمہاری گنجائش میں نہیں ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کی نہ تکلیف ہے اور نہ اس پر کوئی محاسبہ ہے۔ ''اگر ظاہر کرو تم اُن چیزوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں، یا تم ان کو چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے محاسبہ کرے گا''، بِہٖ کی ضمیر مَا کی طرف لوٹ رہی ہے۔

''فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ'' کا صحیح مفہوم

''پھر بخشے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا''، اِن الفاظ سے آپ کا ذہن ادھر نہ جائے کہ چاہے ایک آدمی اچھا ہو، اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے دے گا، یا چاہے ایک آدمی برا ہو اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا، اگرچہ اللہ کی قدرت ہے لیکن ان لفظوں کا یہ مطلب نہیں، اِن لفظوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلے میں کوئی شخص حائل نہیں ہوسکے گا، جس کو چاہے گا اللہ معاف کرے گا، لیکن معاف کرنا کس کو چاہے گا؟ جو معافی کے قابل ہے۔ اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا، عذاب کس کو دے گا؟ جو گناہ گار ہے۔ جس کو چاہے گا کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آگے رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، اللہ تعالیٰ جو کچھ کرے گا اپنی قدرتِ کاملہ کے مطابق کرے گا، اور اپنی حکمت کے طور پر طے شدہ قانون کے مطابق کرے گا، جو اس نے اپنی حکمت کے طور پر قاعدہ متعین کرلیا اُس کے مطابق ہی برتاؤ کرے گا۔ اس لئے واقعہ یونہی ہے کہ کافر کو جنت میں نہیں ڈالے گا اور مؤمن کامل کو اللہ تعالیٰ جہنم میں نہیں ڈالے گا، لیکن مؤمن کامل کو جنت میں بھیجنا بھی اُس کی مشیت سے ہے، اور کافر کو جہنم میں بھیجنا بھی اُس کی مشیت سے ہے، کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کو مجبور کر کے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف فیصلہ نہیں کرواسکتا۔ تو فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اپنی مشیت کے مطابق ہوگا، کوئی دوسرا اُس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، جس کو چاہے گا بخشے گا، بخشنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا، عذاب دینے سے کوئی نہیں روک سکتا، یہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار کو ذکر فرماتے ہیں، کہ میرا اختیار ہے، میں جس کو چاہوں گا بخشوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، میرے فیصلے پر کوئی دوسرا آدمی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

آگے اُن کے اِس ایمان کی تعریف ہے، ''ایمان لے آیا رسول، مان لیا رسول نے اُس چیز کو جو اُس کی طرف اتاری گئی اُس کے رَبّ کی طرف سے'' رسول سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ ''اور مؤمنوں نے'' یعنی جو پہلے ایمان لا چکے ہیں انہوں نے

(۱) مسلم ج۱ص۷۷، باب بیان تجاوز اللہ عن حدیث النفس.

بھی اِس نئی آنے والی بات کو قبول کرلیا، مان لیا، ''ہر کوئی ایمان لے آیا اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، یہ کہتے ہوئے کہ ہم اِن رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے، تفریق نہیں کرتے'' کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، یہاں فرقِ مراتب مراد نہیں ہے، بلکہ ایمان کے اعتبار سے فرق مراد ہے، کیونکہ فرقِ مراتب تو منصوص ہے، جیسے آپ کے سامنے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ کے تحت ذکر کیا تھا، تو فضیلت تو بعض کو بعض پر ہے، یہاں تفضیل کا انکار نہیں، بلکہ تفریق کا معنی یہ ہے کہ اِن میں فرقے بنالئے جائیں، کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، ایسا نہیں کرتے، سب رسولوں کو مانتے ہیں'' اور انہوں نے یہ کہا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا'' نَطْلُبُ غُفْرَانَكَ ہم تیری مغفرت طلب کرتے ہیں، غُفران مصدر ہے مغفرت کے معنی میں۔ ''اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔''

عذاب وثواب کس چیز کا ہوگا؟

اب آگے اُس مسئلے کی وضاحت آگئی کہ ''اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا کسی نفس کو مگر اُس کی گنجائش کے مطابق، اُسی کے نفع میں ہے جو کچھ اُس نے نیکی کی، اُسی پر وبال پڑے گا جو اُس نے بُرائی کی''، لفظِ کسب کے اندر اختیار کی طرف اشارہ ہے، کہ اپنے اختیار کے ساتھ نیکی کریں گے تو اُس کا فائدہ ہے، اور اختیار کے ساتھ برائی کریں گے تو وبال اُسی پر ہے، براہِ راست جن چیزوں کا ثواب وعذاب انسان کو ہوگا اُس میں تو اپنے کسب کا اعتبار ہے، اور بالواسطہ یعنی بغیر کسب کے بھی آسکتا ہے، لیکن کسب اس میں پایا جاتا ہے اگرچہ کچھ مخفی ہے، جیسے اپنے اختیار کے ساتھ ایک اچھا طریقہ کسی نے جاری کردیا، اب یہاں اُس کا کسب ہے، ثواب ملے گا، آئندہ چاہے اِس کا ارادہ متعلق ہو یا نہ ہو، جتنے لوگ بھی اِس اچھے طریقے پر عمل کرتے رہیں گے، واسطہ بننے کی وجہ سے اُن کا ثواب بھی اِس کو ملتا رہے گا۔ اسی طرح میں اپنے اختیار کے ساتھ ایک نیکی کرتا ہوں اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو بخش دیتا ہوں تو چاہے اِس میں بظاہر اُس کا کسب نہیں پایا گیا لیکن یہ ثواب اُس کو پہنچ جاتا ہے، یہ ہے بالواسطہ۔ اور بلاواسطہ براہِ راست انسان پر عذاب وعقاب اُسی چیز کا ہوگا جو اس نے اپنے اختیار کے ساتھ اچھائی یا بُرائی کی ہے۔ باقی! واسطہ بننے کے طور پر برائی کا عذاب بھی پہنچے گا، کہ بری رسم جاری کردی، اور آگے جتنے اس پر عمل کریں گے سب کے برابر اس کو وبال ہوگا۔ اور نیکی کا طریقہ جاری کردیا تو جتنے آگے عمل کرتے رہیں گے سب کے برابر اس کو ثواب ہوگا، جیسا کہ روایات میں صراحت ہے۔

اہم دُعاؤں کی تلقین

آگے دُعائیں تلقین فرمائیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا ہم چُوک جائیں، کہ تیرا حکم وقت پر یاد نہیں رہا، یا یاد تو تھا لیکن ہم زبان سے کہنے کچھ لگے تھے لیکن نکل کچھ اور گیا، کرنے کچھ لگے تھے لیکن ہمارا ہاتھ

چوک گیا اور ہو گیا کچھ اور، جیسے قتلِ خطا وغیرہ میں ہوتا ہے، کہ ہم نے گولی تو ماری مثال کے طور پر ہرن کو، لیکن ہاتھ چوک گیا اور لگ گئی کسی انسان کو، تو اس کا آخرت میں گناہ نہیں، اس میں مواخذہ دنیا میں ہی ہے جو کچھ ہو گا۔ ''اے ہمارے پروردگار! ہم پر مشکل اَحکام نہ ڈال'' اِصر سے یہاں مشکل احکام کا بوجھ مراد ہے، ''جیسا کہ تو نے یہ مشکل احکام کا بوجھ ڈالا تھا اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسے مصائب نہ ڈال جن کے برداشت کی ہم میں طاقت نہیں، ہم سے درگزر کر جا'' یعنی جو ہم سے نسیان اور خطا ہو گیا اُس کو معاف کر دے، وَاغْفِرْ لَنَا: اور ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے، چھپا دے، بخش دے۔ ''اور ہمارے اُوپر رحم کر'' یعنی ہمیں مصیبتوں سے بچا، اَنْتَ مَوْلٰنَا: تو ہمارا کارساز ہے، فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: پس تو مدد کر ہماری کافر لوگوں کے خلاف۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***